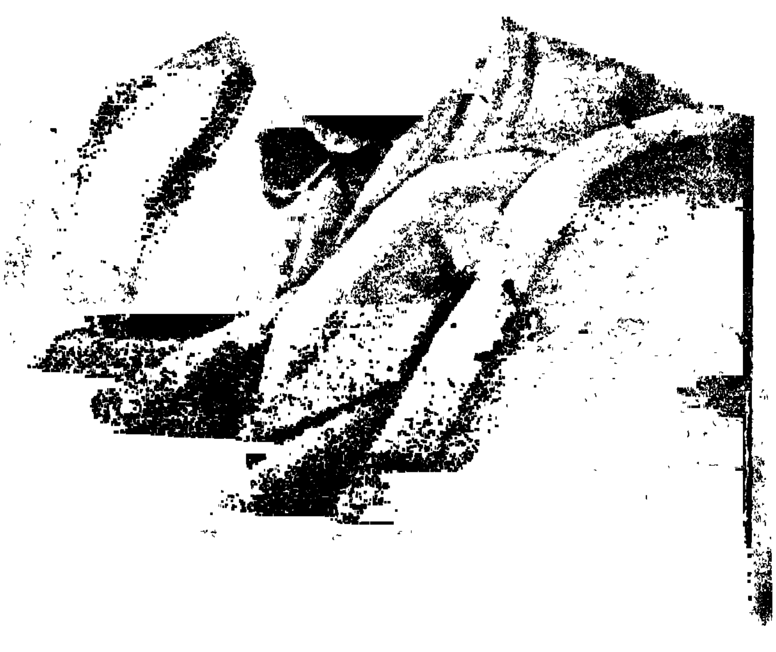
آجکل

ابوالکلام نمبر



اگست

شراون۔ بھادوں

Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi—8
and Printed by the Model Press Private Ltd., Delhi.

Regd. No. D-509.

"ابوالکلام نمبر" کے لئے



وزیر اعظم کا پیغام

اس سال کے شروع میں مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات سے ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ بہت سے دوسرے ملکوں میں بھی لوگوں کے دل و دماغ پر شدید اثر ہوا ہے۔ اس کی تھوڑی سی جھلک اس دن دہلی میں نظر آئی جب کہ دہلی کے لوگ لاکھوں کی تعداد میں مولانا کو اپنا آخری نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔

ہم جب بعض چیزوں کے عادی ہو جاتے ہیں تو یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ وہ ہمیشہ رہیں گی۔ اسی طرح اپنے ساتھیوں کے بارے میں بھی ہمیں کچھ ایسا ہی گمان ہو جاتا ہے لیکن جب کوئی ایسا شخص اچانک اس دنیا سے اُٹھ جاتا ہے تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس کی زندگی اور اس کی موت ہمارے لئے کیا معنی رکھتی ہے۔ مولانا آزاد ان لوگوں میں سے تھے جن کی شخصیت کی نشو و نما قومی تحریک کے ساتھ ساتھ نصف صدی سے زیادہ مدت میں ہوئی۔ انھوں نے قومی تحریک کے مختلف دور دیکھے اور ان میں حصہ لیا۔ وہ اس کی جد و جہد، اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں اور اس کے منتہائے مقصد کی تکمیل میں شریک رہے۔ وہ اس تحریک کا ایک اہم جزو تھے اور انھوں نے بڑی حد تک اس کی تشکیل کی۔ پھر بھی وہ ایک جیّد عالم اور انفرادیت پسند رہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ ہندوستانی عوام کے انبوہِ کثیر میں یکہ و تنہا حیثیت کے مالک رہے۔ اس طویل مدت میں انھوں نے قومی تحریک کی جو رہنمائی کی صرف اسی کی وجہ سے انھیں ہماری قومی تاریخ میں ایک بلند اور پائندہ مقام حاصل رہے گا۔

اس کے علاوہ ان کی ذات غیر معمولی علمیت اور حیرت افزا ذہانت کی حامل تھی جس پر کبھی جذبات یا تعصب کا غلبہ نہیں ہونے پاتا تھا۔ سب سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ ان کی شخصیت ایک ایسا آئینہ تھی جس میں ہندوستان کی اس گوناگوں تہذیب کا عکس پایا جاتا تھا جسے بہت سے بیرونی دھاروں نے متاثر اور مالا مال کیا ہے۔

بعض اعتبار سے اُن کی طرزِ فکر بنیادی طور پر جدید بھی تھی اور بعض دوسری باتوں میں ان کا ماضی سے بڑا گہرا رشتہ تھا۔ اور وہ اُس دور کے شعور کا ایک عکس تھے جسے روشن خیالی کا دور کہا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر وہ ایک ایسے غیر معمولی فرد تھے جنھوں نے اس مقصد کو جس کے لئے وہ عمر بھر کوشاں رہے ایک امتیازی شان بخشی اور وہ بھی کچھ اس ڈھنگ سے جس کی کوئی ہمسری نہیں کر سکتا۔ پُرانا نظام بدلتا ہے اور ہم اُسے واپس نہیں لا سکتے لیکن ہم اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم مولانا آزاد کی یاد دلوں میں تازہ کرتے ہوئے ان کی زندگی اور ان کی تعلیمات سے ایک بڑا سبق سیکھ سکتے ہیں۔

نئی دہلی
۵ جولائی ۱۹۵۸ء

جواہر لال نہرو

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل دہلی

(سال نامہ)
ابوالکلام نمبر

سرورق:۔ مولانا ابوالکلام آزاد رح کی روغنی تصویر
(ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کے ذخیرۂ تصاویر سے۔ بہ شکریہ بیگم زہرہ انصاری)

اگست ۱۹۵۸ء
جلد ۱۷
نمبر ۱
ساون بھادوں شک سمت ۱۸۸۰

سالانہ چندہ:۔	ہندوستان میں:۔	چھ روپے
	پاکستان میں:۔	چھ روپے (پاک)
غیر ممالک سے:۔	نو شلنگ یا ایک ڈالر	
فی پرچہ:۔	ہندوستان میں:۔	۵۰ نئے پیسے
	پاکستان میں:۔	آٹھ آنے (پاک)

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر "آج کل" اردو اولڈ سیکریٹریٹ دہلی

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند
پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ترتیب

تعارف

ڈاکٹر سید محمود	مولانا آزاد مرحوم کے پرانے رفیق کار، مشہور قومی رہنما، ممبر پارلیمنٹ
جناب بخشی غلام محمد	پرائم منسٹر ریاست جموں و کشمیر۔
جناب حافظ محمد ابراہیم	وزیر آبپاشی و بجلی، حکومت ہند
مسز ارونا آصف علی	مشہور قومی لیڈر اور دلی کارپوریشن کی میئر
جناب ہادی القادری	استاذ ادبیات عربی و اردو نظام کالج، حیدرآباد
جناب فضا ابن فیضی	خوش گفتار مقبول شاعر۔ (منو ناتھ بھنجن۔ یوپی)
حضرت ذائق بنگلوری	جنوبی ہند کے کہنہ مشق شاعر
ڈاکٹر ذاکر حسین	صاحبِ فکر و نظر، مشہور ماہر تعلیم، بہار کے گورنر
پروفیسر ہمایوں کبیر	وزیر سائنسی تحقیقات و امور ثقافت حکومت ہند۔ مولانا آزادؒ سے آپ کا قریبی تعلق رہا
جناب منظور علی تمنا فاروقی	بجنور (یوپی) کے ایک پرانے شاعر
مولانا نیاز فتحپوری	مشہور انشاپرداز، مدیر "نگار" لکھنؤ۔
علامہ جمیل مظہری	کامل فن اور مخلص شاعر۔ پٹنہ کالج (پٹنہ)
مولانا محمد اجمل خاں	مولانا آزاد مرحوم کے معتمد خصوصی، علم و ادب کے شیدائی۔ مذہبیات پر بھی آپ کی گہری نظر ہے۔
جناب خواجہ غلام السیدین	سیکرٹری وزارتِ تعلیم حکومت ہند۔ ممتاز ماہر تعلیم۔
جناب سید سرفراز حسین رضوی خبیر	محلہ نخاس لکھنؤ۔
جناب ظفر حسین خاں	فلسفی اور مصنف، بنگلہ نمبر سی ۹۰۵-۹۰۶ جہانگیر، لکھنؤ۔
جناب بسمل سعیدی ٹونکی	زباں داں اور پختہ کار شاعر۔ فکر و فن میں ممتاز
پروفیسر محمد مجیب	وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) ماہر تعلیم اور تاریخ داں، رکنِ ادارہ
جناب محمد شفیع الرحمٰن	شعبۂ امورِ عامہ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی)
جناب گوپی ناتھ امن لکھنوی	کہنہ مشق ادیب و شاعر۔ دہلی پبلک ریلیشنز کمیٹی کے چیئرمین۔ رکن ادارہ
مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی	مشہور صحافی، عربی زبان و ادب کے عالم۔ مولانا آزادؒ کے دیرینہ رفیق
جناب یحییٰ اعظمی	دارالمصنفین اعظم گڑھ، مشاق اور خوش گفتار شاعر
مولانا غلام رسول مہر	ممتاز صحافی اور بہترین ادیب، مولانا آزاد کے قدیم دوست۔ ماہرِ غالبیات
جناب روحی الہ آبادی	حلیم انٹر کالج، چمن گنج، کان پور
مولانا سعید احمد اکبرآبادی	پرنسپل کلکتہ مدرسہ (کلکتہ) عربی اور فارسی کے فاضل، اسلامی علوم کے ماہر اور مصنف
جناب روش صدیقی	صاحبِ فکر، پختہ کار شاعر۔ پروڈیوسر (اردو) آل انڈیا ریڈیو۔
جناب حافظ علی بہادر خاں	ایڈیٹر 'دورِ جدید' (دہلی)، کہنہ مشق صحافی۔ جدوجہد آزادی کے مخلص کارکن۔
جناب شمیم کرہانی	کوچہ میر عاشق۔ دہلی۔ خوش مذاق اور نغز گفتار شاعر
جناب محمد یونس خالدی	ابوالکلام اکادمی، عرب ہاؤس، مولوی گنج لکھنؤ، مولانا آزاد کے پرانے ارادت مند اور ادیب
ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	ریڈر (اردو) دہلی یونیورسٹی۔ صاحبِ فکر ادیب اور نقاد۔ رکنِ ادارہ
جناب اعجاز صدیقی	خوش فکر شاعر۔ ایڈیٹر "شاعر" قصر الادب، بمبئی
جناب ریاض الرحمٰن شروانی	حبیب منزل علی گڑھ۔ مولانا آزادؒ کے حبیبِ لبیب حبیب الرحمٰن شروانی مرحوم کے پوتے، نوجوان ادیب
محترمہ حمیدہ سلطان	مشہور ادیبہ۔ انجمن ترقی اردو دہلی کی جنرل سیکرٹری
جناب غلام احمد فرقت	مشہور مزاح نگار۔ معلم اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول۔ دہلی

مُلاحظات

بڑی بڑی طاقتوں کی باہمی کشمکش اور ایٹم و ہائیڈروجن بموں کی تیاری نے ں خوف و ہراس کی فضا پیدا کر دی ہے اور ہر لمحہ یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی ساحۂ عالمگیر جنگ کا بہانہ نہ بن جائے۔ ایک طرف یہ صورت حال ہے اور ی طرہ ایٹمی تجربات نے نسل انسانی کو زبردست خطرے میں ڈال دیا ہے۔ آج کے جو مضر اثرات فضائے بسیط پر پڑ رہے ہیں وہ کچھ کم نہیں۔ اور آئندہ رات کا اندازہ متحدہ اقوام کی پندرہ قومی سائنٹفک کمیٹی کی رپورٹ سے ہو سکتا کے اقتباسات غیر سرکاری طور پر شائع کر دئے گئے ہیں۔ اس میں بتایا کہ اگر ایٹمی دھماکے ۱۹۵۸ء کے بعد جاری رہے تو ان کی وجہ سے ہر سال کوئی لاکھ اشخاص مہلک امراض میں مبتلا ہوتے رہیں گے اور ان امراض کا اثر نسلوں پر بھی پڑے گا۔ یہی نہیں بلکہ سابقہ دھماکوں کے اثرات آئندہ نسلوں تے رہیں گے۔ اس رپورٹ سے ایٹمی دھماکوں کو روکنے کی ضرورت بالکل ہو گئی ہے اور عام انسانی آبادی کی بقا اور تحفظ کا تقاضا یہی ہے کہ ان تجربات بند کر دیا جائے۔ روس نے از خود ایٹمی دھماکے روک دئے ہیں۔ امریکہ اور کا اصرار ہے کہ پہلے اس امتناع کی پابندی کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ اس کے لئے جنیوا میں مغربی اور کمیونسٹ ملکوں کے سائنس دانوں کی گفتگو شروع ہے کہ ایٹمی دھماکوں پر پابندی کی نگرانی کے ذرائع تلاش کئے جائیں۔ اگر صاف ہے تو ذرائع کی تلاش اور سمجھوتے کی صورت کچھ مشکل نہیں۔

لبنان کی خانہ جنگی اور عراق کے حالیہ انقلاب کی وجہ سے مغربی ایشیا میں صورت حال انتہائی نازک ہے۔ اگرچہ اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل نے لبنان کے بارے میں واضح طور پر مشورہ دیا تھا کا معاملہ اس کا اندرونی معاملہ ہے اور اسے وہیں کے لوگوں کو سلجھانا ہے مگر صدر شمعون نے فوجی درخواست کی اور امریکی فوجیں لبنان میں پہنچ گئی ہیں۔ دوسری طرف شاہ حسین کی درخواست فوجیں اردن میں اتار دی گئیں۔ روس نے اس طرح فوجیں بھیجنے کو جارحانہ کارروائی مداخلت قرار دیا ہے اور اس کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ انہوں نے اپنے سرحدی علاقوں میں فوجی شروع کر دی ہیں۔ ان حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عرب قومیت کا سیلاب بڑھتا جا رہا ہے اور نی مداخلت نہ صرف مغربی ایشیا کو میدانِ کارزار بنا دے گی بلکہ امن عالم بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔

ہمارے ملک میں بڑے بڑے دریا ہیں اور یہ قدرت کا بہت بڑا عطیہ ہیں بشرطیکہ انہیں قابو میں کر کے ان کے پانی سے کام لیا جائے۔ چنانچہ ملک بھر میں جگہ جگہ ان دریاؤں پر بڑے بڑے بند باندھے جا رہے ہیں تاکہ ان کے پانی سے زمینوں کو گلزار بنایا جائے اور بجلی پیدا کر کے کارخانوں کا جال بچھا دیا جائے۔ ان میں سے ایک بہت بڑا بند بھاکڑا بند ہے جہاں دریائے ستلج کو روک کر ایک بریج بنایا گیا ہے۔ پانی کا یہ ذخیرہ ۶۴ مربع میل جھیل کی شکل میں ہے جو دنیا کی سب سے بڑی مصنوعی جھیل ہے جس سے نہریں نکالی جائیں گی۔ یہ کام بڑی تیزی سے ہو رہا ہے۔ چنانچہ یکم جولائی کو وزیر داخلہ پنڈت گووند بلبھ پنت کے ہاتھوں ستلج بیراج سرہند فیڈر کا افتتاح ہوا۔ اس فیڈر کی مجموعی لمبائی ۹۲ میل ہوگی، جس سے پنجاب میں دس لاکھ ایکڑ اراضی اور راجستھان میں سات لاکھ ایکڑ اراضی کو سیراب کرنے میں مدد ملے گی۔

'ابوالکلام نمبر' ناظرین کے ہاتھوں میں ہے۔ اس شمارے کی ترتیب و تدوین میں بڑی محنت کی گئی ہے۔ ہماری کوشش یہی رہی ہے کہ یہ نمبر اس عظیم شخصیت کے شایان شان ہو۔ ہمیں بڑی خوشی ہے کہ نامور انشا پردازوں اور مولانا آزاد کے رفیقوں نے ہماری بڑی ہمت افزائی کی اور مولانا کی شخصیت اور زندگی کے بارے میں قابل قدر مضامین عنایت فرمائے۔ مولانا جس ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے اس کے تمام تر پہلوؤں کا ایک شمارے میں احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی زیر نظر مضامین مولانا کی زندگی، ان کی علمی، دینی اور سیاسی خدمات اور افکار و خیالات کے بہت کچھ آئینہ دار ہیں۔ امید ہے کہ ناظرین اس نمبر کے بارے میں اپنی رائے سے ادارے کو مطلع فرمائیں گے۔

اس سال ہم نے سال نامہ کے علاوہ تین خصوصی نمبر نکالے۔ جن میں موضوعاتی مضامین ہی شامل کئے گئے اور دیگر مضامین جمع ہوتے گئے۔ چنانچہ ہمارے پاس منظور شدہ مضامین کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے جس میں مزید اضافہ کی گنجائش نہیں۔ اس لئے مضمون نگار حضرات ابھی کچھ دنوں مضامین بھیجنے کی زحمت نہ فرمائیں۔

اگست ۱۹۵۸ء

اظہارِ عقیدت

ڈاکٹر سید محمود ایم۔ پی

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ ماہنامہ "آج کل" کا آزاد نمبر نکال رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی ذات باصفات اور شخصیت بابرکت کا تذکرہ اب ہماری قومی اور ملی زندگی کا لاینفک جزو ہو گیا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس سے ہزار پہلو اور بصد رنگ ہم حوصلہ پائیں گے، روشنی حاصل کریں گے اور یقیناً آئندہ کی ہماری ہر نسل کو اس سے سبق ملے گا۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ مولانا مرحوم ہمارے احساس و تاثر میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اور تا قیامت بلفظ "آج" ہوتے رہیں گے اور "کل" آتے رہیں گے۔ اُن میں اُن کی زندگی کے نقوش ہمیشہ اُبھرتے رہیں گے۔ مولانا ہم سے جدا ہو چکے ہیں اور ہم اس محرومیت کی تھوڑی بہت تلافی بس اب اسی طرح کر سکتے ہیں کہ ان نقوش کو مستوار کرتے رہیں اور یہ پہلو و بہرحال خوار ہیں۔

مولانا کی موت سے پورے ملک و قوم نے جو کچھ کھویا اُس کے احساس کی چبھن کے ساتھ ذاتی رنج و صدمہ کی شدت نے شعور کو نڈھال کر دیا ہے ورنہ اُن کی ذات سے جو مجھے تعلق رہا اور ۵۲ برس تک جو اُن سے نیاز خصوصی حاصل رہا، اُس کی ایک الگ داستان مرتب کرنے کے لئے اگر فرصت لمحات مل بھی جائیں، کئی کتابوں کے اجزاء پورے کرنے کی ہمت بھی ہو جائے تو بھی وہ تندہی دل و دماغ کہاں سے لاؤں گا؟ بس تمام عمر میں اُن سے خلوت و جلوت میں جو ملاقاتیں رہیں اور اُن سے جو برکات و فوائد مجھے حاصل ہوئے اُن کو کچھ میرا ہی دل جانتا ہے۔ اپنی واقفیت اور اپنے تجربہ کی بنا پر بلا خوفِ تردید یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ مولانا مرحوم جیسا فاضل اجل، ذہین الطباع اور اسلامی علوم پر گہری نظر رکھنے والا اس وقت اسلامی دنیا میں کوئی دوسرا نہ تھا۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی نے اسلامی دنیا میں دو بڑے مجاہد اور فاضل پیدا کئے، یعنی جمال الدین افغانی اور مفتی عبدہ۔ مولانا مرحوم ان دونوں کے جوڑ تھے۔ اس سے زیادہ ان کے متعلق میں کیا کہوں۔

اب ان کے گذرنے کے بعد مجھے تنہائی کے لمحات میں شدت سے احساس ہوتا ہے کہ احمد نگر جیل میں مولانا جو یہ شعر

کم لذتم و نیم افزوں زشمار است
گوئی ثمر پیشتر از باغ وجودم

گنگنایا کرتے تھے وہ حقیقتاً شعر نہیں بلکہ اپنی زندگی، اپنی ہستی اور اپنی ہی بات کو زیر لب دہراتے تھے۔ آنے والی تاریخ کا ایک لمحہ بھی اس سے منکر نہ ہو سکے گا کہ مولانا ایک ایسے انسانی پیکر تھے جس میں ایک سمت علم و فکر کی ایک وسیع دنیا آباد تھی تو دوسری سمت اخلاق و انسانیت کی وہ بلندیاں موجود تھیں جہاں وہ تنہا تھے اور اُن کا کوئی حریف نہ تھا۔

مجھے مولانا سے پہلی بار ۱۹۰۶ء کے آخری مہینوں میں علامہ عبداللہ عمادی جو عربی ادب کے فاضل اجل تھے کے ساتھ لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تھی۔ میری عمر اُس وقت سولہ سترہ سال کی تھی اور مولانا غالباً اُس وقت ۱۸ سال کے تھے۔ قبول صورت نہیں بلکہ نہایت حسین شکل تھی اور پوشاک کی تراش خراش و ہر انداز سے ٹپکتی نفاست سے وہ بالکل الف لیلیٰ کی کسی داستان کے جیتے جاگتے شاہزادے معلوم ہو رہے تھے۔ مجھے یاد ہے سب سے زیادہ اُن کے طرز گفتگو نے مجھے متاثر کیا تھا جو خطیبانہ مگر تیز رو تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ معلومات کا دریا بہہ رہا ہے۔ علامہ عمادی اور اُن کے درمیان متنبی وغیرہ کے متعلق گفتگو ہوتی رہی اُن کے حافظے

ل یہ تھا کہ چھتیس سال بعد جب ۱۹۴۲ء میں قید فرہنگ میں احمد نگر جیل ہماری
ستوں کا آماجگاہ بنا تو انھوں نے اُس پہلی ملاقات کے درمیان کی ساری گفتگو کا
وع اور تمام تر تفصیلات مجھ سے دہرائیں، کہاں جرأت کہ صرف وہی ملاقات
ہیں بلکہ بعد کے بھی دوسرے واقعات اور لمحات کی یادیں جو میرے ذہن سے
ہو چکی تھیں اُن کو ہمیشہ اس طرح یاد رہیں کہ جیسے سب کچھ کل کی بات ہو۔ اب
۱۹۰۸ء کی بات کہ وہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سلسلے میں علی گڑھ آئے تو دیگر
زات کے ہمراہ میرے گھر پر تشریف لائے۔ اس صحبت کی باتیں میں بھول
تھا۔ لیکن ان کے حافظے نے وہ سب محفوظ کر رکھا تھا۔

فنِ خطابت کے اس تاجدار کے بارے میں بہت کچھ دہرایا جا چکا ہے
لیکن میرے ذہن میں ہمیشہ وہ نمین موقعے ایسے اُبھرتے ہیں جہاں میں نے
نھیں اپنے الفاظ سے مجمع کے ذہنی دھارے کو اتنی آسانی سے موڑتے دیکھا
شاید کسی جادوگر سے بھی ممکن نہ ہوتا۔ دسمبر ۱۹۱۲ء میں جب کہ جنگ بلقان کی
ماگرمی تھی۔ لکھنؤ میں مسلم یونی ورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ سوال پیش تھا
مسلم یونی ورسٹی گورنمنٹ کی شرائط پر منظور کی جائے کہ نہیں۔ اُس وقت الہلال
دھوم تھی اور جب مولانا آزاد قیصر باغ کی بارہ دری میں آئے تو جلسے میں
دوڑ گئی اور ہر طرف سے مولانا کی تقریر کے لئے تقاضا ہوا مگر جو لوگ حکومت
کے اشارے پر یونی ورسٹی منظور کر لینا چاہتے تھے اُن کی خواہش نہ تھی کہ مولانا
تقریر کریں لیکن مولانا کو اسٹیج پر جگہ دینی ہی پڑی اور اُن کی تقریر نے آن کی آن میں
ہوا کا رُخ بدل دیا۔ اور یہی رائے پاس ہوئی کہ اُن شرائط پر یونی ورسٹی منظور نہ
کی جائے۔ مولانا حق بات کہنے میں اس قدر بے باک اور نڈر تھے کہ انھوں نے کبھی
وقت و جگہ کی بندش تسلیم نہ کی۔ جنگ بلقان کے متعلق ایک پبلک جلسہ تھا جس کی
صدارت نواب حامد علی خاں صاحب مرحوم والیٔ رام پور فرما رہے تھے۔ جلسہ کا مقصد
وں کے لئے چندہ جمع کرنا تھا۔ مولانا آزاد جیسے ہی جلسہ میں تشریف لائے مجمع "الہلال"
ول" کہہ کر چلا اٹھا۔ انھوں نے اس موقع پر انگریزوں کے خلاف سخت تقریر کی
سے نواب صاحب دم بخود جلسہ کی صدارت کرتے رہے۔

میرے اور مولانا کے ذاتی تعلقات ۱۹۱۲ء ہی سے بتدریج پختہ تر ہوتے
اور میں جب کبھی کلکتہ جاتا تو انھیں کے یہاں قیام کرتا تھا۔ اُن کی غیور
فطرت کو بار بار نزدیک سے دیکھنے اور محسوس کرنے کا موقع ملتا رہا۔ انھوں
اپنی خودداری کو مجروح نہیں کیا۔ ایسے مواقع بھی اُن کی زندگی میں آئے کہ انہیں
سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا لیکن دستِ سوال کبھی کسی کے سامنے نہ پھیلایا اور
اپنے عزیز ترین دوستوں کو بھی خبر نہ ہونے دی۔ جب وہ رانچی میں تھے تو اُن کو
گورنمنٹ سے نظر بندی الاؤنس بہت کم ملتا تھا اور وہ بھی سارے کا سارا
کتابوں کی خریداری میں ختم ہو جاتا۔ تکلیف و عسرت کی زندگی تھی پر کبھی زبان پر اُف
نہ آنے دی۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر انصاری نے بہت منت و سماجت اور اصرار
کے ساتھ کچھ مدد کرنی چاہی لیکن انھوں نے قبول نہ کیا۔ لفظ و وضع داری کی جیتی
جاگتی تصویر تھے۔ ضبط کا یہ عالم تھا کہ شاذ و نادر ہی کبھی انھیں غصہ آیا ہو۔ ہر مسئلہ
پر بے حد ٹھنڈے دل سے سوچنے کے عادی تھے۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی یہ
تھی کہ وہ کبھی اپنی بُرائی کرنے والوں کو بھی بُرا نہ کہتے تھے اگر ایسے شخص کی کوئی اُن
کے سامنے بُرائی کرتا تو وہ اُس کی کوئی اچھائی بیان کرتے یا تعریف کر دیتے تھے۔
صابر اس درجہ تھے کہ کسی حالی میں بھی اور کسی موقع پر بھی انھوں نے اپنے سخت
سے سخت معترضین کا بھی کبھی جواب نہ دیا۔ تقسیم سے پہلے لیگی حضرات و لیڈران
نے اُن کی کیا کچھ تضحیک نہ کی مگر اُس نیک دل نے نہ اُس وقت کسی پبلک
اسٹیج سے اور نہ تنہائی میں اُن کی شکایت کی اور نہ وہ اُن کے بارے میں کبھی
کوئی عامی لفظ زبان پر لائے اور نہ بعد میں جب دو قومی نظریہ کی ہلاکت کا
پورا پورا احساس ہو چکا تھا۔ انھوں نے کبھی طعنے یا شکوے کر کے بدلہ چکانے
کی سوچی بلکہ ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ کے مسلم کونشن کے اسٹیج پر جب وہ تشریف لائے
تو لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ مولانا آزاد اب مسلم لیگ کو بُرا بھلا کہیں گے۔ اُس کے
لیڈروں کی پولیں کھولیں گے اور اُن کی پالیسی کی دھجیاں اڑائیں گے۔ مگر اُن کی
زبان سے جو پہلا فقرہ نکلا وہ یہ تھا کہ "میں یہاں کسی کو ملامت کرنے نہیں آیا ہوں
جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب ہم کو آیندہ کی فکر کرنی ہے۔" کون تھا جو اس بلند اخلاق
اور حسنِ کردار سے متاثر ہوئے بغیر رہ جاتا۔ مسلمانوں کی گذشتہ مضرت رساں سیاست
کا جب آپس میں کبھی ذکر آیا تو یا خاموش رہ گئے یا اگر کچھ کہا تو صرف یہ کہا کہ "اپنے
سینے کا داغ کس کو دکھاؤں؟"

اگر میں مولانا کی شخصیت اور تمام زندگی کو ایک جملے میں بیان کرنے پر
مجبور ہوں تو یہی کہوں گا کہ وہ انسان کے روپ میں فرشتہ تھے اور اُن کی زندگی
ایک فرشتہ کی زندگی تھی۔

اس عظیم شخصیت کے لئے اتنے الفاظ تو کیا کئی کتابیں بھی ناکافی ہوں گی لیکن
فی الوقت بس اتنا کافی ہے کہ اُن کی سیاسی، ادبی، مذہبی خدمات ہمیشہ سنہرے حروف

پر ثبت رہیں گی۔
ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما۔

بخشی غلام محمد پرائم منسٹر ریاست جموں و کشمیر

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی اور ان کی تعلیمات ہماری عظیم قومی ثقافتی اور ادبی میراث ہے۔ اس لئے مولانا کی یاد تازہ کرنا ایک اہم قومی اور ادبی فریضہ ہے۔ اس سلسلے میں آجکل کا ابوالکلام نمبر ایک مبارک قدم ہے، امید ہے کہ رسالہ مولانا کی زندگی اور فکر و عمل کے مختلف پہلوؤں اور چھپے ہوئے گوشوں کو اجاگر کر کے نئی نسل کا مولانا کی زندگی کو دور کرسکے گا۔

مولانا کو کشمیر سے خاص شغف اور لگاؤ تھا۔ یہ رشتۂ اخلاص و محبت صرف ان کے ذوقِ جمال کا ہی رہین منت نہ تھا۔ دوستی اور یگانگت کا یہ علاقہ سیاسی عقائد و اعمال سے زیادہ تر متعلق تھا۔ سیاسی میدان میں مولانا نے متحدہ قومیت، بھائی چارہ، تعمیر اور امن کی راہ اختیار کی تھی۔ کشمیری عوام کا بھی یہی محبوب منزلِ مقصود رہا ہے۔ باشندگانِ ریاست اس دشوار گزار، کٹھن مگر قومی فلاح کے راستے پر کڑی سے کڑی آزمائش اور امتحان میں اسی طرح ایک زبردست عزم غیر متزلزل یقین اور پورے اعتقاد کے ساتھ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند ڈٹے رہے۔ جس طرح مولانا نے اپنی ساری زندگانی میں زمانے کی ہولناک چیرہ دستیوں اور جبر و تشدد کی کڑی اور ستم رانیوں کے درمیان انسانیت کی سربلندی اور سرخروئی کے لئے فرقہ پرستی، تعصب، جہالت، حرص و آز کی باطل قوتوں سے زبردست قوتِ ارادی، محکم ایمان اور بے پناہ جوشِ عمل کے ساتھ لڑتے رہے یہ اُن ہی اصولوں اور آدرشوں کی یکسانیت اور یگانگی کی کرشمہ سازی ہے۔ کہ آج کشمیر ہند کے رشتۂ اشتراک میں ایسے بندھا ہے کہ توڑنے سے ٹوٹ نہ پائے گا اور کشمیری عوام ہند کے دوسرے حصوں میں رہنے والے اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ تعمیر، امن اور فلاحِ عامہ کے لئے سرزمینِ ہند پر ایک تاریخی اور یادگار جنگ لڑ رہے ہیں۔ آج اگرچہ مولانا ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ لیکن ان کی تعلیمات اور اصول ہمیں پنڈت نہرو کی قیادت میں ایک ایسا سوشلسٹ سماج تعمیر کرنے پر اُبھار رہے ہیں۔ جس میں بلا امتیاز مذہب و ملت، رنگ و نسل ہند میں رہنے والے سبھی لوگوں کو ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے یکساں مواقع اور سہولیات کی ضمانت دی گئی ہے۔

— الغرض مولانا میدانِ سیاست کے شہسوار اور ہماری جدید تاریخ ایک ہیرو ہی نہ تھے۔ آپ ایک ہی زندگی اور ایک ہی وقت میں ایک قومی رہنما بھی تھے، زبردست فلسفی بھی تھے، جادو بیان خطیب بھی تھے صاحبِ طرز ادیب بھی تھے، جیّد عالمِ دین بھی تھے، اور منجھے و سلجھے ہوئے اور ماہرِ تعلیم بھی تھے۔ قصہ کوتاہ مولانا کی ایک ہی زندگی میں بیک وقت زندگیاں جمع ہوگئی تھیں۔ متضاد اور بٹی ہوئی حیثیتوں کی یہ جامع زندگی تمام خوبیوں اور اچھائیوں کا ایک حسین اور دل نواز امتزاج تھی۔ جو ہمارے سماجی اور ثقافتی زندگی کا حاصل ہے۔ اس حیثیت سے مولانا کی زندگی ہمارا ایک قابلِ قدر ورثہ ہے۔ وہ ورثہ جسے ہم سینے سے لگا کر اپنی اور اپنی نئی پیڑھی کی زندگیوں کو خوش آئند اور تابناک مستقبل کی لازوال خوشیوں اور مسرتوں سے مالا مال کر سکتے ہیں۔

میں اس پیغام کی وساطت سے ہند کے قومی رہنماؤں، ادیبوں، شاعروں اور عوام کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہم ہندوستان کی برفیلی پیشانی کشمیر میں مولانا کی زندگی اور تعلیمات کی نورانی مشعل کو اسی طرح فروزاں رکھیں گے جس طرح اب تک روشن رکھے ہوئے ہیں۔

کامیابی کے لئے دُعائیں

حافظ محمد ابراہیم وزیر آبپاشی و بجلی

مولانا مرحوم کی نسبت میرا کچھ عرض کرنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ مولانا کے پاس سب سے بڑی چیز علمیت تھی۔ اس کی نسبت مجھ جیسا جاہل کہہ ہی کیا سکتا ہے۔ پھر بھی اتنا ضرور عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں، کہ اُن جیسا اس زمانے میں کوئی اور نہیں تھا۔ اور زمانہ مدتوں اب ایسا کوئی اور پیدا نہیں کرسکے گا۔ نہ معلوم کب تک انتظار کرنا ہوگا۔

دُنیا میں بے مثال عالم ہونے کے علاوہ مولانا محبِ وطن اور بہت درجہ کے محبِ وطن تھے۔ کانگریس اور ملک کی خدمات جو مولانا نے انجام دیں ہندوستان کی تاریخ کا ایک زرّیں باب ہوں گی، جس کو پڑھ کر ہماری آنے والی نسلیں فخر و مباہات کے ساتھ مرحوم کو یاد کریں گی اور ان کی سیرتوں میں اس یاد سے ایک علو اور بلند حوصلگی پیدا ہوگی۔ باوجود وفات مولانا ہمارے درمیان زندہ ہیں۔

مولانا ابوالکلام زندہ باد

مسز ارونا آصف علی میئر دلی کارپوریشن

مولانا آزاد کی عظمت کا چند لفظوں میں احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی گوناگوں اور درخشاں شخصیت علماء اور عوام دونوں ہی کے لئے سرچشمۂ فیض تھی۔ جس کسی کو انھیں قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا اس کے لئے یہ ایک بھرپور تجربہ ثابت ہوا۔

مولانا آزاد ہندوستان کی آزادی کے شاید سب سے زیادہ فصیح بیان وکیل تھے لیکن جن لوگوں نے ہندوستانی قومیت کی ترقی میں رکاوٹیں ڈالیں، ان کے لئے بھی مولانا کے دل میں انتہائی صبر وتشکر کے سوا کچھ نہ تھا۔ مولانا آزاد ہماری تاریخ میں ہندوستان کی اس نشاۃ ثانیہ کے نقیبوں میں شمار کئے جائیں گے جو قومی خدمات کے لئے گویا ایک موسم بہار تھا اور جس نے ملک والوں کو بیدار اور تر وتازہ کیا۔

ان کی تحریروں میں نہ صرف ہمہ گیریت ہے جس نے انھیں ادب عالیہ بنایا ہے بلکہ ان میں والہانہ ادبی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ یہ تحریریں کئی نسلوں تک اردو کی تاریخ کو متاثر کرتی رہیں گی۔ ہمارے زمانے کا مؤرخ اگر مولانا آزاد کی زندگی کا بغور مطالعہ کرے گا تو اس کا کام آسان ہو جائے گا۔

گاندھی، نہرو اور آزاد یہ تینوں شخصیتیں ہندوستانیوں کی دو نسلوں کے خیال و عمل پر پوری طرح چھائی رہی ہیں۔ ان تینوں شخصیتوں کی قوت تاثیر اس بات میں مضمر ہے کہ یہ عقل و کردار کے بیش عجیب وغریب رجحانات کا ہم آہنگ امتزاج تھا۔

مولانا آزاد کی وفات سے جو خلا پیدا ہو گیا۔ وہ پُر نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر ہم ان کی عظمت اور ذہانت کے ورثے کو برقرار رکھ سکے تو وہ برابر آئندہ نسلوں کو متاثر کرتے رہیں گے۔

ہادی القادری

تاریخ انتقال ابوالکلام آزاد از ہادی

١٩ ء ٥٨

ہوئے جو حضرتِ آزاد زیست سے آزاد | بپا ہے قصرِ حکومت میں نالہ و فریاد
وہ جن کو فکر ہو تاریخِ سالِ رحلت کی | انھیں یہ چاہیئے رکھیں یہ شعرِ ہادی یاد

وزیرِ دانش و دانش در و ادیبِ شہیر

١٣٨٣

مجاہدِ وطن، آزاد، ابوالکلام آزاد

٦٧٥ +١٣٨٣ = ١٩٥٨

وفورِ جذبۂ دل اور شدّتِ احساس | بیان کر نہیں سکتا ہے نطقِ انسانی
کوئی بتاؤ تو کیا بات ہے کہ کرنے لگی | زبانِ کلکِ گہر بار اشک افشانی
یہ کون اُٹھ کے گیا ہے کہ بزمِ اُردو میں[1] | ہوئی ہے رنج و غم و درد کی فراوانی
ملی ہے خوب یہ تاریخِ سالِ فصلی بھی
ابوالکلام خطیب و ادیب لاثانی

١٣ ت ٦٧

وہ جسے سب ابوالکلام کہیں | ایسے اچھے خطیب سے رخصت
عقل کرتی تھی جس سے استہلال | ہند کے اس لبیب سے رخصت
دوستوں کے قلوب جانتے ہیں | ہے قیامت حبیب سے رخصت
کوئی پوچھے اگر سنہ ہجری
کہئے ہادی "ادیب سے رخصت"

١٣٧٧

[1] استہلال سے عقلوں نے روشنی حاصل کی ہے

رضا ابن فیضی

فردوسِ گم شدہ

بہ یادِ آزاد

لٹی لٹی سی ہے ہر جنّتِ نگاہ کہ تو
تمام دلکشیٔ کائنات لے کے گیا

خیال و فکر کی نزہت، دل و جگر کا سکوں
نظر کی تازگی، لطفِ حیات لے کے گیا

جو تجھ سے بھی حسیں تھی بہ یادِ روئے حبیب
تو اپنے ساتھ وہ پُرکیف رات لے کے گیا

کنارِ چشمۂ حیواں ہے خضر تشنہ بلب
تو اپنے جام میں آبِ حیات لے کے گیا

بہ ایں مقام یہ ہے تو کہ جستجو میں تری
جنوں مجھے بہ حدِ ممکنات لے کے گیا

مجھے نہ بھولے گی تیرے جنوں کی وضعِ جمیل
کہ اپنی ذات سے خود ایک انجمن تھا تو

بُجھا کبھی نہ تری شوخیٔ ہنر کا چراغ
سحر کی اوس پہ ہنستی ہوئی کرن تھا تو

ملی تھی خلوتِ شادابیٔ بہار تجھے
چمن میں لالۂ رنگیں کا پیرہن تھا تو

خمارِ کم نگہی تھا تری شراب سے دور
نمودِ نشۂ مینائے علم و فن تھا تو

ہزار صبحوں کا پیکر تھی ایک رات تری
جمالِ شامِ تمدّن کا بانکپن تھا تو

بکھر کے رہ گئی کاغذ پہ روحِ عصرِ رواں
اُٹھا لیا جو حیات آشنا قلم تونے

حریمِ قوم و وطن کے اداس طاقوں پر
سجا دئے "ادب و شعر" کے صنم تونے

سنور گیا مری راتوں کا بانکپن پھر اُن
دئے "ہلال" کو وہ دلبری کے خم تونے

جبینِ "تاج و ہمالہ" پہ کلکِ ہمت سے
کیا فسانۂ انسانیت رقم تونے

رموزِ دیں کو کیا فاش اس سلیقے سے
عرب کو کر دیا آوارۂ عجم تونے

آج کل دہلی (ابوالکلام نمبر)

ہوا بھی تیرے چراغوں کا رُخ نہ موڑ سکی — خدا گواہ بڑا مستقل مزاج تھا تو
تری حیات تھی "سیف و قلم" کا گہوارہ — کہ شعر و دین و سیاست کا امتزاج تھا تو
کسے نصیب ہوئی تیرے فکر کی معراج — سرِ تدبّر و خود آگہی کا تاج تھا تو
عجیب تھا وہ تری طبعِ سخت گیر کا پیچ — سمجھ سکا نہ میں تیغ تھا یا زجاج تھا تو
تو آنسوؤں کا وہ نم تھا جو میری آنکھ میں ہے — ملا جو مملکتِ دل سے وہ خراج تھا تو

کرن تراش لی تو نے غبارِ خاطر سے — نقوش کے روپ میں نورِ سحر ملا تھا تجھے
تضادِ "شعر و شریعت" کو کر دیا ہم رنگ — بلند کتنا مذاقِ نظر ملا تھا تجھے
ملی تھی آنکھوں کو تیری نظر غزالی کی — ضمیرِ پاک و دلِ خود نگر ملا تھا تجھے
شرابِ حافظِ شیراز تھی سبو میں ترے — بقدرِ شوق، سرورِ ہنر ملا تھا تجھے
وہ بے پناہ لطافت تری ظرافت کی — مزاجِ خندۂ گلہائے تر ملا تھا تجھے

سدا بہار تھی تیرے قلم کی رعنائی — تو چشمِ علم و ہنر میں خمار بن کے رہا
خوشا علومِ حدیث و کتاب کی تابش — تو اپنے سوزِ دروں کا نکھار بن کے رہا
بڑا غیور تھا عشقِ نیاز مند ترا — حضورِ حُسن بھی تو وضعدار بن کے رہا
لہو تھا کتنی بہاروں کا تیری نبضوں میں — نفس نفس ترا اک لالہ زار بن کے رہا
فضائے قلعۂ احمد نگر ہو یا دہلی — جہاں جہاں بھی رہا تو بہار بن کے رہا

وہ تیری آہِ سحر تھی کہ موجِ بادِ نسیم — قفس میں ڈال دی جس نے بنائے گل ریزی
تھی تیری چائے کی پیالی ادا شناسِ سبو — بڑا حسین تھا یہ اسلوبِ کیف انگیزی
فغاں! کہ رندِ سحر خیز اب وہ تیرے بعد — رہی نہ آبروئے شیوۂ سحر خیزی
کرن بھی ڈوب گئی اپنے آفتاب کے ساتھ — کہاں وہ صبحِ تمنا کی اب دل آویزی
"کسے کہ زود گسل نیست دیر پیوند است" — زہے نصیب تری خوئے دیر آمیزی

آج کل دہلی (ابوالکلام نمبر)
اگست ۱۹۵۸ء

گرہ کشائے زمانہ تھا تیرا ناخنِ ہوش | جنوں ملا تھا بڑا عہد آفریں تجھ کو
تری نگاہ سے اسرارِ شوق کب چھپتے | عطا ہوئی تھی نگاہِ کرشمہ بیں تجھ کو
ہوائے منزلِ جاناں کب آئی راس تجھے | قرار مل نہ سکا ایک پل کہیں تجھ کو
بلند تر تھی ترے ذوق و کیف کی دنیا | کہ جامِ زہر بھی تھا جامِ انگبیں تجھ کو
نچوڑ تھا کئی صدیوں کا شخصیت تیری | بھلا سکے گی نہ یہ خاکِ عنبریں تجھ کو

نہ رہ سکا قفسِ رنگ و بو میں قید کہ تو | ازل سے فطرتِ آزاد لے کے آیا تھا
اتر گئی جو رگِ گل میں بن کے خون کی بوند | وہ موجِ نکہتِ برباد لے کے آیا تھا
کسے خبر تھی تو ہنستی ہوئی نگاہوں میں | فسانۂ دلِ ناشاد لے کے آیا تھا
غزل سرا رہا ہر دور میں جنوں تیرا | غلط کہ تو لبِ فریاد لے کے آیا تھا
ترے لبوں پہ دمِ واپسیں تھا کس کا نام | تو دل میں کس کی حسیں یاد لے کے آیا تھا

ذائق بنگلوری

قطعۂ تاریخ بر وفات امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم

عالمِ جید، فقید المثل، دانائے علوم | زیں سرائے ششدری نقلِ مکاں فرمودہ اے
سرفروشِ ملک و ملت شہسوارِ حریت | بست رختِ زیست راہِ آخرت پیمودہ اے
روزِ شنبہ بود بست و دو ویں از فروری | طائرِ جانش پئے پرواز را بکشودہ اے
زادبومش بود مکہ شصت و نہ سالِ حیات | در کنارِ خاکِ دہلی آخرش آسودہ اے

سالِ ترحیلش، مکرر گفت ذائق عیسوی

مشرقستاں از امام الہند خالی بودہ اے

۱۹ ۰ ۵۸

ڈاکٹر ذاکر حسین

ابوالکلام آزاد ۔ ایک ہمہ گیر شخصیت

یہ تقریر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے دلّی کے اس تعزیتی جلسے میں فرمائی تھی جو صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر راجیندر پرشاد کی زیرِ صدارت ۲۳ ۔ فروری ۱۹۵۸ء کو منعقد ہوا تھا ۔۔۔

شرپتی جی، بھائیو اور بہنو! آپ جانتے ہیں کہ ہم آج کیوں یہاں ۔ اب تک آپ کے سامنے جو کچھ کہا گیا وہ مولانا کے ساتھیوں کی کا اظہار تھا ۔ میں مولانا کے ساتھی ہونے کا فخر نہیں رکھتا ہوں ۔ میں یک حقیر چیلے ہونے کا فخر رکھتا ہوں ۔ آدمی چھوٹا ہو یا بڑا اپنی زندگی کے لئے کہیں نہ کہیں سے روشنی اور گرمی لیتا ہے ۔ میں جب ایک تھا اپنی زندگی کے مٹی کے دیئے کو سلگانا چاہتا تھا ۔ اور لوگوں کی طرح ی روئی کی بتّیاں بنائی تھیں ۔ اور اپنی زندگی کے تیل میں ان کو ڈالا تھا ڈتا پھرتا تھا کہ ان کو کہاں سے جلاؤں ۔ اس زندگی کی پہلی بتّی، اس پہلی بتّی میں نے مولانا کے دیئے سے جلائی تھی ۔ ایک طالب علم کی سے میں ان کا "الہلال" پڑھتا تھا اور جب میں اپنے ساتھیوں اس کو پڑھتا تھا اور انھیں سناتا تھا اس وقت اس بتّی میں ۔ یوں اور جگہ سے بھی میں نے آگ لی ۔ لیکن آج میں اقرار کرتا ہوں انھیں سے لی تھی ۔ میں ان سے دور دور رہتا تھا اس لئے کہ میں آدمی نہیں ہوں ۔ ہر وقت ان کے ساتھ کا موقع مجھ کو نہیں تھا سے ملتا تھا اور جب ملتا تھا تو اُن سے روشنی اور گرمی پاتا تھا ۔

عرصہ ہوا کہ ایک بات میں مجھے ان سے کچھ رنج ہُوا اور میں ان س وقت آپ کے سامنے اقرار کرتا ہوں کہ میں نے اپنی کم ظرفی س کمپا وٹ کو ان پر ظاہر بھی کیا مگر اس کو وہ وقار نے، بجائے اس کے کہ اسے میری گستاخی سمجھے مجھ پر محبت کی بھرمار کی اور جب میں ان کے بلانے پر ان سے ملنے گیا تو میں شرم سے گڑا جاتا تھا اور وہ محبت سے اُبلے جاتے تھے اور میرے اوپر شفقت کی ایسی بارش تھی کہ میں اس کو کبھی بھلا نہیں سکوں گا ۔ مولانا بہت سی حیثیتیں رکھنے والے آدمی تھے ۔ وہ بہت بڑے عالم تھے مذہب کے، بہت بڑے عالم تھے ادب کے، ادبیات لٹریچر پر بڑی نظر رکھتے تھے ۔ بڑا اچھا مذاق رکھتے تھے ۔ کتابوں پر عاشق تھے اور کوئی سیاست داں یہ نہ سمجھے کہ انھوں نے سیاست کی خاطر اپنے علم کو کبھی بھی چھوڑا ہو وہ آخر لمحے تک اس کے ساتھ وفادار رہے ۔ ہاں وہ یہ جانتے تھے کہ علم ایک بار بھی ہو سکتا ہے، علم ایک ایسا بوجھ ہو سکتا ہے جو آدمی کو دبا دے اور اس کو ناکارہ کر دے ۔ وہ علم کے ساتھ اپنی سماجی ذمہ داریوں کو بھی سمجھتے تھے ۔ وہ اپنے وطن کے فرائض کو بھی جانتے تھے ۔ انھوں نے آخر وقت تک علم کو نہیں چھوڑا اور علم کی لگن اُن کے دل میں لگی رہی ۔ کتابوں کی تلاش، چیزوں پر غور و فکر، ان کو سوچنا، ان کو سمجھنا، ان کے جوڑ ملانا، چاہے وہ تاریخی مسائل ہوں، چاہے وہ ادبی مسائل ہوں، چاہے وہ علمی مسائل ہوں، ان کا یہ شغل آخر تک باقی رہا ۔ ابھی آخری مرتبہ دسمبر میں جب میں ان سے ملا تو وہ دو کتابیں دیکھنا چاہتے تھے ۔ ان کتابوں کے دیکھنے کے لئے پٹنے آنے کا ارادہ ظاہر کیا کہ گوہاٹی کے سفر میں پٹنے آؤں گا اور وہ دو کتابیں دیکھوں گا ۔ افسوس کہ

اس کا موقع ان کو نہیں ملا۔ علالت کی وجہ سے نہ وہ کانگریس میں گئے اور نہ اس لئے بیٹھنے گئے لیکن ان کی یہ لگن آخری وقت تک رہی۔ مگر کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ ایسے عالم تھے کہ علم کے بہانے سے اپنے تمام سماجی فرائض سے الگ ہو جاتے اور سماجی فرائض کا خیال نہ کرتے۔ انھوں نے اپنی مثال سے یہ بتا دیا کہ وہ اپنی ساری زندگی ایک مجاہد کی طرح اپنی قوم کی آزادی کے لئے، اس کی آزادی حاصل کرنے کے لئے اور آزادی حاصل ہونے کے بعد آزادی کو اچھی نیو اور بنیاد پر قائم کرنے کے لئے صرف کرسکتے ہیں۔ انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ علم ایک گورکھ دھندا نہیں ہے کہ جس سے لوگوں کو دھوکے دئے جائیں بلکہ وہ ایک روشنی ہے جس سے آدمی دوسروں کو روشنی دکھا سکتا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس عالم، اس مفکر، اس مرد مجاہد نے کلمۂ حق کہنے، سچی بات کہنے، ناگوار سچی بات کہنے کی مثالیں قائم کی ہیں۔ سچ بات کا کہنا سب سے بڑا جہاد ہے۔ سچ بات کہنے میں بڑی ناگواریاں ہیں۔ لوگ ناخوش ہوتے ہیں اور مولانا سے لوگ کیا ناخوش نہیں ہوئے۔ یہاں مسلمان بھائی ہوں گے۔ ہم سوچیں کہ ہم نے مولانا کا کس کس طرح دل نہیں دکھایا۔ ہم نے مولانا کو کیا کچھ نہیں کہا۔ کون سا بُرا لفظ ہے جو ہم نے ان کے لئے استعمال نہیں کیا لیکن اس وقار کے پتلے نے کبھی ایک لفظ کہا اس کے متعلق؟ کوئی ہے یہاں جو یہ شہادت دے سکتا ہے کہ اس نے کبھی کسی کی بابت کوئی ایسا کلمہ سنا کہ انھوں نے شکایت کی ہو یا بُرا مانا ہو۔ سب کچھ گزر جاتا تھا اور اس کی وہ بالکل پروا نہیں کرتے تھے، وہ کلمۂ حق ضرور کہتے تھے۔ مشورہ لیجئے صحیح مشورہ دیتے تھے۔ جیسا کہ ابھی کہا گیا کہ وہ کم آمیز تھے۔ کچھ عرصے سے زیادہ کم آمیز ہوگئے تھے۔ لوگوں سے کم ملتے تھے لیکن وہ سب کے ساتھی تھے۔ وہ اس کمرے میں بیٹھ کر ہمارے سب کے ساتھی تھے۔ اور اس طرح ساتھی کہ ہمیں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہمارے ساتھی ہیں۔ اس لئے کہ جب وہ بات کہنے کی ضرورت ہوتی تھی جو ہم چاہتے ہیں کہ کہی جائے اور جو ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نہیں کہہ رہے ہیں اور ہماری طرف سے نہیں کی جا رہی ہے وہ اس کو کہتے تھے اور ہمیں یقین تھا کہ وہ اس کو کہہ سکتے ہیں اور ایک مرد مجاہد کے واسطے یہ بہت بڑا مرتبہ ہے۔ ان سب میں ہمارے واسطے بہت بڑی عبرتیں ہیں۔ ان سب میں ہمارے واسطے بہت بڑے سبق ہیں اور جیسا کہ میں نے کہا چونکہ میں ایک طالب علم کی طرح سبق لینے کے لئے ہی ان کے پاس گیا تھا۔ آج بھی یہ سمجھتا ہوں کہ وہ سبق جاری ہے۔ اگرچہ وہ ہم میں نہیں رہے۔ جیسا کہ راشٹرپتی جی نے کہا کہ وہ قلم جس سے موتی برستے تھے، وہ قلم جس سے بجلیاں بھی گرتی تھیں، وہ زبان جس سے پھول برستے تھے اور جس سے چنگاریاں بھی برستی تھیں، جو باطل کو جلاتی بھی تھی اور سچ کو روشن بھی کرتی تھی، وہ زبان بند ہے وہ قلم ٹوٹ گیا ہے لیکن وہ مثال باقی ہے اور ہمیں چاہئے کہ ہم اس مثال سے گرمی بھی لیں اور روشنی بھی لیں اور اپنی زندگی کو ایسا بنائیں جیسا کہ وہ چاہتے تھے کہ ہم بنائیں اور جس کی مثال وہ ہمارے لئے چھوڑ گئے۔ ہمارے سامنے ایک بہت بڑا کام ہے۔ اس قوم کے بنانے کا کام کوئی کھیل نہیں ہے۔

بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہتھیلی کے اوپر سرسوں جم سکتی ہے۔ اس میں نہ معلوم کتنے ابوالکلام کھپ جائیں گے، کتنی نسلیں کھپ جائیں گی اور یہ کام کبھی ختم نہ ہونے والا کام ہے۔

اس لئے ہمیں اپنے سامنے اس راستے کو رکھنا چاہیئے۔ ان مثالوں کو زندہ رکھنا چاہیئے۔ وہ اس طرح زندہ رہ سکتی ہیں کہ ہم وہ کریں جو وہ کرتے رہے اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم وہ نہیں کرسکتے ہیں جو وہ کرتے تھے۔ کمی کی جگہ پُر نہیں کی جا سکتی۔ بہت بڑے بڑے لوگ گزر گئے۔ جیسا کہ کسی نے ابھی حال میں کہا تھا کہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ آسمان پر بہت سے ستارے ایک ساتھ آجاتے ہیں۔ ہمارے قومی آسمان پر بھی بہت سے ستارے ایک ساتھ آ گئے تھے۔ وہ ایک ایک کرکے ٹوٹتے جاتے ہیں۔ لیکن اس کی پروا نہیں کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ پروا کرکے کچھ ہو نہیں سکتا۔ ان کا جانا ضروری ہے، یہ حق ہے۔ کوئی ان کو واپس نہیں لا سکتا۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں کسی ترکیب سے ان کاموں کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔ جو کام ایک آدمی کرتا تھا وہ ایک ہزار آدمی مل کر کریں۔ لیکن اپنی زندگی کا رُخ وہی رکھیں۔ سچائی کی طرف رکھیں، عمل کی طرف رکھیں، علم کی طرف رکھیں، ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں اور یہ جانیں کہ ہمارے اوپر جو فرائض ہیں وہ پوری طرح ادا کئے جانے کے لئے روز مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ فرائض کبھی ختم نہیں ہوتے۔

میرے خیال میں مولانا نے جو ایک سب سے بڑی خدمت کی وہ یہ ہے کہ ہر مذہب کے آدمی کو انھوں نے یہ جتایا کہ مذہب کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک مذہب کی حیثیت ہوتی ہے جو تفریق پیدا کرتی ہے، ایک مذہب کی حیثیت ہوتی ہے جو لوگوں کو الگ الگ کرتی ہے، جو لوگوں میں نفرت پیدا کرتی ہے۔ وہ مذہب جھوٹا مذہب ہے۔ انھوں نے یہ بتلایا کہ مذہب کی روح ملانے والی روح ہے، مذہب کی روح ایک دوسرے کو پہچاننے والی روح ہے، مذہب کی روح خدمت کی روح ہے۔ مذہب کی روح دوسروں کے لئے اپنے کو مٹانے کی روح ہے، مذہب کی روح وحدت کو ماننے کی روح ہے، ساری زندگی کی وحدت کو ماننے کی روح ہے۔ اور یہ ایک ایسا سبق ہے جو تمام مذہبی جماعتوں اور تمام اُن لوگوں کو سیکھنا چاہیئے جو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بنانا چاہتے ہیں۔ زبان کے اوپر یا صوبے کے اوپر یا کسی ذات پات کے اوپر یا کسی مذہب کے اوپر ٹکڑیاں بنا کر ہماری زندگی کی وحدت کو مٹانا چاہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اس وقت جو سب سے بڑا مرض ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے پاس جو چھوٹی وفاداریاں ہیں، تنگ وفاداریاں ہیں وہ زیادہ قوی ہیں۔ ہم چھوٹے چھوٹے گروہوں سے زیادہ وابستہ ہیں اور بڑے گروہ کو پوری طرح نہیں سمجھتے ہیں۔ ہم کو چاہیئے کہ اپنی چھوٹی وفاداریوں کو اس بڑی وفاداری کا تابع کریں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے کہ چھوٹی وفاداریاں توڑ دی جائیں۔ کسی کو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سکھ نہ رہے، مسلمان نہ رہے، ہندو نہ رہے یا پارسی نہ رہے لیکن اس کو پہلے اپنے دیس کا، پھر تمام انسانیت کا خادم بننا چاہیئے۔ تب وہ سچا مسلمان ہے، تب وہ سچا ہندو ہے، تب وہ سچا عیسائی ہے، تب وہ سچا پارسی ہے تب وہ سچا سکھ ہے۔ یہ سبق مولانا کی زندگی سے جیسا روشن طور پر ہمیں ملتا ہے اور یہ سبق جس طرح ہمارے واسطے آج کی زندگی میں اور ہماری قومی زندگی میں ضروری ہے اس کے اعتبار سے ہم سمجھتے ہیں کہ آج کا دن ہمارے لئے اس عہد کرنے کا دن ہے کہ ہم اس روح کو، مذہب کی سچی روح کو اپنی قومی زندگی میں کارفرما کریں۔

بہار و خزاں

اور امید و بیم

"اس میں تو شک نہیں کہ جس قدر کاوش سے غور کیجیئے گا۔ جذبات انسانی کی تحلیل و تفریق کے بعد کے آخری عناصر میں دو چیزیں امید و حسرت نظر آئیں گی۔ وہ جو کچھ کرتا ہے یا آئندہ کی امید ہے یا رفتہ پر حسرت۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ امید و یاس کی تقسیم کو صرف افراد و اشخاص ہی میں محدود نہ کیجیئے بلکہ اس میں دراصل قوموں اور ملکوں کی تاریخ پوشیدہ ہے۔ باغ و چمن میں بہار و خزاں دو موسم ہیں جو یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔ اور اپنی اپنی آمد کے تقاضا و مخالف آثار چھوڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح امید و حسرت کو دو مختلف موسم تصور کیجیئے جو قوموں اور ملکوں پر بھی آتے ہیں اور وہ نامرادی و کامرانی کی تقسیم ہے جو اپنے اپنے وقتوں پر قوموں میں ہو جاتی ہے۔ بعض قومیں ہیں جن کے حصے میں امید کی بہار آئی ہے اور بعض ہیں جو اب صرف یاس و حسرت کے خزاں ہی کے لئے رہ گئی ہیں۔ موسم بہار زندگی و شگفتگی کا موسم ہوتا ہے اور انسان کی رگوں کے اندر دوڑنے والے خون سے لے کر درختوں کی شاخوں اور ٹہنیوں تک ہر چیز میں جوشِ حیات اور ولولۂ انبساط پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی حال ان قوموں کا ہوتا ہے جو اپنے دورِ امید سے گزرتی ہیں۔ تمام دنیا ان کے لئے ایک بہشتِ امید بن جاتی ہے اور اس کی ہر آواز ان کے کانوں کے لئے ایک ترانۂ امید کا کام دیتی ہے۔ وہ اپنے اندر دیکھتے ہیں تو دل کا ہر کونہ امیدوں اور ولولوں کا آشیانہ نظر آتا ہے اور باہر نظر ڈالتے ہیں تو دنیا کا کوئی حصہ عروسِ امید کی مسکراہٹ سے خالی نہیں ہوتا۔ اس طلسم زارِ ہست و نیست میں انسان سے باہر نہ غم کا وجود ہے نہ خوشی کا۔ زندگی کی تمام کامیابیاں اور مسرتیں دراصل دل کی عشرت کا پیول ہیں جب تک آپ کے دل کے طاقِ مخفی میں امید کا چراغ روشن ہے۔ اس وقت تک دنیا بھی عیش و مسرت کی روشنی سے خالی نہیں۔ لیکن اگر بادِ صرصرِ نامرادی کا کوئی جھونکا وہاں تک پہنچ گیا تو پھر آفتاب نصف النہار پر درخشاں کیوں نہ ہو مگر یقین کیجیئے کہ دنیا کا یہ تمام نظامِ منور آپ کے لئے ظلمت سرائے تاریک ہے۔"

(الہلال، ۹۔ اپریل ۱۹۱۳ء)

ہمایوں کبیر

عہد آفریں شخصیت

کوئی چالیس سال ہوئے جب مولانا ابوالکلام آزاد پہلی بار ہندوستان کے علم و ادب اور سیاست کے میدان میں داخل ہوئے تھے۔ لیکن آج تک ان کے ہم وطنوں میں ان کے مداح اور ناقد دونوں شامل ہیں۔ اس بات کا فیصلہ نہ کر سکے کہ مولانا آزاد ایک ادیب کی حیثیت سے زیادہ نمایاں تھے یا بہ حیثیت سیاست داں۔ مولانا آزاد ابھی عنفوانِ شباب کی منزل میں ہی تھے کہ انھوں نے "الہلال" اور "البلاغ" میں آتش نوا مضامین لکھ کر شمالی ہند کی ادبی دنیا میں ایک ہنگامہ بپا کر دیا تھا۔ محض ادبی کاوشوں کے اعتبار سے بھی اردو زبان و ادب کی تاریخ میں یہ مضامین اپنی مثال آپ ہیں۔ خطابت، فصاحت و بلاغت، ذہانت و فطانت، تیکھے طنز اور اعلیٰ و ارفع عینیت کا ایسا امتزاج مشکل سے ہی ملتا ہے۔ "الہلال" کے اداریوں میں مضمون نگاری کے جو نمونے پیش کئے گئے انھوں نے اردو نثر میں ایک نئے اسلوبِ نگارش کی بنیاد ڈالی۔

مگر اس وقت کے نوجوانوں کے جس چیز سے متاثر ہوئے وہ مولانا آزاد کے مضامین کی صرف ادبی فوقیت یا شاعرانہ حسن نہیں تھا۔ برطانوی اقتدار کے خلاف ۱۸۵۷ء کی ہندوستان کی جدوجہد کے ناکام ہو جانے کے بعد سے ہندوستانی مسلمان مایوسی اور عدم اعتماد کی فضا میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ سر سید احمد نے مسلمانوں کی گرتی ہوئی حالت سدھارنے کے لئے اس طریقے پر کوشش کی کہ فاتحوں کی حمایت حاصل کی جائے اور مسلمانوں کو عملی سیاست سے دور رکھا جائے۔ سیاست سے گریز بالآخر سیاست کی مخالفت ہو کر رہ گیا۔ ایسی منفی پالیسی بذاتِ خود بُری پالیسی تھی۔ پھر اس وقت کے حالات کی وجہ سے یہ پالیسی ملک اور قوم کے لئے زبردست خطرے کا باعث ہو گئی۔ مسلمانوں کی سیاست سے الگ ہونے کی کوشش ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی قومی بیداری کے مدِ مقابل تھی۔ جو اب سیاست میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے لگے تھے۔ سر سید کی ہندوؤں سے دوستی اور قدر و منزلت کے باوجود ان کی سیاست نے بالآخر ایک پلٹا کھایا۔ ان کی پالیسی جو کہ سیاست کے خلاف تھی ان کے جانشینوں کے ہاتھ میں ہندوؤں کے خلاف آلۂ کار بن کر رہ گئی۔

جس وقت مولانا آزاد ہندوستانی سیاست کے میدان میں داخل ہوئے تو ہندوستانی مسلمانوں کی منظور شدہ پالیسی یہی تھی۔ اس وقت نیم سیاسی شعور رکھنے والے مسلمانوں کی بڑی اکثریت کے سامنے سرسید کی پالیسی کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا۔ یعنی برطانیہ سے تعاون اور ہندوؤں سے علیحدگی۔ جب مولانا آزاد نے واضح طور پر اس بات کی دعوت دی کہ قومی تحریک سے پورا پورا اتحاد اور تعاون کیا جائے اور برطانوی شہنشاہیت کی طاقتوں کی پُر زور مخالفت کی جائے تو پہلے پہل لوگوں کو بڑا دھکا لگا اور پھر سرکردہ مسلم سیاستدانوں کے بعض حلقے ناراض بھی ہوئے۔ اس وقت اہل الرائے مسلمانوں کی اکثریت کو مولانا آزاد کا یہ موقف ایک سراسر سیاسی بدعت دکھائی پڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "الہلال" ہندوستانی مسلمانوں کے ابھرتے ہوئے جذبے کے اظہار کا ذریعہ ہو گیا۔

مولانا آزاد چالیس سال سے زیادہ عرصے تک قومیت، ترقی، آزادی اور جمہوریت کے تقاضوں کے حامی رہے۔ یہ بات بعض لوگوں کو کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ مولانا آزاد مذہبی علماء کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی پرورش اور تربیت ان کی خاندانی روایات کے مطابق ہوئی تھی۔ چوں کہ

مولانا آزاد مذہبیات کے زبردست عالم اور اسلامی حدیث و فقہ کے ماہر تھے اس لئے بعض لوگ مصلح اور قوم پرست کی حیثیت سے ان کے رول کو کچھ غیر متوقع سمجھتے تھے۔ لیکن یہ کوئی عجیب و غریب بات نہ تھی۔ یہ بات انھیں لوگوں کے لئے تعجب خیز ہے جو اسلام کی روایات کو بھول گئے ہیں اور صرف انھیں عقائد پر نظر رکھتے ہیں جو اکثر انگریزوں نے ہندوستانی مسلمانوں سے وابستہ کر دئے ہیں۔ اسلام نے جس میں جمہوریت، آزادی اور عقلیت پر زور دیا گیا ہے جواں سال مولانا آزاد کو اس وقت کی سیاسی غلامی، جاگیردارانہ طبقاتی درجہ بندی اور ذہنی ظلمت پسندی کے خلاف بغاوت پر اُبھارا۔ چنانچہ وہ ملک و قوم کو سیاسی غلامی، جاگیرداری، خوشامد پسندی اور توہم پرستی سے نجات دلانے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ یہ ہمہ گیر آزادی کا جذبہ ہی تھا جو مولانا آزاد کو عزلت نشینی کی خانقاہ سے نکال کر سیاست کے میدانِ کارزار میں لے آیا۔

لیکن سیاسی سرگرمیاں مولانا آزاد کی علمی حیثیت پر کبھی حاوی نہیں ہو سکیں۔ ایک عالم کو زندگی کی مستقل قدروں سے تعلق ہوتا ہے جبکہ سیاست دان عام طور سے وقتی باتوں پر توجہ کرتا ہے۔ مولانا آزاد ڈپلومیٹ یا سیاسی چال باز سے زیادہ ایک بڑے مدبر تھے۔ ان میں دو خصوصیات تھیں جو ان کے تمام سیاسی اعمال کا طرۂ امتیاز ہیں۔ یعنی ان کی سنجیدگی اور مزاجی توازن اور ان کی سلجھی ہوئی قوتِ فیصلہ۔ اگرچہ وہ ایک شاعر کی طرح بے حد حساس واقع ہوئے تھے لیکن انھوں نے کبھی سیاسی فیصلوں میں اپنے جذبات کو حاوی نہیں ہونے دیا۔ کسی شخص کے بارے میں ان کی پسند یا ناپسند ان کے فیصلوں میں کبھی آڑے نہیں آئی۔ انھوں نے ہر معاملے کو واقعیت پسندی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی اور یہ بات ان کے دوست دشمن دونوں کے لئے تعجب خیز رہی ہے۔ اس مزاجی توازن اور سنجیدگی کی وجہ سے اُن کا مشاہدہ بہت صاف تھا۔ جب تک کوئی شخص معقولیت پسند رہتا ہے اور ہر بات کو دلائل کی روشنی میں پرکھتا ہے۔ اس وقت تک اس سے غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔ سیاست میں اور دوسری جگہ بھی غلطیاں اسی وقت ہوتی ہیں جبکہ توازن پر تعصب غالب آ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے ہم زیرِ نظر معاملے کے مختلف پہلوؤں کو پرکھ نہیں پاتے۔ مولانا آزاد کی سنجیدگی اور سلجھی ہوئی قوتِ فیصلہ کی وجہ سے ان کے سیاسی فیصلوں کو ایک طرح کی غیر فانی حیثیت حاصل ہو گئی تھی جس سے دوست مرعوب تھے اور مخالف بدحواس۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کیوں تلخ ترین مباحثوں میں بھی ان کے منھ سے غصہ یا طیش میں کوئی لفظ نہیں نکلا اور نہ انھوں نے کبھی کسی پر الزام دھرا یہاں تک کہ انھوں نے ان لوگوں کے خلاف بھی کسی غم و غصہ کا اظہار نہیں کیا جنھوں نے ان کی بے عزتی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مولانا ہر قسم کے طوفانی حوادث اور اختلافات کے درمیان ذرا نہیں گھبرائے۔ اس ضبط و تنظیم کی وجہ سے وہ ایک بے پناہ شخصیت کے مالک ہو گئے تھے۔ مولانا کی ہمت اور ارادے کی مضبوطی نے ان کے بدترین دشمنوں سے بھی خراجِ تحسین حاصل کیا۔

چونکہ مولانا آزاد کی شخصیت بیک وقت ایسی درخشاں بھی تھی اور رمز آمیز بھی، اس لئے ان کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہو جانا لازمی بات ہے مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ مولانا نے جامعۂ ازہر میں تعلیم حاصل کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تعلیم زیادہ تر گھر پر ہوئی، البتہ اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ محض ایک سیاح کی حیثیت سے جامعہ ازہر گئے تھے۔ ایک دوسری کہانی یہ ہے کہ مولانا نے بچپن میں ہی ایک عالم کی حیثیت سے بے پناہ شہرت حاصل کر لی تھی۔ ایک مرتبہ اس زمانے کے ایک مشہور عالم سے کسی موضوع پر ان کی طویل خط و کتابت ہوئی۔ پھر اس عالم نے یہ خواہش ظاہر کی کہ بالمشافہ گفتگو کر کے بعض مسائل طے کئے جائیں چنانچہ جب نوجوان مولانا اس بزرگ عالم کے پاس پہنچے تو انھوں نے ان کا خیر مقدم کیا اور تپاک سے پوچھا کہ آپ کے بابا کیوں تشریف نہیں لائے آپ کو کیوں بھیج دیا۔ ایک اور کہانی یہ بھی مشہور ہے کہ کسی جگہ مولانا کو خصوصی مہمان کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا مگر جب مولانا وہاں پہنچے تو انھیں اندر جانے نہیں دیا گیا کیونکہ کسی کو یہ اعتبار نہیں آ سکتا تھا کہ یہ بے ریش لڑکا وہی مشہور عالم ہے جس کا سب لوگ انتظار کر رہے ہیں۔

قدرت اکثر مختلف لوگوں کو مختلف قسم کے انعامات سے نوازتی ہے کسی کو جسمانی طاقت عطا ہو جاتی ہے تو کسی کو ذہنی قوت۔ قدرت بعض لوگوں کو دولت دیتی ہے تو بعض کو شہرت و عظمت عطا کرتی ہے۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ یہ سارے انعامات ایک ہی شخص کو ملیں۔ مولانا آزاد ان چند خوش قسمت انسانوں میں سے تھے جنھیں قدرت نے پورے طور پر وہ تمام چیزیں عطا کی تھیں جن کی ہر انسان آرزو کرتا ہے۔ لیکن ان کے یہاں ایک تضاد بھی پایا جاتا تھا جسے انسانی دماغ سمجھنے سے قاصر ہے۔ وہ یہ کہ ان تمام انعامات کے ساتھ انھیں حساس طبیعت بھی عطا ہوئی تھی اور ان کے دل میں انسان کے دکھ درد کے لئے ہمدردی بھی تھی۔ چنانچہ اپنی ذاتی کامیابیوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے چاروں طرف

اس قدر غلطیوں فضولیات اور نفرت کو دیکھ کر بےچین رہتے تھے۔

مولانا آزاد جیسے شخص کے لئے روحانی طور پر ایک طرح کی تنہائی محسوس کرنا لازمی امر تھا۔ جو کوئی ان کے قریب آیا اس نے محسوس کیا کہ مولانا روحانی طور پر تنہا ہیں۔ مولانا آزاد بڑے خلیق تھے اور ان کی شخصیت میں بےپناہ کشش تھی، پھر بھی ان کی دنیا الگ تھلگ تھی جس میں بہت کم لوگوں کا گذر ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے خیالات کی دنیا میں رہتے تھے، اور اپنی لیے خداداد کے بل بوتے پر دنیا کے دُکھ درد کو برداشت کرتے تھے۔ وہ انسانی دکھ درد کو بہت زیادہ محسوس کرتے تھے، مگر اس کے ساتھ ساتھ ان میں قوتِ برداشت بھی تھی اور انسان کی بنیادی اچھائی پر انھیں پورا اعتماد تھا جس کی وجہ سے وہ ہر طرح کی تکالیف میں اپنے آپ کو سنبھالے رہے۔ بنیادی طور پر وہ عقلیت پسند تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ ہر معاملے میں بالآخر منشائے الٰہی پورا ہوتا ہے۔ یہی ان کا ایمان تھا اور یہی اس نسل کے لوگوں کے لئے ان کی وصیت۔

منظور علی تمنّا فاروقی بخاری

قطعہ تاریخ بایں وفاتِ آزاد

۱۹۵۸ء

ہزار حیف یکایک زگلشنِ ایجاد — برفت سوئے جناں شکلِ بوئے گلِ آزاد

ز رفت پیکرِ آزاد، رفت روحِ کبیر — چہ شد کہ حیف جدا شد زخانہ خانہ زاد

دریغ، رہبرِ مخلص بہ وقتِ نامسعود — برفت و کرد دلِ دوستاں زغم ناشاد

زعیم عالی ہمم، نیک رائے، خوش تدبیر — کشادہ قلب و نظر، دوربین و دور افتاد

ادیب نکتہ رس و اہلِ علم و صاحبِ فن — کہ بود جنبشِ جنبشِ پیامِ علم و ارشاد

ہزار عقدۂ مشکل، ز ناخنِ تدبیر — بہ صد خلوص بہ فکرِ رسا گرفت و کشاد

ہمیں کہ قوم و وطن را ز پنجۂ افرنگ — بہ نسبتے کہ او آزاد بود، کرد آزاد

بہ قولِ فیصلِ خود مطمئن بہ استقلال — بہ عزمِ کوہِ گراں بار، ہر چہ بادا باد

کسے نہ بود بہ ایماں، مجالِ برگشتن — زباں بہ گفت و بگوش آمدہ "بجا ارشاد"

دراں زماں کہ بایں ظلمت احتیاجش بود — ضیائے شمعِ ہدایت، دریغ رفت بہ باد

تمنّا، بادلِ غمگیں، چشم اشک فشاں — سرِ تلاش چو بر آستانِ فکر نہاد

برائے سالِ وفاتش ندا ز غیب آمد

کہ حیف رفت بہ جنّت ابوالکلام آزاد

۱۳۷۷ھ

نیاز فتحپوری

مولانا آزاد کی صحافتی عظمت

مولانا آزاد کی تمام ذہنی خصوصیات اور جامعیت فضل و کمال سے ہٹ کر محض ان کی صحافتی عظمت و خصوصیت پر اظہارِ خیال بہت دشوار ہے۔ مولانا کے صحافتی بدایع کا ذکر کرنا اور اُن تمام عطایائے فطرت کو نظر انداز کر دینا ۔ جو قدرت نے ان کے ذہن و دماغ میں ودیعت کئے تھے ممکن نہیں کیونکہ مولانا کی صحافت عہدِ حاضر کی اصطلاحی اور ٹیکنیکل صحافت سے بہت مختلف تھی۔ اتنی مختلف کہ اگر ہم اسے ماورائے صحافت کسی اور چیز سے تعبیر کریں تو غالباً یہ تعبیر غلط نہ ہوگی۔

مولانا اپنی فطری افتاد، اپنے فکر و تصوّر، اپنے رجحانات و میلانات اور ذہنی اکتسابات کے تنوع کے لحاظ سے اس قدر غیر معمولی انسان تھے کہ بیک وقت نہ ہم ان کے جملہ فضائل و خصائص کا احصار کر سکتے ہیں، نہ ان کے دماغ کو مختلف خانوں میں تقسیم کر کے ان کی ادبی، علمی، مذہبی و صحافتی خصوصیات کے درمیان کوئی حدِ فاصل قائم کر سکتے ہیں۔

لایڈ جارج سے ایک بار کسی نے پوچھا کہ "صحافی بننے کے لئے ایک انسان کو کیا کیا جاننا چاہیئے۔" انھوں نے جواب دیا۔ "سب کچھ اور کچھ نہیں یعنی صحافی دراصل وہ ہے جو دنیا کی تمام باتوں کو جانے، لیکن ماہر کسی کا نہ ہو۔" لیکن مولانا کی یہ عجیب و غریب خصوصیت کہ وہ بہت کچھ جانتے تھے اور جو کچھ جانتے تھے ماہرانہ حیثیت سے جانتے تھے ایسی خصوصیت تھی جس کی نظیر دنیائے صحافت میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

مولانا کے فضل و کمال کا تنوع، ان کے مطالعہ کی وسعت ان کا پاکیزہ جمالیاتی ذوق اور ایک خاص قسم کا عالمانہ رکھ رکھاؤ۔ ان سب کا اتنا دل کش امتزاج ان کے اندر پایا جاتا تھا کہ ہم ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے جدا کر ہی نہیں سکتے۔ گویا وہ ایک ایسا کل تھے جس کا کوئی جزو اس سے علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارے سامنے اگر مختلف رنگ کے پھول علٰحدہ علٰحدہ رکھ دیئے جائیں تو ہم ان کے رنگ و نکہت پر علٰحدہ علٰحدہ اظہارِ خیال کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان سب کا گلدستہ بنا کر سامنے لایا جائے تو ہم اسے گلدستہ ہی کی حیثیت سے دیکھیں گے اور امتیازِ رنگ و نکہت کا کوئی سوال ہمارے سامنے نہ ہوگا۔ بالکل یہی حال مولانا کے ذہنی اکتسابات کے تعدد و تنوع کا تھا کہ ہم ان کو ایک دوسرے سے علٰحدہ کر ہی نہیں سکتے۔ خواہ وہ شعر و ادب سے متعلق ہوں۔ خواہ مذہب و حکمت سے وابستہ ہوں۔ خواہ صحافت و سیاست سے!

یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ مولانا کی جو خصوصیات دنیا پر ظاہر ہو سکیں وہ اُن سے بہت کم تھیں جو چھپی ہوئی رہ گئیں۔ حالاں کہ وہ بہت زیادہ وزنی و گراں قدر تھیں۔ ہم نے مولانا کو اتنا ہی جانا جتنا وہ چاہتے تھے کہ ہم جانیں اور ان کی ہستی کے بہت سے امکانات دنیا پر ظاہر نہ ہو سکے۔

وہ امکانات کیا تھے ان کی تعیین و صراحت آسان نہیں تاہم جس حد تک میرے ذاتی ربط و مطالعہ کا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان کی زندگی ایک خاص سانچہ میں ڈھل کر وہ نہ ہو جاتی جو ہمارے سامنے آئی تو وہ خدا جانے کیا کیا ہو سکتے تھے ۔ وہ اگر عربی شاعری کی طرف توجہ کرتے تو متنبی و بدیع آزماں ہوتے ۔ اگر وہ محض دینی و مذہبی اصلاح اپنا شعار بنا لیتے تو اس عہد کے ابن تیمیہ ہوتے۔ اگر محض علومِ حکمیہ کے لئے اپنے آپ کو وقف کر

دیتے تو ابن رشد اور ابن طفیل سے کم درجے کے متکلم و فلسفی نہ ہوتے۔ اگر وہ فارسی شعر و ادب کی طرف متوجہ ہوتے تو عرفی و نظیری کی صف میں نظر آتے۔ اگر وہ تصوف و اصلاح نفس کی طرف مائل ہوتے تو غزالی اور رومی سے کم نہ ہوتے۔ اور اگر وہ گوشۂ اعتزال اختیار کر لیتے تو دور سے دیکھنے میں ملا ہوتے۔ واصل حق غلط کہا گیا ہے تو اس کے تبحر علمی کا بھی ایک المیہ سمجھئے۔ یہ پیدائشی تو تلا تھا جسے عربی میں الثغ کہتے ہیں۔ بات کا آغاز وہ صحیح نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اس کی ذہانت اور لسانی مہارت کا یہ عالم تھا کہ جب وہ کسی مجمع میں تقریر کرنے کھڑا ہوتا تو وہ کوئی لفظ ایسا استعمال نہ کرتا تھا جس میں رے پائی جاتی ہے۔ ایک بار اس سے کسی نے پوچھا کہ اگر تم یہ کہنا چاہو کہ "وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنا نیزہ تانا" تو کیا کہو گے۔ تو اس مفہوم کو یوں ادا کریں گے "رکب علی فرسہ و جرّ رمحہ" اس نے بلا تامل بلکہ برجستہ کہا۔ واصل نے کہا کہ میں اسے یوں کہوں گا۔ "استوی علی جوادہ و سحب عاملہ" خیر یہ تو ایک دلچسپ بات تھی جس کا ذکر ضمناً آ گیا لیکن اس میں شک نہیں کہ مولانا آزاد کو زبان پر انتہائی عبور حاصل تھا

مولانا عجیب و غریب دماغی صلاحیتیں لے کر پیدا ہوئے تھے۔ جن کو زمانہ نے یا خود ان کی تنوع پسند طبیعت نے ابھرنے کا موقع نہ دیا اور آج ہم انھیں صرف الہلال و البلاغ کے مدیر، التذکرہ، ترجمان القرآن اور غبار خاطر کے مصنف ہونے کی حیثیت سے جانتے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس عہد کے بڑے ہونے کی تمام صلاحیتیں اپنے اندر رکھتے تھے۔

مولانا کے حالات زندگی اور ان کے میلان و عواطف سے بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ورنہ یہ حکایت مزید دراز تر ہو جاتی۔ لیکن اگر ہم محض ان کی صحافتی زندگی سامنے رکھیں تو بھی اس کی بوقلمونی اور بوالعجبی ایسی نہیں کہ اس سے سرسری گزر جایا جائے۔ کیونکہ یہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے ہم نے ابوالکلام کو پہچانا اور اگر زمانہ مساعدت کرتا اور ان کے صحافتی مشاغل جاری رہتے تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کے اور کون کون سے قوا کا مظہر بروئے کار آتے اور آج تک ان کی کون کون سی نئی علم و ادب کا ہمارے سامنے موجود ہوتیں۔

مولانا کی فطری اہلیت و صلاحیت اور قدرت کا ایک سر بستہ راز تھی جس کے بعض گوشے تو ہمارے سامنے آگئے۔ اکثر بے نقاب نہ ہو سکے۔ اس کا ایک سبب تو زمانہ کے حالات تھے جنھوں نے ان کو اپنے ذوق کی پوری وسعت سے کام لینے کا موقع نہ دیا اور دوسرا سبب ان کی فطری خلوت پسندی و کم آمیزی تھی۔ وہ نام و نمود اور شہرت سے گریز کرتے تھے اور یہ بربنائے متانت و خودداری وہ بے تکلفی میں بھی وہ اپنی "شان گرانمایگی" ہات سے نہ جانے دیتے۔

مولانا کے دور صحافت کی تاریخی تعیین دشوار ہے۔ کیونکہ ہم سمجھ نہیں سکتے کہ اس کا آغاز کب سے سمجھا جائے۔ مولانا کی علمی و صحافتی زندگی کے سلسلہ میں رسالہ مخزن، اخبار وکیل اور الندوہ کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی ابتدا لسان الصدق کے اجرا سے ہوتی ہے۔ جسے انھوں نے خود جاری کیا، خود مرتب کیا اور خود ہی بند کر دیا۔ جس کا سبب غالباً یہ تھا کہ جس فضا و ماحول میں رہ کر اسے جاری کیا گیا تھا وہ مولانا کے لئے بہت تنگ تھی اور بہت سی ایسی باتیں جنھیں وہ زیادہ کھل کر کہنا چاہتے تھے نہ کہہ سکتے تھے۔ یہ زمانہ مولانا کی بہت کم سنی کا تھا۔ اتنی کم سنی کا کہ اس عمر میں لوگ اپنی تعلیم بھی ختم نہیں کر چکتے کسی معلمانہ قدم اٹھانے کا کیا ذکر ہے لیکن مولانا کی غیر معمولی ذہانت اور قبل از وقت پختگی ذہن و دماغ نے ان کے مستقبل کو بھی حال میں تبدیل کر دیا تھا اور لوگ اس مستقبل کی درخشانی کو دیکھ کر حیران تھے۔

اس کے بعد جب مولانا شبلی کے اصرار پر الندوہ کی ادارت اپنے ہاتھ میں لی تو فضا دوسری تھی، ماحول کچھ اور تھا۔ معاملہ عوام کا نہیں خواص کا تھا اور خواص بھی جماعت علماء کا، لیکن مولانا نے اپنی انفرادیت کا اعتراف کرائے بغیر ان کو بھی نہ چھوڑا۔

علامہ رشید رضا اڈیٹر المنار ایک عظیم الشان اجتماع میں جو بڑے بڑے علماء پر مشتمل تھا تقریر کرنے جا رہے ہیں اور ضرورت ہے ایک ایسے شخص کی جو عربی و اردو دونوں کا ماہر ہو اور ان کی عربی تقریر برمحل ترجمہ کرتا جائے مولانا شبلی کے منصب سے یہ بات فروتر تھی کہ وہ خود اس خدمت کو انجام دیں اس لئے وہ اس باب میں بہت متفکر تھے۔ آخر "بجز قیس کوئی اور نہ آیا بروئے کار" مولانا ابوالکلام بے تکلفانہ سامنے آجاتے ہیں اور اس خدمت کو اتنی خوبی و دل کشی سے انجام دیتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے وہ ترجمہ نہیں بلکہ خود تقریر کر رہے ہیں۔

یہ تھا مولانا کی ذہانت و قابلیت کا پہلا عملی مظاہرہ جسے کھلے اسٹیج پر سینکڑوں ماہریانِ فضل و کمال نے دیکھا اور اسی وقت سے وہ حاسدانہ ریشہ دوانیاں شروع ہو گئیں جنھوں نے مولانا کو ندوہ و اہلِ ندوہ سے بیزار کر دیا۔ علاوہ اس کے وہ یوں بھی اپنی موجودہ خدمت سے خوش نہ تھے۔ کیوں کہ الندوہ ایک خاص تعلیمی ادارہ کا آرگن تھا۔ مولویوں کا پرچہ تھا۔ جن کی باہمی سازشوں سے وہ تنگ آ چکے تھے اس لئے انھوں نے اس خدمت سے ہاتھ اٹھا لیا۔ تاہم اس دورِ ناخوشگوار میں بھی انھوں نے الندوہ کو جس بلندی تک پہنچا دیا وہ الندوہ کا دورِ زرّیں کہا جاتا ہے۔

یہی وہ زمانہ تھا جب مولانا کی خطیبانہ شہرت بھی ملک میں عام ہوتی جا رہی تھی اور ان کے اندر زیادہ آزادی، زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ کام کرنے کا ولولہ تیزی سے ابھر رہا تھا۔ چناں چہ آپ کلکتہ واپس گئے اور وہاں سے الہلال جاری کیا جس کی خصوصیات سے آج ہر شخص واقف ہے۔

الہلال کے اجراء سے قبل مولانا کی صحافت زیادہ تر علم و مذہب تک محدود تھی اور بہت گھٹی گھٹی سی تھی۔ لیکن اس کے بعد جب وہ صحیح طور پر میدانِ صحافت میں آئے تو اس شان سے کہ افقِ صحافت پر ایک نیا آفتاب طلوع ہو رہا تھا اور اک نئی گرمی ہمارے دلوں میں پیدا ہو رہی تھی۔

مولانا کا رجحان سیاست کی طرف کب اور کیوں کر ہوا اس کی صحیح تاریخ متعین کرنا مشکل ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی ابتدا اسی وقت ہوئی جب مصر کے جامعۂ ازہر میں انھیں جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی تحریک آزادی کے لٹریچر کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اس کے بعد جب وہ ہندوستان واپس آئے تو یہ چنگاری اپنے سینہ میں لے کر آئے اور پھر رفتہ رفتہ اس کی حرارت و تیزی بڑھتی گئی اور آخر کار شعلۂ جوالہ بن کر الہلال کی صورت میں ہمارے سامنے آئی۔

جس وقت الہلال جاری ہوا ہے اس وقت ہندوستان ذہنی اضطراب کے بڑے نازک دور سے گزر رہا تھا اور روئے زمین کی دوسری قوموں میں بھی سخت انتشار پیدا تھا۔ ملوکیت کہیں دم توڑ چکی تھی اور کہیں سنبھالا لے رہی تھی۔ استعماریت و استعماریت اپنے بقا و تحفظ کے لئے ناخن و چنگال کی پوری قوت صرف کر رہی تھی۔ ڈیماکریسی کی مدعی حکومتوں کے چہرے بے نقاب ہوتے جا رہے تھے اور قومی آزادی و خود داری کا احساس بڑے آزمائشی دور سے گزر رہا تھا۔ برطانوی مستعمرات کا طنطنہ ختم تو نہ ہوا تھا۔ لیکن اس سورج کو گہن لگنا ضرور شروع ہو گیا تھا اور وہ اپنے بقا و تحفظ کے لئے آستینیں چڑھائے ہوئے ہر انسانیت شکن اقدام پر آمادہ تھا۔ ہندوستان میں کانگریس آزادی کا بیج بو چکی تھی۔ اس کے کلّے پھوٹ چکے تھے۔ لیکن انگریز یہ طے کر چکا تھا کہ وہ اس پودے کو کبھی بار آور نہ ہونے دے گا اور جماعتی تفریق پیدا کر کے ملک کی ذہنیت کو دو متضاد حصّوں میں تقسیم کر دینا چاہتا تھا۔ مسلم لیگ وجود میں آ چکی تھی لیکن مسلمانوں کی ذہنی رفتار ہندوؤں سے مختلف تھی ان کے سامنے ملکی مسائل ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی نگاہیں ترکی، بلقان و طرابلس پر لگی ہوئی تھیں اور سرسیّد کی تعلیمات نے جو وقار انگریزوں کا مسلمان کے دل میں پیدا کر دیا تھا وہ بڑی حد تک اپنی جگہ قائم تھا۔ ہر چند مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت بھی تھی جو انگریزوں سے منحرف ہو چلی تھی لیکن یہ انحراف و اختلاف داخلی نہ تھا، خارجی تھا، فاعلی نہ تھا۔ انفعالی تھا۔ وطن سے اس کا تعلق نہ تھا بلکہ مذہب و مذہبیت سے تھا۔ ملکی سیاست سے نہیں بلکہ ترکی کے انقلاب، بلقان و طرابلس کی تباہیوں اور مذہبی لامرکزیت کے احساس سے تھا۔ اس لئے ٹھیک اسی وقت جب کہ کانگریس اجتماعی تحریکِ آزادی کی بنیادیں استوار کر رہی تھی۔ مسلمان بعض نفوس کو چھوڑ کر سب کے سب بیرونِ ہند کے مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ جن کا تعلق زیادہ پان اسلامزم کی تحریک سے تھا۔

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کے دو قابلِ ذکر اخبار جاری تھے۔ ایک زمیندار، دوسرا مسلم گزٹ، زمیندار کی توجہ تمام تر ترکی پر مرکوز تھی اور اس کا عظیم ترین مقصد شہدائے بلقان کے پسماندگان کے لئے چندہ جمع کرنا تھا۔ اندرونِ ملک کے معاملات اور یہاں کی داخلی سیاست سے اسے بہت کم دلچسپی تھی۔

مسلم گزٹ کے اڈیٹر مولانا وحیدالدین سلیم، مولانا حالی کے عزیزوں میں تھے اور قدرتاً انھیں سرسیّد تحریک سے دلچسپی ہونا چاہیئے تھی لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ وہ علی گڑھ یا مسلم لیگ کا آرگن تھا تاہم اس میں کلام نہیں کہ وہ مسلمانوں کا جماعتی اخبار تھا اور سیاست میں اس کا نقطۂ نظر ملّت پرستی ہو تو ہو لیکن خالص وطن پرستی یقیناً نہ تھا۔ وہ آزادی کا محرک، معاون ضرور تھا

انھیں خطوط پر جو مسلم لیگ کے پیش نظر تھے وہ انگریزوں سے خوش نہیں تھا۔ لیکن اس کی برہمی نہ جارحانہ تھی نہ حریفانہ بلکہ اس کا انداز ایک ایسے دوست کا سا تھا جو روٹھتا ہے صرف منائے جانے کی توقع پر۔

یہ تھا وہ ماحول۔ یہ تھے وہ حالات، یہ تھی مسلمانوں کی عام ذہنیت جب مولانا آزاد نے الہلال جاری کیا اور اس شان کے ساتھ کہ صحافت کا تمام اگلا پچھلا تصور ہمارے ذہن سے محو ہو گیا اور ہم سوچنے لگے کیا یہ آواز ہماری ہی دنیا کے کسی انسان کی ہے۔ کیا یہ زبان ہمارے ہی ابنائے جنس میں سے کسی فرد کی زبان ہے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنی مشہور کتاب "الفتنۃ الکبریٰ" میں صدر اسلام کی حکومت پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ ملوکیت تو یقیناً نہ تھی کیونکہ شخصی استبداد کا اس میں مطلقاً گذر نہ تھا۔ ہم اسے ارستقراطیت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ارستقراطیت یا جماعت اشراف کی کوئی حکومت دنیا میں ایسی نظر نہیں آتی جس نے سماجی مساوات اور عدل و انصاف کی اتنی سخت پابندی کی ہو جتنی اسلامی حکومت کے ابتدائی دور میں کی گئی۔ ہم اسے ڈیماکریسی یا جمہوریت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ خلفاء اسلام کا انتخاب جمہور کی رائے سے نہ ہوتا تھا۔ ہم اسے اشتراکیت یا اشتمالیت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اس نے شخصی و انفرادی رائے کی آزادی کو نہیں چھینا۔ اس لئے ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ابتدائے عہد اسلام کی حکومت خالص عربی اسلامی حکومت تھی جو خود مسلمانوں ہی نے وضع کی اور جس کی نوعیت حکومت کی تمام دوسری حکومتوں سے بالکل علٰحدہ تھی۔

میں جس وقت مولانا ابوالکلام کی صحافت پر غور کرتا ہوں تو میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کرتا ہوں کہ وہ مغربی انداز کی صحافت تو یقیناً نہ تھی کیونکہ اس میں شانِ خطابت قطعاً نہیں ہوتی۔ مشرق میں البتہ بعض عربی رسائل و اخبارات کا لب و لہجہ خطیبانہ ہوتا ہے۔ لیکن ان میں وہ تنوع نہیں پایا جاتا جو الہلال میں نظر آتا ہے۔ خود ہندوستان میں البتہ زمیندار ایک بلند بانگ اخبار تھا۔ لیکن اس میں الہلال کی سی گہرائی، سنجیدگی اور علمی وزن کا فقدان تھا۔ مسلم گزٹ کے لب و لہجہ میں بے شک ایک قطعیت تھی لیکن اس کا خطاب صرف عوام سے تھا عوام ہی کی زبان میں اور کوئی دوسری خصوصیت اس میں نہیں پائی جاتی تھی۔ اس لئے مولانا آزاد کی صحافت کے متعلق بھی ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی زبان میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ ان کی صحافت خود ان کی اپنی صحافت تھی جسے خود انھوں نے ایجاد کیا اور جو انھیں کے ساتھ ختم ہو گئی۔

مولانا نے الہلال بہت سوچ سمجھ کر جاری کیا تھا اور ملک کے حالات کے نہایت غائر مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ وہ یہ فیصلہ تو الہلال کے اجراء سے قبل ہی کر چکے تھے کہ ملک کو آزاد ہونا چاہیئے۔ اور فرنگی تسلّط کو ختم، لیکن اسی کے ساتھ وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہ تھے کہ اس فیصلہ پر عمل کرنا بچوں کا کھیل نہیں اور یہ وہ راہ ہے جس میں "شرطِ اوّل قدم آن ست کہ مجنوں باشی" وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جب تک ملک میں اجتماعی حیثیت سے ایک عام و مشترک جذبۂ وطنیت پیدا کر کے مذہب و ملّت کے اختلاف کو نہ مٹایا جائے حصولِ مقصود ممکن نہیں۔ ملک کی آیندہ سیاست کا جو نقشہ ان کے سامنے تھا اس کا تقاضہ یہ تھا کہ تعمیر سے پہلے عملِ تخریب سے کام لیا جائے۔ کیونکہ مولانا کا نظریہ یہ تھا کہ جب کوئی ڈھانچہ اتنا بگڑ جائے کہ اس کی اصلاح و مرمت ممکن نہ ہو تو ضرورت اس امر کی ہے کہ پہلے اس ڈھانچہ کو توڑا جائے اور پھر از سرِ نو تعمیر کی جائے۔ وہ پرانے مٹے ہوئے نقوش اور کج مج خطوط پر تعمیر کے قائل نہ تھے بلکہ وہ ان کو مٹا کر نئی داغ بیل پر عمارت قایم کرنے کے قائل تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب ذہن انسانی رسوم و روایات سے اس حد تک داغدار ہو جائے کہ اس کی اصلاح ممکن نہ ہو تو بہتر صورت یہی ہے کہ پہلے اس کے پرانے نقوش کو مٹایا جائے اور ذہن و دماغ کو صفحۂ سادہ بنا کر اس پر دوسرے نقوش قایم کئے جائیں۔

یہی وہ اصولِ کار تھا جس کے پیشِ نظر انھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کے ذہن سے سید احمد خانی نقوش مٹانے کی کوشش کی کیونکہ وہ جانتے تھے ہندوستان اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتا جب تک یہاں کی تمام آبادی بلا امتیازِ ملّت و مذہب، بلا امتیازِ نسل و رنگ کسی ایک غرض مشترک پر متحد و متفق نہ ہو جائے اور یہ اشتراکِ ذہن و عمل ممکن نہ تھا جب تک مسلمان ہندوؤں سے کٹ کر اپنے جداگانہ مستقبل کی تعمیر کا خیال ترک نہ کریں اور اس راہ میں سب سے زیادہ پتھر وہی ذہنیت تھی جس نے مسلمانوں کو انگریز کے رحم و کرم پر جینا سکھایا اور جو باوجود تلخ تجربات کے اب تک اپنے جذبات نیاز مندی ہی کو حصولِ مقصود کا صحیح ذریعہ سمجھتے تھے۔

پھر آپ الہلال کے دورِ اوّل کے پرچے اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو معلوم

مولانا نے کس کس پہلو اور کن کن زاویوں سے اس ذہنیت کو توڑنا چاہا اور کس حد تک اس میں کامیاب ہوئے۔ جیسا کہ میں ابھی ظاہر کر چکا ہوں وہ بڑی آپا دھاپی کا زمانہ تھا۔ سخت ذہنی خلفشار کا دور تھا اور مولانا کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ان غیر ملکی مسائل کو نظر انداز کر دیتے جن سے براہ راست یا بالواسطہ مسلمانوں کے اذہان متاثر ہو رہے تھے۔ چناں چہ آپ دیکھیں گے کہ اصل مقصد کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ انھوں نے طرابلس و بلقان کے مسائل پر بھی بحث و گفتگو کی، ترکی کی اندرونی کشاکش، اور اس کے خونچکاں انقلابات پر بھی واضح روشنی ڈالی اور جب مسجد کانپور کا حادثہ پیش آیا تو اس پر بھی اپنے قلم کی پوری قوت صرف کر دی۔ پھر یہ سب کچھ اس لئے نہ تھا کہ وہ مسلمان تھے اور ان مسائل کا تعلق اسلام و اسلامیات سے تھا بلکہ اس سے مقصود صرف ظاہر کرنا تھا کہ جب کسی قوم پر بیرونی قوتیں مسلط ہو جاتی ہیں تو اس قوم کا کیا حشر ہوتا ہے اور اسے کتنے ذہنی و جسمانی دکھ جھیلنا پڑتے ہیں۔

مولانا کے سامنے ہی کانگریس نے اپنا کام شروع کر دیا تھا اور وہ اس کے عزائم و اقدامات سے بے خبر نہ تھے۔ اسی طرح وہ مسلم لیگ اور اس کے نصب العین سے بھی واقف تھے اور چاہتے تھے کہ یہ دونوں ادارے کسی طرح ایک ادارہ میں تبدیل ہو جائیں اور مسلم لیگ بھی کانگریس کے اصول پر اپنا لائحہ عمل مرتب کرے۔ چناں چہ الہلال کا اوّلین حصہ اسی سعی و کوشش کا دور تھا کیونکہ ان کی انتہائی خواہش یہ تھی کہ وہ کانگریس میں تنہا شریک نہ ہوں۔ بلکہ اپنی ساری قوم کو ساتھ لے کر شریک ہوں۔ لیکن وہ اس میں خاطر خواہ کامیاب نہ ہو سکے اور مجبوراً انھیں تنہا کانگریس میں شامل ہونا پڑا۔

مولانا ابنائے ملک اور بالخصوص مسلمانوں کے ذہن تک جن جن راہوں سے پہنچنا چاہتے تھے ان میں سب سے زیادہ واضح اور روشن راہ مذہب تھی۔ چناں چہ آپ الہلال کا فائل اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ دنیاوی سیاست کے سلسلہ میں ذہنی و اخلاقی اصلاح کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس کی تائید انھوں نے قرآنی دلائل پیش نہ کئے ہوں اور مسلمانوں کی ہدایت کے لئے کتاب الٰہی کی محبت سے کام نہ لیا ہو۔

دوسری راہ جو مسلمانوں کے کلچر اور فطری ذوق کے لحاظ سے ان کے لئے قابل قبول ہو سکتی تھی ادب و انشا کی راہ تھی۔ سو اس باب میں بھی یہ خصوصیت کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ اس نے آثار وغیرہ شعر و ادب کا فراہم کر دیا کہ اگر آج تمام مشہور شعرائے فارسی کا کلام دنیا سے محو ہو جائے تو بھی اس کا ایک بڑا ستھرا انتخاب آپ الہلال کی مدد سے پیش کر سکتے ہیں۔

مولانا کی صحافتی عظمت کا تعلق کسی ایک چیز سے نہ تھا بلکہ اس کی تشکیل متعدد عناصر سے ہوئی تھی جن میں ایک بڑا زبردست عنصر ان کی غیر معمولی قوتِ حافظہ تھی۔

غالباً ۱۹۱۵ء کی بات ہے کہ انھوں نے مجھے کلکتہ سے دہلی جاتے ہوئے تار دیا کہ میں ان سے دہلی میں ملوں۔ وہ حاذق الملک حکیم اجمل خاں کے صاحبزادہ جمیل میاں کی تقریبِ شادی میں شرکت کی غرض سے دہلی آ رہے تھے۔ یوں تو باہمی مراسلت اور میری نظموں کے ذریعہ سے جو الہلال میں شائع ہوتی رہتی تھیں میں مولانا سے غیر متعارف نہ تھا لیکن ذاتی ملاقات کا موقع نصیب نہ ہوا تھا۔ میں اس فرصت کو غنیمت سمجھ کر فتح پور سے دہلی پہنچا اور کامل ایک ہفتہ تک ان کی معیت کی سعادت مجھے نصیب ہوئی۔ اس دوران میں ادب مذہب و سیاست سے متعلق کوئی موضوع ایسا نہ تھا جس پر مولانا سے تبادلۂ خیال کا موقع مجھے نہ ملا ہو اور میں ان کی قوتِ حافظہ و استدلال کو دیکھ کر دنگ نہ رہ گیا ہوں۔

ایک بار حکمائے اسلام کے سلسلہ میں ابن طفیل کا ذکر آ گیا تو مولانا نے اس کی مشہور کتاب "حی بن یقظان" کی پوری داستان ایک نشست میں اس طرح سنا دی گویا وہ اس کے حافظ تھے۔ ایک دوسری صحبت میں جو سیاست سے شروع ہوئی اور ادب پر ختم ہوئی اس سے زیادہ دلچسپ تھی۔ انسان کے فطری احساس آزادی اور ضمیر انسانی کی بے اختیار پکار کے سلسلے میں، میں نے کہا کہ اس کے مظاہر انتہائی متضاد ماحول میں کبھی کبھی سامنے آ جاتے ہیں۔ عرفی مدحیہ قصیدہ لکھتا ہے اور جب وہ ذہن انسانی کا تجزیہ قسمیہ اشعار کے ذریعہ سے کرتا ہے تو ایک شعر بے اختیار اس کے قلم سے ایسا بھی نکل جاتا ہے جسے عہدِ حاضر کی اشتراکیت پسندی اور سرمایہ و عمل کے تصادم کی بنیاد کہنا چاہیئے۔ کہتا ہے ؎

بزورِ بازوئے نفعِ کاسیانِ ضعیف
بہ چینِ ابروئے وجہِ خواجگانِ کبار

حیرت ہے کہ مغلیہ دورِ ملوکیت و استبداد میں یہ خیال عرفی کے ذہن میں آئے یہ سنکر مولانا کے چہرہ پر ایک رنگ آ گیا اور وہ اس موضوع پر کچھ کہنے ہی والے تھے کہ ناگہاں ایک صاحب اور آ گئے اور مولانا نے گفتگو کا سیاسی

پہلو بدل کر اسے ادبی رنگ میں تبدیل کر دیا اور فرمایا کہ اس میں شک نہیں عرفی کا یہ قصیدہ اس کا شاہکار ہے اور اس کے تمام تمہیدی اشعار اس طرح سنانا شروع کیے گویا کتاب ان کے سامنے کھلی رکھی تھی۔

مولانا کا حافظہ اس میں شک نہیں عجیب و غریب خداداد ودیعت تھی اور مولانا کی صحافتی و علمی زندگی کی کامیابی بہت کچھ اسی انعام خداوندی کی ممنون تھی۔ اسی کے ساتھ دوسری خصوصیت جس نے الہلال کو معراج کمال تک پہنچایا وہ مولانا کا مخصوص اسلوب تحریر تھا۔ بہت کم ایسا دیکھا گیا ہے کہ ایک شخص تحریر و تقریر دونوں پر یکساں قدرت رکھتا ہو لیکن وہ اس باب میں "ذوالریاستین" ہونے کی حیثیت رکھتے تھے۔

مولانا کے اسلوب تحریر و تقریر کی دو خصوصیتیں ایسی تھیں جو کبھی ان سے منفک نہیں ہوئیں۔ ایک اس کی بلند ادبیت، دوسری اس کی شانِ خطابت کہ جب ہم الہلال کو پڑھتے ہیں تو ایسا محسوس کرتے ہیں کہ کوئی شخص کسی بلند منارہ پر کھڑا ہوا پُر جوش خطبہ دے رہا ہے اور ایک بے پناہ ذخیرہ الفاظ کا اس کے پاس ہے جسے وہ موتیوں کی طرح بکھیرتا جا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں مولانا ایک ایسی عجیب و غریب طرز تحریر کے موجد و مخترع تھے کہ نہ اس سے قبل اس کی کوئی مثال دیکھنے میں آئی اور نہ اس کے بعد کوئی شخص اس کی تقلید کی جرأت کر سکا۔

الہلال کے بعد جب مولانا نے البلاغ جاری کیا تو اس کا نصب العین بھی وہی تھا جو الہلال کا، لیکن طریق ابلاغ کچھ مختلف تھا یعنی وہی تھے لیکن رُخ دوسرا تھا، انداز قد وہی تھا مگر لباس بدلا ہوا تھا۔ الہلال غضبیاتِ عملی کا درس تھا اور البلاغ نفسیات ذہنی کا۔ الہلال حرکت و عمل، جوش و ولولہ کا پیام رساں تھا اور البلاغ فکر و بصیرت اور روحانی عزم و ثبات کا۔ الہلال کا پیام تھا:

"شیر شو، شیرانہ در صحرائے شیراں پائے نہ"

اور البلاغ کا:- "جلوہ بر خود کن و خود را بہ نگاہے دریاب"

الہلال۔ خونِ منصور کی شعلہ آہنگی تھی اور دعوتِ دار و رسن، البلاغ بشارت روحانی تھی اور پیام طاغوتیت شکن۔

الہلال۔ عرفی کی زبان میں نوید سرفروشی تھا کہ

برو پیالۂ خونیں بخور ز قصاباں
مشو گدائے شبانان کہ شیر می دوشند

اور البلاغ۔ بیدل کی زبان میں پیام تھا۔ "خونے بہ جگر جمع کن و برزن آہ" کا

الہلال ایک کھلا ہوا چیلنج تھا۔ ایک بے باکانہ اعلان کہ

نازک دلانِ باغ تو چوں شبنم سحر
بر روئے برگِ گل شکنند آبگینہ ہا

اور البلاغ نہایت بلیغ درس تھا اس حقیقت کا کہ

دلِ گم گشتہ سراغے ز تہِ کیفیتِ شوق
نشۂ بادہ اگر از دست رود شیشہ ما

بات وہی ایک تھی لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ الہلال نے دامنِ کتاں چاک کیا اور البلاغ نے اس چاک سے نظارۂ پرتو ماہ کی دعوت دی۔

الہلال مولانا کی تمام خصوصیات ذہنی کا ایک ایسا رنگین دستہ گل تھا جو بیک وقت اخبار بھی تھا اور قدر اوّل کا میگزین بھی جس میں سیاسی مقالات، علمی و تاریخی مضامین، مذہبی و ادبی مباحث، مطائبات، منظومات الغرض وہ سب کچھ پایا جاتا تھا جس سے ہر ذوق انسانی آسودہ ہو سکتا ہے اور جو اپنے بعد ایسا خلا چھوڑ گیا جس کا پُر ہونا ممکن نہیں اور البلاغ ایک مذہبی تبلیغی آرگن تھا جس کا خطاب زیادہ تر مسلمانوں سے تھا تاکہ ان کے ذہن و دماغ سے رسم و روایات کے نقوش محو کر کے ان کو صحیح تعلیم قرآنی سے آشنا کیا جائے اور وہ سمجھ سکیں کہ اسلام کا حقیقی مقصود انسانیت پرستی سوا کچھ نہیں اور جو ماوراء دیر و حرم "ہر جا کنیم بدل آستاں رسد" کا مبلغ ہے۔

اس طرح ہم مولانا کے زمانِ صحافت کو تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں ایک وہ جو مخزن، اخبار وکیل اور لسان الصدق سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا دور الہلال کا اور تیسرا البلاغ کا۔ دور اوّل خالص علمی تھا۔ دوسرا سیاسی اور تیسرا مذہبی و اصلاحی اور ان تینوں زمانوں میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ ان کی انفرادیت و "انانیت" کا بڑا زبردست مظاہرہ تھا۔ میں نے "انانیت" کا لفظ قصداً استعمال کیا ہے کیونکہ ان تحریروں میں جو خود اعتمادی و کیفیت ایقان پائی جاتی تھی وہ صرف لفظ "انانیت" ہی سے ظاہر ہو سکتی ہے جس میں منطقی چوں و چرا اور استدلالی "این و آں" کی کوئی گنجائش نہیں۔

مولانا کے دینی و علمی مقالات کا فاضلانہ لب و لہجہ، سیاسی مضامین کا مجاہدانہ و قائدانہ انداز، مذہبی افکار کا حکیمانہ اسلوب اور اسی کے ساتھ ان کی خطیبانہ بلند آہنگی، سرعسکرانہ رجز خوانی، مرد مجاہد کا سا اذعان و ایقان، کا ہنوں کا سا وزن و وقار، جس نے ہم کو نیا ولولۂ حیات، نیا جوشِ زندگی بخشا، اب کہاں؟

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

جمیل مظہری

ماتمِ آزاد

آہ اے آزاد، اے بھارت کے لعلِ شب چراغ — آہ اے آزاد اے قومی سیاست کے دماغ
لہلہایا تیرے خونِ دل سے آزادی کا باغ — تجھ کو تربت میں مبارک آج لمحاتِ فراغ

کارواں جائے کدھر اب رہبری کے واسطے
ذہن بھٹکے پھر رہے ہیں روشنی کے واسطے

ہند کی تاریخ کا تو مستقل اک باب تھا — کچھ دنوں تک سب جیسے دیکھا کئے وہ خواب تھا
سینۂ ہندوستاں کا شعلۂ شاداب تھا — زینتِ کرسی و زیبِ منبر و محراب تھا

کیوں نہ تجھ کو اک چمن، اک بزمِ رندانہ کہیں
اک ادارہ اک دبستاں اک کتب خانہ کہیں

تیرا ہر نقشِ ادب اک نقش پائے اعتبار — سرمۂ چشمِ بصیرت تیری خاطر کا غبار
تیرا آہنگِ خطابت جوششِ قلزم در کنار — کچھ سمندر کا جلال اور کچھ پہاڑوں کا وقار

نبضِ ملت میں دہک تیرے لبِ گفتار سے
دھڑکنیں دل کی معین وقت کی رفتار سے

فلسفہ کی روح گھُل کر جانِ میخانہ بنی — شوخیٔ تحریر سے تاریخ افسانہ بنی
خامشی محفل میں کیف و کم کا پیمانہ بنی — سینہ چاکی گیسوئے الہام کا شانہ بنی

ایک بے تابی حرم سے تا بہ بتخانہ ہے آج
سوزِ دل تیرا متاعِ شمع و پروانہ ہے آج

مرحبا اے ساقیٔ کیف و نشاطِ حریت — ذہنِ مستقبل میں تجھ سے انبساطِ حریت
مرحبا اے مجلس آرائے بساطِ حریت — کس قدر باریک و نازک تھی صراطِ حریت

پائے ہمت کو ترے دی اک خلش ہر خار نے
چُن لئے کانٹے بیاباں سے تری رفتار نے

آستانوں سے اُٹھائی تو نے تہذیبِ سجود   سربلندوں کو سکھائی تو نے تعظیمِ حدود
کیوں مؤرخ پہ نہ گم ہوں تیری آیاتِ شہود   تو نے خود مقصد پہ قرباں کر دیا حبِّ نمود

روشنی کیونکر پہنچتی امرِکہ بیں رو‌س میں
شمع تو جلتی رہی تا زندگی فانوس میں

وقت کو تو نے دیا اک شوخ آہنگِ خرام   جوش کو سنجیدگی، جذبات کو اک انتظام
ہند کو روحِ عمل اُردو کو اک زندہ کلام   راکھ کو چنگاریاں شعلے کو اک رقصِ دوام

سوز کو اک نغمگی دی ساز کو نغمہ دیا
اب بھی کیا تاریخ پوچھے گی کہ تو نے کیا دیا

ہوگا جب تیرا کمالِ یا عیانی بے نقاب   کھیت سے تاروں کے جب اُگنے لگیں گے آفتاب
تب وفا اس دل کے زخموں کا لگائے گی حساب   جس کے خونِ تو کا ہر قطرہ تھا تخمِ انقلاب

جس کے چھینٹوں سے ہری کشتِ چمن ہے آج بھی
جس کی سُرخی غازۂ روئے وطن ہے آج بھی

ناخدا کو بھی سُلا سکتے ہیں جھونکے خواب کے   جاگی طوفانوں کی قسمت دن پھرے گرداب کے
دھمکیاں ساحل کو دیں اب حوصلے سیلاب کے   اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر احباب کے

تیرگی سی ہے دماغوں میں مناظر کی طرح
صبح کا چہرہ بھی اترا ہے جواہر کی طرح

پھر بھی تیری روح زندہ ہے کہ پائندہ ہے وفا   سن رہے ہیں موت کا ہم فاتحانہ قہقہا
کیوں نہ اس بے رحم کا ہم بھی اڑائیں مضحکا   نعرۂ "آزاد زندہ باد" سے گونجے فضا

ہے طبیعت پر جو مایوسی کا زنگ اڑنے لگے
سن کے نعرے موت کے چہرے کا رنگ اڑنے لگے

اے جلوسِ آخری تیرا نگاہوں کا سلام   گرم اشکوں کا سلام اور سرد آہوں کا سلام
رہبروں کا، رہروؤں کا، شاہراہوں کا سلام   عالموں کا، شاعروں کا، کج کلاہوں کا سلام

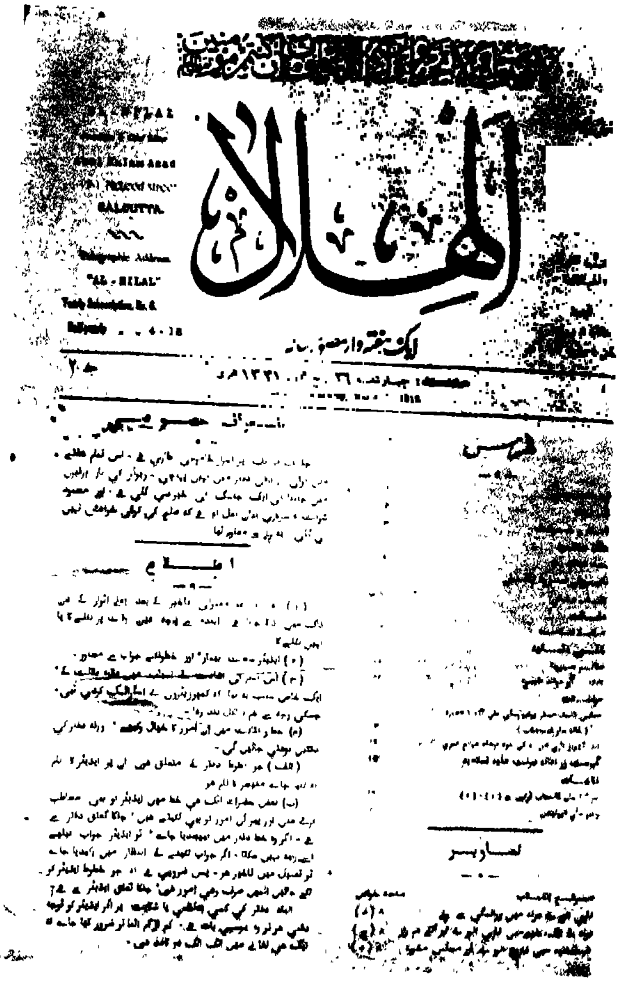
آج وہ دن ہے کہ بھارت کا علم سجدے میں ہے
مظہری سجدے میں ہے اس کا قلم سجدے میں ہے



حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ

(عطیہ محمد اجمل خاں صاحب)

'الہلال' کے پہلے صفحے کا عکس



الہلال

ایک ہفتہ وار مصور رسالہ

CALCUTTA

Telegraphic Address

"AL-HILAL"



مولانا آزاد بہ حیثیت ایڈیٹر 'الہلال' و 'البلاغ'



مولانا آزاد ۱۹۱۲ء میں

محمد اجمل خاں

مولانا آزاد کے نام کچھ خط اور اُن کے جواب

اگست ۱۹۴۲ء میں مولانا آزاد کو پوری ورکنگ کمیٹی کے ساتھ گرفتار کرکے راتوں رات ہندوستان میں کسی جگہ بھیج دیا گیا۔ عام افواہ یہ تھی کہ ہندوستان سے باہر کہیں بھیجے گئے ہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ احمد نگر کا قلعہ ہے۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے "ہندوستان چھوڑ دو" والا رزولیوشن پاس کر دیا تھا۔ کانگرس سے یہ امید نہ رہی تھی کہ وہ برٹش جنگ کو بلا شرط اپنی جنگ سمجھے۔

میں اور بھابی (یعنی مسز ارونا آصف علی) بھی کسی نہ کسی طرح اسٹیشن کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ مولانا نہایت خندہ پیشانی سے اپنے ورکنگ کمیٹی کے ساتھیوں کا استقبال کر رہے تھے۔ اس لئے کہ وہ بحیثیت صدر کانگرس کے سب سے پہلے گرفتار کئے گئے تھے اور چونکہ بھولا بھائی ڈیسائی ورکنگ کمیٹی سے استعفیٰ دے چکے تھے اس لئے وہ گھر ہی بیٹھ رہ گئے۔ مولانا نے فرمایا کہ بھئی یہاں کہیں چائے بھی ملے گی۔ میں نے ہر طرف تلاش کیا، کسی کا پتہ نہ چلا۔ ریفریشمنٹ روم بند تھا۔ اتنے میں ایک پولیس افسر آیا اور اس نے فہرست نکالی جس میں میرا نام نہ تھا۔ لہٰذا گاڑی میں رہنے کی اجازت نہ ملی۔ ارونا جی بھی باہر ہی رہیں۔ کہا گیا کہ ریل میں چائے کا انتظام ہے۔ جب سب آ گئے تو دوبارہ حاضری لی گئی اور ریل خدا جانے کہاں چل دی۔

گوالیہ ٹینک پر والنٹیروں اور والنٹیرنیوں کی پریڈ تھی۔ وہاں مولانا آزاد یا پنڈت جی جھنڈا لہرانے اور آزادی کا رزولوشن سنانے والے تھے۔ ان لوگوں کی گرفتاری کی خبر رضاکاروں کو نہ تھی۔ وہ سب منتظر تھے۔ ہم (ارونا جی اور میں) وہاں پہنچے۔ ارونا جی نے جھنڈا لہرایا۔ پولیس نے جس میں گورے سپاہی زیادہ تھے مداخلت کی۔ میدان کو چاروں طرف سے دخانی توپوں سے گھیر لیا گیا تھا۔ ننھے ننھے رضاکار بچوں، لڑکیوں اور لڑکوں پر یکایک گولہ باری ہونے لگی۔ ہم نے اس تہلکہ کو دیکھ کر جلدی جلدی "جھنڈا اونچا رہے ہمارا" ختم کیا۔ اور معصوموں کو دھوئیں کی دم گھٹا دینے والی اور زہریلی تیزی سے بچانے کی کوشش کی۔ انگریز سپاہیوں نے نہتے راہ گیروں کو پستول کا نشانہ بنانا شروع کیا۔ دھیرو بھائی ڈیسائی اور ان کی دھرم پتنی مع کچھ اور لوگوں کے پہنچ گئیں۔ بیہوش لڑکیوں کو اسپتال بھیجنے کا انتظام ہونے لگا اور لاشوں کے لئے

.....

آج کل دہلی (ابوالکلام نمبر)

احمد نگر فورٹ جیل میں اخبار بھی بند تھے۔ آخر وہ قیدی کیوں اپنی بے بسی کے عالم میں ہندوستانیوں کے قتل و خون کے قصے پڑھیں؟

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

اس پس منظر کے بعد مولانا نے اپنا غم غلط کرنے یا یوں سمجھئے کہ اپنے دل بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ کچھ لکھنے لگے۔ مخاطب نواب صدر یار جنگ مرحوم تھے۔ خطوط سیاسی نہ تھے۔ یعنی نہ اُن میں منطقی خشکی کے ساتھ تاریخی حقائق سے نتیجے نکالے گئے تھے، نہ قربانی کے فلسفے پر لکچر تھے۔ اور اگر یہ ہوتے بھی تو کس کے لئے ہوتے۔ قلعہ سے ایک پرچہ بھی باہر نہ جا

اگست ۱۹۵۸ء

سکتا تھا۔ نہ یہ لوگ اس طرح کہتے تھے کہ خفیہ سوسائٹی کے اصولوں کو مانتے۔ وہ سب ہندوستانی کے بتائے ہوئے اصول کے پابند تھے یعنی مقصد کے ساتھ ساتھ ذرائع مقصد بھی پاکیزہ ومناسب یا جائز ہوں۔ نوجوان طبقہ اس اصول کو مانتا تھا اور کہتا تھا کہ جن اصولوں کو ہمارے بڑے بوڑھے (یعنی ورکنگ کمیٹی کے ممبر) ناجائز سمجھتے ہیں، وہ اگرچہ عام حالات میں ناجائز سمجھے جائیں مگر مقصد کی پاکیزگی انھیں بھی پاکیزہ بنا دیتی ہے۔ مثلاً کسی شخص کا ہاتھ کاٹنا برا سمجھا جاتا ہے، لیکن اگر اس ہاتھ کی بدولت سوسائٹی کا مسلسل نقصان ہوتا ہو تو کیا اس ہاتھ کو کاٹنا نامناسب سمجھا جائے گا یا اگر خود اس شخص کا ہاتھ سڑ رہا ہو تو کیا ڈاکٹر کی رائے نہ مانی جائے گی۔ بہرحال یہ لوگ خفیہ کارگزاری کے خلاف تھے۔ اور کوئی خط اس طرح باہر نہ بھیج سکتے تھے۔

مجبوراً مولانا نے خطوط لکھنے شروع کئے۔ جواہر لال جی نے "ہندوستان کی تلاش" شروع کر دی۔ اور جب میں نے مولانا کے ان خطوط کو شائع کیا تو بہت سے ادب نوازوں نے تو یہاں تک مجھے لکھنا شروع کیا کہ کاش یہ لوگ سیاست میں نہ پڑتے اور عمر بھر قید و بند میں رہتے تاکہ ایسے ایسے تاریخی و ادبی شاہکار تیار ہوتے رہتے۔ دیکھا آپ نے ان خود غرضوں کو! یہ لوگ تو جیل سے باہر رہ کر دادِ عیش دیتے اور لیڈر بیچارے دیوارِ زنداں سے سر پھوڑا کرتے۔ خود ان کی قید ایک پیغام تھی، جس نے پورے ملک کو یہ دعوت دی تھی کہ

آں راز کہ در سینہ نہاں است نہ وعظ است
بر دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

'الہلال' و 'البلاغ' نے مسلسل یہی دعوت دی تھی۔ یہی جیل کا بھی پیغام تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ان لوگوں کی گرفتاری کی صبح کو جو ہفتہ وار 'ہریجن' نکلا تھا وہ پانچ پانچ روپے میں بکا گیا اور پھر ڈھونڈے نہ ملا۔ اس میں پیامِ عمل تھا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہزاروں نوجوانوں نے سینے پر گولیاں کھائیں۔ اور آخرکار حکومتِ برطانیہ مجبور ہوئی کہ اپنا بستر سنبھالے۔ Quit India زندہ باد!

مولانا نے اپنی زندگی میں مختلف حیثیتوں سے ہزاروں خط لکھے اور لکھوائے ہوں گے۔ ان خطوں کی الگ الگ نوعیتیں کی جا سکتی ہیں۔ مولانا شعر نہیں کہہ سکے، لیکن آپ کے ادبی خطوط کی نثر میں جو شعریت پائی جاتی ہے وہ شاعری نہیں تو اور کیا ہے۔ ہاں انھوں نے جو خط بحیثیت ادیب کے نہیں لکھے ان میں ہر صنعت کا خط ظاہر کرتا ہے کہ کاتب مدبر ہے، مبلغ ہے، فقیہ ہے،

دوست ہے، بزرگ ہے، یا کیا ہے!

حسرت موہانی نے اشعار کی کئی قسمیں کی ہیں جس کلام میں آمد ہی آمد ہو وہ عاشقانہ، عارفانہ یا فاسقانہ ہوگا۔ جس میں آورد ہی آورد ہو وہ ماہرانہ، ناقدانہ یا ضاحکانہ ہوگا۔ جس میں آمد و آورد مخلوط ہو وہ شاعرانہ، واعظانہ یا باغیانہ ہو سکتا ہے۔ ضاحکانہ کلام میں اگر ابتذال ہو تو وہ سوقیانہ ہو جائے۔ اور فاسقانہ کلام میں جذبات ہوس کی جگہ مذہب یا حکومت پر حملہ ہو اور سوسائٹی کو انقلاب کی دعوت دی جائے تو وہ باغیانہ ہے۔

اگر ہم نثر مرصع و عاری و عریاں وغیرہ کی صوری صنعت گری سے قطع نظر کر لیں تو معنوی حیثیت سے حسرت کی تبویب نثر پر بھی عائد ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً حاکمانہ (جارحانہ، ظالمانہ یا عادلانہ)، عالمانہ (مؤرخانہ، ناقدانہ، فلسفیانہ)، احمقانہ یا مجنونانہ (مثلاً بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ   کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی)۔ غاویانہ (مجرمانہ لاابالیانہ، الشعراء یتبعہم الغاوون)۔ ناصحانہ (مشفقانہ، دوستانہ) بے بسانہ (فریاد کی کوئی لے نہیں ہے   نالہ پابندِ نے نہیں ہے)۔ اس کی ایک قسم بڑبڑانا بھی ہو سکتی ہے۔ خاموشانہ (یعنی وہ کلام جس کا جواب خاموشی ہو، خاموشی کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ سوال ہی طفلانہ ہو۔ دوسرے یہ کہ جواب کے لئے سائل کی بصیرت وعلم اونچے درجے کی نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ جواب نہ دینے میں کوئی مصلحت ہو۔ چوتھے یہ کہ جواب دینے سے فتنہ بڑھنے کا اندیشہ ہو اسی لئے ایک محاورہ بن گیا ہے کہ گنوار کی گالی ہنس کے ٹالی۔ بہرحال

خموشی معنیٔ دارد کہ در گفتن نمی آید

ذیل میں ہم چند خطوط کے اقتباسات دیتے ہیں جو دوسروں نے مولانا کو لکھے تھے۔ بعض کے جواب مفصل دئے گئے ہیں۔ بعض کے دو حرفی ہیں۔ اور بعض کے متعلق خموشی ہی جواب ہے۔ ان خطوط میں آپ کو "غبارِ خاطر" کے خطوں کا لطف تو شاید نہ آئے، اس لئے کہ وہ ایک خاص صنف کے خط ہیں اور بالارادہ 'غبارِ خاطر' کو ادبیات کے خم میں غرق کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ لیکن علاوہ سیاست کے دوسرے میدان بھی ہیں جن میں مولانا کے فیصلے نہ صرف ناطق ہیں بلکہ محترم ہیں۔ یہ خط انھیں پیش کئے گئے اور پیش کرتے ہی ان کے جواب برجستہ اور بے تکان دئے گئے۔ جواب دینے میں ایک لمحے کا تامل نہیں

ہو۔ ان میں سیاسی خطوط نہیں ہیں اور مشتے نمونہ از خروارے ہیں جنھیں موقع ملنے پر شائع کیا جاسکتا ہے۔

مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط تبرکاً یہاں درج کردیتا ہوں۔ یہ خط مولانا محمد میاں فاروقی (حال ام۔پی) کو لکھا گیا تھا۔ مولانا احمد نگر جیل سے بانکوڑا بھیج دئے گئے تھے اور ۱۵ جون ۱۹۴۵ء کو رہا کردئے گئے تھے۔

رام نواس

بانکوڑا

۱۵۔ جون ۴۵ء

صدیق العزیز جیسا کہ کل شام آپ کو ریڈیو سے معلوم ہوگیا ہوگا۔ آج صبح مجھے رہا کردیا گیا میں آج رات کی ٹرین سے کلکتہ جارہا ہوں۔ میں نے اس وقت ایک تار اکسپرس آپ کے نام اس مضمون کا بھیجا ہے کہ اجمل خاں صاحب بلا تاخیر کلکتہ آجائیں امید ہے کہ وہ تار ملتے ہی روانہ ہوگئے ہونگے۔

کھڑک پور میں آپ کو دیکھ کر طبیعت نہایت خوش ہوئی تھی۔ اس محبت و اخلاص کے لئے شکر گزار ہوں افسوس ہے کہ بہ اطمینان گفتگو کرنے کا موقعہ نہ تھا۔ اس لئے چند منٹوں سے زیادہ ملاقات کا سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہونگے والسلام علیکم ورحمتہ اللہ برکاتہ

ابوالکلام

یہ دو خط جناب اقبال شیدائی صاحب کے ہیں۔ یہ بہت پرانے ہندوستانی نیشنلسٹ ہیں اور آج کل اپنے سوانح حیات لکھ رہے ہیں۔ ان سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ۱۹۱۵ء میں حضرت مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم (۱۸۷۲-۱۹۴۴) کابل میں تھے اور وہاں انھوں نے انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد ڈالی تھی۔ پھر جب وہاں دو انقلابیوں یعنی مولانا برکت اللہ اور راجہ مہندر پرتاپ نے ہندوستانی عارضی حکومت قائم کی تو اس کے وزیر داخلہ تھے۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی مرحوم پرائم منسٹر تھے (جنہوں نے ۱۹۲۷ء میں کیلیفورنیہ میں وفات پائی)۔ مولوی محمد بشیر صاحب امیر مجاہدین سرحد وزیر جنگ تھے۔ ڈاکٹر رحمت علی (جو آج کل لاہور یونیورسٹی میں فرنچ پڑھاتے ہیں) وزیر رسل و رسائل تھے۔ مسٹر پلے وزیر خارجہ تھے (جو برلن میں نازیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے) اور راجہ مہندر پرتاپ (جو آج کل رکن پارلمان ہند ہیں) حکومت کابل آریانہ اور انقلابیان ہند کے ندوح رواں تھے۔ اقبال شیدائی صاحب بھی وزارت جنگ و رسل و رسائل کے نائب وزیر تھے۔ ان کو مولانا ابوالکلام آزاد نے کابل بھیجا تھا۔ اب وہ پاکستانی ہیں اور اتحاد اسلامی کے خواہش مند ہیں:

یہاں علم تبنیم یا تدلش کا خیال آگیا۔ میرے سامنے متعدد "اقبال" اپنی اپنی شان میں نظر آنے لگے۔ مثلاً اقبال احمد خاں سہیل (مرحوم) شاعر ادیب، ڈاکٹر اقبال شاعر۔ ڈاکٹر اقبال (پروفیسر لاہور)۔ پروفیسر اقبال علی شاہ (میرٹھی۔ مصنف) اقبال شیدائی صاحب انقلابی۔ سر اقبال (جج ہائی کورٹ) اقبال سنگھ (کرکٹ)، . . . .

بسمہ اللہ تعالےٰ

۱۲ جون ۴۵ء

سیدی و مولائی۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔

یہ غالباً تیسرا مکتوب ہے جو خدمت عالی میں ارسال کررہا ہوں اس مکتوب کے ساتھ چند صفحات ایک خاص واقعہ کے متعلق جو ایک تاریخی واقعہ ہوچکا ہے ارسال خدمت ہیں۔ دو ایک عربی اخبارات کے کٹنگ بھی بھیج رہا ہوں۔ ممکن ہے باعث دلچسپی ہوں۔ ایک اور صحیفہ بھی ہے جو مولوی فضل الٰہی صاحب مرحوم و مغفور نے ہر ہٹلر مرحوم اور سینیر موسولینی مرحوم کو لکھا تھا۔ اور جس کی کاپی مولوی صاحب مرحوم نے مجھے دی تھی کسی دوسرے وقت میں ارسال کروں گا۔ یہ سب چیزیں تاریخی حیثیت رکھتی ہیں، اور بہت ممکن ہے، ہندوستانی تاریخ نویس اس سے کچھ فائدہ حاصل کرسکیں۔

حضور کے جواب کا ایک مدۃ سے منتظر ہوں۔ تاخیر غالباً گو ناگوں مصروفیات کی وجہ سے ہوگی۔ جواب آنے پر یہاں سے سفر کی تاریخ مقرر کروں گا۔

والسلام

حضور کا خادم

اقبال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

قاہرہ - ۱۴ر اکتوبر ۱۹۵۵ء

حضرۃ مولانا صاحب قبلہ ۔ سلام مسنون - مکرمی محمد اجمل خاں صاحب نے میرے حال سے مکتوب کا جواب دیا - کہ حضور میرے لئے دست بدعا ہیں کہ مجھے سکون و اطمینان حاصل ہو بشکریہ - مسلمان ممالک میں سکون و اطمینان کسی حساس شخص کو حاصل ہونا جوئے شیر کا لانا ہے ، بہرحال مایوسی گناہ ہے -

میں ابھی یہاں کچھ روز اور قیام کروں گا - ارادہ ہے کہ اس ماہ کے آخر میں جدہ چلا جاؤں - وہاں پرانے دوست بھی ہیں - وہ چاہتے ہیں کہ ان کے ساتھ مل کر کچھ تجارتی کام کروں - آخر دن کٹی کرنا ہے - فی الحال مدِ نظر کوئی خاص مقصد نہیں - یعنی سیاسی - خدا کرے کچھ تجارتی کام چل نکلے - دعا فرمائیے گا -

یہاں مسٹر ڈیسائی ہائی کمشنر اتفاق سے مل گئے - ان کے ہاتھ ایک مکتوب خدمت عالی میں بھیج دیا - استاد مرحوم کا مرید ہوں یعنی ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

اجمل خاں صاحب کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں -

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضور کا خادم اور دعا کا طلبگار

اقبال

یہ دو خط ایک ایسے شورش پسند کے ہیں جس کا مقصود حیات ہی حرکت ایجابی ہے - جس نے اپنے قید و بند کے زمانے میں جیلوں تک کو انقلاب پسند نہیں بلکہ انقلابی بنا دیا - وہ ایک کوہ وقار ہے جو بچپن سے آج تک چٹان کی طرح اپنے مسلک پر قائم ہے - شمع حریت کے ان پروانوں کے سوز و گداز کو کوئی کیا جانے : مولانا کے بعد

ہو غم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کریں!

محترم المقام سلام مسنون -

ادارۂ ہفت روزہ "چٹان" نے فیصلہ کیا ہے - کہ ۱۹۵۷ء کے آغاز میں مولانا ابوالکلام آزاد کی جامع صفات شخصیت سے متعلق ایک خاص اور ضخیم نمبر شائع کرے - اصلاً یہ ایک اعتراف ہوگا — ان علمی - ادبی - تفسیری — دینی اور سیاسی خدمات کا جو اس بزرگ ہستی نے پچھلی نصف صدی میں سرانجام دی ہیں -

ہماری کوشش یہ ہوگی کہ ہم اس نمبر کو مولانا کی شان کے شایان اور ان کے مذاق کی نفاست کے مطابق شائع کریں - اس ضمن میں ہم نے ان تمام اہلِ قلم اور اہلِ سیاست سے رجوع کیا ہے - جو مولانا سے قریب رہے - یا آپ کی عظمت کے کسی نہ کسی اعتبار سے معترف ہیں -

نیازکار

شورش کاشمیری

ایڈیٹر "چٹان" لاہور

(آج کل دہلی : ابوالکلام نمبر)

بھائی اجمل

سلام مسنون آج ہی ایک خط حضرت مولانا مدظلہٗ کو بھی لکھا ہے، کبھی تو اُن کی نگہ التفات کو آمادہ کیجئے — ع

ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لئے

اس دفعہ سالنامہ کی ترتیب و تزئین کا اچھا خاصا نقشہ جمایا ہے، دو سو صفحے، کئی تصویریں — سہ رنگی و یک رنگی، پریس اپنا ہے، آپ طباعت دیکھ کر یقیناً خوش ہوں گے — اپنے قلم کو بھی حرکت میں لائیے — مولانا مدظلہٗ کی سیرت کے بعض خاص پہلوؤں پر کچھ لکھئے -

یہ میری دوستانہ استدعا ہی نہیں درد مندانہ خواہش بھی ہے، ایک بات ضرور پیشِ نظر رہے کہ پندرہ دسمبر تک مضمون مل جائیں — آپ کا بھی اور مولانا کا بھی — فرمائیے اُن سے کیسے التماس ہو،

جواب کا منتظر

المخلص

شورش کاشمیری

9-11-55

جواب۔ کبھی موقع ہو تو آپ دہلی آ کر مل لیں۔

ایک ہندو سنیاسی کا خط

۲۴ جولائی ۱۹۵۳ء

مخدوم مکرم جناب پیر مرشد صاحب دام ظلکم

بندہ اک عرصے سے آرزوئے خاص دل میں پوشیدہ رکھتا تھا کہ جناب کی خدمت میں چند حروف ارسال کروں مگر موقع محل و نیز دیگر مجبوریاں تھیں۔ آج خوش قسمتی سے تحریر کرتا ہوں اُمید قوی ہے کہ جواب دے کر بندہ پر بڑی ہی عنایت کریں گے تاہم ڈر بھی ہے کہ ایک ملک کا اتنا بڑا آدمی اک غریب فقیر کو کیوں جواب دینے لگا مگر بلند خیالی و پاک دامنی کا سہرہ لوح دنیا پر ہر سو پھیلا ہوا ہے اس لئے امید ہے۔

آج میں نے ہندی کی سخن و شاعری کی ایک کتاب پر غور کیا جس میں ملک محمد جائسی کے تصانیف اشعار تھے۔ ایک ہندی شاعر نے ان کو "صوفی" لکھا جس کو میں بھی مانتا ہوں اور ہر شخص ماننے کو تیار ہے۔ مگر مذکورہ کتاب کے اندر "صوفی" الفاظ کی تشریح نے مجھے پریشان کر دیا۔ بعض اشخاص نے تو صوفی اس جماعت کا نام لکھا ہے جو سفید اون کے کپڑے پہنتے تھے۔ غرض کتنے ہی الفاظ بے تکے تھے۔ کیا میں امید کروں کہ وقت میا ست سے نکال کر مجھے دو الفاظ میں صوفی الفاظ کے مرادف الفاظ و نیز اس جماعت کی ابتدائے تواریخ پر چند حروف عنایت فرمائیں گے۔

میں ایک ہندو فقیر (سنیاسی) ہوں۔ اور اردو ہندی دونوں سے پریم ہے۔ امید ہے حروف غلط و نیز دیگر غلطی پر غور نہ کریں گے۔ مجھے یہ شعر نامعلوم کیوں پسند ہے۔

ہزاروں بندے تو ہیں خدا کے بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

آپ کا خیر اندیش

سوامی۔ برھم دتہ ہنس

جواب:۔ میرا خیال ہے کہ یہ لفظ یونانی لفظ صوفی یونان سے نکلا ہے جس کے معنی حکمت و عقل ہیں۔ اس سے فیلا سوف بنا ہے۔ قطعی طور پر کہنا مشکل ہے لیکن یہی خیال زیادہ معقول معلوم ہوتا ہے۔

ایک ادبی سوال اور اس کا جواب

رانی کھیت ضلع الموڑہ

۱۰ ستمبر ۱۹۵۲ء

فضیلت مآب قبلہ مولانا صاحب مدظلہٗ

آداب۔ آپ پر بخوبی روشن ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کے لئے شیخ سعدی کی مشہور و مستند تصنیف کریما سے بہتر کتاب آج تک کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی۔ خوش قسمتی سے اس لطیف کتاب کے ہندی ترجمہ کی ایک جلد میرے پاس موجود ہے جو غالباً ساٹھ ستر سال کے ہوئے دہلی میں چھپی تھی۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ محکمۂ تعلیم یا کوئی اور شعبۂ تعلیم اس ترجمہ کو چھپوا کر شیخ سعدی کے پند و نصائح سے اہلِ ہند کو مستفیض کرے۔ شرط طلب یہ ہندی کتاب بسر و چشم ارسال خدمت ہوگی۔

کچھ عرصہ ہوا ایک کتاب میں دیکھا تھا کہ انگریزوں کے عہد میں جب آپ احمد نگر کے قلعہ میں سلطانی مہمان یا خاکم بدہن اسیر تھے تو ایک چڑیا سے جو آپ کے کمرہ میں مخل ہو کر باعث تکلیف ہوتی تھی آپ کو زیر ہونا پڑا کیونکہ اس کو مداخلت سے روکنے کی تمام تدبیریں بے کار ثابت ہوئیں۔ مبادا موجودہ سیاسی جدوجہد میں پھر حالات ماضی رونما ہو جائیں یہ تجویز پیش خدمت ہے کہ آیندہ آپ کے لبتہ وزارت میں ایک ربر کا گیند بھی اضافہ کر دیا جائے۔ جو بوقت ضرورت ایسے مُدخلین بیجا کے تدارک و اندفاع میں تیر و تفنگ تو کیا بمب اور بومرینگ (Boomrang) سے بھی زیادہ موثر ہوگی۔

چونکہ میں مہاجر اور مزدور ہوں اس خدمت کے اجر کا بھی مستحق ہوں اور اجر بھی تجویز کر دیتا ہوں۔ وہو اہذا۔ مجھے دو غزلوں کی نقلیں جن کے ایک ایک مصرع ذیل میں منقول ہیں عنایت فرمائی جائیں۔ ان کے حصول میں میں اب تک ناکام رہا۔

۱۔ بیا در کشتی و چشم نشیں و سیر دریا کن

۲۔ منم آں شمعِ تنہائی کہ در ویرانہ می سوزد

نیز مغلیہ بادشاہوں کے مشہور عالم باغ موسومہ شالامار کے صحیح نام اور وجہ تسمیہ سے بھی مطلع فرمائیں۔ یاد پڑتا ہے کہ وقائع نعمت خاں عالی میں مذکور ہے کہ اس کا اصل نام شعلہ ماہ باغ تھا۔ براہ کرم اس کی تدقیق و

تصدیق فرمائیں۔ اخبار Blitz نے اس سے متعلق ایک غلط بیان شائع کیا ہے اس کی تصحیح اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

دعاگو و محتاجِ دعا

نیازمند آس

سری کرشن داس یاس خراب آبادی

جواب:۔ پہلا مصرعہ آتشی قندھاری کا ہے۔ عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں ذکر کیا ہے اور یہ مطلع لکھا ہے۔

شالامار کے بارے میں کئی رائیں ہیں لیکن صحیح وجہ تسمیہ نہیں بیان کی جا سکتی۔ شالامار باغ دلّی میں بھی تھا اورنگ زیب نے اپنی تخت نشینی کا وہیں سے اعلان کیا تھا۔ لیکن اب اس کا نام نشان باقی نہیں ہے۔

. . . . .

مکرم و محترم چودھری غلام رسول مہر (سابق اڈیٹر انقلاب لاہور) اردو کے بہترین ادیب، فارسی کے رمز شناس، عربی اور انگریزی ادب کے قدردان کا مولانا سے بہت قدیم یارانہ ہے۔ سیاسی زلزلوں نے اس رشتہ کو جنبش نہیں دی بلکہ مزید استواری بخشی۔ لاہور میں ان سے مولانا کی ملاقاتیں بھی مجھے یاد ہیں اور تقسیم ہند کے بعد مہر صاحب کا دلّی میں مولانا کے یہاں فروکش ہونا بھی کل کی بات ہے۔ ان کے خطوں پر جو مولانا کے جواب ہیں وہی باہمی محبت و خلوص کے لئے شاہد عدل ہیں:۔

باسمہ سبحانہ

۲۲۔ مارچ ۱۹۵۸ء

برادرِ محترم۔ میں نے جب آپ کو لکھا تھا کہ جلد آرہا ہوں تو اسی وقت تیاری کر لی تھی لیکن دفعتہً بیمار ہو گیا اور اب تک بیماری سے پیچھا نہیں چھوٹا۔ ذرا طبیعت سنبھلے تو چند روز کے لئے حاضر ہو جاؤں۔ چند ضروری باتیں پیش نظر ہیں، ستمبر میں یورپ جانا چاہتا ہوں۔ اغلب ہے اس سفر میں چار پانچ مہینے لگ جائیں۔

یہاں پنجاب یونیورسٹی ایک دائرۃ المعارف مرتب کر رہی ہے۔ اس کے لئے حضرت مولانا کے متعلق ایک مقالہ میرے ذمے لگا ہے۔ وہ تمام حالات میرے پیش نظر ہیں جو مولانا نے اپنی تصانیف میں ضمناً لکھے یا دوسرے اصحاب نے منتقل کئے ہیں

تصنیف کرتے وقت تحریر کئے۔ بعض امور کے متعلق تعین کے ساتھ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ کیا آپ ازراہِ عنایت میرا یہ عریضہ مولانا کو سنا کر جوابات لکھنے کی زحمت گوارا فرما لیں گے؟ یہ مقالہ چونکہ دائرۃ المعارف میں چھپے گا۔ اس لئے تمام معلومات زیادہ سے زیادہ واضح اور مستند ہونی چاہئیں۔ مثلاً

۱۔ مولانا کا سالِ ولادت ۱۳۰۵ھ ہے۔ لیکن مہینے، تاریخ اور دن کے متعلق کہیں سے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

۲۔ "لسان الصدق" کا پہلا پرچہ ۲۰۔ نومبر ۱۹۰۳ء کو نکلا تھا۔ یہ پرچہ اور متفرق پرچے میرے پاس ہیں۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کب تک جاری رہا؟

۳۔ "الندوہ" کی ایڈیٹری کا زمانہ ۱۹۰۵ء کے اواخر سے ۱۹۰۶ء کے اوائل تک کا معلوم ہوتا ہے۔ کیا اس تعلق کی قطعی تاریخیں معلوم ہو سکتی ہیں؟

۴۔ مولانا "وکیل" میں کب سے کب تک رہے

۵۔ مولانا کی تحریروں سے مترشح ہوتا ہے کہ عراق کا سفر ۱۹۰۸ء میں ہوا تھا۔ کیا اس کی صحیح تاریخ اور مدت کا علم ہو سکتا ہے؟ مولانا کے بھائی کا انتقال کس مقام پر ہوا تھا؟

۶۔ مختلف لوگوں نے لکھا ہے کہ مولانا بسلسلۂ تعلیم مصر بھی گئے تھے۔ یہ سفر کس زمانے میں ہوا تھا؟

۷۔ مولانا کے والد ماجد ۱۸۵۷ء میں حجاز گئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر کیا تھی۔

۸۔ میرا خیال ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً ہندوستان آتے رہے، اس لئے کہ بمبئی، بنگال، برما وغیرہ میں ان کے بے شمار مرید تھے۔ مستقل اقامت کی نیت سے ۱۸۹۰ء میں آئے۔ کیا یہ درست ہے؟

۹۔ مولانا کے والدین کی تاریخ ہائے وفات؟ میں نے ۱۹۲۷ء میں ان کی قبروں کی زیارت کی تھی اور تاریخیں لکھ لی تھیں، لیکن اب وہ تحریر کہیں کاغذوں میں گم ہو گئی ہے اور نہیں ملتی

۱۰۔ رانچی میں مدتِ قیام کو "نظربندی" سے تعبیر کرنا درست ہوگا یا "اسیری" سے۔ مولانا نے "غبارِ خاطر" میں اس مدت کو "اسیری" میں محسوب کیا ہے۔

میں نے بڑی ہمت کر کے یہ سطریں لکھی ہیں لطفاً یہ بھی لکھئے کہ مولانا کی صحت اب کیسی ہے۔ مجھے ہر حال میں جلد آنا ہے۔ صرف اس انتظار میں ہوں کہ ذرا طبیعت

سنبھل جائے تاکہ سفر کے قابل ہو جاؤں۔

امید ہے آپ بہ خیر ہوں۔ سید صاحب کی سیرت کی جلد اول کے پروف بھی دیکھے گئے۔ دوسری جلد کے پروفوں کا انتظار ہے۔ کتاب انشاء اللہ جلد چھپ جائے گی۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

نیاز مند

مہر

جواب ۔ بہتر یہ ہے کہ آپ دو تین دن کے لئے یہاں آئیں تو ان سوالوں کے زبانی جوابات مل جائیں۔

باسمہٖ سبحانہٗ

۲۔ مئی ۱۹۵۴ء

حضرت مولانا۔ میں کل ایک مفصل عریضہ خان صاحب کی وساطت سے خدمتِ گرامی میں بھیج چکا ہوں۔ آج دوپہر کو لیٹا تو معمول کے مطابق سب سے پہلے آپ ہی کی یاد تازہ ہوئی۔ میں یہ عرض کرنا بھول گیا کہ عرفی کا ایک شعر آپ نے "غبارِ خاطر" میں کس قدر بدل کر چھاپا ہے اور بدلا ہوا ٹکڑا اصل سے بہتر نہیں۔ غور و فکر کے باوجود معلوم نہ ہو سکا کہ اس میں مصلحت کیا تھی۔

شعر یوں ہے:۔

من از یں دردِ گراں مایہ چہ لذّت یابم
کہ بہ اندازۂ آں صبر و ثباتم دادند

لیکن غبارِ خاطر میں "دردِ گراں مایہ" کی جگہ "رنجِ گراں بار" چھپا ہے

یہ بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ نے شرف جہاں قزوینی کے دیوان پر کس حد سے تبصرہ لکھا تھا؟ آیا اس کا دیوان بہت اچھا ہے؟ آیا اس تبصرہ کا کوئی ٹکڑا آپ کے مسودات میں موجود ہے؟ لیکن اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ دہلی دوبارہ آؤں تو پوچھوں۔

والسلام علیکم

نیاز مند

مہر

جواب ۔ ہو سکتا ہے کہ میرے حافظے میں وہی الفاظ ہوں جو میں نے لکھ دیئے۔ اگر آپ نے دیوانِ عرفی دیکھا ہے تو وہی الفاظ ٹھیک ہیں۔

شرف جہاں قزوینی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے فارسی شاعری میں وقوعہ گوئی کے طرز کی بنیاد ڈالی، وقوعہ گوئی اس معاملے میں بولا جاتا ہے جس معنی میں اردو میں معاملہ بندی کہتے ہیں۔ اس کے مسودات ضائع ہو گئے، موجود نہیں ہیں۔

خان بہادر ظفر حسین خاں کی معرکۃ الآرا کتاب 'لوازمِ فلسفہ' چھپ گئی ہے مولانا نے باوجود اپنی گوناگوں مصروفیات کے جو کچھ فرمایا ہے وہ کتنا دقیع ہے!

"لوازمِ فلسفہ میں آپ نے بعض مصطلحات ایسی استعمال کی ہیں جو غور طلب ہیں۔ آپ نے Resultant کے لئے معلولات استعمال کیا ہے۔ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ Resultant ریاضی کی مشہور اصطلاح ہے جس کے لئے صحیح عربی لفظ حاصلات ہے۔ Emergent کے لئے آپ نے خارجات کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حالانکہ خروج اس کے مفہوم کو ادا نہیں کرتا میں نے الہلال کے زمانے میں اس کے لئے ظہور رفعی کا لفظ استعمال کیا تھا لیکن پھر میں نے اس کے لئے زیادہ موزوں عربی فلتات پایا جو فلتہ کی جمع ہے۔

Atom کے لئے آپ نے ذرہ استعمال کیا ہے۔ ٹھیک ہے۔ لیکن عربی کی پرانی اصطلاح جوہر فرد ہے۔

آپ نے Dilectic کے لئے مکالمیات و جدلیات دو لفظ لکھے ہیں۔ کلامیات اس کے لئے درست نہیں ہوگا۔

Experimentalism کے لئے آپ نے اختیاریت استعمال کیا ہے۔ جو بھی لفظ استعمال کیا جائے اس میں تجربہ کا مفہوم آنا چاہیئے

آپ نے Mass اور Quantity کو مرادف قرار دیا ہے اور دونوں کے لئے کمیت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حالاں کہ ماس کے لئے صحیح لفظ جِرم ہے نہ کہ کمیت۔ 'الہلال' کے مضامین میں میں نے ماس کے لئے جرم ہی استعمال کیا ہے۔

آپ نے Platonic Ideas کے لئے افلاطونی اعیان کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ عباسی مترجموں نے اس کے لئے مثال کی اصطلاح استعمال کی تھی اور وہی صحیح ہے۔ اعیان کا عربی فلسفہ اور تصوف میں دوسرا مفہوم ہے۔

Response کے لئے آپ نے جوابی حرکت اور ردّ عمل دو لفظ لئے ہیں۔ ردّ عمل Reaction ہے Response کے لئے صرف جواب صحیح اصطلاح ہوگی۔

Self کے لئے آپ نے ذات اور نفس دو لفظ لکھے ہیں۔ صرف ذات استعمال کیجئے۔ نفس صحیح نہیں ہوگا۔ اگر Self کے لئے نفس استعمال کریں گے تو Nous کے لئے کیا باقی رہے گا۔ عربی فلسفے میں Noetic کے لئے نفسِ ناطقہ استعمال کیا گیا ہے

Velocity کے لئے آپ نے حرکت کا لفظ دیا ہے۔ پھر آپ Movement کو کیا کہیں گے۔

Proton کے لئے آپ نے برق مثبت کی اکائی لکھا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ اس قسم کے تمام انگریزی مصطلحات جو ہمارے لئے سہل الفاظ ہوں بجنسہٖ اختیار کر لینے چاہئیں۔ اردو میں Electron اور پروٹون ہم کہہ سکتے ہیں

Pluralism کے لئے آپ نے کثرتیت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہوگا۔ اسے مذہب کثرت کر دیجئے۔

. . . . .

شری دیانند شرما کا سوال اور اس کا جواب

دہلی ۱۷۔اکتوبر ۱۹۵۱ء

محترم مولانا صاحب

معاصر امروز لاہور نے آپ کا مضمون "اسوۂ حسینؑ" ماخوذ از "داستانِ کربلا" بشکریہ نفیس اکیڈیمی اپنے مورخہ ۱۴۔اکتوبر کے شمارے میں شائع کیا ہے۔ ایڈیٹر لکھتا ہے کہ ہم مولانائے موصوف سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا وہ اس موقع پر مسلمانانِ کشمیر کو بھی یہی مشورہ دیں گے کہ وہ "سرفروشانہ و جابرانہ حکومت کا علانیہ مقابلہ کریں اور کسی ایسی حکومت سے اطاعت و فرمانبرداری کی بیعت نہ کریں جو خدا کی بخشی ہوئی انسانی حریت اور حقوق کی غارت گر ہو۔"

قطع نظر اس کے کہ معاصر ایسا کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہے۔ میں ایک بات آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اسلام میں بنیادی حقوق کا نظریہ کیا ہے۔ کیا یہ خدا کی بخشش ہیں جیسا کہ آپ کے مضمون میں درج ہے یا انسانی دماغ کی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ اس معاملے میں اگر آپ مجھے راہ دکھا سکیں تو آپ کا بہت شکرگزار ہوں گا۔

خادم

دیانند شرما

جواب: ۔جو چیز قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مساوات پر یعنی انسانی برادری اور بھائی چارہ" پر عام طور سے اس میں زور دیا گیا ہے تو اس خیال کی مخالفت کی گئی ہے کہ معاشرت یا نسل کی بنا پر انسان کا کوئی گروہ دوسرے گروہ سے افضل ہوسکتا ہے۔

مساواتِ انسانی کا یہ تصور فطری ہے اور خدا کی بخشش ہے۔ رہ گئی اس کے حصول کی کوشش یا عدم سعی۔ یہ انسانی دماغ پر منحصر ہے۔ فطرتِ صحیح اُسے راستہ دکھا چکی ہے اس پر چلنا نہ چلنا اس کے اختیار میں ہے۔

آج کل دہلی (ابوالکلام نمبر)

مکتوب ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب ڈائرکٹر دائرۃ المعارف العثمانیہ۔حیدرآباد

۲۳۔اگست ۱۹۵۶ء

مخلص و محترمی

تسلیم۔آپ کے الطاف نامہ مورخہ ۱۴۔اگست کا بے حد مشکور ہوں۔

حضرت مولانا کی خدمت میں تمام علمی دنیا اور خصوصاً دائرۃ المعارف کی جانب سے ہدیۂ تشکر پیش فرمائیے اور عرض کیجئے کہ آپ کے عہد اور آپ کی سرپرستی میں جو کام ہو رہے ہیں وہ ابدالآباد تک زندہ رہیں گے۔ خدا تعالیٰ آپ کو ان کا اجر دے گا اور یہ کارنامہ تاریخ ثقافت عالم میں زریں حروف سے لکھا جائے گا۔ دائرۃ المعارف کی سرپرستی درحقیقت ہمارے مشاہیر کی بھی قدردانی ہے۔ کتاب الہند جس کا ملنا مشکل تھا وہ بھی حضرت مولانا کے فیض سے عالم تحقیقات کو مکرر دستیاب ہوجائے گی اور ہندوستان اور بیرونی کا نام پھر روشن ہو جائے گا۔ پہلے پروف مکرر ملفوف ہیں۔

میری شخصی استدعا مورخہ ۴۔جون ۱۹۵۶ء کے متعلق کیا کارروائی عمل میں لائی گئی کچھ پتہ نہیں چلا۔ دو حرفی جواب سے سرفراز فرمائیے کیونکہ یہاں حالات بہت جلد تبدیل ہو رہے ہیں۔

منتظر کرم

محمد نظام الدین

جواب: ۔کتاب الہند کی طباعت و اشاعت یقیناً ایک علمی و ثقافتی کارنامہ ہے دائرۃ المعارف کی شہرت ہندوستان کی شہرت ہے۔ حیدرآباد کے پولیس ایکشن کے زمانے میں متعدد استفسارات بیرونِ ہند سے اس ادارہ کی سلامتی کے متعلق وصول ہوئے تھے۔ آپ کے ذاتی مسئلہ پر غور ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر نور حسین صاحب کا سیالکوٹ (پاکستان) سے مکتوب

سیالکوٹ - ۴ ستمبر ۱۹۵۰ء

مکرمی و محترمی جناب مولانا! السلام علیکم و رحمۃ اللہ

ایک مدت سے ارادہ کر رہا تھا کہ آپ کی خدمت میں عریضہ لکھوں - چند ایک مسائل ہیں جو میرے لئے ایک مدت سے اُلجھن بنے ہوئے ہیں - آج میں آپ ہی کی خدمت میں ان کے حل کرنے کے لئے رجوع کر رہا ہوں کیونکہ میری دانست میں ان مسائل کی دشواریوں کو طے کرنے کی اہلیت سرزمینِ پاکستان و ہند میں آپ کی ذات کے بغیر اور کوئی نہیں رکھتا - لہٰذا آپ ہی کو تکلیف دے رہا ہوں میں جانتا ہوں کہ آپ کی مصروفیتیں بے حد ہیں - لیکن اسے کیا کیا جائے کہ اور کوئی راستہ بھی دکھائی نہیں دیتا -

اسلام کی ہمہ گیر سادگی اور یہ کہ یہ فطرت کا مذہب ہے - مسئلۂ توحید اور اس کے بعد محض عمل صالح پر زور - یہ سب کچھ نہایت عمدہ اور قابلِ قبول - لیکن اس کا کیا جواب کہ تاریخ کے اعتبار سے (قرونِ اولےٰ کے شاندار زمانہ سے قطع نظر) سوائے مایوسی کے اور کچھ نہیں - کم از کم بارھویں صدی عیسوی یا خلافتِ عباسیہ کے خاتمہ کے بعد اسلام کی تمام ترقی کا دارو مدار ایسا مسدود ہوا کہ پھر نہ کھلا - اور آج تک پیروانِ اسلام ذلت و ادبار میں مبتلا ہیں - میں اس حقیقت سے پوری طرح آشنا ہوں کہ اسلام اور پیروانِ اسلام دو مختلف چیزیں ہیں - اور دونوں کو خلط نہیں کیا جا سکتا - لیکن اس کے باوجود میرے لئے یہ چیز معمہ بن چکی ہے کہ اتنی اچھی تعلیم کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کی حالت ہر لحاظ سے اس قدر پست ہے اور کیوں - تہذیب و تمدن، اقتصادی مرفع الحالی، خدمتِ علم و سائنس، وراثت فی الارض، انسانیت اور اس کے جملہ خصائص انفرادی اور اجتماعی، ان سب چیزوں میں مسلمان سب قوموں سے پیچھے ہیں اور پھر بظاہر کوئی صورت اصلاحِ حال کی دکھائی نہیں دیتی - مغربی ممالک کی نظروں میں مسلمان محض ایک مذاق بن کے رہ گئے ہیں - اس کے برخلاف دوسری اقوام کو دیکھا جائے تو وہ ہر چیز میں ہم سے پیش پیش ہیں - خدمتِ خلق، راستبازی، بلند اخلاق ان چیزوں کا عیسائی اقوام کے اندر اس قدر دور دورہ ہے کہ حیرانی ہوتی ہے - علم و فن کے ہر گوشے میں وہ ہم سے پیش پیش ہیں -

اس سلسلے میں ایک چیز نے بظاہر میری رہنمائی ضرور کی ہے اور وہ یہ کہ جس جس تہذیبوں نے اس دنیا میں آج تک سر اُٹھایا مثلاً بابل و کلدانیوں کی تہذیب ہندوستان میں آریاؤں کی تہذیب، مصریوں کا عروج و ترقی، یونانی اور رومن تہذیبیں - یہ سب اپنے اپنے زمانے میں انتہائی عروج پر پہنچیں اور پھر ان کا زوال ایسا آیا کہ پھر نہ اُبھریں - تو کیا فطرت کا یہ اٹل قانون تو نہیں کہ جو قوم یا تہذیب ایک انتہائی بلندی پر پہنچ جائے اس کی پستی لازمی اور یقینی ہے - اور پھر وہ نہیں اُبھرتی بجنسہٖ یہی اسلام کے ساتھ تو ایسا نہیں ہوا - ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا کے ماتحت تو ایسا نہیں ہو رہا لیکن قرآن حکیم میں بھی تو لکھا ہے کہ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ - تو اس کے ماتحت اس دین کو سب پر غالب آنا چاہیئے - لیکن ایسا نہیں ہو رہا -

اگر بہ نظرِ غور دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ جو ذلیل اور پست حرکتیں ہیں - وہ مسلمانوں کے اندر بدرجہ اتم موجود ہیں - حالی مرحوم جس قدر بُرائیاں گن گئے تھے ان سے کئی گنا زیادہ اب موجود ہیں - آج کے مقابلہ میں شاید وہ دور بہتر تھا - شرافت، دیانت، تحمل، وسعت قلبی، ایثار، رحم، سچائی، عدل و انصاف، ان سب خصائص سے ہمیں دُور کا بھی تعلق نہیں - نفرت، خود غرضی، ظلم، بددیانتی، تنگ نظری یہ سب ہمارا شیوہ بن چکی ہیں تو خدارا بتلائیے کہ ایسا کیوں ہے اور کیا کوئی اصلاحِ حال کی امید ہے -

جو میرے ظنون و شبہات ہیں وہ یہ ہیں کہ قرآن و سنت کے صحیح اور سیدھے راستے کی موجودگی میں مسلمانوں کی تمام عالمِ اسلام میں یہ حالت کیوں ہے - مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک کی حالت شاید ہم سے بھی زیادہ زبوں ہے تو آخر ایسا کیوں ہے کیا نعوذ باللہ اسلامی تعلیم میں وہ دلکشی ختم ہو گئی اور محمد علی باب کے مطابق کہ ہر مذہب ایک ہزار سال کے بعد اپنی اصلی ماہیت کھو بیٹھتا ہے یہی اطلاق ہمارے اوپر تو نہیں - حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کا ذکر آپ نے تذکرہ میں جو کیا ہے وہ تو مایوس کن نہیں - لیکن آخر امید کی کرن کب روشن ہوگی - ان امور کا جواب دیجئے اور ضرور وقت نکالیے - میں پُرانا نیازمند ہوں اور تسکینِ قلب کی تلاش میں ہوں -

آپ کا ادنےٰ نیازمند

نور حسین

جواب: - اسلام دینِ فطرت ہے یا نہیں اس کا فیصلہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے کہ خود اسلام کی تعلیم کو پرکھا جائے - باقی رہی یہ بات کہ لوگوں میں بے عملی کیوں ہے اس کی ذمہ داری اسلام کی تعلیم پر نہیں ہو سکتی

لوگوں کی بدعملی پر ہے۔ اس تیرہ سو برس کے اندر اس تعلیم کے جو کامیاب نتائج نکلے وہ بھی ہمارے سامنے ہیں اور اب لوگوں کے بدعملی کے نتائج بھی ہم دیکھ رہے ہیں۔

غلامی کے متعلق ایک استفسار

رانچی چرچ روڈ
۴۔ اگست

ذوالمجد والکرم حضرۃ مولانا محترم! ادام اللہ بقائک۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ! ایک مسئلہ کی تحقیق کے لئے بصورت تحریر حاضر خدمت ہوا ہوں۔

آپ نے اپنے ترجمان القرآن میں "ما ملکت ایمانکم" کے لئے نکاح ضروری قرار دیا ہے اور بغیر نکاح وطی ناجائز ہے اور اس کی وضاحت آپ نے دوسرے حصہ سورۂ مومنون کے نوٹ کے اندر کی ہے کہ "قرآن کے نزدیک اتحادِ تناسلی کا جائز طریقہ صرف ایک ہی ہے اور وہ ازدواج کا طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے گا ناجائز ہوگا خواہ کسی شکل اور کسی نوعیت کا ہو۔" حالانکہ آیاتِ قرآنیہ سے اس کا صاف طور سے ثبوت نہیں ملتا ہے۔ ہاں، اس کا ثبوت ملتا ہے کہ جبکہ وہ لونڈی کسی دوسرے کے مِلک میں ہو تو مالک سے اجازت لے کر اس کا نکاح کیا جائے گا جیسا کہ آیت شاہد ہے 'فانکحوھن باذن اھلھن' اور دوسری آیت 'وانکحوا الایامیٰ منکم والصالحین من عبادکم وامائکم' سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ جبکہ کسی کے پاس کوئی لونڈی ہو اور اس سے فائدہ نہ اٹھا رہا ہو تو دوسرے سے اس کا نکاح کر دے۔

اور سورۂ مومنون میں "الا علیٰ ازواجھم او ما ملکت ایمانھم" سے تو صاف طور سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ بغیر نکاح لونڈی سے وطی کرنا جائز ہے کیونکہ یہ آیت ازواج اور ما ملکت ایمانھم کے حق وطی میں ظاہر ہے اس لئے کہ عقدِ مناکحت کے بعد ملکِ یمین بھی ازواج میں داخل ہے تو پھر دوبارہ ملکِ یمین کا تذکرہ کیوں ہوا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آزاد حرہ بیوی اور لونڈی سے وطی جائز ہے۔ اس آیت کے علاوہ فتاویٰ عالمگیری وعزیزی و قاضیخان وغیرہ سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ ملک یمین سے بدون نکاح وطی جائز ہے اور اس دورِ حاضرہ میں حجاز کے بادشاہ سلطان ابنِ سعود کا بھی اسی پر عمل ہے اور ہمارے شہر کے علماء بھی قرآن و حدیث اور دلائل عقلیہ کی روشنی میں اسی کو ثابت کرتے ہیں کہ شرعی لونڈی سے بغیر نکاح وطی جائز ہے۔ اب میں حیران ہوں کہ صحیح مسئلہ کس کو سمجھوں۔ مہربانی فرما کر اس مسئلہ کی وضاحت قرآن، حدیث و واقعات کی روشنی میں فرما دیجئے تاکہ پیدا شدہ شکوک و شبہات رفع ہو جائیں۔

آج کل دہلی (ابوالکلام نمبر)

راقم نیازمند
محمد نعیم

جواب۔ مختلف موقعوں پر مختلف نوعیت کی تصریحات ہیں۔ لڑائی کے قیدیوں کی نسبت عام رواج یہ تھا کہ وہ لونڈی غلام بنا لئے جاتے تھے۔ اسلام نے ابتدا میں رحم و شفقت کے احکام دے کر اس رسم کے تشدد کو کم کیا اور پھر سورۂ محمد کی آیت "فاما منًا بعد و اما فداءً" نازل کر کے اس رسم کو بھی بند کر دیا۔ البتہ اس سے پہلے جو لونڈیاں لوگوں کے تصرف میں آ چکی تھیں ان کے تعلق کو باطل نہیں کیا۔ سورۂ مومنون میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

سرمد شہید کے متعلق استفسار

۷۸۶

لاہور

گرامی قدر جناب!

السلام علیکم۔ قافلے چلتے رہیں گے اور انسانی فکر میں بھی ترقی رونما ہوتی رہے گی اور چند ایسے انسان بھی قرطاسِ عالم پر اُبھریں گے جو اوراقِ پارینہ سے زندگی حاصل کریں۔ مجھے بھی انہیں میں سے ایک فرض کر لیجئے۔

سرمد کی ذات، صفات اور ارشادات پر کچھ تحقیق کر رہا ہوں۔ آپ کی کتاب "خونِ شہادت کے قطرے" نظر سے گزری تو دل نے کہا کہ آپ اس سلسلے میں میری معاونت کر سکیں گے۔ براہِ کرم مجھے وہ کتب اور رسایل تجویز فرمایئے جن کا مطالعہ مجھے منزلِ مطلوبہ تک لے جائے۔

آپ کی عدیم الفرصتی کے باوجود جواب ملنے کا یقین رکھتا ہوں۔ فقط

آپ کا خیراندیش
کرم الٰہی بدر

جواب۔ فارسی شعراء کے جو تذکرے ہیں اکثر میں مختلف حال موجود ہے۔ ہندوستان کے تذکروں میں مراۃ الخیال میں کسی قدر تفصیل ملتی ہے۔ دبستانِ مذاہب میں بعض تفصیلات ملیں گی۔ نیز کتاب پیدائش کا فارسی ترجمہ بھی سرمد کی نگرانی میں ہوا۔

خواجہ غلام السیدین

مولانا ابوالکلام آزاد

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
ملک میں اک چراغ تھا نہ رہا

مولانا آزاد کا ذکر کن لفظوں میں کروں اور جذبات کی یورش کو کس طرح دماغ کا تابع بناؤں؟ ان کی عظمت کا صحیح اندازہ تو اس وقت ہوگا جب وقت تاریخ کی سخت گیر کسوٹی پر ان کے ہم عصر مثالی شخصیت اور ان کے کارناموں کو پرکھے گا۔ ہم لوگ جو ہمالہ کے دامن میں اپنی زندگی گزارتے رہے ہیں کیا اندازہ کر سکتے ہیں اس کی پابندی کا، اس کی برف پوش چوٹیوں کا جن پر سکون کی ایک ابدی کیفیت چھائی معلوم ہوتی ہے، اس کے دل کی شورشوں کا جس میں لاوا کھولتا رہتا ہے، ان طوفانوں کی یورش اور بجلیوں کی تڑپ کا جو اس کی آغوش میں پلتی ہیں یا جواہرات کے ان خزانوں کا جو اس کے سینے میں پوشیدہ ہیں؟ اس مختصر مضمون میں تو بس اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ ان کی عصر آفریں شخصیت کے چند نمایاں پہلوؤں کی طرف اشارہ کر دوں۔

ہر بڑی تہذیب صدیوں وقت کی گود میں پل کر اپنے کمال کو پہنچتی ہے اور اپنی خاص قدریں، خاص اصول، نیک و بد کے خاص سانچے ڈھالتی ہے۔ ہندوستان کی تہذیب بہت سی مختلف تہذیبوں کا سنگم ہے جس کے بنانے میں مختلف قوموں، نسلوں، زبانوں اور مذہبوں نے حصہ لیا ہے۔ اور اس کا اٹوٹ سلسلہ ہزاروں برس سے قائم ہے۔ قدرت کی فیاضی سے تاریخ میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک تہذیب کی تمام یا بہت سی اچھی قدریں کسی غیر معمولی شخصیت میں اپنا نشیمن تلاش کر لیتی ہیں جیسے اٹلی میں لیونارڈو ڈی ونچی، جرمنی میں گوئٹے، امریکہ میں ابراہیم لنکن، ہندوستان میں ٹیگور، گاندھی اور مولانا آزاد۔ اس ہندو مسلم تہذیب کا ایک شاہکار تھے جو گذشتہ ہزار برس میں پروان چڑھی ہے۔ انھوں نے مشرقی تہذیب، ادب اور علوم و فنون کے ماحول میں ابتدائی تربیت پائی، مذہب کو اپنی توجہ کا خاص مرکز بنایا اور اس طرح ان کی بہترین قدروں کو اپنی ذات میں جذب کیا۔ لیکن وہ اس پر قانع نہیں ہوئے۔ ان کی خلاق طبیعت نے اس کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کی بہترین قدروں کو بھی اس طرح اپنایا کہ ان کی ذات مشرق و مغرب کا ایک حسین سنگم بن گئی۔ اس میں ایک طرف مشرق کی سکون پسندی اور گہرائی، رواداری اور وضعداری، انسانیت اور روحانی بصیرت تھی اور دوسری طرف مغرب کی روشن خیالی، ذہنی جرأت، انسان دوستی، عملیت اور عوام کی پاسداری کا جذبہ کارفرما تھا۔ اس طرح ان کی ذات ماضی اور حال کے درمیان، مشرق اور مغرب کے درمیان ایک پل کا کام کرتی تھی۔ وہ ایک زبردست عالم دین تھے لیکن ملا کی تنگ نظری سے آزاد۔ فلسفے میں گہری نظر رکھتے تھے لیکن کبھی اس کی سطحی موشگافیوں میں راستہ نہیں بھٹکے۔ ان کا مسلک گویا یہ تھا:

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت، وہ اندیشہ و نظر کا فساد!

ان کے نزدیک مذہب، فلسفہ، سائنس، سیاست سب کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ انسان اپنی زندگی کو شرافت کے سانچے میں ڈھالے اور اس غرض کے لئے اپنی جسمانی، ذہنی اور روحانی قوتوں کو پورا فروغ دے۔ ان کی زندگی میں دین اور دنیا کی تفریق نہ تھی، دونوں میں حق پسندی اور شرافت کے اصولوں کی کارفرمائی تھی۔ وہ ایک پختہ کار اور بیدار مغز سیاست داں تھے لیکن ان تمام ریشہ دوانیوں اور گھٹیا چالوں سے بلند، جن کے ذریعہ بہت سے سیاست کا کھیل کھیلنے والے اپنی قوت اور اثر کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی قوم اور ملک کے دل میں اپنی جگہ پیدا کی تھی لیکن اس کے لئے کبھی اشتہار بازی کے طریقوں سے کام

نہیں یا وہ کبھی عام کی سطح پر نہیں آتے، بلکہ ہمت [illegible] ان تک [illegible] اٹھیں
اپنی سطح پر [illegible] کی کوشش کی اور جب کبھی وہ راستے سے ہٹے، مولانا ان کی طرف سے
انحراف، بدگمانی یا روگردانی کی، مولانا صراطِ مستقیم پر چلتے رہے اور [illegible]
کے فرض کو پورے عزم اور دل سوزی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ سیاست کے طوفان
آئے، زلزلوں نے پہاڑوں کے ثبات قدم کو ڈگمگا دیا لیکن یہ مردِ مجاہد پہاڑ کی طرح
اپنی جگہ پر اپنے اصولوں پر اپنی رائے پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہا۔ اس شان کے
ساتھ کہ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا، نہ مخالفوں اور بدباطنوں کی ملامت کا خوف
اور شکوہ۔ ان کی دردمندی [illegible] بدزبانی کو اس طرح برداشت کیا کہ پیشانی پر بل
[illegible] زیادہ سے زیادہ یہ کہا کہ "یہ کیسے عاقبت نااندیش ہیں، یہ نہیں
جانتے [illegible] کہ ان کی حرکتوں کا کیا نتیجہ ہونے والا ہے۔" ان کے دل میں [illegible]
کے لئے [illegible] انھوں نے کسی جگہ ظہوری کا ایک شعر نقل کیا ہے جو [illegible]
قلبِ صافی کا نقشہ کھینچ دیتا ہے:

شدا [illegible] ظہوری [illegible]

برائے کینہ [illegible]

ان کا سینہ ہر قسم کے کینے [illegible] اور [illegible] سے [illegible]
کے [illegible] خدا کی [illegible] حق اور صداقت کی بیں [illegible]
[illegible] دلی کے ساتھ [illegible] اور خود انھوں نے عمر بھر کبھی اس [illegible]
[illegible] کا ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ کبھی غلطی اور بے انصافی میں اپنوں کا ساتھ
نہیں دیا۔ کبھی سچ اور سچی بات میں غیروں سے پہلو تہی نہیں کی۔ ان کے لئے [illegible]
[illegible] ان کے اصولوں سے متفق ہوں اور غیر وہ جو ان اصولوں کی مخالفت کریں۔

قدرت نے انھیں ایسا روشن دماغ دیا تھا کہ وہ بڑی مشکل [illegible]
گتھیوں کو سلجھا دیتے تھے اور ان کا ناخنِ تدبیر کامیابی کا راستہ کھول دیتا تھا۔ یہی
[illegible] ہوں میں تھا۔ ہم لوگ معاملے کی جزئیات میں اُلجھے، موافق اور مخالف
دلیلوں کو [illegible] لیکن ان کی نظر تفصیلات کو چیرتی ہوئی نفسِ معاملہ تک پہنچ
جاتی اور وہ ایک واضح اور محکم فیصلہ صادر کر دیتے۔ ان کا دل آتنا فراخ تھا کہ اس
میں کسی قسم کے تعصب یا تنگ نظری کو بار نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایمان، انصاف پسندی
اور انسان دوستی سے معمور تھے۔ اسی وجہ سے ان پر تمام اقلیتوں کو پورا پورا بھروسا
تھا اور وہ جانتے تھے کہ مولانا ان کے جائز حقوق کی حمایت کریں گے۔ میں نے ان کی
زبان سے کسی شخص کی بُرائی میں سخت سے سخت لفظ یہ سُنا کہ فلاں "چھوٹے دل کا

دماغ کا آدمی ہے" یعنی ان کی نظر میں دل اور دماغ کی تنگی انسان کی سب سے بڑی
محرومی اور ذلت تھی۔

انھوں نے جنگِ آزادی کے زمانے میں اس تحریک کی سرداری کی اور قید و بند
کی مصیبتوں، قربانی اور ایثار کی آزمائشوں کو شہد کا گھونٹ بنا کر پیا۔ لیکن جب
آزادی حاصل ہوئی تو انھوں نے اپنی ساری قوت اور توجہ اس بات پر صرف کر دی
کہ قومی زندگی صالح بنیادوں پر قائم ہو۔ جب کبھی کوئی ایسا نازک موقع یا مشکل مقام
آیا جہاں یہ اندیشہ ہو کہ شاید مصلحت کی کشمکش انصاف اور دیانت داری پر غالب
آجائے تو ان کی اصول پرستی، جرأت اور حق گوئی نے سدِ سکندری کا کام دیا اور
مصلحت پرستی کو پسپا ہونا پڑا۔ اسی وجہ سے ہم نے ان کو "قوم کے ضمیر"
کا خطاب دیا تھا۔ یعنی اس میدان میں انھوں نے اس فرض کے بار کو اٹھایا تھا جو
گاندھی جی انجام دیتے تھے۔ ناواقف لوگ ان کو عام جلسوں یا سرکاری تقریبوں اور
دعوتوں میں دیکھتے تو خیال کرتے کہ شاید مولانا آزاد اب سیاست کے مرکز سے دور
ہو گئے ہیں۔ لیکن انھیں یہ معلوم نہیں کہ ہر مقام اور زمانے کے اپنے آداب ہوتے
ہیں۔ جب کانگریس آزادی کی جنگ کر رہی تھی مولانا اس کے ایک ممتاز رکن اور
صدر کی حیثیت سے طوفان کے مرکز میں رہے۔ آزادی کے بعد انھوں نے اپنے لئے
ایک دوسری شاہراہِ عمل متعین کر لی تھی جس پر چل کر وہ ملک کی خدمت اور رہنمائی
کر سکتے تھے۔ بے شک اب وہ ایک لحاظ سے گوشہ نشین تھے۔ لوگوں سے کم ملتے جلتے
تھے لیکن ان کی انگلیاں قوم کی نبض پر تھیں اور وہ جانتے تھے کہ کیا کرنا ہے اور کیا
کرنا چاہیئے۔ اس زمانے میں ان کی شان یہ تھی ؎

مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں

شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق !

اور سب کی رفاقت کا ثبوت یہ ہے کہ جب اس کے بنانے والے نے ان کو یاد
کیا اور وہ اس کا نام لیتے لیتے اس کے حضور میں پہنچ گئے تو نہ صرف لاکھوں دلی
والوں کی، بلکہ کروڑوں ہندوستانیوں کی عقیدت اور محبت، صبر اور ضبط کے بندھن
توڑ کر امنڈ پڑی اور باہمی فرقوں اور اختلافوں کو بھول کر سب نے ان کی خاموش
اور بے لوث خدمت کا اعتراف کیا۔ میں نے اس جمِ غفیر میں جو ۲۲- فروری کو
ان کے مکان کے گرد جمع تھا ایک بوڑھے سکھ کو یہ کہتے سُنا "لو ارے تمہیں کیا
معلوم ہے آزاد نے تو بادشاہت کی ہے بادشاہت" ایک معنی میں یہ بالکل
سچ ہے۔ وہ دل اور دماغ کے بادشاہ بھی تھے اور حکومت کی پالیسی کے بنانے اور

زمانے میں ان کا جو حصہ تھا اور ان کے ساتھ ان کی رائے اور فیصلوں کی جو قدر کرتے تھے اس کے پیش نظر اس بڑھے کا یہ قول ٹھیک معلوم ہوتا ہے

لیکن یہ بادشاہ جس میں ایک طرف انتہائی خودداری اور خودی کا احساس تھا جو کبھی کسی قوت کے سامنے سر نہ جھکاتا تھا، ایک فقیر بھی تھا۔ فقیر اقبال کی اصطلاح میں یعنی

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

اسی وجہ سے اس کے ہاں قصر و شاہی کے ڈانڈے مل جاتے تھے اور دل پکار اٹھتا تھا

نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

اس فقیر کے پاس متاع دنیا میں سے بہت کم تھا، نہ مال نہ دولت، نہ جائداد نہ سرمایہ۔ نہ خانگی زندگی کی وہ پابندیاں جو دل میں کمزوری پیدا کرتی ہیں۔ اس میں بے نیازی کی ایک خاص شان تھی اور نام و نمود اور شہرت پسندی سے نفرت۔ کبھی کسی انجمن، کسی درسگاہ، کسی عمارت کو اپنے نام سے منسوب نہیں ہونے دیا۔ شاید ایک دفعہ کے سوا کسی یونی ورسٹی کی اعزازی ڈگری قبول نہیں کی۔ تاریخ پیدائش تک پوشیدہ رکھی کہ دوست اور عقیدت مند اس کو منانے نہ لگیں!

مولانا آزاد نے جہاں ایک شاہانہ شخصیت اور انداز فکر و عمل پایا تھا وہاں ان کے دل میں عام لوگوں، غریبوں اور سماج کے ستائے ہوئے طبقوں کے لئے خاص ہمدردی اور گداز تھا جس کے افسانے زبانِ خلق مدتوں تک سنائے گی۔ لیکن اس کی ایک انوکھی جھلک آپ کو اس انتساب میں دکھائی دے گی جو انھوں نے ۱۹۳۱ء میں اپنے علمی اور مذہبی شاہکار "ترجمان القرآن" کے لئے لکھا تھا۔ اس زبردست تصنیف کو انھوں نے نہ کسی رئیس کے نام منسوب کیا نہ عالم کے نہ کسی دوست کے نہ عزیز کے بلکہ ایک غریب گمنام اجنبی کے نام جو ان کے پاس ایک دوسرے دیس سے سینکڑوں میل چل کر علم اور دینی ہدایت حاصل کرنے آیا تھا۔

" غالباً دسمبر ۱۹۱۸ء کا واقعہ ہے، میں رانچی میں نظر بند تھا عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکلا تو مجھے محسوس ہوا کوئی شخص پیچھے آرہا ہے۔ مڑکے دیکھا تو ایک شخص کمبل اوڑھے کھڑا تھا۔

"آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"
"ہاں جناب میں بہت دور سے آیا ہوں۔"
"کہاں سے؟"
"سرحد پار سے۔"
"یہاں کب پہنچے؟"

"آج شام کو پہنچا۔ میں بہت غریب آدمی ہوں۔ قندھار سے پیدل چل کر کوئٹہ پہنچا۔ وہاں چند ہم وطن سوداگر مل گئے تھے انھوں نے نوکر رکھ لیا اور آگرے پہنچا دیا۔ آگرے سے یہاں تک پیدل چل کر آیا ہوں۔"

"افسوس تم نے اتنی مصیبت کیوں برداشت کی؟"

"اس لئے کہ آپ سے قرآن مجید کے بعض مقامات سمجھ لوں۔ میں نے 'الہلال' اور 'البلاغ' کا ایک ایک حرف پڑھا ہے۔"

یہ شخص چند دنوں تک ٹھہرا اور پھر یکایک واپس چلا گیا۔ وہ چلتے وقت اس لئے نہیں ملا کہ اسے اندیشہ تھا میں اسے واپسی کے مصارف کے لئے روپیہ دوں گا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بار مجھ پر ڈالے۔ اس نے یقیناً واپسی میں بھی مسافت کا بڑا حصہ پیدل طے کیا ہوگا۔

مجھے اس کا نام یاد نہیں مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ لیکن اگر میرے حافظے نے کوتاہی نہ کی ہوتی تو میں یہ کتاب اس کے نام سے منسوب کرتا۔"

کیسا شاندار اور اثر آفریں اعتراف ہے طلبِ صادق کا، علم کی پیاس کا، مذہب کی سچی لگن کا، خواہ وہ ایک بوسیدہ کمبل ہی میں ملبوس ہو۔

اس مرد مومن کی زندگی میں خدا کی فیاضی کی ایک عجیب شان نظر آتی ہے۔ اسے قدرت نے کیا کچھ نہیں دیا، وجاہتِ ظاہری جو اس کو لاکھوں میں ممتاز بناتی تھی، دماغ کی تابانی جو فکر و عمل کے تاریک گوشوں کو منور کرتی تھی، دل کی فراخی جس میں تعصب کے سوا سب کے لئے جگہ تھی، علم کی وہ فراوانی کہ حدود کا پتہ نہ چلے، تحریر و تقریر کا وہ کمال جو اس کی زندگی ہی میں فسانہ بن گیا۔ زبان کو اس نے ایک نئی قدرت اور نیا انداز بخشا اور لفظوں سے کام لیا شعلہ اور شبنم کا، رزم اور بزم کا، پھول اور تلوار کا۔ مذہب میں اس کی وہ نظر تھی کہ اس کے آئینے میں

دین اور دنیا دونوں کی واضح تصویر نظر آتی تھی اور فکرِ حاضر سے ایسی وابستگی کہ مغرب کے عالم بھی اس کا لوہا مانتے تھے ـــــ یہ تھے مولانا آزاد ـــ ایسا دوسرا کہاں سے آئے گا؟ بقول حالی

ملک یکسر ہوا ہے بے آئیں — اک فلاطوں نہیں جو یوناں میں
ختم تھی اک زباں پہ شیرینی — ڈھونڈتے کیا ہو سیبستاں میں
لبِ جادو بیاں ہوا خاموش — گوشِ گل وا ہے کیوں گلستاں میں
وہ گیا جس سے بزم روشن تھی — شمع جلتی ہے کیوں شبستاں میں

آخر میں ایک قطعۂ تاریخ سن لیجئے جو ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے مولانا کی وفات پر لکھا ہے اور جس کے آخری شعر میں امید کا وہ پیام ہے جو دکھ اور مایوسی کی موجودہ کیفیت میں ہماری ہمت بندھاتا ہے

کل تک ہم سب ہند کے خادم خوش ہو ہو کر کہتے تھے
ہم کیوں دیش کی فکر کریں جب تک ہم میں ہے آزاد

آج بچھڑ کر تجھ سے ہم تو سر کو پکڑ کر روتے ہیں
اور تو سب فکروں سے چھٹ کر باغِ ارم میں ہے آزاد!
رحلت کی تاریخ تری نکلی منہ سے فغاں بن کر
دل پہ آج ہجومِ یاس ترے غم میں ہے آزاد!

۱۹۵۸ء

اتنے میں محسوس ہوا جیسے کوئی کہتا ہے
دل کی آنکھیں کھول کے دیکھا اب بھی ہم میں ہے آزاد!
روحِ فکر و عمل اس کی سارے جہاں میں ساری ہے
شرق و غرب میں ہے آزاد، دیر و حرم میں ہے آزاد!

یہ تو تھی جگ بیتی آپ بیتی کوئی کیونکر سنائے سوائے اس کے۔

گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناشاد چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت!

سرفراز حسین رضوی خبیر لکھنوی

قطعۂ تاریخ وفاتِ حسرت آیات مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم

ہوا غروب وہ مہرِ کمالِ علم و ادب — قمر "ہلال" کی صورت تھا جس کا حلقہ بگوش
بلند جس نے کیا تھا نشانِ آزادی — عمل میں گاندھی و نہرو کے تھا جو دوش بدوش
بنایا ملک کو آزاد تھا جو نام آزاد — جگا چکا جو ہمیں، سو گیا وہ صاحبِ ہوش
بساطِ علم و فراست پہ اہلِ بینش و کشاد — تھے اُس کے سامنے شاگردوں کے حلقہ بگوش
نہاں تھے لاکھ تکلم سکوت میں اس کے — چھپائے مشک کی خوشبو نہ جیسے مشک فروش
وہ سو رہا ہے نہاں ہو فنا کے دامن میں — پر اس کا نام بقا سے رہے گا ہم آغوش
زبان موجۂ سیلاب تھی دمِ تقریر — کہ جس طرح ہو سمندر میں وقتِ طوفاں جوش
جہانِ علم و ادب میں جو چھایا سناٹا — تو آئی غیب کی جانب سے یہ ندائے سروش

خبیر مصرعِ تاریخ لکھو ہجری میں
اُداس اُداس ہے مجمع ابوالکلام خموش

۱۳۷۷ھ

ظفر حسین خاں

ابوالکلام بہ حیثیت انشا پرداز

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی شخصیت اپنی جگہ ایک انجمن تھی۔ وہ ایک بڑے مقرر بھی تھے اور انشاپرداز بھی، مفکر بھی تھے اور مدبر بھی۔ لیکن غور کیجئے تو اُن کی شخصیت کا مایۂ خمیر ادب ہی تھا اور وہی اُن کے مشاغل کے مختلف میدانوں میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا تھا۔ اُن کی سیاسی تقریریں، اعلیٰ ادب کی بہترین مثالیں ہیں۔ اُن کے فلسفیانہ افکار صاف اور ستھرے ادبی پیرایۂ بیان سے آراستہ ہیں۔ وہ مشکل سے مشکل مسائل کو ایسا سریع الفہم بنا دیتے ہیں کہ معمولی سمجھ کے آدمی کو بھی غلط فہمی کا امکان نہیں رہتا، اسے ادبی اعجاز نہیں تو کیا کہئے ؟ مولانا سیاسیات میں بھی ادبی دروازہ سے داخل ہوئے۔ الہلال اور البلاغ بہترین سیاسی مسالوں سے پہلے بہترین ادب پارے تھے۔ جنھوں نے جمہور کے دل میں جگہ کر کے مولانا کو لیڈروں کی صفِ اوّل میں کھڑا کر دیا غرضیکہ ہر شعبۂ حیات میں مولانا کی عظمت، اُن کی انشاپردازی کی رہینِ منت ہے۔ اور یہی کہنا چاہتے اُن کا اصلی جوہر ہے۔

راقم الحروف کو مولانا کی خدمت میں شرفِ نیاز سب سے پہلی بار ۱۹۱۷ء میں حاصل ہوا۔ میرا طالب علمی کا زمانہ تھا اور مولانا کی تحریروں کی چاشنی سے زبان آشنا تھی۔ اُن سے ملنے کا کمال اشتیاق تھا کہ سنا مولانا لکھنؤ آئے ہیں اور سول ملٹری ہوٹل میں قیام ہے۔ سول ملٹری ہوٹل، اس زمانہ میں لکھنؤ کا بہترین فیشنبل ہوٹل تھا جو مغربی انداز پر ایک یوروپین مہتمم کی نگرانی میں چل رہا تھا۔ مولانا اور سول ملٹری ہوٹل: یہ ایک اجتماعِ نقیضین سا معلوم ہوتا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی میرے ہم مکتب تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد سے پہلے سے رسم و راہ رکھتے تھے۔ چناں چہ میں نے انھیں کو اپنے تعارف کا واسطہ بنایا۔ ہم دونوں جب اُس کمرہ کے برآمدہ میں پہنچے جس میں مولانا مقیم تھے تو کمرہ کے اندر سے میں نے ایک "کلین شیو" نوجوان کو برآمد ہوتے دیکھا۔ مولانا عبدالماجد نے میرا تعارف کرایا۔ میرے ذہن میں مولانا آزاد کا جو تصور تھا اس پر یہ دوسری ضرب تھی۔ یعنی یہ کہ وہ کم و بیش ہم لوگوں کے ہم عمر ہی تھے اور ابھی ڈاڑھی مونچھ ان کے چہرے پر نمایاں نہیں ہوئی تھی۔ مولانا ہم لوگوں کو اپنے کمرے میں لے گئے اور چائے کے ساتھ اپنے حسنِ تقریر سے جو ہم لوگوں کی ضیافت کی اُس کا ذائقہ حافظہ میں اب تک محفوظ ہے۔ واقعاتِ حاضرہ پر ہر خیال کے اظہار کے لئے، بہتر سے بہتر الفاظ و فقرات کا انتخاب، برجستہ مناسب حال اشعار کا استعمال؛ غرضیکہ وہ کالج کے دو نوجوانوں کے ساتھ معمولی بات چیت نہ تھی بلکہ ادبیاتِ عالیہ کا ایک کلاسیکل نمونہ تھا۔ اس قدر بے پناہ قوتِ بیان کا مظاہرہ دیکھنے کا اتفاق مجھے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

مشہور عالم اطالوی فلسفی کروچے نے اپنے "جمالیات" میں ماہرِ فن کے کمال کا پیمانہ قوتِ اظہار ہی کو قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بڑے سے بڑے مدعیانِ فن کے حواس اس وقت درست ہو جاتے ہیں جب وہ اپنے کمال کے اظہار پر مجبور ہوتے ہیں، چنانچہ کروچے کا کہنا ہے کہ کسی مدعی فن کے امتحان کا سیدھا سادہ طریقہ یہ ہے کہ اس سے کہئے کہ ذرا اس گیت کے دو بول تو گا دیجئے یا یہ پنسل حاضر ہے اس سے کوئی نقش کھینچ کر اپنے وارداتِ قلب کا ذرا اظہار تو فرما دیجئے۔ "قوتِ اظہار کی اس جانچ سے ذرا کی ذرا میں اُن کے کمال کی پول کھل جائے گی۔ اور معلوم ہو جائے گا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔

قوت گویائی

مولانا کی قوتِ اظہار و بیان کے نمونے ان کی ہر تحریر میں ہر قدم قدم پر بغیر کسی تجسس کے ملتے ہیں چنانچہ "تذکرہ" کے چند ورق الٹتے ہی مولانا کی یہ تحریر سامنے آجاتی ہے:

"وہی دنیا جس کے دیدہ و فراموش نے غفلت کے جام چڑھائے تھے اپنے ہر جلوہ سے آنکھوں کو، اپنے ہر نغمہ سے کانوں کو مستی و سرشاری کی پیہم دعوتیں دی تھیں اب اس کا گوشہ گوشہ، چپہ چپہ، ہشیاری و بینش کا مرقع تھا۔ بصیرت و معرفت کا درس تھا۔ ذرّے ذرّے کو گرم گفتار پایا، پتہ پتہ کو مکتوب و مسطور دیکھا۔ پھولوں نے زبان کھولی پتھروں نے اٹھ اٹھ کر اشارے کئے، خاکِ پامال نے اڑ اڑ کر گمشدہ رفتہ بیان کیں، آسمانوں کو بار بار اترنا پڑتا کہ سوالوں کا جواب دیں۔ زمین کو کتنی ہی مرتبہ اچھالنا پڑا تا کہ فضا و آسمانی کے تارے توڑ لائیں، فرشتوں نے بازو تھامے کہ کہیں لغزش نہ ہو جائے، سورج چراغ لے کر آیا کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔ سب نے نقاب اتار دیئے، سارے پردے چاک ہو گئے، سب کی ابروؤں میں اشارے تھے سب کی آنکھوں میں کائناتیں بھری تھیں۔ سب کے ہاتھ بخشش و قبولیت کے لئے دراز تھے، بادل کو پکڑا تو ساون بھادوں کا طنبورہ نکلا، بجلی کو پاس بلایا تو سب بانٹے دانہ کا ایک تبسم آتش کار نکلی، ہوا کے جھونکے جھولیوں میں آگئے مگر پھر بھی خالی رہیں۔ سمندر نے اپنی ساری موجیں خرچ کر دیں مگر پھر بھی ہمارے ہاتھ کا پیالہ نہ بھرا ...... غرضیکہ ہمتِ خوابیدہ جاگ اٹھی اور دلِ رفتہ پھر نئی نئی طاقتوں اور نئے نئے سامانوں کے ساتھ واپس آگیا۔ عالمِ آفاق و انفس میں جو کچھ ہے اُن میں سے کوئی نہ تھا جس کے ابرو پر گرہ یا آنکھوں میں غمزہ ہو سب کی زبانیں گویا سب کے اشارے آشکارا، سب کی سطوریں اُبھری ہوئی تھیں، نہ کوئی لب بند رہا نہ کوئی جلوہ مستور، نہ آنکھوں نے دیکھنے میں کمی کی، نہ کانوں نے سننے میں، چشم و گوش نے جو کچھ بہم پہنچایا دل کی وسعت نے سب کو سمیٹ لیا۔ اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے۔

آج کل دہلی (ابوالکلام نمبر)

سخن عشق بدل درنہ و لب را مکشا
سر این شیشہ فرو بند کہ بادہ نخورد" (صفحہ ۳۰۳)

یا پھر کمال ایجاز کے ساتھ ایک اہم حقیقت کا اظہار ان چند لفظوں میں محسوس کیجئے:-

"غور کیجئے تو انسان کی زندگی اور اُس کے احساسات کا بھی کچھ عجیب حال ہے تین برس کی مدت ہو یا تیس دن کی۔ مگر جب گذرنے پر آتی ہے تو گزر ہی جاتی ہے۔ گذرنے سے پہلے سوچئے تو حیرانی ہوتی ہے کہ یہ پہاڑ سی مدت کیوں کر کٹے گی؟ گذرنے کے بعد سوچئے تو تعجب ہوتا ہے کہ جو کچھ گذر چکا وہ چند لمحوں سے زیادہ نہ تھا۔" (غبارِ خاطر صفحہ ۲۹)

زبان دانی

جرمنی کے مشہور عالم شاعر و ادیب، گوئٹے کا قول ہے کہ اگر انسان دوسری زبان نہ جانتا ہو تو وہ اپنی مادری زبان کو بھی سلیقہ سے استعمال نہیں کر سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ مولانا کی اس حیرت انگیز قوت گویائی کا باعث اُن کی متعدد زبانوں سے واقفیت ہو۔ عربی اور فارسی ادب پر تو اُن کو عبور حاصل تھا ہی۔ وہ فرانسیسی اور انگریزی زبان بھی خوب جانتے تھے اور آخر الذکر دونوں زبانوں کی کلاسکی کتابیں اکثر اُن کے زیرِ مطالعہ دیکھی گئی ہیں۔ پھر قدرت سے حافظہ ایسا زبردست پایا تھا کہ ایک بار جو پڑھ لیا پتھر کی لکیر ہو گئی۔ مولانا کو عربی، فارسی، اُردو کے ہزاروں شعر ازبر تھے۔ غبارِ خاطر میں فرماتے ہیں:-

"معلوم نہیں ایک خاص طرح کے ذہنی واردہ کی حالت کا آپ کو تجربہ ہوا ہے یا نہیں؟ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے۔ کہ کوئی بات برسوں تک حافظہ میں تازہ نہیں ہوتی۔ گویا کسی کونے میں سو رہی ہے۔ پھر کسی وقت اچانک اس طرح جاگ اٹھے گی۔ جیسے اُسی وقت دماغ نے کواڑ کھول کر اندر لے لیا ہو۔ اشعار و مطالب کی یادداشت میں اس طرح کے واردات اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ تیس چالیس برس پیشتر کے مطالعہ کے نقوش کبھی اچانک اس طرح ابھر آئیں گے کہ معلوم ہوگا ابھی ابھی کتاب دیکھ کر اٹھا ہوں مضمون کے ساتھ کتاب یاد آجاتی ہے، کتاب کے ساتھ جلد اجلد کے ساتھ صفحہ اور صفحہ کے ساتھ یہ تعیین کہ مضمون ابتدائی سطروں

ہیں تھا، یا درمیانی سطروں میں یا آخری سطروں میں، نیز صفحہ کا رُخ کردہنی طرف کا تھا یا بائیں طرف کا۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی حسبِ معمول سو کر اٹھا تو بغیر کسی ظاہری مناسبت اور تحریک کے یہ شعر خود بخود زبان پر طاری تھا۔

کم نہ ام وقیمتم افزوں ز شمار است
گوہری تر پیشتر از باغ وجودم

ساتھ ہی یاد آ گیا کہ شعر حکیم صدرائے شیرازی کا ہے، جو اواخر عہد اکبری میں ہندوستان آیا اور شاہ جہاں کے عہد تک زندہ رہا اور آفتاب عالم تاب میں نظر سے گزرا تھا۔ غالباً بائیں طرف کے صفحہ میں اور صفحہ کی ابتدائی سطروں میں۔ آفتاب عالم دیکھے ہوئے کم سے کم تیس برس ہو گئے ہوں گے۔ پھر اتفاق نہیں ہوا کہ اُسے کھولا ہو۔" (صفحہ ۱۰۹ تا صفحہ ۱۱۰)

اسالیب بیان

اسی طرح مشرقی اور مغربی فلسفہ کے مسائل اُن کے ذہن میں محفوظ تھے جن پر مخصوص صحبتوں میں پُر لطف مذاکرہ کرتے تھے۔ ادب لطیف ہو یا فلسفہ، سیاسی بحث ہو یا مذہبی مسئلہ اور پھر تحریر ہو یا تقریر ہر جگہ اُن کی "ابوالکلامی" کا ثبوت ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موضوع بحث کی نوعیت کے اعتبار سے مولانا کا اسلوب بیان فی الجملہ بدلتا ہے۔ فلسفیانہ مسائل کی گرہ کشائیوں میں ان کا اسلوب بالعموم صاف اور سادہ ہوتا ہے۔ ایسی تحریروں میں شاذ و نادر شعر استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جیسا اوپر اشارہ کیا گیا اُن کی ذہنی تعمیر میں ادیبانہ صورت ہمیشہ مضمر پائی جاتی ہے۔ جو ذرا سے غور کرنے سے نظروں کے سامنے آ جاتی ہے۔ خالص ادبی تحریرات میں جو استعارہ و تشبیہ تھا وہ مذہبی تحریروں میں تمثیل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مولانا کی منطق اکثر و بیشتر تمثیلی ہوتی ہے استقرائی یا قیاسی نہیں۔ وہ اپنے تمثیلی استدلال سے مشکل سے مشکل مباحث اس طرح ذہن نشین کر دیتے ہیں کہ باید و شاید، استقرا اور قیاس کی کاوشیں ان کی تمثیل کے سامنے پانی بھرنے لگتی ہیں۔ ایک اچھوتی تمثیل کی مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

"میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارا یہی حال رہا جو بادجودیکہ ظلمات تسلط و تنبیہ کے آج نظر آ رہا ہے تو کچھ عجب نہیں کہ مسلمان مسجد کا دروازہ کھولنے، اذان دینے، نماز پڑھنے اور رمضان کا روزہ رکھنے کے لئے بھی گورنمنٹ کی اجازت اور رضا کے منتظر رہا کریں گے اور جمعہ کے دن خطیب منبر کے سامنے ہمہ تن انتظار ہو کر کھڑا رہے گا کہ شملہ سے تار آ جائے تو خطبہ پڑھنے کے لئے آمادہ ہو۔۔۔۔"

(الہلال ۷ نومبر ۱۹۱۲ء)

مولانا کی انشا پردازی کے اجزائے ترکیبی، استعارہ، تشبیہ، تضاد

مولانا کے کمال انشا پردازی کا اصلی میدان ادب لطیف ہے۔ جس کے جوہر تازہ استعاروں، بولتی ہوئی تشبیہوں کے ساتھ چبھتے ہوئے تضادات بھی ہیں۔ جو ان کی نوشتہ جات میں بکھرے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ ایک تضاد کی مثال ملاحظہ فرمایئے، استعارات و تشبیہات تو انھیں اقتباسات میں آپ نے دیکھے۔

"ہمارے تعلیم یافتہ دوستوں کا کچھ عجب حال ہے۔ ان کے پاؤں کو دیکھئے تو یورپ کی ناخہانہ دکورانہ تقلید و عبودیت فکر کی زنجیر میں بٹی نظر آتی ہیں۔ مگر چہرے کی طرف نظر اٹھایئے تو زبان کو ادعائے اجتہاد سے فرصت نہیں۔ اس سے بڑھ کر دنیا میں جمع اضداد کا اور کونسا تماشا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص آپ کے سامنے آئے اور عین اس وقت جب کہ اس کے پاؤں میں تقلید و استعباد کی زنجیریں پازیب کی طرح صدا دے رہی ہوں۔ اجتہاد فکر اور حریت رائے پر بے تکان لکچر دینا شروع کر دے" (الہلال ۱۰ ستمبر ۱۹۱۳ء)

ٹھیٹ ہندی کے الفاظ

چست فارسی ترکیبوں کے ساتھ مولانا اکثر ٹھیٹ ہندی الفاظ استعمال کرتے ہیں جو ایک خاص لطف دیتے ہیں۔ مثلاً

"گو اس کی گرفتاری بھی گرفتاری اور اس کا اٹکاؤ بھی اٹکاؤ ہے؟"

"جس کو کیسی کیسی تمناؤں اور چاہتوں سے ہمیشہ سینے میں بچا کے رکھا تھا کہ کہیں ناسور بننے کی جگہ مندمل نہ ہو جائے۔"

"الغرض توفیق الٰہی کی سیکڑوں راہیں ہیں۔ ہدایت و تربیت غیبی کے ہزاروں بھیس ہیں۔"

"دل کی ٹیس اور ٹپک" وغیرہ وغیرہ۔

مآخذ و موثرات

مولانا کے قلم سے نکلے ہوئے ادب لطیف کو اگر "شعر منثور" کہا جائے تو

ہمیشہ جاری رہے گا۔ شاعری کا کون سا کمال ہے جو ان کی نثر میں جلوہ افروز نہ ہو۔ کون سی صنعت ہے جو ان کی تحریر میں نہ ہو۔ بس وزن اور قافیہ ردیف سے عاری ہے۔ اس لئے آپ اسے نثر کہنے پر مجبور ہیں۔ ایسی نثر میں سینکڑوں نظمیں نثار ہیں۔ مولانا کی انشا پردازی اگرچہ اپنے مخصوص رنگ میں یکتا ہے لیکن غور کرنے سے اس میں کچھ اثرات ملتے ہیں جو محمد حسین آزاد، ظہوری، عرفی، نظامی، متنبی کی معنی آفرینیوں اور ادیبانہ تراش خراش کے مرہون منت معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ مسلم ہے کہ مولانا آزاد ہر تقلید سے آزاد تھے۔ اور جا بجا انھوں نے اپنی آزاد روی کا اپنی تحریرات میں اظہار بھی کیا ہے۔

ظرافت

مولانا کی ظرافت اور عام ظرافت میں وہی فرق ہے جو کسی دہقانی کے بے ہنگم ٹھٹھہ مارنے اور کسی متمدن و مہذب کے مسکراہٹ میں ہوتا ہے۔ مولانا کی ظرافت مہذب، سنجیدہ اور شان دار ہوتی ہے جو عالموں کے لئے مخصوص ہے۔ اس میں کوئی سوقیانہ یا بازاری پہلو نہیں ہوتا۔ یہ خصوصیت ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہوگی۔ یہ دونوں اقتباس مسلم یونی ورسٹی کے قیام کے سلسلہ میں جو جلسے کلکتہ میں ہوئے تھے ان سے متعلق ہیں۔ راقم الحروف ان جلسوں میں موجود تھا۔

"اتنے میں خبر آئی کہ (مہاراجہ) کے ہاں ڈنر ہے۔ ہم نے کہا کہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ قومی طاقت کے ہزاروں آہنی تیر ایک طرف، اور ان نقرئی چھری کانٹوں کی جھنکار ایک طرف۔ حریت پسندوں سے پوچھا کہ کیا اس ناوک کا بھی کوئی جواب آپ کے ترکش میں ہے۔ جواب ملا کہ نہیں، شکست کا اعتراف ہے۔

چشم اگر این است و ابرو این و ناز و عشوہ این

الفراق اے ہوش و تقویٰ الوداع اے عقل و دین

لیکن پھر ہم نے دل کو تسلی دی۔ اطبا نے قدیم و جدید کا اتفاق ہے کہ چھ گھنٹے کے بعد غذا کے جرم سے معدہ خالی ہو جاتا ہے۔ جلسہ رات کو نہیں بلکہ صبح آٹھ بجے ہے اور انگریزی کھانا بھی سادہ اور دیر آمیز ہونے کے قدرتی طور پر زود ہضم ہوتا ہے۔ اب ایسی بھی یہ غذائے نفیس کیا ثقیل ہوگی کہ صبح تک معدہ میں گردش کرے اور آمادہ نکلیں تو حلق کی جگہ معدہ سے۔"

(الہلال، نشر نیم شبی کا صبح شمارہ ۵۔ فروری ۱۹۱۲ء)

"جن لوگوں نے ان عجیب و غریب گھڑیوں کو نہیں دیکھا ہے محال ہے کہ انھیں اس کی کیفیت سمجھائی جا سکے۔ چہرے جوش و ہیجان سے سرخ، گردن کی رگیں ابھری ہوئی، گلے شدت شور و ہنگامے سے پڑے ہوئے، ہاتھ میں اچھلتی ہوئی ٹوپیاں، اور پاؤں کو اضطراب رقص سے قرار نہیں، منہ سے کف اڑ رہی تھی اور چونکہ قریب قریب کھڑے تھے اس لئے آپس ہی میں ایک دوسرے کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ رومال نکال کر منہ پونچھتے اور پھر کف اڑاتے۔ منتظمین جلسہ کو کیا معلوم تھا کہ بادہ وری کے اسٹیج سے میدانِ رقص کا کام لیا جائے گا۔ ورنہ اس کی رعایت ملحوظ رکھتے۔ نتیجہ یہ تھا کہ جوشِ تواجد میں گردشِ رقص کی جگہ نہیں ملتی تھی۔ اس لئے جو رقاص جہاں کھڑا تھا وہیں اپنے پاؤں سے اسٹیج کے چوبیں تختوں کو کوٹ رہا تھا۔ یہ رقص مغلوبہ کا اصلی ایکٹ تھا اگر (سر ہنری اورنگ) زندہ ہوتا اور اس مجمع کو دیکھتا تو یقین ہے کہ ان پر جوش نوجوانوں کی ایک کھیپ تو ضرور اپنے ساتھ لے جاتا۔"

(الہلال - ۱۳ مارچ ۱۹۱۳ء "نشر نیم شبی کا صبح شمارہ")

چند تذکرات

مولانا کے نقش قدم پر چلنے والوں کی تعداد کثیر ہے۔ الہلال صرف اُن کی سیاسیات ہی کا آرگن نہ تھا۔ بلکہ کالج کے نوجوانوں کے اندر ادبی ذوق و بیداری پیدا کرنے کا بھی ایک مؤثر آلہ تھا۔ راقم الحروف کو بھی اردو پڑھنے لکھنے کا شوق الہلال کے مطالعہ ہی سے پیدا ہوا اور پھر الہلال ہی میں "ابوالاثر بہزاد" کے نام سے مضامین لکھنا شروع کئے جو مولانا کی اصلاح و تصحیح کے بعد الہلال میں شائع ہوتے رہے۔

ایک بات کا ملال مجھے تمام عمر رہے گا۔ الہلال جب اپنے اشاعت کے شباب پر تھا، مولانا نے مجھے اس کے عملۂ ادارت میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ مگر اپنی ناتجربہ کاری سے میں نے تکمیلِ تعلیم کو ترجیح دی اور نہ گیا حق یہ ہے کہ مولانا کی صحبت ایک ایسی جنس تھی جو ہر قیمت پر خریدنا چاہیے تھی۔ اُسی زمانہ میں، مولانا نے مولانا سید سلیمان ندوی کو بھی بلایا تھا۔ سید صاحب الہلال کے ادارہ میں عرصہ تک رہے اور مضمون نگاری کی خوب

دادودی۔ الہلال کے بہت سے مضمون ایسے ہیں کہ لوگ اب تک مولانا کے رشحاتِ قلم سمجھتے ہیں۔ مگر دراصل وہ نقوشِ سلیمانی ہیں۔ مثلاً کانپور کی مسجد کے مسئلہ پر زبردست مضامین کا سلسلہ سیّد صاحب ہی کا لکھا ہوا ہے۔ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ مولانا کے قلم کا اثر نہیں۔ مولانا کا اسلوبِ تحریر بلاشبہ ناقابلِ نقل ہے۔ لیکن الہلال کی بعض تحریریں جیّد سے جیّد ناقدفن کے سامنے رکھ دی جائیں اور پوچھا جائے کہ کون سی تحریر مولانا کی اور کون سی سیّد صاحب کی ہے تو بتانا مشکل ہوگا۔ مولانا کے مضامین اور مقالات جمع اور شائع کرنے والی کمیٹی میں ایسا شخص ہونا چاہیئے جو سیّد صاحب کے مضمونوں کو مولانا کے مضمونوں سے الگ کر سکے۔

چالیس برس سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد جب مولانا پہلی بار پارلیمنٹ کی ممبری کے لئے رام پور سے کھڑے ہوئے تو میرا قیام رام پور ہی تھا۔ الہلال سے سطحی ربط ایسا نہ تھا کہ یاد رکھنے کے قابل ہو۔ لیکن مولانا کو سب یاد تھا۔ نہایت گرمجوشی سے مجھے دہلی آنے کی دعوت دی اور واپس تشریف لے جانے کے دو ڈیڑھ مہینہ کے بعد پروفیسر محمد اجمل خاں صاحب کا خط آیا۔ عرض نہیں کر سکتا کہ صحبت کے چند دن کس لطف سے کٹے۔ اور الہلال کے دفتر میں شامل نہ ہونے کی حماقت پہ میں نے اپنے تئیں کتنی نفرین کی۔ مولانا شاکی تھے کہ دہلی میں کوئی ایسا ہم ذوق و ہم نوا نہیں کہ جس کے ساتھ گھڑی دو گھڑی بات کی جا سکے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اپنی افتادِ طبیعت کے اعتبار سے وہ سیاسی ہنگاموں جلسوں کے تیز قمقموں اور شہرت پسندی سے نفور تھے۔ وہ پڑھنے لکھنے اور غور و فکر کے لئے گوشۂ تنہائی کے طالب تھے۔ لیکن ان شورشوں نے اُن کا پیچھا نہ چھوڑا اور اُن کی ساری زندگی انھیں ہنگاموں میں کٹی۔ مگر جیسا عرض کیا گیا اُن کی ہنگامہ انگیز سیاسی تقریریں بھی اعلیٰ ادب کا بے نظیر نمونہ ہیں۔ مولانا ہر رنگ میں ادیب ہی ہیں۔

به هر رنگے که خواهی جامه می پوش

من اندازِ قدت را می شناسم

مولانا کی شخصیت کی نفسیاتی تعمیر کی بنیاد تخیّل پر ہے۔ تخیل ہی نے اُن کے ادب میں ایک بے مثال رمزیت Symbolism پیدا کر دی ہے تخیل ہی اُن کے تر و تازہ استعاروں کا سرچشمہ ہے اور تخیل ہی اُن کے فلسفیانہ مباحث میں تمثیلی استدلال کے جیس میں ظاہر ہوتی ہے۔ حقیقت میں اُن کی جولانگاہ ادبیات عالیہ ہی کا میدان ہے۔ دیگر میدانوں میں اُن کا ورود "دلے پر ندارش" کا مصداق ہے۔

تصنیفات

مولانا کے مضامین سے رسالہ الندوہ، الہلال اور البلاغ مالامال ہیں اور اُن کے جمع کرنے اور سلیقہ سے کتابی شکل میں شائع کرنے کی ضرورت ہے۔ اُن کی بڑی تصنیفات مثلاً ترجمان القرآن، تذکرہ، غبارِ خاطر وغیرہ کے علاوہ اُن کے بعض مقالے مثلاً "خونِ شہادت کے دو قطرے" از سرِ نو مستقل طور پر طبع ہونے کے مستحق ہیں۔

موعظۃ وذکریٰ

"اگر پانی کہے کہ یہ میری کارفرمائی ہے تو آفتاب بھی چمک سکتا ہے کہ یہ اس کی حرارت کا معجزہ ہے۔ اگر دہقان مدعی ہو کہ اس نے بیج ڈالا تو موسم اُسے جھٹلا سکتا ہے کہ بغیر میرے آئے ہوئے محض تخم ریزی کیا کر سکتی تھی۔ مزدوروں نے ہل جوتا، کاشتکار نے بیج ڈالا، نگہبانوں نے رکھوالی کی اور موسم نے آبپاشی، اور ان میں سے ہر فریق دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں ہی اس لہلہاتے ہوئے کھیت کی وجود پذیری کی علت ہوں مگر وہ جو ان سب سے بالاتر قوت ہے کہتی ہے کہ تم سب ہیچ ہو۔ اگر قدرتِ الٰہی تمام اسباب و وسائل مہیا نہ کرتی تو نہ تو ایک بیج بارآور ہوتا اور نہ ایک سبزہ زمین پر نظر آتا۔"

(الہلال ۳ فروری ۱۹۱۳ء)

بسمل سعیدی

مولانا ابوالکلام آزاد

کم ہوا کرتے ہیں اس دنیا میں وہ مردانِ کار
زندگی اور موت دونوں کو ہو جن سے افتخار

زندگی اپنے محاسن خود بیاں کرتی نہیں
موت کرتی ہے محاسن زندگی کے آشکار

زندگی رکھتی ہے آغوشِ بقا میں کچھ نفس
موت کرتی ہے حیاتِ جاوداں سے ہمکنار

جب سماتی ہے یہ بڑھ کر وسعتوں میں موت کی
آب جوئے زندگی بنتی ہے بحرِ بے کنار

ثبت ہو جاتا ہے لوحِ دہر پہ اس کا دوام
موت کر دیتی ہے جس کی زندگی کو استوار

زندگی جس سمت جب چاہے بدل سکتی ہے رُخ
موت ہی پہ منحصر ہے زندگی کا اعتبار

اپنے زشت و خوب میں ہوتی ہے ساری زندگی
موت کے اک لمحۂ آخر کے زیرِ اختیار

زندگی ہے موت کے تابع مگر با ایں ہمہ
موت کا بھی ایک وضع زندگی پر ہے مدار

زندگی بھر کے خیالوں ہی کا ہے اک خواب موت
موت خود بھی زندگی کی ہوتی ہے آئینہ دار

بالعموم انساں کو موت آتی ہے حسبِ زندگی
ہے یہی کچھ فطرتِ عادل کا دستور و شعار

الفراق اے منزلت یابندۂ مرگ و حیات
موت کے راس البضاعت، زندگی کے شاہکار

تیری مرگ و زیست دو حلقے ہیں اک زنجیر کے
سلسلہ کردار کا تیرے ہے مثلِ کوہسار

تھا اسی کا مقتضی تیرا عمل آغاز سے
زندگی جس موت پہ منتج ہوئی پایانِ کار

ماتم انسانیت کرنے کو تیری موت پر
آج شاید آسماں پر ہوں ملائک سوگوار

سلسلہ جو کی فضیلت کا ہے تا خیر القرون
چند اُن اسلاف کا تھا آخری تو یادگار

موج اندر موج تھا اک قلزمِ زخارِ فہم
علم کا تو ایک عالم تھا دیار اندر دیار

ناگزیر تھا رد ترا اور ناصحا تیرا قبول
نہی و امرِ دینِ برحق تیرا ترک و اختیار

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق
تو مشیرِ عقل تھا اور تو جنوں کا مستشار

تیرے ہی نقشِ قدم پر چلتے ہیں سب بے قدم
کس قدر زندہ ہے تو نے عظمتوں کی رہگزار

آج کل دہلی (ابوالکلام نمبر)

دیکھ کر اندازِ تیشہ ری روح کے روزِ ازل
دی حیاتِ دُنیوی تجھ کو ابد نے مُستعار

بن بنائے پختگیٔ فکر تیری زندگی
اپنی ایک اک سانس میں رکھتی ہے قرنوں کا شمار

ہو سکا تجھ تک پہنچ کر منتہز مَدِّ جہاں
ہو سکے گا اور کیا فوزِ عظیمِ روزگار

تھا ترے آغازِ عظمت ہی کا پرچم "الہلال"
تھی تری صبحِ نخستیں رُو کشِ نصف النہار

کس قدر ویران ہے مستقبلِ انسانیت
عالمِ تخلیق میں ہے اک خلائے بے کنار

ہو سکے گی کیا تلافی اب غمِ مافات کی
حشر تک شاید رہے گی چشمِ ہستی اشکبار

تھی تری وضعِ تواضع میں سرافرازی کی شان
تیری افتادِ طبیعت میں ہمالہ کا وقار

پیشِ پا افتادہ رہتی تھی بہ صد عجز و نیاز
کج کلاہی سے تری، شانِ کلاہِ تاجدار

ناطقہ تیری طلاقت پر اگر قربان تھا
تھی طلاقت تیرے اندازِ خطابت پر نثار

اس طرح منہ سے ترے جھڑتے تھے پھول الفاظ کے
خلد سے جیسے بہاروں کا گرے اک آبشار

جنبشِ ادنیٰ بھی تیرے کلک کی اعلیٰ ادب
غازۂ روئے نگارش تیری خاطر کا غبار

نامۂ اعمال در دست آئیں گے جس وقت لوگ
حشر میں تُو آئے گا تفسیرِ قرآں در کنار

ناموافق جس قدر ہوتی سیاست کی فضا
ہمّتِ عالی کو ہوتی اتنی ہی کچھ سازگار

قلعۂ احمد نگر کو یاد ہیں وہ صبح و شام
تھی جہاں شامِ خزاں تیرے لئے صبحِ بہار

تھا ترے نزدیک عینِ وقتِ آزادیٔ ہند
عہدِ افرنگی کا دَورِ قید و بند و گیر و دار

ہاں پریشاں کُن تری جمعیتِ خاطر کو تھا
مسلمِ ہندوستاں کا افتراق و انتشار

تو امیرِ کارواں بھی تھا امام الہند بھی
ماسوائے ملک، ملّت کا بھی تھا تو ذمّہ وار

منتہائے عزم تیرا اس سے ظاہر ہے کہ تھی
ہم رہوں کی منزلِ مقصود تیری رہگزار

تھا جہاں تابِ فضیلت تیرا خورشیدِ حیات
اب حیات افروزِ عظمت ہے تری شمعِ مزار

سر بہ افلاک اس زمیں کو کر گئی کشش کی نظر
زیرِ پائے مسجدِ جامع بنا کر یہ مزار

مسجدِ جامع! تری رفعت کا ضامن ہو گیا
علم و دیں کا اک ستوں، عزم و عمل کا اک منار

سر بہ سجدہ ہے وہ تیری سیڑھیوں کے سامنے
تیری محرابوں میں بھی ایسے نہیں طاعت گزار

اُس کے ذمّے تھے جو تیرے حق وہ پورے کر گیا
اب ترے ذمّے ہے اُس پر رحمتِ پروردگار

ثبت ہے عظمت پہ تیری مُہرِ توثیقِ دوام
یہ عظیم المرتبت تربت، فلک رفعت مزار

ے پنڈت جواہر لال نہرو

محمد مجیب

انگریزی سے ترجمہ
مترجم۔ محمد شفیع الرحمٰن

تذکرہ

"ان اوراقِ پریشاں کی تالیف کا باعث ایک دوست عزیز کا اصرار تھا" مولانا آزاد نے تذکرہ کے آخر میں تحریر فرمایا ہے "اب وہ مُصر ہیں کہ اپنے حالات بھی قلمبند کروں۔ اس تمام داستان سرائی کے اہتمام سے اُن کا اصل مقصد یہی تھا۔" تذکرہ اسلامی فکر کے موضوع پر ایک مقالہ کی حیثیت سے پڑھا جا سکتا ہے۔ اُس کی حیثیت ایک کتاب سے بہت زیادہ ہے۔ وہ ایک اشاریہ ہے، ایک شخصیت ہے، ایک شعلہ اور جوش ہے، ایک الہامی واعظ کی قوتِ نطق، ایک بڑے دل کا گریۂ نیم شبی، ایک المیہ کا حزن و غم اور ایک فتح کا مسرت انگیز نغمہ، وہ ایسی خودنوشت سوانح عمری ہے جو ایک تصوّر کا پیکر بن گئی ہے اور ایسا تصوّر جو فطرتِ انسانی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

لیکن تذکرہ ایک انوکھی کتاب ہے وہ کتاب نہیں جس کی خواہش ناشر کو تھی۔ اُن کا مقدمہ بہت دلچسپ اور قابلِ توجہ ہے۔ وہ صریحاً ایسے شاہ پرست معلوم ہوتے ہیں جو تمام مشاہیر کی پریشانی کا باعث بن جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اُن کی مولانا آزاد سے ۱۹۰۲ء میں واقفیت ہوئی۔ اُس وقت مولانا طالب علم ہی تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد کے ارتقا کو دیکھا۔ جب مولانا آزاد نے "الہلال" شائع کرنا شروع کیا اور ہندوستانی مسلمانوں کے قلوب کو ایک خاص اثر سے مسخر کر لیا تو مرزا فضل الدین کو خیال ہوا کہ اس کا عین وقت ہے کہ ایسی پُراثر شخصیت کے مداحوں کو اُن کے حالات سے واقفیت ہونی چاہیے۔ لیکن مولانا آزاد نے اُن کی خودنوشت سوانح عمری کی فرمائش کا مذاق بنا کر ٹال دیا۔

"کتنی بزرگ اور عظیم الشان زندگیاں ہمارے سامنے ہیں جن کے سوانح اور حالات نہیں لکھے گئے۔ اُن کو نظرانداز کر کے میری زندگی کے حالات مرتب کرنا محض ایک مضحکہ انگیز حرکت ہوگی۔" لیکن یہ بات قابلِ شکر ہے کہ مرزا فضل الدین مزاج کے معاملہ میں نکتہ رس نہ تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد پر مسلسل تقاضہ جاری رکھا۔ یہاں تک اُن کو یہ وعدہ حاصل ہو گیا کہ "ہر ہفتہ کچھ" ملتا رہے گا۔ جو کچھ اُن کو ہر ہفتہ ملتا رہا اُس سے ابتداء میں مرزا فضل الدین نے یہ سمجھا کہ مولانا آزاد اپنی خودنوشت سوانح عمری کو اپنے خاندان کے حالات سے شروع کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب مولانا آزاد موضوع سے ہٹنے لگے اور یہ معلوم ہونے لگا کہ وہ اصل مضمون پر آنا نہیں چاہتے تو مرزا فضل الدین اس پر مجبور ہوئے کہ اُن کو روکیں اور فہمائش کریں کہ مختصر لکھیں اور مطلوبہ موضوع پر لکھیں۔ لیکن مولانا آزاد کسی ہدایت کے پابند ہونے والے نہیں تھے۔ انھوں نے اصرار کے جواب میں لکھا "میری طبیعت میں رکاوٹ نہ پیدا کرو۔ جو کچھ بے اختیار قلم سے نکل جاتا ہے بھیج دیتا ہوں، جمع کرتے جاؤ ہر حال میں فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔"

لیکن مرزا فضل الدین بھی مایوس ہونے والے نہیں تھے۔ وہ رانچی پہنچ گئے اور مقیم ہو گئے۔ مولانا آزاد رانچی میں نظربند تھے۔ مرزا فضل الدین پندرہ سوال ایسے مقرر کر کے لے گئے کہ جن کے اندر مولانا آزاد کی زندگی کی تمام تفصیلات آ جاتیں۔ انھوں نے مولانا آزاد سے ان سوالات کے بالترتیب جوابات کا اصرار کیا لیکن مولانا آزاد نے اپنی شخصیت کو شاعرانہ اشارات کے مزیّن پردے کے اندر چھپا لیا اور اپنے وجود کو گویا ایک روحانی پیکر بنا لیا اور اُن کی مادّی زندگی ایسی ہو گئی کہ موضوعِ کلام سے خارج ہو گئی پھر مرزا فضل الدین

آج کل دہلی (ابوالکلام نمبر)

کو یہ اندازہ ہوا کہ وہ ناکامیاب رہے۔ لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مولانا آزاد نے جیسی سوانح عمری لکھی ہے ایسی نہ لکھی جائے تو کس قدر غلط فہمی کا باعث ہو سکتی ہے

تذکرہ دو جلدوں میں لکھا جانے والا تھا۔ مرزا فضل الدین کی اصل متن کی قطع برید اور طویل حاشیوں کی کاٹ چھانٹ بھی اس کو مختصر نہ کر سکی۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ دوسری جلد کا شائع ہونا بہت بعید ہے تو انھوں نے خود نوشت سوانح عمری کا مقالہ پہلی جلد کے ضمیمہ کے طور پر شامل کر دیا۔ کوئی کتاب بمشکل ناشر کی خواہش کے اس قدر خلاف ہو سکتی ہے جتنا کہ تذکرہ ہے اور ایسا بھی شاذ ہی ممکن ہے کہ کوئی مصنّف جس نے اپنے تخیل اور قلم کو آزاد رکھا ہو اور ترتیب اور تعلیل استدلال کا لحاظ چھوڑ دیا ہو۔ اس طرح ناشر کے دام میں آگیا ہو کہ وہ مسودہ پر نظرِ ثانی نہ کر سکے، حوالوں کی جانچ نہ کر سکے اور پروف بھی نہ پڑھ سکے۔ جب دو ثلث کتاب چھپ چکی تو مولانا کو اطلاع کی گئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ انھوں نے بے اعتنائی سے کہا "لوگوں نے اپنی دل جمعی اور فراغِ خاطر کی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ اپنی پریشان خاطری اور پراگندگیٔ طبع کی بھی ایک یادگار رہے تو بہتر ہے۔" یہ غیر محدود آمادہی ہے جس نے تذکرہ کو اشخاص کا ایسا موثر بیان اور مذہبی اور اخلاقی مسائل کا اس قدر پُر جوش مذاکرہ بنا دیا ہے اور یہ اس ہی سبب سے ہے کہ اس سے مولانا آزاد کی شخصیت واقعی طور پر اس قدر منعکس ہوتی ہے کہ کسی صحیح سے صحیح سوانح عمری سے بھی ظاہر نہیں ہو سکتی۔ تذکرہ واقعی موضوع نہیں ہے۔ وہ حمایتِ حق ہے جس کی تکمیل کے لیے تبحرِ علم و فضل اور الفاظ پر پُر زور اقتدار اور غیر معمولی قدرت کے طرزِ بیان سے کارفرمائی کی گئی ہے۔ مولانا آزاد اس سے بھی واقف ہیں کہ کن بیانات کی کمی کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ وہ بالارادہ ہیں اور ان کا مقصد ان کے موضوع کی زیادہ موثر وضاحت ہے۔ اُن کو اس کا بھی یقین ہوگا کہ بیانات میں جو غلو انھوں نے اپنے ذوق سے کیا ہے وہ اک دل آویزی ہے اور ناظرین کو محظوظ کرنے میں ناکام نہیں ہو سکتا۔

تذکرہ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ ابتداء میں جہاں مولانا آزاد اپنے خاندان کا مختصر ذکر کرتے ہیں اور اس استدلال پر ختم کرتے ہیں کہ خاندان سے آدمی نہیں بنتا۔ اور آخر میں تتمہ میں وہ اپنی "سوانح عمری" لکھتے ہیں۔ فی الحقیقت تذکرہ کو کماحقہ سمجھنا ممکن نہیں جب تک کہ اس کو اختتام سے شروع نہ کیا جائے۔ اس سے نہ صرف اُن کا اندازِ فکر واضح ہوگا بلکہ اُن کا زورِ بیان، روانی، اُن کی اشاریت، اُن کی اُردو زبان کے زمین و آسمان کی خداوندی بھی وہ صرف ادبی اکتساب ہی نہیں ہے بلکہ وہ روحانی قوت ہے اور اُس تجلی کا نتیجہ ہے جو اس دُنیا کی روشنی سے نہیں ہے۔ تذکرہ عمیق روحانی کیفیتِ مزاج کی تخلیق ہے اور اُس ہی کیفیتِ مزاج کے اثر میں پڑھا جانا چاہیئے۔

"یہ غریب الدیار عہد، ونا آشنائے عصر، بیگانۂ خویش، و نمک پروردۂ ریش، معمورہ تمنّا و خرابہ حسرت کہ موسوم بہ احمد و مدعو بابی الکلام ہے ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ ہجری بیں ہستی عدم سے عدم ہستی نما میں وارد ہوا۔ اور تہمت حیات منتہم، الناس نیام، اذا ماتو فانتبہوا۔

شد وستے شد وار خواب عدم چشم کشودیم — دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

والد مرحوم نے تاریخی نام "فیروز بخت" رکھا تھا۔ اور مصرعہ ذیل سے ہجری سال کا استخراج کیا تھا: جوان بخت و جوان طالع، جوان باد مکان الشّد۔ بخت کی فیروزی اور طالع کی ارجمندی! نیمۂ عمر لغزشوں اور ٹھوکروں کی پامالی و درماندگی میں بسر ہو چکی ہے۔ نیمۂ عمر جو شاید باقی ہے، دم لینے اور سستانے میں ختم ہو رہی ہے۔ نہ منزلِ مقصود کا پتہ ہے نہ شاہراہ منزل پر قدم، جب پاؤں میں تیزی اور ہمت میں جوانی تھی تو رہ نوردی اور منزل طلبی کا دروازہ نہ کھلا تھا اب پامالیوں اور افتادگیوں سے نہ قدم میں پامردی رہی نہ ہمت میں کارفرمائی تو طلب نے آنکھیں کھولیں اور غفلت نے کروٹ بدلی۔ راہ دُور اور نہ نشانِ منزل گم، کیسۂ زاد خالی اور سروسامان کار ناپید، وقت جا چکا اور ہر آن و لمحہ کا رفتار مقصود سے دوری اور منزل مراد سے مہجوری بڑھتی گئی۔ اب قدم کی تیزی اور ہمت کی چُستی واپس بھی مل جائے۔ پھر بھی وہ دولتِ وقت کب واپس مل سکتی ہے جو لُٹ چکی؟ اور قافلۂ اُمید کب پس ماندگانِ غفلت کی خاطر لوٹ سکتا ہے جو جا چکا؟۔

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر — یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

ساری فیروز بختی و جوان طالعی کا معاملہ آج نہیں کل فیصل ہونے والا ہے یوم تبیض وجوہ و تسود وجوہ۔ اصل فیروز مندی وہاں کی فیروز مندی ہے۔ اور جوان بخت وہی ہے جو اُس آنے والے دن آزمائش میں پورا اُترے نکل امرئ منہم یومئذ شان یغنیہ۔ اگر وہاں روح و ریحان و جنت النعیم

اور فوز عظیم کی پیروزی کامرانی ہاتھ آئی تو پھر جنت بجنت ارجمند ہے۔ لیکن اگر وہ ہو "یا لیتہا علیہا تسبقتا قرۃ اور لا ہشنی یومیذ الموہبۃ کی رسوائی اور محرومی ملی تو پھر اُس حرماں نصیبی کے لئے اُمید ہے نہ سرمایۂ حسرت کے لئے خانہ۔ جنت اسکتی رہی اور تخت دینی ہمیں ہاتھ آسکے نوشتہ کر لیا گیا۔

گر بدا نم کہ وصالش تو بدین دست دہد دل و دین را ہمہ در باختہ و تو فیری

ان خیالات میں منہمک ہونے کے بعد مولانا آزاد واقعات اور تاریخوں کی طرف منعطف ہوتے ہیں۔

"آبائی وطن دہلی مرحوم ہے۔ مولد عرب خدا بامن اور یاجنگ ما در زمین مکہ معظمہ ہے۔ دار الہجرت سیالکوٹ ہو و شہرستان غربت ہو رہی ہے۔ قبلۂ عبادت گزاران عشق وکعبۂ نیاز مندان شوق اعلی صاحبا الصلوٰۃ والتحیۃ

دارم دلے گرداں کہ من قبلہ نما یم خواہش رو سوئے ابروئیش کند ہر چند می گردانمش

اور وطن حقیقی کی نسبت کیا کہیے کہ بحکم "کن فی الدنیا کانک غریب" ہم سب غربت سرائے ارضی کے آوارہ و مسافر۔ تمام مسافران ہستی ایک ہی قافلۂ غربت کے رہ سپار۔ سب کو ایک ہی مستقر و مرطن درپیش البتہ کسی کے لئے ساءت مستقرا و مقاما ہیں داخل اور کسی خوش نصیب کے لئے حسنت مستقرا و مقاما۔۔۔

"مولد و منشاء طفولیت" وادی غیر ذی زرع عند بیت المحرم ہے۔ یعنی مکہ معظمہ زادہا اللہ شرفا و کرامۃ۔ محلہ قدوۃ متصل باب السلام۔۔۔۔

اس وقت کہ ۱۳۳۵ھ ہے گویا قریب الاختتام ہے قافلۂ برق رفتار عمر منزل ثلاثین تک پہنچ چکا ہے۔

یقولون ہل بعد الثلاثین ملعب فقلت وہل قبل الثلاثین ملعب ؟

قریب ہے کہ چند دن میں یہ منزل بھی پیچھے رہ جائے اور آگے کا حال کچھ معلوم نہیں۔

کس نمی گوید م از منزل آخر خبرے صد بیاباں بگذشت و دگرے در پیش است

جتنی زندگی گزر چکی ہے۔ گردن موڑ کر دیکھتا ہوں تو ایک نمود غبار سے زیادہ نہیں۔ اور جو کچھ سامنے ہے وہ بھی جلوہ سراب سے زیادہ نظر نہیں آتا۔ قلم درماندۂ تذکرہ و نگارش سے عاجز اور فکر گم گشتہ حیران اظہار۔ ولعیبۂ اپنی سرگذشت اور روداد عمر لکھوں تو کیا لکھوں؟ ایک نمود غبار و جلوۂ سراب کی تاریخ قلمبند ہو تو کیونکر ہو۔ دریا میں حباب تیرتے ہیں۔ ہوا میں غبار اڑتا ہے۔ طوفان نے درخت گرا دئے۔ سیلاب نے عمارتیں بہا دیں۔ عنکبوت نے اپنی پوری زندگی تعمیر میں بسر کر دی۔ مرغ آشیاں پرست نے کونے کونے سے چن چن کر تنکے جمع کئے۔ خرمن و برق کا معاملہ، آتش و خس کا افسانہ، الواسب کی سرگذشتیں لکھی جا سکتی ہیں تو لکھ دیجئے۔ میری سوانح عمری بھی ان ہی میں مل جائے گی۔ نصف افسانۂ اُمید اور نصف ماتم یاس۔

عاشق نہ شدی محنت الفت نکشیدی کس پیش تو غم نامۂ ہجراں چہ کشاید

پہلے مجسم اُمید تھا۔ اب سرتاسر حسرت ہوں۔

خونتبہ حالی چشم و دل یہ ہے اس کو آرام، اُس کو خواب نہیں

اس پر بھی اگر داستاں سرائی کا شوق ہو تو ان پورے تیس برسوں کی سرگذشت سن لیجیے۔ حکایت برق و خرمن کوئی افسانۂ دراز نہیں جس کے لئے پوری رات آنکھوں میں کاٹنی پڑے۔ صرف ایک نالۂ گرم اور آہ سرد میں پوری حکایت ختم ہے۔

ہمسایہ شنید نالہ ام گفت خاقانی را دگر شب آمد

ایک صبح امید تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے گزر گئی۔ ایک عید سے کہ دور ایام بہار آمد و رفت، ایک شام مایوسی تھی جس کی تاریکی کو اُمید کا کوئی چراغ روشن نہ کر سکا۔

بجھا ہے دل جب سے بھ حزیں کا چراغ جلتا نہیں کہیں کا

یاس و حسرت کے دو دن۔ ایک ہوس تعمیر میں بسر ہوا۔ ایک ماتم تخریب میں۔ ایک دن تنکے چنتے رہے، دوسرے دن دیکھا تو راکھ کا ڈھیر تھا جس پر جی بھر کے آنسو بہا دئے۔

دریں چمن کہ بہار و خزاں ہم آغوش است زمانہ جام بدست و جنازہ بر دوش است

ابو طالب کلیم نے چار مصرعوں میں پوری سوانح عمری لکھ دی۔

بدنامی حیات دو روزے نبود بیش آنہم کلیم با تو بگویم چساں گذشت
یک روز صرف بستن دل شد باین و آں روزے دگر بکندن دل زین و آں گذشت

اور در اصل اس شعبدہ گاہ ہستی کی بڑی سے بڑی مہلتوں کا بھی یہی حال ہے۔ لم یلبثوا الا عشیۃ او ضحاہا۔ اور قالوا لبثنا یوما او بعض یوم کلیم کو معلوم نہ تھا کہ اس سے پہلے یہی مضمون زیادہ ایجاز بلاغت کے ساتھ کہا جا چکا ہے۔

ومتی یسا عدنا الوصال، ودہرنا یومان، یوم نوی و یوم صدود

عہد طفلی ایک خواب بے عیش تھا۔ حیف صد حیف کہ ماند و خبردار شدیم آنکھیں کھلیں تو عہد شباب کی صبح ہو چکی تھی۔ اور خواہشوں اور ولولوں کی

شبنم سے خارستانِ ہستی کا ایک ایک کانٹا پھولوں کی طرح شاداب تھا۔ اپنی طرف دیکھا تو پہلو میں دل کی جگہ سیماب کو پایا۔ دُنیا پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس صبحِ فریب کے لئے نہ تو سوز و تپش کی دوپہر ہے، نہ اُمیدی و ناکامی کی شام یہ سارا شہرستان اُمید اور نگارخانۂ نظر فریب صرف ایک ہمارے ہی دیدۂ و دل کی کام جوئیوں کے لئے بنا ہے۔ اور گویا گوشہ گوشہ اور ذرّہ ذرّہ ہماری ہوسناکیوں کے لئے چشم براہ ہے۔ جس طرف کان لگایا یہی صدا سُنائی دی۔ معلوم نہیں اپنے ہی گنبدِ غفلت اور ہنگامۂ ہوس کی گونج تھی۔ یا نوگرفتارانِ طلسم شباب کی ہوش رُبائیوں کے لئے سازِ ہستی کا نوائے فریب ہی یہی۔

شہر لیست پُر ز خوبان، و ز ہر طرف نگارے یاران صلائے عام ست گومی کنید کارے

غفلت و مدہوشی نے افسوں پھونکا۔ سرمستی و سرگردانی نے جام بھرے جنونِ شباب نے ہاتھ پکڑا اور ولولوں اور ہوس نے جو راہ دکھلائی، دل کی خود فروشیوں نے اسی کو منزلِ مقصود سمجھا۔ ہوش و خرد کو گو پہلے حیرانی ہوئی لیکن پھر اس نے بھی آگے بڑھ کر اشارہ کیا۔ راہ ہے تو یہی ہے اور وقت ہے تو اسی کا، ساقیا مرنج از من عالم جوانی ہاست..... جس راہ میں قدم اٹھایا زنجیروں اور کمندوں نے استقبال کیا جس گوشہ میں پناہ لی وہی زندانِ ہوش و آگہی نکلا۔ ایک قید ہو تو ذکر کیجئے ایک زنجیر ہو تو اس کی کڑیاں گنیئے۔ دل ایک تھا مگر تیر ہزاروں ہاتھوں میں تھے۔ نظر ایک تھی مگر جلووں سے تمام عالم معمور تھا۔ ہر کشش نے اپنا تیر چلایا۔ ہر رہزن نے اپنی کمند پھینکی ہر فسوں ساز نے اپنا افسونِ محبت پھونکا۔ ہر جلوۂ ہوش رُبا نے صرف اپنے ہی دامِ الفت میں اسیر اور اپنی ہی فتراک اسیری کا نخچیر رکھنا چاہا۔

وائے بر صیدے کہ یک باشد و صیادے چند

یہ بات نہ تھی کہ امتیاز نے بالکل ساتھ چھوڑ دیا ہو اور دیدۂ اعتبار یک لخت کور ہو، برق نے بارہا چشمک کی، ستاروں نے کبھی کبھی پردۂ شب کی اوٹ سے جھانکا، لیکن رات کی تاریکی اور طوفان کی تیرگی ایسی نہ تھی جو ان چنگاریوں سے روشن ہو جاتی وہ برابر بڑھتی ہی گئی

رمیدنت ز دست رفتہ و عمر فسردہ پاسئے کارانِ دوا گذشتہ وا فسوں نہ کردہ کس

کبھی سرو کی بلند قامتی پر رشک آیا تو سربلندی اور سرفرازی کے لئے دل خون ہوا۔ کبھی سبزۂ پامال کی خاکساری و افتادگی پر نظر پڑ گئی تو اپنے پندار اور خود پرستی پر شرم آئی۔ کبھی بادِ صبا کی روش پسند آئی تو اقامت گزینی سے وحشت ہوئی۔ آوارگی و رہ نوردی کی دل میں ہوا سمائی۔ کبھی آبِ رواں کی بے قیدی و بے تعینی اس طرح جی کو بھائی کہ پابندیوں گرفتاریوں پر آنکھوں نے آنسو اور دل نے زخموں کے ساتھ ماتم کیا۔ پھولوں کو جب مسکراتے دیکھا تو اپنی آنکھوں نے بھی رونے میں کمی نہیں کی اور درختوں کو جب کبھی جنبش ہوئی شاخوں نے جھوم جھوم کے وجد کیا۔ تو اپنی سنگینی و بے حسی بھی ضرور یاد آ گئی۔ غرض کہ نہ تو اسباب ہی کی کمی تھی اور نہ استعداد بالکل مفقود تھی۔ بجلیاں کوندتی رہیں۔ بادل گرجتے رہے۔ لیکن افسوس کہ نیند بھی بڑی ہی سخت تھی۔ اور پشتِ غفلت کسی بڑے ہی سخت تازیانے کا انتظار کر رہی تھی

نہ پہنچی ضعف سے لب تک دعا ہی، ....

بہتر یہ ہے کہ صاف صاف ہی کہہ دیا جائے.....

"البتہ ساری ہلاکت اس میں ہے کہ ہنگامۂ غفلت و خود فراموشی میں نفسِ لوامہ کی صدائے شہادت بہت کم کانوں تک پہنچتی ہے اور پہنچتی ہے تو خود ہماری ہاتھ سرشاری و بدمستی کے نقاروں پر اس زور سے پڑ رہے ہیں کہ اُن کے شور و غل میں یہ سرگوشیٔ ملامت کب کام دے سکتی ہے.....

" لیکن دُنیا کی ساری سچائیوں اور یقینوں سے بڑھ کر یہ حقیقت ہے کہ

کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

اور اس راہ کی نیرنگیوں کا عجب حال ہے، کہ علم بے خبر افتاد و عقل بے حس شد۔ ہر چند راہ ایک ہی ہے۔ لیکن کرشمے بے شمار ہیں اور گو ہوش سب کھوتے ہیں۔ مگر ایک ہی جلوہ سے نہیں۔

اے ترا با ہر دلے رازے دگر ہر گدا را بر درت نازے دگر۔ کوئی پکارتا ہے اور دروازہ نہیں کھلتا۔ کوئی بھاگتا ہے اور کمند پھینکے جاتے ہیں۔ قانونِ طلب و سعی سے انکار نہیں۔ لیکن اگر وہ بے طلب دینا چاہے تو اس کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے.....

" ناگہاں جاذبہ توفیقِ الٰہی پردۂ عشقِ مجازی میں نمودار ہوا اور ہوس پرستی کی آوارگیوں نے خود بخود شاہراہِ عشق و محبت تک پہنچا دیا۔ آگ لگتی ہے تو رفتہ رفتہ شعلے بھڑکتے ہیں سیلاب آتا ہے تو بتدریج پھیلتا ہے۔ یہ تو ایک بجلی تھی جو ناگہاں نمودار ہوئی۔ چمکی اور دیکھا تو خاک کا ڈھیر تھا.....

اصل میں تین ہی منزلیں ہیں۔ ہوس، عشق، حقیقت

حاصلِ عمرم سہ سخن بیش نیست - خام بدم، پختہ شدم، سوختم، اور یہاں

عشق سے مراد عشق محدود و ناقص یعنی مجاز ہے۔ نہ کہ علی الاطلاق، کیونکہ اس اعتبار سے تو اول و آخر جو کچھ ہے عشق ہی ہے۔ تمام کائناتِ ہستی میں بجز اس کے ہے اور کون؟ آسمانوں کا ستون ہے تو یہی ہے، زمین کا مدار و محور قائم ہے تو اسی کے دم سے، دنیا میں جس قدر ظاہر ہے یہی ہے، جس قدر باطن ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ تمہاری نگاہ وحدت ناآشنا نے ایک ہی حقیقت کو طرح طرح کے ناموں سے موسوم کر دیا ہو۔ کتنے ہی پردے ہیں جو اسی کج نظری و کثرت بینی نے جمالِ حقیقت یگانہ و یک رنگ پر ڈال رکھے ہیں ؎

یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پرتوِ آن ہر کجا می نگری، انجمنے ساختہ اند

بلاشبہ یہ بھی لغزش تھی، لیکن اس لغزش کو کیا کہو گے جو محبوب کے قدموں پر گرا دیتی ہے؟ مقصود تو ساری باتوں سے اس تک پہنچنا ہے۔ اگر لغزش و مستی ہی رہنما بن جائے تو پھر کیوں نہ ہزار استقامتیں اس پر قربان ہوں، لاکھوں ہوشیاریاں اُس پر سے نچھاور ہوں ؎ گر طمع خواہد ز من سلطانِ دین، خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں۔ اصل یہ ہے کہ اس راہ کا سارا دارومدار قطع و وصل اور شکستگی و پیوستگی پر ہے اور قرب ایک منزل ہے جس تک پہنچنے کی راہ بعد ہی میں سے ہو کر نکلی ہے۔ یعنی ایک سے ملنے کے لئے سب کو چھوڑنا اور ایک سے جڑنے کے لئے سب سے کٹنا، اس دروازہ کا کھلنا اس پر موقوف ہے کہ وہ تمام دروازے بند کر دیئے جائیں جو پہلے کھول لئے تھے۔

درقبولِ نظرِ عشق ہزاران شرط است اول از عافیتِ رفتہ ندامت باشد

. . . .

"تو اب اصلی کام یہ ہوا کہ یہ ساری بندشیں کٹیں اور پرستش ماسوائے اللہ کی ساری زنجیریں ٹوٹیں۔ اس کے لئے دو ہی صورتیں ہیں، یا تو کوئی ایسا طاقت ور ہاتھ آمادۂ عقدہ کشائی ہو کہ گن گن کر ایک ایک گرہ کھول دے۔ ایک کے بعد ایک، ساری زنجیریں کھلتی جائیں۔ یا پھر ایک تلوار چمکے جس کا ایک ہی بھرپور ہاتھ چشم زدن میں ساری بندشوں اور زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دے، نہ ناخنِ گرہ کشا کی منت پذیری نہ زنجیروں کی حلقہ شماری کا انتظار ایک سوکھی لکڑی کو جلانے کے لئے ہزاروں تدبیریں کیجئے جب کہیں آگ سے دُھواں اٹھے۔ لیکن معلوم ہے کہ ہزاروں آشیانوں اور خرمنوں کے لئے بجلی کی ایک ہی نظرِ شعلہ بار کافی ہوتی ہے۔

آج کل دہلی (ابوالکلام نمبر)

گفتم چہ گونہ می کشی و زندہ میکنی از یک نگاہ کشت، بہ جوابے دگر نداد

. . . .

"ہوس و عشق پر کیا موقوف ہے؟ کوئی درمیانی منزل ہو اگر قدم آگے بڑھنے سے رُک گئے تو وہ ہی منزل بُت ہے اور رہرو اُس کا پرستار، تسبیح آرائی و دلق پوشی ہی کی منزل کیوں نہ ہو....

"چناں چہ الحمدللہ کہ اس منزل کے وقفہ نے بھی زیادہ طول نہ کھینچا۔ ایک سال پانچ ماہ کے اندر اس کوچہ کے بھی تمام رسم و راہ ایک ایک کر کے دیکھ ڈالے، کوئی گوشہ کوئی مقام نہ چھوڑا......

"اس راہ کے رسم و آئین اگرچہ بے شمار ہیں لیکن ہر رہرو کو دو مسلکوں میں سے ایک مسلک ضرور اختیار کرنا پڑتا ہے۔ یا قمری و بلبل کی آوارگی و شورش یا شمع کی خاموشی اور سوزش....

" اور معلوم ہے کہ شعلوں کی طرح بھڑکنا آسان ہے مگر تنور کی طرح اندر ہی اندر سلگنا اور حفظ و ضبط کے سارے آداب و شرائط سے عہدہ برا ہونا مشکل ہے

عریاں تنی خوش ست، دے زینت گرفت داماں چاک و گریباں دریدہ را

. . . .

اگر کسی نے عمر بھر دشت و صحرا میں نالہ زاری کی ہو تو کی ہو۔ یہاں ایک ایک گھڑی کا ایک ایک لمحہ ایسا گذر چکا ہے کہ سینکڑوں آہیں اندر ہی اندر چپکی ہیں۔ ہزاروں شورشیں سینہ کے اندر جلی ہیں، آنسوؤں کو آنکھوں کی وسعت نہ ملی تو دل کے گوشہ ہی میں طوفان اٹھاتے رہے.....

" اگرچہ اس معاملہ کا خاتمہ بظاہر ناکامی و مایوسی پر ہوا، لیکن فی الحقیقت فتح و مراد کی ساری شادمانی اسی ناکامیابی میں پوشیدہ تھی....

' وہی دنیا جس کے میکدۂ خود فراموشی نے غفلت کے جام لنڈھائے تھے اپنے ہر جلوہ سے آنکھوں کو، اپنے ہر نغمہ سے کانوں کو مستی و سرشاری کی پیہم دعوتیں دی تھیں۔ اب اس کا کونہ کونہ، چپہ چپہ، ہوشیاری و بینش کا مرقع تھا بصیرت و معرفت کا درس تھا۔ ذرّے ذرّے کو گرم گفتار پایا، پتہ پتہ کو کتبہ مسطور دیکھا، پھولوں نے زبان کھولی، پتھروں نے اٹھ اٹھ کر اشارے کئے، خاکِ پامال نے اُڑ اُڑ کر گہر افشانیاں کیں، آسمانوں کو بار بار اترنا پڑا تاکہ سوالوں کا جواب دیں، زمین کو کتنی مرتبہ اچھلنا پڑا تاکہ فضاء آسمانی کے تارے توڑ لائیں، فرشتوں نے بازو تھامے کہ کہیں لغزش نہ ہو جائے۔ سورج چراغ

ے کر آیا کہ کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔ سب نے نقاب اُتار دیئے، سارے پردے چھلنی ہو گئے، سب کی ابرؤں میں اشارے تھے، سب کی آنکھوں میں حکایتیں بھری تھیں ..... ۔

"حالات ابتداء سے جیسے اور جتنے رہے، سب کے سب اس حالت سے یکسر متضاد تھے۔ جن تک بتدریج رسائی میسّر آئی، قطع نظر اس معاملۂ خاص کے عقائد، اعمال، عادات، خصائل، فکر و نظر، طرز و روش، کوئی بات بھی تو ایسی نہیں ہے جس کو اپنے قدرتی حالات کے مطابق پاتا ہوں۔ پس اپنی تشنگی و خستگی نہ تو کسی ہاتھ کی ممنون ہے نہ کسی زبان کی، نہ کسی خاندان کی، نہ تعلیم و تربیت ظاہری کی، جو کچھ پایا ہے صرف بارگاہِ عشق سے پایا ہے جتنی نمایاں ملیں صرف اُسی مُرشدِ فیض و ہادیِ طریق سے ملیں....

"علم کا دروازہ اُسی نے کھولا، عمل کی حقیقت اُسی نے بتلائی، معرفت کے صحیفے اُس کی زبان پر تھے، حقیقت کے خزانے اُس کے دستِ کرم میں تھے شریعت کے حقائق کا وہی معلم تھا۔ طریقت کے نشیب و فراز میں وہی رہبر تھا قرآن کے بھید اُسی نے بتلائے۔ سنت کے اسرار اُسی نے کھولے، نظر اُسی نے دی۔ دل اُس نے بخشا، کون سی مشکل تھی جو اُس سے حل نہ ہوئی۔ کون سا اُلجھاؤ تھا جو اُس کی سلجھی ہوئی نظر سے نہ سلجھ گیا؟ کون سی بیماری تھی جس کی دوا اُس کے دارالشفا سے نہ مل سکی؟ .....

"ہاں۔ یہ ضرور ہے کہ اگر کسی کو اوّل روز سے اپنے زہد و پاکی کی خشک دامنی پر ناز ہو تو ہم کو بھی اپنی اُس رندی اور ہوسناکی کی تر دامنی کا کوئی شکوہ نہیں جس کی عین اکیس بائیس برس کی عمر تک دکہ جنونِ شباب کی سرمستیوں کا اصلی موسم ہوتا ہے، دونوں ہاتھوں سے اس طرح نچوڑا کہ ایک قطرہ بھی باقی نہ چھوڑا۔ کوئی صاف راہ پر دوڑ تا گیا ہے تو یہ اُس کی خوش نصیبی سہی لیکن ہم بھی اس کو بدنصیبی نہیں سمجھ سکتے کہ کتنی ہی دلدلوں سے پاؤں نکالے کتنی ہی جھاڑیوں میں دامن سنبھالا، کتنی ہی زنجیریں توڑنی پڑیں، ولولوں، اُمنگوں، اُمیدوں، تمناؤں کے کتنے ہی دفتر خود اپنے ہاتھوں سے جلانے پڑے، جب کہیں جاکر اس کوچہ میں دم لے سکے۔ جہاں آج اپنے آپ کو پار ہے ہیں ......"

یہ مسلمانوں کے مذہبی فکر کا ایک کارنمایاں ہے کہ پابندیٔ مذہب اور تصوّف میں مطابقت کر دی۔ اور مذہبی غلو جو شرعی پابندیوں کے اظہار میں بطورِ ریا داخل ہو گیا تھا۔ اس کی اصلاح جوشِ ایمانی کی قدر و منزلت بڑھا کر کر دی، خدا کی نگاہ میں منفعل گنہ گار کو، اُس محتاط متبعِ شریعت سے، جس کی طاعت رسمی و رواجی ہو لیکن دل سرد ہو، اکثر زیادہ بلند مرتبہ مرحمت ہوا ہے۔ لیکن تذکرہ محض آزادی کی حمایت نہیں تھا۔ اس کے برخلاف، مولانا آزاد پابندیٔ مذہب کی، اُن لوگوں کی پابندیٔ مذہب کی جنھوں نے حق اور کلمۃ الحق کی زمانہ ساز فقیہوں اور غیر محتاط صوفیوں اور بے دین حکمرانوں کے مقابلہ میں حمایت کی، اپنے مخصوص زورِ بیان سے تصدیق کرتے ہیں۔ وہ کسی طریقۂ خیال کے پیرو نہیں ہیں۔ وہ قرآن کی یا شریعت کی کوئی خاص تفسیر پیش نہیں کرتے۔ ان کا خاص تعلق رحمت سے معلوم ہوتا ہے۔ اور ایسا خاص تعلق ظاہر ہوتا ہے کہ جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ صحیح پابندیٔ مذہب، رحمت سے راسخ العقیدگی ہے۔

تذکرہ مولانا آزاد کے خاندان کے مختصر حال سے شروع ہوتا ہے۔ "میرے خاندان میں تین مختلف خاندان جمع ہوئے ہیں۔ اور تینوں خاندان ہندوستان و حجاز کے ممتاز بیوت علم و فضل اور اصحاب ارشاد و ہدایت میں سے ہیں۔ دنیوی عزت و جاہ کی اگرچہ اُن میں سے کسی نے خواہش نہیں کی لیکن دُنیا نے اپنی عزتوں اور شوکتوں کو ہمیشہ اُن کے سامنے پیش کیا اور کبھی انھوں نے قبول کیا، کبھی ردّ کر دیا۔"

مولانا آزاد یہ تذکرہ، یہ ظاہر کرنے کے لئے کرتے ہیں کہ اُن کا یہ خیال نہیں ہے کہ کسی خاندان سے متعلق ہونا کوئی اعزاز او رمباہات کی بات ہے۔ اُس کے بعد وہ شیخ جمال الدین (م۔ ۹۸۱ھ) کا ذکر کرتے ہیں۔ جو اُن کے مادری اجداد میں سے تھے۔ اُس کے بعد وہ اُس زمانہ کا ذکر کرتے ہیں جس میں شیخ جمال الدین تھے وہ اکبر کا عہد تھا۔ اکبر نے مرتبۂ خلافت و امامت کا ادّعا کیا تھا۔ یہ زمانہ اختلاف ہی کا تھا۔ بلکہ اُس وقت شدید مذہبی فساد برپا تھا۔ صوفی جو وحدت وجود کا عقیدہ رکھتے تھے۔ بھگت، جو لافرقیت کو مٹا دینا چاہتے تھے۔ صاحبانِ تہذیب، جو ہر چیز میں، ہر جگہ ذہنی غذا کے جویا تھے۔ سیاست پیشہ جو حکومت کی ضرورت سے اتحاد کے لئے کوشاں تھے، عورتیں، جو خاندانی زندگی میں تقریبات اور مراسم کے اضافہ سے تنوع پیدا کرنا چاہتی تھیں۔ ان سب نے ایسی صورت حالات پیدا کر دی تھی جس سے معلوم ہوتا کہ گویا انسان اخلاقی احکام کی پابندی کے بغیر رہ سکتا ہے۔

لیکن اس صورت حالات میں بھی جو لوگ الحق کا آلۂ کار بنے اور مذہبی وجوہ سے اُن علماء کے مقابلہ میں جو اُس زمانہ کے حالات کو قایم رکھنا اپنا حق سمجھتے تھے۔ اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالا۔ مولانا آزاد جس خاص فتنہ کا تذکرہ میں ذکر کرتے ہیں اُس میں حملہ کے بانی، زمانہ ساز علماء ہی تھے اور حامیٔ حق سید محمد جون پوری تھے۔ سید محمد کے اوپر الزام لگایا گیا تھا کہ انھوں نے اپنے مہدی ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ یہ مسلمانوں کا ایک عقیدہ ہے کہ آخر زمانہ میں قیامت سے پہلے امام مہدی ظاہر ہوں گے۔ مخالفت کرنے والے علماء نے سید محمد کی تعلیمات کی مخالفت اور اُن کی اخلاقی اور مذہبی حیثیت کو دبانے میں اپنی تمام طاقت اور اثر صرف کر دیا۔ ظاہری مخالفت سید محمد کے مہدیت کے دعوی کی تھی۔ مولانا آزاد نہایت اہمیت سے بیان کرتے ہیں کہ اصل مقصدِ مخالفت سید محمد کے تجدیدی رجحان، دعوت کلمۃ الحق اور اسوۂ حسنۂ حضرت رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کی دعوت کو دبانا تھا۔

سید محمد کے اوپر الزام لگایا گیا کہ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جو صریحاً کفر ہیں۔ اور اس سے مولانا آزاد کو یہ گفتگو کرنے کا موقعہ ملتا ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مستقل کیفیت وجدان پر فائز کیا ہے وہ کس حد تک اپنے بیانات کے ذمہ دار ہیں اور جس آزادیٔ بیان کے وہ مستحق ہیں وہ اُن کو ملنی چاہیئے۔ یہاں مولانا آزاد کی کیفیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ اللہ والے لوگ اُس فضل سے پہچانے جاتے ہیں جو اُن پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اُس زمانہ کے مومنوں پر واجب ہے کہ اُن کے بیانات کو فقہی تنقیحات کا موضوع نہ بنائیں۔ بلکہ اُن کے بیانات میں جو کچھ حق ہو اُس کو اخذ کریں۔

مولانا آزاد کے نزدیک پابندیٔ مذہب پر فخر و مباہات اور اعمال سے غفلت قابل نفرت ہے۔ وہ اپنی تمام انشاء پردازی کی قوت کو ایسے لوگوں کی بزرگی اور علوِ مرتبت بیان کرنے میں صرف کرتے ہیں، جیسے شیخ علائی (و۔ ۱۵۵۰) شیخ نیازی، شیخ جمال الدین جنھوں نے کلمۂ حق کی حمایت کی اور زمانہ ساز علماء مثل مولانا عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی کی فاسقانہ اور تباہ کن حکمت عملی کی مخالفت کی۔

یہ دونوں علماء اُس طبقہ کے تھے۔ جس نے شریعتِ اسلامی میں، غیر واقعی تاویلات، غلط اجتہاد اور پاکیزہ اخلاق کے اصولوں سے عدم توجہی کو داخل کر دیا۔ مولانا آزاد اُن ہی حالات کا اعادہ اور تکرار، اکبر کے زمانہ میں دیکھتے ہیں۔ جو اس سے پہلے زمانوں میں اللہ والوں کو برداشت کرنا پڑے۔ جیسے امام حسین علیہ السلام، شیخ سعید ابن مصعب، امام مالک امام حنبل، امام ابن تیمیہ، وہ اپنے زمانہ میں شک، تذبذب اور بے دینی کی لعنت دیکھتے ہیں۔ اور اُس کو ایسے شغف، سرجوشی اور کمال وثوق سے بیان کرتے ہیں کہ اُس کی مثال اُردو ادب میں نہیں ہے۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اعلائے حق کرنے والے ہندوستان میں اکیلے نہیں ہیں۔ بلکہ اُن شخصیتوں کے علاوہ جن کا ذکر آیا ہے۔ شیخ سلامی (و۔ ۱۵۴۷)، شیخ داؤد (و۔ ۱۵۷۴)، شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ وغیرہ نے اس سے پہلے حمایت حق کی۔

ایقان کے لئے ولولہ کی، تمام زندگی عمل صالح کے لئے وقف کرنے کی بدکاروں سے مقابلہ کرنے کے عزم کی اور اللہ کے فکر و غم میں شرکت کرنے کی ضرورت ہے۔ تذکرہ میں خاص طور پر اسلامی روایات کا ذکر ہے۔ اور یہ مولانا آزاد کے ارتقائے خیال کا نسبتاً ایک غیر پختہ منزلہ ہے۔ جس میں اُن کی بعد کی تصنیف ترجمان القرآن کی عالم گیریت کم ظاہر ہوتی ہے۔ اِن دونوں تصانیف کے درمیان یقیناً پندرہ بیس برس کا تفاوت ہے۔ یہ دونوں قطعاً مختلف حالات میں لکھی گئی ہیں یہ گفتگو ہو سکتی ہے کہ جس کیفیت مزاج میں تذکرہ لکھا گیا۔ اُس میں تبدیلی واقع ہو گئی ہو۔ مولانا آزاد کی سیاسی مصروفیات نے اس بات کو اُن پر واضح کیا کہ تصوّرِ حق و صداقت میں نیک کام کرنے کے فراخ ترمیدان کا شامل ہونا، روحانی ضرورت ہے۔ اور اس تخیل نے اُن کا تصوّرِ حق و صداقت اور زیادہ وسیع کر دیا ہو۔

لیکن واقعات ایک دوسرے رُخ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مولانا آزاد میں تبدیلی نہیں ہوئی وہ مسلم رہنما سے ہندوستان کے سیاسی لیڈر نہیں بنے۔ تذکرہ سے اُس کیفیت مزاج کی تصویر نظر آجاتی ہے۔ جس کیفیت میں وہ قومی تحریک سے نہایت موثر ہو گئے تھے کہ حق کی حمایت کریں اور اپنے ساتھ زیادہ سے زیادہ، ایسے لوگوں کو شامل کریں جو اُن کی روحانی زبان سمجھتے ہوں اور عظیم اخلاقی روایات کی حمایت کرنے کے لئے طلب کئے جا سکیں اُن کا تمام استدلال اپنے اندر وہ وعدہ مضمر رکھتا ہے۔ جو ترجمان القرآن کے اندر پورا ہوا، کلمۃ الحق کی تشریح اور تفسیر کا وعدہ، تذکرہ اور ترجمان القرآن ایک دوسرے کے متمم ہیں اور ترجمان القرآن کی روشنی میں تذکرہ نے تبلیغِ عقیدہ کو اپنے خطیبانہ طرزِ بیان میں پیش کر کے، عالم گیر مقبولیت اور رفعت حاصل کی ہے۔

گوپی ناتھ امن لکھنوی

مولانا آزاد ۔ غبارِ خاطر کے آئینے میں!

یوں تو پچھلی صدی سے اب تک اُردو میں خطوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے لیکن پچھلی صدی میں غالب کے خطوط (اُردوئے معلّٰی اور عودِ ہندی) اور موجودہ صدی میں مولانا آزاد کے مجموعۂ خطوط (غبارِ خاطر) کو طرۂ امتیاز حاصل ہے دونوں کا اندازِ نگارش جُدا لیکن دونوں نے بات میں بات پیدا کی ہے۔ مولانا کی زندگی غالب سے کہیں زیادہ ہمہ گیر تھی اس لئے اُن کے خطوط میں جو نکات اور مسائل پائے جاتے ہیں وہ غالب کے ہاں نہیں پھر بھی غبارِ خاطر میں مولانا نے سیاسیات کے تذکرہ سے گریز کیا ہے اگر کہیں اشارے ہیں تو اس انداز سے کہ مکتوب الیہ سمجھ جائے۔ غالب کے خطوط مختلف دوستوں، عزیزوں، شاعروں اور شاگردوں کے نام ہیں مولانا کے خطوط صرف ایک ہی ہستی کے نام یعنی صرف نواب صدر یار جنگ مکتوب الیہ ہیں۔ غالب نے گھر بیٹھے خطوط لکھے، مولانا کے بیشتر خطوط جن پر غبارِ خاطر مشتمل ہے، قلعہ احمد نگر کی نظربندی کے زمانے کے لکھے ہوئے ہیں یہ بھی ایک بڑا فرق ہے یہ خطوط مکتوب الیہ تک پہنچتے نہیں تھے لیکن مولانا کے دل کی تسلی ہو جاتی تھی گویا ان کی نوعیت میگھ دوت سے ملتی ہے جہاں ایک گندھرپ بادلوں سے مخاطب ہو کر اپنے دل کے جذبات بیان کر دیتا ہے۔ مجھے خود بھی سزا یافتہ اور نظربند قیدی کی حیثیت سے جیلوں میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے اور میرا یہ تجربہ ہے کہ جیل کی زندگی جسے عام طور پر بے چارگی کی زندگی سمجھا جاتا ہے۔ بڑی شدّت کی زندگی ہوتی ہے یعنی سیاسی قیدیوں اور نظربندوں کی طبیعت کے پردے جو ہر جیل میں کھلتے ہیں مولانا اس نظربندی کی حالت میں اپنے اصل روپ میں نظر آتے ہیں۔ ورنہ وہ عام نظروں میں یا مولوی ہیں یا سیاسی تھا یا پھر اس کے بعد وزیرِ تعلیم اور ان میں سے ہر حیثیت میں اُن سے کہا جا سکتا ہے کہ

ع ۔ نرخ بالا کُن کہ ارزانی ہنوز

اِن خطوں میں مولانا کی انفرادیت نظر آتی ہے وہ آزاد جو زمانے کو للکارتا ہے کہ مجھے رُلا کر تو دیکھ دل درد مند رکھتا ہے اور روتا نہیں لذّتِ غم کے مزے لیتا ہے اور چہرے پر شکن نہیں آنے دیتا (تو یہ تو یہ میں صیغۂ واحد غائب میں لکھنے لگا) ہاں تو مولانا فرماتے ہیں:۔

" جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگا اٹھتی ہوں کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں۔ جہاں دوپہر ہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح و شام چہکیں اُسے قید خانہ ہونے پر بھی، عیش و مسرّت سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے؟"

اسی طرح سونے جاگنے کے معاملے میں لکھتے ہیں:۔

" زندانیوں کے اس قافلہ میں کوئی نہیں جو سحر خیزی کے معاملہ میں میرا شریکِ حال ہو..... زندگی کی بہت سی باتوں کی طرح اس معاملہ میں بھی ساری دنیا سے اُلٹی ہی چال میرے حصّہ میں آئی۔ دنیا کے لئے سونے کا جو وقت سب سے بہتر ہوا وہی میرے لئے بیداری کی اصل پونجی ہوئی لوگ ان گھڑیوں کو اس لئے عزیز رکھتے ہیں کہ خوابِ شیریں کے مزے لیں میں اس لئے عزیز رکھتا ہوں کہ بیداری کی تلخ کامیوں سے لذّت یاب

ہوتا ہوں۔

خلق را بیدار باید بود تا آب چشم من
دیں عجب کا ندم کہ می گریم کسے بیدار نیست

ایک بڑا فائدہ اس عادت سے یہ ہوا کہ میری تنہائی میں اب کوئی خلل نہیں ڈال سکتا میں نے دنیا کو اپنی جراتوں کا شروع سے موقع ہی نہیں دیا وہ جب جاگتی ہے تو میں سو رہتا ہوں جب سو جاتی ہے تو اٹھ بیٹھتا ہوں۔"

اس آخری جملے سے گیتا کے دوسرے ادھیائے کا یہ شلوک ذہن میں آجاتا ہے جو مہاتما گاندھی کے وظیفۂ شام و سحر میں داخل تھا

یا نشا سرو بھوتانام تسیام جاگرت سینمی
یسیام جاگرت بھوتانی سا نشا پشیتو منیہ

(جو تمام مخلوق کے لئے رات ہوتی ہے اس میں جوگی جاگتا ہے اور جس میں تمام مخلوق جاگتی ہے اُسے رات دکھائی دیتی ہے ۔) یعنی ان منتخبان روزگار کی سحر و شام عوام سے الگ بلکہ متضاد ہوتی ہے۔

اسی انفرادیت نے مولانا میں بے پناہ قوتِ برداشت پیدا کر دی تھی اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مرزا غالب نے رنج گراں نشیں کی حکائتیں لکھی تھیں صبرِ گریز پا کی شکائتیں کی تھیں۔

کبھی حکایتِ رنجِ گراں نشیں لکھئے
کبھی شکایتِ صبرِ گریز پا کہئے

لیکن یہاں نہ رنج کی گراں نشینیاں ہیں کہ لکھوں نہ صبر کی گریز پائیاں ہیں کہ سناؤں رنج کی جگہ صبر کی گراں نشینیوں کا خوگر ہو چکا ہوں صبر کی جگہ رنج کی گریز پائیوں کا تماشائی رہتا ہوں۔"

سب سے سخت امتحان کا وقت مارچ - اپریل ۱۹۴۳ء کا تھا مولانا کی گرفتاری کے وقت بھی اُن کی اہلیہ بیمار تھیں مارچ میں حالت زیادہ خراب ہو گئی اور اپریل میں رحلت فرما گئیں اس درمیانی وقفہ میں جیل کے سپرنٹنڈنٹ اور مولانا کے جیل کے ساتھیوں نے چاہا کہ کوئی سبیل نکالی جائے کہ مولانا رفیقۂ حیات کا آخری دیدار کر لیں مگر مولانا کی طبعِ غیور نے اسے گوارا نہ کیا مولانا لکھتے ہیں:-

" جس دن تار ملا اُس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور یہ کہا کہ اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تو وہ اسے فوراً بمبئی بھیج دے گا۔ درمیان کی پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی۔ وہ صورتِ حال سے بہت متاثر تھا اور اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہتا تھا لیکن میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنی نہیں چاہتا پھر وہ جواہر لال کے پاس گیا اور اُن سے اس بارے میں گفتگو کی وہ سہ پہر کو میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں گفتگو کرتے رہے میں نے اُن سے بھی وہی بات کہہ دی جو سپرنٹنڈنٹ سے کہہ چکا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات حکومت بمبئی کے ایماء سے کہی تھی۔" غالب کا یہ شعر غالب سے زیادہ مولانا کے کیریکٹر پر صادق آتا تھا ؎

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم
گر بہ موج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

مولانا کے چند جملوں سے اُن کی اس انفرادیت کا اندازہ کیجئے۔

" لوگ بازار میں دکان لگاتے ہیں تو ایسی جگہ ڈھونڈھ کر لگاتے ہیں جہاں خریداروں کی بھیڑ لگتی ہو میں نے جس دن اپنی دکان لگائی تو ایسی جگہ ڈھونڈھ کر لگائی جہاں کم سے کم گاہکوں کا گذر ہو سکے

در کوئے ما شکستہ دلی مے خرند و بس
بازارِ خود فروشی ازاں سوئے دیگر ست

مذہب میں، ادب میں سیاست میں فکر و نظر کی عام راہوں میں جس طرف بھی نکلنا پڑا کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا۔

بارِ فیضانہ ز خود رفتہ معروست نہ داد
سیرِ صحرائے جنوں حیف کہ تنہا کردیم

جس راہ میں بھی قدم اٹھایا وقت کی منزلوں سے اتنا دور ہو گیا کہ جب مڑ کے دیکھا تو گردِ راہ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا اور یہ گرد بھی اپنی ہی تیز رفتاری کی اڑائی ہوئی تھی"

جہاں تک انانیتی ادبیات کا تعلق ہے مولانا نے ۹ جنوری ۱۹۴۳ء کے

خط میں اس پر بحث کی اور اسے پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ تجارتی ادب کتنا حقیر ہے یہی نہیں بلکہ خطیبانہ ادب اور عوامی ادب کی حقیقت بھی کھل جاتی ہے اس خط میں دنیا کی چند عظیم ہستیوں کے اندازِ فکر کا جو جائزہ لیا گیا ہے وہ دنیا کے ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔

مذہبی رواداری

مولانا مسلمان تھے، خاندانی عالم تھے، ترجمان قرآن فقہ و احادیث کے تمام رموز سے باخبر لیکن بایں ہمہ وہ کٹر مُلّا نہیں تھے۔ چنانچہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء کے خط میں الہیات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"دنیا میں وحدت الوجود کے عقیدہ کا سب سے قدیم سرچشمہ ہندوستان ہے غالباً یونان و اسکندریہ میں بھی یہیں سے یہ عقیدہ پہنچا اور مذہب افلاطون جدید نے جسے غلطی سے عرب نے افلاطون کا مذہب خیال کیا تھا اس پر اپنی اشراقی عمارتیں استوار کیں یہ عقیدہ حقیقت کے تصوّر کو ہر طرح کے تصوّری تشخصات سے منزہ کر کے ایک کامل مطلق تصوّر قائم کر دیتا ہے۔ اس تصوّر کے ساتھ صفات متشکل نہیں ہو سکتیں اور اگر ہوتی بھی ہیں تو تعینات و مظاہر کے اعتبار سے نہ کہ ذات مطلق کی ہستی کے اعتبار سے، اس عقیدہ کا روشناس اُس کی ذات کے بارے میں بجز اس کے کہ ہے اور کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ اگر ہم اپنے اشارات کی پرچھائیں بھی اس پر پڑنے دیتے ہیں تو وہ ذاتِ مطلق مطلق نہیں رہتی، تشخص اور غبار کے حدود سے آلودہ ہو جاتی ہے بابا فغانی نے دو مصرعوں کے اندر سب کچھ کہہ دیا ہے۔

مشکل حکایتے ست کہ ہر ذرہ عین اوست
اما نمی تواں کہ اشارت بہ او کنند

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے اُپنشدوں نے نفی ثبات کی راہ اختیار کی اور تنزیہہ کی 'نیتی نیتی' کو بہت دُور تک لے گئے لیکن پھر دیکھئے کہ اسی ہندوستان کو اپنی پیاس اس طرح بجھانی پڑی کہ نہ صرف برہما (ذات مطلق) کو ایشور (ذات متصّف و متشخص) کی نمود میں دیکھنے لگے بلکہ پتھر کی مورتیں بھی تراش کر سامنے رکھ لیں کہ دل کے اٹکاؤ کا کوئی ٹھکانا تو سامنے رہے۔

کرے کیا کعبہ میں جو سر تیرا بتخانہ سے آگہ ہے
یہاں تو کوئی صورت بھی ہے واں اللہ ہی اللہ ہے"

مولانا کی تفسیر قرآن میں اُن کی مذہبی رواداری اپنے بھرپور روپ میں نظر آتی ہے اس اعتبار سے ترجمان القرآن کا مقابلہ لوک مانیہ تلک کے گیتا رہسیہ سے کیا جا سکتا ہے ان دونوں کتابوں کا گہرا مطالعہ کرنے والا حقیقی معنوں میں مذہبی آدمی ہو سکتا ہے فرقہ پرست کبھی نہیں ہو سکتا اسی خط میں مولانا نے آگے چل کر لکھا ہے۔ "ہندوستان کے اُپنشدوں نے ذات مطلق کو ذات متصف میں اُتارتے ہوئے جن تنزلات کا نقشہ کھینچا ہے مسلمان، صوفیوں نے اُس کی تعبیر احدیت اور واحدیت کے مراتب میں دیکھی"

اب ذرا ملاحظہ کیجئے کہ مولانا ایک کٹر مُلّا کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ مولانا احمد نگر کے قلعہ میں جس کمرے میں نظر بند کئے گئے تھے اس میں چڑیاں بہت تھیں مولانا نے اُن میں سے چند کے نام بھی رکھ دیئے تھے جس کا نام مُلّا رکھا تھا اس کے متعلق لکھا کہ

"ایک چڑا بڑا ہی تنومند اور جھگڑالو ہے جب دیکھو زبان فرفر چل رہی ہے اور سر اٹھا ہوا اور سینہ تنا ہوا رہتا ہے جو بھی سامنے آ جائے دو دو ہاتھ کئے بغیر نہیں رہے گا کیا مجال کہ ہمسایہ کا کوئی چڑا اس محلہ کے اندر قدم رکھ سکے کئی شہ زوروں نے ہمت دکھائی مگر پہلے ہی مقابلہ میں چت ہو گئے جب کبھی فرش پر یارانِ شہر کی مجلس آراستہ ہوتی ہے تو یہ سرو سینہ کو جنبش دیتا ہوا اور دہنے بائیں نظر ڈالتا ہوا فوراً موجود ہوتا ہے اور آتے ہی اُچک کر کسی بلند جگہ پر پہنچ جاتا ہے۔ پھر اپنے شیوۂ خاص میں اس تسلسل کے ساتھ چوں چاں چوں چاں چوں چاں شروع کر دیتا ہے کہ ٹھیک ٹھیک قاآنی کے واعظک جامع کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے.... فرمایئے اگر اس کا نام مُلّا نہ رکھتا تو اور کیا رکھتا" اور جس چڑے کا نام صوفی رکھا ہے اس کے صفات یوں بیان کرتے ہیں

"ٹھیک اس کے برعکس ایک دوسرا چڑا ہے تعرف لا تنیا بہ اضداد ہم، اسے جب دیکھئے اپنی حالت میں گم اور خاموش ہے

کالی دا کہ خبر شد خبرش باز نیامد

بہت کیا تو کبھی کبھار ایک ہلکی سی ناتمام چوں کی آواز نکال دی

اور اس ناتمام چوں کا بھی انداز تلفظ و تحسن کا نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسی آواز ہوتی ہے جیسے کوئی آدمی سر جھکائے اپنی حالت میں گم پڑا رہتا ہو اور کبھی کبھی سر اٹھا کے 'ہا' کر دیتا ہو۔

"تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

دوسرے چڑے اس کا بیچھا کرتے رہتے ہیں گویا اس کی کم سخنی سے عاجز آ گئے ہیں۔ پھر اس کی زبان کھلتی نہیں البتہ دگا ہوں پر کان لگا بیٹھے تو ان کی صدائے خاموش سنی جا سکتی ہے۔

تو نظر باز نۂ ورنہ تغافل نگر ست
تو سخن فہم نۂ ورنہ خموشی سخن ست

میں نے یہ حال دیکھا تو اس کا نام صوفی رکھ دیا"

چاء سگریٹ

کھانے پینے کے معاملہ میں گاندھی جی اور مولانا آزاد کے نظریوں میں بڑا اختلاف نظر آتا ہے گاندھی جی چاء کو زہر اور مِل کی بنی ہوئی چینی کو سفید زہر کہا کرتے تھے۔ لیکن مولانا نے چاء کی تعریف میں بائیس صفحے لکھ دیئے گاندھی جی نے شکر کی جگہ گڑ استعمال کرنے کو کہا ہے۔ لیکن مولانا کو اس بات پر تاسف آمیز حیرت ہے کہ جواہر لال ایسا شخص گڑ کھانا پسند کرتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"جواہر لال چوں کہ مٹھاس کے بہت شائق ہیں اس لئے گڑ کا بھی بہت شوق رکھتے ہیں میں نے یہاں ہزار کوشش کی کہ شکر کی نوعیت کا یہ فرق جو میرے لئے اس درجہ نمایاں ہے انھیں بھی محسوس کراؤں لیکن نہ کرا سکا اور بالآخر تھک کر رہ گیا۔"

گاندھی جی سفید شکر کے اس لیے خلاف ہیں کہ اس کا غذائی جوہر نکل جاتا ہے لیکن مولانا یہ چاہتے ہیں کہ چاء کے لئے جو شکر ہو وہ بلور کی طرح بے میل اور برف کی طرح شفاف ہو یعنی وہ معمولی چینی سے بھی مطمئن نہیں کیونکہ اُن کے نزدیک یہ دوبارہ شکر اگرچہ صاف کئے ہوئے رس سے بنتی ہے مگر پوری طرح صاف نہیں ہوتی اس غرض سے کہ مقدار کم نہ ہو جائے، صفائی کے آخری مراتب چھوڑ دیئے جاتے ہیں، گاندھی جی اور مولانا آزاد کا یہ اختلاف محض سطحی نہیں، بات یہ ہے کہ گاندھی جی کا نظریۂ حیات افادی ہے

اور مولانا کا جمالیاتی۔ گاندھی جی سگریٹ کے بھی سخت خلاف ہیں۔ لیکن مولانا فرماتے ہیں:-

"میں نے چاء کی لطافت و شیرینی کو تمباکو کی تندی و تلخی سے ترکیب دے کر ایک کیفِ مرکب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے یعنی چاء کے پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی متصلاً ایک سگریٹ بھی سلگا لیا کرتا ہوں پھر اس ترکیب خاص کا نقشِ عمل یوں جماتا ہوں کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد چاء کا ایک گھونٹ لوں گا اور متصلاً سگریٹ کا بھی ایک کش لیتا رہوں گا۔"

اس معاملہ میں جب گاندھی جی اور مولانا کے نظریوں یا عمل کو سامنے رکھئے تو یہ نظر آتا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کی روش دونوں کے بیچ بیچ ہے مولانا نے خود اس چاء اور سگریٹ کے بارے میں فرمایا ہے کہ آپ کہیں گے چاء کی عادت بجائے خود ایک علت تھی اس پر مزید علت بڑھئے تا فرجام کا اضافہ کیوں کیا جائے۔ اس طرح کے معاملات میں امتزاج و ترکیب کا طریقہ کام میں لانا علتوں پر علتیں بڑھانا گویا حکایت بادہ و تریاک کو تازہ کرنا ہے۔ میں تسلیم کروں گا کہ یہ تمام خود ساختہ عادتیں بلاشبہ زندگی کی غلطیوں میں داخل ہیں لیکن کیا کہوں جب کبھی معاملہ کے اس پہلو پر غور کیا طبیعت اس پر مطمئن نہ ہو سکی کہ زندگی کو غلطیوں سے یکسر معصوم بنا دیا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس روزگار خراب میں زندگی کو زندگی بنائے رکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ غلطیاں بھی ضرور کرنی چاہئیں۔"

اس پر بے ساختہ برنارڈ شا کی وہ بات یاد آ جاتی ہے جو انھوں نے گاندھی جی کی شہادت پر کہی تھی کہ اس دنیا میں ضرورت سے زیادہ نیک ہونا بھی خطرناک ہے۔

قوتِ حافظہ

مولانا نے جس طرح اِن خطوں میں عربی، فارسی، اُردو کے اشعار اور فقروں کو جابجا نقل کیا ہے اس سے اُن کے حافظہ کی داد دینی پڑتی ہے ظاہر ہے کہ جیل میں تو اُن کے پاس وہ کتابیں تھیں نہیں جن کے اشعار نقل کئے گئے ہیں۔ لیکن مولانا نے اپنی یادداشت کے بل پر حوالے دیئے اور ٹھیک دیئے۔ لوک مانیہ تلک نے جب گیتا رہسیہ جیل میں لکھی تھی تو انھوں نے بھی بہت حوالے دیئے مگر حوالوں کی جگہ اس لئے چھوڑ دی تھی کہ جیل سے باہر پُر کی جائے گی

اور ایسا ہی ہو۔ یہ قوتِ حافظہ مولانا کی یک سوئی طبع کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ وہ طوفانوں میں بھی پُرسکون رہ سکتے تھے اور سیاسی ہنگاموں میں بھی اپنی ادبی شان قائم رکھ سکتے تھے یہ بڑی بات ہے جو اس عالم آب و گل میں خاص خاص لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اشعار اور فقروں کا برمحل حوالہ لاجواب ہے۔ اگر کوئی جواب ملتا ہے تو وکٹورین دور کے آخیر ادیب لارڈ اوبری کے یہاں جو پیس آف لائف اور پلیژرز آف لائف کے مصنّف تھے۔ مولانا فرماتے ہیں:-

" بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات برسوں تک حافظہ میں تازہ نہیں ہوتی گویا کسی کونے میں سو رہی ہے۔ پھر کسی وقت اچانک اس طرح جاگ اٹھے گی جیسے اسی وقت دماغ نے کواڑ کھول کر اندر لے لیا ہو۔ اشعار و مطالب کی یادداشت میں اس طرح کی واردات اکثر پیش آتی رہتی ہیں۔ تیس چالیس برس پیشتر کے واقعات کے نقوش کبھی اس طرح اُبھر آئیں گے کہ معلوم ہوگا ابھی ابھی کتاب دیکھ کر اٹھا ہوں مضمون کے ساتھ کتاب یاد آجاتی ہے۔ کتاب کے ساتھ جلد، جلد کے ساتھ صفحہ اور صفحہ کے ساتھ یہ تعیین، کہ مضمون ابتدائی سطروں میں تھا یا درمیانی سطروں میں نیز صفحہ کا رُخ کہ داہنی طرف کا تھا یا بائیں طرف کا۔"

محقق

محققوں کی دُنیا میں بھی مولانا صفِ اوّل میں ہیں۔ قلعہ احمد نگر پہنچے تو چند صفحوں میں وہاں کی ساری تاریخ بیان کر دی۔ چاء کا بیان کرنے پر آئے تو اس کی تاریخ قسمیں پینے کے طریقے سب اس انداز میں بیان کئے کہ چاء نہ پینے والا بھی پورا لطف لے سکتا ہے۔ ۷ اکتوبر کے خط الٰہیات کا ذکر کرتے ہیں تو قدیم عقیدوں سے لے کر جدید تحقیقات تک کے حوالے دل کش اور ذہن کش انداز میں پائے جاتے ہیں۔ ویدوں کے زمانہ سے لے کر آئن سٹائن کی تھیوری تک ان کی طبع رسا کی جولانی نظر آتی ہے تمام متمدّن ملکوں اور قوموں کے عقیدوں کی کہانی چند صفحوں میں بیان کر کے گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ یہی کیفیت ۵ دسمبر کے خط میں ہے جس میں پانچویں صلیبی حملہ کی سرگزشت اور اس کے سیاسی اور مجلسی نتیجوں کا تذکرہ ہے۔

صاحبِ داستان

چڑیا چڑے کی کہانی کے عنوان سے جو خط غبارِ خاطر میں درج ہے اُس سے مولانا کی قوتِ بیان کا اندازہ ہوتا ہے۔ الفاظ کی دل کشی، واقعات کا مشاہدہ، ذاتی تجربہ، طبیعتوں کا جائزہ غرضیکہ اِن داستانوں میں ایک صاحبِ دل کا دل اور ایک صاحبِ نظر کی نظر دکھائی دیتی ہے۔ ایک فلسفی کس طرح قدرتی مناظر کو دیکھتا، اور اُن کا لُطف لیتا اور رنگینی کے ساتھ انھیں بیان کرتا ہے اس کا نمونہ شاید ہی اس سے بہتر کہیں مل سکے۔

چند نشتر

ان خطوں میں چند در چند نشتر ہیں بہ خوفِ طوالت صرف دو پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ جب لوگ کام جوئیوں اور خوش وقتیوں کے پھول چن رہے تھے تو ہمارے حصّے میں تمناؤں اور حسرتوں کے کانٹے آئے انھوں نے پھول چُن لئے اور کانٹے چھوڑ دیئے ہم نے کانٹے چن لے اور پھول چھوڑ دئے۔

۲۔ یکسانی بجائے خود زندگی کی سب سے بڑی بے نمکی ہے۔ تبدیلی اگرچہ سکون سے اضطراب کی ہو مگر پھر تبدیلی ہے اور تبدیلی بجائے خود زندگی کی ایک بڑی لذّت ہوئی۔ عربی میں کہتے ہیں ُحمضوا مجالسکم' اپنی مجلسوں کا ذائقہ بدلتے رہو سو یہاں زندگی کا مزہ بھی انھیں کو مل سکتا ہے جو اس کی شیرینیوں کے ساتھ اُس کی تلخیوں کے بھی گھونٹ لیتے رہتے ہیں۔

ایک سوال اور اُس کا جواب

مولانا کی انفرادیت تنہائی پسندی علمیت اور فلسفیانہ رُخ سے زندگی کو دیکھنے کی نظر کے ہوتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ وہ اتنے بڑے لیڈر کیسے بن گئے اُس کا جواب ان کی مندرجہ ذیل عبارت کے آخر جملہ میں ہے۔

" زمانے کے بہت سے جّبے میرے لئے بیکار ہو گئے، لوگ اگر میری طرف سے رُخ پھیرتے ہیں تو بجائے اس کے کہ دل گرفتہ ہو اور زیادہ منت گذار ہونے لگتا ہے کیونکہ ان کا جو ہجوم لوگوں کو خوش حال کرتا ہے میرے لئے بسا اوقات ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ اگر عوام کا رجوع و ہجوم گوارا کرتا ہوں تو یہ میرے اختیار کی پسند نہیں ہوتی، اضطرار و تکلّف کی مجبوری ہوتی ہے۔ میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈا تھا۔ سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈ نکالا۔"

اسی وجہ سے مولانا میں خلوت در انجمن اور انجمن در خلوت کی کیفیت رہی بقول پنڈت جواہرلال نہرو کے ایسا جامع کمالات شخص جس میں قدیم و جدید کی ایسی آمیزش ہو اور جس میں ماضی اور مستقبل کی اتنی صلاحتیں ہوں اب پیدا ہونا مشکل ہے۔

عبدالرزاق ملیح آبادی

مولانا آزاد فقر و فاقہ میں!

(کچھ تاثرات)

سن ۱۹۲۲ یا ۱۹۲۳ء کی بات ہے کہ مولانا انتہائی مالی مصائب میں مبتلا تھے۔ میں ان کے گھر ہی کا آدمی تھا۔ ہر وقت کا ساتھ تھا۔ دوپہر کا کھانا بھی ساتھ ہی ہوتا تھا اور مجھ سے گھر کی کوئی بات بھی چھپ نہیں سکتی تھی۔

دنیا جانتی ہے کہ مولانا ازحد نفاست پسند اور عالی دماغ آدمی تھے۔ جو کچھ ہو بہتر سے بہتر ہو، اعلیٰ سے اعلیٰ ہو۔ سگریٹ کے عادی تھے اور قیمتی سے قیمتی سگریٹ پیا کرتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں سستے سے سستے گھٹیا سگریٹ پر اتر آئے تھے۔ یقیناً سخت ترین اذیت میں مبتلا ہوں گے۔ آدمی کے لئے ہر مشکل آسان ہے مگر ذہنی کوفت کا جھیلنا آسان نہیں۔ وہ بڑے انسان ہی ہیں جو ذہنی اذیتوں اور دماغی کلفتوں میں بھی اپنے اعصاب پر قابو رکھتے ہیں اور اپنی اندرونی ویرانی کو ظاہر ہونے نہیں دیتے۔

مولانا نے آنکھ کھولی تو سونے کا چمچہ ہاتھ میں تھا۔ بہت بڑے پیر کے نور نظر تھے۔ دولت ہی دولت برستی تھی۔ ایسے آدمیوں کے لئے فقر و فاقہ دوسروں سے کہیں زیادہ مصیبت اور ذہنی اذیت کا سبب بن جاتا ہے۔ مگر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مولانا اس فقر و فاقہ میں بھی زیادہ سے زیادہ ہشاش بشاش رہتے تھے۔ کبھی ان کے ماتھے پر بل نہیں دیکھا۔ کبھی گھبرائے نہیں بلکہ ان "خوشحال" دنوں میں مولانا کی بشاشت اور ظرافت عروج پر پہنچ گئی تھی۔

دوپہر کا کھانا تو لازمی طور پر ساتھ ہی ہوتا تھا۔ ارہر کی اُبالی دال اور ابلے ہوئے چاول، یہ ہمارا دوپہر کا کھانا تھا۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا کھانا تھا۔ یہ دن بھر کا وقت وہ ہوتا تھا کہ مولانا کی پوری فصاحت اور خطابت ہاتھ جوڑ کر ان کے ذہن کے میدان میں کھڑی ہو جاتی تھی اور مولانا کی زبان بسم اللہ کے بغیر چل پڑتی تھی، چل نہیں پڑتی تھی طوفان اُٹھاتی تھی اور طوفان بٹھاتی تھی۔ سننے والا اکیلا میں ہوتا تھا، دم بخود بیٹھا رہتا، ٹکر ٹکر دیکھا کرتا۔ بھوک کا تقاضا سخت ہوتا۔ کھانا سامنے موجود ہوتا مگر ابوالکلام کی زبان آخر ابوالکلام کی زبان تھی، رکتی کیسے۔ مگر بے حد حساس بھی تھے، کہتے "مولوی صاحب! آپ کچھ نڈھال سے دکھائی دیتے ہیں کہیں مرض عشق میں تو مبتلا نہیں ہو گئے؟

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔"

میں عرض کرتا جناب مدت سے آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ اب تو کھانا بھی آ چکا ہے اور پڑا ٹھنڈا ہو رہا ہے، کیوں نہ صاف کر دیا جائے۔

اس پر اور زیادہ جوش و خروش سے تقریر شروع ہو جاتی اور دیر پر دیر کرتے چلے جاتے۔ میری بھوک اور بھوک سے میری بے تابی کا بڑا لطف اُٹھاتے۔

آخر کھانے کو نپٹانا ہی پڑتا۔ اب مولانا کی فصاحت و بلاغت ارہر کی اُبالی دال اور بھات کے فضائل بیان کرنے پر ایسی رواں دواں ہوتی کہ اس کا کہیں جواب نہیں۔

میں تو حیرت میں ڈوب ڈوب جاتا۔ ارہر کی دال سب دالوں سے افضل کیوں ہے، اور بگھاری نہ جائے تو تندرستی ہی کے لئے نہیں زندگی کے لئے بھی گارنٹی ہے۔ لیکن بگھار دینے سے دال کے خواص کس طرح بدل جاتے ہیں اور وہ تندرستی کے لئے کیسی خطرناک بن جاتی ہے۔

یہ سب تقریریں اس جلیل القدر انسان کی اس لئے ہوتیں کہ مجھے بہلائے

رکھے اور احساس نہ ہونے دے کہ فقر و فاقہ چھایا ہوا ہے۔ میں تو سب کچھ جانتا بوجھتا تھا مگر انجان بنا رہتا تھا تاکہ مولانا کو تکلیف نہ ہو۔ خود مولانا بھی جانتے تھے کہ صورتِ حال سے باخبر ہوں۔ مگر مجھ سے کچھ فرماتے نہیں تھے۔ میں مہمان تھا اور میرا میزبان فاقوں پر تھا۔ عجب گومگو کا معاملہ تھا۔ مگر میرے لئے کھانے سے کہیں زیادہ مولانا کی تقریریں لذیذ تھیں، اور ان دنوں میں دعائیں کیا کرتا تھا کہ فقر و فاقہ پھیلتا چلا جائے اور میں مولانا کی زبان سے بکھرے ہوئے پھول چنتا چلا جاؤں۔

مصیبت کے انھیں دنوں میں مولانا محمد علی، شوکت علی اور ان کے ساتھ مولانا آزاد سبحانی کلکتے آئے اور مولانا کے مہمان بن گئے۔ سبحانی صاحب کو مولانا پسند نہیں کرتے تھے۔ اکیلے مولانا ہی نہیں ہر آدمی مرحوم سے دور رہنا چاہتا تھا۔ لائق آدمی تھے، بہترین مقرر بھی تھے، مگر کوئی ایسی بات بھی تھی کہ تمام قابلیتوں کے باوجود مقبول نہ ہو سکے اور افسوسناک طریقے پر زندگی بسر کی۔

ان دنوں مولانا سبحانی گاندھی جی کے "پکے چیلے" بنے ہوئے تھے۔ ننگے سر، ننگے پاؤں، ایک لنگوٹی سر پر بندھی ہوئی۔ کھچڑی داڑھی، سر کے کھچڑی بال۔ بڑی مضحکہ صورت تھی

مولانا آزاد کی نفیس طبیعت دیکھتے ہی منقبض ہوگئی۔ ایک رنگ آتا تھا ایک رنگ جاتا تھا۔ بار بار میری طرف بے بسی سے نگاہیں اٹھاتے تھے۔ بے شک بے بس تھے۔ مہمان کو کہتے تو کیا کہتے۔ لیکن میں خوب سمجھ رہا تھا اور بعد میں مولانا نے خود بھی ظاہر کر دیا کہ مولانا سبحانی کے نازل ہو جانے سے ان کے دل و دماغ کو جو تکلیف پہنچی اپنی کی پوری زندگی میں بھی اس کے عشرِ عشیر سے بھی سابقہ نہ پڑا تھا۔

لیکن یہ شخص کو وقار و حلم بھی تھا، فوراً سنبھل گیا اور بڑی خندہ پیشانی سے پہلے علی بھائیوں سے پوچھا کیا کھاؤ گے؟ آپس میں سخت چشمک تھی۔ انتہائی رقابت تھی بلکہ دشمنی کہنا بھی شاید خلافِ واقعہ نہ ہو۔ لیکن جب مل جاتے تھے تو بڑی پرلطف صحبتیں رہتی تھیں۔ ایسی ایسی بے تکلفیاں برتی جاتی تھیں کہ بیان میں نہیں آ سکتیں۔ شوکت علی مرحوم تو بس "بڑے بھائی" تھے اور بے تکلفی کی صحبتوں میں کہا کرتے تھے۔ "سگ باش برادرِ بزرگ مباش" محمد علی محمد علی تھے۔ ان کی ذہانت، فطانت، حاضر دماغی، حاضر جوابی کا ملک بھر میں جواب نہ تھا لیکن ہاں ابوالکلام بھی ابوالکلام تھا اور محمد علی مرحوم پر آخر بھاری ہو ہی جاتا

کرتا تھا۔

بہرحال مولانا نے بے تکلفی سے، ایسی بے تکلفی سے جیسی "لنگوٹیا یاروں میں ہوتی ہے۔" علی بھائیوں سے پوچھا۔ کیا کھاؤ گے بلکہ "کیا زہر مار کرو گے؟" دونوں بھائی بہت ہنسے۔ خوب خوب چوٹیں چلیں۔ آخر پلاؤ، زردہ، قورمہ اور نہ جانے کیا کیا کھانے طے پا گئے۔

پھر مولانا، آزاد سبحانی مرحوم سے مخاطب ہوئے۔ "مولانا آپ اپنی پسند کا کھانا تجویز کریں۔" مرحوم نے کئی پہلو بدلنے کے بعد فرمایا۔ "مولانا میں تو دنیا ہی کو چھوڑ چکا ہوں۔ اناج سے اور اناج کے ہر پکوان سے یک لخت اجتناب ہے۔ مہاتما سے عہد ہو چکا ہے۔"

میں نے دیکھا مولانا کا چہرہ تمتما اٹھا۔ مگر پھر سنبھل گئے اور ہنس کر فرمایا "مگر مولانا آپ ہوا کھا کر تو زندہ نہیں رہتے۔" اشارہ تھا کہ آپ او سر سانڈ سے تو نہیں ہیں۔ مولانا سبحانی خفیف ہوئے۔ پھر فرمایا۔ "مولانا اس فقیری کی زندگی میں ممکن ہوتا ہے تو صرف دو ہی چیزیں کھاتا ہوں ـــ کباب اور رس گلّے۔"

اس پر علی بھائیوں کے جو قہقہے بلند ہوئے کاش ریکارڈ کر لئے جاتے۔ مگر مولانا سبحانی ٹس سے مس نہ ہوئے اور کباب اور رس گلّے اتنے کھائے کہ سیر ہو گئے۔ ماشاءاللہ غذا اچھی خاصی تھی۔ یاد پڑتا ہے کہ ایک بڑی پلیٹ شامی کبابوں سے بھری تھی اور رس گلّے تو مجھے یاد ہیں خود میں نے منگائے تھے۔ پورے دو سیر بہترین بنگالی دکان بھیم ناگ سے۔

لیکن اس فقر و فاقے میں یہ آفت مولانا نے کیسے جھیلی!

روپیہ قرض منگایا گیا۔ حاجی فقیر محمد پشاوری مرحوم یا حاجی اللہ بخش پشاوری مرحوم سے میں ہی جا کر ۲۰۰ روپیے لایا تھا۔

فقرِ و فاقہ کے اس زمانے میں مولانا گھر سے باہر نہیں جاتے تھے۔ مجبوراً جانا ہی پڑتا تو کلکتے میں ٹیکسی پر اور کلکتے کے باہر ریل کے فرسٹ یا سیکنڈ کلاس میں۔ یہ ... کچھ بھی قرض سے ہی ہوا کرتا تھا۔

لیکن ایک دفعہ مولانا کو ٹریم گاڑی پر بھی بیٹھنا پڑا۔

بات یہ ہوئی کہ مولانا کے اور میرے ایک عرب دوست سید محمد عمری مرحوم تھے۔ لکھ پتی تھے۔ سگریٹ کے کارخانے کے مالک تھے۔ پھر ایسے حالات پیش آئے کہ تمام دولت غائب ہو گئی اور پیسے پیسے کے محتاج ہو گئے۔ لیکن موٹر ابھی تک باقی تھی اور مولانا کی کوٹھی میں کھڑی ہوتی تھی۔ عمری مرحوم حیدرآباد گئے ہوئے

تھے۔ نہ جانے کیوں مولانا کو خیال ہوا کہ ڈائمنڈ ہاربر چلا جائے اور سمندر کی سیر کی جائے۔ اسکیم طے پا گئی۔ موٹر میں پٹرول بھرا گیا اور مولانا کے ساتھ میں، قاضی نورالانام اور ڈپٹی نجم الدین بیٹھ گئے۔ موٹر چل پڑی۔ ڈائمنڈ ہاربر کلکتے سے ۳۰۔۴۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ موٹر اڑی چلی جا رہی تھی، دفعتاً رُک گئی۔ کوئی خرابی ہوگئی تھی۔ ڈرائیور نے پوری کوشش کی مگر بے سود۔ آخر اعلان کر دیا موٹر چل نہیں سکتی۔ ہم لوگ کلکتے سے بہت دور ایک اُجاڑ جگہ پر تھے۔ ۱۵۔۲۰ منٹ چل کر ایک ریلوے اسٹیشن پر پہنچ سکتے تھے۔ آخر جانا ہی پڑا۔ مگر یہ اسٹیشن چھوٹی لائن کا تھا۔ بڑی کوفت ہوئی لیکن کرتے تو کیا کرتے۔ مجبوری کے ایسے موقعوں پر مولانا اپنے آپ کو سنبھال کے ایسے بن جاتے تھے جیسے کوئی پریشانی نہیں ہے اور لطائف و ظرائف کے نہ ختم ہونے والے خزانے کھل جاتے تھے

مگر ہم ایک کورده مقام میں تھے اور چھوٹی ریلوے کے اسٹیشن سے سابقہ تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ سمندر پر پہنچ کر کھانے پینے کی فکر کریں گے۔ مگر اب ہم سمندر سے دور یہاں تھے۔

یوں تو بھوک نہیں لگتی لیکن معلوم ہو جائے کہ کھانے کا سامان ممکن نہیں تو بھوک ٹوٹ پڑتی ہے۔ اب ہم بہت بھوکے تھے۔ ڈپٹی نجم الدین کی عمر ۸۰۔۸۹ سے کیا کم ہوگی۔ سب سے زیادہ بھوک میں مبتلا یہی تھے۔ خود مولانا بھی بھوکے تھے مگر ظاہر کیسے کرتے۔ اسٹیشن پر کسی قسم کا کوئی کھانا نہ تھا۔ اب ہم کریں تو کیا کریں۔ بڑی مایوسی سے دوچار تھے۔ دفعتاً ایک لڑکا نمودار ہوا سر پہ ٹوکری اٹھائے۔ ہم سب اس پر لوٹ ہی تو پڑے۔ صرف مولانا اپنی جگہ پر کھڑے مسکراتے رہے۔ ٹوکری اتروائی تو بالکل کچے امرود نکلے۔ ڈپٹی صاحب خوشی سے چیخ اٹھے۔ پوری ٹوکری خریدلی گئی۔ میں نے عرض کیا لیکن یہ کچے امرود آپ کھائیں گے کیسے دانت کہاں ہیں؟ ڈپٹی صاحب نے فرمایا۔ چبائے بغیر ہی نگلے جائیں گے۔ مولانا اس نظارے سے پورا لطف اٹھا رہے تھے۔ مگر آخر بھوکے تو تھے ہی امرودوں پر وہ وہ ہاتھ مارے کہ آج تک یاد ہے۔ امرود چٹ کرنے سے کچھ تسلی ہوگئی۔ مگر ریل آنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ گرمی سخت تھی اور ہم پسینے سے

شرابور۔ مگر مولانا پر اس آفت کا ذرا اثر نہ تھا۔ چٹکلوں پر چٹکلے کرتے چلے جاتے تھے اور جب سنجیدہ ہوتے تو مناسب موقع کوئی تاریخی واقعہ سنانے لگتے یا پھر کلام اللہ کی کسی آیت پر موتی لٹانے لگتے۔

یہ واقعہ ہے کہ مصیبت کے اس زمانے میں مولانا کی زندہ دلی اور دقائق دیکھ کر میں عش عش کیا کرتا تھا۔ حیرت ہوتی تھی کہ اس شخص میں کیسی قوتِ برداشت ہے، خدا پر کیسا بے حساب بھروسہ ہے۔ آدمی مصیبت میں ہی پہچانا جاتا ہے اور مولانا ہر مصیبت میں خواہ کتنی ہی بڑی رہی ہو، سرفراز ہی رہے۔

لیکن ابھی ایک مضحکہ خیز واقعہ اس داستان کی تکمیل کے لئے باقی ہے۔ اُکتا ڈالنے والے کئی گھنٹوں کے بعد خدا خدا کرکے ریل گاڑی آئی اور ہم سوار ہوگئے۔ چیونٹی کی چال چل کر ریل نے ہمیں کلکتے کے مضافات خضرپور میں اُتار دیا۔ ہر چند تلاش کرتے رہے کوئی ٹیکسی نہ ملی۔ اب شام ہو رہی تھی مجبوراً ٹریم گاڑی میں بیٹھنا پڑا۔ مولانا ٹریم کی بنچ کے بالکل کنارے اس طرح بیٹھے تھے گویا جست لگانے کے لئے بالکل تیار ہیں۔ بیٹھے نہیں بس یوں سمجھئے کہ بنچ پر ٹکے ہوئے تھے اور گھبرا کر ہر طرف دیکھتے جاتے تھے کہ کسی کی نگاہیں تو نہیں پڑ رہی ہیں۔ بالکل گم سم تھے۔ ایک اسٹینڈ آیا اور ٹریم ٹھہر گئی۔ ایک دو مسافر داخل ہوئے۔ ٹریم ابھی حرکت میں نہیں آئی تھی کہ ایک مسافر نے زور سے نعرہ مارا "السلام علیکم مولانا!" ساتھ ہی ہاتھ پکڑ کے چومنا شروع کر دیا۔ اب مولانا کی حالت ایسی ہو گئی جیسے تپ دق کا کوئی بیمار آخری مرحلے میں ہو۔ چہرہ بالکل سفید، ہونٹ بھنچے ہوئے، آنکھیں نیچی، کسی قدر تلخ لہجے میں اس آفت ناگہانی معتقد سے فرمایا۔ "بیٹھ جاؤ میرے بھائی۔" پھر مجھے بڑی بے بسی کی نظروں سے دیکھا۔ میں تو مزاج آشنا تھا ہی، اُٹھ کھڑا ہوا اور ٹریم کی رسی زور سے کھینچ کر پوری طاقت سے گھنٹی بجانا شروع کر دی۔ ایک آدھ منٹ کے اندر ٹریم رک گئی۔ ہم سب اُتر پڑے اور مولانا نے فرمایا۔ "سخت کوفت اُٹھانا پڑی، ہم ٹیکسی کا انتظار کریں گے۔" ٹیکسی جلد مل گئی اور ہم گھر پہنچ گئے۔ مگر اس داستان کا چرچا مولانا نے مہینوں اپنی خاص وضع سے جاری رکھا۔ اتنا ہنسایا اتنا ہنسایا کہ اب کیونکر بیان کروں۔



مولانا آزاد مہاتما گاندھی کی چتا پر
۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء



مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر رادھا کرشنن
(اگست ۱۹۴۷ء)

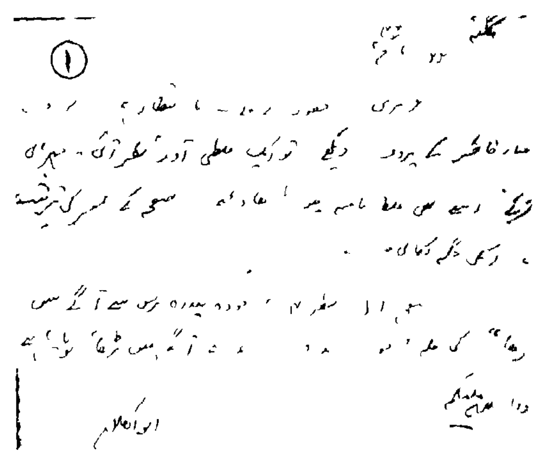


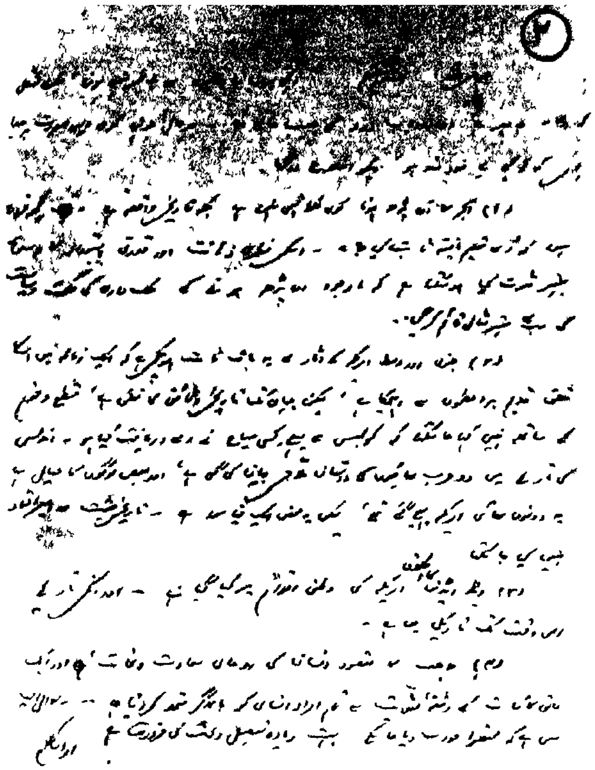
صدر کانگریس مولانا آزاد شملہ کے سیسل ہوٹل میں (۲۴ جون ۱۹۴۵ء بوقت شب)
(بشکریہ محمد اجمل خاں صاحب)

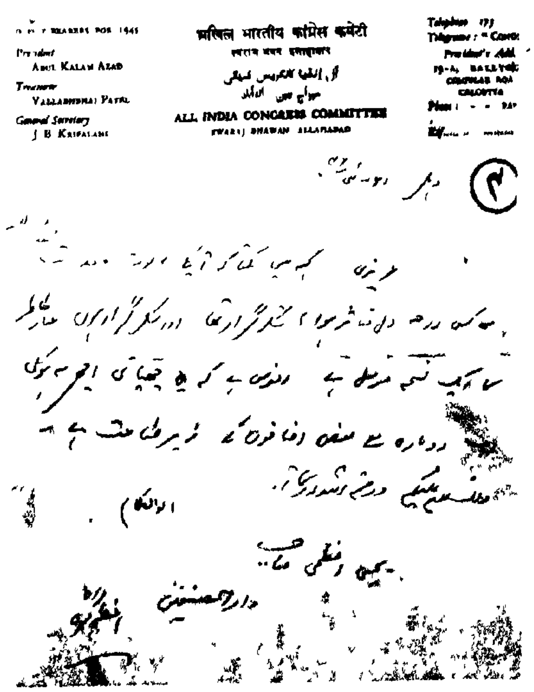


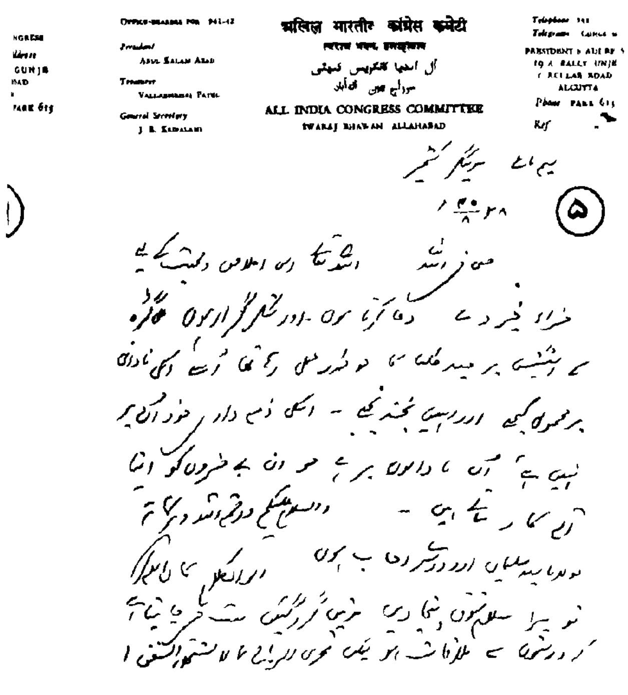
مولانا آزاد جے پور کانگریس میں
(دسمبر ۱۹۴۸ء)

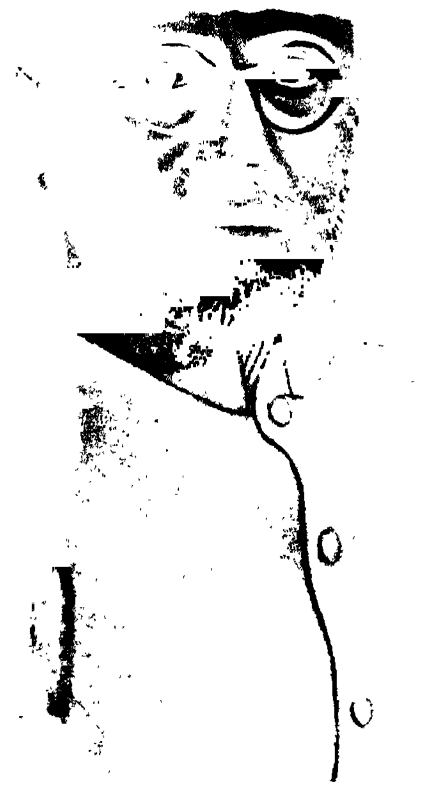
مولانا آزاد کے چند خطوط



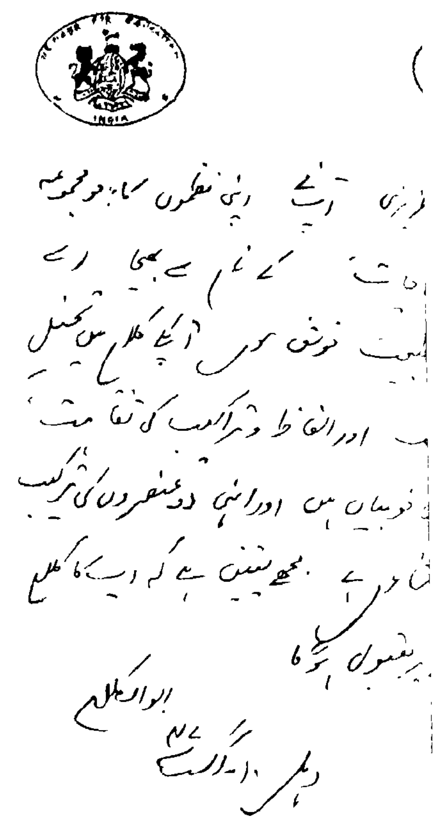


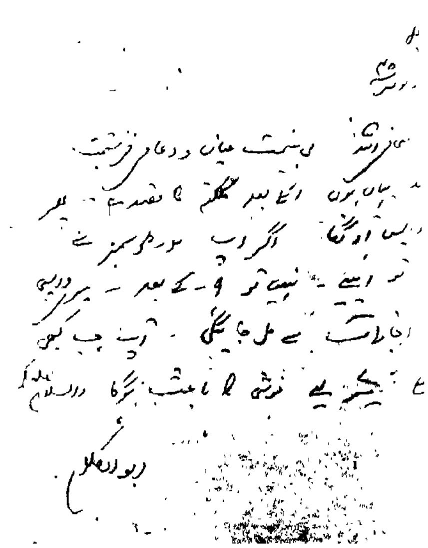






مولانا آزاد ۱۹۴۳ء میں





OFFICE BEARERS FOR 1945

President
ABUL KALAM AZAD

Treasurer
VALLABHBHAI PATEL

General Secretary
J. B. KRIPALANI

अखिल भारतीय कांग्रेस कमेटी
स्वराज भवन, इलाहाबाद

آل انڈیا کانگریس کمیٹی
سوراج بھون ۔ الہ آباد

ALL INDIA CONGRESS COMMITTEE
SWARAJ BHAWAN, ALLAHABAD

۱۔ غلام رسول مہر کے نام

۲۔ ایم اے ذکریا بھاگلپوری کے نام (بہ شکریہ محمود واجد)

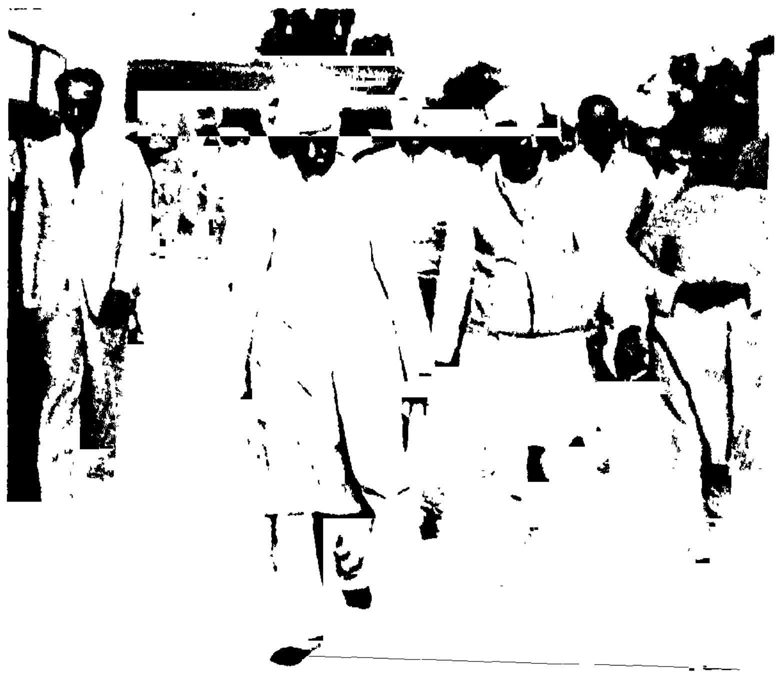
۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ یحییٰ اعظمی کے نام





اوپر دائیں ۔ مولانا آزاد مہاتما گاندھی سے کسی نکتے پر گفتگو
فرما رہے ہیں

اوپر بائیں ۔ مولانا ابوالکلام آزاد بہ حیثیت صدر کانگریس
آل انڈیا کانگریس کے تاریخی اجلاس منعقدہ اگست
۱۹۴۲ء میں مہاتما گاندھی کے ساتھ۔ اسی میں
ہندوستان چھوڑ دو کی قرارداد منظور ہوئی۔



دائیں ۔ مولانا آزاد پنڈت جواہر لال نہرو اور
وزارت تعلیم کے افسران کے ساتھ۔

نیچے ۔ مولانا آزاد پارلیمنٹ ہاؤس کے سنٹرل ہال میں
انڈین نیشنل کمیشن برائے یونیسکو کے افتتاحی
جلسے میں صدارتی تقریر فرما رہے ہیں۔



مولانا آزاد کا ایک خط

قلعہ احمد نگر

۱۱- اپریل ۴۳ء

آنچہ دل از فکر آں می سوخت بیم ہجر بود
آخر از بے مہری گردوں بہ آں ہم سر شدیم!

صدیقِ مکرّم

اس وقت صبح کے چار نہیں بجے ہیں بلکہ رات کا پچھلا حصّہ شروع ہو رہا ہے۔ دس بجے حسبِ معمول بستر پر لیٹ گیا تھا لیکن آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوئیں۔ ناچار اُٹھ بیٹھا، کمرے میں آیا، روشنی کی اور اپنے اشغال میں ڈوب گیا۔ پھر خیال ہوا قلم اُٹھاؤں اور کچھ دیر آپ سے باتیں کر کے جی کا بوجھ ہلکا کر دوں۔ ان آٹھ مہینوں میں جو یہاں گزر چکے ہیں۔ یہ چھٹی رات ہے جو اس طرح گزر رہی ہے اور نہیں معلوم ابھی اور کتنی راتیں اس طرح گزریں گی۔

دماغ بر فلک و دل بہ پائے مہرتیاں
چگونہ حرف زنم دل کجا دماغ کجا

میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ ۱۹۴۱ء میں جب میں نینی جیل میں مقید تھا تو اس خیال سے کہ میرے لئے تشویشِ خاطر کا موجب ہوگا۔ مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں گزرا تھا۔ مجھے قید خانہ میں اس کے خطوط ملتے رہے۔ ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ رہائی کے بعد ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا تو ان سب کی رائے تبدیلِ آب و ہوا کی ہوئی اور وہ رانچی چلی گئی۔ رانچی کے قیام سے بظاہر فائدہ ہوا تھا۔ جولائی میں واپس آئی تو صحت کی رونق چہرہ پر واپس آ رہی تھی۔

اس تمام زمانے میں میں زیادہ تر سفر میں رہا۔ وقت کے حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے کہ کسی ایک منزل میں دم لینے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی۔ ایک منزل میں ابھی قدم پہنچا نہیں کہ دوسری منزل سامنے نمودار ہو گئی۔

صد بیاباں بگزشت و دگرے در پیش ست

جولائی کی آخری تاریخ تھی کہ میں تین ہفتہ کے بعد کلکتہ واپس ہوا اور پھر چار دن بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس بمبئی کے لئے روانہ ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ ابھی طوفان آیا نہیں تھا مگر طوفانی آثار ہر طرف امنڈنے لگے تھے۔ حکومت کے ارادوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ایک افواہ جو خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی یہ تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا جائے گا اور ہندوستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام میں بھیج دیا

جائے گا[1]۔ یہ بات بھی کہی جاتی تھی کہ لڑائی کی غیر معمولی حالت نے حکومت کو غیر معمولی اختیارات دے دئے ہیں اور وہ ان سے ہر طرح کا کام لے سکتی ہے۔ اس طرح کے حالات پر مجھ سے زیادہ زلیخا کی نظر رہا کرتی تھی اور اس نے وقت کی صورت حال کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا۔ ان چار دنوں کے اندر جو میں نے دو سفروں کے درمیان بسر کئے ہیں اس قدر کاموں میں مشغول رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقع بہت کم ملا۔ وہ میری طبیعت کی افتاد سے واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی ہے اور میں پسند نہیں کرتا کہ اس خاموشی میں خلل پڑے۔ اس لئے وہ بھی خاموش تھی لیکن ہم دونوں کی یہ خاموشی بھی گویائی سے خالی نہ تھی۔ ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سن رہے تھے اور ان کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ ۳۔ اگست کو جب میں بمبئی کے لئے روانہ ہونے لگا تو وہ حسب معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے کے لئے آئی۔ میں نے کہا اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آگیا تو ۱۳۔ اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرہ کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا۔

خود را بحیلہ پیشِ تو خاموش کردہ ایم

گزشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی؟ میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورت حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لئے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس لئے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔

وہ میری طبیعت کی افتاد سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرا بھی اضطرابِ طبع کا اظہار ہوگا تو مجھے سخت ناگوار گزرے گا اور عرصہ تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی۔ ۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اضطراب خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصہ تک اس سے ناخوش رہا تھا۔ اس واقعہ نے ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی کا ڈھنگ پلٹ دیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے۔ اس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوش گوار حالات برداشت کئے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار۔ پھر کیا بات تھی کہ اس موقعہ پر وہ اپنی طبیعت کے اضطراب پر غالب نہ آسکی؟ غالباً یہی بات تھی کہ اس کے اندرونی احساسات پر مستقبل کی پرچھائیں پڑنا شروع ہو گئی تھی۔

گرفتاری کے بعد کچھ عرصہ تک ہمیں عزیزوں سے خط و کتابت کا موقعہ نہیں دیا گیا تھا۔ پھر جب یہ روک ہٹالی گئی تو ۱۷ ستمبر کو مجھے اس کا پہلا خط ملا اور اس کے بعد برابر خطوط ملتے رہے۔ چونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی بیماری کا حال لکھ کر مجھے پریشان خاطر کرنا پسند نہیں کرے گی۔ اس لئے گھر کے بعض دوسرے عزیزوں سے حالت دریافت کرتا رہتا تھا۔ خطوط یہاں عموماً تاریخ کتابت سے دس بارہ دن بعد ملتے ہیں۔ اس لئے کوئی بات جلد معلوم نہیں ہو سکتی۔ ۱۵۔ فروری کو مجھے ایک خط ۲ فروری کا بھیجا ہوا ملا جس میں لکھا تھا کہ اس کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ میں نے تار کے ذریعہ مزید صورت حال دریافت کی تو ایک ہفتہ کے بعد جواب ملا کہ کوئی تشویش کی بات نہیں۔

۲۳۔ مارچ کو مجھے پہلی اطلاع اس کی خطرناک علالت کی ملی۔ گورنمنٹ بمبئی نے ایک ٹیلی گرام کے ذریعہ سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع دی کہ اس مضمون کا ایک ٹیلی گرام اسے کلکتہ سے ملا ہے۔ نہیں معلوم جو ٹیلی گرام گورنمنٹ بمبئی کو ملا وہ کس تاریخ کا تھا اور کتنے دنوں کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے یہ خبر پہنچا دینی چاہیئے۔

چونکہ حکومت نے ہماری قید کا محل اپنی دانست میں پوشیدہ رکھا ہے اس لئے ابتدا سے یہ طرزِ عمل اختیار کیا گیا ہے کہ نہ تو یہاں سے کوئی ٹیلیگرام باہر بھیجا جاسکتا ہے نہ باہر سے کوئی آسکتا ہے کیونکہ اگر آئے گا تو ٹیلیگراف آفس ہی کے ذریعہ آئے گا اور اس صورت میں آفس کے لوگوں پر راز کھل جائے گا۔ اس پابندی کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بات کتنی ہی جلدی کی ہو لیکن تار کے ذریعہ نہیں بھیجی جاسکتی۔ اگر

[1] گرفتاری کے بعد جو بیانات اخباروں میں آئے ان سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ افواہیں بے اصل نہ تھیں۔ سیکرٹری آف سٹیٹ اور وائسرائے کی یہی رائے تھی کہ ہمیں گرفتار کر کے مشرقی افریقہ بھیج دیا جائے اور اس غرض سے بعض انتظامات کر بھی لئے گئے تھے لیکن پھر رائے بدل گئی اور بالآخر طے پایا کہ قلعہ احمد نگر میں فوجی نگرانی کے ماتحت رکھا جائے اور ایسی سختیاں عمل میں لائی جائیں کہ ہندوستان سے باہر بھیجنے کا جو مقصد تھا وہ یہیں حاصل ہو جائے۔

تار بھیجنا ہو تو اسے لکھ کر سپرنٹنڈنٹ کو دے دینا چاہیئے۔ وہ اسے خط کے ذریعہ بمبئی بھیجے گا وہاں سے احتساب کے بعد سے آگے روانہ کیا جا سکتا ہے۔ خط و کتابت کی نگرانی کے لحاظ سے یہاں قیدیوں کی دو قسمیں کر دی گئی ہیں۔ بعض کے لئے صرف بمبئی کی نگرانی کافی سمجھی گئی ہے۔ بعض کے لئے ضروری ہے کہ ان کی تمام ڈاک دہلی جائے اور جب تک وہاں سے منظوری نہ مل جائے آگے نہ بڑھائی جائے۔ چونکہ میری ڈاک دوسری قسم میں داخل ہے اس لئے مجھے کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے نہیں مل سکتا۔ اور نہ میرا کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے کلکتہ پہنچ سکتا ہے۔

یہ تار جو ۲۳ مارچ کو یہاں پہنچا فوجی خط (رمز Code) میں لکھا گیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ اسے حل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اسے فوجی ہیڈکوارٹر میں لے گیا۔ وہاں اتفاقاً کوئی آدمی موجود نہ تھا اس لئے پورا دن اس کے حل کرنے کی کوشش میں نکل گیا۔ رات کو اس کی حل شدہ کاپی مجھے مل سکی۔

دوسرے دن اخبارات آئے تو ان میں بھی یہ معاملہ آ چکا تھا۔ معلوم ہوا ڈاکٹروں نے صورت حال کی حکومت کو اطلاع دے دی ہے اور جواب کے منتظر ہیں۔ پھر بیماری کے متعلق معالجوں کی روزانہ اطلاعات نکلنے لگیں۔ سپرنٹنڈنٹ روز ریڈیو میں سنتا تھا اور یہاں بعض رفقاء سے اس کا ذکر کر دیتا تھا۔

جس دن تار ملا اس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور یہ کہا کہ اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تو وہ اسے فوراً بمبئی بھیج دے گا اور یہاں کی پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی۔ وہ صورت حال سے بہت متاثر تھا اور اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنی نہیں چاہتا۔ پھر وہ جواہر لال کے پاس گیا اور ان سے اس بارے میں گفتگو کی۔ وہ سہ پہر کو میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے ان سے بھی وہی بات کہہ دی جو سپرنٹنڈنٹ سے کہہ چکا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات حکومت بمبئی کے ایما سے کہی تھی۔

جونہی خطرناک صورت حال کی پہلی خبر ملی میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کر دیا انسان کے نفس کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ ساری عمر ہم اس کی دیکھ بھال میں بسر کر دیتے ہیں۔ پھر بھی یہ معمہ حل نہیں ہوتا۔ میری زندگی ابتدا سے ایسے حالات میں گزری کہ طبیعت کو ضبط و اختیار میں لانے کے متواتر موقعے پیش آتے رہے اور جہاں تک ممکن تھا ان سے کام لینے میں کوتاہی نہیں کی۔

تا دست رسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

تاہم میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لئے جد و جہد کرنی پڑے گی۔ یہ جد و جہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو تھکا دیتی ہے۔ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے۔

اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کر لوں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب و بناوٹ اور نمائش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشہ میں ہم ہمیشہ کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے

سب سے پہلی کوشش یہ کرنی پڑی کہ یہاں زندگی کی جو روزانہ معمولات ٹھہرائی جا چکی ہیں ان میں فرق آنے نہ پائے۔ چائے اور کھانے کے چار وقت ہیں جن میں مجھے اپنے کمرہ سے نکلنا اور کمروں کی قطار کے آخری کمرہ میں جانا پڑتا ہے۔ چونکہ زندگی کی معمولات میں وقت کی پابندی کا منٹوں کے حساب سے عادی ہو گیا ہوں اس لئے یہاں بھی اوقات کی پابندی کی رسم قائم ہو گئی اور تمام ساتھیوں کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ میں نے ان دنوں میں بھی اپنا معمول بدستور رکھا۔ ٹھیک وقت پر کمرہ سے نکلتا رہا اور کھانے کی میز پر بیٹھتا رہا۔ بھوک یک قلم بند ہو چکی ہے لیکن میں چند لقمے حلق سے اتارتا رہا۔ رات کو کھانے کے بعد کچھ دیر تک صحن میں چند ساتھیوں کے ساتھ نشست رہا کرتی تھی اس میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ جتنی دیر تک وہاں بیٹھتا تھا جس طرح باتیں کرتا تھا اور جس قسم کی باتیں کرتا تھا وہ سب کچھ بدستور ہوتا رہا۔

اخبارات یہاں بارہ سے ایک بجے کے اندر آیا کرتے ہیں۔ میرے کمرے کے سامنے دوسری طرف سپرنٹنڈنٹ کا دفتر ہے۔ جیلر وہاں سے اخبار لے کر سیدھا میرے کمرہ میں آتا ہے۔ جونہی اس کے دفتر سے نکلنے اور چلنے کی آہٹ آنا شروع ہوتی تھی دل دھڑکنے لگتا تھا کہ نہیں معلوم آج کیسی خبر اخبار میں ملے گی لیکن میں فوراً چونک اٹھتا۔ میرے صوفے کی پیٹھ دروازہ کی طرف ہے۔ اس لئے جب تک ایک آدمی اندر آ کے سامنے کھڑا نہ ہو جائے میرا چہرہ دیکھ نہیں سکتا۔ جب جیلر آتا تھا تو میں حسب معمول مسکراتے ہوئے اشارہ کرتا کہ اخبار ٹیبل پر رکھ دے۔

اور پھر لکھنے میں مشغول ہو جاتا گویا اخبار دیکھنے کی کوئی جلدی نہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہرداریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جسے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا اور اس لئے کھیلتا تھا کہ کہیں اس کے دامن صبر و وقار پر بے حالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔

بدہ یارب دے کیں صورت بے جاں نمی خواہم

بالآخر ۹ - اپریل کو زہر غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا۔

فاتق ما تحسن دبن، قد دقع!

۲ بجے سپرنٹنڈنٹ نے گورنمنٹ بمبئی کا ایک تار حوالہ کیا جس میں حادثہ کی خبر دی گئی تھی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ کو یہ خبر ریڈیو کے ذریعہ صبح ہی معلوم ہو گئی تھی۔ اور اس نے یہاں بعض رفقاء سے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ لیکن مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔

اس تمام عرصہ میں یہاں کے رفقاء کا جو طرز عمل رہا اس کے لئے میں ان کا شکرگزار ہوں۔ ابتدا میں جب علالت کی خبریں آنا شروع ہوئیں تو قدرتی طور پر انہیں پریشانی ہوئی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس بارے میں جو کچھ کر سکتے ہیں کریں۔ لیکن جونہی انہیں معلوم ہو گیا کہ میں نے اپنے طرز عمل کا ایک فیصلہ کر لیا ہے اور میں حکومت سے کوئی درخواست کرنا پسند نہیں کرتا تو پھر سب نے خاموشی اختیار کر لی اور اس طرح میرے طریق کار میں کسی طرح کی مداخلت نہیں ہوئی۔

اس طرح ہماری چھتیس برس کی ازدواجی زندگی ختم ہو گئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہو گئی۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں مگر اسی دیوار کی اوٹ سے۔

مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے۔ میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں۔

غافل نیم ز راہ دے آہ چارہ نیست

زیں رہزناں کہ بر دل آگاہ می زنند

یہاں احاطہ کے اندر ایک پرانی قبر ہے۔ نہیں معلوم کس کی ہے؟ جب سے آیا ہوں سینکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے۔ لیکن اب اسے دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ایک نئے طرح کا انس اس سے طبیعت کو پیدا ہو گیا ہو۔ کل شام کو دیر تک اسے دیکھتا رہا اور متمم بن نویرہ کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی مالک کی موت پر لکھا تھا بے اختیار یاد آ گیا۔

لقد لامنی عند القبور علی البکا	رفیقی لتذراف الدموع السوافک
فقال اتبکی کل قبر رأیته	لقبر ثوی بین اللوی فالدکادک
فقلت لہ ان الشجا یبعث الشجا	فدعنی فھذا کلہ قبر مالک

اب قلم روکتا ہوں۔ اگر آپ سنتے ہوتے تو بول اٹھتے

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر

اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانہ میں

(غبار خاطر سے)

فاتحۃ السنۃ الثالثہ

"جو رب الارباب انسان کی غذا جسمانی کا یہ سب کچھ سامان رکھتا ہے کیونکر ممکن ہے کہ اس کی روحانی غذا کا انتظام نہ کرے۔

یہ روحانی غذا کیا ہے۔ یہ ہدایت وسعادت انسانی کی دعوت الٰہیہ ہے میں کہہ سکتے نی الحقیقت روح انسانی بھوکی پیاسی ہوتی ہے۔ اور جس طرح جسم حیوانی مدتوں کی بھوک اور پیاس کے بعد بے قرار و مضطرب ہو کر غذا کو پکارتا ہے اسی طرح ضلالت کی شدت اور ہدایت کا فقدان بھی روح انسانی کو ایک معنوی جوع و عطش میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ اپنی زندگی کے لئے اپنی غذا کو دیوانہ وار پکارنے لگتی ہے۔ پس وقت آتا ہے کہ اس حکیم علی الاطلاق، اس فاطر الارض والسماوات، اس مدبر الامر والاشیا اور اس مسبب الاسباب حقیقی کی ربوبیت ظاہر ہوتی ہے جس نے انسان کی حیات جسمانی کے لئے تمام دنیا کو طرح طرح کے اغذیہ وثمرات کی بخشش سے ایک خوان کرم بنا دیا ہے۔ اس کا دست مخفی غذائے روحانی کا بیج بوتا ہے اور اپنی نشو فرمائی سے اسے یکایک سربلند و بالاقامت بنا دیتا ہے۔ پھر اس کی سعادت و ہدایت کی نعمتوں سے زمین کے بڑے بڑے ٹکڑے بھر جاتے ہیں اور اس بخشش کی دعوت سے ارض الٰہی گونج اٹھتی ہے۔"

(الہلال ۱۳ جنوری ۱۹۱۳ء)

یحییٰ اعظمی

آہ! مولانا ابوالکلام آزادؒ

جس کی زباں کا حرف حرف نغمۂ جاں نوائے راز   دفترِ علم و آگہی نوکِ قلم سے جس کے باز
شانِ حیات جس کی تھی اوجِ شرف سے سرفراز   عرشِ کمال و فضل تھا جس کا مقامِ امتیاز
نشأۃِ تازہ جس نے دی قوم کو وہ ابوالکلام
بامِ حریمِ قدس تھا جس کی حیات کا مقام

پیکرِ عزّت و شرف، مظہرِ عظمت و جلال   پیشِ نظر نظر فروز ایک مرقعِ جمال
خازنِ فضل و علم و فن، خاتمِ دانش و کمال   قاسمِ بادۂ کہن، ساقیٔ دورِ الہلال
اُٹھ گیا وہ تو بے فروغ مصطبۂ یقیں ہے آج
پیرِ مغاں کے ہجر میں بزمِ مغاں حزیں ہے آج

حیف خموش ہو گیا باغِ ادب کا عندلیب   اٹھ گیا ہند کا امام سو گیا قوم کا خطیب
اب نہ اُٹھے گا حشر تک ایسا مفکر و ادیب   حق کا مجاہدِ جلیل، دیں کا منادی و نقیب
فکرِ جدید و طرزِ نو کا وہ محقق کتاب
جس کے صحیفۂ کلام کا نہیں دہر میں جواب

ایک حریمِ راز تھی اُس کی کتابِ زندگی   فکر و نظر سے تھی بلند اس کی جنابِ زندگی
آج کہاں ہے دہر میں اُس کا جوابِ زندگی   آہ برس کے تھم گیا اب وہ سحابِ زندگی

بکھرے ہوئے ہیں چار سو لعل و جواہرِ کمال
اس کے مآثرِ ہنر، اُس کے مظاہرِ کمال

اس کا قلم جب اُٹھ گیا لالہ و گُل کھِلا دیا   شعر و ادب کے پھول سے صحنِ ورق سجا دیا
شاہدِ فکر و راز کے رُخ سے حجاب اُٹھا دیا   جلوۂ رنگ رنگ سے گل کدہ جگمگا دیا

عقدہ کشائے فکر و راز چہرہ طرازِ علم و فن
فیض سے جس کے تازہ تھا دانش و فکر کا چمن

آہ وہ کلکِ خوش نگار، لالہ طراز و لالہ کار   جس کا نوشتہ حسیں ایک صحیفۂ بہار
جس کی نگارشِ جمیل شعر و ادب کا شاہکار   ایک حدیقۂ کمال جس کا ہر اک خطِ غبار

اس کا "حبیب" سے کلام اس کا "صدیق" سے خطاب
نامۂ شوق کی زبور، نغمہ و شعر کی کتاب

علم و ہنر کا تاجدار، خسروِ کشورِ قلم   بدرِ معانی و علوم، صدرِ معارف و حکم
نوکِ قلم سے گل طراز، نغز نگار و خوش رقم   جس کا کمالِ معتبر جس کا کلام محترم

قوم کو جس پہ ناز تھا ہاں وہ زعیمِ ممتحن
ایک حکیمِ دیدہ ور ایک کلیمِ طورِ فن

سجنِ فرنگ کا اسیر، قائدِ صاحبِ ضمیر   جس کے ثباتِ عزم کی ملتی نہیں کوئی نظیر
ملکِ بلند کا فقیر، فکر و دماغ کا امیر   تھا جو وطن میں کل تلک نظمِ امور کا مشیر

کنجِ لحد میں گوشہ گیر ہوگیا آہ اب وہی
اس کے الم میں سرنگوں کیوں نہ ہو پرچمِ شہی

اسوۂ یوسفی کی نذر جس کی حیات تھی تمام　　حق کے لئے غم و محن جس کا تھا منصبِ مقام
شکر و رضا کی سرخوشی جس کا شعار تھا مدام　　دار و رسن سے سرفراز، قیدِ محن سے شادکام

صبرِ جمیل کی ادا جس کی تھی شانِ امتیاز
عفو و کرم سے دل نواز، جور و ستم سے بے نیاز

آہ کہاں ہے آج اس شانِ فخیم کی مثال　　طبعِ کریم کی مثال، خلقِ عظیم کی مثال
اب نہ اُٹھے گی ہند میں ایسے زعیم کی مثال　　ایسے فریسِ دیدہ ور، ایسے حکیم کی مثال

آج ہے بے فروغِ فیض بزمِ وطن ترے بغیر
بزمِ وطن ہے محفلِ حزن و محن ترے بغیر

اس کی حیات کو تھا آہ ملّت حق سے یہ گلہ　　بے خبرِ مقام ہے ہند میں حق کا قافلہ
فکر و شعور سے تہی جس کا ہے عزم و حوصلہ　　رزمِ حیات سے فرار آہ ہے جس کا مشغلہ

جہلِ خطاب سے دیا جس نے سلام کا جواب
سوءِ کلام سے دیا حُسنِ کلام کا جواب

جس نے کیں تازہ سنّتیں سرکشیٔ عناد کی　　حق کے خلاف بے پناہ معرکۂ جہاد کی
آہ وہ گرم جوشیاں ملّتِ کم سواد کی　　آہ وہ شانِ صبر و شکر بندۂ حق نہاد کی

گالیاں سن کے بھی مدام لب پہ دعائے خیر تھی
عفو و کرم کی کل متاع یعنی نشانِ خیر تھی

اب نہ اُٹھے گا عارفِ دینِ حجاز پھر کبھی　　آہ ابوالکلام سا واقفِ راز پھر کبھی
ہوگا نہ عندلیبِ فن نغمہ طراز پھر کبھی　　دفترِ علم و معرفت ہوگا نہ باز پھر کبھی

آہ نہ جانی اس کی قدر، ملّتِ کم شناس نے
مسلمِ کم سواد نے، اُمّتِ ناسپاس نے

غلام رسول مہر

مولانا ابوالکلام آزاد

ایک نادرِ روزگار شخصیت

معاشراں گرہ از زلفِ یار باز کنید
شبے خوش است۔ بہ ایں قصہ اش دراز کنید

مولانا کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے۔ بہت کم بڑے آدمی ہیں، جن کے متعلق ان کی زندگی میں اتنی کتابیں شائع ہوئی ہوں جتنی مولانا کے متعلق شائع ہوئیں۔ جب تک روز و شب کا سلسلہ دور جاری ہے بہت کچھ لکھا جائے گا، تاہم حقیقتِ حال پر نظر رکھی جائے تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک کچھ بھی نہیں لکھا گیا۔

ترا، چنانکہ توئی، ہر کسے کجا داند
بہ قدرِ طاقتِ خود مے کنند ادراک

انسانوں کے درجے

عظیم الشان انسانوں کے مقامات و مدارج ہیں۔ جو اس بنا پر متعین ہوتے ہیں کہ زمانی اور مکانی اعتبار سے ان کے دائرۂ اثر و رسوخ کی کیا کیفیت رہی، بعض افراد خاص اسباب کی بنا پر شہرت پا لیتے ہیں اور ان میں مقامِ شہرت پر قائم رہنے کے جوہر موجود نہیں ہوتے۔ بعض کو قدرت عزت و احترام کی اوج گاہوں پر پہنچا دیتی ہے۔ لیکن وہ اپنے مخصوص ماحول سے باہر کوئی قابلِ ذکر حیثیت حاصل نہیں کر پاتے نیز ان کی قدروں کو زمانی اعتبار سے چنداں پائیداری نصیب نہیں ہوتی۔ بعض اوقات یہ خاکدان تیرہ و تار ایسی شخصیتوں کی جلوہ گری سے بھی زیب و زینت پاتا ہے۔ جو زمان و مکان کے لوحِ قلب پر اپنی عظمت کے گہرے نقش ثبت کر جاتی ہیں۔ لیل و نہار کے وہ نقوش مدھم نہیں ہوتے بلکہ زیادہ ابھرتے رہتے ہیں مولانا کا تعلق عظیم المرتبت انسانوں کی اسی آخری صف سے تھا اور ایسے انسان زمانے کے دور گزر جانے کے بعد ہی عرصۂ شہود پر جلوہ آرا ہوتے ہیں۔ خواجہ سنائیؒ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جب کہا تھا کہ:-

دورہا باید کہ تا یک مردِ حق پیدا شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

نادرِ روزگار شخصیت

یقیناً مولانا ایک نادرِ روزگار شخصیت کے مالک تھے اور ایسے گوناگوں اوصاف و محاسن کسی ایک وجود میں بہت ہی کم جمع ہوتے ہیں انھوں نے زندگی کے اتنے دائروں میں انتہائی بلند مقام حاصل کیا جن کا حصر مشکل ہے اور ان میں سے کسی ایک دائرے میں ویسی بلندی حاصل کر لینا بڑے سے بڑے انسان کے لئے بھی دائمی فخر کا سامان ہو سکتا ہے۔ علم و فضل حقائق دین، فلسفہ و حکمت، شعر و ادب، تصنیف و تالیف، تقریر و خطابت اخبار نویسی و صحیفہ نگاری، سیاست و ملک داری، غرض کون سا دائرہ اور کون سا حلقہ ہے جس میں ان کی یگانگی ابتدا ہی سے سب کے نزدیک ثابت و مسلّم نہ تھی اور آج تک اس کی تصدیق و توثیق نہ ہوتی رہی؟ عربی، فارسی، انگریزی اور اُردو میں علوم کا شاید ہی کوئی قابلِ توجہ مطبوعہ یا مخطوطہ و کمیاب ذخیرہ ہو،

آج کل دہلی (ابوالکلام نمبر)

جو ان کی نظر سے نہ گزر چکا تھا اور اس ذخیرے کی ہر منتخب اعتناء شے ان کے گنجینۂ حفظ و ضبط میں محفوظ نہ تھی۔ لوگوں نے مختلف کتابیں پڑھیں اور ان کے وہ مطالب ذہن میں بٹھا لئے جو انھیں پسند آئے۔ مولانا کے حافظے میں نہ محض تمام مطالب ہی محفوظ تھے بلکہ مشہور مصنفوں کے اسلوب پر بھی حد درجہ گہری نظر تھی۔ جب اس موضوع پر گفتگو کرتے تو ایسے حقائق بیان فرماتے جو اس فن میں درجہ اختصاص حاصل کرنے والوں کی زبان سے بھی بہت کم سُنے گئے۔ حیرت اس بات پر ہوتی تھی کہ یہ کمال انھوں نے کیوں کر حاصل کر لیا۔

حیرت انگیز کمالات

عربی تو بہرحال ان کی مادری زبان تھی اور حیاتِ مستعار کے ابتدائی دس سال انھوں نے مکّہ معظمہ میں گزارے تھے۔ لہٰذا اسے اہلِ زبان کی طرح بولنے پر تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہ فارسی بھی تازہ وارد ایرانیوں کے انداز میں بولتے تھے۔ مشہور ایرانی شاعر قاآنی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ فرانسیسی زبان فرانسیسیوں کی طرح بولتا تھا۔ یہاں تک کہ اسے پردے میں بٹھا دیا جاتا تو کوئی پہچان نہ سکتا کہ فرانسیسی نہیں ایرانی بول رہا ہے۔ یہی ایک مرتبہ مولاناؒ کو ایک ترک مہمان سے فارسی میں باتیں کرتے سُنا تو حیران رہ گیا۔ گفتگو میں اہلِ زبان کی سی روانی کے علاوہ تلفظ کی لطافت اور لب و لہجہ کی ملائمت کا وہی رنگ تھا جو خوش ذوق ایرانیوں کا خاصہ ہے۔

علوم میں ہمہ گیری

پھر مختلف انسانوں کی طبیعتوں کو مختلف علوم سے مناسبت ہوتی ہے اور انھیں میں وہ درجہ کمال حاصل کر لیتے ہیں۔ مولانا کی طبیعت کو ہر علم سے مناسبت تھی۔ دین و مذہب، تاریخ و سیر، فلسفہ و حکمت، شعر و ادب، علم الالسنہ، آثارِ قدیمہ اور خدا جانے کس کس دائرۂ علم و فن میں وہ یگانگی کے درجے پر فائز تھے۔ یہاں تک کہ طب کی تعلیم بھی باقاعدہ پائی تھی اور دوسرے علوم کے علاوہ طب بھی پڑھاتے رہے۔ جو کتاب ایک مرتبہ نظر سے گزر جاتی تھی۔ اس کے تمام مطالب ذہن میں محفوظ ہو جاتے تھے۔ عربی، فارسی اور اُردو شعرا کے تذکرے اور دواوین انھوں نے بالکل ابتدائی دور میں دیکھے ہوں گے۔ شاید ہی کوئی اچھا اور قابلِ توجہ شعر ہو جو انھیں یاد نہ تھا۔ ہم لوگوں نے جن اُردو شعرا کے محض نام سن رکھے تھے اور اُن کا کلام کبھی نہیں دیکھا۔ اس لئے کہ اپنے خیال کے مطابق اسے دیکھنے کے قابل نہ سمجھا۔ مولاناؒ کی تصانیف میں ان کے اشعار بھی جا بجا ملتے ہیں۔ کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ انھیں یہ تمام ذخیرے دیکھ جانے کا وقت کب ملا اور ہزاروں گراں قدر کتابوں کے مطالعے سے اتنی فرصت کیوں کر میسّر آگئی کہ ان کتابوں کو بھی نظر سے گزار لیا۔ جن کے وجود تک سے اہلِ علم بے خبر ہیں۔ پنجابی زبان کی ایک کتاب "پکّی روٹی" ہے جس میں دینی مسائل سوال و جواب کے انداز میں جمع کئے گئے ہیں۔ قیامِ امرتسر کے دوران میں انھوں نے وہ کتاب بھی پڑھ لی تھی۔

غیر معمولی حافظہ

صلاحیت حفظ و استحضار کے لحاظ سے وہ قدرت کا ایک عجیب و غریب نشان تھے۔ بے تکلّف کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ پڑھتے تھے، دماغ کے مختلف خانوں میں حسنِ ترتیب سے چنتے جاتے تھے۔ ہر خانۂ ضرورت کے وقت خود بخود کھل جاتا اور جو شے چاہتے اُٹھا لیتے۔ "تذکرہ" انھوں نے صرف حافظے کی بنا پر مرتب فرما دیا تھا۔ بعد میں چند کتابیں منگوا لیں تاکہ اطمینان فرما لیں جو کچھ لکھا ہے اس میں کہیں غلطی تو نہیں ہوئی۔ اس کتاب کی دو جلدیں تھیں۔ مرحوم فضل الدین احمد مرزا نے صرف ایک جلد چھاپی اور مولانا ابھی رانچی میں نظر بند ہی تھے کہ مرزا صاحب کلکتہ چھوڑ کر اپنے وطن پنجاب چلے آئے اور دوسری جلد بھی ساتھ لے آئے۔ پھر ان کا انتقال ہو گیا اور سعی و تلاش کے باوجود دوسری جلد کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

اسی طرح ایک عزیز دوست نے بتایا کہ جس زمانے میں مولانا "وکیل" کے ایڈیٹر تھے۔ طباطبائیؒ مرحوم کی شرح دیوانِ غالب میں انھوں نے سادہ اوراق لگوا لئے تھے اور ان پر مختلف شعروں کی شرح لکھتے جاتے تھے۔ ایک ندیم نے وہ نسخہ مولانا کے علم کے بغیر اٹھا لیا اور تقسیمِ ہند کے وقت تک وہ محفوظ تھا۔ تقسیم کے ہنگاموں میں وہ نذرِ آتش ہو گیا۔

خدا کی خاص نعمت

"غبارِ خاطر" پہلی مرتبہ لاہور میں چھپی تھی اور میں اس کی نگرانی پر مامور تھا۔ ایک مکتوب میں اپنے محبس احمد نگر کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> "اسی احمد نگر کے معرکوں میں عبدالرحیم خانخاناں کی جوانمردی
> کا وہ واقعہ نمایاں ہوا جس کی سرگزشت عبدالباقی نہاوندی
> (صاحبِ ماثرِ رحیمی) اور صمصام الدولہ (صاحبِ ماثر الامرا)
> نے ہمیں سنائی ہے۔ جب احمد نگر کی مدد پر بیجاپور اور گولکنڈہ

لی فوجیں بھی آگئیں، ورخان خاناں کی قلیل التعداد فوج کو سہیل حبشی کی طاقت ور فوج سے ٹکرانا پڑا تو دولت خاں لودی نے پوچھا تھا "جنیں انبوہے در پیش و فتح آسمانی اگر حادثہ رو دہد جائے آشنا دمید کشمارا دریابیم" خان خاناں نے جواب دیا تھا "زیر لاشہ"

میں نے فارسی کا یہ فقرہ پڑھا تو احساس ہوا کہ "فتح آسمانی" اچھی فارسی معلوم نہیں ہوتی، ممکن ہے اصل میں "فتح آساں نے" (فتح آسان نہیں) ہو۔ میری گزارش کے جواب میں مولانا نے کلکتہ سے لکھا:۔

" دولت خاں لودی کا مقولہ محض حافظے سے لکھا ہے لیکن اس میں "فتح آسمانی" ہی ہے۔ یعنی حالت ایسی ہے کہ سرو سامان کی بنا پر فتح کی اُمید نہیں کی جاسکتی۔ آسمان کی مدد ہی سے ہو تو ہو "آسمان نے" ہرگز نہیں ہوسکتا۔۔۔ اگرچہ دماغ مطمئن تھا۔ خیال ہوا برسوں کی بات ہے۔ اصل مقام نکال کر دیکھ لوں۔ چنانچہ "ماثر الامراء" میں مقام مل گیا اور دولت خاں لودی کا مقولہ ٹھیک ٹھیک وہی نکلا جو حافظے میں محفوظ رہ گیا تھا۔ طبیعت خوش ہوئی کہ تیس برس تک دماغ نے اس مقولے کی پوری محافظت کی تھی اور ایک لفظ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوا تھا۔"

کون اس حافظے کو خدا کی خاص نعمت تسلیم کرنے میں تامل کرے گا جس نے تیس برس میں ایک معمولی فقرے کا ایک لفظ بھی اِدھر اُدھر نہ ہونے دیا۔

ہر دائرے میں مستقل قدریں

اسے بھی چھوڑ دیئے اور یہ دیکھئے کہ ہر دائرے میں انھوں نے مستقل قدریں قائم کیں۔ جن کا کوئی سراغ ان سے پیشتر کسی دائرے میں نہیں ملتا۔ اگر میں اس بارے میں تفصیلات پیش کروں تو ایک دفتر تیار ہو جائے تاہم ایک دو مثالیں پیش کئے بغیر مدعا واضح نہیں ہوسکتا۔

"الہلال" سے پیشتر تمام جرائد و رسائل (الا ماشاء اللہ) امراء و رؤسا سے اعانتی رقوم لینا غیر مناسب نہ سمجھتے تھے بلکہ قیمت کا اشتہار چھاپا جاتا تھا تو امراء و رؤسا کے لئے زیادہ رقم لکھی جاتی تھی۔ شاید اس لئے کہ ان کے درجۂ امتیاز میں کوئی خلل نہ آسکے۔ "الہلال" نکلا تو اس کا پہلا ہی نمبر دیکھ کر ایک مشہور صاحب ریاست نے خاص رقم کا چیک مولاناؒ کے پاس بھیج دیا۔ ساتھ ہی لکھا کہ ہر مہینے اتنی رقم باقاعدہ پہنچتی رہے گی۔ سال بھر کے لئے تو وعدہ سمجھئے اس کے بعد بھی اخبار اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہوسکا تو یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

سیر چشمی اور خودداری

مولانا نے شکریے کے ساتھ چیک واپس کر دیا اور لکھا:۔

" ہم نے جس قدر کام اپنے ذمے لے لئے ہیں۔ وہ روپے کے بل، پبلک کی قدردانی اور رؤسائے قوم کے جود وسخا کے بھروسے پر نہیں بلکہ صرف اس کے فضل اور توفیق کے اعتماد پر جو اپنے دروازے کے سائلوں کی فریادیں جب ایک مرتبہ سن لیتا ہے تو پھر دوسروں کی چوکھٹوں پر کبھی نہیں بھیجتا۔"

پھر فرمایا۔

" ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لئے نہیں بلکہ تلاش زیاں و نقصان میں آئے ہیں۔ صلہ و تحسین کے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلبگار ہیں۔ عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔ دنیا کے زر و سیم کو قربان کرنے کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے تئیں قربان کرنے کے لئے آئے ہیں۔ ایسوں کی اعانت کر کے آپ کا جی کیا خوش ہوگا۔"

آخر میں تحریر فرماتے ہیں

" پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کا یہ عطیہ کس مقصد سے ہے؟ اگر آپ مجھے خریدنا چاہتے ہیں تو یہ رقم ایک گراں قدر قیمت ہے۔ میں تو اپنی قیمت میں گھانس کی ایک ٹوکری کو بھی گراں سمجھتا ہوں۔۔۔ ہاں اگر اس سے میری رائے اور میرا ضمیر خریدنا مقصود ہو تو بہ ادب واجب عرض ہے کہ ان خزف ریزہ ہائے طلائی کی تو کیا حقیقت ہے، کوہ نور اور تخت طاؤس کی دولت بھی جمع کر لیجئے۔ تو مع آپ کی پوری ریاست کے اس کی قیمت کے آگے ہیچ ہیں۔ یقین کیجئے کہ اسے تو سوائے شاہنشاہ حقیقی کے اور کوئی نہیں خرید سکتا اور وہ ایک مرتبہ خرید چکا۔"

کم از کم اُردو اخبار نویسی میں میرے علم کے مطابق عظمتِ خودداری کی یہ پہلی صدائے حق تھی جس نے اس اخبار نویسی کے معیار کو آسمان پر پہنچا دیا۔

"الہلال" کی ضمانت کا واقعہ

طلب ضمانت کا خیر مقدم "الہلال" سے پیشتر کبھی کسی اخبار نے نہ کیا تھا۔

"الہلال" سے ۱۹۱۳ء میں دو ہزار کی ضمانت مانگی گئی تو مولاناؒ نے پہلے یہ خبر شائع کرنے میں تامل کیا۔ جب اطراف ملک سے پے درپے خطوط ان کی خدمت میں پہنچنے لگے تو ۱۴ ستمبر ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع کی اور اس کا عنوان رکھا۔ "ابتدائے عشق" ساتھ ہی فرماتے ہیں:-

"انسان صرف کام کے لئے بنایا گیا ہے۔ بس اس کو چاہیئے کہ اپنے کام میں مصروف رہے۔ یہ بہت ہی ادنےٰ درجے کی اور چھوٹی باتیں ہیں کہ لوگوں کا اس کے متعلق کیا خیال ہے اور حکامِ وقت اسے کیا سمجھتے ہیں۔"

اس ضمن میں یہ اصول پیش کر دیا کہ حق و صداقت کے لئے کامیاب و منصور ہونا لازم ہے۔ باطل کے ساتھ دنیوی طاقتوں کا کتنا ہی ساز و سامان ہو اور وقتی کامیابیاں اسے خواہ کتنا ہی مغرور کر دیں لیکن بالآخر وہ خاسر و نامراد رہے گا۔

آخر میں لکھتے ہیں کہ ۸ ستمبر کو دو ہزار کی ضمانت طلب کی گئی تھی۔ جسے ۲۷ تک داخل کرنے کی مہلت تھی، لیکن ۱۳ ہی کو داخل کر دی گئی۔

"ضمانت کا روپیہ تو اسی تاریخ سے بطور ایک سرکاری امانت کے علیحدہ رکھ دیا گیا تھا۔ جس دن "الہلال پریس" کا ابتدائی سامان خریدنے کے لئے ہم نے روپیہ نکالا تھا۔ سچ یہ ہے کہ اس امانت کی حفاظت کرتے کرتے ہم اکتا گئے تھے اور اب تو وقت آگیا تھا اگر کوئی مانگنے کے لئے نہ آتا تو ہم خود ہی پیش کرنے کے لئے آگے بڑھتے..... بڑی فکر یہ تھی کہ جب محرومئ قسمت سے ضمانت کی پہلی منزل ہی طے نہیں ہوئی تو آیندہ کی فکر کے لئے ہمیں وقت کیسے ملے گا؟"

قولِ فیصل

ایسی بے شمار قدریں مولاناؒ نے ہر دائرے میں قائم کیں اور ان سے پیشتر ہماری قومی زندگی میں ان کا کوئی نشان موجود نہ تھا۔ وہ دسمبر ۱۹۲۱ء میں بسلسلہ ترک موالات گرفتار ہوئے تھے۔ اور وقت کے قومی فیصلے کے مطابق انھوں نے بھی دوران مقدمہ میں عدالت سے تعاون نہ کیا تھا۔ البتہ آخر میں ایک بیان داخل کیا تھا جو قول فیصل کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ آج بھی موجود ہے۔ ہندوستان میں چھوٹے بڑے ہزاروں افراد گرفتار ہوئے تھے اور بے شمار لوگوں نے تحریری بیانات دیئے تھے۔ مگر کوئی بیان "قول فیصل" کا درجہ حاصل نہ کر سکا بد بن آزادی کے خلاف۔ مقدمے ہر ملک میں چلے اور اکثر نے بیانات بھی دیئے۔ میرے علم کے مطابق آئرلینڈ کے قائدِ آزادی رابرٹ ایمٹ کا بیان بہت پر زور اور پرتاثیر مانا جاتا ہے۔ لیکن 'قول فیصل' کے مقابلے میں بھی وہ بالکل بے کیف معلوم پڑتا ہے۔ مولانا نے اس میں حقیقتِ حال واضح کی، آزادی کے لئے ہر جد و جہد کا اقرار کیا۔ بلکہ کہا میں اس جرم کا ارتکاب بہت پہلے سے کر رہا ہوں اور اسے اپنا پیدائشی حق قرار دیا۔ پھر اپنا یہ یقین بھی واضح کر دیا کہ حق کامیاب ہوگا اور باطل اپنی ظاہری قوت کے باوجود ٹھہر نہ سکے گا۔ دنیا جانتی ہے کہ حالات نے مولانا کے اسی یقین کا ساتھ دیا۔ خدا کی سنت کبھی نہیں بدلی، قدرت کے مقرر کئے ہوئے اصول کی کارفرمائی میں کبھی تغیّر نہیں ہوا۔ لیکن یہ بول بول لینا ایک چیز ہے اور اس کارفرمائی پر چٹانوں سے بھی بدرجہا زیادہ مستحکم ایمان و یقین کی روح سے معمور ہونا بالکل دوسری چیز ہے

مقامِ دعوت کے تقاضے

"الہلال" کے ابتدائی دور میں بعض اصحاب کو یہ احساس پیدا ہوا کہ مولانا کا لب و لہجہ ذرا سخت اور درشت ہے۔ ممکن ہے "الہلال" کی جلدوں کا مطالعہ کرتے وقت اب بھی بعض اصحاب کو یہ احساس پیدا ہو۔ اس غلط فہمی سے محفوظ رہنے کے لئے مولاناؒ کے مقامِ دعوت اور وقت کے عام حالات کو پیشِ نظر رکھ لینا ضروری ہے۔ وہ آزادی اور حق پرستی کی دعوت لے کر اٹھے تھے۔ "الہلال" اس دعوت کا وسیلہ تھا۔ داعی کا مقام اس امر کا متقاضی ہوتا ہے کہ اپنی ہر بات کو عوام کے دلوں میں اتار دے۔ وہ صرف دماغوں کو اپیل نہیں کرتا بلکہ دماغوں سے کہیں بڑھ کر اس کی اپیل دلوں سے متعلق ہوتی ہے۔ اس زمانے میں عام طور پر بے حسی پائی جاتی تھی۔ ہر طرف جمود نظر آتا تھا۔ حکومت کا رعب دلوں پر چھایا ہوا تھا۔ ذی وسائل اور ذی رتبہ افراد کے لئے ایک خاص احترام کی فضا موجود تھی۔ تمام ان کا مسلک و مشرب راہ حق سے کتنا ہی ہٹا ہوا تھا۔ مولانا کے لئے ایک داعیِ حق کی حیثیت میں صورتِ حال کو منقلب کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ اسی ضرورت نے انھیں ایک ایسے لب و لہجہ پر مجبور کیا جو درشت نہیں البتہ حد درجہ بے باکانہ ضرور تھا۔ دعوتِ حق کو کامیاب بنانے کا احسن طریقہ یہی تھا کہ وہ نہایت ہراس انگیز اقدامات کو زیادہ سے زیادہ محبوب و دل پذیر بنا دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں

نے نفع و سود کو ٹھکرایا اور نقصان و زیاں سے پیار کی دعوت دی۔ پھولوں کو پامال کیا اور کانٹوں سے محبت کرنے کی صدا بلند کی۔ اس وقت اہلِ ملک کو قربانی کے لئے تیار کرنا منظور تھا اور قربانی کی دعوت گل باریوں کے ذریعے سے کبھی پروان نہیں چڑھتی۔

شانِ استقامت

مولانا کے ایمان و یقین کی طرح ان کی رائے کو بھی پختگی کا بلند ترین درجہ حاصل تھا۔ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے ملک کی آزادی کے لئے کب اپنے ذہن میں ایک مستقل نقشہ تیار کر لیا تھا۔ "الہلال" کے پہلے نمبر کے افتتاحیے میں ایک اشارہ کیا ہے کہ ۱۹۰۶ء کے موسمِ گرما میں ان کی چشمِ بیدار نے ایک خواب دیکھا تھا۔ دنیا کے سامنے ان کے نقشۂ عمل کے اجزا ۱۹۱۲ء میں آئے یعنی جو پروگرام انھوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں تیار کیا تھا اس پر چوبیس سال کی عمر میں عمل شروع کیا۔ اس وقت سے آزادی حاصل کرنے تک پینتیس سال گزر گئے، سینکڑوں اکابر کی رائیں بدلیں۔ ان کے مسالک و مشارب میں تغیر پیدا ہوا لیکن مولانا نے جو راستہ ۱۹۱۲ء میں اختیار کیا تھا۔ اس پر وہ برابر انتہائی دلجمعی سے قائم رہے یہاں اس رائے پر بحث کا کوئی سوال نہیں، اصل سوال یہ ہے کہ وہ جہاں ایک مرتبہ چٹان کی طرح جم گئے وہاں سے ایک آنچ بھی اِدھر اُدھر نہ ہوسکے۔ زندگی کی عزیز ترین متاع ہر دل عزیزی ہے جسے قربان کرنے کے لئے انسان بہ آسانی تیار نہیں ہوتا۔ یہ متاعِ عزیز انھیں جوانی کے ابتدائی مراحل ہی میں اس پیمانے پر مل گئی تھی۔ جس کا ایک حصہ بھی اکثر اصحاب کے نزدیک سرمایۂ فخر بن کر حاصلِ حیات ہوتا ہے اور یہ ہر دل عزیزی ایسی نہ تھی جیسی سیاسی ہنگاموں کے دوران میں پھولوں کے ہاروں، جلوسوں اور نعروں کی شکل اختیار کر کے لیڈروں کے روبرو پیش ہوتی رہی۔ مولانا کی ہر دل عزیزی دلوں کی تڑپ کا جزو بن گئی تھی۔ یہ گراں بہا متاع انھوں نے اپنی رائے کی پختگی اور اپنے مسلک کی استقامت کے سلسلے میں بے دریغ لٹا دی۔ اپنے علم و نظر کے مطابق حق کی خاطر اس بے نظیر حوصلے، اس بے مثال ہمت اور اس بے مدیث قربانی کا نمونہ کہاں مل سکتا ہے؟

علم و عمل کا تاجدار

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جن لوگوں کو علم و نظر میں تاجداری و سلطانی کا مرتبہ مل جاتا ہے۔ وہ عمل و عزیمت کے میدان میں کم تر ہی کوئی ممتاز درجہ حاصل کرتے ہیں۔ کتابوں کے مطالعے اور غور و فکر میں انہماک عموماً قوتِ عمل پر ناخوشگوار اثر ڈالتا ہے۔ مولانا علم و عمل دونوں کے تاجدار تھے۔ انھیں دونوں دائروں میں سلطانی کا تاج نصیب ہوا اور آج فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ علم میں بڑے تھے یا عمل میں، انھوں نے مدت العمر قوم کو عزیمت کی دعوت دی اور یہ دعوت جوش نما الفاظ، دل نشیں تحریرات یا پُر تاثیر خطابت تک محدود نہ تھی بلکہ ایسے قلب کی گہرائیوں سے اٹھی ہوئی دعوت تھی۔ جس کے متحرک خون کا ہر قطرہ عزیمت کی حرارت سے مخمور تھا۔ انھوں نے جو اونچی سے اونچی بات کہی۔ اس پر اونچے سے اونچے کا عمل کا نمونہ پیش کیا۔ ایسے یگانہ افراد ہر فضا میں تربیت نہیں پاتے اور ایسے گراں مایہ گوہر ہر خاک سے نہیں اٹھتے۔ غالب کیا خوب کہہ گیا ہے۔

عمر ہا چرخ بہ گردد کہ جگر سوختۂ

چوں من از دودۂ آتش نفساں برخیزد

مضمون بے قصد و ارادہ بہت لمبا ہوگیا۔ سچ ہے :-

ہمیں عشق است برخود چیدہ چندیں داستاں ورنہ

کسے از معنیٔ یک حرف صد دفتر نمی سازد

استغنا اور بے نیازی

تاہم مولانا کی ایک نادر خصوصیت کا ذکر کئے بغیر اسے ختم نہیں کرسکتا یہ اُن کی شانِ بے نیازی تھی۔ "الہلال" کے دورِ اول ہی میں دنیا نے تسلیم کر لیا تھا کہ علم و فضل میں ویسا آدمی صدیوں سے پیدا نہیں ہوا اور عقیدت مندوں کا ایک وسیع حلقہ ان سے وابستہ ہوگیا تھا۔ بارہا ان سے التجائیں کی گئیں کہ اپنے سوانح مرتب فرما دیجئے اور اپنے علوم و معارف کی مستقل حفاظت کا بندوبست کر دیجئے انھوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ نیازمندوں کی التجاؤں کو شرفِ پذیرائی بھی بخشا۔ پھر ہر اسکیم، ہر منصوبہ اور ہر ارادہ ان کی بے نیازی کی نذر ہوگیا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے بھی ایک جگہ اطمینان سے بیٹھ جاتے تو علوم و معارف کا ایک یگانہ حلقہ قائم کر سکتے تھے اور یہ حلقہ ان کی نگرانی میں علمی کارناموں کے ایسے انبار لگا سکتا تھا۔ جن کی کوئی مثال اس وقت تک سامنے نہیں آئی اور خود اُن کے معارف بھی بہترین طریق پر اشاعت پا سکتے تھے مگر انھوں نے اپنی ذات کو ہمیشہ سب سے آخر میں رکھا۔ یہ استغناء

یہ بے نیازی تمام نیازمندوں کے لئے ہمیشہ رنج و قلق کا سامان بنی رہی۔ معلوم ہوتا ہے وہ طے کئے بیٹھے تھے کہ اگر انھوں نے علم و عمل کی کوئی قابلِ ذکر متاع چھوڑی ہے تو زمانہ خود اسے محفوظ کرے گا۔ اگرچہ اسے محفوظ کر دینے کا وقت کتنی صدیوں کے بعد آئے گا اگر ایسی کوئی متاع نہیں چھوڑی تو پھر اس کی حفاظت میں چند لمحے بھی صرف کرنا قدرت کی عطا کی ہوئی مہلت کا ضیاع ہوگا۔

نذرِ حقیر

میں اپنے علم و نظر کی بے مائگی کو سامنے رکھتے ہوئے اس بلند مرتبہ شخصیت کے متعلق کچھ لکھنے کا اہل نہ تھا۔ چند محسوسات و مشاہدات تھے، جو بے اختیار زبانِ قلم پر آ گئے۔ یہ بے رنگ اور بے خوشبو پھول ہیں۔ جنھیں دامن میں سمیٹ کر مولانا کی بارگاہ عظمت و جلال میں حاضر ہوا ہوں۔ ایک بے نوا فقیر سلطانِ علم و عمل کی قدم گاہ میں اور کیا نذر پیش کر سکتا ہے؟ خدا کرے یہ نذرِ حقیر شرف قبول سے محروم نہ رہے۔ اس ذکر کو مرزا غالب کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں جس کی ردیف ضرورتاً بدل لی ہے۔

ہندرا رندِ سخن پیشہ گمنامے بود
اندریں دیر کہن سے کدہ آشامے بود

مرزا غالب ہندوستان کے یگانہ تاجدارِ سخن تھے۔ مولانا علم و عمل دونوں کے یگانہ تاجدار تھے۔ مرزا بھی گمنام نہ تھے اور مولانا کے بارے میں بھی کسی کو گمنامی کا وسوسہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن مرزا نے اپنے مقام کی برتری اور اس کے شایانِ شان قدر شناسی سے محرومی کے باعث اپنے آپ کو گمنام کہنا پسند کیا تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ بالکل یہی حالت مولانا کی سمجھیئے۔

زمانہ جس طرح غیر معلوم ماضی سے گردش میں ہے۔ اسی طرح غیر معلوم مستقبل میں بھی گردش کرتا رہے گا۔ عام لوگ بھی پیدا ہوتے رہیں گے اور بلند مرتبہ شخصیتوں کے ظہور کا دروازہ بھی بند نہ ہوگا۔ لیکن ہم جیرہ ذوقی کے جس عہد سے گزر رہے ہیں اسے مدنظر رکھتے ہوئے کیا امید ہو سکتی ہے کہ مولانا کے پایے کی یا ان سے ملتی جلتی شخصیت پھر پیدا ہوگی؟ اس کائنات کی کوئی بھی شے فنا کی دسترس سے باہر نہیں۔ بقا صرف اللہ کے لئے ہے۔

روحی الہ آبادی

یَغفِرُکَ اللّٰہُ

۱۳۷۷ھ

قطعۂ تاریخ وفاتِ حسرت آیات امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نوراللہ مرقدہٗ

اُٹھ گیا آزاد ذی فضل و کمال — ہو گئی سنسان بزمِ سوز و ساز
چشم ناکامِ تماشائے جمال — گوش محرومِ صدائے دل نواز
چھپ گیا علم و ادب کا آفتاب — آ گئی شامِ بلا محشر طراز
جنگِ آزادی کا وہ مردِ جری — سرزمینِ ہند کو تھا جس پہ ناز
تھا غریبوں کا انیس و غم گسار — دردمندانِ وطن کا چارہ ساز
تھا سراپا درد وہ عالی تبار — پیکرِ اخلاق تھا وہ پاک باز
اس کا دل تھا محرمِ رازِ حیات — دور بیں تھی اس کی چشمِ امتیاز
رحلتِ آزاد کی صبحِ ملال — لے کے آئی ہے شبِ ہجر دراز
اس کی فرقت میں ہیں آنکھیں خونچکاں — ہے زباں پر یہ دعائے دل گداز
وقفِ عیشِ جاوداں ہو اس کی روح — دے اسے جنت خدائے بے نیاز

یہ ہے روحی اس کی تاریخِ وفات
زیرِ تربت اب ہے محوِ خوابِ ناز

۱۹۵۸ء

سعید احمد اکبرآبادی

ترجمان القرآن

مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو ادب کے چمن میں حسنِ انشا و بیان کے جو پھول کھلائے ہیں یوں تو وہ سب ہی سدا بہار ہیں لیکن مستقل تصنیف کی حیثیت سے قرآن مجید کی تفسیر "ترجمان القرآن" مولانا کی تمام علمی اور ادبی تحریروں میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ قلم کی توانائی، اجتہادِ فکر، وسعتِ نظر و مطالعہ اور تحقیق و تدقیق مولانا کی یہ وہ خصوصیات ہیں جو اُن کی ہر علمی اور ادبی تحریر میں نمایاں ہیں لیکن مولانا کی یہ خصوصیات اس کتاب میں جا بجا نمایاں ہیں اور اس بنا پر اردو زبان کے علمی ذخیرے میں اس کو امتیازی مقام حاصل ہے۔

عربی، فارسی اور اردو میں سینکڑوں تفسیریں لکھی جا چکی ہیں لیکن اُن کا عام رنگ یہ ہے کہ ایک آیت کی تشریح و توضیح میں اس سے مستخرج احکام کے بارے میں متقدمین مفسرین کے جو مختلف اقوال منقول ہیں ان سب کو نقل کرتے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ہی اُن اقوال میں سے ہر ایک کی دلیل بھی بیان کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اربابِ علم ان سے استفادہ کرلیں تو کرلیں۔ لیکن عام لوگوں کا دماغ ان میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور قرآن کا جو مقصد ہے یعنی کسی حقیقت کو ذہن نشین کرکے اس کا یقین پیدا کر دینا وہ حاصل نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں ہر مفسر کوشش کرتا ہے کہ وہ فقہ یا علم الکلام کے جس مسلک سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کو قرآن کی آیات سے ثابت کرے۔ اور دوسرے مسلک کے لوگوں کی تردید میں اُن سے استدلال کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن کی تفسیر میں تاویل و توجیہہ کا ایک ایسا باب کھل جاتا ہے کہ قرآن کی عمومیت، اس کی جامعیت اور اس کی بے قید و بند تعلیمات محدود ہو کر رہ جاتی ہیں اور قرآن فقہی اور کلامی بحثوں کا میدان بن جاتا ہے۔ مولانا نے اس عام روش کے خلاف بالکل ایک نیا طریقہ اور نیا اسلوب اختیار کیا ہے جو قرآن کی عمومیت کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ مولانا عربی زبان اور اس کے اسالیبِ بیان، صحابۂ کرام کے اقوال اور قدما مفسرین کی تشریحات و توضیحات کی روشنی میں کامل غور و خوض کے بعد قرآن کی آیت کا ایک مطلب متعین کر لیتے ہیں اور اس کو کمال قوت و بلاغت کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ قاری کے ذہن میں اضطراب و تشویش کی کوئی کیفیت پیدا نہیں ہوتی اور قرآن کے حقائق و مطالب دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔

عام تفسیروں کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اُن میں بقول مولانا کے "وضعیت" پائی جاتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ جو جو علوم و فنون پیدا ہوتے رہے اور عام انسانی افکار و خیالات پر اُن کی گرفت مضبوط ہوتی رہی قرآن کی تفسیر میں بھی اس کے اثرات نمایاں ہوتے رہے۔ چنانچہ امام فخرالدین رازی کی مشہور تفسیر کبیر کی نسبت کہنا پڑا کہ اس میں منطق، فلسفہ، حکمت، علم الکلام وغیرہ سب کچھ ہے مگر قرآن نہیں ہے۔ ہمارے زمانے میں اس کی سب سے بڑی مثال مصر کے علامہ جوہر طنطاوی کی ضخیم تفسیر جواہر القرآن ہے جس نے قرآن کو سائنس کے علوم و فنون کا ایک ذخیرہ بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے یہ وضعیت یا صناعیت قرآن کی اس سادگی اور فطریت کے بالکل خلاف ہے جو اس کی ہر ہر آیت میں نمایاں ہے۔ قرآن اگرچہ عقل کو نظرانداز نہیں کرتا لیکن اس کا عام طریقۂ استدلال وجدانی ہوتا ہے جس کو ہر شخص خواہ عالم ہو یا جاہل محسوس کرتا ہے اور اسی وجدانیت کے ذریعہ ہدایت اور اصلاح کا وہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے جس کے لئے دنیا میں پیغمبر آتے رہے اور جس کے لئے خود قرآن کا نزول ہوا۔ اس سلسلے میں مولانا کا کمال یہ ہے کہ ایک طرف تو اس فطریت اور سادگی کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے

جو قرآن کے اسلوبِ بیان کی نمایاں خصوصیت ہے اور دوسری جانب جہاں کہیں قرآن کی کسی تاریخی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے سائنٹیفک طریقۂ استدلال کی ضرورت ہوتی ہے وہاں تحقیق و تدقیق اور بحث و نظر کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ذوالقرنین نامی جس شخصیت کا ذکر آیا ہے اُس کے بارے میں کافی اختلاف ہے کہ یہ کون شخص تھا؟ اکثر مفسرین کا رجحان یہ ہے کہ ذوالقرنین سے مراد سکندرِ مقدونی ہے۔ لیکن مولانا نے ان تمام آراء کے برخلاف بڑی تحقیق اور کاوش کے بعد آثارِ قدیمہ اکتشافاتِ جدیدہ اور پھر خود قرآن کے بیان کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ اس سے مراد ایران کا عظیم المرتبت بادشاہ کیخسرو ہے۔ مولانا نے اس بحث میں ایک بلند پایہ مؤرخ کا رول ادا کیا ہے۔ اسی طرح خدا کی ذات و صفات پر سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں جو کلام کیا ہے وہ جس طرح انسانی فطرت و وجدان کو اپیل کرتا ہے فلسفہ کے طلباء اور علماء کو بھی متاثر کرتا ہے۔ مولانا قرآن کی اصل فطریت اور سادگی اور اُس کی وجدانیت کے ساتھ فلسفے و سائنس کا پیوند اس خوش اسلوبی کے ساتھ لگاتے ہیں کہ ذہنیت کا رنگ غالب نہیں ہونے پاتا اور وجدان کی بیداری کے ساتھ عقل کی تسکین کا بھی سامان ہوتا رہتا ہے۔

ان چیزوں سے قطع نظر عام تفسیروں میں ایک نقص یہ ہے کہ اُن میں معمولی معمولی اور فروعی باتوں پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک قرآن کی اہم اور بنیادی تعلیمات کا تعلق ہے جن کا رابطہ عام انسانی اجتماع و تمدن سے ہے اُن پر یا تو کلام ہی نہیں کیا جاتا۔ یا کلام کیا بھی تو محض سرسری اور ضمنی۔ جس سے قرآن کا بڑا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور اس کا خطاب ایک قوم یا ایک جماعت کے ساتھ مختص ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً وحدتِ ادیان۔ اور دوسرے مذاہب اور اُن کی الہامی کتابوں کی تصدیق۔ قرآن کی ایسی اہم اور بنیادی تعلیم ہے جس کو اس نے بار بار مختلف طریقوں سے بڑے شد و مد کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لیکن عام مفسرین نے اس پر زیادہ اعتنا نہیں کیا اور جہاں کہیں ایسی آیات آئی ہیں اُن پر سرسری طور سے گذر گئے ہیں۔ متاخرین میں غالباً حضرت شاہ ولی اللہ البیادی پہلے شخص ہیں جنھوں نے حجۃ اللہ البالغہ میں اور دوسری کتابوں میں اس حقیقت کو زیادہ اُبھارا اور اُجاگر کیا ہے اور ان کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد دوسرے بزرگ ہیں جنھوں نے اس بحث پر نہایت مدلل، واضح اور پُرزور کام کیا ہے اور اس سلسلے میں دین کی اصل حقیقت، عہد بعہد اس کا ارتقاء شریعت و منہاج کا فرق، دین اور شریعت کا باہمی تعلق، دوسرے مذاہب آلہ کے باہمی اور ان کی آسمانی کتابوں کے متعلق قرآن کا نقطۂ نظر اور اس سلسلے میں پیغمبرِ اسلام کی عام دعوت اور انسانیتِ عامہ کی فلاح و بہبود کا اصل راز۔ ان تمام مباحث پر مولانا نے زورِ قلم کمالِ بلاغت اور وسعتِ فکر و نظر کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس بحث کو پڑھ کر صاف محسوس ہوتا ہے کہ قرآن اُس پروردگارِ عالم کا کلام ہے جس کی ربوبیت اور پروردگاری ہر انسان اور ہر شخص کے لئے ہے اور وہ کسی خاص ایک گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ قرآن فرقہ بندیوں اور گروہ سازیوں کو توڑنا چاہتا ہے نہ کہ ان میں اور اضافہ کرنا۔ وہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کی طرف جو دعوت دیتا ہے وہ ایک ایسی ازلی اور ابدی حقیقت ہے جو ہر مذہب کی بنیاد ہے اس لئے اس کا کام وصل کردن ہے نہ کہ فصل کردن۔

چنانچہ مولانا اسلام کے لفظ کی تشریح بھی اسی وحدتِ ادیان کی روشنی میں اس طرح کرتے ہیں :۔

"اس نے (قرآن نے) دین کے لئے الاسلام کا لفظ اسی لئے اختیار کیا ہے کہ "اسلام" کے معنی کسی بات کے مان لینے اور فرماں برداری کرنے کے ہیں۔ وہ کہتا ہے، دین کی حقیقت یہی ہے کہ خدا نے جو قانونِ سعادت انسان کے لئے ٹھہرا دیا ہے، اس کی ٹھیک ٹھیک اطاعت کی جائے۔ وہ کہتا ہے۔ یہ کچھ انسان ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ تمام کائناتِ ہستی اسی اصل پر قائم ہے۔ سب کے بقاد قیام کے لئے خدا نے کوئی نہ کوئی قانونِ عمل ٹھہرا دیا ہے اور سب اس کی اطاعت کر رہے ہیں۔ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی روگردانی کریں تو کارخانۂ ہستی درہم برہم ہو جائے . . . . . وہ جب کہتا ہے "الاسلام" کے سوا کوئی دین اللہ کے نزدیک مقبول نہیں تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ دینِ حقیقی کے سوا جو ایک ہی ہے اور تمام رسولوں کی مشترک تعلیم ہے انسانی ساخت کی کوئی گروہ بندی مقبول نہیں۔"

(ترجمان القرآن ج ۱ ص ۲۰۸-۲۰۹)

مولانا نے اس بحث کے آخر میں ایک بڑا نکتہ پیدا کیا ہے۔ مجھ کو یاد نہیں پڑتا کہ کہیں کسی اور جگہ میری نظر سے گذرا ہو۔ یہ سب کچھ لکھنے کے بعد خود سوال کرتے ہیں کہ :۔

"جب قرآن کی دعوت کا یہ حال تھا تو پھر آخر اس میں اور اس کے مخالفوں میں وجہ نزاع کیا تھی؟ ایک شخص جو کسی کو بُرا نہیں کہتا

سب کو مانتا اور سب کی تعظیم کرتا ہے اور ہمیشہ ان ہی باتوں کی تلقین کرتا ہے جو سب کے یہاں مانی ہوئی ہیں۔ کوئی اس سے لڑے تو کیوں لڑے؟ اور کیوں لوگوں کو اس کا ساتھ دینے سے انکار ہو؟"

اس سوال کو قائم کرنے کے بعد خود ہی اس کا جواب اس طرح دیتے ہیں:

"اصل یہ ہے کہ پیروانِ مذاہب کی مخالفت اس لئے نہ تھی کہ وہ (قرآن) انہیں جھٹلاتا کیوں ہے بلکہ اس لئے تھی کہ جھٹلاتا کیوں نہیں؟ ہر مذہب کا پیرو چاہتا تھا کہ قرآن صرف اسی کو سچا کہے باقی سب کو جھٹلائے۔ اور چونکہ وہ یکساں طور پر سب کی تصدیق کرتا تھا اس لئے کوئی بھی اس سے خوش نہیں ہو سکتا تھا۔"

یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولانا نے تفسیر میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ذہنی پس منظر کیا ہے؟ اب سوال یہ ہے کہ یہ ذہنی پس منظر خود بخود بن گیا یا اس کی تعمیر میں چند خارجی مؤثرات و عوامل کا دخل ہے؟ اصل یہ ہے کہ انیسویں صدی کا نصف آخر اور بیسویں صدی کا شروع ایک ایسا دور ہے جس میں عالمِ اسلام نے فکری اور ذہنی طور پر ایک نئی کروٹ لی ہے اس کے اسباب سیاسی بھی ہیں اور علمی بھی۔ دنیا کے عام تمدنی حالات بھی ہیں اور علومِ جدیدہ کا ارتقا بھی! اسی نئی کروٹ کا نتیجہ تھا کہ مصر میں مفتی محمد عبدہ اور سید رشید رضا پیدا ہوئے اور ہندوستان میں شبلی اور سرسید۔ مولانا ابوالکلام کی سوانح عمری سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو مولانا میں خود اجتہادِ فکر کی کمی نہیں تھی اور دوسری جانب وہ سید رشید رضا اور سرسید احمد خاں دونوں کی تحریروں سے کافی متاثر تھے اور ان کا بکثرت مطالعہ کرتے تھے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص سید رشید رضا کی تفسیر المنار اور مولانا کا ترجمان القرآن ایک ساتھ مطالعہ کرے تو اسے صاف نظر آئے گا کہ ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے دو ذہن ہیں جو دو مختلف زبانوں میں اظہارِ مطلب کر رہے ہیں۔

متوسطین میں مولانا، حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم سے کافی متاثر ہیں۔ "الہلال" اور "البلاغ" کے زمانے میں مولانا کے قلم سے جو مذہبی تحریریں نکلیں ان میں یہ رنگ کافی نمایاں نظر آتا ہے۔ لیکن مولانا کے طرزِ بیان و انشا

اور قدرت و بلاغتِ کلام کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے خواہ کوئی فکر یا خیال کہیں سے لیا ہو لیکن اس کو اس بسط و تفصیل سے اور مدلل و مبرہن بیان کریں گے کہ اس فکر کے بانی اور موجد وہی نظر آئیں گے۔

شروع شروع میں جب مولانا کی کتاب "ترجمان القرآن" چھپ کر آئی تو جیسا کہ پہلے سے توقع تھی۔ جہاں عام طور پر اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور سراہا گیا مسلمانوں کے ایک طبقے میں اس پر سخت تنقید اور نکتہ چینی بھی ہوئی۔ جو لوگ چار پانچ صدیوں سے اجتہادِ فکر سے محروم ہو کر تقلیدِ محض اور جمودِ ذہنی کی زندگی بسر کر رہے ہوں اُن میں مولانا ابوالکلام آزاد ایسے مجتہدِ فکر کا پیدا ہو جانا اُن کے ہیجان کا باعث ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ترجمان القرآن پر تنقیدیں ہوئیں اور بہت دنوں تک اخبارات اور رسائل میں یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اگر ان تمام تنقیدوں کا تجزیہ کیا جائے تو ان تنقیدوں کا ماحصل صرف یہ دو چیزیں ملیں گی۔

۱۔ مولانا نے قرآنی حقائق کا بیان اور آیات کی تفاسیر میں بالکل قرآنی اسلوب کی پیروی کی ہے یعنی جہاں قرآن میں کوئی حقیقت مطلق ہے مولانا نے بھی اس کو اسی طرح بیان کیا ہے اور جو حقیقت مقید بیان کی گئی ہے مولانا نے بھی اس کی رعایت رکھی ہے اس اسلوب سے ان لوگوں کی تشفی تو ہو جاتی ہے جو قرآن کو فقہ و کلام کی فرقہ بندیوں سے بلند و بالا ہو کر پڑھتے ہیں لیکن جن دماغوں پر فقہی مکاتیبِ خیال کا اس قدر غلبہ ہے کہ وہ اُن سے الگ ہو کر کسی بات کو سوچ ہی نہیں سکتے اُن کو یقیناً مولانا کے اسلوب و زاویۂ نظر سے اختلاف ہونا چاہیئے۔

۲۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ مولانا نے تفسیر بالرائے سے کام لیا ہے جس کی حدیث میں مذمت آئی ہے لیکن یہ اعتراض بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ جہاں تک مولانا کی تفسیر کے مآخذ کا سوال ہے اُن کی نسبت مولانا نے خود لکھ دیا ہے کہ:

"پہلے اُس کی تفسیر صحابہ و تابعین کی روایات میں ڈھونڈو۔ پھر بعد کے مفسروں کی طرف رُخ کرو اور دونوں کا مقابلہ کرو صاف نظر آئے گا کہ صحابہ و سلف کی تفسیر میں معاملہ بالکل واضح تھا۔ بعد کی دقیقہ سنجیوں نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا اور اُلجھاؤ پیدا ہو گئے۔"

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اس کی اصل صحابہ و سلف کے ہاں ضرور موجود ہے اور محض ایجادِ بندہ نہیں ہے۔ جہاں تک تفسیر بالرائے کا تعلق ہے خود مولانا اس کے متعلق لکھتے ہیں:-

"اشکال و موانع کا بڑا دروازہ تفسیر بالرائے سے کھل گیا جس کے اندیشے سے صحابہ و سلف کی روحیں لرزتی رہتی تھیں"

لیکن تفسیر بالرائے سے مولانا کی مراد کیا ہے؟ اس کو بھی مولانا کی زبان سے سن لیجیے تاکہ مولانا کا نقطۂ نظر سمجھنے میں کوئی کنجلک باقی نہ رہے۔ فرماتے ہیں:-

"تفسیر بالرائے کا مطلب سمجھنے میں لوگوں کو لغزشیں ہوئی ہیں۔ تفسیر بالرائے کی ممانعت سے مقصود یہ نہ تھا کہ قرآن کے مطالب میں عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے۔ کیونکہ اگر یہ مطلب ہو تو پھر قرآن کا درس و مطالعہ ہی بے سود ہو جائے۔ حالانکہ خود قرآن کا حال یہ ہے کہ اول سے آخر تک تعقل و تفکر کی دعوت ہے اور ہر جگہ مطالبہ کرتا ہے کہ افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالها دراصل تفسیر بالرائے میں رائے لغوی معنی میں نہیں ہے بلکہ رائے مصطلح شارع ہے اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس لئے نہ کی جائے کہ خود قرآن کیا کہتا ہے بلکہ اس لئے کی جائے کہ ہماری کوئی ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے، اور کس طرح قرآن کو کھینچ تان کر اس کے مطابق کر دیا جا سکتا ہے۔"

اس بنا پر مولانا کو متداول اور مروجہ تفسیروں سے جو شکایت ہے وہ یہ ہے کہ

"جس مقام کی تفسیر میں متعدد اقوال موجود ہوں گے وہاں اکثر اسی قول کو ترجیح دیں گے جو سب سے زیادہ کمزور اور بے محل ہوگا۔ جو اقوال نقل کریں گے، ان میں بہتر قول موجود ہوگا۔ لیکن اس کو نظر انداز کر دیں گے۔"

مولانا کی مندرجہ بالا عبارتوں سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں اور دوسرے مفسرین میں جو راہوں کا اختلاف ہے اس کا مبنیٰ کیا ہے؟ اس بنا پر اگر بعض حلقوں میں مولانا کی تفسیر پر نکتہ چینی ہوئی تو وہ ہرگز خلاف توقع اور محل تعجب نہیں ہے۔

ترجمان القرآن۔ قرآن مجید کی تفسیر بھی ہے اور ترجمہ بھی۔ اب تک آپ نے جو کچھ پڑھا وہ تفسیر سے متعلق تھا۔ اب چند باتیں ترجمہ کی نسبت سن لیجئے:- یہ ظاہر ہے کہ ایک زبان سے کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ اصل زبان سے واقف نہیں ہیں وہ ترجمہ کے ذریعہ اس عبارت کا مفہوم و مطلب سمجھ جائیں۔ مگر عام طور پر قرآن کے جو تراجم اردو میں پائے جاتے ہیں اُن سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ تراجم لفظی بلکہ تحت اللفظی ہیں اور ان سے مقصد اخذ کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس قسم کے تراجم کے برخلاف مولوی نذیر احمد دہلوی نے ترجمہ قرآن میں دلی کی بولی ٹھولی کو اس درجہ دخل دیا کہ بعض مقامات پر قرآن کی سنجیدگی اور ثقاہت مجروح ہو گئی۔ لیکن مولانا نے نہ وہ راہ اختیار کی اور نہ یہ، بلکہ ایک طرف تو قرآن کی عظمت اور اس کی ثقاہت کا پورا خیال رکھتے ہیں اور ایسا کوئی لفظ نہیں آنے دیتے جو قرآن کے مرتبۂ ثقاہت سے فروتر ہو اور دوسری جانب ترجمہ کی ترتیب اس طرح قائم کی ہے کہ وہ اپنی وضاحت میں کسی کا محتاج نہیں۔ ایک عالم کی طرح ایک عام اردو خواں بھی اس سے پوری طرح استفادہ کر سکتا ہے۔ پھر مولانا نے صرف ترجمہ پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ جا بجا نوٹوں کا بھی اضافہ ہے۔ جن میں مطالب قرآن کی تفسیر و توضیح کی گئی ہے۔ قرآن میں جو مطلب یا جو حکم مجمل تھا اس کی تفصیل لکھی ہے تاکہ قرآن کا اصل مطلب سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو اور جہاں جہاں قرآن کے کسی مطلب کو واضح کرنے کے لئے دلائل و شواہد کی ضرورت تھی وہاں دلائل و شواہد لکھے ہیں۔ اس طرح یہ ترجمہ بجائے خود مستقل افادیت کا حامل ہے۔ اگر کوئی شخص تفسیر کا مطالعہ نہ بھی کرے تو نفس ترجمہ اور اس پر جو نوٹس ہیں ان کی مدد سے قرآن کے مطالب کو سمجھ سکتا ہے۔

پھر ترجمہ اور تفسیر اور یہی نہیں بلکہ مولانا کے عام مذہبی مضامین کی ایک نمایاں خصوصیت جس پر شاید عام لوگوں کی نظر نہیں ہے یہ ہے کہ ان سب میں مولانا کا اسلوب بیان وہی ہے جو قرآن کا ہے۔ یعنی حکیمانہ ہونے کے ساتھ ساتھ خطیبانہ بھی ہے۔ اس میں وعدہ بھی ہے اور وعید بھی۔ تبشیر بھی ہے اور انذار بھی۔ کہیں وہ نسیم جاں فزا ہے اور کہیں برق صاعقہ فگن۔ اس لئے قدرتی طور پر اس کا اثر ہوتا ہے اور قاری میں ہیجانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مولانا کا یہ طرز ادا، یہ اسلوب بیان اُن کے ہر مذہبی مضمون میں نمایاں ہے لیکن جہاں تک خاص ترجمان القرآن کا تعلق ہے تو یہ شراب دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ ہو گئی ہے اور اس لئے غالب کا یہ شعر اس پر پوری طرح صادق آتا ہے ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر جو تھا رازداں اپنا

روشِ صدیقی

امام الہند کی یاد میں

کون یہ آخرِ شب بزمِ سحر سے اُٹھا نالۂ درد، دلِ اہلِ خبر سے اُٹھا
ہائے کس وقت بجھی شمعِ نہاں خانۂ عشق شعلۂ غم نفسِ بادِ سحر سے اُٹھا
کون ہے محرمِ اسرارِ مشیت لیکن اعتبار آج دعاؤں کا اثر سے اُٹھا
ہو گئے قافلۂ اشکِ رواں میں شامل بارِ اندوہ نہ جب لعل و گہر سے اُٹھا
عظمتِ منبر و محراب جھکی جاتی ہے کون خلوت کدۂ فکر و نظر سے اُٹھا
تا فلک سلسلۂ حزن و الم طاری ہے جس طرف آنکھ اُٹھی درد اُدھر سے اُٹھا
سن لیا جب کہ جدائی ہے یہاں شرطِ وصال حشر خود اشک بداماں ترے در سے اُٹھا
علم ہے شاہدِ پنہاں کا حجابِ اکبر ہاں یہ پردہ بھی ترے حسنِ نظر سے اُٹھا
سرو خورشید نے آنکھوں سے لگایا اس کو کوئی ذرہ جو تری راہ گزر سے اُٹھا
تو نے تمکینِ خرد، ذوقِ جنوں کو بخشی ایک الزامِ کہن عشق کے سر سے اُٹھا

مرگ سے راز کھلا تیری دل آرائی کا
اک نیا دور ہے یہ تیری مسیحائی کا

حافظ علی بہادر خاں

مولانا آزاد کے فکر و نظر کی چند جھلکیاں

تحریکِ خلافت کے دور میں مولانا ابوالکلام آزاد کی رفاقت حاصل ہوئی۔ جیل کی زندگی میں ایک عرصہ تک اُن کے ساتھ ہم نوالہ و ہم پیالہ رہنے کا موقع ملا اور بارہا اُن سے بحث و گفتگو کا بھی فخر حاصل رہا۔ ان ملاقاتوں اور مذاکروں میں یہ حقیقت مجھ پر ثابت ہو گئی کہ مولانا "حیات بعد الممات" کے فلسفہ کے قائل تھے۔ ایک مقالہ میں خود انھوں نے یہ الفاظ لکھے "درحقیقت یہ ایک قانون حیات بعد الممات ہے جو کائنات کی ہر شے پر طاری ہے۔" وہ اکثر قرآن کی یہ آیت پیش کیا کرتے تھے۔ یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی (وہ موت سے زیست اور زیست سے موت پیدا کرتا ہے)۔

اس فلسفہ کی روشنی میں یہ کہنا مشکل نہیں ہے کہ مولانا آزاد کی موت دراصل ایک نئی زندگی کا پیش خیمہ ہے ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق   ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

وہ عموماً یہ آیت بھی استعمال کیا کرتے تھے۔ الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا (سب تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں زندگی دی بعد اس کے کہ ہم مر چکے تھے)

اس لحاظ سے مولانا کی وفات کے بعد اگر ان کی زندگی کے حالات تحریر و تقریر میں اس طرح پیش ہوتے رہیں جو قوم میں نئی روح پیدا کریں تو ان کی وفات کے بعد بھی ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں اور خدمتِ خلق کا رول ادا کر رہے ہیں۔

ایسے لوگوں کی تعداد کافی ہے جو مولانا ابوالکلام کے حالات بیان کرنے میں فصاحت اور بلاغت کے دریا بہا رہے ہیں اور فلسفیانہ انداز میں لطیف نکات پیش کر رہے ہیں لیکن اس مختصر مقالہ میں مجھے چند واقعات سادہ الفاظ میں بیان کرنے ہیں تاکہ خواص کے ساتھ عوام بھی ان سے سبق حاصل کر سکیں۔

"ہندوستان چھوڑ دو" والی تحریک سے کچھ دنوں قبل کا واقعہ ہے جب کہ جاپانی فوجیں ہندوستان کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھیں اور یہ اندیشہ ہو رہا تھا کہ اُن کی یلغار سے ہندوستان شاید ہی محفوظ رہ سکے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ارکان مع صدر کانگریس مولانا ابوالکلام جیل میں تھے۔ ایسے وقت گاندھی جی نے ایک اخباری بیان میں یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر جاپانیوں نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اُن کا مقابلہ بھی کانگریس عدم تشدد کے ساتھ کرے گی۔

اس وقت مولانا آزاد نینی سنٹرل جیل الہ آباد میں ایک مختصر سے یارڈ میں تھے جس میں صرف چار کوٹھریاں اور ایک ورانڈا تھا۔ ایک کوٹھری میں مولانا آزاد اور بقیہ تین میں ڈاکٹر کاٹجو، کیشو دیو مالویہ اور راقم الحروف رکھے گئے تھے جب گاندھی جی کا مذکورہ بالا انٹرویو اخبارات میں آیا تو مولانا آزاد کا اضطراب قابلِ دید تھا وہ ہم سے بار بار کہتے تھے "میرے بھائی! یہ تو کانگریس کی پوزیشن سے ہی نہیں۔ یہ گاندھی جی نے کیسے کہہ دیا۔" پھر فرماتے تھے کہ "کانگریس نے تو جاپانیوں کے مقابلہ کے لئے عدم تشدد کا کوئی فیصلہ نہیں کیا۔" مجھے مولانا کے وہ سب فقرے یاد نہیں جو وہ رہ رہ کر زبان پر لاتے تھے۔ مگر مطلب یہ تھا کہ کانگریس کے لئے عدم تشدد کوئی مذہبی عقیدہ نہیں ہے بلکہ صرف ایک پالیسی ہے جو اُس نے برطانیہ کے اقتدار سے آزاد ہونے کے لئے اختیار کر رکھی ہے یہ ضروری نہیں کہ جاپانیوں کے مقابلہ میں بھی عدم تشدد کا حربہ موثر سمجھا جائے۔

اتفاق سے میری اور مولانا کی کوٹھریوں کے درمیان ایک مستقل دروازہ کھلا تھا جس کے باعث ہر وقت ایک دوسرے کی حالت آنکھوں کے سامنے رہتی تھی۔ جب مولانا ورانڈے میں غم و غصہ کا اظہار کرنے کے بعد اپنی کوٹھری

آجکل دہلی (ابوالکلام نمبر)

جیل داخل ہوئے تو اپنی کوٹھری سے اُن کے [illegible] کا دل [illegible] کر سکتا تھا۔ وہ کوٹھری میں زیادہ [illegible] بے قرار تھے [illegible] یہ بھی سننے [illegible] گاندھی جی نے بالکل غلط بات کہہ دی۔ ایک بار اپنی کوٹھری سے [illegible] کر کے تو "گاندھی جی کی بڑی عجیب حالت ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ ہماری مشکلات کا باعث ہو جاتے ہیں اور پھر وہی ہماری مشکلات کا حل بھی ہوتے ہیں۔"

اس کے بعد مولانا کی سیاسی زندگی کا ایک اور پہلو نظر آیا۔ [illegible] یہ کوشش کی کہ ایک تحریر جیل سے باہر بھیجی جائے جو بدرجہ خلاف قانون طریقوں سے جا سکتی تھی۔ اسی زمانہ میں دو کانگریسی کارکن ایک وائس [illegible] اور ایک اسکول ٹیچر بھی سزا پا چکے تھے کہ انھوں نے جیل میں سیاسی لیڈروں کو خفیہ خطوط پہنچانے کی کوشش کی تھی اور [illegible] مولانا آزاد کہتے [illegible] اس زمانے کا کانگریس کا [illegible] فیصلہ تھا کہ جیل میں [illegible] کے بعد جیل کے قانون اور ڈسپلن کی پابندی [illegible] یا نہیں۔ مولانا آزاد اس گروپ میں تھے [illegible] خفیہ خطوط کی آمد و رفت اگر وہ انقلاب کے لئے ہو تو جائز ہے۔ [illegible] لگا تو مجھے بھی ایک خط خفیہ طریقہ سے باہر بھیجنے کا حکم [illegible] مولانا کو اور کوئی [illegible] ذریعہ [illegible] میں [illegible] خطرات [illegible] محروم رہا۔

بہرکیف جب مولانا اس فکر میں تھے کہ گاندھی جی تک اپنا پیغام پہنچائیں اور اُن کی غلطی پر متنبہ کریں کہ خبر ملی کہ گاندھی جی الٰہ آباد تشریف لا رہے ہیں جہاں کملا میموریل اسپتال کا افتتاح فرمائیں گے۔ [illegible] مولانا سے ملاقات کے لئے جیل میں بھی آئیں گے۔

گاندھی جی اور مولانا کی یہ ملاقات جیل [illegible] ہوئی تھی جہاں [illegible] میں سے کوئی موجود نہ تھا مگر گاندھی جی نے ملاقات کے بعد فوراً ہی ایک انٹرویو [illegible] بات کو [illegible] کہ پہلے انٹرویو میں جاپانیوں کے مقابلہ میں عدم تشدد [illegible] کا جو نظریہ میں نے ظاہر کیا تھا وہ میرا ذاتی عقیدہ تھا کانگریس کا عقیدہ نہیں تھا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کو اپنے فیصلہ کا اختیار ہے اور وہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ جب دوسرے روز گاندھی جی کا بیان میں نے پڑھا تو مولانا سے دریافت کیا کہ کیا آپ نے گاندھی جی سے یہ بیان دلایا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ ہاں میں نے اُن کو توجہ دلائی تھی اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسٹر جناح کا یہ الزام کتنا غلط

تھا کہ مولانا آزاد کانگریس کے یا ہندوؤں کے "شو بوائے" ہیں۔ ایک طرف تو گاندھی جی کی انصاف پسندی پر روشنی پڑتی ہے۔ دوسری طرف ثابت ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کانگریس میں [illegible] اور وہ کانگریس کے منصب قیادت اور روایات کے زبردست محافظ تھے۔

نینی جیل کی زندگی میں مولانا نے چند لیکچر بھی ہماری درخواست پر دیئے تھے۔ دوسری پارٹیوں سے بھی سیاسی قیدی ان میں شریک ہوتے سمجھے جاتے تھے۔ بعض رفیقوں کے مشورہ پر میں نے ان لیکچروں کی بنیاد پر ایک طویل مقالہ بھی لکھا تھا جس پر خود مولانا نے جگہ جگہ ترمیم و اضافہ کیا تھا۔ ایک جگہ میں نے "اسلامی کلچر" کا جملہ استعمال کیا۔ بین السطور میں مولانا نے اپنے قلم سے لکھ دیا "بشرطیکہ اسلام جیسے عالمگیر مذہب کا کوئی کلچر ہو۔" اس پر میں نے جب مولانا سے گفتگو کی تو پایا کہ اُن کی رائے میں اسلام کا کوئی مخصوص کلچر نہیں ہے۔ مختلف ممالک کے لوگوں کے مختلف کلچر ہوتے ہیں اور مختلف زمانوں میں کلچر بدلتے رہتے ہیں مگر ان مختلف ممالک کے لوگوں اور مختلف زمانوں کے لئے اسلام ایک ہی رہتا ہے۔ لہٰذا اسلام کا کوئی مخصوص کلچر نہیں ہو سکتا۔ وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ کلچر ایسا لفظ ہے جس کی کوئی تعریف نہیں کی جا سکتی اور مختلف ملکوں میں مختلف مفکرین نے اس کا استعمال مختلف معنی میں کیا ہے۔

نینی جیل میں یہ عجیب بات میں نے پائی کہ مولانا صبح سے شام تک صرف انگریزی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ صرف صبح کے چار بجے ترجمان القرآن کا فائل لے کر بیٹھتے اور اس کے بعض مسائل پر غور کرتے تھے۔ اُس کے بعد اُن کے مطالعہ میں والٹیر، روسو، نٹشے، گوئٹے اور متعدد سیاسی لیڈروں کے سوانح حیات رہتے تھے۔ بعض کتابیں ایسی بھی تھیں جن سے صرف بی۔ اے، ایم۔ اے کی قابلیت والے آدمی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ مجھے شک ہوا کہ مولانا کی انگریزی کی قابلیت اتنی ہے کہ ایسی ادق کتابیں سمجھ سکیں۔ اپنا شک رفع کرنے کے لئے اُن کتابوں میں سے بعض کے مسائل پر میں نے مولانا سے سوالات کئے۔ مولانا نے جو جواب دیئے اُن سے معلوم ہوا کہ نہ صرف انھوں نے وہ کتابیں پڑھی اور سمجھی ہیں بلکہ اُن مسائل سے متعلق دوسری بھی بہت سی انگریزی کتابوں کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ فہم مضامین کے اعتبار سے اُن کی قابلیت ایم۔ اے سے زیادہ تھی لیکن انگریزی میں گفتگو بالکل نہیں

کرسکتے تھے۔ ایک بار جیل میں انگریز حاکم (غالباً ڈپٹی کمشنر تھا) آگیا تھا۔ وہ مولانا سے انگریزی میں بات کرتا تھا تو مولانا سمجھ تو لیتے تھے مگر جواب اُردو میں ہی دیتے تھے۔ بعد میں مولانا نے انگریزی بولنے کی بھی کچھ مہارت پیدا کی تھی مگر نہ اس قدر کہ بے تکان بات چیت کرسکیں میرا خیال ہے کہ مولانا کو انگریزی بولنے میں صرف اس لئے تکلف تھا کہ تحریر و تقریر میں جو بلند معیار اُن کے پیشِ نظر رہتا تھا اُسے گفتگو میں قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔ اسی لئے مولانا نے شاعری ترک کردی تھی۔ وہ فی البدیہہ شعر کہتے تھے۔ جو نہایت اچھے بھی ہوتے تھے لیکن مولانا کے اعلیٰ معیار پر پورے نہیں اُترتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو اعلیٰ معیار انھوں نے قائم کیا تھا اُس کے مطابق وہ شعر نہیں کہہ سکتے تھے لیکن ایسے شعر کہنے کے لئے جتنی فرصت درکار تھی وہ انھیں کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ مجبوراً انھوں نے شعر گوئی کا شوق ترک کر دیا۔

شعر و شاعری کا ذکر آگیا تو ایک واقعہ اور بھی لکھ دوں۔ مولانا کی آنکھیں آشوب کر آئیں جس کے باعث اُن کا مطالعہ بند ہوگیا۔ معمول یہ تھا کہ میں اور وہ صبح سویرے اُٹھتے مولانا اپنے ہاتھ سے چائے تیار کرتے اور پینے کے لئے تحریر پڑھتے۔ دو دو کپ چائے پی کر ہم الگ ہوجاتے اور اپنا اپنا مطالعہ شروع کر دیتے لیکن جب آنکھیں دُکھنے لگیں تو کبھی تو صبح تک باتوں میں گزر جاتی اور کبھی میں اپنی کوٹھری میں چلا آتا اور مولانا تنہا کچھ سوچتے یا عموماً اشعار پڑھتے رہتے۔ ایک روز چائے کے بعد جب میں اپنی کوٹھری میں آکر مطالعہ میں مشغول ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا اپنی کوٹھری میں چہل قدمی کرتے جاتے ہیں، سگریٹ کے دھوئیں چھوڑتے جاتے ہیں اور میرؔ کی غزل کا یہ شعر ہلکی آواز سے مزے لے لے کر گاتے جاتے ہیں ؎

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

اوپر بتا چکا ہوں کہ دونوں کوٹھریوں کی پوزیشن ایسی تھی کہ درمیان میں مستقل در کھلا ہوا تھا اور مولانا کی ایکٹنگ کے لئے میں تماشائی تھا۔ مولانا کو جو ترنگ میں میرؔ کی غزل پڑھتے دیکھا تو سوچا شاید مجھے دیکھ کر مولانا آزادی سے اپنے جذبات کا مظاہرہ نہ کرسکیں لہٰذا میں پلنگ پر لیٹ گیا گویا کہ سو رہا ہوں۔ مگر تقریباً ایک گھنٹہ تک نیم باز آنکھوں سے یہ تماشا دیکھتا رہا کہ مولانا لہرا لہرا کر غزل کے اشعار پڑھتے تھے اور جب مذکورہ بالا شعر پر آتے تو خوب اُس کی رٹ لگاتے اور وجد میں آجاتے۔ مقطع کو بھی بار بار دہراتے ؎

میرؔ کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو تم اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

مولانا کی آنکھیں کیا دُکھنے آئیں کہ میرا نصیب جاگ اٹھا کیونکہ صبح کا مطالعہ تو بند ہوگیا تھا مگر چائے کا دَور ضرور اپنے وقت پر چلتا تھا اُس کے بعد اکثر مولانا کی گل افشانیاں صبح تک جاری رہتی تھیں۔ اگرچہ اُردو زبان میں گل افشانی کا محاورہ کبھی بُرے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے مگر میں اصلی لغوی معنی میں استعمال کر رہا ہوں۔ بلا مبالغہ پھول جھڑتے تھے۔ کاش کہ اللہ تعالیٰ مجھے وسعتِ داماں بھی بخشتا۔ خیر! جتنا بھی مل گیا اُس کے لئے شکر ادا نہیں کرسکتا۔ اگر اس گفتگو کے صبحگاہی کے مختلف پہلو لکھنے لگوں تو سو ڈیڑھ سو صفحات لکھنے کے بعد بھی یہی کہتا رہوں گا۔

؎ کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

جیل کی زندگی میں مولانا کے تبصرے، لطیفے اور پند و نصائح سُننے کے متعدد مواقع ملتے تھے۔ دو وقت کھانے کی میز پر، ایک وقت ناشتے کے ساتھ، اور ایک بار شام کو پانچ بجے کی چائے پر، علاوہ بریں جب اخبارات پڑھ چکتے تھے تو اُس روز کی خبروں پر بھی رائے زنی ہوتی تھی۔ پھر شام کو ہم لوگ بیڈمنٹن کھیلتے اور مولانا کتاب لے کر برآمدے میں بیٹھتے اور کھلاڑیوں کو داد دیتے۔ کبھی شطرنج جم جاتی تھی۔ دو ایک شاطر دوسرے یارڈوں سے بھی آجاتے تھے۔ مگر عموماً میں ایک طرف ہوتا اور سب مل کر مجھے مات دینے کی ناکام کوشش کرتے۔ میرے مقابلہ پر تو ڈاکٹر کاٹجو یا کرشن کانت مالویہ بیٹھتے تھے مگر چالیں بتانے میں مولانا بھی شریک ہوتے تھے۔ میں سب کو مات دیا کرتا تھا لیکن ایک روز مجھ سے ایسی غلطی چال میں ہوگئی کہ ڈاکٹر کاٹجو نے مات کر دیا۔ بس پھر کیا تھا مولانا نے بساط الٹ دی اور فرمایا کہ بس اب حافظ جی کو مات ہوگیا اب نہیں کھیلتے اور دوسرے یارڈوں میں بھی شاطروں کو خبر بھجوا دی کہ "حافظ جی کو مات ہوگیا" جیل میں تاش بھی ہوتا تھا مگر مولانا اس میں کبھی دلچسپی نہیں لیتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی اس زندگی کا نقشہ پیش کرتے ہوئے چند الفاظ اُس بارک کے متعلق لکھ دینا ضروری ہیں جس میں مولانا کو قید کیا گیا تھا اور جہاں حسنِ اتفاق سے مجھے مولانا کی رفاقت کی معیت نصیب ہوگئی تھی یعنی منول

جیل الٰہ آباد کے مضافات میں بہت وسیع جیل ہے۔ اس کے اندرونی وسیع رقبہ کے ایک گوشہ میں چار کوٹھریوں کے گرد احاطہ کی دیوار بنا کر وہ پارک بنائی گئی تھی جس میں مولانا آزاد کو رکھا گیا تھا۔ اسے جیل کے قیدی "کتا پارک" کہتے ہیں۔ سبب یہ کہ اس میں اُن قیدیوں کو رکھا جاتا تھا جن کو پیٹنے کا پروگرام ہوتا تھا۔ اِن کوٹھریوں میں بند کر کے جب ان پر مار پڑتی تھی تو یہ کتے بھی چیختے اور چلاتے کتوں کی طرح چلاتے مگر دوسری بارکوں تک آواز نہ پہنچتی تھی اس لئے بارک کا نام "کتا پارک" پڑ گیا تھا۔ جب پنڈت جواہر لال نہرو کے والد پنڈت موتی لال نہرو کو گرفتار کیا گیا تو یہی چار کوٹھریاں رہنے کو دی گئیں تاکہ وہ عام قیدیوں سے بالکل الگ رہ سکیں اور اُن پر سیاسی اثرات نہ پڑنے پائیں۔ پنڈت موتی لال نہرو کے لئے انگریزی حکومت نے ایک وارنڈا اور بنوا دیا۔ میں جب پہنچا ہوں تو اس میں تین سیاسی قیدی تھے۔ ایک مسٹر کینشو دیو مالویہ، دوسرے بالکرشن شرما "نوین" اور تیسرے مسٹر پالیوال۔ یہ تینوں اُتر پردیش کے مشہور سیاسی لیڈر تھے۔ میں اگرچہ بمبئی کا تھا مگر الٰہ آباد میں ایک تقریر کی تھی جس کے جرم میں وارنٹ بھیج کر حکومت نے بمبئی سے گرفتار کرا لیا تھا۔ اس کے بعد کوئی نہ کوئی رہا ہوتا گیا اور ڈاکٹر کاٹجو، آر۔ ایس پنڈت (وجے لکشمی کے شوہر) مولانا آزاد اور ڈاکٹر حسین ظہیر بادی باری آتے گئے۔ مولانا کو پہلے تو ایک ہی کوٹھری ملی تھی لیکن بعد میں ہم لوگوں نے مولانا کی تکلیف کا خیال کر کے اُن کو دو کوٹھریاں دے دیں اور دو آدمی ایک میں ہو گئے۔ مولانا ایک کوٹھری بطور غسل خانہ استعمال کرنے لگے۔ ان کوٹھریوں کے رقبہ کا اندازہ یوں کیجئے کہ جس کوٹھی میں مولانا کا انتقال ہوا اُس کے ڈرائنگ روم میں تین جیل والی چھ کوٹھریاں بن سکتی تھیں۔ اسی احاطہ کے اندر بیڈمنٹن کا کورٹ تھا۔ ہم سب اے کلاس قیدی تھے اس لئے جو کھانا جیل سے ملتا تھا اُس میں اپنے خرچ پر اضافہ بھی کر سکتے تھے۔ کبھی کبھی پنڈت نہرو کے گھر سے (غالباً وجے لکشمی پنڈت کی طرف سے) کوئی کھانے کی چیز آ جاتی تھی۔ مگر زیادہ تر وہیں کھانا تیار ہوتا تھا۔ احمد نگر کی اسیری کے دوران تیز اپنی کوٹھی پر مولانا معمولی چائے کی بجائے یاسمین سے شوق کرتے تھے مگر نینی سنٹرل جیل میں لپٹن یا بروک بانڈ ہی استعمال ہوتی تھی۔ کبھی اتفاق سے صبح چار بجے کی چائے کے وقت اگر رات کا دودھ خراب ہو گیا یا بلی پی گئی تو پھر مولانا بغیر دودھ کی چائے کا سیٹ نکالتے تھے۔

بمبئی میں آغا حشر کشمیری مشہور ڈراما نگسٹ سے جو مولانا کے ساتھ تھے مجملہ اور حالات کے مولانا آزاد کے اشعار بھی سنتے تھے۔ ان میں سے دو ایک شعر مجھے یاد تھے۔ نینی جیل میں میں نے مولانا سے دریافت کیا کہ آیا یہ اشعار اُن کے ہی ہیں اور آغا حشر کی سند پیش کی۔ مولانا یہ کہتے ہوئے اپنی کوٹھری میں چلے گئے کہ "عہد جاہلیت کی باتوں سے کیا فائدہ؟" ان میں سے دو شعر یہ ہیں ؎

وعدۂ وصل بھی اک طرز تماشہ کی ہے بات ۔۔۔ میں تو سمجھوں نہ کبھی اُن کو کبھی یاد نہ ہو

آزاد سے خودی کے نشیب و فراز دیکھ ۔۔۔ پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

مولانا کبھی کبھی بمبئی بھی رہے ہیں مگر اُن کی سرگرمیاں زیادہ تر کلکتہ ہی میں محدود رہیں۔ بمبئی میں پرپل روڈ پر اُن کے والد کے نام سے ابھی تک بیت خیر الدین موجود ہے۔ ایک بار تحریک خلافت کے زمانہ میں منبر پر کھڑے ہو کر میں نے سیاسی تقریر کی تو مجھے سیٹھ عبدالرحمٰن فیت والا مرحوم نے بتایا کہ اسی منبر پر مولانا آزاد کے والد اپنا خطبہ اس مصرعہ سے شروع کیا کرتے تھے۔

۴ سب کا خدا خدا ہے میرا خدا محمدؐ

اس مصرعہ میں مذہبی عقائد کا جو تصور ہے اُس کے خلاف مولانا آزاد نے جس طرح بغاوت کی اُس کا نقشہ مولانا ملیح آبادی کی کتاب "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" میں نہایت دلچسپ پیش کیا گیا ہے۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ باپ اور بیٹے کے عقائد میں یہ بعد المشرقین بہت ہی دلچسپ ہے۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہ سمجھنا چاہیئے کہ مولانا آزاد بالکل "وہابی" ہو گئے تھے۔ اُن کی وسیع الخیالی کا تجربہ مجھے کئی اہم مواقع پر ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں جب میں روزانہ "خلافت" کا ایڈیٹر تھا تو میں نے اُس میں تصاویر کی اشاعت شروع کی۔ اس پر مولویوں نے بہت مخالفت کی کیونکہ اُن کے نزدیک فوٹو کی اشاعت حرام تھی۔ مولانا یہ سلسلہ "الہلال" میں شروع کر چکے تھے میں نے اُن سے اخلاقی امداد طلب کی۔ مولانا نے کوئی اعلان تو نہیں دیا۔ مگر پرائیویٹ طریقہ سے بعض سرکردہ مخالفین کو سمجھا دیا اور مجھے چند ایسے مشورے دیئے جو نیر بہدف ثابت ہوئے۔ مثلاً یہ کہ پہلے مظالم سمرنا اور قائدین ترکی کے فوٹو شائع کرو جب لوگ عادی ہو جائیں تو آگے قدم بڑھانا۔ اس طرح روزنامہ "خلافت" میں فوٹو چھپنے کا رواج ہو گیا۔

دوسرا واقعہ اُن کی وسعت نظری کا یہ ہے کہ جب کمال اتاترک نے خلیفہ کو جلا وطن کر کے جمہوریت قائم کی تو مولانا نے اس خیال کی تائید کی کہ ایک جمہوری کونسل بھی خلیفہ کی قائم مقام ہو سکتی ہے۔ خلیفہ کی جلاوطنی پر آگے اور علی برادران کے درمیان نہایت ناخوشگوار مناقشہ بھی ہوا مگر مولانا نے ایک سلسلۂ مضامین میں کمال اتاترک کے طریق کار کی حمایت کی۔

مسلمانوں میں جس قسم کا پردہ رائج ہے مولانا اُسے غلط سمجھتے تھے۔ جیل میں اس مسئلہ پر کافی گفتگو ہو چکی تھی لیکن جیل سے باہر بھی ایک بار جب میرے دوست خلیل شرف الدین مع اپنی ہمشیرہ کے مولانا کی ملاقات کو گئے تو اُن کی ہمشیر کا صرف چہرہ اور ہاتھ کھلے تھے۔ مولانا نے فرمایا اسلام کا منشا اسی قسم کا پردہ ہے۔

مولانا کا تعلق اسلام کے کسی فرقہ سے نہیں تھا۔ وہ اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے اور ہر مسئلہ پر اسلام کی تعلیمات کی روح و منشاء کی روشنی میں نظر ڈالتے تھے۔ حال میں کتاب "آزاد کی کہانی" کے بعض ابواب، شیعہ فرقہ کو یہ غلط فہمی ہو رہی ہے کہ مولانا اُن کے خلاف تھے لیکن نینی جیل میں ایک واقعہ پیش آیا جو اس غلط فہمی کو دُور کر سکتا ہے۔ جب ہم جیل میں تھے تو لکھنؤ میں مدح صحابہ کا قضیہ چل رہا تھا۔ میرے اخبار روزنامہ "ہلال" میں ایک مقالہ مدح صحابہ کی تائید میں شائع ہوا تھا۔ یہ پرچہ جب جیل میں آیا تو ڈاکٹر کاٹجو نے اس مقالہ میں دلچسپی لی کیونکہ جب وہ یو۔ پی میں وزیر قانون تھے تو انھوں نے مدح صحابہ کے حق میں رائے دی تھی۔ ڈاکٹر کاٹجو کو یہ موقع اُس وقت ملا تھا جب کانگریس نے صوبائی خود مختاری کے دَور میں وزارتیں بنائی تھیں۔ مولانا آزاد مدح صحابہ کی تحریک کے خلاف تھے۔ اور اس بارے میں جمعیۃ علماء اور مجلس احرار دونوں سے اُن کو اختلاف تھا۔ ڈاکٹر کاٹجو نے روزنامہ "ہلال" کا وہ پرچہ مولانا کو دکھایا۔ مولانا مجھ پر خفا ہوئے کہ تمھارے اخبار میں ایسے مقالات کیوں چھپتے ہیں۔ ڈاکٹر حسین ظہیر بھی اس وقت جیل میں تھے۔ میں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ میں تو بمبئی سے اتنی دور آپ کے پاس ہوں مجھ پر "ہلال" کے مقالات کی کوئی ذمہ داری نہیں ہو سکتی۔ بہرکیف مولانا نے مجھ سے ایک خط بمبئی لکھوا دیا جس میں ادارۂ "ہلال" کو ایسے مقالات شائع کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔

اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولانا کے سامنے کسی وقت بھی کسی خاص فرقہ کی مخالفت یا موافقت کا سوال نہیں تھا۔ وہ ہر معاملہ پر اُس کے حسن و قبح کے لحاظ سے نظر ڈالتے اور ایک نتیجہ پر پہنچ کر بلا خوف و استقلال اُس پر قائم رہتے تھے۔

میرے نزدیک مولانا آزاد کی تمو بیت کانگریس سے پہلے کا سب سے اہم واقعہ ۱۹۱۳ء میں پیش آیا جب کہ وہ یونی ورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسہ منعقدہ لکھنؤ میں مولانا محمد علی کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ ذاتی تجربات کی بنا پر کہتا ہوں کہ اس اختلاف کے نتائج کا اثر مولانا کی تمام زندگی پر پڑا۔ "الہلال" میں اس اختلاف پر مولانا نے نہایت رنگین سلسلۂ مضامین "حدیث الغاشیہ" کے عنوان سے لکھا۔ جواب میں علی برادران نے مولانا کے مقابلہ میں محاذ قائم کیا۔ بدقسمتی سے چار برس روزنامہ "خلافت" کا ایڈیٹر رہنے کے باعث میرا دامن مولانا شوکت علی صاحب کے ساتھ وابستہ ہو گیا تھا۔ عقائد مولانا آزاد سے ملتے تھے مگر زندگی مخالف کیمپ میں گذرتی تھی۔ میں نے یہ پایا کہ گو مولانا آزاد نے محض قابلیت کے زور سے ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں اپنا ایک بلند مقام بنا لیا مگر بڑی حد تک اُن کو عام پلیٹ فارم چھوڑ دینا پڑا۔ بہت لوگوں کو یہ شکایت رہی کہ ہندوستان کے اعلیٰ ترین خطیب ہوتے ہوئے بھی مولانا بہت کم عوامی پلیٹ فارم پر آکر تقریر کرتے ہیں۔ لیکن اصلی سبب یہ تھا کہ پلیٹ فارم پر علی برادران کا قبضہ تھا جو مولانا کو پلیٹ فارم سے الگ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

مولانا نے بھی اس کا احساس کیا اور اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ مولانا نے "پنجاب پارٹی" بنائی۔ دراصل مجلس احرار کی تنظیم میں بھی مولانا آزاد کا اشارہ شامل تھا مگر مجلس احرار بہت جلد ایسی راہوں پر پڑ گئی جو مولانا کو پسند نہیں تھیں۔ نینی جیل میں پنجاب کے بعض لیڈر مولانا سے ملنے آئے اور اس جیل انٹرویو کے بعد انھوں نے مجلس احرار سے علحدگی کا اعلان کیا مثلاً جناب داؤد غزنوی صاحب نے ہمیشہ کے لئے مجلس احرار کو نینی جیل کی انٹرویو کے بعد ہی چھوڑا ہے۔ پلان یہ تھا کہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، محمد داؤد غزنوی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور دیگر بعض اکابر اجتماعی طور سے مجلس احرار سے الگ ہو کر صرف کانگریس میں شریک رہیں مگر پلان پوری طرح کامیاب نہیں ہوا۔

بہرکیف علی برادران اور اُن کے ساتھی علانیہ الزام لگاتے تھے کہ مولانا

... نے پنجابی ٹوپی کو ہمیشہ سے چھوڑ دیا ہے۔ مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم اس پنجابی ٹوپی کے لیڈر قرار دیئے جاتے تھے۔

علی برادران اور مولانا آزاد کی تحریک کا اثر یہ ہوا کہ مولانا آزاد کی ان تقریروں سے دنیا محروم ہو گئی جو "الہلال" والی اُردو میں ہوتی تھیں اور جن سے ان کو اپنا الگ مقام بنایا تھا۔ کانگریس کے منتر کے پلیٹ فارم پر انھوں نے سادہ اُردو بلکہ ہندوستانی میں اظہار خیالات شروع کر دیا جس میں معنی ضرور ہوتا تھا مگر وہ جادو کہاں جو سامعین کو دیوانہ بنا دیتا تھا۔

مولانا کی زندگی اور اُن کی تحریروں پر ایک نظر ڈالنے سے مجھ پر یہ عقدہ بھی کھلا کہ کانگریس میں شامل ہونے سے تقریباً دس برس پہلے سے وہ کانگریس کے رجحانات کو پسند کرتے تھے۔ مثلاً ۲۶۔ فروری ۱۹۱۳ء کے "الہلال" میں مسلمانوں کی نئی بیداری پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"مسلمانوں میں نئی حرکت کی تاریخ تقسیم بنگال کی منسوخی سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے پہلے صرف خال خال اشخاص تھے جن کو کانگریسی یعنی باغی، بے وفائے قوم، مفسد اور اسی طرح بعض بعض اصطلاحات خاص سے یاد کیا جاتا تھا۔"

اس اقتباس میں غور کیجئے کہ "کانگریسی" کا استعمال کس پیرایہ میں کیا گیا ہے۔ یہ ۱۹۱۳ء کی تحریر ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کانگریس میں شرکت سے بہت پہلے اُن کے رجحانات کانگریسی تھے۔

جیل میں مذہبی مسائل پر مولانا سے اکثر گفتگو ہو جاتی تھی مگر یہاں اس کا تذکرہ مناسب نہیں ہوگا لیکن ایک ادبی مسئلہ کی طرف اشارہ کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ گزشتہ عید کو جب میں ملاقات کے لئے گیا تو موقع پاکر ایک سوال کر بیٹھا جس کا جواب تو انھوں نے دیا مگر ادھورا کیونکہ دوسرے لوگ آ گئے۔ سوال اس بارے میں تھا کہ جناب غلام رسول مہر نے جو کتاب غالب پر لکھی ہے اُس میں غالب کے گھر کو قمار خانہ اور غالب کا جواریوں سے نال وصول کرنا ثابت کرنے کے لئے مولانا آزاد کی سند پیش کی ہے اور مولانا آزاد نے نواب لوہارو کی شہادت پر بھروسہ کرکے غلام رسول مہر کو اس بارے میں تحریر دی ہے۔ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ نواب لوہارو کی شہادت قابلِ اعتبار نہیں بلکہ Tainted (مجروح) ہے کیونکہ غالب کی گرفتاری کے بعد خاندان لوہارو نے ایک مہینہ جواری کے ساتھ اپنے ہر تعلق سے بیزاری کا اعلان کر دیا تھا۔ حالاں کہ خاندان لوہارو سے غالب کے تعلقات کا سب کو علم ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس اعلانِ بیزاری کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے اُس خاندان کے ایک فرد نے مولانا کے سامنے غالب کے متعلق ایسا بیان دیا ہو۔

مولانا نے جواب کا آغاز اس طرح کیا تھا کہ غالب کا خرچ بہت تھا اور آمدنی کم تھی اس لئے انھوں نے اپنے گھر شہر کے جواریوں کو جمع کرنا شروع کر دیا تھا تاکہ آمدنی کا سلسلہ قایم رہے۔ ایسے حالات میں خاندان لوہارو کے ایک ذمہ دار آدمی کی شہادت کافی ہے۔ خصوصاً جب کہ مجھے معلوم ہے کہ وہ مجھ سے جھوٹ نہ بولیں گے۔ ابھی مولانا سمجھا ہی رہے تھے کہ چند آدمی آ گئے۔ اور تھوڑے انتظار کے بعد مجھے رخصت ہو جانا پڑا۔ مگر مولانا کے جواب سے مجھے ذرا بھی تشفی نہ ہوئی۔

میں نے مولانا کے سامنے ایک اور وقت مرزا ابوالفضل کی غیر مطبوعہ تصانیف کے مسودوں کے بارے میں بھی چند گزارشات پیش کی تھیں اور مولانا نے ضروری کارروائی کرنے کا وعدہ بھی فرمایا تھا۔ میں نے بمبئی کے متعلق حضرات مثلاً عبدالحکیم صاحب (مالک شرف الدین الکتبی۔ ادارہ) کو یہ خوشخبری بھی پہنچا دی تھی۔ مگر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس اہم کام میں مولانا نے کیا اقدامات کئے۔

مولانا کی زندگی کے سب واقعات جو میرے تجربہ میں آئے ایک مقالہ میں نہیں سما سکتے اس لئے یہاں بس کرتا ہوں ؎

تو مپندار کہ این قصہ بخود می گویم   گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

شمیم کرہانی

خضرِ حیات

لوٹا ہے آج خاکِ وطن پر دہ کوہِ غم
پربت کا دل اداس ہے گنگا کی آنکھ نم
یکجا ہیں سوگوار صنم خانہ و حرم
غم سے جبینِ پرچمِ ہندوستاں ہے خم
مشرق کی صبحِ نو کا اُجالا چلا گیا
فرزندِ ارجمندِ ہمالا چلا گیا
وہ اُٹھ گیا، وطن کو ملا جس سے آپ و رنگ
جس نے حیاتِ عصر کو بخشی نئی امنگ
دل جس کا کوہِ ہند تھا، خون جس کا موجِ گنگ
دانش نے جس کی توڑ دیئے جادوئے فرنگ
خضرِ حیات و رہبرِ بیدار چل دیا
ہندوستاں کا قافلہ سالار چل دیا

جس نے جنوں کو عام کیا وہ ابوالکلام
جس نے خرد کا کام کیا وہ ابوالکلام
مغرب کو جس نے رام کیا وہ ابوالکلام
مشرق کا جس نے نام کیا وہ ابوالکلام
ہر نا امید دل کو جو اُمید دے گیا
شامِ وطن کے ہاتھ میں خورشید دے گیا
دانش میں طاق، فن میں یگانہ تھی جس کی ذات
اک روزگارِ نو کا ترانہ تھی جس کی ذات
عہد آفریں جنوں کا فسانہ تھی جس کی ذات
دنیا تھی جس کی ذات، زمانہ تھی جس کی ذات
بے تاب ایک دل میں جہاں کی حیات تھی
ذاتِ ابوالکلام تھی یا کائنات تھی

پرسانِ حال، شامِ غریباں کے واسطے
افسانہ گو، جہانِ حبیباں کے واسطے
افسوں طراز، بزمِ خطیباں کے واسطے
سالار، کاروانِ ادیباں کے واسطے
یکتا علوم و فن میں، یگانہ ثبات میں
شعلہ جہادِ زیست میں، شبنم صفات میں

دانش میں اس کی جذب تھا نورِ مہِ منیر
ظلمت میں جھلکتا تھا تخیل کرن کے تیر
حسنِ سخن گلال تھا، رنگِ سخن عبیر
تیشے سے کوہکن کے ابلتی تھی جوئے شیر
فن کے نئے نقوش جو ایجاد کر گیا
وہ بیستونِ فکر کا فرہاد مر گیا

مسند نشیں، مجاہد، باطل شکار بھی
دنیائے انقلاب کا پروردگار بھی
قرآن کا مفسر، حکمت شعار بھی
نقاد بھی، مصنفِ جادو نگار بھی
اتنے تضاد اور اک انساں کی ذات میں
ملتے ہیں ایسے لوگ کہاں کائنات میں

دل میں عمل کا جذبۂ محکم لئے ہوئے
آنکھوں میں دردِ عشق کی شبنم لئے ہوئے
ہمراہ، انقلاب کا عالم لئے ہوئے
ہاتھوں میں استقلال کا پرچم لئے ہوئے
جس رخ گیا، حیات کو بیدار کر دیا
ظلمت کدے کو مطلعِ انوار کر دیا

ذوقِ نظر، لطافتِ گل سے دوچند تھا
لہجہ نبات و شہد، سخن شیر و قند تھا
رتبے میں مہر و ماہ سے بھی کچھ بلند تھا
لیکن عجیب مردِ حقیقت پسند تھا
دیتا نہ تھا گماں کو بڑائی یقین پر
تاروں پہ تھی نگاہ قدم تھے زمین پر

اس کی نوا میں غنچۂ خنداں کی نغمگی
شامِ نشاط و صبحِ بہاراں کی نغمگی
صحنِ چمن کی جوئے خراماں کی نغمگی
زورِ جنوں کے شہپرِ جنباں کی نغمگی
وہ نغمگی کہ بانگِ درا جس کا نام تھا
جس کی تپش سے قافلہ مستِ خرام تھا

آواز کی تھی گونج کہ بادل کی تھی گرج
ہر سانس اک جہاد تھی ہر گام ایک حج
کیا زندگی کی شان تھی کیا بانکپن کی دھج
رہتی تھی منچلے کی جبیں پہ کلاہ کج
مردِ فقیر، شوکتِ شاہانہ لے گیا
صحرا میں جتنا رنگ تھا دیوانہ لے گیا

بے شیشہ و چراغ تھی گو زندگی کی رات
سینے میں ضوفشاں تھی مگر مشعلِ حیات
فکر و نظر کے نور سے روشن تھے شش جہات
چلتا تھا ساتھ ساتھ جہانِ تجلیات
نقشِ قدم تھے مہر کا پرتو لئے ہوئے
اک صبح کا مزاج تھی نئی ضو لئے ہوئے

وہ عہدِ طوق و دار وہ ہنگامِ قید و بند
وہ حرّیت کا شور، وہ زنداں کا زہرخند
وہ ہر فضا پہ دام، وہ ہر زیست پر کمند
لیکن مقامِ دار سے گزرا وہ سربلند
ہمّت جو اُس کی ہمدم و دمساز ہو گئی
اک سرخمیدہ قوم سرافراز ہو گئی

کیا دورِ اضطراب تھا، کیا گردشِ مُدام
زنداں میں اک قدم تو بیاباں میں ایک گام
بچپن، حصولِ ہوش و خرد میں ہوا تمام
گزری جنوں میں عہدِ جوانی کی صبح و شام
فصلِ شباب، تیشہ زنی میں گزر گئی
پیری تمام کوہ کنی میں گزر گئی

ہر راستے میں سنگ، ہر اک رہگزر میں خار
اپنوں کا وہ سلوک کہ دشمن ہو شرمسار
ملّت کے اس عناد کے با وصف زینہار
خاطر کے آئینے پہ نہ پایا گیا غبار
تھی کون سی وہ بات جو وجہِ محن نہ تھی
لیکن جبینِ عزم پہ کوئی شکن نہ تھی

ملّت کے طعن و طنز سے دم بھر نہ تھا فراغ
ہر لمحہ ایک زخم تو ہر لفظ ایک داغ
پھر بھی نہ دل تھکا نہ فسردہ ہوا دماغ
موجِ ہوائے تند سے لڑتا رہا چراغ
آندھی کبھی کبھی جو بلاخیز ہو گئی
کچھ اور بھی چراغ کی لَو تیز ہو گئی

تازہ نہیں یہ شیوۂ ابنائے روزگار
اکثر کہا گیا ہے زمانے میں گُل کو خار
گم ہو گئی ہے شور میں ہادی کی ہر پکار
حق گو کو دی گئی ہے سزائے صلیب و دار
"گفتارِ صدق مایۂ آزار می شود
چوں حرفِ حق بلند شود دار می شود"

"منصور حوصلوں کو مگر کیا ہراسِ دار
ہوتے ہیں شاد دیکھ کے میدانِ کارزار
دائم کفن بدوش رہا مردِ جاں نثار
مقتل میں جب گیا تو غزل خوان و نغمہ بار
ہر دم یہ دُھن کہ دشت کوئی پُرخطر ملے
کم ایسے روزگار میں شوریدہ سر ملے

ہمّت قوی، دماغ توانا، نظر بلند
منزل حسین، عزم جواں، رہگزر بلند
یوں کر گیا وطن کو بشانِ دگر بلند
ہندو ہے سرفراز مسلماں ہے سربلند
"نے رستم اب جہان میں نے سام رہ گیا
مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا"

منزل سے آہ چھوٹ گیا ایسا راہبر
جس کی حیات آگ تھی جس کا لہو شرر
جس کے نقوشِ پا سے چراغاں تھی رہگزر
غمگیں ہیں جس کے صدمۂ ہجراں سے دشت و در
صحنِ فضائے ہند ہے اور گردِ یاس ہے
"مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے"

محمد یونس خالدی

امام الہند مولانا آزادؒ ــــ سفر اور مقصدِ سفر

"۱۹۱۲ء میں جب کہ میری موجودہ پبلک زندگی کا بالکل ابتدائی عہد تھا، مجھے موقع ملا کہ اپنی آیندہ زندگی کے لئے ایک مذہبِ عملی "آزادی" سے لوں، خدمتِ ملک و ملت دشت ناپیدا کنار کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے، اصولِ عمل کی مختلف راہیں میرے سامنے تھیں، اور میں چاہتا تھا کہ میرا سفر اس دانش مند مسافر کی طرح ہو جس نے سفر سے پہلے راہ و منزل کے سارے مرحلوں پر غور کر لیا ہے۔ اس طوفانی کشتی کی طرح نہ ہو جس نے ہوائی جھونکوں اور سمندر کی موجوں پر اپنے سفر کا رخ، اور کنارے کی جستجو چھوڑ دی ہے۔"

(مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب)

یہ بھی یاد رہے کہ

"سفر دو ہیں، ایک اشخاص کا، ایک مقصد کا، اشخاص کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنے کام کئے جائیں یہاں تک کہ اپنے آپ کو مقصد کے لئے قربان کر دیں، جب انھوں نے اپنے آپ کو قربان کر دیا تو ان کا سفر منزلِ مقصود تک پہنچ گیا، اور وہ کامیاب ہو گئے۔ اب ان کے لئے یہ سوال باقی نہیں رہتا کہ مقصود حاصل ہوا یا نہیں؟ اس سفر میں سفر سے نہ تھکنا اور آخر تک چلتے رہنا ہی سب سے بڑا مقصود ہے۔ اور اس کے جس مسافر نے اس مقصود کو پا لیا۔ اس نے اپنا کام پورا کر دیا۔ یہاں راہ اور منزل دو نہیں ہیں، ایک ہی ہے۔"

(زمانہ مضامین ابوالکلام آزاد ۱۹۲۰ء)

آج کل دہلی (ابوالکلام نمبر)

باقی رہا مقصد کا سفر، تو بلاشبہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ مقصد حاصل ہو جائے، لیکن یہ انسان کا کام نہیں ہے جو پیش رو ہوتا ہے۔ خدا کا کام ہے جو سورج چمکاتا اور بدلیاں بھیجتا ہے۔ اور اس کا قانون یہ ہے کہ اگر رہروانِ مقصد کامیابی کے ساتھ اپنا مقصد پورا کرتے رہے تو مقصد کا سفر بھی ایک دن پورا ہو کر رہے گا۔"

(زمانہ مضامین)

جب یہ حقیقت ہے اور اس حقیقت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں مذہبِ عمل کا تعین کس طرح کیا جائے اور کیا کیا جائے؟ لیکن جس کی زبانِ قلم سے یہ صدا بلند ہو رہی تھی۔ اس نے کہا کہ میرا مذہبِ عمل "ملک کی آزادی یا موت ہے۔" اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

یہ آواز ہندوستان میں پہلی آواز تھی، اس لئے حیرت و استعجاب کے ساتھ سنی گئی، ہر سننے والے نے ایک دوسرے سے پوچھنا شروع کر دیا کہ جو "مذہبِ عمل" متعین کیا گیا ہے۔ اور اشخاص کے سفر کی جو منزل بتلائی جا رہی ہے کیا واقعی کسی شخص واحد کا یہ مذہب ہو سکتا ہے اور کیا کوئی شخص اس راہ پر چل سکتا ہے؟

مگر جواب دے تو کون دے!

آخر کار وہی انسان آگے بڑھتا ہے اور پورے جلال کے ساتھ ہندوستان کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ

"میری طرف دیکھو! میں ایک انسان تم میں موجود ہوں" (مسئلہ خلافت)

. . . .

"ملک کی آزادی یا موت" یہ راگنی ہے وقت کی راگنی

اگست ۱۹۵۶ء

ہے، ملک اس کے لئے تیار نہیں۔"

یہ آواز کسی ایک فرد کی آواز نہ تھی، ہر شخص کی زبان پر یہی الفاظ جاری تھے۔ عوام سے شکوہ کیا جائے تو کس طرح کیا جائے مدبرین عصر کی زبانوں پر یہی کلمات تھے۔ ان حالات میں "مردکار" آگے بڑھتا ہے، اور مدبرین زمانہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ

"ہمارے زمانے کے اکثر مدبر اس امر کو ایک مسلم الثبوت مسئلے کی حیثیت سے پیش کر دیا کرتے ہیں کہ کسی قوم کے لئے اس وقت تک آزاد ہونا مناسب نہیں، جب تک وہ اپنی "حریت" کے صحیح استعمال کے لائق نہ ہو جائے۔

یہ مقولہ اس احمق کی زبان سے زیادہ موزوں معلوم ہوگا جو پرانی روایت کے مطابق تیرنا سیکھے بغیر پانی میں قدم نہیں رکھنا چاہتا، پس اگر قوم حریت (آزادی) کے لئے اتنے دنوں تک انتظار کرے کہ پہلے حالت غلامی ہی میں پوری عاقل اور ذی ہوش بن جائے، تو اس کو تا ابد صرف انتظار ہی کھینچنا پڑے گا، وہ دریا میں اترنے کے لئے شناوری کے سیکھنے کا انتظار کرے گی اور شناوری بغیر دریا میں اترے تا قیامت نہ آئے گی۔"

(انتخاب البلال ص ۱۵)

لیکن مدبرین زمانہ نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا۔ بلکہ یہ کہنا شروع کر دیا کہ ایک آزادی کی جنگ کے نتائج آج تک بھگت رہے ہیں، اب جو جنگ لڑی جائے گی وہ ہم کو کہیں کا نہیں رکھے گی۔ ہم کسی نئے انقلاب کے لئے تیار نہیں یہ غلامی ایک نعمت ہے اس میں ہم کو ہر قسم کی آزادی حاصل ہے۔ دنیا میں جو انقلاب آتا ہے وہ تباہیوں اور بربادیوں کا پیغام لے کر آتا ہے۔ یہ آوازیں اس کے کانوں تک پہنچیں۔ ایک اضطراب کی چیخ بلند ہوئی۔ اس نے کہا:۔

"گو اکثر انقلاب کی ابتدا نہایت خراب دیکھی جاتی ہے مگر قوم جب تک آزادانہ زندگی بسر نہ کرے وہ آزادی کے صحیح استعمال سے واقف نہیں ہو سکتی" (انتخاب البلال ص ۱۳)

اس کی یہ دلیل ایک معقول دلیل تھی۔ مخالفت کرنے والوں نے سوچنا شروع کر دیا، شاید بہت جلد وہ وقت آ جاتا کہ پورا ملک اس کا ہمنوا بن جاتا کہ ملک کے قلب نے کہا کہ اس دور میں آزادی کا نام لینا اپنے کو مجرم بنوانا ہے۔ ہندوستان طاقت ور ظالمانہ اقتدار کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ان حالات میں وہ مجرم بننے کے لئے تیار نہیں ہے۔

لیکن "آزادی یا موت" کا متوالا جو شخصی سفر اور "مذہب عمل" کی حقیقت انسانی دماغوں سے منوانے کے لئے بے چین تھا، وہ بول اٹھا:

"ہر قوم کی تاریخ میں ایک زمانہ ایسا آتا ہے۔ جب اس کا ہر فرد حکومت کے نزدیک مجرم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ خدا کے جرم سے توبہ کرتی ہے اور حق و آزادی کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ قوم کی آزادی کے یہی معنی ہیں کہ غیروں کی حکومت کا خاتمہ ہو، پس ظاہر ہے کہ اجنبی حکمرانوں کے نزدیک جرم اور بغاوت کی اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔

ہندوستان بھی آزادی کے لئے بے قرار ہے اس لئے کب کا مجرم ہو چکا ہے" (نازہ مضامین ابوالکلام آزاد ۱۹۲۱ء)

مگر اس کی باتوں پر جس طرح دھیان دینا چاہئے تھا۔ اس طرح دھیان نہیں دیا گیا، اور "سنی، ان سنی کو برابر کر کے" کا مرید نما ہمدردوں" نے کہنا شروع کر دیا کہ انگریزی حکومت اور اس کی برکات کا مقابلہ دنیا کے آزاد ملکوں سے کرو، اور دیکھو کہ یہاں کی غلامی دنیا کی آزادی سے کس قدر بلند ہے تعلیمی، سماجی، اصلاحی ادارے قایم کرنے کا ہم کو اختیار حاصل ہے۔ مندر، مسجد، گرجے، گردوارے آزاد ہیں۔ حکومت ہر گوشۂ حیات میں ہماری مدد کرتی ہے۔ اس سے بڑی آزادی اور کیا ہو سکتی ہے۔

یہ تقریر بڑی خوش نما تقریر تھی اور دلائل بھی ناقابل تردید دلائل تھے۔ لیکن جس طبیب حاذق نے نبض پر ہاتھ رکھنے سے پہلے چہرے سے مرض کو بھانپ لیا ہو۔ اس کے سامنے ان دلائل کی کوئی قیمت نہیں۔ اس نے کہا کہ:۔

"ایک حکومت ایک قوم کی حریت و آزادی سلب کر لیتی ہے۔ اس سے غلاموں کی طرح کام لیتی ہے۔ اس کی قوت کو فنا کر دیتی ہے۔ اس کی اخلاقی حالت برباد کر دیتی ہے۔ اس کا یہ عمل باطل یک قلم سرچشمہ فساد ہے۔

لیکن وہ کہتی ہے کہ میں اپنی قوم کی اصلاح کرتی ہوں،
اور اسی کی اصلاح و عروج کے لئے دوسری قوم کو اپنا غلام بناتی
ہوں۔

پس جو شخص اس حکومت کے خلاف جہاد کرتا ہے، اس کو
مفسد قرار دیتی ہے۔" (مضامین البلاغ)

لیکن

میرا اعتقاد ہے کہ آزاد رہنا ہر فرد اور قوم کا پیدائشی حق ہے۔ کوئی
انسان یا انسانوں کی گڑھی ہوئی بیوروکریسی یہ حق نہیں رکھتی، کہ
خدا کے بندوں کو اپنا محکوم بنائے۔ محکومی اور غلامی کے لئے کیسے
ہی خوشنما نام کیوں نہ رکھ دیئے جائیں۔ لیکن وہ غلامی ہی ہے۔ اور
خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے خلاف ہے، پس میں موجودہ
گورنمنٹ کو جائز حکومت تسلیم نہیں کرتا، اور اپنا ملکی، مذہبی، اور
انسانی فرض سمجھتا ہوں کہ اس کی محکومی سے ملک و قوم کو نجات دلاؤں۔

(قول فیصل" بیان عدالت)

مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ملک کی آزادی کی جنگ لڑے تو کون لڑے
اس ملک میں متعدد قومیں ہیں، لیکن یہاں کے عوام دو اکثریتوں میں بٹ
جاتے ہیں۔ ایک کا نام ہندو ہے اور ایک کا نام مسلمان، دونوں کی تہذیب
دونوں کی معاشرت میں شدید اختلاف ہے اور یہ اختلاف ہر گوشۂ حیات
میں ظاہر ہے۔ اس لئے دونوں مل کر آزادی کی جد و جہد میں کیسے حصہ
لے سکتے ہیں؟

یہ سوال ایک ایسا سوال تھا کہ جس نے اس پیکرِ عزیمت کو ایک لمحہ
کے لئے غور و فکر میں ڈال دیا۔ اس نے اپنی رہنمائی کا ہاتھ عیس رہنما کے ہاتھ
میں دیا تھا۔ اس کی تعلیم نے رہنمائی کی۔ تفصیلی جواب سے قبل اس نے پرجوش
لب و لہجہ میں کہا کہ:

"ہندوستان کے لئے، ہندوستان کی آزادی کے لئے۔
صداقت و حق پرستی کے بہترین فرائض ادا کرنے کے لئے،
ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کا اتفاق اور اُن کی یک جہتی
ضروری ہے۔" (خطبہ صدارت آگرہ)

اس اجمالی جواب نے مخالفین میں جھنجھلاہٹ پیدا کر دی۔ اور اس
جھنجھلاہٹ کے نتیجہ میں ان لوگوں نے کہنا شروع کر دیا، کہ یہ نعرہ مذہب کے
خلاف ہے، کہ ازروئے اسلام کا اتحاد قیامت تک ناممکن ہے۔ اور دنیا کا کوئی بڑا
سے بڑا انسان مذہبی تعلیم کی روشنی میں اس کو ثابت نہیں کر سکتا۔ یہ آواز صرف
پبلک پلیٹ فارم کی آواز نہ تھی، بلکہ کچھ خانقاہوں سے بھی اسی قسم کی صدائیں
بلند ہوئیں، سروں، خان بہادروں، رائے بہادروں نے آواز میں آواز
ملائی۔ کتابچے شائع ہونے شروع ہوئے، اور مخالفین کو یہ یقین ہو گیا کہ اس کا
جواب ناممکن ہے۔ لیکن وہ پیکرِ حریت و آزادی آگے بڑھا، اور ہندوستان
کے ۲۹ کروڑ انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا کہ:-

"ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان، ہندوستان کے ۲۲
کروڑ ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں مل کر
ہندوستان کی ایک قوم اور نیشن بن جائیں۔

آپ میں سے اب مسلمان بھائیوں کو سنانا چاہتا ہوں کہ
خدا کی آواز کے بعد سب سے بڑی آواز جو ہو سکتی ہے وہ (حضرت
محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان تھی۔ اس وجودِ مقدس نے عہد نامہ
لکھا بجنسہٖ یہ اس کے الفاظ ہیں کہ

"ہم ان تمام قبیلوں سے جو مدینہ کے اطراف میں بستے ہیں
صلح کرتے ہیں، اتفاق کرتے ہیں اور ہم سب مل کر ایک نیشن بنا
چاہتے ہیں، ایک قوم بنا چاہتے ہیں" (خطبہ صدارت آگرہ)

پھر اس سلسلے میں دلائل کا ایک انبار سامنے آیا۔ اُس نے مخالفین کو ایک زبردست
شکست دی۔ مگر نوجوانوں میں" آزادی" کے جذبات پرورش پاتے دکھائی
دیئے۔ یہ بات ہندوستانی روایات کے خلاف تھی۔ اس لئے اس نے کہا
کہ میری ۱۹۱۲ء کی بات کو یاد کرو، اور اس کو اس معرکۂ آزادی میں اصل الاصول
کی حیثیت دے لو۔ میں نے کہا تھا کہ

"ہر طاقت وہ ہاتھ جس میں تلوار ہو، اپنے مخالف کو شکست
دے سکتا ہے، لیکن تحسین اس فاتح کے لئے ہے جو اسلحہ کے استعمال
کے بغیر حریف کو اپنے قابو میں کر لے۔" (الندوہ لکھنؤ اپریل ۱۹۱۲ء)

یہ بات بظاہر بڑی خوش آیند بات تھی مگر جس فصیح انداز میں کہی گئی تھی۔ عوام
اس کے متحمل نہ تھے، مردِ آزاد نے اُن کے چہروں کو پڑھا اور کہنا شروع
کیا کہ:-

"ہندوستان کی قومیت بحث و نظر کے ابتدائی مدارج طے کر کے عملی زندگی میں گامزن ہو چکی ہے۔ اس لئے قدرتی بات ہے کہ آپ کے ذوقِ عمل پر بحث و نظر کی طوالت گراں گزرتی ہو اب آپ کی پسندیدہ چیز فصاحت نہیں رہی بلکہ عمل کی سادگی ہے۔" (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

اور یہ حقیقت بھی تھی لوگ عمل کے لئے بے چین تھے۔ پہلا عملی پروگرام "ترکِ موالات" اور ولائتی مال کے بائیکاٹ کے نام سے سامنے آیا۔ مگر ترکِ موالات (نان کواپریشن) ایک ایسا مسئلہ تھا جو ماہرین زمانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ کیا ترکِ موالات سے ملک آزاد ہو سکتا ہے کیا اس طرح غلامی سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے؟ کیا کسی ملک نے نان کواپریشن سے نجات حاصل کی ہے؟ بظاہر یہ باتیں ایسی تھیں جو عوام کو متاثر کرنے والی تھیں، حالاں کہ اعتراض کرنے والوں کے دل جانتے تھے۔ اور ان کو اس کے دور رس نتائج کا بھی اندازہ تھا۔ پھر بھی ان زبانوں پر مہر سکوت لگانا ضروری تھا۔ اس لئے معلمِ آزادی نے صاحبانِ فہم و فراست کی زبان میں فرمایا کہ۔

"قوموں کی سیاسی جدوجہد کے میدان میں دیکھا جائے جب بھی یہ نہ صرف ایک متفقہ اعتقاد ہے۔ بلکہ متفقہ عمل ہے یہ بالکل ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی قوم اور جماعت اپنے آزادہ حقوق کواپریشن کے ذریعہ نہیں حاصل کر سکتی۔ ہر قوم نے اپنے حقوق جدوجہد کر کے حاصل کئے ہیں اور جدوجہد مقابلہ اور کشمکش ہے۔ کواپریشن نہیں۔" (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

اب مسئلہ کی صحیح صورت نگاہوں کے سامنے آگئی اور ملک کے ہندو مسلمانوں نے مل کر جدوجہد شروع کر دی۔ عام تعاون (نان کواپریشن) اور ولائتی مال کے بائیکاٹ کی تحریک شباب پر آئی برطانوی سامراج کے قدم ڈگمگانے لگے۔ مذہب سے بیگانہ مذہبی ٹھیکیداروں کی تلاش شروع ہو گئی۔ ملک میں کچھ خانقاہیں اور آشرم پہلے سے موجود ہی تھے۔ جو موقعے کے منتظر تھے۔ بریلی سے ایک نیا محاذ کھلا، جس نے سرے سے اس تحریک کو عمل باطل قرار دیا۔ ہندو مسلمانوں میں اختلاف کی خلیج حائل کرنا اور شدھی، سنگٹھن کے نام سے ملک میں تصادم کرانا اصول قرار پایا جس کے لئے دوڑ دھوپ شروع ہو گئی۔ بہروپیے نئے نئے بہروپ بھرنے لگے، اور وہ آزادی کی جنگ جو کامیابی سے ہم کنار ہونے والی تھی، وہ بظاہر رکتے نظر آئی۔ لیکن یہ بات ملک کے لئے اور اہلِ ملک کے لئے بڑی شرمناک بات تھی۔ اس لئے اس نے ہندوستان کے ہر باشندے کو اس کا کیا ہوا عہد یاد دلایا، اور اس عہد کو یاد دلاتے ہوئے کہا کہ:۔

"چار سال ہوئے کہ ہم نے قومی عزت و شرف کا ایک بڑے سے بڑا اعلان کیا، اور دنیا سے کہا کہ ہماری آزادی کا انتظار کرے لیکن عین اس وقت جب کہ وہ ہماری آزادی کی داستان سننے کے لئے گوش برآواز ہے، ہم آمادہ ہو گئے ہیں کہ اپنی غلامانہ شرمناکی اور اپنے جنونانہ کشت و خون کی اس کے لئے نمائش ترتیب دیں۔ موجودہ صورت یہ ہے کہ سوراج اور خلافت کی جگہ شدھی کی تحریک اس کی مدافعت اور سنگٹھن کا غلغلہ ہر طرف بپا ہے۔" (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

اسی حالت میں

"ایک طرف کہا جا رہا ہے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے بچاؤ، دوسری طرف سے کہا جا رہا ہے کہ اسلام کی لاج کی ہندوؤں کے حملے سے حفاظت کرو، جب ہندوؤں اور مسلمانوں کی حفاظت کی پکار بلند ہو رہی ہے تو ظاہر ہے کہ بدنصیب ہندوستان کا وطن کب قائم رہ سکتا ہے۔" (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

بات بھی کچھ ایسی ہی تھی، انگریزی سامراج کا منشا پورا ہوتے نظر آیا۔ علاحدگی پسندی کے خیالات کی پورے ملک میں اشاعت ہونے لگی مسلمان جن کی تعداد ہندوؤں سے بہت کم تھی، اور جو تعلیم اور دولت میں ان سے بہت پیچھے تھے۔ خود کو ٹوٹے اور خسارے میں سمجھنے لگے۔ اس لئے انھوں نے دریافت کیا کہ کہئے اب کیا راستہ ہے۔ اس نے کہا کہ:۔

"کسی قوم کے آزاد ہونے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ آپ کو آزادی کا پورا قدر شناس ثابت کر دے۔ جس وقت ہندوستان نے یہ مطالبہ کیا کہ ترکی، اور عرب کی آزادی محفوظ رہنی چاہیئے تو ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ خود آزادی سے محروم نہیں رہ سکتا۔" (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

یہ تو مسلمانوں کے لئے درسِ حقیقت تھا۔ اور ان کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلانا تھا مگر ساتھ ہی ہندوستان کی ۲۲ کروڑ آبادی سے بھی خطاب

کرتے ہوئے اس مردِ حق بین کو کہنا پڑا، کہ

"میں نے ۱۹۱۲ء میں اپنے تمام ہم مذہبوں کے مسلک کے خلاف اپنی صدا بلند کی تھی۔ اور ان کی مخالفت کا خوف مجھے اظہارِ حق سے نہ روک سکا تھا۔ ٹھیک اسی طرح آج میں اپنا پہلا فرض سمجھتا ہوں کہ میں ان تمام بھائیوں کے خلاف اپنی صدا بلند کروں، جو ہندو سنگٹھن کی تحریک کے علمبردار ہیں۔

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے آگے فرمایا کہ

"آج یہ تحریک ان لوگوں کو برانگیختہ کرنا چاہتی ہے جن کی تعداد مسلمانوں سے تین گنی زیادہ ہے۔ میں بلا کسی تامل کے صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ آج ہمیں ہندوستان میں نہ کسی ہندو سنگٹھن کی ضرورت ہے اور نہ مسلم سنگٹھن کی، ہمیں صرف ایک سنگٹھن کی ضرورت ہے اور وہ یہ "انڈین نیشنل کانگریس" ہے۔"

(خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

ابھی یہ کلمات اس کی زبان سے ادا ہوئے تھے کہ قیامت آگئی، مسلمانوں کو برگشتہ کرنے کا سامان پہلے فراہم کیا جا چکا تھا۔ اب ہندو بھی برگشتہ ہونے شروع ہوگئے۔ مسلمان کو ہندوؤں کی اکثریت کا خوف کھائے جا رہا تھا، اور ہندو خلافت کی تحریک سے پیدا ہونے والے اثرات سے پریشان تھے۔ ان کو یہ خیال تھا کہ انگریز اگر اس وقت چلا گیا تو ملک کی باگ ڈور پھر مسلمانوں کے ہاتھ میں آ جائے گی۔ بساطِ سیاست کے شاطر کھلاڑیوں نے دو قوموں کے دلوں میں دو الگ الگ قسم کے شبہات پیدا کر دیئے تھے ہندوؤں سے جس حد تک بات کہنی چاہیئے تھی، اس حد تک کہی گئی، رہا مسلمانوں کا سوال تو وہ اس کے ہم قوم تھے، ان سے اس بطلِ حریت اور مجاہدِ جلیل کے تخاطب کا انداز دوسرا تھا۔ ہندوؤں کی اکثریت کا خوف کوئی نیا نہیں تھا۔ جب اس نے ۱۹۱۲ء میں ملک کی آزادی کے لئے ہندو مسلم یکجہتی بھائی چارہ اور اتحاد کا درس دیا تھا، اس وقت بھی ہندو اکثریت کا سوال اس کے سامنے مسلمانوں کی طرف سے رکھا گیا، مگر اس کی نگاہیں ماضی کے آئینہ میں حال کو دیکھتے ہوئے مستقبل کو دیکھ رہی تھیں۔ اس لئے اس کو کہنا پڑا کہ:۔

"میں تو سمجھتا تھا کہ اب یہ بن نکل گیا، مگر آپ بیس برس کا پرانا سبق ابھی بھولے نہیں، بہتر مسلمانوں کی تعداد کم ہے، سیلف گورنمنٹ، ہندو گورنمنٹ ہو جائے گی، ہندو مسلمانوں کو چیر پھاڑ ڈالیں گے۔ پس مسلمانوں کو ہمیشہ غلام اور مملوک بن کر رہنا چاہیئے اگر یہ فلسفہ اب تک باقی ہے تو باقی رہے، تم کو غلامی مرغوب ہے تو انشاء اللہ خدا ہمیشہ غلام بنا کر رکھے گا۔"

("مضامین ابوالکلام آزاد" حصہ دوم، ایک مراسلت کا جواب)

مسلمانوں کو آزادی کی حقیقت سمجھاتے ہوئے فرمایا کہ:۔

ہندوستان کو آزاد ہونا ہے وہ آزاد ہو کر رہے گا مورخین عالم کی صف ایک نئے مورخ کی راہ تک رہی ہے۔ وہ آزادیٔ ہند کا مورخ ہوگا۔ خلافت کمیٹیاں اگر پوچھتی ہیں کہ ان کو کیا کرنا چاہیئے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو آزادیٔ ہند کی تاریخ کا پورا مواد صرف اپنے ہی سرمایہ سے فراہم کر دینا چاہیئے۔ تاکہ جب مورخ کا قلم اٹھے تو اُسے اعتراف کرنا پڑے کہ ہندوستان اپنی آزادی کے لئے کسی جماعت کا اس قدر مرہونِ منت نہیں ہے، جس قدر پیروانِ اسلام کا "

(تازہ مضامین ابوالکلام آزاد ۱۹۲۱ء)

اور جس وقت یہ باتیں کہی گئیں اس وقت کچھ حالات بھی ایسے ہی پیدا ہو گئے تھے۔ اس لئے ہندوؤں کا اپنی جگہ یہ فیصلہ کر لینا قرین قیاس تھا۔ کہ انگریز اگر گیا تو ملک کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ انگریزی سامراج کے ایجنٹوں نے اس شک کو یقین کا درجہ دینے کے لئے مسلمانوں سے مصالحت کی گفتگو شروع کی اور مسلمانوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستان میں مصالحت کی پیشکش کا خیر مقدم کرنا چاہا۔ مگر جس کی نظر بساطِ عالم پر تھی اور جو پیشہ اور یہ مات کہنے کے لئے تیاریاں کر رہا تھا اس نے کہا کہ:۔

"جس وقت تک ایک چپہ زمین پر، ایک انچ زمین پر اتنے حصہ پر کہ جتنے حصہ میں عراق کے گرد و غبار کا ایک ذرہ آ سکتا ہے، اگر انگریزی حکومت کا بلاواسطہ یا بالواسطہ ہاتھ باقی رہے۔ مسلمان کے لئے آسان ہے کہ بچھوؤں کے ساتھ، سانپوں کے ساتھ صلح کر لیں، پہاڑوں کے غاروں اور جنگلوں میں چلے جائیں وہاں درندوں کے ساتھ صلح کر لیں۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ انگریزوں کے سامنے صلح کا ہاتھ بڑھائیں" (خطبۂ صدارت جمعیت علماء لاہور ۱۹۲۱ء)

مگر جب یہ مردِ باوقار نے دیکھا کہ میری بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے تو تھوڑی سی تفصیل میں جاتے ہوئے کہنا شروع کیا کہ:-

"ہر مسلمان کے قلب پر یہ حقیقت نقش ہے، اور رہو جانا چاہیئے کہ جب تک انگریز گورنمنٹ، برٹش گورنمنٹ اپنے اس ابلیسانہ گھمنڈ سے باز نہ آجائے، مسلمانوں کے معاملات شرعی کو پورا نہ کردے، عراق کی سرزمین اس کی مداخلت سے پاک نہ ہوجائے۔ جب تک ایشیاء کوچک میں اس کی کوئی طاقت مخالفت نہ کرے، قسطنطنیہ سے تمام شرائط اور پابندیاں اٹھا نہ لی جائیں، ہندوستان کو آزادی نہ دی جائے اس وقت تک برٹش گورنمنٹ فریق محارب ہے، اس وقت تک اس کے لئے جائز نہیں کہ صلح صفائی کا ہاتھ انگریزوں کی طرف بڑھا سکے، وہ تمہارے ان آباد شہروں کو چھوڑ دے، جنگلوں میں چلا جائے وہاں سانپوں کے ساتھ صلح کرلے بچھوؤں کے ساتھ صلح کرلے، مگر انگریزی گورنمنٹ کے ساتھ صلح نہیں کرسکتا۔" (خطبۂ صدارت جلسہ آگرہ ۱۹۲۱ء)

لیکن جو تخم فساد فرقہ واریت کے نام سے بویا جاچکا تھا۔ اور جس کی آبیاری کے لئے دونوں کے خون بہائے جاچکے تھے۔ اب ایک تناور درخت بنتے ہوئے نظر آیا، دوسری طرف ملک کے بعض گوشوں سے یہ آوازیں آنے لگیں کہ انگریز ہندوستان کو آزاد کرنے کے لئے تیار ہے مگر یہ ہندو مسلم اتحاد کا راگ گانے والے آزادی کی راہ میں روڑا بنے ہوئے ہیں۔ آج اگر ہندوستان اس مطالبہ سے دست بردار ہوجائے تو کل اس کو آزادی مل سکتی ہے۔ داعی امن و اتحاد نے بھی ان بھولی بھالی پرفریب باتوں کو سنا، اور پھر اس وقت کے ۲۹ کروڑ ہندوستانی باشندوں کو مخاطب کرکے فرمایا:-

"آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں میں سے اتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑے ہوکر یہ اعلان کردے کہ سوراج ۲۴ گھنٹہ کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہوجائے۔

تو میں سوراج سے دست بردار ہوجاؤں گا مگر اس سے دست بردار نہ ہوں گا۔ کیونکہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا، لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالمِ انسانیت کا نقصان ہے" (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

لیکن بات جو ہونے والی تھی وہ ہوکر رہی، ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہوا، فسادات کی لہریں تیزی کے ساتھ بڑھیں، اور ملک پھر غلام کا غلام رہا، مگر اس کے اٹھے ہوئے قدم پیچھے کی جانب نہ مڑ سکے۔ یہاں تک کہ تاریخ نے ۱۷ برس دوبارہ دیئے یہ زمانہ خاموشی کے ساتھ نہ گزارا جائے گا۔ جون ۱۹۲۲ء سے دسمبر ۱۹۲۳ء تک وہی پوری داستان دہرائی گئی ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک عدم تعاون، بائی کاٹ کی جنگ، بہادری کے ساتھ لڑی گئی۔ آئینی تبدیلی کے آثار ۱۹۳۵ء سے آنے شروع ہوئے۔ اور اب ہندوستان کے بوڑھی سیاست کے ماہرین نے بھی سمجھ لیا کہ حکومت کی چولیں ڈھیلی ہوتی چلی جارہی ہیں۔ اس مبصرِ اعظم کو ایک بار پھر پورے ہندوستان کو مخاطب کرنے کا موقع ملا۔ اور اس نے کہنا شروع کیا کہ

"اس سترہ برس کے اندر ایک کے بعد ایک بہت سی منزلیں ہمارے سامنے آتی رہیں، ہمارا سفر دور کا تھا۔ اور ضروری تھا کہ مختلف منزلوں سے گذرتے، ہم ہر منزل پہ ٹھہرے، مگر رکے کہیں نہیں، ہم نے ہر مقام کو دیکھا بھالا، مگر ہمارا دل اٹکا کہیں بھی نہیں، ہمیں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ پیش آئے، مگر ہمارے میں ہماری نگاہ سامنے کی طرف رہی۔ دنیا کو ہمارے ارادوں کے بارے میں شک رہے ہوں مگر ہمیں اپنے فیصلوں کے بارے میں کبھی شک نہیں گذرا، ہمارا راستہ مشکلوں سے بھرا تھا، ہمارے سامنے قدم قدم پر طاقت ور رکاوٹیں کھڑی تھیں ہم جتنی تیزی سے چلنا چاہتے تھے، نہ چل سکے ہوں، لیکن ہم نے آگے بڑھنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی اگر ہم ۱۹۲۳ء اور ۱۹۴۰ء کی درمیانی مسافت پر نظر ڈالیں تو ہمیں اپنے پیچھے بہت دور دھندلا سا نشان دکھائی دے گا۔ ۱۹۲۳ء میں ہم اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھنا چاہتے تھے۔ مگر منزل ہم سے اتنی دور تھی کہ اس کی راہ کا نشان بھی ہماری آنکھوں سے اوجھل تھا لیکن آج نظر اٹھایئے اور سامنے کی طرف دیکھئے، نہ صرف منزل کا نشان صاف صاف دکھائی دے رہا ہے بلکہ منزل بھی دور نہیں" (خطبۂ صدارت کانگریس ۱۹۴۰ء)

مگر جہاں تک اور ملکی مسائل کا تھا، تو اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسی طرح الجھے ہوئے تھے، سب سے بڑا مسئلہ ہندو مسلمانوں کی علاحدہ پسندی

کہ ہندی مسلمان اپنے کو اقلیت ہی سمجھنے لگے تھے۔ اقلیت کو جن خدشات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، وہ سارے خدشات ایک ایک کر کے اس کے سامنے آچکے تھے۔ اور ۱۹۴۰ء میں اس نے بعض برخود غلط ذہنوں نے اپنی علاحدہ سٹیٹ کا عام طور پر اعلان بھی کر دیا تھا۔ اب آپ ہی بتلایئے کہ جس نے ہندوستان کو متحدہ قومیت کا درس دیا ہو، اور جو باہمی اختلاف کو عالم انسانیت کا نقصان سمجھتا ہو، اس کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ پھر واگہانی حادثات سے اس کا سکون دل ہل گیا، اور ایک بار حکیمانہ انداز میں پورے ہندوستان کو اکثریت اور اقلیت کی حقیقت سمجھاتے ہوئے مسلمانوں کے دلی خدشات کو دُور کرنے کا فیصلہ کر لیا، اور اسی جذبے کے پیش نظر حکیم ملت، امام الہند نے سب سے پہلے ایک سوال کیا کہ

"کیا ہندوستان میں مسلمان کی حیثیت ایک ایسی اقلیت کی ہے جو اپنے مستقبل کو شک اور خوف کی نظر سے دیکھ سکتی ہے اور تمام اندیشے اپنے سامنے لا سکتی ہے۔ جو قدرتی طور پر ایک اقلیت کے دماغ کو مضطرب کر دیتے ہیں؟"

لیکن اس سوال کا جواب کون دیتا، جب اس نے دیکھا کہ سب کی زبانوں پر مہر سکوت لگ چکی ہے، جواب دینا در کنار، سوال کے سمجھنے کی بھی صلاحیت نظر نہیں آتی تو وہ خود آگے بڑھا اور کہنا شروع کیا:

"ہندوستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں سمجھی گئی۔ جس درجہ یہ بات کہ ہندوستان کے مسلمان کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی ہے۔ اور اس لئے ایک جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہیئے۔ اس ایک بنیادی غلطی نے بے شمار غلط فہمیوں کی پیدائش کا دروازہ کھول دیا۔ غلط دیواریں چنی جانے لگیں۔ اس نے ایک طرف تو خود مسلمانوں پر ان کی حقیقی حیثیت مشتبہ کر دی، دوسری طرف دُنیا کو ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا، جس کے بعد وہ ہندوستان کو اس کی صحیح صورت حال میں نہیں دیکھ سکتی۔

اگر اس معاملہ کی ابتدائی تاریخ آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو آپ ایک سابق وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن اور سابق لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی (اب یونائیٹڈ پراونسز) سر آکلینڈ کالون کے زمانہ کی طرف لوٹنا چاہیئے۔

برطانوی سامراج نے ہندوستان کی سرزمین پر وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے ان میں سے ایک بیج یہ تھا۔ اس نے فوراً پھول پتے پیدا کئے، وہ گو پچاس برس گذر چکے ہیں، مگر ابھی تک اس کی جڑیں خشک نہیں ہوئیں۔

سیاسی بول چال میں جب کبھی "اقلیت" کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری تعداد سے کم ہو لازمی طور پر اقلیت ہوتی ہے اور اسے اپنی حفاظت کی طرف سے مضطرب ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس سے مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے جو تعداد اور صلاحیت دونوں اعتبار سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لئے خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے۔ اس حیثیت کے تصور کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد کی نسبت دوسرے گروہ سے کم ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ بجائے خود کم ہو، اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جا سکے۔ ساتھ ہی اس میں تعداد کے ساتھ نوعیت کا سوال بھی کام کرتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک ملک میں دو گروہ موجود ہیں، ایک کی تعداد ایک کروڑ ہے، دوسرے کی دو کروڑ ہے اب اگرچہ ایک کروڑ دو کروڑ کا نصف ہوگا، اور اس لئے دو کروڑ سے کم ہوگا، مگر سیاسی نقطۂ خیال سے ضروری نہ ہوگا کہ صرف اسی نسبتی فرق کی بنا پر ہم اسے ایک اقلیت فرض کر کے اس کی کمزور ہستی کا اعتراف کر لیں۔ اس طرح کی اقلیت ہونے کے لئے تعداد کے نسبتی فرق کے ساتھ دوسرے عوامل کی موجودگی بھی ضروری ہے۔

اب ذرا غور کیجئے کہ اس لحاظ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کر لیں گے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے۔ اس کی نسبت "اقلیت" کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صریح دھوکا دینا ہے۔"

(خطبۂ صدارت کانگریس ۱۹۴۰ء)

لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کو شک کا مریض بنا دیا گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کی نعشوں پر کھڑے ہو کر اپنی لیڈری کی عمارت تعمیر کرنے والوں نے اس مردِ حق آگاہ سے عام مسلمانوں کو برگشتہ کرنے کے لئے طرح طرح کے منصوبے گانٹھے، اور یہ یقین دلانا شروع کیا کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے علاحدہ پسندی کی پالیسی صحیح پالیسی ہے، برطانوی سامراج کو اپنے منصوبے میں کامیاب ہونے کا اس سے اچھا کیا وقت تھا۔ اس لئے اس نے بھی ۱۹۴۶ء میں "انڈیا پلان" کا اعلان کیا

"انڈیا پلان کی تفصیل ایک طولانی تفصیل ہے۔ لیکن اس کے نتیجے میں ملک تقسیم ہوا۔ تقسیم کے بعد جو حالات رونما ہوئے اس کا تصور بھی اندوہ ناک تصور ہے۔ اس وقت یہ یقین تھا کہ

"سوراج ملنے کی تاخیر سے ہندوستان کا نقصان تھا۔ لیکن اتحاد کے رخصت ہو جانے سے عالمِ انسانیت کا نقصان نظر آرہا ہے۔

اور یقین نے اعتماد کی شکل ۱۹۴۷ء میں اختیار کر لی تھی اور حال یہ تھا کہ ایک طرف ہندو چیخ رہا تھا کہ ہمارا وجود خطرے میں ہے، تو ہندوستان میں مسلمانوں کے قدموں کے نیچے سے زمین نکل چکی تھی۔ برطانوی سامراج کے ایجنٹ اس وحشت و بربریت کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے اور ان کو یقین ہو گیا تھا کہ ہندوستان اب سنبھالا نہیں لے سکتا۔ اور یہ یقین اُن کا غلط بھی تھا۔ مگر انہیں کیا خبر تھی کہ ابھی وہ مسیحا موجود ہے کہ جس نے غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی اور دم توڑتی ہوئی انسانیت میں آزادی کی روح پھونکی تھی وہ مسیحا نفسی کا پھر ثبوت دے گا۔

آخر کار یہی ہوا سب سے پہلے ۲۴؍اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دہلی کی جامع مسجد میں اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ

"انگریز کی بساط تمہاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی اور راہ نمائی کے وہ بُت جو تم نے وضع کئے تھے وہ بھی دغا دے گئے حالانکہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لئے بچھائی گئی ہے اور انھیں بتوں کی پوجا میں تمہاری زندگی ہے۔"

پھر یہی بات ایک دوسرا انداز اختیار کر کے سامنے آتی کہ

"یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمہاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی۔ بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی ہے، اور یہی وہ انقلاب ہے کہ جس کی ایک کروٹ نے تمہیں بہت حد تک خوف زدہ کر دیا ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شے چھن گئی اور اس کی جگہ بُری شے آگئی۔ یہ واقعہ نہیں، واہمہ ہے حقیقت یہ ہے کہ بُری شے چلی گئی اور اچھی شے آگئی۔"

لیکن یہ باتیں ساری تمہیدی باتیں تھیں، اصل سوال اکھڑے ہوئے قدموں کا جمانا تھا اور ان کے دلوں سے اس خوف و ہراس کو نکالنا تھا کہ جس نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا تھا، اس کے لئے فرمایا کہ

"مسلمان اور بُزدلی، یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمان کو نہ کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں، انھوں نے تمہیں جانے ہی کے لئے اکٹھا کیا تھا، آج انھوں نے تمہارے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تو یہ عیب کی بات نہیں، یہ دیکھو کہ تمہارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہے تو اس کو اپنے اس خدا کا جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک امّی کی معرفت فرمایا تھا کہ "جو ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لئے نہ تو کسی کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم۔" ہوائیں آتی اور گذر جاتی ہیں اور یہ صرصری، لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں، ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا موسم گذرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت میں نہ تھے۔"

(امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا پیغام، تقریر جامع مسجد دہلی ۲۴؍اکتوبر ۱۹۴۷ء)

پھر دسمبر ۱۹۴۷ء میں یہی باتیں اس سے مختلف انداز میں لکھنؤ میں دہرائی گئیں مسلمانوں کے اُکھڑے ہوئے قدم جمنے لگے، اور دیکھتی آنکھوں نے یہ منظر دیکھنا شروع کر دیا کہ ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے کہ جہاں مسلمان موجود نہ ہوں اور آج کسی کو کسی قسم کا کوئی خوف پریشان کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

اب سوال ملک کی حفاظت اور اس کی ترقی کا تھا، اس پر ہندوستان گامزن ہو چکا ہے۔

"لیکن سفر وہیں ایک اشخاص کا اور ایک مقصد کا"

مقصد کے سفر کی ایک کڑی ۱۹۴۷ء میں پوری ہو جاتی ہے۔ اور دوسری کڑی اس وقت پوری ہوگی جب پوری انسانیت آزاد ہو جائے گی۔

مگر جس کا اندیشہ برسوں سے لگا ہوا تھا وہ وقوع میں آچکا اور ۲۲۔ فروری ۱۹۵۸ء کو شخصی سفر کا خاتمہ ہو گیا اور اس مسافر آخرت نے منزل کو جا لیا، اور دنیا کو کہنا پڑا کہ "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔"

آج پورے ملک کے دلوں پر سناٹا چھایا ہوا ہے۔ آج سب کی روحیں موت کی افسردگی سے مرجھائی ہوئی ہیں۔

لیکن کیا کوئی ہے، جو اس کی زبان سمجھتا ہو، اور اس کا آشنا ہو، کیا کسی کو اس کا نام معلوم ہے۔ کیا کسی نے اس کے کاموں کا اندازہ لگایا ہے؟

یہ سوالات بے تکے سوالات ہیں، مگر یہی بات وہی ہے جو اس کی زبان سے اضطراب کی چیخ بن کر نکلی تھی۔

"افسوس تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو، تم میں کوئی نہیں جو میرا آشنا ہو، میں سچ، سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اس پورے ملک میں بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں۔"

(مسئلہ خلافت اور جزیرۂ عرب)

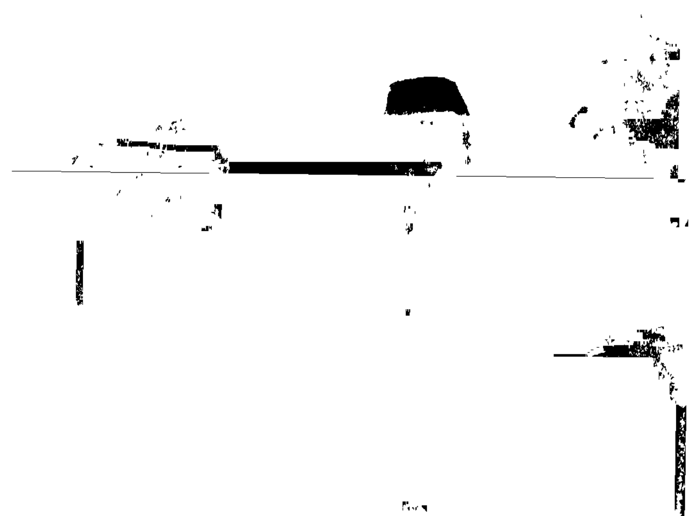
اگر اس کی اس بات کو ہندوستان غلط ثابت کرنا چاہتا ہے، تو پھر اس کا عملی ثبوت پیش کرے، اور جس مقصد کو لے کر اس کے شخصی سفر کا آغاز ہوا تھا۔ اسے پورا کرے۔ اس کا اہم مقصد ملک کی آزادی کے ساتھ باہمی اتحاد اور فرقہ واریت کا ... تھا اور آج بھی ہندوستان کی راجدھانی میں کسی اور کی زمین پر نہیں بلکہ اگر دہلی کے قدیم نقشے پر نظر ڈالی جائے تو پتا چلے گا کہ اپنی زمین پر کھڑے ہو کر وہ یہی پیغام دے رہا ہے۔

"ہماری ساری کامیابیوں کا دار و مدار قدرت پر اعتماد، باہمی اتحاد، اور ڈسپلن پر ہے، اور اسی سے ہم ایک فتح مند مستقبل کی توقع کر سکتے ہیں۔"









اُوپر:- ہندوستان کی جمہوری حکومت کے ممبر تعلیمات کی حیثیت سے مولانا آزاد پہلی پریس کانفرنس میں (۳۱ جنوری ۱۹۴۷ء)

درمیان دائیں:- مولانا ابوالکلام آزاد جرمنی کی فیڈرل ری پبلک کے صدر کے ساتھ۔ (جولائی ۱۹۵۵ء)

درمیان بائیں:- مولانا آزاد آثارِ قدیمہ کے مرکزی مشاورتی بورڈ کے چھٹے اجلاس میں تقریر فرما رہے ہیں۔

نیچے:- مولانا آزاد نئی دلی میں شاہِ افغانستان کا خیر مقدم کرتے ہوئے۔







اوپر دائیں - مولانا آزاد مشرق قریب اور یورپی ممالک کے غیر ملکی دورے پر روانگی کے وقت۔

اوپر بائیں - مولانا آزاد دلی کے پالم ہوائی اڈے پر شاہ محمود کے ساتھ

سامنے: مولانا آزاد استنبول میں

مولانا آزاد کشمیر کے مقام ڈاچی گام میں (بشکریہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی)



خواجہ احمد فاروقی

مردِ آزاد

دہلی، کے ویلری لین

۲۲ - فروری ۱۹۵۸ء

صدیقی - کیا لکھوں؟ حقیقت یہ ہے کہ اب کچھ لکھنے کو نہیں ہے وہ منحوس گھڑی جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا، بالآخر آ پہنچی اور حضرت مولانا آزاد کے دو بجے ساری قوم کو سوگوار چھوڑ کر اپنے آقا سے جا ملے۔ رنج، صدمہ، اس قسم کے سارے الفاظ کمزور معلوم ہوتے ہیں۔ اور دیدہ و دل کی اُس حالت کو بیان کرنے سے قاصر ہیں جو صبح سے اس وقت تک آن پر گزر رہی ہے - کل پرسشِ حال کے لئے درِ دولت پر حاضر ہوا تھا۔ مجمع سا مجمع تھا - اجمل خاں صاحب ٹیلیفون لئے بیٹھے تھے - بلا مبالغہ ہر منٹ پر گھنٹی بجتی تھی اور یہی سوال ہوتا تھا:

"اب حضرت کا مزاج کیسا ہے؟"

جواب ملتا: "وہی حال ہے - کوئی افاقہ نہیں - دعا فرمایئے۔"

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، گھنٹی جلد جلد بجنے لگی اور سوال و جواب مختصر ہوتے ہوتے بس یہ رہ گئے:

"حضرت کا مزاج؟"

"وہی، بدستور" —— پھر خاموشی چھا گئی - اتھاہ خاموشی - لاکھوں آدمیوں کا ٹھٹ مگر سانس تک کی آواز نہ تھی - ہر شخص کا رُخ ہمانگ ایڈورڈ روڈ کی طرف تھا - سارا شہر اُمڈ پڑا تھا - مضافات کے لوگ ٹوٹے پڑتے تھے۔ میرٹھ اور علی گڑھ تو خیر دلّی کی انگنائی ہیں وہاں سے عقیدت مندوں کا آنا تعجب خیز نہیں لیکن مدراس، بھوپال، بمبئی، حیدرآباد، کلکتہ، جے پور، سری نگر تک سے لوگ ہوائی جہازوں میں آگئے تھے۔ تا حدِ نظر آدمی ہی آدمی تھے - ہر شخص مغموم، ہر آدمی رنجیدہ۔

میرا جی چاہتا تھا کہ حضرت کو مہندیوں میں دفن کیا جاتا جہاں چند ایسے بزرگوں کی آرام گاہ ہے جن کا زمانہ میں جواب نہیں: حضرت شاہ ولی اللہؒ، حضرت شاہ عبدالقادرؒ، حضرت شاہ عبدالرحیمؒ، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، حضرت شاہ رفیع الدینؒ، حضرت شاہ محمد اسحاقؒ لیکن فیصلہ یہ ہوا کہ انکو لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان کے میدان میں دفن کیا جائے - سب سے الگ - خاص الخاص جگہ — یہ فیصلہ سب سے ہی مناسب ہے اس لئے کہ مولانا منفرد لوگوں میں سے تھے - یا ہمہ و بے ہمہ - فکر و نظر کی عام راہوں میں وہ کبھی وقت کے معمولی قافلوں کا ساتھ نہ دے سکے - ان کی نظر کا پیمانہ ہر جگہ بلند اور نظر کا معیار ہر جگہ ارجمند ہی رہا - زندگی بھی لائقِ رشک اور موت بھی لائقِ رشک،

شدیم خاک ولیکن بوئے تربتِ ما
تواں شناخت کزیں خاک مردمی خیزد

اُن کی زندگی، وفاداری و استواری کا کامل نمونہ - پرافشانیٔ نور کی عجیب و غریب مثال - اُن کا مقصد بلند تھا، اس لئے وفا کا درجہ بھی بلند تھا - اور وفاداری بھی ایسی وفاداری جیسے قبلہ نما کی سوئی قبلہ کی سمت ہوا کرتی ہے اس راستے میں کس کس طرح کی ذلتیں برداشت کیں، کیسی کیسی تکلیفیں اٹھائیں، کیا کیا سختیاں جھیلیں، نہ پوچھیے

گردِ مناک ہے اب تک بھی بیابانوں کی

وہ واقعی بے پناہ تھے - قطرہ کو گہر بننے تک بہت سی منزلیں طے کرنی پڑتی

ہیں یکین موتی بیشنے کے بعد وہ بے بہاہ ہو جاتا ہے۔ اس کو کوئی خطرہ نہیں ہتا۔ دریا کا طوفان اسے منتشر نہیں کرسکتا۔ اس سے برابر نور کی لہریں نکلتی رہتی ہیں۔ اور میں تو کہوں گا کہ مرنے کے بعد بھی اس کی نورافشانی جاری رہتی ہے۔ وہ ہستیاں جو اپنے آپ کو ایک بڑے مقصد کے لئے تج دیں، جو سچائی اور آزادی کی راہ میں مٹ جائیں، ان کے لئے مرنے کے بعد بھی موت نہیں ہے

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگراست

قلعۂ معلیٰ کے لاہوری دروازے سے نکل کر ایک وسیع میدان پڑتا ہے۔ یاد ہے آپ کو؟ جو شمال میں چاندنی چوک تک، جنوب میں فیض بازار تک اور مغرب میں جامع مسجد تک چلا گیا ہے۔ یہ بڑی مبارک جگہ ہے۔ شاہ جہاں سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک تمام بادشاہوں کی سواری یہیں سے گزری ہے اس طرح کہ امراء پا پیادہ جلو میں اور ماہی مراتب کے ہاتھی ہمراہ۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ حضرت شاہ کلیم اللہ نے یہیں بوریائے فقر پر بیٹھ کر دلوں پر حکمرانی کی ہے۔ یہیں ان کے شیدائیوں نے ان کی خاکِ پا کو سرمہ سمجھ کر آنکھوں میں لگایا ہے، یہیں ان کا مشہور مدرسہ تھا، جہاں انھوں نے انسانیت کی بہترین قدروں کا درس دیا ہے یہیں مغلوں کے زمانے میں بڑے بڑے باغ، بازار، مسجدیں اور مدرسے تھے۔ یہیں گلابی باغ اور خانم کا بازار تھا۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد اس حصے کو کھود کے پھینک دیا گیا تھا۔ آثار بھی سب مٹا دئے گئے۔ غالب نے لکھا ہے، شیخ کلیم اللہ جہاں آبادیؒ کا مقبرہ اُجڑ گیا۔ ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی — اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر۔

آج اسی تاریخی میدان میں، جس کے ایک طرف قلعہ کی خوبصورت عمارت ہے اور دوسری طرف جامع مسجد کے سربلند مینار، ایسا مجمع تھا کہ باید و شاید۔ ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ اپنے محبوب رہنما کو جی بھر کے دیکھ لے اور اسے عقیدت کا آخری نذرانہ پیش کرسکے۔ ڈیڑھ دو لاکھ آدمی ہوں گے جنھوں نے نمازِ جنازہ میں شرکت کی لیکن ماتمیوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ اس کے بعد ان کے جسمِ اطہر کو بڑے ادب اور قاعدے اور پورے فوجی اعزاز و اکرام کے ساتھ خاک کے سپرد کر دیا گیا:

اے خاکِ تیرہ خاطرِ مہمان نگہ دار
ایں نورِ چشمِ ماست کہ در بر کشیدہ

صدیقی۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک روشنی تھی جو گُل ہو گئی۔ ماضی کو حال سے ملانے والی ایک کڑی تھی جو ٹوٹ گئی۔ علم و فضل کے صحیفہ کا ایک ورق تھا جو گم ہو گیا:

أرأيتَ من حملوا على الأعواد
أرأيتَ كيف خبا ضياء النادي

[کیا (تم) نے دیکھا کہ لوگ کس کو تابوت میں اُٹھا کے لے گئے اور
ہاں کیا (تم) نے دیکھا کہ ہماری محفل کی روشنی کیسی گُل ہو گئی]

اس وقت عجیب عالم ہے "دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب" جو صحبتیں ان کے ساتھ گزریں، وہ سب ایک ایک کرکے چشمِ باطن کے سامنے آگئی ہیں جذبات کی پوری شدت اور حشر سامانیوں کے ساتھ لیکن بیان کی ہمت کسے ہے اور ہو بھی تو — بپایاں کہ رساند؟ ایک مرتبہ حضرت نے فرمایا:

" احمد صاحب (مولانا ہمیشہ احمد صاحب کہہ کر پکارتے تھے) آپ کا وطن کہاں ہے؟"۔ میں نے عرض کیا " بچھراؤں" ذرا حیرت سے "بچھراؤں! بچھراؤں تو میرے بھائی ہم بھی گئے ہیں — خواجہ غلام الثقلین ساتھ تھے۔ اس زمانہ میں انگریزی تمدن کا نفوذ قصبات تک کہاں ہوا تھا۔ وہاں ایک صاحب نے جو علی گڑھ سے غیر معمولی طور پر متاثر تھے، ہمارے اعزاز میں امروہہ سے (جو اس کے قریب واقع ہے) Menu چھپوا کر منگوائے تھے اور کھانے کی میز پر رکھے تھے!! (ذرا سکوت کے بعد) اور آپ اپنے ہم وطن زبدۃ الموحدین مفتی محمد ولی اللہ کی تصانیف سے بھی واقف ہیں؟"

مجھے حضرت مولانا کی پابوسی کا شرف پہلی دفعہ ۱۹۴۶ء میں ہوا جب وہ احمد نگر جیل سے رہا ہو چکے تھے اور غبارِ خاطر نئی نئی چھپی تھی۔ کاظمی صاحب قبلہ ساتھ تھے وہ بھول گئے کہ "یاسمن سفید" پیئیں گے لیکن وہ ختم ہو چکی تھی۔ چنانچہ ڈبہ کو جھاڑ کے بنائی گئی اور سب کو بطور تبرک اس دردِ تہ جام کا ایک ایک فنجان پیش کیا گیا۔ میں نے غبارِ خاطر کا ذکر چھیڑنا چاہا تو فرمایا "وہ تو غبارِ خاطر ہی ہے اور بس"۔

غبارِ خاطر کے متعلق آپ کے نعیم صاحب ہمیشہ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ دار و رسن کی آزمائش میں لکھی گئی ہے اور اس امتحان کی بعض منزلیں "غزل خواں" ہی طے کی جا سکتی ہیں۔ غبارِ خاطر کا انداز کچھ اس طرح کا ہے:

وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

انھوں نے بساطِ دلبری پر ادائے لطف کو عام نہیں کیا، لیکن آخر اپنا ایک

مصنف سے یہ کیوں توقع رکھیں کہ وہ اپنی خلوت کے سب زاویے آپ کو دکھلا دے۔ کوئی شخص اپنے متعلق پوری سچائی بیان بھی تو نہیں کر سکتا اور اگر بیان بھی کر دے تو بقول ایلیٹ اس کی تاب کون لا سکتا ہے ؟ کیا روسو نے پوری سچائی بیان کی ہے سامرسٹ ماہم تو یہاں تک کہتا ہے کہ "اعترافات" میں بھی اس کی تصویر ناقص ہی ہے !

مولانا نے یہ خطوط احتیاط کی چھلنی میں چھلتے ہیں" سراپا شیشہ فروشند" پر زور دیا ہے اور بڑے خاص حالات میں لکھے ہیں :

خواہم از بستر بہ زندان سخن آغاز کنم

غم دل پردہ دری کرد فغاں ساز کنم

بہ نوائے کہ زمضراب چکاند خوناب

خویشتن را بہ سخن زمزمہ پرداز کنم

پھر بھی جا بجا التفات و تغافل کی عشوہ گری ہے اور کیا وہ بذاتِ خود دلچسپ نہیں ہے ؟ مولانا نے ذوقِ حضوری کے لئے بات میں بات پیدا کی ہے اور دل کی گرمی سے محفل کی شمع کو روشن کیا ہے ۔ انھوں نے اپنے بارِ حیات ہی کو ہلکا نہیں کیا ۔ ہمارے احساسات میں بھی بالیدگی پیدا کی، اور زندگی کے احترام کے نئے دروازے کھولے ۔ وہ اپنے لمحات کو جاوداں بنانے کا سلیقہ رکھتے ہیں اور من و تو کی دنیا سے نکل کر بے کراں فضا میں پہنچ سکتے ہیں اور یہی ادبِ عالیہ کی شرطِ اوّل ہے ۔

غبارِ خاطر کو پڑھ کر وادیٔ کشمیر کے ایک نرم رو جوئبار کا احساس ہوتا ہے جس کے دونوں طرف سفیدار کے سیدھے سیدھے اور خوش نما درخت ہوں، لیکن الہلال اور البلاغ کی تحریریں اُس تند رو دریا کی یاد دلاتی ہیں ۔ جو پہاڑوں کو چیرتا، کاٹتا اور میدانوں کو طے کرتا موج در موج سمندر میں گرتا ہے King James کی بائبل کی طرح لوگوں نے الہلال اور البلاغ کی تحریروں کو بار بار پڑھا اور اس کی نثر پر سر دُھنا ۔ یہ ٹھیٹ مشرقی نثر ہے جس میں عربوں کی سی خطیبانہ بلند آہنگی اور ہندوستانیوں اور ایرانیوں کی سی مرصع کاری ہم آمیز ہوگئی ہے ۔ اس نثر میں اس دور کی سیاست کے تمام قیود موجود ہیں ۔ فقروں میں سلیقہ اور خوش ترتیب فوج کا سا جلال اور شکوہ ہے ۔ الفاظ میں نقارہ و دہل کا سا شور و ہنگامہ ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ نہیں ۔ خون کے قطرے ہیں اور ہر قطرہ پر کاوشِ مژگاں کے ظلم و ستم کی مہریں ہیں ۔

مولانا نے لکھنا ایسے سیکھا تھا جیسے مچھلی تیرنا سیکھتی ہے ۔ انشا کے قواعد ان کے ضمیر میں اس طرح جاگزیں تھے جیسے فولاد میں جوہر ۔ لیکن اگر تاریخ وار ان تحریروں کو پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے انداز و اسلوب کا بڑا ہموار ارتقا ہوا ہے ۔ یہ شان دار اور پُر شکوہ نثر الہلال اور البلاغ تک رہی جو صحافت سہی لیکن اس نے تخلیقی سرحدوں کو چھو لیا ہے ۔ غبارِ خاطر اور کاروانِ خیال کا اسلوب دوسرے موثراتِ خارجی کا نتیجہ ہے اسی لئے اس میں ادب کی جو گل کاریاں ہیں وہ سب سے الگ ہیں ۔ خطبات میں آتش خانوں کی سی گرمی ہے اور یونانی اور عربی اصولوں کی پوری پابندی جو انھوں نے منبر پر نہیں، دار پہ پہنی ہے لیکن ترجمان القرآن کے مقدمے میں جو سادگی اور پرکاری ہے اس کا اردو میں جواب نہیں ۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوثر و سلسبیل کی موجیں ہیں جو بہہ نکلی ہیں ۔

مجھے بی بی سی کی وہ بحث یاد ہے جب آپ نے نثر کا سخن گسترانہ ذکر چھیڑ دیا تھا ۔ درحقیقت ہماری نثر ایک بچے کی طرح ہے جو نیا نیا چلنا سیکھ رہا ہو ۔ وہ کئی دفعہ اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی اور کئی دفعہ گری ہے ۔ نظم کے برابر اس نے مدارج طے نہیں کئے ۔ غالب نے محمد شاہی روشوں کو ترک کیا اور اس کے اصلی جوہر کو چمکایا لیکن رجب علی بیگ سرور نے آئینہ خانہ میں رنگینیاں قید کیں ۔ وہ "بے ناپ تول" لکھنے کے قائل ہی نہ تھے ۔ ان کی انشاء فارسی کے حسنِ مستعار سے چمکی ۔ ایسا نظر سوز حسن جس میں اس کے اصلی خط و خال ہی چھپ گئے ۔ حالی کے یہاں آب و رنگ غیر ضروری تھا اسی لئے رات کا غازہ اور نرگسی آنکھوں کا سرمہ بڑے اہتمام سے دھو ڈالا گیا ۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد نے پھر ادبی مرصع کاری کا آغاز کیا ۔ یہ اسی قسم کی کوشش تھی جیسی (بلاتشبیہ) ڈرائیڈن کے زمانے میں جانسن نے یا ہیزلٹ کے زمانے میں کارلائل اور ڈی کوئنسی نے کی تھی ۔ یہ گویا، غوثیہ باجی کی زبان میں بھاری بھاری "تکوان اور ٹکن کے جوڑے میں یا سونے کے جڑاؤ اور سچے موتیوں کے گہنے" لیکن مولانا آزاد کے یہاں یہ بھاری مصالحہ بے وجہ صرف نہیں ہوا ۔ اس کے پیچھے ایک اصلی سیاسی مقصد تھا جس نے تاریخ کا رُخ بدل دیا ۔ اگر یہ سلمہ ستارے کا کام یوں ہی دکھلاوے کے لئے ہوتا تو اردو کی پرکار اُلٹی گھوم جاتی لیکن اس کے ساتھ اچھی قدریں وابستہ تھیں اس لئے یہ نثر بھی آگے بڑھی اور اس کے ذریعہ ہماری زندگی بھی ۔ اس روشنی میں دیکھا جائے تو آزاد اپنے طرز کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی ۔ نہ دو جانشین

ہیں۔ نہ ان کا کوئی جانشین ہے۔ وہ اس قدر کاوش کے ساتھ گلزار میں داخل ہوئے کہ بے رو شمشاد و شمشاد ماگئے۔ وہ جہاں ہیں تنہا ہیں۔

مولانا کی عظمت میں شبہ نہیں۔ لیکن جو چیز مجھے رہ رہ کر یاد آتی ہے وہ ان کی شخصیت کا حسن تناسب اور اس کی دلکشی ہے۔ بعض لوگوں کے یہاں بے افراط و تفریط ہوتی ہے۔ آدمی فن تصور میں گم ہوئے تو پھر کسی بات کی خبر نہیں۔ اور دنیا کی طرف توجہ کی تو دین سے ہو گئے۔ Pascal کو بہت عجیب ہوا کہ لوگ عاقبت سے بے خبر ہو کر کیسے شاہد و شعر بات و رامش و رنگ و بو میں محو ہو سکتے ہیں۔

(They) Dance and Play the Lute and Sing and Make Verses

ڈی۔ ایچ۔ لارنس نے کہا ہے لوگوں کو گرد و پیش کی مسرتوں اور مشکلوں سے آخر کس طرح فرصت مل جاتی ہے کہ وہ ماورائی مسائل پر وقت ضائع کر سکیں۔ لیکن مولانا کے وسیع تخیل میں ان دونوں کے لئے گنجائش تھی اور بڑے سلیقے کے ساتھ انھوں نے اسلام اور ہندوستانی تہذیب سے وہ سب کچھ لیا تھا جو انھیں لینا چاہیئے تھا۔ حد یہ ہے کہ انھوں نے انسانیت اور رواداری میں دونوں کی ایک مشترک اساس بھی تلاش کر لی تھی۔ ایک مرتبہ "انسانم آرزوست" کے سلسلہ میں ایک چینی مقولہ پیش کرنے لگے کہ اگر تمہیں ایک سال کا انتظام کرنا ہے تو گیہوں بوؤ، اگر دس سال کا، تو درخت بوؤ اور اگر نسلوں کا بندوبست کرنا ہے تو انسان بوؤ۔ ان کے یہاں سارا زور انسان اور انسانیت ہی پر ہے، قدیم تمدن کی گہرائی اور پختگی پر ہے۔ لیکن اس میں جدید کی بیداری اور اس کا احساس و شعور بھی شامل ہے۔ انھوں نے اپنے اعجازِ عمل سے تاریخ کی تخلیقی رَو کو موڑ دیا اور ہمیں وہ قدریں دیں جن کی روشنی میں چل کر ہم حیات کے مراتبِ عالیہ پر فائز ہو سکتے ہیں۔

گویند پس از ہزار سال از عالم	روشن جانے ز آسماں فرو آید
خاقانی ازاں جنس درین دہر بجو	بر رہ منشیں کہ کارواں دیر آید

آپ کا
خواجہ احمد فاروقی

حاصلِ گذارش

".... ہم کو اپنے سفر میں نکلے ہوئے دو سال ہو گئے۔ ہمارا سفر تاریکی میں نہ تھا بلکہ دوپہر کی روشنی میں تھا اور دنیا اُسے دیکھ رہی تھی۔ ہم اگر حرکت میں رہے ہیں تو اس پر پردہ نہیں پڑا ہے اور اگر جمود و غفلت میں کھڑے کے کھڑے رہ گئے ہیں تو وہ بھی کوئی راز نہیں ہے۔ اگر اپنے سفر کا کچھ حصہ طے کر سکے ہیں تو دیکھنے والے اس کی شہادت دے سکتے ہیں۔ اور اگر راہ کی دشواریوں سے واماندہ رہ گئے ہیں تو ہمت کا تزلزل اور قدم کی لغزش بھی بیچ بازار ہے۔ متاع بالکل نئی تھی اور اپنے سفر کے لئے خود ہی ایک نئی راہ نکالی گئی تھی۔ نہ تو ہمارے سامنے نمونہ تھا اور نہ کوئی رہنمائی کی مادی روشنی ---

لب خشک رفت و دامنِ پرہیز تر نہ کرد　　　زاں چشمہ کہ خضر و سکندر وضو کنند

قوموں اور جماعتوں میں انقلاب و تغیر کی دعوتوں کے نفاذ کا کام ایک ایسا دشوار گذار سفر ہے کہ اگر قوموں کی بادیہ پیمائی اور تگ و دو کے بعد سلامتی کا ایک قدم بھی طے ہو جاتا ہے تو اس کی کامیابی رشک انگیز اور اُس کی فتح مندی جشن و نشاط کی مستحق ہوتی ہے۔ ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کو گرا کر نئی دیوار کے بنانے کے لئے کس قدر سامان اور وقت مطلوب ہوتا ہے۔ پھر ان لوگوں کے لئے تو وقت کا کوئی سوال ہی نہ ہونا چاہیئے جو معتقدات و اعمال کی ایک پوری آبادی کو بدل دینا چاہتے ہوں۔ اور صرف کسی دیوار اور محراب ہی کو نہیں بلکہ شہر کی تمام عمارتوں کو از سرِ نو بنانے کے آرزو مند ہوں.... "

('الہلال' جون ۱۹۱۴ء)

اعجاز صدیقی

تیرے بعد!

بیادِ ابوالکلام آزادؒ

تھا عجب سلسلۂ لطف و عنایت تجھ سے
تیغوں کو بھی ملا رنگِ حلاوت تجھ سے
کسی دلدار نے کی جب بھی شکایت تجھ سے
مل گئی چہرۂ افسردہ کو رنگت تجھ سے
پائی اک لذّتِ بے حرف و حکایت تجھ سے
اے کہ باقی تھی تب و تابِ محبت تجھ سے
"شعلۂ عشق سیہ پوش ہُوا" تیرے بعد

وضعداری وہ تری، وہ تری گفتار کا ڈھنگ
وہ خموشی تری اور وہ لبِ اظہار کا ڈھنگ
کج کلاہی وہ تری، وہ تری رفتار کا ڈھنگ
خلوتِ شب میں وہ تیرے دلِ بیدار کا ڈھنگ
صبح کے کیف میں وہ فکرِ فسوں کار کا ڈھنگ
"چائے" کی بھاپ سے اُٹھتے ہوئے اسرار کا ڈھنگ
"ہوئی معزولیِ انداز و ادا" تیرے بعد

جیسے یکبارگی خضرِ رہِ منزل کھو جائے
کوئی زحمت کشِ ہر جادۂ مشکل کھو جائے
جیسے محفل ہو، مگر صاحبِ محفل کھو جائے
بھیڑ میں جلووں کی تابِ نگہ و دل کھو جائے
شبِ تاریک میں جیسے مہِ کامل کھو جائے
سخت طوفان ہو اور دامنِ ساحل کھو جائے
راستہ بھول گئے راہنما تیرے بعد

موم ہو کر تری مٹھی میں رہا آہنِ وقت
ایک تھی گردشِ مینا ہو کہ ہو گردشِ وقت
مستیِ راہبراں جب بھی بنی رہزنِ وقت
ہوشیاری نے سنبھالا تری اک توسنِ وقت
تو کہ تھامے کدۂ وقت میں تر دامنِ وقت
"کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن" وقت
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا "تیرے بعد"

تیرے خاموش تدبّر کے اشارات کہاں
سب میں وہ قوتِ تجزیۂ حالات کہاں
تھا یہ معلوم تجھی کو کہ گھنی رات کہاں
دن کے اُجیاروں سے کھا جاتی ہے خودمات کہاں
ختم ہو سکتی ہے ہر شورشِ آفات کہاں
بن کے خورشید، چمک سکتے ہیں ذرّات کہاں
سرد آتش کدۂ فکر ہوا تیرے بعد

گو ترے طرزِ تکلم کا وہ جادو نہ رہا
نگراں اب وہ ترا دیدۂ ہر سو نہ رہا
نفسِ گرم سے پھیلائے جو خوشبو نہ رہا
پھول بن جانے کے قابل کوئی آنسو نہ رہا
دل کی تسکین کا باقی کوئی پہلو نہ رہا
وہی ہنگامۂ محفل ہے مگر تو نہ رہا
"بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا" تیرے بعد

ہیں غلط سمت خیالات کے دھارے اب بھی
ضد پہ ہیں، الجھنِ روایات کے مارے اب بھی
ہیں پسِ پردۂ انفاس شرارے اب بھی
آندھیاں دیتی ہیں شعلوں کو سہارے اب بھی
شر پہ آمادہ ہیں کچھ لوگ ہمارے اب بھی
ہیں وہی برقِ سیاست کے نظارے اب بھی
"کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا" تیرے بعد

لوگ کہتے تھے ترا خلوتیِ راز جنھیں
اور تو نے ہی دیا شعلۂ آواز جنھیں
سوز دیتی رہی تیری نگہِ ناز جنھیں
تو نے بخشی تھی نئی قوتِ پرواز جنھیں
وہ کہ تھا ہوشِ رُبا تیرا ہر انداز جنھیں
تھا ترے رنگِ طبیعت سے بڑا ساز جنھیں
اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا" تیرے بعد

یوں تو دیکھے گئے شاملِ ترے ماتم میں سبھی
چند دن کا تھا مگر مشغلۂ جامہ دری!
اب نہ وہ آہوں کی شدت ہے، نہ وہ نوحہ گری
قوم نے لُٹے تری موت کی وہ قدر نہ کی!
تیرے اخلاص کی، دیپنے کی طرح داد نہ دی
"غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی"
"کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا" تیرے بعد

حل کیا وقت کا پیچیدہ سے پیچیدہ سوال
حدِ امکاں کے قریب آ گیا ہر امرِ محال
فیصلوں کو ترے ٹھکرائے، یہ تھی کس کی مجال
سب نے تجویزوں کو مانا تری بے قیل و قال
اللہ اللہ تری فکر کا وہ اوج و کمال
جنھیں گمراہیِ منزل سے ہو بچنے کا خیال
چُوم لیں وہ ترا نقشِ کفِ پا تیرے بعد

ہمہ دانوں میں مسلّم ہمہ دانی تیری
بھول سکتا نہیں دل، سحر بیانی تیری
لے کے تحریر ہر اک گنجِ معانی تیری
اے کہ تصنیف نہیں کوئی بھی فانی تیری
بے نشانی سے بھی پیدا ہے نشانی تیری
وقت دُہرائے گا تا حشر کہانی تیری
تذکرہ ہوگا بہر حال ترا تیرے بعد

تیرا کردار مثالی وطنیت کے لئے!
تو نے نفرت کے سہے وار، محبت کے لئے!
تو شریعت کے لئے تھا کہ امامت کے لئے؟
تو قیادت کے لئے تھا کہ سیاست کے لئے؟
یہ سمجھنا ہے کٹھن چشمِ حقیقت کے لئے!
تیرا ہوتا تھا کسی سخت ضرورت کے لئے؟
رازِ قوم اور وطن پہ یہ کھُلا تیرے بعد

یہ وطن، تیرا وطن، میرا وطن، سب کا وطن
یہ چمن، تیرا چمن، میرا چمن، سب کا چمن
یہ ہمالہ کی زمیں، رقص گہِ گنگ و جمن
منبعِ علم و ادب، مرکزِ تہذیب و فن
جس میں پیوست تری فکر، مرا سوزِ سخن
ٹانکنے والا ہے تاروں کو سرِ پیراہن
پوچھ مجھ سے۔ کہ یہ ہو جائے گا کیا، تیرے بعد!

ریاض الرحمٰن شروانی

مولانا آزاد کی شخصیت

"آثارِ ابوالکلام آزاد" کی روشنی میں

مولانا آزاد کی شخصیت جتنی عظیم تھی اُس اعتبار سے اُن پر بہت کم لکھا گیا ہے اور جتنا لکھا گیا ہے اُس میں بھی اکثر کے بارے میں یہ کہنا دشوار ہے کہ اُس نے اُن کی عظمت کے ساتھ کس حد تک انصاف کیا ہے۔ انگریزی میں مہادیو ڈیسائی کی کتاب اور اُردو میں قاضی عبدالغفار کی "آثارِ ابوالکلام آزاد" شاید اس وقت تک اس معیار پر سب سے زیادہ پوری اُترتی ہیں۔ قاضی عبدالغفار سے اُردو ادب کے طالب علم بہ حیثیت ایک اِنشا پرداز، صحافی، طنز نگار اور سوانح نویس کے اچھی طرح واقف ہیں۔ اور حیثیتوں سے قطعِ نظر سوانح نگار کی حیثیت سے "آثارِ جمال الدین افغانی" کی ترتیب کے بعد اُن کا پایہ ہمارے سوانحی ادب میں خاصہ بلند تسلیم کر لیا گیا ہے۔ انھیں دوسروں کے مقابلے میں مولانا آزاد سے قُرب بھی زیادہ حاصل رہا اور اس لیے اُن کی نظر حضرت مولانا کے ذہن کے پوشیدہ گوشوں تک زیادہ پہنچ سکی۔ آج کی صحبت میں یہ دیکھنا ہے کہ قاضی عبدالغفار اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب رہے ہیں کہ ہمیں ان پوشیدہ گوشوں کی جھلکیاں دکھا سکیں اور حضرت مولانا کی عظمت کے ساتھ انصاف کر سکیں۔

قاضی عبدالغفار نے شروع ہی میں یہ اعتراف کیا ہے کہ کسی بڑی شخصیت کی خصوصیات کا صحیح اندازہ کرنا بہت مشکل کام ہے اور اس سے بھی زیادہ مشکل یہ ہے کہ غلط اندازہ کرنے کے اندیشے کو دل سے نکال دیا جائے۔ وہ خود یہ اندیشہ اپنے دل سے دُور نہیں کر سکے ہیں۔ وہ مولانا آزاد کو ایک "بہت مشکل اِنسان" سمجھتے ہیں اور ان اعترافات کے بعد اپنے کام کی ابتدا کرتے ہیں۔ اس سے یہ تو فائدہ ہوتا ہے کہ اُن کا قاری اُن سے مولانا کی شخصیت کے بارے میں عجائب و لطائف سُننے کا متوقع نہیں رہتا لیکن یہ نقصان بھی ہوتا ہے کہ خود اُن کے ذہن میں تردّد اور تذبذب پیدا ہو جاتا ہے جس کا اثر اُن کے کام پر بھی پڑتا ہے۔

قاضی عبدالغفار نے مولانا آزاد کی شخصیت کے جس پہلو پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ اُن کی "انفرادیت" ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں: "جب میں نے یہ مطالعہ شروع کیا تو میرے اس تبصرے کا موضوع نہ تو مولانا کی شخصی زندگی کے معمولات تھے، نہ اُن کی خاندانی یا ذاتی عظمت تھی نہ اُن کی سیاسی زندگی کے کارنامے تھے۔ نہ اُن کا مجتہدانہ علم و فضل تھا۔ بلکہ میری فکر و نظر کا مرکز صرف اُن کی مخصوص "انفرادیت" تھی جس کے نقش و نگار اُن کی تحریروں میں نمایاں ہوتے ہیں۔" مولانا کی اس "انفرادیت" میں سب سے زیادہ حصہ اُن کی "مُحیّر العقول" "جینیس" کا ہے جس کے بارے میں قاضی عبدالغفار کی رائے ہے: "جب مولانا دُنیا کے سامنے آئے تو وہ اپنے ساتھ علم و فضل اور تقدّس کی روایات ہی نہیں لائے بلکہ ایک طاقت ور "جینیس" کی بے پناہ قوتِ اجتہاد بھی لے کر آئے جس نے انھیں آبا و اجداد کے حلقۂ افکار کے باہر بہت سی نئی راہیں دکھائیں اور دُنیا کو ایک ایسی زبردست "انفرادیت" سے آشنا کیا جیسی کہ صدیوں سے اس ملک میں پیدا نہ ہوئی تھی۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا کی "جینیس" نے اُن کی "انفرادیت" کو جنم دیا اور اُن کی انفرادیت نے ایک طرف اُن کی شخصیت

میں وہ حسن اور عظمت پیدا کر دی جس کی اس ملک کی حالیہ تاریخ میں سوائے ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے کوئی دوسری مثال نہیں ملتی اور دوسری طرف اُن کے قلم سے ایسے جواہر ریزے نکلوائے جنھوں نے اُردو زبان کو امر کر دیا۔

"قاضی عبدالغفار نے مولانا آزاد کی "انفرادیت" کو اُن کے ادب میں جابجا تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور جہاں کہیں اُس کا سراغ پایا ہے۔ بڑے ماہرانہ انداز میں نقاب کشائی کی ہے۔ مولانا سب سے زیادہ "غبارِ خاطر" میں کھل کھیلے ہیں اور وہ بھی اس لئے کہ یہ خطوط اشاعت کے لئے نہیں لکھے گئے تھے بلکہ ان کا مقصد خود اپنی طبیعت کا بار ہلکا کرنا اور اپنے "حبیبِ لبیب" اور "صدیقِ مکرم" سے "ہم کلامی" اور "مخاطبت" کی خوش وقتی حاصل کرنا تھا۔ چنانچہ قاضی صاحب نے بھی مولانا کی شخصیت کو سمجھنے میں سب سے زیادہ مدد "غبارِ خاطر" ہی سے لی ہے۔

اس میں شُبہ نہیں ہے کہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے مولانا کی انفرادیت نے اُن کی شخصیت میں بڑا حسن اور عظمت پیدا کر دی لیکن اس میں بھی شُبہ نہیں ہے کہ اسی "انفرادیت" ہی کی بدولت اُن کے اور عوام کے درمیان ایک ایسی آہنی دیوار کھڑی ہو گئی جو ایک سیاسی کارکن اور قومی رہنما کے منصب سے میل نہیں کھاتی اور جس نے انھیں ہندوستان کی عوامی زندگی میں گاندھی اور جواہر لال یا محمد علی اور عبدالغفار خاں نہیں بننے دیا۔ اس سلسلے میں قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں:- "اُن کی انفرادیت عوام کی نفسیاتی سطح سے اس قدر بلند ہے کہ کوئی عامی اُسے عام پیمانے سے ناپ تول نہیں سکتا.... مولانا کی یہ نفسیاتی کیفیت، جس کا خود انھوں نے "غبارِ خاطر" کے مکتوبات میں بہت بلیغ اشاروں کے اندر ذکر فرمایا ہے۔ اُن کے اور عوام کے درمیان ایک اُونچی دیوار بن گئی ہے"۔ کون جانتا ہے کہ اگر یہ "اُونچی دیوار" نہ بن گئی ہوتی تو آج ہندوستان، خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کس طرح مرتب ہوئی ہوتی۔

قاضی عبدالغفار نے مولانا آزاد کی اس "انفرادیت" اور "تنہائی پسندی" کی توجیہ "غمگین احساس" سے کی ہے۔ اس معاملے میں انھیں مولانا کے شریکِ حال حکیم اجمل خاں (جن کے بارے میں قاضی صاحب کی تصنیف "حیاتِ اجمل" شائع ہو چکی ہے) نظر آتے ہیں۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ انھیں "حکیم صاحب مرحوم کی شخصیت کے مطالعہ کا کافی موقع ملا تھا" اور اس لئے انھوں نے "ایک ایسی ہی کیفیت کو پہچاننے کے کچھ اشارے پائے تھے"۔ لیکن وہ "مولانا کے اس قدر قریب کبھی نہیں" پہنچ سکے اور "اس لئے اُن کی فطرت کے تقاضوں کو اُن کی تحریروں ہی میں تلاش کرنا" ضروری ہو گیا۔ غالباً اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ حکیم اجمل خاں کی شخصیت اتنی "مشکل" نہیں تھی جتنی مولانا آزاد کی تھی۔

اس مرحلے پر قاضی عبدالغفار مولانا آزاد کی فطرت کے "غمگین احساس" پر مزید روشنی ڈالنے سے قاصر رہتے ہیں اور ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ آخر اس "غمگینی" کا اصلی سبب کیا ہے۔ صرف "فطرت کا کمال" ہی تو اس کا واحد سبب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پھر بھی "آثار" کے مطالعہ سے ہمیں یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ جس طرح مولانا آزاد کی شخصیت عجوبۂ روزگار تھی۔ اُسی طرح اُن کی شخصی اور سیاسی زندگی کے واردات اپنے اندر چشمِ بینا کے لئے بڑا سرمایۂ عبرت رکھتے ہیں۔ اُن کی پیدائش ایک خالص مشرقی بلکہ مولویانہ گھرانے میں ہوتی ہے۔ انھیں تعلیم وہ ملتی ہے جو سوائے تنگ نظری اور خود بینی کے دوسرا کوئی سبق نہیں پڑھا سکتی چوں کہ وہ مشائخ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے اُن کے گرد عقیدت مندوں اور ارادت کیشوں کا ایسا ہجوم رہتا ہے جو اُن کے ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگاتا ہے اور اُن کی طرف پیٹھ کر کے چلنا عذابِ الٰہی کا مستوجب سمجھتا ہے۔ اِن حالات اور ایسے ماحول میں اُنھیں جو کچھ بننا چاہئے تھا اُس کے بالکل برعکس وہ زندگی کے اِبتدائی دور ہی سے وسیع النظری اور خدمتِ خلق کے مسلک کو اپناتے ہیں اور عیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر استخلاصِ وطن کی تحریک میں تن من سے شریک ہو جاتے ہیں۔ یہاں انھیں ایک اور ہی نقشہ نظر آتا ہے۔ آزادیٔ ہند کی جدّوجہد میں برادرانِ وطن تو بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہے ہیں لیکن مسلمان من حیثیت القوم اُس سے الگ ہیں اور سرسیّد اور اُن کے جانشینوں کے بتائے ہوئے راستے ہی پر چلنا باعثِ نجات سمجھے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر اُن کے جذبات کو شدید ٹھیس پہنچتی ہے اور وہ قلم کو خونِ دل میں ڈبو کر اُس سے مسلمانوں کے خوابیدہ احساس کو بیدار کرنے کا کام لیتے ہیں۔ وہ جو کچھ اور جس انداز سے لکھتے ہیں۔ اُس سے ایک طرف تو عام مسلمانوں میں بیداری کی لہر دوڑ جاتی ہے لیکن دوسری طرف بوڑھے رہنماؤں کی پیشانیاں بھی شکن آلود ہو جاتی ہیں اور غیر ملکی حکومت کے اِشارے پر اُن کے خلاف بہتان تراشی اور الزام آفرینی کا طوفان کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ مگر وہ اُس کی ذرا پروا نہیں کرتے اور اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں۔ اُن کے لئے وہ وقت البتہ بہت سخت ہوتا ہے جب اس ملک میں بسنے والے دو بڑے فرقے (ہندو اور مسلمان) اپنی سادہ لوحی کے سبب خود غرض رہنماؤں اور غیر ملکی حکمرانوں

بیان کرنے والے کاروں کو باہم دگر دست و گریباں ہو جاتے ہیں اور ملک کی آزادی اور اتحاد کا جو نقشہ انھوں نے اپنے ذوقِ عمل اور حیاتِ کردار سے بنایا تھا وہ بگڑا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی پر بس نہیں ہوتی بلکہ ملک کے فرقہ پرست عناصر ہندوستانی عوام اور خصوصاً مسلمانوں کے "سوادِ اعظم" کے دلوں میں اُن کے خلاف بے سر و پا شکوک پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب کہ وہ لوگ جن کی خدمت اور رہ نمائی کی خاطر انھوں نے طرح طرح کی اذیتیں برداشت کی تھیں اور قسم قسم کے الزامات اٹھائے تھے اُن سے واقعی بدظن ہو جاتے ہیں اور اُن کے ہر قول اور ہر فعل کو شُبہے کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اُن کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کر دیتے ہیں اور اُن کی شان میں کسی گستاخی اور بدزبانی سے باز نہیں آتے۔ اس کے جواب میں وہ یہ تو نہیں کرتے کہ اپنے مخالفوں پر کیچڑ اچھالیں اور اُن کی بُرائی کا بدلہ بُرائی سے دیں اس لئے کہ یہ اُن کی شانِ استغناء اور شخصی عظمت کے منافی ہے لیکن یہ ضرور کرتے ہیں کہ "ایک گنبد کے اندر جس کا کوئی دروازہ نہیں ہے (اور اگر ہے تو کوئی چور دروازہ ہے!) اپنے وجودِ معنوی کو بند" کر لیتے ہیں اور دنیا والوں کی نظروں سے اتنے دُور ہو جاتے ہیں کہ اُن کے لئے سوائے اس کے چارۂ کار نہیں رہتا کہ "اُن کی فطرت کے تقاضوں کو اُن کی تحریروں ہی میں تلاش" کرنے کی کوشش کریں! ظاہر ہے کہ اس کا اثر مولانا کی تحریروں پر بھی پڑتا ہے اور اُن کی فطرت کا "غمگین احساس" جسے اُن کے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کے طرزِ عمل سے بہت تقویت پہنچتی ہے۔ اُن کے ادب میں ایک ایسی انفرادیت اور گداز پیدا کر دیتا ہے جس کا دوسرے ادیبوں کے ہاں سراغ لگانا آسان نہیں ہے۔ مولانا نے "غُبارِ خاطر" کے اوراق میں اپنے آرٹ کے بنیادی عناصر کی نشان دہی فرما دی ہے، وہ "انانیتی ادب" کی اصطلاح میں اپنے ادب کی فطرت کو نام زد فرماتے ہیں۔ مولانا نے "انانیتی ادب" کے سلسلے میں دنیا کے مختلف نامور ادیبوں کا تذکرہ فرمایا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس فہرست میں خود مولانا کا نام بھی کافی اُونچے مقام پر جگہ پانے کا مستحق ہے۔ اور اُردو ادب میں تو بقول "قاضی عبدالغفار" کوئی دوسرا ادیب ایسا نظر نہیں آتا جس نے اس شدّت کے ساتھ اپنی انفرادیت کے تازیانے عوام کی ذہنیت پر مارے ہوں"۔ دوسری زبانوں کے "انانیتی ادب" کو سمجھنے میں بھی ہمیں سب سے زیادہ مدد مولانا ہی کی تحریروں سے ملتی ہے۔ جیسا کہ قاضی صاحب کا خیال ہے کہ "انانیتی ادب" کے اخص الخواص ایسے افراد ہوتے ہیں جن کا ادب عام تعداد میں تولا نہیں جا سکتا اور جن کو ادب و تصنیف کے عام کُلیّات پکڑ نہیں سکتے .... اس اشارے کو مولانا کا ادب سامنے رکھ کر سمجھ لینا کچھ ایسا دشوار تو نہیں ہے"

مولانا کے ادب کی اس شاخ کے مطالعہ سے ہمارے ذہن میں جس شخصیت کا نقش اُبھرتا ہے اُس کے سب سے نُمایاں اجزائے ترکیبی قاضی عبدالغفار کے الفاظ میں "خودداری، انانیت، انفرادیت، کم آمیزی اور احساسِ برتری" ہیں۔" جو عقلیت اور Intellect کا ایک طبقاتی امتیاز ہے۔"

یہ "خودداری اور کم آمیزی" مولانا کی شخصیت میں جو جادو جگا دیتی ہے اُس کی طرف مضمون کے شروع میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن یہاں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اس "خودداری اور کم آمیزی" کی بدولت ہم نے کھویا کیا اور پایا کیا؟ اس میں شُبہ نہیں ہے کہ ہمیں ایک اوّل درجے کی "جینیس" میسّر آگئی، خود مولانا کو اس سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ عوام کی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کی زد سے بہت دُور نکل گئے۔" لیکن ساتھ ہی ہم نے ایک ایسا عظیم سیاسی رہ نُما کھو دیا جو اگر اس درجہ "خوددار اور کم آمیز" نہ ہوتا تو اُس کا مقام کسی طرح گاندھی جی سے کم نہ ہوتا۔ افسوس ہے کہ مسئلے کے اس پہلو سے قاضی عبدالغفار نے بحث نہیں کی ہے۔

مولانا آزاد کی انفرادیت کے نمایاں ہونے کا ایک اور موقع بھی بار بار آتا ہے اور وہ ہے اُن کے مخالفوں کے ساتھ اُن کا برتاؤ۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ مولانا کے مخالفوں نے انھیں عوام کی نظر سے گرانے کے لئے بڑے بڑے جتن کئے اور طرح طرح کے نام دھرے۔ لیکن مولانا نے کبھی اپنی زبان یا قلم کو اُن کی مخالفت سے آلودہ نہیں ہونے دیا بلکہ اُن کے اعتراضات اور الزامات کا جواب دینا بھی اپنے لئے کسرِ شان ہی سمجھا۔ اس ملک کی سیاسی زندگی کی عام اخلاقی سطح کو بلند کرنے میں مولانا نے جتنا بڑا کام کیا ہے اُس میں اُن کے ساتھ دوسرا نام گاندھی جی ہی کا لیا جا سکتا ہے۔ اس عارفانہ یک سوئی کے مظاہرے میں اُن کی انفرادیت اُن کے بہت کام آئی۔ قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں "رائے اور خیالات کو وہ ایسی بلندی سے دیکھتے رہے اور عام مباحث میں اُلجھنے کو انھوں نے اپنے شخصی وقار کے اس قدر منافی سمجھا کہ ایسے مسائل میں افکار اور تصوّرات کا ضبط ایک سنجیدہ خاموشی اُن کے علم و فضل کی ایک ضروری شرط قرار پائی۔" مولانا آزاد کی طرح قاضی عبدالغفار بھی فرقہ واریت کے بہت

بڑے دشمن ہیں اور اس لئے جہاں کہیں اُن کا قلم مولانا کے مسلم فرقہ پرستوں سے تصادم کی نقش آرائی کرتا ہے وہاں اُس میں بڑی جان آجاتی ہے اور وہ بہت دل فریب گل بوٹے کھلانے لگ جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:- "مولانا کی شخصی اور معنوی عزم و استقامت کا امتحان حکومت کے جبر و استبداد کی کسوٹی پر کوئی اتنا بڑا امتحان نہ تھا کہ وہ آزمائش تھی جس میں مولانا اُس وقت مبتلا ہوئے جب ہندو مسلم اتحاد کا دور گزر چکا، وہ تیرا ایک دفعہ پھر مسمار ہوگئی اور ایک دفعہ پھر حکومت نے فرقہ وارانہ تعصبات کی آگ روشن کر دی ..... بہت سے بلند آہنگ لیڈر تھے جو اس امتحان میں پورے نہ اتر سکے، لیکن مولانا خود اپنی "قوم" کے ہاتھوں (جب وہ گمراہ ہو چکی تھی) سب کچھ جھیل گئے۔ برطانوی حکومت کا فولادی پنجہ اُن کے وجود معنوی کو اس قدر مجروح کبھی نہ کر سکا۔ جتنے زخم خود اُن کی گمراہ "قوم" نے اُن کے دل و دماغ پر لگائے۔ مگر انھوں نے ان تمام جراحتوں کو شکوہ شکایت کا ایک حرف بھی زبان پر لائے بغیر گوارا کر لیا .... مولانا کی اس استقامت میں بہت کچھ دخل اُن کی نفسیاتی کیفیت کو بھی تھا۔ اپنی نفسیاتی خلوت میں انھوں نے اپنے سے کم درجے کی مخلوق سے شکوہ شکایت کرنے کی ادنیٰ سطح پر جانا اپنے ذہنی مقام کی توہین سمجھا....... اُس احساسِ خودی اور علم و نفس کی اُس انانیت نے جو مولانا کے کردار کی بنیاد ہے اُن کو ہمیشہ راہ و رسمِ عام سے علیحدہ رکھا اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی ایک پُر تمکین و غیور، خاموشی تن تنہا اُن یورشوں کا مقابلہ کر سکی جو سال ہا سال ہر قدم پر اُن کا راستہ روکتی تھیں..... مولانا ہمیشہ سب سے زیادہ اُن حملوں کی زد پر رہے جو لیگ سے اختلاف رکھنے والے مسلمانوں پر کئے جاتے تھے.... جب کانگریس کی تحریکِ آزادی کے دوران میں خدا اور رسول کے نام پر کرشمہ پاکستان کے نظریے کو جاہل مسلمانوں کے دلوں میں بٹھایا گیا اور ایک خود غرض اور ناعاقبت اندیش قیادت نے جہلاء کے جذبات کو اتنا گرما دیا کہ عقل و فہم کے تمام راستے بند ہو گئے تو اُس زمانے میں مولانا کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا وہ سب کو معلوم ہے۔ "قائدِ اعظم" نے انھیں "شو بوائے" کا خطاب عطا فرمایا... جتنی گالیاں انھیں دی گئیں شاید ہی ہندوستان کے کسی دوسرے لیڈر کے حصے میں آئی ہوں ... اور یہ سب ایک ایسا امتحان تھا جس سے مولانا اپنی پیشانی پر ایک شکن ڈالے بغیر گزر گئے۔" اس سلسلے میں ہم نے اتنے طویل اقتباسات اس لئے دیئے ہیں کہ قاضی عبدالغفار کی طرح ہم بھی یہ خیال ہے کہ مولانا آزاد کی شخصیت اور اُس کے پس منظر کو سمجھنے کے لئے سب سے اہم اُن کی زندگی کے اُسی پہلو کا مطالعہ ہے، جہاں اُن کا تصادم مسلمانوں کی فرقہ وارانہ سیاست سے ہوا۔ غیروں کے ہاتھ سے تلوار کے زخم کھا کر بھی دل و دماغ کی وہ کیفیت نہیں ہوتی جو اپنوں کی زبان سے نکلا ہوا ایک تلخ لفظ کر دیتا ہے۔ آدمی جب یہ سمجھے کہ ہم جن کی بھلائی کے لئے کام کر رہے ہیں وہی ہماری جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں اور اُن کے بھڑکانے والے وہ لوگ ہیں جن کی ساری زندگی اوّل تو غیر ملکی حکومت کی کاسہ لیسی میں گزری ہے ورنہ کم از کم ذاتی عافیت کوشی کی خاطر قومی زندگی کی ہمہمی اور نشیب و فراز سے تو ضرور ہی کنارہ کش رہے ہیں تو دل و دماغ پر جو بھی نہ گزر جائے کم ہے لیکن ان حالات میں بھی ایک طرف خدمتِ خلق میں بدستور مصروف رہنا اور دوسری طرف اپنے زبان و قلم کو مخالفت کی آلودگی سے ملوّث نہ ہونے دینا اتنا بڑا کام ہے جس کی مثالیں تاریخ میں ڈھونڈنے سے دو چار ہی مل سکتی ہیں اور یہ کام کوئی ایسا شخص ہی انجام دے سکتا ہے جس کی انفرادیت نے اُسے عام سطح سے بہت بلند یا لا مقام پر متمکن کر دیا ہو۔

زندگی کے سفر میں طرح طرح کی رکاوٹیں اور قسم قسم کے نشیب و فراز آتے ہیں جن سے انسان کو گزرنا پڑتا ہے، اور پھر زندگی جتنی اعلیٰ اور با مقصد ہوتی ہے اتنی ہی اُس کی راہ میں رکاوٹیں بھی زیادہ آتی ہیں۔ اِن رکاوٹوں سے کامران گزرنے کے لئے اِنسان کو جو جدوجہد کرنی پڑتی ہے وہ اُس کی شخصیت میں کچھ ایسے عناصر کو اُجاگر کر دیتی ہے جنھیں تضاد کا نام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن زندگی کا یہ تضاد اُس میں ایک خاص قسم کی جاذبیت اور کشش پیدا کر دیتا ہے اور اسے ایک ایسا "انسانی رنگ" Human Touch دے دیتا ہے۔ جس سے وہ بصورتِ دیگر محروم ہی رہتا۔ مولانا آزاد نے "غبارِ خاطر" کے ایک خط میں اورنگ زیب کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ یہ "لوہے اور پتھر کا انسان" جب ایک مسئلہ میں اور بے باک لڑکی سے متصادم ہوا تو اُس کا اِس درجہ اثر قبول کیا کہ اُس کے ہاتھوں اپنی سب سے عزیز متاع یعنی دین و ایمان فروخت کرنے کو تیار ہو گیا۔ ہم اب تک اورنگ زیب کو ایک سادگی پسند اور باوقار بادشاہ، بہادر اور ہوشیار سپہ سالار اور سخت گیر اور بے لچک انسان کی حیثیت سے جانتے آئے ہیں۔ اس لئے جب ہماری نظر کے سامنے اُس کی زندگی کا یہ "تضاد" آتا ہے تو ہمیں حیرت تو ضرور ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی ہمارے لئے اُس کی شخصیت میں ایک ایسا حسن اور دلربائی بھی پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ اب تک قطعاً محروم تھا۔ قاضی عبدالغفار نے بھی مولانا آزاد کی شخصیت کے "تضاد" کا تذکرہ

کیا ہے اور بتایا ہے کہ "متضاد عناصر کے تصادم" نے اُسے کس طرح متحرک Dynamic بنا دیا تھا۔ وہ مولانا کی زندگی کے ان متصادم عناصر کا سراغ خود اُن کی تحریروں میں لگاتے ہیں۔ چناں چہ لکھتے ہیں: "مولانا اپنی فطرت کے تضادات کو شاعرانہ اور فلسفیانہ انداز میں بار بار بیان فرماتے ہیں "غبارِ خاطر" کے ایک مکتوب میں پہلے تو آتش دان سے اپنی طبیعت کے لگاؤ کا ذکر کرتے ہیں اور پھر اپنے پیراکی کے شوق کو . . . . . سامنے لاتے ہیں۔" آگے چل کر وہ یہ بھی واضح کر دیتے ہیں کہ مولانا اپنی فطرت کے ان تضادات کی وضاحت کیوں ضروری خیال فرماتے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "مولانا کے اندر یہ احساس موجود ہے کہ عوام اُن کی زندگی کے تفاوت سے بے خبر نہیں ہیں اور بعض اوقات جب ایسی کوئی واردات پیش آجاتی ہے جس سے یہ تضاد ظاہر ہوتا ہے تو لوگ سوچنے لگتے ہیں کہ ایک ہی طبیعت کے یہ دو رُخ کیوں کر ممکن ہوئے۔ مولانا اپنے شاعرانہ انداز میں اس تضاد کی تصریح فرماتے ہیں اور اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ بسا اوقات سطح کے اوپر جو کچھ ہوتا ہے، اُس سے بالکل مختلف بہت کچھ سطح کے نیچے ہوتا ہے۔" مولانا کی شخصیت کے اس "تضاد" پر بھی اُن کی بے پناہ "انفرادیت" کی چھاپ پوری طرح لگی ہوئی ہے اس سلسلے میں قاضی صاحب رقم طراز ہیں:- "زندگی کے حقائق کو وہ بار بار اپنے ہی رنگ میں اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ ہر چار سطروں کے بعد ایک نقطہ اُن کی بے پناہ اور بے محابا انفرادیت کا آئینہ دار ہوتا ہے . . . . مولانا نے اپنی زندگی کے ایک خاص اسلوب کا جو معیار اور زاویہ قائم کر دیا ہے وہ کبھی متزلزل نہیں ہوتا۔ نہ اُن کی خلوتوں میں اور نہ سیاسی مشاغل کی جلوت میں۔"

انسان کے لئے حد سے زیادہ خوشی اور حد سے زیادہ رنج کے مواقع ایسے ہوتے ہیں جب اس کا توازنِ ذہنی قائم نہیں رہتا اور وہ اپنی انفرادیت کو باقی نہیں رکھ پاتا لیکن مولانا آزاد اس آزمائش سے بھی پوری طرح کامیاب گزرتے ہیں۔ قلعہ احمد نگر کی نظر بندی کے دوران میں انھیں اپنی بیگم صاحبہ کی شدید علالت کی اطلاع پہنچتی ہے اور اُن سے کہا جاتا ہے کہ اگر وہ حکومتِ برطانیہ سے درخواست کریں تو انھیں بیگم صاحبہ کی تیمارداری کے لئے رہا کیا جا سکتا ہے لیکن اُن کی خودداری انھیں اس کی اجازت نہیں دیتی اور باوجود اس کے کہ وہ بیگم صاحبہ کو دیکھنے کے لئے بہت بے تاب ہیں مگر غیر ملکی حکومت سے اس قسم کی درخواست کرنا مناسب نہیں سمجھتے اور قلب و جگر پر جو کچھ گزرتی ہے اُسے برداشت فرماتے ہیں اور اس طرح برداشت فرماتے ہیں کہ روزمرّہ کے معمولات میں ذرا فرق نہیں آنے دیتے، یہاں تک کہ جیل کے ساتھیوں کو بھی، جن میں اُن کے بعض ایسے قریبی دوست شامل ہیں جیسے پنڈت جواہر لال نہرو، مسٹر آصف علی اور ڈاکٹر سیّد محمود، حقیقی وارداتِ قلب سے آشنا کرنا پسند نہیں فرماتے، البتہ ایک "غائب از نظر، ہم نشینِ دل" کے نام ان واردات کو صفحۂ قرطاس پر ضرور مُرتسم کرتے جاتے ہیں اور وہ بھی غالباً اس لئے کہ انھیں ان مکتوبات کے مکتوب الیہ تک پہنچنے کا پورا یقین نہیں ہے۔ اُس زمانے میں مولانا کے محسوسات کتنے شدید تھے اور انھیں اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے میں کیا کیا جتن کرنے پڑے۔ اس کا حال خود مولانا کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے۔ "اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا میں اُسے چھپاتا نہیں چاہتا، میری کوشش تھی کہ اس صورتِ حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کروں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن باطن نہ ہو سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمائش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشے میں ہم کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے . . . . . قرار و سکون کی یہ جو کچھ نمائش تھی جسم و صورت کی تھی، قلب و باطن کی نہ تھی۔ جسم کو میں نے ہلنے سے بچا لیا مگر دل کو نہیں بچا سکا۔" بہر حال جو وقت آنا تھا آکر رہا غیر بدستی کر مولانا کی جو کیفیت ہوئی ہوگی وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن اُن کی انفرادیت اس جاں گسل موقع پر بھی کس طرح سرفراز رہی اُس کا حال سُنئے: "سب سے پہلے یہ کوشش کرنی پڑی کہ یہاں زندگی کے جو معمولات ٹھہرائے جا چکے ہیں اُن میں فرق نہ آنے پائے . . . . چوں کہ زندگی کے معمولات میں وقت کی پابندی کا منٹوں کے حساب سے پابند ہو گیا ہوں اس لئے یہاں بھی اوقات کی پابندی کی رسم قائم ہو گئی اور تمام ساتھیوں کو بھی اُس کا ساتھ دینا پڑا . . . . یہ سب کچھ بدستور ہوتا رہا۔" یہاں یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کم از کم اس موقع پر مولانا کی انفرادیت میں آمد Sp. ntaneity باقی نہیں رہی، بلکہ اُسے قائم رکھنے اور بروئے کار لانے کے لئے انھیں خاص طور پر جدّ و جہد کرنی پڑی اور اسی کا دوسرا نام تصنّع اور بناوٹ ہے۔ اس طرف قاضی عبدالغفار نے بھی اشارہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں:- "ضبط و تحمّل بھی اسی انفرادیت کے سرفرازانہ وقار کی گویا

ایک بناوٹ ہے ..... اس بناوٹ کو وہ تسلیم کرتے ہیں کہ انھوں نے اس موقع پر اپنے ظاہر کو باطن سے متاثر نہ ہونے دیا۔" اس واقعہ سے مولانا کی عظمت کم نہیں ہوتی۔ بڑھ جاتی ہے۔ فطرت کے تصنع اور بناوٹ کی اس طرح نقاب کشائی کرنا ایک بڑے آدمی ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ ہر کہ ومہ اس کی جرأت کیسے کر سکتا ہے۔

مولانا آزاد کی انفرادیت نے انھیں جیسے سیاست اور ادب میں ایسے ہی مذہب میں شاہراہِ عام سے ہٹ کر اپنا راستہ بنانے پر مجبور کیا۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے وہ ایک علمی اور مذہبی خانوادے کے چشم و چراغ تھے اور اس لئے مذہب اُن کی گھٹی میں پڑا تھا لیکن ورثے میں انھیں مذہب کا جو تصور ملا تھا وہ بہت جامد اور بے روح تھا، وہی تقلیدی اور آبائی مذہب جو ہم میں سے اکثر لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ لیکن مولانا اس پر کیسے قانع رہ سکتے تھے! زندگی کے ابتدائی دور ہی میں اُن کے دل میں شک کا کانٹا چبھا اور اُس کی خلش اتنی بڑھی کہ اُس نے انھیں الحاد اور بے دینی کی سرحد تک پہنچا دیا۔ مگر مولانا قدرت سے طبعِ سلیم اور فکرِ رسا لے کر آئے تھے اس لئے اُن کے قدم یہاں رُک نہیں گئے بلکہ جلدی ہی وہ اس مقام پر پہنچ گئے جو مذہب کا اصلی مقصود ہے۔ جس عمر میں دوسرے لوگ زندگی کا سفر شروع کرتے ہیں۔ اُس عمر میں مولانا سفر کی تکان دُور کر رہے تھے۔ قاضی عبدالغفار نے مولانا کے مذہبی عقائد سے خاصی طویل بحث کی ہے لیکن چونکہ وہ ہمارے موضوع سے خارج ہے اس لئے ہم اُس کے بارے میں زیادہ لکھنا نہیں چاہتے، البتہ اتنا ضرور عرض کریں گے کہ یہ مولانا کی انفرادیت ہی کا کارنامہ ہے کہ وہ مذہبِ اسلام کو عورتوں کی ترقی، موسیقی کے ذوق، جہادِ حریت، متحدہ قوم کی تشکیل اور غیر مسلم موحدین کی نجات کی راہ میں حائل نہیں سمجھتے تھے۔ اگرچہ اپنے ان عقائد کے اظہار میں انھیں ایک طرف جُبّے اور عمامے والے بزرگوں سے اور دوسری طرف اپنے سیاسی مخالفوں سے بہت کچھ سُننا اور سہنا پڑا۔

کسی شخص کی انفرادیت اور عظمت کو سمجھنے کے لئے اُس کے ہم عصروں سے اُس کا مقابلہ و موازنہ بہت مفید ہوتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک جیسے ماحول میں رہ کر ایک جیسے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے مختلف لوگوں نے کس طرح کا طرزِ عمل اختیار کیا تو ہمیں اُن کی قدر و قیمت متعین کرنے میں بہت آسانی ہو جاتی ہے۔ قاضی عبدالغفار نے مولانا آزاد کا مقابلہ و موازنہ اُن کے دو جلیل القدر ہم عصروں مولانا محمد علی اور ڈاکٹر سر محمد اقبال سے کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ یہی دو بزرگ ایسے ہو سکتے تھے۔ جن سے مولانا آزاد کا موازنہ کیا جاتا، اس لئے کہ موجودہ صدی کے نصف اوّل میں اسلامی ہند کو صحیح معنی میں یہی تین شخصیتیں ایسی میسّر آئیں جو دل و دماغ کی صلاحیتوں سے پوری طرح متصف تھیں اور جنھوں نے بعد میں آنے والوں کے لئے اپنے طرزِ عمل اور کردار سے جاندار اور صالح روایتیں قائم کیں۔

مولانا محمد علی ایک عملی انسان تھے اور اُن کا "عشق" انھیں آتشِ نمرود میں کود جانے کے لئے آمادہ رکھتا تھا لیکن وہ مولانا آزاد کی طرح علم و فضل کے اعلیٰ مقام پر متمکن نہیں تھے اور اس لئے اُن میں ضبط و تحمل اور استقلال و استقامت کے وہ بلند پایہ اوصاف نہیں پائے جاتے تھے جو مولانا آزاد کی انفرادیت کے سب سے روشن مینارے ہیں۔ اسے قاضی عبدالغفار اس طرح لکھتے ہیں: "مولانا محمد علی ایک عمومی لیڈر تھے اور ایک عمومی لیڈر کی طرح اپنے بادبانوں کا زاویہ ہوا کے رُخ پر قائم کر سکتے تھے۔ مولانا (آزاد) اس مفہوم اور انداز کی عمومیت سے تقریباً بے گانہ رہے ..... کبھی ان دونوں کے طرزِ فکر میں کوئی نقطۂ اتصال پیدا ہی نہ ہو سکا ..... ان دونوں کے درمیان ایک ایسی ذہنی خلیج حائل ہے جس پر کوئی پُل نہیں باندھا جا سکتا ..... مولانا محمد علی بسا اوقات اپنے نقّاد اور مخالف سے دست و گریباں ہو جانے کی جرأت رکھتے تھے اور ضرورت کے وقت اُن کی صداقت کا انداز بھی جارحانہ ہو سکتا تھا لیکن مولانا (آزاد) بعض اوقات دوسروں پر اس لئے تنقید یا تعریض نہ کرتے تھے کہ ایسا کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ یہ کوئی احساسِ کمتری نہیں بلکہ ایک بہت ضدی اور مستحکم انفرادیت ہے جو میدانِ جنگ میں اس لئے نہیں جاتی کہ اُسے کوئی برابر کا حریف نظر نہیں آتا۔"

ڈاکٹر اقبال عملی انسان بالکل نہیں تھے بلکہ ایک فلسفی اور مفکر تھے اور اس لئے اُن کا موازنہ مولانا آزاد سے فکر و نظر کی دُنیا ہی میں کیا جا سکتا ہے ان دونوں کے درمیان جو چیز سب سے زیادہ مشترک ہے وہ رمزِ خودی اور عرفانِ حیات کا فلسفہ ہے لیکن اس باب میں بھی مولانا آزاد کو ڈاکٹر اقبال پر فوقیت حاصل ہے۔ اس کی تشریح قاضی عبدالغفار اس طرح کرتے ہیں:-
"اقبال رمزِ خودی کا فلسفہ صرف مسلمان کے لئے پیش کرتے ہیں، اُسی کو اپنا مخاطب بناتے ہیں اور اُسی کو زندگی کا پیام دیتے ہیں مگر مولانا کا فلسفۂ حیات اقبال کے تصورات سے زیادہ وسیع اور زیادہ ہمہ گیر ہے۔ وہ اقبال سے

زیادہ "مذہبی" ہونے کے باوجود خود شناسی کے فطری تقاضوں کو انسانیت حتیٰ کہ ہر جاندار کے ساتھ منسوب کرتے ہیں..... اقبال صرف مسلمانوں کے لئے قوّتِ عمل کا ایک نسخہ تجویز کرتے ہیں اور مولانا تمام مخلوقات کی اُس قوتِ نمو کا ذکر کرتے ہیں جو اس میں ودیعت ہے.... اقبال اپنے بلند ترین افکار میں انسانیت کے تصوّر سے اس قدر وابستہ نظر نہیں آتے جتنے کہ صرف اسلام اور مذہب کے تصوّر سے..... اور اسی لئے اقبال کا پیام فرقہ پرستوں کے لئے فرقہ پرستی کا ایک فتنہ انگیز کھلونا بن گیا ورنہ خود شناسی اور خودی کا وہ فطری عمل جس کو مولانا نے ایک چڑیا کے بچے کے پروں میں کارفرما دیکھا، انسان کے پیکر میں اور بھی زیادہ نسل اور فرقہ اور مذہب کی تنگ نظری سے آزاد ہے"

مولانا آزاد کی انفرادیت کو نمایاں کرنے کے لئے قاضی عبدالغفار نے اُن کی زندگی کے مختلف گوشوں کو بے نقاب کیا ہے اور اپنی اِس کوشش میں انھوں نے زیادہ مدد مولانا کی تحریروں خصوصاً "غبارِ خاطر" سے لی ہے۔ لیکن انھیں مولانا سے یہ شکوہ ہے کہ انھوں نے "اپنی اس نثر میں شعر کی تمام لطافتیں اس طرح سمودی ہیں اور شاعرانہ اشارات و کنایات سے اس قدر کام لیا ہے کہ تنقید اور تبصرے کی راہ دُشوار گزار ہوگئی ہے اور مغالطے سنگِ راہ ہو سکتے ہیں۔ اُن کی شعریت نے ایک چادر بن کر اُن کے حقیقی تاثرات کے چہرے کو اس طرح ڈھانپ لیا ہے کہ بعض مقامات پر تو یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کس نقطے پر شاعری ختم ہوتی اور حقیقت شروع ہوتی!" کچھ اسی قسم کا شکوہ ہمیں قاضی عبدالغفار سے بھی ہے۔ جو کسر مولانا کی شعریت سے باقی رہ گئی تھی اُسے قاضی صاحب کی شعریت نے پورا کر دیا اور "تنقید اور تبصرے کی راہ" اور بھی دشوار گزار ہوگئی۔ بہر حال کہا جا سکتا ہے کہ "آثارِ ابوالکلام آزاد" مجموعی طور پر ایک عظیم اور "مشکل شخصیت" کو سمجھنے اور اُس کی نفسیات کا مطالعہ کرنے کی خاصی کامیاب کوشش ہے، اگرچہ یہ اور زیادہ کامیاب ہو سکتی تھی اگر عقیدت کے ساتھ تنقید سے بھی کام لیا جاتا اور "مشکل شخصیت" کا تاثر پہلے ہی سے ذہن میں قائم نہ کر لیا جاتا۔

حیاتِ امید وموتِ قنوط

مایوسی سے بڑھ کر کوئی شے انسان ... کے لئے ... مہلک نہیں اور دنیا کی تمام کامرانیاں صرف امید کے قیام پر موقوف ہیں۔ یہ امید ہی ہے ... زمینوں پر قبضہ کیا ہے، پہاڑوں کے اندر سے ... پیدا کیا ہے، سمندر کی تہ ... کو طے کیا ہے اور جب چاہا ہے اس میں اپنی سواری ... چلائے ہیں اور جب چاہا ہے اس کے کناروں کو میلوں اور فرسخوں تک خشک کر دیا ہے۔ پھر امید ہی ہے جس نے مردہ قلوب کو زندہ کیا ہے، بسترِ مرگ سے بیماروں کو اٹھایا ہے، ... کو کناروں تک پہنچایا ہے، بچوں کو جوانوں کی تیزی سے دوڑایا ہے اور بوڑھوں کو جوانوں سے زیادہ قوی و طاقتور بنا دیا ہے۔

جبکہ قوتیں جواب دے دیتی ہیں، جبکہ زمانہ منہ پھیر لیتا ہے، جبکہ زمین کے کسی گوشے سے صدائے ہمت نہیں آتی اور جبکہ تمام اعضائے عمل جواب دے دیتے ہیں تو امید ہی کا فرشتہ ہے جو مسکراتا ہے، اپنے پروں کو کھولتا ہے اور اس کے سایے میں سے کر قوت و طاقت، ہمت و مستعدی جستی و چالاکی کی ایک روحِ تازہ دلوں میں پیدا کر دیتا ہے۔

دنیا میں کامیابی اعمال کا نتیجہ ہے اور اعمال کے لئے پہلی چیز امید ہے۔ جب تک انسان کے اندر امید قائم ہے، مصیبتوں اور ہلاکتوں کے اگر ... بھی سامنے آ کھڑے ہوں تو بھی اس کو شکست نہیں دے سکتے۔

اگر خون اور اس کا دوران انسان کی جسمانی حیات کے لئے ضروری ہے تو یقین کیجئے کہ اخلاقی و ادبی حیات کے لئے امید ... اس کے اندر بمنزلہ روح کے ہے جب تک اس کا دوران دل سے اُٹھ کر ... اعضائے حال و دماغ سے نکل کر جسم کے تمام گوشوں میں حرارتِ عمل پیدا کر رہا ہے، اس کی قوتِ عمل زندہ، اس کے اعضائے کار متحرک اور پائے مستعدی سرگرم تکاپو ہیں۔ لیکن جہاں یہ رشتۂ حیات دل سے نکلا پھر جسم انسانی کے لئے قبر کے سوا کہیں ٹھکانا نہیں۔"

("الہلال" ۹۔ اپریل ۱۹۱۳ء)

حمیدہ سلطان

زلیخا

نرگسی آنکھیں، دراز پلکیں، تنی بھوئیں، پگھلے ہوئے سونے کا سا رنگ، بیضوی چہرہ، یاقوتی لب، ساون کی گھٹاؤں کے مانند کالے لانبے بال، بوٹا سا قد مائل بہ گداز، دلآویز جسم، سفید کالی کنی کی سوتی یا ریشمی ساری بے پروائی سے پہنے مشرقی حیا آمیز اداؤں کا قافلہ اپنے جلو میں لئے میں نے اسی دنیا کی حور کو دیکھا ہے۔ یہ پاکیزہ صورت حضرت یوسف والی زلیخا نہیں، یوسف ہندی حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی رفیقہ حیات زلیخا بیگم تھیں۔

میری عمر سات یا آٹھ سال کی تھی دلی میں ایک زنانہ کانفرنس منعقد ہوئی اس کی صدارت بیگم صاحبہ بھوپال سلطان جہاں بیگم نے کی۔ ان کے ہمراہ مولانا آزاد کی دونوں بہنیں آبرو بیگم صاحبہ اور فاطمہ بیگم صاحبہ بھی تشریف لائیں۔ ان دونوں کے علم و فضل اور ادیبانہ خطبوں کی دھاک پڑھی لکھی خواتین پر بیٹھی ہوئی تھی۔ چوں کہ والدہ صاحبہ اس کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کی ایک رکن تھیں اسی لئے ان کی میزبانی کا شرف ہمارے گھر کو ملا۔ اس طرح دوستی کی بنیاد پڑی۔ پھر یہ مراسم دن بدن بڑھتے گئے۔ ۱۹۳۳ء میں ابا جان کی وفات کے بعد تین سال ہمارا کلکتہ رہنا ہوا، تو تعلقات بالکل عزیزانہ ہوگئے۔ یہ دونو اپنے مکرم بھائی سے ملنے بھوپال آئیں تو ہمارے یہاں بھی آئیں۔ پھر اپنی چہیتی بھاوج بیگم زلیخا آزاد سے والدہ صاحبہ کو ملوایا۔ مولانا آزاد اس زمانے میں بالی گنج کی ایک شاندار دو منزلہ کوٹھی میں رہتے تھے۔ والدہ مرحومہ پرانے زمانے کی بہت رکھ رکھاؤ والی بیوی تھیں۔ مگر ادھر تو بیگم آزاد کی پاکیزہ صورت، دل نشین اداؤں نے ان کو کھینچا، ادھر وہ بھی شرمیلی اور کم آمیز ہونے کے باوجود کچھ ایسی گھل مل گئیں کہ بلاناغہ ایک ہفتہ یہ وہاں جاتیں دوسرے ہفتہ وہ یہاں آتیں۔ ان میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک اچھی خاتون میں ہونی ضروری ہیں۔

وہ سلیقہ شعار بھی تھیں اور خانہ داری کے امور سے بھی بخوبی واقف۔ مہمان نواز بھی تھیں اور ہنس مکھ شیریں زبان بھی۔ سسرال والوں پر بھی جان چھڑکتی تھیں اور شوہر پر بھی فدا تھیں۔ چونکہ آپس میں کافی بے تکلفی تھی اس لئے نند بھاوج کے رشتے کو لے کر دونوں میں مذاق بھی ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ صبح دس بجے کے بعد یہ ان کے یہاں پہنچیں تو خلاف عادت اس دن وہ پندرہ منٹ بعد مسکراتی ہوئی آئیں اور معانقہ کرتے ہوئے کہا۔ "معاف کیجئے گا بھئی! آپ کو اتنی دیر میرا انتظار کرنا پڑا۔ میں مولانا کو کھانا کھلا رہی تھی۔ وہ بہت تھوڑا اور سادہ کھانا کھاتے ہیں۔ دو چمچے اُبلے ہوئے چاول، تھوڑی سی دال، سبزی یا گوشت اور دہی۔ چونکہ صبح بہت سویرے اُٹھ جاتے ہیں اس لئے دوپہر کے کھانے کے بعد بارہ بجے سے بھی پہلے لیٹ جاتے ہیں۔ پھر دو بجے غسل کرکے نماز پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد کاموں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ملنے والوں کا تانتا رات گئے تک لگا رہتا ہے۔"

بیگم آزاد کے بکھرے بالوں کی طرف اشارا کرکے یہ بولیں مگر "بھاوج معلوم ہوتا ہے ہمارے بھائی کو آپ کی یہ زلف پریشاں بہت پسند ہے جو آپ سر نہیں گوندھتیں'"

وہ جس انداز سے لجا کر بولیں "اے نہیں نہیں یہ بات نہیں۔ ان کے بار بار جیل جانے سے میری طبیعت کچھ ایسی خفقانی ہوگئی ہے کہ چوٹی گوندھنے سے دل گھبراتا ہے"۔ وہ اندازِ حجاب آج بھی مجھے یاد ہے۔ کیسی باحیا بیوی تھیں اور کیا زمانہ تھا کہ شوہر کا ذکر کرتے بھی شرماتی تھیں۔ یہ اس دن ان پر

تعقید کرنے کی ٹھان کر گئی تھیں۔ پھر ان کی خالی کلائیوں کی طرف اشارا کر کے کہا "اے توبہ! ایسی بھی کیا سادگی، وہم نہیں آتا۔ اللہ تمھارا سہاگ قائم رکھے ایک ایک چوڑی ہاتھوں میں ڈال لیا کرو۔"

انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا "آخر ہیں نا آپ بھی نند، بالکل سسرال والوں کی طرح طعنے دے رہی ہیں۔ اچھا آیندہ میں آپ کی خوشی کا خیال رکھوں گی۔"

دوسرے ہفتے جو وہ ملنے آئیں تو پشت پر چوٹی لہرا رہی تھی۔ چکنی کا خوبصورت بیں لگا بلاوز پہنے تھیں اور ہلکی دھانی ریشمی ساری زیب تن تھی۔ ہاتھوں میں سونے کی دو دو چوڑیاں تھیں۔ کانوں میں بندے، اچھے لباس اور ہلکی سی آرائش نے ان کی من موہنی صورت کو اور بھی دل ربا کر دیا تھا۔ یہ ان کو گلے لگا کر مسرور لہجے میں بولیں۔ "اے ہے کہیں بری نظر نہ لگ جائے۔ آج تو ماشاءاللہ چشم بد دور بہت اچھی لگ رہی ہو۔" وہ حسب عادت لجا کر بولیں "آپ کو خوش کرنا تھا۔ ورنہ مجھے تو اب رنگین کپڑے اور زیور پہنتے شرم آتی ہے۔" "اے ہے لو اور سنو حد کر دی تم نے بھی۔ ابھی تمھاری عمر کون سی ایسی ہے سہاگنیں تو بڑھاپے میں بھی رنگا پیلا پہنتی ہیں"، انھوں نے کہا۔

مجھے ہر بار کتابوں کا لالچ جانے پر مجبور کرتا۔ مولانا صاحب کی لائبریری اوپر زنانے میں ہی تھی۔ میں جاتے ہی لائبریری میں گھس جاتی اور کتابیں وہاں سے لاتی پھر ان کو پڑھ کر رکھ دیتی اور لے آتی۔ میرے ذوق کی تسکین کا سامان فراوانی سے ملتا۔ کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ اسی لائبریری میں ہی پہلی مرتبہ میں نے مولانا کی زیارت کی۔

اوائل گرمی کی ایک شام تھی۔ وہ دونوں بیویاں باتوں میں لگیں۔ میں حسب معمول لائبریری میں پہنچ گئی۔ ایک سرخ و سفید رنگ کا تیکھے خط و خال والا انسان، سفید کرتے پاجامے میں ننگے سر کتابوں کے اردگرد ڈھیر لگائے مطالعہ میں ایسا مصروف تھا کہ میں قریب پہنچ گئی اس کو خبر نہیں ہوئی۔ وہ اسی طرح سر جھکائے پڑھتا رہا۔ میں الٹے قدموں واپس ہوئی تو وہ محبت بھرے لہجے میں بولیں "کیوں کتابیں نہیں ہیں؟" میں نے کہا "غالباً آج لائبریری میں مولانا صاحب تشریف رکھتے ہیں اسی لئے واپس آ گئی۔"

"ارے ہاں وہی ہوں گے آج کل ان کو ذرا فرصت ہے۔ اکثر شام کو ملنے والوں سے بچ کر لائبریری میں بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔ لیکن تمھارے تو ماموں ہیں۔ آؤ میرے ساتھ چلو میں ان سے تم کو ملوا دوں۔" انھوں نے ایک خاص انداز سے کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر لے گئیں۔ میں ڈرتی جھجکتی مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ انھوں نے میرا تعارف کرایا۔ مولانا صاحب نے مسکراتے ہوئے مہربانی کے لہجے میں فرمایا۔ "آؤ بیٹی جو کتاب چاہو لے لو۔" اور میں بت بنی کچھ دیر اس عظیم انسان کو دیکھتی رہی جو دنیائے علم و ادب، خطابت، مذہب، سیاست کا خورشید تاباں تھا۔ مولانا علیہ الرحمۃ کی عظمت کا نقش میرے دل کے سادہ ورق پر اسی دن بیٹھا۔ پھر عمر کے ساتھ میری عقیدت میں اضافہ ہوتا گیا۔

ایک دن صبح جو ہم پہنچے تو بیگم آزاد کی نرگسی آنکھوں میں سرخ ڈورے دیکھ کر والدہ نے ان سے مسکرا کر کہا "کیا رت جگا کیا ہے بھاوج؟ آنکھیں گلابی ہو رہی ہیں۔"

وہ ہنس کر بولیں "آپ کی تو عادت ہے ہی بنانے کی۔ آج کل مولانا قرآن کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔ رات کو دو بجے کے بعد اٹھ بیٹھتے ہیں۔ جتنی دیر وہ لکھتے ہیں میں پنکھا جھلتی ہوں۔ موسم بہت گرم ہے۔ باہر بھی حبس ہی رہتا ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ جاگیں، محنت کریں اور میں آرام سے سوتی رہوں۔"

یہی تھا اس نیک بی بی کا وہ جذبۂ رفاقت جس کو یاد کر کے مرنے والی کے غم میں مولانا پر احمد نگر قلعہ میں ایک پرانی قبر کو دیکھ کر رقت طاری ہو جاتی تھی۔

بڑے آدمیوں کے سوانح حیات جب لکھے جاتے ہیں تو اکثر ان کی خانگی زندگی کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے حالانکہ یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اپنے مشاہیر کے متعلق یہ جانیں کہ ان لوگوں کے گھریلو حالات کیا تھے اور اپنی بیوی سے ان کا برتاؤ کیسا تھا۔

مولانا آزاد کی شادی زلیخا بیگم سے ہوئی تو وہ بارہ سال کے معصوم لڑکے تھے اور زلیخا بیگم چھ سال کی ننھی منی بچی تھیں۔ ان کے والد آفتاب الدین صاحب بغداد کے ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے ان کا سلسلۂ نسب حضرت صدیق اکبرؓ سے جا کر ملتا تھا۔ آفتاب الدین صاحب مولانا کے والد بزرگوار کے خاص مریدوں میں سے تھے۔ زلیخا بیگم ان کی پانچویں صاحبزادی تھیں۔ ان کے پیدا ہوتے ہی انھوں نے پیر کے قدموں میں لا کر ڈال دیا۔ انھوں نے بہت محبت سے اس حسین پیاری بچی کو گود میں لیا اور زلیخا نام رکھا۔ بعد میں موہنی صورت والی بچی ان کو اتنی اچھی لگی کہ اس کو انھوں نے اپنی بہو بنا لیا۔ چھ سال کی بالی عمر میں زلیخا بیگم بیاہ کر آئیں۔ ان کے ننھے سے دل پر اسی وقت سے

ہی اپنے یوسف جمال شوہر کا فیصلہ ہو گیا اور شباب کی منزل میں قدم رکھتے ہی وہ اس عظیم انسان کی پرستش کرنے لگیں۔ مولانا کے ہر خیال کو انھوں نے سر آنکھوں پر رکھا۔ ہجر کی سختیاں بھی سہیں اور مالی مشکلات بھی برداشت کیں مگر لب پہ کبھی اُف تک نہ لائیں۔ مولانا صاحب کی مالی حالت سیاسی جدوجہد میں حصہ لینے کی وجہ سے کبھی بھی اچھی نہیں رہی۔ اگر ان کو اتنی مہلت ملتی کہ وہ صرف ادبی کام کرتے تو یقیناً دولت کی دیوی ان کے قدموں کو چومتی مگر ان کو ان کا احساس دل مچلا نہ بیٹھنے دیتا تھا۔ انھیں پس ماندہ قوم اور غلام ملک کا غم چین نہ لینے دیتا تھا۔ ان کی شعلہ نفسی اور آتش بیانی قلم و زبان سے دلوں کو گرماتی رہتی۔ اور ان کی رفیقِ حیات نہ اچھا کھاتی نہ اچھا پہنتی۔ ان تمام تکالیف کو محبت اور سکون سے برداشت کرتی جو شوہر کی جسمانی اور مالی پریشانی کی وجہ سے اس پر گذرتیں۔ زلیخا بیگم کا زیادہ وقت یادِ الٰہی اور مولانا کی کامیابی کی دعاؤں میں گذرتا۔ ہر وقت کڑھتے رہنے کے باعث ان کی صحت گر گئی تھی مگر بستی ستونتی اپنی دُھن میں مگن رہی۔ اپنی خرابیٔ صحت کا ذکر کبھی مولانا سے نہیں کیا۔ جس وقت بھی اور جتنے دن بعد بھی وہ گھر آتے یہ پاک طینت بیوی مسکراتی ہوئی ہمہ تن شوق بنی ان کا استقبال کرتی اور ہر طرح شوہر کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتی تاکہ یہ تھکا ہوا دماغ جس کو سیاسی گتھیاں بھی سلجھانی تھیں اور مذہبی و ادبی کام بھی کرنے تھے گھریلو آرام وہ فضا میں آرام پاکر اور زیادہ ہمت و جوش سے کام کر سکے اور مولانا صاحب اسی پیکرِ صبر و ایثار کی بدولت ہر مرتبہ نیا ولولہ اور جوش لے کر جنگِ آزادی کے لئے تیار ہو جاتے۔

وہ فطری طور پر آزاد طبیعت اور والہانہ جذبات کے مالک تھے۔ اس لئے اپنی کم عمری کی شادی سے ایک دوسرے بڑے فنکار غالب کی طرح خوش نہیں تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کو اپنی باوفا محبت کرنے والی بیوی کا خیال نہیں تھا یا ان کی ازدواجی زندگی اچھی نہیں گزری۔ زلیخا بیگم کی وفات کے بعد انھوں نے جو خط صدر یار جنگ کو لکھا ہے اس سے ان کے بے اندازہ غم کا اظہار ہوتا ہے۔

جب ۱۹۴۲ء میں مولانا کو اور تمام لیڈروں کے ساتھ احمد نگر قلعہ میں نظر بند کیا گیا زلیخا بیگم کی طبیعت کافی خراب تھی۔ ان دنوں برٹش گورنمنٹ کا رویہ سخت ہو رہا تھا اور صورتِ حالات بہت تشویش ناک ہو رہی تھی۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ ان لوگوں کو کہاں رکھا گیا ہے۔ تمام ہندوستان میں سیاسی نظر بندوں کے متعلق متضاد افواہیں مشہور ہو رہی تھیں اور یہ بھانت بھانت کی بولیاں ستم رسیدہ فرقت کی ماری بیگم آزاد کے دل پر تیر و نشتر کا کام کرتی تھیں۔ اپنے چہیتے شوہر کے متعلق ہر نئی خبر سن کر وہ تڑپ کر رہ جاتیں۔ اُن کو بس دن رات مولانا کی سلامتی کی دعائیں مانگنے اور رونے کے سوا کچھ یاد نہ رہا تھا۔ دوا انھوں نے بالکل چھوڑ دی تھی۔ غذا بھی برائے نام تھی۔ دق کا نامراد مرض دو سال سے پیچھا کئے ہوئے تھا۔ اب کمزور جسم پر اس نے بالکل تسلط جما لیا۔ ڈاکٹر بی سی رائے اور کلکتہ کے مشہور ڈاکٹروں نے ان کو دیکھا۔ مگر مرض کو افاقہ کیسے ہوتا جب کہ نہ دوا تھی نہ غذا۔ وہ ہر ایک معالج سے یہی کہتی تھیں۔ "بس خدا کے لئے مجھے ایک مرتبہ مولانا کو دکھا دو۔" ان کی حالت دیکھ کر اور التجا سن کر آنکھوں میں آنسو بھرے ہڈا کر چارپائی سے اُٹھتا تھا۔ آخر بقول مولانا صاحب کے ۹۔ اپریل ۱۹۴۳ء کو زہرِ غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا۔ زلیخا بیگم اپنے محبوب شوہر کے دیدار کی حسرت لئے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ جسدِ بے جان تو سپردِ خاک کر دیا گیا اور روح شاید قیدِ جسم سے آزاد ہو کر بھی اپنے یوسف کے گرد پھر رہی ہوگی۔

مولانا صاحب 'غبارِ خاطر' میں نواب صدر یار جنگ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:۔

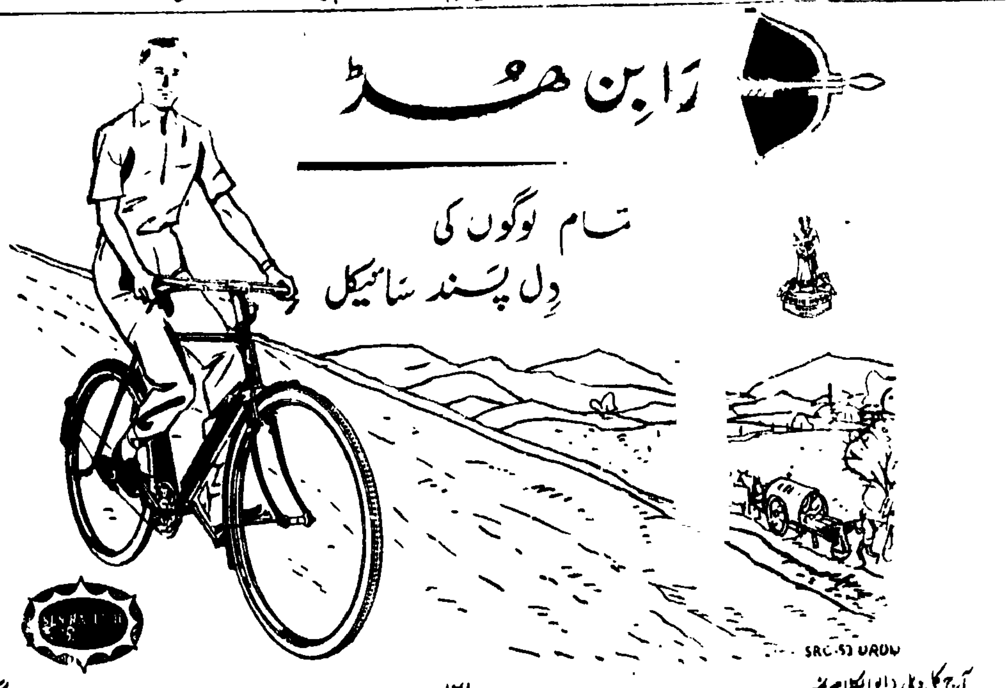
> "گذشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر درپیش ہوئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں۔ میں نے اس درجہ افسردہ اس کو کبھی نہیں دیکھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس پر غالب آ گئی تھی۔ میں نے اس وقت تو ایسا ہی خیال کیا لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اُسے صورتِ حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لئے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس لئے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔"

غم گسار شمعِ صفت بیوی کے بعد مولانا صاحب کی زندگی کے معمولات میں تو بظاہر فرق نہیں آیا لیکن اُن کا دل ہل گیا۔ وجودِ معنوی سراپا درد بن کر رہ گیا۔ اس جانگزا غم کے زیرِ اثر انھوں نے غبارِ خاطر کے ایک خط میں اپنے کو شاخِ بریدہ سے تشبیہ دی ہے جس کو موسمِ بہار کی جانفزا ہوائیں بھی تازگی نہیں بخش سکتیں۔ اپنے غمزدہ دل کو تھام کر بے اختیار فرماتے ہیں:۔

شاخِ بریدہ را نظرے بر بہار نیست

ان کا دلی حزن اس سے واضح ہو جاتا ہے۔ رہا ہونے کے بعد جب وہ اپنی زلیخا کی آخری آرام گاہ پر گئے تو باوجود اس بے انتہا ضبط و تحمل کے جو اُن کی طبیعت کی خاص خصوصیت تھی اپنی چاہنے والی کے مرقد پر آنسوؤں کے موتی نچھاور کئے بغیر نہ رہ سکے۔ دفورِ رقت کو تھامنا ان کے بس میں نہ رہا اور بہت دیر تک وہ سر جھکائے روتے رہے۔ مولانا صاحب کی صحت بیوی کی وفات کے بعد دن بدن خراب ہوتی گئی اور مزاج کی شگفتگی بھی بہت کم ہو گئی۔ وہ بذلہ سنجیاں جو اُن کے مخصوص احباب کی محفلوں کو کشتِ زعفران بنا دیتی تھیں برائے نام رہ گئیں۔ وہ ہر وقت کھوئے کھوئے سے رہنے لگے۔ زلیخا بیگم کی زندگی میں اُن کو غالباً یہ احساس نہ تھا کہ اس باوفا بیوی سے خود اُن کو بھی دلی لگاؤ ہے لیکن مرنے والی کے جانے کے بعد جیسے ان کی زندگی میں کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ اپنی زندگی کی یہ متاعِ عزیز بھی ملک و قوم پر وہ نچھاور کر چکے تھے۔ اسی خدا کی بھری ہوئی دنیا میں ان کے لئے کاموں اور مرحومہ کی یاد کے علاوہ کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اللہ تعالےٰ نے جیسے اور بہت سی نوازشوں سے مولانا آزاد کو نوازا تھا وہاں ایسی باوفا نیک طینت پاکیزہ صورت بیوی بھی عطا فرمائی تھی۔ زلیخا بیگم کی ذات پر عالمِ نسواں جتنا فخر کرے بجا ہے۔ جس نے حسن و جمال کی آغوش میں آنکھ کھولی۔ میرا یہ کہنا کُلّی نہیں حقیقت ہے۔ میری مرحومہ ماں حسن کی مورت تھیں اور بھی حسین و جمیل خواتین کو دیکھا لیکن جیسی معصومیت اور تقدس بیگم آزاد کی صورت پر میں نے دیکھا ایسا پھر کبھی کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ اس دنیائے آب و گِل کی رہنے والی ہستی نہیں آسمانی مخلوق معلوم ہوتی تھیں۔ ان کی پاکیزگی خیال کا یہ عالم تھا کہ کبھی ٹیلیفون کا ریسیور اس لئے نہیں اُٹھاتی تھیں کہ نہ جانے دوسری طرف کون اور کیسا آدمی بات کر رہا ہوگا۔ اس زمانے میں ایسی عفت مآب خواتین کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔

۱۹۴۷ء کے بعد میں اکثر مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتی رہتی تھی۔ جب بھی میں حاضر ہوتی وہ مجھ پر شفقت فرماتے۔ ایک مرتبہ دورانِ گفتگو میں مرحومہ کا ذکر میں نے کیا۔ مولانا صاحب ایکدم اس طرح خاموش ہو گئے گویا اس ذکر نے ان کے دل پر نشتر لگا دیا۔ وہ بہت دیر سرنگوں خاموش بیٹھے رہے۔ میں بھی دم بخود پشیمان سی بیٹھی ان کے اس جانکاہ غم کا اندازہ کر رہی تھی ...... آخر یہ مفارقت کا طویل زمانہ ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کی آدھی رات کو ختم ہو گیا اور مولانا صاحب کی مقدس روح اپنی زلیخا کی تلاش میں عالمِ جاوداں کو سدھار گئی۔



غلام احمد فرقت کاکوروی

نگارشاتِ آزاد میں طنز و مزاح

ابتدائے آفرینش سے اب تک شاید ہی کوئی ہستی ایسی گزری ہو جس کی زندگی میں وہ لطیف اور پُر مسرت لمحات نہ آئے ہوں جن میں انسان کا ہنسنے ہنسانے کو دل چاہتا ہے اور وہ دوسروں سے چھین کر کے اپنے لئے لطف و مسرت کا سرمایہ فراہم کرتا ہے اس میں ثقہ اور غیر ثقہ، مہذب اور غیر مہذب، سنجیدہ اور غیر سنجیدہ کی تخصیص نہیں ہوتی۔

این سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بہت سے لوگ جو بظاہر بے حد سنجیدہ، مذہبی، خاموش اور اپنے آپ کو بہت ہی لئے دئے نظر آتے ہیں۔ ان میں بھی بعض بعض اپنی نجی زندگی میں بے حد شوخ اور بذلہ سنج ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی خلوت و جلوت میں بڑا بُعد ہوتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار بھی انھیں بزرگوں میں سے تھا جو بظاہر خاموش اور بہ باطن ایک باغ و بہار قسم کے انسان تھے۔ چنانچہ جن لوگوں سے مولانا کی بے تکلفی تھی اُن کا کہنا ہے کہ وہ اپنی نجی زندگی میں نہ صرف بے حد شوخ، ہنس مکھ اور بذلہ سنج ہی تھے، بلکہ ضلع جگت اور رعایتِ لفظی یا فقرے چست کرنے میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ ان کی فقرے بازی کا اندازہ ان کی مندرجہ ذیل رائے سے ہوتا ہے جو انھوں نے ایک مرتبہ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا شوکت علی مرحوم کے بارے میں قائم کی تھی:

" ملک میں کسی تحریک کو مہینوں کے بجائے ہفتوں میں پھیلانا ہو تو مولانا ظفر علی خاں اور شوکت علی کو چھوڑ دو۔ وہ بہ سرعت یہ قلعہ بنا ڈالیں گے۔ لیکن جب یہ قلعہ بن جائے تو ان کو فوراً باہر کر دو کیونکہ وہ پھر اُسی قلعہ کو ڈھا دیں گے۔"

اُردو زبان اگرچہ دنیا کی دوسری مشہور زبانوں کے مقابلے میں ایک نو عمر اور نوخیز زبان کی حیثیت رکھتی ہے اور اس میں طنز و مزاح کا سرمایہ بھی دنیا کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں کم ہے مگر اس مختصر سے سرمایہ میں بھی وہ چمک دمک اور وہ پختگی ہے کہ پڑھنے والا اس کی عمر میں شک کرنے لگتا ہے۔ اور ایک دوسری خصوصیت اس زبان کے بعض لکھنے والوں کی یہ ہے کہ متانت اور ظرافت دونوں میدانوں میں ایک جیسے رستم اور مرد مجاہد کا درجہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں تھا جو اگر دنیا کی دوسری زبانوں کے ممتاز طنز نگاروں میں کھڑے کر دئے جائیں تو بہتوں کی نگاہیں ان پر جم کر رہ جائیں گی۔ اور ہم ان کے طنز کو پورے اعتماد کے ساتھ دنیا کی بڑی زبانوں کے انشاپردازوں کی نگارشات کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں اُن کی تحریر میں ایک ایسی انفرادیت پائی جاتی ہے جو اردو کے کسی طنز نگار اور انشاپرداز کے یہاں نہیں ملتی اور یہ واقعہ ہے کہ جس طرح وہ اپنی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں ایک جداگانہ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے اُسی طرح ان کا طرزِ تحریر بھی تمام ادیبوں اور طنز نگاروں سے الگ تھلگ تھا۔ ان کے سوچنے کا انداز، اُن کی زبان، اُن کے لہجے، ان کی عبارت اور الفاظ کی نشست و برخاست سب میں ایک انوکھا پن ہے۔ جب وہ نثر لکھتے لکھتے آخر میں کوئی شعر لکھ دیتے ہیں تو پوری عبارت میں ایک ترنم اور موسیقی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور پوری نثر اس طرح جگمگا اُٹھتی ہے کہ نثر پر نظم کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں ایک برجستگی اور بے ساختہ پن ہے۔ 'غبارِ خاطر' میں ایک جگہ جب وہ ہندوستانی اور چینی چائے پر لوگوں کو رد و قدح کرتے دیکھتے ہیں تو اپنے ایک خط میں نہایت شوخی اور بذلہ سنجی کے ساتھ لکھتے ہیں:-

" دراصل یہ عالمگیر غلط فہمی اس طرح پیدا ہوئی کہ انیسویں صدی کے اوائل میں جب چائے کی مانگ ہر طرف بڑھ رہی تھی، ہندوستان کے بعض انگریز کاشتکاروں کو خیال ہوا کہ سیلون اور ہندوستان کے بلند اور مرطوب مقامات میں چائے کی کاشت کا تجربہ کریں۔ انھوں نے چین سے چائے کے پودے منگوائے اور یہاں کاشت شروع کی۔ یہاں کی مٹی نے چائے پیدا کرنے سے انکار کر دیا مگر تقریباً اسی شکل و صورت کی ایک دوسری چیز پیدا کر دی۔ ان زیاں کاروں نے اسی کا نام چائے رکھ دیا اور اس غرض سے کہ اصلی چائے سے ممتاز رہے اُسے کالی چائے کے نام سے پکارنے لگے۔

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

دنیا جو اس جستجو میں تھی کہ کسی نہ کسی طرح یہ جنس کامیاب ارزاں ہو بے سمجھے بوجھے اس پر ٹوٹ پڑی اور پھر تو گویا پوری نوعِ انسانی نے اس فریب خوردگی پر اجماع کر لیا اب آپ سر پیٹیے سنتا کون ہے۔

اُسی کی سی کہنے لگے اہلِ محشر
کہیں پُرسشِ دادخواہاں نہیں "

مولانا کی بلند ترین مزاح نگاری اور بذلہ سنجی کی مثال ان کے ۱۷ اور ۱۸۔ مارچ ۱۹۴۳ء کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کو لکھے ہیں۔ ان میں چڑیوں کے تدارک کا ذکر کرتے کرتے لکھتے ہیں :۔

" چند دنوں تک تو میں نے صبر کیا لیکن پھر برداشت نے صاف جواب دے دیا اور فیصلہ کرنا پڑا کہ اب لڑائی کے بغیر چارہ نہیں

من و گرز و میدان و افراسیاب

یہاں میرے سامان میں ایک چھتری بھی آ گئی ہے۔ میں نے اٹھائی اور اعلانِ جنگ کر دیا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد معلوم ہو گیا کہ اس کوتاہ دستی کے ساتھ ان حریفانِ سقف و محراب کا مقابلہ ممکن نہیں حیران ہو کر کبھی چھتری کی نارسائی دیکھتا کبھی حریفوں کی بلند آشیانی بے اختیار حافظ کا شعر یاد آ گیا ؎

خیالِ قدِ بلندِ تو می کند دلِ من
تو دستِ کوتہِ من بین و آستینِ دراز

اب کسی دوسرے ہتھیار کی تلاش ہوئی برآمدہ میں جالا صاف کرنے کا بانس پڑا تھا دوڑتا ہوا گیا اور اسے اٹھا لایا۔ اب کچھ نہ پوچھیے کہ میدانِ کارزار میں کس زور کا رن پڑا۔ کمرے میں چاروں طرف حریف طواف کر رہا تھا اور میں بانس اٹھائے دیوانہ وار اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا فردوسی اور نظامی کے رجز بے اختیار زبان سے نکل رہے تھے ؎

بہ خنجر زمیں را میستاں کنم
بہ نیزہ ہوا را نیستاں کنم

آخر میدان اپنے ہی ہاتھ رہا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد کمرہ ان حریفانِ سقف و محراب سے بالکل صاف تھا ؎

بیک تاختن تا بجے تاختم
چہ گردن کشاں را سر انداختم "

یہ واقعہ ہے کہ جس طرح مولانا کا ایک مخصوص اندازِ بیان ہے اُسی طرح ان کے موضوعات بھی مخصوص ہیں۔ ہر موضوع ان کے اندازِ تحریر کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ان کی خطابت، ان کی تقریر کا انداز اور اپنے ما فی الضمیر ادا کرنے کا لب و لہجہ دوسرے لکھنے والوں سے بالکل ہی مختلف ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ ان کے سوچنے کا انداز بھی سب سے جداگانہ ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اردو مزاح میں ایک چیز رعایتِ لفظی ہوتی ہے جس سے بعض مشاق مزاح نگار بڑا ہی لطف پیدا کر دیتے ہیں اور پڑھنے والا نہ صرف ایک خاص قسم کی گدگدی محسوس کرتا ہے بلکہ مسکرا مسکرا کر زبان کے چٹخارے بھی لیتا رہتا ہے۔ مولانا جہاں رعایتِ لفظی سے مزاح پیدا کرتے ہیں وہاں بھی وہ اس فن کے ماہر نظر آتے ہیں۔ احمد نگر میں ایک مرتبہ باورچی کی دقت پیش آئی۔ قیدیوں میں کوئی باورچی نہ تھا۔ چیتہ خاں (سپرنٹنڈنٹ جیل، یہ نام مولانا کا رکھا ہوا تھا) اس سلسلے میں بڑی مستعدی اور سرگرمی دکھاتا۔ چناں چہ ایک باورچی کا شہر کے کلکٹر نے انتظام کر دیا۔ دوسرے روز جب وہ اُس قلعے میں لایا گیا تو اس کا حلیہ اور اس کی تصویر مولانا کے قلم سے ملاحظہ ہو :

" دوسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ واقعی ایک جیتا جاگتا آدمی اندر لایا گیا ہے۔ معلوم ہوا طباخ (باورچی) موعود یہی ہے ؎

آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید

مگر نہیں معلوم اس غریب پر کیا بیتی تھی کہ آنے کو تو آ گیا تھا لیکن کچھ

ایسا کھویا ہوا اور سراسیمہ حال تھا جیسے مصیبتوں کا پہاڑ سر پر ٹوٹ پڑا ہو۔ وہ کھانا کیا پکاتا اپنے ہوش و حواس کا مسالہ کوٹنے لگا۔"

ایک مصیبت اس بدنصیب باورچی کے ساتھ یہ بھی تھی کہ اُسے قلعہ سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ چنانچہ حکومت کے لئے بڑی پریشانی یہ تھی کہ اس باورچی کو رکھا کہاں جائے۔ اس مقام پر مولانا نے رعایت لفظی سے جو مزاح پیدا کیا ہے اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

"ستے کلکٹر کے یارانِ طریقت کی عقلمندی دیکھئے پہلے دقوفی کہ اُسے پہلا ضِپسلا کر یہاں کے مقامی قید خانے میں بھیج دیا۔ کیونکہ اُن کے خیال میں قلعہ کے علاوہ اگر کوئی اور محفوظ جگہ یہاں ہو سکتی تھی تو وہ قید خانے کی کوٹھڑی ہی تھی۔ قید خانے میں جو اُسے رات دن قید و بند کے تسمے پر سینکا گیا تو بےچارہ تلنے کی ساری ترکیبیں بھول گیا۔ اُس احمق کو کیا معلوم تھا کہ ساٹھ روپے کے عشق میں یہ پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ اس ابتدائے عشق ہی نے کوم نکال دیا تھا۔ قلعہ تک پہنچتے پہنچتے قلیہ بھی تیار ہو گیا

کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا"

مولانا کے طنز میں ایک سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں اخلاص، سچائی اور صداقت کی بجلیاں کوندتی ہیں۔ ان کا طنز ہنگامی نہیں بلکہ دوامی اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ عموماً طنز کے حربے کو ہنگامی حالات میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر مولانا کا طنز اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ مولانا کے مخصوص موضوعات سیاسی اور سماجی دونوں قسم کی اصلاح کے لئے ہوتے ہیں۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں پہلے اُسے خود محسوس کرتے ہیں اور جب پورے طور پر اُس جذبے کی اپنے دل میں پرورش کر لیتے ہیں تب اس کی اپنے الفاظ اور اپنے قلم کی تلوار سے کانٹ چھانٹ کرتے ہیں۔ ان کی انشا پردازی الفاظ کا گھروندا نہیں ہوتی۔ وہ ایک سیلاب، ایک طوفانِ بلاخیز کا دھارا اور ایک شمشیرِ آبدار ہے جس پر سنجیدگی اور متانت کی نفیس صیقل بھی ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ان کی مثال ایک پہلوان سے دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"ابوالکلام کی مثال اُس پہلوان کی ہے جو وسطِ میدانِ جنگ میں مبارز طلب ہو اور مد مقابل کا نہیں بلکہ اپنے رجز سے خود اپنا دل بڑھا رہا ہو۔"

جیل میں ڈاکٹر محمود کا ایک دلچسپ مشغلہ یہ تھا کہ وہ طشتری میں دانہ لئے پرندوں کو آ آ کر کے بلاتے مگر اُن آہوانِ ہوائی میں اتنی سمجھ کہاں جو وہ ڈاکٹر صاحب کی طرف توجہ بھی کرتے۔ سید محمود اپنی اس ناکامی پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں۔ مولانا اُن سے کچھ پوچھتے ہیں۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر سید محمود کہنے لگے۔

"سید محمود کہنے لگے۔ عجیب معاملہ ہے۔ دانہ دکھا دکھا کر جتنا پاس جاتا ہوں اُتنی ہی تیزی سے بھاگنے لگتی ہیں گویا دانے کی پیش کش بھی ایک جرم ہوئی

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں وہ کھنچتا جائے ہے مجھ سے

میں نے کہا طلب و نیاز کی راہ میں قدم اُٹھایا ہے تو عشوہ و ناز کے تغافل کیشوں کے لئے صبر و شکیب پیدا کیجئے۔ نیازِ عشق کے دعوؤں کے ساتھ نازِ حُسن کی گلہ مندیاں زیب نہیں دیتیں۔" ....

جب ڈاکٹر سید محمود میناؤں کو دانہ دکھانے پر بھی اپنی طرف ملتفت نہیں کر سکے تو مولانا لکھتے ہیں:-

"شہرستانِ ہوا کے دریوزہ گرانِ ہرجائی یعنی کوؤں نے ہر طرف سے ہجوم شروع کر دیا ہے۔ میں نے کوؤں کو دریوزہ گرانِ ہرجائی اس لئے کہا کہ کبھی اُنھیں مہمانوں کی طرح کہیں جاتے دیکھا نہیں ہمیشہ دانے پر پہنچے صدائیں لگائیں اور چل دئے۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے"

جب ڈاکٹر سید محمود کو رفتہ رفتہ اپنے مقصد میں کامیابی ہونے لگی اور بجائے میناؤں کے دوسرے پرندے اور جانور اُن کی طرف متوجہ ہونے لگے تو مولانا اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:-

"صحن کے شمالی کنارے میں نیم کا تناور درخت ہے اُس پر گلہریوں کے جھنڈ کودتے ہیں۔ انھوں نے جو دیکھا کہ

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

تو فوراً لبیک اور مرحمت عالی زیادہ کہتے ہوئے اس دسترخوانِ کرم پر ٹوٹ پڑیں

یاراں صلائے عام است گر می کنید کارے

پھر فوراً گردنیں اُٹھالیتیں اُٹکڑا چباتی جاتیں اور سر ہلا ہلا کر کچھ اشارے

بھی کرنی جاتیں۔ گویا محمود صاحب کو دادِ ضیافت دیتے ہوئے بطریقِ حسنِ طلب یہ بھی کہتی جاتی ہیں کہ۔

گرچہ خوب است ولیکن قدرے بہتر ازیں!

ڈاکٹر سید محمود کی سخاوت سے متاثر ہو کر جب قلعۂ احمد نگر پر کوؤں کی یورش شروع ہو گئی تو اُن سے کہا گیا کہ حضرت اگر ممکن ہو تو فیضِ عام کا یہ لنگر خانہ کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دیجئے۔ اس پر مولانا اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:۔

" ابھی سید محمود صاحب اس درخواست پر غور ہی کر رہے تھے کہ ایک دوسرا واقعہ ظہور میں آ گیا۔ ایک دن صبح کیا دیکھتے ہیں کہ چھت کی منڈیر پر دو معمّر و مشیخت مآب گدھ بھی تشریف لے آئے ہیں۔

پیری سے کمر میں اک ذرا خم تو قیر کی صورتِ مجسم

اور گردنیں اٹھائے صلائے سفرہ کے منتظر ہیں،

اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی "

پھر جب وہ لنگر خانہ بند کر دیا گیا تو اس کے بند ہونے پر مولانا لکھتے ہیں:۔

" اُن کی تشریف آوری ہمارے لئے تو بڑی ہی بابرکت ثابت ہوئی کیونکہ ادھر تو ان کا مبارک قدم آیا اُدھر محمود صاحب نے ہمیشہ کے لئے اپنا سفرۂ کرم لپیٹنا شروع کر دیا۔ ایک لحاظ سے معاملہ پر یوں بھی نظر ڈالی جا سکتی ہے کہ ان کی آمد کی آبادی میں اس ہنگامۂ ضیافت کی ویرانی پوشیدہ تھی۔ دیکھئے کیا موقع سے مومن خاں کا قصیدہ یاد آ گیا

شیخ جی آپ کے آتے ہی ہُوا دیر خراب

قصدِ کعبہ کا نہ کیجے گا بہ ایں یمنِ قدوم "

اب تک مولانا کے طنز و مزاح کے جو نمونے پیش کئے گئے وہ صرف ان کی کتاب 'غبارِ خاطر' سے تھے جن میں ان کے اُنتیس مکاتیب مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کے نام ہیں۔ ان خطوط کے علاوہ بھی ان کے اخبار 'الہلال' میں حدیث الغاشیہ کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین شائع ہوا تھا جس میں اُن لوگوں پر طنز ہے جو ایک دن قبل تک مجوزہ یونیورسٹی کے متعلق حکومت کی شرائط قبول کرنے کے بدترین مخالف تھے مگر رات کو لفٹیننٹ گورنر کے یہاں کھانا کھانے کے بعد انھوں نے اپنی رائیں بدل دیں۔ مگر اس طرح کا طنز صرف ان کے دو ہی تین مضامین میں ملتا ہے۔

" سنتے ہیں خبر اڑی کہ (ہز آنر) کے ہاں (ڈنر) ہے۔ ہم نے کہا کہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ قومی طاقت کے ہزاروں آہنی حربے ایک طرف اور اُن نقرئی چھری کانٹوں کی جھنکار ایک طرف۔ حریت پسندوں سے پوچھا کیجئے اس ناوک کا بھی کوئی جواب آپ کے ترکش میں ہے جواب ملا کہ نہیں شکست کا اعتراف ہے۔

چشم اگر اینست وابرو ایں وناز وعشوہ ایں

الفراق اے ہوش وتقویٰ الوداع اے عقل ودیں

لیکن پھر ہم نے دل کو تسلی دی۔ اطبائے قدیم وجدید کو اتفاق ہے کہ چھ گھنٹے کے بعد غذا کے جرم سے معدہ خالی ہو جاتا ہے جلسات کو نہیں بلکہ صبح ہی سے اور انگریزی کھانا بوجہ سادہ و بے آمیز ہونے کے قدرتی طور پر زود ہضم ہوتا ہے۔ اب ایسی بھی یہ غذائے نفیس کیا ثقیل ہو گی کہ صبح تک معدے میں فروکش رہے اور آوازیں نکلیں تو حلق کی جگہ معدے سے۔ مگر افسوس کہ دوسرے روز ہمارے طبی معلومات میں ایک انقلابِ عظیم واقع ہوا۔ طبی کانفرنس کے آئندہ اجلاس میں ہم اس مسئلہ کو پیش کریں گے۔ ہمیں اب یقین ہے کہ غذا جتنی نفیس و لطیف ہوتی ہے اتنی زیادہ ثقیل بھی ہوتی ہے نیز اگر بقراط بھی کہیں ملیں تو ہم ان سے اس بارے میں لڑنے کے لئے تیار ہیں کہ شام کی غذا کم از کم دوسرے دن کی دوپہر تک تو ضرور معدے میں موجود رہتی ہے۔

دل از من، دیدہ از من، آستیں از من، کنار از من

لیکن یہ جو کچھ ہُوا اس پر محض ایک سرسری نظر ڈال کر نہیں گزرنا چاہیئے آج کل ہماری نظریں (بحر مارمورہ) اور (دردانیال) کے جنگی طوفانوں کی طرف لگی ہوئی ہیں اور جی نہیں چاہتا کہ اور کسی طرف دیکھیں۔ تاہم ہم ناظرین سے کہیں گے وہ ان چند ہلکی لہروں سے بھی اغماض نہ کریں جو ۲۶۔ دسمبر کو (گومتی) کی ساکن خاموش سطح میں اٹھی تھیں۔ عجب نہیں کہ کسی وقت یہی گومتی کی لہریں قلزم کے طوفانوں کا کام دیں۔ فی الحقیقت ان جلسوں میں صاحبانِ عقل و فکر کے لئے بہت سی عبرتیں تھیں جن کو ایک ایک کر کے یاد کرنا چاہیئے کیونکہ وہ مسلمانانِ ہند کے اس تغیرِ افکار و اعمال کی پہلی منزل تھیں جن سے اس تغیر کا مستقبل وابستہ ہے اور جس کی طرف ہم نے پچھلے دنوں "صبح امید" کے عنوان سے دو افتتاحیہ مضمون لکھ کر توجہ دلائی تھی اور ہم چاہتے ہیں کہ اسے تفصیل سے لکھیں۔"

یہ تھا مولانا ابوالکلام آزاد کا طنز و مزاح اور اندازِ بیان جس پر اردو ادب بجا طور پر فخر کر سکتا ہے +

فرمودات آزادؒ

دُنیا میں حق و صداقت کی آواز کبھی بھی تاج و تخت اور ایوان و محل کے اندر سے نہیں اُٹھتی ہے بلکہ ہمیشہ اس کا سرچشمہ ویران جنگلوں، پھونس کے جھونپڑوں اور پہاڑوں کے اندر رہا ہے۔ اور یہ بھی اس شاہد عجائب پسند کا عجیب و غریب کرشمہ ہے کہ ہمیشہ شکستگی اور افتادگی ہی کو محبوب رکھتا ہے۔ اپنا گھر بھی بناتا ہے تو ٹوٹے ہوئے اور زخمی دلوں کو، اپنی آواز بھی سناتا ہے تو کانٹے پڑے ہوئے خشک حلقوں سے، اپنی نگاہوں کا جلوہ بھی دکھاتا ہے تو گردنوں کی خوں چکانی اور تڑپتی ہوئی لاشوں کے اضطراب میں، اور پھر اپنے حسن و جمال کا جلوہ گاہ بھی بنائے گا تو تاریک غاروں میں شکستہ دیواروں اور پھٹی ہوئی چٹائیوں کو، پھر اگر وہ نہیں ہے تو کون ہے جس کا ہاتھ گلیم فقر و مسکینی سے اٹھتا ہے اور بادشاہوں کے تخت و تاج کو اُلٹ دیتا ہے یا کس کی تماشا آرائی ہے کہ چند بے نوا فقیروں کو کھڑا کر دیتا ہے، اور وہ دنیا کی بڑی بڑی قوتوں کے تسلط سے نکال کر لاکھوں دلوں کو اپنے آگے سربسجود کرا لیتے ہیں۔

•

قومی حیات کا محل اس طرح تعمیر نہیں ہو سکتا کہ پہلے دیواریں کھڑی ہو جائیں پھر اس کی محرابیں اور اطراف و جوانب بھی طیار ہو جائیں گے۔ کشاکش حیات و ممات اور تسابق اقوام کی کشمکش میں فرصت و مہلت کا سکون بغیر خواب ممات کے ممکن نہیں۔ یہاں تو ہر دم اور ہر لمحہ کام کئے جائیے اور ایک ہی وقت میں اس عمارت کے ہر حصے کی خبر لیجئے۔ یہ نہ ہو کہ دروازہ بن رہا ہے مگر پشت کی طیار کردہ دیواریں گر رہی ہیں۔ اس عالم میں جو کھو گیا وہ پھر نہیں ملتا اور جو وقت غفلت میں کٹا پھر اس کی تلافی کی مہلت نہیں دی جاتی۔

ہاں رہِ عشق ست و کج گشتن ندارد باز گشت　　　جرم را ایں جا عقوبت ہست و استغفار نیست!

•

اس عالم اثر و تاثر میں ہر چیز کی طرح ہر فعل بھی ایک قدرتی طبیعت اور مزاج رکھتا ہے۔ تخریب کے مزاج میں شورش اور ہولناکی ہے اور تعمیر سرتا سر سکون اور خاموشی ہے۔ تعمیر جمع و نظم و ترتیب اور ایجاب ہے۔ تخریب تفرقہ و برہمی، اضطراب اور سلب و نفی ہے۔ جمع و نظم کی حالت ہی سکون ہے۔ اور تفرقہ و برہمی کی حالت ہی شورش و اضطراب کی حالت ہے۔ دیوار جب بنتی ہے تو کوئی ہولناکی محسوس نہیں ہوتی لیکن اس کے گرنے میں دھماکا ہوتا ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر تخریب کا عمل تعمیر سے زیادہ نمایاں اور پُر شور ہے۔ تخریب کی ہیبت فوراً ڈرا دیتی ہے لیکن تعمیر کی دلآویزی آہستہ آہستہ نمایاں ہوتی ہے۔ تخریب کا دھماکا دور سے بھی سن لیا جا سکتا ہے لیکن تعمیر کا خاموش عمل دیکھنے کے لئے نزدیک آنے کی ضرورت ہے

•

دہقان ایک بیج اُٹھاتا ہے اور زمین کے حوالے کر دیتا ہے۔ اب دیکھو کہ اس ایک بیج کے بار آور ہونے کے لئے قدرتِ الٰہی نے کس طرح اپنا کارخانۂ ہستی مہیا کر دیا ہے۔ سورج منتظر ہے کہ اپنی گرمی اس کے لئے وقف کر دے، بادل تیار ہیں کہ اپنے ذخیروں کا منہ کھول دیں، زمین مستعد ہے کہ اپنی آغوش اس کے لئے وا کر دے۔ لیکن اس تمام کارخانۂ بخشش سے وہ جبھی فائدہ اُٹھا سکتا ہے جبکہ خود اس کے اندر کی استعداد صحیح و صالح ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ تمام کارخانۂ بخشش و نوال اس کے لئے بے کار ہو گا۔ سورج اپنا دہکتا ہوا تنور رکھنے پر بھی اُسے گرم نہ کر سکے گا۔ بادل اگر اپنا تمام ذخیرۂ آب ختم کر ڈالے جب بھی اُسے زندگی کی رطوبت کا ایک قطرہ نہیں ملے گا۔

•

آج کل دہلی (ابو الکلام نمبر)　　　اگست ۱۹۵۸ء



ہماری کتابیں

نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
دیس دیس کی لوک کہانیاں	۷۵ نئے پیسے	۲۵ نئے پیسے
بھارت کی لوک کہانیاں	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
کیلنڈر کی اصلاح	۲۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی	۷۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
ہمارے نئے سکے	۲۵ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
جواہرلال نہرو کی تقریریں (۱)(۲)(۳)(۴)(۵)(۶)	۱۰ نئے پیسے (فی کاپی)	۸ نئے پیسے (فی کاپی)

[illegible] پیشگی روپیہ یا اس سے زیادہ کی [illegible] کتابوں پر ڈاک خرچ نہیں لیا جائیگا

قیمت پیشگی اور پوسٹل آرڈر کے ذریعے بھیجنے سے آسانی رہتی ہے

پبلیکیشنز ڈویژن [illegible]

Edited and Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi

Regd. No. D—509





آج کل

اہلِ نظر کی نظر میں

"آج کل" آج کل خوب نکل رہا ہے۔ خصوصاً موسیقی نمبر تو ایسا نکلا کہ باید و شاید۔ کا کوئی ادبی رسالہ اب تک ایسا نمبر پیش نہیں کر سکا، کیا باعتبارِ فن اور کیا بلحاظِ تاریخ فن۔ یہ ترتیب کا کمال ہے۔ خدا آپ لوگوں کا حامی ہو۔ آپ حقیقت میں زبانِ اردو کے محسن ہیں۔
(عبدالمجید سالک)

"آج کل" ان رسالوں میں ہے جو ہر طبقے کے پڑھنے والوں کے لئے کچھ نہ کچھ دلچسپی کا سامان ضرور مہیا کرتے ہیں۔ رسالے کی ادبی حیثیت بہت اچھی ہے۔ اس کے مقالے اور نظمیں بیشتر معیاری ہوتی ہیں۔ ظاہری حسن یعنی کاغذ چھپائی اور تصویروں کے اعتبار سے کوئی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ (مسعود حسن رضوی)

"آج کل" کا موسیقی نمبر دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ اس فن پر خصوصی نمبر نکالنا آسان بات نہ تھی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو جمع و ترتیبِ مضامین میں کن کن صبر آزما منزلوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ آپ کے ذوق و انتخاب دونوں کی داد دیتا ہوں۔
(نیاز فتحپوری)

میں "آج کل" کو ہمیشہ بہت دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ اس میں اکثر قابلِ قدر مضامین اور نظمیں شائع ہوتی ہیں علاوہ معنوی خوبیوں کے یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بحیثیتِ مجموعی اس کی لکھائی اور چھپائی وغیرہ بھی خوش مذاقی کا ثبوت دیتی ہیں۔ ہمارے بہت سے رسالے تو اس ظاہری حسن سے بھی عاری ہیں۔ (غلام السیدین)

رسالہ "آج کل" علمی، لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔ (فراق گورکھپوری)

"آج کل" کا بجا طور پر اردو کے بہترین رسالوں میں شمار ہے۔ اس کے بیشتر مضامینِ نثر پُر مغز اور دلچسپ معلومات سے لبریز ہوتے ہیں۔ گھناؤنے بیہودہ افسانوں سے اس کا دامن پاک رہتا ہے۔ نظم کے حصے میں بھی ایک امتیازی شان ہوتی ہے۔
(اثر لکھنوی)

"آج کل" اردو کے ان چند مقبول رسالوں میں سے ہے جو ہر ادبی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے عام نمبروں میں علاوہ معلوماتِ عامہ پر مفید مضامین کے ادبی تنقیدیں اور تذکرے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں اور اس میں بلند پایہ نظموں اور پُر کیف غزلوں کا بھی ایک گلدستہ ہوتا ہے۔ (آلِ احمد سرور)

"آج کل" کے لئے میں نے لوگوں کو بے تاب اور منتظر پایا ہے۔ اچھے ادبی اور تنقیدی مضامین تو اس میں شائع ہوتے ہی رہتے ہیں، اکثر ایسے علمی، تہذیبی، فنی اور معلوماتی مضامین بھی نکلتے ہیں جو دوسرے رسائل میں نظر نہیں آتے۔ اس کا یہ تنوع ہی اسے ہر دل عزیز بناتا ہے۔ (احتشام حسین)

فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے	بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی	سالانہ چھ روپے

ترتیب

سرورق ـــ یہ خموشی پیش خیمہ ہے کسی طوفان کا

ستمبر ۱۹۵۸ء

بھادوں، اسوج شک سمت ۱۸۸۰

جلد ۱۷ نمبر ۲

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

سالانہ چندہ :۔
ہندوستان میں :۔ چھ روپے
پاکستان میں :۔ چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے :۔ ۹ شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ :۔
ہندوستان میں۔ ۵۰ نئے پیسے
پاکستان میں۔ آٹھ آنے (پاک)

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل اردو اولڈ سیکریٹریٹ دہلی

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

مُلاحظات

مشرقِ وسطیٰ میں حالات اس قدر تیزی سے تبدیل ہوئے کہ کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ لبنان اور شرقِ اردن میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کی اہمیت اتنی نہیں تھی کہ سیاستِ عالم پر اس کا کوئی گہرا اثر ہو، اتنے میں عراق میں شاہ فیصل، ان کے چچا اور وزیرِ اعظم کو قتل کر دیا گیا۔ ایک جمہوری حکومت قائم کر دی گئی۔ برطانیہ کے ہاتھوں میں کھیلنے والی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اب دنیا کے بیشتر ممالک نئی حکومت کو تسلیم بھی کر چکے ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ اس صورتِ حالات سے غافل نہیں رہ سکتے تھے انھیں مشرقِ وسطیٰ میں اپنے اقتدار کو سخت خطرہ محسوس ہوا۔ چناں چہ انھوں نے لبنان اور شرقِ اردن میں اپنی فوجیں اُتار دیں۔ روس کے وزیرِ اعظم خروشچیف نے اعلان کیا کہ مغربی طاقتوں کا یہ اقدام ایک عالم گیر جنگ کا پیش خیمہ ہے۔ یو۔ این۔ صالح مزاج سیاست دانوں نے اس اقدام کو چھوٹی طاقتوں کے لیے خطرہ اور متعلقہ ممالک کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی قرار دیا۔ اقوامِ متحدہ کی سیفٹی کونسل میں یہ مسئلہ پیش ہوا۔ اب تجویزوں پر تجویزیں ہیں کہ 'چوٹی کانفرنس' کی جائے۔ روس کا تقاضا ہے کہ ہندوستان کو اس میں بلایا جائے۔ امریکہ کا خیال ہے کہ ہندوستان کو دعوت دینا قرینِ مصلحت نہیں۔ فرانس کا تقاضا ہے کہ یہ کانفرنس اقوامِ متحدہ کے دائرۂ اختیار و اثر سے باہر ہونی چاہیئے۔ اب ہوتا کیا ہے اسے تو مستقبل ہی بتائے گا لیکن یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ جو ملک دوسروں کے ہاتھ میں کھیلتے رہتے ہیں ان کے عوام آخرکار ایسا اقدام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جس سے ملک آزادی کی فضا میں سانس لے سکے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ اپنے مفاد کی خاطر بڑی طاقتیں چھوٹی طاقتوں کو غیر معیّن مدّت کے لیے دبائے رکھیں۔ گفت و شنید اور صلح و صفائی سے بڑے بڑے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ کسی ملک میں اندرونی انقلاب آئے تو اپنی فوجوں کو نقل و حرکت دے کر اشتعال انگیز صورتِ حالات پیدا کرنا عقل مندی نہیں۔ تا دمِ تحریر حالات ایسے ہیں کہ جنگ کا فوری خطرہ نہیں۔ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کا ہنگامی اجلاس اس مسئلے پر غور کر رہا ہے۔ ہمیں امید کرنا چاہیئے کہ حالات بہتر صورت اختیار کریں گے۔

حکومتِ ہند نے صوبائی حکومتوں کو لکھا تھا کہ اردو سے ہمدردانہ سلوک کیا جائے اور اس کا جو جائز حق ہے وہ اسے ملنا چاہیئے۔ یہ ایک صالح اقدام تھا۔ لوگوں نے اسے پسند کیا اور حکومتِ ہند کی سوجھ بوجھ کو سراہا۔ اس کے بعد بہت سے بیانات شائع ہوئے۔ حکومتِ ہند کی وزارتِ داخلہ کا بیان خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس میں تفصیل سے بتایا گیا تھا کہ اردو کو ہندوستان میں دوسری زبانوں کے ساتھ برابر کا درجہ حاصل ہے۔ اُتر پردیش کے وزیرِ اعلیٰ ڈاکٹر سمپورنانند نے حال ہی میں ایک بیان دے کر حکومتِ یو۔ پی کی پالیسی کی وضاحت کی ہے۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ مرکزی حکومت کی ہدایات پر پورا عمل ہوگا۔ یوں پہلے بھی صوبائی حکومت اردو کی حفاظت میں کوشاں رہی ہے۔ اس بیان سے بہت سے ایسے دلوں کو تسکین ہوگی جو شک و شبہ میں مبتلا تھے۔

اپریل کے شمارے میں 'برگد اور کونپل' کے عنوان سے ایک نظم عمیق حنفی صاحب کی شائع ہوئی تھی۔ جناب ہادی مصطفٰے آبادی رام پور سے اطلاع دیتے ہیں کہ اُن کی نظم 'برگد کا پیڑ' شاہراہ فروری ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی تھی اور حنفی صاحب کی نظم اُسی نظم سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے۔ حقیقت کچھ بھی ہو بہرحال ہادی صاحب کو 'مقدم' ہونے کا فخر تو حاصل ہے۔ شعر و ادب میں اخذ و ترجمہ جزواً بھی ہو تو اس کی صراحت کرنا عین فرض ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ حنفی صاحب صورتِ حال سے ہمیں آگاہ فرما دیں گے۔

اختر انصاری

قطعات

عالمِ فردا

جنونِ شوق نہ زنہار بے عمل ہوگا!
جو عیش آج نہیں ہو سکا وہ کل ہوگا!
خوشا کہ عالمِ فردا مُراد ہے جس سے
ہماری خاک سے تعمیر وہ محل ہوگا!

عشرتِ غم

دلِ خراب ہے اب تک اسیرِ بہجتِ غم
نفس نفس ہے، ابھی تک غریقِ لذّتِ غم
ہماری عیش پسندی بھی کیا قیامت ہے
تمام عمر رہے وقفِ عیش و عشرتِ غم

پیغمبرِ خودی

جو ہو سکے تو مصائب کی تیرگی کو بھگا!
جو بن پڑے تو ہمارے نصیبِ خفتہ جگا!
خدا کو دیکھ، خدائی کی آفتوں کو دیکھ
خودی کے وِرد سے باز آ، خودی کی رٹ نہ لگا!

ایک کیفیت

ہائے یہ حالِ دل اپنا کہ سکوں ہے نہ خروش
اور یہ رنگِ طبیعت کہ نہ مستی ہے نہ ہوش
محض اطلاق ہے دنیا، نہ زمیں ہے نہ فلک
وقت اک لمحۂ ساکت ہے، نہ فردا ہے نہ دوش

عامی

یہ جہاں خود ہی خدا ہے کہ خدا کی ہے شبیہ
ذاتِ حق جلوۂ مستور ہے یا سرِّ بدیہہ
کیا تعلق ہے اِن اسرارِ نہفتہ سے مجھے
ہیں نہ واعظ نہ مدرّس، نہ مفسّر نہ فقیہ

محمد سخاوت مرزا

میر امداد علی علوی قلندر تھانوی

تیرھویں صدی ہجری ہندوستان کا ایک انقلابی دور تھا، اِدھر سلطنتِ مغلیہ زوال پذیر تھی اور اُدھر سلاطینِ مغلیہ عیش و عشرت میں گویا غم غلط کر رہے تھے۔ دہلی کی آخری شمع ٹمٹما رہی تھی، بڑے بڑے شعرائے ریختہ ذوق، غالب، مومن، مجیر وغیرہ بہادر شاہ ظفر کے گرد جمع تھے۔ اُردو شاعری کو شاہ نصیر نے اپنی سنگلاخ زمینوں میں شعر کہہ کر جوئے شیر بنا رکھا تھا۔ مرزا غالب نے اپنا فلسفیانہ رنگ جما رکھا تھا بقول ؎ طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا اسد اللہ خاں قیامت ہے حکیم مومن خاں مومن نے غزل کو اور ذوق نے خصوصاً قصیدہ کو ریختہ میں معراجِ کمال پر پہنچا دیا تھا۔ اس طرف دکن میں شاہ نصیر المتوفی ۱۲۵۳ھ نے مہاراجہ چندو لال اور ان کے دربار کے ایرانی فارسی گو شعرا کو اپنی ریختہ گوئی سے ششدر کر رکھا تھا، اور "مہرد ہلال و کہکشاں والے" قصیدے نے عجیب دھوم مچا دی تھی۔ ان کے بعد میر شمس الدین فیض حیدرآبادی کا طوطی بول رہا تھا جن کے گرد سینکڑوں شاگرد جمع تھے۔ ان کے بعد گویا تیسرا دور حضرت علویؒ اور ان کے تلامذہ اور فصیح الملک داغ دہلوی کا ہے۔ ان دونوں شاعرانِ باکمال نے اپنے اپنے رنگ میں خوب کہا ہے، اور چمن زار اُردو کی خوب آبیاری کی ہے۔ اور حضرت علویؒ تو عجیب جامع الکمال تھے۔ فقیہ، محدث، صوفی، شاعر سب ہی کچھ تھے، بلکہ بیک وقت شاہ نصیر، ذوق اور مومن تھے جن کے کارنامے پردۂ اخفا میں ہیں۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے بیس بائیس سال پہلے، علم و ہنر کے مردم خیز خطہ تھانہ بھون (مظفر نگر) میں حضرت پیر جی میر نجابت علی علوی رزاقی کے کاشانہ میں ۱۲۵۵ھ میں سید انبی، مادر زاد ولی، حضرت میر امداد علی علوی کی ولادت سے پیر جی مرحوم پھولے نہ سماتے تھے، کیونکہ ایک فرد کامل غلام مرتضیٰ مجذوب پانی پتیؒ کی پیشین گوئی کہ میاں پیر نجابت علی تو تو "بھلی نعمت کی نعمت مار کے بیٹھا ہے" پوری ہوئی، اور پیر جی صاحب دوڑے دوڑے گئے اور مجذوب صاحب سے فرمایا کہ حضرت جس کو آپ نے بلایا تھا وہ آج عالمِ ارواح سے دنیا میں آگیا ہے۔ حضرت علیہ الرحمۃ تشریف لائے۔ بہت خوش ہوئے اور پیر جی کے پیر مولانا امداد حسین اور سادات علویہ کی مناسبت سے "میر امداد علی" نام رکھا آپ مشہور بزرگ حضرت شاہ العالمین شیخ عبدالرزاق جھنجھانوی المتوفی ۹۴۹ھ خادم شیخ امان پانی پتیؒ کے صاحبزادے شاہ محمد جمال العارفین قدس سرہٗ کی اولاد سے تھے، غرض پیر نجابت علی، اعیان تھانہ بھون سے تھے جن کے فرزند دلبند حضرت علویؒ اور نواسہ حکیم الامت علامہ مولانا اشرف علی تھانویؒ سے کون واقف نہیں۔

علویؒ نے اردو فارسی کی تعلیم اپنے والد ماجد سے پائی۔ زبان فارسی گویا خاندانی جوہر تھا فرماتے ہیں ؎

چہ یارائے زبانِ فارسی علویِ ہندی را

خمیرش از خراسان است ازاں ذوقِ غزل دارد

عنفوانِ شباب میں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ طبیعت رسا، اور ذہن براق تھا، فارسی و اردو شعر کہنے لگے۔ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت علوی غدر ۱۸۵۷ء (۱۲۷۴ھ) سے قبل دہلی جاکر قلعۂ معلیٰ کے مشاعروں میں حصہ لیتے تھے اور وہیں چند روز مولوی احسان اللہ تخیر دہلوی ثم میرٹھی کو اپنا کلام دکھایا تھا اور بس۔ اور ستر اور پچیس سال کی عمر میں یعنی غدر کے بعد ۱۲۸۰ھ میں اپنا پہلا دیوان مکمل کر لیا تھا۔ چناں چہ آپ کے دیوانِ اوّل "عملِ علوی" کے حاشیہ پر خود مصنف کی قلمی

تحریر سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ پہلی جنگ آزادی میں سخت پریشان رہے۔ غدر کے مجاہدین میں آپ کا بھی نام تھا مگر جلد خلاصی پائی، اسی زمانے میں والد ماجد کا سایہ سر سے اُٹھ چکا تھا۔ امن قائم ہونے کے کچھ عرصہ بعد تلاش روزگار رڑکی چلے آئے اور یہاں گوروں کی فوج کے راشن افسر مقرر ہوئے جہاں ۱۲۸۵ھ تک مقیم رہے۔ آپ کی ایک مزاحیہ مثنوی "کھٹمل نامہ" میں شہر رڑکی کا ذکر آیا ہے۔ تصوف اور علم دعوات کا بے حد شوق تھا۔ علم دعوات میں کمال حاصل تھا۔ کیمیا بھی سیکھی مگر عشق و عرفان کی جنوں خیزیوں نے نچلا بیٹھنے نہ دیا۔ ۱۲۸۶ھ میں حیدرآباد دکن آئے۔ آپ کے ایک دوست مولوی قادر بخش سے مکہ مسجد میں بعد نماز جمعہ ملاقات ہوئی۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ چلو میں تمہیں ایک بڑے قلندر سے ملائے دیتا ہوں۔ غرض آپ نے حیدرآباد کے مشہور روحانی حضرت میر غلام حسین المعروف بہ میرزا سردار بیگ آزاد قلندرؒ خلیفہ مولانا حافظ محمد علی خیرآبادی کی قدم بوسی حاصل کی۔ مرزا صاحبؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ مولوی صاحب آج تو تم ایک بڑے شہباز کو لے آئے ہو۔ عجیب غریب آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ غرض آپ اس کے بعد مرزا صاحب علیہ الرحمۃ کے آستانہ پر حاضری دینے لگے مگر حضرت ممدوح نے علوی صاحب المشہور بہ منشی صاحب کو پانچ سال کے سخت انتظار کے بعد ۱۲۹۰ھ میں مرید فرمایا۔ ادھر سلوک کے مراحل طے کئے اور ادھر مرزا صاحبؒ کو حکم ہوا کہ علوم عربی کی بھی تکمیل کر لو۔ غرض آپ نے علامہ عباس علی خاں مرحوم سے عربی علوم متداولہ کی تکمیل کی، علامہ مفتی نور الضیاء الدین ضیا فارسی کے زبردست شاعر آپ کے ہم درس اور استاد بھائی تھے۔ حضرت علوی مرشد کی صحبت میں کوئی پچیس سال رہے۔ مدرسہ مرزا سردار بیگ میں درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ مثنوی مولانا رومؒ خوب پڑھاتے تھے کہ لوگ "مولانا مثنوی" کہا کرتے تھے۔ غرض حضرت مرزا صاحبؒ کو اپنے اس مایۂ ناز مرید و خلیفہ پر بڑا ناز تھا اور فرمایا کرتے تھے، "المنشی بضعۃ منی" "من کنت مولاہ فامداد علی مولاہ" "میرا خسرو تو میرا منشی ہے" وغیرہ اور منشی صاحب علوی اپنے مرشد کے جان نثار اور پروانے تھے ؎

قوائے خضر کے نسخے ہیں اس کی چشم کے غمزے
مسیحا کی دوا ہے نرگس بیمار مرزا ہیں

سب کچھ ہو سر علوی   سب کچھ ہو گر مرزا ہو

مختصر یہ کہ منشی صاحب علویؒ بوقت واحد عالم، صوفی، فقیہہ، قلندر آزاد، فارسی اردو اور بھاکا کے بے مثل شاعر اور سرمست بادۂ الست تھے۔ آپ کی حال و قال کی مجلسیں حیدرآباد میں یادگار ہیں، مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو نام و نمود و نمائش منظور نہ تھی گمنامی پسند تھی۔ پہلی شادی تھانہ بھون میں کی ایک فرزند میر سجاد علی تولد ہوئے جو صغر سنی میں داغ مفارقت دے گئے۔ اس کے بعد کئی عقد کئے مگر اولاد نہ ہوئی۔ اپنی گمنامی کے متعلق فرماتے ہیں۔ ؎

میرے ہی ساتھ میری نسل بھی دنیا سے اٹھی   للہ الحمد نسب بھی نہ چلا میرے بعد
علوی آزادی و گمنامی اسے کہتے ہیں   کہ میرا نام و نشاں کچھ نہ رہا میرے بعد

راہ سلوک طے کرنے کے بعد تقریباً ۱۲۹۵ھ میں حسب ایماء پیرؒ دہلی گئے۔ دہلی، ملتان، کلیر، جھنجھانہ وغیرہ میں اپنے سلسلہ کے شیوخ کی زیارت کی۔ تھانہ بھون میں پنڈت سورج بھان میکش جن کا اسلامی نام سجاد علی رکھا تھا، آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ بڑی عقیدت تھی۔ پنڈت جی ۱۳۰۵ھ میں حیدرآباد آ گئے۔ فیوض باطنی کے علاوہ شعر و سخن کی مجلس گرم رہا کرتی تھی، خصوصاً پنجشنبہ شب میں آپ کے خاص مریدین میکش، میر عارف علی عارف، میاں نعمت علی برادرزادگان کو بیدار کر دیتے اور فرماتے کہ طبیعت اس وقت موزوں ہے کوئی مصرع طرح دو۔ خصوصاً عرفاء کا کلام پسند تھا۔ بعض وقت داغ کا مصرعہ دے دیا جاتا تو جھنجھلا جاتے۔ غرض مصرعہ دیتے ہی اشعار لکھوانا شروع کر دیتے گویا کہ اشعار آپ کی زبان تھے۔

حضرت علویؒ نے اُردو، فارسی، ہندی، بھاکا میں کافی سے زاید سرمایہ چھوڑا۔ اردو میں آٹھ نو دیوان پانچ مثنویاں حسام عبرت وغیرہ، ایک مثنوی بزم ماتم، واقعات شہادت میں اور فارسی کے سات دیوان نصرت علوی، دسر علوی وغیرہ۔ بحیثیت مجموعی پچیس ہزار ابیات محفوظ ہیں۔ بعض نثر کی کتابیں اور مثنوی حسام عبرت اردو طبع ہوئی۔ غرض آپ کا کلام سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے۔ واردات قلبی، عاشقوں اور عارفوں کی جان ہے۔ معاملہ بندی، جذبات کی مصوری، جدت آفرینی میں کمال دکھایا ہے۔ ایک ایک غزل کے دس دس بیس بیس مطلع اور بیس پچیس شعر کی غزلیں کہنا تو معمولی بات تھی۔ روزمرہ، محاورہ بندی کا کیا کہنا کہ خود اہل زبان تھے۔ آپ کی غزلیں سماع کی محفلوں میں بڑے ذوق شوق سے گائی جاتی ہیں اور سامعین کو تڑپا دیتی ہیں۔ آپ کے ایک معاصر مؤرخ غلام صمدانی گوہر مؤلف تزک محبوبیہ نے آپ کی سرمستیوں کا اس طرح نقشہ کھینچا ہے۔

"منشی صاحبؒ زبردست عارف کامل تھے۔ علما و فضلا اسرار و نکات سن کر پیچ و تاب کھاتے تھے۔ مدرسہ ہی میں اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے صبح سے شام تک تلقین کے سوا کام نہ تھا۔ قرآن و حدیث تفسیر اور تصوف میں فتوحات و فصوص وغیرہ کا درس رہا کرتا تھا۔

نہایت متشرع ... لہذا ... پرہیز کرتے سماع کا شوق تھا جب
مجلس میں بیٹھ گئے تو قیامت برپا کر دی جس طرف نظر ڈالی مجلس
گرا دی، ذرا توجہ کی تو حاضرین مجلس کو تڑپا دیا، گھنٹوں مستغرق
آنکھیں پتھرائی ہوئی بے حس و حرکت سانس ہی سانس چلتی رہی
معتقدین ... کہیں پیر قطب کاکیؒ کی طرح شہید محبت نہ ہو
جائیں۔" (تذکرۂ مجوبیہ جلد ۲ صفحہ ۲۴۴)

وفات: حضرت علویؒ نے ۱۰ محرم ۱۳۱۹ھ کو داعیٔ اجل کو لبیک کہی۔ حضرت مرزا سردار بیگ صاحب کے روضہ میں مدفون ہوئے۔

قطعہ تاریخ وفات ؎

کردم تمنا نہ ہمی علوی ما ... ور ختم جہش ہے باقی ماند
گفت ہاتف از سر ... ال ... آن قدسے ثبکست آن ساقی ماند

۱۳۱۸ + ۱ = ۱۳۱۹ھ

حضرت علوی علیہ الرحمۃ کو ذوق ... احسان الدین ... شاگرد ذوق دہلوی سے۔
... جناب ... اس طرح ... لکھتے ہیں ؎

... تھا ... نہیں خوگیری کی حسرت
آپ کے تخلص تھے اردو و فارسی میں "علوی" ... رنگیلا رنگیلی
... میں ... اور ... پوربی زبان میں نادر

... علوی ... اور ... پر ... زبان و طبع گرچہ میری روانی پر
... حال ... نہیں غرور ہے علوی کو نکتہ دانی پر
تم ہو علوی شاعر ... خود غلط انشا غلط املا غلط

تلامذہ: آپ کے تلامذہ میں ... تھانوی، محمد احمد فانی (... ازجنگ)، تہنیت علی محشری، قطب الدین ... وغیرہ مشہور تھے اور ... کے تلامذہ میں ... رائے ... لکھنوی، رضی الدین حسین کیفی ... اور کیفی کے ... ور رنگ آباد ... بڑے باکمال شاعر گزرے ہیں۔

معاصرین: داغ دہلوی، امیر مینائی، جلال لکھنوی، ظہیر دہلوی۔ مگر آپ ان سب میں نہایت پرگو شاعر تھے۔ آپ کا رنگ اور مذاق اور تھا۔

حضرت علوی، صرف ایک مرتبہ مشاعرے میں گئے تھے۔ خوب واہ واہ ہوئی مگر آپ کو یہ چیز کچھ اچھی نہ معلوم ہوئی۔ اپنی وضعداری کے خلاف سمجھا۔ پھر کبھی نہ گئے۔ ... اپنے ... محمد ... سے کہا کہ تم پہلوان سخن ہو تم جایا کرو۔

البتہ اپنے مرشد حضرت مرزا سردار بیگ صاحب کے عرس کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ تو آپ کے عرس کے مشاعروں میں مصرع طرح آپ کی غزلوں سے ہی ... دیا کرتے تھے۔ مثلاً ایک گلدستہ میں مصرع طرح تھا ؎

فرشتوں کا لکھنا ... تقدیر ... (چودھواں مشاعرہ عرس علوی ۱۳۳۲ھ)

فارسی میں ... دیوان ہیں، کئی ایک مثنویاں بھی ہیں۔ فارسی شعراء میں جیسا کہ ہیں آپ کے معاصرین ... (...) مولوی ... کیل، مفتی ضیاء الدین ضیاء، وجیہ الدین ... قاضی ... سید علی شستری وغیرہ تھے۔

استاذ الاساتذہ ... الشعراء سید علی شستری سے آپ کے خاص تعلقات تھے۔ بسا وقت آپ کے پاس آیا کرتے تھے اور کوئی نو وارد ایرانی شاعر آتا تو آپ سے ملتے اور کلام سنتے۔ ایک مرتبہ ایک ایرانی شاعر کو ایک خط کے ساتھ آپ کی ملاقات کے لئے بھیجا ... آپ اپنے مدرسہ سے گھر جا رہے تھے۔ آپ نے حسب خواہش فی البدیہہ ... میں طویل غزل لکھی تھی جس کے بعض اشعار یہ ہیں ؎

... ذات حق ... نگردد دگر چہ گردد
نبی، علی، فاطمہ، حسین و حسن نگردد دگر چہ گردد
تیالم از عکس عارضش یاسمن نگردد دگر چہ گردد
دل ... داغ عشقش چمن نگردد دگر چہ گردد الخ

انتخاب از دیوان "گل علوی" کلام ایام شباب:

قفس کو ... صیاد کچھ حاجت نہیں ... بنا کے بلبل کی موج بوئے گل زنجیر پا
نجر کو ... ابرو ... کہنے لگے یہ دیکھ لو عجز تہ خنجر
جب تمہارے ... کا دفتر کھلا ... ہو گیا سب عقل کا دعویٰ غلط
تیری چشم میگوں ... تماشا غزال حرم دیکھتے ہیں
کہہ رہی تھی راز دل ... بلبل ناشاد کی تقریر آدھی رہ گئی

حقائق علوی، دیوان دوم (بعد بیعت بزمانۂ کہولت)

... یہ عقدہ کھلا ... خدا میں خودی ہے خودی میں خدا
یہ وہ ہے وہ یہ ہے کھلا اور چھپا ... خدا میں خودی ہے خودی میں خدا
صنم نے حسن کو تن تن کے دیکھا ... ہر ایک آئینہ میں بن بن کے دیکھا
... ہم آخر ... بہت پس و پیش کے اور چمن چمن کے دیکھا

وہ ادھر ہے غمزہ و ناز میں، ہیں ادھر ہوں سوز و گداز میں
کہوں ... اس ... وہ ادھر ہوا میں ادھر ہوا

ہم اُس کو ہی سمجھیں گے شاخِ شجرِ الفت   جو آپ سے سوکھے گی آتش سے ہری ہوگی

میں بھی کیا ٹکڑا بن کر   مٹ گیا نقشِ پا بن کر
سمٹا میں قطرہ بن کر   پھیل گیا دریا بن کر
جب نہ کسی نے میری سُنی   بیٹھ گیا گونگا بن کر

دل کے داغوں کی قدر کیا جانو   یہ فقط عرش کے ستارے ہیں
مہر و مہ رات دن جو مضطر ہیں   یہ کسی قلب کے شرارے ہیں

جانبری معرکۂ دہر سے کچھ سہل نہیں   مرد وہ ہے جو نکل جائے دبا کر پہلو
بحرِ امواجِ حوادث نہیں جانے آرام   رکھتی ہے آپ پہ کب ماہی مضطر پہلو

حضرت منشی علوی صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متقدمین ومتاخرین اساتذہ شعراء اردو کے سامنے تھے اور ہر ایک وقت انشاء و مصحفی و شاہ نصیر و ذوق و غالب اور داغ و جلال تھے۔ شاہ نصیر کی سنگلاخ زمینوں میں کئی غزلیں کہی ہیں، اور ذوق کے رنگ میں بھی کہا اور داغ کے رنگ میں بھی مگر آپ کو عارفانہ کلام زیادہ پسند تھا۔ بلحاظ جدّت مضامین، صفائی بیان و سلاست زبان، حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کا کلام آپ کے معاصرین سے بلند درجہ رکھتا ہے۔ مگر آپ ابھی گمنامی میں ہیں۔ آپ نے بعض اوقات طبع ایک ایک غزل کے پندرہ پندرہ بیس بیس مطلع کہے ہیں۔ اور خصوصاً شاہ نصیر کی سخت زمینوں اور مشکل قافیوں میں وہ جولانی دکھائی ہے کہ گویا آپ کو شاہ نصیر اور ذوق کا قائم مقام کہا جانا چاہئے۔ اپنے طرز اور کلام کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:-

چلتا ہوں میں بھی تو علوی روشِ شاہ نصیر   یہ اداکاری نہیں کچھ میں نے نقل کی کبھی
میں کیوں نہ کروں آبِ رواں سخت زمیں کو   یاں پانی مری بات نہیں ہیں میر کی بہرتی

گویا سخت سنگلاخ زمینوں میں میر کی سادگی پیدا کر دی ہے۔ شاہ نصیر نے لکھنؤ کے ایک معرکۃ الآرا مشاعرہ میں جس میں استاد مصحفی اور آتش بھی شامل تھے، ایک غزل پڑھی تھی۔

خال پشتِ لبِ شیریں ہے عسل کی مکھی   روحِ فرہاد ہے بیٹھی ہے جو بن کے کبھی کی مکھی

نصیر:-   صدا ہے اس آہ و چشمِ تر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
نکل کے دیکھو ٹک اپنے گھر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

علوی کچھ قافیہ بدل کر فرماتے ہیں:-

دلا عروج و نزولِ عالم عجب ہے کچھ جزر و مد ہیں
عجب ہے کچھ ہو رہے ہیں جلسے زمیں فلک پہ فلک زمیں پہ
غبار اڑ کر فلک پہ پہنچا تو ابر جھک کر زمیں پہ آیا
یہ ربطِ الفت کے دیکھو نقشے زمیں فلک پہ فلک زمیں پہ
جو عازمِ عرش تھے محو سرودِ عشرت وہ کچھ تھا بے حد
کہ جوشِ مستی میں گر رہے تھے زمیں فلک پہ فلک زمیں پہ

اور ذرا ردیف قافیہ بدل کر فرماتے ہیں:-

زمیں کے نیچے فلک کے اوپر جو کچھ ہے سب ہے اسی کا جلوہ
اسی رُخ و زلف کا ہے چرچا زمیں کے اوپر فلک کے نیچے

اور بھی ملاحظہ ہو:-

زمیں سے ہے عروج ہے فلک سے ہے نزول ہے
ہے یوں ہی ہر نفس ہوتا زمیں اونچی فلک نیچا

شاہ نصیر:-   وقتِ نماز ہے ان کا قامت گاہ خدنگ و گاہ کماں
بن جاتے ہیں اہلِ عبادت گاہ خدنگ و گاہ کماں

سپر و تیغ کو علوی نے خوب باندھا ہے:-

ہے ابرو رخسار پہ اس زلف کا قبضہ   ہے باندھے ہوئے پانکی کا کل سپر و تیغ
لے تیغ دکھن ہاتھ میں پی جامِ محبت   اور کھول کے رکھ پیشِ خم ہل سپر و تیغ ا

ذوق:-   کوہ اور آندھی میں ہوں گر آتش و آب و خاک و باد
آج نہ چل سکیں گے پھر آتش و آب و خاک و باد

علوی:-   تن میں ہیں جو چار عناصر خاک و آب و باد و نار
رہتے ہیں یہ دل کو مکدّر خاک و آب و باد و نار

ذوق:-   بنایا اس لئے اس خاک کے پتلے کو تھا انساں
کہ اس کو درد کا پتلا بنائیں سر سے پاؤں تک

علوی:-   آتا ہے نظر نورِ لقا سر سے پاؤں تک
انساں کا نہیں ہے پتا سر سے پاؤں تک

مومن دہلوی:-   دعا بلا تھی شبِ غم سکونِ جاں کے لئے
سخن بہانہ ہوا مرگِ ناگہاں کے لئے

علوی:-   کیا یہاں کے لئے کچھ نہ کچھ وہاں کے لئے
تو کوئی کیجئے کہ اب ہم رہے کہاں کے لئے
ظہور عینِ بطون و بطون عینِ ظہور
یہ اعتبار فقط ہیں سب این و آں کے لئے

سمجھ کے ہاتھ بڑھا سوئے خوانِ عشق اے دل
کُھلا دھرا ہے یہاں زہر میہماں کے لئے

علوی — ہر دم اس تن کے قفس میں مرغِ جاں کا ہے خطر
ہیں بہت نازک خطِ موجِ نفس کی تیلیاں
آتشِ گل آج کل بھڑکی چمن میں اس قدر
ہیں مجھے سیخِ کباب اپنے قفس کی تیلیاں

یہ طرح اس غزل کی ہے جس میں شاہ نصیر کی غزل ہے، قفس کی تیلیاں خس کی تیلیاں، اور ذوق نے دو غزلہ کہا تھا اور شاہ صاحب سے چوٹیں ہوئیں اور منیر مرحوم نے یہ شعر پڑھا تھا اور حجت و تکرار میں مشاعرہ ہی برخاست ہو گیا تھا۔

منیر — گرچہ تندیلِ سخن کو منڈھ لیا تو کیا ہوا
ڈھانچ میں تو ہیں وہی اگلے برس کی تیلیاں

انشاء — توڑوں گا خم بادۂ انگور کی گردن
رکھ دوں گا وہاں کاٹ کے اک حور کی گردن

مصحفی — ایک ہاتھ میں گردن ہو صراحی کی مزا ہے
اور دوسرے میں ساقیِ مخمور کی گردن

علوی — اس درجہ بڑھی نالۂ شب گیر کی گردن
خجلت سے ہوئی خم فلکِ پیر کی گردن
اللہ رے او شوخ حیا کہتے ہیں اس کو
کھنچتی ہے جھکی شرم سے تصویر کی گردن

آتش لکھنوی — فریبِ حسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا
خدا کی یاد بھولا شیخ، بُت سے برہمن بگڑا

مصحفی — نگاہِ لطف کے کرتے ہی رنگِ انجمن بگڑا
محبت میں تری ہم سے ہر اک اہلِ وطن بگڑا

علوی — کوئی رندہ اگر واعظ میانِ انجمن بگڑا
سنبھل، مونھ ہی بگڑ جائے گا گر لب پر سخن بگڑا

(دو غزلہ) مطلع — دمِ توحید سے جس دل میں آیا شک وظن بگڑا
جو دل بگڑا تو جاں بگڑی جو جاں بگڑی تو تن بگڑا

دوسری بحر میں —

سو بار ہو عالم تہ و بالا یہ عجب ہے — اک بال ترا زلفِ گرہ گیر نہ بگڑے
لے جاتا ہوں دل میں تری صورت کا تصور — تا زیرِ لحد بھی میری تصویر نہ بگڑے
لکنت ہے زباں میں نہ بہت کیجئے باتیں — اے نازکیِ ہستی کہیں تقریر نہ بگڑے

مولانا غلام امام شہید — کوئی کارواں بھی گیا اگر سوئے نجد، قیس یوں بول اٹھا
وہ بجا جرس وہ بجا جرس، وہ بجا جرس، وہ بجا جرس

علوی — وہ رواں ہے دیکھ لے قافلہ اسے غافل اب بھی کمر کو کس
نئے ہے جرس، انئے ہے جرس، انئے ہے جرس، انئے جرس
ہوا پختہ بسبب ذقن ترا وہ میرے حق میں ہے بے مزا
ابھی نیم رس، ابھی نیم رس، ابھی نیم رس، ابھی نیم رس

میر انیس لکھنوی اور حضرت علوی: — علوی عاشقِ اہلِ بیت تھے، عشرۂ محرم میں ہری کفنی پہنا کرتے تھے اور باتیں ع پہ دہیر بہ چہار مند محمد علی بیرا یادی تعزیہ انکا لتے مرثیہ خوانی بھی ہوا کرتی تھی۔ مرثیوں میں اساتذہ سے کم نہ تھے۔

میر انیس مرحوم $\frac{1216}{1291}$ ھ حیدرآباد دکن ۱۸۷۱ء میں آئے تھے۔ اس وقت علوی حیدرآباد میں قیام پذیر تھے۔ ملاقات کا حال معلوم نہیں۔ حضرت علوی نے مرثیے، نوحے، سوز، مخمس، مسدس — بلکہ ایک مرثیہ مسدس ریختی میں تضمین قدسی بھی کہا ہے۔

جلال لکھنوی — ہمہ تن تمنّا و شوق و تمنا میں ہوں — لالہ کہ جگر شستہ ہیں میرے ساتھ وہ تنہا میں ہوں

علوی — میری کیا پوچھتے ہے ایک پتلا سوا کا میں ہوں — ساتھ ایک پھونکنے بگڑ جائیے وہ نقشا میں ہوں

(تلمیذ مخبر) — ابھی کھل جاؤں تو سب رازِ محبت کھل جائے — ہائے حبِ حقیقی کا لفافا میں ہوں۔

داغ دہلوی — بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

علوی — کوئی فتنہ اٹھائیں گے وہ بے ڈھب تن کے بیٹھے ہیں
بگاڑیں گے کسی کو آج جو وہ بن کے بیٹھے ہیں

داغ — بتان ماہ وش اُجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں
کہ جس کی جان جاتی ہے اسی کے دل میں رہتے ہیں

علوی — اکٹھے ہو کے حسن و عشق میرے دل میں رہتے ہیں
یہاں لیلیٰ و مجنوں ایک ہی محمل میں رہتے ہیں

علوی — بلا سے عرش تک ہیں ہم تڑپ کر دیکھتے جاؤ
ذرا آؤ پھیر کر گردن پہ خنجر دیکھتے جاؤ
لبِ بام آ کے یہ کہتا ہے وہ بت راہ داروں سے
سوا نیزہ پہ ہے خورشید محشر دیکھتے جاؤ

متاخرین میں فانی کی مشہور غزل ہے — بھڑک اٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ

آصفؔ (میر محبوب علی خاں آصفجاہ ششم)

تلمیذ داغ ؎ تم شاہ حسن ہی شہریار ہم بھی ہیں

علویؔ ؎
ذرا ادھر کو بھی ہاں، کوئی دادر ہم بھی ہیں
اودھر ادھر ہی چلی تیغ، یار ہم بھی ہیں
اڑایا ہوگا بہت تم نے خاکساروں کو
ہمیں اوٹھا کے تو دیکھو غبار ہم بھی ہیں

تصوّف کے تو آپ شہنشاہ ہیں اور محقق صوفی، مشاہیر اردو شعراء میں خواجہ میر دردؔ بہت مشہور ہیں۔ مگر متاخرین میں علوی صاحب پر اردو کو ناز ہے تصوّف کو اشعار میں اس انداز اور نزاکت سے سمویا ہے کہ بے ساختہ دل سے واہ واہ نکلتی ہے۔ اپنے مرشد طریقت کی تعریف اور اپنے کمال کا اس طرح سادہ اور پُر جوش الفاظ میں اظہار کیا ہے ؎

نسیم خلد بھی دامان و جیب بھرتی ہے — یہاں میں پھیل رہی ہے گلِ دکن کی بو
سفلی درخت تھا میں جواب علوی ہوگیا — بیخِ نہال ہند میں کلی دکن کی شاخ
؎ کیا کیا تھے اور کیا کیا ہو — تم بھی ایک تماشا ہو
بندے ہو یا مولیٰ ہو — میرے اب ہو مرزا ہو

ہستی و نیستی لازم و ملزوم ہیں ؎

ٹوٹتا ہے سلسلہ کب لا و الّا ہیں بہم — رشتۂ اثبات سے اُلجھا ہے ہر دم تارِ لا

کنت کنزاً مخفیاً فاحببت اِن اعرف کے بلند مضمون کو عجیب انداز اور سادگی سے بیان کیا ہے۔

جب ترا جلوہ نظر میں آگیا — میرے گھر کا نور گھر میں آگیا
مجھ کو حیرت ہے کہ پیچ کر آنکھ سے — کون یہ شکلِ بشر میں آگیا

حافظ شیرازی کی مشہور غزل کا مطلع ہے ؎

دوش دیدم کہ ملایک درِ میخانہ زدند — گلِ آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند

علوی نے اسی کو سیدھے سادے اردو شعر میں کس انداز سے بیان کیا ہے۔

ساقی ترا مستی سے کیا حال ہوا ہوگا — جب تو نے یہ مے ظالم شیشہ میں بھری ہوگی
گردوں کو جو یوں پھونکا آہ جگری ہوگی — عالم کو کیا برہم بادِ سحری ہوگی
ہے تازگیٔ دل یاں کا مدیدگی تن پر — جب سب یہ شجر سوکھے اک شاخ ہری ہوگی
ہم اس کو ہی سمجھیں گے شاخِ شجرِ الفت — جو آب سے سوکھے گی آتش سے ہری ہوگی

شیخ نصیرالدین چراغ دہلوئیؒ یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے ؎

صیّاد ہمو صید ہمو دانہ ہمو

علویؔ ؎
اب آیا نظر دیدۂ بحیر میں دریا — سمٹا ہوا آیا ہے ترے تیر میں دریا
اک بحر تھا کوزہ میں کہ مضمونِ خطِ یار — کاغذ پہ رواں کر دیا تحریر میں دریا
دیکھے دمِ گریہ ترے عاشق کی کوئی شکل — تصویر ہے دریا میں تو تصویر میں دریا

حقیقت اور ذوقِ سماع ؎

ہوئے ہیں کان مرے کانِ گوہرِ نایاب — بھرے ہوئے ہیں یہاں کیسے کیسے رازِ سماع

کمالِ فقیری ؎

کہتے ہیں فقیری جسے وہ بات ہے کچھ اور — یوں شیخ بھی اچھا ہے قلندر بہت اچھا

دیوان رنگ علوی (نصف قبل ۱۳۱۵ھ) رنگیلا منشی (بھاکا): ابتداء ؎

(کنایہ در صوت سرمدی) نرنجن نرمن، نروھیہ — نرکھ نرگن نرنکارا
سرب گن، سرب رنگی — سرب روپی جگت کرتارا الخ

بانسریا گن گاوے رے موہن بانسریا گن گاوے
پی کی شبد سناوے رے موہن بانسریا گن گاوے الخ

؎ بادرنیا بجری چمک رہی بادرنیا

سانورے تن نینن سین جوت نجریا — او چمک رہی بادرنیا
(بجلی چمک رہی)
سُلگت ہیرا دہکت جیرا — وائے نینن بین کسک رہی بادرنیا
(بجلی چمک رہی)

وا بجری موہے گیت جلاوت — آگ کریجے دھک رہی بادرنیا بجلی...
پات پات اور ڈاری ڈاری — پھول پھول واہی مہک رہی بادرنیا بجلی...
بال بال سُلگت جوں دیپک — ہردے ہردے دھک رہی بادرنیا بجلی...
وا بجری چھوں اور برا سجے — وسوں وساوا ہی لپک رہی بادرنیا بجلی...
آنکھ کھول کے دیکھ رنگیلی — دن کو چاندنی چٹک رہی بادرنیا

(بجلی چمک رہی بادرنیا)

التشبیہ فی التنزیہ والتنزیہ فی التشبیہ

وا ہے نرمل جوت بست ہے مورے روم روم میں
نحن اقرب و ہو معکم فی انفسکم بولت ہے — مورے روم روم میں الخ (۵ بیت)

؎ "ہوری" "نندن گردھاری موہن چیری ہوں تمھاری"

چھپ چھپ آت ہے پچکاری ایسو چتر کھلاڑی — جب ماری مکھ اور پر ماری شدہ بسراؤ یو ساری
سانوری برج بہاری — نندن گردھاری

علی عباس حسینی

دیہاتی

انسان اور جانور میں صورت ہی کا فرق ہے، فطرت کا نہیں، ہم میں رینگتے کیڑے بھی ہیں، رنگین اڑتی تتلیاں بھی، مینا طوطا بھی ہیں، اور چمگادڑ اور الّو بھی۔ غزال بھی ہیں اور گدھے بھی، گائیں بھینسیں بھی ہیں اور دانا بھینسے اور سانڈ بھی۔ شہری مار آستین بننے میں طاق، تو دیہاتی بیل کہلانے میں مگن۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہمیشہ اسی کی فکر رہی کہ اس دیہاتی بیل کا لیبل مجھ پر نہ چپکنے پائے۔ اس لئے گاؤں میں پیدا ہونے اور پورا بچپن اسی گرد اور گوبر والی فضا میں بسر کرنے پر بھی اپنے کو لکھنوی کے علاوہ کاکوروی کہلانا کبھی نہ پسند کیا۔ بلکہ جب کبھی اعزا و برادری میں سے کچھ لوگ لکھنؤ میں مجھ سے ملنے آتے تو میں موقع بے موقع ان کے گنوار پن اور دیہاتیت کو اچھالتا اور ان پر فقرے کستا۔ آج بھی دو صاحب قریب کے ایک گاؤں سے آئے تھے۔ چونکہ ہم سن تھے، اس لئے میں بڑی بے تکلفی سے ان کے دیہاتی لب و لہجہ، وضع قطع کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اور ناشتہ اور چائے کی تواضع کے ساتھ ساتھ ان کی حرکتوں پر پھبتیاں کس رہا تھا۔ ان میں سے ایک صاحب کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی۔ ہاتھوں میں جو بہنوں نے مہندی لگائی تھی اس کے نمایاں دھبے اب تک ہتھیلیوں اور انگلیوں پر موجود تھے۔ وہ آج ایک مقدمے میں گواہی دینے آئے تھے۔ میں کہہ رہا تھا

"مجیب بھائی، گواہی کے کٹہرے میں جاتے ہی قسم کھانے کے لئے ہاتھ ضرور اٹھائیے گا۔ اس مہندی کا حاکم پر بڑا "رعب" پڑے گا۔ وہ فوراً دل میں کہے گا۔ "بھلا، یہ بھولا بھالا دیہاتی دولہا کیا جھوٹ بولے گا!...."

میری بات تمام نہ ہونے پائی تھی کہ اکرم بھائی یہ کہتے ہوئے کہ "کیا میں اندر آسکتا ہوں؟" پردہ اٹھا کر کمرے میں آگئے۔ اکرم بھائی صورت شکل، وضع قطع سے ہر طرح انگریز معلوم ہوتے تھے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ انگریز کے انگلستانی ہونے پر شبہ کیا جا سکتا تھا، مگر ان پر نہیں، تو یہ بات بے جا نہ ہوگی۔ انگریزی بولتے تو لب و لہجہ وہ ہوتا کہ آکسفورڈ میں انگریزی پڑھانے والے پروفیسر بھی جھک ماریں۔ رنگ بھی شلجمی، اور آنکھیں بھی نیلگوں، پڑھے لکھے، حد درجہ "کلچرڈ" دنیا دیکھے ہوئے حد درجہ ملنسار اور ہنس مکھ، ان تمام باتوں پر، یہ طرّہ کہ وہ بہت بڑے تاجر تھے چمڑے کے کارخانے، کپڑوں کی ملیں، کلکتہ، بمبئی، مدراس جیسے شہروں میں موجود تھیں۔ اس لئے ہم میں سے ہر ایک ان سے دھونس کھاتا تھا۔ عمر میں بزرگ تجربے میں بزرگ، علم میں بزرگ، تہذیب و شائستگی میں بزرگ اور سب سے بڑی بزرگی یہ کہ وہ کروڑپتی اور ہم میں سے کوئی بھی دس بیس ہزاری بھی نہ تھا۔

انھوں نے ہم لوگوں کا سلام لے کر میرے اصرار پر صدر میں بیٹھتے ہی پوچھا "بھئی سجاد صاحب، یہ کیا آپ دیہاتیت پر ہنس رہے تھے؟"

میں نے رٹ پٹا کر کہا۔ "جی کچھ نہیں، یہ ہمارے مجیب بھائی نے جو پوروں پر مہندی لگا رکھی ہے اسی پر اظہار خیال کر رہا تھا...."

وہ بولے "یہ مہندی تو کچھ ہمارے دیہاتیوں ہی کی ریت نہیں۔ حنابندی تو ہمارے شہروں میں بھی ہوتی تھی، اور ہندوستان میں تو غالباً عرب سے یہ رسم آئی ہے۔ اور طبی حیثیت سے گرم ملکوں کے باشندوں کے لئے اس کا لگانا مفید بھی ہے۔"

میں نے کہا۔ "آپ تو بھائی صاحب آج پورے مشرقی بن بیٹھے ہیں۔ وہ بھی دیہاتی قسم کے...."

اکرم بھائی ذرا سنبھل کر بیٹھ گئے۔ بولے "یہ اگر شہریت اور دیہاتیت کا مقابلہ ہے۔ تو میں تو سارے جہان کی اور سارے اقسام کی "شہریت" کو اپنی دیہاتیت پر

قربان کرنے کے لئے تیار ہوں! ....."

مجیب بھائی کی ہنسی نکل آئی۔ ان کے خواب میں بھی نہ گزرا تھا کہ انھیں ایسا شائستہ و مہذب وکیل اپنی حمایت میں مل جائے گا۔ میں نے بھی کچھ گھبرا کر اکرم بھائی کی صورت دیکھی۔ ان کے ہاتھ میں جو سگریٹ جل رہا تھا اس کی راکھ میز پر گر رہی تھی۔ وہ اس کے دھوئیں کو دیکھ رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا دھوئیں کی چادر سے ماضی کی مختلف یادیں نئے سنئے روپ بھر کے چلی آ رہی ہیں۔ اور وہ سب کچھ بھول کر انھیں کے جھیب دیکھ رہے ہیں۔

میں نے انھیں متوجہ کرنے کے لئے کہا "اکرم بھائی، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے جو بات کہی ہے۔ اس کے پس منظر میں کوئی خاص ذاتی تجربہ ہے؟"

وہ ذرا مسکرائے، کہنے لگے "ہاں، آج سے کوئی دس برس پہلے کی بات ہے۔ وہی جب کہ میں آپ کے سنوں کا تھا۔ اسی سال ابا میاں کا انتقال ہوا تھا اور مجھے اُن کی لاکھوں روپے کی جائداد، ملیں، کارخانے ترکہ میں ہاتھ آئے۔ ہماری شاخیں ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں تھیں اور بمبئی سے خاص طور پر بہت درآمد برآمد کا کام ہوتا تھا۔ میں تعلیم ختم کر چکا تھا۔ شادی بھی نہ ہوئی تھی۔ بالکل آنا دتھا۔ بس ایک والدہ کا سایہ سر پر تھا، ورنہ بزرگوں میں کوئی بھی نہ تھا اور جو تھے بھی تو وہ اپنے ہی دست نگر، تو دینے والے کا ہاتھ ہمیشہ اُونچا رہتا ہے۔ رشتہ کا بزرگ ملازم ہو کر اپنے خورد کا ملازم ہی رہتا ہے۔ اتالیق و ناصح نہیں بن سکتا۔ غرض میں نے دل میں ٹھانی کہ میں ساری شاخوں پر نظر ڈال کر بمبئی میں کچھ دنوں قیام کر کے یورپ اور امریکہ جاؤں گا۔ تاکہ ان ممالک کی سیر بھی ہو جائے اور اپنا کام بڑھانے کی نئی صورتیں بھی پیدا کر سکوں۔ جب کلکتہ، مدراس، بنگلور، حیدرآباد ہوتا ہوا میں بمبئی پہنچا تو قصد تھا کہ بس ایک ہفتہ کے اندر ہی لندن کے لئے پانی کے جہاز سے روانہ ہو جاؤں گا۔ چناں چہ ایک فرانسیسی جہاز پر ایک، فرسٹ کلاس کیبن ریزرو بھی کرا لی تھی۔ لیکن وہاں پہنچنے کے تیسرے ہی دن مارجوری سے ملاقات ہو گئی اور آہستہ آہستہ میری زندگی کا پورا نقشہ ہی بدل گیا۔ میں بھی تمھاری طرح دیہاتیت ہی نہیں بلکہ پوری مشرقیت سے نفرت کرتا تھا۔ ایشیائیوں کو نیم وحشی اور اپنے گاؤں والوں کو تو بالکل جانور سمجھتا تھا...

یہ تو خیالات ہیں، اور میں لایا ہوں مارجوری حسن کی ملکہ کو میرین ڈرائیو کی سیر کرانے، ہفتوں کی کوشش کے بعد، آج پہلی دفعہ اسے میرے ساتھ تنہا سیر کرنے کی اجازت ملی ہے۔ شام کا وقت ہے۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں سمندر کے گلے میں بجلی کے رنگین قمقموں کا ہار پڑا ہے۔ پانی خوشی و سرمستی میں بار بار پشتوں سے آ کر ٹکراتا ہے۔ اور فوارہ کی طرح بلند ہو کر سڑک تک آبدار موتیوں کے انبار بکھیر دیتا ہے۔ جب موج کو ہم آتے دیکھتے ہیں تو ہم جلدی سے ایسے مقامات سے ہٹ جاتے ہیں جدھر سے بھیگ جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ اس پر بھی ہمارے کپڑے کچھ نہ کچھ نم ضرور ہو گئے ہیں۔ مارجوری نے آج ریشمی جالی کی سفید ساڑی پہن رکھی ہے۔ اسی کپڑے کا سفید جالی دار بلاؤز بھی ہے۔ ہوا اس شاخِ گل جیسے جسم کو بار بار ہلا رہی ہے۔ وقتی آبشاروں سے جو پھوار اُٹھتی ہے وہ ایک دھوئیں کی طرح اس کے حسین چہرے کو اس طرح دھندلا کر دیتی ہے کہ محسوس ہوتا ہے جل پری چادرِ آب کو چاک کرتی قریب چلی آ رہی ہے۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ مارجوری نے جو رکھ رکھاؤ کے بندھن اپنے گرد باندھ رکھے تھے آج وہ ڈھیلے ہو رہے ہیں اس کی آنکھوں میں سیراب کرنے والے ساقی کا کیف اُبھرتا آ رہا ہے۔ میں اس کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے کہہ رہا ہوں۔

"مارجوری، دیکھتی ہو سمندر کی حالت کہ کیونکر آپے سے باہر ہے۔ میرے دل میں بھی تمھارے لئے اسی طرح کے طوفان اُٹھتے ہیں۔ مگر تم انھیں چٹانوں کی طرح سخت ہو، جن سے موجیں ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہیں۔ کاش تم انھیں سنگ دلوں سے کچھ سبق لیتیں! دیکھو، دیکھو وہ چند ہی لمحوں کے لئے سہی مگر سمندر کے تلاطم میں اپنے کو ڈوب جانے تو دیتی ہیں۔ بہت ہی قلیل وقت کے لئے سہی مگر پانی اور پتھر کا فرق تو باقی نہیں رہتا۔ اُن کی حیات میں ایک ایسا وقت آ ہی جاتا ہے جب "من و تو" کا امتیاز نہیں رہ جاتا! مگر تم! آہ تم!....."

اور میں نے اس کی نازک کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی طرف کھینچنا چاہا تھا۔ اس کا تنفس تیز ہو گیا تھا۔ اُس کی آنکھیں مخمور ہو گئی تھیں۔ اُس کے جسم میں ایک ایسی حرارت تیزی سے دوڑنے لگی تھی۔ جو ساری کی تہوں اور بلاؤز کے حاشیوں میں سے چھن کر میری ہتھیلی اور انگلیوں میں ایک جھنجھناہٹ سی پیدا کر رہی تھی۔ پتھر موم بن رہا تھا! مارجوری میں پہلی دفعہ ہمہ سپردگی کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی کہ....

"ارے چاند بیٹے خوب ملے!"

اے سی کرنٹ، ڈی سی میں بدل گیا۔ ہم ایک دوسرے سے جھٹکے سے الگ ہو گئے۔ بڑے غصہ سے میں نے اس بے جا مداخلت کرنے والے کو دیکھا تو ندر ماموں کیسے نکالے کھڑے نظر آئے۔ حلیہ و لباس وہ کہ اگر کوئی انگریز دیکھ لے تو اس حلقہ سے، جہاں سائیس اور جاروب کش تک کے لئے وردی ضروری ہے۔ انھیں

... ہاتھ نکال رہے ہیں ... بیٹھے ہوئے ... بڑبڑاتے ہوئے کراہتے
تھے ... مٹی اور خاک کی تہیں جمی ہوئی تھیں ۔ کالی سوکھی پنڈلیاں ، آدھی بنی کُرتے کی میلی
... ٹوٹے ہی کو ... سر پر ... دو پلڑی ٹوپی ، صورت شکل بھی اسی مناسبت
سے ... پیشانی ... ابھرا ہوا ... دھنسی ہوئی آنکھیں ،
... ناک ، پچکے گال اور ٹھوڑی پر چھدری سی سفید داڑھی ۔ اس وقت اپنی ذات
ہیں مجھے بڑی محبت ... پیارے ... لگ رہے تھے ، اس طرح کی ... سامنے
کے تینوں ٹوٹے ہوئے دانتوں سے لال لال مسوڑھے دکھائی دے رہے تھے ... یہ
حلیہ اور مجھے مسٹر اکرام کو "چاند" کہہ کے پکار رہے !

بچپن سے سمجھاتے ہوئے طور طریقے آنکھ بڑی ... ایک ... کی صورت
اختیار کر لیتے ہیں ۔ مجھے ناصر ماموں کو ہمیشہ ... تہذیب یافتہ ... اس لئے
... اور ... ہی ... سے دہرا ہو ... وہ ... تھی کہ اگر
... تو اس وقت ... گیا ۔ سوڈس سے بال بھر کم ... چہرہ
پکے ٹماٹر کی طرح سرخ ہو گیا تھا اور میرا ... کانپ رہا تھا جو درخت سے
ٹوٹ کر گرنے والی ہی ہو ۔ سوڈے کی بوتل کی جھاگ کی طرح منہ کھلتے ہی سینکڑوں
گالیاں میرے ... والی ہی تعبیر کر دوں ... ایک ... ٹکرایا ...
پانی کی ایک ... ۔ انسن بنا ہوا اور ایک ... تبدیل ہو کر اس نے مجھے
اور مارجوری دونوں کو نہلا دیا ۔ ناصر ماموں اس طرح ... سڑک کی طرف بھاگے
کہ جیسے وہ گاؤں ... کھیل رہے ہیں ۔ ایک پاؤں کا جوتا اسی فٹ پاتھ پر
چھوٹ گیا ۔ اب وہ سڑک کے اس پار کھڑے چیخ رہے ہیں !

"ارے چندا بیٹے ، ادھر ہو گئے ۔ آؤ ، اور میاں ہمارا جوتا بھی اٹھاتے آنا ! "

مارجوری ہنستی ہوئی ایک طرف بھاگی ۔ میں نے اسی کا پیچھا کرنے میں مفر دیکھی
اتفاق سے ویسے ہی ایک خالی ٹیکسی ادھر سے گزری ۔ میں نے ہاتھ سے اشارہ کر کے
اُسے روکا اور ہم دونوں اس میں بیٹھ کر ناصر ماموں کو حیرت زدہ چھوڑ کر چل دیئے
مارجوری ٹیکسی میں مجھ سے ہٹ کر بیٹھی اور اس پر ہنسی کے دورے سے پڑتے
رہے ۔ میں خود اس طرح پشیمان و شرمندہ تھا کہ میری ہمت ہی نہ پڑتی کہ میں کچھ کہوں
میں نے ہفتوں مارجوری کے گھر کے چکّر کئے تھے ۔ اس کی نانی کی خدمت میں بار بار
حاضری دی تھی ، ان لوگوں کو اپنی امارت و شرافت کا یقین دلایا تھا جب آج مارجوری
کو تنہا لے کر تفریح کی نوبت آئی تھی اور وہاں بلائے آسمانی کی طرح اچانک نازل ہو گئے
ناصر ماموں ۔ جن کی وضع قطع اور حلیہ وہ تھا کہ سوائے سائیس کے انھیں کچھ اور سمجھا
بھی نہیں جا سکتا تھا ۔ اب اگر مارجوری مجھے اپنے دل میں ذلیل و حقیر سمجھے تو کون سی
تعجب کی بات ہے ۔ میں تو پیشانی کا پسینہ پونچھتے پونچھتے تھک گیا ۔ چاہتا تھا کہ صفائی
میں کچھ کہوں مگر جہاں اس کی طرف نظر کرتا وہ ہنسی سے بے تاب ہو جاتی ۔ بارے اس کا
فلیٹ آ گیا ۔ میں نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا ۔ وہ جلدی سے اُتری اور یہ کہتی تیزی سے
اندر بھاگی " اور اس غریب کا ایک جوتا تک اٹھا کر نہ دیا " وہ تو کھلکھلاتی چلی گئی ۔ مگر مجھے
ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے ناصر ماموں کا جوتا میرے منہ پر کھینچ مارا ....

ساری رات میں نے انگاروں پر لوٹ کر کاٹی ، سب سے زیادہ اس کا خوف
تھا اگر جب مارجوری نانی سے یہ واقعات بیان کرے گی تو وہ یقیناً میرے متعلق یہی رائے
قائم کریں گی کہ میں کوئی لپا لفنگا ہوں ۔ اور مارجوری سے میرا ملنا جلنا قطعی طور پر بند
کر دیں گی ۔ اور ان ساری مصیبتوں کا باعث کون ؟ ناصر ماموں ، دیہاتی ، گنوار ،
بدتہذیب ۔ اور دماغ نے ان کے لئے نئی نئی گالیاں تراشیں اور دل نے اُن کو دلتے
کے جہنم سے کہیں زیادہ جلتے بھنتے جہنموں میں غوطہ دیا اور نکالا ۔

صبح ہوتے ہوتے ایک صورت ذہن میں آئی ۔ آج لنچ پر دونوں کو بلاؤ ۔ وہ
خود دیکھ لیں گی کہ کتنے مہنگے ہوٹل میں رہتا ہوں ۔ کس شان سے رہتا ہوں ۔ انھیں
بہتر سے بہتر کھانے کھلاؤ ، پھر کوئی قیمتی چیز نذر دو ۔ اپنے حالات بیان کرو ، اب وہ
ایسی نہیں ہو سکتیں کہ محض ناصر کی ایک جھلک دیکھنے سے مجھ سے ملنا بھی پسند نہ
کریں ۔ چنانچہ منہ اندھیرے ہی ہیڈ کک کو تلاش کرتا ، اُس کے کمرے میں پہنچا
اور تین آدمیوں کے کھانے کے لئے تیس آدمیوں کے کھانے بھر کی مختلف چیزوں
کا آرڈر دے آیا ۔ تین طرح کی مچھلی ، تین طرح کے مُرغ ، بٹیر ، تیتر ، ہریل ، ران کباب
شامی کباب ، سیخ کباب ، پلاؤ کئی قسم کے ، متنجن ، زعفرانی ، کیسر شاہی ٹکڑے ، پڈنگ ،
ہر طرح کے پھل ، کھانے انگریزی ڈھنگ کے بھی ہوں ، ہندوستانی ڈھنگ کے بھی ۔
اُس نے گھبرا کر پوچھا " اور کچھ " میں نے کہا " اور جو جو چیزیں تم کو خود سب سے
اچھی پکانی آتی ہوں وہ بھی ! "

اب ذرا اطمینان ہوا ۔ مگر ان لوگوں سے وعدہ لینا باقی تھا ۔ چھ بجے ٹیلیفون
کیا ، گھنٹی بجتی رہی ، کوئی جواب نہ ملا ، خیال آیا ۔ ابھی خواب ناز سے بیدار نہ ہوئی ہونگی
آٹھ بجے پھر ٹیلیفون کیا ۔ معلوم ہوا ٹیلیفون لائن خراب ہے ۔ نو بجے کے بعد
پھر کھٹکھٹایا ۔ بارے نانی نے ٹیلیفون اٹھایا ۔ دونوں کو لنچ پر تشریف لانے کی
استدعا پیش کی ۔ انھوں نے حد درجہ خشک لہجے میں کہا ۔
" مارجی نے کل شام کے جو واقعات بیان کئے ہیں اُن کی روشنی میں آپ سے

ملاقات جاری رکھنا کچھ زیادہ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔"

میں نے کہا: "اگر آپ کا خیال ہے کہ میں کسی ایسے ویسے خاندان کا فرد ہوں تو یہ آپ کا خیال غلط ہے۔"

وہ بولیں: "آپ کے ماموں کی زیارت کے بعد تو مارجی کو کچھ ایسا ہی خیال پیدا ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا: "تو میں اسی لئے تو لنچ پر بلا رہا ہوں۔ تشریف لائیے غلط فہمی رفع ہو جائے گی۔"

وہ بولیں: "جی، آج کے لئے تو معاف ہی کر دیجئے، مارجی کی طبیعت آج ٹھیک نہیں۔ اب کسی دن اور!"

میں نے ہوٹل کے منیجر سے بلا کر دریافت کیا: "آج کا لنچ ٹالا جا سکتا ہے یا نہیں؟"

اس نے کہا: "آپ نے جن چیزوں کا حکم دیا تھا وہ سب منگا لی گئی ہیں۔ اُن میں کچھ چیزیں تیار ہو چکی ہیں، کچھ چولھوں پر چڑھی ہیں۔ اب آپ انھیں کھائیں یا نہ کھائیں دام تو دینے ہی پڑیں گے۔"

لیجئے یہ نقصان مایہ و شماتتِ ہمسایہ والا معاملہ بھی پیش آ گیا۔ لنچ کے دام سینکڑوں تک پہنچتے تھے۔ اب بات تو وصول کرنا ہی تھا۔ اس لئے جلدی جلدی اپنے مخصوص دوستوں کو فون کرنا شروع کر دیا۔ بارے اُن میں سے تین آدمیوں، پرنس مرزا، کنور راجیندر اور ٹھاکر اجیت نے وعدہ کر لیا کہ وہ آ کر لنچ سوارت کر لیں گے۔

میں نے تخلیہ کے خیال سے لنچ کا انتظام اپنے کمرے ہی میں کیا تھا۔ تینوں صاحبان تشریف لا چکے تھے۔ میز چُنی جا رہی تھی اور یہ تینوں مجھے چھیڑ رہے تھے کہ "چیف گیسٹ" کہاں ہیں اُن کی تو زیارت کرائیے" کہ دفعتہً دروازہ زور سے کھلا اور نا صر ماموں اپنی کل شدہ دالی مٹیت کذائی میں یہ کہتے ہوئے داخل ہوئے "ہونہہ! بڑے آئے ہیں روکنے والے! میرا لڑکا ہے اور مجھی کو کمرے میں گھسنے نہیں دیتے!"

یہ سب تو روکنے والے خانساماں کو جھڑکتے ہوئے کہا۔ پھر جو مجھ پر نظر پڑی تو جھنجھلا کر بولے "دیکھتے ہو میاں اکرم، ان خانساماؤں کی بدتمیزی!..."

اب اُن کی نظر میرے تمتمائے ہوئے چہرے سے ہٹ کر میرے دوستوں کے مسکراتے ہوئے چہروں پر پڑی۔ اور ہوٹل کے اس شاندار کمرے پر جس کا روزانہ کرایہ میں سوا سو روپیہ دے رہا تھا۔ اور ایک پچکے ہوئے بیلون کی طرح اُن کے منہ سے بھی سانس بے اختیار نکل گئی اور وہ پیچھے ہٹنے لگے۔

پرنس مرزا نے ہنستے ہوئے بڑھ کر کہا "اچھا تو آپ ہی چیف گیسٹ ہیں۔؟ تعارف کراؤ ہم لوگوں سے! تم تو کھڑے منہ دیکھ رہے ہو!"

اور جب میں پھر بھی نہ بول سکا تو اس نے اپنا اور دوسرے دوستوں کا تعارف کرا کے پوچھا "اور آپ کیا ان اکرم کے والد ہیں؟"

میں جھلا کر بول اٹھا "جی نہیں، آپ میرے رشتے کے ماموں ہیں، بمبئی تفریح کرنے تشریف لائے ہیں اور آپ کا اسم گرامی ناصر ہے۔"

ماموں نے مجھ پر ایک خوف زدہ نظر ڈالی، ان دوستوں کو سراسیمگی سے دیکھا اور جلدی جلدی وہ بول اٹھے۔

"میاں، اس وقت تو میں تمھیں گاؤں کا مخصوص تحفہ، جوار کے ستو، دینے چلا آیا تھا۔ یہ لے لو، پھر ملنے آ جاؤں گا۔" اور یہ کہتے کہتے انھوں نے میلے کپڑے میں بندھی ایک پوٹلی بڑھائی۔

میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں کیا کروں، ساری شان اس بڈھے نے خاک میں ملا دی۔ کیا کہتے ہوں گے یہ لوگ اپنے دل میں، کتنے چھوٹے گھر کا ہے یہ اکرم!

پرنس نے کہا "ہے لو میاں اکرم۔ سنبھال کر رکھو، یہ نعمتیں کہیں روز روز نصیب ہوتی ہیں!"

کنور نے چٹکی لی۔ "ہاں بھائی۔ یہ من و سلویٰ تو قسمتوں ہی سے صدیوں کے بعد کبھی کبھی جنت سے اترتا ہے!"

اب سوائے اس کے چارہ ہی کیا تھا کہ میں اس پوٹلی کو لے لوں۔ بڑے میاں پوٹلی کے بوجھ سے ہلکے ہوتے ہی پلٹ کر جانے لگے۔ اب اجیت آگے بڑھا۔

"ارے ماما، یہ آپ جا کہاں رہے ہیں؟ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ ہم لوگ آپ ہی کا تو انتظار کر رہے تھے!"

دیہاتی کے لئے کھانے کا نام لاحول کا کام دیتا ہے۔ ناصر ماموں کے قدم اور تیز ہو گئے۔ اجیت جھپٹ کر دروازے کے سامنے دونوں ہاتھ پھیلا کر راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ "ماما، یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ بغیر دو لقمہ کھائے یہاں سے چلے جائیں۔ مسٹر اکرم اگر مسٹر ناصر نے ہمارے ساتھ کھانے میں شرکت نہ کی تو ہم میں سے کوئی بھی نہ کھائے گا!"

اب مجھے بھی مجبوراً اصرار کرنا ہی پڑا۔ "ماموں کھانے کا وقت ہو گیا۔ کھانا میز پر لگا ہے۔ اب اس میں بے جا تکلیف کی کیا ضرورت ہے؟"

وہ بے چارے بہت سٹ پٹائے۔ پرنس نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ پکڑ کر

کہا "اسے معاف کیجئے۔ آپ ہی تو آج رات کے کھانے پر خاص مہمان ہیں۔ آپ نے اگر شرکت نہ کی تو یہی خیال ہوگا کہ ہم سے کوئی نہ کوئی ایسی بدتمیزی ضرور ہوئی جس سے آپ خفا ہو کر چلے گئے۔"

ماموں ریبڈ غلطی ہوگئے۔ انھوں نے قصے کہانیوں میں شہزادوں اور نذیرزادوں کا ذکر پڑھا تھا۔ آج ایسے ہی نصیب جاگے تھے کہ ایک شہزادے سے ملاقات ہوئی اور وہ بھی ایسا بھلا مانس کہ اپنے مرتبے کو بھول کر اس طرح باتیں کر رہا ہے جیسے واقعی نامر ماموں اس کے بھی بزرگ ہیں۔

وہ ہکلا ہکلا کر بولے "جی۔ جی، آپ رئیس ہیں شہزادے ہیں۔ میں بھلا آپ سے خفا ہو سکتا ہوں؟"

غرض ماموں نے کھانا کھایا اور میرے لئے اُسے زہر بنا دیا۔ سب تو چھری کانٹے سے کھاتے رہے، وہ اپنے گھر یا جیسے ہاتھ ہی استعمال کرتے تھے لطف یہ کہ اکثر چمچے کے استعمال سے بھی بے نیاز ہو جاتے تھے۔ اپنے جوٹھے ہاتھوں ہی سے بھری بھری پلیٹوں سے چیزیں نکال لیتے تھے اور اس طرح اس پوری ڈش کو دوسروں کے لئے بیکار بنا دیتے۔ کھانے میں اس قدر سیقے سے انھوں نے کام لیا کہ ڈاڑھی بھی رنگین ہوئی، آستینیں بھی اور کُرتے کا دامن بھی، خیر جب وہ پورا کھانا تہس نہس کرنے کے بعد اور کئی ڈکاریں زور زور سے لینے کے بعد اٹھے، تو ہاتھ دھونے کے لئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ خانساماں نے فنگر بول پیش کئے تو اس ڈر سے کہ وہ اُن میں پڑی ہوئی گلاب کی پتیوں کو دیکھ کر اس کے پانی کو عرقِ گلاب سمجھ کر پی نہ جائیں میں نے جلدی سے اُن کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "آیئے اِدھر باتھ روم میں ہاتھ دھو لیجئے" وہ فنگر بول پر حسرت کی نظر ڈالتے ہوئے میرے ساتھ ہوگئے۔

انھیں وہاں صابون اور تولئے سے جھگڑتا چھوڑ کر جب میں اپنے دوستوں کے پاس آیا تو تینوں نے مجھے بغور دیکھا، مسکرائے اور ہاتھ ملا کر رخصت ہونے لگے۔ میں اُن سے معافی مانگنے کی غرض سے اُن کی گاڑیوں تک چلا گیا۔ پرنس نے موٹر اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا "میاں اکرم ذرا اس جانور کو سنبھال کر رکھنا چیف منسٹر کو اگر کہیں پتہ لگ گیا تو وہ انھیں زُو میں بند کرا دے گا! اُسے نئے نئے جانوروں کی بڑی تلاش رہتی ہے!" اور تینوں قہقہے لگاتے چل دیئے

جب میں غصہ و ندامت کا مرکب بنا پلٹا تو بجائے ڈرائنگ روم کے ناصر ماموں بیڈ روم میں ملے۔ وہ سنگار میز کے سامنے کھڑے مارجوری کی وہ تصویریں دیکھ رہے تھے جو اس نے میرے ساتھ جُوہُو کے ریتیلے ساحل پر کھچوائی تھیں، ہم دونوں نہانے والے لباس پہنے ایک رنگین چھتری کے نیچے بیٹھے تھے۔ اس لباس میں جسم کے سارے نشیب و فراز اور اعضا کا تمام تناسب خاص طور سے نمایاں تھا۔ ناصر ماموں اس حسین مرقع کو ملاحظہ کر کے طرح طرح سے منہ بنا رہے تھے۔ اُن کے جھلسے ہوئے چہرے پر ایک خاص قسم کی سُرخی دوڑ گئی۔ نہ جانے ایک حسینہ کو نیم برہنہ دیکھ کر کیفیتِ شباب عود کر آئی تھی یا اپنی اس حرکت پر شرمندگی کہ میرے سونے کے کمرے میں ایک عریاں عورت کی تصویر کو گھورتے پکڑے گئے۔ انھوں نے مجھ سے آنکھ نہ ملائی، مگر نظریں نیچی کئے پوچھ ہی ڈالا۔

"یہ لڑکی تو وہی کل شام والی ہے نا؟"

اب میرا غصہ میرے تحمل سے باہر ہو گیا تھا۔ میں نے جھلّا کر جواب دیا۔

"جی ہاں وہی ہے۔ غور سے دیکھ لیجئے، اس کی عُریاں ٹانگیں دیکھ لینے میں آپ کے لئے کوئی مضائقہ نہیں، یہی آپ کی ہونے والی بہو ہے۔"

انھوں نے نظریں اُٹھا کر مجھے دیکھا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے آنکھوں سے شعلے نکل کر میرے چہرے کو جھلسا گئے۔ اور وہ لپکے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے۔

میں نے اُسی دن شام کو تین ہزار کی ایک انگوٹھی خریدی اور سیدھا مارجوری کے ہاں پہنچا۔ وہ کہیں باہر جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر کچھ گھبرائی، کچھ شرمائی، کچھ خوف زدہ ہوئی۔ میں نے اس سے پوچھا "نانی کہاں ہیں؟"

وہ بڑی بی کو بُلا لائی۔ میں نے انھیں سلام کیا۔ اور قبل اس کے کہ وہ کچھ ارشاد فرمائیں کہنا شروع کر دیا۔

"میں یو پی کے ایک دیہات کا رہنے والا ہوں۔ میرے ہاں کھیتی بھی بڑے بڑے پیمانے پر ہوتی ہے اور میں کپڑے کا کاروبار بھی کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ کپڑے کی کئی ملیں اور کارخانے بھی ہیں۔ میرے کارخانے کی ایک شاخ بمبئی میں بھنڈی بازار میں موجود ہے۔ میری اوسط آمدنی پچیس ہزار روپے ماہوار ہے۔ جن صاحب کو مارجوری نے کل شام کو میرے ہمراہ دیکھا تھا وہ میرے ہم وطن ہیں۔ اُن سے کوئی قریبی عزیزداری نہیں۔ لیکن ہم دیہات والے اپنے سے ہر بڑے کو چچا یا ماموں کہتے ہیں، اور اُن کی اسی طرح عزت کرتے ہیں۔ میں مارجوری سے محبت کرتا ہوں۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کے ہاتھ میں یہ انگوٹھی پہنا دوں۔"

میں نے یہ کہہ کر جیب سے انگوٹھی نکالی۔ بجلی کی روشنی میں ہیرا چمکا۔ نانی اور نواسی کی آنکھیں بھی اسی کی طرح چمکنے لگیں۔ نانی نے انگوٹھی ہاتھ میں لے کر اسے الٹ پلٹ

کردیکھا۔ مارجوری نے ہاتھ بڑھا کر ان سے لے لی، میری طرف پیار سے دیکھا اور انگوٹھی پہن لی۔

بڑی بی نے اپنی ٹوٹی پھوٹی اُردو میں کہا۔ "جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی؟" اور وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں مسکراتی چلی گئیں۔ اور میں نے مارجوری کو اپنی گود میں کھینچ کر پیار کر لیا۔ اور اس سے اقرار لے لیا کہ ہفتہ کے اندر ہی ہماری شادی ہو جائے گی۔

پرنس اور کنور کے مشورے سے شادی کے لئے پروگرام مرتب کیا گیا۔ طے ہوا کہ جس دن شادی ہوگی۔ اس دن ایک بہت ہی بڑے پیمانے پر ایٹ ہوم دیا جائے گا اور اُس میں میرے اور مارجوری کے ملنے والے ہی نہیں بلکہ پرنس اور کنور کے احباب بھی بلائے جائیں گے۔ شب بھر کے لئے ایک بڑا موٹر لانچ کرایہ پر حاصل کر لیا جائے گا اور پوری رات اس پر شراب نوشی ہوگی اور رنگ رلیاں منائی جائیں گی۔ اس درمیان میں میں نانی کو شادی کی تیاری کے سلسلے میں کیا کرنے والا تھا وہ میں نے کسی کو نہ بتایا۔ مگر اپنے طور پر طے کر چکا تھا کہ وہ جو کچھ مارجوری کو بطور جہیز کے دینا چاہیں گی۔ اس کی پوری کی پوری لاگت میرے ہی ذمہ ہوگی۔ میں انھیں منصوبوں میں مگن تھا کہ دفعتہً گھر سے تار آیا کہ والدہ پر فالج گرا ہے چند گھنٹوں کی مہمان ہیں فوراً آؤ۔ میں رات ہی کے ہوائی جہاز سے دلی آیا اور وہاں سے اپنے ایک دوست کی موٹر پر سوار ہو کر گاؤں پہنچا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس میرے دیکھنے کے لئے اُن کی آنکھوں میں دم اٹکا تھا۔ مجھے انھوں نے دیکھا۔ اُن کی پھیکی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ ڈھلک کر ان کے خشک گال پر بہہ آیا اور ایک ہچکی کے ساتھ وہ اپنا جان جانِ جنت سدھار گئیں۔

آج کل کی خود غرض، بھوک کی نشکی دُنیا میں بھی دو ذاتوں سے محبت کی جاتی ہے۔ ایک ماں اور ایک محبوبہ، ایک سے ماضی کی یادیں وابستہ ہوتی ہیں، دوسری سے حال کے خواب۔ یادوں سے خواب زیادہ شیریں ہوتے ہیں اس لئے منوں مٹی میں دبتے ہی بھولی بسری یادیں واقعی بھولی بسری ہو گئیں۔ مگر خوابوں نے پیچھا نہ چھوڑا، وہ سوتے جاگتے ہر وقت نظروں میں رہے۔ اس لئے تیجا کرتے ہی ضروری کاموں کا بہانہ کر کے میں بمبئی بھاگا۔

اسٹیشن پر پرنس بھی تھے کنور بھی تھے اور اجیت بھی، مارجوری بھی نانی کے ساتھ آئی تھی۔ میں جب فرسٹ کلاس کے ڈبے سے اُترا تو ان لوگوں نے گویا حلقہ میں لے لیا۔ وہ شائستہ طور پر چند لفظوں میں یا خاموشی سے ہاتھ دبا کر تعزیت ادا کر رہے تھے کہ ناصر ماموں انھیں ڈھکیلتے ہوئے اچانک آگے بڑھے اور میرے گلے سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر کے رونے لگے۔ اسٹیشن آدمیوں سے چھلک رہا تھا۔ ہر ایک اپنی اپنی دُھن میں مگن لپکا چلا جا رہا تھا۔ لیکن اُن کے اس طرح چیخ چیخ کر رونے نے ہر ایک کے قدم میں زنجیر ڈال دی۔ اور ہم ہزاروں آنکھوں کے لئے بیگ۔ وقت ایک اچھا خاصا تماشا بن گیا۔ پرنس کی مدد سے میں نے اس بھاؤ نما معانقہ سے اپنے کو چھڑایا اور جلدی جلدی مارجوری کو لے کر اسٹیشن کے باہر نکلا۔ ہم سب پرنس اور کنور کی گاڑیوں میں لد کر ہوٹل پہنچے اور میرے اصرار پر سب نے وہیں میرے ساتھ لنچ کھایا۔ اتفاق سے وہ ہفتہ کا دن تھا اس لئے یہ طے پایا کہ سب اس دن ریس میں بھی چلیں۔ میرے پاس خرچ سے بچے ہوئے تقریباً ایک ہزار روپے تھے۔ میں نے سوچا کہ اتنے لوگ ساتھ ہیں۔ نہ جانے کافی ہوں یا نہ ہوں۔ اس لئے میں نے پرنس کو پانچ ہزار کا ایک چیک دے کر ساڑھے بارہ بجے سے پہلے کیش کرا دیا کہ اسے بھنا کر ریس میں آ ملیں۔ کنور اور اجیت بھی اُن کے ساتھ ہی چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد مارجوری سے یہ معلوم کر کے کہ نانی لنچ پر شراب کی بھی عادی ہیں میں نے قیمتی سے قیمتی شرابیں اُن کے لئے منگوا دیں۔ مارجوری نے بھی اس سے نوشی میں شرکت کی مگر میں نے اسے ہاتھ نہ لگایا۔ مجھے اس کی بو سے متلی آنے لگتی ہے، اور اگر میں بھولے سے بھی اس کا گلاس ہونٹ سے لگا لوں تو سارا کھایا پیا افغانی قرضے کی طرح فوراً مع سود پٹا دینا پڑتا ہے۔ نانی تو ہمارے معاملے میں قاضی تھی ہی، انھیں جو مفت کی ملی تو انھوں نے چھک کے چڑھائی۔ مارجوری نے جو ان کو مدہوش ہوتے دیکھا تو وہ انھیں میرے بیڈ روم میں پہنچا آئی۔

اب میں تھا اور مارجوری، اور اُس دن مجھے محبت کرنے والی عورت کا صحیح روپ دکھائی دیا۔ مارجوری کی ہر ادا، اس کا ہر اشارہ ہر انداز یہی کہتا تھا کہ وہ اپنی شخصیت، اپنی خودداری، ہر قیمتی سے قیمتی چیز مجھ پر نچھاور کرنے کے لئے تیار ہے۔ اس کی مخمور نگاہیں مجھے اس طرح دیکھتیں کہ میں ایک اتھاہ سمندر میں ڈوبنے لگتا اور اس کی ہر مسکراہٹ دعوتِ عشرت دیتی۔ وہ بار بار اس طرح انگڑائی لیتی کہ میرے ہاتھ خود بخود اس کی نازک کمر کی طرف بڑھ جاتے۔ وہ بار بار ہاتھ میں ہاتھ پھنسا کر اس طرح انگلیاں چٹخاتی کہ میرا دم پھولنے لگتا۔ سچ کہتا ہوں اگر میں یہ طے نہ کر چکا ہوتا کہ ہفتہ کے اندر ہی اندر اس سے باقاعدہ طور پر شادی کر لوں گا۔ اسے اپنی بیوی بنا لوں گا تو شاید۔ . . .

وہ عجیب طرح نظریں نیچی کر کے بہکاتی، "جب ولی عہد سے دیا جیسے زبان

دے دی تو پھر شادی ہو گئی۔ مُلّا کا نکاح پڑھنا، برہمن کا رسم ادا کرنا، پادری کا انگوٹھیاں بدلوانا یا مجسٹریٹ کا رجسٹر میں نام لکھ لینا۔ سب دکھاوے کی باتیں ہیں۔ اپنے لئے نہیں، محض سوسائٹی کی خاطر، دوسروں کی خوشی کے لئے۔" مگر باوجود آج کل کا نوجوان ہونے کے بھی مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ نذرِ عقیدت و محبت کوئی شرمناک سی بات ہے۔ شاید یہ دیہاتیت تھی کہ بار بار اپنے ہونے والے بچوں کی ماں کے احترام کا خیال آجاتا تھا۔ دل قبول نہ کرتا تھا کہ اُن کی ماں میری ماں سے کم درجے کی ہو۔ اس کو بھی ایسی ہونا چاہیئے کہ جس کے ذکر پر ان کا سر فخر سے بلند ہو جائے۔ ایسی جس کی ذات اُن کے لئے دیر و حرم سے بھی زیادہ طاہر و مقدس ہو!۔

مارجوری نے میرے بڑھے ہوئے ہاتھوں کے دفعتہً کھنچ جانے پر مجھے کچھ جھنجھلا کر دیکھا، ایک گھونسہ کھینچ کر مارا اور بائیں قدم چل گئی۔

اُس دن کی ریس کچھ لُٹی پُٹی سی رہی۔ میں ریس کھیلنے کے فن سے ناواقف پرنس اور کنور شروع سے آخر تک غائب، نانی نے جتنی بازی لگائی وہ سب ہاریں ہر مرتبہ اُن کو یقین ہوتا کہ وہ اب کے سارے خسارے پورے کر لیں گی اور ہر مرتبہ بازی ہوئی رقم کی تعداد بڑھتی ہی جاتی۔ میں خوش خوش یہ سارے خسارے برداشت کرتا رہا۔ میں اُن کی خوشی میں خوش تھا۔ غالباً انھوں نے اپنی زندگی میں پہلی دفعہ ریس اپنی مرضی کے مطابق کھیلی اور اس اطمینان کے ساتھ کھیلی کہ اس کے نقصانات سے ان کے گھر کے بجٹ پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ وہ بچوں کی طرح کھلکھلاتی تھیں، ہنستی تھیں، اچھلتی تھیں اور ریس کے وقت برابر اپنے نمبر کے گھوڑے کا نام لے کر چیختی رہتیں۔ بہرحال وہ جب آٹھ سو کے قریب ہار چکیں تو مجھے فکر ہوئی کہ اب تو جیب میں سو سوا سو ہی روپے رہ گئے۔ پرنس کو اسی دن کے لئے چیک دے کر بھیجا تھا۔ وہ لاپتہ ہیں، انھیں فکروں میں تھا کہ معلوم ہوا آخری دوڑ ہے مارجوری نے خود کہا: "اب کے نانی نہیں، میں خود لگاؤں گی۔" اس نے ایک گھوڑے پر "ون" اور "پلیس" دونوں کے لئے دس دس روپے لگائے۔ اس کا بھاؤ ایک اور تیس کا تھا۔ لیکن عجیب اتفاق کہ وہ اوّل آگیا۔ بس مارجوری کی حالت کچھ نہ پوچھیئے مجھ سے کہنے لگی۔

"میں اپنے روپوں میں سے کسی کو ایک پیسہ نہ دوں گی!" میں نے کہا "سرکار میں سب مانگتا ہوں" پھر وہ نانی کو طعنے دینے لگی۔

"رکھیے گر نہیں۔ ہم گھوڑے سے پہچانتے ہیں۔ آپ کی طرح ہر نیل الکل پر نہیں لگا دیتے!"

[illegible] ریس کورس سے باہر موٹروں ٹیکسیوں کے پاس ملے۔

پرنس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سر کے بال اُلجھے ہوئے تھے اور کوٹ کی جیب کٹی ہوئی لٹک رہی تھی۔ کنور اُن کو سنبھالے ہوئے تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ میرے پانچ ہزار کے نوٹ اور اپنے روپے جس پرس میں رکھے ہوئے تھے وہ ریس کی بھیڑ میں ٹکٹ لیتے وقت کسی جیب کٹ نے اڑا دیا۔ بس ریس بھر اسی کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ کئی آدمیوں سے جھڑپ ہو گئی۔ وہ تو خیریت گذری کہ کنور ساتھ تھے۔ ورنہ جھنجھلاہٹ اور شرمندگی میں نہ جانے کیا کر گذرتے۔

میں نے کہا: "تو اس میں اس قدر پریشان ہونے کی کون سی بات ہے۔ میری جیب سے نہ گئے، آپ کی جیب سے چلے گئے۔ ایسے کتنے پانچ ہزار آپ جیسے دوست پر سے صدقے!"

وہ بولے "نہیں صاحب، کھوئے ہیں میں نے، آپ کیوں نقصان اٹھائیں بس اس وقت ذرا ہاتھ خالی ہے ورنہ ذکر تک نہ کرتا۔"

اور مارجوری بار بار ہنستی اور اپنے جیتے ہوئے روپے دکھاتی، "تم میں جب ضرورت ہو مجھ سے قرض لے لو۔ میں اس وقت سیٹھ ہو رہی ہوں۔" ہم لوگ اسی کی خوش نعلیوں پر ہنستے جب اسے اس کے فلیٹ پر چھوڑ کر ہوٹل پہنچے تو پرنس نے اصرار کر کے مجھے پانچ ہزار کا سرخط لکھ کر دے دیا۔

اتوار کو چونکہ مارجوری اور نانی دونوں صبح شام کی "سروس" میں جانا چاہتی تھیں اس لئے ان کے ساتھ کوئی پروگرام نہ بن سکا تھا۔ پرنس اور کنور نے بھی پونا جانے کا پروگرام پہلے ہی سے طے کر رکھا تھا۔ اس لئے وہ دن میرے لئے بالکل خالی تھا۔ صبح کو جب میں کارخانے کی مقامی شاخ کے منیجر سے کچھ حساب کتاب کر رہا تھا تو ناصر ماموں آ گئے اور اپنے ہمراہ اُن ٹیلر ماسٹر صاحب کو بھی لائے جن کے وہ کتنے دنوں سے مہمان تھے۔ وہ بھی ہم دونوں کے ہم وطن تھے اور ناصر ماموں کے قریبی عزیز۔ منگلور اسٹریٹ میں اُن کی ایک چھوٹی سی دوکان تھی اور اس کے اوپر وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتے بھی تھے۔ دونوں نے حد سے زیادہ اصرار کیا کہ رات کا کھانا میں انھیں کے ہاں کھاؤں اور سویرے ہی سے اُن کے ہاں آ جاؤں۔ میرے سارے عذر نامقبول ہوئے اور مجھے ان کی دعوت منظور ہی کرنا پڑی۔

شام کو چھ بجے جب منگلور اسٹریٹ میں داخل ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ کئی موٹروں کے ساتھ ایک مکان کے سامنے پرنس کی موٹر بھی موجود ہے۔ اسی کی بغل میں ٹیلر ماسٹر صاحب کی دکان اور قیام کا کمرہ تھا۔ ناصر ماموں سڑک پر کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ اپنے منجھے ہوئے دیہاتی تپاک اور خلوص سے کام

سے کر وہ فوراً مجھے اپنے کمرے میں لے گئے اور مجھے اس کا موقع ہی نہ مل سکا کہ میں پرنس کی گالی کے متعلق کچھ دریافت کر سکوں۔ چھوٹے سے کمرے میں صاف ستھری چاندنی کے فرش پر صاف ستھرا دسترخوان بچھا تھا۔ اور اُس پر خالی پلیٹیں، چمچے، گلاس سلیقے سے لگے ہوئے تھے۔ ٹیبل ماسٹر موجود نہ تھے۔ وہ کھانا لانے گئے تھے کہیں اس کا خاص طور پر انتظام کیا گیا تھا۔

میں نے کہا۔ "یہ بے کار ہی آپ حضرات نے اتنی زحمت اٹھائی۔"

ناصر ماموں نے بڑے زور سے "ہونہہ!" کہا اور خاموش ہو گئے۔ اسی سکوت کے عالم میں کمرے کی دیوار سے میں لگ کر بیٹھ گیا۔ یہ دیوار بغل والے مکان اور کمرے کے درمیان مشترک تھی اور بظاہر بہت پتلی تھی۔ اس لئے کہ اس طرف کی آوازیں اِدھر صاف صاف سُنائی دیتی تھیں۔ میرے بیٹھتے ہی ایک جانی پہچانی آواز نے پوچھا۔

"کیوں پیاری، کل تم تو اپنی چالوں میں ناکامیاب رہیں، اب کیا کرو گی؟ وہ دیہاتی بھولا ضرور ہے مگر اپنے اصول میں پکا ہے۔"

میں نے گھبرا کر ناصر ماموں سے پوچھا "یہ تو پرنس کی آواز معلوم ہوتی ہے۔"

انھوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے بولنے سے روکا اور سر ہلا کر میرے سوال کے جواب پر ہامی بھری۔

میں کان لگا کر پوری توجہ سے سُننے لگا۔ معلوم ہوا جیسے کسی نے گلاس سے کچھ پی کر اسے میز پر ذرا زور سے رکھا۔ پھر پرنس کی آواز آئی: "تم نے کوئی جواب نہ دیا شادی کو تو صرف پانچ دن رہ گئے ہیں!"

پھر مارجوری کی آواز آئی۔ "پہلے تو کل کے پانچ ہزار میں سے میرا حصّہ اِدھر بڑھاؤ۔ پھر میں تمھیں اپنی اسکیم بتاؤں گی۔"

بس معلوم ہوا کہ جیسے میرا سارا جسم سُن ہو گیا۔ میں انسان نہ تھا کوئی پتھر تھا۔ بالکل بے حس تھا۔ مگر کان میں آواز چلی آتی تھی۔

پرنس نے کہا: "قسم سے جو جھوٹ کہتا ہوں، واقعی جیب کٹ گئی تھی۔"

مارجوری نے کہا۔ "دیکھو پیارے ایسی باتیں کرو گے تو مجھ سے تم سے لڑائی ہو جائے گی۔ ہونہہ! کیا بہانہ تراشا ہے! جیب کٹ گئی!"

"تمھاری جیب کوئی کیا کاٹے گا؟ تم خود سینکڑوں کی جیب کاٹتے پھرتے ہو!"

وہ بولا "اچھا بھائی اچھا، خفا نہ ہو، نانی کے پاس چلو کر حصّہ بڑا ہو جائے گا۔ تم آگے کا پروگرام تو طے کر لو۔"

وہ بولی۔ "طے کیا کرنا ہے۔ نانی دس ہزار روپے جہیز کے نام سے وصول کرنے والی ہیں، پھر عین موقع پر اجیت شوہر اوّل ہونے کا مدعی بن کر آ جائے گا اور معاملہ رفع دفع کرنے کے سلسلے میں پچیس تیس ہزار جو کچھ مل رہیں تعجب نہیں!"

پرنس ہنسا: "نہیں تو اجیت خون خرابے پر تیار ہو جائے گا۔ اپنے پاس مولی تو موجود ہی ہیں!"

مارجوری نے ٹھنک کر کہا: "اور یہ بھول جاتے ہو کہ مجھے روز روز کے دونوں طرف کی گالیاں سننا پڑیں گی۔"

اور دونوں قہقہے لگانے لگے۔

اس قہقہے کی آواز سے میرے کانوں کی لویں جلنے لگیں۔ آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ جسم بھر میں آگ کا شعلہ سا دوڑ گیا۔ میں "حرامزادی" کہہ کر زینے کی طرف چلا۔ ناصر ماموں نے روکا، سمجھایا "میاں وہ ہوٹل نام کا ہے۔ اصل میں قحبہ خانہ ہے۔ بدقماش معاملہ شرابیوں، جواریوں، جیلیوں کا اڈا! تمھارا پرنس ان کا ایجنٹ ہے اور اس لڑکی کی نانی اُن کی سرغنہ ہے۔"

مگر مجھ پر بھوت سوار تھا۔ یہ بدمعاش پرنس میرا دوست بنا تھا، اور یہ بازاری قحبہ مارجوری میری بیوی میرے ہونے والے بچوں کی ماں بننے والی تھی۔ میں ان دونوں کے ناپاک وجود سے آج دنیا کو پاک کر کے چھوڑوں گا! میں ماموں کو دھکیلتا ہوا نیچے اُتر گیا اور دوڑتا ہوا ہوٹل میں داخل ہوا۔ پٹھان قسم کے دربان نے روکا۔ "اندر جانے کا اجازت نہیں!" میں نے اس کے منہ پر زور کا طمانچہ مارا: "کیا بکتا ہے پٹھان کے بچے!" اور میں نے کہا۔ "کہاں ہے وہ پرنس کا بچہ؟ اور کہاں ہے وہ مارجوری حرامزادی؟" چیختا زینہ پر چڑھنے لگا۔ دوسرے ہی زینے پر قدم رکھا تھا کہ دربان نے پیچھے سے پوری لاٹھی ماری اور میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

ہوش آیا تو اسپتال کے ایک کمرے میں تھا۔ ناصر ماموں گز بھر کا منہ لٹکائے ایک کرسی پر سرہانے کی جانب بیٹھے تھے۔ سچ پوچھو ایسا معلوم ہوا جیسے اماں ابا ہی نہیں اپنا پورا خاندان، پورا گاؤں میری عیادت، میری دیکھ بھال کے لئے آ گیا ہے۔ اب میں نہ اکیلا ہوں، نہ اب پردیس میں، انجانے دشمنوں میں گھرا ہوں، وہ جو تحت الشعور میں بے چارگی اور غریب الوطنی کا احساس تھا، وہ یک لخت جاتا رہا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا اتنا تھا، بے وقوف، دیہاتی ناصر ماموں میری لاٹھی بھی بن گئے تھے اور میری تلوار بھی، اور میرے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ ماموں کی پشت پناہی کے بعد تو میں پرنس، مارجوری اور اس کے دربان کو ٹھونک کر نہ رکھ دوں گا بلکہ اس پورے

ہوٹل کو توڑ پھوڑ کر پھینک دوں گا، میں نے اس لئے جلدی سے اُٹھ کر کھڑے ہو جانے کی کوشش کی۔ ناصر ماموں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اُٹھنے سے روکا۔ اور میں نے پہلی دفعہ صحیح طور پر یہ محسوس کیا کہ میں اسپتال میں ہوں، ہوٹل میں نہیں۔

میں نے پوچھا "میں یہاں کیسے آیا؟"

ناصر ماموں بولے۔ "کچھ نہیں میاں، جیسے ہی تم ہوٹل میں گھسے ویسے ہی ٹیلر ماسٹر بھی آ گئے اور ہم دونوں ایک ساتھ تمھارے پیچھے پیچھے جھپٹ پڑے دربان تم پر دوسرا وار کیا ہی چاہتا تھا کہ ہم نے اسے دھکیل دیا اور تمھیں ٹیکسی پر لاد کر یہاں لے آئے۔"

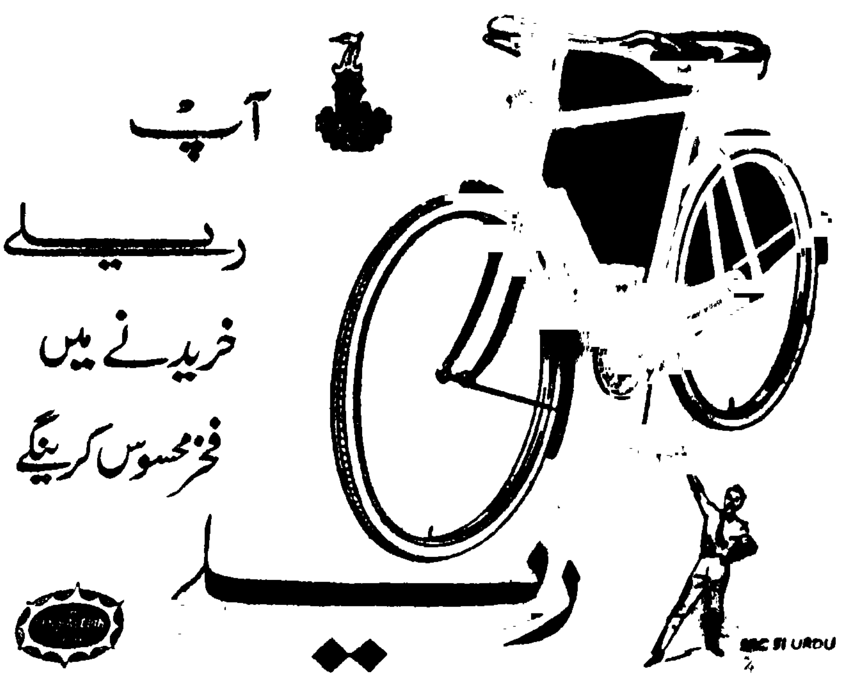
میں نے سر کے درد سے کراہ کر ہونٹوں پر زبان پھرائی۔ اور پوچھا "پولیس میں خبر کی؟"

وہ بولے "نہیں میاں۔ یہاں اسپتال میں یہی کہنا مناسب سمجھا کہ تم پھسل کر سِل پر گر پڑے تھے۔ دل میں سوچا کہ تم دُہری چوٹ کھا چکے ہو اب کیا عدالتوں میں رسوائی کی بھی مار تم ہی کھاؤ گے۔ ان بدمعاشوں کا تو یہی پیشہ ہے۔ وہ تو کہو میں نے انھیں تمھارے ساتھ دیکھ لیا۔ یہاں کے کارخانے تو روز دیکھا ہی کرتا تھا۔ اس لئے تم جیسے رئیس شہزادے کو ٹیلر ماسٹر کی کوٹھریا میں لے آیا۔ کہ تم خود دیکھ سن لو کہ تمھیں دیہاتی سمجھ کر یہ پاجی کس کس طرح لوٹ رہے ہیں!....."

میں نے ماموں کا سوکھا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "ماموں آپ کا شکریہ آپ نے جان بھی بچائی، عزت بھی!"

وہ بولے "واہ میاں واہ، یہ کون سی بات تھی، اپنے گاؤں والا روٹی کا نہ ہوگا تو بوٹی کا تو ضرور ہی ہوگا!" اور وہ اس طرح مسکرائے کہ ان کے لال لال مسوڑھے دکھائی دینے لگے"۔

اکرم بھائی نے ہم سب کے تعجب سے کھلے ہوئے منہ کو مُڑ کر دیکھا اور کہا "اور میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے اس وقت ماموں کے لال لال مسوڑھے بارجوری کے سفید چمکتے ہوئے دُردنداں سے کہیں اچھے اور خوبصورت لگے۔ اس لئے کہ اس کے دانتوں میں بھیڑیئے کے دانتوں جیسی تیزی اور چمک تھی اور ماموں کے مسوڑھوں میں وہ سُرخی جو بیمار کو دیئے جانے والے انار کے دانوں کا محبوب رنگ ہے!"



سحر رام پوری

غزل

کہاں تک اور جفائیں سیاہ راتوں کی — اٹل ہے، چند دھندلکوں کے بعد سورج بھی

سمجھ میں آئی ہے اُس وقت ان کی ناراضی — کہ مجھ سے پھول ہی بولے نہ چاندنی بولی

غمِ حیات کی سنجیدگی پہ طنز نہ ہو — یہ انگ انگ شرارت، ادا ادا شوخی

چمن میں جشنِ بہاراں کا ایک ردِّ عمل — بہت لبوں پہ ہنسی بھی ملی، تو زہر بھری

اُس انجمن میں غمِ صبح و شام کے بدلے — ہمیں بھی عارض و گیسو کی بات کرنی تھی

وہ پھول ہی نہیں، تارے بھی توڑ لائیں گے — جنھیں قبول ہیں دامن کے ساتھ کانٹے بھی

عروسِ زیست کے ماتھے پہ حادثوں کی لٹیں — غضب ہے، آج کی مشاطگی بھی دیکھا کی

بہ اعتبارِ ستم دیکھنا ہے گلچیں کو — تمھارے روپ میں آئی اگر بہار کبھی

یہ سطحِ ساغر و مینا پہ مے کے قطرے ہیں — کہ رو رہی ہے کسی کو، کسی کی تشنہ لبی

سحرؔ بنا کے محبت نے مجھ پہ ظلم کیا

کہ دشمنوں میں اضافہ ہے، دوستوں میں کمی

راز یزدانی

نظام کی انفرادیت

میاں نظام شاہ غزل گو شاعر تھے اور اس زمانے کے غزل گو تھے جب غزل "شیوۂ فرسودۂ ابنائے روزگار" ہی جسے نئی تھی اور غالب جیسے "مستقبل شناس" شاعر "ظرفِ تنگنائے غزل" میں "بقدرِ ذوق" کچھ کمی محسوس کر رہے تھے اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ نظام کی شاعری میں غزل کی داخلی واقفیت زیادہ ہے یعنی نہ وہ استاد ذوق کی طرح غزل کو موعظت کا پلندہ یا محاوروں کی ڈکشنری بناتے ہیں نہ غالب کی طرح عام نفسیاتِ انسانی کو اپنی غزل کی منزل سمجھتے ہیں بلکہ وہ صرف معاملاتِ حسن و عشق کے واقعاتی مترجم ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کی غزل گوئی اور ان کے تغزل کا میدان دوسرے شعراء کے مقابلے میں زیادہ تنگ اور دشوار گزار تھا۔ دشوار گزار یوں کہ ایک تنگ تر میدان میں منزل تک پہنچنے کے لیے نئے نئے راستوں کی تلاش ایک نسبتاً وسیع میدان کے مقابلے میں زیادہ مشکل ہے۔۔۔ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ ان کی شاعری میں انفرادیت کا پایا جانا ایک غیر محدود قسم کے غزل گو شاعر کے مقابلے میں زیادہ کمال کی بات ہے کیوں کہ ان کے یہاں "تنگنائے غزل" کا ظرف نسبتاً کم ہے اس لئے ان کے کلام میں "وسعتِ بیان" اور زیادہ غیر متوقع ہے۔ اس نظر سے جب ہم ان کے کلام کو دیکھتے ہیں تو ہمیں قدم قدم پر حیرت ہوتی ہے کیوں کہ انھوں نے اپنی غزل کے تنگ تر میدان کو طے کرنے کے لئے اپنی شعری قابلیت سے جس قدر کام لیا ہے وہ جرأت آمیز اور محنت مندانہ تصرفات بڑے بڑے بڑوں کے یہاں زیادہ وسیع میدان کا مسافر ہونے کے باوجود نظر نہیں آتے۔

ظاہر ہے کہ غزل کی داخلی کیفیات میں اظہارِ مدعا، ہجر و وصل اور رقیبانہ جذبات زیادہ ہوں گے۔ ان جذبات کو عام طور سے سب اظہارِ مدعا، محبوب کی بے پروائی، شدائدِ فرقت، اشتیاقِ ملاقات، رقیبوں کی محبوب رسی اور اپنی محرومی وغیرہ پر ہی محدود کر دیا جاتا ہے لیکن نظام نے ان مضامین کی عام سطحیت میں وہ نوک پلک نکالے ہیں کہ ہمیں بے اختیار مرثیہ کا محدود میدان اور میر انیس کی وسعتِ بیان یاد آ جاتی ہے یعنی جس طرح میر انیس نے مرثیہ میں اپنی وسعتِ بیان کے لحاظ سے ایک ایسی انفرادیت پیدا کی ہے کہ ان کے بعد ساقی نامہ، بہار اور دوسرے نئے نئے گوشوں کی ایجاد کے باوجود مرثیہ کوئی دوسرا انیس نہیں پیدا کر سکا اسی طرح غزل کی داخلی کیفیات میں نظام اپنی انفرادیت کی وجہ سے ابھی تک تنہا ہیں اور ان کا کوئی ہم سفر نہ ان سے پہلے تھا نہ ان کے بعد ہوا۔ نظام کی یہ خصوصیت ان کی ادا نگاری اور معاملہ بندی میں زیادہ قابلِ توجہ ہے لیکن ان کی ادا نگاری اور معاملہ بندی کا ذکر کرنے سے پہلے میں تغزل کی عام داخلی روایات کے سلسلہ میں اس کا ذکر مناسب سمجھتا ہوں کیوں کہ ادا نگاری اور معاملہ بندی میں تو ان سے پہلے اور ان کے بعد ان کے حریف ہو سکتے ہیں مثلاً سوز، جرأت وغیرہ اور یہ صورت محدود مقابلے کی ہے لیکن جس انفرادیت کا میں ذکر کر رہا ہوں اس میں ہر غزل گو شاعر سے ان کا مقابلہ ہے اور ظاہر ہے کہ جب ایسے وسیع تر مقابلے میں وہ منفرد ہوں تو چند حریفوں کے مقابلے میں تو انھیں کامیاب ہونا ہی چاہیئے۔ اب دیکھیئے کہ اس زیادہ مشکل میدان کو نظام کس آسانی سے طے کرتے ہیں ؎

دمِ رخصت تو اس کو دیکھنے دے — کیا تجھے چشمِ اشک بار رہا

وہ لطفِ انتظار وہ سامانِ وصل ہے — دل کو شبِ فراق میں بھی اک سرور تھا

میں تو ناصح کی بات پر خوش ہوں — تذکرہ یار بار ہے کس کا

کچھ بات تو خلافِ طبیعت نہیں سنی — یہ شکر ہے کہ واں سے پھرا نامہ بر نہیں

بوسہ تو میسر ہوا اس نقشِ قدم کا — پھر کیوں نہ ہوں میں کوچۂ اغیار کے صدقے

کیا کیا بوسے لے کے ہائے نظام　　　نقشِ پا کو مٹا دیا میں نے

اس قسم کے اشعار نظام کے دیوان میں بہ کثرت پائے جاتے ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عام اور گفتہ مضامین کہتے وقت بھی وہ اپنی انفرادیت کے اظہار کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے مثلاً رقیبانہ جذبات۔ ظاہر ہے کہ ان جذبات میں کوسنے اور گالیاں ہی متوقع ہیں لیکن نظام کے یہاں اس موقع پر بھی ایک ایسا پہلو پایا جاتا ہے جس سے ان کی انفرادیت کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ علی الخصوص یہ شعر کہ

تیرا ملنا تو اک قیامت ہے　　　غیر کا حال کیسا ہوا ہوگا

کیا دنیائے ادب اردو میں نظام کے اس شعر کی معاملہ فہمی، بلاغت، انداز فکر اور اسلوب بیاں کا کوئی جواب ہے

غیر سے کہنا تھا مرا حالِ زار　　　ہائے غضب آپ نے یہ کیا کیا

کتنی مصلحتیں ہیں جن کو نظام نے دوسرے مصرع میں پوشیدہ کر دیا ہے۔

نازبرداریوں کا غیر کی ذکر　　　آپ نے کیوں مجھے خفا جانا

رقیب کی نیازمندانہ نازبرداریاں اور زبانِ محبوب لیکن نظام اس پر تلملا اٹھنے کی جگہ کچھ اور سوچتے ہیں۔ آخر اس کی مصلحت کیا ہے۔ دل کی یہ آواز ان کے دماغ میں گونجتی ہے اور وہ قیاس کرتے ہیں کہ شاید محبوب نے ان کی طرف سے کوئی رکاوٹ محسوس کی۔ نظام اپنے محبوب کو اغیار سے ترکِ وفا پر آمادہ کرنا چاہتے ہیں لیکن کس طرح۔ ان کا محبوب انھیں بے وفا کہہ دیتا ہے اور وہ فوراً ہی جواب دیتے ہیں

تو بھی وفا عدو سے نہ کر بے وفا نہ ہو　　　میں نے وفا کی تجھ سے تو میں بے وفا ہوا

اب کچھ ایسے شعر سنئے جن پر میں کچھ لکھنا نہیں چاہتا

کچھ کسی بات کا خیال بھی ہے　　　غیر کے سامنے گلا میرا

تمھیں تو جاتے کسی نے کہیں نہیں دیکھا　　　کسی کو تم نے بھی دیکھا ہے غیر کے در پہ

جواب اس کا جو لکھو ہاں وہ دکھانا　　　مجھے غیر کا خط دکھلانے سے حاصل

کہنا نہ تھا کسی سے بھی دل کا معاملہ　　　دشمن کے سامنے گلۂ دوستدار حیف

ملنے سے ترے یہ کچھ ڈرا ہوں　　　دشمن کی بھی خیر مانگتا ہوں

پھر بھی آتا اسی کے سر کی قسم　　　جس کسی سے تمھیں محبت ہو

لطفِ دشنام بھی ہم کیا جانیں　　　یہ بھی دشمن ہی کی قسمت ہوگی

بے داغِ رشک کھائے نہ مرنا نصیب ہو　　　کرنا پڑی عدو کے لئے اب دعا مجھے

آخری شعر میں بددعا کو دعا بنا کے پیش کرنا اور اس طرح کہ رقیب کے لئے بددعا اور اپنے لئے دعا نظام ہی کا حصہ ہے۔ معاملاتِ عشق و محبت، مضامینِ عہد و پیماں اور قول و قسم بھی عام طور سے کہے جاتے ہیں لیکن نظام اس شوخی سے، اس جگہ بھی اس کی انفرادیت موجود ہے

گو جھوٹ ہو، دھوکا ہو تسلّی تو ہے دل کو
ہوتا ہے قلق اور جو وعدا نہیں ہوتا

منہ پھیر کے ہنس ہنس کے وہ اقرار کی باتیں
اس طرح سے کرتے ہیں کہ باور نہیں آتا

آپ آئیں اور اپنے وعدے پر　　　اور قسم بھی تو میرے سر کی قسم

اور رشکِ عدو بڑھانے کو　　　تھا عدو ہی قسم بھی کھانے کو

یقیں کیوں کر نہ آنے گا ہمیں آپ آئیں گے
قسم سچی جو ہوتی ہے ہمارے سر کی ہوتی ہے

شبِ وصل کی کیفیتوں کا ذکر تو میں ادا نگاری کے تحت کروں گا۔ شبِ ہجر اور انتظار کی کیفیت یہاں دیکھ لیجئے

کچھ کا کچھ حال ہو گیا ہوتا　　　اور دم بھر اگر نہیں آتا

موت آ جائے ہجر میں شاید　　　اس کے آنے کا اعتبار نہیں

کب تلک رو دئیں کب تلک تڑپیں　　　شبِ غم کی سحر نہیں ہوتی

مر گئے انتظارِ مرگ میں ہم　　　اب نہ آئے اگر نہیں آتی

محبوب سے عرضِ التجا کے بعد محبوب کی حالت اور اس پر عاشق کا ردِ عمل دیکھئے

گو نہ کہا عرضِ تمنا پہ کچھ　　　منہ کو وہ لیکن مرے دیکھا کیا

ایسا تو کسی پہ تمھیں غصّا نہیں آتا
ہاں سچ ہے مجھے بات کا کہنا نہیں آتا

مطلب تو مری بات کا وہ پائے ہوئے ہیں
منہ پھیر کے چپ بیٹھے ہیں شرمائے ہوئے ہیں

میں اپنا حال کہہ کے پشیماں ہوں آپ ہی
وہ سر جھکائے بیٹھے ہیں فکرِ جواب میں

ان تمام مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظام نے گفتہ مضامین کے میدان کو کس طرح انوکھے پن کے ساتھ طے کیا ہے کہ ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ نظام کا شمار اپنے عہد کے ترقی پسند شعرا میں ہونا چاہیئے کیوں کہ ترقی پسندی درحقیقت کسی چیز کو اس کی موجودہ حیثیت سے آگے بڑھا دینا ہی تو ہے۔ نظام نے ہر گفتہ

مضمون میں نئے نئے گوشے تلاش کرکے اسے آگے بڑھایا اور زندگی سے قریب لانے کی کوشش کی ہے۔ اب میں چند شعر ایسے پیش کرتا ہوں جنھیں میرؔ کے کلام میں ملا دیا جائے تو ناواقف کو یہ محسوس نہ ہو کہ وہ میرؔ کے نہیں ہیں ؎

تم سے کچھ کہنے کو تھا بھول گیا — ہائے کیا بات تھی کیا بھول گیا
بھول جاؤں جو وہ صورت دیکھی — شکوۂ جور و جفا بھول گیا
خوش ہوں اس وعدۂ فراموشی پر — اس نے ہنس کر تو کہا بھول گیا
تمھیں یہ بھی کبھی خیال آیا — کہ کوئی راہ دیکھتا ہوگا
آج کل آپ سے باہر ہے نظام — اپنی محفل میں نہ بلوا بیٹھے گا
آپ ہی پھر اس کو دیتے ہیں اکا کر — مشورہ جو دل سے ہم کرتے ہیں ہم
اس بزم سے اُٹھ جاتے ہیں جب ہو کے خفا ہم
رہ رہ کے خیال آتا ہے کہ بیٹھے یہ کیا ہم
یوں ہم کو نہ دل سے تم بھلاؤ — دیکھو کبھی یاد آئیں گے ہم
گئے وہ تو جہاں جانا تھا ان کو — اب ان کا نقش پا ہے اور میں ہوں
بزم میں اور سب تو باتیں ہوں — جیسے ہم بے بلائے بیٹھے ہیں
وہ مجھے راہوں میں بھی آ جائیں تو آنسو پہ چھپوں
بستر اپنا پسِ دیوار کروں یا نہ کروں
تم بھی تو ذرا ادھر کو دیکھو — میں دیر سے تم کو دیکھتا ہوں
اپنے جھوٹے تپاک کو دیکھو — اور میرے یقین لانے کو
ہم بھی مر کر عذاب سے چھوٹے — آپ بھی داخلِ ثواب رہے
پھر کہا اس طرح کہ مان گئے — قول ان کا نہ مانتے کیسے
آپ ہم جا کے مل گئے اُن سے — یہ نہ کرتے تو اور کیا کرتے
یہی کہئے مری بلا آئے — وہ بھی تو میرے گھر نہیں آتی
اس کی خوشی میں نیند نہ آئی تمام رات — کچھ ایسی بات وہ مجھے سمجھا کے سو رہے

معاملہ بندی

معاملہ بندی کا ذکر کئے بغیر نظام کے محاسنِ کلام ادھورے رہ جاتے ہیں۔ معاملہ بندی اور ادا نگاری میں معنوی حیثیت سے زیادہ فرق نہیں ہے کیوں کہ جو شعر معاملہ بندی کے تحت آتے ہیں ان میں زیادہ تر ادا نگاری ہی ہوتی ہے۔ معاملات جیسا کہ کہتے ہیں نظام اس میدان میں جرأت اور سوز سے بہت بلند ہیں ادا نگاری اور معاملہ بندی کو شعر میں آسانی کے لئے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک نفسیات اور دوسرا لگاوٹ۔

نفسیات

معاملہ بندی اور ادا نگاری کی پہلی اور آخری منزل نفسیات ہے۔ درحقیقت لگاوٹ نفسیات ہی کا ایک حصہ ہے لیکن ان دونوں کو جداگانہ طور پہ بیان کرنا مطلب کو واضح کرنے کے لئے آسان ہوگا۔ ایک مخصوص ماحول کے ضروری حصے بیان کرکے اس ماحول میں پھنسے ہوئے انسان کے اس وقت کے جذبات کی صحیح ترجمانی نفسیات سے گہری واقفیت کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے اور نفسیات کا یہ گہرا مطالعہ موجودہ طریقۂ تعلیم پر ہی مبنی نہیں ہے اس میں کمال سوچ بچار کی قوت اور مشاہدے سے پیدا ہوتا ہے یہی وہ منزل ہے جہاں نظام کا سٹور سٹری اردو کے تقریباً ہر شاعر سے آگے نظر آتا ہے اور معاملاتِ دل و نظر پر اس کے اوریجنل ابزرویشن (ذاتی مطالعہ) کا پتہ معاملہ بندی کے اسی مقام سے چلتا ہے ؎

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دئے مسکرا کے ہاتھ

مطلع کا پہلا مصرعہ سامع کو اپنے مقرر کردہ ماحول میں پہنچا دیتا ہے اور اس ماحول کی ایک ایسی مبہم تشریح کرتا ہے جس میں محبوب اور احباب دونوں شامل ہو سکتے ہیں مثلاً آپ اپنے کسی دوست کے کمرے میں ایسے وقت چلے جائیے جب وہ نہا کر آئینہ کے سامنے بال بنا رہا ہو ذرا دبے تکلفی سے) پھر اس کی ندامت آمیز ہنسی دیکھئے اور نظام کا مطلع پڑھیئے، اور اگر کہیں محبوب کے ساتھ یہ واقعہ گزر جائے تو وہ ہنسی جسے نظام نے یوں کہا ہے کہ "چھوڑ دئے مسکرا کے ہاتھ" فانی کی دیکھی ہوئی اس ہنسی سے زیادہ قیامت خیز ہے جس کو اس نے ان الفاظ میں کہا ہے

اک برق سرِ طور ہے لہرائی ہوئی سی — کیوں کہ فانی کی دیکھی ہوئی ہنسی محض ہنسی ہی تھی اور نظام کی دیکھی ہوئی ہنسی میں محبوب کا اندازِ ندامت یعنی نفسی کیفیت بھی شامل ہے ؎

کہیں اس بزم میں رسائی ہو — پھر کوئی دیکھے اہتمام مرا

یہ تصویر بھی کاروبارِ محبت اور محبوب تک محدود نہیں جس سوسائٹی میں دخیل ہونے کی انسان مدت سے تمنا رکھتا ہو اس کی یہ تمنا پوری ہوتی نظر آئے تو پھر کوئی دیکھے اہتمام اس کا۔ دوڑ دھوپ۔ نک سک اور اچھے بُرے کا خیال آدابِ نشست و برخاست کی تگ و دو۔ لباس کی تراش خراش اور زیب و زینت کا اہتمام اسے باؤلا سا بنا دیتا ہے۔ پھر کوئی دیکھے اہتمام مرا۔ ایک ایسا آئینہ ہے اس

صورت حال کا۔ جس میں تمام پس منظر۔ اپنی تمام بے چین کر دینے والی کیفیات کے ساتھ اس صفائی کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے کہ پس منظر کا ہر گوشہ انتہائی ساحرانہ اور جادو گرانہ فن کاری کے ساتھ نمایاں ہے۔ پھر کوئی دیکھے اہتمام مرا۔ نظام کے انتخاب کئے ہوئے پانچ نغموں کے اس مجموعہ میں کیا نہیں ہے یا کیا ہے جو اس احاطے سے خارج ہے ؎

غضب وہ دیکھنا نیچی نظر سے ـــــ ستم وہ مسکراتا منہ پھرا کر

وہ الٹی سیدھی کہہ کر ناحق مجھے رُلا کر ـــــ اس بت کا دیکھنا پھر نظریں چُرا چُرا کر

ہائے مایوس چلے تو ہیں نہ پوچھو پر کچھ   دیکھیے پھر پھر کے کس ارمان سے ہم دیکھتے ہیں

ان اشعار میں جو تصویریں پیش کی گئی ہیں اُن کی بے ساختگی اور صداقت پر کس کے دل میں کسک پیدا نہ ہوگی ؎

انداز اپنے آئینہ میں دیکھتے ہیں وہ   اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

یہ انسان کی ایک عام کمزوری ہے کہ آئینہ سامنے پڑ جائے تو وہ کسی حال میں کیوں نہ ہو بے ساختہ آئینہ میں اپنی سج دھج دیکھنے لگتا ہے خواہ ایک نظر ہی ہو بلکہ ایسی نظر جو بظاہر نگاہ سے کم ہو اور چوں کہ ہر شخص یہ بھی جانتا ہے کہ یہ عام انسانی کمزوری ہے اس لئے وہ کنکھیوں سے ایسے مواقع پر یہ بھی دیکھ لیتا ہے کہ کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ آپ ملک کے کسی بڑے سے بڑے آدمی کے ساتھ کسی ایسی گیلری میں جا رہے ہوں جس میں قدِ آدم آئینے نصب ہوں تو بھی آپ کی چور نظر آئینہ پر ضرور پڑے گی اور کہیں وہ بھی اسی وقت آئینہ کی طرف دیکھ لے تو نگاہوں کا یہ تصادم ـــ اب میں چند ایسے اشعار پیش کرتا ہوں جن میں اُتاری ہوئی تصویریں ادب اردو میں منفرد اور نایاب ہیں ؎

ٹھکیلیوں سے چلتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ   مڑ مڑ کے دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

اس کا وہ نیچی نیچی نگاہوں سے دیکھنا   اور یہ بھی دیکھنا کہ مجھے دیکھتا نہ ہو

چھپ چھپ کے دیکھتے تو ہو اس شوخ کو نظام ـــــ یہ بھی خیال ہے وہ کہیں دیکھتا نہ ہو

بے ساختہ نگاہیں جو آپس میں مل گئیں   کیا منہ پہ اس نے رکھ لئے آنکھیں چرا کے ہاتھ

دینا وہ اس کا ساغرِ مے یاد ہے نظام ـــــ منہ پھیر کر اُدھر کو اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

چھپ چھپ کے دیکھنے کا مزہ دیکھتے نظام ـــــ بے خبر گزری اس کی اِدھر کو نظر نہ تھی

نہ بن آیا جب کوئی ان کو جواب   تو منہ پھیر کر مسکرانے لگے

یہ ہے نظام کی نفسیات دانی۔ نفسیات کے کتنے گہرے مطالعہ کا پتہ چلتا ہے ان اشعار سے۔

لگاوٹ

اظہارِ جذبات کے اس نفسیاتی پہلو کو نمایاں کرتے ہوئے جب کوئی فن کار یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ ان جذبات کا اظہار کرنے والا جان بوجھ کے اظہار کا ایک ایسا غلط طریقہ اختیار کرنا چاہتا ہے جس سے اس کا مقصد انکار سے اقرار ہو تو اس صورت حال کو اسی تذبذب آمیز طریقۂ بیان میں کہہ دینا لگاوٹ کہلاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں فن کار کے مطالعۂ نفس کا بھرم کھلتا ہے اور اکثر اس کی قابلیت کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں داغ کی حسن پرستی اور عاشق مزاجی نے اور امیر کی مولویت نے ان کے اختیار کردہ اسلوب بیان کو سوقیت سے ملا دیا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں لگاوٹ مصنوعی اخلاق کا ساتھ نہ دے سکے تو شعر کچھ اس قسم کا ہو جاتا ہے ؎

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے   اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی

درحقیقت لگاوٹ نیچر کے خلاف ہوتے ہوئے نیچر سے بڑا قریبی تعلق رکھتی ہے۔ سُنا ہے کہ کسی مصور نے سبزہ زار کی ایک بڑی سی تصویر بنا کے سرِ راہ رکھ دی تو سامنے سے آتی ہوئے گائے نے اُسے لہلہاتی ہوئی گھاس سمجھ کے اس پر منہ مار دیا۔ بس یہ ہے آرٹ اور نیچر یعنی آرٹ پر نیچر کا دھوکا نہ ہو تو وہ فن کاری نہیں فن کاری کی توہین ہے۔ اسی طرح اگر لگاوٹ پر صحیح کیفیتِ مزاج کا دھوکا نہ ہو تو وہ خود بھی دھوکا ہے۔ گویا یہ دھوکا اس طرح کا کھلا دھوکا نہیں ہونا چاہیئے جیسے ؎

انکار سے کسی نے مجھے کیا مزا دیا   سینے پہ چڑھ کے اس نے خم سے پلا دیا

(داغ)

اس شعر میں "خم سے" داغ کے سارے لگاوٹ بھرے ہوئے انکار کو لے ڈوبا۔ یا جیسے محبوب کی انگڑائی کی لگاوٹ کو بیان کرنے میں ایک دوسرے فن کار نے ٹھوکر کھائی ہے ؎

حسبِ منشا دلِ پُر شوق کی باتوں کا جواب   دے دیا شرم میں ڈوبی ہوئی انگڑائی نے

اس شعر میں "حسبِ منشا" اور "شرم میں ڈوبی ہوئی انگڑائی" نے اس کو لگاوٹ کی حد سے گزار کر سوقیت تک پہنچا دیا۔ درحقیقت لگاوٹ کو صحیح طور پر بیان کرنا غیر ممکن ہے جب تک نفسیات کے گہرے مطالعہ کے ساتھ مومن کی شاعرانہ خصوصیت یعنی بیان میں ایسے لطیف خلا چھوڑنے کی قدرت نہ ہو جنھیں سامع کا ذہن خود پورا کرے اور شاعر کی منشا کے مطابق پُر کرے مثلاً ؎

وہ نیچی نیچی نگاہوں سے دیکھنا مجھ کو   وہ پیار تکیہ کو کرنا لگا کے سینے سے

اس شعر میں بھی دلِ پُر شوق کی باتوں کا جواب حسبِ منشا ہی ملا ہے لیکن نہیں

"حرفِ مدعا" کی تشریح ہے نہ "عرضِ حال" ہے نہ جواب کی مبہم کیفیات کو واضح کرنے کے لئے عرضِ مدعا جیسا کوئی لفظ۔ اور ان ہی تمام محذوفات نے شعر کو لگاوٹ کا شہکار بنا دیا ہے۔ ان تو ذکر لگاوٹ کی دل کشی کا تھا۔ سنئے اور نظام کی فنکاری کی داد دیجئے

دو یوں مسکرا کر نہ منہ پھیرتے — نہ منظور ہوتا اگر دیکھنا

میرے نالوں کو سن کے کہتے ہیں — دل یہاں ایسا موم کا ہوگا

یہاں ایسا موم کا ہوگا میں کس لگاوٹ سے اثر کا اعتراف کیا گیا ہے۔

عاشق نے ایک دن پیچھے سے محبوب کا دوپٹہ اٹھا لیا اور اس کی جگہ نیا دوپٹہ رکھ دیا اب سنئے

بیٹھے ہیں ہم تو ضبطِ ہنسی کو کئے ہوئے — کہتے ہیں وہ کہ کس سے دوپٹا بدل گیا

نظام میں بڑی خوبی یہ ہے کہ نفسیات ہوں یا لگاوٹ وہ دو طرفہ جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور حاضر و غائب دونوں قسم کے ماحول میں سے

کہتے ہیں مجھ کو سنا کر جو طبیعت ہے اداس — کسی کم بخت نے جل کر ہمیں کوسا ہوگا

وہ اشاروں میں اس کا کہنا ہائے — دیکھو اپنے پرائے بیٹھے ہیں

وہ دورِ پہم کے شبِ وصل اس کا یہ کہنا — کوئی الگ ہی کو بیٹھا رہے قرینے سے

شاد عارفی

غزل

پاسدارِ لامکاں ہے ہر مکانِ کوئے دوست — دوست ہی چاہے تو مل جائے نشانِ کوئے دوست

جھوٹ بھی کیا کہہ رہے ہیں واقفانِ کوئے دوست — کون دیوانوں کو بتلائے نشانِ کوئے دوست

اولاً ہر موڑ پہ کچھ ناصحانِ کوئے دوست — اور ان کے بعد، جبرِ پاسبانِ کوئے دوست

یہ تو ایسا ہے کہ جیسے کوچۂ دار و رسن — ہم نہ جانے کر رہے تھے کیا گمانِ کوئے دوست

شام ہوتے ہی بکھر جائیں گے تارے راہ میں — شام تک سوتی رہے گی کہکشانِ کوئے دوست

کوئی سوچے تو، جبیں سائی کا حاصل کیا رہا — نامکمل چھوڑتی ہے داستانِ کوئے دوست

جب شفق کی آڑ میں کوئی سرِ بام آ گیا — جگمگا اٹھی فضائے آسمانِ کوئے دوست

ہر صداقت رنگ لاتی ہے مگر تاخیر سے — دوست بنتے جا رہے ہیں دشمنانِ کوئے دوست

آج کل راتیں بڑی ہیں اس لئے دن گھٹ گیا — تھے کبھی ہم لوگ بھی شایانِ شانِ کوئے دوست

ریشمیں پردوں سے، نازک چلمنوں کی آڑ سے — جھانکنے لگتا ہے مجھ کو ہر مکانِ کوئے دوست

شاد، بیچارے قصیدے بھی تو کہہ پاتے نہیں
تاجرانِ عصمتِ فن، مدح خوانِ کوئے دوست



دلّی میں محرم الحرام



'المسعودی ہزار سالہ برسی' کا افتتاحی اجلاس

علی گڑھ میں 'المسعودی ہزار سالہ برسی' اور 'کُل ہند علومِ اسلامیہ کانفرنس'



کُل ہند علومِ اسلامیہ کانفرنس کا اجلاس



'المسعودی ہزار سالہ برسی' کے دوسرے اجلاس میں پروفیسر جی، ای، فان گرونے بام (صدر) تقریر کر رہے ہیں۔





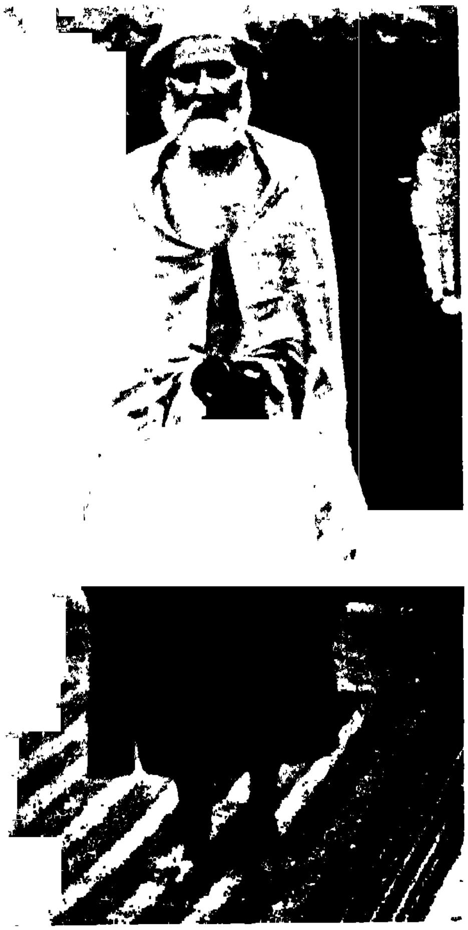


کل ہند علوم اسلامیہ کانفرنس
کے موقع پر مخطوطات اور مطبوعہ
کتابوں کی نمائش









میر امداد علی علوی قلندر تھانوی
آپ کی شخصیت اور شاعری پر
محمد سخاوت مرزا کا مضمون صفحہ ۴ پر
ملاحظہ فرمائیں



منشی نوبت رائے نظر لکھنوی
آپ کے بارے میں منوّر لکھنوی کا
مضمون بعنوان 'رہنما کے قدموں میں'
صفحہ ۸۳ پر درج ہے ۔

المسعودی کی ہزار سالہ برسی

اس سال کے شروع میں ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ اور انڈین سوسائٹی فار ہسٹری آف سائنس کے زیر اہتمام "المسعودی" کی ہزار سالہ برسی اور پہلی کل ہند علوم اسلامیہ کانفرنس علی گڑھ میں منعقد کی گئیں۔

"المسعودی" دسویں صدی عیسوی کا ایک اہم عرب مورخ، جغرافیہ داں اور سیاح گذرا ہے۔ وہ بغداد کا رہنے والا تھا۔ اس نے ایشیا اور افریقہ کے متعدد مقامات کا سفر کیا۔ دسویں صدی عیسوی کے پہلے نصف میں مسعودی ہندوستان آیا اور یہاں دو برس تک مقیم رہا۔ اس نے اس عہد کے ہندوستان کے حالات بڑی تفصیل سے قلمبند کئے ہیں۔ ان تحریروں میں ہندوستان کی تہذیب، فلسفہ، مذہب اور دیگر علوم کے لئے بڑی تعریف و توصیف پائی جاتی ہے۔ اس ہزار سالہ برسی کے انعقاد کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ہندوستان کو عرب ممالک سے متعارف کروانے میں مسعودی نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کا اعتراف کیا جائے۔

افتتاحی اجلاس کی صدارت جناب آصف علی اصغر فیضی وائس چانسلر جموں کشمیر یونی ورسٹی نے کی۔ اس اجلاس میں ہندوستانی مؤرخین اور علماء کے علاوہ امریکہ، سوویت یونین، انگلستان، ایران اور لبنان کے مشہور علماء نے بھی شرکت کی۔

صدر جمہوریۂ ہند نے جشن ہزار سالہ برسی کے لئے حسب ذیل پیغام ارسال فرمایا۔

"مجھے مسرت ہے کہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ عرب عالم اور سیاح المسعودی کی جو دسویں صدی عیسوی کے ابتدائی حصے میں ہندوستان آیا تھا، ہزار سالہ برسی منا رہی ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ اپنے تذکروں میں اس نے ہماری تاریخ کے اس دَور پر روشنی ڈالی ہے۔ جس کے بارے میں مستند معلومات کم ملتی ہیں۔ ہرش کی وفات اور پہلی مسلم سلطنت کے قیام کے درمیانی وقفے کے بارے میں ہمارا علم اب تک سرسری نوعیت ہی رکھتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے مسعودی کی تحریروں کا مطالعہ خاص طور پر خوش آئند ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ تاریخ ہند میں دلچسپی رکھنے والوں کے فائدے کے لئے المسعودی کی تحریروں کو شائع کرنے کا انتظام کر سکے گا۔

اس موقع پر اس اہم اقدام کی تعریف کرتے ہوئے میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی "مجلس جشن مسعودی" تک اپنی نیک تمنائیں پہنچانا چاہتا ہوں اور اس تقریب کی کامیابی کے لئے دُعا کرتا ہوں۔"

صدر جمہوریۂ ہند کے پیغام کے علاوہ نائب صدر جمہوریہ ہند، وزیر اعظم ہند، عراق کے شاہ فیصل الثانی، صدر جمال عبدالناصر، پروفیسر ہملٹن گِب (ہارورڈ یونیورسٹی)، جیرا لمیتوف، اکیڈمی آف سائنس (سوویت یونین) پروفیسر اے۔ جے۔ آربری (کیمبرج)، پروفیسر ٹی۔ لیونسکی (کریکاف یونی ورسٹی) پروفیسر ایس۔ ایچ تقی نادر (کولمبیا یونی ورسٹی) وغیرہ کے پیغامات بھی موصول ہوئے۔

تقریب کے دوسرے دن المسعودی کی زندگی اور تاریخ، فلسفہ، جغرافیہ اور ادب میں اس کی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر چودہ مقالے پڑھے گئے۔

تقریب کا تیسرا دن کل ہند علوم اسلامیہ کانفرنس کے لئے وقف رہا۔ کانفرنس کے دو اجلاس منعقد ہوئے۔ جن کی صدارت ڈاکٹر سید عبداللطیف اور ڈاکٹر محمد نظام الدین نے کی۔ اس کانفرنس میں ہندوستانی جامعات میں علوم اسلامیہ کے اغراض و مقاصد اور ان کی تعلیم کے مسائل پر غور و خوض کیا گیا۔ اس کے علاوہ ہند میں علوم اسلامیہ پر ہونے والے تحقیقی کاموں کی تنظیم اور ان کی نشر و اشاعت کے امکانات بھی زیر بحث آئے۔ اس مباحثہ میں مولانا حفظ الرحمن ممبر پارلیمنٹ، ڈاکٹر کے۔ ایم اشرف، امتیاز علی عرشی، مولوی مجیب اللہ ندوی، سعید احمد اکبر آبادی، ڈاکٹر سید احمد، محمد سلیمان عباس اور ڈاکٹر عبدالعلیم نے حصہ لیا۔

آخر میں کانفرنس نے ایک قرارداد منظور کر کے یہ طے کیا کہ ہر دو سال میں ایک کل ہند کانفرنس منعقد کی جایا کرے اور علوم اسلامیہ پر تحقیق اور اُن کی نشر و اشاعت کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ اس مقصد کے لئے ایک ٹھوس کمیٹی کے قیام کا اعلان کیا گیا۔

ان تقریبات کے علاوہ علوم اسلامیہ سے متعلق کتابوں کی ایک نمائش بھی منعقد کی گئی، جس میں نادر فارسی اور عربی مخطوطات شامل تھے۔ اور مسلم ممالک کی زندگی کے بارے میں متعدد [illegible]، خاکے اور تصویریں دکھلائی گئی تھیں۔

ہارون خاں شروانی

آپ بیتی

مولانا آزاد سے میری ملاقاتیں

۱۹۱۲ء

میں لندن میں قیام تھا۔ چند بعد طیلسانی (پوسٹ گریجویٹ) پگڑوں میں شریک ہو رہا تھا۔ والد محترم حاجی محمد موسیٰ خان شروانی کبھی کبھار اُردو کتابیں اور رسالے بھیج دیا کرتے تھے۔ جولائی کا آخری ہفتہ تھا کہ ایک پیکیٹ میرے پاس پہنچا کھولا تو کلکتہ کا رسالہ "الہلال" نکلا۔ ایڈیٹر احمد ابوالکلام آزاد۔ نام یوں ہی اڑتا اڑتا سنا تھا۔ معلوم تھا کہ ایک نوجوان عالم اور انشا پرداز ہیں۔ مگر یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کتنے قابل ہیں۔ اکسفرڈ کی تازہ ڈگری لئے ہوئے ہر نوجوان سمجھتا ہے کہ میں بامِ علم پر پہنچ چکا ہوں مگر پرچہ کھولا تو اگر اس طرح کا کوئی احساس برتری تھا تو وہ آناً فاناً ختم ہو گیا دیدہ زیب ٹائپ، تصویروں کا عصری معیار، غضب کی علمیت، مضامین کا معیار کسی دوسرے رسالے سے کم نہیں۔ اسلوب دل میں اتر جانے والا ان سب باتوں کا مجھ پر خاص اثر پڑا۔ اس وقت تک جو بھی رسالے اُردو زبان میں چھپتے تھے وہ مبتذل کاغذ، خراب چھاپے، اور اس سے بھی خراب ترکیب سازی کا نمونہ ہوتے تھے۔ یوں تو سید احمد خاں نے ۱۸۷۷ء ہی میں اردو صحافت کے لئے نسخ ٹائپ کو رواج دے دیا تھا۔ مگر یہ تحریک ان ہی کے ساتھ دفن ہو چکی تھی اب اس کا احیاء ابوالکلام آزاد کر رہے تھے اور اس آب و تاب سے کر رہے تھے۔

رسالے کا سرورق اُلٹا تو اداریے پر نظر پڑی اس میں ابوالکلام نے گویا آپ بیتی قلمبند کی تھی:۔

"۱۹۰۶ء کی آخری راتیں تھیں جب امرت سر میں میری چشم بیدار نے ایک خواب دیکھا۔ انسان کے ارادوں اور منصوبوں کو جب تک وہ ذہن و تخیل میں ہیں عالم بیداری کا ایک خواب سمجھنا چاہیئے۔ کامل چھ برس اس کی تعبیر کی عشق آمیز جستجو میں صرف ہو گئے۔ اُمیدوں کی خلش اور ولولوں کی شورش نے ہمیشہ مضطرب رکھا اور یاس و قنوط کا ہجوم بارہا حوصلہ اور عزم پر غالب ہو گیا۔۔۔ یہاں تک کہ آج اس خوابِ عزیز کی تعبیر عالم وجود میں پیش نظر ہے۔۔۔۔"

اداریہ کافی طویل ہے اور کئی صفحوں پر مشتمل ہے۔ آخر میں ایڈیٹر نے جو دعا خداوند عالم سے کی ہے اسے اُردو زبان کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ سمجھنا چاہیئے:۔

"اس حی و قیوم سے یہ آخری التجا ہے کہ اگر وہ مجھ میں سچائی اور خلوص کی کوئی سرگرمی دیکھتا ہے، اگر اس کی ملت مرحومہ اور اس کے کلمۂ حق کی کوئی سچی تپش میرے دل میں موجود ہے۔ اگر واقعی اس کی راہ میں محویت اور خود فروشی کی ایک آگ ہے۔ جس میں برسوں سے بغیر دھوئیں کے جل رہا ہوں۔ تو اپنے فضل سے مجھے اتنی مہلت عطا فرما کر اپنے بعض مقاصد کے نتائج اپنی آنکھ سے دیکھ لوں۔ لیکن اگر میرے تمام کام محض ایک

تجارتی کاروبار اور ایک دوکاندارانہ شغل ہیں جس میں قومی خدمت اور ملّت پرستی کے نام سے گرم بازاری پیدا کرنا چاہتا ہوں تو قبل اس کے کہ میں اپنی جگہ پر سنبھل سکوں وہ میری عمر کا خاتمہ کر دے۔"

ان فقروں کا ایک ایک لفظ دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا معلوم ہوتا ہے دو نہیں مہینے بعد ۱۱ ستمبر کو لکھتے ہیں:-

"ہمارے دل میں جو ہوتا ہے بے تامل حوالۂ قلم کر دیتے ہیں آج کی مصلحت بینی کی عادت نہیں، کیونکہ اپنے عقیدے میں اسے نفاق سمجھتے ہیں جو ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔"

جو سنتا تھا اسے حیرت ہوتی تھی کہ اڈیٹر صاحب کی عمر تیئیس سال سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن ابھی سے وہ بڑے سے بڑے سیاس اور بڑے سے بڑے ادیب کے ساتھ ٹکر لینے کے لئے تیار ہیں۔ جستجو سے معلوم ہوا کہ وہ "الہلال" سے پہلے جب ان کی عمر بیس برس کے لگ بھگ تھی، "الندوہ" جیسے بلند پایہ رسالے اخبار "وکیل" امرتسر، اخبار "دارالسلطنت" کلکتہ کی ادارت کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ بلکہ صرف گیارہ برس کی عمر میں مصباح الاخبار نکال چکے ہیں، اور اس سے پہلے ایک اخبار "نیرنگ عالم" کی ادارت بھی کر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ قابل ذکر ہے۔ ۱۹۰۴ء میں (جب آزاد کی عمر صرف سولہ برس کی تھی) مولانا شبلی نعمانی سے ملاقات ہوئی اور شبلی پر آزاد کی علمیت کا بڑا اثر پڑا۔ انھوں نے صاحبزادے کی پیٹھ ٹھونکی اور کہا میں تمہارے والد ابوالکلام سے ملنا چاہتا ہوں، جو مصباح الاخبار اور لسان الصدق اخبار نکال چکے ہیں۔ ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ اڈیٹر صاحب یہی سولہ برس کے صاحبزادے ہیں جنھوں نے علمی دنیا میں ابھی سے ایک خاص مقام پیدا کر لیا ہے۔

۱۹۱۶ء

مسلم یونی ورسٹی کی تحریک زوروں پر تھی۔ مسلم یونی ورسٹی ایسوسی ایشن قائم ہو چکی تھی اور اس زمانے میں مسلمانوں کا جو عام ماحول تھا اس کے مطابق یہ بھی دو فریقوں میں بٹ چکی تھی۔ ایک فریق وہ تھا جس کی قیادت ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کر رہے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ مسلم یونی ورسٹی کے حصول میں جو شرطیں حکومت نے لگائی ہیں، اور جن کے بموجب سرکار کو یونی ورسٹی کے معاملوں میں ہر منزل پر مداخلت کرنے کا حق ہے، ان کو کبھی نہیں ماننا چاہیے اور اس سے بہتر تو یہ ہے کہ یونی ورسٹی لینے سے انکار کر دیا جائے۔ دوسرا فریق جو زیادہ تر ایم اے او کالج کے اجارہ داروں کا تھا اور جس کے روح رواں ڈاکٹر ضیاء الدین تھے، وہ ہر قیمت پر یونی ورسٹی قبول کرنے پر تیار تھا۔ اس کا ادعا یہ تھا کہ مسلمانوں نے یونیورسٹی لینے یا اس کے حاصل کرنے میں دیر کی تو نئی یونی ورسٹی ہندو یونی ورسٹی سے پچھڑی ہو کر رہ جائے گی اور اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ جو مراعات ہندو یونیورسٹی کو مل رہی ہیں اس سے زیادہ مراعات ہمیں کیسے مل سکتی ہیں۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو ایسوسی ایشن کا جو جلسہ علی گڑھ میں ہوا اس میں اس اختلاف نے ایک نئی صورت اختیار کی، وہ یہ کہ انصاری صاحب کے فریق نے جلسے سے واک آوٹ کیا۔ میں اور میرے والد ماجد دونوں ڈاکٹر انصاری کے گروہ میں شامل تھے اور ہم نے بھی واک آوٹ کیا۔ اس زمانے کے مسلمانوں میں ملک کی آزادی اور انگریزی حکومت سے نفرت کا جذبہ اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ جو ممبر ڈاکٹر انصاری کے ساتھ جلسہ گاہ سے نکل آئے ان کی تعداد باقی ماندہ ممبروں سے زیادہ تھی۔

مسلم جنتا میں یونی ورسٹی کے تعلق سے خود اعتمادی اور خودداری کا یہ جذبہ پیدا کرنے میں مولانا آزاد کا ایک بہت بڑا حصہ تھا۔ دو سال تک نہایت آب و تاب سے نکلنے کے بعد الہلال بند ہو چکا تھا۔ ایڈیٹر کو یک بیک حکم ملا کہ وہ دس ہزار روپے کی ضمانت داخل کریں اور مولانا نے یہ رقم داخل کرنے کے بجائے اخبار بند کرنا ہی مناسب سمجھا۔ ۷ اکتوبر ۱۹۱۴ء کا نمبر الہلال کا آخری نمبر تھا مگر صرف ڈیڑھ مہینے کے توقف سے مولانا نے کلکتے ہی سے البلاغ نکالنا شروع کر دیا۔ اس نئے اخبار کے مباحث میں ایک اہم مسئلہ مسلم یونی ورسٹی کا بھی تھا اور مولانا کے قلم سے مسلم یونی ورسٹی کو حکومتی شرطوں پر قبول نہ کرنے کے موضوع پر جو اجتہادی مضامین نکلے۔ اس نے گویا مسلمانوں کے تمام سیاسی اعتقادوں کی کایا پلٹ دی۔ مسلمانوں کی ذہنیت میں یہ تبدیلی دراصل ۱۹۱۳ء ہی سے پیدا ہو رہی تھی۔ کان پور میں ایک محلہ مچھلی بازار ہے، وہاں ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ کلکٹر ضلع کے حکم سے اس مسجد کے صحن کا ایک حصہ اور ایک حجرہ مسمار کر دیئے گئے۔ اس پر ملک کے طول و عرض میں گویا آگ ہی تو لگ گئی اور مسلمانوں نے حکومت پر یہ ظاہر کر دیا کہ ہمارے مقدس مقامات کا ایک ایک گوشہ اور ایک ایک اینٹ ایسی ہے کہ اس کی طرف برطانوی سامراج آنکھ تک نہیں اٹھا سکتا۔ اس جذبے کو ہوا دینے بلکہ اس کی تخلیق میں مولانا کے اخبار الہلال کا بڑا حصہ تھا اور انھوں نے مچھلی بازار کی چھوٹی سی مسجد کے ایک گوشے کے انہدام کو "واقعہ ہائلہ کان پور" بنا دیا۔ چشم زدن میں مولانا آزاد کا نام گھر گھر لیا جانے لگا۔ نمونے کے طور پر اس زمانے کی مشہور ادیبہ اور شاعرہ

"نوزش" (زاہدہ خاتون شروانیہ) کے ایک خط کی نقل باعثِ دلچسپی ہوگی۔ وہ اپنی ایک عزیزہ کو لکھتی ہیں:۔

"کیا تم نے اخبار ہمدرد دہلی میں آزاد بھائی سے پولیس کا ان پر کا ظلم دیکھا۔ کیا رئیس الاحرار مسلم رب الابرار سے پولیس کی مخصوص باتیں مثلاً ...... ان کو کسی سے بات چیت کی اجازت نہ دینا، ناظر کی سخت کلامی، مسجد، جیل خانہ، اسپتال کے دیکھنے سے روکنا اور بالآخر کان پور سے نکلوا دینا، ان کا نفٹننٹ گورنر کو تار دینا وہاں سے عدم مداخلت کا اعلان کیا۔ تمام باتوں پر مطلع ہو کر بھی تم عنان ضبط مضبوط تھامے رہو گی؟ مگر ان باتوں سے ان کی کوئی ذلت نہیں ہوئی بلکہ عین عزت ہے۔ ۔۔ اگر خدا نا خواستہ مولانا آزاد ...... پابند سلاسل ہو جائیں جب بھی ان کی عزت دنیا کی نگاہ میں کم نہ ہوگی۔ بلکہ سے چار چاند لگ جائیں گے۔"

"نوزش" واقعہ کان پور اور مسلم یونیورسٹی پر جو مضامین شائع ہوئے انھوں نے مولانا کے پیام کو ملک کے تاریک ترین گوشوں میں پہنچا دیا۔ یونیورسٹی پر ان کے مضامین کئی مہینوں تک جاری رہے۔ ان میں سے ایک مضمون میں یونیورسٹی کے اجارہ داروں پر طنز ملاحظہ ہو۔

"لوگ کہتے ہیں کہ اب ہم بہت زیادہ عقلمند ہو گئے ہیں ...... اگر ہم دیوار قہقہہ، چشمۂ حیات یا حاتم طائی کی فیاضانہ سیاحتوں کو نہیں مان سکتے تو اس واقعہ کو تو مان سکتے ہیں کہ مسلم یونیورسٹی فقط علاقہ سے لینی چاہتے تھے، اس لئے کہ مہاراجہ دربھنگہ اور پنڈت مدن موہن مالویہ سے لی، اور اس لئے کہ ایک لاکھ روپیہ ماہوار ملے گا، اور اس لئے کہ علی گڑھ میں تقسیم اسناد کا عظیم الشان جشن منعقد ہوگا اور اس لئے کہ برٹش حکومت میں رحمت رہتی ہے" اور اس لئے کہ سرسید علیہ الرحمۃ کا حقیقی مقصد ایسا ہی تھا" اور اس لئے کہ خالقِ اکبر نے ہم کو اسی لئے بنایا ہے کہ احکام امام و نواہی کی تعمیل کریں" اور اس لئے کہ مسلمانوں کی قومی پالیسی گورنمنٹ کے اعتماد پر مبنی ہے۔" اور سب سے آخر میں اس لئے کہ بنارس کی طرح علی گڑھ کی گلیاں بھی عجیب و غریب مناظر کو دیکھیں گی، اور یہ سب سے بڑی نعمت ہے جو آدم کی اولاد کو مل سکتی ہے۔ وفی ذالک فلیتنافس المتنافسون۔"

یہ وہ پیام تھا جس نے مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے حریت پسند ممبروں کی رگوں میں ایک نیا خون دوڑا دیا اور پرانی رسم کے نام لیواؤں کی آنکھوں میں یہ ستائیس، اٹھائیس سال کا نوجوان کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔

شاید مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے چند روز بعد مولانا علی گڑھ آئے اور مسافر بنگلے میں قیام کیا۔ والد صاحب کے ساتھ ساتھ میں بھی ملنے گیا۔ الہلال اور اس کے بعد البلاغ کو مسلسل پڑھنے کی وجہ سے مولانا کی شخصیت کا ایک خاص اثر مجھ پر پڑا تھا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خوبرو نوجوان سر پر سبز عمامہ باندھے ڈھیلی ڈھالی اچکن پہنے بیٹھا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے والد ماجد کے رشتے کے بھائی مولوی حبیب الرحمن خان شروانی بھی (جو بعد میں چل کر حیدرآباد کے صدر الصدور بنے اور نواب صدر یار جنگ کے لقب سے مخاطب ہوئے) بیٹھے تھے۔ باوجودیکہ تعلیمی اور سیاسی مسائل میں ان دونوں کی رائے میں بہت کچھ فصل تھا، لیکن مولانا کے تبحر کے دل سے قائل تھے اور باوجود سن و سال کے تفاوت کے مولانا کی بڑی عزت کرتے تھے۔ مولانا شروانی اور مولانا آزاد کے مابین ایسے دلی تعلقات پیدا ہوئے کہ ان کی بدولت دونادر ادبی ذخیرے یعنی کاروانِ خیال اور غبارِ خاطر کی تخلیق ہوئی۔ والد مرحوم کی بھی مولانا سے پہلے سے ملاقات تھی۔ ہم لوگ مولانا کے پاس آدھے گھنٹے سے زیادہ بیٹھے اور ان کے اندازِ گفتگو میں جو انکسار نظر آیا وہ اس وقت تک دل پر نقش ہے۔

۱۹۴۶ء

۱۹۱۹ء میں میرا تقرر بہ حیثیت مددگار پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ہو گیا اور مجھے عملی سیاسیات سے کنارہ کشی اختیار کرنا پڑی۔ لیکن باوجود سلک ملازمت میں شامل ہو جانے کے میں ہمیشہ قومی تحریکات میں دلچسپی لیتا رہا۔ گو یہ دلچسپی ایک بڑی حد تک کتابی ہو کر رہ گئی تھی۔

۱۹۱۴ء سے ۱۹۴۶ء تک کے تیس برس میں ہندوستان کی سیاسی بساط میں انقلاب عظیم پیدا ہو چکا تھا۔

مولانا آزاد ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۰ء تک رانچی میں نظربند رہے۔ اسی سال یعنی ۱۹۲۰ء میں پہلی مرتبہ ان کی گاندھی جی سے ملاقات ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک نے دوسرے کو گویا اپنا لیا۔ ۱۹۱۸ء کی دہلی کانگریس میں مولانا محمد علی نے مسلمانوں کے مقدس مقامات کی آزادی اور حفاظت پر کانگریس میں ایک ریزولیوشن بھیجا تو اس کو ایک

بجو بُرے نگار سمجھا جانے لگا اور لوگ کہنے لگے کہ ہندوستانی قومی کانگریس کو کیا تعلق مکہ مدینہ اور بیت المقدس سے ہو سکتا ہے۔ یہ ایک بڑی حد تک مولانا آزاد کا کارنامہ تھا کہ ۱۹۲۱ء میں خلافت کے مسئلے کو جلیاں والا باغ کے مسئلے سے ایسا ملا دیا گیا کہ دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا اور خلافت کا مسئلہ بھی ہندوستان کی آزادی کی تحریک کا ایک زبردست ستون بن گیا۔ جن لوگوں نے اس وقت کے روح پرور نظارے دیکھے ہیں وہ انھیں کبھی نہیں بھولیں گے کہ ایک طرف کانگریس کے جلسوں میں اللہ اکبر کے نعرے سنائی دیتے ہیں تو دوسری جانب مہاتما گاندھی دہلی کی جامع مسجد کے منبر سے ہزاروں کو مخاطب کرتے ہیں۔ آزاد اور محمد علی کے درمیان اب تک بعض امور میں اختلاف رائے تھا لیکن ترکِ موالات کے زبردست اصول کو جو ایک اعتبار سے گاندھیت " کی بنیاد بن گیا تھا۔ دونوں زعیم ماننے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں مولانا کو ایک سال کی جیل ہوئی۔ جو بیان انھوں نے عدالت کے سامنے دیا وہ ہندوستان کی قومی تاریخ اور اردو ادب کا ایک شاہکار ہے۔ اس میں ایک جگہ وہ کہتے ہیں:-

" میں تسلیم کرتا ہوں کہ اب دنیا میں دوسری صدی عیسوی کی خوفناک تعزیری عدالتیں اور قرونِ وسطیٰ کی پُراسرار انکوئی زیشن وجود نہیں رکھتیں۔ مگر میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ جو جذبات ان عدالتوں میں کام کرتے تھے ان سے ہمارے زمانے کو نجات مل گئی۔ وہ عمارتیں ضرور گرا دی گئیں جن کے اندر وہ خوفناک اسرار بند تھے مگر ان دلوں کو کون بدل سکتا ہے جو انسانی خود غرضی اور ناانصافی کے خوفناک رازوں کا دفینہ ہیں۔ اس عدالت کی عظیم الشان اور عمیق تاریخ پر جب میں غور کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ اس جگہ کھڑے ہونے کی عزت آج میرے حصہ میں آئی ہے تو بے اختیار میری روح خدا کے حمد و شکر میں ڈوب جاتی ہے اور صرف وہی جان سکتا ہے کہ میرے دل کے سرور و نشاط کا کیا عالم ہے۔ میں مجرموں کے اس کٹہرے میں محسوس کرتا ہوں کہ میں بادشاہوں کے لئے قابلِ رشک ہوں۔ ان کو اپنی خواب گاہِ عیش میں وہ خوشی اور راحت کہاں نصیب جس سے میرے دل کا ایک ایک ریشہ معمور ہو رہا ہے۔ کاش غافل نفس پرست انسان اس کی ایک جھلک بھی دیکھ پائے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں سچ کہتا ہوں کہ لوگ اس جگہ کے لئے دعائیں مانگتے "

یہی وہ دور تھا جب سے کہ سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں ہندوؤں مسلمانوں نے پابزنجیر ہونا پسند کیا اور یہی وہ حربہ تھا جس سے انگریزی اقتدار کی بنیادیں ہل گئیں۔ عمیق نظر سے دیکھا جائے تو یہ ملک گیر ترکِ موالات کا نسخہ تھا جو آزاد نے تجویز کیا اور جسے مہاتما گاندھی نے اہنسا سے مرکب کر کے ملک کی غلامی کے زہر ہلاہل کے لئے تریاق کے طور پر استعمال کیا۔

۱۹۱۶ء کے تیس برس کے بعد میں نے ۱۹۴۶ء میں مولانا سے نیازمندی حاصل کی۔ میں ۱۹۴۶ء میں نظام کالج حیدرآباد کی پرنسپلی سے سبکدوشی حاصل کر کے اینگلو عرب کالج دہلی کا پرنسپل مقرر ہو گیا تھا۔ لیاقت علی خاں مرحوم جو اس زمانے میں "نواب زادہ" کے لقب سے ملقب تھے کالج کی انتظامی کمیٹی کے صدر تھے۔ باوجود اس مشکل موقف کے اب بھی مجھے وطن دوست اور قوم پرست بزرگوں کی نیازمندی پر فخر تھا۔ آصف علی (جو بعد میں چل کر ہمارے ملک کی طرف سے امریکہ میں پہلے سفیر مقرر ہوئے) میرے پرانے رفیق تھے اور مدتوں یورپ میں ان کا میرا ساتھ رہا تھا۔ انھوں نے یورپ جانے سے پہلے اینگلو عربک کالج ہی میں تعلیم پائی تھی۔ میں نے کالج میں ایک انجمن طلبائے قدیم بنائی تھی اور میرا جی چاہتا تھا کہ وہ اس انجمن کے صدر بنیں۔ ان کی کوٹھی پر گیا ان سے صدر بننے کے لئے کہا۔ انھوں نے جواب دیا کہ یا حضرت تم سمجھتے ہو کہ جو فضا یہاں دہلی میں پیدا کی گئی ہے اور جس کے اثر سے تمھارا کالج بھی نہیں بچا ہے اس فضا میں کوئی مجھے تمھاری انجمن کا صدر بننا پسند کرے گا؟ خود تمھارا بھی اس کالج کا پرنسپل رہنا ایک معجزہ ہے۔ پھر کہا کہ تم مولانا آزاد سے ملو گے؟ میں اچھل پڑا میں نے کہا کہاں تشریف رکھتے ہیں۔ بولے میرے پاس ٹھیرے ہوئے ہیں۔ پیچھے کے کمرے میں ہیں۔ میں حاضر ہوا۔ مولانا کئی مرتبہ کانگریس کے صدر رہ چکے تھے اور صفِ اول کے رہنماؤں میں ان کا شمار ہوتا تھا، مگر وہ مجھ سے بالکل مساویانہ حیثیت سے ملے جو میرے لئے باعثِ فخر تھا۔ باتوں باتوں میں والد مرحوم کی وفات پر تعزیت کی اور ان سے ملاقات کے کئی واقعات دہرائے۔ تیس برس پہلے جو نیاز حاصل ہوا تھا اس کا بھی ذکر کیا۔ آدھے گھنٹے سے زیادہ شرفِ صحبت حاصل رہا جس کے دوران میں مسلم یونیورسٹی اور اینگلو عرب کالج کا حال پوچھتے رہے۔ دو چار روز بعد مولانا وزارت تعلیم کا جائزہ حاصل کرنے والے تھے۔ میں نے عرض کی کہ آپ وزیر ہو جائیں گے تو کالج کے سلسلے میں بار بار حاضر ہونا پڑے گا فرمانے لگے جب جی چاہے ٹیلیفون کیجئے اور آئیے۔

۱۹۴۷ء

یہاں ۱۹۴۷ء کی خون چکاں داستان بیان کرنا بے محل ہوگا۔ ستمبر کے پہلے

ہفتے میں کالج سوا مہینے کے لئے بند ہو چکا تھا۔ ایک مہینے کی تو گرما کی چھٹیاں ہوتی ورنی کی منظورہ تھیں، لیکن اس سے ایک ہفتہ پہلے ہی کالج میں باہر والے طلبا کی آمدورفت بالکل بند ہو گئی اور کالج مجبوراً بند کرنا پڑا۔ اکتوبر کے وسط میں کالج کھولنے دوبارہ دہلی پہنچا تو معلوم ہوا کہ پانچ یا سوا پانچ بجے کے بعد باہر نکلنا خطرناک ہے۔ میں سوچنے لگا کہ کالج کیسے دوبارہ کھولا جائے۔ مولانا وزیر تعلیمات تھے ان سے ملنے گیا۔ نہایت تپاک اور محبت سے ملے اور فرمایا کہ "میرے بھائی اگر تین استاد اور دس لڑکے مل جائیں تو بھی کالج کھول دو۔" مجھے معلوم ہوتا تھا کہ پرانے قلعے میں چند اساتذہ ہیں۔ وہاں بصد دقت پہنچا، مگر تین اساتذہ اور دس طلبا نہیں ملے۔ وہ تین دن میں کئی مرتبہ مولانا سے نیاز حاصل ہوا۔ جن حالات میں ہو کر ملک گزر رہا تھا ان کا مولانا پر بھی اثر ہونا لازم تھا۔ لیکن ایک راسخ الاعتقاد مسلمان قوم پرست کی طرح وہ خدا کی رحمت سے مایوس نہیں تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ انجام بہ خیر ہوگا۔ وہ آٹھ برس پہلے کانگریس کی صدارتی کرسی سے ہندو مسلمان دونوں سے کہہ چکے تھے:

"صدیوں کی مشترک تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ گئی ہو۔ . . . . یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے۔ ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں تو انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی گزری ہوئی تہذیب و معاشرت کو پھر تازہ کریں جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے تو میں ان سے کہوں گا کہ وہ جس قدر جلد اس خواب سے بیدار ہو جائیں بہتر ہے۔ کیوں کہ یہ ایک غیر فطری تخیل ہے اور حقیقت کی سرزمین میں ایسے خیالات نہیں اُگ سکتے۔"

۱۹۴۸ء

مولانا مرحوم سے ۱۹۴۸ء میں متعدد بار نیاز حاصل ہوا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد دستور ساز مجلس کے صدر تھے۔ انھوں نے دستور کے مسودے کو اردو اور ہندی میں ترجمہ کرنے کے لئے دو کمیٹیاں بنائی تھیں۔ اردو کمیٹی کے صدر مولانا صاحب تھے اور اس کا ایک رکن ہونے کا مجھے بھی فخر حاصل تھا۔ کوئی بات دریافت کرنی ہوتی تو مولانا صاحب سے استمزاج کر لیا جاتا۔ ورنہ معمولی طور پر انھیں تکلیف نہیں دی جاتی تھی۔ اس دوران میں ایک ملاقات کی یاد خاص طور پر تازہ ہے میں ویسٹرن کورٹ میں ٹھیرا تھا۔ ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ کھانے کے کمرے میں سری پت راؤ صاحب بھی موجود ہیں۔ سری پت راؤ حیدرآباد ہائی کورٹ کے جج رہ چکے تھے اور ۱۹۴۸ء میں پرانے حیدرآباد کی آخری مقننہ کے اسپیکر مقرر ہوئے تھے۔ انھیں اب حیدرآباد سرکار نے ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کی کارروائی اور آئین کا مطالعہ کرنے کے لئے دہلی بھیجا تھا۔ ان کا میرا کئی روز تک ساتھ رہا۔ کھانا پینا بھی ایک ہی میز پر تھا۔ ایک دن انھوں نے کہا کہ آپ میرا تعارف مولانا صاحب سے کرا دیجئے۔ ملاقات کا وقت گیارہ بجے مقرر ہوا۔ اس زمانے میں حیدرآباد میں رضاکاروں کا بڑا زور تھا اور حیدرآباد سرکار کسی طرح بھی یونین میں شرکت کے لئے تیار نہ ہوتی تھی۔ مولانا صاحب نے چھوٹتے ہی سری پت راؤ سے دریافت کیا کہ حیدرآباد ریاست کیوں ہندوستان میں شامل نہیں ہو جاتی۔ انھوں نے ذرا سوچ کر جواب دیا کہ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ صاحب اقتدار جماعت کو اس بات کا خطرہ ہے کہ یونین میں شمولیت کے بعد اقتدار ہمارے ہاتھ سے چھن جائے گا۔ اس پر میں نے مولانا صاحب سے عرض کیا کہ مجھے دہلی آئے ہوئے کئی مہینے ہو گئے اور متعدد مرتبہ نیاز حاصل ہو چکا ہے۔ لیکن میں نے کبھی سیاسی بحث نہیں چھیڑی۔ اگر اجازت ہو تو کچھ عرض کروں فرمایا، کہئے۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے اس کا تو علم نہیں کہ حیدرآباد ریاست کیوں ہندوستان میں شامل نہیں ہو جاتی۔ لیکن شامل ہونے کی صورت میں اگر مروجہ زبانوں کے اعتبار سے اس کے حصے بخرے کر دیئے گئے تو اس کا اثر باقی ماندہ ہندوستان پر بھی پڑے گا اور پھر سے ہندوستان کو لسانی صوبوں میں تقسیم کرنا پڑے گا جس سے ایک صوبے اور دوسرے صوبے کے درمیان گویا لوہے کی دیواریں قایم ہو جائیں گی۔ میں نے یہ بھی عرض کیا کہ میرے نزدیک حیدرآباد ریاست کا ہندوستان میں شمول ناگزیر ہے لیکن ریاست اور اس کا یہ مقام ہندوستان بھر کی زبانوں، نسلوں، مذہبوں، سماجوں، کا سنگم ہے اور اسے برقرار رکھا جائے گا تو یہ شمال، جنوب، مشرق مغرب سب کے لئے مفید ہوگا۔ مولانا برابر

میری پیش کش کو سُنتے رہے۔ میں خاموش ہوا تو فرمانے لگے کہ "میرے بھائی جو کچھ آپ نے کہا اس کا ایک ایک لفظ درست ہے۔ مگر آج کل کی فضا میں اسے کوئی بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔" ہم لوگ صرف دس منٹ کے لئے مولانا صاحب کے پاس حاضر ہوئے تھے، چلتے وقت گھڑی دیکھی تو بارہ بج چکے تھے۔

۱۹۵۲ء

کانگریس کے حیدرآباد سشن میں مولانا صاحب حیدرآباد آئے ہوئے تھے۔ شاہ منزل میں ان کی تقریر تھی۔ وہی شاہ منزل جو کسی زمانے میں پُرانے حیدرآباد کے صدر اعظم کی قیام گاہ رہ چکا تھا۔ میں نے مولانا صاحب کے چہرے پر وہ شگفتگی نہیں پائی جس سے وہ دہلی کے اندوہناک ترین زمانے میں بھی خالی نہ تھا۔ وقت کا بے پناہ دریا نہایت تیزی کے ساتھ اس نقطے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جہاں پہنچ کر پورے ملک کی لسانی تقسیم ہونے کو تھی یہ بھی ممکن ہے کہ جو کچھ مجھے مولانا صاحب کے چہرے پر نظر آیا وہ خود میرے خیالات کا آئینہ دار ہو۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ارشد کاکوی

غزل

تیرا کرم ہے تو نے مجھے یہ جامۂ ہستی بخشا ہے
اب یہ اپنی قسمت جو یہ زیب سے مسکا جاتا ہے

ہاتھوں میں زنجیر تنہائی، دیواروں سے رکھا دور
سر ہے وبالِ دوش، گریباں اپنے گلے کا پھندا ہے

جس نے کسی کا کچھ نہ بگاڑا جس نے کسی کو دکھ نہ دیا
ہم نے اُسی کو اس دنیا میں رہتے کڑھتے دیکھا ہے

جن کے دل میں درد نہیں ہے جو احساس سے عاری ہیں
ایسوں کی تقدیر میں راحت چین سراسر لکھا ہے

خود سے باتیں کرتے ہو اور پہروں سوچتے رہتے ہو
یوں بھی نہ جینے دے گی ارشدؔ سنتے ہو، یہ دُنیا ہے

دینا ناتھ مست کشمیری

نغمۂ اعظم

رابندر ناتھ ٹیگور کی آخری نظم "دی گریٹ سمفنی" کا ترجمہ

(تشریحی مقصد سے کہیں کہیں شعروں کا اضافہ مترجم کی طرف سے کیا گیا ہے باقی اشعار اصل نظم کے مطابق ہیں)

کہاں اندازہ ہو سکتا ہے اس دنیا کی وسعت کا — بہت محدود حلقہ ہے مری فہم و فراست کا
یہ لاکھوں ڈھنگ کے انساں یہ شہر اور بستیاں لاکھوں — یہ لاکھوں ملک یا اور بستیوں کی بستیاں لاکھوں
یہ دشت و بحر و بہر یہ کوہ و میداں او ویرانے — گلستاں اور نخلستاں ہیں کتنے کوئی کیا جانے
یہ سورج چاند تارے کہکشاں او بزم عرش آرا — سمجھ سکتی ہے کیا نظر ہر ایک نظارا

کبھی الہام ملنے سے بھی راز حق نہ سمجھا میں — خیال و خواب و تعبیرات کے چکر میں گم تھا میں
عیاں نغموں میں ہر دم پاتا تھا ہم رنگی — کہ نغمے مختلف ہو کر بھی رکھتے تھے ہم آہنگی
ہے یہ شور سکوت افزا بپا خاموش لمحوں میں — ہے دل میں گونجتی کوئی صدا خاموش لمحوں میں

اُدھر یہ سلسلہ دنیا کی وسعت اور عظمت کا
اِدھر دل کا ہے گوشہ مختصر مرکز حقیقت کا

خدا کی کل خدائی گم ہے کنج قلب انساں میں — عجب نسبت ملا ہے اس کو اس دنیائے امکاں میں
نہیں واقف یہ پھر بھی حق کے اسرار نہانی سے — سخنداں ہے مگر محرم نہیں پھر بھی معانی سے
یہ نقش پا میں اور کیکن نشاں ہے کس کی منزل کا — ہے تصویر جہاں میں عکس کس نقاش کامل کا
گزرتی تجربوں میں ہے بشر کی زندگی ہمدم — مگر یہ ذوق تجسس ہے بشر کی فطرت محکم
دئیے سے ہے دیا جلتا تو دل سے دل منور ہے — مہ و انجم بھی پلتے ہیں ضیا اک ہر الوسے ہے

افق پہ دُور تابندہ کلس دہ برف زاروں کے
بلاتے ہیں مجھے جو اپنی کرنوں کے اشاروں سے

لبھاتے ہیں مرادل ان سے نغمے کسی رُت کے — جگاتے ہیں مجھے نادیدہ سپنے خواب غفلت کے
اُدھر قطب جنوبی پر وہ اک گمنام اختر ہے — جو خاموشی سے راتوں کو رواں اپنے سفر پر ہے
مری آنکھیں یہ روشن کر رہا ہے نور قدرت سے — شناسا کر رہا ہے مجھکو یہ راہ طریقت سے

کہیں سے آبشاروں کی صدائے نغمہ آتی ہے — جو بھیرِ سازِ دل کا گیت بن کر گونج جاتی ہے
سُنے جاتا ہوں میں وہ شور نغمے سازِ فطرت کے — ازل سے ہر کہ شاعر ہیں یہ ملیں کی لذت کے
مرے نغمے بھی ہم آہنگ ہو کے لمحوں سے رہتے ہیں — جو باغ دہر میں آ کر کی ندی بن کے بہتے ہیں

میں شاعر ہوں جہاں کا ہاں مجھے الہام ہوتا ہے
سدا کا شوق حقیقت کا مرا پیغام ہوتا ہے
جہاں کی ہر صدا نغمہ مری ہستی کا بنتی ہے — کہ ہر ہے تجربوں کی روشنی یوں دل سے چھنتی ہے

یہ سرحد اوقات و تعین سے یہ انساں ہے
حقیقت جس کی پیکے میں اسی ہستی کے پنہاں ہے

اگر انساں کا رتبہ جانتا ہے پاس آ اس کے
تو رسم و راہِ اُلفت کی دل میں گھر بنا اس کے

مرے طرزِ تمدن نے پرایا کر دیا مجھ کو
جہاں میں رہ کے محروم جہاں اس نے کیا مجھ کو

مٹی نورِ تمدن سے کچھ ایسی میری بینائی
نظر آ کر بھی تصویرِ معانی کب نظر آئی
یہ دہقاں کھیت میں مصروف ہے جو ہل چلانے میں
ہے مخفی جانِ اہلِ دہر جس کے دانے دانے میں
جُلاہا اپنی بے حالی سے گویا حال میں اپنے
یہ ماہی گیر جو اُلجھا ہوا ہے جال میں اپنے
یہ سب ادنیٰ و رسمی مزدور محنت کش جہاں بھر کے
جہاں کو زندگی دیتے ہیں جیتے جی تو مر مر کے
سماجی بندھنوں نے ان سے مجھ کو دور ہی رکھا
مجھے اس شہرت و تہذیب نے معذور ہی رکھا
جلا ڈھلتی ہیں رنگ کے پانی میں سنے دریوں
کہ میں اُونچے تمدن اور شہرت کا ہوں پروردہ
غم و اندوہ میں ان کے کبھی شرکت نہیں کرتا
ہیں چھوٹے منہ بھی ہمدردی کا ان کی دم نہیں بھرتا

ہیں ان کی حدِ ہمدردی سے کچھ آگے نہیں جاتا
میں ان کے درمیاں چلنے کا رستہ ہی نہیں پاتا
عبث ہے جانتا ہوں یہ میرا ان نغموں کی گلباری
ہیں گلدان ان کے کانوں کو ڈبو کے مارے بھاری
نہیں کچھ مجھ کو رسم و راہ ان کی زندگانی سے
کہ عاری ہے مرا دل ان کے دل کی ترجمانی سے
ادھورے رہ گئے ہیں گیت میرے کچھ اثر کھو کر
فضا منتشر میں رہ گئے ہیں منتشر ہو کر
مجھے معلوم ہے نغمے مرے ناکام بھی کچھ ہیں
ابھی تک ان میں بے انجام بھی کچھ خام بھی کچھ ہیں
ہر اک دل میں مرے نغمے ابھی بستے نہیں پائے
برابر وسعتِ کون و مکاں پر یہ نہیں چھائے

ترے پیغام کا ہوں منتظر اے "شاعرِ اعظم"
ترے ارشادِ نو کی منتظر ہے خلقتِ عالم
ترے وحدت بھرے نغموں سے دل معمورِ وحدت ہوں
محبت کے ترانوں سے بھی مستِ محبت ہوں
ترے قول و عمل میں نورِ قدرت کا چمکتا ہو
کہ دل میں چراغِ عالمتابِ اُلفت کا چمکتا ہو
خدا لگتی سنا دے بات بے خوف و خطر ہو کر
تو نغمے سب کی آزادی کے گائے جا نڈر ہو کر

تو رازِ حق کو پوشیدہ نہ رکھ دنیا کے لوگوں سے
ہو سچی بات بے خوفی سے ظاہر تیرے نغموں سے
فقط نظریں نہ ہوں خیرہ دلوں میں نور پیدا ہو
محبت یوں حسیں ہو جائے جس پر حُسن شیدا ہو
عطا وہ نعمتیں ہو جائیں ہم محروم ہیں جن سے
مٹیں وہ علتیں عالم کی دل مغموم ہیں جن سے
تو لطفِ عیش و عشرت میں زمانے کے نہ کھو جائے
تو ہمدردی سے انسانوں کی یوں غافل نہ ہو جائے
ریاکاری نہ ہو دل میں بظاہر پارسا ہو کر
کہیں بیگانگی برتے نہ ان سے آشنا ہو کر
کہیں بن کر تو غاصب ان کی دولت خود نہ لے جائے
متاعِ زیست ان کی لوٹ کر دھوکا نہ دے جائے

ادھر آ شاعرِ خلقِ خدا پیغامِ اُلفت دے
تو اس گمراہ انساں کو سراغِ رازِ قدرت دے
تو اس کی روح کی عظمت بیاں کر گیت گا گا کر
دلِ مجروح کا تو چارہ گر بن کر مداوا کر
تو اس غم خانۂ عالم کو راحت سے جواں کر دے
جہاں خالی ہے نغموں سے لئے نغموں سے تو بھر دے
بہار آئے نہ آئے پر عنادل چپ نہیں رہتے
کوئی ہو بے وفا پر باوفا دل چپ نہیں رہتے
بہاریں سو گئی ہیں روپوش ہو کر باغِ عالم سے
تو ان خوابیدہ پھولوں کو جگا تحریکِ پیہم سے
تری آواز سنتے ہی مسرت لوٹ کر آئے
کہ فکرِ رنج و غم سے نوعِ انسانی ابھر آئے
جھکے جاتے ہیں سر جن کے گناہوں کی ندامت سے
نگاہیں جن کی نیچی ہیں یہاں شرم و خجالت سے
ترے گیتوں کی بارش ان کو مثلِ ابرِ رحمت ہو
جہاں میں ان دکھی لوگوں کو بھی حاصل مسرت ہو
چلے آئیں سبھی اس بارگاہِ نغمہ پرور میں
یہ تیرے گیت گونجیں سب کے سازِ قلبِ مضطر میں

اٹھا او نغمہ زن شاعر اٹھا تو اپنا اکتارا
سنا کر نغمۂ وحدت تو اپنا لے جہاں سارا
جو تیرے دل میں رہ کر دور ہیں پھر بھی ترے دل سے
جو منزل پر پہنچ کر بھی ابھی ہیں دور منزل سے
انھیں بھی اپنی قربت بخش بن کر ان کا رہبر تو
سراپا بن عمل او شاعرِ الہام پرور تو
تری شہرت سے وہ بھی دہر میں مشہور ہو جائیں
کہ دل ان کے بھی نورِ عشق سے معمور ہو جائیں
جہاں سارا ہے آباد الفت سے اخوت سے
بنے ہر آدمی آگاہ رازِ آدمیت سے
ہم آہنگی کی عظمت سے ہو واقف نوعِ انسانی
محبت سے یہ فانی دہر بن سکتا ہے لافانی

بشیشور پرشاد منور لکھنوی

رہنما کے قدموں میں

منشی نوبت رائے نظر لکھنوی کا دیدار سب سے پہلے مجھے ۱۹۱۳ء میں حاصل ہوا جب بڑے بھائی بابو رام تمنا پرشاد ایڈیٹر "تفریح" کی وفات کے بعد میں تلاش ملازمت کی غرض سے بھائی صاحب کے کرم فرما منشی دیا نرائن نگم کی خدمت میں کانپور پہنچا۔ بھائی صاحب ۱۹۰۹ء میں "زمانہ" کے منیجر تھے۔ نظر صاحب ۱۹۱۳ء میں "زمانہ" کے ایک رکن ادارت تھے یا بالفاظ دیگر وہی ادارت کے فرائض انجام دیتے تھے، نگرانی البتہ منشی دیا نرائن نگم مرحوم کی۔ ناپختہ کاری اور کم سنی میرے حصول ملازمت کی راہ میں حائل ہوئی۔ مجھے کامیابی نہیں ہوئی لیکن مجھے یہ پتہ نہ تھا کہ جو صاحب میرے ترجمے کو یہ سفارش لے کر منشی جی کے پاس گئے تھے کہ ترجمہ تو درست ہے صرف بادشاہ معظم کے لئے اعلیٰ حضرت کے بجائے آپ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ کمی آئندہ دور ہو جائے گی۔ وہ ہماری ہی کائستھ سکسینہ برادری کے ایک ممتاز رکن اور باکمال شاعر و ادیب منشی نوبت رائے نظر لکھنوی تھے۔

اس کے بعد ان کی خدمت میں باقاعدہ طور پر حاضر ہونے کا شرف ۱۹۱۵ء میں حاصل ہوا۔ جب "تفریح" کی ادارت سے منشی پیارے لال شاکر میرٹھی (مرحوم) کی علیحدگی کے بعد وہ اس کے ایڈیٹر ہو کر کانپور سے لکھنؤ آ گئے۔ ڈاکٹر عبدالوحید نے اپنے تذکرہ "شعرائے جدید" میں لکھا ہے کہ نظر صاحب کا تعارف حامد علی خاں صاحب بیرسٹر (مرحوم) نے منشی نول کشور سے کرایا تھا۔ یہ غلط ہے۔ منشی نول کشور کب کے انتقال فرما چکے تھے اور اس زمانہ میں منشی جی کے لائق و فائق جانشین رائے بہادر منشی پریاگ نارائن بھارگو نول کشور اسٹیٹ کے مالک تھے۔ منشی نول کشور نے انھیں متبنیٰ کیا تھا۔ رائے بہادر بھی ایک نہایت عالی ظرف، رئیس طبع اور علم و فن کے قدردان عظیم تھے۔ میرے والد مرحوم ملک الشعراء حضرت افق لکھنوی کو انھوں نے زبردستی لاہور سے بلوا کر انھیں الف لیلہ مکمل نیز دوسری کتابوں کے ترجمے کے لئے لکھنؤ میں کئی برس تک روک رکھا تھا۔ اور اس کے بعد تاحیات انھیں لاہور واپس جانے ہی نہیں دیا۔ انھوں نے ہی نظر صاحب کو بھی "تفریح" کی ادارت کا بار سپرد کیا۔ مرحوم رائے بہادر کا میں بھی ذاتی طور پر تمام عمر بے حد ممنون رہوں گا۔ والد مرحوم کے بعد جس قدر انگریزی ناول رائے بہادر مطالعہ کرتے وہ مجھے ترجمے کے لئے بھجوا دیا کرتے۔ یہ سلسلہ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۵ء تک جاری رہا۔ مجھ پر بہت شفیق تھے اور میرے ساتھ باپ کا ایسا سلوک کرتے تھے۔ "تفریح" کی زندگی بہت مختصر ثابت ہوئی اور نظر صاحب روزنامہ "اودھ اخبار" سے منسلک کر دیئے گئے۔ یوں بھی "تفریح" کی ایڈیٹری کے ساتھ ساتھ نظر صاحب اودھ اخبار کے لئے لکھا کرتے تھے۔ اس زمانے میں مرحوم منشی جوالا پرشاد اودھ اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ جوالا پرشاد صاحب کی وفات کے بعد نظر صاحب مینیجنگ ایڈیٹر بنا دیئے گئے۔ مرزا واجد حسین یاس یگانہ چنگیزی ان کے اسسٹنٹ تھے میں بھی سرکاری ملازمت کے ساتھ دفتر کے اوقات کے بعد وہاں کام کیا کرتا تھا۔ یہ سلسلہ جہاں تک یاد ہے ۱۹۲۱ء تک رہا۔ اس کے بعد نظر صاحب پنڈت برج ناتھ شرغہ ایم اے ایل ایل بی کے ہفتہ وار اخبار خادم ہند سے وابستہ ہو گئے اور آخر دم تک اسی سے وابستہ رہے۔ اُن کی وفات غالباً اپریل ۱۹۲۳ء میں ہوئی (صحیح تاریخ وفات یاد نہیں) میری کوشش سے ہندو پاٹھ شالہ اشرف آباد میں اُن کی وفات پر ایک ماتمی جلسہ پنڈت برج نرائن چکبست مرحوم کی صدارت میں ہوا۔ افسوس کہ جلسے کی یہ تجویز کہ مرحوم کا کلام یکجا کر کے شائع کیا جائے۔ آج تک عمل میں نہ آسکی۔ خادم ہند امن سبھا کا اخبار تو ضرور تھا۔ لیکن اس کی ادبی حیثیت بھی تھی۔ وفات کے قبل نظر صاحب نے اپنی زندگی کے مختصر حالات خود تحریر کئے تھے۔ یہ تحریر میرے

پاس محفوظ ہے۔ اگرچہ تحریر کی اب سیاہی بہت مدھم ہو گئی ہے۔ یہ حالات 'خادمِ ہند' میں ان کی وفات کے بعد شائع بھی ہوئے تھے۔

نظر سے ۱۹۱۵ء میں میری ملاقات کچھ عجیب حالات میں ہوئی۔ ۱۹۱۵ء ہی میں لکھنؤ کے رئیسِ اعظم اور اس وقت کے اعتدال پسند سیاسی رہنما راجہ بہادر سری رام ایم اے کا ناگہانی انتقال ہو گیا۔ جب آپ جلسے کی صدارت فرما رہے تھے (شاید ہندو یونیورسٹی کے مجوزہ قیام کے سلسلے میں یہ جلسہ ہوا تھا) ان کی وفات پر میں نے نوحہ کہا وہ 'تفریح' میں چھپنے کے لئے دیا گیا۔ 'تفریح' میں میرا کلام ۱۹۱۱ء سے ہی چھپنا شروع ہو گیا تھا۔ جب بھائی صاحب مرحوم اس کے ایڈیٹر تھے۔ آنریبل مسٹر گوکھلے نیز منشی گنگا پرشاد ورما کی وفات پر جو اس زمانے میں لکھنؤ کے سب سے زیادہ سرگرم سیاسی رہنما نیز انگریزی اخبار 'ایڈوکیٹ' اور اردو اخبار 'ہندوستانی' کے ایڈیٹر تھے۔ میرے نوحے 'تفریح' میں شائع ہو چکے تھے۔

جب راجہ بہادر سری رام کا نوحہ چھپ کر آیا تو اس میں کئی جگہ تبدیلیاں نظر آئیں۔ ان تبدیلیوں سے برہمی پیدا ہوئی۔ منشی دوارکا پرشاد افق ایسے غیور شاعر کے بیٹے کے کلام میں تبدیلیوں کا حق کسے پہنچتا تھا۔ خاندانی غیرت کو چوٹ لگی۔ لیکن میرے شفیق ماموں منشی جگدمبا پرشاد قیصر مرحوم نے جو مزاحیہ شعر کہتے تھے اور بعد میں مجھ سے اصلاح بھی لینے لگے تھے منشی نوبت رائے نظر کے کمالات کا ذکر کر کے مجھے قائل کر دیا۔ میں نے اپنے نوحہ میں 'دیدۂ نم' نظم کیا تھا۔ نظر مرحوم نے اسے 'دیدۂ پرنم' بنا دیا۔ جب اس اصلاح کا جواز میرے ذہن نشین کر دیا گیا تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ آج بھی بعض حضرات اور اچھے کہنے والے حضرت 'چشمِ پرنم' کے بجائے 'چشمِ نم' استعمال کر جاتے ہیں۔ والد صاحب اس وقت حیات تھے۔ مجھے بڑے چچا صاحب منشی رام سہائے تمنا سے درخواستِ اصلاح کرنے کی جرأت نہ تھی (شاید منشی ماتا پرشاد دنیا (میرے دوسرے چچا) نے نوحہ پر نظر ڈالی تھی) مگر ان کی نظر اس غلطی کی جانب مبذول نہ ہو سکی۔ اسی لئے خاندانی اعتماد کو دھکا لگا۔ منشی بشمبھر پرشاد صدر لکھنوی (مرحوم) سے جو بعد میں میرے خسر ہوئے ربط ضبط نہ تھا۔ اس کے علاوہ منشی نوبت رائے نظر کی عظمتوں کا ایسا موثر و رنگین نقشہ میرے سامنے کھینچا گیا کہ میں کشاں کشاں ان کے دربار میں پہنچ گیا۔ امین آباد لکھنؤ کے کشمیری ہوٹل میں ان دنوں وہ مقیم تھے۔ میں نے ادب کے ساتھ رہنمائی کے لئے درخواست کی جو فوراً قبول ہوئی۔

اس کے بعد میں اکثر و بیشتر کشمیری ہندو ہوٹل جانے لگا۔ اس وقت ہوٹل کی ایک ہندو ملازمہ اُن کی خدمت کیا کرتی تھی۔ ہوٹل ہی میں وہ مرحوم سے وابستہ ہو گئی۔ جب نظر صاحب میرے ہی محلہ نوبستہ میں آ کر تھانہ رسول کے پل کے قریب ایک مکان میں رہنے لگے تو ان کے ساتھ وہ ملازمہ بھی شریکِ زندگی بن کر آ گئی اور اس نے اُن کے آخر دم تک ان کا ساتھ دیا۔ اس کے پہلے خاوند سے ایک لڑکی تھی۔ نظر صاحب نے اس کی شادی کا خود بندوبست کیا۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ لڑکی بھی اب زندہ نہیں اور اُن کی وہ آخری رفیقۂ حیات بھی کس مپرسی کی حالت میں زندگی بسر کر رہی ہے۔

جیسا کہ مرحوم نے خود نوشت تحریر میں تسلیم کیا ہے۔ ان کی طبیعت اوائلِ شباب ہی سے حسن پرست تھی۔ اسی لئے برادری میں باقاعدہ شادی کے بعد بھی اُن کی زندگی کا بیشتر حصہ صحبتِ خوباں میں گزرا۔ اُن کی جوانی کا دم خم ۷۵ سال کی عمر تک قائم رہا۔ اسی عمر میں انھوں نے انتقال فرمایا۔ جن عورت کے ساتھ شادی ہوئی تھی اُن کی طرف التفات کم تھا اسی لئے شاید وہ دنیا سے جلد ہی رخصت ہو گئیں۔ مرحوم نے دوسری باقاعدہ شادی پھر کبھی نہیں کی۔

نظر صاحب کی اولاد میں صرف ایک صاحبزادی تھیں۔ وہ بھی اور اُن کے داماد بھی انتقال فرما چکے ہیں۔ ان صاحبزادی کا ایک لڑکا گوری سہائے بھی تھا جس سے نظر صاحب بہت محبت کرتے تھے۔ اسی کی موت پر انھوں نے وہ نہایت پُر درد نوحہ لکھا تھا جو ادبی دنیا میں بہت مشہور ہے۔ ان کے دو اور بڑے نواسے لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ اپنے بھتیجے داماد ماتا پرشاد کم سخن کی اولاد کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے اور نوبستے میں قریب قریب روزانہ وہ ان بچوں کو دیکھنے آتے اور اپنی شفقتیں ان پر بکھیرتے۔

نظر صاحب کا قد لمبا تھا، چہرہ پتلا بھی تھا اور لمبا بھی۔ سینہ پتلا، گردن میں قدرے خم تھا۔ میں نے اُن کو ہمیشہ کوٹ اور پائجامہ پہنے ہوئے دیکھا۔ سر پر اُس زمانے کی گول فلیٹ کیپ رکھتے تھے۔ مونچھیں ترشی ہوئی مساوی الاضلاع تھیں۔ شراب کا شوق تھا۔ میں نے انھیں دن کے وقت عالمِ آب میں صرف ایک مرتبہ ہولی کے موقع پر دیکھا۔ ہمیشہ خوش مزاجی اور زندہ دلی سے کام لیتے۔ خُردوں سے زیادہ کھل کر ملنا خلافِ مروت تھا۔ مگر اپنے ہم عمر دوستوں اور عزیزوں میں اکل و شرب کا مشغلہ نہایت بے تکلفی کے ساتھ رہتا۔ گنجفہ اور چوسر کا بھی بہت شوق تھا۔ گنجفہ سے نسبتاً زیادہ دلچسپی تھی۔ حسن پرستی اور خوباں نوازی کی صفت کے باوجود عقائد کے لحاظ سے سناتن دھرمی تھے۔ جب پہلے پہل مرحوم مُحبِ وطن ڈھل جاتی

پٹیل نے ہندو میرج ریفارم بل لیجسلیٹو کونسل میں پیش کیا تو اُس کی مخالفت میں نظر صاحب نے بھی اودھ اخبار کے کالموں میں قلم اٹھایا ایک مضمون مجھ سے بھی لکھوایا تھا اگرچہ اب میرے اس زمانے کے خیالات میں انقلاب آچکا ہے۔ اس غریب ملازم کو رفیقۂ حیات بنانے کے باوجود کبھی اس کے ہاتھ کا بنایا ہوا کچا کھانا نہیں کھایا۔ روٹی وہ خود اپنے ہاتھ سے بناتے تھے۔ کم از کم میں نے ہمیشہ یہی دیکھا

جب سے نوبستے آکر رہے میں نظر صاحب کی خدمت میں قریب قریب روزانہ حاضری دیتا اور وہ نہایت شفقت سے پیش آتے۔ ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۸ء میں محلے کے بعض خوش مزاج اور باذوق دوستوں نے Idle Club کے نام سے ایک تفریحی کلب قائم کیا۔ اس میں نظر صاحب کے بھتیجے بابو شانتا پرشاد کم سخن (تخلص سخن)، منشی بابو پرشاد، مہابیر پرشاد مرحوم میرے ماموں قیوم صاحب اور خود میرے چھوٹے بھائی عزیز پرشاد متعدد دفعہ شامل تھے۔ آئیڈل ہاؤس میں خوش گپیاں، شراب و کباب کی دعوتیں، تاش اور شطرنج کی بازیاں ہوتی تھیں۔ جلد ہی آئیڈل Ideal Club بن گیا۔ ان زندہ دلانِ وابستہ نے اس کلب کے ذریعہ اتنے اچھے اچھے مشاعرے منعقد کئے جن کی یاد آج تک بدن میں ایک جھرجھری سی پیدا کر دیتی ہے۔ ان مشاعروں میں نظر صاحب کو خاص طور پر تکلیف دی جاتی تھی۔ مشاعروں کا اہتمام میرے سپرد ہوتا تھا۔ انھیں مشاعروں کی بدولت پہلی مرتبہ نظر صاحب کی رہنمائی میں میری رسائی لکھنؤ کے تمام باکمال اساتذہ تک ہوئی۔

۱۹۱۵ء میں جب میں نے زانوئے ادب نظر صاحب کی بارگاہِ ادب میں خم کیا تو کوئی باقاعدہ رسم ادا نہیں ہوئی۔ شاگرد نے استاد کو اپنا دل پیش کیا اور استاد نے اس کے سر پر دستِ شفقت رکھا۔ بس۔ نہ شاگرد کے دل میں کبھی استاد کی خدمت میں دنیوی قسم کی نذر و نیاز پیش کرنے کا خیال آیا نہ اُستاد کی طرف سے کبھی اس بارے میں کوئی اشارہ ہی ہوا، ورنہ اشارہ ہوتا بھی کیوں؟ ان کو کس بات کی کمی تھی؟ پیشہ ملازمت سے سلسلۂ آمدنی رہا۔ دوسرے رسالے اور اخباروں میں جو کچھ لکھتے تھے اس کا بھی معاوضہ ملتا تھا۔ اچھی طرح سے بسر ہوتی تھی۔ طبیعت کو حرص و زر سے قطعی لگاؤ نہ تھا۔ قانع بزرگ تھے لیکن خالی بیٹھنا بھی خلافِ وضع و طبیعت تھا۔

یہ عجیب بات ہے کہ نظر مرحوم کی رہنمائی کے نقوش میرے سامنے کبھی کاغذ پر ان کے قلم سے نمودار نہیں ہوئے۔ میری نظموں پر تو نظر ڈالنے کی کبھی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ جو کچھ لکھتا تھا اودھ اخبار میں جوں کا توں شائع ہو جاتا تھا۔ البتہ غزلیں خاص توجہ سے سنتے اور جہاں ضرورت سمجھتے شعر کی کمزوری بتا دیتے تھے۔ اس کمزوری کو دور کرنا میرا فرض تھا۔ صرف دو مرتبہ میرے اصرار سے انھوں نے خود تبدیلی فرمائی۔ میں نے کہا تھا۔

رات کو پڑھتا ہوں روزانہ کتابِ آسماں　　دل نہیں لگتا جو کوئی شغلِ تنہائی نہ ہو

اگر یہ صحیح ہے کہ شاعر کا شعر اس کی فطرت کا غماز ہوتا ہے تو شعر کا پہلا مصرعہ میری فطرت کی ترجمانی کر رہا تھا۔ کیوں کہ رات کے وقت کتب بینی میرا بچپن سے مشغلہ رہا ہے اور اب تک جاری ہے۔ لیکن نظر مرحوم نے اسے تغزل کا رنگ دے کر فرمایا ؎

کروٹیں بائیں پھیرتا ہوں جب اُچٹ جاتی ہے نیند　　جی نہیں لگتا جو کوئی شغلِ تنہائی نہ ہو

ایک اور موقع پر میں نے کہا تھا ؎

سانس اس طرح کھینچی کھل گیا دل کا کنول　　پتی پتی میں نظر آتی ہے صورت یار کی

فرمایا۔ پہلے مصرعہ میں شعریت نہیں ہے۔ میں نے عرض کی کہ پہلے مصرعہ میں یوگ کے ایک عمل کی طرف اشارہ ہے فرمایا تو پھر یوں کہو ؎

چشمِ باطن سے جو دیکھا کھل گیا دل کا کنول　　پتی پتی میں نظر آتی ہے صورت یار کی

یہ تبدیلی اس حالت میں فرمائی جب دماغ بے حد کمزور ہو چکا تھا۔

اس طرح آپ دیکھیں گے کہ دیدہ نم کو دیدۂ پُرنم بنانے کے بعد صرف دو ہی موقع پر نظر مرحوم نے میرے کلام میں اصلاح فرمائی۔ ایک اور بات بھی ہے۔ میں اس زمانے میں غزلیں بہت کم کہتا تھا اور میری اس زمانے کی غزلوں کا رنگ بھی جداگانہ تھا۔ نظم گوئی کی مزاولت زیادہ تھی اور وہ بھی قومی نیز منظریہ موضوعات پر۔ نظر صاحب غزل گوئی کو خاص توجہ کا مستحق سمجھتے تھے۔

۱۹۱۸ء کی بات ہے۔ آئیڈل ہاؤس کا مشاعرہ تھا مجھے غزل کہنے کی فرصت نہ ملی۔ دفتر سے مکان واپس آنے پر کسی ضروری کام سے بازار جانا پڑا۔ بس اسی مدت میں میری غزل ہو گئی۔ نظر صاحب کو سنانے کا موقع نہ ملا۔ چناں چہ ان کو سنائے بغیر ہی مشاعرے میں غزل پڑھ دی۔ اس وقت تک میں اُن اداؤں سے واقف نہ تھا جن میں ایک شاعر دوسرے شاعر کے کلام پر سرِ مشاعرہ اعتراض وارد کرتا ہے برادری کے ایک بزرگ کنور گوری شنکر مسرت نے جو امیر لکھنوی کے صاحبزادے حکیم دانش کے تلامذہ میں تھے۔ میرے ایک شعر پر پھبتی کسی کہ واہ صاحبزادے خوب تانیث کو تذکیر کیا ہے۔ یہ وہ بزرگ تھے جو چاہتے تھے کہ میں نظر صاحب کے بجائے ان سے اصلاح لیا کروں۔ ایک مرتبہ دورانِ گفتگو میں انھوں نے اس قسم کا خیال ظاہر کیا تھا۔ مجھے شہر میں قومی شاعر کی حیثیت سے تھوڑی بہت شہرت حاصل ہو چکی تھی

غزل کے مشاعروں میں بھی میرا تعارف میرے دوست حسرت لکھنوی کے وسیلے سے ہو چکا تھا (معلوم نہیں اب حسرت کہاں ہیں۔ ریلوے کلیرنگ اکاؤنٹس آفس سے اُن کی علٰحدگی کے بعد مجھے اُن کا کہیں پتہ ہی نہیں چلا۔ شاید کسی فلم کمپنی سے وابستہ ہو گئے تھے) حسرت صاحب کے اعتراض کا مجھے ذرا بھی احساس نہ ہوا۔ دوسرے روز صبح کے وقت جناب نظر اپنے بھتیجے۔ داماد کے مکان پر تشریف لائے لکھنؤ میں ان کا یہ مکان میرے مکان کے بالکل سامنے ہے۔ آتے ہی فوراً مجھے بلوایا اور فرمایا:۔

"بھئی کل رات تم نے جو اشعار پڑھے ان پر اعتراض ہوا ہے کچھ خبر بھی ہے۔"

میں نے نفی میں جواب دیا تو مجھ سے پوری غزل پھر پڑھوائی، جب یہ شعر پڑھا تو فرمایا کہ اس شعر پر اعتراض ہے

سیلِ گریہ عالمِ وحشت میں اتنا بڑھ گیا — بہکے صحرا پر رواں ہر سو سمندر ہو گیا

فرمایا اعتراض لفظ "سیل" پر ہے تم نے اسے مذکر باندھا ہے۔ اس کی تحقیق کرو خود اپنی رائے نہیں دی۔ تلاش کرتے کرتے حسرت لکھنوی کی زبانی ناسخ کا یہ مصرعہ سنا۔

"سیل سے یادِ مژہ ہو کیوں خانۂ خمار کا"

میں نے نظر صاحب کے نوٹس میں لا کر یہ مصرعہ لکھنور صاحب مرحوم کو سنایا تو لکھنور صاحب بھی مطمئن رہ گئے۔ مگر اس واقعہ کے بعد میں نے ہمیشہ لفظ "سیل" کو مونث باندھا کیوں کہ بیشتر اساتذہ نے اسے مونث ہی باندھا ہے

غزل کا مقطع تھا

ہے منوّر دین کا اب تو تصور بھی محال
اس قدر دنیا کا غالب خون دل پر ہو گیا

فرمایا یہ منوّر دین صاحب پہلے مصرعہ میں کہاں سے پھاند پڑے۔ میں نے منوّر دین صاحب کے "دین" کو ذرا سی تبدیلی کر کے دوسرے مقام پر منتقل کر دیا۔ یہ سب کی اصلاح جو نظر صاحب نے میرے کلام پر فرمائی پھر بھی ان کی رہنمائی میرے لئے ہمیشہ قابلِ فخر رہے گی اور میں نے اس رہنمائی پر بیشتر اس فخر کا اظہار بھی کیا ہے مثلاً

منوّر خون رگوں میں ہے اُفق سے کامل فن کا — ہدایت میں ہوں میں نازاں نظر سے کامل فن پر

یا

تصنیفِ غزل کیا کوئی آساں ہے منوّر — اس فن میں نظر سا بھی اک استاد ہوا ہے

اور

تسکینِ منوّر کے لئے راہِ سخن میں — جو نقش ہے وہ نقشِ کفِ پا ہے نظر کا

رسالہ خدنگِ نظر کی ورق گردانی سے معلوم ہوا کہ میرے علاوہ حسبِ ذیل حضرات کو بھی نظر صاحب کی رہنمائی سے فیض پہنچا ہے۔

۱۔ حافظ محمد حسن تمیز، ۲۔ میر وہب علی اثر، ۳۔ مراد حسن مراد کلکتہ۔ ۴۔ سلامت اللہ اسلم خوشنویس کانپور، ۵۔ برج بھوکھن لال محب دریاباد، ۶۔ حاجی تجمل حسین تجمل ۷۔ ندرت غنی صابر مدراسی۔ ۸۔ عبدالسبحان تحسین کلکتہ۔

نظر صاحب کا غزل گوئی میں تعلق لکھنؤ کی معیار پارٹی سے تھا جس کے بانی نشتر آغا پر تھے۔ معیار پارٹی کے رسالہ معیار میں جن شعرا کا کلام امتیاز کے ساتھ شائع ہوتا تھا اُن میں نظر صاحب بھی تھے۔ بیشتر ان اساتذہ میں صفی، محشر، ثاقب عزیز اور نظر صاحب شامل ہوتے تھے۔ لکھنؤ نیز دیگر مقامات کے مشاعروں میں نظر صاحب کی غزل نہایت اشتیاق سے سُنی جاتی تھی۔ ان سب بزرگوں سے میرا تعارف نظر صاحب کے توسل سے ہوا اور انھیں کے رشتے سے سب مجھے اپنا عزیز سمجھنے لگے تھے۔

نظر صاحب جناب مظہر لکھنوی کے محبوب ترین تلامذہ میں تھے۔ ان کے ایک اور شاگرد کا تخلص بھی نظر تھا۔ اسی لئے استاد منشی نوبت رائے نظر اور دوسرے نظر صاحب کو اپنی "دو نظریں" کہا کرتا تھا۔ صفی، محشر، عزیز سب نظر صاحب کی غزل گوئی کے قائل تھے اور شاید حسرت موہانی سے زیادہ ان کا مداح کوئی نہ تھا۔ لکھنؤ کے مشہور ادب دوست ادیب نواز اور بذاتِ خود ایک عالم و فاضل سخن ور و سخن فہم حامد علی خاں صاحب بیرسٹر تو نظر صاحب کے خاص قدردانوں ہی میں نہیں بلکہ مُربیوں میں تھے۔

دو تین سال کا ذکر ہے کہ لکھنؤ کے ایک کرانہ فروش کی دوکان سے سودا خریدتے وقت جب مجھے مسالہ ایک ایسے کاغذ کی پُڑیا میں ملا جو حامد علی خاں صاحب بیرسٹر کی مطبوعہ سوانح عمری کا ایک ورق تھا تو مجھے سخت صدمہ ہوا۔ میں نے دکان دار سے فوراً پوری کتاب خرید لی اور اسے پڑھا تو اس میں حامد علی خاں صاحب اور منشی نوبت رائے نظر کے درمیان جو منظوم خط و کتابت ہوئی تھی اس پر نظر پڑی طبیعت اتنی خوش ہوئی گویا کوئی دولت مل گئی۔ یہ خط و کتابت تاریخی حیثیت رکھتی ہے اور قابلِ ملاحظہ ہے۔

ان دنوں نظر صاحب بہت بیمار تھے اور علاج و معالجہ کے لئے شاید کافی مالی بندوبست نہ تھا۔ آپ نے اپنے محسن حامد علی خاں صاحب کی خدمت میں ۱۴ مئی ۱۹۱۳ء کو یہ اشعار لکھ کر بھیجے ؎

[illegible] ہے کوئی حامدِ مخلص نواز سے — حالت تباہ ہے نظرِ بد نصیب کی
بیماری طویل [illegible] — کن مشکلوں میں جان پھنسی ہے غریب کی
[illegible] — جینے کے واسطے ہے ضرورت جریب کی
کمزور [illegible] دماغ اس قدر [illegible] — کانوں کو ناگوار صدا ہے قریب کی
[illegible] اللہ کی پناہ — جیسے ہو دردمند صدا عندلیب کی
[illegible] علاج ہو — حالت یہ ہے کہ فیس غضب ہے طبیب کی
تنہا [illegible] کوئی غمگسار [illegible] — ایسے میں بےکسی رفیق ہے جانِ غریب کی
[illegible] — مدت سے منتظر ہے نوازش حبیب کی
[illegible] — کس طرح کارگر ہو نصیحت ادیب کی
[illegible] کس طرح [illegible] — برسوں نہ دے غذا تو عنایت طبیب کی

مشکل نظر کی دور ہو یہ کیجیے دعا
درکار نیم جاں کو ہے مدد حبیب کی

حامد علی خان صاحب نے فوراً جواب دیا۔

بعد نمازِ صبح پڑی ڈاک پر نظر — اک خط سے صاف آتی تھی بو اک حبیب کی
کھولا لفافہ خط کو پڑھا پڑھ کے رکھ دیا — حالت تھی اس میں درج نظر سے ادیب کی
منظوم خط کے شعر تھے نشتر مرے لئے — مرہم ہے زخمِ گل کو صدا عندلیب کی
مضمون خط میں کیا تھا علالت کا ذکر تھا — گزرا یہ مجھ پہ غم۔ ہوئی حاجت طبیب کی
مدت سے تھا مریض۔ مرض اور بڑھ گیا — بارِ گراں ہے اب تو امانت جریب کی
اس درجہ غم سے طاقتِ حامد ہوئی ہے سلب — کمزور جسم شکل ہے گویا صلیب کی
کثرت سے قدرداں ہیں کثرت سے دوست ہیں — کیوں بےکسی رفیق ہے جانِ غریب کی
مجھ سے اگر خطاب کیا تو غضب کیا — الفت بھری ہے دل میں نظر سے ادیب کی
میں اور تم سے سلسلہ الفت کا ترک ہو — کیا خوب تم نے قدر کی اس بے نصیب کی
حاضر ہے یہ مکان نظر آپ کے لئے — خدمت کروں گا جیسے عزیزِ قریب کی
مانا یہ میں نے آپ کے مشتاق [illegible] — اور ہے دوائے تلخ نصیحت ادیب کی

حامد کی یہ دعا ہے نظر جلد ہو شفا
فضلِ خدا ہو۔ مہر ہو اس کے حبیب کی

نظر صاحب نے اس خط کی رسید میں فرمایا:۔

نامہ ملا جو مرہمِ زخمِ جگر ہوا — وجہِ تسلیٔ دل و جانِ نظر ہوا
ہر شعر ہے محبتِ خالص کا آئینہ — دل پر اس التفات کا بے حد اثر ہوا

میں آپ کے مکان میں آ کر رہوں مگر — زحمت بہت ہے حال جو نوعِ دگر ہوا
مشکل ہے اہتمام دوا و غذا کا روز — گویا یہ انتظام نیا دردِ سر ہوا
تکلیف ہوگی آپ کو ہر حال میں ضرور — افسوس ہے جو باعثِ زحمت نظر ہوا
کہنے کو قدرداں ہیں بہت دوست ہیں بہت — لیکن نہ بےکسی میں کوئی چارہ گر ہوا
شکوہ نہیں کسی کا یہ ہر حال شکر ہے — غم کیا ہے غمگسار نہ کوئی اگر ہوا
محروم مدتوں سے ہوں اہل و عیال سے — برسوں سے بےکسی میں زمانہ بسر ہوا
مرہم ہیں قلبِ ریش کا اخلاق آپ کے — ممنون انتہا سے زیادہ نظر ہوا
اک قافیہ حبیب بھی تھا نظم ہو گیا — وہ باعثِ تکدّرِ خاطر مگر ہوا
حاشا کہ تھا نہ روئے سخن آپ کی طرف — نادم سیاقِ نظم سے میں سر بسر ہوا

واللہ میں نوازشِ حامد کا ہوں رہین
زائل کبھی نہ قلب سے جس کا اثر ہوا

حامد صاحب کا مخلصانہ جواب تھا:۔

اب فرض مجھ پہ شکریۂ نامہ بر ہوا — خط کا سواد سرمۂ چشمِ نظر ہوا
منظوم خط میں درج تھے جو چند شعر — نکلے تھے دل سے دل پہ اسی کا اثر ہوا
مصرعہ یہ پڑھ کے غیر مرا حال ہو گیا — ”زحمت بہت ہے حال جو نوعِ دگر ہوا“
یہ کیا کہا۔ خیال تمہارا کدھر گیا — ہمت ہے اسپراسن[1] اگر چارہ گر ہوا
کہتے تھے دل۔ ویل[2] - اب اِل[3] نہیں ہے دوست آپ کا — بولو کہ چار روز میں موٹا نظر ہوا
تکلیفِ شکریہ کی اٹھاتے ہو کیوں نظر — صد شکر کوئی کام تمہارا اگر ہوا
مجھ سے اگر خطاب کیا تو غضب کیا — نادم یہ لکھ کے میں بخدا سر بسر ہوا
آیا تھا اک خیال مرے دل میں کہہ دیا — افسوس ہے وہ وجہِ کدورت اگر ہوا
اب وہ خیال دل سے کرو دور اے نظر — کچھ ناگوارِ طبع جو اس کا اثر ہوا
لاکھوں ہی غم اٹھائے پر احسان [illegible] — صد شکر اس طرح جو زمانہ بسر ہوا

کٹنے کو کٹ گئی بخدا بات رہ گئی
حامد کا چارہ ساز ترا چارہ گر ہوا

۱۹۳۳ء میں انتقال کے وقت نظر صاحب کی عمر تقریباً [illegible] سال تھی کئی سال سے حرارتِ غریزی کے کم ہو جانے کی شکایت تھی۔ آخر کار اسی موذی مرض

---

[1] اسپراسن میکڈیمی — اسپراسن ایم ڈی ایم ایس پرنسپل میڈیکل کالج لکھنؤ
[2] Well یعنی خوب   [3] Ill یعنی بیمار

نے جان دے کر چھوڑی۔ اُن کی زندگی کے آخری حصے میں پنڈت برج ناتھ شرما نے کافی دست گیری کی۔ انتقال کے بعد نظر صاحب نے کوئی اثاثہ نہیں چھوڑا۔ اُن کے کلام کا مجموعہ ان کے نواسوں سے ہندوستانی اکاڈمی الٰہ آباد نے خرید کر منشی دیا نرائن نگم کو ترتیب کے لئے دے دیا تھا لیکن افسوس کہ یہ کام نگم صاحب کی زندگی میں مکمل نہ ہو سکا اور اب تو اس کے مکمل ہونے کی صورت ہی کوئی نہیں تا وقتیکہ ہندوستانی اکاڈمی یہ مسودہ نگم صاحب کے ورثا سے حاصل کر کے اسے شائع نہ کر دے۔ اس سلسلے میں میری مسلسل ذاتی مساعی بالکل ناکام رہیں اور ادبی دُنیا آج تک نظر صاحب کے نادرات سے محروم ہے۔ ان مساعی کی تفصیلات نہایت تلخ اور مایوس کُن ہیں۔

نظر صاحب کو مجھ سے بڑی محبت تھی اکثر کلام سنانے کا حکم فرمایا کرتے ایک مرتبہ ہولی کا دن تھا۔ قاعدے کے مطابق ہم محلے والے ایک دوسرے کے ہاں رنگ کھیلنے کے لئے گئے۔ چنانچہ جب راستے گورے دیال کی کوٹھی پر پہنچے وہاں نظر صاحب موجود تھے۔ عالمِ آب کی کیفیت تھی۔ شعر و شاعری کا سلسلہ چھڑ جانے پر سب کے سامنے فرمایا "منوّر۔ تم پر بڑی ذمہ داری ہے۔ میں چند روزہ ہوں، لکھنؤ کے ہندوؤں میں لے دے کے صرف پنڈت چکبست قابلِ ذکر شعرا میں رہ گئے ہیں جن کا ادبی دُنیا میں کچھ مقام ہے۔ اس لئے تم میری جگہ سنبھالو" چنانچہ ان کے انھیں ارشادات سے متاثر ہو کر میں نے اپنی ایک غزل کے مقطع میں کہا تھا۔

سوچتا ہوں میں یہ رہ رہ کے منوّر دل میں

بارِ چکبست و نظر مجھ سے اُٹھے گا کہ نہیں

۱۹۲۰ء کی بات ہے۔ نظر صاحب بیمار تھے اور دفتر نہیں جاتے تھے۔ اتفاق سے اسی روز لوک مانیہ تلک کا انتقال ہو گیا۔ لکھنؤ میں بہت بڑا ماتمی جلسہ ہوا۔ میں نے ایک مسدس اس موقع پر لکھا اس کا لہجہ بہت سخت تھا مثلاً

ہاتھ میں تلوار اگر ہوتی تو پرتھی راج تھا

وغیرہ۔ نوحہ اودھ اخبار میں اشاعت کے لئے فوراً دے دیا گیا اور دوسری طرف کئی ہزار کے مجمع میں پڑھا بھی گیا۔ لکھنؤ کے مشہور وکیل پنڈت جگت نارائن کی صدارت تھی چکبست بھی موجود تھے۔ نوحہ بے حد پسند کیا گیا۔ مرزا یگانہ نے بے تامل اسے اودھ اخبار میں شائع بھی کر دیا۔ تیسرے روز جب نظر صاحب کی نظر سے پرچہ گزرا تو بہت ناراض ہوئے۔ فرمایا: سرکاری ملازم ہو کر تم نے اس قدر سخت نوحہ لکھا۔ کیا تم میری ملازمت کے بھی پیچھے پڑے ہو مگر ان کا اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ میرے خلاف کوئی کارروائی نہ دفتر میں ہوئی نہ دفتر سے باہر۔

اسی طرح ۱۹۲۱ء میں جب میں تحریکِ ترکِ موالات میں شریک ہونے کو آمادہ تھا بشرطیکہ نظر صاحب مجھے اودھ اخبار کے حلقۂ ادارت میں لے لیں۔ تو مرحوم نے آمادگی ظاہر کر دی مگر پھر ذاتی حالات سے مجبور ہو کر میں خود ہی ترکِ ملازمت سے محترز رہا۔

نظر صاحب لکھنؤ کی ہر ادبی مجلس میں مجھے بھیجتے۔ انجمن ادب اُردو (شاید انجمن کا یہی نام تھا) میں بھی جو انھیں دنوں قائم ہوئی تھی اور جس میں مولانا عزیز، حکیم کمال الدین، ڈاکٹر عبدالرحمٰن، مرزا یاس یگانہ چنگیزی سید مسعود حسین صاحب رضوی نیز دیگر ادبا و شعرائے لکھنؤ شریک ہوتے تھے۔ مجھے نظر صاحب کی نمائندگی کا فخر حاصل ہوتا تھا۔ اس انجمن کے ایک بہت بڑے جلسے میں جس کی صدارت مولانا شرر نے فرمائی تھی۔ مولانا نے فرمایا تھا کہ مسلمانوں سے بڑی بھاری تاریخی غلطی ہوئی کہ انھوں نے اپنی زبان کا نام ہندی کے بجائے اُردو رکھا۔ اس جلسے میں جو قیصر باغ کی بارہ دری میں منعقد ہوا، چکبست اور اس زمانے کے مدیر اودھ اخبار جناب محسن صاحب بھی موجود تھے۔

نظر صاحب اوائل عمر سے نہایت ذہین اور طباع تھے۔ تحقیق الفاظ کا بہت شوق تھا۔ شعر و ادب کا ذوق بزرگوں سے میراث میں حاصل ہوا تھا۔ اصلاح سے بھی بہت جلد فارغ ہو گئے۔ ان کی غزلیں لکھنؤ کی ٹکسالی زبان میں واقعات و حقائق سے مملو ہوتی تھیں اور ان پر تغزل کی پوری چھاپ ہوتی تھی۔ آن کی غزل گفتگو یا زناں کی قائل نہیں تھی اور ان کے تمام دیوان میں ایک شعر بھی ایسا نہیں نکالا جا سکتا جسے ہم رکیک، مبتذل یا سوقیانہ کہیں۔ میرے ایک دوست کا کلام سُن کر جو حضرت نوح ناروی کے شاگرد تھے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ اُن کے کلام میں رکاکت ہے، ان کا مذاق نہایت پاکیزہ اور بلند تھا۔ غزل گوئی میں تو یگانہ روزگار تھے ہی، ان کی نثر بھی نہایت شگفتہ تھی۔ خود اپنے رسالہ خدنگ نظر میں لکھتے تھے۔ نیز زمانہ، ادیب، شمس، نگار، تنویر، المشرق اور اودھ اخبار میں بھی ان کی نثر کے اعلیٰ نمونے مختلف موضوعات پر ملتے ہیں۔ نقد و نظر میں بھی اُن کو اچھا ملکہ تھا۔ معرکہ چکبست و شرر میں بھی انھوں نے حصہ لیا اور منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ اور احمد علی شوق وغیرہ کے ہمنوا تھے۔ رینالڈز کے ایک ناول کا ترجمہ شامِ جوانی کے نام سے دو حصوں میں کیا جو نول کشور پریس سے کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ ان کا رسالہ خدنگ نظر ۱۸۹۵ء میں جاری ہو کر کئی سال تک نکلتا رہا۔ منشی لکھنو لال صائب لکھنوی نے تاریخ نکالی تھی کہ

ہے مکھنو کا خدنگ نظر نظام پسند

۱۳۱۳ھ ف

خدنگ نظر نظامِ دکن کے نام سے منسوب تھا۔ آپ کے مطبع کا نام بھی نظام کے نام پر ہے۔ آپ چھپنی پریس تھا یا مطبع نوازگنج میں تھا۔ جہاں نظر صاحب کا اصلی خاندانی مکان ہے۔ خدنگ نظر کے سرورق پر دو شعر زیب دیا کرتے تھے۔

مانوس ہیں اگر نگہ فتنہ گر سے آپ
بہلائیں دل کو میرے خدنگ نظر سے آپ

اور

بصد ادب بحضورِ نظام گردوں فر
اُمیدوارِ نگاہِ کرم خدنگ نظر

اس رسالے میں ایک ناول سلسلہ وار عزیز مصر کے نام سے نکلتا تھا۔ معزول سلطان اودھ نواب واجد علی شاہ کے بارے میں نظر صاحب کا ایک تحقیقاتی مضمون خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ایک مرتبہ برسات کے موسم میں آسمان پر بادلوں کی ایک خاص کیفیت کے زیر اثر میں راستے میں اس منظر پر شعر کہتا ہوا دفتر جا رہا تھا۔ اتنے میں جناب نظر ادھر تشریف لائے۔ پوچھا کیا ہو رہا ہے۔ میں نے کسی قدر تامل سے جواب دیا۔ اس حسین نظارے پر نظم لکھ رہا ہوں۔ فرمایا خوب مگر شعر اس طرح راستے میں نہیں کہے جاتے۔ اطمینان سے کہے جاتے ہیں۔ مگر شاید ناسازیٔ مزاج کے باعث یہ اشعار وہ بھی میری طرح راستے میں فرماتے ہوئے جا رہے تھے۔

ضبط سے دل نزار رہتا ہے   اندرونی بخار رہتا ہے
یوں تو دل کو کبھی قرار نہ تھا   اب بہت بے قرار رہتا ہے
قطع اُمید ہو تو صبر آئے   روز اک انتظار رہتا ہے

ایک مرتبہ میں نے بھگوان کرشن سے خطاب کر کے ایک نظم کہی جس کا آغاز اس بند سے تھا۔

اے نے نوازِ جلوہ گر بزمِ لامکاں
میں تشنہ کام شربتِ دیدارِ پاک ہوں
بچھڑے ہوئے شیر سے پیو گے جمنا میں ہو رواں
دامن بدست غسلِ دوامی سے پاک ہوں

قبلہ نے سُن تو فرمایا کہ نظم میں فارسیت غالب ہے۔ اس سے احتراز مناسب ہے شعر روزمرہ کی زبان میں ہونا چاہیئے اور حتی الامکان عطف و اضافت سے پاک ہونا چاہیئے۔

روز روز کی بیماری سے تنگ آ کر ایک شعر میں فرمایا۔

آج کل میں ملی

دل کی حالت نہیں سنبھلنے کی   اب یہ دنیا نہیں بدلنے کی

اسٹیل ہاؤس کے مشاعروں میں ان کے دو شعر حاصلِ مشاعرہ قرار دیئے گئے۔

اک نظر دیکھا تھا تم کو صرف اتنا یاد ہے   پھر نہیں معلوم ہم بے ہوش کیونکر ہو گیا
ساری دنیا کی زمیں بسترِ گل ہے لیکن   ہم جس آرام کے طالب ہیں وہ آرام نہیں

ان کے کچھ شعر اُردو زبان میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جس بحر میں ڈوبی دلِ مایوس کی کشتی   اس میں کبھی اٹھتے ہوئے طوفان نہیں دیکھا
جب اس نے نقاب اپنی سرِ بزم اُلٹ دی   پھر ہم نے کسی شمع کو سوزاں نہیں دیکھا

نزع میں دیکھا جو اُن کو سامنے آتے ہوئے   اُٹھ گئے اک بار دونوں ہاتھ تھراتے ہوئے

کوئی مجھ سے مستحقِ رحم و غمخواری نہیں   سو مرض ہیں اور بظاہر کوئی بیماری نہیں

یہ دل ہے مرا یا ترا نقشِ کفِ پا ہے   غل ہے کہ سرِ راہ اک آئینہ پڑا ہے

مری زباں سے تو سُنتا نہیں خدا میری   تمھیں بلاؤ کہ آئے کہیں قضا میری

بس ایک نظر اور کہ اب ختم ہے قصہ   پھر ہو گی نہ تم کو مرے مرنے کی خبر بھی

جناب نظر غزل گو تو اعلیٰ پائے کے تھے ہی، اُن کی نظموں میں بھی تغزل کا انداز جھلکتا ہے۔ مختلف موضوعات پر متعدد نظمیں ہیں جو بیشتر رسالہ زمانہ کانپور میں شائع ہوئی تھیں۔ اپنے نواسے گوپی سہائے اور راسے بہادر پریاگ نارائن بھارگو کے نوحے بھی کہے ہیں جو انتہائی سوز و گداز سے بھرے ہوئے ہیں۔ اُردو اور ہندی کے مسئلہ پر 'ادیب' ماہ دسمبر ۱۹۱۰ء کے ایک ایڈیٹوریل نوٹ میں جناب نظر نے جو رائے ظاہر فرمائی ہے۔ اُس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ دونوں زبانوں کا یکساں فروغ چاہتے تھے۔ فرمایا ہے۔

" ناگری پرچارنی سبھا کا سالانہ اجلاس ۱۰ اور ۱۱ اکتوبر کو بمقام بنارس منعقد ہونے والا ہے۔ جس کی صدارت پنڈت مدن موہن صاحب مالوی نے قبول فرمائی ہے۔ اس مرتبہ سبھا موصوف کی ایک قابلِ تعریف کارگزاری یہ ہوگی کہ وہ ترقیٔ اُردو کے مسئلے پر بھی غور کرے گی۔ ہمارے خیال میں ناگری پرچارنی سبھا کے لئے ترقیٔ اُردو کا مسئلہ جو ضرورت سے زیادہ واضح ہو چکا ہے۔ اس قدر قابلِ غور نہیں جس قدر اُردو اور ہندی کے تعلقات کا نازک مسئلہ جو ملک کی بدقسمتی سے روز بروز پیچیدہ ہوتا جاتا ہے اگر ناگری پرچارنی سبھا کے روشن خیال ممبروں کی کوشش سے یہ گتھی سُلجھ جائے تو گویا یہ پہلا قدم ہوگا جو صحیح راستے پر پڑے گا۔ اُردو اور ہندی ملک کی دو نہایت وسیع زبانیں ہیں جو ہندوستان کی دو بڑی قوموں سے تعلق رکھتی ہیں اور جن میں کسی ایک کا مٹ جانا دوسرے کے لئے

باعثِ نقصان ہوگا۔۔۔۔۔"

مضمون کافی طویل ہوگیا ہے اس لئے نظر صاحب کے کلام کا انتخاب درج کرنا مشکل ہے۔ ضرورت ہے کہ ہندوستانی اکاڈمی یا کوئی دوسرا ادارہ نظر صاحب کا کلام حاصل کرکے شائع کردے اُن کا کلام زمانہ اور ادیب کی فائلوں میں ملتا ہے۔ حضرت جگر بریلوی کی یادِ رفتگاں میں بھی کلام کا نمونہ کافی ہے۔

نظر صاحب کے ایک بھائی منشی ہرپرشاد سکسینہ کسی زمانے میں اودھ اخبار کے ایڈیٹر رہے ہیں۔ انھوں نے لکھنؤ کی سیاسی زندگی میں ہمیشہ نمایاں حصّہ لیا ہے اور آج کل راجیہ سبھا کے ممبر ہیں۔

منشی پریم چند مرحوم، منشی دیا نرائن نگم مرحوم، منشی اقبال ورما سحر ہنگامی مرحوم، مولانا شبلی مرحوم، مولانا ظفر علوی مرحوم ایڈیٹر الناظر، مولانا عبدالماجد دریابادی کے ساتھ نظر مرحوم کے خاص تعلقات تھے۔ ان کے قابلِ ذکر لکھنوی معاصرین میں مولانا صفی، عزیز، ثاقب، محشر، بچن صاحب ثروت، علی میاں کامل، بنے صاحب مشتاق، جناب توقیر اور ننھو صاحب شفیق تھے۔ شفیق امی شاعر تھے۔ نظر صاحب سے اُن کے خاص مراسم تھے۔ یوں تو نظر صاحب کے کمالات کا کون قائل نہیں، لیکن جیسا پہلے کہا جاچکا ہے۔ مرحوم حسرت موہانی نے ان کے تکمیلات کو بہت سراہا ہے۔ حسرت نے کہا ہے۔

نظر کی طرح حسرت مجھ کو بھی اک آہ کافی ہے
خلاصہ اس قدر میں نے کیا ہے رنج فرقت کا

ناظرین کرام "ابوالکلام نمبر" کے بارے میں اپنی گراں قدر رائے سے ادارے کو مطلع فرمائیں

غیر طلبیدہ مضامین اُسی صورت میں واپس کئے جائیں گے جب اُن کے ساتھ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ بھیجے جائیں گے۔

پنڈت نہرو سے بات چیت

ہندوستان کی غیر جانبداری اور امنِ عالم کی بقا کے لئے اس کی مسلسل کوشش دنیا بھر سے خراجِ تحسین حاصل کرچکی ہے۔ اور اس کا سہرا وزیر اعظم پنڈت نہرو کے سر ہے جن کی ذات اس ایٹم بدوش دنیا کے لئے امید کا سہارا ہے۔

مسٹر ٹیبر منڈی نے جو پیرس میں سیاسیات کے استاد ہیں اور اس دَور کے سیاسی اور سماجی مسائل پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں، پنڈت نہرو سے دسمبر ۱۹۵۵ء اور جنوری ۱۹۵۶ء کے درمیانی عرصہ میں حالاتِ حاضرہ پر بات چیت کی تھی جو لبعد کو انگریزی میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔

اس بات چیت میں پنڈت نہرو نے ملکی اور غیر ملکی مسائل پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور چونکہ یہ بے تکلّف گفتگو کے انداز میں ہے اس لئے پنڈت نہرو کی شخصیت کے بعض بڑے دلچسپ پہلو سامنے آگئے ہیں۔

وزیرِ اعظم کے پارلیمنٹری سیکریٹری جناب سعادت علی خاں ایم پی نے اس کتاب کا سلیس اُردو میں ترجمہ کرکے بڑی خدمت انجام دی ہے۔

امید ہے کہ یہ کتاب اُردو داں حضرات کے لئے دلچسپی کا مُوجب ہوگی۔

قیمت فی جلد دو روپیہ۔ ڈاک خرچ ۴۰ نئے پیسے

ملنے کا پتہ:۔ پبلیکیشنز ڈویژن۔ پوسٹ بکس ۲۰۱۱۔ اولڈ سیکریٹریٹ دہلی

جلیل عشرتی

غزل

مرے دل کو اس سے رغبت، مری جان کو یہ پیارا
ترا درد اے ستمگر مجھے کیوں نہ ہو گوارا

مری چشمِ تر سے آنسو جو مژہ پہ کوئی آیا
ترے دامنِ نظر کا وہی بن گیا ستارا

شبِ ہجر دونوں دشمن مری زندگی کے نکلے
تری یاد نے ستایا مرے دردِ دل نے مارا

ترے غم نے آج اس سے بھی مرے دل سے ہاتھ چھینا
وہ جو ایک رہ گیا تھا تری یاد کا سہارا

ترا سوز ہو نہ دل میں تو وہ سینہ ہی نہیں سینہ
مری آہ کا ہو شعلہ کہ فغاں کا ہو شرارا

میں نظر سے آج اُن کی کہیں گر نہ جاؤں عشرتی
کہو گردشِ جہاں سے مجھے بڑھ کے دے سہارا

تاباں امروہوی

غزل

یہ وہ اک ذوقِ سجدہ ناز کہ سلیم انداز میں ہے — ورنہ جو سوز ہے کیف وہی ساز میں ہے

کیا ہوا اگر مرا اندازِ جنوں عام ہوا — بات جو راز کی تھی وہ تو ابھی راز میں ہے

کارواں ہی سہی رہنما بھی سہی — میری منزل تو مری جرأتِ پرواز میں ہے

ابتدا ہی میں ہے آنسو سرِ مژگاں ہے — انتہا آخر تو افسانے کی ابھی راز میں ہے

دیکھنے والوں میں کوئی گوشِ بر آواز نہیں — ورنہ لبِ ہمہ خاموش ابھی ساز میں ہے

آج تک عشق کو تھا ناز جن افسانے پر — اب وہ نازک سا فسانہ نگہِ ناز میں ہے

عشقِ خود دار نے آنکھوں میں بسا رکھا ہے — وہی جلوہ جو تری جلوہ گہِ ناز میں ہے

جان پہ کھیل گیا جوشِ وفا میں تاباں
بدگمانی مگر اب تک نگہِ ناز میں ہے

محمد یوسف قیصر

مولانا ابوالکلام آزاد اور بھوپال

مولانا ابوالکلام آزاد اس دنیا سے رحلت کر گئے۔ زندگی کی یہی آخری منزل ہے جس سے ہر ایک کو گزرنا لازمی ہے۔ مگر اکثر انسانوں کی موت دل پر داغ بن کر رہ جاتی ہے جو کسی طرح بھی دور نہیں ہوتا جب کہ یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ اب اس کا نعم البدل کوئی نہیں ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نہایت ذہین اور ذکی انسان تھے۔ ادب و انشا میں وہ اپنی ایک خاص طرزِ نگارش رکھتے تھے۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ماہ نامہ "الندوہ" میں ان کے اکثر مضامین شائع ہوا کرتے تھے جنھیں پڑھ کر لوگ جھوم اٹھتے تھے اور حیرت کرتے تھے کہ اردو میں ایسے لکھنے والے بھی موجود ہیں۔ اسی زمانہ میں ان کا ایک مضمون بالاقساط "المراۃ المسلمہ" کے عنوان سے شائع ہوا اور بہت مقبول ہوا یہاں تک کہ اس کو کتابی صورت میں چھاپ کر ہاتھوں ہاتھ پہنچا دیا گیا۔ یہ کتاب مصر کے ایک ادیب اور فلسفی علامہ فرید وجدی کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ جس میں عورتوں کو "جنسِ نازک" کہہ کر مردوں سے دوسرے درجہ پر رکھا گیا ہے اور اس طرح مصر کے ایک عیسائی مصنف کو ان کی ایک تالیف کا جواب دیا گیا ہے۔

لکھنؤ میں مولانا ابوالکلام آزاد کا قیام زیادہ رہتا تھا۔ وہ مولانا شبلی کے رفقائے صحبت میں تھے اور وہی ان کی تربیت کر رہے تھے۔

بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہوگا کہ وہ اپنے عنفوانِ شباب ہی میں لکھنؤ کے ایک ماہ نامہ "خدنگ نظر" کے ایڈیٹر بن گئے تھے جس کو منشی نوبت رائے نظر (جو لکھنؤ کے محلہ نولبستہ میں رہتے تھے) شائع کیا کرتے تھے۔ اس میں مولانا آزاد اور ان کے بڑے بھائی ابو النصر مولوی غلام یٰسین آہ مرحوم کی اکثر غزلیں شائع ہوتی تھیں جو اس زمانہ کے لحاظ سے اچھی ہوتی تھیں، آتش لکھنوی کا رنگ ان میں جھلکتا تھا۔ یہ رسالہ ایک عرصہ تک شائع ہوتا رہا پھر بند ہو گیا اور منشی نوبت رائے نظر الٰہ آباد کے مصور ماہ نامے "ادیب" کے کچھ دنوں کے لئے ایڈیٹر بن گئے۔

اسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد بھوپال تشریف لائے۔ مولوی محمد امین صاحب زبیری مارہروی کے مہمان ہوئے اور تقریباً ایک ہفتہ رہے۔ مولوی محمد امین صاحب زبیری دفتر تعلیمات میں ملازم تھے۔ اس دفتر میں قواعد و قانون تیار کئے جاتے تھے اور تاریخ بھوپال کے لئے مواد جمع کیا جاتا تھا۔ نواب سکندر بیگم نے اس کو قائم کیا تھا۔ مولوی صدیق حسن خاں (نواب شاہ جہاں بیگم کے شوہر) بھی سب سے پہلے اسی دفتر میں ملازم ہوئے تھے۔ نواب سلطان جہاں بیگم کے عہدِ حکومت میں یہ دفتر "دفتر تاریخ" کے نام سے موسوم ہو گیا تھا اور اس میں تصنیف و تالیف کا کام ہوتا تھا۔ مولوی محمد امین صاحب زبیری سب سے پہلے نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خاں کے مسودہ نگار تھے اور علی گڑھ کالج تحریک کے سرگرم حامیوں میں تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے دلی میں کسی نہ کسی وقت مسلمانوں کی تعلیم پر بڑی دلچسپ بحثیں ہوا کرتی تھیں اور ہر روز دورانِ گفتگو میں اس موضوع کا کوئی نہ کوئی پہلو نکل آتا تھا اور بحث کا آغاز ہو جاتا۔ میں بھی اکثر مولوی محمد امین کے یہاں جایا کرتا اور ان دلچسپ باتوں سے استفادہ کرتا۔

ایک عرصہ کے بعد وہ سہ روزہ اخبار "وکیل" امرتسر کے نائب مدیر (سب ایڈیٹر) ہو گئے۔ اس اخبار کے مالک مولوی غلام محمد اور ایڈیٹر مولوی عبداللہ العمادی تھے۔

میری ایک نظم ماہ نامہ "خاتون" علی گڑھ میں شائع ہوئی۔ اس رسالہ کو شیخ عبداللہ بی اے ایل ایل بی نے جو محمڈن کالج کے زنانہ شعبہ کے سیکرٹری تھے جاری کیا

تھا۔ اس نظم پر مولانا آزاد نے "وکیل" اخبار کے شذرات میں کچھ اعتراض کر دئے وہ اخبار مولانا ابوالکمال سیّد عبدالودود بریلوی کے ذریعہ سے میری نظر سے گزرا اس کا جواب روزنامہ پیسہ اخبار لاہور میں دیا گیا۔ کچھ دنوں یہ بحث چلتی رہی پھر ختم ہو گئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی تین بہنیں تھیں ابو النصر مولوی غلام یٰسین آہ (جو بعد میں مذہبی مناظرے اور تبلیغ کا کام کیا کرتے تھے) کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان ہی بہنوں میں سے ایک بہن جن کا نام محمودہ بیگم اور آبرو بیگم سے مخاطب تھیں اور بہت دنوں یہاں رہیں بھوپال کی خواتین سے ان کی ملاقات ہوتی رہی۔ سرکار نواب سلطان جہاں بیگم سے بھی ملیں، اب ایک عرصہ کے بعد وہ اپنے گھر جانا چاہتی تھیں۔ ان کے بُلانے پر مولانا ابوالکلام آزاد ۱۹۰۸ء میں امرت سر سے بھوپال آئے، چوں کہ ان کی بہن کے جانے میں کسی قدر تاخیر ہوتی گئی، اس لئے مولانا آزاد تقریباً ایک ماہ تک بھوپال میں رہے، مجھ سے تعارف تو ہو چکا تھا۔ اب ان کے ساتھ رہنے کی بھی عزّت حاصل ہو گئی۔ مولانا کی زبان پر اُردو فارسی کے سینکڑوں اشعار رہتے تھے۔ اُٹھتے بیٹھتے یہی مشغلہ تھا۔ امرت سر سے آتے وقت ان کے پاس فارسی شعراء کا تذکرہ آتش کدہ تھا جس میں سے بعض وقت اچھے اچھے شعر سُنایا کرتے، رات کے بارہ ایک بجے کھلے میدانوں اور ریلوے پلیٹ فارم پر چہل قدمی رہتی اور دن کو اکثر مولوی محمد امین زبیری کے یہاں مجلس مباحثہ گرم رہتی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ برٹش گورنمنٹ سے مسلم یونی ورسٹی کے لئے ابتدائی گفتگو شروع ہو چکی تھی اور گورنمنٹ کی شرائط پر اخباروں اور تعلیم یافتہ حلقوں میں نہایت سرگرم بحث ہو رہی تھی۔ ہز ہائی نس سر آغا خاں (مرحوم) مسلم یونی ورسٹی کے معماروں کی صفِ اولین میں نہایت ہی پُر جوش اور سرگرم سربراہ کار تھے۔ غرض کہ مسلم یونی ورسٹی کا موضوع اس قدر عام ہو گیا تھا کہ اس زمانہ کی مسلم زندگی کا ایک جزوِ اعظم بن گیا تھا۔ مولانا آزاد کو بھی اپنے دن گزارنے کے لئے یہی ایک دل چسپ موضوع بن گیا تھا۔ مولانا آزاد کالج کی تعلیم سے غیر مطمئن تھے۔ اور مولوی محمد امین، کالج کے رنگ میں سر سے پاؤں تک رنگے ہوئے تھے۔ اس صورت سے ان دونوں کی باتیں بہت ہی دل چسپ ہوتی تھیں۔

بھوپال میں اُردو فارسی شعرا کے جو کثیر الحجم تذکرے شائع ہوئے ہیں، مولانا آزاد کو ان کی تلاش تھی کیونکہ وہ نایاب ہو چکے ہیں، دن کا ایک بڑا حصّہ تاجرانِ کتب کے یہاں حاضری میں گزر جاتا تھا۔

پُرانی کتابوں کے تاجر مولوی محمد اسحاق تھے جن کی دکان جامع مسجد کی دکانوں میں تھی۔ لکڑی کی مچانوں پر گرد آلود کتابیں اور کچھ کتابوں کے انبار مچانوں کے سامنے پڑے رہتے تھے۔ مولوی محمد اسحاق کو اس کی بھی خبر نہیں تھی کہ ان کے یہاں کون کون سی کتابیں ہیں۔ قدیم کتابوں کے جویا ان انباروں میں تلاش کیا کرتے تھے۔ اگر کتابیں مل گئیں تو مولوی صاحب سے سودا ہو گیا۔ مولانا آزاد بھی کئی دن تک ان گرد آلود کتابوں میں گھسے رہے خدا خدا کر کے دو تذکرے ان کی دکان سے مل گئے اور ایک تذکرہ دوسرے کُتب فروش عبدالرحیم جمعدار کی دکان (جو ابراہیم پورہ میں تھی) سے ملا۔ یہ تینوں تذکرے پا کر مولانا صاحب بہت مسرور تھے، اب "آتش کدہ" ملا کر ان کے پاس چار تذکرے ہو گئے۔ مولانا صاحب دن بھر ان کو دیکھا کرتے جو اچھا شعر دل میں بیٹھ گیا وہ ہر وقت زبان پر رہتا تھا۔ بڑے مزے سے سنایا کرتے تھے۔ سناتے وقت معلوم ہوتا تھا کہ اس کے کیف سے خود بھی بے خود ہو گئے ہیں۔ کبھی دل چاہا تو میرے اصرار پر اپنی غزل کے دو چار شعر سنا دیئے مگر وہ بے کیف ہوتے تھے اور ان سے کوئی سرور پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا اور وہ دن آ گیا کہ مولانا آزاد صاحب اپنی ہمشیرہ عزیزہ (محمودہ بیگم آبرو) کو لے کر بمبئی روانہ ہو گئے، ان کی بہنیں دو تین مرتبہ بھوپال میں آئیں اور سرکاری مہمان کی حیثیت سے مہینوں رہیں اور پھر ترکِ وطن کر کے بھوپال ہی میں آباد ہو گئیں۔ یہ خاندان محمودہ بیگم عرف آبرو بیگم اور ان کے شوہر مولوی ابراہیم صاحب (جو کلکتہ میں تبیرز ہوا کرتے تھے) فاطمہ بیگم عرف آرزو بیگم اور ان کے شوہر مولوی معین الدین عرب اور ان کے بچوں پر مشتمل تھا۔ مولانا آزاد کی بڑی بہن کلکتہ ہی میں رہیں۔ بھوپال نہیں آئیں اور وہیں اُن کا انتقال ہو گیا۔

اس خاندان کا معاشی مسئلہ اس طرح حل ہو گیا کہ مولوی احمد ابراہیم صاحب (آبرو بیگم کے شوہر) سرکار نواب سلطان جہاں بیگم کے سیکرٹری امور متفرق بنا دیئے گئے۔ آبرو بیگم صاحبہ پرنسس آف ویلز لیڈیز کلب کی سکرٹری ہو گئیں جس کو نواب سلطان جہاں بیگم نے خواتین بھوپال کی اصلاح و تربیت کے لئے عالی منزل (باب عالی) میں قائم کیا تھا۔ فاطمہ آرزو بیگم زنانہ مدارس کی لیڈی انسپکٹر بنا دی گئیں۔ ان دونوں بہنوں کا بیش قرار منصب بھی مقرر تھا۔ ان بہنوں سے نواب سلطان جہاں کو بہت محبت تھی اور ان دونوں کو بھی علیا حضرت سے دلی لگاؤ تھا،

ایک عرصہ تک تاج محل اور نواب منزل (شاہجہاں آباد) میں سکونت پذیر

رہ کر یہ خاندان احمد آباد پیلیس کے ایک بنگلہ میں منتقل ہوگیا۔

اس خاندان میں سب سے زیادہ قابلِ عزت اور شریف انسان مولوی معین الدین صاحب عرب تھے۔ وہ عرب کے ایک ممتاز خاندان سے متعلق تھے اور بھوپال میں بہت زیادہ ہر دل عزیز تھے، بہت ہی خلیق، ہمدرد اور ملنسار تھے بھوپال میں اس خاندان کے یہاں سب سے پہلی موت ان ہی محترم عرب صاحب کی ہوئی (خدا ان کو جنت نصیب کرے)

ان کے بعد مولوی احمد ابراہیم صاحب اس دنیا سے رخصت ہوئے اور اس طرح یہ دونوں بہنیں اپنے شوہروں کی رفاقت سے محروم ہوگئیں۔

ان اموات کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد پھر بھوپال تشریف لائے۔ بھوپال آکر وہ احمد آباد ہی میں مقیم ہوئے۔ اب کے مولانا آزاد کے بہت سے عقیدت مند بھوپال میں ہو گئے۔

مولانا صاحب گھر سے چل کر درختوں کے سایہ میں صاف و شفاف پتھر کی چٹانوں پر بیٹھ جاتے، عقیدت مند ان کے سامنے حلقہ بنا کر بیٹھتے، اور مولانا کی سحرالبیانی اور زورِ کلام سے اس درجہ مسحور ہو جاتے کہ گھنٹوں سنتے رہتے پھر بھی یہی دل چاہتا تھا کہ اسی طرح سُنا کریں اور یہ آواز کانوں میں آتی رہے۔ کبھی رشد و ہدایت کی باتیں تھیں، کبھی اسلام کے حقائق و معارف تھے۔ کبھی حالاتِ حاضرہ کا جائزہ تھا، کبھی مسلمانوں کی غفلت و جہالت کا تذکرہ تھا۔ کبھی منتخب اشعار زبان پر تھے، کبھی طنز و مزاح تھا۔ غرض جس موضوع پر زبان کھلتی تھی ایک دریا موجزن ہو جاتا تھا

کچھ دنوں رہ کر کلکتہ چلے گئے، پھر نہ آنا تھا نہ آسکے، کلکتہ جا کر اخبار الہلال جاری کیا جو ملک میں بے حد مقبول ہوا کیونکہ اردو میں اس شان کا اخبار جاری ہی نہیں ہوا تھا جس میں ہر قسم کے مضامین ہوتے تھے اور ہر مضمون اپنی جگہ اس قدر موثر ہوتا تھا کہ آنکھیں کھل جاتی تھیں اور دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ مچھلی بازار کانپور کی محراب توڑ کر سڑک میں شامل کی جا رہی تھی۔ مسٹر مظہر الحق بیرسٹر (بانکی پور) کی قانونی موشگافیاں اور اسیران بلا کے ساتھ انتہائی ہمدردیاں، دوسری طرف الہلال کے پُرجوش مضامین دلوں میں اُمنگ اور ہمت و حوصلہ کو قوی بنا رہے تھے۔

مولانا آزاد ابتدا ہی سے کانگریسی تھے۔ الہلال والبلاغ کے بعد ان کی تمام تر توجہ کانگریس پر رہی اور اسی کی فلاح و بہبود ان کی زندگی کا نصب العین بن گیا تھا۔ ملکی خدمت کے جذبات میں غرق ہو گئے تھے۔ وہ دن بھی آیا کہ ان کی تمنائیں بار آور اور ان کی کوششیں کامیاب ہوئیں، ملک آزاد ہوا، جمہوریت کا پرچم لہرایا۔ مولانا وزیرِ تعلیمات بنے۔

کئی مرتبہ ان کے بھوپال آنے کا پروگرام بنا مگر کسی عذر کے ساتھ ختم ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ بھی اس دُنیا سے رخصت ہوئے لیکن ان کی علمی و سیاسی خدمات ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

پیداواری صلاحیت میں اضافے کی تحریک

کونسل کا قیام

پیداواری صلاحیت میں اضافے کی قومی کونسل کا مقصد یہ ہے کہ سائنسی تکنیک کے ذریعے پیداوار میں اضافہ اور نوعیت میں اصلاح کی جائے۔ سائنسی تکنیک کے ذریعے پیداوار میں اضافہ اور نوعیت میں اصلاح کی جائے۔ سائنسی تکنیک میں جن شکلی خام مال اور مشینری کو عمدہ طریقے سے کام میں لانا شامل ہیں۔ پیداواری صلاحیت میں اضافے کی بدولت فی کس آمدنی اور قومی دولت میں اضافہ ہوگا اور اس اضافے کا شمار پنج سالہ پلانوں کے خاص مقاصد میں ہوتا ہے۔

پیداواری صلاحیت میں اضافے کی قومی کونسل سائنسی مطالعوں اور تکنیک کو منظم کرے گی اور انھیں ترقی دے گی۔ علاوہ ازیں کونسل ملک کے اندر اور غیر ممالک کے مختلف کارخانوں میں فن داروں اور انتظامی عملے کی تربیت اور مزدوروں کا انتظام بھی کرے گی۔ ٹیکنیکل معلومات کے متعلق تحقیق اور اس کی مسلسل نشر و اشاعت کونسل کے خاص فرائض میں شامل ہوگا۔ کونسل کے کام میں وسعت اور تیزی پیدا کرنے کی غرض سے سال رواں میں ملک کے مختلف حصوں میں پیداواری صلاحیت میں اضافے کی ۱۵ مقامی کونسلیں قائم کی جائیں گی۔ چنانچہ ان میں سے دو کونسلیں بنگلور اور کوئمبٹور میں قائم کی جا چکی ہیں۔

ع۔م

نئی کتابیں اور رسالے

تذکرۂ شعرائے جے پور

مؤلف احتشام الدین احمد شاغل۔ ناشر انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔
ضخامت ۲۲×۲۹/۱۶ کے ۵۲۸ صفحے۔ کتاب مجلد ہے اور جلد پوش کی حامل
کتابت و طباعت عمدہ۔

دہلی اور لکھنؤ زبان و ادب کے مرکز تھے لیکن حیدرآباد، پٹنہ، جے پور بھی اپنی اپنی جگہ خدمت زبان و ادب میں پیش پیش رہے ہیں ۲۲۵ شعراء کا یہ ضخیم تذکرہ اپنی مثال نہیں رکھتا۔ راجستھان کے ریگ زاروں میں شعر و ادب کے دلدادگان نے شعر و ادب کے دریا بہائے ہیں۔ ان کا تذکرہ اس کتاب میں ملے گا۔ مؤلف نے بڑی محنت کی ہے۔ شعراء کی تصویریں بھی شامل کتاب ہیں۔ شعراء کے حالات حروفِ تہجی کے اعتبار سے درج کئے ہیں۔ تذکرۂ شعراء سے پہلے ۱۵ صفحوں میں جے پور کی ادبی سرگرمیوں پر ایک طویل مواکرہ ہے۔ جے پور کالج، مشاعرے، مناظرے، رسالے، علمی و ادبی رسائل، مطبعے، ادبی انجمنیں وغیرہ عنوانات کے تحت مفید معلومات کتاب میں درج ہیں۔ متعدد شعراء جے پور دربار اور جے پور سے متعلق رہے ہیں۔ چنانچہ اس کتاب میں ظہیر دہلوی، انور دہلوی، میر مہدی مجروح، خواجہ قمرالدین راقم، مرزا عباس بیگ منشر شاگرد شاہ نصیر، تسلیم ناولی، مائل دہلوی، محسن اور اطہر ہاپوڑی کے حالات شامل ہیں۔ یہ سب ایسے شعراء ہیں جن کا تذکرہ ادب کی ہر تاریخ میں ضروری ہے۔

ہمیں امید ہے کہ شاغل صاحب کا یہ کارنامہ ادبی دنیا میں احترام سے دیکھا جائے گا۔

آشفتہ بیانی میری

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اس کتاب میں علی گڑھ سے متعلق اپنے تاثرات بیان کئے ہیں۔ علی گڑھ سے آپ کا پرانا تعلق ہے۔ یہ وابستگی روح کی گہرائیوں تک ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے اپنے زمانۂ تعلیم، اسکول، ماسٹر صاحب کے حال سے لے کر علی گڑھ کے بزم و رزم کے افسانے اپنے مخصوص انداز میں بیان کئے ہیں۔ یہ کتاب اردو ادب کا ایک قیمتی سرمایہ ہے جس کا تفصیلی جائزہ کسی آئندہ اشاعت میں ملاحظہ فرمائیے گا۔ رشید صاحب نے کچھ ایسے شگفتہ انداز سے جزئیات کی تفصیل پیش کی ہے کہ بے اختیار کہنا پڑتا ہے ع

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

کتاب ۲۲×۳۶/۱۶ کے ۱۹۲ صفحوں پر مشتمل ہے۔ کتابت و طباعت اوسط۔ قیمت مجلد ۳ غیر مجلد ۲۔
ملنے کا پتہ:۔ سرسید بک ڈپو شمشاد بلڈنگ علی گڑھ

شکنتلا

کالی داس کی شہرۂ آفاق تصنیف کا اردو روپ۔ از قدسیہ زیدی ——
تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶۔ صفحات ۱۴۴۔ کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ۔ ناشر انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔ قیمت ۵۵۵ روپے۔

شکنتلا کا یہ ترجمہ بول چال کی زبان میں ہے اور یہ خوبی ہے کہ ہندی الفاظ کے استعمال سے اصل کا مزاج بھی قایم رکھا گیا ہے۔ بیگم قدسیہ زیدی کا یہ کارنامہ اردو ادب میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔ اردو میں ’ڈراما‘ کا فقدان بالخصوص اس دور میں بہت روح فرسا ہے۔ اچھے ترجمے بھی کم یاب ہیں۔ عالمگیر شہرت کی کتاب کا یہ ترجمہ مطالعے کی چیز بھی ہے اور اسٹیج کی بھی۔

محشرِ خیال

سجاد انصاری مرحوم کے مقالات، ڈراما اور کلام کا مجموعہ آزاد کتاب گھر کلاں محل دلی نے شائع کیا ہے۔ صفحات ۲۳۴، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ——
قیمت تین روپے تیس نئے پیسے

یہ کتاب نایاب تھی۔ اسے دوبارہ شائع کر کے ناشرین نے ایک نادر کتاب

کو زندہ کیا ہے۔ سجاد انصاری مرحوم اردو نثر میں ایک بہت بڑے صاحبِ طرز تھے۔ ان کی نثر میں استدلال، خلوص، اور بیان کی شوکت کے ساتھ ساتھ ایک تند و تیز دریا کی روانی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے "...... لیکن فطرتِ شر نہ ارتقاء کی محتاج تھی اور نہ مرورِ ایام کی۔ وہ ایک سیرت مطلق ہے جس کی تکمیل کے لئے ان اضافتوں کی ضرورت نہیں جو فطرت خیر کے لئے لازمی تھیں شیطان خود اپنی ابتداء تھا اور خود اپنی انتہاء جس پیام کا وہ حامل تھا اُس کی تکمیل اس وقت ہو چکی تھی جب وہ ملکوتیت کے گہوارے میں کھیل رہا تھا۔ قدرت صرف اس کی منتظر تھی کہ ایک حامل خیر وجود میں آسکے۔ جب آدم کا تخیل مکمل ہو گیا شیطنت مع اپنی تمام عظمتوں کے نمودار ہو گئی اور کائنات کو اپنی نیرنگیوں سے لبریز کر دیا...... " (پیام زلیخا)

اس کتاب میں چھوٹے بڑے پچیس مضامین، ایک ڈراما اور کچھ کلام شامل ہے۔ ان کا سرمایۂ شعری کم ہے۔ لیکن اس میں بھی ان کی نثر کی شوکت موجود ہے۔ غزل کا رنگ بڑا پاکیزہ ہے۔

فضائے حُسن کے صدہا کرشمے چھپ گئے ہوتے
مری محرومیوں نے مجھ کو پابندِ نظر رکھا

آثارِ ابوالکلام

قاضی عبدالغفار مرحوم کی یہ تصنیف ایک نفسیاتی مطالعہ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اب یہ ترمیم و اضافہ کے بعد شائع ہوئی ہے۔ قیمت تین روپے پچھتر نئے پیسے۔ ملنے کا پتہ آزاد کتاب گھر کلاں محل۔ دلّی۔ صفحات ۴۴۸۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کتابت، طباعت، جلد، جلد پوش اوسط سے بہتر۔ اس کتاب کے موضوع کی تشریح خود مصنّف نے ابتداء ہی میں فرمادی ہے۔

"جب میں نے یہ مطالعہ شروع کیا تو میرے اس تبصرے کا موضوع نہ تو مولانا کی شخصی زندگی کے معلومات تھے نہ ان کی خاندانی یا ذاتی عظمت تھی۔ نہ ان کی سیاسی زندگی کے کارنامے نہ ان کا مجتہدانہ علم و فضل تھا۔ بلکہ میری فکر و نظر کا مرکز صرف اُن کی وہ مخصوص انفرادیت تھی جس کے نقش و نگار ان کی تحریروں میں نمایاں ہوتے ہیں۔"

تنقیدی شعور

سید اختر علی اختر تلہری کے ادبی و تنقیدی مقالات کا مجموعہ۔ ناشر کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنؤ۔ قیمت دو روپے پچھتر نئے پیسے۔ ضخامت ۲۰۸ صفحات۔ کتابت و طباعت عمدہ، کاغذ اوسط۔ ذیل کے بارہ مقالات اس کتاب میں شائع ہوئے ہیں۔

شعر اور ذوقِ سلیم، تخلیقی ادب اور تنقیدی ادب، ادب اور زندگی، شعر اور ترقی پسند ادب، شاعری کے نئے رجحانات، جناب مجنوں گورکھپوری کے تنقیدی مفروضات، نئے ادیبوں پر مدا وا کا ردِ عمل، موجودہ ادیبوں اور شاعروں سے آزاد ہندوستان کا مطالبہ، پنڈت برج نرائن چکبست ایک انشا پرداز کی حیثیت سے، صفی لکھنوی کی نظم نگاری صحیفۃ الملّت کے آئینے میں۔ حالی اور پیروی مغربی، اقبال اور اشتراکیت۔

موضوعات بڑے دل چسپ ہیں اور سب سے زیادہ قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ مُصنّف نے انصاف پسندی اور رائے کی آزادی سے دست کشی نہیں کی وہ ایک پختہ کار فن کار اور صاحبِ علم و فضل ادیب ہیں۔ قدیم و جدید کو کسی تعصّب کے بغیر دیکھتے ہیں اور جو جی میں آتا ہے بے دریغ کہہ دیتے ہیں یہی حُرّیتِ فکر آج کل کے ادیبوں اور نقادوں میں نہیں ملتی۔ یہ کتاب اسم بامسمیٰ ہے اور ادب کے ہر طالب علم کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔

اردو ایسیز Urdu Essays

مرتبہ ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی۔ ناشر ایشیا پبلشنگ ہاؤس امپوریم پرائیویٹ لمیٹڈ۔ پیپل بلڈنگ۔ سر فیروز شاہ مہتہ روڈ بمبئی نمبر ا۔ قیمت دو روپے ۵۰ نئے پیسے۔ صفحات ۲۱۸۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶۔ کتابت، طباعت، کاغذ اوسط۔

اُردو میں 'ایسے' کا رواج کم رہا ہے۔ فاضل مرتب نے مقدمے میں "اردو لٹریچر میں ایسے" کے عنوان سے 'ایسے' کی تاریخ تفصیل سے بیان کی ہے۔ کتاب کا تعارف مولانا نیاز فتح پوری نے لکھا ہے۔ اس کے بعد سرسیّد احمد خاں سے لے کر کنہیالال کپور تک متعدد ادیبوں کے "ایسیز" درج کئے ہیں۔

سعیدہ کے خطوط

مُصنّف ظفر حسین خاں۔ ناشر کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنؤ۔ قیمت ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے۔ ضخامت ۱۴۸ صفحات

اردو کے مقتدر ادیب جناب ظفر حسین خاں سے کون واقف نہیں آپ متعدد کتابوں کے مصنّف ہیں۔ جن میں انواعِ فلسفہ اور مآل وشیت بہت مشہور ہیں۔ مؤخر الذکر پر ساہتیہ اکادمی نے آپ کو پانچ ہزار روپے کا گراں قدر انعام بھی دیا تھا۔ زیرِ تبصرہ کتاب ایک نفسیاتی مطالعہ ہے جس میں ایک شریف لڑکی کی

داستانِ محبت اسی کی زبان سے بیان کی گئی ہے۔ یہ ناول دوسری بار شائع ہوا ہے پہلے بھی قبولِ عام کی سند پا چکا ہے۔ اب بھی امید ہے اس کا پرجوش استقبال ہوگا۔ فلسفہ و حکمت کا یہ اخلاقی مرقع ایک اچھا ادبی کارنامہ ہے۔

تذکرۂ نادر

مرتبہ سید مسعود حسن رضوی۔ ناشر کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنؤ۔ قیمت ۶؍ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔

یہ تذکرہ مرزا کلب حسین خاں بہادر مبارز جنگ نادر شاگردِ شیخ ناسخ کی تصنیف ہے جسے مرتب نے اپنے مفصل مقدمے کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ اس تذکرے میں ۱۲۵ ہم عصر شعراء کا کلام شامل ہے۔ اس تذکرے میں ایسے بہت سے شاعروں کا مختصر حال اور نمونۂ کلام مل جائے گا جن کا ذکر اور کہیں نہیں ملتا۔ بعض نامور شعراء کی غزلیں جو غزل گو کی حیثیت سے معروف نہیں ہیں اس میں موجود ہیں مثلاً ضمیر، خلیق، انیس، دبیر، انس، مونس۔ بقول مرتب یہ تذکرہ ہماری ادبی تاریخ کے ایک دور کے لئے معتبر ماخذ کا کام دے سکتا ہے۔

طالب و موہنی

ہمارا شہر کے ایک تاریخی شہر پر نیڈہ کی پرانی داستانِ عشق جس کو سید الہ موسیٰ نے حیدرآباد میں ۱۲۳۳ھ سے قبل منظوم کیا۔ مرتب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے۔ ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر۔ خیریت آباد حیدرآباد (اندھرا)۔ شروع میں زور صاحب نے والہ کی زندگی کے حالات، تصنیفات، مثنوی کی تفصیلات و خصوصیات کا ذکر کچھ ایسے اجمال سے کیا ہے جو شرح و تفصیل کا محتاج نہیں۔ اس کے بعد مثنوی تمام و کمال درج کتاب ہے۔

ابوالکلام آزاد

جگن ناتھ آزاد کی یہ نظم ادارۂ فروغِ اردو لکھنؤ نے شائع کی ہے۔ سولہ صفحے کے اس کتابچے کی طباعت و کتابت دیدہ زیب ہے۔ مولانا آزاد کے انتقال پر بہت سی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ یہ نظم بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ قیمت پچیس نئے پیسے

موصولات

میرا پہلا گناہ ۔ ناول از دہقانی۔ حصہ اول سے حصہ ششم تک کتاب موصول ہوئی ہے۔ ملنے کا پتہ عزیز الرحمن رئیس مقام و ڈاک خانہ میانگنج ضلع اناؤ۔ قیمت مکمل سیٹ چھ حصے۔ ایک ہزار سات سو ستر صفحات مبلغ بارہ روپے۔

شعلۂ حرف ۔ کیف بھوپالی کا مجموعۂ کلام۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ اختر مسعود۔ ہوا محل روڈ بھوپال

اشرف ۔ ایک دلچسپ معاشرتی ناول۔ ضخامت ۱۴۰ صفحات۔ قیمت ۱۲؍۔ مصنف۔ محمد نعیم الحق مختار و میونسپل کمشنر نیا بازار دھنباد۔

وادیٔ خیال ۔ جوہر زاہری کا مجموعۂ کلام۔ ناشر مکتبۂ قصرِ اردو۔ اردو بازار دہلی۔ قیمت ۲؍۔ مانی جائسی، ہری چند اختر، زاہر حیدری، عبادت بریلوی اور خواجہ احمد فاروقی کی رائیں کتاب کے شروع میں درج ہیں۔ ان سب بزرگانِ ادب کا قول ہے کہ جوہر صاحب کا مستقبل حال سے زیادہ تابناک ہوگا۔ کتاب حسین و جمیل ہے۔

میخانہ ۔ کشن دت طوفان کا مجموعۂ کلام۔ ناشر مکتبہ قصرِ اردو، اردو بازار دہلی۔ قیمت دو روپے پچیس نئے پیسے۔ طوفان انور صابری صاحب کے شاگرد ہیں۔ ان کا یہ مجموعۂ کلام جو طباعت و کتابت کا ایک اچھا نمونہ ہے امید ہے اہلِ ادب سے دادِ تحسین پائے گا

عزمِ جواں (ناول) مصنف ہیرلڈ رسل و وکٹر روزن، مترجم راج نرائن ایم اے قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ میسرز لاجپت رائے اینڈ سنز اردو بازار دہلی۔

رسالے

المجید ۔ مجیدیہ اسلامیہ کالج میگزین الہ آباد کا سالانہ نمبر اپریل ۱۹۵۸ء

حرم ۔ ماہنامہ حرم لاہور (پاکستان) چندہ سالانہ چھ روپے۔ مدیرہ ظہیرہ بیگم طالبات اور عورتوں کے لئے مفید رسالہ

سویرا ۔ ۲۳۔ ناشر نیا ادارہ ۔ ۱۵ سرکلر روڈ لاہور۔ ٹائپ میں چھپا ہے۔ ۲۰۴ صفحے ۔ معیاری مندرجات۔ قیمت درج نہیں۔

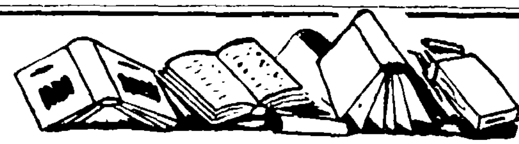
شاہکار ۔ ادبی ڈائجسٹ۔ ناشر مکتبہ شاہکار ۔ ۱۲ کٹرہ الہ آباد ---- مدیر محمود احمد ہنر۔ قیمت سالانہ دس روپے

صحیفہ ۔ ۴۔ سہ ماہی رسالہ۔ مدیر اعزازی سید عابد علی عابد۔ ناشر کریم احمد خاں معتمد مجلس ترقیٔ ادب۔ نرسنگھ داس گارڈننز کلب روڈ لاہور۔ زرِ سالانہ دس روپے۔

آستانۂ زکریا (ملتان)، مدیر مسئول مخدوم زادہ محمد سجاد حسین۔ سالانہ چندہ ۵ روپے۔ ایڈیٹر میر حسان الحیدری۔

ریویو کے لئے ہر کتاب کے دو نسخوں کا آنا ضروری ہے

ہماری کتابیں



نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
پنڈت نہرو سے بات چیت (نامور فرانسیسی جرنلسٹ تیبر منڈی)	دو روپے	۵۰ نئے پیسے
دیس دیس کی لوک کہانیاں	۷۵ نئے پیسے	۲۵ نئے پیسے
بھارت کی لوک کہانیاں	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
اپنے گھر کو آگ سے بچائیں	۷۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
ہماری کامیابیاں اور نئی منزلیں	۶۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی	۷۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
ناپ تول کا میٹری نظام	۳۵ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
ہمارے نئے سکے	۲۵ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
کیلنڈر کی اصلاح	۴۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے

نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
جواہر لال نہرو کی تقریریں (۱)، (۲)، (۳)، (۴)، (۵)	۱۰ نئے پیسے (فی کاپی)	۸ نئے پیسے (فی کاپی)

ہندوستان ترقی کی راہ پر

نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
نئے سماجی نظام کی جانب		
آبپاشی اور بجلی	۱۰	۸
ہمارے پلان اور سوشلزم	نئے پیسے	نئے پیسے
صنعتی ترقی	فی	فی
خوراک اور زراعت	کاپی	کاپی
رسل و رسائل		

(رجسٹری خرچ الگ)

• پچیس ۲۵ روپے یا اس سے زیادہ کی کتابوں پر ڈاک خرچ نہیں لیا جائے گا قیمت پیشگی اور پوسٹل آرڈر کے ذریعے بھیجنے سے آسانی رہتی ہے

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸

ہندوستان کے کلچر اور تعمیر و ترقی

کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے یہ رسالے پڑھئے

انگریزی رسالے

انڈین انفارمیشن
(پندرہ روزہ رسالہ)

اس میں اہم سرکاری اعلانات اور ملک بھر میں پلان کے تحت ہونے والے ترقیاتی کاموں کی خبریں پیش کی جاتی ہیں۔
قیمت فی کاپی ۳۰ نئے پیسے - سالانہ چندہ چھ روپے

مارچ آف انڈیا
"ہندوستان اور اس کی ترقی کا دلچسپ مرقع"
(سنڈے نیوز آف انڈیا)
فی کاپی ایک روپیہ - سالانہ چندہ دس روپے

کشمیر
کشمیر کی زندگی اور اس کے مسائل سے متعلق انگریزی ماہنامہ جو دلکش مضامین اور خوبصورت تصاویر سے مزین ہوتا ہے۔
فی کاپی ۵۰ نئے پیسے - سالانہ چندہ پانچ روپے

بھاگیرتھ
سینٹرل واٹر اینڈ پاور کمیشن کا سرکاری ترجمان - اس میں ہندوستان کے آبپاشی اور بجلی کے منصوبوں سے متعلق معلومات شائع کی جاتی ہیں۔
فی کاپی ۲۵ نئے پیسے - سالانہ چندہ تین روپے

سوشل ویلفیر
سینٹرل سوشل ویلفیر بورڈ کا انگریزی ماہنامہ جس میں ملک کی سماجی بہبود سے متعلق مختلف مسائل پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔
فی کاپی ۳۵ نئے پیسے - سالانہ چندہ چار روپے

انگریزی اور ہندی
میں ایک ساتھ شائع ہونے والے رسالے

کروکشیتر
اس مصور ماہنامہ کا مقصد کمیونٹی ڈولپمنٹ پروگرام کی اشاعت ہے۔
فی کاپی ۳۵ نئے پیسے سالانہ چندہ چار روپے

گرام سیوک
یہ رسالہ کمیونٹی پراجیکٹ ایڈمنسٹریشن کے تحت کام کرنے والے گرام سیوکوں کی رہنمائی کے لئے شائع ہوتا ہے۔
فی کاپی ۱۵ نئے پیسے۔
سالانہ چندہ ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے

یوجنا (پندرہ روزہ)
چیف ایڈیٹر - خوشونت سنگھ

اس میں پنج سالہ پلان کے بارے میں ضروری معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں اور ملک بھر میں جو مختلف قسم کے ترقیاتی کام ہو رہے ہیں ان کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ فی کاپی ۱۰ نئے پیسے
سالانہ چندہ دو روپے پچاس نئے پیسے

ہندی رسالے

بھارتیہ سماچار
(پندرہ روزہ رسالہ)

اس میں اہم سرکاری اعلانات اور ملک میں پلان کے تحت ہونے والے ترقیاتی کاموں کی خبریں پیش کی جاتی ہیں۔
فی کاپی ۲۵ نئے پیسے - سالانہ چندہ ۵ روپے

آج کل (ہندی)
یہ ایک ثقافتی رسالہ ہے جس میں ملک کے سماجی ثقافتی مسائل اور غیر ملکی معاملات سے متعلق مضامین کہانیاں اور نظمیں شائع ہوتی ہیں۔
قیمت فی کاپی ۵۰ نئے پیسے۔
سالانہ چندہ چھ روپے۔

بال بھارتی
ہندی میں بچوں کا باتصویر رسالہ - دلچسپ کہانیاں، بچوں سے متعلق مضامین اور چٹکلے اس میں شامل ہوتے ہیں۔
فی کاپی ۳۵ نئے پیسے۔
سالانہ چندہ چار روپے

سماج کلیان
ہندی میں سنٹرل سوشل ویلفیر بورڈ کا ترجمان
فی کاپی ۳۵ نئے پیسے
سالانہ چندہ چار روپے

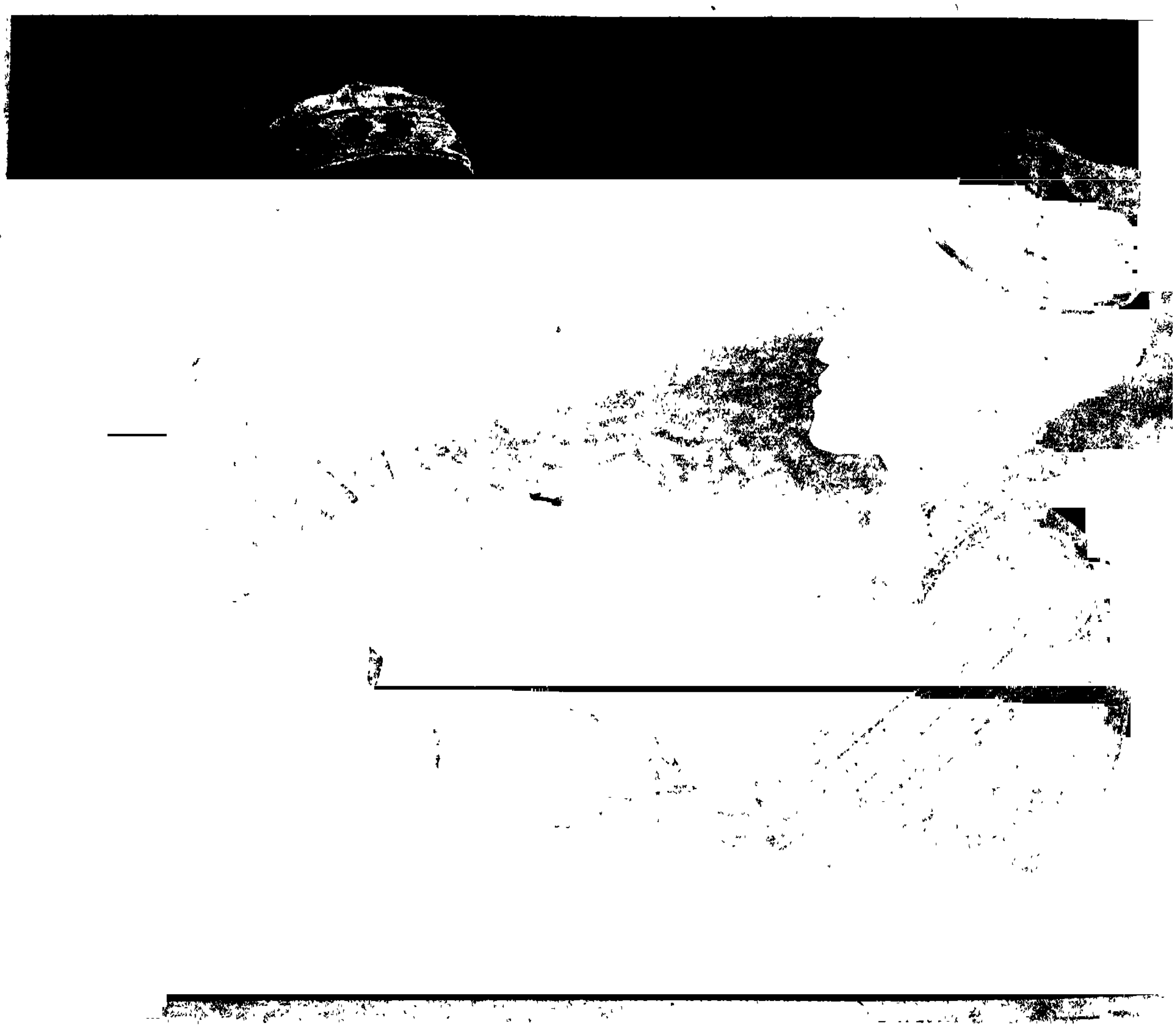
ان رسالوں میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیجئے

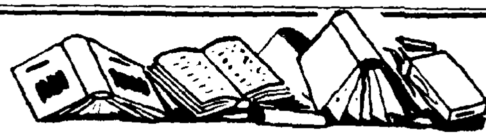
یہ رسالے مشہور کتب فروشوں اور اخباری ایجنسیوں سے مل سکتے ہیں
یا براہ راست اس پتہ پر لکھئے

پبلیکیشنز ڈویژن، اولڈ سیکریٹریٹ، پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

Edited and Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi

Regd. No. D—509





ہماری کتابیں

نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
پنڈت نہرو سے بات چیت (نامور فرانسیسی جرنلسٹ ٹیبر منڈی سے)	دو روپے	۵۰ نئے پیسے
دیس دیس کی لوک کہانیاں	۷۵ نئے پیسے	۲۵ نئے پیسے
بھارت کی لوک کہانیاں	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
اپنے گھر کو آگ سے بچائیں	۷۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
ہماری کامیابیاں اور نئی منزلیں	۶۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی	۷۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
ناپ تول کا میٹری نظام	۳۵ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
ہمارے نئے سکے	۲۵ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
کیلنڈر کی اصلاح	۴۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے

نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
جواہر لال نہرو کی تقریریں (۱)، (۲)، (۳)، (۴)، (۵)	۱۰ نئے پیسے (فی کاپی)	۸ نئے پیسے (فی کاپی)

ہندوستان ترقی کی راہ پر

نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
نئے سماجی نظام کی جانب	۱۰ نئے پیسے فی کاپی	۸ نئے پیسے فی کاپی
آبپاشی اور بجلی		
ہمارے پلان اور سوشلزم		
صنعتی ترقی		
خوراک اور زراعت		
رسل و رسائل		

(رجسٹری خرچ الگ)

پچیس روپے یا اس سے زیادہ کی کتابوں پر ڈاک خرچ نہیں لیا جائے گا قیمت پیشگی اور پوسٹل آرڈر کے ذریعے بھیجنے سے آسانی رہتی ہے

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸

غضبناک عورت
قہرِ الٰہی سے کم نہیں!



گھر کی سیدھی سادی عورت ہی سہی . . . مگر اُسکی خواہشیں ہمارے لئے نہایت اہم ہیں۔ گھریلو کام کاج میں اُسکی ضرورتوں سے آنکھ پھیر کر اُسے غصّہ دلانا کوئی دانائی نہیں۔ اسی لئے اِس سلسلے میں ہم اُسکی بات کو ہمیشہ حرفِ آخر سمجھتے ہیں۔
اُسکی ضروریات جاننے کیلئے ہم سارے مُلک میں 'مارکیٹنگ ریسرچ' کے ذریعے اُسکی مانگوں کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ اور یوں درحقیقت گھر کی یہ سیدھی سادی عورت ہی وہ معیار پیش کرتی ہے جن کے مطابق ہندوستان لیور کی مصنوعات تیار کیجاتی ہیں۔
یہ معیار برقرار رکھنے کیلئے مصنوعات کی تیاری کے دوران میں، بار بار اُن کی کڑی جانچ پرکھ کی جاتی ہے، اور اِسطرح ہم آپ کی خدمت میں آپکی ضرورتوں کی اعلیٰ مصنوعات پیش کر پاتے ہیں۔

ہندوستان لیور کا آدرش ـــــ گھر گھر کی خدمت

HLL 16-238UD

آپ کی بھلائی
اور
قوم کی بہتری
کے لئے



دوسرا پنج سالہ پلان افلاس اور ادبار سے چھٹکارا پانے کے لئے قوم کی بے تاب تمنا کا مظہر ہے۔

ہر شخص زندگی کے کسی نہ کسی شعبے میں پلان کی کامیابی کے لئے تھوڑی بہت خدمت ضرور کر سکتا ہے۔ پلان پوری قوم کو مشترکہ طور سے خوشی اور خوشحالی کی راہ پر آگے بڑھنے کی ہمت اور حوصلہ عطا کرتا ہے۔

زیادہ اناج پیدا کر کے یا صنعتی پیداوار بڑھانے میں مدد دے کر یا سماجی خدمات میں حصہ لے کر یا قومی بچت اسکیم میں روپیہ لگا کر آپ واقعی نئے بھارت کی تعمیر میں ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ خود آپ کی اپنی ترقی کا راز ملک کی بہتری میں ہے۔





پلان کی مدد اپنی مدد ہے

اپنی مدد آپ کیجئے

ترتیب

سرورق — بشنو از نے چوں حکایت می کند

اکتوبر ۱۹۵۸ء

اسوج۔کارتک شک سمت ۱۸۸۰

جلد ۱۷۔ نمبر ۳

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

سالانہ چندہ:۔ ہندوستان میں:۔ چھ روپے
پاکستان میں:۔ چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے:۔ نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ: ہندوستان میں:۔ ۵۰ نئے پیسے
پاکستان میں:۔ آٹھ آنے (پاک)

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر "آج کل" (اردو) اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸

مُرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومتِ ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

مُلاحظات

۲ اکتوبر کو راشٹر پتا مہاتما گاندھی کا جنم دن ہے۔ اس عظیم ہستی نے اہنسا کا جو پیغام دیا، آج ایٹمی دھماکوں سے سہمی ہوئی دنیا کے لئے وہی نجات کا واحد ذریعہ ہے۔ حالات و واقعات نے ثابت کر دکھایا ہے کہ نفرت اور جنگ و جدال سے دنیا کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ صلح و آشتی پیار اور محبت کے راستے پر چل کر ہی دنیا کی سب چھوٹی بڑی قومیں امن اور چین سے رہ سکتی اور ترقی کر سکتی ہیں۔ یہی گاندھی کا پیغام ہے جس کی اہمیت اور ضرورت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

مغربی ایشیا میں لبنان اور عراق کی سیاسی صورتِ حال نے ایک ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ جس سے عالمی امن کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ شکر ہے کہ اب خطرے کے بادل چھٹ گئے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ جنرل اسمبلی نے متفقہ طور پر عرب ملکوں کا ریزولیوشن منظور کر لیا جس میں اقوام متحدہ سے کہا گیا ہے کہ وہ براہِ راست تعلق رکھنے والے ملکوں کے مشورہ سے ایسے انتظامات کرے جس سے لبنان سے امریکی اور اردن سے برطانوی فوجوں کے تخلیہ میں سہولت ہو۔ اس ریزولیوشن میں سیکرٹری جنرل سے کہا گیا ہے کہ وہ اس معاملہ میں سہولت پیدا کرنے کے لئے متعلقہ حکومتوں سے جلد از جلد بات کریں۔

جیسا کہ پنڈت نہرو نے کہا ہے۔ اس ریزولیوشن کی منظوری سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے ایک تو یہ کہ عرب ممالک ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں اور عرب قومیت کا جذبہ بڑھ رہا ہے۔ دوسرے جو ملک عرب قوم پرستی کے جذبہ کو نظر انداز کرتے رہے تھے، وہ اب اس حقیقت کو تسلیم کرنے لگے ہیں۔

روس نے یک طرفہ طور پر ایٹمی تجربے بند کرنے کا اعلان کیا تھا۔ اب امریکہ اور برطانیہ بھی بعض شرائط کے ساتھ ایٹمی تجربے بند کرنے کو تیار ہو گئے ہیں۔ خدا کرے، بڑی بڑی طاقتوں میں جلد کوئی سمجھوتہ ہو جائے اور دنیا ایک مستقل خوف و ہراس سے نجات پائے — اس کے ساتھ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سمجھوتے کی نگرانی کا انتظام کیوں کر ہو؟ اس مقصد کے لئے جنیوا میں مشرق و مغرب کے ایٹمی ماہرین کی جو کانفرنس ہو رہی تھی اس نے طویل غور و خوض کے بعد یہ سفارش کی ہے کہ اس بات کی نگرانی کے لئے کہ ایٹمی تجربات واقعتاً بند ہو گئے ہیں یا نہیں، بین اقوامی کنٹرول کا ایک ادارہ قائم کیا جائے۔ تمام ضروری آلات سے لیس، نگرانی کی چوکیوں کا ایک سلسلہ براعظموں اور جزیروں پر اور بڑے سمندروں کے بیچ میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر قائم کیا جائے۔ یہ ماہرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بعض امکانات اور حدود کے اندر ایک ایسا قابلِ عمل اور مؤثر نگرانی کا نظام قائم کرنا ممکن ہے جس سے ایٹمی تجربات بند کرنے کے سمجھوتہ کی خلاف ورزی کا پتہ چل سکتا ہے۔

آج کل دہلی

جب کوئی ملک ترقی کے میدان میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان مشکلات کو حل کرنے میں جہاں اندرونی وسائل کو کام میں لایا جاتا ہے وہاں بیرونی امداد کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے۔ اس وقت ہمارے ملک میں تعمیر و ترقی کے بڑے بڑے کام چل رہے ہیں جن کے لئے ہمیں بیرونی ممالک سے بھاری سامان وغیرہ منگانا ہوتا ہے اور اس کے لئے غیر ملکی زرِ مبادلہ کی ضرورت ہے۔ جس میں بعض اوقات مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں یہ اطلاع باعثِ تسلی ہے کہ واشنگٹن میں ہندوستان کی بقایا ادائیگیوں کے مسئلہ پر عالمی بنک کے ماتحت جو گفتگو ہو رہی تھی وہ کامیابی کے ساتھ ختم ہو گئی اور اب ہندوستان کو مزید معقول امداد حاصل ہو جائے گی۔

بخشی غلام محمد وزیر اعظم کشمیر اور ان کی حکومت مبارک باد کی مستحق ہے کہ انھوں نے پنڈت ہری چند اختر مرحوم کے بچوں کی امداد کے لئے -/۱۲۰۰ روپیہ فی سال کا وظیفہ دو سال کے لئے جاری فرمایا ہے۔ اختر صاحب ایک بے مثال ادیب و شاعر تھے۔ کشمیر میں بھی وہ بہت ہر دل عزیز تھے۔ لیکن اس دور میں ریاستی حکومتیں کتنے ادیبوں اور شاعروں کے پسماندگان کی حفاظت کا ذمہ لیتی ہیں؟ حکومت کشمیر کا یہ اقدام اس کی ادب نوازی کا ایک بے مثال ثبوت ہے۔ اس سے قبل بھی بخشی غلام محمد صاحب نے ادب دوستی کی ایسی ہی مثالیں قائم کی تھیں۔ بہی خواہانِ ادب ان کے شکر گزار ہیں۔

گوپی ناتھ امن لکھنوی

دورِ حاضر کا مردِ اعظم

خاکِ ہند نے بہت سی عظیم ہستیاں پیدا کیں۔ تاریخ کے صفحے اس کے شاہد ہیں۔ بڑے بڑے راجا مہاراجا، بادشاہ شہنشاہ جنھوں نے آس پاس کے ملکوں پر اپنا سکہ بٹھایا۔ بڑے بڑے مدبر، دنیا نے جن کا لوہا مانا، بڑے بڑے فن کار جنھوں نے وہ لازوال دولت بخشی جس سے آج بھی ہم فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر وہ عظیم ہستیاں تھیں جنھوں نے زندگی کی مستقل قدریں قائم کیں۔ وہ قدریں جنھوں نے سیاست، ادب، معاشیات، فن غرضکہ زندگی کے ہر شعبے پر اپنا اثر ڈالا۔ ایسی ہی ہستیوں کو اپنے دور کا مردِ اعظم کہا جاتا ہے۔ رام اور کرشن کا زمانہ تو زمانۂ قبل تاریخ مانا جاتا ہے لیکن گوتم بدھ کے زمانے کی مستند تاریخ ملتی ہے اور اگر ہم ان روایات سے قطع نظر بھی کریں جن کی تہہ میں واقعیت سے زیادہ عقیدت ہوتی ہے تب بھی یہ ماننا پڑے گا کہ بدھ کی ہستی نے ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا۔ خونیں انقلاب نہیں بلکہ وہ انقلاب جو ذہن اور ضمیر میں پیدا ہوتا ہے اور اسی لئے زیادہ پائدار ہوتا ہے۔ ہمارے زمانے کے انسانوں میں ایسی ہی ہستی مہاتما گاندھی کی تھی جن میں بہت سی خوبیاں اور بہت سے کمال تھے لیکن میں ان کا سب سے بڑا کمال یہ مانتا ہوں کہ انھوں نے سیاسی میدان میں رہ کر بلکہ اس میدان میں آزادی کے قافلے کی رہنمائی کرتے ہوئے بھی مستقل قدروں کو نظر میں رکھا اور یہ کہنے کی جرأت کی کہ ذریعے کا نیک اور مناسب ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا مقصد کا۔ اگر دنیا کے جھمیلوں سے الگ تھلگ رہ کر کوئی سادھو یا مہاتما ایسی بات کہے یا اس پر عمل کرے تو یہ چنداں مشکل بات نہیں لیکن اگر کوئی سیاسی رہنما یہ اعلان کرے اور اپنے عمل میں اپنے عقیدے پر پورا اترے تو یہ بات ضرور حیرت میں ڈال دینے والی ہے۔

ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور نے گاندھی جی کے متعلق یہ لکھا تھا کہ "سیاسی میدان میں ان سے بڑے سیاسی مدبر بھی دنیا میں پیدا ہوئے ہیں اور سنتوں میں ان سے بڑے سنت بھی ہوئے ہیں لیکن اتنا بڑا سیاسی درویش دنیا میں اب تک پیدا نہیں ہوا۔" عام طور پر لوگ سیاست کو مصلحتوں کا کھیل سمجھتے ہیں۔ ایک پرانی کہاوت چلی آتی ہے کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے لیکن گاندھی جی جن مستقل قدروں کو لے کر میدانِ سیاست میں آئے اُن پر آخر تک قائم رہے۔ لوگ حیرت میں تھے کہ سچائی اور سیاست ان دونوں کا نباہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مقابلہ اور اہنسا! یہ اجتماعِ ضدین کیسا؟ مگر دنیا نے دیکھا کہ ایک شخص ایسا بھی ہے جو یہ کہتا ہے کہ زندگی میں الگ الگ خانے نہیں ہیں بلکہ وہ ایک ناقابلِ تقسیم مجموعہ ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ذاتی اور عملی زندگی کو شخصی اور سیاسی زندگی کو الگ الگ کیا جائے۔ سیاسی میدان میں یہ نئی بات تھی۔ بہتوں نے مذاق اڑایا، بہتوں نے حیرت کا اظہار۔ کچھ نے اس کی باتوں پر غور کیا۔ مجھے یاد ہے کہ جب مہاتما گاندھی ۱۹۱۹ء میں لکھنؤ گئے تھے تو انھیں کل مجھ میں سے گیارہ آدمی اپنے کام کے ملے تھے لیکن ایک سال کے اندر بات دلوں میں گھر کر گئی۔ تمام ملک میں گاندھی کی جے ہونے لگی اور وہ تحریک شروع ہوئی جن کی بدولت ۲۷ سال بعد ہندوستان کو آزادی ملی۔ اہلِ کارواں اہلِ جشن تھے مگر میرِ کارواں نے کہا کہ یہ منزل نہیں نشانِ منزل ہے۔ سیاسی آزادی کا حصول پھر بھی آسان ہے لیکن اس کا استحکام زیادہ سخت منزل ہے۔ ایک بدیشی حکومت کے مقابلے میں غریبی اور مفلسی، جہالت اور تعصب کا مقابلہ زیادہ ہے۔ آج ہم اسی منزل سے گذر رہے ہیں وہ رہنما ہم میں نہیں مگر اس کی ہدایتیں موجود ہیں۔ آفتاب غروب ہوا مگر روشنی باقی ہے۔ دیکھنا! یہ روشنی مدھم نہ ہونے پائے۔ اس کی بتائی ہوئی منزل کی طرف بڑھوگے تو روشنی بڑھتی جائے گی۔ اس منزل کی طرف سے منہ موڑ لوگے تو اندھیرا ہو جائے گا۔

راجندر ناتھ شیدا

اُردو کی ایپک شاعری

ایپک، اس کی رزمیت اور دوسرے لوازم

شروع ہی میں یہ کہہ دینا مناسب ہوگا کہ اردو میں ایپک شاعری کا وجود متفقہ طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس بات پر اردو کے بلند ترین ادبی حلقوں میں اختلاف رائے موجود ہے۔ اس کا اندازہ ایک تو اس بحث سے ہو سکتا ہے جو انیس کے سلسلے میں ۱۹۴۸ء اور ۱۹۴۹ء کے درمیان لکھنؤ کے رسالے "نگار" میں چلتی رہی، دوسرے حال ہی میں اردو کی ایپک شاعری سے متعلق آل انڈیا ریڈیو کے دلی اسٹیشن نے جو مباحثہ نشر کیا ہے اس میں بھی یہ اختلاف رونما ہوا۔

"نگار" والی بحث کا آغاز ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے ایک طویل مضمون "انیس کی مرثیہ نگاری" سے ہوا تھا جو اکتوبر ۱۹۴۸ء سے ستمبر ۱۹۴۹ء تک قسط وار شائع ہوتا رہا۔ اس کا جواب اثر لکھنوی نے اسی پرچے کے مارچ سے جولائی ۱۹۵۰ء تک کے شماروں میں دیا۔ اثر کے اس مسلسل مضمون پر نیاز فتح پوری بھی جا بجا حواشی کی صورت میں اپنی رائے کا اظہار کرتے جاتے تھے جس کا مفہوم ڈاکٹر فاروقی کی تائید معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا نیاز کے حواشی کا جواب اثر نے اپنے مجموعۂ مقالات "انیس کی مرثیہ نگاری" کے مقالے "طوطیِ پسِ آئینہ" میں دیا ہے۔

یوں تو بدیہی طور پر اس بحث کا اصل موضوع انیس کے مراثی تھے لیکن ضمنی طور پر اس میں مرثیے کے ایپک شاعری میں شمار کئے جانے یا نہ کئے جانے کے بارے میں بھی بحث چھڑ گئی۔ ڈاکٹر فاروقی کا خیال تھا کہ مغرب میں جو اصنافِ سخن رائج رہی ہیں مرثیہ ان میں سے کسی کی شرائط پوری نہیں کرتا اس لئے اس پر ایپک کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ایپک کا ترجمہ رزمیہ شاعری ہی غلط ہے کیونکہ ایپک میں رزم کا ہونا ضروری نہیں۔ نیاز نے اس پر یہ اور اضافہ کیا کہ "شاہنامہ اس ایپک شاعری نہیں لیکن اس خیال سے کہ اس میں ایک قوم کی تاریخ کا ذکر ہے اسے ایپک کے مماثل کہہ سکتے ہیں۔" (نگار بابت ماہ مارچ ۱۹۵۰ء صفحہ ۴ فٹ نوٹ)

ان دونوں کے برعکس اثر کا اصرار تھا کہ انیس کے زمانے میں مرثیہ ایپک کے تمام لوازم کو پورا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ارسطو کی بوطیقا سے متعدد بیانات نقل کرکے ان کی وضاحت کی گئی۔ مثلاً اثر نے کہا:-

> "یہ ضرور ہے کہ مرثیہ اپنی ابتدائی شکل میں سیدھی سادی ایلیجی Elegy تھا لیکن انیس و دبیر نے اس کو مرتفع کرکے ٹریجیڈی اور ایپک شاعری کا (وسیع ترین یونانی مفہوم میں) رتبہ دے دیا۔"

> "ایپک شاعری کے جو خصوصیات بیان کئے گئے ہیں میر انیس کی شاعری ان تمام لوازم کو پورا کرتی ہے۔"

> "انیس کی شاعری میں ایپک کے تمام اوصاف اپنے پورے عروج پر موجود ہیں۔"

(انیس کی مرثیہ نگاری۔ اثر لکھنوی)

ایسا ہی کچھ اُس نشری مباحثے میں ہُوا جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے۔ اس میں پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر محمد حسن، مالک رام اور میں نے حصہ لیا تھا۔ بحث کا موضوع تھا۔ "اردو میں ایپک شاعری کا رواج کیوں نہیں ہُوا؟ کیا اس کا سبب غزل ہے؟" ظاہر ہے کہ یہاں اردو میں ایپک شاعری کے وجود و عدم سے بحث کرنا مقصود نہیں تھا۔ یہ پہلے ہی فرض کر لیا گیا تھا کہ اوّل تو اردو میں ایپک شاعری ہے ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو کم از کم اس کا رواج کبھی نہیں ہوا۔ مباحثہ کی غرض و غایت درحقیقت ان اسباب کا پتہ چلانا تھی جو ایسی شاعری کی تخلیق میں رکاوٹ ثابت ہوئے اور اس مسئلہ پر خصوصاً غور کرنا تھا کہ کیا اردو میں غزل کا رواج ایپک کی راہ میں حائل رہا ہے اور اگر رہا ہے تو کیونکر؟

ڈاکٹر محمد حسن اور پروفیسر سرور انہیں پہلے مذکورہ بحث کے زمانے میں لکھنؤ میں تھے۔ یہ مقالات وہاں جلسوں میں پڑھے بھی گئے ہیں۔ انھوں نے غالباً انھیں عرف نگار ہی پڑھا ہی نہیں مقالہ نگاروں کی زبانی سنا بھی ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اسی بحث کے تاثرات کے زیر اثر ہیں۔ چنانچہ ریڈیو والی بحث کے وقت محمد حسن نے بھی کہا کہ ایپک میں لڑائی کا ذکر ہونا ضروری نہیں ہے اور سرور نے اسکی تائید کی۔ میں اس خیال کو صحیح نہیں سمجھتا۔ میری نظر میں ایپک میں سماجی یا نفسیاتی کشمکش ہی کا ہونا کافی نہیں ہے بلکہ اس میں جسمانی ٹکراؤ کا بیان بھی لابدی ہوتا ہے۔ اس ٹکراؤ یا لڑائی میں مروجہ آلات جنگ استعمال ہو بھی سکتے ہیں نہیں بھی۔ فوق الفطرت قوتوں اور غیر معمولی آلات کا ذکر ایپکوں میں برابر آتا رہا ہے۔ جب میں نے دریافت کیا کہ ایسی ایپک نظمیں آخر کون سی ہیں جن میں کسی لڑائی کا ذکر ہی نہیں آتا تو ڈاکٹر محمد حسن نے پیراڈائز لاسٹ اور ڈیوائن کامیڈی کو پیش کیا۔ اگرچہ یہ بات ریکارڈ نہیں کی گئی، میری رائے میں اس بنیادی بات پر پریشان خیالی سے ایپک کا پورا تصور اپنے محور سے ہٹ جاتا ہے جس سے اس کے حدود متعین کرنے ہی میں نہیں بلکہ ادب پر اُس کے اطلاق میں بھی دشواری پیش آتی ہے۔ اس لئے پہلے اس کی وضاحت ضروری ہے۔

سب سے پہلے پیراڈائز لاسٹ اور ڈیوائن کامیڈی والی بات صاف کریں۔ ایپک نظم کی حیثیت سے پیراڈائز لاسٹ کی اہمیت میں تسلیم کرتا ہوں مگر یہ نہیں مانتا کہ اس میں لڑائیوں کا ذکر نہیں آتا۔ اس سلسلے میں مزید بحث مناسب مقام پر کی جائے گی۔ رہی ڈیوائن کامیڈی سو اس کو ایپک سمجھنا غلط ہے۔ یہ غلط فہمی کچھ اور بھی لوگوں کو رہی ہے۔ انھوں نے اس کی خصوصیات پر غور کئے بغیر اور اسے اینیڈ اور پیراڈائز لاسٹ کی درمیانی کڑی سمجھ کر ایپک تصور کر لیا تھا۔ اسی لئے محققوں کو یہ غلط فہمی دور کرانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کے ثبوت میں میں فی الحال حوالہ جات کی بجائے صرف دو اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

"ڈکشنری آف ورلڈ لٹریری ٹرمز" کا مقالہ نگار دنیا کی معروف ایپک نظموں کا ذکر کرتے ہوئے بعنوان "ایپک شاعری" لکھتا ہے:

"کبھی کبھی ایسی نظموں کو ایپک کے نام سے پکارا جاتا ہے جو اُن نظموں سے بے حد مختلف ہیں جن سے اوپر بحث کی گئی ہے۔ چنانچہ دانتے کی ڈیوائن کامیڈی کو بھی ایپک کہا گیا ہے۔ اس نظم میں کوئی ہیرو نہیں۔ اس کا خاص کردار خود شاعر ہے جو شروع سے آخر تک صیغہ متکلم میں واقعات بیان کرتا ہے... اصل میں ڈیوائن کامیڈی کے حجم، اسلوب اور وزن سے متاثر ہو کر نقاد اسے ایپک کہہ دیتے ہیں۔"

Dictionary of World Literary Terms Edited by J. T. Shipley—Epic Poetry

اسی طرح انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں "دانتے" کے عنوان سے لکھا گیا ہے:

"غرض کامیڈیا، جسے بہتر اصطلاح نہ ہونے کے باعث اکثر اوقات ایپک کہہ دیا جاتا ہے، اپنے اسلوب اور تعمیر کے لحاظ سے اس نوع کی ساری نظموں سے کلیتہً مختلف ہے۔ خود واقعات بیان کرنے والا اس کا ہیرو ہے۔ واقعات کا کہانی کے اُٹھان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ضمنی واقعات کی جگہ مذہبی اور مابعد الطبیعاتی بحثیں ہیں جس دنیا سے شاعر اپنے قارئین کو گزارتا ہے اس میں رزمیہ داستان کے کردار نہیں بستے بلکہ ایسے مرد عورت آباد ہیں جن سے یا تو شاعر ذاتی طور پر واقف ہے یا جن کی شہرت شاعر اور قارئین تک پہنچ چکی ہے۔"

Encyclopaedia Britannica—Dante

غرض ان دونوں اقتباسات میں جہاں اور شرائط کا ذکر کیا گیا ہے جنھیں پورا نہ کرنے کے باعث کامیڈیا کو ایپک کہلانے کا مستحق قرار نہیں دیا گیا وہیں ایک بات کی کمی دونوں میں محسوس کی گئی ہے یعنی اس نظم میں ایپک کی طرح کا ہیرو نہ ہونا۔ یہ صحیح ہے کہ آج ہیرو کا مفہوم بدل گیا ہے نیز یہ کہ مختلف ایپکوں کے ہیرو متنوع خصوصیات کے حامل رہے ہیں۔ اس کے باوصف ایپک نظموں کے ہیروؤں میں ایک قدر مشترک

بھی ہوتی ہے اور وہ ہے شجاعت۔ ایپک کے ہیرو کی عام خصوصیات مضبوط جسم، غیر معمولی جرأت اور دلیری، فنِ سپہ گری میں مہارت، مہم پسندی، تکالیف برداشت کرنے کی صلاحیت، استقلال وغیرہ ہیں جن میں سے کچھ نہ کچھ ایپک کے ہر ہیرو میں ہونا ہی چاہئیں۔ انھیں خصوصیات کی کمی بیشی سے اور ان میں دوسرے ذہنی، جذباتی، اخلاقی، روحانی محاسن و معائب کی شمولیت سے ان ہیروؤں کے کرداروں میں تنوع پیدا ہوتا ہے۔ اگر کسی نظم میں ایسا کوئی ہیرو نہیں ہے تو اس پر ایپک کا اطلاق نہیں ہو سکتا خواہ دوسری خصوصیات کے باعث وہ کتنی بھی اہم اور قابلِ قدر کیوں نہ ہو۔ ایپک کے افسانہ کا ایسے ہیروؤں کے عظیم کارناموں پر مشتمل ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی شاعری کو "ہیروائک پوئٹری" بھی کہا جاتا ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ایپک میں ہیرو کا کردار نمایاں کرنے کے لئے شاعر کو کسی نہ کسی صورت سے لڑائی کا ذکر کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ شاعر اپنے مافی الضمیر کو ہیرو اور اس کے عمل کے سہارے ہی پیش کر کے اپنے بیان کو مؤثر بنا سکتا ہے کیونکہ اسے کا بہترین موقع اسے میدانِ جنگ ہی میں ملتا ہے جہاں ہیرو اور کی شجاعت کا مظاہرہ نہایت سہولت سے کرایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اگر اردو میں ایپک کا ترجمہ رزمیہ شاعری کیا گیا ہے تو اس میں کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی۔ کسی عمدہ ادبی اصطلاح سے ہم یہی توقع کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے موضوع کی کسی اہم خصوصیت کی نمائندگی کرے۔ کوئی بھی اصطلاح — غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، قطعہ، رباعی — ایسی نہیں ہے جو اپنے موضوع کے پورے مفہوم پر حاوی ہو۔ رزمیہ شاعری کے لفظ سے اگر خاص کرداروں کی شجاعت کا براہِ راست پتہ نہیں چلتا تو ان واقعات کا علم ضرور حاصل ہوتا ہے جو ہیرو کی تخلیق کے بہترین مواقع فراہم کرتے ہیں۔

اوپر جو باتیں کہی گئی ہیں اُن کی تصدیق چند باتوں سے ہو سکے گی۔ سب سے پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا کی معروف اور مسلّمہ ایپکوں میں لڑائیوں کا ذکر آتا ہے یا نہیں نیز یہ کہ شجاعت کو ایپک کے ہیروؤں کے کرداروں کی ایک لازمی خصوصیت سمجھا گیا ہے یا نہیں سمجھا گیا ہے۔

ہومر کی ایلیڈ اور اوڈیسی اور ورجل کی اینیڈ ایپک کی ایسی مثالیں تصور کی جاتی ہیں جن کے سہارے ایپک نگاری کے اصول و قواعد وضع کئے گئے ہیں۔ لفظ ایلیڈ، ایلیم سے مشتق ہے جو ٹرائے کا دوسرا نام تھا۔ یہ ساری نظم ٹرائے کے محاصرے سے تعلق رکھتی ہے۔ چونکہ ٹرائے کا شاہزادہ شاہِ اسپارٹا مینی لوس کی بیوی ہیلن کو اڑا کر لے گیا تھا اس لئے مینی لوس انتقاماً ٹرائے پر حملہ آور ہوتا ہے۔ دس برس تک اس کا محاصرہ کئے پڑا رہتا ہے۔ نظم کا پلاٹ محاصرے کے آخری سال میں پیش آنے والے واقعات سے لیا گیا ہے۔ اس کا سب سے اہم کردار ایکی لیز پہلے تو اپنی فوج کے کمانڈر انچیف اگامیمنو سے ایک ذاتی معاملے میں خفا ہو کر جنگ سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن بعد کو جب جنگ خطرناک صورت اختیار کرتی ہے تو وہ سمجھانے بجھانے سے دہکتی آگ میں کود پڑتا ہے۔ ایلیڈ چوبیس ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں تیسرے باب سے کر بائیسویں باب تک برابر لڑائی ہوتی رہتی ہے جس میں متعدد کرداروں کو شجاعت کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔

اوڈیسی کا ہیرو اوڈیسیس، جس کے نام پر نظم کا نام رکھا گیا ہے، جہاز کے ذریعہ اتھاکا پہنچ کر ایک قدیم اور وفا شعار خادم کے گھر ٹھہرتا ہے لیکن چونکہ وہ پہچانا جانا نہیں چاہتا اس لئے فقیرانہ لباس پہن کر محل میں وارد ہوتا ہے۔ وہاں پینی لوپ کو عاشقوں سے گھرا ہوا پاتا ہے۔ ان سے عاجز آ کر پینی لوپ یہ اعلان کر دیتی ہے کہ جو اوڈیسیس کی کمان کو خم دے گا وہی اس سے شادی کر پائے گا۔ یہ کام سوائے اوڈیسیس کے اور کسی سے نہ ہو سکا اور اس طرح اس کی اصلیت کا راز فاش ہو گیا۔ لہٰذا محل کے اندر ہی اوڈیسیس اور اس کے رقیبوں میں لڑائی ہوتی ہے جس میں اوڈیسیس کامیاب ہوتا ہے۔ اس نظم کے بھی چوبیس ابواب ہیں جس کا بائیسواں باب لڑائی بیان کرنے کی غرض ہی سے لکھا گیا ہے۔

اینیڈ کے واقعات ٹرائے کی فتح کے بعد ظہور میں آتے ہیں۔ اس کا ہیرو اینیس ایک دشوار سفر کی صعوبتیں برداشت کرتا ہوا اٹلی واپس آتا ہے جو اس کا وطن ہے۔ اٹلی کا بادشاہ لیٹی نس صرف اس کا استقبال ہی نہیں کرتا بلکہ اس سے اپنی بیٹی لیونیا کی شادی کا وعدہ بھی کر لیتا ہے۔ مگر وعدہ کرنے کے بعد اسے پتہ چلتا ہے کہ لیونیا کی ماں نے اس کی منگنی پہلے ہی شہزادے ٹرنس سے کی ہوئی ہے۔ اس سے وہ بڑی اُلجھن میں پھنس جاتا ہے۔ اُلجھن سے نکلنے کے لئے وہ لیونیا کے دونوں عاشقوں کو ہتھیاروں کے ذریعے اپنے حق کا فیصلہ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس طرح اینیس اور ٹرنس میں لڑائی ہوتی ہے جس میں ٹرنس مارا جاتا ہے اور اینیس سے لیونیا کی شادی ہو جاتی ہے۔ اس لڑائی کا ذکر اینیڈ کے بارہ ابواب میں سے آخری تین میں آتا ہے۔

غرض یونانی اور لاطینی ادب کی ان تینوں عظیم ایپکوں میں لڑائیاں بھی ہوتی ہیں

ورجل کے ہیرو شجاع بھی ہیں۔ لیکن شجاعت شجاعت میں بھی فرق ہوتا ہے اور ہیروؤں کے کرداروں کی دوسری خصوصیات ان میں امتیاز اور انفرادیت قائم کرنے کی ضامن ہوتی ہیں۔ ہر اچھے کتب خانے میں اس موضوع پر لٹریچر ملتا ہے اس لئے اس بحث کو طول دینا غیر ضروری ہے۔ یہاں میں صرف تین مستند محققین کی کتابوں سے اقتباسات پیش کرتا ہوں جن میں پہلا اقتباس ہیرو اور رزمیہ شاعری کے تصورات سے زیادہ متعلق ہے اور باقی دو میں ان تینوں شاہکاروں کی متنوع خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

سی۔ ایم۔ باورا نے اپنی کتاب "ہیروئک پوئٹری" میں جو بڑی محنت سے لکھی گئی معلوم ہوتی ہے رزمیہ نظموں کا بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے اور موضوع اور فن دونوں کے اعتبار سے مختلف زبانوں اور قوموں کی اس نوع کی شاعری میں تنوع پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کے شروع میں وہ ہیرو اور اس کے کردار و عمل کی اس طرح وضاحت کرتا ہے:

"ہیرو اور اس کی ذات کا تصور دور دراز تک پھیلا ہوا ہے اور اس کے اظہار اور اجزائے ترکیبی میں تنوع ہونے کے باوصف کچھ مشترکہ خصوصیات بھی ہیں جو یونانیوں کے اپنے ہیرو کے تصور سے ہم آہنگ ہیں۔ جس زمانے میں لوگ وقار حاصل کرنے کے لئے سعی و عمل کے معتقد ہوں وہ زمانہ قدرتی طور پر اپنی تحسین کا اظہار عمل، مہموں، دلیرانہ جد و جہد اور نیک آدرشوں کی شاعری کے ذریعہ کرنا چاہے گا۔ . . .

ایسی شاعری کی تخلیق کا محرک یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ لوگ اپنے کچھ ساتھیوں کا جو احترام کرتے ہیں وہ ان کے فطری اوصاف میں ذاتی برتری کے باعث ہوتا ہے۔ مگر بے شک کسی شخص کے لئے اعلیٰ اوصاف کا مالک ہونا ہی کافی نہیں ہے، اُسے عملی طور پر اس کا ثبوت بھی دینا چاہیئے۔ ہیرو کی پُر مہم زندگی میں ان اوصاف کا پوری طرح امتحان اور مظاہرہ ہوتا ہے۔ یہ تو کوئی ضروری نہیں کہ اس میں اُسے کامیابی ہی حاصل ہو۔ جو ہیرو میدانِ جنگ میں شجاعت کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کرنے کے بعد مارا جاتا ہے وہ بعض باتوں میں اس سے بہتر ہے جو زندہ بچ رہتا ہے۔"

(صفحات ۴-۲)

اب ایک جرمن محقق ارنسٹ رابرٹ کرٹی یس کی تصنیف "یورپی ادب اور لاطینی قرونِ وسطیٰ" سے چند جملے نقل کئے جاتے ہیں جو ہیروں کے بارے میں ہومر اور ورجل کے تصورات کی وضاحت کے لئے لکھے گئے ہیں:

"ایچی لیز صرف تقدیر ہی کی بدولت ایپک کا ہیرو اور زکیت کا شکار نہیں بنا بلکہ اس کی ناکامی کا باعث خود اس کی جذباتیت بھی ہے جس پر وہ قابو نہیں پا سکا۔ ہومر سمجھتا ہے کہ قوت اور ذہانت متوازن ہو کر جنگی حماسی میں رجائیت پیدا کرتی ہیں۔ لڑائی کے ذوق کی توقع تو معمولی سپاہیوں سے بھی کی جا سکتی ہے۔ لڑائی کا کام تو سپاہی کو آنا ہی چاہیئے لیکن سپہ سالاروں کے اندر جرأت کے ساتھ ساتھ نہایت اونچے معیار کی دانش مندی کا ہونا بھی ضروری ہے . . . . . . ایسا سپہ سالار صرف اوڈیسیس ہے جس میں شجاعت، جنگی قابلیت اور دانش مندی متوازن نظر آتی ہیں۔" (صفحہ ۱۷۱)

"ورجل کی مفکرانہ، صد درجہ شعوری اور پیچیدہ ایپک مختلف موڑ سے ہومر سے منسلک ہے لیکن یہ ایک مختلف زمانے کے آدرش بیان کرنے کے لئے لکھی گئی ہے اور ان دونوں میں اس اختلاف کا ہونا ویسے بھی ناگزیر تھا۔ اینیڈ میں اس داخلی کشمکش کا پتہ چلتا ہے . . . . ورجل پر آگسٹس کے دور کی امن پسندانہ اسپرٹ اور اس کے اخلاقی آدرشوں اور آگسٹس کے ذریعے سو سال پرانی خانہ جنگی کے خاتمے کا بہت اثر تھا۔ بلکہ خود جوپیٹر نے تمام جنگوں کے خاتمے کی پیش گوئی کی تھی۔

اس طرح کی تہذیب میں پرانے آدرشوں کے لئے گنجائش نہیں تھی۔ ورجل نے اینیڈ میں ہیرو کا ایک نیا آدرش پیش کیا جو اخلاقی قوت پر مبنی ہے۔ اتنا البتہ صحیح ہے کہ یہ ہیرو بھی جنگ کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔

غرض اینیس میں دانش مندی کی جگہ اخلاقی خوبیاں لے لیتی ہیں اور بدیہی طور پر ان میں اور اس کی سپاہیانہ صلاحیتوں میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔" (صفحہ ۱۷۳)

European Literature and the Latin Middle Ages by Ernst Robert Curtius, translated into English by Willard R. Trask

موزیز ہاڈس کی "یونانی ادب کی تاریخ" سے ایک مختصر اقتباس اور ملاحظہ فرمائیے وہ یہاں ہومر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ہومر اور ورجل کی بیان کردہ جنگوں کا فرق واضح کر رہا ہے :

" جنگوں کے لمبے لمبے مناظر سے وہی لوگ اکتاتے ہیں جو ان چیزوں سے طبعاً بیزار ہیں۔ جن لوگوں کو فٹ بال یا ایسے ہی کھیلوں سے دلچسپی نہیں ہوتی انھیں ان کے ذکر سے بھی اکتاہٹ ہوتی ہے۔ (ہومر کے یہاں) یہ مناظر جنگ بے دلانہ طور پر شامل کئے ہوئے معلوم نہیں ہوتے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی ماہر نے انھیں ماہرین کے لئے لکھا ہے۔ ہاں ورجل کے یہاں کبھی کبھی اس کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ وہ منہ پھیر کر زبردستی انھیں شامل کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ قابل غور چیز یہ ہے کہ ان (ہومر کے) مناظر جنگ میں نہ صرف عمل کی تفصیلات میں بلکہ کرداروں کے پس منظروں میں بھی غیر معمولی تنوع پایا جاتا ہے ۔ (صفحہ ۲۰)

A History of Greek Literature by Moses Hada:

لڑائیوں کا ذکر اور شجاعت کی جھلکیاں صرف انھیں تین ایپکوں میں نہیں ملتیں بلکہ ہر ایپک میں ملتی ہیں مثلاً راماین میں رام کی راون اور بالی سے جنگیں ہوتی ہیں۔ مہا بھارت میں کوروؤں اور پانڈوؤں کے درمیان قیامت خیز جنگ ہوتی ہے جس میں متعدد ہیرو ارجن ، بھیم ، کرن ، دریودھن بہادری کے جوہر دکھاتے ہیں۔ شاہنامے میں رستم اور سہراب کی لڑائی آتی ہے اور ہفتخوان رستم میں تو گھوڑے اور شیر کی لڑائی سے لے کر دیو سپید کے قتل تک جنگیں ہی جنگیں ہیں۔ سکندر نامے میں سکندر اور دارا کی لڑائیوں کا مفصل ذکر ہے نجات یروشلم میں عیسائی مجاہدین کے ہاتھوں ارض مقدس کی فتح بیان کی گئی ہے۔ اس کے ہیرو رینالڈو اور گاڈفرے ہیں۔ نغمہ رولاں میں شارلیمان کے درباری رولاں کی قرون وسطیٰ کے بربریوں کے خلاف جنگ ہوتی ہے۔ قدیم ترین انگریزی ایپک کا ہیرو بیولف اژدہا سے لڑتا اور مارا جاتا ہے اور پیراڈائز لاسٹ میں نیک اور بد فرشتوں کے درمیان جنگ ہوتی ہے۔

چونکہ پیراڈائز لاسٹ میں لڑائی کے ذکر سے انکار کیا گیا تھا اس لئے اس پر کسی قدر زیادہ روشنی ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس نظم کے پانچویں باب میں رافیئل خدا کی ہدایت کے بموجب آدم کو شیطان کی شرارت سے خبردار کرنے کے لئے فردوس میں وارد ہوتا ہے جہاں آدم اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔ ایک صحبت میں رافیئل خدا کے خلاف شیطان کی بغاوت کا قصہ بہت تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ اس میں نیک فرشتوں اور حضرت عیسیٰ کی شیطان کے خلاف جنگ کا تفصیلی ذکر موجود ہے جو پانچویں باب میں شروع ہو کر پورے چھٹے باب میں جاری رہتا ہے۔ رافیئل بتاتا ہے کہ کن حالات میں اور کس طرح شیطان نے سب سے پہلے جنت میں اپنے ساتھی فرشتوں کو ورغلایا اور بغاوت کرنے پر آمادہ کیا۔ پھر کس طرح میکائیل اور جبرئیل کو ان کے خلاف لڑنے کے لئے بھیجا گیا۔ اس کے بعد پہلی لڑائی کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں جس میں آخر کار شیطان اور اس کے ساتھی پسپا ہوتے اور رات کی تاریکی میں روپوش ہو جاتے ہیں۔ تب شیطان اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرتا ہے اور ایک خطرناک ہتھیار ایجاد کر لیتا ہے جس کی مدد سے وہ دوسرے دن کی لڑائی میں ایک حد تک میکائیل کی فوجوں میں انتشار پیدا کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر تیسرے روز خدا حضرت عیسیٰ کو بھیجتا ہے۔ وہ آکر اپنی فوج کی ہمت بندھاتے اور دشمن کی فوج میں گھستے چلے جاتے ہیں ، یہاں تک کہ شیطانی فوج کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ شیطان کے ساتھی اپنی جانیں بچانے کے لئے سراسیمگی کے عالم میں جنت کی دیوار سے نیچے کودتے نظر آتے ہیں اور حضرت عیسیٰ فتح یاب ہو کر خدا کے پاس واپس آتے ہیں۔

یہ بیان اتنا واضح ہے کہ اس پر کسی تبصرے یا اضافے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی مگر پھر بھی میں نمونے کے طور پر اصل نظم سے کچھ سطریں نقل کرتا ہوں تا کہ موضوع ہی کا نہیں بلکہ نظم کے لہجے اور فضا کی رزمیت اور رجزیت کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جا سکے۔ یہ اقتباس چھٹے باب سے ماخوذ ہے اور یہ وہ موقع ہے جہاں میکائیل اور جبرئیل کو شیطان کی بغاوت فرو کرنے کی ہدایت کا ذکر آتا ہے۔ ان سے کہا گیا تھا :

میکائیل ! مقدس فوج کے
شہزادے !
اور جنگی قوت میں اس کے ثانی جبرئیل !
جاؤ
میرے ان ناقابل شکست بیٹوں کی ،

ان مسلح اور عظیم ہستیوں کی
میدانِ کارزار کی طرف
رہنمائی کرو
ان کی تعداد ہزاروں اور لاکھوں ہے
اور یہ لڑائی پر تلے کھڑے ہیں،
گنتی میں اس خدا دشمن اور
باغی گروہ کے برابر ہیں
تم اپنے ہتھیاروں سے ان پر
بے خوفی سے حملہ کرو۔
اور جنت کی حد تک ان کا تعاقب
کرکے انھیں یہاں سے باہر نکال دو
یہاں تک کہ وہ اپنی سزاگاہ
خلیج تاتارس میں پہنچ جائیں
جو اپنا وسیع آتشیں
دہانہ کھولے
ان کے نزول کا انتظار
کر رہی ہے۔

(Book VI Lines 44-45)

Paradise Lost edited by Helen Darbishire

پیراڈائز ری گینڈ کے چوتھے باب میں حضرت عیسیٰ اور شیطان میں لڑائی ہوتی ہے۔ شیطان جب مسیح کو حضرتِ داؤد کے تخت و تاج کا لالچ دلاکر اپنی اطاعت قبول کرانے میں کامیاب نہیں ہو پاتا تو انھیں طوفانِ باد و باراں کے ذریعے خوف زدہ کرنا چاہتا ہے۔ مگر مسیح اس پر بھی ثابت قدم رہتے ہیں۔ تب وہ مسیح کو پکڑ کر یروشلم لے جاتا ہے تاکہ انھیں فضا سے زمین پر گرائے۔ لیکن ہوتا اس کے برعکس ہے یعنی وہاں سے خود شیطان اور اس کے ساتھی دوزخ میں گرائے جاتے ہیں۔

ویسے بھی ایپک اور رزمیت کو لازم و ملزوم سمجھا جاتا رہا ہے۔ مولوی عبدالحق کی مرتبہ اسٹنڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری میں ایپک کے معنی لکھے ہیں "رزمیہ جس میں کسی ایک یا چند سورماؤں کے کارناموں کا مسلسل بیان ہو"۔ جامع اللغات میں رزمیہ نظم کے معنی بتاتے ہوئے لکھا گیا ہے "(مؤنث) وہ نظم جس میں لڑائیوں کا ذکر ہو جیسے شاہنامہ، مہابھارت، رامائن، ایلیڈ، اوڈیسی، اینیڈ وغیرہ"۔ عزیز احمد نے جنھوں نے ارسطو کی بوطیقا کو اردو میں منتقل کیا تھا ایپک کا ترجمہ رزمیہ شاعری اور ہیروائک ورس کا ترجمہ بحر کیا ہے۔

یہاں یہ واضح کرنا شاید مناسب ہوگا کہ ایپک کے رزمیہ کردار پر اس قدر زور دینے اور اس کی تفصیلات میں جانے کا اصل مقصد اس غلط فہمی کا ازالہ جس کا ذکر گزر چکا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ایپک کے لوازم میں اور بھی کئی چیزیں شامل ہیں جو بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ انھیں اختصار کے ساتھ بیان کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ہر ایپک ایک منظوم قصہ ہوتی ہے جو نہ صرف کہانیوں یا ایسے حقیقی اور غیر حقیقی واقعات سے مرتب کیا جاتا ہے جنھیں عموماً مسلم سمجھا جاتا ہو یا سمجھا جا سکے۔ اس نوع کی نظموں میں حیرت انگیز واقعات اور فوق الفطرت عناصر کی فراوانی رہی ہے۔ ایپک نگار عام طور پر اپنے ماضی کی داستان بیان کرتا ہے مگر کچھ ایپکیں ایسی بھی ہیں جن کا تعلق شاعر کے ہم عصر واقعات سے ہے۔ مثال کے طور پر چاند بردائی کی "پرتھوی راج راسو" جس میں پرتھوی راج اور محمد غوری کی جنگوں کا ذکر ہے۔ ایپک میں جنگوں اور مہموں کے علاوہ بھی طرح طرح کے مناظر آتے ہیں۔ اس کا قصہ ایک مکمل وحدت ہونا چاہیے اس کا آغاز، وسط اور انجام ہونا چاہیے۔ تمام واقعات کو مسلسل اور باہم مربوط ہونا چاہیے اور ایسا محسوس ہونا چاہیے کہ وہ سب کے سب ایک ہی قصے کے ضروری اجزا ہیں۔ اصولاً یہ بات مانی جاتی ہے کہ ایپک طویل نظم ہوتی ہے لیکن اس طول کا تعین بہت دشوار ہے جب کہ شاہنامہ ساٹھ ہزار ابیات پر مشتمل ہے، ایلیڈ میں ۳۵۸ ۲۷ اور اوڈیسی میں ۳۵۳۲۹ مصرعے ہیں اور ان دونوں میں سے ہر ایک کے چوبیس ابواب ہیں، پیراڈائز ری گینڈ صرف چار باب کی نظم ہے جس میں صرف ۲۰۳۵ مصرعے ہیں۔

ایپکوں میں کردار کثیر تعداد میں ملتے ہیں ہر ایپک کے کسی نہ کسی یا کچھ کرداروں کا شجاع ہونا ضروری ہے۔ ایک اچھا ایپک نگار اپنے کرداروں کو محض رنگا رنگی ہی نہیں بخشتا بلکہ پوری نظم میں ان کرداروں کی خصوصیات کو برقرار بھی رکھتا ہے، ان کے عمل اور گفتگو کے وقت محل و موقع کو فراموش نہیں کرتا۔ اگر کسی کردار میں کوئی تبدیلی پیدا ہوتی ہے تو واقعات میں اس کا تشفی بخش جواز موجود ہونا چاہیے۔

موزیز ہاڈس کی "یونانی ادب کی تاریخ" سے ایک مختصر اقتباس اور ملاحظہ فرمایئے وہ یہاں ہومر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ہومر اور ورجل کی بیان کردہ جنگوں کا فرق واضح کر رہا ہے :

" جنگوں کے لمبے لمبے مناظر سے وہی لوگ اکتاتے ہیں جو ان چیزوں سے طبعاً بیزار ہیں۔ جن لوگوں کو فٹ بال یا پیچ جیسے کھیلوں سے دلچسپی نہیں ہوتی انھیں ان کے ذکر سے بھی اکتاہٹ ہوتی ہے۔ (ہومر کے یہاں) یہ مناظر جنگ بے دلانہ طور پر شامل کئے ہوئے معلوم نہیں ہوتے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی ماہر نے انھیں ماہرین کے لئے لکھا ہے۔ ہاں ورجل کے یہاں کبھی کبھی اس کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ وہ منہ پھیر کر زبردستی انھیں شامل کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ قابل غور چیز یہ ہے کہ ان (ہومر کے) مناظر جنگ میں نہ صرف عمل کی تفصیلات میں بلکہ کرداروں کے پس منظروں میں بھی غیر معمولی تنوع پایا جاتا ہے " (صفحہ ۳۰)

A History of Greek Literature by Moses Hada:

لڑائیوں کا ذکر اور شجاعت کی جھلکیاں صرف انھیں تین ایپکوں میں نہیں ملتیں بلکہ ہر ایپک میں ملتی ہیں مثلاً رامائن میں رام کی راون اور بالی سے جنگیں ہوتی ہیں۔ مہابھارت میں کوروؤں اور پانڈوؤں کے درمیان قیامت خیز جنگ ہوتی ہے جس میں متعدد ہیرو ارجن، بھیم، کرن، دریودھن بہادری کے جوہر دکھاتے ہیں۔ شاہنامے میں رستم اور سہراب کی لڑائی آتی ہے اور ہفتخوان رستم میں تو گھوڑے اور شیر کی لڑائی سے لے کر دیو سپید کے قتل تک جنگیں ہی جنگیں ہیں۔ سکندرنامے میں سکندر اور دارا کی لڑائیوں کا مفصل ذکر ہے۔ نجات یروشلم میں عیسائی مجاہدین کے ہاتھوں ارضِ مقدس کی فتح بیان کی گئی ہے۔ اس کے ہیرو رینالڈو اور گاڈفرے ہیں۔ نغمۂ رولاں میں شارلیمان کے درباری رولاں کی قرونِ وسطیٰ کے بربریوں کے خلاف جنگ ہوتی ہے۔ قدیم ترین انگریزی ایپک کا ہیرو بیوولف اژدہا سے لڑتا اور مارا جاتا ہے اور پیراڈائز لاسٹ میں نیک اور بد فرشتوں کے درمیان جنگ ہوتی ہے۔

چونکہ پیراڈائز لاسٹ میں لڑائی کے ذکر سے انکار کیا گیا تھا اس لئے اس پر کسی قدر زیادہ روشنی ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس نظم کے پانچویں باب میں رافیئل خدا کی ہدایت کے بموجب آدم کو شیطان کی شرارت سے خبردار کرنے کے لئے فردوس میں وارد ہوتا ہے جہاں آدم اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔ ایک صحبت میں رافیئل خدا کے خلاف شیطان کی بغاوت کا قصہ بہت تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ اس میں نیک فرشتوں اور حضرت عیسیٰ کی شیطان کے خلاف جنگ کا تفصیلی ذکر موجود ہے جو پانچویں باب میں شروع ہو کر پورے چھٹے باب میں جاری رہتا ہے۔ رافیئل بتاتا ہے کہ کن حالات میں اور کس طرح شیطان نے سب سے پہلے جنت میں اپنے ساتھی فرشتوں کو ورغلایا اور بغاوت کرنے پر آمادہ کیا۔ پھر کس طرح میکائیل اور جبرئیل کو ان کے خلاف لڑنے کے لئے بھیجا گیا۔ اس کے بعد پہلی لڑائی کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں جس میں آخرکار شیطان اور اس کے ساتھی پسپا ہوتے اور رات کی تاریکی میں روپوش ہو جاتے ہیں۔ تب شیطان اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرتا ہے اور ایک خطرناک ہتھیار ایجاد کر لیتا ہے جس کی مدد سے وہ دوسرے دن کی لڑائی میں ایک حد تک میکائیل کی فوجوں میں انتشار پیدا کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر تیسرے روز خدا حضرت عیسیٰ کو بھیجتا ہے۔ وہ آکر اپنی فوج کی ہمت بندھاتے اور دشمن کی فوج میں گھستے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ شیطانی فوج کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ شیطان کے ساتھی اپنی جانیں بچانے کے لئے سراسیمگی کے عالم میں جنت کی دیوار سے نیچے کودتے نظر آتے ہیں اور حضرت عیسیٰ فتح یاب ہو کر خدا کے پاس واپس آتے ہیں۔

یہ بیان اتنا واضح ہے کہ اس پر کسی تبصرے یا اضافے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی مگر پھر بھی میں نمونے کے طور پر اصل نظم سے کچھ سطریں نقل کرتا ہوں تاکہ موضوع ہی کا نہیں بلکہ نظم کے لہجے اور فضا کی رزمیت اور رجزیت کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جا سکے۔ یہ اقتباس چھٹے باب سے ماخوذ ہے اور یہ وہ موقع ہے جہاں میکائیل اور جبرئیل کو شیطان کی بغاوت فرو کرنے کی ہدایت کا ذکر آتا ہے۔ ان سے کہا گیا تھا :

میکائیل! مقدس فوج کے
شہزادے!
اور جنگی قوت میں اس کے ثانی جبرئیل!
جاؤ
میرے ان ناقابل شکست بیٹوں کی،

ان مسلح اور عظیم ہستیوں کی
میدانِ کارزار کی طرف
رہنمائی کرو۔
ان کی تعداد ہزاروں اور لاکھوں ہے
اور یہ لڑائی پر تلے کھڑے ہیں،
گنتی میں اس خدا دشمن اور
باغی گروہ کے برابر ہیں
تم اپنے ہتھیاروں سے ان پہ
بے خوفی سے حملہ کرو۔
اور جنت کی حد تک ان کا تعاقب
کرکے انھیں یہاں سے باہر نکال دو
یہاں تک کہ وہ اپنی سزا گاہ
خلیج تاتارس میں پہنچ جائیں
جو اپنا وسیع آتشیں
دہانہ کھولے
ان کے نزول کا انتظار
کر رہی ہے۔

(Book VI Lines 44-45)

Paradise Lost edited by Helen Darbishire

پیراڈائز ریگینڈ کے چوتھے باب میں حضرت عیسیٰ اور شیطان میں لڑائی ہوتی ہے۔ شیطان جب مسیح کو حضرتِ داؤد کے تخت و تاج کا لالچ دلاکر اپنی اطاعت قبول کرنے میں کامیاب نہیں ہو پاتا تو انھیں طوفانِ باد و باراں کے ذریعے خوف زدہ کرنا چاہتا ہے۔ مگر مسیح اس پہ بھی ثابت قدم رہتے ہیں۔ تب وہ مسیح کو پکڑ کر یروشلم لے جاتا ہے تاکہ انھیں فضا سے زمین پہ گرائے۔ لیکن ہوتا اس کے برعکس ہے یعنی وہاں سے خود شیطان اور اس کے ساتھی دوزخ میں گرائے جاتے ہیں۔

ویسے بھی ایپک اور رزمیت کو لازم و ملزوم سمجھا جاتا رہا ہے۔ مولوی عبدالحق کی مرتبہ اسٹنڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری میں ایپک کے معنی لکھے ہیں نظم، رزمیہ جس میں کسی ایک یا چند سورماؤں کے کارناموں کا مسلسل بیان ہو۔

جامع اللغات میں رزمیہ نظم کے معنی بتاتے ہوئے لکھا گیا ہے "(مونث) وہ نظم جس میں لڑائیوں کا ذکر ہو جیسے شاہنامہ، مہابھارت، رامائن، ایلیڈ، اوڈیسی، اینیڈ وغیرہ" عزیز احمد نے جنھوں نے ارسطو کی بوطیقا کو اردو میں منتقل کیا تھا ایپک کا ترجمہ رزمیہ شاعری اور ہیروئک ورس کا رجز یہ بحر کیا ہے۔

یہاں یہ واضح کرنا شاید مناسب ہوگا کہ ایپک کے رزمیہ پہلو پر اس قدر زور دینے اور اس کی تفصیلات میں جانے کا اصل مقصد اس غلط فہمی کا ازالہ تھا جس کا ذکر گزر چکا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ایپک کے لازم میں اور بھی کئی چیزیں شامل ہیں جو بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ انھیں اختصار کے ساتھ بیان کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ہر ایپک ایک منظوم قصہ ہوتی ہے جو ان کہانیوں یا ایسے حقیقی اور غیر حقیقی واقعات سے مرتب کیا جاتا ہے جنھیں عموماً مذہبی سمجھا جاتا ہو یا سمجھا جا سکے۔ اس نوع کی نظموں میں حیرت انگیز واقعات اور فوق الفطرت عناصر کی فراوانی رہی ہے۔ ایپک نگار عام طور پر اپنے ماضی کی داستان بیان کرتا ہے مگر کچھ ایپکیں ایسی بھی ہیں جن کا تعلق شاعر کے ہم عصر واقعات سے ہے۔ مثال کے طور پر چاند بردائی کی "پرتھوی راج راسو" جس میں پرتھوی راج اور محمد غوری کی جنگوں کا ذکر ہے۔ ایپک میں جنگوں اور مہموں کے علاوہ بھی طرح طرح کے مناظر آتے ہیں، اس کا قصہ ایک مکمل وحدت ہونا چاہیئے اس کا آغاز، وسط اور انجام ہونا چاہیئے۔ تمام واقعات کو مسلسل اور باہم مربوط ہونا چاہیئے اور ایسا محسوس ہونا چاہیئے کہ وہ سب کے سب ایک ہی قصے کے ضروری اجزاء ہیں۔ اصولاً یہ بات مانی جاتی ہے کہ ایپک طویل نظم ہوتی ہے لیکن اس طول کا تعین بہت دشوار ہے جب کہ شاہنامہ ساٹھ ہزار ابیات پر مشتمل ہے، ایلیڈ میں ۳۵۳ ۲۷ اور اوڈیسی میں ۳۵۳۲۹ مصرعے ہیں اور ان دونوں میں سے ہر ایک کے چوبیس ابواب ہیں، پیراڈائز ریگینڈ صرف چار باب کی نظم ہے جس میں صرف ۲۰۳۵ مصرعے ہیں۔

ایپکوں میں کردار کثیر تعداد میں ملتے ہیں ہر ایپک کے کسی نہ کسی یا کچھ کرداروں کا شجاع ہونا ضروری ہے۔ ایک اچھا ایپک نگار اپنے کرداروں کو محض زندگی ہی نہیں بخشتا بلکہ پوری نظم میں ان کرداروں کی خصوصیات کو برقرار بھی رکھتا ہے، ان کے عمل اور گفتگو کے وقت محل و موقع کو فراموش نہیں کرتا۔ اگر کسی کردار میں کوئی تبدیلی پیدا ہوتی ہے تو واقعات میں اس کا تشفی بخش جواز موجود ہونا چاہیئے۔

یہاں ایک اور غلط فہمی کا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جس کی طرف اشارہ پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ سمجھ یہ لیا گیا ہے کہ ہر ایپک میں اس کی قومی تہذیب و تمدن اور آداب و معاشرت کا وافر ذخیرہ محفوظ ہوتا ہے۔ یہ بات کچھ ایپکوں جیسے ایلیڈ، مہا بھارت یا شاہنامے کے متعلق تو بالکل صحیح ہے۔ یہ نظمیں درحقیقت اپنے ہی قومی سورماؤں کو ہدیۂ عقیدت پیش کرنے اور ان کی عظمت کا احساس کرانے کے لئے لکھی گئی تھیں۔ یوں بھی یہ بہت طویل ہیں۔ ان میں گوناگوں اشخاص، واقعات اور مناظر کا مفصل ذکر ملنا ہی چاہیئے۔ قدرتی طور یہاں سے اپنے خالقوں کی ہم عصر زندگی کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ مگر ایسی ایپکوں کو نیشنل ایپک کہتے ہیں۔ ہر ایپک کو نیشنل ایپک قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پیراڈائز لاسٹ کو لیجیۓ۔ اس کے قصے کی نوعیت ہی غیر قومی ہے۔ لہٰذا اس میں ملٹن کے زمانے کی برطانوی زندگی زیادہ نہیں جھلک سکتی۔ ہاں یہ ضرور صحیح ہے کہ اس نظم کی تخلیق کا اصل محرک پرہیزگاری اور مذہبی اصلاح کا جذبہ ہے جسے قومی اہمیت حاصل ہے اور جو خیر و شر کے تصادم کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔ مگر اس میں پیراڈائز لاسٹ ہی کی کوئی خصوصیت نہیں۔ صحیح تجزیے کے ذریعے ہر طرح کی تصنیفات کی جڑیں قومی شعور میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ جس ہیرو کی توصیف و تعظیم مقصود ہو وہ اپنی ہی قوم کا ہو۔ سکندر نامے کا سکندر نظامی گنجوی کا ہم قوم نہیں بلکہ اس کے ہم قوم دارا کا حریف ہے اور دارا کو شکست دیتا ہے۔ دراصل نظامی کی نظر میں سکندر اس کی نظم کا ہیرو بننے کا مستحق اس لئے ہے کہ وہ کچھ ایسی انسانی قدروں کی نمائندگی کرتا ہے جو شاعر کو عزیز ہیں۔

ایپک کے موضوع کی عظمت مسلّمہ ہے۔ ایسی ہر نظم کے اسلوب اور لہجہ میں وقار اور سنجیدگی ہونی چاہیئے۔ اس میں پست درجہ کی بذلہ سنجی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ایپک کا کینوس وسیع ہونے کی وجہ سے اس میں زندگی کے بہت سے پہلو جلوہ گر ہو سکتے ہیں، زندگی کے ہمہ گیر اور دقیق مسائل سے بحث آ سکتی ہے۔ مگر اس میں کامیابی کا انحصار شاعر کی بصیرت، وسیع تجربات اور بیانیہ شاعری کی فنی صلاحیتوں پر ہے۔ مختلف ایپکوں کے تخلیقی مقاصد میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ ایپک محض ایک صنفِ شاعری کا نام ہے کسی نظم کا ایپک ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ نظم عظیم بھی ہے۔ خود ارسطو نے جہاں ہومر کی ایپکوں کے محاسن بیان کر کے ان کی عظمت کا اقرار کیا ہے وہیں اس نے دو اور ایپک نظموں لٹل ایلیڈ اور سپریا کی خامیاں بھی بتائی ہیں۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

> "جہاں تک دوسرے ایپک نگاروں کا تعلق ہے، وہ کسی ایک شخص یا کسی ایک دور کی عکاسی کرتے ہیں، یا پھر کسی واقعہ کو لیتے ہیں جو ہوتا تو ایک ہے مگر اس کے متعدد حصے ہوتے ہیں۔ یہ آخری بات سپریا اور لٹل ایلیڈ کے مصنفین کے یہاں پائی جاتی ہے۔" (صفحہ ۸۰)

Aristotle on the Art of Poetry translated by Ingram Bywater

ایپک کے لئے زبان کا استعمال اور بحر کا انتخاب بھی اہمیت رکھتا ہے۔ مناظر اور عمل میں تبدیلی کی مناسبت سے زبان میں بھی تغیر ہونا چاہیئے۔ ارسطو نے ایپک کے لئے ہیروئک ورس کو موزوں بتایا تھا۔ مگر ظاہر ہے کہ دنیا میں بیانیہ شاعری کے لئے مختلف بحریں استعمال میں آتی ہیں۔ بحر بیان میں آہنگ پیدا کرتی ہے اور آہنگ کا حسن اہلِ زبان کے ذوق پر منحصر ہے اس لئے ایپک نگار اپنی زبان کے مزاج اور رزمیہ شاعری کی سہولت کے پیشِ نظر بحر منتخب کر سکتا ہے۔ اردو اور فارسی میں شاہنامہ کی بحر کو اس مقصد کے لئے بہت مناسب خیال کیا جاتا ہے۔

کچھ لوگ محض بوطیقا کی روشنی میں ایپک کے خد و خال دیکھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ارسطو کی یہ کتاب ایپک نگاری کے فن پر نہایت مستند سمجھی جاتی ہے اس کی اہمیت صرف تاریخی ہی نہیں بلکہ کچھ باتیں جو اس میں کہی گئی ہیں انھیں آج بھی ایپک کی ضروری شرائط میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور وہ باتیں میں مختصر طور پر بیان کر بھی رہا ہوں۔ مگر یہاں میں کچھ ایسے حقائق کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھیں بوطیقا کے مطالعے کے وقت ذہن میں رکھنا چاہیئے۔

درحقیقت بوطیقا کی تصنیف کا مقصد یونانی فنِ شاعری پر ایک رسالہ لکھنا تھا۔ یونان کے شعری ادب میں ارسطو کے زمانے میں ڈراما کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ وہاں کے ڈراموں میں ٹریجیڈی اور کامیڈی دونوں شامل تھیں لہٰذا بوطیقا میں بھی زیادہ بحث یونانی ڈراما ہی پر ہے۔ ایپک کا ذکر زیادہ تر ٹریجیڈی سے اس کی مماثلت یا اختلاف واضح کرنے کے سلسلے میں آتا ہے۔ دوسری ملحوظ رکھنے کی بات یہ ہے کہ بوطیقا لکھتے وقت ارسطو کے پیشِ نظر ہومر کی دو رزمیہ نظمیں تو تھیں ہی اور غالباً دو چار اور رہی ہوں گی۔ انھیں کے سہارے اس نے اس قسم کی

شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔ بعد کو جن نقادوں کے سامنے زیادہ نظمیں تھیں انھوں نے ارسطو کے وضع کئے ہوئے اصولوں میں ترمیم اور توسیع کی۔ پھر اصلاً ارسطو کا تبصرہ ایپک نگاری کے فن پر ہے اس لئے موضوع کی زیادہ تفصیلات بوطیقا میں نہیں ملتیں۔ ہو سکتا ہے کہ بیانیہ شاعری کے متنوع نمونے اس کے سامنے نہ ہونے کے باعث بھی موضوع سے تفصیلی بحث کرنا اس نے غیر ضروری سمجھا ہو۔ حقیقت کچھ بھی ہو بہر کیف ارسطو کا کھل کر یہ نہ کہنا کہ ایپک بیانیہ شاعری کی ایک قسم ہے جس میں شجاعت اور رزم کا ذکر ضروری ہے کچھ لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرتا ہے۔ مگر ایسا خیال بوطیقا کا سطحی نظر سے مطالعہ کرنے ہی سے پیدا ہو سکتا ہے کیونکہ ارسطو نے ایپک کی فنی خصوصیات پر بحث کرتے وقت ایپک کی اس خصوصیت کو برابر ملحوظ رکھا ہے۔ اس کے ثبوت میں میں بوطیقا سے چند جملے نقل کروں گا اور وہ بھی عزیز احمد کے اردو ترجمے سے تاکہ مفہوم میں ردّ و بدل کا الزام مجھ پر عائد نہ ہو سکے۔

کتاب کے تیسرے باب میں تاریخ اور ایپک کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے ارسطو لکھتا ہے:

"۔۔۔۔ اور ترتیب میں وہ (رزمیہ شاعری) تاریخ سے بہت مختلف ہو کیوں کہ تاریخ ایک عمل کو بیان نہیں کرتی بلکہ ایک عہد کے وہ سب واقعات بیان کرتی ہے جو اس زمانے میں کسی ایک شخص یا اشخاص کو پیش آئے۔ تاریخ ایسے واقعات بیان کرتی ہے جن کا ایک دوسرے سے بالکل سرسری تعلق ہوتا ہے۔ مثلاً سالامس Salamis کی بحری لڑائی اور سسلی میں اہل قرطاجنہ سے جنگ ایک ہی زمانے کے واقعات ہیں۔ لیکن مقصد یا نوعیت کے اعتبار سے ان دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں مسلسل تاریخی واقعات میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ایک کے بعد دوسرا واقعہ پیش آتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ دوسرے واقعے کا پہلے واقعہ سے کوئی تعلق ہو۔

اکثر شعراء اس غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس معاملے میں ہومر کی خدا داد صلاحیت کی بلندی اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس نے اپنی نظم میں جنگ کے پورے واقعات کو شامل نہیں کیا بلکہ صرف ایک ایسا مکمّل عمل چنا جس میں آغاز اور انجام دونوں موجود ہیں۔ اگر وہ پورے واقعات کو شامل کر لیتا تو وہ ایک نظم میں اچھی طرح نہیں سما سکتے، اور اگر وہ ان کو اختصار کے ساتھ بیان کرتا تو نظم اتنی پیچ بیچ ہو جاتی کہ مطلب ہی خبط ہو جاتا۔ بجائے اس کے اس نے جنگ کے صرف ایک واقعہ کو چُنا ہے اور دوسرے واقعات — مثلاً جہازوں کی فہرست وغیرہ — کو جا بجا محض تذکرتاً بیان کیا ہے۔"

(صفحات ۵۴۔۵۵ فن شاعری از ارسطو مترجمہ عزیز احمد
شائع کردہ انجمن ترقّیٔ اردو (ہند) دہلی)

غرض ارسطو اپنے مافی الذہن کو واضح کرنے کے لئے قدم قدم پہ رزمیہ واقعات کی مثالیں پیش کرتا چلتا ہے جس سے ایپک میں جنگوں کے متعلق اس کے نظریے کو جاننا آسان ہو جاتا ہے۔

کوئلے کی پیداوار بڑھانے کا وسیع پروگرام

دوسرے پنج سالہ منصوبے میں صنعتی ترقی پر زور دیا گیا ہے۔ ۱۹۵۵ء میں جب دوسرا منصوبہ تیار کیا جا رہا تھا تو اس وقت کوئلے کی پیداوار تین کروڑ اسی لاکھ ٹن تک پہنچ چکی تھی۔ دوسرے پنج سالہ پلان میں مشہور صنعتی نشانوں اور ریلوے کی ترقی و توسیع کے پیش نظر یہ توقع کی جاتی ہے کہ دوسرے منصوبے کے اختتام پر تقریباً ۶ کروڑ ٹن کوئلہ درکار ہوگا۔ یہ اعداد و شمار کوئلے کی مانگ میں ۲ کروڑ ۲۰ لاکھ ٹن کا اضافہ ظاہر کرتے ہیں۔ یہ ذمہ داری پبلک سیکٹر اور پرائیویٹ سیکٹر دونوں کو سونپی گئی ہے

جگر مرادآبادی

غزل

محبت کا بالآخر رقصِ بنیا یا نہ کام آیا
نگاہِ شرمگیں اُٹھی، سلام آیا پیام آیا

نہ جانے آج کس دُھن میں لباں پر کس کا نام آیا
فضا نے پھول برسائے، ستاروں کا سلام آیا

ادب اے گردشِ دوراں کہ پھر گردش میں جام آیا
سنبھل اے عہدِ تاریکی کہ وقتِ انتقام آیا

جہادِ زندگی میں جب کوئی نازک مقام آیا
جنوں ہی نے قیادت کی، خلوصِ غم ہی کام آیا

نئی تخریب لازم ہے نئی تعمیر کی خاطر
ہُوا کیا؟ تو اگر کچھ گرتی دیواروں کو تھام آیا

سنبھل کر یوں تو ہم گذرے کسی کی راہ میں لیکن
کچھ ایسے بھی مقام آئے کہ گر پڑنا ہی کام آیا

مجھے شکوہ نہیں ساقی سے اپنی تشنہ کامی کا
مری قسمت میں دل آیا ترے حصّے میں جام آیا

اُٹھا تعظیم کو ساقی، جھکے شیشے، بڑھے ساغر
نہ جانے آخرِ شب کون رندِ تشنہ کام آیا

اندھیروں سے اُجالے پُھوٹ نکلے دل یہ کہتا ہے
مرا افسوں خرام آیا، مرا ماہِ تمام آیا

نکل آیا جگر جب میکدے میں شور یہ اُٹھا
وہ رندِ دل بہ یار و مے بہ جام و تشنہ کام آیا

عبادت بریلوی

میر کی شاعری کا جمالیاتی پہلو

میر صاحب ریختے کے صناع طرفہ ہیں۔ انھوں نے اس عیب کو ہنر سے بہتر کیا ہے۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کے فن کار اور ایک بہت بڑے خالقِ جمال ہیں۔ باتوں کو شعر کا روپ دے دینا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ انھوں نے شعر نہیں کہے، موتی سے پروئے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے تغزل اور تفکر دونوں میں غضب کی دل کشی اور بلا کی دلآویزی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کا راز میر صاحب کی فن کاری اور صناعی میں ہے۔ یہ فن کاری اور صناعی اُن کے اظہار و بیان، انداز و اسلوب، لب و لہجہ تشبیہات و استعارات، علامات و اشارات اور الفاظ و زبان کے مجموعی امتزاج کا نام ہے۔ یہ سب مل کر ان کی شاعری کے جمالیاتی پہلو کی تشکیل کرتے ہیں، جن کے اثر سے ان کے یہاں تاثر کا سحر پیدا ہوتا ہے۔ میر صاحب کی غزلوں میں سارا کھیل اسی جمالیاتی پہلو کا ہے۔ ان کا کمال صرف اس بات میں نہیں ہے کہ انھوں نے تغزل اور تفکر دونوں کو اپنی غزلوں میں سمویا ہے اور حسن و عشق کی واردات و کیفیات اور حیات و کائنات کے معاملات و مسائل کی تفصیل و جزئیات کو ان میں جگہ دی ہے۔ ان کا کمال تو اس میں ہے کہ انھوں نے ان سب کو پیش کر کے غزل کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں کو ان کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا ہے جس کے باعث غزل کی صنف ان کے یہاں ہم دوشِ ثریا ہو گئی ہے۔

اس صورتِ حال کے پیدا ہونے کا ایک سبب تو یہ ہے کہ میر صاحب غزل کے فنی اور اس صنف کے بنیادی اصول کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ انھوں نے غزل کی روایت کو صحیح طور پر سمجھا ہے اور سمجھ کر اس کو برتنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لئے ان کی غزلوں میں فنی اعتبار سے ایک تجربے کا احساس بھی ہوتا ہے اور روایت اور تجربے کی اس ہم آہنگی ہی سے ان کے فن کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس ہم آہنگی ہی سے ان کے فن کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس ہم آہنگی کو ان کے فنی شعور ہی نے پیدا کیا ہے۔ اس فنی شعور کی بنیاد کچھ ان خیالات پر ہے کہ فن کی تشکیل معنویت اور خیال کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتی اور معنویت جگر کو خون کرنے کا نام ہے، کہ اس کے بغیر فن میں گرمی کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔ چنانچہ میر صاحب کے خیال میں غزل موزوں کرنے کے لئے دل جگر کو خون کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح فن زبان و دل کا ترجمان بنتا ہے۔ اسی سے اس میں حسن و جمال کی قدر پیدا ہوتی ہے۔ سادگی، روانی، پیچ داری، رمزیت، ایمائیت، علامتیں، اشارے، تشبیہیں، استعارے میر صاحب کے یہاں معنویت سے الگ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ معنویت ہی ان سب کو پیدا کرتی ہے اور اسی طرح ان کے ہاتھوں اُن کے فن میں حسن کی اقدار کا وجود ہوتا ہے۔ میر صاحب اس حقیقت کا گہرا شعور رکھتے ہیں اس لئے اُن کے فن میں محض صناعی کا احساس کسی ایک جگہ بھی نہیں ہوتا، بلکہ وہ فطری طور پر وجود میں آتی ہے۔

میر صاحب کا فن ان کی شخصیت کا پرتو ہے۔ جو کچھ ان کی شخصیت میں تھا، وہ ان کے فن میں بھی ہے۔ جن عناصر سے ان کی شخصیت کی تشکیل ہوئی ہے، وہی ان کے فن میں بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ میر صاحب کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو ان کا خلوص اور صداقت ہے۔ دورنگی اور منافقت سے وہ بہت دور تھے۔ اسی لئے ان کے یہاں تکلف اور تصنع نہیں ہے۔ مبالغہ آرائی اور انتہا پسندی نہیں ہے۔ ان پر جو کچھ گزرتی ہے اس کا صحیح اور مکمل اظہار اُن کے فن میں ہوتا ہے۔ اسی لئے میر صاحب کے فن میں سب سے پہلے ایک بے ساختگی اور برجستگی کا احساس ہوتا ہے۔ اور ان کے یہاں باتیں کرنے کی سی جو کیفیت نظر آتی ہے اس کا سبب بھی یہی برجستگی اور بے ساختگی ہے — ان کی سادگی اور سلاست جس کا اس قدر شہرہ ہے، اور

جس کی ان کے فن میں ایک بلا کی سی دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے، وہ بھی درحقیقت اسی بے ساختگی اور برجستگی کا ایک پہلو ہے۔ میر صاحب نے شعر کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے بات بنانے اور بات کرنے کو جو اتنی اہمیت دی ہے، اس کا سبب بھی یہی سادگی کا خیال ہے۔ اور اسی خیال کا یہ اثر ہے کہ میر صاحب نے باتوں کو شعر اور شعر کو باتوں کا روپ دے دیا ہے۔ ان کے فن میں اسی لئے کسی طرح کی مشکل پسندی کا پتہ نہیں چلتا۔ کسی قسم کی پیچیدگی نظر نہیں آتی۔ برخلاف اس کے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی کہی ہوئی بات پہلے سے پڑھنے والے کے دل میں موجود تھی۔ اس لئے ان کا ہر خیال پڑھنے والے کو اپنا خیال معلوم ہوتا ہے۔

اس بے ساختگی اور برجستگی ہی کا یہ اثر ہے کہ میر صاحب کے فن میں سادگی اور سلاست کا حسن ہے۔ کسی ایک جگہ بھی اس حسن کا دامن ان کے فن کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ میر صاحب کے فن میں اظہار و ابلاغ چونکہ ایک فطری ردِ عمل کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اس میں تکلف اور تصنع کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ ان کے فن میں پرکاری کے نہ ہونے کا بنیادی سبب بھی یہی ہے۔ میر صاحب کا گہرا اور شدید تاثر ایک فطری اور واقعی ردِ عمل کی صورت میں اس طرح نمایاں ہوتا ہے کہ انھیں اس کی تراش خراش کا موقع ہی نہیں ملتا، اور اسی لئے فنی اظہار کو پرکار بنا کر پیش کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ میر صاحب کے فن میں تو بس سیدھی سادی باتیں ہوتی ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں سادگی کا حسن بھی نظر آتا ہے اور حسن کی سادگی بھی!

میر صاحب کے کلام میں اس سادگی کے حسن اور حسن کی سادگی کی ہر جگہ کارفرمائی ہے اور اس نے ان کے فن میں بڑے کارہائے نمایاں ادا کئے ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہیں کہ ان کے فن کا ہر پہلو درحقیقت اسی کا مرہونِ منت ہے۔ ان کی زبان میں، اندازِ بیان میں، ترکیبوں میں، تشبیہوں میں، استعاروں میں، اشاروں میں، علامتوں میں، بہت واضح طور پر اس سادگی کے اثرات کا پتہ چلتا ہے۔

میر صاحب کا فن غزل کا فن ہے اور انھوں نے اپنی غزلوں میں حسن و عشق کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کی ہے۔ حسن کا وہ بڑا رچا ہوا مذاق رکھتے تھے، اور اس میں شک نہیں ہے کہ انسانی حسن کی تصویر کشی انھوں نے بڑی خوبی کے ساتھ کی ہے لیکن اس کے باوجود ان معاملات کی ترجمانی میں ان کے یہاں رنگینی پیدا نہیں ہوتی۔ کیونکہ سادگی کا حسن ان کے فن کو بیان کی رنگینی سے دور رکھتا ہے۔ اسی لئے رنگیں بیانی ان کے فن میں نظر نہیں آتی۔ وہ تو بس سادہ پرکاری کے قائل ہیں اور اس سے اپنے فن میں ایک عمومی فضا قائم کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں تزئین اور آرائش کا پتہ نہیں چلتا۔ بجلی کی تیز روشنی کی سی چکاچوندھ نظر نہیں آتی۔ وہ جو فضا قائم کرتے ہیں اس پر نظر ٹھہر سکتی ہے، خیرہ نہیں ہوتی۔ اسی لئے ان کے فن میں رنگینی اور رعنائی کی جگہ نفاست اور لطافت ہے، صفائی اور ستھرا پن ہے، اور وہ ہر جگہ اسی سے پہچانے جاتے ہیں۔ خواہ وہ کسی موضوع کو بھی فن کے سانچے میں ڈھالیں۔ ان کا یہ انداز بہرصورت باقی رہتا ہے ؎

میراں نیم باز آنکھوں میں — ساری مستی شراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

لعلِ خموش اپنے دیکھو ہو آرسی میں — پھر پوچھتے ہو ہنس کر مجھ بے نوا کی خواہش

سراپا میں اس کے نظر کر کے تم — جہاں دیکھو اللہ اللہ ہے

آگہ تو رہیئے اس کی طرزِ رہ و روش سے
آنے میں اس کے لیکن کس کو خبر رہے ہے

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
ان سے بھی تو پوچھتے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

رخسار اس کے ہائے رے جب دیکھتے ہیں ہم — آتا ہے جی میں آنکھوں کو ان میں گڑو دیئے
حیرت سے عاشقی کی پوچھا تھا دوستوں نے — کہہ سکتے کچھ تو کہتے شرما کے رہ گئے
میرے پوچھا جو ہم عاشق ہو تم — ہو کے کچھ چپکے سے شرمائے بہت
بھاتی ہے مجھے اک طلب بوسہ میں وہ آن — لکنت سے الجھ جا کے اسے بات نہ آتی
ہرچند میں نے شوق کو پنہاں کیا و لے — اک آدھ حرف پیار کا منہ سے نکل گیا

چھپ لگ کے بام و در سے گلی کوچے میں سے میر
میں دیکھ لوں ہوں یار کو اک بار ہر طرح

کیا کیا لکھا ہے میں نے وہ میر کیا سے گا
گم ہووے نامہ بر سے یارب مری کتابت

آئے ہیں میر منہ کو بنائے خفا سے آج — شاید بگڑ گئی ہے کچھ اس بے وفا سے آج

ان اشعار میں محبوب کے حسن کا بیان بھی ہے اور ان روابط کا تذکرہ بھی جو محبوب اور محبت کرنے والے کے درمیان ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں کسی ایک جگہ بھی رنگینی اور رعنائی کے عناصر پیدا نہیں ہوتے۔ حالانکہ ان موضوعات کو پیش کرنے میں رنگینی کا پیدا ہونا ایسا عجیب نہیں ہوتا۔ لیکن میر صاحب اس سے بہت دور ہیں ان کے خیال ہی میں رنگینی نہیں ہے۔ پھر بھلا اظہار میں اس کا وجود کس طرح ہو سکتا ہے

ان کے یہاں تو خیال کی سادگی ہے اور اسی خیال کی سادگی نے ان کے فنی اظہار میں بھی سادگی کے عناصر پیدا کر دئے ہیں۔

میر صاحب کے فن میں رنگینی اور رعنائی کے پیدا نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان کے خیالات حزن و یاس اور رنج و الم سے علاقہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں حزنیہ فضا اور ایک المیہ آہنگ کا احساس سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہ فضا اور یہ آہنگ بھی ان کے فن میں رنگینی اور پُرکاری کو پیدا نہیں ہونے دیتے برخلاف اس کے سادگی ہی کی پرورش کرتے ہیں۔ حزنیہ اور المیہ آرٹ میں تکلف اور رعنائی کا پنپنا مشکل ہوتا ہے۔ تزئین اور آرائش کا چراغ اس محراب میں نہیں جل سکتا۔ میر صاحب کا فن بھی چونکہ بنیادی طور پر حزنیہ اور المیہ ہے، اس لئے اس میں بھی یہی صورت حال ہے۔ ان کا ہر شعر اس خیال کو صحیح ثابت کرتا ہے۔

چونکہ میر صاحب غم زندگی کے فن کار ہیں اس لئے، انسانی زندگی کا سارا گداز ان کے فن میں کھنچ کر آگیا ہے۔ اسی لئے اس میں سادگی کے ساتھ ایک آہستہ روی، ایک نرمی، ایک گھلاوٹ کا احساس سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ اور یہ خصوصیات غزل کے فنی اصول کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں۔ میر صاحب کے یہاں شدید داخلیت ہے اور اسی داخلیت نے ان کے فن میں حزن و یاس کی فضا پیدا کرکے اس کو نرمی، گھلاوٹ اور شیرینی سے آشنا کیا ہے۔ میر صاحب کے خیالات اپنی سادگی اور معصومیت کے باعث بذاتِ خود حد درجہ نرم اور شیریں ہوتے ہیں اس لئے ان کا اظہار بھی انھیں خصوصیات کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کے ایک ایک لفظ سے جو گھلاوٹ اور شیرینی ٹپکتی ہے اس کا بنیادی سبب یہی ہے۔

میر صاحب کی شاعری غنائی شاعری کی تمام خصوصیات اپنے اندر رکھتی ہے۔ اسی لئے اس میں فنی اعتبار سے دیکھا جائے، تو ایک مترنم انداز ملتا ہے۔ میر صاحب کے لہجے میں نغمگی ہوتی ہے۔ لیکن یہ نغمگی محض الفاظ کے در و بست کے ہاتھوں پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس میں جو خیال ہوتا ہے، وہ اس نغمگی کو وجود میں لاتا ہے۔ اس نغمگی میں بلند آہنگی نہیں ہوتی بلکہ آہستہ روی ہوتی ہے۔ البتہ فطری بہاؤ اور روانی کا احساس اس میں ضرور ہوتا ہے۔ اس روانی اور بہاؤ کو پیدا کرنے میں بحروں کے انتخاب کو بھی بڑا دخل ہے جس میں میر صاحب اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ انھیں خود بھی اس کا احساس ہے۔ ایک جگہ اس کا اظہار بھی کیا ہے ؎

کہے میں نے اشعار ہر بحر میں
ولیکن قیامت روانی کے ساتھ

اور اس میں شک نہیں کہ میر صاحب نے جس طرح مختلف خیالات اور مختلف موڈ کے اظہار کے لئے مختلف بحروں کا انتخاب کیا ہے، اس نے ان کے فن کو چار چاند لگا دئے ہیں۔ انھوں نے چھوٹی سے چھوٹی بحروں میں بھی غزلیں کہی ہیں اور بڑی سے بڑی بحروں میں بھی۔ انھوں نے فارسی کی مروجہ بحروں کو بھی استعمال کیا ہے اور ہندی کے پنگل کو بھی غزل کے مزاج سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس سے اس غنائی کیفیت کو پیدا کرنے میں بڑا کام لیا ہے جو ان کے فن کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان بحروں میں الفاظ کے در و بست سے جو آہنگ پیدا ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں مجموعی طور پر جس غنائیت کی تشکیل ہوتی ہے اس میں بڑی ہی ڈوبی ہوئی کیفیت ہوتی ہے بڑا ہی رس ہوتا ہے، کچھ ایسی نغمگی ہوتی ہے جس کا اثر کانوں سے کہیں زیادہ دل پر ہوتا ہے۔ میر صاحب کی غنائیت تمام حواس کو متاثر نہیں کرتی براہِ راست دل پر اثر انداز ہوتی ہے اسی لئے اس میں وہ پہلو بہت زیادہ نمایاں نظر آتا ہے جس کو عام طور پر فنِ موسیقی میں آواز کے درد سے تعبیر کرتے ہیں۔ میر صاحب کی لَے بڑی دھیمی لیکن بے حد گداز ہے۔ ان کا لہجہ بہت ہی نرم لیکن بلا کا پُرسوز ہے اور اس کو پیدا کرنے میں ان کے بحروں کے انتخاب اور ان بحروں میں الفاظ کے مخصوص در و بست کا بڑا ہاتھ ہے۔

میر صاحب کا فن اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ مکمل اظہار و ابلاغ کے قائل ہیں اور غیر شعوری طور پر ان کی ساری کوشش یہی ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں اس کا اثر بھرپور ہو۔ ایسا کرنے کے لئے انھوں نے ایک طرف تو روایت کا سہارا لیا ہے اور دوسری طرف اپنے ماحول کے گرد و پیش سے اثر قبول کرکے اظہار و ابلاغ کے نئے وسائل بھی تلاش کئے ہیں۔ اسی لئے ان کے فن میں روایت اور تجربے کا ایک متوازن امتزاج بھی ملتا ہے اور اسی لئے میر صاحب کے فن میں جدت اور اُپج نمایاں نظر آتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو میر صاحب ایک حد تک باغی بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے زمانے کی مروجہ روایات سے انحراف بھی کیا ہے اور اپنا ایک مخصوص انداز نکالا ہے۔ میر صاحب سے قبل ایک دور ایسا گزر چکا تھا جب غزل کا فن ایہام گوئی سے عبارت تھا۔ میر صاحب نے نہ صرف ایہام گوئی سے روگردانی کی بلکہ اس کو چھوڑ کر ان روایات سے استفادہ کرکے جو فارسی کے وسیلے سے ان تک پہنچی تھیں اپنے فن کو نئی بنیادوں پر استوار کیا ہے۔ اسی لئے وہ اپنے پیش روؤں اور ہم عصروں سے اتنے مختلف نظر آتے ہیں اور ان کے فن میں جدت اور اُپج کی وجہ سے اس قدر دلکشی کا پتہ چلتا ہے۔ انھیں خود بھی اس حقیقت کا

احساس ہے۔ اُنھوں نے جو یہ شعر کہا ہے ؎

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میرؔ کے
کچھ ایسی طرز بھی نہیں ایہام بھی نہیں

وہ بس یونہی نہیں کہہ دیا ہے۔ اس کے پیچھے تو روایت اور تجربے کا وہ پورا پس منظر ہے جس سے اس وقت کی غزل کا فن دوچار تھا اور جس میں میر صاحب پیش پیش تھے۔

فارسی روایات کا میر صاحب پر گہرا اثر ہے لیکن وہ اس کے حلقہ بگوش نہیں ہیں۔ انھوں نے اس روایات سے اس حد تک استفادہ کیا ہے جس حد تک ریختے کے فنی حدود نے اس کی اجازت دی ہے۔ ان روایات نے انھیں لکیر کا فقیر نہیں بنایا ہے۔ انھوں نے تو ان پر اجتہاد کیا ہے۔ اس میں اضافے کئے ہیں۔ ان کو نئے سانچوں میں ڈھالا ہے۔ نئے آسمانوں پر پرواز سکھائی ہے۔ نئے حالات سے آشنا کیا ہے۔ اسی لئے ان کا سخن کسی سے نہیں ملتا اور اُن کی گفتگو کا ڈھب سب سے جدا نظر آتا ہے ؎

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے
ہماری گفتگو کا ڈھب جُدا ہے

میر صاحب اس اعتبار سے ایک بڑے صاحبِ کمال فن کار ہیں۔ اور ان کا یہ کمال اُن کی لفظی پیکر تراشی اور شاعرانہ اور فن کارانہ لب و لہجہ میں نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں اُن کی تشبیہیں اور استعارے، علامتیں اور اشارے خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔

میر صاحب کے فن میں تشبیہ اور استعارے کا استعمال بڑے سلیقے سے ملتا ہے لیکن وہ ذریعہ ہے، مقصد نہیں۔ میر صاحب اپنی تشبیہوں اور استعاروں سے ایک طرف تو اپنے خیال کو پوری طرح واضح کرتے ہیں اور دوسری طرف ایک ایسی فضا پیدا کرتے ہیں جس میں زندگی سے بھرپور تصویریں ان کے فن کو ایک نگار خانہ بنا دیتی ہیں۔ ان کی تصویریں مبہم اور دور از کار نہیں لیکن ان میں ایک اچھوتا پن ضرور نظر آتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے اندر ایک زندگی رکھتی ہیں۔ میر صاحب کی تشبیہیں اور استعارے ان کی کوشش اور کاوش کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ ان کے تخلیقی عمل کے ہاتھوں وہ فطری طور پر پیدا ہوتی ہیں۔ میر صاحب نے کیسی کیسی عجیب تشبیہوں اور استعاروں کی تخلیق کی ہے ؎

جب غبار اپنے دل کا نکلے ہے — دیر رہتی ہے آندھی کی سی دھوم
کارواں ہائے صبح ہوتے گیا — میں ستم دیدہ محوِ خواب رہا
عشق دریا ہے ایک لنگر وار — تہہ کسو نے نہ اس کی پائی ہے
یادِ زلفِ یار جی مارے ہے میر — سانپ کے کاٹے کی سی یہ لہر ہے
دلِ پُر خوں کی اک گلابی سے — عمر بھر ہم رہے شرابی سے
حاصل ہو کیا سوائے ترائی کے دہر میں — اُٹھ آسماں تلے سے کہ شبنم بہت ہے یاں
آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہی — دردمندی میں گئی ساری جوانی اس کی
شاخِ گل لچکے ہے تو جانوں ہوں — جلوہ گر یوں ہی یار ہوتا ہے
ان گل رخوں کی قامت لہکے ہے یوں ہوا میں — جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں
تو کیے وال ناگہاں بجلی گری — وہ نگاہِ تند کرتا ہے جہاں
چلتا ہوا تو قافلۂ روزگار سے — میں جوں صدائے جرس کی اکیلا جدا گیا
یک بیاباں ہے مری بے کسی و تنہائی — نالِ آوازِ جرس سب سے جدا جاتا ہوں
یک بیاباں برنگِ صوتِ جرس — مجھ پہ ہے بے کسی و تنہائی
آنچل اس دامن کا ہاتھ آتا نہیں — میر دریا کا سا اس کا پھیر ہے
ہے تصنع کہ لعل ہیں وے لب — یعنی اک بات سی بنائی ہے
ایسے ہنس مکھ کو شمع سے تشبیہ — شمعِ مجلس کی رونی صورت ہے
میر تلوار چلتی ہے تو چلے — خوش خراموں کی چال ہے کچھ اور
دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے — یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
دیدۂ گریاں ہمارا نہر ہے — دل خرابہ جیسے دلی شہر ہے
تری شورش بھی بے کل ہے مگر میرؔ — ملادی ہیں کہ بجلی فغاں میں
حال گل زارِ زمانہ کا ہے جیسے کہ شفق — رنگ کچھ اور ہی ہو جائے ہے اک آن کے بیچ
شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے — دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

ان اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ میر صاحب تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعے سے بعض کیفیات کی تصویر کشی کرتے ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ ان کے ہاتھوں فن میں مصوری کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ میر صاحب کی ان تشبیہوں اور استعاروں میں ان کی تخیل کا کمال نظر آتا ہے۔ اسی تخیل نے ان میں جدت پیدا کی ہے۔ میر صاحب اپنی تشبیہوں اور استعاروں کا خام مواد اپنے آس پاس اور گرد و پیش سے حاصل کرتے ہیں اسی لئے ان کے نامانوس ہونے کا احساس نہیں ہوتا مثلاً دل کے غبار نکلنے کی کیفیت کو آندھی کی سی دھوم سے تعبیر کرنا، عشق کو لنگر وار دریا کہنا، زلفِ یار کی یاد کو سانپ کے کاٹنے کی لہر سے نسبت دینا، دلِ پُر خوں کی گلابی کی

وجہ سے اپنے آپ کو شرابی بتانا، گل رخوں کی قامت کو پھولوں کی لچکتی ہوئی ڈالیوں سے تعبیر کرنا، بے کسی اور تنہائی کے ساتھ ریک بیاباں بہ رنگ صوتِ جرس کا خیال آنا، دامن کو دریا کا سا پھیر بتانا، دل کو چراغِ مفلس، دیدۂ گریاں کو نہر، خرابۂ دل کو دِلّی شہر کہنا اور اسی قسم کی بے شمار باتیں اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ میر صاحب نے ان پیکروں کی تخلیق میں اپنی زندگی اور ماحول سے بہت کچھ حاصل کیا ہے

تشبیہات و استعارات کے ساتھ ساتھ میر صاحب کے فن میں رمزیت اور ایمائیت بھی خاصے کی چیز ہے۔ میر صاحب خود غزل کے فن میں تہ داری کے قائل ہیں جہاں جہاں تہ داری کے اصول کو انھوں نے اپنے فن میں بھی برتا ہے۔ لیکن اس تہ داری کے نتیجے میں جو رمزیت اور ایمائیت ان کے یہاں پیدا ہوتی ہے وہ کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ ان کا موضوع اور مواد ہی اس کو پیدا کرتا ہے یہ دو چار شعر اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں ؎

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں ___ مشتِ غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی ___ کیا پتنگے نے التماس کیا

کچھ کرو ذکر مجھ دوانے کی ___ دھوم ہے پھر بہار آنے کی

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات ___ کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

کچھ موجِ ہوا پیچاں اے میر نظر آئی ___ شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

لبِ خموشی سے دیکھو ہو آرسی میں ___ پھر پوچھتے ہو ہنس کر مجھ بے نوا کی خواہش

پھر جو دیکھا کچھ نہ تھا جز شعلۂ پر پیچ و تاب ___ شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

گل کی جفا بھی دیکھی دیکھی وفائے بلبل ___ اک مشت پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بلبل

وصل اس کا خدا نصیب کرے ___ میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ ___ کتنے آنسو پلک تلک آئے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے ___ اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

یہ شعر بڑے ہی پہلو دار شعر ہیں اس میں تہ داری کی خصوصیت اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ اسی تہ داری نے ان میں دل موہ لینے والے انداز کو پیدا کیا ہے۔

میر صاحب کے فن میں ان کی زبان کے استعمال اور رچاؤ نے بھی بڑا کام کیا ہے۔ ان کی زبان میں فارسی کا غلبہ نہیں۔ انھوں نے بول چال کی زبان میں شعر کہے ہیں۔ پُرکار ترکیبیں ان کے فن میں نظر نہیں آتیں۔ برخلاف اس کے سیدھے سادے الفاظ ، دردمندیت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کا لہجہ نرم اور شیریں ہے جو غزل کے فن کے ساتھ بڑی مناسبت رکھتا ہے۔

فن کی یہی خصوصیات ہیں جنھوں نے میر صاحب کو غزل کا ایک عظیم فن کار بنایا ہے۔ انھیں کا یہ اثر ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو ریختے کا صناعِ طرفہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ یہ خیال ان کے دم کے ساتھ رہتا ہے کہ انھوں نے اس عیب کو ہنر سے بہتر کیا ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

یوں میر صاحب نے دوسری اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن طبعاً وہ غزل سے مناسبت رکھتے ہیں اور اسی لئے انھوں نے اس صنف کو اپنا میدان بنا لیا ہے۔ غزل جیسی انھوں نے کہی ہے شاید اردو شاعروں میں سے کسی اور نے نہیں کہی اور اس میں شک نہیں کہ ان سے بڑا غزل گو شاعر اردو میں پیدا نہیں ہوا۔ ان کا فن اکتسابی نہیں ہے۔ انھوں نے شاعری کرنے کے لئے شاعری نہیں کی ہے۔ انھوں نے تو شعر و سخن کا پردہ کسا تھا لیکن حالات نے اسی کو ان کا فن بنا دیا۔ اسی لئے تو ان کے یہاں زندگی اور فن کا ایک ایسا حسین امتزاج ملتا ہے اور ان دونوں میں ایک ایسی متوازن ہم آہنگی نظر آتی ہے جس سے وہ سنہ بعد کے بھی پہچانے جاتے ہیں ؎

راجپوتانہ عجائب گھر (اجمیر)

راجپوتانہ عجائب گھر (اجمیر) شہنشاہ اکبر نے ۱۵۷۲ء میں تعمیر کرایا تھا وہاں اجمیر ریلوے اسٹیشن سے صرف دس منٹ میں بآسانی یہاں پہنچا جا سکتا ہے۔ اس عجائب گھر کے بانیوں نے راجپوتانہ کے فائدے کے لئے اسے قائم کیا تھا جس میں ۲۲ دیسی ریاستیں اور اجمیر شامل تھے۔ اس وقت اس عجائب گھر کے پانچ بڑے سیکشن ہیں جو زمانہ قبل از تاریخ کی یادگاروں، کتبوں، سکوں، تصویروں جن میں کچھ تو تصاویر بھی شامل ہیں، کے لئے مخصوص ہیں۔

واہی

گویّا شاعر

ان سے ملئے، آپ ہیں وہ شاعرِ رنگیں نوا ‎ جن سے بزمِ شعر کی مرطوب رہتی ہے ہوا
پھیر دیں لَی دُھن میں جس دم دادرا گاتے ہیں آپ ‎ بن کے ساون کی گھٹا محفل پہ چھا جاتے ہیں آپ
آپ پڑھتے ہیں غزل جب لے کے ہلکی گٹکری ‎ آپ پر قربان ہو جاتی ہے روحِ شاعری
آپ کی آواز یوں لبریز ہے تاثیر سے ‎ گونجتی رہتی ہے محفل نعرۂ تکبیر سے
آپ کی رنگیں نوائی کا ہے یہ ادنیٰ کمال ‎ شعر بے معنی بھی بن جاتا ہے اک سحرِ حلال
سر جھکائے دم بخود رہتے ہیں گو اہلِ نظر ‎ جھومتا رہتا ہے مجمع آپ کی ہر تان پر
فلم کے گانوں کی دھن میں جب سناتے ہیں کلام ‎ انجمن پر ٹوٹ پڑتا ہے سڑک کا اژدھام
آپ کے شعروں میں گو آہنگ کا فقدان ہے ‎ آپ کا گانا مگر بزمِ سخن کی جان ہے
آپ کی نغمہ سرائی کی خبر ہے دُور تک ‎ آپ کا شہرہ ہے دِلّی سے مظفر پور تک
فرق یہ ہے آپ میں اور پیشہ ور قوّال میں ‎ فیس کا طالب ہے، وہ اور آپ خوش ہر حال میں
گنگنا کر آپ جب کرتے ہیں صاف اپنا گلا ‎ بزمِ قوّالی کا آجاتا ہے ہلکا سا مزا
مصرعۂ اوّل کو دو دو بار دہرانے کے بعد ‎ انگلیوں سے تال سُر کا بھاؤ بتلانے کے بعد
لوچ پیدا کر کے قدموں میں تھرک جاتے ہیں آپ ‎ کچھ پھڑک جاتی ہے محفل کچھ پھڑک جاتے ہیں آپ
آپ سے واہی کا ہے یہ دست بستہ مشورہ ‎ آپ کو فطرت نے بخشا ہے مغنّی کا گلا
آپ کی شفقت کا ہے محتاج رقّاصی کا فن ‎ کیوں نہ بزمِ رقص میں تبدیل ہو بزمِ سخن
کس قدر بے چین ہیں یہ پاؤں گھنگھرو کے لئے ‎ گردشیں محدود کیوں ہوں چشم و ابرو کے لئے
لطف آجائے جو سازندے بھی ہوں کچھ ساتھ ساتھ ‎ اِس طرف پیروں میں جنبش اُس طرف طبلے پہ ہاتھ

پھیل جائے چار جانب پھر تو شہرا آپ کا
اور ہر تقریبِ شادی میں ہو مُجرا آپ کا

صالحہ عابد حسین

صدّیقہ قدوائی

شفیق الرحمٰن قدوائی اپنے دوستوں میں صرف "شفیق صاحب" تھے۔ چھوٹے بڑے سب ان کو اسی لقب سے یاد کرتے تھے۔ اور بیگم صدّیقہ قدوائی بھابی تھیں۔ اس لئے کہ جامعہ میں سب لوگ اپنے ساتھیوں کی بیویوں کو اسی رشتے سے پکارتے تھے۔

۱۹۳۳ء میں جب شادی کے بعد میں جامعہ آئی تبھی سے شفیق صاحب سے واقفیت ہو گئی تھی اس لئے کہ وہ میرے شوہر کے بڑے عزیز دوست تھے۔ لیکن بیگم شفیق سے کہیں ۱۹۳۹ء میں جا کر ملاقات ہوئی۔ ان کی شادی کو مجھ سے ایک سال پہلے ہو چکی تھی مگر وہ اپنے وطن بڑا گاؤں یا لکھنؤ رہا کرتی تھیں۔ جب کبھی میں شفیق صاحب سے ان کے بارے میں پوچھتی وہ مذاق میں بات اڑا دیا کرتے۔ "ارے وہ بچاری گنوار یہاں آ کر کیا کرے گی۔" کبھی کہتے "بھابی اُسے ہماری پرواہ کیا ہے" یا "وہ جامعہ کی زندگی کہاں جھیل سکتی ہے۔" اور میں ان کی مزاحیہ طبیعت سے واقف عرصہ تک سمجھتی رہی کہ بیگم شفیق جو ایک رئیس گھرانے کی نازونعم کی پلی لڑکی ہیں، ایسے، حول کی عام لڑکیوں جیسی جاہل، مغرور، آرام طلب، خود پسند امیرزادی ہوں گی جو اپنے غریب شوہر کے ساتھ آ کر رہنا پسند نہیں کرتیں۔ اور شوہر بھی کیسا؟ جس نے عیش و آرام کی زندگی کو لات ماری، خاندانی روایات کو توڑا، روپیہ پیسہ، عہدہ، عزت کو ٹھکرایا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کو چھوڑا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کو لبیک کہہ کر وہیں سے بی اے کی ڈگری لی۔ وہ ڈگری جس کی کوئی حیثیت نہ تھی جس کے ذریعے نہ ڈپٹی کلکٹری مل سکتی تھی نہ تحصیلداری اور پھر یہی نہیں حکومت کو اپنے خلاف کیا، قومی تحریک میں حصہ لیا، جیل گیا، لاٹھیاں کھائیں، حکومت کی نظر میں مشتبہ ٹھہرا اور اب جامعہ کی چالیس پچاس روپے ماہوار کی نوکری دنیا کے بڑے سے بڑے عہدے سے بڑھ کر سمجھتا ہے اس "سر پھرے نوجوان" نے ۱۹۲۰ء میں جو راستہ اپنے لئے متعین کیا تھا اس پر پوری ثابت قدمی سے تیس سال تک گام زن رہا۔ جس کا ہر سانس، ہر لمحہ قومی خدمت اور جامعہ کی بہبود اور ترقی کی کوشش میں صرف ہوتا تھا۔ جس کو عشق کی اس کٹھن راہ کا ہر کانٹا پھول، ہر پتھر موتی، ہر مصیبت راحت، ہر دکھ سکھ نظر آتا تھا۔ بھلا اگر ایسے شخص کی نازونعم میں پلی ہوئی بیوی اس کے ساتھ آ کر نہ رہے تو تعجب کی کیا بات ہے؟

لیکن جب ۱۹۳۹ء میں صدّیقہ پہلی بار قرول باغ آئیں اور میری ان سے ملاقات ہوئی تو وہ میرے تصور کے بالکل برعکس نکلیں۔ رات کا وقت تھا جب میں ان کے گھر پہنچی دروازے پر ہی ایک میری ہم سن خاتون نے جس کے چہرے پر بلا کی معصومیت اور دلکشی تھی میری پیشوائی کی یہی صدّیقہ تھیں۔ وہ بھی مجھے پہلے سے جانتی تھیں اور پہلی ہی ملاقات میں ہم دونوں میں خاصی بے تکلفی ہو گئی۔ میں نے کہا "بھابی آپ یہاں آ کر کیوں نہیں رہتی ہیں؟" جواب ملا "آپ کے بھائی رکھتے ہی نہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ رہیں تو وہ رکھیں۔ میرے بھائی بچارے کو کیوں الزام دیتی ہیں۔" ہنسیں۔ آہ! کیسی دلکش ہنسی ہوتی تھی ان کی — "تو آخر کہاں رہوں؟ کوئی گھر دیکھا ہو ان کے پاس۔" ان کا اس وقت کا قیمتی لباس، بھاری زیور، بستروں پر کامدانی کی بھاری بھاری رلائیاں، ساتھ کئی کئی ملازمائیں، سبھی میرے اس شبہ کی تصدیق کر رہے تھے کہ اس رئیس زادی کے لئے درویش منش شفیق کے ساتھ رہنا بہت مشکل ہے۔ ویسے وہ خاصی پڑھی لکھی، بڑی سمجھدار، ذہین، خوش مزاج، ملنسار، ہنس مکھ خاتون نکلیں۔ شفیق صاحب کے نام پر ان کی سیاہ حیادار آنکھوں میں جو چمک اور ہونٹوں پر جو مدھ بھری مسکراہٹ پیدا ہو جاتی تھی وہ چغلی کھا رہی تھی کہ انھیں اپنے شوہر سے بہت محبت ہے۔

اس سال ان کی بچی عزّت پیدا ہوئی اور وہ پھر لکھنؤ چلی گئیں۔ اس کے بعد

اکثر ان کا آنا جانا ہوتا رہا۔ ۱۹۳۵ء میں جامعہ ملیہ نے اوکھلے میں جامعہ نگر کی بستی بسائی اور وہاں منتقل ہو گئی۔ البتہ جن اداروں کا تعلق شہر سے تھا، یا جن کے لئے ابھی عمارت نہ تھی وہ وہیں رہے۔ شفیق صاحب کا ادارۂ تعلیم و ترقی بھی انھیں میں سے ایک تھا۔ ان کا تعلیم بالغان کا اور سوشل سروس کا سب کام شہر میں پھیلا ہوا تھا اس لئے وہ قرول باغ ہی میں رہے۔ بیگم شفیق اب اکثر آکر وہاں رہتی تھیں اور میری اور ان کی کبھی قرول باغ میں کبھی جامعہ نگر میں ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ دوستی اور محبت کا جو بیج پہلی ملاقات میں بو گیا تھا وہ برابر بڑھ رہا تھا اور ہم میں یگانگی بڑھتی جا رہی تھی۔

۱۹۴۶ء کے آخر میں جب ملک کی فضا مکدر تھی جامعہ ملیہ کی سلور جوبلی منائی گئی۔ اس وقت جامعہ نگر کی چھوٹی سی بستی کئی ہزار مہمانوں سے آباد تھی۔ خیموں کا ایک خوبصورت شہر بس گیا تھا۔ دور دور سے لوگ آئے تھے۔ ہر گھر میں دوست احباب اور عزیزوں کا مجمع تھا۔ صدیقہ بھی اپنے بہت سے عزیزوں کے ساتھ جامعہ جوبلی میں شرکت کرنے آئی ہوئی تھیں اور مدرسہ ابتدائی کے ایک بڑے کمرے میں مقیم تھیں۔ یہ دیکھ کر کہ وہ لوگ زمین پر بستر لگا کر سوتے اور ڈائننگ ہال کا کھانا کھاتے ہیں۔ میں سوچنے لگی کہ کس قدر شوق ہے انہیں جامعہ جوبلی دیکھنے کا کہ یہ اتنی تکلیف اٹھا رہی ہیں۔ اس وقت کیا جانتی تھی کہ اس نازک اندام عورت کے اندر تکلیف اٹھانے اور کٹھنائیاں سہنے کی کتنی بے پناہ طاقت چھپی ہوئی ہے۔

جوبلی میں ایک بڑا جلسہ عورتوں کا بھی طے ہوا تھا جس کا انتظام میرے سپرد کیا گیا تھا اور جامعہ کی کچھ اور عورتیں اور لڑکیاں اس میں میری مددگار تھیں۔ صدیقہ اس جلسے میں صرف دور کی تماشائی رہیں۔ نہ میں نے ان سے کسی کام کے کرنے کے لئے کہنے کی ہمت کی نہ خود انھوں نے پیش کش کی۔ ان کی خود پوشی اور جھجک کو میں اپنی حماقت سے یہ سمجھتی رہی کہ ان بیچاری میں نہ اس قسم کے کاموں کی کوئی صلاحیت ہے نہ شوق۔ اب سوچتی ہوں تو اپنی عقل پر رونا آ جاتا ہے کہ میں اس ہستی کو بد شوق اور نااہل سمجھ رہی تھی جس کا نام اپنے خلوص، خدمت، ان تھک محنت اور کارگزاری کی بدولت چند سال کے اندر اندر دور دور مشہور ہونے والا تھا۔

پھر ۱۹۴۷ء کا ہنگامی دور آیا۔ ایک طرف ملک کو آزادی کی نعمت ملی۔ دوسری طرف سارے دیس میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی جس میں سینکڑوں سال کی رواداری، انسانیت، محبت اور خلوص جل کر بھسم ہو گیا۔ بھائی نے بھائی کا گلا کاٹا، بہنوں کی عزت لوٹی، ہمسائگی کی روایات کو خاک میں ملایا، بچوں پر وحشیانہ ظلم توڑے اور صبح آزادی کو تنگ شام بنا ڈالا۔ لیکن اس تاریکی میں امید کے کچھ مینارے بھی تھے جو چمک چمک کر بے آسوں کی آس بندھاتے رہے۔ جنھوں نے انسانیت کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش میں اپنے تن من کی بازی لگا دی تھی۔ ان مبارک ہستیوں میں سے ایک ہمارے شفیق صاحب کی ذات بھی تھی۔ وہ سچے اور پکے مسلمان بھی تھے اور گاندھی جی کے عقیدت مند اور پیرو بھی۔ انھوں نے اس وقت وہی کیا جو ایک سچے مسلمان کے شایان شان تھا اور گاندھی جی کے پیرو کو زیب دیتا تھا۔ دلی کی فساد کی آگ میں شفیق صاحب کا گھر بار، ان کا ادارہ، ان کا مکتبہ جامعہ اور کیا کچھ نہیں بھسم ہو گیا مگر ان کی تیوری پر بل نہیں آیا، دل پر میل نہیں آیا۔ وہ اسی بشاشت اور خندہ پیشانی سے، اسی خلوص اور محبت سے دلی کے باسیوں کی خدمت اور مصیبت ماروں کی مدد اپنی جان پر کھیل کر کرتے رہے۔ اس زمانے میں شفیق اور ان کے ساتھی نوجوانوں نے جن میں ہر مذہب اور خیال کے لوگ شامل تھے مصیبت ماروں کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ آزادی کی اور انسانیت کی تاریخ کا ایک زریں باب کہا جا سکتا ہے۔

یہاں شفیق صاحب کا گھر اور ادارہ لوٹا جا چکا تھا اور وہ اپنی جان ہتھیلی پر لئے ایسے علاقوں میں بے تکلف گھومتے پھرتے رہتے تھے جہاں ہر وقت موت ناچتی تھی۔ ادھر لکھنؤ میں ان کی بیوی اور خاندان والوں کا ان کی فکر میں برا حال تھا۔ صدیقہ تو اس پریشانی میں گھلی ہی جا رہی تھیں۔ انھوں نے آنکھ کھول کر صدمے ہی صدمے دیکھے تھے۔ باپ کا صدمہ، ماں کی جدائی، جوان بہن بھائی کا داغ، جانے کتنے مصائب اور دکھوں سے ان کا دل داغ داغ تھا۔ اور شوہر کی ہستی تو ان کو سب سے زیادہ پیاری تھی۔ راستے بند تھے ورنہ وہ اپنی جان پر کھیل کر دلی پہنچتیں۔ ڈاک، تار، فون سبھی کچھ تو کچھ عرصے کے لئے بند ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں ان کے دل پر کیا کچھ نہ بیت گئی ہوگی۔ بارے خدا نے یہ سخت وقت بھی کاٹ دیا اور شفیق کی سلامتی کی خبر سن کر ان کی جان میں جان آئی۔ ساتھ ہی یہ خبر بھی ملی کہ ان کا بھرا ہوا گھر لوٹ لیا گیا۔ عورت کو اپنی گھر گرہستی کتنی پیاری ہوتی ہے۔ یہ کچھ عورت ہی سمجھ سکتی ہے۔ اس کی ہر ہر چیز پر اس کے ماں باپ کی محبت کی مہر، اس کی اپنائیت کا ٹھپہ، اس کے سگھڑاپے اور سلیقے کی چھاپ ہوتی ہے۔ اور جب وہ یوں آناً فاناً لٹ جائے تو اس پر کیا بیتتی ہے لیکن یہ ایک مصیبت تھی جس سے اس خوفناک دور میں ہزاروں لاکھوں عورتوں کو گزرنا پڑا اور اس وقت ہندوستان کی بہت سی عورتوں نے اپنی شخصیت کا یہ دلکش پہلو جاگر کیا کہ اگر ان کی آبرو اور ان کے پیاروں کی جان بچ جائے تو پھر انھیں کسی چیز کی پروا نہیں ہوتی۔ صدیقہ ایسی ہی عورتوں میں سے تھیں۔ گھر بار کے لٹنے

کی جزرسی کہ ان کو ذرا سا بھی ملال نہیں ہوا۔ خدا نے شفیق کی جان بچالی اب انھیں اور چاہیئے بھی کیا؟ افسوس اور شکایت کا تو ذکر ہی کیا ہے وہ تو اس طرح ہنس ہنس کر اس کا ذکر کرتیں جیسے کہتی ہوں ؎

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتی ہوں رہزن کو

۱۹۴۷ء کے ہنگامہ کے بعد صدیقہ نے اب دلّی میں مستقل رہنا شروع کر دیا، شاید اب شفیق صاحب سے جُدا رہنے کی ان کے دل میں برداشت نہ رہی تھی۔ شفیق صاحب کا ادارہ اب جامع مسجد میں مٹیا محل میں منتقل ہو گیا تھا۔ اسی مکان کے اوپر کے حصّے میں وہ رہتے بھی تھے۔ صدیقہ پہلے پردے کی پابند تھیں مگر اب انھوں نے برقع ترک کر دیا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامے کے جو بہت سے اچھے بُرے نتائج نکلے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ بہت سی مسلمان عورتوں نے جو خاندانی روایات یا بزرگوں کے خوف یا رواج کی مجبوری کے سبب پردے کی پابند تھیں، حالات سے مجبور ہو کر یا ان سے فائدہ اُٹھا کر رواجی پردہ ختم کر دیا۔ میں اور صدیقہ بھی اس گروہ میں شامل تھے۔ وہ مٹیا محل میں رہتیں اور جامع مسجد جیسے علاقے میں بے برقعہ گھومتی تھیں۔ شروع شروع میں انھیں قدامت پرست اور تنگ نظر لوگوں کی بہت سی دل شکن اور نامعقول باتیں سننی پڑیں مگر انھوں نے نہ ان سے جھگڑا مول لیا نہ ان کی رائے سے متاثر ہوئیں۔ اور پھر یہی تنگ نظر متعصب لوگ تھے جو چند سال کے اندر اندر صدیقہ کی پاکدامنی اور شرافت کی قسمیں کھاتے اور اُن کی اپنی ماں کی طرح عزّت کرنے لگے۔

میری اور صدیقہ کی دوستی اب زیادہ گہری اور پائیدار ہو چکی تھی۔ بہت سی باتوں میں ہم دونوں میں ذہنی اشتراک تھا۔ ہمارا جامعہ سے دلی تعلق، سیاسی خیالات، مذہبی عقیدے، اخلاقی اقدار اور سماجی نقطۂ نظر بہت کچھ ملتے جلتے تھے۔ پھر کچھ طبیعت اور مزاج بھی ایک دوسرے سے میل کھاتے تھے۔ میں ان کی سیرت کی دلکشی اور شخصیت کے حُسن سے بہت متاثر تھی اور ان کی تو خیر فطرت ہی تھی کہ وہ ہر ایک سے حُسنِ ظن رکھتیں اور خلوص و محبت سے پیش آتی تھیں۔ مگر مجھے یہ خوش فہمی ہے کہ مجھ سے انھیں کچھ زیادہ ہی خصوصیت تھی۔ جتنا ہم دونوں ایک دوسرے کو سمجھتے اور قدر کرتے تھے شاید کم دوست آپس میں ایسے تعلقات رکھتے ہوں گے۔ کہنے ہم دونوں ایک دوسرے کو بھائی ہی کہتے تھے مگر ہم میں سگی بہنوں کا سا پیار تھا۔

اب جو صدیقہ مستقل دلّی میں رہنے لگیں تو ان کے جامعہ اور جامعہ والوں سے تعلقات اور زیادہ گہرے اور قریبی ہو گئے۔ جامعہ کی عورتوں سے تو پہلے ہی سے انھیں بڑی محبت تھی اب جامعہ کے کارکنوں سے بھی خصوصیت ہو گئی۔ بڑے چھوٹے سب انھیں بھابی یا آپا جان کہتے تھے۔ اور وہ بلا استثناء سب سے سگے بہن بھائی کا سا سلوک کرتی تھیں۔ اب وہ اپنے شوہر کی سیرت اور خیالات کا اثر تیزی سے قبول کر رہی تھیں۔ قومی اور سیاسی تحریک سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اور جامعہ سے تو دلی تعلق پہلے ہی سے تھا۔ شفیق صاحب کے سوشل سروس اور تعلیم و ترقی کے کاموں کو بھی اب انھوں نے زیادہ قریب سے دیکھا اور سمجھا۔ ان کے دل میں ان سب کی بڑی قدر اور اپنے شوہر کی ذات پر بڑا ناز تھا لیکن ان کے کاموں میں عملی حصہ نہیں لیتی تھیں۔ ان کی طبیعت میں انکسار کا بڑا مادہ تھا کوئی ان سے کتنا بھی کہتا بھی تو وہ کبھی عملی میدان میں آنے پر راضی نہیں ہوتی تھیں۔ لیکن جامعہ سے ان کی محبت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ عام طور سے کارکنانِ جامعہ کی بیویاں جامعہ کی شاکی رہتی تھیں اس لئے کہ اوّل تو وہاں کی کٹھن زندگی اور بہت کی ساری تکلیفیں مردوں سے زیادہ انھیں کو سہارنا پڑتی تھیں۔ اور پھر جس مقصد کی خاطر ان کے مرد یہ سب جھیل رہے تھے اس سے بھی بہت کم تھیں جو واقف ہوں لیکن گنتی کی چند عورتیں ایسی بھی تھیں جن کو اس سے لگاؤ تھا اور وہ اس کے اعلیٰ مقصد سے واقف تھیں اور اپنے شوہروں کے ایثار اور خدمت کو فخر اور قدر کی نگاہوں سے دیکھتی تھیں اور اس راہ کی کٹھنائیوں کو خوش دلی سے جھیلتی تھیں۔ صدیقہ ان میں سب سے آگے تھیں۔ وہ ہم سب سے زیادہ ناز و نعم اور آرام و آسائش میں پلی بڑھی تھیں۔ ان کے شوہر کی تنخواہ پچاس ساٹھ سے زیادہ نہ تھی جو ملتی بھی مہینوں بعد تھی۔ لیکن اپنی اور بچوں کی ضروریات، گھر کا خرچ، مہمانوں کی خاطر مدارات اور ضرورت مندوں کی مدد وہ سب گھر سے روپیہ منگا کر پورا کرتی رہیں اور کبھی اس بارے میں شکایت کیا تذکرہ بھی کسی کے سامنے نہیں کیا۔ اب ان کا رہن سہن، طرزِ معاشرت بالکل وہی ہو گیا جو جامعہ کی دوسری عورتوں کا تھا۔ اپنے قیمتی کپڑے اور زیورات انھوں نے بالائے طاق رکھ دئے اپنے صوبائی اور خاندانی رواج کو ترک کیا۔ سوتی مل کے موٹے دوپٹے اور لٹھے اور چھینٹ کے غرارے اور سادی سستی ساڑھیاں پہننی شروع کر دیں۔ ان کی کوشش تھی کہ ان کے یا ان کے بچوں کے رہن سہن میں کوئی امتیاز نظر نہ آئے۔

ان کا گھر ہمیشہ ایک اچھا خاصا لنگر خانہ بنا رہتا تھا۔ پاکستان جانے اور وہاں سے آنے والے عزیز اور دوست ہفتوں ان کے ہاں پڑے رہتے۔ بیمار لوگ علاج کے لئے آتے، کچھ سیر سپاٹے کے لئے آتے۔ اور جامعہ نگر سے جو بھی مرد عورت

شہر کسی کام سے آتے وہ کھانے یا چائے کے وقت بے تکلف ان کے ہاں پہنچ جاتے۔ جب شہر میں شفیق صاحب کا گھر موجود ہے تو پھر تکلیف یا تکلف ہی کیا؟ اور دوسروں کے لئے کیا خود ان دونوں میاں بیوی کے لئے بھی یہ معمہ حل طلب ہی ہوگا کہ اس قدر آمدنی میں مستقل مہمان داری کا یہ خرچ آخر چلتا کیسے ہے؟ جو بھی وقت پہنچ گیا اس کے لئے کھانے ناشتے کو کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا اور آنے والا جو بے تکلفی اور اپنایت یہاں محسوس کرتا وہ کہیں اور ممکن نہ تھی۔ ابھی پچھلے سال ہی کا تو ذکر ہے۔ جامعہ نگر کی ایک لڑکی شاید نوکری کی تلاش میں دن بھر شہر گھوم کر، پریشان بھوکی پیاسی مٹیا محل پہنچی۔ اس کو دیکھتے ہی صدیقہ سمجھ گئیں اور کہا جاؤ نعمت خانے میں جو ملے کھالو۔ اس وقت دلی کی چند مقتدر خواتین بھی وہاں موجود تھیں۔ انھوں نے پوچھا کہ "یہ لڑکی کون ہے"۔ جواب دیا "میری بیٹی ہے"۔ انھیں "ماں بیٹی" کی صورت میں بہت فرق نظر آیا۔ حیرت کا اظہار کیا۔ اس پر بولیں "صورت نہ ملے تو کیا بیٹی بیٹی نہیں رہتی؟" اور وہ بچاری ان دونوں کی رنگتوں کے فرق پر ہی غور کرتی رہیں۔ شاید ان کے ذہن میں یہ بات آ بھی نہیں سکتی تھی کہ بعض ایسی ہستیاں ہوتی ہیں جن کے دل میں سے اپنے اور غیر کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ سب ان کے ہوتے ہیں اور وہ سب کے ہوتے ہیں۔

۱۹۵۰ء میں جب شفیق صاحب کو یونسکو کی طرف سے انڈونیشیا جانے کی دعوت ملی تاکہ وہ وہاں تعلیم بالغاں کو پھیلانے اور سکھانے میں مدد دیں۔ وہ جامعہ چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے۔ مگر اپنے دوستوں کے سمجھانے سے مان گئے۔ صدیقہ بڑی آسانی سے ان کے ساتھ جا سکتی تھیں۔ میں نے ان سے بہت کہا بھی کہ سیاحت کا ایسا موقع پھر نہ ملے گا مگر انھوں نے شوہر کی مرضی نہ پائی تو جانے کا ارادہ بھی نہیں کیا۔ اب شفیق صاحب دنیا کی نظر میں بڑے عہدے پر تھے۔ آمدنی بھی کافی تھی۔ مگر صدیقہ کے رہن سہن لباس وغیرہ کسی چیز پر اثر نہیں پڑا۔ جامعہ والوں سے خصوصیت کا اور اپنایت کا اظہار کچھ اور بڑھ گیا۔ یوں بھی وہ روپیہ جو یونسکو سے ملا زیادہ تر دوسروں ہی کی ضرورت اور مدد میں خرچ ہوا۔ وہاں شفیق صاحب کے کام کی بہت تعریف ہوئی۔ یونسکو انھیں اور روکنا چاہتی تھی مگر وہ نہ مانے اور اپنی جامعہ کی خدمت کو چھوڑ کر وہاں کی ملازمت پسند نہ کی۔ مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ اب وہ جامعہ میں کام کریں۔ اس زمانے میں دلی اسٹیٹ کی اسمبلی کے انتخابات ہو رہے تھے اور لوگوں نے بغیر شفیق صاحب کی خواہش کے ان کے لئے انتخاب لڑنا شروع کر دیا تھا۔ شفیق صاحب اس جھمیلے میں پھنسنا نہ چاہتے تھے۔ وہ انڈونیشیا سے واپس آئے تو بمبئی میں چھپ کر بیٹھ گئے لیکن دلی میں ان کے عقیدت مند خود ہی سب کچھ کر رہے تھے۔ نتیجہ نکلا تو وہ بڑی اکثریت سے منتخب ہو گئے۔ اب ان کو دلی اسٹیٹ کی وزارت تعلیم کا عہدہ پیش کیا گیا۔ شفیق جامعہ کا خادم ہونا کسی بھی اسٹیٹ کے وزیر اعظم سے بڑھ کر اونچا عہدہ سمجھتے تھے۔ اور اس پیش کش کو قبول کرنا نہ چاہتے تھے۔ ان کے دوستوں کی رائے بھی یہ تھی کہ وہ اس عہدے کو منظور نہ کریں۔ مگر جب پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور دیگر حضرات نے اصرار ہی نہیں کیا بلکہ حکم دیا تو انھیں مجبور ہونا پڑا اور وہ دلی اسٹیٹ کی وزارت تعلیم کے کرتا دھرتا مقرر ہوئے۔ چند سال کے اس قلیل عرصے میں شفیق صاحب نے جو قابل قدر خدمات دلی اسٹیٹ کی اور محکمۂ تعلیم کی انجام دیں وہ نہ میرا موضوع ہے اور نہ میرا منصب، کہ اس پر روشنی ڈالوں۔ میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ ان کی ہر دل عزیزی اور مقبولیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی، خواص اور صاحب غرض لوگوں ہی میں نہیں عوام میں، غریبوں میں، ضرورت مندوں میں۔ سنا کرتے تھے کہ ع خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے' اور خدا جب عہدہ اور اعزاز دیتا ہے تو شان و غرور اور احساس اہمیت خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن شفیق کا تو یہ عالم تھا کہ جیسے شرمندہ ہوں کہ وہ اس عہدے پر کیوں پہنچے! ان کا انکسار اور بھی زیادہ بڑھ گیا تھا۔ اور جب میں "اور بھی زیادہ" کہتی ہوں تو اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ پہلے ہی سے ان میں کتنا انکسار اور فروتنی تھی۔ شروع میں انھوں نے بہت سے قاعدے توڑنے چاہے مثلاً کار پر جھنڈا لگانا، سنتری ساتھ رکھنا، دروازے پر پہرہ وغیرہ دینا۔ خیر بعد میں مجبوراً ان کی پابندی تو کرنی پڑی لیکن ان کے مزاج اور طرز عمل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جس طرح مٹیا محل کا دروازہ ان کے دل کے دروازے کی طرح سب کے لئے کھلا ہوا تھا اسی طرح نئی کوٹھی کا پھاٹک ہر کس و ناکس کے لئے آغوش وا کئے رہتا تھا۔ انھوں نے اس عرصے میں دلی کی خدمت کے لئے جو کچھ کیا اور جس طرح ان کے دل میں گھر بنایا اس کی شہادت وہ لاکھوں برستی ہوئی آنکھیں اور تڑپتے ہوئے دل دے چکے ہیں جو ان کی میت کے ساتھ ۳۰ اپریل ۱۹۵۳ء کو نظر آ رہے تھے۔

اور جامعہ والوں سے — اپنے ساتھیوں اور دوستوں سے تو ان کی عاجزی اور محبت کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔ پہلے آیا کرتے تو دو ایک دوستوں سے ملے، کام کیا اور واپس چلے گئے۔ اب آتے تو کوشش ہوتی کہ ایک ایک کے گھر جائیں

اور اظہارِ محبت و بے تکلفی کریں۔ وہ کیا آتے تھے جامعہ نگر کی بستی میں جان سی پڑ جاتی تھی۔ مجھ سے ان کے دیور بھاوج اور بھائی بہن دونوں رشتے قائم تھے۔ وہ مجھے چھیڑا کرتے تھے اور میں انھیں۔ جیسے ہی میں ان کی آواز سنتی اندر کمرے ہی سے کہتی۔ "آئیے آئیے منتری مہودے ـ پدھاریئے —" اور شفیق صاحب ایک دم خفا ہو کر سیڑھیاں اترنی شروع کر دیتے۔ "بھابی دیکھئے — میں نے کتنی بار آپ سے کہا ہے کہ آپ —" وہ مذاق میں بھی یہ برداشت نہ کر سکتے تھے کہ ان کا کوئی دوست انھیں منتری یا وزیر کہے۔

خیر شفیق صاحب نے تو تیس برس جامعہ ملیہ کے ماحول میں اپنی سیرت کی تشکیل کی تھی لیکن بیگم شفیق میں تو کچھ تبدیلی پیدا ہوتی۔ پہلے بڑے لوگ جامعہ کے اس معمولی سے کارکن کی سیدھی سادی بیوی کی طرف رُخ بھی نہیں کرتے تھے۔ آج گویا ساری دلی اور دلی سے باہر کتنے لوگ، مرد اور عورت ان کی خوشامد، دلداری تعریف و توصیف میں لگے رہتے تھے۔ بڑے بڑے لوگ حاضری دے رہے ہیں۔ دن رات لوگوں کے فون آ رہے ہیں۔ جلسوں میں صدارتوں پر اصرار ہے۔ تقریر کرنے کی درخواستیں، اسکولوں اور اداروں کے افتتاح کرنے کے لئے خوشامدیں ہیں۔ ان کے مزاج، طبیعت، ہنر، سلیقے، قابلیت کا اعتراف ہے۔ کسی چیز نے تو صدیقہ کا دماغ خراب کیا ہوتا؟ مگر نہیں — وہ سمجھتی تھیں کہ یہ خوشامد اس کرسی کی ہے جس پر آج ان کے میاں بیٹھے ہیں۔ اور جس کو وہ کوئی اہمیت نہ دیتی تھیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس حلقے میں بھی ان کو خلوص سے محبت کرنے والے لوگ ملے۔ ان کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ مخلص لوگ ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے اور وہ خود بھی ان سے بہت متاثر ہوئیں۔ لیکن ان کو کسی قسم کی غلط فہمی یا غرور پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ اپنے پہلے کے دوستوں سے ان کی محبت اور انکسار دوچند ہو گیا۔ میاں اور بیوی دونوں کی یہ کوشش تھی کہ کسی دوست، ساتھی اور عزیز کو یہ غلط فہمی پیدا نہ ہونے پائے کہ ہم رتی بھر بھی بدلے ہیں۔

اور پھر ۳- اپریل ۱۹۵۸ء کو دلی کی جنتا کا یہ سچا خیر خواہ، دلی کا محبوب وزیر اور ہر دل عزیز لیڈر۔ جامعہ کا عاشق، دیس کا پجاری، دوستوں کا جاں نثار عزیزوں کا غمگسار، خدا کو پیارا ہو گیا، دیس اور قوم نے کیا کیا امیدیں شفیق کی ذات سے وابستہ کی تھیں۔ ان کی بڑھتی ہوئی ہر دل عزیزی اور مقبولیت، ان کی قابلیت اور صلاحیتیں ابھی تو ذرا سامنے آئی تھیں۔ اب وقت آیا تھا کہ جو اہم کام وہ چھوٹے پیمانے پر انجام دیتے رہے تھے۔ اُسے پورے دیس میں پھیلاتے اب وقت آیا تھا کہ تینتیس برس تک جو کوہ کنی انھوں نے قوم اور ملک کی خاطر کی تھی اس سے چشمۂ شیریں جاری ہوتا۔ لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ شفیق کا دل اور جسم تینتیس سال تک ہر قسم کی جسمانی اور ذہنی تکلیفیں اٹھاتے اٹھاتے اور ان تھک محنت کرتے کرتے تھک چکا تھا۔ ہارٹ اٹیک کا بہانہ ہوا اور وہ دو مہینے کی بیماری میں ختم ہو گئے۔ لیکن شفیق جیسا انسان کبھی مرتا نہیں ہمیشہ زندہ رہتا ہے ــ

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

شفیق صاحب کی جدائی ان کے دوستوں اور عزیزوں کے لئے ایک ایسی محرومی تھی جس کو وہ عمر بھر نہیں بھلا سکتے۔ اس صدمے سے لوگوں کے دلوں پر جو کچھ گزری اس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ لیکن مرنے کے ساتھ مرتا کوئی نہیں۔ صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔ مگر بعض وقت کسی ہستی کی جدائی انسان کو زندہ درگور کر دیتی ہے۔ شفیق صاحب کا حادثہ یوں تو کتنے لوگوں کے لئے روح فرسا تھا مگر ایک ہستی ایسی تھی جس کی دنیا سچ مچ اجڑ گئی۔ اس کا دل ویران ہو گیا۔ اس کے دماغ کا سکون چھن گیا۔ خوشی ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ گئی۔ ہونٹوں کی مدھ بھری مسکراہٹ حزن و یاس میں بدل گئی۔ چہرے کی شگفتگی کملا گئی۔ صدیقہ کو اپنے شوہر سے محبت ہے۔ اور بہت محبت ہے۔ اس کا اندازہ کم و بیش ان کے سبھی دوستوں کو تھا۔ لیکن یہ ان کے بعد ہی معلوم ہوا کہ ان کی محبت عشق کے بڑے اونچے درجے تک پہنچی ہوئی ہے۔ جہاں عاشق اپنی ذات کو محبوب کی ذات میں فنا کرنا اپنی زندگی کا مقصود سمجھتا ہے۔ انھوں نے اس صدمۂ عظیم کو بڑے صبر اور ضبط سے سہارا۔ ان کا صبر "صبرِ جمیل" کی تعریف میں شامل ہو سکتا ہے۔ ترجمان القرآن میں مولانا ابو الکلام آزاد رحمت اللہ علیہ نے حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کی جدائی کے بیان میں صبرِ جمیل کی توضیح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ بظاہر یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت یعقوب نے بیٹے کے غم میں روتے روتے آنکھوں کی بینائی کھو دی تھی اور ہر وقت ان کی یاد میں بے قرار رہتے تھے۔ پھر بھی ان کے صبر کو قرانِ پاک میں "صبرِ جمیل" کہا گیا ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں کہ صبر دراصل مستحسن ہے جو انتہائی شدتِ غم میں کیا جائے۔ اگر فراق کی تکلیف، دردِ جدائی کی چمک، ہجر کی کسک دل میں نہ ہو تو وہ ایک بے حسی کی کیفیت ہو گی۔ جہاں صبر اور ضبط کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صبر وہی صبرِ جمیل ہو سکتا ہے جب درد و غم کی شدت

موجود ہو، فراق میں دل تڑپ رہا ہو، پھر بھی زبان سے سوا خدا کے شکر کے کوئی اور کلمہ نہ نکلے دل میں سوا راضی برضا رہنے کے کوئی گلہ نہ آسکے۔ اور خالقِ حقیقی کے حکم کے آگے سر جھکا لیا جائے۔ یہی صبر صبرِ جمیل ہے، ولیوں اور نبیوں کی بات ان کے ساتھ ہے۔ ہم عاجز انسانوں میں صبر کی یہ کیفیت شاذ و نادر ہی کبھی نظر آتی ہے۔ لیکن میری پیاری بہن صدیقہ قدوائی کا صبر اس صبرِ جمیل کی تعریف میں آسکتا ہے۔ شفیق صاحب کی جدائی میں پانچ سال ان کا کیا حال رہا ہے اس کو کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کو ان کی حالت بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ اس طویل عرصے میں ذرا دیر کے لئے بھی تو وہ انھیں نہ بھلا سکیں۔ ان کی آنکھوں کی وہ چمک جو شفیق کو دیکھ کر پیدا ہوتی تھی۔ ہونٹوں کی وہ مسکراہٹ جو اُن کی دید سے دمک اٹھتی تھی پھر کبھی دکھائی نہ دی۔ ان دو ہزار دنوں میں کوئی دن نہیں گزرا جب انھوں نے ان کی یاد پر آنسوؤں کی مالا نہ چڑھائی ہو۔ میں نے بہت سی بدنصیب بیوہ عورتوں کو دیکھا ہے جو اپنے شوہروں کو بہت چاہتی تھیں اور ان کے بعد سچ مچ ان کی زندگی ویران ہو جاتی ہے۔ لیکن زمانہ رفتہ رفتہ زخم کو مندمل کر ہی دیتا ہے اور کچھ نہیں تو وہ اپنے بچوں کی خاطر ہی اپنے کو سنبھال لیتی ہیں۔ لیکن صدیقہ کا غم کسی طرح بھی کم نہ ہو سکا، بچوں کو دیکھ کر تو اُن کے باپ کی یاد میں اور بھی ان کے دل کی تڑپ بڑھ جاتی تھی۔ ایک ناسور تھا جو ہر وقت رستا رہتا تھا۔ اس پانچ سال میں سینکڑوں مرتبہ ہی میری ان کی ملاقات ہوئی لیکن ایک بار بھی تو یہ نہیں ہوا کہ کسی عنوان شفیق کا ذکر انھوں نے نہ کیا ہو۔ ہر بات ان کو شفیق کی یاد دلاتی تھی اور آنکھوں سے موتیوں کی برکھا ہونے لگتی تھی۔ مگر یہ سب ہوتے ہوئے بھی انھوں نے کبھی گلہ شکوہ کا کلمہ منھ سے نہیں نکالا۔ ان کے صبر و ایمان میں فرق نہیں آیا۔ زیادہ سے زیادہ کہا تو بس یہ "میں بھی ان کے ساتھ ہی کیوں نہ مرگئی" قسمت سے شکایت تھی تو بس اتنی کہ "میں ان کے بعد زندہ کیوں رہی؟" کسی طرح سے ان کا دل اس پر آمادہ نہ ہوتا تھا کہ شفیق کے بعد وہ زندہ رہیں۔

لیکن یہ سب دل کی کیفیت تھی۔ عمل کا یہ حال تھا کہ غم کا پہلا ہلہ گزرتے ہی صاحبِ عزم شوہر کی حوصلہ مند اور غیور بیوی نے کارزارِ حیات میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی ٹھان لی اور شوہر کے ادھورے کاموں کو پورا کرنے کا عزم کر لیا۔ انھوں نے ایک طرف اپنی مشکلات اور پریشانیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تو دوسری طرف لوگوں کے لئے شفیق کا نعم البدل بن گئیں۔ ان کا ہر دوست، ہر ساتھی ہر عقیدت مند جو ان کی محبت، سرپرستی اور دوستی سے محروم ہو گیا تھا۔ اس کے دکھے دل کو جوڑنا صدیقہ کا فرض بن گیا۔ اپنے بچوں کی کوئی خاص فکر نہ تھی۔ ان کے نزدیک شفیق صاحب کے دوستوں کو ان کے بچوں کا زیادہ خیال اور فکر تھی۔ ہاں ان لوگوں کی فکر ہر وقت لگی رہتی تھی جو شفیق سے سچ مچ اپنے باپ کی طرح محبت کرتے اور مرشد کی طرح ان سے عقیدت رکھتے تھے، کہتی تھیں۔

"یہ بے چارے بھی تو یتیم اور بے سہارا ہو گئے۔ مجھے اپنے بچوں سے زیادہ اُن پر رونا آتا ہے۔" ان کی ہر مدد کے لئے صدیقہ کمربستہ رہتیں۔ کسی کے ساتھ کوئی ناانصافی ہو جائے، صدیقہ اس کی حمایت کے لئے موجود، کوئی جھوٹ موٹ جا کر اپنی مصیبت یا دوسروں کی زیادتی کا رونا رو دے۔ صدیقہ سخت بے چین ہو جائیں گی۔ ہر قسم کی مدد دامے، درمے، قدمے، سخنے کرنے کو حاضر۔ یہی نہیں انھوں نے شفیق صاحب کے کاموں کو بھی سنبھالا۔ ادارۂ تعلیم و ترقی کے مختلف شعبوں کی نگرانی اپنے ذمہ لے لی۔ اور اس کے زیرِ نگرانی جتنے کام ہو رہے تھے ان سب کی بہبود اور ترقّی کے لئے تن من سے کوشش میں لگ گئیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو بے پایاں محبت شفیق کو جامعہ سے تھی وہ صدیقہ کو سونپ گئے ہیں۔ مگر ان کی کارگزاریاں اور خدمتیں صرف جامعہ ہی کے لئے محدود نہ رہیں بلکہ پانچ سال کے اس عرصے میں جتنے کام سوشل سروس کے، سرکاری یا غیر سرکاری دلّی میں ہو رہے تھے۔ ان سب کی خدمت اور ترقّی کی کوشش وہ اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ ان کا کام کرسی پر بیٹھ کر حکم دینے والے اور صرف زبان اور قلم سے جنتا کی سیوا کرنے والوں سے بہت مختلف تھا۔ وہ حقیقی خدمت اور ٹھوس کام خاموشی سے کرنے کی قائل تھیں۔ اس قسم کے ہر کام میں لوگ ان کو کھینچنے کی کوشش کرتے تھے۔ کوئی شک نہیں ابتدا میں لوگ شفیق صاحب کی بیوی ہونے کی وجہ سے ان سے خصوصیت برتتے اور اس قسم کے عوامی خدمت کے کاموں میں ان کو شریک کرتے تھے، لیکن بعد میں خود ان کی اَن تھک محنت، خلوص اور لگن کی وجہ سے انھیں ان کاموں میں شریک ہونے پر مجبور کیا جانے لگا۔ ہر وہ تحریک جس میں عوام کی اور خصوصاً عورتوں اور بچوں کی بھلائی کا کچھ کام ہو رہا ہو صدیقہ کسی نہ کسی حیثیت سے اس میں ضرور نظر آئیں گی۔ کسی کی سیکرٹری ہیں، کسی کی صدر ہیں، کسی کی کنوینر ہیں کسی کی مُشیر اور سرپرست ہیں۔ لاکھ انکار کرتیں، اپنی خرابیٔ صحت کا عذر کرتیں اپنی "نااہلیت" اور "ناقابلیت" کا بہانہ پیش کرتیں مگر لوگوں کا اصرار اور اپنی

دلی لگن انھیں مجبور کر دیتی کہ وہ مان لیں۔ کام تھے کہ بڑھتے جا رہے تھے صحت تھی کہ گرتی جا رہی تھی مگر کسی بات کی پروا نہ تھی۔ دلی میونسپلٹی کی ممبری زبردستی گلے لگا دی گئی۔ انکار کرتی رہیں۔ اصرار بڑھتا گیا۔ شفیق کے خاص دوست جن کو وہ اپنا بزرگ سمجھتی تھیں، ہمیشہ ان کے مشیر رہے۔ ان سے مشورہ کیا، رائے دی گئی کہ منظور کر لیجئے، مان گئیں، اب وہاں کوئی قصہ جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے۔ تو صدیقہ کو ایسی فکر جیسے ساری ذمہ داری انھیں پر ہے، اُسے نپٹانے کے لئے ہر کوشش ہو رہی ہے۔" ان کا یہی طریقہ تھا۔ "کبھی کسی پارٹی بندی میں شریک نہیں ہوئیں یہ اُن کے مسلک کے خلاف ہے۔" گویا ہر کام اس لئے کیا جاتا تھا کہ "وہ یہی پسند کرتے تھے۔" جب راجیہ سبھا کے لئے پہلی بار وہ نامزد کی گئیں تو بہت گھبرائیں "میں اس قابل کہاں ہوں؟" مشورے کے لئے شوہر کے دوستوں کے پاس دوڑیں، رو رہی ہیں "میں کسی قابل نہیں، کچھ نہیں۔ یہ سب اُن کی وجہ سے لوگ مجھے اعزاز دیتے ہیں۔ مجھ میں تو کوئی قابلیت نہیں ـــ صلاحیت نہیں ـــ" سمجھایا گیا، اصرار کیا گیا۔ مان گئیں۔ مصروفیت اور بھی بڑھ گئی، ہم لوگ سمجھتے یہ جتنی زیادہ مصروف رہیں گی ان کے لئے اچھا ہوگا۔ غمِ مفارقت کو سہارنے کی سب سے بہتر تدبیر یہی تو ہے کہ کام میں اپنے کو فنا کر دیا جائے اور صدیقہ یہی کر رہی تھیں۔ مگر غم کو بھلانے کے لئے نہیں تازہ رکھنے کے لئے، ہر کام، ہر خدمت، ہر اعزاز اور ہر عہدہ کو قبول کرتے وقت یہی چیز ان کے پیشِ نظر رہتی تھی کہ اُن کا کام اور اُن کا نام زندہ رکھیں۔ صحت خراب ہے، دردِ سر کے دورے بڑھ رہے ہیں۔ رنگت روز بہ روز سفید پڑتی جا رہی ہے مگر کوئی پروا نہیں، تمام کام بدستور ہو رہے ہیں۔ جامعہ کے کام، تعلیم و ترقی کے کام، سوشل سروس کے کام، محلہ، پڑوس والوں کی خدمت، ضرورت مندوں کی حاجت روائی کسی کی سفارش کے لئے اپنے سے کم رُتبہ لوگوں تک کے پاس دوڑی جا رہی ہیں ان سے جھگڑ رہی ہیں، اصرار کر رہی ہیں۔ "یہ میرا کام ہے۔" ہر کام، ہر ایک کا کام ان کا اپنا ہی کام ہوا کرتا تھا۔ کوئی بیمار پڑ گیا تو اسپتال میں علاج کا انتظام کرا رہی ہیں ڈاکٹروں سے سفارش کر رہی ہیں۔ کسی کے بچہ ہونے والا ہے تو لیڈی ڈاکٹر کو لے کر پہنچ گئیں لوگوں میں آپس میں کوئی اختلاف ہو جائے تو گھبرائی گھبرائی ایک ایک کے پاس پھر رہی ہیں کہ آپس میں صلح صفائی ہو جائے۔ "بدنامی نہ ہو غیر ہم پر نہ ہنسیں" کسی کے ہاں خوشی کی تقریب ہے تو دلِ شکستہ کو دبائے وہاں بھی موجود۔ آنکھوں سے آنسو چھلکے پڑ رہے ہیں مگر ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ پیدا کر لی ہے۔ کبھی چپکے سے کسی ہمدرد سے کہہ دیتی ہیں "وہ ہوتے تو کتنے خوش ہوتے" اور سب کی آنکھ بچا کر کھدر کی موٹی سفید ساڑھی کے آنچل میں آنسو جذب کر لئے جاتے ہیں۔ کوئی موت ہو جائے تو صدیقہ سب سے پہلے آنسو بہانے کو موجود نظر آئیں گی۔ کسی کو کوئی عہدہ یا اعزاز ملے، صدیقہ سے بڑھ کر خوش اور نازاں دوسرا نہ ملے گا۔ کوئی اپنے سگے بھائی بہن اور اولاد کی ترقی اور اعزاز سے اتنا خوش نہ ہوتا ہوگا جتنا وہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے لئے ہوتی تھیں یہ کیسے کہوں کہ لوگ ان سے حسد یا رشک نہ کرتے تھے، یہ کہوں تو گویا اقرار کروں کہ دنیا میں تنگ نظر اور حاسد لوگوں کا کال پڑ گیا ہے۔ بے شک ایسے لوگ بھی تھے جو ان کی ہر دل عزیزی اور اعزاز سے جلتے تھے۔ کہتے تھے خود ان میں کیا ہے؛ کچھ نہیں، یہ سب شفیق صاحب کی وجہ سے انھیں مل رہا ہے، جلتے تھے کہ خود ان کو یہ منصب، یہ عزت کیوں حاصل نہیں۔ لیکن ایسے لوگ بہت کم تھے اور جو تھے بھی اُن کے ڈنک بھی صدیقہ کی شرافت اور خلوص کے سامنے گر جاتے تھے۔

اور صدیقہ اپنی ہر دل عزیزی سے بے نیاز، اپنی صلاحیتوں سے بے خبر، اپنی اونچی پوزیشن سے بے پروا، ان تھک بے غرض خدمت میں اپنے کو کھپائے شفیق کی یاد کو انمول دولت کی طرح سینے سے لگائے، قوم کی خدمت کی راہ پر کس تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔ بڑے بڑے پُرانے خادموں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی، بڑے بڑے ماہرِ فنِ سیاست دانوں کو مات دیتی ہوئی، ان کی ہر دل عزیزی کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ ابھی چند مہینے پہلے جب دلّی اسٹیٹ کی طرف سے راجیہ سبھا کی ممبری کے لئے ان کا انتخاب ہوا تو وہ متفقہ فیصلہ سے دلّی والوں کی نمائندہ چُنی گئیں اور کتنی مضحکہ خیز تھی، ان کے حریف کی پوزیشن جس کو صرف ایک ووٹ ملا۔ ہم ان کو "اربابِ حکومت" کہہ کر چھیڑتے تھے، اور آہ کتنا چڑاتی اور شرماتی تھیں وہ اس وقت کتنا انکسار تھا ان میں، لوگ ذرا سا موقع نام اور شہرت کا مل جاتا ہے تو کتنا اچھلتے ہیں ـــ ان کے قدم شہرت اور عزت خود آ کر چومتی تھی اور وہ اسے اپنے شوہر کی ہر دل عزیزی سے یا جامعہ سے منسوب کر دیتی تھیں۔

اور صدیقہ یہ سب کرتی رہیں اور شمع کی طرح اندر ہی اندر گھلتی رہیں کاموں کی زیادتی کے ساتھ ساتھ دردِ سر کے دورے بڑھتے رہے۔ مگر انھوں نے باوجود عزیزوں اور دوستوں کے اصرار کے جھگڑے لڑائی کے کبھی سنجیدگی سے اپنے علاج اور صحت

کے مسئلے کو د سوچا۔ بہت تکلیف ہوتی تو چار چار چھ چھ اسپرین کی گولیاں کھا کھا کر جیسے تیسے کسی جلسہ یا میٹنگ میں پہنچ جاتیں۔ پچھلے رمضان میں ملنے گئی۔ معلوم ہوا روزے سارے رکھتی رہیں یہاں تک کہ طبیعت بہت خراب ہو گئی۔ دیکھا کہ جسم میں خون کی چھینٹ نظر نہیں آ رہی۔ بہت ہی کمزور ہو گئی ہیں۔ کتنی دیر میں ان سے ان کی صحت کے مسئلے پر جھگڑتی اور سمجھاتی رہی۔ مگر وہ کبھی میری اس قسم کی بات کو سنجیدگی سے نہیں سنتی تھیں۔ ایک حزیں مسکراہٹ کے ساتھ سب کچھ یہ کہہ کر ٹھکرا دیتیں "میں بہت سخت جان ہوں بھابی — مروں گی نہیں — مجھ جیسے بدنصیبوں کو موت نہیں پوچھتی —" اس بار کچھ زیادہ ہی افسردہ تھیں۔ جون ۳۔ اپریل قریب آ رہی تھی ان کے دل اور دماغ کی حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی تھی۔ "بھابی کتنی بار میری قسمت میں یہ منحوس تاریخ دیکھنی لکھی ہے—" اور میں کچھ جواب بھی تو نہ دے سکی۔ آہ — مجھے کیا خبر تھی کہ ان کے ہجر کی رات کٹ رہی ہے اور ہماری مفارقت کی شب قریب آ رہی ہے۔ میں تو ہمیشہ اپنے دل کو یہی سوچ کر تسلی دے لیتی تھی کہ عورت بڑی سخت جان ہوتی ہے۔ بہت کچھ سہار لیتی ہے۔ اور صدیقہ بھی یہ سب جھیل لے جائیں گی۔ وہ زندہ رہیں گی اپنے کم سن بچوں کے سر پر ان کی محبت کا سایہ برقرار رہے گا۔ شفیق صاحب کے غم زدہ دوستوں کو ان کی دوستی کی نعمت حاصل رہے گی۔ ان کی خدمات سے وطن اور قوم کو فائدہ پہنچتا رہے گا — ان کی حسین و دل کش شخصیت اپنے حلقے میں چمکتی رہے گی اور میں۔ (اور میرے ساتھ کتنے اور) ان کی پُرخلوص محبت اور انمول دوستی کی دولت سے مالامال رہیں گے — مگر آہ — ہر امید خاک میں مل گئی۔ صدیقہ کے لئے باغِ دنیا کی ساری نعمتیں، ساری خوشیاں، سارے اعزاز، ساری محبتیں خاک تھیں۔ محبوب کی ملاقات کی امید پر وہ ایک کیا ہزار زندگیاں نچھاور کر سکتی تھیں ؎

سوختن بر شمع کشتہ کارِ ہر پروانہ نیست
جز زنِ ہندی کسے در عاشقی مردانہ نیست

زندگی کے علائق نہ پہلے ان کے پاؤں کی زنجیر بنے تھے نہ مرتے وقت دامن گیر ہوئے۔ انھوں نے اپنے پیارے بچوں اور سب چاہنے والوں کو اس خدا کے سپرد کر دیا جو سب کا والی و وارث ہے — زندگی اور اس کے بندھنوں پہ ایک بے نیازی کی نگاہ ڈالی اور مسکرا کر جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ جیسی سبک بار آئی تھیں ویسی ہی سبک دوش واپس گئیں۔ اپنے خالق کی بارگاہ میں — اپنے محبوب کے پہلو میں ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

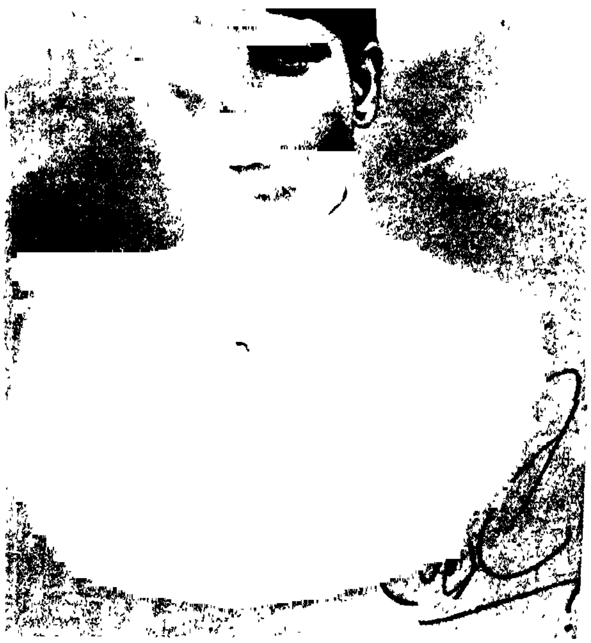
تم چلی گئیں صدیقہ — آہ کتنی جلد چلی گئیں — مگر اپنی حسین و دل کش زندگی کی یاد ہمیشہ کے لئے ہزاروں دلوں میں ثبت کر گئیں — تم نے سب کو بھلا دیا صدیقہ — مگر بتاؤ — تمہیں کون بھلا سکے گا — تمھارے یتیم بچے، جن کی زندگی کا ہر لمحہ تمھاری اور اپنے بے مثال باپ کی یاد میں بسر ہوگا — تمھاری قوم اور تمھارا دیس ؟ جس کو تمھاری سی خدمت اور خلوص والی ہستی کبھی کبھار ہی نصیب ہوتی ہے — جس کے افق پر تم ایک شہابِ ثاقب کی طرح اُبھریں، چمکیں، اپنی روشنی سے دم بھر کے لئے تاریک گوشوں کو منور کیا اور پھر ہمیشہ کے لئے فضا میں غائب ہو گئیں — تمھاری جامعہ ؟ جس کو تم جیسا عاشق نثار خادم اب کبھی نہ ملے گا۔ تمھارے عزیز ؟ جن کے لئے تم محبت کا سرچشمہ اور فخر و ناز کا سبب تھیں۔ اور تمھارے دوست جن کو ایسا مخلص اور سچا دوست اب نہیں ملے گا کبھی — اور تمھاری حرماں نصیب بہن صالحہ — آہ وہ کیسے تمھیں بھولے گی صدیقہ ؎

دلِ مضطر کو کون دے تسکیں
ماتمِ یارِ غم گسار ہے آج

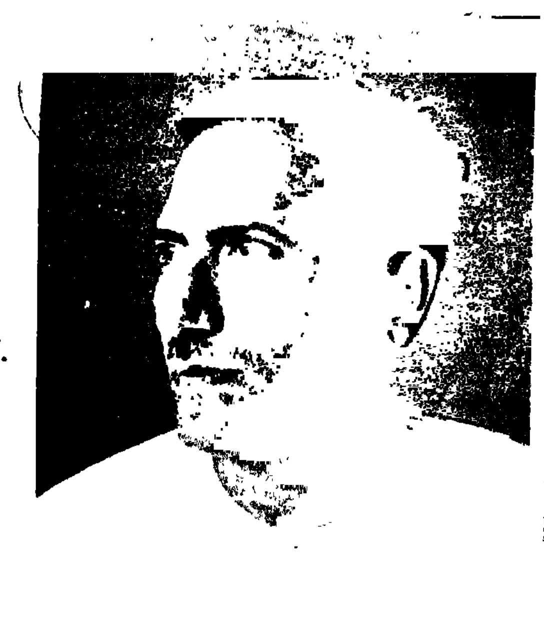
اور تمھیں بھلانے کا سوال ہی کیا ہے ؟ بھولتے وہ ہیں جو مر جاتے ہیں — تم مری ہی کب ہو ؟ تمھاری ہنسی کی آواز اب بھی کانوں میں گونج رہی ہے — تمھاری موہنی صورت آنکھوں میں بسی ہوئی ہے۔ دل اب بھی تمھاری پُرمحبت اور ہمدرد باتوں کے مزے لے رہا ہے۔ تصور اب بھی تمھیں زندگی کے ہر شعبے میں ان تھک محنت اور بے پایاں لگن کے ساتھ سرگرمِ کار دیکھ رہا ہے۔ تخیل میں اب بھی تم مجسم حُسن و خوبی کی مورت، سامنے موجود ہو۔ تم زندہ ہو — زندہ رہو گی — آنکھوں میں آنسو بن کر ——— دل میں کسک بن کر ——— دماغ میں روشنی کی کرن بن کر ؎

تمھیں کہتا ہے مُردہ کون، تم زندوں کی زندہ ہو
تمھاری نیکیاں زندہ، تمھاری خوبیاں باقی

ہمارے لکھنے والے

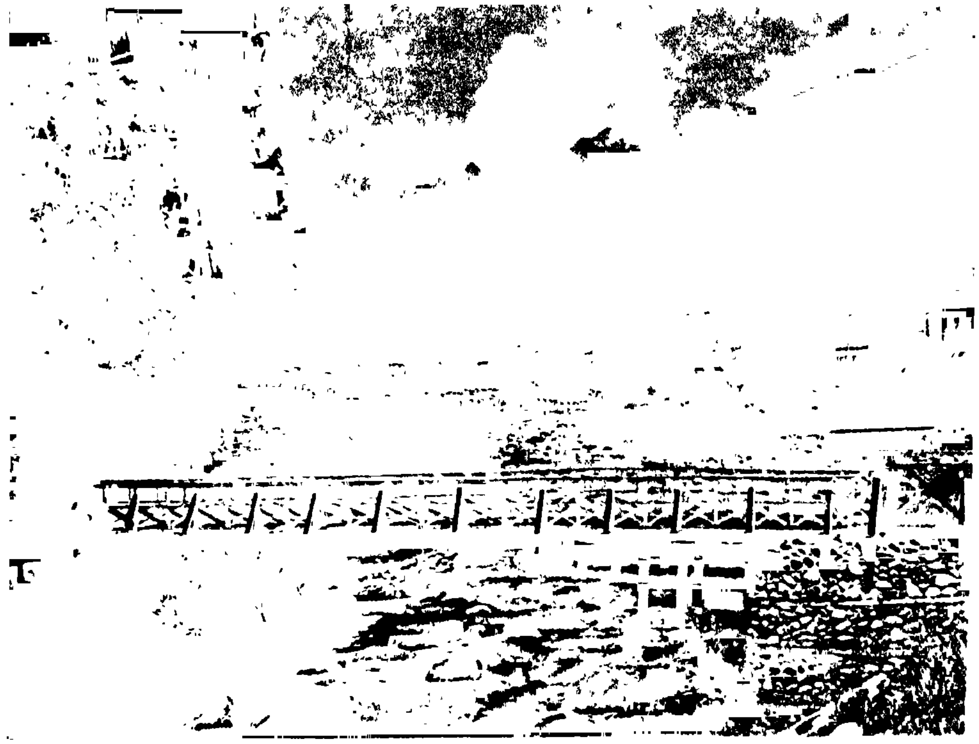


ساغر نظامی



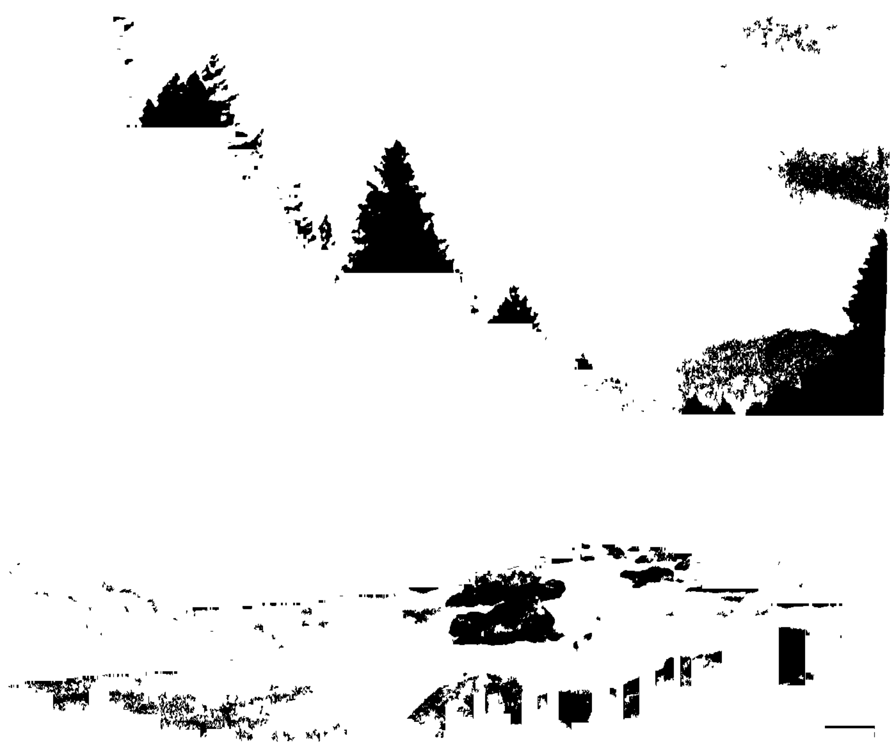
جی، ایل ادیب لکھنوی

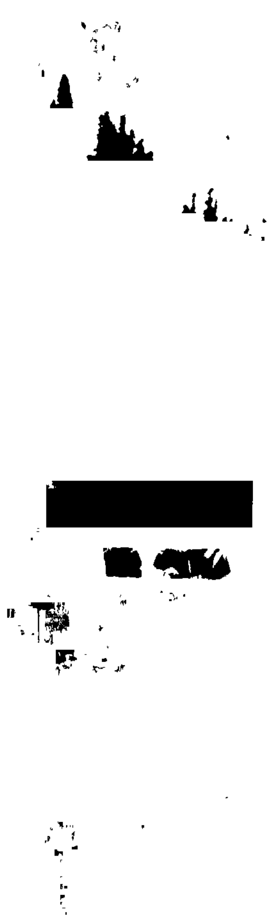
پہل گام



پہلگام کا ایک نظارہ

دریائے لدر





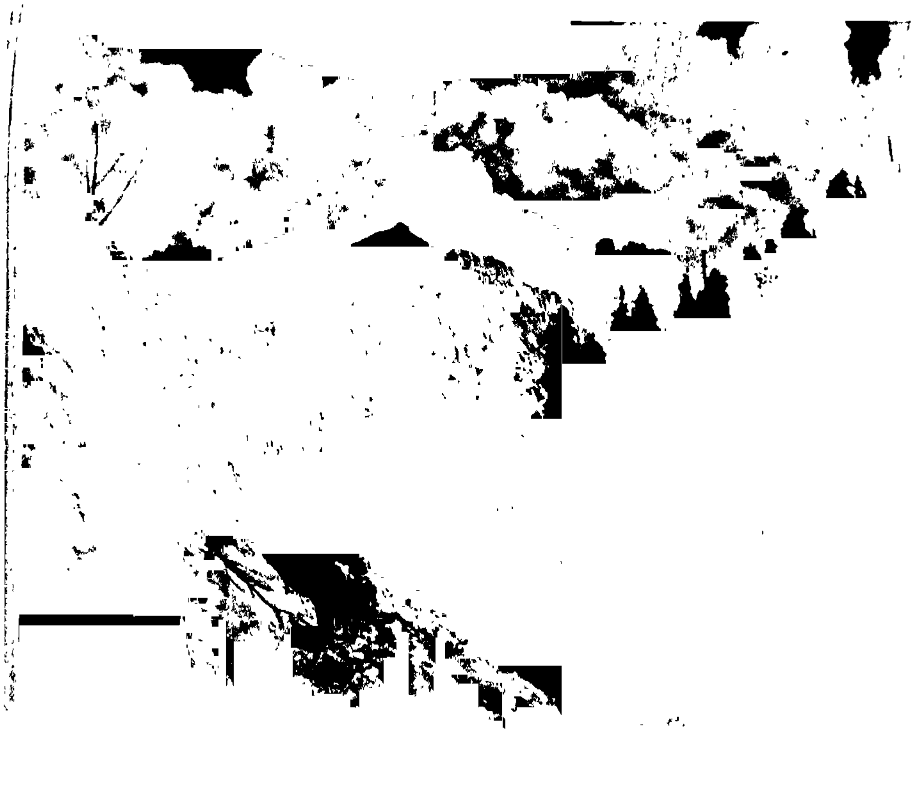
کے چند مناظر

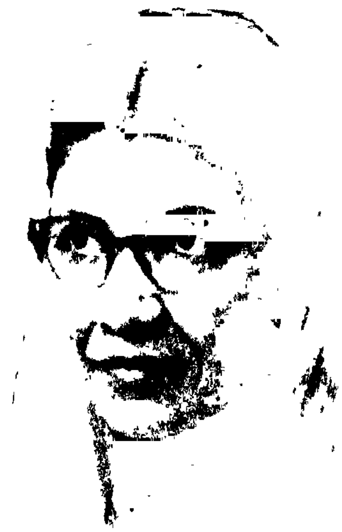
چندن واڑی



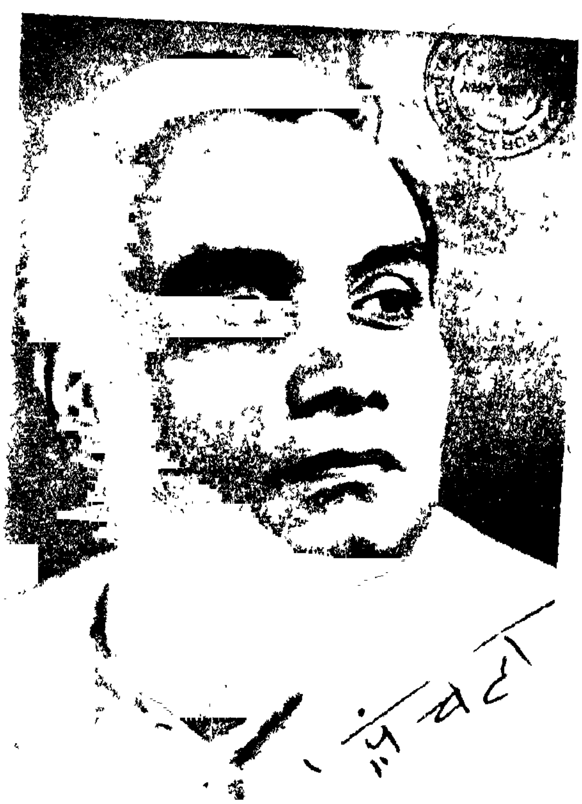
کولائی گلیشیر

چندن واڑی کا راستہ





مرحومہ بیگم صدیقہ قدوائی
آپ کے بارے میں
بیگم صالحہ عابد حسین کا مضمون
اس شمارے میں ملاحظہ فرمائیں



ہندی کے نوجوان شاعر 'انچل'
آپ کی شاعری پر
جی۔ ایس ادیب لکھنوی کا مقالہ
اس شمارے میں شامل ہے

انچل

ہندی کے عظیم الفکر ممتاز شاعر — انچل — کی شخصیت پر غالب کا یہ شعر بالکل صادق آتا ہے۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

پہلی نظر میں آپ انچل کو دیکھ کر یہ نہ کہہ سکیں گے کہ ایک تنومند قوی جسم پہ موٹی اور کچی گردن لئے ہوئے "غیر شاعرانہ" اور کچھ بھدّی شکل و شباہت کا مالک ایک ایسا انسان ہے جس کے سینے میں حساس دل اور بیدار روح ہے۔ جس کا دماغ دانا اور توانا ہے۔ جس کے ضمیر و خمیر میں شاعری کے لطیف احساسات اور جذبات کوٹ کوٹ کر بھر دیئے گئے ہیں۔ جن میں حُسن ہے، تواناری ہے، لطافت ہے، اور خلوص ہے — اور جن کے مجموعہ کا دوسرا نام ہندی شعر و ادب نے "انچل" رکھ لیا ہے۔ ہندی کا یہ بلند پایہ شاعر اُردو ادب کی دُنیا میں اس لئے متعارف ہونا چاہیئے کہ اس نے بڑی خوبصورتی اور چابک دستی سے اُردو شاعری کے تخیل کی لطافت اور ہندی جذبات کے خلوص کا ایک حسین امتزاج پیش کیا ہے — "ہندی بول" کے امرت رس میں اُس نے اُردو شاعری کی شگفتگی کو حل کر کے دونوں کو ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا ہے۔ اُس کے قلم نے اُردو شعر و سخن کے عروض کی تنگنائے سے ہندی بھاشا کے لوچ کو سبک اور رواں انداز میں گذارا ہے چونکہ قومی یک جہتی کے لئے لسانی یک جہتی ضروری ہے۔ اس لئے ہندی شعر و ادب اور مطالعہ کی خدمت کو اُردو شعر و ادب کی خدمت اور مطالعہ تصور کرنا چاہیئے۔

ہندی ادب کی دُنیا میں اس مایۂ ناز شاعر اور سلیم الفکر ادیب کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

رامیشور شکل انچل، کشن پور (ضلع فتح پور، ہسوہ۔ یوپی) میں یکم مئی ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی۔ اُس میں اَدب کا ذوق اور شعر و سخن کا چرچا تھا۔

انچل نے ابتدائی تعلیم کشن پور میں حاصل کی۔ اور لکھنؤ سے ایم۔ اے (انگریزی ادب) کا پہلا سال ختم کیا تھا کہ مالی پریشانیوں کی وجہ سے سلسلۂ تعلیم منقطع کرنا پڑا۔ مختلف محکموں کے دروازے کھٹکھٹانے اور چھ سات سال تک کئی حیثیتوں سے ملازمت کرنے کے بعد ۱۹۴۲ء میں انھوں نے ناگ پور یونیورسٹی سے ہندی میں ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اور ۱۹۴۵ء میں رابرٹسن کالج جبل پور میں ہندی کے لکچرار مقرر ہوئے اور آج کل محکمۂ لسانیات میں ہندی کے ریڈر ہیں۔

جو ادبی ذوق ان کو ورثہ میں ملا تھا وہ لکھنؤ کی فضا اور ذاتی ذوق و شوق کے سایہ میں پرورش پا کر نظم و نثر کے حسبِ ذیل مجموعوں کی شکل میں جلوہ گر ہوا ہے۔

۱۔ تارے	۱۹۳۸ء	۲۔ مدھولیکا	۱۹۳۸ء
۳۔ اپراجتا	۱۹۳۹ء	۴۔ کرن بیلا	۱۹۴۱ء
۵۔ کرِیل	۱۹۴۲ء	۶۔ لال چُنر	۱۹۴۴ء
۷۔ سماج اور ساہتیہ	۱۹۴۴ء	۸۔ چڑھتی دھوپ	۱۹۴۵ء
۹۔ نئی عمارت	۱۹۴۶ء	۱۰۔ اُلکا (شہابِ ثاقب)	۱۹۴۶ء

۱۔ رابرٹسن کالج جبل پور میں پروفیسر انچل کو دیکھ کر جو تاثرات راقم السطور کے ذہن پر مرتسم ہوئے اُن کو بے کم و کاست بیان کرنے کی جراءت کی ہے۔ شاعر اور ناظرین کرام۔ دونوں سے اس بے باکانہ اظہارِ خیال کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ (ادیب)

۱۱- مراؤدیپ (چراغِ صحرا) ۱۹۵۲ء ۱۲- ورشانت کے بادل ۱۹۵۴ء

اِن کے علاوہ کئی درسی تالیفات کے مالک ہیں۔

"نارست" ایک مقبول افسانہ ہے۔ شاعرانہ اور لطیف زبان میں سماجی حالت کا نقشہ پیش کرتا ہے۔

مدھولیکا اور اپراجیتا میں رومانی نظمیں ہیں۔ مگر کرپل اور کرن بیلا، میں آپ کو ترقی پسند عناصر بھی ملیں گے۔ کرپل کی بعض نظموں (سہاگن سے یوں للکار، چپل چیز، انترجوالا، کوی کا سوپن، کرانت کی پکار، کسان وغیرہ) میں جذبات کا گہرا اظہار پایا جاتا ہے۔ مگر انداز بیان اور الفاظ کی غرابت کی وجہ سے اکثر نظمیں پامال طبقہ کی موافقت میں ہمدردی کے جذبات اُبھارنے میں ناکام نظر آتی ہیں۔

افلاس و عسرت وہ موضوع نہیں جو محبت کے فرشتہ کے ساتھ ہم آہنگ ہوسکیں۔ اس لئے "ترقی پسندی" سے شاعر پھر محبت کی خوبصورت دنیا میں آ جاتا ہے۔

"کرپل" میں ظلم و تشدد، غلامی اور سرمایہ داری کے خلاف غریب پامال طبقہ کی ہمدردی میں جو آواز بلند ہوئی تھی۔ سُنیئے۔ وہ لال چیز کی شفق زادیوں میں گا رہی ہے — جاگ سوزِ عشق جاگ!

لال چیز میں انچل اپنے جذبات کے اظہار کی نفاست اور لطافت میں کامل طور سے جلوہ گر ہے۔ نظموں کی زبان آسان ہے۔ ان میں حیرت خیز تازگی اور اثر ہے۔

"سماج اور ساہتیہ" گیارہ مضامین پر مشتمل ہے۔ اُن میں جدید ہندی اُدب پر متوازن انداز میں سائنٹفک طریقہ پر نظر ڈالی گئی ہے۔ سماج اور ادب کے آئینہ میں نظر آنے والے سماج کے خدوخال کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

پریم چند، جینیندر، اگیہ اور جوشی وغیرہ ادیبوں پر" درشت مگر درست" انداز میں تنقید کی گئی ہے۔ بعض مقامات پر تکرار ہے۔ مبالغہ سے بھی کام لیا گیا ہے مگر تکرار اور مبالغہ سے کتاب کی افادیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

"چڑھتی دھوپ" میں سماج اور سیاست کی کشمکش ہے۔ نئی عمارت کی بنیاد ۱۹۴۲ء کی تحریکِ آزادی کے مواد پر رکھی گئی ہے۔

اُلکا۔ اَن میل بیاہ کے عنوان پر معاشرتی حالات کا آئینہ دار ہے۔

مراؤ دیپ۔ میں ہندوستانی بیوہ کے حالات کی مصوّری کی گئی ہے۔ پورا فسانہ۔ شانتی۔ (بیوہ) کے گرد گھومتا ہے۔ جو اپنی روایاتی جذباتی کشمکش کی بے پناہ ہیبوں کو لئے ہوئے ہے۔

"عروجِ افسانہ" میں جذبات کی کشمکش کی انتہا ہے۔ جو انسانی خدمت کے بہترین جذبہ پر جاکر ختم ہوتا ہے۔

"ورشانت کے بادل" - انچل کی پچاس اور چار تازہ نظموں کا مجموعہ ہے۔ ہر نظم، اُپج اور حسنِ بجستگی میں ایک دوسرے سے بڑھ کر ہے۔ اظہارِ جذبات کی برجستگی اور الفاظ کی مرصّع کاری کا کمال، ممتا ورشا گیت کیسے دیپ جلے گا۔ کالی داس۔ تم میٹھا گاتی ہو، وغیرہ نظموں میں دیکھئے۔ ان میں آپ کو شاعرانہ تخیّل کی بلندی اور تازگی ملے گی۔ اِن کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں گرانی اور ثقل نہیں۔

آیئے! انچل کی ذہنی تخلیقات کے اس سرسری جائزہ کے بعد ہم اس کی شاعری پر اچٹتی سی نظر ڈالیں۔

انچل کے ابتدائی کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اُس کے گیت گیت نہیں وقت کی پُکار ہیں۔ اُن میں تلخ پیچخیں ہیں۔ دُکھ بھری ادکسکی آوازیں ہیں۔ مگر چوں کہ رنگِ ساز میں صاحبِ ساز کا لہو رواں نہیں ہے" اس لئے اثر کے لحاظ سے وہ بے حد کمزور ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ طالب علموں کے سامنے کوئی استاد لکچر دے رہا ہے۔

معاشی مشکلات، افلاس، ناداری اور سرمایہ داری کی دُنیا میں وہ ایک انقلاب چاہتا ہے۔ اور اس انقلاب کو وہ عمل کے ذریعہ لانا چاہتا ہے۔

مانگنے اور رونے سے نہ ملتا انقلاب
تو سوئیم[۱] بڑھ کر اُلٹ دے موت کے منہ سے نقاب

چوٹ ڈنکے پر پڑی
اٹھ!
مورچہ پہچان لے!

جس انداز میں 'جرأتِ انقلاب' کو دعوت دی ہے۔ اس میں وہ بے باکی اور جرأت نہیں جو انقلاب لاتا ہے۔

زمین دار کا ظلم ہمارے ادب میں نئی چیز نہیں ہے۔ رومان کی بولن گاہ 'بنگھٹ' پر وہ اس کے ظلم کی تصویریوں کھینچتا ہے۔

۱؎ خود

زمین دار کے ظلم سے تنگ آکر ایک کسان اپنی زمین سے بے دخل ہو کر گھر کی سہانی فضا اور معصوم بچوں کی مسکراہٹ کے سکون بخش ماحول سے دُور تلاشِ معاش میں پردیس چلا گیا ہے۔ اس کی بیوی پنگھٹ پر اُس کی راہ تک رہی ہے۔

دل میں کس کا دیپ جلائے ۔ مونن کھڑی ہے پنگھٹ پہ
سانجھ ہوئی ۔ پنتھ دیکھ رہی ہے کس کا ۔ بھرے درگون کی گگری
کہیں پیٹ کی آگ بجھانے گئے پیا ۔ تنج اس کی نگری
بیتے کتنے ورش آ سے ۔ یوں پنتھ میں اپنی رین بچھائے
اور کھلی آنکھوں میں اس کی اب تو کوئی سوپن نہ آئے
اُس کی بھی آئی تھی ۔ آموں سی پورائی کبھی جوانی
کنتو گئی چُپ چاپ ۔ زمینداروں کے ڈر کی چھوڑ کہانی
ان ظالموں کی یاد نہ پوچھو ۔ جل اٹھتا پڑتی تو دم سہر کر
دبے کنٹھ سے روتی پھوا ۔ بیتی رجنی پہر پہر ۔ ۔ ۔
دل میں کس کا دیپ جلائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

عیش و عشرت کی پناہ گاہ ' حویلی ' کے قریب سے گذرتے ہوئے مزدوروں کی حالت کو جب وہ بیان کرتا ہے۔ تو غربت کے وقار اور سرمایہ داری کے تسکوہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔

روز صبح اس پنتھ سے جاتیں مل کے مزدوروں کی پاتیں
دسے اودھ چلے یوک ۔ ادھر پکے بالکوں کی خاموش جماعتیں
پھر مرکرتی ۔ بھوک کی سوکھی ۔ پھیڑ اسی ۔ ادھر ننگی ناری
رہتے ہی کچھ سمے ۔ ملوں کی جو کرنے لگی تیاری
بھول رہی ہے ۔ پھانسی کے تختے پر شو سی جن کی مسکانیں
اندھی مانو تا جن کی بھاگ سمجھ جو ظلم نہ جانے
آنکھیں پھاڑ نہار رہے ہو ۔ جیسے جگ جگ سے حویلی
ادھر راج پتھ سے کچھ ہٹ کر شون نت سے نہ حویلی

نظم "بڑھتے آتے" میں وہ لکھتا ہے کہ مزدوروں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور اب مذہب کے نام پہ زیادہ دنوں تک اس طبقہ کو فریب نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے ہاتھوں آنے والے انقلاب کے دھارے میں ہر خشک و تر بہہ جائے گا۔

یہ کون کھڑا ہے ؟ سناٹے میں ہند وہت کی آواز لئے
یہ کون کھڑا ہے ؟ دھرم لئے ۔ ننگے پن کی لاج لئے
مذہب مذہب چلا کر روکے گا کون ؟ پرانی شو
کس کی باہوں میں طاقت روک سکے جو طوفانی ویلو

شاعر ایک خواب دیکھتا ہے جس میں موجودہ سماجی نظام سسک سسک کر دم توڑ رہا ہے۔ ظلم و تشدد اور موت کے اندھیارے پر عیش و عشرت اور زندگی کی روشنی غالب آرہی ہے

کوی کے اس "سوپن" کی ابتدائی پنکتیاں ملاحظہ کیجئے۔

بھوک میں پڑا ہپری دار
بند کئے گھر کا لڑکھڑاتا دوار
سوچتا ہے کوئی ہی
ہوگی جیون کی ۔ جاگرت کی وجے
اس مرتیو پہ

ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ کرن سیلا کا انقلابی شاعر لال چند کے آنچل میں بھی حسن و محبت کے نغمے گاتا ہے۔ زلف و رخسار کی باتیں کرتا ہے کہتا ہے

چاندنی میں آج کیول چاند کی باتیں کرو

تصور کو زحمت دیجئے کہ اس منظر کو نگاہوں کے سامنے پیش کیجئے جب "پریم کی مدھو جھیل کی تٹ" پر دو چاہنے والے ایک جا ہوں ۔ اور جب عاشق کی فراق زدہ زندگی کی تلخیاں قربتِ محبوب کے سکون میں گم ہو رہی ہوں ۔ !
اور کتنی حسین ہے اُن پیار بھری آنکھوں کی درخواست جو دیدِ یار کی تمنائیں واہیں ۔

ٹھہر جاؤ گھڑی بھر اور تم کو دیکھ لیں آنکھیں

---

۱ خاموش ۲ راہ ۳ آنکھوں ۴ چھوٹے
۵ رات ۶ آموں کی مانند گدرائی ہوئی ۷ رواں
۸ رات ۹ نیم سوختہ جوان ۱۰ زنجیر لڑکے ۱۱ لاش
۱۲ مسکراہٹ ۱۳ انسانیت ۱۴ دیکھنا ۱۵ شاہراہ ۔

۱ پرانی لاش ۲ انقلاب ۳ سطریں ۴ خاندانی میت
۵ دروازہ ۶ بیداری ۷ فتح ۸ موت

تمھارے روپ کا ست آورن[1] کتنا مجھے شیتل[2]
تمھاری چیتونوں کی چھاؤں میری آتما اُجول[3]
اُلجھنیں پھڑ پھڑاتیں۔ پران پنچھی کی تری آنکھیں
ٹھہر جاؤ! گھڑی بھر اور تم کو دیکھ لیں آنکھیں

یہ روشن اندھیرے[4] بار بار نہیں آتے۔ اس لئے وہ معشوق سے درخواست کرتا ہے کہ

"ٹھہر جاؤ! گھڑی بھر!!!"

تاکہ اس کی روح اس کے حسین روپ سے سرشار اور شیریں آواز سے مست اور "بے پناہ" مژگاں کی چھاؤں میں قرار یاب ہو سکے۔ کتنی حسین تمنّا ہے۔!

انچل کے کلام میں محاکات کی دل کشی بھی ہے۔ جب وہ منظر کشی کرتا ہے تو واقعات کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے۔

ذیل کے بند میں معشوق سے مخاطب ہے۔ کہ جب مشرقی اُفق سے نور کی بارش ہو رہی ہو اور تیری مست گلابی آنکھیں کسی حسین خواب کی تمنّا میں نرگس کی مانند بار بار کھل رہی ہوں۔ بند ہو رہی ہوں۔ اور جب تیرا نازک جسم چمپئی رنگ کی ساری میں "فردوسِ نظر" ہو تو اُس وقت تجھے اس ستم نصیب کی یاد آتی ہے؟

پَو پھٹے اُسکماربوں پر شبنم سویدھ کن[6]۔ ایک تمھارا
دور دھڑکتا۔ نبھ میں جیسے پربھات دیپ[7] کا تارا
جب رنگین مدھر سپنوں کی سدھ میں چنچل مست انکھڑیاں
کھل کھل بند ہوئی جاتی ہوں جیسے نرگس کی پنکھڑیاں
اور شتھل[8] لیٹی ہوگی پہنے چمپئی رنگ کی ساری
جب اشوک کی ٹہنیوں سے نازک یہ انگ کماری[9]

دیکھ رہے سپنوں کا درپن[10]۔ پاٹل کی منہ بند کلی
تب اپنے ہمدم کو کیا تم پل بھر کو بھی یاد کرو گے

اس بند میں دیکھئے۔ عاشق کے جذبات شاعر کی زبانی کن کن شکلوں کو اختیار کرنے کے لئے بے تاب ہیں ؎

میرا بس چلتا۔ میں بن جاتا
جب تم ٹک[11] لجاتیں[12]۔ بنتا میں گالوں کی لالی
تر دسم[13] تن میں۔ بنتا میں پلکوں کی گھنجالی
میں نہ چھلکنے دیتا۔ مسکانوں کی گوری پیالی
میرا بس چلتا۔ میں بن جاتا
اُن بیدھے[14] موتی کی کچل تا پش[15] بھر بھر دیتا
کھس کھس پڑتے سنقل چیر کو مسک پکڑ لیتا
میں گت چنچل۔ منجیروں اُدھک[16] بجنے دیتا
میرا بس چلتا.......

محبت کی دنیا کے اس راز کی کہ
"کب کیسے من جاتا ہے؟ آنکھوں سے ملنے سے پہلے"
کب کیسے.........
جو آج لگتا بہت باہر وہ پیاؤں[17] تک چھا جاتا ہے
جو دکھتا آج بہت اوپر وہ تن من کو نہلاتا ہے
تہسا[18] جیون کی رُتیو بدلی۔ رس کر نیدھنتا[19] شرمائی
پھر ماٹے پنتھی کی سندھیا[20] پھر سپنوں کے من میں آئی

. . . .

"کب گندھ پون سے آتا ہے۔ کلیکا کے کھلنے کے پہلے"
وہ چاند بہت بڑا اُگا۔ چٹ گیا گگن[21] کا اندھیارا
ہے جگ جگ تاروں کی گھاٹی شیلون پہ چھایا اُجیارا
پر من کی ریت نرالی ہے۔ آکاش انوکھا جیون کا

---

[1] نقاب [2] ٹھنڈا [3] روشن
[4] کہاں پھر یہ قسمت میں روشن اندھیرے
اِدھر آؤ اک بار پھر پیار کر لیں
[5] نرم [6] پو پھٹنے پر پسینہ میں ڈوبا ہوا۔
[7] صبح کا چراغ [8] ڈھیلے
[9] نازک بدن۔

[10] آئینہ [11] ذرا [12] شرماتیں [13] گہرنا صفت
[14] تاب [15] روح [16] رفتار [17] ریت
[18] مفلسی [19] شام [20] آسمان۔

بن دیکھے ۔ بن جانے بھی ۔ سب سنتاپ بجھا جاتا تن کا

ورشا نت کے بادل کے بھی کچھ حصے ملاحظہ کیجئے :۔

فطرت کے تمام مظاہر موسمِ گرما کی شدّت سے تنگ آکر آسمان کی سمت نظریں جمائے ہوئے بادلوں سے سکون بخش رم جھم کے منتظر ہیں۔

ہے یہ کیسی بان تمھاری ترساتے جگ کو
پُروا کی تھپکی دے دے کر برماتے جگ کو
من کی بوندوں سے کب تک جیون کو ترپتی[1] ملے
کب تک جلتی بالو پہ پون کا پھول کھِلے
تم برسو جلتی دھرتی کا تن شیتل[2] ہو جائے
تم برسو اُتری تمدکان کا من مہری گھومے
او نبھ میں منڈلاتے بادل

شاعر کی اس تمنّا کو بھی دیکھئے ۔

دُنیا بدلے ۔ تم نہ بدلنا ۔ تم ایسے ہی رہنا
نولڑ کا لیتا ہیچھے مجھے تم گت کی راہ دکھانا
اندھیاری جیون رجنی[3] میں تم دیپک بن جانا
تھکے اُچٹتے ٹوٹے من میں سپنے نئے سجانا
دے دینا وشواش کو ٹوٹے سپنوں کا ہر جانا
دُنیا بھولے ۔ تم نہ بھلانا ۔ سب دن اپنا کہنا

مختصر یہ کہ اس فطری شاعری کے کلام کے مطالعہ سے ہم یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ اُس کی نظموں کے تصوّرات دائمی قدر کے مالک ہیں اور ہمیں اُمید ہے کہ وہ ہندی شعر و سخن کی دنیا میں اپنا ایک مقام پیدا کرے گا۔

---

[1] تسلّی [2] ٹھنڈی [3] تاریکی [4] رات

صابر اکبرآبادی

غزل

دنیا ہے ایک خوابِ پریشاں ترے بغیر
ہیں مرگ و زیست دست و گریباں ترے بغیر

کیا یہ بھی زندگی ہے نہ خوش ہوں نہ غمزدہ
گریاں ترے بغیر نہ خنداں ترے بغیر

پھیکی سی وہ بہار کے چہرے پہ تازگی
اُڑتا ہوا سا رنگِ گلستاں ترے بغیر

کتنی طویل ہو گئی دو دن کی زندگی
زنجیر بن گئی ہے رگِ جاں ترے بغیر

طوفانِ رنگ و بو ہو گلستاں کو کیا کریں
کس کو ہے اعتبارِ بہاراں ترے بغیر

شمس و قمر کے چہروں سے نور اُڑ گیا تمام
دونوں ہیں داغِ دامنِ امکاں ترے بغیر

آنکھیں سیاہ پوش نگاہیں اُداس اُداس
کانٹوں کا ڈھیر ہے چمنستاں ترے بغیر

جیسے خزاں نے لوٹ لیا ہو کوئی چمن
یوں ساری کائنات ہے ویراں ترے بغیر

نظریں لگی ہیں میری طرف کائنات کی
سودردِ غم ہیں سلسلہ جنباں ترے بغیر

عنوانِ صد ہزار قیامت ہے ہر نفس
کیا بڑھ چلی ہے تلخیٔ دوراں ترے بغیر

صابر نے کرکے کوششِ بے سود دیکھ لی
دل مانتا نہیں کسی عنواں ترے بغیر

غلام ربّانی تاباں

غزل

ترے قریب ترے آستاں سے دور رہے

وہیں خیال رہا ہم جہاں سے دور رہے

کسے یہ فکر کہ انجامِ عشق کیا ہوگا

کسے یہ ہوش کہ راہِ زیاں سے دور رہے

قریب آئے تو خود جانِ اعتبار بھی تھے

وہی جو مدتوں وہم و گماں سے دور رہے

وہ حرفِ شوق جو تمہیدِ آرزو ٹھہرے

خدا کرے کہ میری داستاں سے دور رہے

یہ میکدہ ہے یہاں مہر و ماہ پلتے ہیں

کہو کہ خیمۂ ظلمت یہاں سے دور رہے

وہ ہمسفر بھی نہایت عزیز تھے تاباںؔ

چلے جو ساتھ مگر کارواں سے دور رہے

عمیق حنفی

گیت

غزل شاعری کے علاوہ موسیقی کی صنعت بھی قرار دی جاتی ہے۔ زیر نظر غزل میں جوگیا کی کیفیات اور غزل میں خالص ہندستانی فضا پیدا کرنے کی ایک کوشش کی گئی ہے
ہندی شاعری میں گیت دو طرح کے ہوتے ہیں (۱) خالص ادبی اور (۲) غنائیہ یعنی جنھیں گایا جا سکے۔ اگر غزل کی ایسی ہی دو قسمیں کردی جائیں تو زیر نظر غزل قسم دوم میں شمار ہوگی۔ (عمیق حنفی)

یاد آتے ہو تو من میں ہوک اٹھتی ہے پیا

جیسے سارنگی پہ کوئی چھیڑتا ہو جوگیا

اپنے آنگن میں کوئی سکھ ہے نہ جنگل میں سکوں

اے گھنی زلفوں کی ٹھنڈی چھاؤں تو نے کیا کیا

پھول رُت میں اچھے اچھوں کے گریباں چاک ہیں

پھول کا دامن سیا بھی تو کسی نے کیا سیا

بیل منڈھے سے لپٹ جاتی ہے جس انداز سے

یوں کسی کی یاد نے دل کو مرے لپٹا لیا

رات بھر گہری نراشا کے تھپیڑے جھیل کر

بجھ گیا آخر سویرے آس کا ننھا دیا

چھیڑ دے کوئی کہانی، گیت کا چُپ توڑ دے

ٹکڑے ٹکڑے ہو نہ جائے درد سے بوجھل جیا

سرلا دیوی۔

خودکشی

رات بھر بڑی گرمی رہی تھی۔ آسمان میں چاروں طرف دھول چڑھی ہوئی تھی لیکن ہوا کا ایک جھونکا بھی کہیں سے نہیں آ رہا تھا۔ کانتا کی طبیعت ان دنوں کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ رات بھر وہ ایک جھپکی بھی نہیں لے پائی تھی۔ کبھی وہ چارپائی پر بیٹھ جاتی کبھی پھر لیٹ جاتی۔ کبھی اُٹھ کر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگتی۔ ایک آدھ بار اُس نے کمرے میں جاکر پنکھے کے نیچے سو جانے کی کوشش کی پر وہ ہوا اُس گھٹن سے بھی بُری لگی اور کانتا پھر باہر نکل آئی۔ صراحی میں سے پانی لے کر پیا۔ کچھ ٹھنڈا تھا، جان میں جان آئی دو تین گلاس اور لئے، اور اپنے پیروں پر لٹائے۔ بچّوں کو دیکھا سب آرام سے سو رہے تھے۔ شوہر کی طرف دیکھا تو وہ بھی آرام سے خرّاٹے لے رہا تھا۔ کانتا پھر لیٹ گئی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ پر نیند تو شاید پر لگا کر کہیں اڑ گئی تھی۔ لیٹی لیٹی وہ آکاش کی طرف تکنے لگی دھول نے چاند کے خوبصورت چہرے کو مٹیالا اور گبرا گبرا سا کر دیا تھا۔ تارے تو دکھائی نہیں پڑتے تھے۔ کہیں کہیں ایک آدھ کوئی نظر بھی آجاتا تھا۔ کانتا کے فکرمند چہرے سے یہ صاف جھلکتا تھا۔ کہ اُسے کوئی ایسی پریشانی ہے جس کو دُور کرنے کا علاج اُس کے پاس نہیں ہے۔ لیٹے لیٹے گردن پھیر کر اُس نے پھر دیکھا، ابھی اُس کا شوہر بے فکر چین سے سو رہا تھا۔ اتنے میں چھوٹا بچہ اٹھا اور اُس نے پانی مانگا۔ کانتا پھر اُٹھی اور بچے کو پانی پلا کر سُلا دیا۔ کانتا سوچ رہی تھی کہ گرمی کی وجہ سے صرف اُسی کو نیند کیوں نہیں آتی۔ یہ سب کیا ہے؟ میرے لئے ہی دُنیا سے سارا چین، سکون کیوں اڑ گیا ہے؟ یہ میرا شوہر ہے، ہمیشہ کا مہمان، میں کچھ بھی کر دوں اِسے اُس سے سروکار نہیں۔ ایسے ناشتہ میں اگر یہ چاہیئے تو کھانے میں وہ۔ اس نے میرے ساتھ بیاہ کیا تھا۔ میری دیکھ ریکھ کا بھار اپنے اوپر لیا تھا۔ میری بانہہ پکڑ کر ساری عمر ساتھ نبھانے کی قسم کھائی تھی پر یہاں تو سب اُلٹ کر میرے ہی کندھوں پر آپڑا ہے۔ اِسی میں بس ہو جائے تو بھی غنیمت ہے۔ ہر بات میں دخل اندازی اور قدم قدم پر رکاوٹ ڈالی جاتی ہے میں جسے بیٹھنے کا کمرہ بنا دوں۔ میلے کپڑے وہیں پر ڈالے جاتے ہیں۔ ریڈیو سونے والے کمرے میں رکھنا چاہوں تو وہ ضرور باہر کے کمرے میں آئے گا۔ اِدھر میری صحت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ دن پر دن میرا مزاج چڑچڑا ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں کیا ہوگا یہ گھر کیسے چلے گا۔ ان بچوں کا کیا بنے گا۔ یہ سب سوچتے سوچتے کانتا کی پلکیں بھاری ہو گئیں اور وہ سو گئی۔

کانتا کسی دفتر میں کام کرتی تھی۔ تھوڑی تنخواہ اور گھر کا سارا خرچ۔ اُس پر آئے دن مہمانوں کا جمگھٹ، آنے والے کہتے کہ ہماری خاطر نہیں ہوتی۔ ہمیں کون سے چاولڈ پکا پکا کر کوئی دیتا ہے اور اُدھر سادی روٹی اور چائے پانی میں ہی کانتا کا ناک میں دم آچکا تھا۔ اُس کا شوہر مہینے میں دس دن کے لئے باہر جاتا تھا اور بیس دن گھر آکر بات بات میں خواہ مخواہ کی بحث کرتا۔ کانتا کے شام کو گھر پہنچنے تک روز کوئی نہ کوئی لڑائی کا نیا سلسلہ تیار رہتا اور وہ بے چاری تھکی ماندی برداشت نہ کر سکنے پر تلملا اٹھتی یہ روز کی جھک جھک ہر بات کی ذمہ داری اور فکر اُس کی صحت کو خراب کئے جا رہی تھی۔ کانتا صبح اُٹھتی گھر کا کام ختم کر کے دفتر چلی جاتی۔ اور شام کو آکر پھر چولہا جھونکتی بڑی لڑکی میرا اُس کی کافی مدد کرتی تھی۔ کوئی آدھ گھنٹہ کانتا سوئی ہوگی کہ شوہر صاحب کی آنکھ کھلی اور اُٹھتے ہی انھوں نے پکارا:۔

"کانتا او کانتا۔"

کانتا سوتی رہی۔ اُس نے سُنا یا نہیں سُنا۔ یہ تو وہی جانے پر اُس نے جواب کچھ نہیں دیا۔

"سُنتی ہو میں کہہ رہا ہوں۔ دوپہر ہونے کو آئی ابھی تک رانی صاحبہ نیند

مزے لوٹ رہی ہیں۔ آج کیا فاقہ کرنا ہوگا ؟"

"کیا شور مچا رکھا ہے۔ صبح ہی صبح، دن تو ابھی نکلا نہیں۔ دوپہر کہاں سے ہوگئی مجھے نیند آرہی ہے۔ تنگ مت کرو۔"

"مجھے جلدی جانا ہے آج، جلدی سے آؤ کے پرانٹھے بنا دو۔"

"کہاں جانا ہے تمھیں؟ روز ہی کہہ دیتے ہو اور ناشتہ کر کے پھر پڑے رہتے ہو۔"

"کہیں بھی جانا ہو تمھیں اس سے کیا؟"

"مجھے نہیں تو اور پڑوسیوں کو غرض ہوگی؟ خود تو ساری رات سوتے رہتے میری ابھی ابھی آنکھ لگی تو دیکھ کر اتنا نہیں برداشت کر سکے کہ میں بھی دو لمحے آرام کروں۔ میری نیند کے تو تم شروع ہی سے دشمن ہو۔"

"ارے صبح جاگنا صحت کے لئے بڑا اچھا ہوتا ہے میں تو تمھارے بھلے کی کہہ رہا ہوں۔"

"میں اپنے بھلے اور بُرے کی ذمہ دار خود ہوں تم رہنے دیا کرو۔ مجھے اور میری صحت کو ہر وقت تنگ کرتے رہتے ہو اور چلے ہو اپنی باتوں سے ہمدردی کھانے۔"

"تم مجھ سے تنگ آگئی ہو تو مجھے چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟ تمھیں میری ہمدردی کی ضرورت ہی کہاں ہے۔ بڑے بڑے آدمیوں سے باتیں کرکے تم خوش ہوتی ہو۔ انھیں سے ملنا جلنا چاہتی ہو۔ ان کے سامنے جا کر میری بدنامی کرتی رہتی ہو۔"

"جیسے کوئی کام نہیں ہوتا تمھاری بدنامی کرنے کے سوائے دنیا میں۔ چھوڑو سونے دو مجھے۔ اب تو کل سے نوکر بھی مل گیا ہے۔ اُس کو کہہ دو بنا دے گا تمھیں جو کچھ کھانا ہو۔"

کانتا پھر کروٹ سے کر پڑی رہی۔ پتی دیو اُٹھے اور نیرا کو جگانے لگے۔

"اٹھو بیٹیا، تم تو بڑی اچھی رانی بٹیا ہو، چلو جا کر ذرا آٹا گوندھنے کے لئے نکال دو۔"

"کیا ہے پاپا جی؟"

"بیٹی اٹھو نا۔ اب تو تمھیں ہی اٹھ کر سب دیکھنا پڑے گا۔ تمھاری ممی تو جیسے ہوئیں جیسے نہ ہوئیں۔"

"کیا ہوا ہے پاپا جی۔" نیرا آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی۔

"یہ جو تیری ماں ہے نہ، اس کو کسی کی کیا پروا ہے بھلا؟ دن بھر غائب رہتی ہے۔ دوپہر تک سوتی رہتی ہے۔ اور پھر نہا کر جلدی جلدی چلی جاتی ہے۔ میں تو تنگ آگیا ہوں اس سے۔"

نیرا نے اُٹھ کر کانتا کی طرف دیکھا پھر کہنے لگی۔ "پاپا جی، ممی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کل شام بھی زور سے سر میں درد ہو رہا تھا۔ ممی تم آرام کرو۔ میں اُسے چیزیں دے آتی ہوں۔" اتنا کہہ کر گیارہ سال کی بچی نیرا نے رسوئی گھر میں قدم رکھا۔ اسٹور کھولا۔ چیزیں نکالیں اور نوکر کو سب بتا کر واپس آگئی۔ چھوٹا بچہ اٹھا تو اُسے بھی لے گئی اور اُس کا منہ ہاتھ دُھلا کر لے آئی اور کہنے لگی۔

"پاپا جی آج ہم خربوزے کھائیں گے۔ آپ ہمیں ابھی لا دیجئے۔ وہ سامنے ہی تو دوکان ہے۔"

"اچھا بٹیا ٹھہرو میں لے کر ابھی آتا ہوں۔ تب تک شاید تمھاری ماں کا مزاج بھی درست ہو جائے۔"

کانتا کہنے لگی، "نیرا بیٹی جاؤ ذرا بھیّا کے لئے دودھ لا دو۔ میں اُسے پلا دوں گی۔"

"اچھا ممی جاتی ہوں۔ پر آج کیا بات ہوگئی صبح ہی صبح؟"

"کچھ نہیں بیٹی، مجھے رات بھر نیند نہیں آئی ابھی ابھی سو گئی تھی ذرا سا۔ تو تیرے پاپا ناراض ہونے لگے۔"

نیرا دودھ لینے چلی گئی۔ واپس آئی تو کہنے لگی۔ "پتہ نہیں، پاپا جی ہر وقت آپ کو کیوں تنگ کرتے رہتے ہیں۔"

کانتا نے بچّے کو دودھ پلایا اور اس سے باتیں کرنے لگی۔ اتنے میں اُس کا شوہر خربوزے لے کر آپہنچا۔ آتے ہی کہنے لگا۔ "دیکھو کیسے بڑھیا خربوزے لایا ہوں۔ میں نے کہا ہماری میم صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ چلو انھیں خوش کرنے کے لئے اتنے ہی سو پیسے خرچ ہی کر دو۔ اور تم ہو کہ تمھیں ہمارا ذرا بھی خیال نہیں آتا۔"

کانتا نے آنکھ اٹھا کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور بنا کچھ کہے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔

"نہ میری عزّت نہ میری لائی ہوئی چیز کی قدر۔ ٹہلنا شروع کر دیا۔ یہاں تیرے باپ کا بنایا ہوا باغیچہ ہے کیا؟ شکل مزدوروں کی اور دماغ پریوں کا۔"

"اب چُپ بھی ہو جاؤ گے کہ جھگڑا بڑھا کر ہی رہو گے۔"

"یہ جھگڑا میں بڑھا رہا ہوں یا تم؟"

"اچھا میں ہی قصوروار سہی، بس اب تو چھوڑو۔ کیا صبح اٹھتے ہی کوئی نہ کوئی بات شروع کر دیتے ہو۔"

"پھر وہی بات میں شروع کر دیتا ہوں؟"

اور اسی طرح کی باتیں وہ کرتا رہا پر کانتا نے ایک چپ ہی پکڑ لی۔ وہ اور بھی تلملا کر کہنے لگا۔

"میرے ساتھ بات کرنا اس کے شایان شان نہیں۔ ابھی کوئی اور آ جائے باہر سے تو ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے گی۔ بُرا تو میں ہی لگتا ہوں اسے۔ مجھے پتہ ہوتا کہ تم اس طرح بدل جاؤ گی تو کبھی نوکری نہ کرنے دیتا۔"

"میں کیا بدل گئی ہوں بھلا؟"

"تم، تم میں تو زمین آسمان کا فرق آ گیا ہے۔"

"تو نوکری میں آج چھوڑے دیتی ہوں۔ میں تو چاہتی یہ ہوں کہ تم اپنی ذمہ داری خود سنبھالو۔"

"تو اب تم نے سنبھال ہی رکھی ہے کیا؟ سب کچھ تمھیں کرتی ہو؟ میں بالکل ہی نکما ہوں، یہی نہ۔"

"یہ مجھ سے کیا پوچھتے ہو دُنیا سے پوچھو۔"

"یہ ہوتی ہے عورت کی ذات، چار پیسے کمانے لگی تو سر پر چڑھ جاتی ہے۔ میں ہی بے وقوف نکلا جو تمھیں اتنی آزادی دے دی۔"

"کیا آزادی دے دی ہے مجھے تم نے؟ دفتر جانے کی؟ اپنی غرض سے بھیجتے ہو۔ نہ بھیجو، بند کراؤ مزدوری، مجھے اپنے گھر اور بچے چھوڑ کر در در کی ٹھوکریں کھانے اور طرح طرح کی باتیں سننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ مجھے آرام سے گھر بیٹھنا نصیب ہو تو رونا کس بات کا۔"

"یہ میرا ہی حوصلہ ہے جو تمھیں اکیلے اِدھر اُدھر جانے دیتا ہوں۔"

"جو ایسی فکر ہے تو رکھوالی کیوں نہیں کرتے میری؟"

"میں تمھارا پتی ہوں، چوکیدار تو نہیں۔"

"پتی ہو تو پتی بن کر رہو، نکلو میدان میں جس دن کچھ کر کے دکھاؤ گے میرا سر تمھارے قدموں پر اپنے آپ جھک جائے گا۔ سارا دن عورتوں کی طرح گھر میں چوڑیاں پہنے پڑے رہتے ہو۔"

"میں کہتا ہوں کانتا، میں تیری زبان کھینچ لوں گا۔"

"اوہو، زبان کھینچ لو گے؟ دیکھوں تو کیسے؟ سچی بات تو سب ہی کو کڑوی لگتی ہے۔"

"میں تیری کمائی تو نہیں کھاتا جو تو مجھ پر رعب گانٹھتی ہے۔ عورت کی بساط ہی کیا ہے۔ ایک پاؤں کی جوتی اور اُس پر یہ نخرے۔"

"جوتی بھی کاٹنے لگے تو بُری طرح سے کاٹتی ہے۔ تم میں ہے کیا، بڑھ چڑھ کر جو مجھے پاؤں کی جوتی بناتے ہو۔"

"شروع سے ہی چلا آتا ہے۔ عورت مرد کی باندی ہوتی ہے اور پتی اُس کے لئے بھگوان کا روپ ہوتا ہے۔"

"مرد پتی بن کر عورت کو ذلیل کرتا ہے اور بھگوان کے ساتھ برابری کرکے بھگوان کو۔"

"میں کہتا ہوں تو چپ بھی رہے گی یا نہیں؟"

"کب تک چپ رہوں میں؟ کیسے رہوں؟ کب تک زبان ہونٹوں سے دُور رکھوں؟ برسوں سے سب کچھ دیکھ رہی ہوں، اُٹھ رہی ہوں۔ سہہ رہی ہوں آخر میں بھی سوچ سکتی ہوں کہ فرض کیا ہے اور حق کیا ہے۔ پر یہاں اس گھر میں جتنا فرض ہے وہ سب میرا اور جتنا حق ہے وہ سب تمھارا۔ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟"

"کیوں کیا نہیں کرتا ہوں میں؟ چار دن مہمان کی طرح میں تمھارے پاس آ جاتا ہوں تو تم میرے ساتھ یہ سلوک کرتی ہو۔"

"باز آئی ایسے مہمانوں سے جو کھائیں بھی اور احسان بھی رکھیں۔"

"غریب آدمی کی کہیں عزّت نہیں ہوتی۔ عورت پیسے ہی کی دوست ہوتی ہے۔"

"ہوتی ہو گی لیکن میں تمھارے ساتھ رہ کر بھی ابھی اتنی نیچے نہیں گر گئی ہوں۔"

"تمھارا دماغ ساتویں آسمان پر چڑھ گیا ہے۔"

پر میں نے تمھارا پیسہ دیکھا ہی کب تھا؟ آج کی بات چھوڑو جب سے شادی ہوئی بتاؤ تم نے کب میرے لئے کچھ کیا، کھانا ملتا رہا ہے میں مانتی ہوں۔ پر وہ تو ایک کُتے کو بھی دیا جاتا ہے جو گھر کے ایک کونے میں پڑا رہتا ہے اور میں تو اپنی ہمت سے بڑھ کر گھر کا کام کاج کرتی رہی۔ جب تمھارے پاس کچھ ہوتا ہے تو تمھارے اپنے رشتہ ناتے والے دوست کافی ہوتے ہیں۔ اُس وقت تمھیں میری کیا پروا ہوتی ہے۔ تمھارے راج میں تو ترس ترس کر ہی دن کاٹتی رہی۔ مجھے کچھ بھول تو نہیں گیا ہے۔"

"ہاں ہاں یہ کہو کہ تم دانہ دانہ کو ترستی رہیں۔ کھانا تمھارے لئے تمھارے ماں باپ کے گھر سے آتا تھا۔ بلکہ یہ کہو کہ ہم سب اُن کا دیا ساری عمر کھاتے رہے۔ چار دن کے لئے آ جاتا ہوں۔ تو یہ عورت میری جان کھا جاتی ہے۔ تیرا لاڈ میرا پیگ میں نہیں رہوں گا یہاں۔"

"ہاں یہ ایک نیا تماشا شروع کر رکھا ہے۔ ذرا سی بات ہوئی اور بوریا بستر اٹھا بھاگنے کی سوچی۔ جیسے یہاں رہنا بھی ہمارے اوپر احسان ہے۔"

یہ سُن کر کانتا کا شوہر ٹپک ٹپک کر سامان جمع کرنے لگا۔ یہ سب دیکھ کر وہ گھبرا کر رونے لگی۔

" ہائے پاپا جی۔ نا جاؤ، پاپا جی نہ جاؤ۔ "

" چُپ رہو تم، اب میں یہاں نہیں ٹھہروں گا۔ کبھی اس گھر میں پاؤں نہیں رکھوں گا۔"

" ہاں تو کیا "؟ کانتا کہنے لگی "کہاں جا رہے ہو تم۔ ذرا میں بھی سُنوں۔"

" جا رہا ہوں جہاں نصیب لے جائے۔ تم کون ہوتی ہو پوچھنے والی؟ "

" میں پوچھنے والی کوئی نہیں یہ میں مانتی ہوں، پر میں پھر تمہارے بچوں کو پالنے والی بھی کوئی نہیں سُن لینا جانا ہے تو ان سب کو لے جاؤ۔ میں تو جا رہی ہوں اپنی ماں کے پاس۔ بھاڑ میں جائے سب کچھ۔ مجھے کیا غرض پڑی ہے۔ صبح سے شام تک ٹھوکریں کھاتی پھروں اور گھر آکر یہ سب برداشت کروں۔ جہاں محنت کروں گی روٹی کپڑا مل جائے گا۔"

" کیا؟ تم اپنی ماں کے پاس چلی جاؤ گی؟ "

" ہاں ہاں کیوں نہیں۔ پندرہ بار انھوں نے بُلایا ہے۔"

" کب جاؤ گی؟ "

" میں آج ہی چلی جاؤں گی۔ ابھی چلی جاؤں گی۔ میں تنگ آگئی ہوں۔ میں تھک گئی ہوں تمہارے دروازے پر تو میں کام کرتے کرتے مر جاؤں گی، پر تمہارے منہ سے دو میٹھی باتیں کبھی سننے کو نہیں ملیں گی۔ ماں کو بُلی دُکھ سُکھ کا ساتھی تو ہوگا۔"

" اچھا تو تم اپنی ماں کے پاس چلی جاؤ گی؟ "

یہ کہہ کر کانتا کا پتی کمرے میں گیا اور سائیکل لے کر باہر آگیا کہنے لگا۔

" تم تو جب جاؤ گی، جاؤ گی، لیکن میں جا رہا ہوں اور کبھی لوٹ کر نہیں آؤں گا۔"

یہ سُن کر نیرا اندر زور سے رونے لگی۔

" لے کانتا میں جا رہا ہوں۔ اب تو تُو خوش ہے نا۔ میں نے ساری عمر تیرے لئے کچھ نہیں کیا تو تیرے لئے جیسے تھا ویسے نہ ہوا۔ اب اس گھر میں میں کبھی پاؤں نہیں رکھوں گا۔ ریل کے نیچے آکر مر جاؤں گا، پھر تو منا لینا رنگ رلیاں، کر لینا شادی جس سے تیرا جی چاہے۔"

" میں کہتی ہوں تم چپ ہوگے یا نہیں۔ شرم نہیں آتی ایسی دیوانگی کی باتیں اپنے منہ سے نکالتے ہوئے۔"

" اور تم تو میری بڑی عزت کر رہی ہو نوکروں اور بچوں کے سامنے، لعنت ہے ایسی زندگی پر۔ ایسی زندگی سے تو موت بھلی۔"

یہ کہہ کر وہ سائیکل پر سوار ہوا اور چل دیا۔

" ممی! ممی پاپا جی کہاں گئے؟ کیوں چلے گئے؟ ممی! ممی" اور نیرا بلک بلک کر رونے لگی۔

" چپ رہو نیرا! کوئی جاتا ہے تو جائے میں کیا کروں؟ کوئی بچہ ہو تو اُسے سمجھائے یا روکے پر جو جانے پر ہی تُل جائے اُسے کون روک سکتا ہے۔"

" ممی اٹھو تم پاپا کو بلا لاؤ۔"

" میں کیوں بُلانے جاؤں ہر لڑک پر تماشا دکھانا ہے لوگوں کو مجھے؟ وہ تو دس دن کے بعد چلے جائیں گے پر میں کیا منہ لے کر لوگوں کے سامنے گھر سے باہر نکلوں گی" اور کانتا لیٹ گئی۔ لیٹی لیٹی بڑبڑاتی رہی "میں کیا کر سکتی ہوں یہاں۔ بھگوان جانے اس گھر کا کیا حشر ہوگا۔ اوہ میں تو تھک چکی ہوں۔ ہار مان چکی ہوں۔ اس مرد نے کبھی مجھے اپنا نہیں سمجھا۔ کبھی اپنے برابر کی ساتھی نہیں سمجھا۔ میں ہار گئی ہوں۔ میں ختم ہو چکی ہوں اُف"

" ممی اٹھو نا۔ کیوں روئے جا رہی ہو۔ پھر سر دُکھنے لگے گا۔"

" تم جاؤ بیٹی کھیلو۔" نیرا ایک طرف ہٹ گئی۔ پھر آہستہ آہستہ کہنے لگی یہی بیاہ ہوتا ہے۔ میں کبھی بیاہ نہیں کروں گی کبھی نہیں۔ میں اکیلی رہوں گی اور کبھی کسی کو اپنے گھر میں آکر نہیں رہنے دوں گی۔"

اتنے میں بچہ آیا۔ " ممی ہم بھی کھُو جا کھائیں گے۔ ممی ہمیں کھُو جا منگا دو۔ ہمیں جلدی کھُو جا دو۔" کانتا نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کا بھولا بھالا چہرہ اُس پر خربوزے کی فرمائش۔ کانتا اٹھی، چھُری اور پلیٹ لی اور خربوزے کاٹنے لگی۔

" ممی تم بھی کھاؤ۔ بڑا میٹھا ہے۔"

" نہیں بیٹا تم ہی کھاؤ۔ دیدی کو دو۔"

نیرا بولی " ممی تم بھی کھاؤ نہیں تو ہم بھی نہیں کھائیں گے۔"

" نہیں بیٹی تم کھاؤ میرا ابھی کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔"

بچے نے کٹی ہوئی پھانک لی اور کانتا کے منہ میں ٹھونس دی۔ کانتا نے بچوں کو دیا خود بھی کھایا اور باقی کاٹ کر نیرا سے کہنے لگی " لو نیرا یہ پاپا کے لئے رکھ دو۔"

" ممی پاپا جی تو گئے۔"

کانتا کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اُس کا شوہر آیا اور ایک طرف سائیکل رکھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

" پاپا جی لو خربوزہ کھا لو۔"

" نہیں مجھے نہیں چاہیئے۔"

" پاپا جی اب کھا بھی لو نا۔"

" کانتا میں سچ کہتا ہوں کہ ریل نہیں آئی، نہیں تو . . . . . "

کانتا نے چھُری خربوزوں پر پٹکی اور تیزی سے کپڑے جھاڑتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

گھنشیام سیٹھی

لدر کی گھاٹی میں : کولائی تک

۱۲ مئی

تم کیٹس تو بھاگتے دوڑتے بس اسٹینڈ پر پہنچا۔ گاڑی کا وقت ہو گیا تھا، مسافر بیٹھ چکے تھے۔ قیوم میری جگہ روکے بس کے پاس کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ سامان چھت پر رکھ دیا گیا تو بس چل پڑی۔ تھوڑی دیر میں ہی ہم شہر سے دور نکل گئے۔ جہاں دور دور تک، فلک بوس کوہساروں کے سرسبز دامنوں کو چومتی ہوئی وادی میں کوسوں تک پھیلے ہوئے سرسوں اور دھان کے ہرے بھرے کھیتوں کا دل کش اور دل فریب منظر میرے سامنے تھا۔ سڑک کے دونوں کناروں پر میلوں تک پھیلی ہوئی سفیدوں کی قطاریں تھیں اور درمیان میں کہیں کہیں چنار کے شاندار درخت باہیں پھیلائے کھڑے تھے۔ چنار کے یہ درخت کشمیر کے ایوانِ بہار کے سبز مینار ہیں۔ جن کے پتے پتے پر خدائے عز و جل کا نام لکھا ہوا ہے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ بل کھاتا ہوا اور اپنی ہی اٹکھیلیوں میں مست دریائے جہلم مجھے دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔ اجنبیت کا وہ احساس میرے دل و دماغ سے مٹ چکا تھا جو اسی سڑک پر مری نگر آتی بار مجھ پر چھایا ہوا تھا۔ بلکہ مجھے یوں لگا گویا میں غیروں سے چھٹکارا پا کر اپنوں میں آ گیا ہوں۔

کئی چھوٹے بڑے دیہات گذر گئے۔ کئی مسافر اترے اور کئی نئے مسافر سوار ہوئے۔ پھر پہل گام آ گیا پہلگام میں نے بچپن میں دیکھا تھا لیکن اب یہ صرف نیچے کاٹیج کے لئے ایک 'پلیٹو' ہی نہیں رہا بلکہ ایک چھوٹا موٹا شہر بن چکا ہے اور رہن سہن کے جدید تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ ہوٹل ہیں۔ کلب ہے۔ سرکار کی بنائی ہوئی Huts ہیں۔ بنگلے ہیں، ریستوران ہیں، کافی ہوٹل ہیں۔ لیکن یہاں زیادہ تر سیاح خیموں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ میں نے چمکتے ہوئے، شفاف پانی والے سیماب صفت لدر دریا کے کنارے پُل کے نزدیک ایک خیمہ طے کر لیا ہے۔

آج شام کو کرسی باہر ڈال کر بیٹھی۔ یہاں کے مناظر کا کیا کہنا۔ چاروں طرف آسمان سے باتیں کرنے والے پہاڑ، دامن میں نغمہ سرا لدر کا تیز رفتار دریا، پیشِ منظر سبزہ زار زیرِ قدم رنگا رنگ پھولوں کے گلستاں پُر بہار، بس ایک کیف و سرور کی دنیا تھی۔ لدر کی مدھر کل کل سنتے سنتے ایک جھپکی سی آ گئی تو پتہ چلا کر پاؤں تلے کی زمین کے علاوہ کہیں اور بھی ہوں۔ وہاں، جہاں تم بیٹھی ہو۔۔۔۔

دیکھتے دیکھتے میرے خیموں کے دونوں طرف کچھ خیمے لگ گئے۔ آج بڑی خوبصورت چاندنی چھٹکی ہوئی۔ سامنے چاندنی میں تیرتی ہوئی لدر ہے اور لدر میں مچلتی ہوئی لہریں۔ کشمیر کے صحت افزا اور قابلِ دید مقامات میں پہل گام کا ایک امتیازی مقام ہے۔ لدر کے کناروں پر بسا ہوا یہ مرغزار وادی کے سینے پر ہیرے کی طرح جڑا ہوا ہے۔ ساڑھے سات ہزار فٹ کی بلندی پر قدرت کا یہ حسن جلال دل کو بے قابو بنا دیتا ہے۔ سنا ہے بہت پہلے اس جگہ پر ایک بڑا گھنا جنگل کھڑا تھا۔ سوچتا ہوں تب فردوسِ بریں کے اس خاموش گوشے کی شکل کیا ہو گی۔ سرسبز، ترشے ترشائے درختوں سے ہرے بھرے جنگل۔ فلک بوس پہاڑ — ساکت اور خاموش، کیسے لگتے ہوں گے۔

۱۳ مئی۔

لدر کے اس پار، اوپر بہت اوپر، 'بائی سرن' کا پلیٹو ہے۔ اس پلیٹو کے چاروں طرف بڑے بڑے، اونچے اونچے اور سرسبز کیل، بدو، چیل اور

دیودار کے درختوں والے گھنے جنگل ہیں۔ شاید کبھی حوریں ان میں رہتی ہوں۔ یا کون جانے وہ آج بھی چندن کا لیپ لگائے۔ پھولوں کے گجرے اور مالائیں پہنے اپنے محبوب کی تلاش میں دور۔۔۔ دور آسمان میں مل جانے والی پگڈنڈی پر رات کو بھٹکتی پھرتی ہوں۔ اکثر یوروپین سیّاح اسی جگہ آکر ٹھہرتے ہیں۔ سیر کے لئے میں اسی طرف نکل گیا۔ راستہ بڑا بھیانک اور چکر دار تھا۔ ایک طرف ہزاروں فٹ کی اونچائی اور دوسری طرف ہزاروں فٹ گہرے کھڈ اپنا ڈراونا منہ کھولے آسمان کو خالی خالی نگاہوں سے تاک رہے تھے۔ ان گہرائیوں میں کہیں ننگی چٹانیں، کہیں چھوٹی بڑی رنگا رنگ پھولوں سے لدی جھاڑیاں، کہیں باجرے اور مکّی کے سیڑھی دار کھیت، کہیں کوئی تالاب، تو کہیں کوئی برساتی ندی پگھلی ہوئی چاندی کے دھارا کی طرح چٹان کی ہر ایک اٹھان پر مچلتے، اُچھلتے جھرنے، کہیں کوئی کل کل کا مدھر سنگیت کرتی ہوئی پدر کی کوئی سکھی، پہاڑی ندی۔ پدر کی ان سکھیوں کی تعداد سینکڑوں تک جا پہنچتی ہے۔ نہ جانے یہ کب سے بہہ رہی ہیں اور کب تک بہتی رہیں گی۔ شاید یہ دنیا کی ابتدا کو انتہا سے ملا دیں۔ ہم انسان ذرا سا بڑھ جانے پر غرور، تکبر اور انا کے غلام ہو جاتے ہیں اور ذرا دکھی ہوتے ہی زندگی کی اہمیت اور عظمت کو بھلا بیٹھتے ہیں مگر پانی کے یہ کھلونے اتنے گمبھیر ہیں کہ ہمیشہ ایک چال سے چلتے ہیں۔ رات دن ایک دھن اور ایک جذبے سے اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں۔ تلیبن کی برفانی جھیل کو جانے والا بائی سرن کا یہ راستہ چیل اور بلوط کے گھنے جنگلوں سے ہو کر گذرتا ہے اور ایک اچھی خاصی بھول بھلیاں ہے۔ پہل گام سے تین میل کی کھڑی چڑھائی کے بعد لگ بھگ ایک میل کا یہ میدان ہریالی میں گھرا ہوا۔ خاموشی سے خدا کی قدرت کو تک رہا ہے۔ جس کی دلآویزی دیکھتے ہی بنتی ہے۔ یہی بائی سرن ہے۔ کھلے آسمان کی چھاؤں میں زندگی کی تھکا دینے والی گہما گہمی سے بھاگ کر لوگ یہاں بسے، کچھ وقت بائی سرن میں گذارنا چاہتے ہیں۔ میں نے دیکھا خیموں کے باہر، ادھ کھلی دھوپ میں کچھ کرسیاں لگی تھیں۔ جن میں کچھ مرد عورتیں اور بچے بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔

تقریباً تیرہ ہزار فٹ کی بلندی پر تلیبن کی برفانی جھیل واقع ہے۔ چاروں طرف گلیشیر ہی گلیشیر نظر آتے ہیں۔ سنہری دھوپ جھیل پر بکھری ہوئی تھی اور برفیلی چوٹیاں روپہلی ہو کر جگ مگ جگ مگ کر رہی تھیں۔ جھیل کی سطح اور اس پر بکھرے ہوئے برف کے اُجلے تودے رنگین نظر آ رہے تھے۔ ایک جگہ جھیل ہے، جھیل کے کنارے ہیں۔ کناروں سے لگے پہاڑوں کے سہارے ہیں۔ پر دھوپ کہاں ہے؟ کہاں ہے اور کس میں ہے؟ وہ سب پر چھائی ہے۔ سب پر بکھری ہے، سب پر پھیلی ہے وہ سب کو چومتی ہے۔ اور سب اس کی چھایا میں اپنے کناروں کو چومتے ہیں، اپنی باہوں سے لپٹی باہوں کو چومتے ہیں۔

اُترتے وقت تو ڈھلان پر پیر ٹکے ہی نہیں۔ بس تلیبن سے اُترا تو اترتا چلا گیا۔ پہاڑ کی سہانی دُھوپ اور ہوائیں ایسا لگا کہ مسکراتی ہیں اور پھر جیسے بھیگ کر بنا چومے ہی ایک دوسرے کو چوم جاتی ہیں۔ میں اترتا رہا تنگ راہ پر چلتے چلتے پاؤں اُچھل اُچھل جاتے اور راستے کے کنکر، پتھر پیر کی ٹھوکر کھا کر نیچے لڑھکتے تو لڑھکتے چلے جاتے۔

۱۴۔ مئی

کل رات کو یہ ادھورا خط لکھا اور سو گیا۔ آدھی رات کے قریب سردی نے بہت ستایا تو نیند اُچٹ گئی۔ پل دو پل پہن کر مفلر سر پر لپیٹا تب جا کر ٹھٹھرن رُکی بلا شبہ یہ جگہ بڑی پیاری ہے۔ لیکن یہ اکیلا پن ۔۔۔ کوئی ساتھی ہو تو پدر کا یہ طوفانی بہاؤ، بڑی بڑی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر دودھ کی طرح جھاگ دیتا ہوا اور گر گر کر پھر اُٹھتا اُبھرتا ہوا اس کا پانی اچھا بھی لگتا ہے۔

یہاں سے تھوڑی دُور ہی ملیشور کے مندر کے آگے پانی کا ایک آبشار ہے۔ ابھی میں آبشار سے ایک میل دُور ہی ہوں گا کہ بلندی سے پانی گرنے کی صدا سنائی دینے لگی۔ پھر دور سے آبشار نظر آنے لگا۔ پانی کا ایک ریلا کئی دھاروں میں تقسیم ہو کر پتھروں سے ٹکراتا ہوا شور مچاتا ہوا گر رہا تھا۔ دور دور تک پھیلی ہوئی پھواروں میں شعاعوں نے طرح طرح کے رنگ بنائے تھے جدھر نگاہ جاتی تھی جنگلی پھولوں کی روشیں ہی روشیں تھیں۔ قدرت کے معصوم مگر عظیم ہاتھوں کی گلکاری ہی گلکاری نظر آتی تھی۔ نظریں ان روشوں پر دوڑتیں تو پھر لوٹتی نہیں۔ بس دوڑتی ہی چلی جاتیں۔ نیچے پہنچ پر جو دیکھا تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ چٹانوں سے لپٹے ہوئے بھیانک، شور مچاتے ہوئے، اس آبشار کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ وہیں اپنی بلندی، اپنے اوج پر رُکنا چاہتا ہے۔ پر دیکھتے دیکھتے اپنی ہی نظر کے جرم کا احساس ہوتا ہے۔ پانی ہمیشہ تحریک میں رہتا ہے۔ اسے روکنے کے لئے بڑی بڑی چٹانیں کوشاں ہیں۔ بڑے بڑے درخت آبشار کے بہاؤ کی زد میں آکر اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔۔ مجھ جیسا ناستک بھی اس عظیم کارخانۂ قدرت کے عجیب و غریب خالق کی عظمت کا

قائم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے ۔؟ لگتا ہے آج تک جن اصولوں پر زندگی چلائی ہے ان کے پاؤں ریت پر ٹکے ہوئے تھے اور اب پاؤں تلے کی ریت نکلتی چلی جا رہی ہے۔ میں گھبرا سا گیا کہیں دل پھر دماغ کے غم ز سمیٹنا شروع کر دے۔ کہیں جھوٹی اُمیدوں کے پول نہ کھل جائیں۔ کہیں غمزدہ حقیقتیں عیاں نہ ہو جائیں۔۔۔ پانی غصّے میں چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر دودھ بن رہا تھا۔

پہل گام ایک عمدہ قیام گاہ ہے۔ سیلانی اور مجھ جیسے گھمکڑ یہاں آ کر خیمے گاڑ دیتے ہیں اور پھر آس پاس کی وادیوں کو کھوندنے چل دیتے ہیں۔

آج میں دیر تک لِدر کے کناروں پر گھومتا رہا۔ کہرے اور دھند لکے نے پہل گام کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ مکانوں کی چمنیوں سے اُٹھتا ہوا دُھواں پھواروں سے ٹکرا ٹکرا کر عجب دائرے بنا رہا تھا۔ لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے درمیان، یہاں وہاں، بکھرے مٹی کے گھروندوں کی لپی پُتی چھتوں پر سُکھانے کے لئے ڈالے گئے مکئی کے بھٹے بڑے خوبصورت لگ رہے تھے۔ کہیں کسان بیٹھے بھون رہے تھے اور کہیں گوالنیں دودھ بھری چھاگلیں سروں پر اٹھائے، بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیو پر سہاگ کے گیت بکھیرتی ہوئی اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ کہیں چراگاہوں میں بھولی کسنیں گھاس کے گٹھے بنانے میں مشغول ملیں تو کہیں بکروال سینکڑوں بھیڑ بکریوں کے گروہ لے کر پہاڑیوں کی طرف جاتے نظر آئے اور کہیں گوجر عورتیں کمر پر لکڑیوں کا بوجھ لادے پہل گام جانے والی پگڈنڈیوں پر رواں تھیں

اس سبز پوش خواب آگیں وادی کے باشندوں کی زندگی بڑی کٹھن ہے۔ زندگی میں قدم قدم پر جسم توڑ دینے والی مشقت اور کمر توڑ دینے والی محنت سے انھیں لوہا لینا پڑتا ہے۔ شرد کے سلونے بادل کے ٹکڑے سے بھی کومل، دل کش اور دل فریب حُسن، جو کشمیری عورت کے سانچے میں ڈھلا ہے۔ یہاں گھاس کاٹتا ہے اور کمر پر لکڑیاں لادتا ہے۔ لیکن آفرین ہے ان کی جوانمردی اور استقلال پر جو زندگی پر ان کا اعتقاد اٹل بنائے ہوئے ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے اسکول جا رہے تھے۔ قوم اور ملک کے ننھے معمار 'نیا کشمیر' کی اُمیدوں کے اُٹھتے ہوئے مینار۔ جب یہ بڑے ہوں گے تب کشمیر کی کایا پلٹ چکی ہوگی۔ ان کی آنکھوں میں خودداری کی چمک آ چکی ہوگی اور توہمات کا پردہ ان کے ذہن پر سے ہٹ چکا ہوگا۔ کشمیر میں جس ذہنی انقلاب کی ابتدا ہو چکی ہے۔ وہ انھیں مکتبوں میں ارتقا کی منزل پر پہنچے گا۔ تب تک مہذب زندگی کے مختلف شعبوں میں اتفاقی ترقی کی تمام راہیں کھل چکی ہوں گی۔ بچوں کے ہنستے چہکتے اور معصوم چہروں کو دیکھ کر مجھے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ بچپن کی وہ دلرُبائی، معصومیت اور کج ادائی یاد آ گئی۔۔۔ زندگی کی ہر منزل میں کتنی تیزی سے طے کرتا آیا ہوں۔ سوچ کر تعجب ہوا۔ سامنے پہاڑ کے دامن میں ایک طرف ہٹ کر گاؤں کا چھوٹا سا مکتب تھا آنگن میں اخروٹ کا پرانا درخت لہلہا رہا تھا۔ اس کے نیچے چبوترے پر سلیٹ پتھر کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ دیکھا تو ٹھٹھک کر رہ گیا، جی چاہا رُکوں نہیں بھاگتا بھاگتا پہنچ جاؤں۔ گاؤں کے اس مکتب میں جہاں دودھ پتھری کے ٹوٹے ٹکڑوں اور سلیٹ پتھر کے ٹکڑوں کو جیتنے کی بازی لگی رہتی تھی۔ من کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا۔ میں جیتا چلا جا رہا ہوں۔ ڈھیر سے چھرّے، ڈھیری دودھ پتھریاں، ڈھیری ٹھیکریاں۔ یکایک وہ سناٹا چھپٹا۔ جھولی کھلی اور سب بکھر گیا۔ نہیں اس پیڑ کے نیچے۔۔۔۔ پر یہاں نہیں، اس پیڑ کے نیچے نہیں، یہ وہ مدرسہ نہیں، چبوترا نہیں، یہ میرے ہاتھ وہ نہیں، اور یہ میں وہ نہیں، تب وہ ننھے ننھے لاپرواہ ہاتھ تھے۔ نٹ کھٹ اور شریر، اور آج، آج یہ ہاتھ خود ہی بندھے ہیں۔ چھوٹے سلام کرتے ہیں اور کھوکھلے آداب بجا لاتے ہیں۔ اٹھا لوٹنے کے لئے۔ لیکن اگلے موڑ پر جا کر نہ جانے کیوں قدم پھر پیچھے لوٹ آئے۔ جلدی جلدی چڑھائی چڑھی۔ چبوترے پر ہاتھ پھیلا کر ایک دودھ پتھری اٹھائی اور اُسے مٹھی میں بند کر کے نیچے بھاگ آیا۔ بچپن کے اس خواب کے بارے میں سوچتا رہا جو کبھی حقیقت تھا۔ ماضی کو کوئی واپس نہیں لا سکتا صرف دل کے دریچے کھلے پر کھڑی یادوں کے ہجوم کبھی کبھی اُسے پکار کر رہ جاتے ہیں۔ یہی سوچتے سوچتے نہ جانے کتنی دُور نکل آیا۔ ہوش آیا تو دیکھا۔ سامنے پھولوں کے قالین بچھے ہوئے تھے۔ بنفشہ کے پھولوں کے کھیت، بنفشہ یہاں اس کثرت سے پیدا ہوتا ہے کہ لوگ ہم وزن نمک لے کر بنفشہ دے دیتے ہیں۔ ساری فضا بنفشہ کے پھولوں میں بس کر مہک اٹھی تھی۔ ایک عجیب سی غنودگی کا عالم چھایا ہوا تھا۔ اتنی بلندی پر ہوا کا ہر جھونکا ایک نیا پیغام لاتا۔ کبھی پھولوں کا، کبھی کلیوں کا، کبھی آبشاروں اور جھرنوں کا۔ جی چاہتا ہے ان جھونکوں کو چوم چوم لوں، رس میں بھیگ کر اُن کے پروں پر اڑ جاؤں۔۔۔ پر کہاں؟

اور آ گئے امراوتی اور لِدر کے سنگم پر آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں بیسیوں چھوٹے چھوٹے نالے عجب برق رفتاری سے ایک مرکز کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں کا چپّہ چپّہ فردوسِ بریں ہے۔ جہاں کی پرت

دیو مالا ہے۔ جہاں ہزاروں، لاکھوں ندی نالے دھرتی کی چھاتی پر بہہ رہے ہیں اور انسانی زندگی کا سرچشمہ بنے ہوئے ہیں

۱۵ مئی

آج ہم کولائی کی راہ پر ہیں۔ راہ کی یہ رات لارڈوٹ کے ڈاک بنگلے میں کٹ رہی ہے۔ لارڈوٹ کولائی گلیشیر اور پہل گام کے درمیان ایک پلیٹو ہے۔ جس پر ایک ڈاک بنگلہ بھی ہے۔ ہم کوئی تین بجے کے قریب یہاں پہنچے، ایسا لگا جیسے دُنیا کی چھت پر آ گئے ہیں یا کسی اور بلندی پر جا نکلے۔

لارڈوٹ کا میدان گلمرگ کی طرح ہے۔ اس کی سبز مرتفع ڈھلانوں پر بیٹھے رہ جائیے، سو جائیے اور کھو جانے کو جی چاہتا ہے۔ چٹانوں کے کونوں میں چھپے ہوئے اس کے آبشار، وہ جنگل ترو تازہ، رنگین پھولوں کی خوشبوؤں سے مست، دُنیا سے دور، الگ۔ سورج کی وہ کرنیں چھن چھن کر گرتی ہوئی۔ بدلیوں کی وہ پھوار رہ رہ کر پڑتی ہوئی، نیچے وادی میں کوسوں تک پھیلی ہوئی رعنائی اور دلربائی ایک سراپا حسن — یہ سب دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کا عشر عشیر کسی کالی داس اور کسی شیکسپیئر کا قلم بھی بیان نہ کر سکے گا۔

دوپہر ڈھلے ہم دودھ سر نی جھیل دیکھنے گئے۔ دن ڈھلنے میں تھوڑی دیر تھی کہ ہم نے درختوں کے جھرمٹ میں پانی کی چمک دیکھی۔ آس پاس کی پہاڑیاں ہتھیلیوں کی طرح تنگ نہ تھیں۔ ایک کے بعد ایک تین چار کھلے پہاڑ تھے جو بالترتیب نیچے ہوتے چلے گئے تھے۔ اور جیسے دھند کے درمیان کسی جوہری نے سنبھال کر مدوّر کے ایک گالے پر کوئی بیش قیمت ہیرا رکھ دیا ہو۔ ویسے ہی ایک جھیل چمک رہی تھی ..... جی چاہا وہیں بیٹھ جاؤں، ہمیشہ کے لئے گھر بنا لوں، ایسا کچھ کروں کہ نظر زندگی کا سہارا اور منظر زندگی کا سامان بن جائے۔ لیدر کی اس وادی میں آ کر میری حالت عجب سی ہو گئی ہے۔ شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ کہ کشمیر آ کر آدمی کی حالت اس مہمان کی طرح ہو جاتی ہے جسے بہت سے دوست ایک ساتھ بلا رہے ہوں۔ وہ سب کو عزیز رکھتا ہو اور کسی کی دعوت کو بھی نا منظور نہ کرنا چاہتا ہو۔ ایسا مہمان انتخاب میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا..... لیدروٹ کی راہ ہی میں دن ڈھل گیا تھا۔ آسمان کی وسعتوں میں دھند لکا چھاتا چلا جا رہا تھا۔ پہاڑیوں کی سیاہ بلندیوں کے سوائے اور کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

۱۶ مئی

کولائی کا گلیشیر یہاں سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اسی علاقے میں دُنیا کے سب سے اُونچے راستے پندرہ سے بیس ہزار فٹ بلندی پر سے گذرتے ہیں۔ دس سے اٹھارہ بیس ہزار فٹ اُونچی چوٹیاں یہاں جگہ جگہ ہیں گلیشیر کو جانے والا راستہ بے حد سنکرا، پیچ دار، تنگ اور بھیانک ہے۔ ایک طرف حد نظر تک ڈھلان ہی ڈھلان ہے۔ ادھر پھر پانی کی چمکتی ہوئی ایک لکیر جس میں جگہ جگہ برفانی تودے سر اٹھائے خدا کی قدرت کو تک رہے تھے اور دوسری طرف بلندی ہی بلندی، چٹانیں ہی چٹانیں اور چٹانوں پر برف — اور پھر برف۔

کولائی کے دامن میں بھی ایک بڑا ہی شاندار سرسبز پلیٹو ہے۔ میرے خیال میں تم نے کولائی کا نام تک بھی نہ سنا ہو گا۔ کشمیر کے کوہستانی سلسلوں میں یہ سب سے شاندار اور بلند گلیشیر لگ بھگ اٹھارہ ہزار فٹ اونچا ہے اور ایک طرف سے چار ہزار فٹ ترچھا کٹا ہوا ہے۔ ہم گلیشیر پر تھوڑی دور تک چلے بھی، نمک تنگاف پربتوں سے آبشار گر رہے تھے۔ نالے اس رفتار سے بہہ رہے تھے کہ ان کے بہاؤ کی روانی میں بڑی بڑی چٹانیں اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہی تھیں۔ جدھر بھی نظر جاتی، آنکھ کھلتی، مندتی اور جھک جاتی۔ کھلتی اس لئے کہ برف کے یہ ذخیرے اور قدرت کے یہ مناظر اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے اور مندتی اس لئے کہ برفانی چوٹیاں روپہلی بن کر چمک رہی تھیں اور ان کی چکا چوند آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی اور جھکتی اس لئے کہ کولائی کا ماتھا میرے ماتھے سے بہت اونچا ہے — آسمان کو چھوتی ہوئی بلندیوں سے برف پگھل کر آ رہی تھی تاکہ انسان کو کبھی پانی کی قلت محسوس نہ ہو۔ اس کے کھیت ہرے بھرے اور لہلہاتے رہیں۔ اس کی پھلواری طرح طرح کے رنگا رنگ پھولوں سے سجی رہے۔ اس کے پھلوں کا رس کبھی خشک نہ ہو۔ پانی۔ بادل۔ اور برف — ایک ہی چیز کی الگ الگ شکلیں ہیں۔ ایک کی تباہی دوسرے کی تخلیق ہے یہی قانون شاید زندگی کا بھی ہے۔

کولائی سے لوٹ کر ہم تارسر اور مارسر کی جھیلوں تک گئے۔ یہ جھیلیں تقریباً چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہیں۔ شاید کبھی یہ ایک ہی جھیل رہی ہو گی لیکن آج تک ایک ننھا سا پہاڑ انھیں دو حصّوں میں تقسیم کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک طرف جھیل سے نکل کر بہتا ہوا تیز پہاڑی نالا ہے۔ تیز، خنک اور سنسناتی ہوئی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں گھاس میں سے ابھری ہوئی ایک چٹان پر بیٹھ کر دیر تک آدھے میل کی تارسر کو دیکھتا رہا۔ قدرت کی دریا دلی نے وہاں لالہ زار اگائے تھے اور گل ویاسمین کے چمن کھلائے تھے۔ جھیل کے

ساتھ ہی ایک مرغزار تھا، اور برف پوش چٹیل پہاڑوں نے دونوں کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ گویا جھیل کیا تھی ایک بیضوی پیالہ ساتھی جو آسمان کے گنبدِ مینائی کی طرف تک رہی تھی — اور دیو نما فلک بوس پہاڑ اس گنج گرانمایہ کی حفاظت کر رہے تھے — تارسر سے جو پہاڑی نالا نکلتا ہے۔ وہی لارواٹ تک پہنچتے پہنچتے لِدر دریا ہو جاتا ہے اور پھر کل کل کا شور مچاتا مچلے انداز سے چٹانوں میں الجھتا، سانپ کی طرح بل کھاتا، اور اژدھے کی طرح پھنکارتا ہوا پہل گام جا پہنچتا ہے۔ یہ نالا ایک لمبی کہانی بیان کرتا ہے فکر و تصوّف کے ان خاموش گوشوں سے پہل گام کے ہنگاموں تک کی داستان — اور داستان کی ہر ایک کیفیت میں یہ خود ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔

مارسر کی دودھ سے دُھلی اور دھوپ سے منجھی جھیل میں سے بھی ایک ایسا ہی نالا نکلتا ہے جو ڈاچی گام کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ جس کی منزل ہارون کی بلوری جھیل ہے۔ جس کا پانی موتی کی آب کو بھی شرماتا ہے۔ وہاں اس کی خاموشی اس کی محویت کا پتہ دیتا ہے۔ جس کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہاں یہ کتنی شوخ اور چنچل ہے۔ سرینگر میں کبھی نل کے نیچے بیٹھے، پیاس بجھاتے ہوئے یا ہارون کے باغ میں کسی اتوار کو پکنک کرتے کبھی تمہیں خیال آیا ہے کہ ہارون کی اس جھیل کی اتنی لمبی کہانی ہو سکتی ہے!

من موہن تلخ

ماوراء

تلخ ایسی کوئی تصویر بنا دے اپنی
جسے تکتے ہی ہر اک شخص کو چُپ لگ جائے
یوں نظر آئے تری زیست کا پُر ہول کھنڈر
کہ تری عمر کا ہر موڑ ہر اک راہگزر
تیرا بکھرا ہوا شیرازۂ ہستی ہو جائے
محض عنواں ہی سے اندازۂ ہستی ہو جائے
ربط ہو کوئی لکیروں میں نہ کوئی مفہوم
کارفرما رہے ہر رنگ میں یادِ معدوم
اپنی ویران نگاہوں میں وہ دہشت بھر دے
رُخ کو پردہ ہی پردے میں جو عُریاں کر دے
یوں اُبھر آئے رُخِ پردہ پہ ہر عکسِ خیال
کہ ہر اک نقش نگاہوں میں جھجکے بن کے سوال
کوئی بھی خط نہ ہو پہلے کسی خط کی مانند
ساری تصویر ہو اک حرفِ غلط کی مانند
جس طرح مٹنے سے پہلے کسی گونگے کی پکار
سر پہ لٹکی ہوئی ہو موت کی ننگی تلوار

تلخ ایسی کوئی تصویر بنا دے اپنی
رنگ ایسا کوئی تصویر میں گہرا بھر دے
جو سبھی دھندلے نشانوں کو علیحدہ کر دے
ایسی منہ بولتی تصویر کہ جس کی آواز
سُن کے سب پوچھیں کہ ہستی کی یہ کس کی آواز
دیکھنا چاہے نہ کوئی بھی مگر سب دیکھیں
بچ کے اک دوسرے سے ایک نظر سب دیکھیں
نظر آئے نگہِ تیز جدھر سے دیکھیں
پاس آ جائیں تو بے ربط صفر سے دیکھیں
ایک اک نقش سے یوں بول اُٹھے رازِ خموش
کس نے دیکھا ہے یہاں نور کا اعجازِ خموش
ایک آوردہ ضیا کس کو مقدس ہوتی
اور اگر ہوتی تو یوں زیست نہ بے بس ہوتی
کہ ہے جو کچھ بھی کوئی اس کے سوا کچھ بھی نہیں
تلخ تصویر بنا دے کوئی ایسی اپنی
صرف تصویر نہ ہو اس سے زیادہ ہو کہیں

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی

میرزا غالب کے حریف؟

غدر کے بعد مغربی علوم اور نئے طرز تعلیم کے اثر سے اردو ادب میں ایک انقلابی لہر اٹھی۔ روشن خیال اور زمانہ کے مزاج میں نگاہ بصیرت رکھنے والے ادیبوں نے محسوس کیا کہ اردو کا دامن نئے زمانے کے علم پر تنگ ہے، اس لئے غدر کے بعد انگریزی علوم سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا خیال پیدا ہوا۔ گو کہ انگریزی ادب تاریخی طور پر انسانی مذاق کے بالکل قریبی دور کا پیش خیمہ دار ہے، یورپ میں ہم دو سو برس سے علمی تحقیق کا سلسلہ جاری ہے مگر ہندوستان میں نئی زبان نے جب قدم پھیلانا شروع کیا تو علمی تحقیق اور ذوق نے تنقیدی ادب کا ایک واضح معیار قائم کیا۔ اس کے لئے حدود قائم کئے اور اصولوں کی روشنی میں سنجیدہ اور واضح طریقے سے شعر و ادب کے جائزہ کی بات بھی سوچی گئی کہ اس طرح فکر کے مختلف دبستان، سوچنے کے مختلف زاویے اور بیان کے مختلف اسلوب قائم ہوئے — اردو ادب میں سب سے پہلی بار زندہ جاوید ادیب غالب نے عملی طور پر قدم اٹھایا۔ اس سلسلے میں دو تذکروں کے اقتباس ملاحظہ ہوں:

سید فخر الدین حسن تخلص سخن بن سید جلال الدین حسین نے ۱۲۸۱ھ میں فسانۂ عجائب کے مقابلے میں سروشِ سخن کے عنوان سے ایک فسانہ حسن و عشق نول کشور پریس سے شائع کیا۔ ختم داستان کے بعد جناب سخن شاگرد صفیر بلگرامی غالب کے سلسلے میں رقمطراز ہیں:

"حضرت جناب تقدس مآب گردوں رکاب سر دفتر محققان سخن افسر شاعران زمن، نجم الدولہ، دبیر الملک نواب اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ عرف مرزا نوشہ تخلص غالب اعلی اللہ درجہ و تعالیٰ اللہ تعالیٰ شانہ جو جد فاسد خورد استاں ہیں۔ سر آمد شاعران حال و گذشتگان ہیں۔ عرصۂ دراز تک کمترین کو معظم الیہ سے درس و تدریس میں استفادہ رہا۔ تحریر نظم و نثر پارسی اور اردو کی مزاولت پر دل آمادہ رہا۔ سبحان اللہ حضرت غالب مد ظلہ العالی امام شعرائے ذی کمال اور پیشوائے نثاران صاحب دانش و شعور ہیں۔ قبلۂ ارباب دیوان ہیں۔ ہم کیا کہیں وہ تو ہند سے شیراز تک بلکہ دو دو روز آفتاب سے زیادہ مشہور ہیں۔ شاعر بہت سے گزر گئے، حضرت کے ہم عصر ہمسری کا دعویٰ کر کے لکھتے لکھتے مر گئے، مگر آج تک کوئی آپ سے بہتر نہ ہوا۔ بہتر تو کیا کوئی آپ کے برابر نہ ہوا۔ منصف مزاج آپ کا کلام دیکھے اور غور فرمائے۔ طبع عالی دقت پسند اور مائل بندش معانی بلند ہے، اگر سمجھے تو لطف اٹھائے، دیوان اردو جب تصنیف فرمایا معنی رس اور سخنداں لوگوں نے ایک ایک شعر میں سو سو طرح کا مزا پایا۔ لیکن بعض شاعر جو بڑے مشاق تھے اپنے فن میں لائق شہرۂ آفاق تھے، اکثر اشعار نہ سمجھے اور ہر ایک مرید پر اولجھے یہاں تک اصلاح و اصرار سے خطوط آنے لگے، لوگ نواب صاحب کی خدمت میں مطلب دریافت کرنے جانے لگے۔ آسان اشعار لکھنے کی فرمائش ہوئی۔ دوسرا دیوان مرتب کرنے کی خواہش ہوئی۔ آپ نے اس دیوان کو دریا برد کیا اور دوسرا دیوان موافق فہم ابنائے روزگار کے ترتیب دیا پھر یہ رباعی لکھ کر لوگوں کو سنا دی اور دیوان کے آخر میں لگا دی۔ غالب مد ظلہ:

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخنورانِ کامل

آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل "

جنابِ سخن، اپنے استاد جناب صفیر بلگرامی کی شان میں اس داستانِ دل آرا اور ملکہ حسن افروز ـــــ جس کا تاریخی نام "سروشِ سخنی"[1] ہے (سروشِ سخن، کتاب مذکور کا تاریخی نام ہے) جس سے ۱۲۷۶ھ سن ظاہر ہوتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ داستان "نغمہ عندلیب" کے عنوان سے لکھنا شروع کیا تھا لیکن منظرِ عام پر "سروشِ سخن" کے نام سے ۱۲۸۱ھ میں آئی ـــ چنانچہ آخر کتاب میں ایک مقدمہ، ایک جلسہ [تذکرہ ادباء و احباب] بہ نام "انجمنِ احباب" اور چند غزلیات سخن پھر قطعات تاریخ مندرج ہیں۔ قطعات ۱۲۷۶ھ اور ۱۲۸۱ھ دونوں ملتے ہیں۔ اس لئے خیال ہوتا ہے کہ مروجہ دستور کے مطابق احباب نے بیشتر ہی مصنف کی اطلاع پر قطعات نظم کرکے بھیج دئے ہوں گے [لیکن یہ واضح رہے کہ ۱۲۷۶ھ اور ۱۲۸۱ھ میں پانچ سال کی طویل مدت باقی رہتی ہے] رقمطراز ہیں :

"سید فرزند احمد صفیر بلگرامی جو صاحب دیوان ہیں، تحریر اون کی چست، روزمرہ درست، نہایت خوش بیان ہیں، ہر شہر و دیار میں اون کے علومِ خاندانی کی شہرت ہے۔ ہر جگہ اون کی قدر و منزلت ہے۔ بیان کرنے کی کیا حاجت ہے۔ "

صفیر بلگرامی کا نام سید فرزند احمد تھا۔ آپ حضرت سید صاحب عالم صاحب بلگرامی ثم مارہروی کے حقیقی نواسے تھے۔ صفیر بلگرامی نے بھی غالب کے حالات شنیدہ نہیں بلکہ دیدہ جلوہ خضر حصہ اول مطبوعہ ۱۳۰۲ھ میں لکھے ہیں۔ اقتباس قابل غور ہے :

"۔ ۔ ۔ ۔ اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ اکبرآبادی مولداً۔ دہلی مسکن الملقب بہ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ۔ یہ وہ خوش مذاق شخص گذرا ہے جس نے ہندوستان کی فارسی شاعری اور اردو نثر کو تجدید کا خلعت عطا فرمایا۔ میرے نزدیک ہندوستان کے کلام فارسی پر ولائتی فارسی کا یقین چار شخصوں کے کلام پر ہوا،

اوّل امیر خسرو　دوم حسن دہلوی　سوم مرزا بیدل　چہارم غالب

اگرچہ ناصر علی سرہندی اور مرزا جان جاناں مظہر اور غنی کشمیری اور غنیمت اور خان آرزو اور آزاد بلگرامی، اور میر امامی بلگرامی اور امام بخش صہبائی اور شاہ الفت حسین فریاد ـــ یہ سب کے سب خوش گو اور شاعر بے بدل تھے، مگر جامہ ایجاد جو خداداد ہے انہیں چاروں کے راست قامت آیا اور ان چاروں کے سوا جن کے نام نامی لکھے گئے ہیں اون پر بھی نغز گفتاری کا خاتمہ ہوا ۔ ۔ ۔ "

(جلوہ خضر مطبوعہ ۱۳۰۲ھ)

لیکن میرے پاس جلوہ خضر حصہ اول و دوم کا جو مسودہ حضرت صفیر بلگرامی کے دست و قلم کا موجود ہے اُس میں :

" اول امیر خسرو　دوم میر حسن　سوم میر تقی　چہارم مرزا بیدل
پنجم مرزا غالب "

تحریر ہے، میر تقی کے سلسلے میں حاشیہ پر یہ عبارت بھی درج ہے :

" میر تقی صاحب کو اگر اردو نثر نگاری کا موقع ملتا تو ان کی نثر اور نظم میں سوز و گداز ایک سا ہوتا۔ شاعر وہ تو باکمال تھے، نثر کی باکمالی کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔"

لیکن یہ عبارت قلمزد کر دی گئی اور نہ جانے کیوں ترتیب بھی بدل دی گئی۔ حالانکہ میر تقی کے حالات میں صفیر بلگرامی صفحہ ۱۴۸ پر لکھتے ہیں :

[1] سروشِ سخن ـــ کا مسودہ صفیر بلگرامی نے اپنے استاد حضرت غالبؔ دہلوی کے پاس برائے ملاحظہ ایک خط کے ساتھ بھیجا۔ اس کا جواب غالب نے دیا :

" مولوی سید فرزند احمد ۔ ۔ اس پیر ہفتاد سالہ کی دعا پہنچے۔ آج میں نے لیٹے لیٹے حساب کیا کہ یہ ستّرواں برس مجھے جاتا ہے۔ ہائے سہ

سینی عمر کے ستر ہوئے شمار برس
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

نامۂ محبت افزا کو دیکھ کر آنکھوں میں نور دل میں سرور آیا۔ اور قصہ سروشِ سخن اس کے دوسرے دن پہونچا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہیں اب میں نواب ضیاء الدین خاں سے باتیں کر رہا ہوں تمہارے خط کے جواب نے اتنی دیر تک ان کو چپکا بیٹھا رکھا۔ وہ بھی تم کو سلام اشتیاق آمیز پہونچاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

حضرت غالب کے شعر کا جواب صفیر بلگرامی نے یہ بھیجا :

سُنا صفیر یہ کہتے ہیں حضرت غالب　　بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس
مگر پہلے سے اعداد فیض کی ہے دعا　　خدا کرے مرا غالب جئے ہزار برس

(سروشِ سخن صفحہ ۱۹۷)

"... میر غزل کے بادشاہ تھے، جو بات کہ غزل میں انھوں نے اختیار کی اس کی تقلید سب پر واجب ہوگئی اور سب اس طرز پر چلنے کو مستعد ہوئے، مثنوی میر صاحب کی اگرچہ ممدوح انام ہے مگر غزلیت کے سبب سے زیادہ مطبوع ہے ..."

(جلوۂ خضر حصہ اوّل)

جناب تنویر "روشِ سخن" میں میر کی بابت لکھتے ہیں:

"میر تقی صاحب غفران مآب تو بادشاہ شاعران اور استاد سارے جہان کے تھے، اس میں تو کسی کو جائے گفتگو اور تقریر نہیں اور اگر ہو تو ع

آپ ہی بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں"

جناب صفیر کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر کی عظمت کا رجحان محض غزل کے نام پر روا رکھنا انھیں کو منظور نہ تھا۔ بلکہ وہ نثر میں بھی میر کا وہی شان اور تمکنت سے دیکھنا چاہتے تھے، جو ودجہ غزل میں مقرر تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ اس تحقیق میں صفیر کو ناکامی ہوئی اور وہ نثری میدان سے میر کو فلہ و کرنا پڑا۔ چنانچہ میر و مرزا[1] کے سلسلہ میں تحریر کا جو نمونہ جلوۂ خضر میں پیش کیا گیا ہے اس میں مرزا کا نثری نمونہ اردو میں ہے لیکن میر کا نمونہ فارسی پیش کیا گیا ہے۔ گویا صفیر بلگرامی کے ذہنی کوشش نے میر کو غالب کا حریف بنانا چاہا لیکن پھر خود ہی اسے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔ یا یہ کہ اپنے استاد غالب کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لئے انھیں اس موضوع سے جدا ہونا پڑا۔ بہرحال اس سے انکار نہیں کہ غالب پہلا شخص ہے جس نے فارسی جو اس زمانے میں مروجہ زبان تھی، کے برخلاف آسان اور سلیس اردو میں نثر لکھی۔ یہ درست ہے کہ دلی کی نئی ادبی زندگی شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان، نیز دلی کالج سے ہوئی۔ لیکن اس سے بھی کسی کو انکار ممکن نہیں کہ دلی کے ادب نواز یا ادیب صرف چار تھے: شاہ نصیر، ذوق، مومن اور غالب۔ لیکن غالب نے اپنے فطری رجحان سے اردو ادب میں تبدیلی کی، اس کے جمود کو توڑا بلکہ ہماری نئی نثر کی صحیح قدروں کو اجاگر کرنے اور روشناس کرنے میں غالب کا بہت زیادہ حصہ ہے یہی نہیں، اگر غالب کی نثر کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں بہت سے ایسے نقوش ملیں گے جو سادگی و پرکاری سے پر ہوں گے اور کیفیت و جامعیت کا امتزاج بھی ہوگا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ وہ تمام چیزیں یہاں مل جاتی ہیں جو کا ایک ادب میں ہونا لازمی ہے مثلاً اصلاح زبان، صحیح الفاظ، شستگی، مناسب تراش خراش، ذو معنی الفاظ، سادہ اور سلیس انداز۔ غرض وہ تمام لوازم جن سے زبان میں زندگی اور اس کا رچاؤ پایا جائے بہ درجۂ اتم موجود ہے۔ سادہ اور سلیس استعمالِ زبان غالب نے میر ہی سے ترکہ کے طور پر پایا۔ میر نے اپنی غزلوں میں جس انا کو اجاگر کیا ہے، مروجہ روش سے جس طور سے انحراف کیا ہے اس نے غالب کو چونکایا ہی نہیں بلکہ اپنا لینے پر مجبور کیا۔ مگر ہوا یہ کہ میر نے سادگی و پرکاری غزل میں سموئی، لیکن غالب نے مشکل پسندی کے باوجود اردو غزل اور نثر کو آسان اور بامحاورہ بنا دینے کی ایک بہتر مثال قائم کر دی۔ یہ ان کی عظمت کی نشان دہی کرتے اور ان کے معاصرین سے ممتاز بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ تمام تذکرہ نویس غالب کی عظمت، ان کے فن، ان کی سوجھ بوجھ، ان کے جدید رجحانات کا اعتراف ہی نہیں کرتے بلکہ اسے نشانِ راہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

اگرچہ اس حقیقت کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ ٹیپو سلطان اور سراج الدولہ کی شکست کے بعد انگریزوں کا اقتدار قائم ہو چکا تھا لیکن مغلیہ سلطنت کے تاجدار کے احکام سارے ملک میں جاری و ساری تھے۔ یا کم سے کم دلی اور گرد و نواح میں یہی سکہ رائج تھا۔ اس طرح ہم اسے عبوری دور کا نام دے سکتے ہیں۔ لیکن یہ دور پرانی دیوار کے گرنے اور نئی دیوار کے تعمیر ہونے کا وقفہ تھا۔ چنانچہ اگر اس وقت کی شاعری کا تجزیہ کیا جائے تو صرف غالب کی شاعری اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ بصیرت، پیش بینی سے بھرپور دکھائی دیتی ہے۔ گرچہ غالب بیک وقت رند، فلسفی اور صوفی بھی دکھائی دیتے ہیں۔ غم ان کی آنکھوں سے جھلکتا ہے، لیکن وہ اس کشاکش کو دنیا کا مضحکہ اڑا کر چپ رہنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہ دراصل غالب کی عظمت اور ان کا فن ہے جو ایک دور کی عکاسی اور نمائندگی بھی کرتا ہے اور پرانے دور و اقتدار کی صحیح حالت کا تجزیہ بھی پیش کرتا ہے۔ ورنہ:

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب   تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

یا

ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

کے تیکھے اشعار پردۂ غیب سے ظہور میں نہ آتے!

[1] مرزا سودا سے مراد ہے۔

سنت رام

اُستاد علاؤالدّین خاں

فن موسیقی کے لاثانی ماہر استاد علاؤالدّین کی کہانی اُن کی اپنی زبانی کا اردو ترجمہ قارئین کی ضیافت طبع کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔

بیوی کی موت ہو جانے پر دینا ناتھ دیو شرما کے لئے اپنے گاؤں میں رہ سکنا دشوار ہو گیا تو وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو ساتھ لے کر وہاں سے نکل پڑے۔ گھومتے گھماتے وہ گوکیوں میں پہنچ گئے۔ جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ آدم خور ہیں۔ وہاں پہنچ کر وہ کالی مندر میں پجاری بن گئے۔ یہاں وہ بالکل محفوظ تھے۔ پجاری کی طرف اور کالی کے بھگت گوکیوں کی نظر بھلا کیسے اٹھتی۔ بلکہ وہ تو ان کے لئے نذرانہ اور چڑھاوا لانے لگے۔

لیکن براہمن دینا ناتھ کے بیٹے نے بڑے ہو کر دوسرا راستہ اختیار کیا۔ اس نے گوکیوں کے ساتھ مل کر اپنا ایک گروہ بنایا۔ اور غریبوں کا خون چوسنے والے زمینداروں اور ستموں سیٹھوں کے خزانے لوٹ کر غریبوں میں بانٹنا شروع کر دیا۔ اسی اثنا میں کلائیو نے جنگ میں فتح پائی۔ اور ان لٹیروں کو گرفتار کرنے کے لئے لاکھوں روپے کے انعام کا اعلان کیا۔ اس مصیبت کی گھڑی میں اس براہمن کے بیٹے نے اسلام قبول کر کے اپنا نام سراجو رکھ لیا۔ سراجو ڈکیت کے نام سے ان دنوں لوگ کانپ اٹھتے تھے۔ ایک دن سراجو نے سلہٹ کے ایک زمیندار کے گھر ڈاکہ ڈالا۔ وہاں اسے ایک چھوٹی سی بچی بچھونے پر سوتی ملی۔ ڈاکہ کی پہلے سے ہی اطلاع مل جانے کے باعث گھر کے سب لوگ تو بھاگ گئے ۔۔ مگر گھبراہٹ اور پریشانی میں بچی کو وہیں چھوڑ گئے تھے۔ سراجو اسے اپنے ساتھ لے آیا اور اپنے بیٹے کے ساتھ اس کی بھی پرورش کرنے لگا اور جب لڑکی بڑی ہوئی تو اپنے بیٹے سے ہی اس کا بیاہ کر دیا۔ اس کے بعد خود بھی وہ پیشہ چھوڑ کر تپیرہ کے شو پور نامی گاؤں میں خانہ دار زندگی بسر کرنے لگا۔

اس لڑکی سے سراجو کے تین پوتے ہوئے۔ علی احمد۔ صالح احمد اور جعفر محمد، پھر جعفر محمد کے ایک بیٹا ہوا، مادر حسین۔ مادر حسین کے ہاں ایک لڑکا سعدو خاں پیدا ہوا۔ سعدو خاں کے پانچ بیٹے ہوئے۔ تمرالدین، آفتاب الدین علاؤالدین اور حیات علی۔ یہی ہے میرا شجرۂ نسب۔

میرے والد بڑے سنگیت پریمی تھے۔ وہ عموماً بیس بائیس میل پیدل چل کر گانا بجانا سننے جایا کرتے تھے۔ میرے بڑے بھائی آفتاب الدین کو بھی موسیقی کا بڑا شوق تھا۔ وہ استاد انہیں موسیقی کی تعلیم دیتے تھے۔ اس ماحول میں میں بھی سنگیت پریمی کیوں نہ ہوتا۔ آہستہ آہستہ سنگیت کی چاٹ اتنی بڑھی کہ اسکول جانے کے بہانے میں اپنے گاؤں کے شیو مندر میں چلا جاتا۔ اور سادھوؤں کا سنگیت سنا کرتا۔

ایک دن یہ چوری پکڑی گئی۔ ہیڈ ماسٹر نے گھر آ کر میرے اسکول نہ جانے کی شکایت کی۔ اس پر میرے والد صاحب نے تو کچھ نہیں کہا بلکہ وہ تو سادھوؤں کے ساتھ گانے بجانے میں حصہ لینے پر خوش ہی ہوئے۔ مگر ماں کو بہت غصہ آیا۔ گھر کی مالک تو وہی تھیں۔ انھوں نے میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دیا اور تین دن تک نہ کھانا پانی نہیں دیا اور خوب پیٹا۔ تیسرے دن میری بڑی بہن مدھو مالتی نے مجھے اس عذاب سے نجات دلائی۔

اس کے بعد ہی میں ماں کے صندوق سے دس بارہ روپے چُرا کر گھر سے بھاگ نکلا۔ آخر تھا تو ڈکیت خاندان کا ہی۔ گاؤں سے مانک نگر اسٹیشن پہنچا اور وہاں سے

بذریعہ ریل نارائن گنج ہوتا ہوا سیالدہ پہنچ گیا۔ اب میں کلکتہ میں تھا۔ اتنے بڑے شہر میں بالکل اکیلا، بے یار و مددگار اور نہ کوئی رہنے کا ٹھکانہ۔ ہیریسن روڈ سے ہوتا ہوا گنگا کے کنارے پہنچا اور رات وہیں گھاٹ پر بسر کی۔

سویرے اٹھ کر دیکھتا کیا ہوں کہ میری روپے کی تھیلی غائب ہے۔ دکھ کے مارے رونے لگا۔ میرا واحد سہارا مجھ سے چھن گیا تھا۔ مجھے روتا دیکھ کر پولیس کا ایک سپاہی میرے پاس آیا۔ مگر میری دکھ کی کہانی سُن کر وہ الٹا مجھے ہی ڈانٹنے لگا۔

"بے وقوف کہیں کا، ایسے کہیں روپے رکھے جاتے ہیں" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

میرا رونا بند نہ ہوا۔ اسی حالت میں اٹھ کر چل دیا اور نیم تلہ گھاٹ پہنچا۔ وہاں کچھ سادھو دھونی رمائے بیٹھے تھے۔ گانے کا دور چل رہا تھا۔ انھیں سادھوؤں میں سے ایک نے میری بات سُن کر کہا "کچھ پروا نہیں۔ گنگا نہاؤ۔ اور وہ سامنے دیکھو، کھانا کھلایا جا رہا ہے۔ وہاں جا کر پیٹ بھر کھا لو۔۔۔"

میں نے بھی یہی کیا۔ ان لولے، لنگڑے، اندھے اور کوڑھی بھکاریوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اور رات میں ایک ڈاکٹر کی دوکان کے باہر چبوترے پر سو گیا۔

اس طرح دن کٹنے لگے۔ کنگالی لنگر میں جا کر پیٹ بھرتا۔ اور ڈاکٹر کی دوکان کے باہر چبوترے پر سو جاتا۔ بہت سے لوگوں نے میرا پتہ، ٹھکانہ اور مقصد پوچھا۔ ان سب کو میں نے یہی بتایا "میں گانا، بجانا سیکھنے آیا ہوں۔ استاد کی تلاش میں ہوں" میرے ہم عمر چھوٹے چھوٹے بچے بھی بڑے شوق سے مجھ سے سوال کرتے اور ان سب سے یہی کہہ دیتا۔

ایک دن ایک لڑکے نے مجھ سے کہا "میں ایک استاد سے سنگیت سیکھتا ہوں۔ چلنا چاہو تو چلو وہیں" میں بڑی خوشی سے اس کے ساتھ ہو لیا، یہ استاد تھے۔ للو گوسوامی مشہور دھروپد گانے والے۔ خیال بھی گاتے تھے۔ انھوں نے کہا۔ بارہ برس تک موسیقی کی مشق کرنی ہوگی۔ میں نے فوراً کہا کہ میں عمر بھر کروں گا۔ درخواست منظور ہوگئی۔ انھوں نے مجھے اپنا شاگرد بنا لیا۔ اب میں دن رات میں صرف ایک ہی وقت کنگالی لنگر میں بیٹھ کر کھانا کھاتا۔ اور گانا سیکھتا۔

گورو جی بڑی لگن سے گانا سکھاتے۔ انھوں نے مجھے تین سو ساٹھ پلٹے سکھائے ساتھ ہی تان بھی۔ ایک دن پلیگ کی بیماری میں اچانک گورو دیو اس دنیا سے رخصت کر گئے اور میں پھر بے سہارا رہ گیا۔

اس کے بعد میں دویکا نند جی کے بھائی حابو دت کے پاس گیا۔ دویکانند جی کا تو سارا خاندان ہی سنگیت پریمی تھا۔ خود وہ اچھا دھروپد گاتے تھے۔ حابو دت کلارنٹ، ستار اور دوسرے کئی ساز بجاتے تھے۔ نیشنل تھیئٹر کا کنسرٹ بھی وہی تیار کرتے تھے۔ ان سے میں بیلا سیکھنے لگا۔ پھر انگریزی بینڈ اور شہنائی کی طرف رجوع ہوا اور اُن کی تعلیم بھی لینے لگا۔ حابو دت کے کنسرٹ کا راگ ہوتا تھا ایمن۔ ایک ایک دن میں میں، ان سے چار پانچ گت سیکھتا۔ اس طرح ترقی کی راہ پر میں بڑی تیزی سے چلنے لگا۔

میرے ایک دوسرے محسن تھے نندو بابو، وہ للو بابو کے ساتھ مردنگ اور طبلہ بجاتے تھے۔ اُس طرف بھی میرا دھیان گیا۔ اور ان سے میں مردنگ اور طبلہ سیکھنے لگا۔ موسیقی سے میرا اتنا لگاؤ دیکھ کر حابو بابو بہت متاثر ہوئے انھوں نے مجھے سبھی ساز سکھانے کا وعدہ کیا اور منروا تھیئٹر میں جس کے مالک گریش گھوش تھے بارہ روپے ماہوار پر نوکر بھی رکھوا دیا۔ اب میں تھیئٹر میں کام کرتا اور سنگیت بھی سیکھتا۔ اسی دوران میں وہیں کے مشہور وائلن بجانے والے لوبو صاحب سے وائلن اور ان کے اُن شاگرد سے کلارنٹ سیکھا۔ ادھر حابو دت کلارنٹ اور ہزاری استاد شہنائی، نقارہ اور چکارہ سکھا ہی رہے تھے۔ ڈھائی برس تک ایسے ہی کام چلتا رہا اب مجھے سنگیت آگیا تھا اور مجھے اپنی لیاقت پر غرور ہونے لگا۔ ایک دن مکتا گاچھا کے راجہ صاحب کے پاس پہنچا اور ان کے پوچھنے پر بڑے غرور کے ساتھ بولا "میری طرح کا استاد تو آپ کو سارے ملک میں نہیں ملے گا۔ دنیا کا ہر باجہ میں بجا سکتا ہوں۔" یہ سب کچھ بلاشبہ تھیئٹر کی بُری صحبت کا نتیجہ تھا۔ میری بات سُن کر راجہ صاحب نے مجھے دوسرے دن سویرے آٹھ بجے اپنے ہاں آنے کو کہا۔ اس وقت میری عمر سولہ سترہ برس کی تھی۔

دوسرے دن جب میں راجہ صاحب کے ہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک شاندار محفل جمی ہے اور لمبی داڑھی والے ایک صاحب سرود کا سُر ملا رہے ہیں۔ اُدھر وہ ٹوڑی کا سُر باندھنے لگے اور اِدھر میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں چیخ مار کر رونے لگا۔ ان کے پاؤں پکڑ کر میں نے کہا "آپ ہمارے گورو ہیں، میں آپ کے گھر میں جھاڑو دوں گا۔ سب کام کروں گا۔ مجھے اس کی تعلیم آپ دیجئے۔" مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی تھی۔ میرا بُرا حال تھا۔ اسی دن میں اس ماہرِ موسیقی کا شاگرد بنا۔ یہ ماہرِ موسیقی تھے رام پور ریاست کے مشہور و معروف استاد احمد علی عابد علی کے بیٹے۔

اب میں انھیں کے ساتھ رہ کر موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے لگا۔ ان کے ساتھ میں ہی کھانا پکاتا۔ گھر کا سب کام کاج کرتا۔ وہ سویرے سویرے

بچانے پی کر کلکتہ چلے جاتے اور میں باورچی خانہ میں بیٹھ کر چوری چوری سرود بجانا سیکھتا۔ چوری چوری اس لئے کہ ایک سال تک وہ مجھے سرگم ہی سکھاتے رہے تھے۔ وہ کبھی کبھی اپنے ساتھ باہر بھی لے جاتے۔ ایسے موقعوں پر طبلہ یا بیلا بجانے کی اُجرت کے طور پر پچیس تیس روپے مل جاتے تھے۔ استاد کو مجھ پر اتنا اعتبار تھا کہ وہ اپنے سارے روپے پیسے مجھے ہی رکھنے کے لئے دیتے تھے۔ اور بوقت ضرورت مانگ لیتے تھے۔ اسی طرح چار سال گزر گئے۔ اس کے بعد ایک دفعہ وہ ملک میں دو تین جگہ موسیقی کے پروگرام میں شرکت کے لئے گئے۔ وہیں سے مجھے رام پور لے گئے۔ میں نے وہاں دیکھا کہ ان کا مکان مٹی کا ہے اور اوپر کھپریل پڑی ہوئی ہے۔ مجھے بڑا دُکھ ہوا۔ ایک دن میں نے اُن سے کہا۔ آپ کے روپے کافی ہو گئے ہیں میرے پاس۔ حساب کر لیتے تو اچھا تھا۔ وہ چونک پڑے "روپے کیسے روپے؟ اب تک تو کسی نوکر نے روپوں کا حساب مجھے نہیں دیا" میں نے ان کے سامنے مہروں کا بھرا صندوق رکھ دیا۔ اس میں گورو دکشنا (استاد کے نذرانہ) کے طور پر میں نے اپنے کچھ روپے بھی شامل کر دیئے تھے۔ کل ملا کر لگ بھگ دس ہزار روپے تھے۔ اتنے روپے پا کر اُن کے ماں باپ بہت ہی خوش ہوئے اور جلد ہی انھوں نے اپنا نیا مکان بنانا شروع کر دیا۔ اب مجھے پھر ایک مشکل سے دوچار ہونا پڑا۔ ہوا یہ کہ استاد کے والد صاحب عابد علی نے مجھے بُلا کر کہا۔ تم نے میرے بیٹے سے جتنا سیکھنا تھا سیکھ لیا۔ اب وزیر خاں کے پاس جا کر ان سے بھی کچھ سیکھو ایک ہی شخص سے سیکھ کر موسیقی کا مکمل علم حاصل نہ کر سکو گے۔ مگر وزیر خاں سے ملنا کوئی آسان نہ تھا۔ لاکھ کوشش کی۔ مگر اُن کے دولت خانے میں داخل نہ ہو سکا آخر ہار کر میں نے خودکشی کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن یہ بھی نہ کر سکا۔ ایک مولوی صاحب نے مجھے بچا لیا اور نواب صاحب رام پور کے دربار میں رسائی کی صورت پیدا کر دی۔ اس وقت رام پور دربار میں سات سو گانے بجانے والے تھے۔ خود نواب صاحب کو بھی موسیقی کی اچھی واقفیت تھی۔

جب میں وہاں پہنچا تو نواب صاحب نے مجھ سے کہا "میں گاتا ہوں۔ تم بیلا پر سنگت کرو۔" انھوں نے گایا اور میں نے سنگت کی۔ میں اُن کے گانے پر فریفتہ ہوا اور وہ میرے باجے پر۔ انھوں نے مجھے نوکری دینا چاہی مگر میں نے انکار کر دیا۔ اور وزیر خاں صاحب سے تعلیم لینے کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے فوراً وزیر خاں کو بلوایا اور مجھے شاگرد کے طور پر ان کے سپرد کر دیا شاگرد بنتے وقت مجھ سے یہ وعدہ لیا گیا کہ میں اپنا علم کسی نا اہل کو نہیں دوں گا۔ بُری صحبت میں نہیں جاؤں گا۔ اپنے اس علم کے بدلے کسی سے کچھ مانگوں گا نہیں کسی رنڈی کو گانا بجانا نہیں سکھاؤں گا۔

اب میں اپنے گورو جی کے ساتھ رہنے لگا۔ دن بھر اُن کے جوتے، حقے پان دان، کھڑاؤں وغیرہ کی صفائی کرتا۔ نواب صاحب نے مجھ سے کہا تھا۔ "اپنے گورو جی کی خوب خدمت کرنا۔ روپے کے زور سے نہیں، خدمت کے زور سے ہی یہ علم سیکھا جا سکتا ہے۔" ان کی ہدایت کے مطابق میں، ان کی خدمت میں لگا رہتا تھا۔ وہ رات کے بارہ بجے گانے بجانے بیٹھتے تھے اور تڑکے تڑکے سوتے تھے۔ پھر آٹھ بجے سو کر اٹھتے تھے۔ ان کے اٹھنے سے پہلے ہی پاخانے کو فنائل سے دھو کر صاف کر دیتا تھا۔ بدھنے میں پانی بھی بھر دیتا۔ اس وقت سے جو میرا کام شروع ہوتا تو دن بھر یونہی چلتا رہتا تھا۔ ان کے کسی بھی کام کے لئے میں نے کبھی چون و چرا نہیں کی۔

استاد کی رہائش گاہ کے قریب ہی میں ایک گھر میں رہتا تھا۔ خدمت میں لگے رہنے کے باعث دن بھر تو مجھے وقت ملتا نہیں تھا۔ اس لئے شام کو سات بجے ریاض کرنے بیٹھتا۔ پھر سویرے چائے پینے کے بعد بھی وقت نکال کر تھوڑا گانا بجانا۔ بھیروی مجھے بہت پسند تھی۔ اس لئے سویرے عموماً بھیروی ہی چھیڑتا۔ لیکن اب تک استاد نے مجھے کچھ سکھانا شروع نہیں کیا تھا۔ اسی طرح ڈھائی برس گزرے۔ ان دنوں میں صرف چنے کھا کر پانی لیتا تھا اور بس۔

ایک دن استاد کے پاس میرے گھر سے تار آیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ میری بیوی نے جس کے ساتھ میرا بیاہ سات برس کی عمر میں کر دیا گیا تھا۔ تین تین بار خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس تار کے ملنے کے بعد سے ہی استاد کا میرے ساتھ رویہ ایک دم بدل گیا۔ اور انھوں نے خود اور اپنے لڑکے کے ذریعے مجھے سرود سکھانا شروع کیا۔ وہ میری تعلیم پر کافی محنت کرنے لگے۔ میرے کھانے پینے کا انتظام بھی انھوں نے اپنے ہی گھر کر دیا۔ اسی اثنا میں میں رام پور کی بینڈ پارٹی میں ایک گھنٹہ بیلا بجانے کا کام بھی کرنے لگا تھا۔ جس کے بدلے میں مجھے بطور اُجرت بارہ روپے ملتے تھے۔

تعلیم کا یہ سلسلہ تیس سال تک چلا اور کئی سازوں اور باجوں سے میری واقفیت ہو گئی۔ تب ایک دن استاد جی نے کہا۔ جاؤ، سیر و سیاحت کرو۔ تعلیم، اپدیش اور تجربہ یہ تینوں ہی علم ہیں۔ باکمال لوگوں کا گانا بجانا سنو اور انھیں اپنا گانا بجانا سناؤ۔

چناں چہ میں ملک کی سیاحت کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ کئی جگہوں کی سیر کرنے کے بعد کلکتہ پہنچا۔ وہاں بھوانی پور میں ایک محفلِ موسیقی کا انتظام کیا گیا۔ جس میں مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ میں وہاں پہنچا۔ دیکھو بڑے بڑے ماہرینِ موسیقی کے سامنے میری کیا پوچھ ہوتی۔ اس پر میرا پہناوا بھی بیدھا سادہ تھا۔ لیکن جب میری باری آئی اور میں نے طنبورے پر ایک تان چھیڑی تب لوگوں کا دھیان میری طرف ہوا۔ پورے آدھ گھنٹہ تک ولمبت کا آلاپ لیتا رہا۔ لوگوں کو اب کہیں جاکر یقین ہوا کہ میں بھی کچھ سنگیت جانتا ہوں۔ اب تو محفل کا یہ حال تھا کہ کوئی پان کھانے جا رہا تھا تو پان ہاتھ میں ہی رہ گیا۔ سگریٹ جلانے کی کوشش کرنے والے لوگوں کا سگریٹ منہ میں مگر دیا سلائی ہاتھ میں جوں کی توں۔ پورے چار گھنٹے گزر گئے سب کے سب ششدر۔ طبلچیوں کی تو حالت نہ پوچھئے۔ اب ہر طرف سے لوگ مجھے شاباش دے رہے تھے۔ میرا دل اپنے استاد کے لئے جذبۂ احترام سے بھرا تھا۔ میری ریاضت بے کار نہیں گئی تھی۔ یہ سب کچھ اس کا مظہر تھا۔ کچھ عرصہ بعد میں شام لال کھتری کے کہنے پر میہر ریاست میں آیا اور وہاں کے راجہ صاحب نے مجھے سنگیت سکھانے کے لئے اپنے پاس رکھ لیا۔ لیکن جب انھوں نے میری تنخواہ طے کرنی چاہی تو میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ سنگیت سکھانے کے لئے میں کوئی معاوضہ نہیں لے سکتا۔ تب انھوں نے مجھے دیوتر جائداد کا منتظم مقرر کر دیا اور اس حیثیت سے ایک سو پچاس روپے ماہوار دینے لگے۔ راجہ صاحب کو میں نے سنگیت سکھایا اور اس کے بعد شاہی خاندان کا معلمِ موسیقی بن گیا۔ اس دوران میں ملک کے دوسرے لوگوں نے بھی میری تعریف کی اور اس سے میری ہمت بڑھتی گئی موسیقی کی مشق جاری رہی اور آج تک قائم ہے۔ ایک بینڈ پارٹی بھی میں نے میہر میں قائم کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے ذریعہ بھی فنِ موسیقی کی کچھ خدمت ہو رہی ہے۔ اسی یقین پر اپنی زندگی کے دن بتاتے جا رہا ہوں۔

آخر میں ایک دو باتیں اپنے خاندان اور خیالات کے بارے میں بھی کہہ دوں۔ میری پیدائش [illegible] میں ہوئی تھی۔ اس حساب سے اب میری عمر [illegible] برس کی ہے۔ میرے ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں۔ میرے بیٹے علی اکبر سے آپ سب واقف ہیں۔ تین بیٹیاں ہیں۔ سروجنی، انّ پورنا اور جہاں آرا۔ انّ پورنا کے باعث مجھے ایک اور گویا بیٹا مل گیا ہے یعنی روی شنکر داماد کی شکل میں۔ میری بیٹیوں کے نام اور ہندو داماد کی بات سے آپ کو کچھ اچنبھا ہوتا ہوگا۔ لیکن حقیقت میں میں ہندو اور مسلم میں کوئی فرق نہیں مانتا۔ میں ہندو بھی ہوں اور مسلمان بھی۔ یہ تو آپ جان ہی گئے ہیں۔ اپنے پوتے کا نام میں نے ایسا ہی رکھا ہے۔ محمد اشیش۔ مسلمان ہونے کے باعث محمد اور ہندو ہونے کے باعث اشیش گوشت بھی میں نے کبھی نہیں چھوا — اسے آپ میرا ہندو پن کہئے یا اور کچھ ناد سرسوتی کا ایک ادنےٰ سا پجاری ہوں۔ حقیقتاً یہی میرا مذہب ہے۔ یہی میری ذات اور یہی سب کچھ۔

غزل

رند فیض آبادی

ہم جو جینے کا حوصلہ کرتے
خونِ دل سے چمن بسا کرتے

اہلِ گلشن ہی بے خبر ٹھہرے
خوشہ چینوں سے کیا گلہ کرتے

حادثوں کا شمار ہو نہ سکا
خونِ دل کا حساب کیا کرتے

ہم کو اپنوں سے رنج پہنچے ہیں
غیر کیا ہم کو بے مزہ کرتے

جاگ اُٹھتا ہے زندگی کا گداز
ورنہ نغموں سے دل جلا کرتے

دل کے جلنے کی بو نہیں چھپتی
اشک ہوتے تو پی لیا کرتے

جام خالی ہی ہو گئے ورنہ
رندؔ اپنا بھی تجزیہ کرتے

مظفّر شاہ

اقوامِ متّحدہ اور ہندوستان

ہندوستان شروع ہی سے اقوامِ متّحدہ میں شامل ہے۔ ہندوستان نے سان فرانسسکو چارٹر پر دستخط کئے تھے جس کی بدولت اقوامِ متحدہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس چارٹر میں کہا گیا ہے کہ اس ادارہ کی بنیاد تمام ممبر قوموں کی خودمختاری اور برابری کے اصول پر قائم ہے۔

دُنیا کی مجالس میں پہلی مرتبہ آزاد ہندوستان کی آواز اس وقت سُنی گئی جب کہ ستمبر ۱۹۴۶ء میں نئی ایگزیکیٹو کونسل بنی اور پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کونسل کے نائب صدر اور امورِ خارجہ کے ممبر کی حیثیت سے یہ اعلان کیا کہ وہ اور اُن کے ساتھی اس توقع پر حکومت میں شامل ہوئے ہیں کہ ملک کو بہت جلد مکمل آزادی حاصل ہو جائے گی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ نئی حکومت بین اقوامی کانفرنسوں میں ایک آزاد قوم کی حیثیت سے پورا حصّہ لے گی اور خود اپنی پالیسی پر عمل درآمد کرے گی، کسی دوسری قوم کے خیمہ بردار کی حیثیت قبول نہ کرے گی۔

چناں چہ ۱۹۴۶ء میں اقوامِ متّحدہ کی جنرل اسمبلی میں ہندوستانی نمائندوں نے عملی طور پر یہ ثابت کر دیا کہ پنڈت نہرو جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں۔ پنڈت نہرو نے حکومت میں شریک ہوتے وقت جن اصولوں کی وضاحت کی تھی انھیں پر ہندوستانی نمائندوں نے عمل کیا۔ پنڈت نہرو نے کہا تھا "خارجی معاملات میں ہندوستان ایک آزاد پالیسی اختیار کرے گا اور ان سیاسی حلقہ بندیوں سے الگ تھلگ رہے گا جو ایک دوسرے کے خلاف قائم ہوں گی۔ ہندوستان محکوم قوموں کی آزادی کی حمایت کرے گا اور جہاں کہیں بھی نسلی امتیاز برتا جاتا ہے اُس کی مخالفت کرے گا۔ وہ بین اقوامی تعاون اور خیر سگالی کے لئے دوسری امن پسند قوموں کے ساتھ مل کر کام کرے گا۔ جس کا مقصد یہ ہوگا کہ کوئی ایک قوم دوسری قوم سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے۔ ہندوستان چارٹر کی روح اور الفاظ کے مطابق اقوامِ متّحدہ کے ساتھ پورا پورا تعاون اور غیر مشروط وفاداری کا برتاؤ کرے گا۔ اسی مقصد کے لئے ہندوستان اس ادارہ کے مختلف کاموں میں پورا پورا حصّہ لے گا اور جہاں تک ہندوستان کی جغرافیائی حیثیت، آبادی اور پُرامن ترقّی میں حصّہ لینے کا تعلّق ہے وہ ادارہ اقوامِ متّحدہ کی مختلف انجمنوں میں اپنا صحیح رول ادا کرنے کی کوشش کرے گا۔"

اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان پوری طرح آزاد ہوا تو اس نے نہ صرف اقوامِ متّحدہ کے ممبر کی حیثیت سے تمام ذمہ داریوں کو قبول کیا بلکہ اس کی خارجی پالیسی کی بنیادی باتیں بھی وہی رہیں۔ چناں چہ اس نے اندرونی اور بیرونی مسائل میں انھیں اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے اقوامِ متّحدہ کے ساتھ پورا تعاون کیا اور اس میں ہندوستان کی دل چسپی صرف اپنے متعلقہ مسائل تک محدود نہ رہی بلکہ اُس نے دوسرے اہم مسائل اور خاص کر امنِ عالم سے متعلق تمام مسائل میں گہری دل چسپی لی۔ اور انسانی فلاح و بہبود کے کاموں میں زیادہ سے زیادہ حصّہ لیا۔ کیونکہ ہندوستان کا شروع سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ ان سب کی بقا امن و سلامتی میں ہے۔ وزیرِ اعظم پنڈت نہرو کا خیال ہے کہ دنیا کو مخالف کیمپوں میں بانٹ دینے کا طریقہ ہی جھگڑے کی جڑ ہے جس کو دُور کرنا ضروری ہے۔ اس سے زبردست خوف و ہراس پیدا ہوتا ہے جس سے انسانوں کے دماغ دھندلا جاتے ہیں اور وہ غلط راستوں پر چل پڑتے ہیں۔ اسی مقصد سے ہندوستان ان تمام کارروائیوں کو بڑی دل چسپی کی نظر سے دیکھتا رہا ہے جو ادارۂ اقوامِ متّحدہ کو

عالمی امن و سلامتی کی حفاظت کے لئے زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانے کی خاطر کی جاتی رہی ہیں۔ ۱۷ جنوری کو پارلیمنٹ میں وزیر اعظم نے ہندوستان کی خارجی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا:-

"اقوامِ متحدہ کو امن کے لئے ایک بڑی تنظیم سمجھنے کے بجائے اس کے کچھ ممبر رفتہ رفتہ اسے ایک ایسی تنظیم سمجھنے لگے ہیں جس کے ذریعہ جنگ چھیڑی جا سکتی ہے۔ اقوامِ متحدہ کے قیام کی پشت پر جو اصلی خیال تھا وہ اس خیال سے بہت دور ہے اور اگرچہ اقوامِ متحدہ کا چارٹر موجود ہے لیکن کسی نہ کسی طرح حقائق نے جھٹلانا شروع کر دیا۔"

اس کے علاوہ ہندوستان نے امن کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے بہت سے عملی قدم بھی اٹھائے۔ کوریا کی لڑائی سے متعلق مسائل کو حل کرنے میں اس نے جو حصہ لیا وہ اس بات کی نہایت شاندار مثال ہے۔ ۱۹۵۲ء میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں ہندوستان نے جنگی قیدیوں کے الجھے ہوئے مسئلہ کے حل کے لئے ایک تجویز پیش کی چنانچہ ۱۹۵۳ء میں ہندوستانی تجویز کی بنیاد پر ہی جنگی قیدیوں سے متعلق سمجھوتہ عمل میں آیا۔ ہندوستان نے اس سمجھوتہ پر عمل درآمد کرانے میں بھی اہم پارٹ ادا کیا۔ وہ قیدیوں کی واپسی کے غیر جانبدار قوموں کے کمیشن کا چیئرمین بھی تھا۔ اور اس کمیشن کی امداد کے لئے مسلح فوجیں اور دیگر کارکن بھی ہندوستان ہی نے مہیا کئے تھے۔

جن دیگر مسائل میں ہندوستان کی مساعی بہت نمایاں رہیں۔ ان میں تخفیفِ اسلحہ اور ایٹمی طاقت کے بین اقوامی کنٹرول کی تجویزیں شامل ہیں۔

ہندوستان نے یہ بھی محسوس کیا کہ اقوامِ متحدہ عالمی معاملات اسی وقت اپنا اخلاقی اثر ڈال سکتی ہیں جب کہ یہ ادارہ وسیع بنیادوں پر قائم ہو۔ اور بین اقوامی صورتِ حال سے متعلق موجودہ سیاسی اور فوجی حقائق کا آئینہ دار ہو۔ اسی وجہ سے ہندوستانی نمائندے برابر کہتے رہتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے اقوامِ متحدہ کے دروازے سب قوموں کے لئے کھلے ہوں اور چین کی قومی جمہوریہ کو اس ادارہ میں اس کا جائز مقام ملنا چاہیئے۔ چونکہ چین کی عوامی جمہوریہ کی حکومت ہی ملک پر مؤثر کنٹرول رکھتی ہے۔ اس لئے اس کو اقوامِ متحدہ میں نمائندگی کا پورا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ اقوامِ متحدہ کے دائرے میں ان عالمی مسائل کو حل کرنے کی جانب توجہ دینے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی یہ کوشش بھی رہی کہ بین اقوامی میدان میں جنگ اور ایسے دیگر مسائل کے بنیادی اسباب کو دور کیا جائے۔ ان میں سے بعض سبب یہ ہیں۔ ایک ملک کا دوسرے ملک پر اقتدار، نسلی امتیاز، غریبی، بیماریاں اور جہالت۔ آج انسانیت کا ایک بڑا حصہ ان کا شکار ہے۔ اور انھیں دور کرنے کے لئے اقوامِ متحدہ جیسے بین اقوامی ادارہ کو اہم کام کرنا ہے۔ اور یہ جبھی ہو سکتا ہے کہ ایک سچے بین اقوامی ادارہ کی حیثیت سے اقوامِ متحدہ کا دنیا بھر میں وقار قائم ہو۔ اسی بات کو سمجھتے ہوئے ہندوستان شروع سے ہی اقوامِ متحدہ کے ساتھ پورا پورا تعاون اور غیر مشروط وفاداری پر عمل پیرا رہا ہے۔

ساحر ادیبی

غزل

ادب ہے شرط کہ ہے ان کی بارگاہِ جمال — یہاں جبینِ محبت جھکا کے بات کرو
سمجھنے والے سمجھ لیتے ہیں اشارے بھی — یہ کیا ضرور ہے سب کو سنا کے بات کرو
فرازِ طور پہ ہوتی تھیں جس طرح باتیں — یونہی ہمیں بھی کسی دن بلا کے بات کرو
فریب ہے یہ محبت، نہ تم کہو ناصح — نظر کا تیر کلیجے پہ کھا کے بات کرو

چمن میں ہو جو کسی گل سے گفتگو ساحر
تو نوکِ خار سے دامن بچا کے بات کرو

ع.م.

نئی کتابیں

انقلابِ روس اور روس انقلاب کے بعد

مُصنف م۔م۔جوہر، ناشر مکتبہ برہان اردو بازار دہلی۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۵۰۴ صفحات۔ کتابت طباعت عمدہ، کاغذ اوسط، جلد اور جلد پوش اوسط سے بہتر۔ قیمت سات روپے۔

شروع میں ڈاکٹر سیّد عابد حسین کی تقریظ ہے۔ کتاب کے پہلے حصّے میں انقلابِ روس کے محرکات اور لینن کی رہنمائی میں منزلِ مقصود تک پہنچنے کی تفصیلات ہیں۔ دوسرے میں ۱۹۲۵ء سے دوسری جنگِ عظیم میں نازیوں کی شکست تک کے حالات کا تفصیلی بیان اور جائزہ ہے یہ کتاب بڑی مفصل اور جامع ہے مُصنّف نے بڑی محنت اور کاوش سے مستند بیانات کی بنیادوں پر اس تصنیف کو مکمل کیا ہے۔ لینن نے مارکس کی تعلیمات کی بنیاد پر انقلاب کا جو نظریہ قائم کیا تھا مُصنّف اس کے حامی ہیں اور بڑی دیانت داری سے اُس کا اعتراف کرتے ہیں۔ اردو میں ایسی کتابیں کم ہیں۔ معلومات سے پُر یہ کتاب اردو داں حضرات کے لئے یقیناً دلچسپی کا سامان ہوگی۔ قطع نظر اس کے کہ انھیں مُصنّف کے خیالات سے اتفاق ہو یا اختلاف۔

میر کی آپ بیتی

میر محمد تقی میرؔ کی خود نوشت سوانح عمری (ذکرِ میر کا اردو ترجمہ ضروری حواشی اور تعلیقات کے ساتھ۔ مرتب و مترجم نثار احمد فاروقی۔ ناشر۔ مکتبہ برہان ۱ اُردو بازار دہلی ۶۔ ضخامت ۲۰×۳۰/۱۶ تقطیع کے ۱۹۲ صفحات۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے

نثار احمد فاروقی ان نوجوان ادیبوں میں سے ہیں جو ادب کا مطالعہ بڑی محنت اور عرق ریزی سے کرتے ہیں۔ اتنی کم عمری میں آپ نے شُلجھے ہوئے ادیبوں میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ یہ مفید اور دلچسپ کام بھی لائقِ تحسین ہے۔ ذکرِ میر فارسی میں تھی اور وہ بھی کم یاب۔ اب اردو میں اس کا ترجمہ ہوگیا تو وہ لوگ جن کی دسترس فارسی تک نہیں اسے پڑھ کر میرؔ کے مستند حالاتِ زندگی اور اُس عہد کی تاریخ کے مطالعے سے بہرہ اندوز ہو سکیں گے۔

بیگماتِ اودھ

مُصنّف شیخ تصدق حسین۔ پبلشر کتاب نگر۔ دین دیال روڈ لکھنؤ۔ ضخامت ۲۲×۳۰/۱۶ تقطیع کے ۲۰۸ صفحات قیمت تین روپے کتابت و طباعت اوسط

شیخ تصدق حسین نے اپنی عمر کا بڑا حصّہ تاریخِ اودھ کے مطالعے میں صرف کیا ہے۔ یہ کتاب اُسی طویل مطالعے کا نتیجہ ہے۔ زبان سادہ اور با محاورہ ہے۔ بیان میں مبالغے کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ نواب سعادت خاں برہان الملک سے لے کر نواب سعادت علی خان تک پانچ نوابوں کی بیگمات کے ذکر کے بعد شاہ زمن غازی الدین حیدر بادشاہ اوّل اور اس کے بعد کے چار بادشاہوں کی بیگمات کا تفصیلی ذکر اس کتاب میں ہے۔ جانِ عالم واجد علی شاہ بادشاہ پنجم تھے۔ انھیں کی بیگمات کے حالات پر یہ کتاب ختم ہوتی ہے۔ کتاب بڑی دلچسپ ہے اور قدر افزائی کی مستحق۔

چراغِ فکر

من موہن تلخؔ کا مجموعۂ کلام۔ قیمت دو روپے پچاس پیسے۔ ضخامت ۱۴۰ صفحات کتابت، طباعت، کاغذ عمدہ۔ ناشر مکتبۂ قصرِ اردو، اردو بازار دہلی۔ تلخؔ بڑے ہونہار نوجوانوں میں سے ہیں۔ مطالعہ اور اُس کے بعد فکر ان کا محبوب مشغلہ ہے سُونی زندگی اور اس کا ویرانہ پن انھیں اس قدر پسند ہے کہ یہ سے دُور کرنے کا نہ جتن کرتے ہیں اور نہ کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے کہتے ہیں ؎

ویرانۂ ہستی میں خلاؤں کی ہے گونج
ہیں کس پہ صداؤں کوئی آواز بھی ہو

لیکن یہ بات بڑی حوصلہ افزا ہے کہ تلخ غم ایام کی تلخیوں سے گھبراتے نہیں ان کی زندگی، مایوسیوں، محرومیوں اور ناشادیوں کا مجموعہ سہی لیکن وہ ان تمام مدارج زندگی میں اپنے فکر کے فلسفیانہ انداز کو نہیں چھوڑتے۔ اُمید کی کرن کبھی کبھی پھوٹتی ہے تو بے پناہ آجانے کی حامل ہوتی ہے۔

شکستہ پا کو بھی اب ذوقِ رہ نوردی ہے
دلوں میں ہم نے وہ دھن منزلوں کی بھر دی

تلخؔ کا بیشتر کلام نہ غمِ جاناں ہے نہ غمِ دوراں اس میں خود اپنا غم ہے۔ اپنی زندگی کی تصویر ہے۔ انداز قنوطی ہی سہی لیکن اس حد تک جاں گداز ہیں چونکہ حقیقت ہے اس لئے دل میں کھب جاتی ہے۔ تلخؔ کا کلام ایک اچھے ہوتے شاعر کا کلام ہے۔ وہ شعور و آگہی کی پُرثبات منزل میں ہیں۔ ان کے کلام میں تنوع ہے۔ غزل، رُباعی اور نظم سب اصناف پر انھیں قدرت ہے۔ ان کی زبان لطیف ترکیبوں کی حامل ہے وہ زبان کے عامیانہ پن اور عام اصطلاحات سے بچتے ہیں اور اس میں انھیں کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ اس کے باوجود ایک نسبتاً کم شاعر کے کلام میں اگر کہیں کہیں زبان و بیان کا سقم ملے تو یہ کہہ کر خاموش ہونا پڑے گا

ع گر سخن اعجاز باشد بے بلند و پست نیست

اتنی گنجائش نہیں کہ کلام پر طویل تبصرہ یہاں درج ہو ورنہ تلخؔ کا کلام اس امر کا متقاضی ہے کہ اس پر تفصیل سے لکھا جائے۔ ہم دست بدعا ہیں کہ تلخؔ کی زندگی میں وہ وقت بھی آئے جب وہ ان رنگینیوں اور دلآویزیوں سے ہم کنار ہو۔ جب دنیا میں آئے وہ لوگ بھی ملیں جنھیں وہ اپنا کہہ سکے۔ یوں تو آہ میں جو لطف ہے وہ واہ میں نہیں پھر بھی ہم متمنی ہیں کہ تلخؔ یہ کہنے پر مجبور نہ ہو۔

دوستی کا کوئی فریب ہی دے
اس قدر زندگی میں تنہا ہوں

اُردو کے چاند تارے یا مرقعِ شعرائے اُردو

مرتب امیر حسن نورانی۔ ناشر راجہ رام کمار بک ڈپو۔ وارث نول کشور بک ڈپو لکھنؤ۔ ضخامت ۴۴۴ صفحات۔ کتابت، طباعت، جلد عمدہ۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ اس کتاب میں اردو کے باکمال شاعروں کا مصور تذکرہ و نمونۂ کلام ہے۔ امیر خسرو سے لے کر فیض تک ۴۹ شعراء کا تذکرہ ہے۔ اس حسین و جمیل کتاب کو نادر تصاویر کی بنا پر ہر لائبریری کی زینت ہونا چاہیئے۔

نامہ ہائے پدرے بدخترش

پنڈت جواہرلال نہرو نے جو خطوط اندرا گاندھی کو دو ڈھائی سال کی مدت میں جیل سے لکھے تھے۔ ان میں تاریخ عالم کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ یہ خطوط انگریزی میں شائع ہوئے تھے۔ ان کا ترجمہ فارسی میں محمود تفضلی نے کیا ہے اور یہ کتاب ایران میں چھپی ہے۔ کتاب مصور ہے۔ قیمت کتاب پر درج نہیں۔ کتاب فردوسی پریس تہران میں خوبصورت ٹائپ میں شائع ہوئی ہے۔

حسرت کدہ

شفقت کاظمی کے کلام کا مجموعہ۔ ناشر علمی کتب خانہ مظفرگڑھ (پاکستان) قیمت تین روپے۔ ضخامت ۱۷۶ صفحات۔ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$۔ کتابت، طباعت، جلد اوسط، جلد پوش عمدہ۔

شفقت کاظمی حسرت موہانی کے نامور شاگرد ہیں۔ غزل آپ کا میدانِ سخن ہے اور اس میں بھی حسرت ہی کا انداز نمایاں ہے۔ نیاز فتح پوری اور سالک نے کتاب کے شروع میں مصنّف کو دادِ سخن دی ہے۔ نیاز کا قول ہے۔

ایک اچھے شعر کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر ہم اس کی خوبیوں کو بیان کرنا چاہیں تو نہ کر سکیں اور یہ خصوصیت ہم کو کلام شفقت میں زیادہ ملتی ہے۔

انھیں کے قرب کی حسرت رہی مجھے شفقت
جو میری بزمِ تصور میں بار بار آئے

آہ وہ ماجرائے دردِ جگر
جو کسی کی سمجھ میں آ نہ سکا

سالک صاحب کا قول ہے۔ شفقت کاظمی کی غزل میں وہی خوشبو محسوس ہوتی ہے جس سے کلام حسرت مہک رہا ہے۔ وہی مہذب و شائستہ اسلوبِ اظہار، وہی نپے تُلے الفاظ و تراکیب، وہی عشق و تصوف کی آہستہ آہستہ سلگتی ہوئی آگ شفقت کاظمی کے کلام میں موجود ہے۔

اب یہ اپنے سے ہے گلہ مجھ کو
تجھ سے کیوں رسم و راہ پیدا کی

آباد رہے دیار تیرا
کچھ روز قیام کر چلے ہم

دُنیا طلبی سے تنگ آ کر
دنیا کو سلام کر چلے ہم

ان عبارتی بھر کم آراء سے مرعوب نہ ہو کر شفقت کے کلام کو دیکھئے۔ ہر صفحہ سہل ممتنع اور برجستہ اشعار کا حامل ہے۔ کلام میں محبت کی پاکیزگی، جذبۂ عشق کی وارفتگی اور صفائی زبان و بیان کی عذوبت و حلاوت ہر جگہ ملے گی۔

یہ رنگ اگر ہے کسی کا
دل ٹوٹ نہ جائے زندگی کا

دیکھا تھا جو اک بار تجھے آنکھ اٹھا کر
اب تک ہیں مری سمت زمانے کی نگاہیں

اُن سے اظہار حال کون کرے
وہ مری بات کم سمجھتے ہیں

شفقت کاظمی نے ڈیرہ غازی خان ایسے دُور افتادہ مقام پہ زندگی بسر کی ہے۔ زبان میں یہ لوچ اور رَس اللہ کی دین ہے۔ گمانِ غالب یہی ہے کہ وہ

شاید دلّی اور لکھنؤ تک کبھی آئے بھی نہیں۔ ان کا یہ شعری کارنامہ ہر حیثیت سے داد اور حوصلہ افزائی کا مستحق ہے۔

زمزمستاں

حسن عظیم آبادی کے کلام کا مجموعہ جو غزلوں، نظموں، قطعات اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ ضخامت ۱۰۶ صفحات۔ قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ: پروفیسر حسن عظیم آبادی گورنمنٹ کامرس کالج چٹاگانگ۔ مشرقی پاکستان۔ پیش لفظ حضرت جمیل مظہری نے لکھا ہے۔ حسن کے کلام میں بڑی گوناگونی ہے۔ کہیں وہ زندگی کی دشوار گزار راہوں کو طے کرتے اور کہیں حسن کی دلآویزیوں کے ساتھ کھیلتے نظر آرہے ہیں۔

کھڑا ہوں بن کے میں کوہِ عزائم — پلٹ جائیں نہ کیوں طوفاں کے دھارے
حاصلِ عمر بن گئی ہیں حسن — حسنِ ایماں شکار کی باتیں

حسن کا کلام بڑا صاف اور ستھرا ہے۔ بیان کے البیلے پن کے ساتھ فکر کی سنجیدگی بھی کم یاب نہیں۔ اس دور میں جب کہ ہلکی پھلکی شاعری کی فراوانی ہے اس طرح کا سکون آمیز اور ٹھہراؤ کا حامل کلام بڑی غنیمت چیز ہے۔

موصولات

لکھنؤ اور جنگ آزادی

۱۸۵۷ء اور اس زمانے کے حالات جہاں تک لکھنؤ کا تعلق ہے۔ ضخامت ۱۳۶ صفحات۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ۔ ادبی اکاڈیمی نیا گاؤں لکھنؤ یا مکتبہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ۔

ادبی تجزئے

پروفیسر مبشر علی صدیقی کے مضامین کا مجموعہ۔ ضخامت ۹۶ صفحات۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ۔ سردار صاحب ماسٹر جگت سنگھ رسالہ رہنمائے تعلیم مفتی والان دہلی۔

سوزِ مسلسل

فرحت انوار صاحب کے افسانوں کا مجموعہ۔ پبلشر بیگ اینڈ سنز ناقد بک ڈپو کراچی۔ قیمت تین روپے۔ شاہد احمد دہلوی نے مصنف کے باب میں بہت اچھی رائے ظاہر کی ہے۔

> "فرحت انوار صاحب کے تمام افسانے روزمرہ کے مشاہدات پر مبنی ہیں ...... ان میں مریضوں کا ذکر ہوتا ہے مگر ان کے افسانے مریضانہ نہیں ہوتے۔ شگفتگی اور زندہ دلی ان کے ہر افسانے سے ٹپکتی ہے۔"

محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ وقار خلیل۔ قیمت ۵۰ نئے پیسے۔ سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیاتِ اردو شعبہ ادبِ اطفال حیدرآباد کے بانی، اردو کے پہلے عوامی شاعر، تاجدارِ گولکنڈہ محمد قلی قطب شاہ کی جیون کہانی ۳۲ صفحات

ٹونک کی عیدیں

مصنف منظور الحسن برکاتی۔ قیمت ۶ آنے ضخامت ۲۳ صفحات۔ کتاب مصنف سے شفا منزل ٹونک راجستھان کے پتے سے مل سکتی ہے۔

شاخِ زیتون

جناب شفا گوالیاری کی رباعیات کا ایک مختصر کتابچہ۔ بہ قامت کہتر و بہ قیمت بہتر۔ قیمت فی جلد ۴ آنے۔ ناشر جدید پبلیکیشنز نزد بھوپال ٹاکیز۔

غنچہ و گل

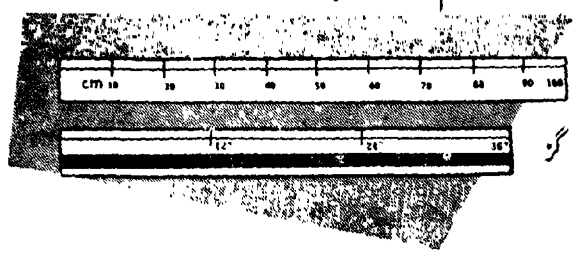
بینی سلی پوری کے کلام کا مجموعہ۔ ضخامت ۴۴ صفحات۔ ملنے کا پتہ۔ پنچ ہفتہ وار اشوک۔ رام بازار سونی پت۔

ضروری گذارش

۱۔ مضمون پورے سائز کے کاغذ کے ایک طرف، صاف اور خوشخط لکھا ہوا ہونا چاہئے۔
۲۔ غیر طلبیدہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جائیں گے جب ان کے ساتھ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ بھیجے جائیں گے۔

تصحیح ۔ اس شمارے کے صفحہ ۳۲ پر بی۔ ایل ادیب لکھنوی کی جگہ پروفیسر ادیب جبل پوری پڑھا جائے۔

میٹرک نظام کیا ہے؟



اس نظام کا نام ناپ کے بنیادی یونٹ میٹر کی رعایت سے میٹرک رکھا گیا ہے۔ تمام عشری نظاموں کی طرح اس میں بھی سارا حساب کتاب دس کے قاعدے سے ہوتا ہے۔ چنانچہ ناپ تول اور حجم کے پیمانے دس ہی سے ضرب یا تقسیم کرکے بڑھائے یا گھٹائے جا سکتے ہیں۔

میٹرک نظام میں بڑے یونٹ بنانے کے لئے میٹر سے پہلے لفظ ڈیکا (یعنی ۱۰ گنا) لگایا جاتا ہے اس طرح ہیکٹو (۱۰×۱۰ = ۱۰۰ گنا) اور کیلو (۱۰×۱۰×۱۰ = ۱۰۰۰ گنا) کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ چھوٹے یونٹ لفظ ڈیسی (۱/۱۰) لگا کر بنائے جاتے ہیں۔ سینٹی (۱/۱۰۰) کو اور ملی (۱/۱۰۰۰) کو ظاہر کرتا ہے۔

ناپ تول کا میٹرک نظام اکتوبر ۱۹۵۸ء سے شروع ہو رہا ہے

میٹرک ناپ کی جان پہچان

ناپ کا بنیادی یونٹ میٹر ہے

۱ میٹر = تقریباً ۴۰ انچ

۱ کیلومیٹر = ۵ فرلانگ

چھوٹے یونٹ

۱۰ ملی میٹر = ۱ سینٹی میٹر

۱۰ سینٹی میٹر = ۱ ڈیسی میٹر

۱۰ ڈیسی میٹر = ۱ میٹر

بڑے یونٹ

۱۰ میٹر = ۱ ڈیکا میٹر

۱۰ ڈیکا میٹر = ۱ ہیکٹو میٹر

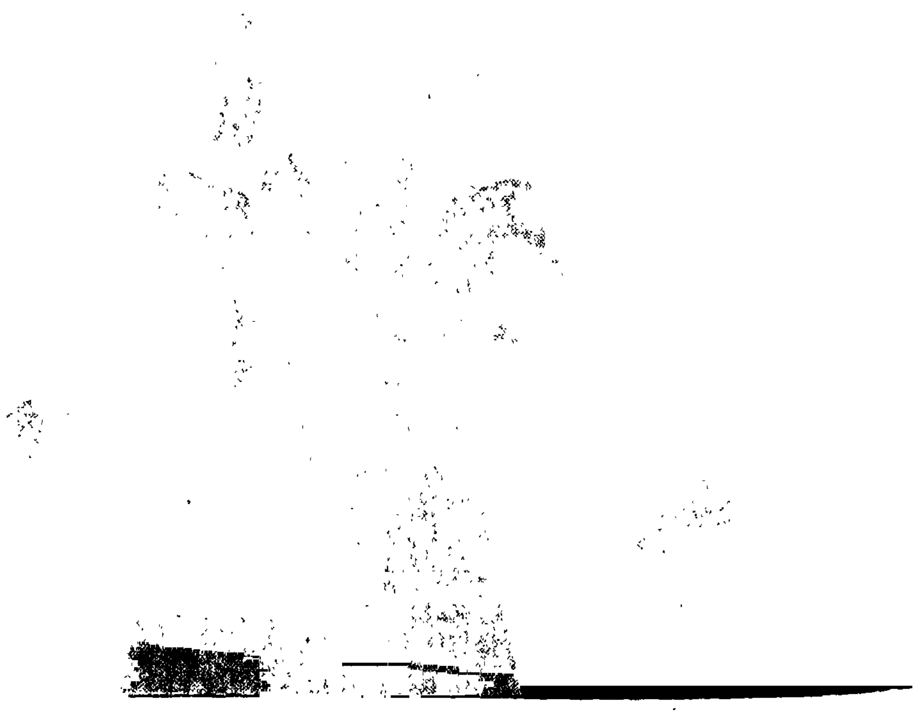
۱۰ ہیکٹو میٹر = ۱ کیلو میٹر

OA 58/109

جاری کردہ حکومت ہند

Edited and Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi

Regd. No. D—509

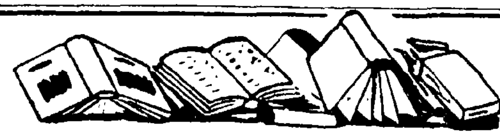


نومبر ۱۹۵۸ء

کارنگ، اٹرپاش ٹنگ سمنٹ

۵۰ نئے پیسے

ہماری کتابیں



نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
پنڈت نہرو سے بات چیت (نامور فرانسیسی جرنلسٹ تیبر منڈی)	دو روپے	۵۰ نئے پیسے
دیس دیس کی لوک کہانیاں	۷۵ نئے پیسے	۲۵ نئے پیسے
بھارت کی لوک کہانیاں	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
اپنے گھر کو آگ سے بچائیں	۷۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
ہماری کامیابیاں اور نئی منزلیں	۶۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی	۷۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
ناپ تول کا میٹری نظام	۳۵ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
ہمارے نئے سکے	۵ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
کیلنڈر کی اصلاح	۴۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے

نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
جواہر لال نہرو کی تقریریں (۱)، (۲)، (۳)، (۴)، (۵)	۱۰ نئے پیسے (فی کاپی)	۸ نئے پیسے (فی کاپی)

ہندوستان ترقی کی راہ پر

نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
نئے سماجی نظام کی جانب	۱۰ نئے پیسے فی کاپی	۸ نئے پیسے فی کاپی
آبپاشی اور بجلی		
ہمارے پلان اور سوشلزم		
صنعتی ترقی		
خوراک اور زراعت		
رسل و رسائل		

(رجسٹری خرچ الگ)

پچیس روپے یا اس سے زیادہ کی کتابوں پر ڈاک خرچ نہیں لیا جائے گا قیمت پیشگی اور پوسٹل آرڈر کے ذریعے بھیجنے سے آسانی رہتی ہے

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸

ترتیب

سرورق :- دیوالی

نومبر ۱۹۵۸ء

کاتک - اگرہائن شک سمت ۱۸۸۰

جلد ۱۷ - نمبر ۴

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر "آج کل" اردو اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸

اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آج کل

دہلی

مجلسِ ادارت

محمد مجیب — جامعہ ملیہ دہلی

محی الدین قادری زور — حیدرآباد

گوپی ناتھ امن — دہلی

خواجہ احمد فاروقی — دہلی

رحمان راہی — سری نگر

یو. ایس موہن راؤ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن

جی. ایس. راگھون ڈپٹی ڈائرکٹر (ایڈیٹوریل)

جی نجا ناتھ ڈپٹی ڈائرکٹر (پبدوکشن)

بال مکند عرش ایڈیٹر شعبۂ اردو یکنڈی

مدیر مسئول

اسسٹنٹ ایڈیٹر مظفر شاہ

سالانہ چندہ :- ہندوستان میں : چھ روپے
پاکستان میں : چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے :- نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ :— ہندوستان میں :- ۵۰ نئے پیسے
پاکستان میں :- آٹھ آنے (پاک)

مرتبہ و شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

مُلاحظات

ڈاکٹر بھگوان داس جنھوں نے ۱۸ ستمبر کو بنارس میں انتقال کیا، ملک کے بہت بڑے عالم تھے۔ وہ ہندوستان کے ان چند لوگوں میں تھے۔ جن میں تفکّر اور عمل دونوں کا حسین امتزاج تھا۔ اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے انھوں نے نہ صرف ہندو مسلم اتحاد کی پُرخلوص کوشش کی بلکہ ساری دنیا کو یہ بتایا کہ سارے مذاہب کی بنیاد ایک ہی ہے۔ ایک ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے انھوں نے ملک کی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سری مہادیو داس بنارس کے زمیندار تھے۔ صرف ۱۹ سال کی عمر میں انھوں نے کلکتہ یونی ورسٹی کے ایم۔اے (فلسفہ) کا امتحان پاس کر لیا۔ کچھ دنوں تک ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر مامور رہے۔ مگر مادرِ وطن کی خدمت کے جذبے نے انھیں ملازمت پہ ٹکنے نہ دیا اور انھوں نے اس سے استعفٰی دے دیا اور اس کے بعد مختلف قومی اور سیاسی کاموں میں مصروف رہے۔

۱۹۲۱ء میں عدمِ تعاون کی تحریک میں حصّہ لے کر گرفتار ہوئے اور ۱۹۲۲ء میں رہا کیے گئے۔ ۱۹۳۴ء میں آپ ہندوستانی مجلسِ قانون ساز کے بلا مقابلہ ممبر منتخب ہوئے۔ بنارس اور الٰہ آباد کی یونی ورسٹیوں نے آپ کو ڈی۔لٹ کی اعزازی ڈگریاں دیں۔ اُن کی موت سے ہندوستان کی ادبی دنیا میں ایک خلاء پیدا ہو گیا ہے جس کا پُر ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔

بمبئی کے نزدیک کیمبے میں تیل کی دریافت نے ملک میں خوشی کی لہر دوڑا دی ہے۔ ابھی یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں کتنی مقدار میں تیل مل سکے گا۔ پھر بھی حالات امید افزا ہیں۔ روسی اور ہندوستانی انجینئر اس قیمتی دریافت کے حصول میں لگے ہوئے ہیں۔ ابھی برمانے کا کام جاری ہے۔ دس ہزار فٹ تک کی گہرائی تک پہنچنے کے بعد کوئی یقینی صورت حال پیدا ہوگی۔

کیموئے اور ماتسو پر چینی بمباری نے مشرقِ بعید میں ایک نازک صورتِ حال

آج کل دہلی

پیدا کر دی ہے۔ چین کا یہ کہنا ہے کہ یہ جزیرے اس کی ملکیت ہیں اور نیشنلسٹ چین کا قبضہ جارحانہ ہے۔ کمیونسٹ چین کا یہ دعویٰ حق بجانب ہے۔ مگر امریکی مداخلت اور نیشنلسٹ چین کی امداد سے بڑی خطرناک صورت پیدا ہو گئی ہے وارسا میں کمیونسٹ چین اور امریکہ کے سفیروں کے درمیان گفت و شنید جاری ہے۔ اقوامِ متحدہ میں برطانوی وزیرِ خارجہ مسٹر سیلون لائیڈ اور ہندوستانی وزیرِ دفاع مسٹر کرشنا مینن اسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ صورت حال بہتر ہو جائے اور مذاکرات کے ذریعے اس نزاع کو طے کیا جائے۔ مسٹر ڈلس سے بارہا ملاقات کا نتیجہ امید افزا نکلا ہے اور اس کا امکان پیدا ہو گیا ہے کہ اگر وارسا کی گفتگو ناکام ہو گئی تو امریکی اور چینی نمائندوں کی ایک دوسری کانفرنس ہوگی۔

ستمبر ۱۹۵۸ء کے شمارے میں مُلاحظات کے تحت رمیق حنفی صاحب سے درخواست کی گئی تھی کہ موصوف اپنی نظم 'برگد کا پیڑ' کی شانِ نزول کے باب میں ہمیں آگاہ فرمادیں۔ موصوف کے خط کا ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

"میں نے کبھی بغیر حوالہ دئے کہیں سے کچھ نہیں لیا۔ اگر ترجمہ کیا تو اس کا، اور مواخذہ یا استفادہ کیا تو اس کا اعلان بھی کیا۔ پھر ذرا سوچئے کہ شاہراہ جیسے مقبول و معروف رسالے میں چھپی ہوئی نظم کا چربہ اُتار کر اسے آج کل جیسے مقبول و معروف رسالے میں چھپوانے سے تو "چربہ اُتارنے" کے فن کا مبتدی بھی احتراز کرے گا، میں تو اس فن سے یکلخت نابلد ہوں! سرتاپا معصوم!

نادی صاحب کو میری باتوں کا یقین آئے نہ آئے میرا ضمیر اس معاملے میں حسبِ معمول صاف اور پاک ہے۔ دونوں نظموں کی حیران کن یکسانیت قطعی بے ارادہ اور غیر شعوری ہے مجھے دلی مسرت ہے کہ میری نظم نادی صاحب کی اتنی خوبصورت نظم کے قریب ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مخالفتوں اور مخاصمتوں کے اس دَور میں کم از کم دو ہم خیال تو موجود ہیں جن کا اسلوبِ بیان علاحدہ ہوتے ہوئے بھی طرزِ فکر ہم آہنگ ہے۔ اور کیا عرض کروں

کوئی حیرانی سی حیرانی ہے آئینے میں وہ نظر آتے ہیں"

سخی حسن نقوی

قدیم ہندوستان کی نوآبادیات

آریائی تہذیب کے اثرات رفتہ رفتہ تمام ملک میں پھیل گئے۔ اگرچہ زمانے کا تعین کرنا مشکل ہے لیکن اندازہ لگایا گیا ہے کہ آریائی تحریک ۶۰۰ اور ۴۰۰ قبل مسیح کے مابین جزیرہ نماء دکن میں پوری طرح پھیل چکی تھی۔ اس کے بعد جو پانچ صدیاں گزریں، اُن میں اس کے اثرات ہندوستان کی سرحدوں کو پارکرکے اُن سمندروں اور پہاڑوں کے ماوراء بھی پہنچ گئے جو اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ وسط ایشیا، لنکا، برما، انڈوچائنا اور مشرقی جزائر الہند سب نے ہندوستانی تہذیب کے اثرات قبول کئے۔

جہاں تک مغربی ایشیا کا تعلق ہے اُس کی تاریخ زیادہ تر تاریکی میں ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ایک زمانہ تھا کہ بدھ مذہب کا اثر ہندوکش سے لے کر بحرِ روم تک پایا جاتا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ جس جگہ آج گوبی ریگستان ہے وہاں کسی زمانہ میں سرسبز میدان تھے اور ان میدانوں ہی میں اہلِ ہند نے بستیاں بسائی تھیں۔ ۱۹۰۰ء میں انگلستان کے مشہور و معروف عالم سرآرل اسٹین نے جو لاہور کے اورنٹیل کالج میں شعبۂ آثارِ قدیمہ کے صدر تھے، وسط ایشیا میں قابلِ قدر انکشافات کئے ہیں جن سے قدیم تاریخ کے بہت سے دلچسپ اور کارآمد مسائل حل ہو گئے ہیں۔

کھدائی کے نتیجہ میں زمین کے اندر سے بدھ مذہب کے مٹھ، استوپوں کے کھنڈر، بدھ اور ہندو مذہب کے دیوتاؤں کے مجسمے، ہندوستانی زبانوں اور حروف میں کندہ عبارتیں، اور اسی طرح کی دوسری بیش قیمت چیزیں برآمد ہوئی ہیں۔ سرآرل لکھتے ہیں: "جب میں وہاں (وسط ایشیاء) میں گھوم رہا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں پنجاب کے کسی شہر کی سیر کر رہا ہوں۔"

دوسری صدی عیسوی میں دریائے فرات کے شمالی علاقہ میں ہندوستانیوں کی ایک نوآبادی آرمینیا میں پائی جاتی تھی۔ یہاں کرشن جیسے برہمن دیوتاؤں کی یادگار قائم کرنے کے لئے مندر تعمیر کرائے گئے تھے۔

ساتویں صدی عیسوی میں جب ہیون سانگ وسط ایشیا سے گزرا تو اُس نے ہندوستان کے تہذیب و تمدن کا اثر ہر جگہ نمایاں طور پر محسوس کیا۔ چین جاپان اور تبت پر ہندوستانی تہذیب فتحیاب ہو ہی چکی تھی جس کا ثبوت چین سے آنے والے بے شمار سیاح دے سکتے ہیں جو مذہبی علوم حاصل کرنے دور دراز کا سفر اختیار کرکے ہندوستان آئے اور جنھوں نے اپنے وطن پہنچ کر یہاں کی مقدس کتابوں کے ترجمے اپنی زبان میں کئے۔ الغرض یہ وہ زمانہ تھا جب تمام براعظم ایشیاء پر ہندوستان کی ثقافتی فتح مکمل ہو چکی تھی۔

اسی طرح ہندوستانی تہذیب کے اثرات مشرق بعید میں بھی پہنچے لیکن یہ زمانہ اس سے چند بعد کا زمانہ تھا۔ یہاں کئی ہندوستانی نوآبادیات، مثلاً برما انڈوچائنا اور انڈونیشیا ایسے راجاؤں کے ماتحت قائم ہوئیں جو ہندوستانی نام رکھتے تھے یا ہندوستانی نسل سے تعلق رکھتے تھے اور بعد میں یہ نوآبادیات مضبوط حکومتوں میں تبدیل ہو گئیں۔

ان میں سب سے پہلے سوندیپ (سرندیپ) کی نوآبادی تھی۔ یہ جزائر کا ایک مجموعہ ہے جس میں جزیرہ نماء ملایا، جاوا، سماترا، بالی، اور بورنیو شامل ہیں۔ عیسوی سن کی پہلی پانچ صدیوں کے اندر ملایا میں ہندو مہاجرین نے کئی نئی

ریاستیں قائم کیں اور نتیجہ میں ملایا وہ دروازہ ثابت ہوا جس کے ذریعے سے ہندوستانی تاجر اور مہاجر مشرق بعید کی طرف پھیلے۔ یہاں سنسکرت زبان میں چار ایسے کتبے دستیاب ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچویں صدی عیسوی میں راجہ پورن ورمن مغربی جاوا میں حکومت کرتا تھا۔ سماترا میں سری وجے کی حکومت چوتھی صدی عیسوی میں قائم ہوئی۔ چنانچہ سینکڑوں برس کے درمیان ہونے والے انقلابات کے باوجود جزیرۂ بالی آج بھی ہندی جاوانی تہذیب کا ایک مرکز اور مشرقی جزائر الہند اور قدیم سورندیپ کے برہمن مذہب کا ایک مسکن ہے۔

دوسری نوآبادی چمپا ہے جو انڈو چائنا کے ساحل پر واقع ہے جسے آج انام کہتے ہیں۔ دوسری یا تیسری صدی عیسوی میں ایک ریاست قائم ہوئی جس کی راجدھانی چمپا تھی۔ جس طرح بمبئی اور مدراس شہروں کے نام کے اعتبار سے ریاستوں کے نام بھی پڑ گئے ہیں۔ اسی طرح راجدھانی کے نام پر پوری سلطنت کا نام چمپا پڑ گیا۔ سنسکرت زبان میں ایک کتبہ دستیاب ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری صدی عیسوی میں یہاں سری مارا نامی راجہ حکومت کرتا تھا۔

تیسری نوآبادی کمبوجہ تھی۔ چینی زبان کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں حکومت ایک برہمن راجہ کونڈنیہ نامی نے قائم کی تھی۔ یہ راجہ ہندوستان سے آیا تھا اور اُس نے مقامی رانی پر فتح پا کر اُسی سے شادی کر لی تھی۔ یہاں کے اصلی باشندے نیم وحشی قسم کے لوگ تھے اور مرد اور عورت سب برہنہ رہتے تھے۔ کمبوجہ کے راجاؤں میں یاسو ورمن، اور سورج ورمن کے نام بہت مشہور ہیں۔ یاسو ورمن ہفتم کمبوجہ کا آخری راجہ تھا۔ اُس کے بعد اس خاندان کے راجاؤں کا اقتدار کم ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ۱۸۸۴ء میں وہ باقاعدہ طور پر فرانسیسی مقبوضات میں شامل ہو گئی اور آج تک اسی طرح باقی ہے۔

چوتھی نوآبادی برہم دیش یا برہما (برما) کے نام سے موسوم ہے لسانیات کا ایک مسئلہ ہے کہ برمن سنسکرت لفظ برہما سے مشتق ہے۔ اس لئے اُس علاقہ میں جب برہمن پہنچے تو انھوں نے پورے ملک کو برہم دیش یا برہما کہنا شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ اُس کا نام برما پڑ گیا۔ برما میں لوگ بحری اور بری دونوں راستوں سے پہنچے۔

یہاں کے اصلی باشندوں میں تین قبیلے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پہلے مانس جو جنوبی برما میں آباد ہیں اور انھیں تیلنگ بھی کہتے ہیں۔ یہ نام معلوم ہوتا ہے ہندوستان کے مشرقی ساحل پر تیلگو زبان بولنے والے اُن مہاجرین کو دیا گیا ہوگا جو اُس علاقہ سے ہجرت کر کے گئے تھے جسے آج ہم تلنگانہ کہتے ہیں یہ لوگ زیادہ تر بدھ مذہب کے مہایانہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مانس آبادی کے شمال میں پالیئیس ہندوؤں کا قبیلہ آباد ہوا، جنھوں نے سرکشیترا نامی حکومت قائم کی۔ جس کی راجدھانی پردم کے قریب ہماورا نامی مقام تھا۔ یہ حکومت تیسری صدی عیسوی میں قائم ہو چکی تھی۔

تیسرے مرما قبیلے کے لوگ تھے جو تبت کے دراوڑوں کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے تمام ملک کو مرما یا برما کہنا شروع کر دیا۔ ایک نظریہ اس سلسلے میں یہ بھی ہے کہ "مرما" دریائے برہم پترا سے بنا ہے جس کی وادی میں ایک عرصۂ دراز تک یہ لوگ رہتے رہے ہیں۔ اس قبیلے کا پہلا ہندو راجہ انی رودھا گزرا ہے۔ جو ۱۰۴۴ء میں گدی نشین ہوا اس خاندان کا آخری راجہ نرسنگھا پتی تھا جسے ۱۲۸۷ء میں اُس کی رعایا نے اس قصور پر قتل کر دیا کہ وہ منگولوں کے خوف سے راجدھانی چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ قبلا خان کے ایک پوتے کے ہاتھوں انی رودھا کی عظیم الشان حکومت دو سو چالیس سال برسرِ اقتدار رہنے کے بعد خاک میں مل گئی۔ اور اگرچہ سلطنت مٹ گئی لیکن ملک کے تہذیب و تمدن پر جو گہرا اثر اُس نے چھوڑا وہ اَن مٹ ہے اور اُس کے اثرات آج تک بدستور باقی ہیں۔

ہندوستانی تہذیب و تمدن کا سب سے زیادہ اثر مشرق بعید نے قبول کیا۔ کمبوڈیہ کے نیم وحشیوں سے لے کر جو ننگے رہتے تھے۔ اہل جاوا تک جو کافی متمدن تھے، تمام لوگوں نے ہندوستانی تہذیب کو اپنایا اور اس میں ضم ہو کر رہ گئے۔ ہندوستان کی زبان، ادب، مذہب، فنون لطیفہ، سیاسی اور معاشرتی اداروں، غرض ہر شے نے اہل مشرق پر پوری پوری فتح حاصل کر لی تھی۔

برما، جزیرہ نماء ملایا، سیام، کمبوڈیہ، انام، سماترا، جاوا اور بورنیو میں سنسکرت زبان کے جو کتبے دستیاب ہوئے ہیں وہ دوسری یا تیسری صدی عیسوی کے ہیں۔ پالی زبان جو سنسکرت سے بنی ہے، انڈوچائنا کے ایک بڑے حصہ میں آج بھی بولی جاتی ہے۔ چمپا میں ایک سو کے قریب کتبے دریافت ہوئے ہیں جو سب کے سب سنسکرت زبان میں ہیں۔ کمبوجہ کے کتبے نہ صرف تعداد میں زیادہ ہیں بلکہ ادبی اعتبار سے بھی اُن کا درجہ بلند ہے۔ اُن کا طرز تحریر پُرکشش، سادہ اور شاعرانہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کسی ہندوستانی پنڈت کی تصنیف ہیں۔ اُن میں سے بعض کتبے کافی طویل ہیں مثلاً راجندر ورمن کے ایک کتبے میں [illegible]

اور دوسرے میں دو سو اٹھانوے اشعار تک پائے جاتے ہیں۔ ان کے مصنفوں نے سنسکرت بحریں استعمال کی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنسکرت اصول نحو علم بیان و عروض میں پوری مہارت رکھتے تھے۔ وہ ہندوستان کی رزمیہ نظموں رامائن اور مہابھارت، پرانوں اور دوسری ادبی کتابوں اور ہندو فلسفہ سے پوری واقفیت رکھتے تھے۔ ان کتبوں میں ہندوستان کے مہاکوی کالی داس کا اثر سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ چار شعر ایسے ملے ہیں جن میں بعینہٖ وہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو کالی داس نے استعمال کئے ہیں۔ اتنے پرانے زمانہ میں ایک ایسے ملک میں جو ہندوستان سے بہت دور ہے ان تمام باتوں کا پایا جانا حیرت انگیز ہے۔

ان ادبی سرگرمیوں میں وہاں کے حکمراں نمایاں حصہ لیتے تھے۔ چمپا کے ایک راجہ کے بارے میں ثابت ہے کہ وہ چاروں ویدوں کا عالم تھا۔ راجہ منتری اور دیگر اعلیٰ افسران علم نحو اور فلسفہ کے علاوہ جوتش، نجوم اور ہندسہ وغیرہ علوم بھی حاصل کرتے تھے۔

جاوانی ادب سنسکرت ادب سے بہت متاثر ہے۔ رامائن اور مہابھارت کا جاوانی زبان میں ترجمہ بھی کیا گیا تھا جو بہت اعلیٰ معیار رکھتا ہے۔ جاوا میں سمرتی اور پرانوں کے انداز پر بھی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ اور تاریخ لسانیات، اور طب پر بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ تنوع، کمیت و کیفیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ہندی جاوانی ادب اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ قدیم ہندوستانی تہذیب کے اثرات نوآبادیات میں کس قدر راسخ اور استوار ہو گئے تھے۔ کسی دوسرے ملک میں ہندوستانی علم و ادب کا نہ اتنا گہرا مطالعہ کہیں کیا گیا اور نہ اس سے اتنا فائدہ اٹھایا گیا جتنا جاوا میں۔ اسی طرح جہاں تک بدھ مذہب اور پالی ادب کا تعلق ہے بالکل یہی بات برما اور لنکا پر بھی صادق آتی ہے۔

مشرق بعید کے لوگ ہندوستان کے مذہبی اعتقادات و رسوم سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ برما اور سیام میں تو بدھ مذہب غالب رہا لیکن دوسری نوآبادیات میں زیادہ زور برہمن مذہب کا رہا اور بدھ مذہب کی اہمیت وہاں کم ہو گئی۔ آج سے تقریباً سو سال پہلے لکھتے ہوئے کرافورڈ کہتا ہے: "خاص بت و مورتیاں، پیتل اور پتھر کی، تمام جاوا میں اس قدر کثرت سے ملتی ہیں کہ مجھے خیال ہوتا ہے کہ ہندو دیومالا کا کوئی مجسمہ مشکل ہی سے ایسا بچا ہوگا جس کی نمائندگی نہ کی گئی ہو اور جس کی مورتی نہ بنائی گئی ہو۔" اگرچہ تثلیث کے تینوں ہی دیوتاؤں

شیوا، وشنو اور برہما کی پوجا کا رواج تھا۔ لیکن ہندوستان کی طرح شیوا کی عزت سب سے زیادہ کی جاتی تھی۔ دوسرا درجہ وشنو کا تھا اور تیسرا برہما کا۔ بھٹارا گرو کی مورتی جاوا میں بڑی مقبول ہے۔ یہ ایک استاد بزرگ کا مجسمہ ہے۔ جس کے دو ہاتھ ہیں، گھڑے جیسا پیٹ ہے، بڑی بڑی مونچھیں ہیں، نوکیلی داڑھی ہے۔ ہاتھوں میں ایک سہ پہلو بھالا ہے، پانی کا گھڑا ہے، مالا ہے، اور چوری ہے۔ یہ مورتی دراصل ایک مہا سادھو شیو مہا یوگی کی نمائندگی کرتی ہے اور اب اس نے ایک باقاعدہ دیوتا کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

ان نوآبادیات میں بدھ مذہب کے فرقے، مہایان اور ہنایان، دونوں پائے جاتے ہیں۔ البتہ جین مذہب کا وہاں کوئی وجود نہیں ہے۔ وہاں کا مذہب ہندوستان کے مذہب سے حد درجہ مشابہت رکھتا ہے اور دراصل ہندوستان کے مذہب کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے اور بر ما اور بالی میں آج تک موجود ہے۔

وہاں ہمیں آشرم بھی ملتے ہیں جن کی تعداد کافی ہے۔ ان میں سے تقریباً سو کمبوجہ کے راجہ یاسو ورمن نے قائم کئے تھے۔ ان میں سے بعض بدھ مذہب والوں نے، اور بعض وشنو دھرم یا شیو دھرم کے ماننے والوں نے قائم کئے تھے۔ یہ سب آشرم تمام مذاہب کے لوگوں کے استعمال میں آ سکتے تھے اور کسی شخص یا فرقہ پر کوئی پابندی عائد نہیں تھی۔ ان آشرموں میں زندگی کی تمام ضروریات ہر چھوٹے بڑے، غریب، لاچار اور اپاہج لوگوں کو بہم پہنچائی جاتی تھیں۔

ان نوآبادیات میں ذات پات بھی داخل ہو گئی تھی۔ اگرچہ چاروں بڑی بڑی ذاتوں — برہمن، چھتری، ویش، اور شودر — کے لوگ وہاں پائے جاتے تھے۔ لیکن ذات کی بندشیں اور امتیازات اتنے شدید نہیں تھے۔ وہاں ایک ذات کے لوگ دوسری ذات کے لوگوں کے ساتھ لڑکی کا لین دین کرتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ اٹھ بیٹھ اور کھا پی سکتے تھے۔ "اچھوت" کا تصور وہاں نہیں پہنچا تھا اور نہ ذاتوں کے لئے مخصوص پیشے ہی مقرر تھے۔ ستی کا رواج بھی پایا جاتا تھا۔ عام طور پر عورت کا درجہ ہندوستانی عورت کے مقابلہ میں بلند تر تھا۔ عورتوں نے راج گدیاں بھی حاصل کیں اور انتظامی معاملات میں بڑے بڑے عہدے حاصل کئے۔ پردے کا رواج وہاں نہیں تھا اور لڑکیاں اپنے شوہر کا انتخاب خود کرتی تھیں۔

ان کی دلچسپیاں اور تفریحات بھی ہندوستانیوں جیسی تھیں۔ جوا، مرغ بازی، موسیقی، رقص اور ناٹک وہاں کی عام تفریحات میں شامل تھیں۔ جاوا میں مورتیوں کی پرچھائیں کا ناٹک بہت عام تھا جسے وہاں کی زبان میں "ویانگ" اور ہم لوگ

اُسے کٹھ پتلی کا تماشہ کہتے ہیں۔ اس میں ایک کپڑے کا اسٹیج بنایا جاتا اور تماشہ دکھانے والے پیچھے مورتیوں کی طرف سے بولا کرتے۔ ان تماشوں اور ناٹکوں کے موضوعات ہندوستانی رزمیہ نظموں سے حاصل کئے جاتے تھے۔ یہ آج تک بدستور جاری ہے حالاں کہ جاوا کی تمام تر آبادی مسلمان ہوچکی ہے۔

چاول اور گیہوں وہاں کی مرغوب ترین غذا تھی۔ شراب نوشی اور پان کھانے کا رواج عام تھا۔ لباس اور زیورات قدیم ہندوستان کے لباس اور زیورات سے مشابہت رکھتے تھے۔ جسم کا بالائی حصہ حتیٰ کہ عورتوں کا بھی برہنہ رہتا تھا اور یہ رواج جزیرۂ بالی میں آج بھی پایا جاتا ہے۔

ہندوستان کی طرح وہاں کا فن "فن مذہب کا غلام ہے" کا مصداق ہے وہاں ستوپ بھی پائے جاتے ہیں اور مندر بھی۔ سب سے زیادہ اہم یادگاریں جاوا میں ملتی ہیں۔ بارا بدور کا مندر جس کی تعمیر ۷۵۰ء اور ۸۵۰ء کے مابین ہوئی ایک بدھ مذہب کا مندر ہے اور ہندی جاوائی فن معماری کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد لارا جونگ رانگ کا مندر ہے جو وضع قطع کے اعتبار سے خاص برہمن مندر ہے۔ لارا جونگ رانگ کے مندروں کے بیچوں بیچ میں شیو جی کا مندر ہے جو سب سے زیادہ شاندار ہے۔ برما کا آنند مندر ہندوستانیوں کا ہی بنوایا ہوا ہے۔ یہ مندر اگرچہ برما کی راجدھانی میں واقع ہے لیکن خالص ہندوستانی وضع قطع رکھتا ہے۔

اس طرح کی اور بے شمار مثالیں مشرق بعید میں ملتی ہیں۔ جن سے ہندوستانی تہذیب و تمدن کی عظمت، آفاقیت اور ہمہ گیری مسلّم ہوجاتی ہے۔

سکندر علی وجد

رقاصہ

بدن زندگی کا چھلکتا پیالا — چمن کی بہاروں نے پھولوں میں پالا
جنوں کی نزاکت کے قالب میں ڈھالا — امنگوں کی لہروں پہ پا ہر نکالا
نگاہوں کی جنّت، دلوں کا اُجالا — جمالِ اجنتا، جلالِ ہمالا

اُٹھی موجِ مے کی طرح انجمن میں
بدلنے لگی کروٹیں جان و تن میں

قدِ دلربا، حسنِ بے باک، چنچل — ہلالی بھنویں رُوئے روشن پہ بے کل
جبیں پر تلک لال، آنکھوں میں کاجل — مدبھرے نین مستی سے بوجھل
لطافت مجسّم، جوانی مکمّل — تنظیم شعر، رفتار نغمۂ مسلسل

عجب رنگ سے رُوٹھ کر من رہی ہے
سرِ بزم قوسِ قزح بن رہی ہے

کبھی جوشِ مستی میں طاؤس رقصاں — کبھی چشمِ نرگس کے مانند حیراں
کبھی صورتِ گل سراسر پریشاں — کبھی دُرِّ غلطاں، کبھی موجِ طوفاں
کبھی مست بادل، کبھی برقِ جولاں — کبھی سروِ سرکش، کبھی تیغِ عریاں

ہر اک جلوہ کچھ اس قدر مختصر ہے
تعاقب سے عاجز عقابِ نظر ہے

اندھیرے میں شب تاب مشعل جلی ہے مخالف ہواؤں کی زد پر پلی ہے
ابھی کھلنے والی مہکتی کلی ہے جوانی کے سانچے میں بجلی ڈھلی ہے
شفق رنگ چہرے پہ افشاں ملی ہے دمِ ساز پر جگمگاتی چلی ہے

یہ بجلی ہوئی لہر ہے چاندنی کی
تجلّی میں ہے دل کشی راز کی سی

خیال آفریں شاہکارِ جوانی سراپا خمارِ مئے ارغوانی
اداؤں سے جذبات کی ترجمانی نگاہوں میں گنجینۂ مسائے معانی
ہر انداز پر دم بخود نکتہ دانی خموشی تکلم، تبسم کہانی

چھڑا راگ دھارے ملے حسن و فن کے
چلی ناؤ سنگم پہ گنگ و جمن کے

سکوں بخش، پُر کیف نغموں کے دھارے حسیں جُنبشِ دست و پا کے سہارے
خم و پیچِ پیکر کے نازک اشارے جواں زندگی کے کرشمے ہیں سارے
بہشتِ تصور یہ دل کش نظارے سرِ چرخ جھلملا گئے چاند تارے

دل افروز منظر ہے صبحِ چمن کا
تماشا ہے سورج کی پہلی کرن کا

نہاں زلفِ پیچاں میں دامِ کمندی سراسر ہلاہل ہے یہ بے گزندی
پریشان جلوؤں کی آئینہ بندی بہ انداز خود بینی و خود پسندی
سجیلا بدن حسن کی سربلندی نگاہوں میں معصوم سی فتح مندی

مسرّت کے طوفان میں کھو گئی ہے
خود اپنی اداؤں میں گم ہو گئی ہے

کمر تال کے ساتھ بل کھا رہی ہے نظر شوق کی آگ بھڑکا رہی ہے
ادائے تبسم غضب ڈھا رہی ہے سرِ طورِ دل، برق لہرا رہی ہے
ہوا نغمۂ سرمدی گا رہی ہے یہاں عقل کو نیند سی آ رہی ہے

سراپا حقیقت بنی ہے فسانہ
نشانِ قدم چومتا ہے زمانہ

راجیندر ناتھ شیدا

اُردو کی ایپک شاعری

اُردو کی رزمیہ نظموں پر ایک عبوری نظر

ایپک کی وضاحت کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ دکن کی رزمیہ مثنویوں، انیس اور دبیر کے مرثیوں اور حفیظ کے شاہنامۂ اسلام پر ایپک کا اطلاق ہوسکتا ہے یا نہیں۔ ایک بات ان تینوں ادوار کی رزمیہ نظموں میں بدیہی طور پر مشترک ہے وہ یہ کہ نصرتی کے علی نامے اور تاریخ اسکندری کو چھوڑ کر باقی سب کے پلاٹ ایسے واقعات پر مبنی ہیں جن کا اس ملک سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ ایپک کے سلسلے میں قومیت کی باتیں کرنے والوں کو یہ بات غالباً سب سے زیادہ گراں گزرتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح اوّل تو اپنی قوم کے دلیروں کے کارناموں کی توصیف نہیں ہوتی اس لئے ان نظموں کے ہیرو اہلِ قوم کے دلوں میں ارتعاش پیدا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ دوسرے ان میں ہندوستانی معاشرت اور تہذیب و تمدن کی عکاسی نہیں ہوتی۔

ایسا سوچنے والے اصل میں چند اہم حقائق کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ دکن اور لکھنؤ کی مذکورہ نظموں کی تخلیق کے وقت وطنیت اور قومیت کے جدید تصوّرات موجود نہیں تھے۔ یہ تصورات ہمارے یہاں مغربی خیالات آنے سے پیدا ہوئے۔ پھر شاہنامۂ اسلام کی تخلیق کے وقت تک کیا، آج تک ایسے لوگ موجود ہیں جن کے ذہنوں نے انھیں پوری طرح قبول نہیں کیا۔ یہ نظمیں قومیت کے جس جذبے کے زیرِ اثر لکھی گئی ہیں اس میں مذہب کو بہت دخل ہے کیوں کہ مذہب اس زمانے میں فکری وحدت پیدا کرنے کی ایک بہت بڑی قوت تھا۔ ان حالات میں قدرتی طور پر لوگ اپنے مذہبی اکابر کے کارناموں کو بڑے فخر سے یاد کرتے اور انھیں نذرِ عقیدت پیش کرتے تھے۔ یہ تاریخی اتفاق ہے کہ جن لوگوں نے اُردو میں رزمیہ نظمیں لکھیں اُن کے مذہبی ہیرو اس ملک کے باشندے نہیں تھے لہٰذا انھیں اپنی نظموں کے واقعات اور کرداروں کے لئے حجاز شام اور عراق کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ یہ بھی یاد رہے کہ اردو ہی کی رزمیہ نظمیں یہ خصوصیت نہیں رکھتیں۔ یہ بات یورپ کی ایپکوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً پیراڈائز لوسٹ میں انگلستان کا محض ایک بار عبوری سا ذکر آتا ہے۔ جب کہ اس سے ہندوستان کا ذکر دو تین بار کیا گیا ہے۔ اگر اس کے پلاٹ کا کوئی مکانی مرکز ہے تو وہ یروشلم ہے اور ملٹن نے انسانی تہذیب و تمدن کے فروغ پر تبصرہ کرتے ہوئے سب سے زیادہ تعریف یونان کی کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ یورپ کے کئی ملکوں کی نظموں میں ایک ہی ہیرو ملتا ہے۔

اسی طرح قومی جذبات پر اثر انداز ہونے کی بات بھی وضاحت طلب ہے۔ یہ قیاس کرنا تو ظاہرا طور پر صریحاً غلط ہے کہ اردو کی ان رزمیہ نظموں میں جن ہیروؤں کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں وہ قوم کے کسی بھی بڑے حصّے کو متاثر نہیں کرتے کم از کم مراثیِ انیس و دبیر اور شاہنامۂ اسلام کی تاثیر اور مقبولیت سے تو انکار ممکن ہی نہیں۔ یہ البتہ مانا جا سکتا ہے کہ ان نظموں کا حلقۂ اثر محدود رہا ہے مگر یہ محدودیت کسی نہ کسی حد تک اُن نظموں کی بھی گریباں گیر ہے جن کا تعلق دوسرے مذاہب کے دیروں سے ہے۔ رہی یہ بات کہ دوسری زبانوں کی نظمیں اپنی مذہبی خصوصیات کے باوجود کسی کسی مقام پر عالم گیر زندگی کے حقائق کی بھی [illegible]

ہیں۔ تو ایسے عناصر سے اردو کی نظمیں بھی خالی نہیں۔

اب رہا قومی زندگی کی عکّاسی کا سوال۔ اسے بھی ٹھیک طور پر سمجھنا ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ واقعات اور کردار غیر ملکی ہونے کے باوجود اردو کے رزمیہ شاعروں نے زندگی کا جو پس منظر پیش کیا ہے اس میں عربی، ایرانی اور ہندوستانی عناصر کا ایک عجیب و غریب امتزاج نظر آتا ہے۔ جو فنّی اعتبار سے کتنا ہی ناقص کیوں نہ سمجھا جائے، اُس شعوری انتشار کی نمائندگی ضرور کرتا ہے جو ہندوستانیوں کی ایک کثیر تعداد کے ذہن میں موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ نظمیں پڑھی جاتی تھیں تو اُن کی یہ بوالعجبی بہت کم لوگوں کو کھٹکتی تھی۔ آج جب زندگی اور ادب سے متعلق ہمارے نظریات بدل گئے ہیں اور ہم ادب سے واقعیت کا مطالبہ کرنے لگے ہیں، تو یہ چیزیں ہمیں بے ربط محسوس ہوتی ہیں۔ اس کے باوصف غور سے پڑھا جائے تو دکن اور لکھنؤ کی رزمیہ نظموں میں ہم عصر تمدّن کی جھلکیاں بھی نظر آئیں گی جن سے اس زمانے کے ہندوستانیوں کے خیالات، رجحانات اور اخلاق و عادات کا پتہ چلے گا۔ یہاں تک کہ شاہنامۂ اسلام سے بھی جس میں شاعر نے تاریخی واقعیت کو برقرار رکھنے کی شعوری کوشش کی ہے، ہم عصر ہندوستان کے چند فا... انات کا اظہار ہوتا ہے۔ ایسے موضوع پر نظم لکھنا خود اس بات کی شہادت ہے کہ اُس وقت اہلِ وطن کا ایک بڑا حصّہ قومی مسائل کے متعلق ایک خاص انداز سے سوچتا اور محسوس کرتا تھا۔ مگر یہ بھی واضح رہے کہ اردو کی یہ نظمیں قومی زندگی کے چند عناصر کی حامل ہونے کے باوجود، قومی ایپک قرار نہیں دی جا سکتیں۔ یہ محض ایپک کہی جا سکتی ہیں کیونکہ قومی ایپکوں کا کینوس اور حلقۂ تاثیر وسیع تر ہوتا ہے۔

آیئے اب ان تینوں ادوار کی رزمیہ نظموں پر الگ الگ نظر ڈال کر دیکھیں۔ پہلے دکنی مثنویوں کو لیں۔ ان کے باب میں دقّت یہ ہے کہ ان میں ابھی تک کافی دلچسپی نہیں لی گئی معلوم ہوتی۔ دوسری اقسام کے دکنی ادب میں سے کچھ شائع ہو چکا ہے لیکن رزمیہ نظموں میں سے غالباً اب تک کوئی بھی شائع نہیں ہو پائی لہٰذا ان کے بارے میں ہماری معلومات اس دور پر کام کرنے والوں مثلاً مولوی عبدالحق، سیّد محی الدین قادری زور، نصیر الدین ہاشمی، شمس اللہ قادری اور چند مستشرقین کی بتائی ہوئی باتوں تک محدود ہیں۔ پھر یہ کام کچھ حیثیتوں سے ناقص بھی محسوس ہوتا ہے اور بہ جدید انداز سے بھی نہیں ہوا۔ اس کے باعث ان رزمیہ نظموں کے محاسن و معائب سے متعلق زیادہ وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں اتنا بے خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایپک شاعری کی اکثر ضروری شرائط پوری کرتی ہیں۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ مثنویاں قطب شاہی اور عادل شاہی حکومتوں کے آخری دور کی پیداوار ہیں۔ ان کی تخلیق کے کچھ ہی زمانے بعد سیاسی، سماجی اور مذہبی فضا کی تبدیلی نے ان کی ترویج اور مقبولیت پر اثر ڈالا ہے۔ پھر اس کے بعد ایک مدّت تک اردو والوں کی نظر سے دکن کا ادب پوشیدہ رہنے اور آخر کار زمان و مکاں کے بُعد کے باعث لسانی دشواریاں پیدا ہو جانے سے بھی دکن کی رزمیہ شاعری کے اچھی طرح سمجھے جانے میں دقّت رہی ہے۔

بہرکیف، موجودہ کام کی روشنی میں بھی دکن کی جن رزمیہ مثنویوں کا پتہ چلتا ہے اُن میں سے کئی قابلِ ذکر ہیں۔ فی الحال میں تین کا ذکر کروں گا جو اوروں سے غالباً زیادہ نمائندہ حیثیت رکھتی ہیں یہ ہیں خاورنامہ، ظفرنامہ اور علی نامہ۔ یہ تینوں شاہنامے کے نمونے پر لکھی گئی محسوس ہوتی ہیں۔ شاہنامے ہی کی بحر میں ہیں لب و لہجہ وہی ہے اور تینوں میں کسی نہ کسی طرح فردوسی کا ذکر کیا گیا ہے۔ خاورنامے کے مُصنّف کمال خاں نے تو اپنا تخلص ہی رستمی رکھ لیا تھا جو بدیہی طور پر شاہنامے کے ہیرو رستم کے نام کی رعایت سے رکھا گیا ہے۔ یوں بھی خاورنامے میں رستمی فردوسی کا ذکر بڑے احترام اور عقیدت سے کرتا ہے۔

جو شاعر تھا فردوسیؔ پاک زاد اچھو حق کی رحمت سوں اوہو شاد
ہوا شعر اُسی خوب آبِ رواں کہا عشق از پہلواناں کہا از شہاں
جو ریا ہوں کی او ثنا لب خاک کوں خدا بخشیا فردوسیؔ پاک کوں
جو فردوس میں اس کا جا کا کیا اپس کی پی رحمت سوں جنت دیا

یہ شعر نصیر الدّین ہاشمی کی کتاب "یورپ میں دکنی مخطوطات" سے نقل کئے گئے ہیں۔ یہی ہاشمی ظفرنامے اور اس کے خالق غلام علی خاں لطیف پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "معلوم ہوتا ہے کہ لطیف نے اس کو شاہنامے کے جواب پر لکھا ہے"۔ (صفحہ ۱۵۸) لیکن لطیف کی تصنیف کی تہ میں فردوسی کی عقیدت کا نہیں مسابقت کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ اپنی نظم ہی کو شاہنامے سے بہتر نہیں کہتا بلکہ اپنی نظم کے کرداروں کو بھی شاہنامے کے اعلیٰ کرداروں سے افضل سمجھتا ہے۔ ہاشمی ہی کی کتاب سے نقل کئے ہوئے یہ شعر ملاحظہ ہوں:-

ظفرنامہ شہ نامے کا تاج ہے رعیت ہے وہ یہ راجا ہے
کہ شہ نامہ مصحف الاسیف ہے ظفرنامہ مرداں کی تعریف ہے

ے ان اشعار کے بعض مصرعے خارج از بحر نظر آتے ہیں۔ ع۔م

کہ رستم اتھا ایک یلے سیستاں　　فردوسی کیا رستم داستاں

پدر اس کا پیچ کرد برتر اتھا　　وسے کہا کہ سیمرغ پیوندا تھا

نصرتی پر جو علی نامے کا مصنف ہے - زیادہ کام مولوی عبدالحق نے کیا ہے - انھوں نے اپنی کتاب " نصرتی " میں اس نظم کے کچھ شعر نقل کئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ نصرتی رستم کی تخلیق کو فردوسی کا بڑا فنی کارنامہ سمجھتا تھا نصرتی کہتا ہے :-

سخن ور سنے سو گئے زمانے میں یاد　　فریدوں کہا نہیں تو کیا کیقباد

صفت کر گیا گر سخن آفریں　　اجھوں لگ ہے رستم پہ نت آفریں

تو شاعروں کے ان اقوال سے قطع نظر بھی جب ان نظموں کی تفصیلات کو دیکھتے ہیں تو اس خیال کو کہ یہ شاہنامے کے انداز پر لکھی گئی ہیں اور بھی تقویت حاصل ہوتی ہے۔

خاور نامے کا مصنف رستمی محمد عادل شاہ کے دربار میں دارالانشا کے کام پر مامور تھا کہا جاتا ہے کہ اس نے یہ نظم محمد عادل شاہ کی ملکہ خدیجہ سلطانہ کے حکم سے لکھی تھی۔ اس کا موضوع حضرت علی اور اُن کے رفقاء کی ایک مجاہدانہ مہم ہے۔ قصہ مختصراً یوں ہے کہ حضرت محمدؐ کی ایک مجلس میں صحابہ کی شجاعت پر گفتگو ہو رہی تھی وہاں کسی نے سعد وقاص کی تعریف کی جو حضرت علی کے رفیق ابوالمحجن کو ناگوار گوری اس پر سعد وقاص اور ابوالمحجن جنگ کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں۔ پھر کئی طرح کے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ بلال بن علقمہ کی مہمان داری، کوٹ نوس کے بادشاہ قوادل کا قنطار شاہ سے مدد مانگنا، ادھر سے حضرت علی کا بھیجا جانا، قنطار شاہ سے جنگ، اُس کی گرفتاری، دیووں سے لڑائی، طلسم کشائی، پھر یکے بعد دیگرے کئی حکمرانوں کا اسلام قبول کرنا —— آخر میں حضرت علی مع اپنے ساتھیوں کے مدینے واپس آکر اپنے صاحب زادوں حسن اور حسین سے ملتے ہیں۔ نظم میں زنانہ کرداروں کی بھی کمی نہیں۔ نواہد شاہ کی دختر دل افروز سعد سے شادی کرتی ہے۔ ملکہ شمامہ اپنے خاوند کے قتل کے بعد مسلمان ہو جاتی ہے۔ لڑائیاں بحری بھی ہوتی ہیں اور بری بھی

غرض یہ نظم ایپک کی ساری شرطیں پوری کرتی ہے۔ اس کا موضوع سنجیدہ ہے، اسلوب پُرشکوہ ہے قصے کی بنیاد تاریخی ہے لیکن اس کی تعمیر مدائتی اور فوق الفطری عناصر کے خمیر سے ہوتی ہے۔ اس کے ہیرو حضرت علی، ابوالمحجن اور سعد ہیں۔ مگر ان کے علاوہ بھی متعدد متنوع کردار آتے ہیں اعلیٰ کردار معروف شخصیتیں ہیں جنھیں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ پلاٹ بکھرے ہوئے تاریخی واقعات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ ایک مکمل وحدت رکھتا ہے۔ نظم کا آغاز بڑے سلیقے سے کیا گیا ہے۔ تمام واقعات منسلک اور مربوط ہیں حصولِ مقصد کے بعد خاتمہ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ہوا ہے۔ ہاشمی کے قول کے مطابق یہ نظم بڑی تقطیع کے ۸۶۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور بیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ موصوف نے ہندوستانی تہذیب و معاشرت کی اُن تفصیلات کا بھی، جو اس نظم میں جا بجا ملتی ہیں مفصل ذکر کیا ہے۔

ظفر نامے کا مصنف غلام علی خاں لطیف عبداللہ قطب شاہ کا درباری تھا یہ نظم ٹریجیڈی ہے۔ کیونکہ اس کے خاص ہیرو محمد حنیف شجاعت کا مظاہرہ کرنے کے بعد غائب ہو جاتے ہیں۔ اس پر امام زین العابدین مدینے پہنچ کر محرم کی بنا ڈالتے ہیں۔ قصہ یوں شروع ہوتا ہے کہ حضرت امام حسین اپنے بھائی محمد حنیف کو یزید سے اپنا بدلہ لینے کے لئے لکھتے ہیں۔ لہٰذا حنیف لشکر آراستہ کر کے جنگ کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ مدینے ہی سے لڑائیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ یزید شاہ زنگ و فرنگ سے مدد مانگتا ہے۔ ادھر حنیف کی مدد کے لئے اُن کے تین بھائی اور تین ترک سردار آتے ہیں۔ لڑائی میں کئی نشیب و فراز آتے ہیں۔ آخر کار دمشق کا محاصرہ ہوتا ہے۔ محمد حنیف اس کو فتح کر کے امام زین العابدین کو جو یہاں پہلے ہی سے مقید تھے اس شہر کا بادشاہ بنا دیتے ہیں اور خود غائب ہو جاتے ہیں۔ امام زین العابدین کو اس کا اتنا رنج ہوتا ہے کہ وہ دمشق کا تخت علی اکبر کو سونپ کر سلطنت سے کنارہ کش ہو جاتے اور بیتا رج بن جاتے ہیں۔ ان تفصیلات سے ظاہر ہے کہ یہ مثنوی بھی ایپک کی لازمی شرائط پر پوری اترتی ہے۔ شاعر کا دعویٰ ہے کہ ساڑھے پانچ ہزار اشعار کی یہ نظم محض ایک سال کا نتیجۂ فکر ہے۔

علی نامے کی نوعیت کسی قدر مختلف ہے کیونکہ اس کا قصہ مذہبی تاریخ پر مبنی نہیں بلکہ ہم عصر واقعات سے لیا گیا ہے۔ اس کا ہیرو علی عادل شاہ ہے جس کا کردار مغلوں، مرہٹوں اور گولکنڈا اور بیجاپور کے سلاطین کی باہمی معرکہ آرائیوں کے پس منظر میں ابھار کر پیش کیا گیا ہے۔ علی عادل شاہ کی تخت نشینی کے وقت ملک کی ابتر حالت کے ذکر سے قصے کا آغاز ہوتا ہے اور مغلوں کو مار بھگانے پر نیا ہنگامہ یعنی شیواجی کے حملے، اس کی طرف سے صلح کی درخواست، بیجاپور کے سپہ سالار افضل خاں کا دغابازی سے قتل، شیواجی کے خلاف صلابت خاں کی مہم، پھر اس کا مقصود شیواجی سے ساز باز اور خود علی عادل شاہ کا حملہ اور فتح۔ اس کے بعد شیواجی کا سورت پر حملہ ہوتا ہے۔ پھر مغلوں کا عادل بادشاہ سے ملنا، ادھر جے سنگھ کا شیواجی سے مل جانا، عبداللہ قطب شاہ کا علی عادل شاہ کو مدد دینا

..متعلقہ ...واقعات — یہ سب باتیں آتی ہیں لیکن شاعر کا مرکزی نقطۂ نظر ان ... کو ... کرتا ہے اور قصے کی وحدت فنا نہیں ہوتی۔ کردار معروف بھی ہیں اور اُن میں تنوع بھی کافی ہے۔

اس زمانے میں اردو کی دوسری اہم رزمیہ نظموں کے برعکس، واقعات اور کردار اپنے ہی ملک کے ہیں اور شاعر کے ہم عصر ہونے کی وجہ سے اُسے ان کا ذاتی طور پر بھی کافی علم ہونا چاہئے۔ ایسی نظم میں اپنے زمانے کے لوگوں کے رہن سہن اور سوچ بچار کا ذکر آنا ناگزیر ہے۔ علی نامہ کی سب سے بڑی خصوصیت غالباً یہ ہے کہ اس سے اُس دور کی پُرپیچ سیاسیات کی شاطرانہ چالیں روشنی میں آتی ہیں۔

انیس کی شاعری کے ایک پہلو سے متعلق ایک بحث کا ذکر میں پیچھے کر آیا ہوں۔ جو اس کی تفصیلات میں دلچسپی رکھتے ہوں وہ نگار کے مذکورہ شمارے کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اثر لکھنوی کی کتاب "انیس کی مرثیہ نگاری" میں شمول اسی عنوان کا مقالہ اور اس سے متعلق ایک اور مقالہ "طوطی پس آئینہ" خصوصاً پڑھنا چاہئے۔ ان میں جو باتیں انیس کی شاعری ایک زاویے کے سلسلے میں کہی گئی ہیں وہی کم و بیش تحسین کے ساتھ دبیر کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہیں۔ میری رائے میں مجموعی حیثیت سے انیس اور دبیر کے مرثیے بھی ایک سمجھے جانے کے مستحق ہیں۔ ان کے باب میں دکن کی رزمیہ مثنویوں والی دقت پیش نہیں آتی کیوں کہ یہ بہت کثرت سے ملتے ہیں۔ لکھے جانے کے وقت سے اب تک برابر زیر مطالعہ رہے ہیں اور ان پر کافی مفید کام ہو چکا ہے۔ لہٰذا اُن سے متعلق رائے قائم کرنے میں بڑی سہولت ہے۔

مرثیے نے اردو شاعری کی ایک مخصوص صنف کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ اس کا مقصد، موضوع، کردار، واقعات، اسالیب بیان، فارم، ٹیکنیک سب قریب قریب متعین ہیں۔ اگرچہ مرثیے کا عام مفہوم بھی ہے اور اردو میں دوسری طرح کے مراثی کی کمی نہیں۔ مگر مرثیہ اپنے مخصوص اور محدود اصطلاحی معنوں میں اُس نظم کو کہتے ہیں جس میں حضرت امام حسین اور اُن کے رُفقاء کی شہادت کا ذکر ہو۔ کربلا کا یہ سانحہ بھی تاریخی ہے۔ مرثیہ نگاروں نے اپنے پلاٹ روایتی واقعات سے لے کر اُن میں حسب ضرورت ردّ و بدل کر لیا ہے جس کی ہر ایک نگار کو اجازت ہے۔ مرثیے کا پلاٹ زیادہ پیچیدہ نہیں ہوتا، مگر وہ بہت مربوط ہوتا ہے۔ اس کے آغاز، ارتقاء اور انجام سے متعلق کچھ قواعد ہیں۔ مختلف حصوں کے اصطلاحی نام ہیں جیسے تمہیدی حصے کو چہرہ اور آخری کو بین کہتے ہیں۔ اس میں فوق الفطرت واقعات بھی آتے ہیں اور ڈرامائی کیفیت بڑی خوبصورتی سے پیدا کی جاتی ہے۔ مراثی میں اتنی باتیں مشترک ہونے کے باوجود ضمنی واقعات میں ایک حد تک تنوع بھی ملتا ہے۔

مرثیوں کے زیادہ اہم کردار امام حسین، عباس، علی اکبر، زینب، بانو، سکینہ، ابن زیاد، اور شمر ہیں۔ ان میں کافی رنگا رنگی ہے۔ اور خصوصاً میر انیس نے انھیں زندگی بخشنے میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ مرثیوں کا موضوع بدیہی طور پر نہایت سنجیدہ ہے۔ لہٰذا اُن کے اسلوب بیان کا بھی سنجیدہ ہونا ضروری ہے۔ شکوہ بیان اور شوکت الفاظ کو ملحوظ رکھے بغیر اس صنف میں کامیابی ممکن نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مرثیے نے بلوغ کو پہنچ کر مسدس کو اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا جس میں مثنوی والی سہولت نہیں ہوتی مگر پھر بھی انیس اور دبیر نے اس فارم کو بیانیہ شاعری کے لئے خوش اسلوبی سے استعمال کیا ہے۔ مرثیوں کے بندوں کی تعداد میں فرق ہے ان میں کوئی کوئی کافی طویل ہے جیسے کہ انیس کا وہ مرثیہ جسے پروفیسر مسعود حسن رضوی نے "رزم نامہ انیس" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ اس کے اشعار کی مجموعی تعداد تقریباً ۲۰۵۰ ہے۔

مرثیے پر اعتراض کرنے والوں نے اس کا بنیادی مقصد رونا رُلانا بتایا ہے جو شیعوں کا ایک مذہبی فریضہ ہے۔ اس کے باعث بھی اُسے ایک شاعری میں شمار کئے جانے کے قابل نہیں سمجھا گیا۔ اگر اس نیم حقیقت کو صحیح بھی مان لیا جائے تب بھی میری نظر میں مرثیے کو ایپک قرار دینے میں کوئی قباحت پیدا نہیں ہوتی، کیوں کہ ایپکوں کے بنیادی مقاصد کا ایک معیار بھی قائم نہیں۔ مختلف ایپکیں، مختلف بنیادی مقاصد کے پیش نظر لکھی گئی ہیں۔ دیکھنا اصل میں یہ چاہئے کہ مراثی ایپک کے لوازم کو پورا کرتے ہیں کہ نہیں یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ مرثیہ نگاروں نے اپنے اعلیٰ کرداروں کے ذریعہ زندگی کا جو مطمح نظر پیش کیا ہے اُس میں کس قدر جاذبیت ہے اور وہ کس حد تک رونے رُلانے کے فرقہ وارانہ حدود کو پار کر کے غیر شیعوں سے بھی خراج تحسین وصول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

مرثیوں پر فنی نقطۂ نظر سے جو اعتراضات کئے گئے ہیں اُن میں کچھ غلط ہیں کچھ صحیح مگر چوں کہ اُن کا مرثیوں کے ایپک ہونے یا نہ ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ ایپک شاعری میں مراثی کا درجہ متعین کرنے پر اثر پڑتا ہے اور یہ بات ہماری موجودہ بحث کی حدود سے خارج ہے۔ لہٰذا ان اعتراضات کو نظر انداز

کیا جاتا ہے۔

شاہنامۂ اسلام میں بھی ایپک کی خصوصیات موجود ہیں۔ اس کا اصلی مقصد ہم عصر مسلمانوں کی بے حسی دُور کرانے کے لئے اسلاف کے دلیرانہ کارناموں کی یاد تازہ کرانا اور اُن کے لہو کو گرمانا ہے۔ اس نظم میں کسی قدر تاریخیت کا احساس ہوتا ہے مگر منتخبہ واقعات اس اصولی نظریے کے ذریعے منسلک بھی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ نظم چار جلدوں میں ہے جس کا زمانۂ تصنیف ۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۷ء تک ہے۔ شاہنامۂ اسلام کے قصّے کا آغاز بھی پیراڈائز لاسٹ کی طرح آدم کو دنیا کی خلافت ملنے اور نیکی اور بدی کے فرشتوں کی باہمی آویزش سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد انبیاء کے حالات ہیں۔ پھر حضرت محمدؐ کی ولادت، اسلام کا پھیلنا اور اس سلسلے میں پیغمبرِ اسلام اور صحابہ کی متعدد جنگوں اور دوسرے کارناموں کا ذکر ہے خاتمہ ابوسفیان کی قریشی فوجوں اور یہود کی شکست پر ہوتا ہے۔ اس نظم کے اعلیٰ کردار بھی تاریخی شخصیتیں ہیں جنھیں نہایت عزّت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے موضوع اور اسلوب کی سنجیدگی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ البتہ شاعر نے اپنے موضوع کی سنجیدگی اور عہد کی واقعیت پسندی سے متاثر ہو کر "حقائق" بیان کرنے کی پابندی اپنے اوپر عائد کر لی ہے جو شعوری طور پر خلافِ عقل باتوں سے سعیِ اجتناب کی صورت میں رونما ہوتی ہے۔

ویسے یہ نظم بھی شاہنامے کے نمونے پر لکھی گئی ہے۔ اگرچہ ان دونوں کے بنیادی مقصد میں بہت فرق ہے۔ ایک تو یہ بات خود نظم کے نام سے ظاہر ہے۔ دوسرے شاعر نے بھی تمہیدی اشعار میں اس کا وضاحت سے ذکر کیا ہے۔ سببِ تالیف بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

مسلمانوں پہ ہے مردہ دلی چھائی ہوئی ہر سو — سکوتِ موت نے چادر ہے پھیلائی ہوئی ہر سو
عمل یت ہے نہ جرأت ہے نہ شدّتِ نوان باقی — فقط حسرت سے تکنے کو رہا ہے آسمان باقی
نظر آتے ہیں اب وہ صف شکن بازو نہ شمشیریں — مقدر کی طرح سوئی پڑی ہیں آج تکبیریں
گئی دُنیا سے آقائی محمدؐ کے غلاموں کی — بھلا بیٹھے جو یادِ اپنے سلف کے کارناموں کی
ارادہ ہے کہ پھر اُن کا لہو اک بار گرماؤں — دلِ سنگیں سخن کے آتشیں تیروں سے برماؤں
سناؤں اُن کو ایسے ولولہ انگیز افسانے — کرے تائید جن کی عقل بھی تاریخ بھی مانے
کیا فردوسیؔ مرحوم نے ایران کو زندہ — خدا توفیق دے تو میں کروں ایمان کو زندہ
عجم کا شاہنامہ بس وہ فردوسی کا حصّہ تھا — تخیل ہی کا ہنگامہ تھا یعنی ایک قصّہ تھا
مگر اُس کی زبان اُس کا بیان اعجاز ہے گویا — کہاں کی رستمی وہ خود ہی تیر انداز ہے گویا

آگے چل کر شاعر کو ضمیر کی یہ آواز سنائی دیتی ہے ؎

مبارک ہو ترے آغاز کا انجام ہو جانا — مبارک ہو تجھے فردوسیِ اسلام ہو جانا

یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ اصل مقصد کے تفاوت اور واقعات کی تخیلی اور تاریخی نوعیت کے باوصف شاعر خود کو فردوسیِ اسلام کہلواتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نظم بھی مثنوی کی فارم میں ہے۔ اس کی بحر البتہ شاہنامہ کی بحر سے مختلف ہے مگر ایپک کے لئے یہ نامناسب بھی محسوس نہیں ہوتی۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ حفیظ ہی نے اپنی نظم کو شاہنامے کے انداز کی نظم تصوّر کیا ہو بلکہ اسے ایسے لوگوں نے بھی ایپکوں میں شمار کیا ہے جن سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایپک کے لوازم سے بے بہرہ ہوں یا غیر ذمہ داری سے بے سوچے سمجھے اپنی رائے کا اظہار کریں۔ میں یہاں اس کے ثبوت میں چند اقوال نقل کرتا ہوں۔ اس نظم کی جلد اوّل کے دیباچے بہ عنوان "تقریب" میں شیخ عبدالقادر لکھتے ہیں:-

"رہا فردوسی کی برابری کا دعویٰ سو مصنف نے اپنے عجز و انکسار کا کافی اعتراف اپنے تمہیدی اشعار میں کر دیا ہے۔ اگر سوءِ ادب کا مرتکب ہوئے بغیر مصنف نے یہ ہمّت کی کہ رزمیہ نظم کے اس وسیع میدان میں قدم رکھے جس میں فردوسی جیسا بڑا شہسوار اپنی شہسواری کے جوہر دکھا چکا ہے تو کم از کم یہ بلندیِ ہمّت کی دلیل ہے۔ باقی حسنِ قبول خدا کے ہاتھ ہے۔ فردوسی نے فارسی میں حقِ شاعری ادا کیا اور حفیظ اردو میں طبع آزمائی کر رہا ہے۔ اگر اردو دانوں کو اپنی زبان میں اس قسم کی کتاب ملے جو بہادران و رہبرانِ اسلام کی یاد کو اس طرح تازہ کر دے جس طرح فردوسی نے غیر معروف پہلوانوں، آتش پرست بادشاہوں کی بھولی ہوئی کہانیوں کو تازہ کر دیا تھا تو اسے یقیناً عرصۂ دراز تک حضرت حفیظ کا شرمندۂ احسان رہے گا۔"

اسی طرح دوسری جلد کے شروع میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر کا "معیار" کے عنوان سے دیباچہ ہے جس میں حفیظ کے خلافِ عقل باتوں کے ترک کرنے کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

"حفیظ نے اپنے مقصد کو اس طرح متعین کر کے اپنے راستے میں بہت سی مشکلیں پیدا کر لی ہیں۔ ہومر کے سامنے ایک افسانہ تھا

جس میں عشق و محبت حسد و نفاق، رقابت اور جذبہ ہمدردی کی کشمکش کے ساتھ ہر طرح کے عقلی و غیر عقلی واقعات بیان کئے جاتا تھا فردوسی کے شاہنامے کا زمانہ بھی ماقبل تاریخ ہے۔ ہمارے مرثیہ نگاروں نے تاریخ کو طاق پر رکھا ہے جو جا ہا ہے جس طرح چاہا ہے کہہ ڈالا ہے حفیظ ان سب کے بعد آتا ہے اور سب سے زیادہ مشکل مہم پیش نظر رکھتا ہے۔

پروفیسر فراق گورکھپوری نے ۷ اگست ۱۹۴۸ء کو ایک تقریر براڈکاسٹ کرتے ہوئے، جو آئندہ آل انڈیا ریڈیو کے سرکاری رسالے "آواز" میں شائع ہوئی شاہنامۂ اسلام پر ان الفاظ پھبتی کہی :۔

"اگر کوئی اسے بے اختیار مرا جینے پر تلا ہوا ہو تو وہ اسے جھوم جھوم کر پڑھ سکتا ہے۔ اور اگر حفیظ کی دوسری شاعری کے مقابلے میں شاہنامۂ اسلام کسی کو پسند نہ آئے تو وہ یہ سمجھ لے کہ ملٹن نے فردوس گم شدہ لکھنے کے بعد کئی ایسی چیزیں لکھیں جن میں شعریت سے زیادہ نثریت ہے۔"

اس نظم کے سلسلے میں حفیظ کے ساتھ شیخ عبدالقادر کے ذہن میں فردوسی کا، تاثیر کے ذہن میں ہومر، فردوسی اور مرثیہ نگاروں کا، اور فراق کے ذہن میں ملٹن کا خیال آنا خود اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ان سب نے شاہنامۂ اسلام کو ایلیڈ، اوڈیسی، شاہنامے، مراثی اور پیراڈائز لاسٹ کی قسم کی نظم تصور کیا ہے۔ فردوسی کے شاہنامے کو ایپک نہ سمجھ کر محض اس کے مماثل قرار دینا بالکل بے معنی بات ہے۔ کسی مسلّم حقیقت کی تردید کے لئے بہت ٹھوس حقائق اور مضبوط دلائل پیش کرنا ضروری ہوتا ہے ورنہ اس پر اصرار کرنا اپنی علمی بے بضاعتی کو ظاہر کرنے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ شاہنامہ ایپک شاعری کا ایک نہایت گراں قدر شاہکار ہے اور ایپک کے تمام لوازم کو پورا کرتا ہے۔ اردو کی جو نظمیں اس کے نمونے پر لکھی گئی ہیں وہ بھی اسی نوع کی ہیں۔ فنی اعتبار سے وہ کتنی اہم ہیں یہ بات بالکل الگ ہے۔

اور آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اردو میں ایپک کے لکھے جانے یا نہ لکھے جانے کا غزل کے رواج سے کوئی تعلق نہیں کیوں کہ یہ خیال سراسر غلط ہے کہ غزل گوئی بیانیہ شاعری کی تخلیق پر برا اثر ڈالتی ہے۔ اردو میں بیانیہ نظموں اور غزلوں کی پیداوار ساتھ ساتھ ہوتی رہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ناقابل تردید شواہد موجود ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ ایک ہی شاعر نے بیانیہ نظمیں بھی لکھیں اور غزلیں بھی۔ مثلاً گلشن عشق اور علی نامے کے مصنف نصرتی کی غزلیں ملتی ہیں۔ صاحب سحر البیان میر حسن کا غزلوں کا دیوان موجود ہے۔ فریاد داغ کا خالق اردو کا سب سے زیادہ شوخ غزل گو ہے۔ اور مصنف شاہنامۂ اسلام کے منظومات کے مجموعوں نغمۂ شیریں اور نغمہ زار میں کثیر تعداد میں غزلیں ہیں۔ یہ درست ہے کہ غزل اور بیانیہ شاعری کے اسلوب اور تکنیک میں فرق ہے مگر ان میں کوئی ایسا تضاد یا تناقض ہرگز نہیں کہ ایک کا وجود دوسرے کے عدم کے مترادف ہو یا اس کے دوام میں بری طرح حائل ہو جائے۔ جیسا کہ شاید فرض کر لیا گیا ہے۔ اگر اس میں کچھ بھی صداقت ہے تو کوئی بتائے کہ غزلوں کے دو دیوان کے مولف امیر خسرو نے کئی مثنویاں کیوں لکھیں اور انھوں نے ان دونوں اصناف سخن میں کس طرح ایسے سدا بہار پھول کھلائے۔

بھارت میں چائے

۱۔ بھارت میں ہر سال ۷۰۰ لاکھ مربع فٹ پلائی وڈ تیار ہوتی ہے۔ اس میں سے ۱۹۵۴ء میں ۴۰۰ لاکھ مربع فٹ پلائی وڈ کی کھپت چائے کی صنعت میں ہوئی۔

۲۔ اس برس کے دوران میں چائے کی صنعت نے ۸۲ ہزار ٹن کھاد خریدی۔ اس میں سے ۲۵۰۴ کروڑ روپے کی مالیت ۳۷ ہزار ٹن کھاد بھارت میں تیار ہوئی۔

۳۔ ۱۹۵۴ء میں ملکی ٹرانسپورٹ سروسوں نے چائے کی صنعت سے ۸۶ء۳ کروڑ روپے بطریق بھاڑے کے کمائے۔

۴۔ چین کے برعکس بھارت ملک میں پیدا ہونے والی چائے کا ایک خاص حصہ غیر ممالک کو برآمد کرتا ہے۔ چین میں جو چائے پیدا ہوتی ہے، اندرونی طور پر کھپ جاتی ہے۔

آوارہ

یہ بھی ہوتے ہیں

ایک ہوتی ہے آکاش بیل جو بِن بوئے آپ ہی اُگتی ہے، پھر جس درخت پر اپنا جالا پورتی ہے اُس کا رس اس طرح چوس لیتی ہے کہ دکھیا پھول پتی کو ترس جاتا ہے۔ دوسرے ہیں یہ بزرگ وار جو آدمی سے چپکتے ہیں اور ٹالے نہیں ٹلتے۔ بن بلائے بولتے ہیں اور اتنا بولتے ہیں کہ آپ تنگ ہو جائیں یہ پھر بھی بولے جائیں۔ پوچھنا تو چھوڑئیے الگ بات ہے، آپ نہ پوچھیں، نہ منہ لگائیں، تو بھی آپ کے ہر معاملے میں خواہ مخواہ دخل دیں گے اور جتائیں گے کہ شادی بیاہ سے لے کر موت مٹی تک ان کا فرمایا ہوا سند ہے۔ تجربے کی کسوٹی پر کسا ہوا یا ون تولہ پاؤ رتی درست۔ اور آپ نے نہ مانا تو سمجھ لیجئے کہ بیڑا غرق ہے۔ پھر بھی یہ نہیں کہ آپ سے اپنی خدمت کا کوئی معاوضہ مانگیں، وکیل اور ڈاکٹر کی طرح مشورے کی فیس طلب کریں یہ تو بہ قول غالب ؎

سرمۂ مفتِ نظر ہوں مری قیمت یہ ہے کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

محض آپ کی بھلائی، صوفی صد آپ کے نفع کے لئے کہتے ہیں، ورنہ ذاتی طور پر انہیں آپ کے معاملے سے کیا غرض ہے یا ہو سکتی ہے۔ جو کہتے ہیں خدا واسطے کہتے ہیں اور ایک سے ایک بڑھ کے مثالیں دے کر ثابت کرتے ہیں کہ ان کا کہا پتھر کی لکیر اور آپ مانیں یا نہ مانیں نوشتۂ تقدیر ہے۔

گھر سے کھا پی کر نکلتے ہیں، ملنے والوں کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں شہر کی ساری آبادی سما کر بھی کچھ نہ کچھ بچ رہتا ہے۔ آپ کو کہیں نہ کہیں ضرور ڈھونڈ لیں گے۔ بلکہ ہو سکتا ہے خود آپ ہی کو تاک کے گھر سے نکلے ہوں۔ بلا ہو کہ کچہری آپ کی بیٹھک ہو کہ ریلوے اسٹیشن، چنگی کی چوکی، شہر کا تھانہ، اسپتال، کسی کی ارتھی جا رہی ہو یا ڈھول تاشے کے ساتھ نوشہ میاں، یہ آپ کو ضرور ہی ملیں گے جان پہچان ہوئی تو سبحان اللہ، سونے پر سہاگہ ہے۔ نہیں تو خیر کیا۔ کسی نہ کسی سے دعا سلام ہو ہی جائے گا، اب کیا ہے۔ صورتِ حال پر ایک چھچھلتی سی نگاہ ڈال کر جو شروع ہوں گے، تو اللہ دے اور بندہ لے۔

بیٹھئے، یادش بخیر، وہ آ ہی گئے!

دیکھنے میں کتنے وضع دار اور سنجیدہ مرد اشراف جان پڑتے ہیں۔ قدم قدم پر ٹھٹکتے، آداب تسلیمات ہوتی آ رہی ہے۔ رکے۔ سامنے کی دھوپ سے بچنے کے لئے ہاتھ سے آنکھوں پر سایہ کیا۔ لمحہ بھر ماتھے پہ شکنیں ڈالے کسی کو دیکھتے رہے، پھر اطمینان سا کر کے داہنی طرف مڑے، چار چھ قدم چلے اور ٹھیر گئے۔ لالہ کندن لال بزاز کی دوکان تھی۔

"میں نے کہا بندگی عرض ہے۔ کہئیے لالہ جی مزاج تو اچھا رہا؟"

"آہا! آپ ہیں! آئیے آئیے! بہت دن پیچھے درشن دیئے۔ یہ کدھر نکل پڑے آج سویرے سویرے؟"

"کچھ نہیں۔ گھر میں پڑا کھٹیا کا بان توڑ رہا تھا۔ کام دھام کچھ تھا نہیں، میں نے کہا چل کے بزازی کا ایک سپاٹا مار آؤ۔ آتے آتے آپ دکھائی دے گئے تو جی نہ مانا۔ میں نے کہا لالہ سے بھینٹ کئے دن ہو گئے، دعا سلام کرتے چلیں۔"

"ارے صاحب بڑی کرپا کی۔ ہم تو جانو آپ ہی کے ہیں۔ کچھ جل پان، پان، سگریٹ منگاؤں؟"

"نہیں"

"لالہ گھر سے کھانا کھا کے نکلا ہوں۔ اور کہئیے حال چال کیسی گزر رہی ہے؟ کپڑا آج کل بڑا مندا تو نہیں چل رہا ہے؟"

"سو تو ہے۔ بھگوان کی دیا سے اپنا کام تو ڈھیلا کسا نرم گرم چلا ہی جاتا ہے پھر آپ سب کا ہات سر پر ہے۔"

"لالہ، ایک بات ہے سنو تو کہوں۔ آج کل املی، تل اور رینڈی کا بھاؤ

گر گیا ہے۔ ہماری جان ہزاروں پانی سے من بھر لیتے تو جیسے چھکے چھوٹے کا سودا تھا۔"

"جی یہ روگ ہم نہیں پالتے، ہم تو اپنے اسی ململ ڈورئیے کے چار تھانوں میں خوش ہیں تم جانو۔ اسی میں چار کوڑیاں مل گئیں، سو بس ہیں دال روٹی کو۔"

"لالہ، اس میں کوئی جوکھم تھوڑی ہے۔ ورنہ میں ہرگز صلاح نہ دیتا تم کو دیکھو نا، تم تو پھر بازار ہاٹ کے کیڑے ہو، اونچ نیچ جانتے ہو۔ گھر کے سامنے اسکول کے ماسٹر رہتے ہیں۔ میرے سمجھانے پر انھوں نے سو من تل بھر لئے۔ اب منڈی کو دو روپے ہیں۔ پوری پچیس اڑھائی روپے کا منافع ہے۔"

"ہوگا میاں جی ضرور کرتے ہوگا۔ پر بات اتنی ہے کہ اس بھانت کے سودے ہم نے کئے نہیں۔ اب تم کہہ رہے ہو تو سوچیں گے، اچار جنوں سے پوچھیں گے۔"

"اچھا۔ اب میں چلا۔ یوں، تو کھلا ٹال دانے ملادی کے جاتا ہے۔ کُنالت گھر آیا تھا، نہ جانے کیا کام تھا۔ اور سب بال بچے، گھر کے لوگ تو مزے میں ہیں؟"

"ہاں صاحب آپ کی دیا سے سب کشل منگل۔"

چل دیئے۔

ایک بڑی حویلی کا دیوان خانہ۔ دری چاندنی کا فرش، قالین پر گاؤ تکیہ کے سہارے کوئی صاحب عینک لگائے بیٹھے ہیں ہات میں کاغذ ہے، جسے بار بار دیکھتے ہیں اور فکر مند دکھائی دیتے ہیں۔ سامنے اور کوئی دو زانو بیٹھا ہے۔ کون ہو؟ وہی ہمارے بزرگوار ہیں۔ ایسا جان پڑتا ہے۔ بات چیت کا سلسلہ جاری تھا جو کچھ دیر بند رہ کر پھر چل پڑا۔

"مرزا صاحب، یوں تو آپ لاکھ روپے کو بھی سستے ہیں۔ پر ایک کمزوری ہے آپ کے مزاج میں۔ وہ کیا؟ یہی کر اپنے آگے آپ دوستوں کی نہیں سُنتے۔ وہ بھی مجھ سے نیاز مند کی۔ مانا کہ آپ بڑے ذہین، اور زمانے کے داؤں گھات خوب جانتے ہیں۔ مگر صاحب یہ کچہری دربار کے معاملے ہیں۔ ان کے آثار چڑھاؤ آپ کے بس کے نہیں۔ دیکھ لیجئے، آؤ دیکھا نہ تاؤ آپ نے اٹھا کے لنکبین صاحب بابٹر کو مقدمہ سونپ دیا۔ وہ ابتدائی میں بھلے ہی کچھ ہاں ہوں کرلیں۔ اپیل لڑانا تو ان کے فرشتے بھی نہیں جانتے۔"

"یہ آپ کیا فرماتے ہیں! لنکبین صاحب تو وہ ہیں کہ جج کا چلتا قلم روک دیتے ہیں۔ پان سو روپے بیٹھے لینا آپ کے نزدیک کچھ ہوا ہی نہیں۔"

"جناب مرزا صاحب۔ حق تو یہ ہے کہ آپ پورے جنتی ہیں۔ جو کسی نے کہہ دیا۔ آپ نے آسمان کا اترا مان لیا۔ کچھ خبر ہے آج صوبے بھر میں کس کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے؟ نہیں؟ تو ہم سے سُنئے۔ منشی جوکھو لال وکیل کا میاں قانون جیب سے بنا ہے۔ اُس دن سے آج تک کی تو ہمیں معلوم ہے۔ مقدمہ ہے مال کا۔ جوکھو لال نے فوجداری کی کوئی نظیر چپکائی اور تپٹ سے دعویٰ جیت ہوا۔ مطلب یہ کہ لنکبین و نکیبن کو تو آپ رکھئے تہہ کرکے، دھڑلے سے دستخط کیجئے، جوکھو لال کے وکالت نامے پر اور پاؤں پھیلا کے سو رہئے آرام سے۔ دس دن لیں گے پہلی پیشی پر۔ اور اُسی پر دعوا ڈگری کرا کے آپ کے ہات دھریں گے۔ مرزا جی بات یہ ہے کہ ہم سے دوست آشنا کا پیسہ برباد ہوتے نہیں دیکھا جاتا کیا کریں عادت سے مجبور ہیں صاحب۔ سینکڑوں مقدمے لڑا کے جو دوچار گُر ہات لگے ہیں، اُنھیں کُھیا کا گڑ بنا کے ہم سے نہیں رکھا جاتا، نہیں دیکھا جاتا کہ مقدمہ آپ کے خلاف فیصل ہو۔ دروازے پر قرقی آئے اور آپ کا مال کے ٹکے دھڑی نیلام ہوتا پھرے۔ اپنی صلاح تو یہ ہے۔ ماننا نہ ماننا آپ کا کام۔ اب اجازت دیجئے۔ اور ہاں یہ آپ نے کانوں کان کسی کو خبر نہ ہونے دی، اور ننھو قسائی والا قلمی آموں کا باغ خرید لیا! یعنی آپ نے ہمیں مردہ تصوّر کرلیا؟"

"نہیں تو یہ آپ سے کس نے کہا؟ خریدا وریدا کچھ نہیں۔ بات چیت ہورہی ہے۔"

"اچھا۔ خیر، تو دیکھئے اس معاملے میں آپ کو میری بات ماننا پڑے گی۔ ورنہ پچھتایئے گا۔ سُنئے۔ جو کہیں دو ہات نیچے نکل آیا کنکر۔ تو آپ ننھوا کا کیا بنا لیجئے گا۔ وہ تو پانچ ہزار نقد کی پوٹلی مار بغل میں چلتا بنے گا۔ اور سال بھی نہ پلٹنے پائے گا کہ سارے پودے سوکھ کے کانٹا رہ جائیں گے، اور آپ کلیجہ مسوس کے ننھوا کی جان اور اپنی رقم کا ماتم کرتے رہیں گے۔ مانا کہ اس سے مجھے کیا سروکار۔ رقم میری جیب سے نہیں جاتی۔ مگر یہی کہ اپنے سے نہیں دیکھا جاتا اتنا روپیہ مٹی میں ملے۔ اور میں چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہوں۔ جتا نا میرا کام تھا، ماننا نہ ماننا آپ کا کام۔ وہ بھئی دیر ہوگئی، اب چلتا ہوں۔"

اٹھے اور چل دیئے۔ اب دوسرے شکار کی تلاش ہے۔ جو شکر خورے کو شکر اور موذی کو ٹکر۔" مل ہی جاتا ہے۔

دیکھ لیجئے۔ دھوم دھڑلّے سے کسی کی برات آرہی ہے۔ یہ جیسی ہوتی ہیں آپ جانتے ہی ہیں۔ جھنڈی بردار، آرائش کے تختے۔ بینڈ باجے، شہنائی والے

سجے ہوئے گھوڑوں پر جاتی بند سوار، گلے میں پھول مالائیں ڈالے خوشی کے مارے آپ ہی آپ مسکراتے، ہنستے بولتے، پھر خود نوشہ کا گھوڑا، اجلے کپڑوں میں گھیرے ہوئے مہمان اور دوسرے براتی مشعلیں اور گیس کے ہنڈے لئے ہوئے لوگ قدم قدم پر رُکتے ہوئے انھیں میں سے چلے ہمارے یہ بزرگوار بھی ہیں ہو نہیں سکتا کہ جلوسیوں میں ان کا کوئی جان پہچان نہ نکلے۔ مان لیجئے کہ نہ نکلا کوئی۔ تو انھیں کیا پروا۔

"ارے نالائقو! یہ تاشے والے سب آگے کیوں بڑھ گئے۔ چلو ایک قطار میں آؤ۔ اور یہ ہنڈے والے کس جنگل سے آئے ہیں۔ غضب خدا کا، برات اندھیری ادھر آ بے! یہاں رہ! دولہا کا مکھڑا تو دکھائی دے!"

بینڈ کی باری آئی تو۔

"یار کیا فلم کے گیت ٹھونکے چلے جا رہے ہو کوئی شہانہ پھونکو۔"

اور

"یہ ڈھول تاشے والے نرے گاؤدی ہیں۔ محرم کا باجا بجا رہے ہیں۔"

اسی میں دولہا کا کوئی ماموں چچا مل گیا تو،

"مبارک ہو، مگر یہ دولہا میاں تو ...."

بات کٹ جاتی ہے۔ برات بڑھتی ہے۔ زری کا چتر آفتاب گیر لئے کچھ لوگ ہوتے ہیں۔ یہ کیوں رہ جائیں۔

"اماں کیسے بدتمیز ہو۔ دولہا کا گھوڑا کہاں پہنچا۔ تم چلم میں دم لگاتے یہاں رہ گئے۔ خبردار، جو اب گھوڑے کی رکاب کے پاس نہ رہے۔ تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں۔"

غرض کہ برات کی آدھی رونق ان کے دم قدم سے ہے۔ براتی سمجھتے ہیں اہتمام انہی کے سپرد ہے۔ نوشہ میاں جانتے ہیں کہ والد صاحب کے کوئی دوست ہیں۔ والد صاحب کا خیال ہے کہ مہمانوں میں سے کوئی مہربان بات بنا رہے ہیں۔ حالاں کہ بزرگوار نہ یہ ہیں نہ وہ۔ محض دخل در معقولات ہیں۔ اب یہیں بھی رخصتی کا سلام داغ کے جانے دیجئے، دیکھ لیا تو بچے جھاڑ کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ پیچھا چھڑانا مشکل ہوگا

چندر پرکاش شاد

غزل

دل سے یہ دھواں سا اُٹھ رہا ہے — شاید یہ چراغ ابھی بجھا ہے

پھر یاس نے آسرا دیا ہے — جینے کا بہانہ مل گیا ہے

تم بھی مجھے چھوڑ دو تو کیا ہے — کب کوئی کسی کا ہو سکا ہے

پھر کھائی ہے تازہ چوٹ شاید — دیوانہ تڑپ کے جی اُٹھا ہے

حالات بہت بدل گئے ہیں — اب عشق بہت سنبھل گیا ہے

آنکھوں سے کہیں رواں نہ ہو جائے — وہ خون جو دل سے رِس رہا ہے

اے شاد سکوتِ زندگی بھی

اب دل کو بہت کھٹک رہا ہے

مغیث الدین فریدی

تضمین

بر غزل غالب

پژمردہ تھی فضائے محبت، نکھر گئی   تقدیرِ عشق، ایک نظر میں سنور گئی
اک سوزِ بے پناہ، رگ و پے میں بھر گئی   دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

جس راہ سے وہ پیکرِ خوبی گزر گیا   اس رہگزر پہ سب کو گماں ہے بہشت کا
بہکے ہوئے شباب کے قدموں نے کیا کیا   دیکھو تو دل فریبیٔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

بے پردگی سے کام لیا ہے حجاب کا   راس آگیا ہے حسن کو نشّہ شباب کا
ساغر چھلک گیا نگہِ کامیاب کا   نظّارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

افشائے رازِ عشق کا مجھ کو کہاں دماغ   روشن ہیں دل میں غم کے کنول یا کہ چراغ
اے ضبطِ غم سلام، کہ لو دے اٹھے ہیں داغ   شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذّتِ فراغ
تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی

شعلے اٹھے ہیں جام سے پیمانے سے دھواں   نغمہ بنا ہوا ہے لبِ ساز پہ فغاں
آلامِ روزگار سے ملتی نہیں اماں   وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی

ہر سر میں ہے ہوائے محبت بھری ہوئی   پہلے تو اتنی عام، یہ جنسِ گراں نہ تھی
موتی کی آب، سیپ کے ٹکڑوں نے لوٹ لی   ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

حنیف نقوی سہسوانی

یادِ رفتگاں

منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

منشی انوار حسین تسلیم[1] کے نام سے غالباً ہر وہ شخص واقف ہوگا جس نے مطبع نولکشور کی قدیم مطبوعات کا مطالعہ کیا ہے۔ مطبع مذکور سے شائع شدہ اکثر و بیشتر کتابوں کے آخر میں آپ کی تقریظیں اور تاریخی قطعات ملتے ہیں۔ منشی صاحب موصوف سہسوان ضلع بدایوں کے ایک ذی علم اور معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۲ رجب ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۵ء کو اپنے آبائی وطن ہی میں ہوئی۔ اس زمانے میں آپ کے والد منشی احتشام الدین صاحب مرادآباد میں وکالت کرتے تھے۔ اس سے قبل موصوف ایک عرصہ تک عہدۂ منصفی پر بھی فائز رہ چکے تھے۔ حضرتِ تسلیم نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر ہی میں حاصل کی۔ بعدہ مختلف اساتذہ سے فارسی و اردو ادب نیز دیگر علومِ مروّجہ کی تکمیل کی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں آپ کے عم حقیقی منشی قیام الدین صاحب مرحوم کوتوال شہر مرادآباد کی صاحبزادی سے آپ کا عقدِ نکاح ہوگیا۔ چناں چہ آپ بھی مرادآباد ہی پہنچ گئے۔ اور عدالتِ دیوانی میں امین کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ کبھی کبھی بحصولِ رخصت وطن آتے جاتے رہتے تھے۔ ۱۸۴۵ء میں جب آپ کے والد کا انتقال ہوگیا تو آپ وطن سے قطعاً ترکِ تعلق کرکے مرادآباد ہی مقیم ہو گئے۔ اوائل ۱۸۵۵ء میں آپ کو ملازمت سے برطرف کردیا گیا جس کی وجہ سے مرادآباد کی سکونت ترک کرنا پڑی۔ اس کے بعد شاید آپ تین چار سال تک وطن ہی میں قیام پذیر رہے۔ ۱۸۶۲ء کے آخر میں یا ابتدائے ۱۸۶۳ء میں آپ لکھنؤ پہنچے اور "اودھ اخبار" سے متعلق ہو گئے۔ یہ تعلق یکم مارچ ۱۸۶۹ء تک قائم رہا۔ دراصل یہی ملازمت ادبی دنیا میں آپ کی شہرت کا باعث بنی۔ جیسا کہ آپ نے خود ہی اخبارِ مذکور کے متعلق اپنے ایک مضمون مطبوعہ اخبار "نیرِ اعظم" مرادآباد مورخہ ۷ نومبر ۱۸۸۱ء میں تحریر کیا ہے۔

"اس اخبار نے بندہ کو مشہور نزدیک و دور کیا ہے۔ میرا محسن ہے۔"

اودھ اخبار سے قطع تعلق کے بعد منشی صاحب جنوری ۱۸۸۱ء میں پھر مرادآباد پہنچ گئے۔ جیسا کہ نیرِ اعظم بابت ۷ جنوری ۱۸۸۱ء کی مندرجہ ذیل خبر سے واضح ہوتا ہے۔

"شاعرِ لاثانی منشی محمد انوار حسین صاحب تسلیم سہسوانی نے آج ہمارے مطبع کو اپنے قدوم سے شرف بخشا مہتمم کو سربلند کیا۔ منشی صاحب ہمارے قدیم مخدوم ہیں۔ بعد سولہ سال کے مرادآباد کا نصیب آپ کی تشریف آوری سے جاگا ہے۔ یقین ہے کہ سکونتِ دائمی مرادآباد کی اختیار فرمائیں گے۔"

آپ کا حلقۂ احباب و تلامذہ بہت وسیع تھا۔ ہندوستان کے اکثر و بیشتر مشاہیر اہلِ قلم اور اربابِ علم و ادب سے آپ کے دوستانہ تعلقات تھے۔ آپ کے قدردانوں میں آنجہانی منشی نول کشور اور راجہ کشن کمار صاحب وقار رئیس مرادآباد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ منشی صاحب علم و فضل کے ساتھ ساتھ

---

[1] "آج کل" کے نومبر ۱۹۵۵ء کے شمارے میں جناب گوپی چند نارنگ نے اپنے مضمون "شادی بیاہ کی مشترکہ رسمیں" میں "مثنویات" مصنفہ امیر احمد علوی کے حوالے سے تسلیم کا نام انوار احمد لکھا ہے مگر ان کا نام دراصل انوار حسین ہے

نازک دماغی اور وارفتہ مزاجی میں بھی یکتا تھے۔ چناں چہ آپ کا مندرجہ ذیل شعر اس حقیقت کا آئینہ دار ہے ؎

نازک مزاج مجھ سا ہوا ہے نہ ہوئے گا
روحِ رواں بھی اپنی ہے بارِ گراں مجھے

مگر مذکورہ بالا دونوں حضرات آپ کی نازک مزاجیوں کو نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے اور آپ کو نہایت قدر و منزلت اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ منشی صاحب کو بھی ان صاحبان سے علیحدہ رہنا کبھی گوارا نہ ہوا۔

ان لوگوں کے علاوہ مولانا صہبائی، مرزا رجب علی بیگ سرور، منشی امیر اللہ تسلیم، فصیح الملک حضرت داغ، حکیم ضامن علی جلال، منظفر علی اسیر اور امیر مینائی لکھنوی سے آپ کے بہت پر خلوص مراسم تھے۔ ان میں سے بعض حضرات کے خطوط مومن حضرت تسلیم جو مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں اس ربط باہمی کی یادگار ہیں۔ مولانا امام بخش صہبائی کا ایک طویل خط (بزبان فارسی) جس میں فنِ تاریخ گوئی کے ایک اہم مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے آپ کی مطبوعہ تصنیف "ملخص تسلیم" میں شامل ہے۔ آئندہ سطور میں حضرت امیر مینائی کا ایک خط ناظرین کے ملاحظے سے گزرے گا۔ ذیل میں منشی صاحب کا ایک خط موسومہ مرزا رجب علی بیگ سرور اور جواب کے رسالہ خیابان لکھنؤ بابتہ ماہ مارچ ۱۹۳۷ء سے نقل کر کے درج کیا جاتا ہے۔

خط منجانب منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی

ساقی بے پروا مست بادۂ استغنا و غافل از حالِ مردم تر دیک و دور مرزا رجب علی بیگ سرور . .

جس دن سے بندہ کان پور میں مقیم ہے پریشانی کے ہاتھوں حالِ جمعیت ستم ہے۔ کام کی کثرت سے امور ذاتی میں نشہ فتور، فرصت کی آفت سے معاملہ خانگی میں ہزار نقصان۔ یادش بخیر کوہ طرازی انشا سخن پرداز۔ خفقان کا جوش ہے۔ مزاق کی شورش، بے دلی و دلر کوشش سے بیکسی بادہ فروشی، ہر دم کلفتِ خاطر زیادہ، وحشت سے اثر نے پر آمادہ، اس کیفیت پر دعی صبر نہ آیا، مصرع طرح عنایت فرمایا۔ انصاف شرط ہے ملاحظہ فرمائیے۔ ادھر دیکھو آنکھیں تو پرائی یہ دوستی کا انداز ہے یا دشمنی کا

---

۱ و ۲ رسالہ خیابان نے اس خط کا عکس شائع کیا ہے۔ چونکہ خط شکستہ میں ہے۔ لہذا ۔ ۔ ۔ ۔ پوری طرح پڑھے نہیں جاتے

کا ساز ہے۔ بہر تقدیر تعمیلِ حکم بجا لاتا ہوں، چند نالۂ دل خراش سناتا ہوں، نقصانی ہوں، باقی ہوں لطف زبان ہے، سخت بیان ہے۔ اب مروت کا انضباط کیجئے چوبِ ناتراشیدہ کو خراط کیجئے۔ دست و قلم کو تکلیف دیجئے اور بندگی کا سر خط لیجئے۔ اعراض پہ اعتراض فرمایئے، اعتراض پہ اعراض لایئے، بعد ملاحظہ و اصلاح کے بجنسہٖ یہی کاغذ . . . فرمایئے اور بندہ کو قیدِ انتظار سے چھوڑایئے۔ فقط

ششم فروری ۱۸۶۸ء
المکلف محمد انوار حسین تسلیم

جواب از جانب مرزا رجب علی بیگ صاحب سرور

سبحان اللہ شیر بیشہ فصاحت ہو، ہزبر میدانِ بلاغت ہو کیا مجال ہے کس کو جو تمہارے سامنے روبہ بازی کر سکے۔ نظم میں ثانی ہو نثر کے بانی ہو، بے مثل ہو یکتا ہو زبان لڑکھڑاتی ہے کیا کہوں کہ کیا ہو۔ سچ یہ ہے تم ہو منشی صاحب کے رفیق و ہمدم ہو۔ والسلام رقیمہ تمام ہوا۔ بندہ بھی اگرچہ نزدیک نہیں دور ہے، مگر منشی نول کشور صاحب کی عنایت سے مسرور ہے۔ مسرور ہے۔

ان خطوں کے علاوہ منشی صاحب کا ایک قطعہ مرزا دبیر کے نام بھی موجود ہے جو "ملخص تسلیم" میں درج ہے۔ یہ قطعہ میر انیس کی تاریخ وفات ۔ ع "طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس"

(جس پر مرزا دبیر نے اعتراض کیا تھا) سے متعلق چند منتخبات و اعتراضات پر مشتمل ہے

منشی صاحب فارسی و اردو نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ خصوصاً فنِ تاریخ گوئی میں آپ کو زبردست دستگاہ حاصل تھی۔ مشغلۂ نظم و نثر فارسی آپ کا خاندانی ورثہ تھا جو آپ کے جد امجد منشی ریاض الدین محمد ریاضی شاگرد مرزا مظہر جان جاناں سے بواسطہ منشی قیام الدین عقیدہ آپ تک پہنچا تھا۔ اردو نظم میں مصحفی کے شاگرد شیخ علی بخش بیمار سے فیضِ تلمذ حاصل تھا۔ آپ نے اکثر کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ مگر افسوس کہ وہ سب سرمایۂ افکار خود آپ ہی کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گیا۔ منشی صاحب اپنی آزادہ روی کی بنا پر اپنی تصنیفات و تالیفات کو نذرِ آتش کر دیا کرتے تھے۔ چناں چہ ایک عرضی موسومہ نواب کلب علی خاں مرحوم میں خود ہی تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس مداح خرد دشمن نے لکھنؤ میں ۵م اگست ۱۸۶۲ء کو چار سو پانسہ جز نظم و نثر اردو و فارسی اپنی تصنیف و تالیف کی جلادی

سکہ منشی نول کشور

بار دیگر یکم ستمبر ۱۸۸۵ء کو بہ مقام مرادآباد دوبستے پھونک دیئے جن میں مسودات کے سوا یہ کتابیں مرتب و مکمل تھیں ... مثنوی اردو نو ہزار بیت کی، دیوانِ فارسی متن و حاشیہ بیس جزو دیوانِ اردو متن و حاشیہ پچاس جزو رسالہ قواعد تاریخ گوئی انیس جزو ..... !"

اخبار نیّر اعظم مرادآباد مورخہ ۲۵ اپریل ۱۸۸۶ء میں ایک خاص مضمون کے تحت رقمطراز ہیں :-

"در بار اجزائے نظم و نثر تصنیف و تالیف خود را کہ زائد از شش صد جزو بود پیراہنِ شعلۂ آتش ساختہ ام و بعد آں کہ بہ حکم شغلِ بیکاری جمع شدہ تفصیل آں ایں است :-

نمبرا۔ رسالہ در فنِ تاریخ گوئی ۸ جزو (۲) خوابِ بعد پنج جزو (۳) دیوانِ فارسی شش جزو متن و حاشیہ (۴) دیوان اردو شانزدہ جزو متن و حاشیہ (۵) رسالہ حامل ہفت صد سوال مع جواب ہیجدہ جزو (۶) مثنوی اردو دہ ہزار و شش صد و شصت و یک بیت بست و ہشت جزو (۷) نظم و نثر فارسی و اردو ہفتاد و یک جزو (۸) بہارِ ہند مصطلحات اردو یک صد و سی جزو (۹) کتاب در قواعد نظم و نثر فارسی ہفتدہ جزو۔ سہ کتاب بجاں جان در قالب طبع در آمدہ اند۔

نمبرا مثنوی سحر بین اردو نمبر ۲ تاج المدائح فارسی نظم و نثر در مدح والی رام پور۔ نمبر۳ مثنوی در محامد والیۂ بھوپال۔"

مندرجہ بالا تخلیقات یکم ستمبر ۱۸۸۵ء کے بعد سے ۲۵ اپریل ۱۸۸۶ء تک کی کوششِ فکر اور طبع آزمائی کا نتیجہ تھیں۔ حضرت تسلیم کی قادرالکلامی اور پختہ مشقی کے ثبوت میں محولہ بالا فہرستِ کتب کوزہ در دریا بہ آغوش کی حیثیت رکھتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان کتابوں کا کیا حشر ہوا ؟ اس سلسلہ میں میرا یہ خیال ہے۔ کہ غالباً یہ تمام ذخیرہ بھی نذرِ آتش کر دیا گیا ہوگا۔ اس خیال کی تائید نواب شمشیر بہادر صاحب اخگر رئیس اجیگڈھ کے ایک خط مطبوعہ ماہنامہ مخزن دہلی بابت ماہ مئی ۱۹۰۹ء سے ہوتی ہے۔ موصوف کے خط کے مندرجہ ذیل اقتباس میں متذکرہ کتب لغت سے مذکورہ بالا کتاب بہارِ ہند مصطلحات اردو کی طرف خیال منتقل ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ اس سے قبل جلائی گئی۔ تصانیف کی فہرست میں کتب لغت کے متعلق کوئی واضح اشارہ نہیں ملتا۔ جناب اخگر تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ منشی فولاد حسین صاحب مرحوم تسلیم سہسوانی نے دو صندوق کتابوں سے بھرے ہوئے جو کہ خاص انھیں کی تصانیف و تالیف تھیں جلا کر خاک کر دیئے۔ ان میں سے بعض بعض کتاب ایسی بے مثل و لاجواب تھی کہ جن کی تعریف نہیں ہو سکتی ایک تو صرف و نحو کی اور دو لغت کی۔ اگر یہ شائع ہو جاتیں تو ملک کو بہت فائدہ پہنچاتیں۔ میں نے اور پنڈت بنواری لال نے پوچھا تھا کہ منشی صاحب ایسا کس واسطے کیا جاتا ہے۔ کہنے لگے اے بھائی اتنا روپیہ کہاں سے، لاؤں گا جو انھیں شائع کراؤں ...... !"

زود گوئی

تسلیم بہت زود گو اور مشّاق شاعر تھے۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ چناں چہ خود بھی ایامِ ضعیفی کی ایک تحریر میں اپنی اس قادرالکلامی کا یوں تذکرہ کرتے ہیں :-

"یاد آں روز کہ زود گوئی بر نامم نازش میداشت و بسیار گوئی بر

ہ یہ عرضی منشی صاحب نے حضرت امیر مینائی کی معرفت نواب صاحب کو بھیجی تھی ساتھ ہی موصوف کے نام بھی ایک خط تھا۔ جس کا جواب بھی اسی عرضی اور خط کے ساتھ اخبار تہذیب مرادآباد مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۸۸۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔ چوں کہ اس جوابی مکتوب سے حضرت تسلیم اور جناب امیر مینائی کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ لہذا میں اس کو یہاں نقل کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ وہو ہذا "حضرت تسلیم کی خدمت میں بعد تسلیم التماس ہے کہ ملامت نامہ آیا شکر گزار فرمایا ؎ ہرچہ از دوست میرسد نیکوست اپنی بے جرمی کی کیفیت اور اس امر واہی افواہی سے اطلاع نہ دینے کی علت اور کسی وقت پر موقوف۔ اصل مطلب سنیئے کہ عرضی شدت انتظار میں پہنچی۔ میں اگرچہ بیمار تھا اور درد شانہ و بازو و پشت میں بے قرار تھا۔ مگر اسی وقت دربار گیا اور حضور میں اس کو پیش کیا۔ بعد ملاحظہ جو کچھ زبان فیض ترجمان سے ارشاد ہوا حاصل اس کا یہ ہے کہ پہلے بھی اعتماد کا یقین نہ تھا اور اب تو وہم بھی نہ رہا۔ مگر تا رنجوری و دردمندی کے عذر سے یہ فراغت نامہ مختصر در بار سے اٹھ کر لکھ بھیجا۔ تاکہ خاطر عاطر سے نگرانی جاتی رہے، نیاز مند کو آپ اپنا خیر اندیش خاص تصوّر فرمائیں اور حتی الامکان کسی موقع پر کمی اور پہلو تہی کرنے کا احتمال دل میں نہ لائیں۔ فقط

۱۸ ستمبر ۱۸۸۵ء راقم عاصم امیر فقیر

طبیعم سوگند ہی خورد، در خاک دخواں نے تپاند۔"

اخبار نیّرِ اعظم بابت ۱۸ جنوری ۱۸۸۱ء میں شائع شدہ مندرجہ ذیل واقعہ سے بھی اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے

"راسے اشن کمار صاحب وقار نے منشی محمد نوازحسین صاحب تسلیم سہسوانی کو جو ان کے استاد ہیں لکھنؤ سے بہ خلوصِ عقیدت بلا بھیجا [illegible] آمادہ ہو گیا۔ ایک دن بہ وقتِ شام کہ دورِ تقریر میں [illegible] وقار صاحب نے فرمایا کہ آپ نے فارسی کہنا بالکل ترک کر دیا۔ اسی شب حضرت تسلیم نے اٹھارہ بیت فارسی میں فرما کر صبح کو پیش کیں [illegible]"

تاریخ گوئی

تاریخ گوئی میں تسلیم کو بھی کمال حاصل تھا۔ انھوں نے اپنا زیادہ تر زورِ فکر اسی فن پر صرف کیا ہے اور دراصل اسی فن کی وجہ سے علمی و ادبی حلقوں میں ان کی شہرت و مقبولیت عام ہوئی۔ آپ جیسے باکمال اور مشّاق تاریخ گو کی نظیر ملنا ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ صدہا لوگوں نے اس فن میں آپ سے استفادہ کیا ہے اور آپ کے شعوروں سے فیض اٹھایا ہے۔ "ملخّص تسلیم" اس موضوع پر آپ کی عدیم المثال اور جامع و مبسوط تصنیف ہے۔ یہ کتاب دو حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصّے میں فنِ تاریخ گوئی کے قواعد اور اصول و مبادیات سے بحث کی گئی ہے اور متنازع فیہ مسائل کو فاضلانہ اور عالمانہ طور پر فیصل کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ چند در چند مثالوں کے ذریعے ہر بات کی اس طرح وضاحت کی ہے کہ بہ آسانی قارئین کے ذہن نشین ہو جائے۔ دوسرا حصّہ مصنّف کے طبع زاد اختراعات و ایجادات پر مشتمل ہے۔ منشی صاحب کا دعویٰ ہے کہ

"در فنِ تاریخ گوئی (دو نیز در نظم و نثر) بسیار قاعدہ مستخرجۂ طبعِ من است۔ ممکن نیست کہ در بطلانِ دعویم ما عی کتابے در سند آرد۔"

تسلیم کی زود گوئی اور مشّاقی کی چند مثالیں ان ہی کے الفاظ میں درج ذیل کی جاتی ہیں:-

۱۔ روزے والدِ مرحوم احتشام الدین محمد نام از مرادآباد بہ وطن می رفتند بندہ در خدمت سعادت اندوز۔ در راہ ہلالِ شوال دیدند فرمودند کہ جہانگیر بادشاہ ہلالِ شوال دیدہ مصرعے گفت ع "ہلالِ عید چو بر آسمان ہویدا شد" مصرعِ دوم را از ہم آغوشیِ مصرعِ اول پہلو زدید۔ شعرائے پایۂ تخت از عہدہ بر نیامدند۔ گویند کہ نورجہاں مصرعے رسانید۔ ع کلیدِ میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد۔ ہنوز چند قدم راہ طے نکردہ بودم کہ عرض نمودم ؎

بہ حکمِ صفتِ راسب شد خیالِ سالِ بہ دل — ہلالِ عید چو بر آسمان ہویدا شد

بخواندہ مصرعِ سبے کم مورخ طبعم — کلیدِ میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد ۱۲۷۱ھ

۲۔ روزے اکابرِ ثقاتِ مرادآباد در تہ فیض محبوب علی کہ عالم بے عدیل و فاضلِ جیّد بود، فیض اندوز بودند۔ اندراں مجمع طفلے از پدرِ خود شرح زلیخائے جامی می خواند و ایں بیت آخر سبقِ او بود ؎

وداعِ کلبۂ تنگِ جہاں کرد — وطن بر اوجِ کاخِ آسماں کرد

دریں مصرع تاریخ آوازم داد فی البدیہہ و مصرع ہم رسانیدم و بر دستے مجمع خواندم نعرۂ [illegible] و آفریں از ہر کرانہ برخاست و ہو ہذا ؎

فقیہ عصر محبوب علی نام — وداعِ کلبۂ تنگِ جہاں کرد

رقم تسلیم زد از کلکِ جامی — وطن بر اوجِ کاخِ آسماں کرد ۱۲۹۲ھ

۳۔ منشی غلام حسین وکیل عدالت مرادآباد رتھ خانہ تعمیر کردند و از من تاریخ طلب نمودند بے ورا رفتاد گفتم ع

کہ تاریخِ رتھ خانہ "رتھ خانہ" شد ۱۲۶۱ھ

۴۔ تاریخ طبعِ دیوان راجہ کشن کمار وقار

چو از فضلِ خدا شد طبعِ دیوانِ وقارِ من — زیکسی صد وقارم گشت اے تسلیم در عالم

زجا بر بود طبعم را خیالِ سالِ طبعِ او — بگوشم گفت ہاتف کن رقم "دیوانِ تلمیذم" ۱۲۹۱ھ

۵۔ ایں تحریر بقیدِ تاریخ در حالتِ زوال تنبیہِ مشق است و دیگر ہیچ۔

ہوالحکیم الحفیظ، ہوالباری الماجد۔ امیدگاہ صداقت۔ ایمانِ اخلاق و محبت یارِ موافق حکیم عبداللہ صاحب سلامت۔ انبوہِ اندوہ دماغ میں ہے۔ آئینِ بدحالی اپنے باغ میں ہے۔ ولولۂ سودا کا خروش ہے۔ آج نہ ادبیہ کی یاد نہ جمعرات کا ہوش ہے۔ قوتِ شنیدن ہوائے دیدن سے دور۔ راستے تباہ مرگ اب بے قصور قوت، دستبردِ مواکب ہم۔ جانِ پژمان گرفتارِ صد الم۔ بایکدگر حیات و ممات جدال و جنگ۔ عرصۂ نشاط حاصل اسباب تنگ۔ خوشی و انبساط مفقود ہے۔ گرسنگی کے بدلے تشنگی موجود ہے۔ تشنگی وہ کہ آب بحر سے نہ بجھے وجع وہ کہ مسہ پربھی دو چار برس رہے۔ بندہ پرور گیارہ مسہل تو ہو چکے۔ دو رہم طاقت و حال معرکہ آزما کھو چکے۔ انجام فصد پرانہ سالی میں قرار پذیر دارا ہے۔ کہ پیش بہ ہم جوئے رنگ سپید و سیاہ لیل و نہار ہے۔ بہر تقدیر آج کچھ تحریر ہو کہ اعطافِ مرگ دگرگوں زندگی

کی تمیز ہو سہ

بلب آمد سپہر عمرم بیزار دل ۱۲۹۰ھ   شد از اسہال ثنانِ ہال یکث ست
نامہ نیاز تسلیم جانگداز ۱۲۹۰ھ۔ مرقوم دوم جون (۱۸۷۳ء)

شاعری

ہر معرکے میں کھلتے ہیں جوہر کمال کے   مانندِ تیغ تیز ملی ہے زباں مجھے

تسلیم نے فارسی واردو دونوں ہی زبانوں میں طبع آزمائی کی۔ ان کی عظیم شخصیت اس بات کی متقاضی تھی۔ کہ اُن کے کلام کا ایک مکمل اور جامع انتخاب پیش کیا جاتا جس سے اُن کا ادبی مقام واضح ہوتا۔ مگر افسوس کہ یہ مضمون لکھتے ہوئے ہیں اس فرض سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ ہم عصر شعرا میں تسلیم کا مقام اسی وقت متعین ہوسکتا ہے جبکہ ان کا مکمل کلام یا اس کا مکمل انتخاب پیش نظر ہو لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ دوسری تصانیف کے ساتھ خود انہی کے ہاتھوں تمام ہو چکا۔ اب جو کرم خوردہ مسودات محفوظ ہیں اُن کا پڑھنا دشوار ہے۔ ایسی صورت میں انتخاب کلام کے بجائے جو اشعار پڑھے جا سکے ہیں، پیش کئے جا رہے ہیں۔ ساتھ ہی کلام پر ایک اجمالی تبصرہ بھی ہدیۂ ناظرین ہے۔

فارسی کلام

منشی صاحب کو فارسی زبان اور اس کے شعر و ادب پر زبردست عبور حاصل تھا۔ اگرچہ انھوں نے نواب شاہ جہاں بیگم والیۂ بھوپال کی مدح میں ایک مثنوی "(تاج الکلام)" بھی کہی ہے۔ لیکن ان کا رجحانِ طبع غزل کی طرف زیادہ تھا۔ فارسی غزل کے نقوش ان کے دل و دماغ پر گہرے تھے۔ اس کی روایات اچھی طرح شعور میں رچی ہوئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا فارسی کلام اردو کے مقابلہ میں بلند ہے۔ ان کے فارسی اشعار میں مضمون آفرینی، جدّتِ خیال اور ندرتِ بیان کے بعض اچھے نمونے ملتے ہیں۔ اُسی کے ساتھ جدید تشبیہات و استعارات کا بھی نہایت لطیف اور قیمتی ذخیرہ پایا جاتا ہے۔ مثلاً سہ

ساند برگِ من بود از حادثات روزگار   برقِ سوزاں رشتۂ شمع شبستانِ من است

ایک موقعے پر اپنا اور محبوب کا تقابلی خاکہ بڑے لطیف انداز میں کھینچا ہے سہ

آں منم یا دنیایم بدلِ دشمن و دوست   تو نہ آئی کہ شوی لحظہ فراموشِ کسے

مندرجہ ذیل شعر میں بداعت خیال کے ساتھ ساتھ "چشم تنگ ظرف" اور "نگۂ جاں شکار" کتنی اچھوتی اور نرالی ترکیبیں ہیں سہ

اے مرگ مژدہ باد کہ آں چشمِ تنگ ظرف   فرصت نمی دہد نگۂ جاں شکار را

چند فارسی اشعار اور ملاحظہ۔

باشد شعارِ گردوں دلہائے خستہ خستن   آموختہ است کاز مضمون بستہ بستن
از بتاں ناز و عتاب و عشوہ و ایما خوش است   بندگی و عجز و تسلیم و نیاز از ما خوش است
دید زاہد چوں بسوئے بت آں بیچارہ گفت   چاکہا اندر کتانِ پاکی و تقوی خوش است
بوسہ از یار تمنّا کردم   طلبِ قطرہ ز دریا کردم
بے وفائی ہمہ خوباں دارند   شکوہ ات کردم و بیجا کردم
مست بودم بہ خیالِ ساقی   دست در گردنِ مینا کردم
قربانِ شیوۂ تو منی رنجم اے صنم   دیگر فریب دہ دلِ اُمیدوار را
طرحِ تعمیرِ دلم از بس خراب افتادہ است   قطرۂ در آتش و اخگر در آب افتادہ است
قسمتِ نقطۂ موہوم کہ دیدو کہ شنید   می طپد خندہ حبث بر دہنِ خاموش کسے
لذتِ بوسہ بہ پیغام ہمہ رنج دلِ ماست   سخن تلخ بس است از لبِ خاموش کسے
مژدۂ وصل کجا و دلِ افسردہ کجا   ایں ننک شیشہ شدواں بادۂ سرجوش کسے
کار با سوختن افتاد مرا اے تسلیم   آتشے زد بہ دلم شعلۂ خپوشں کسے

اردو کلام

تسلیم کی اردو شاعری اس زمانے سے تعلق رکھتی ہے جسے انقلابی دور یا عبوری دور کہا جا سکتا ہے۔ وہ ادبی شاہراہ کے ایک ایسے دوراہے پر کھڑے تھے جہاں دو مختلف تہذیبیں متصادم نظر آتی تھیں۔ اس لئے ان کی شخصیت قدیم و جدید کے درمیان حدِ فاصل کا حکم رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام رنگا رنگ ہے۔ غالب کی سی مضمون آفرینی اور بلند خیالی بھی ہے اور تصنّع و تکلف کا رنگ بھی بہ اقتضائے زمانہ نظر آتا ہے۔ غالب کے رنگ میں ایک غزل کے تین اشعار ملاحظہ ہوں سہ

ہجرِ آتش سوز سے سینے میں دلِ بیتاب ہے   اشک کا ہر ایک قطرہ پارۂ سیماب ہے
روئے آتشناک کا کس کے پڑا پانی میں عکس   شعلۂ جوالہ ہے جو حلقۂ گرداب ہے
مژدہ اے نومیدئ جاوید پھر حسرت رہی   ہاتھ میں اس ترک کے پھر خنجرِ بے آب ہے

لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کے کلام پر لکھنوی رنگِ سخن کا غلبہ ہے۔ داخلیت کا عنصر کم اور خارجیت زیادہ ہے۔ جس کے نتیجے میں بعض جگہ الفاظ کے رکھ رکھاؤ اور لفظی میناکاری کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ مثلاً

واں گاہ گاہ یاں گہ و بیگاہ ہے تڑپ   نسبت ہے مجھ سے برق کو کیا اضطراب میں
کرتی تھی شمع ساقِ صنم سے منفعل   جلتی ہے محفلوں میں یہ اس کا مآل ہے

بیڑنت پا کو ماہِ تاباں کی نہ لگ جائے نظر   چٹکیوں سے پائنچے لے آفتِ جاں چھوڑ دے

لکھنوی رنگ سخن کے دیگر مقلدین کی طرح تسلیم کے یہاں بھی ایسی چنگاریاں بہت کم ملتی ہیں جو پڑھنے والوں کے احساس میں گرمی پیدا کردیں اور وہ ان کے سینے میں اپنے دل کی دھڑکنیں سننے لگیں۔ تاہم انھوں نے تصوف کے سہارے کہیں کہیں اس کی تلافی کردی ہے۔ ان کے متصوفانہ اشعار میں ایسی مثالیں مل جاتی ہیں، جن میں دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ مثلاً

دیر و حرم میں بیٹھنے دیتا نہیں کوئی   اُٹھ کر تمھارے در سے کہیں کا نہیں رہا

مایوسیٔ جاوید کے صدمے نہیں اُٹھتے   ہیں کاش ترا محرمِ اسرار نہ ہوتا

اوراقِ گلوں کے ہیں پریشان چمن میں   غنچوں سے چھپایا نہ گیا رازِ تبسم

اب میں تسلیم کے متعلق لالہ سری رام مصنفِ "خمخانۂ جاوید" کی رائے کا اقتباس پیش کرتے ہوئے وہ تمام اشعار جنھیں کرم خوردہ مسودات سے پڑھ سکا ہوں نقل کئے دیتا ہوں۔ تاکہ کم از کم یہ باقی ماندہ سرمایۂ افکار ہی دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہ سکے۔ لالہ صاحب موصوف نے تسلیم کے متعلق اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

"آپ فنِ سخن میں مشاہیر سے تھے۔ تاریخ گوئی میں ایسا ملکہ رکھتے تھے کہ ان کی مثال بہت کم نظر آتی ہے۔ چناں چہ انواع و اقسام کی صنائع بدائع سے آپ کی تاریخیں مملو ہوتی تھیں .... !
..... شعر اچھا کہتے تھے۔ عاشقانہ اور تشبیہہ دونوں طرزیں ملی جلی ہیں سادگی اور صفائی بھی موجود ہے۔ اُن کے پختہ مشق اور مشاق سخنور ہونے میں کس کو کلام ہوسکتا ہے .... !!"

(خمخانۂ جاوید جلد دوم صفحہ ۱۱۰)

اشعار منقول از مسودات

بے کدورت اپنے دیوانے سے رہنا چاہئے   اے پری رو دل ہے آئینہ مصفا چاہئے

یہ نہیں کہتا کہ مجھ کو جام و صہبا چاہئے   چشمِ میگوں کا تری ساقی اشارا چاہئے

حسن کے شہرے کا اس کو دلنشیں کب ہے خیال   چاہنے والا کوئی رسوا سے رسوا چاہئے

دین و دنیا صبر و طاقت عقل و دل ہوش و حواس   آپ یہ سب لے چکے کہئے تو اب کیا چاہئے

لا کر بٹھایا رُخِ رنگیں سے تیرے سامنا   ایسے باغی بے ادب کا پوست کھینچا چاہئے

کس قدر نکلے گی یا رب حوضِ کوثر میں شراب   مجھ سے عالی ظرف کو دریائے صہبا چاہئے

ٹوٹ جاتا ہے کبھی اور کبھی بھر آتا ہے   دل پہ درد سے ہے بیٹھے ہیں کہ چھالا کوئی

صاف کھل جائیں گے اس پردہ نشیں کے اسرار   دل سے گرتا بہ لب آجائیگا نالا کوئی

یہ تری راہ میں آزار سے راحت پائی   خار ہم نے نہ کفِ پا سے نکالا کوئی

ساقیا خیر تری میکدہ آباد رہے   اور بھی دے مے گلگوں کا پیالا کوئی

کیا کیا ستم کریں گی تری بے حجابیاں   برقِ فنا ہے چشم کی گردش نقاب میں

عالم ہے تار تار میں موجِ بہار کا   جب سے ہے جلوہ گر رُخِ رنگیں نقاب میں

تسلیم مژدہ مشرقِ مینا سے آفتاب   ساقی نکالتا ہے شبِ ماہتاب میں

خوں بہا، لاش جلی، خاک اڑی بے تقصیر   دل میں ظالم کے رہی پھر بھی کدورت باقی

محتسب محفلِ رنداں میں نہ جا ماں کہا   دخترِ رز کی بھی وہاں تو نہیں حرمت باقی

لینے آیا ہے گنہگار اٹھو ساتھ چلو   ہو گئی ختم جو تھی آپ کو حجت باقی

عذرِ تقصیر کیا اُن سے یہاں تک تسلیم   کہ زباں میں نہ رہی نام کو طاقت باقی

تنگ دستی سے نہ کچھ بے سر و سامانی ہے   صورتِ شعلہ ازل سے مجھے عریانی ہے

بھیج دو خدمتِ یارانِ وطن میں یہ غزل   آج تسلیم وہاں ختم سخندانی ہے

بات کہتے گو کہ اُس محفل میں کٹتی تھی زباں   میرے سوزِ دل کا کہتی ہی رہی افسانہ شمع

بزم میں آتے ہی اس خورشید کے اڑ گئی   شب یہ طرزِ عاریت لے کر پرِ پروانہ شمع

کیا چھڑکتا تھا نمک زخمِ دلِ پروانہ پر   اللہ اللہ رات تیرا خندۂ مستانہ شمع

نسترن میں نہ یاسمن میں ہے   جو لطافت ترے بدن میں ہے

حال یہ اُن کی انجمن میں ہے   ہر سخن معرضِ سخن میں ہے

کی صبا نے مگر زلیخائی   چاک ہر گل کے پیرہن میں ہے

کہنے کو یوں تو رات کہیں دن کہیں رہا   جز آستانِ یار کہیں دل نہیں رہا

تسلیم ہم جہاں میں سلیمانِ عہد تھے   تا مرگ نامِ یار ہی نقشِ جبیں رہا

اظہارِ وفا سے فائدہ کیا   میں آپ کو خوب جانتا ہوں

منظور ہے امتحانِ الفت   وہ مجھ سے میں اُن سے کھنچ رہا ہوں

زاہد جو ترا نکتۂ توحید سمجھتا   سجدے سے بتوں کے اسے انکار نہ ہوتا

تسلیم نہ ہوتا جو وہ ساقیٔ کوثر   مستوں کا ٹھکانہ کہیں زنہار نہ ہوتا

دوستی دشمنوں کی کھل جاتی   آپ اگر میرا امتحاں کرتے

اٹھ چلا رو ٹھ کر جو وہ ظالم   رہ گئے ہم کہاں کہاں کرتے

سانس لیتے ہوئے غش آتا ہے   آہ کیا تیرے ناتواں کرتے

وہ نہ آتے جو شبِ ہجر جیا ہوتا میں   رکھ لیا موت نے تاثیرِ فغاں کا پردہ

لاکھ چاہو پہ کہیں چھپتا ہے لادینِ رازِ عشق   بو رہے غنچے کی غنچے ہی میں یہ امکان نہیں

اس قدر ہم ہوگئے محوِ خیالِ رُوئے دوست   چشم کا ہر ایک پردہ آئینہ خانہ بنا
صبح سے تا شام پڑا پا کوئی زنداں میں میر   کیا کہوں میں دردناکی نالۂ زنجیر کی

انتخابِ غزلیاتِ مطبوعہ

ذیل میں تسلیم کی تین چار غزلیات کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ غزلیں مختلف رسائل اور تذکروں میں شائع ہو چکی ہیں ؎

نکتہ داں ہوں کیوں کہوں اس کا دہاں ملتا نہیں   نقطۂ نونِ دہن سے کیا نشاں ملتا نہیں
آفتابِ اوجِ شہرت بن نہیں سکتا ہے حُسن   جب تک اس کو کوئی رسوائے جہاں ملتا نہیں
گھل گیا اپنا بدن غم میں ترے اے شعلہ رو   مثلِ شمعِ سوختہ ایک استخواں ملتا نہیں
بر آ یا دی سوال اور ان کا تشا کی ہے جواب   بے دہن دلبر سا مجھ سا بے زباں ملتا نہیں
رنگ جمنے کا نہیں تسلیم اس گلزار میں   ہم صفیروں سے مرا طرزِ بیاں ملتا نہیں

(مخمخانۂ جاوید)

دیکھا جو سحرِ یار کا اندازِ تبسّم   گر پڑ کے ہوئی برق بھی دمسازِ تبسّم
اعجاز نے عیسیٰ کے کیا مردوں کو زندہ   عیسیٰ کو جلاتا ہے وہ اعجازِ تبسّم
کیوں ہچکیاں لے لے کے نگی رونے صراحی   کیا جام بھی ہے یار کا ہم رازِ تبسّم
تھا گریۂ انجام کو ایک شمعِ دل افروز   اس انجمنِ ناز میں آغازِ تبسّم
رنگ اپنا جمانا ہے جو تسلیم گلوں کو   زخموں سے مرے سیکھ لیں اندازِ تبسّم

(خیابان لکھنؤ)

دردِ فراق نے یہ کیا ناتواں مجھے   پھرتا ہے ڈھونڈھتا مرا وہم و گماں مجھے
شکرِ خدا کہ ہجر میں صورت بدل گئی   آئے ہیں وہ سنانے مری داستاں مجھے
کرتے ہیں یاد وہ کہ اجل نے کیا ہے یاد   آتی ہیں آج ہچکیوں پر ہچکیاں مجھے
داغِ فراقِ یار کے سر پر مرے قدم   مدّت کے بعد ایک ملا میہماں مجھے
میرے وضو کو لاؤ شرابِ دو آتشہ   کرنی ہے آج بیعتِ پیرِ مغاں مجھے

(میرِ شباب[1])

مانندِ ابر اشک سے دامن بھگوئیں کیوں   اک بوند آبرو ہے اسے ہم ڈبوئیں کیوں
ہوتی ہے گر خلش اثرِ آہ سے انھیں   دل میں کسی کے نشترِ مژگاں چبھوئیں کیوں
گھل گھل کے مثلِ شمع تپِ غم میں مجھ نہ جائیں   شبنم کی طرح راتوں کو چھپ چھپ کے روئیں کیوں
سمجھے ہوئے ہیں خوب چھوٹے گا حشر تک   دامن سے اپنے خون ہمارا وہ دھوئیں کیوں
تسلیم ہو رہے گا جو ہونا ہے حشر میں   ہم آج آنکھیں خوف سے رو رو کے کھوئیں کیوں

(خیابانِ لکھنؤ)

میں سمجھتا ہوں کہ یہ مختصر کلام حضرتِ تسلیم کے فن اور اُن کی شخصیت کو پوری طرح واضح نہ کر سکے گا۔ کاش آپ کا پورا کلام موجود ہوتا تاکہ آپ کی شاعری کے تدریجی ارتقاء اور محاسن و کمالات کا بھرپور تجزیہ کیا جا سکتا۔

افسوس کہ علم و ادب کی یہ شمع ۸۰ سال تک گل افشانیاں کرنے کے بعد ۱۲ شوال ۱۳۰۹ھ مطابق ۹ مئی ۱۸۹۲ء کو ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔ تسلیم کی موت کوئی معمولی سانحہ نہ تھا۔ ملک کے گوشے گوشے میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ اکثر مشاہیر شعراء اور آپ کے احباب و تلامذہ نے تاریخیں کہیں جن کا مجموعہ "مددگارِ غم" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ذیل میں امیر مینائی، جلال لکھنوی اور امیر اللہ تسلیم کے کہے ہوئے قطعات علی الترتیب درج کئے جاتے ہیں ؎

چوں رفت ازیں جہانِ فانی تسلیم   تسلیم کناں بعد گر شاہِ حنین
بنوشت امیر مصرعِ سالِ وفات   رحلت کردہ جنابِ انوار حسین
۱۳۰۹ھ

منشیِ بے عدیل و بے ہمتا   سخن آرائے بے بدل تسلیم
شاعری را فروغ بود از وے   سخنش طور بود او چو کلیم
مہِ شوال بود و دہ از دہم   کہ بہ گلزارِ خلد گشت مقیم
سالِ مرگش رقم نمود جلال   شدہ افسوس جان بحق تسلیم
۱۳۰۹ھ

افسوس کہ ہم تخلص من   انوار حسین پاک بنیاد
مشہور زمانہ بود ہر سو   در شعر و سخن یگانہ استاد
بہ دہ از دہم زماہِ شوال   از قیدِ حیات گشت آزاد
گردید ازیں جہاں مسافر   در عالمِ قدس رخت بنہاد
از مرگِ آں بلند پایہ   شد خانۂ نظم و نثر برباد
تسلیم بہ سالِ مرگِ تسلیم   خون شد دل و جاں زدیدہ افتاد
گفتم دمِ آہ و درد و فریاد
در گلشنِ خلد جائے او باد
۱۳۰۹ھ

[1] میاں داد خان سیّاح کی تشریف آوری پر کانپور میں ایک طرحی مشاعرہ ہوا تھا، اس مشاعرے کی غزلیات کو یکجا کر کے میرِ سیاح کے نام سے شائع کر دیا گیا تھا۔ یہ مجموعہ تسلیم ہی کا مرتبہ ہے اور نول کشور پریس سے شائع ہوا ہے۔

زاہد حسین کانپوری

تاج محل

دنیا کی تاریخی عمارتوں میں تاج محل بڑی اہمیت رکھتا ہے اور یہ اہمیت اس کی فنی خصوصیتوں کی بنا پر تسلیم کی گئی ہے گویا فنِ تعمیر کی تاریخ میں تاج محل ایک نئے باب کا اضافہ ہے اس کی وسعت اور بلندی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کا طول ایک ہزار آٹھ سو فٹ اور عرض ایک ہزار فٹ ہے۔ اس کی تعریف میں شعراء اور نثر نگاروں نے اس وقت جو کچھ لکھا ہے اس کو جمع کیا جائے تو کئی ہزار صفحات کی بہت سی کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔

سر ولیم منظر تاج کو خواب مرمریں کہتا ہے اُس نے لکھا ہے کہ تاج ہند و مسلم فنِ تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے جس میں تعمیر کا مقام اتنا بلند ہو گیا ہے کہ فنِ تعمیر نے موتیوں کی شکل اختیار کر لی ہے۔

باشرڈ ٹیلر تاج کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ عمارت خوبصورتی کا آخری اور مکمل نمونہ ہے۔ اس کی بناوٹ میں انسان کا ہاتھ نہیں ہے بلکہ یہ تو قدرت کا کرشمہ ہے

ایک روسی مصور نے تاج دیکھنے کے بعد جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ تاج ایک حسین دوشیزہ کی طرح ہے۔ جس کی غیر موجودگی میں بُرے لوگ اُس کو نا ملائم الفاظ سے یاد کرتے ہیں لیکن جب وہ حسن و ادا کے ساتھ سامنے آجاتی ہے تو وہی لوگ اُس کو دیکھ کر وجد کرنے لگتے ہیں

مشہور مصنف سیمسن نے ایک بار اپنی بیوی سے دریافت کیا تھا۔ کہ تمہیں کبھی تاج محل دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے یا نہیں اور اُس کے بارے میں تمہارے کیا خیالات ہیں تو اُس کی بیوی نے جواب دیا تھا کہ میری زبان تاج کے بارے میں اظہارِ خیال سے قاصر ہے اور نہ مجھ میں اتنی جرأت ہے کہ میں اس عمارت پر تنقید کر سکوں ہاں میرے مرنے کے بعد اگر ایسا ہی تاج محل بنوا دیا جائے تو میں اسی وقت مرنے کو تیار ہوں۔

کہا جاتا ہے جس طرح سنگ تراشی میں وینس ڈی میڈیسی اور شاعری میں شیکسپئر اپنا جواب نہیں رکھتا تھا اسی طرح تاج محل کی بھی فنِ تعمیر میں کوئی مثال نہیں ہے۔

" آرچی ٹیکچر آف آگرہ " کتاب کے مشہور مصنف جناب محمد لطیف صاحب چاندنی رات میں تاج کے حسن و جمال کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: "جب پورنماشی کا چاند اپنی روشنی میں تاج کو ڈھانپ لیتا ہے تب تاج کا بے داغ گنبد ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے چاندی کی تشتری میں موتی سنگِ مرمر پر قیمتی پتھروں کے چمکتے دمکتے بیل بوٹے ایسے لگتے ہیں کہ جگنو چمک رہے ہیں اور دور سے تاج کا یہ دلکش منظر ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ تاج کی دیواروں کے کنارے کنارے کوئی خاموش چشمہ دھیرے دھیرے بہہ رہا ہے"

جناب سروکی وزیرِ اعظم چیکوسلاواکیہ تاج محل کو دیکھ کر اپنے خیال کا اظہار اس طرح کرتے ہیں: "تاج محل ہندوستان کی عظیم تاریخ اور فن کی حیرت انگیز مثال ہے اس سے ہندوستان کے آرٹ اور عوام کی مہارت کا پتہ چلتا ہے۔ دنیا میں یہی ایک ایسی عمارت ہے کہ جسے دیکھ کر انسان فی الواقع حیران رہ جاتا ہے"

جمنا کے دوسرے کنارے میں جہاں شاہجہاں دوسرا تاج بنوانا چاہتا تھا وہاں سے اگر تاج کو دیکھا جائے تو تاج کی خوبصورتی دوچند ہو جاتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہنس دریائے جمن سے تیر کر نکلا ہے اور اپنے پیر پروں کو پھیلائے ہوئے جمنا میں جھانک رہا ہے جمنا کی مست لہروں میں تاج کا عکس عجیب نظارہ پیش کرتا ہے اور ایسا نظر آتا ہے کہ ہر موج کے ساتھ ایک نیا تاج تیر رہا ہے

مشہور ہے کہ ایک سیاح جو ہزاروں میل کا سفر طے کر کے تاج دیکھنے آیا تھا۔ اس کو دیکھ کر اپنے برابر کھڑے ہوئے ایک شخص سے کہنے لگا کہ اس کا بنوانے والا بیوقوف آدمی تھا جس نے کروڑوں روپیہ برباد کر ڈالا تو اس کا جواب اُس شخص نے سیاح کو یہ دیا تھا کہ بنوانے والا جو کچھ بھی تھا اُس کے متعلق تو میں کوئی رائے نہیں دے سکتا مگر اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ سب سے بڑا بے وقوف وہ ہے جو ہزاروں روپیہ صرف کر کے اور ہزاروں میل کا سفر طے کر کے اُس کو دیکھنے آیا ہے۔

تاج محل کی تعمیر ۱۶۳۲ء میں شروع ہوئی تھی۔ بیس ہزار مزدور روزانہ کام کیا کرتے تھے۔ اور ۳ کروڑ روپیہ اس کی تعمیر پہ صرف ہوا تھا۔ بادشاہ نامہ کی شہادت کے مطابق تاج کے کام کی نگرانی کرامت خاں کے سپرد کی گئی تھی۔ اُن کے مددگاروں میں عبدالکریم نامی بھی تھے۔ تاج ۲۲ سال میں بن کر تیار ہوا تھا اُس کے خرچ کے لئے ۳۰ گاؤں کی آمدنی کے علاوہ قرب و جوار کی دکانوں اور سراؤں کا کرایہ بھی مقرر کر دیا گیا تھا۔ تاج کی تعمیر کا کام دراصل ماہرینِ فن کی نگرانی میں ہوا تھا۔ اور یہ لوگ خاص طور سے مختلف مقامات سے بلائے گئے تھے۔ استاد عیسیٰ لاہوری نقشہ نویسی کا کام انجام دیتے تھے ان کی ماہانہ تنخواہ ایک ہزار روپیہ تھی۔ امانت اللہ خاں کلام پاک کی آیتیں کندہ کیا کرتے تھے۔ اُن کو بھی ایک ہزار روپیہ ماہوار دیا جاتا تھا۔ سنگ تراشی کے ماہر محمد حنیف بغدادی تھے یہ بھی ایک ہزار روپیہ ماہانہ پاتے تھے۔ فتح بیگ ترکی پچکاری کا کام کرتے تھے ان کا مشاہرہ ۸۰۰ روپے ماہانہ تھا۔ اسمٰعیل خاں گنبد بنانے پر مامور تھے۔ ان کو دو سو روپیہ ماہوار ملتے تھے۔ منّو لال پیمائش کے ماہرین میں سے تھے ان کو بھی دو سو روپیہ ماہوار دیئے جاتے تھے اور مہندر پال۔ دین محمد محمد یوسف اکبرآبادی، قائم خان خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان کے علاوہ ایرانی بغدادی، ترکی، یونانی اور بہت سے ممالک کے کاریگر بھی شامل تھے۔

تاج کے لئے مختلف قسم کے پتھر مختلف مقامات سے منگائے گئے تھے۔ سنگ مرمر جے پور سے، پیلا پتھّر دریا نربدا کے ساحل سے جس کی قیمت ۴۰ روپیہ فی مربع فٹ تھی سنگ موسیٰ چرخو سے قیمت ۹۰ روپیہ مربع فٹ، بلوری پتھّر چین سے، قیمت ۵۷۰ روپیہ مربع فٹ۔ سنگ یشب پنجاب سے، عقیق بغداد سے، نیلم تبت سے، سنگ سلیمان یمن سے حاصل کیا گیا تھا۔ چمک دار نیلا پتھّر سیلون سے ۱۵۶ روپیہ مربع فٹ کے حساب سے منگایا گیا تھا۔ مونگا عرب سے، جواہرات بندیل کھنڈ سے اور لال پتھّر فتح پور سیکری سے منگایا گیا تھا۔ جس کو آگرہ لے جانے کے لئے ۱۴۰۰۰ چودہ ہزار بیل گاڑیاں استعمال کی گئی تھیں۔ تاج میں بہت سے ایسے بھی پتھّروں کا استعمال کیا گیا ہے۔ جن کا نام آج تک معلوم نہ ہو سکا۔ بہت سے پتھّر بطور تحفہ راجاؤں اور صوبہ داروں نے پیش کئے تھے۔ سپید پتھّر مکرانہ سے منگائے گئے تھے۔ اکبر کے قلعہ سے تاج تک بہت سے محلات اور باغات بنے ہوئے تھے۔ تاج محل جہاں پر بنا ہوا ہے۔ وہ جگہ راجہ مان سنگھ کی جاگیر میں شامل تھی لیکن شاہجہاں نے اُن کے پوتے راجہ جے سنگھ سے اُس کی قیمت ادا کر کے حاصل کر لی تھی۔

تاج محل کا پہلا دروازہ بہت ہی خوبصورت ہے۔ تاج کی نصف خوبصورتی کا دارومدار اسی دروازہ پر ہے اگر یہ نہ ہوتا تو تاج ایک بیوہ حسینہ کی طرح نظر آتا۔ اس دروازہ میں چھوٹے چھوٹے در بنے ہوئے ہیں جس میں سے ایک ہفتہ میں تین بار غریبوں کو کھانا، کپڑا، خیرات کیا جاتا تھا۔ تاج کی سنگ مرمر کی عمارت اور اس دروازہ کے درمیانی فاصلے کے بالکل وسط میں سپید پتھّر کا ایک چبوترا بنا ہوا ہے۔ اس چبوترے کے بیچ میں ایک حوض ہے۔ جس کے چاروں طرف سنگ مرمر کی بنچیں بنی ہوئی ہیں۔ اس چبوترے سے تاج کے باغ اور اس کے نچلے حصّے بہ خوبی دکھائی دیتے ہیں۔ اس حوض کے چاروں طرف لال پتھر کی نہریں بنی ہوئی ہیں جو تاج کی فصیلوں تک چلی گئی ہیں۔ ان نہروں کے اندر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر فوارے لگے ہوئے ہیں جن سے نہروں میں پانی بھرتا رہتا ہے۔ نہروں کے دونوں جانب سرو کے درخت ایک قطار میں لگائے گئے ہیں جو تاج کی ماضی کی یاد دلاتے ہیں نہروں کے ساتھ ساتھ لال پتھّر کے فٹ پاتھ بنے ہوئے ہیں اور ان فٹ پاتھوں سے لگے ہوئے میدانوں میں چاروں طرف ہری ہری گھاس کا فرش ہے اور ان میدانوں کے اندر خوبصورت پھول دار پودوں کی کیاریاں بنی ہوئی ہیں ان میدانوں کے کناروں پر کہیں کہیں بڑے بڑے اور پرانے درخت لگے ہوئے ہیں جہاں تاج کی دیواریں ملتی ہیں وہاں کچھ درخت شاہی زمانہ کے لگے ہوئے ہیں۔ یہ میدان باغ کی شکل میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ ان باغات کی کافی حفاظت کی جاتی ہیں۔ باغ کے آخر میں ایک بہت بڑا چبوترا بنا ہوا ہے جو لال پتھر کا ہے اس کی ایک دیوار کو دریائے جمنا چھوتی ہے۔ اس چبوترے کے بائیں جانب مسجد اور دائیں جانب مہمان خانہ بنا ہوا ہے۔ چبوترے کے بیچ میں ۱۸ فٹ اونچی ۳۱۳ مربع فٹ سنگ مرمر کی کرسی بنی ہوئی ہے اس چبوترے کی کرسی کے ہر کونے پر ایک ایک مینار بنا ہوا ہے۔ ہر مینار کی بلندی ۱۱۲ فٹ ہے۔ اس چبوترے پر ایک اور چبوترا بنا ہوا ہے جس کی پیمائش ۱۸۶ مربع فٹ ہے۔ اس چبوترے ہی پر تاج کی تمام رونق کا دارومدار ہے۔ اس کی دیواروں اور دروں میں اُبھرے ہوئے

بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ اس کے وسط میں ۸۰ فٹ اونچا پیازی شکل کا گنبد بنا ہوا ہے۔ جس کی بلندی زمین سے ۲۶۰ فٹ ہے۔ یہ گنبد دراصل اس ہال کی چھتری ہے کہ جہاں ممتاز محل اور شاہجہاں کی آرام گاہیں بنی ہوئی ہیں۔ اس ہال کے چاروں طرف درمیانہ چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے ہیں۔ مولوی صاحبان ان درروں میں بیٹھ کر کلام پاک کی تلاوت کیا کرتے تھے۔

ان درروں میں مولوی صاحبان کے بیٹھنے کے لئے نفیس قسم کے ایرانی قالینوں کا فرش رہتا تھا اور قریب چالیس ہزار تولہ سونے کا آرائشی سامان شمع دان، لوبان دان وغیرہ کے علاوہ سجاوٹ کی بہت سی چیزیں شامل تھیں۔ سینکڑوں قسم کے قیمتی پتھر جواہرات جو روشنی میں اضافہ کرتے تھے اس ہال کے چاروں طرف لگے ہوئے تھے بعد میں یہ سامان ہٹا دیا گیا اور اس کے بجائے نقشین مرمر کی جالی کا کام ان درمیانہ کمروں میں کرا دیا گیا جن میں سے روشنی چھن چھن کر مقبروں تک پہنچتی ہے۔ سنگ مرمر کی جالی جو ممتاز محل اور شاہجہاں کے مقبرہ کے گرد دائر ہے۔ دس سال میں بن کر تیار ہوئی تھی اور اس پر ۵ لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔ ان جالیوں کے اوپری کنارے پر نہایت نازک باریک پھول پتیاں بنی ہوئی ہیں۔ ان پھول پتیوں کے بنانے میں کہیں کہیں ساٹھ ساٹھ رنگین پتھروں کا استعمال کیا گیا ہے۔ بعض بعض جگہ تو اتنا باریک کام ہے۔ جس کا اندازہ بغیر خوردبین کے لگانا محال ہے۔ ممتاز محل کی قبر پر خوبصورت بیلیں بنی ہوئی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ تبارک و تعالیٰ کے ۹۹ نام بھی لکھے ہوئے ہیں۔ ان قبروں کے نیچے ایک تہ خانہ ہے جس میں اصل قبریں ہیں۔ تہ خانہ کی دیوار پر خاص قسم کا پلاسٹر ہے جو بہت ہی چمکیلا اور چکنا ہے اس کی خاصیت یہ کہ جاڑوں میں اس تہ خانہ میں قدرے گرمی رہتی ہے اور موسم گرما میں یہ جگہ ٹھنڈی رہتی ہے۔ شاہجہان نے ممتاز کی قبر پر چڑھانے کے لئے چادر بنوائی تھی جو صرف ہیرے جواہرات اور موتیوں ہی کی تھی اس چادر کو نشانہ میں علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ جس ہال میں نقلی قبریں بنی ہوئی ہیں اگر اس میں بلند آواز سے بولا جائے تو یہ آواز تقریباً ۵ سیکنڈ تک گونجتی رہتی ہے۔ اس بڑے کمرے میں روشن دان کا بھی انتظام کیا گیا ہے جو اپنی قسم کا ایک ہی ہے۔ ملکہ کی قبر اس ہال کے بالکل وسط میں بنی ہوئی ہے۔ شاہجہاں کی قبر اس قبر کے بائیں جانب ہے۔

زہے مرقد پاک بلقیس عہد — کہ بانوئے آفاق راگشت عہد
منور مقامی چو باغ بہشت — معطر چو فردوس عنبر سرشت
جواہر نگار است دیوار و در — ہوا تازہ و تر چو آب گہر
عمارت گرایں مقدس جناب — ز سرچشمۂ فیض آوردہ آب
بریں بقعۂ پاک والا مقام — ترشح کناں ابر رحمت مدام
اگر عاصی آرد بریں روضہ روی — کند نامۂ خویش راشست و شوی
ز رقت بہ نظارۂ ایں مزار — شود چشم خورشید و مہ اشکبار

نمود ایں عمارت بنا روزگار
کہ ظاہر شود قدرت کردگار

دیہاتوں میں بجلی

ریاستوں سے جو اعداد و شمار حاصل ہوتے ہیں ان کے مطابق دوسرے پلان کی مدت میں ۴۴۴۲۴ دیہاتوں میں بجلی لگائی جائے گی جس میں سے اب تک ۵۱۶۶ دیہاتوں میں بجلی پہنچائی جا چکی ہے۔

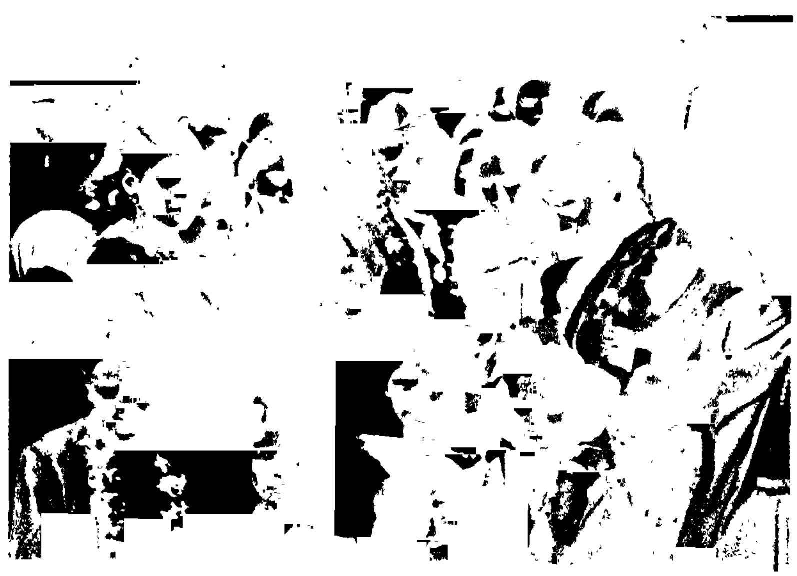
دیہاتوں میں بجلی مہیا کرنے کے پروگرام میں سب سے زیادہ ریاست مدراس کے دیہاتوں میں بجلی مہیا کی جائے گی۔ یعنی اس ریاست کے ۵ ہزار دیہات بجلی کی روشنی سے جگمگا اٹھیں گے۔ دوسری ریاستوں کے اعداد یہ ہیں:۔

پنجاب ۲۱۰۰ کیرالا ۴۴۱۳ آسام ۳۹ بہار ۱۲۸۵ بمبئی ۷۰۰ مدھیہ پردیش ۳۲۹ میسور ۷۰۰ اڑیسہ ۲۲۳
راجستھان ۱۱۳ یوپی ۲۳۵ جموں کشمیر ۷۹ مغربی بنگال ۲۶۵ اندھرا پردیش ۱۷۳۲ مرکزی حکومت کے ماتحت علاقے ۸۷۲

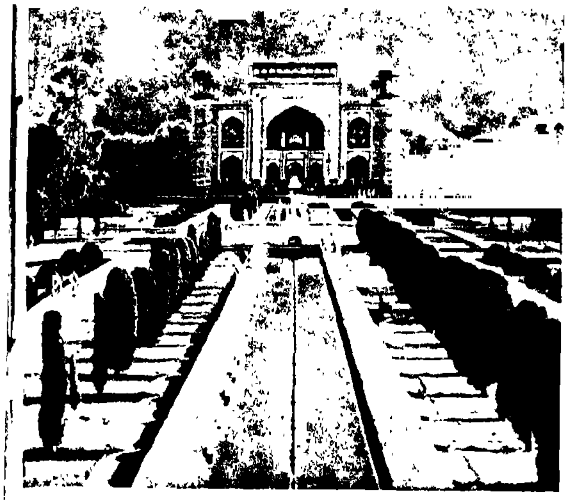
جولائی ۱۹۵۸ء تک ان ریاستوں کے دیہات میں بجلی دی گئی ہے:۔ آسام ۱۳ بمبئی ۳۷۵ مدراس ۲۹۳۹ میسور ۳۱۱ پنجاب ۹۱۷ بہار ۴۶۲ کیرالا ۷۹۹ مدھیہ پردیش ۶۷ اڑیسہ ۳۷ یوپی ۴۳ جموں کشمیر ۲۶ مغربی بنگال ۱۲۰ آندھرا پردیش ۲۷۰ مرکزی حکومت کے علاقے ۲۶



ہر سال ۱۴۔ نومبر کو وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو
کی سال گرہ کے موقع پر 'بچوں کا دن' منایا جاتا ہے
اس تقریب پر دلی کے نیشنل اسٹیڈیم میں پنڈت نہرو
ایک سفید کبوتر چھوڑ رہے ہیں جو صلح و آشتی کا
نشان ہے۔



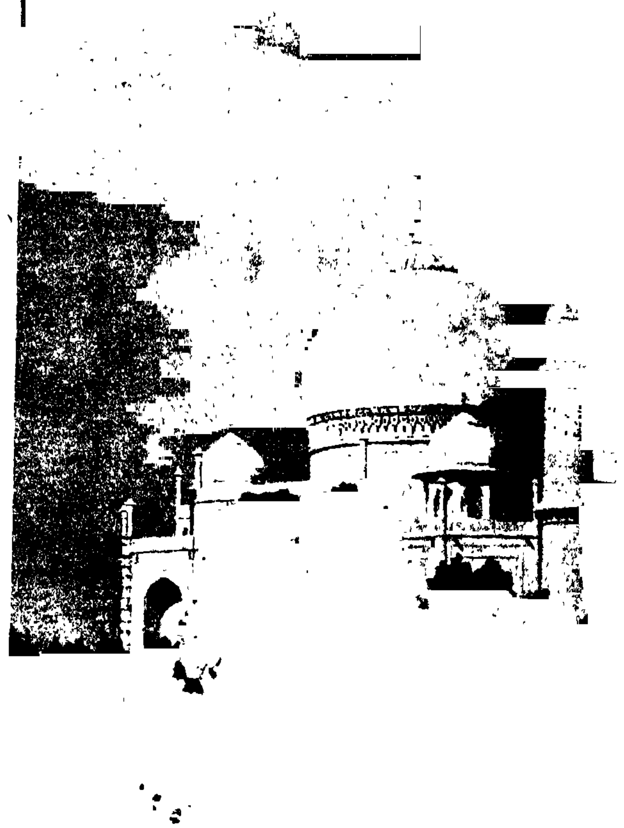
پنڈت نہرو اپنی سال گرہ کے دن بچوں کے ساتھ



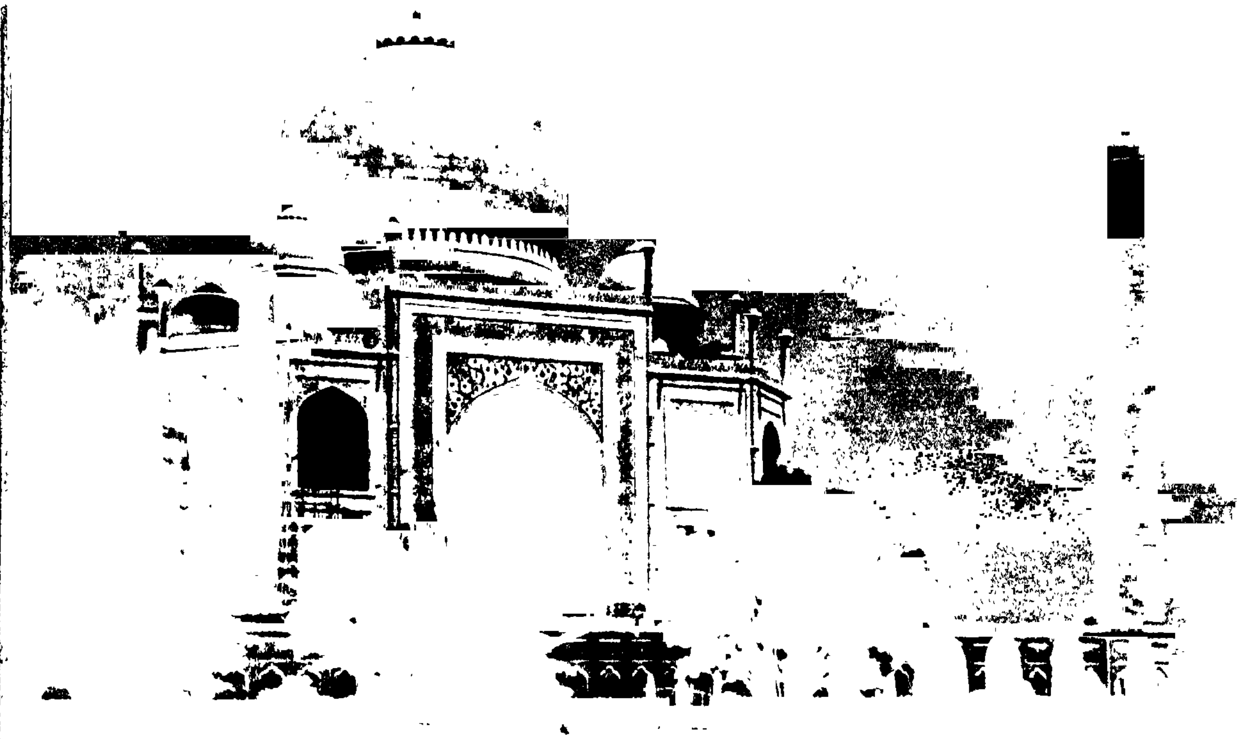
تاج کی طرف سے دروازے کا منظر

تاج کی اُبھری ہوئی کاریگری





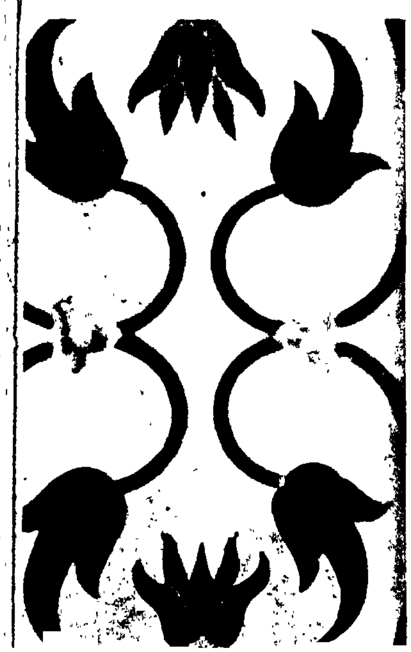
تاج پتیوں کے گھونگھٹ میں



چاندنی رات میں تاج

تاج محل

تاج کی خوش نما بیل



تاج کی سنگ تراشی



ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی

ہیں اِس سال یوم آزادی کے موقع پر صدر جمہوریہ نے عربی کے
ور فاضل و محقق کی حیثیت سے خاص اعزازی سند عطا فرمائی۔





ڈاکٹر بھگوان داس

ممتاز فلسفی و عالم
جن کا ۱۸ ستمبر کو انتقال ہوگیا

محمد عبد الحی

ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی

ڈاکٹر صاحب ضلع پٹنہ (صوبہ بہار) کے ایک اہل علم اور زمیندار خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ اُن کے والد مرحوم حافظ محمد اسحاق صاحب علوم اسلامیہ کے فاضل اور جیّد طبیب تھے۔ وہ اپنے زمانہ کے بہترین اطبائے شہر پٹنہ میں شمار کئے جاتے تھے انھوں نے آخر عمر میں تارک الدنیا ہو کر صوفیانہ زندگی اختیار کر لی تھی۔ اور شہر پٹنہ میں اُن کا مزار اب بھی مرجع عوام ہے۔

ڈاکٹر صدیقی صاحب کی والدہ بھی ایک دین دار، تہجد گذار عابدہ اور زاہدہ خاتون تھیں۔ یہ دونوں موجودہ تعلیم کو مخرب اخلاق اور انگریزی تعلیم کو خلافِ مذہب سمجھتے تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنے ہونہار لڑکوں کو ابتدا سے قدیم طریقے کی عربی و فارسی کی تعلیم دلوائی۔ اور جب ڈاکٹر صاحب دس سال کے تھے تو ان کو ریاست رام پور کے مدرسہ عالیہ میں داخل کر دیا۔ یہاں انھوں نے مولانا سیّد عبد العزیز منطقی سہارنپوری مرحوم اور مولانا فضل حق رام پوری مرحوم جیسے جیّد فضلائے وقت سے علوم عربیہ کی پوری تعلیم حاصل کی اور قدیم درسِ نظامی کے نصاب کی تکمیل کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب لاہور جا کر وہاں کے اورینٹل کالج میں داخل ہو گئے۔ یہاں ایک سال تک جناب مفتی عبد اللہ ٹونکی مرحوم کے حلقۂ درس میں داخل ہو کر ادبیاتِ عرب کی تحصیل کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا ڈپلومہ اعلیٰ درجہ میں حاصل کیا۔

لاہور سے واپسی کے بعد ۱۹۱۳ء کی ابتدا میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے والد کی اجازت سے خانگی طریقہ سے انگریزی پڑھنا شروع کیا اور ۱۹۱۴ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے خانگی طور پر میٹریکولیشن کے امتحان میں اعلیٰ درجہ میں کامیابی حاصل کر کے بہار نیشنل کالج پٹنہ میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۱۸ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی اور اپنے کالج میں فرسٹ ہونے کی وجہ سے طلائی تمغہ حاصل کیا۔ اس کے بعد ۱۹۲۱ء میں ایم۔اے اور بی۔ایل کی ڈگری پٹنہ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اسی سن میں تحریکِ آزادی میں شریک ہو کر جناب مولانا مظہر الحق بیرسٹر ایٹ لا مرحوم کی صدارت میں بہار صوبائی کانگریس کمیٹی کے نائب معتمد ہو گئے اور کانگریس کا کام کرتے رہے۔

۱۹۲۳ء میں حکومت بہار کی طرف سے اُن کو کیمبرج جا کر مشہور انگریز مستشرق براؤن آنجہانی کے زیر نگرانی علوم عربیہ میں ریسرچ کرنے کے لئے وظیفہ عطا کیا گیا۔ ایڈنبرا میں موصوف نے تاریخ طب عرب پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا اور عربی زبان میں طب کی ایک نہایت اہم لیکن غیر معروف کتاب فردوس الحکمت مصنفہ علی ابن ربن طبری مؤلفہ ۸۵۰ء کی تصحیح اور تحشیہ کیا اور اسی غرض سے فرانس اور جرمن زبانوں کی بڑی حد تک تحصیل کی۔ کیمبرج یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

ڈگری مل جانے سے چند ماہ قبل ہی پروفیسر براؤن آنجہانی کی سفارش پر موصوف کو لکھنؤ یونیورسٹی نے اپنے شعبہ عربی کا ریڈر اور افسر مقرر کیا تھا۔ موصوف اُس عہدہ پر ۱۹۲۶ء کی ابتدا سے ۱۹۲۹ء کے وسط تک لکھنؤ یونیورسٹی میں کام کرتے رہے۔ ۱۹۲۹ء میں کلکتہ یونیورسٹی نے اُن کو سر آشوتوش پروفیسر اسلامک کلچر کے عہدہ پر مقرر کیا اور اب تک اسی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

اپنی ذاتی قابلیت اور اخلاق کے باعث ڈاکٹر صاحب جہاں کہیں رہے اور جن لوگوں کے ساتھ بھی رہے ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے چنانچہ حکومت یو۔پی کے قائم کردہ طبی بورڈ کے رکن نامزد کئے گئے اگرچہ اس کی رکنیت سے انھوں نے انکار کیا لیکن ذاتی طور پر اس کے ہر کام میں ممد و معاون

رہے۔ کلکتہ یونی ورسٹی میں ۱۰ سال تک مسلسل اُس کی سنڈیکیٹ کے رُکن منتخب ہوتے رہے۔

کلکتہ آکر وہ ایشیاٹک سوسائٹی کے رُکن ہو گئے۔ اور کچھ دنوں بعد اس کے نائب صدر مقرر ہو گئے اور کچھ سال تک اس عہدے پر رہے اور پھر اُس کے فیلو بھی منتخب ہو گئے۔ بمبئی کی اسلامک سوسائٹی نے اُن کو اپنا اعزازی رُکن بنایا۔ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے دوبارہ اُن کو اپنے کورٹ کا رکن منتخب کیا۔ وشوا بھارتی نے اپنی اکیڈمک کونسل کا ان کو کئی سال تک ایک رکن نامزد کیا۔

آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس نے ان کو اپنے اجلاس منعقدہ ناگ پور، حیدرآباد و دربھنگہ کے شعبہائے عربی و فارسی، اسلامی کلچر اور اردو کا صدر منتخب کیا۔ جامعہ ملیہ دہلی نے خواتین اسلام کی علمی جدوجہد پر لکچر دینے کے لئے موصوف کو مدعو کیا۔ دائرہ معارف اسلامیہ نے اپنے اجلاس خصوصی منعقدہ ۱۹۳۹ء میں علم حدیث کی خصوصیات پر مقالہ پڑھنے کے لئے دعوت دی۔

۱۹۵۱ء میں حکومت ہند نے ڈاکٹر صاحب موصوف کو انٹرنیشنل اورنٹیل کانگریس منعقدہ قسطنطنیہ میں اپنا نمائندہ منتخب کر کے بھیجا اور ۱۹۵۵ء - ۱۹۵۶ء میں بین الاقوامی اسلامی مجلس مذاکرہ منعقدہ لاہور نے اپنے اجلاس میں ڈاکٹر صدیقی صاحب کو بحث و تمحیص میں حصہ لینے کے لئے خاص طور پر مدعو کیا۔

اس سال یوم آزادی کے موقع پر صدر جمہوریہ نے ان کو عربی کے نامور فاضل اور محقق کی حیثیت سے خاص اعزازی سند عطا کی۔

ڈاکٹر صاحب کی تالیفات اور مقالات کی فہرست بڑی طولانی ہے ان میں سے چند کے نام درج ذیل ہیں۔

فردوس الحکمت مع مقدمہ وغیرہ (مطبوعہ برلن ۱۹۲۸ء)

السیرالحثیث فی تاریخ تدوین الحدیث (مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۳۹ء)

تاریخ نامہ ہرات مع مقدمہ وغیرہ (مطبوعہ کلکتہ امپریل لائبریری ۱۹۴۳ء)

اسٹڈیز ان عربک اینڈ پرشین میڈیکل لٹریچر (مطبوعہ کلکتہ ۱۹۵۶ء)

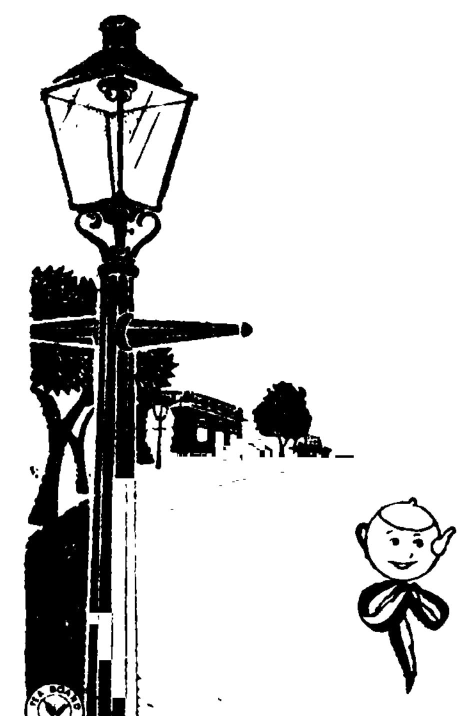
Evolution of Hadith Literature and its special features. غیر مطبوعہ

اسواق العرب روئداد آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس منعقدہ لاہور

روئداد آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس منعقدہ میسور

عہد نبوت میں کتابت احادیث۔

روئداد ادارہ معارف اسلامیہ لاہور ۱۹۳۳ء



نعیم پرواز

دستک

خیالِ نیک نظر کامیاب لائی ہو — خلوصِ مہر و وفا کی کتاب لائی ہو

رُخِ صبیح میں لے کر جمالِ رنگِ شفق — شبِ الم کے لئے آفتاب لائی ہو

چھلکتی آنکھوں میں لے کر لطافتِ رنگیں — نشاطِ لذّتِ جامِ شراب لائی ہو

چُرا چُرا کے لبِ گل سے کیفِ مدہوشی — تبسّموں کے مہکتے گلاب لائی ہو

بچا کے دسترسِ شامِ غم سے میرے لئے — ادائے زلف میں اک ماہتاب لائی ہو

دھنک کی جوت لئے سرمئی گھٹاؤں میں — سوادِ شامِ الم کا جواب لائی ہو

بڑے خلوص، بڑے پیار اور محبّت سے — بطورِ نذر مہکتا شباب لائی ہو

قدم قدم پہ جھلکتی ہوئی سی بے تابی — نظر نظر میں مچلتے حجاب لائی ہو

بڑے ہی ناز سے دوشیزگی کے آنچل میں — سرودِ چنگ و گدازِ رباب لائی ہو

مزاجِ بحرِ تلاطم، سکوتِ شامِ الم — وقارِ عظمتِ ہستی کا باب لائی ہو

غرورِ حسن و نظر، احتیاطِ ہوش و خرد — فضائے زیست میں اک انقلاب لائی ہو

ہزار شکر تمنّائے جام ختم ہوئی — سرورِ لذّتِ صہبائے ناب لائی ہو

حسین پلکوں پہ روشن کئے چراغِ سکوں — دلِ حزیں کے لئے اضطراب لائی ہو

غزل کا سوز، رباعی کا ساز، نظم کا حسن — ہزار نغمۂ شعر و شباب لائی ہو

جمالِ برق، خرامِ نسیم، صبحِ چمن
بڑی ادا سے نیا انقلاب لائی ہو

[illegible] انصاری

یادوں کے چراغ

[illegible] تھی جذبات اور [illegible]

[illegible] لیے کیونکہ [illegible] میری جوانی خارجی سطح

[illegible] داخلی طور پر میں کوشش [illegible]

[illegible] کیفیت [illegible] ایک [illegible]

[illegible] دونوں کا

[illegible] سرخوشی کبھی [illegible] کی دبے دل

[illegible] پیشش [illegible] غلو

[illegible] کی حیثیت [illegible] ایک

[illegible] عطا کر دیا [illegible] باقی [illegible] اعتدال کا

[illegible] جانتے ہیں [illegible]

[illegible] آنسو [illegible]

[illegible] کیفیت سے [illegible]

[illegible] مدتوں [illegible] رہا اور نہ خود کو بلکہ دوسروں کو بھی اس کا

یقین دلاتا رہا کہ میرے دل پر ضرور غم کا ایک داغ یا نشان ہوگا۔ میرا عقیدہ تھا

کہ اگر کوئی ڈاکٹر میرا سینہ کھول کر دیکھے تو وہ میرے دل پر غم کا جسمانی اور عضوی

اثر [illegible] داغ سے ملتی جلتی کسی نہ کسی شکل میں ضرور پائے گا۔ [illegible]

[illegible] وہ شخص [illegible] کو غم سے سابقہ رہا اور یہ سچ ہے

[illegible] نے اس کے دل کی ساخت [illegible] پر ڈالا۔

[illegible] خفیف سے خفیف اور معمولی سے معمولی بات کو بے انتہا

شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ اتنی شدت کے ساتھ کہ زندگی کے عظیم حادثات

اور [illegible] صدمات سے بھی مجھے بس اتنی ہی تکلیف پہنچی ہے جتنی دوسرے

بے شمار چھوٹے چھوٹے آلام و مصائب سے۔ اپنی اس غیر معمولی (اور شاید مبالغہ)

[illegible] احساس اور [illegible] اثر کے [illegible] زمانے میں ایک عجیب خیال میرے

دل میں آیا کرتا تھا۔ میرا ذہن بے اختیار جدید سائنس کے حیرت انگیز اکتشافات اور [illegible]

[illegible] سوچتا تھا کہ اگر کسی [illegible] ماہرین سائنس انسانی [illegible]

[illegible] کیفیات کی پیمائش کرنے والا کوئی آلہ ایجاد کر سکے تو یقیناً وہ آلہ

میری شدت احساس کی تاب نہیں لا سکے گا۔ میرے احساس کی مقدار اس کی ماقی

اور قوت برداشت سے زیادہ ثابت ہوگی اور اس کے نازک پرزے [illegible]

ہو کر رہ جائیں گے۔

اب [illegible] اپنی شدت احساس کو اتنی اہمیت ہی نہیں دیتا کہ اس قسم کا

خیال دل میں پیدا ہو!

•

عوام کی قوت بیان و اظہار پر یا عوامی زبان کی توانائی پر کوئی فاضلانہ

تقریر کرنے کی بجائے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ عام بے پڑھے لکھے جن میں

دیہاتی کسان، شہری مزدور، دستکار اور چھوٹے موٹے تاجر سبھی قسم کے لوگ شامل

ہیں، اپنی روزمرہ کی سادہ اور معمولی زبان میں بڑی سہولت اور عمدگی کے ساتھ

اُن مطالب کو ادا کر جاتے ہیں جن کے اظہار کے لئے پڑھے لکھے لوگوں کو ثقیل الفاظ

اور پیچیدہ تراکیب سے استمداد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ سہولت اور عمدگی

کے لفظوں کو خط کشیدہ سمجھنا چاہئے۔ عمدگی سے میری مراد کامیابی ہے اور سہولت سے میرا مطلب ہے بے تکلفی یا بے ساختگی یا شعوری کوشش کا فقدان۔ اُن لوگوں کی گفتگو کا نمایاں وصف یہی ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں سب بے ساختہ پن کے ساتھ کہہ جاتے ہیں اور الفاظ کے انتخاب و استعمال میں کسی شعوری کوشش سے کام نہیں لیتے۔ بات کرتے وقت وہ اپنے ذخیرۂ الفاظ کا جائزہ نہیں لیتے، نہ فقروں کی تلاش میں اپنے ذہن کے خزانوں کو کھنگالتے ہیں۔ اور سبب اس ساری صورتِ حال کا یہ ہے کہ وہ زبان کو کتابوں سے نہیں بلکہ براہِ راست زندگی اور عملی شرکتِ حیات سے حاصل کرتے ہیں۔

ایک روز میں شہر کی ایک دوکان پر بیٹھا تھا جہاں ایک شخص ایک چھوٹی سی گھریلو مشین پر کام کر رہا تھا۔ یہ مشین لوہے کے ایک پہیئے کی گردش سے چل رہی تھی اور پہیا سُوت کی ایک ڈوری کی مدد سے گردش کر رہا تھا۔ طویل و مدید استعمال کے سبب سے سُوت کی ڈوری نے پہیئے کی مدوّر سطح پر ایک گہرا نشان ڈال دیا تھا۔ مجھے یہ بات بڑی دلچسپ اور خاصی حیرت انگیز معلوم ہوئی کہ معمولی سوت کا دھاگا جسے کچے پن اور بودے پن کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ فولاد جیسی سخت دھات کو اس طرح متاثر کرے۔ پہیئے کی گردش کے ساتھ ساتھ اسمٰعیل میرٹھی کا شعر ؎

پڑے اُس پہ پانی اگر متصل تو بے شبہ گھس جائے پتھر کی سِل

میرے ذہن میں گردش کرنے لگا۔ میں اپنے جذبۂ حیرت و استعجاب میں اُس کاریگری کو شریک کرنے کی خواہش کی تاب نہ لا سکا۔ جب میں نے اس امر کی طرف اُس کو متوجہ کیا تو اُس نے گردن موڑ کر پہیئے پر ایک نظر ڈالی اور بڑی سادگی سے کہا "ہاں میاں" لگا بُرا ہوتا ہے!

لگا بُرا ہوتا ہے! یہ فقرہ جو چار نہایت سادہ اور نہایت معمولی لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ کتنے وسیع مفہوم کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے! اور یہ مفہوم زندگی بلکہ کائنات کی کتنی بڑی حقیقت سے عبارت ہے۔ یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ اس فقرے کو ہم اپنی روزانہ زندگی میں کس کس جگہ اور کتنے مواقع پر استعمال کر سکتے ہیں۔ اور پھر یہ مسئلہ کہ اگر اس بات کو ہم اپنی مہذب علمی زبان میں کہنا چاہیں تو کیوں کر کہیں گے فنِ اظہار اور مسئلہ ابلاغ کے ماہرین کے لئے یقیناً ایک دلچسپ دعوتِ فکر ہے۔

●

ایک دن ایک کرم فرما تشریف لائے۔ بیٹھنے سے پہلے بید کی زرد رنگ کی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ اس کا رنگ تو نہیں چھوٹتا؟ میں نے کہا نہیں، وارنش بالکل خشک ہو چکا ہے۔ آپ اطمینان سے بیٹھئے۔ دو گھنٹے کی ملاقات اور بات چیت کے بعد وہ تشریف لے گئے تو میں نے دیکھا کہ حضرت اپنے سبز پتلون کا بیشتر رنگ میری زرد رنگ کی کرسی پر چھوڑ گئے ہیں۔

مزید لطف کی بات یہ کہ کرسی کے دونوں ہتھوں کا پیلا رنگ بھی گہرے سبز رنگ سے مغلوب ہو چکا تھا۔ میں حیران ہوا کہ آخر پتلون کا رنگ کرسی کے ہتھوں پر کس طرح اثر انداز ہو سکتا ہے۔ تھوڑی دیر کے تردّد سے اس نتیجے پر پہنچا کہ اُن کے پتلون کا رنگ اتنا کچا تھا کہ اُن کے دونوں ہاتھ بھی اُس رنگ سے ملوث تھے۔ اور رنگے ہوئے ہاتھوں سے کرسی کے ہتھوں کا رنگین ہو جانا بالکل قدرتی بات ہے۔

مجھے یہ بات معلوم تھی کہ اپنے کپڑوں کو گھر ہی میں خود اپنے ہاتھ سے رنگنا اُن صاحب کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ چناں چہ جب انھوں نے بیٹھتے ہی اپنی بُش شرٹ کے سانولے فاختی رنگ کی داد چاہی تو مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا اور میں نے۔ رنگ کی خوش نمائی اور اُن کی رنگ کارانہ مہارت کی جی کھول کر تعریف کی۔ ظاہر ہے کہ جس پتلون سے وہ میری کرسی کا رنگ تبدیل کر گئے اس کو بھی انھوں نے خود ہی گھر کے اندر تختۂ مشق بنایا ہو گا۔

●

بعض لوگ اپنے پسندیدہ مشاغل کی پیروی میں بہت زیادہ غلو سے کام لیتے ہیں۔ وہ اپنے شوق کو جنون کی حد تک پہنچا دیتے ہیں۔ شکار یا شطرنج یا برج یا اس نوع کے دوسرے تفریحی مشاغل کے شیدائیوں کی کمی نہیں۔ وہ ہر جگہ دیکھنے میں آتے ہیں اور اُن کی بے اعتدالیاں ایک عام مشاہدے کی بات ہے لیکن میں نے ایک ایسے صاحب کو دیکھا ہے جن کو شکار یا شطرنج یا برج کا جنون نہیں تھا بلکہ آم کھانے کا خبط تھا۔ وہ دہلی میں تھے اور اب پاکستان جا چکے ہیں۔ اوّل درجے کے مفلس تھے اور اوّل درجے کے کھانے والے! آموں کی فصل میں جب تک دس بارہ مرتبہ سو سو پچاس پچاس روپے کے آم نہیں کھا لیتے تھے مطمئن نہیں ہوتے تھے۔ گزشتہ جنگِ عظیم کے آخری سالوں میں اگر اُن کو کسی بات کا دُکھ تھا تو صرف اس کا کہ دلّی میں امریکنوں کی بھرمار کے سبب سے آم دوا کے مول بکتا ہے اور اُن جیسے معمولی استطاعت کے لوگوں کو حسبِ دل خواہ کھانے کو نہیں ملتا۔ وہ اپنے ہر خط میں اس مصیبت کا ذکر کرتے تھے۔ ایک دفعہ آموں کے موسم میں علی گڑھ آئے۔ میں اُن کو لینے اسٹیشن گیا۔ گاڑی سے اُترے۔ جب تانگے پر

بیٹھ کر ہم دونوں گھر کی طرف روانہ ہوئے تو سلسلۂ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے میں نے اُن بے پناہ اور بے شمار آندھیوں کا ذکر چھیڑا جن سے اُس سال علی گڑھ والوں کو سابقہ رہا تھا۔ ابھی میری زبان سے حرفِ آندھی کا لفظ نکلا تھا اور آندھیوں کی مصیبت کا تفصیلی بیان شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ میرے دوست کا ذہن فوراً اُن آندھیوں کی طرف منتقل ہوا جنھوں نے اس سال آموں کی فصل کو تباہ کیا تھا، اور اسٹیشن سے لے کر مکان تک وہ آموں کی قلّت اور گرانی کی رقّت انگیز داستان کہتے چلے گئے۔

یہ تو خیر آموں سے شغف کی ایک غیر معمولی مثال تھی۔ لیکن یوں بھی اکثر لوگوں کو آم حد سے زیادہ بھاتا ہے، وہ کبھی اُس کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ آم کو دنیا کا بہترین پھل قرار دینے میں اُن کو ہرگز تامل نہیں ہوتا۔

بہت سال ہوئے، ایک شام لاہور ریڈیو اسٹیشن سے کسی تاریخی موضوع (غالباً مغلوں کی تہذیب) پر اردو میں ایک تقریر نشر ہو رہی تھی۔ شاید یہ بتا دینا دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ مقرر تاریخ کا کوئی ہندو عالم تھا۔ فاضل مؤرخ نے دورانِ تقریر میں یہ کہا کہ جس چیز نے مغلوں کو ہندوستان کی زلفوں کا اسیر کیا اور انھیں صحیح معنوں میں ہندوستانی بنایا وہ آم کا پھل تھا۔ العظمۃ للّٰہ! کہنے کو محض ایک پھل مگر اس کا تاریخی رول اتنا زبردست! یعنی آم کا پھل نہ ہوا، علامہ ابوالفضل ہو گیا یا راجہ ٹوڈرمل!

غرض یہ کہ اکثر لوگوں کو آم کا بے حد معترف، مداح اور دلدادہ پایا۔ یہ چیز میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔ میں نے ہمیشہ یہی محسوس کیا کہ آم اچھا پھل ہے۔ بہت اچھا کہنا بھی شاید غلط نہ ہو۔ مگر اُس کو دو جہاں کی نعمت یا "پھلوں کا بادشاہ" سمجھنے کی بظاہر کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ میں یقینی طور پر بعض دوسرے پھلوں کو آم پر ترجیح دوں گا۔ اس سلسلے میں بعض اوقات یہ خیال بھی ذہن میں آیا کہ ممکن ہے مجھے اچھے اور اعلیٰ درجے کے آم کثرت کے ساتھ اور بار بار کھانے کو نہ ملے ہوں اور یوں میں آموں کا صحیح ذوق پیدا کرنے اور آموں کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے سے قاصر رہا ہوں۔ لیکن اپنے خورد و نوش کی تاریخ کا جائزہ لینے سے پتہ چلا کہ شاید ایسا تو نہیں ہے۔ اچھے سے اچھے آم کھائے ہیں اور خوب خوب کھائے ہیں۔ بقول شخصے کھاتے کھاتے منہ پھر گیا ہے۔ پھر بھی یہ سوچا کہ کہیں آموں کے متعلق میری یہ رائے الل ٹپّ پن کی بنا پر تو نہیں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ سارے زمانے سے مختلف رائے رکھنے کی خاطر میں نے یہ رائے قائم کر لی ہو اور اُس پر اصرار محض میری انانیت اور ذوقِ سخن پروری کا نتیجہ ہو۔ دماغ کو اچھی طرح ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ ایسا بھی نہیں ہے۔ یعنی میں خاصی ایمانداری کے ساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ آم اچھا پھل ضرور ہے مگر دنیا کا بہترین پھل نہیں ہے۔ چناں آج بھی میرا یہ خیال ہے کہ اگر کہیں پھلوں کی دعوت اور دسترخوان پر تمام اچھے پھل چنے ہوئے ہوں تو میرا ہاتھ سب سے پہلے ممکن ہے کہ انگور کی طرف بڑھے، ممکن ہے کہ مرسے کی طرف بڑھے، لیچی کی طرف بڑھے۔ مگر آم کی طرف یقیناً نہیں بڑھے گا۔ اور بہت ممکن ہے کہ قبل اس کے کہ آم کھانے کی نوبت آئے میرا پیٹ بھی بھر چکا ہو اور نیت بھی سیر ہو چکی ہو۔

اس سلسلے میں میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ زندگی اور عمل کے ہر شعبے میں روایتی خیالات و عقائد کا عمل دخل ہمیشہ ضرورت سے زیادہ رہا ہے اور اب بھی ہے۔ جو بات عام طور پر کہی جاتی ہے اُس کو بغیر سوچے سمجھے قبول کر لینے کی روش ایک ہمہ گیر انسانی کمزوری رہی ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ عام مفروضات یا مزعومات کو ہم ذاتی تجربے کے عمل سے گزاریں اور روایت کو درایت کی خراد پر چڑھائیں۔ اس سے غلط یا غیر متوازن نظریوں اور رایوں کو پھیلنے اور پھلنے پھولنے میں جو مدد ملتی رہی ہے وہ ظاہر ہے۔ تعصبات بھی، خواہ وہ کسی نوعیت کے ہوں اور ذہن و عمل کے کسی بھی شعبے سے متعلق ہوں، اسی سرچشمے سے سیراب ہوتے رہے ہیں۔ شعر و ادب کی دنیا میں اس فاسد رجحان کی کارفرمائی بالکل سامنے کی بات ہے۔ کیسی کیسی غلط ادبی رائیں اور کیسے کیسے ادبی فیصلے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہے ہیں اور گفتگو یا تحریر کے ذریعے نشر ہو کر مسلّمہ ادبی حقائق کا مرتبہ اختیار کرتے رہے ہیں۔ کیسے کیسے نامور نقاد جن کے کیسے ادبی بصیرت کی متاع سے خالی ہیں مستعار خیالات اور مانگے تانگے کے نظریات سے، گویا چوری یا ادھار کے مال سے، اپنی تنقید نگاری کی دوکان سجاتے ہیں اور دونوں ہاتھوں سے ادبی شہرت کا منافع بٹورتے ہیں! یہ عام پڑھنے والوں کی زود اعتقادی اور خوش اعتقادی کا ثمر نہیں ہے تو کیا ہے؟ لوگوں کے حسنِ اعتقاد کی بدولت کسی پھل کے سر پہ پھلوں کی بادشاہت کا تاج بھی رکھا جا سکتا ہے اور کسی نام نہاد شاعر کی ہوا بھی ایسی باندھی جا سکتی ہے کہ باید و شاید!

•

ایک شیروانی سلوائی۔ اُس پر جو خرچ آیا اُس کا خیال کر کے بار بار میرے ذہن میں اپنے ایک مرحوم چچا اور اُن کی مرحوم شیروانیوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

میرے یہ چچا جو پچپن سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے، اپنے لباس، رہن سہن اور دوسری دل چسپیوں کے معاملے میں بہت ستھرے اور کسی قدر انوکھے مذاق کے آدمی تھے۔ اُن کی دوسری خصوصیات سے بحث نہیں۔ لباس کے سلسلے میں جو خصوصیت برتتے تھے اُس کا ذکر مقصود ہے۔ انھوں نے کُرتے، پاجامے اور شیروانی کے سوا کبھی کوئی دوسرا لباس نہیں پہنا۔ اور اس میں یہ التزام ملحوظ رہتا تھا کہ روزانہ ایک نیا دُھلا ہوا جوڑا پہنتے تھے۔ جس طرح صبح کے وقت دسترخوان پر ناشتہ چُنا جاتا تھا اُسی طرح کپڑوں کا ایک جوڑا۔ جو ایک بنیان، ایک کُرتے ایک پاجامے، ایک شیروانی پر مشتمل ہوتا تھا بکس سے نکال کر باہر رکھ دیا جاتا تھا شیروانی پہن کر گھر سے باہر نکل جانا شرط تھا۔ اب چاہے وہ نصف گھنٹہ گھر سے باہر رہیں چاہے سارا دن۔ دوسرے دن وہ شیروانی ہرگز نہیں پہنی جاتی تھی۔ بلکہ میلے کپڑوں میں ڈال دی جاتی تھی۔ ایک بڑا سا ٹرنک صرف شیروانیوں کے لئے مخصوص تھا۔ زیادہ نہیں تو بیس پچیس شیروانیاں تو اُس میں رہتی ہی ہوں گی۔ مزے کی بات یہ کہ سب شیروانیاں ایک ہی کپڑے کی، ایک ہی وضع کی، اور ایک ہی درزی کے ہاتھ کی سلی ہوئی ہوتی تھیں۔ اور سب سے زیادہ مزے کی بات یہ تھی کہ کوئی شیروانی دو روپے سے زیادہ کی نہیں ہوتی تھی۔ یہ اس طرح کہ اُس زمانے میں تین چار آنے گز کا کوئی لٹھا آتا تھا۔ روپیہ بارہ آنے کا ایک شیروانی کے لائق یہ کپڑا ہوا۔ اور روپیہ سوا روپیہ سلائی کا جاتا تھا۔ یوں کم و بیش دو روپے کی شیروانی ہوئی۔

اب اس زمانے میں دو روپے کی شیروانی کا تصوّر بھی محال ہے۔ میں نے اپنے مرحوم چچا کی شیروانیوں کو اس بنا پر اور انھیں معنوں میں مرحوم شیروانیاں کہا تھا۔

مجھے تقدیر سے خود اعتمادی کی کمی کا شکوہ نہیں۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ زندگی کے کسی دور میں شکست خوردگی کے زیر اثر میرے دماغ میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا ہو کہ میرے ذہنی وکردار میں مثبت محاسن کی بڑی کمی ہے۔ غالباً کسی ایسے ہی خیال یا احساس کے زیر اثر میں نے غیر شعوری طور پر بھی اور شعوری کوشش کے ذریعے بھی اپنے اندر کچھ منفی میلان یا منفی اوصاف پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انھیں منفی خصوصیات کے سہارے میں برسوں ایک اچھوتی وضع کا انسان بننے کی کوشش میں مصروف رہا۔

میرے یہ منفی اوصاف کیا تھے؟ یہی کہ میں بائیسکل نہیں چلا سکتا۔ ٹیلیفون پیمبات نہیں کر سکتا۔ مشاعرے میں شعر نہیں پڑھ سکتا۔ میں نے تاج محل کبھی نہیں دیکھا۔ میں گرمی کے موسم کو جاڑوں کے موسم پر ترجیح دیتا ہوں۔ مجھے آم کھانے سے کوئی خاص رغبت نہیں۔ مجھے شکار کھیلنے سے بالکل کوئی دل چسپی نہیں۔ میں دن کو سوتا ہوں رات کو جاگتا ہوں، اور یہ کہ میں جسمانی ورزش یا کھیل کود یا صبح کی ہوا خوری کو تضیعِ اوقات خیال کرتا ہوں!

منفیات کا وہ دور شاید اب ختم ہو چکا ہے، اور میں منفیات کی نفی کو اپنا شعار بنانے کی کوشش میں مصروف ہوں۔

●

میں اپنے مزاج کے لحاظ سے بے حد بلاغیت۔ Communicative واقع ہوا ہوں۔ کہیں کوئی قابلِ توجہ یا چونکا دینے والی یا کسی قدر عجیب یا دل چسپ بات پاتا ہوں (خواہ وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے کیسی ہی ہو۔ اچھی یا بُری، پسندیدہ یا ناپسندیدہ، لائقِ توصیف یا قابلِ مذمت خوش گوار یا ناخوش گوار) تو اس کے بارے میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ ہر کس و ناکس سے اُس کا تذکرہ کرنا ــــ بیان و اظہار کی پوری قوت سے کام لیتے ہوئے اور بصیرت و ژرف نگاہی کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کرتے ہوئے۔ اپنا فرضِ اولین خیال کرتا ہوں۔ اگر کسی خوبی سے دوچار ہوتا ہوں تو گویا یہ چاہتا ہوں کہ ساری دنیا نہ صرف اُس سے واقف ہو جائے بلکہ اُس کی تعریف میں رطب اللساں ہونے اور تحسین و آفرین کے پھول برسانے کے علاوہ اور کچھ نہ کرے۔ اگر کوئی مکروہ مذموم، قابلِ نفرت یا شرم انگیز بات نظروں کے سامنے آتی ہے تو میری طبیعت گویا اس امر کی متقاضی ہوتی ہے کہ کل عالم انسانیت نہ سہی، کم از کم میرے اردگرد کے لوگ تو لعنتوں کی بوچھار کرنے کے سوا کوئی دوسرا کام نہ کریں۔

میں سمجھتا ہوں کہ مزاج کی یہ خصوصیت نامناسب ہو تو ہو، مگر قبیح ہرگز نہیں اس کا سرچشمہ کسی قسم کا نفسیاتی عدمِ اعتدال تو ہو سکتا ہے لیکن اس کو بد نیتی یا خبثِ طبع کا نتیجہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ شاید اُن خصائص میں سے ہے جو نیک نیتی پر مبنی ہونے کے باوجود بُرے یا نامناسب سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ان سے دنیاداری، زمانہ سازی اور مصلحت کوشی کے تقاضوں کی نفی ہوتی ہے۔ ذاتی طور پر میرا یہ خیال ہے کہ یہ دراصل اپنے تجربات، مشاہدات اور احساسات میں دوسروں کو شریک کرنے کا وہ ازلی جذبہ ہے جو ہر فن کار یا فن کارانہ مزاج رکھنے والے شخص کا لازمی وصف ہوتا ہے اور جو فی الحقیقت تمام فنونِ لطیفہ کی اساسِ اوّلی ہے۔

مگر بدقسمتی سے جس ماحول میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں وہ تنا تنوں اور چشکوں کا ماحول ہے۔ جوڑ توڑ اور اُکھاڑ پچھاڑ کی اس دنیا میں مذکورۂ بالا خصوصیت طبع بہت سی خرابیوں اور رنجشوں کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا اور میں اپنے مزاج کے اس فطری رجحان کی بدولت برسوں طرح طرح کی رسوائیوں سے دو چار ہوتا رہا۔ بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اپنے آپ کو تبدیل کرنا چاہیئے اور جس حد تک بھی ممکن ہو نشاط، مکاری اور مصلحت پسندی کی کوشش کرنی چاہیئے۔ میں نے سوچا کہ بہ حیثیت مجموعی میری روش یہ ہونی چاہیئے کہ زیادہ سے زیادہ فرزانگی اور زیادہ سے زیادہ گھٹے پن سے کام لوں۔ سب کچھ دیکھوں اور سب کچھ سنوں، مگر حتی الامکان خاموش رہوں۔ اگر کوئی شخص انسانوں کو قتل کرنا اپنا شعار بنائے ہوئے ہو تو ایسا انداز اختیار کروں گویا مجھے کچھ اور نظر آتا ہو یا نہ نظر آتا ہو، انسان کا قتل ہرگز نظر نہیں آتا۔ اگر کسی علامۂ اجل کے بارے میں پتا چلے کہ علم اس بے چارے کو چھو بھی نہیں گیا ہے تو اپنا سر پیٹ لینے کے بجائے ایک مکارانہ طمانیت کے آثار اپنے چہرے پر پیدا کئے ہوئے مسکراتا رہوں۔ اگر تجربے سے ظاہر ہو کہ ایک بظاہر نیک طینت بلکہ فرشتہ خصلت شخص پرلے درجے کا جیب تراش ہے یا ایک بدکردار جو بچپنے میں پیمبرانہ معصومیت کا مجسمہ معلوم ہوتے ہیں، درحقیقت ریاکاری، کور باطنی، خود پرستی اور موقع پرستی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تو کیا مجال کہ دل کو جو دھکا لگا ہے اُس کا ذکر زبان پر آ جائے یا دماغ پر جو چوٹ پڑی ہے اُس کا اثر چہرے سے ظاہر ہو جائے۔

اب یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ میں اپنا مزاج بدلنے میں کامیاب ہو گیا لیکن اتنا ضرور ہے کہ سمجھ داری اور دانش مند بننے کا جو منصوبہ میں نے تیار کیا تھا وہ بے کار نہیں گیا۔ ثبوت یہ کہ کچھ ہی دنوں میں میرے بعض رفقا نے میرے بدلے ہوئے رویے کو محسوس کیا اور اُن میں سے ایک نے تو یہاں تک مناسب خیال کیا کہ وہ اس سلسلے میں مجھے خراجِ تحسین پیش کریں۔ انھوں نے کہا کہ تمھاری روش بہت اچھی ہے کہ نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں، اپنے کام سے کام رکھتے ہو اور کسی بات کا اثر نہیں لیتے، وغیرہ وغیرہ۔ میں نے یہ سوچ کر کہ ممکن ہے تعریف کے پیرائے میں ان کو تنقیص یا نکتہ چینی مقصود ہو۔ اُن کو یہ جتا دینا ضروری خیال کیا کہ میری بے حسی وہ بے حسی نہیں ہے۔ جس کی بنا پر انسان کو چکنا گھڑا کہا جاتا ہے بلکہ وہ بے حسی ہے جس کا ذکر اصغر نے اپنے ایک شعر میں کیا ہے ؎

بار الم اٹھایا، رنگ نشاط دیکھا
آئے نہیں ہیں یونہی انداز بے حسی کے

سیدہ جعفر

مولانا آزاد کے انشائیے اور اُن کا پس منظر

ابوالکلام آزاد کے انشائیوں کے بنیادی تصورات، ان کی مجموعی روح اور اُن کے تشکیلی عناصر کو سمجھنے کے لئے اس سماجی اور سیاسی پس منظر کا جائزہ لینا ضروری ہے جس میں آزاد کی تحریریں ابھری ہیں۔ ابوالکلام آزاد کی انشائیہ نگاری کے اُبھرنے اور نکھرنے اور ہندوستان میں تحریک آزادی کی رفتار میں تیزی اور گرمی پیدا ہونے کا زمانہ ایک ہی ہے۔ ۱۸۸۴ء میں لارڈ ڈفرن ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے۔ دوسرے انگریز حکمرانوں کی طرح لارڈ ڈفرن بھی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی کا زبردست حامی تھا۔ آزادی کے بعد سے انگریزوں کو ہندوستانیوں سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں ان کا باہمی اتحاد اور ان کی اجتماعی قوتیں اتنی مستحکم نہ ہو جائیں کہ وہ ہندوستان میں برطانیہ کی بساط سیاست الٹ دیں اس لئے ہندوستانیوں کو ایک مرکز پر سمٹنے سے روکنا انگریزی سیاست کا سب سے اہم مقصد بن گیا تھا چنانچہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد مراد آباد کے کمانڈنٹ لفٹنٹ کرنل جان کوک نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا "ہماری ساری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ ہندوستان کے مختلف مذاہب اور نسلوں میں جو اختلافات ہیں انھیں اپنی پوری قوت سے ترقی دیں اور ہندوستانیوں کو باہم متحد ہونے کا موقعہ نہ دیا جائے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" ہندوستانی حکومت کا اصول ہونا چاہئے"[1]

لارڈ ڈفرن کا عمل اسی اصول پر تھا چنانچہ ۱۸۸۵ء میں ایلن آکٹیوین ہیوم کو انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کی دعوت دی گئی۔ اس موقعے پر لارڈ ڈفرن نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

> "ہندوستانی ماحول کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ دو عظیم مذاہب میں منقسم ہے جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور ان کے معتقدات میں تطابق کا فاصلہ ہے۔"[2]

اسی طرح برطانوی سامراجیت کی زہرناک پالیسی کے لئے راہ ہموار ہو گئی اور انڈین نیشنل کانگریس کے ردِ عمل کے طور پر "متحدہ محب وطن ہند" کی بنا ڈالی گئی اور ہندوستان میں سیاست کے دو مختلف اور متضاد محاذ قائم ہو گئے۔

اس وقت ابوالکلام کی عمر دو سال سے زیادہ نہ تھی۔ اسی زمانے سے ابوالکلام کے سیاسی شعور کی نشو و نما اور تعمیر کا آغاز ہوتا ہے جو اُن کی تمام تحریروں اور خصوصیت کے ساتھ ان کے انشائیوں کا محرک ہے۔ "نیرنگِ عالم" اور "لسان الصدق" کے صفحات میں اس سماجی کرب اور انتشار کی جھلک نظر آتی ہے جو ۱۹۰۳ء سے ہندوستان کی سماجی سیاسی زندگی پر چھایا ہوا تھا۔

تقسیم بنگال نے ہندوستان کے تمام صوبوں میں انگریزوں کے طرز حکومت کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑا دی تھی۔ اس زمانے میں بنگال، بہار اور اڑیسہ

[1] "انڈین فائیٹ فار فریڈم" از سردول سنگھ • (ص ۲۷۴)

[2] "ابوالکلام آزاد" از بی ایل راجپوت ص ۴۴

قومی تحریک کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ تقسیم بنگال کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کی اجتماعی جد و جہد کو منتشر کرکے اُسے کمزور بنا دیا جائے۔ جب تقسیم بنگال پر ہندوستان کے مختلف شہروں میں احتجاج شروع ہوا تو حکومت نے اس کی غلط توجیہیں پیش کیں اور انتظامی پہلو کی آڑ لے کر یہ سمجھانا چاہا کہ بنگال کا بٹوارہ انتظامی بنیادوں پر کیا گیا ہے۔ لیکن اس قسم کی توجیہوں سے ہندوستانیوں کے جوش و خروش کو روکا نہ جا سکا اور کانگرس کے کلکتہ سیشن میں دادا بھائی نوروجی نے حکومت کے خلاف تحریک چلانے کی تجویز کی جس پر ہندوستان کے مختلف حصوں میں عمل شروع کر دیا گیا۔ اس وقت ابوالکلام آزاد نے پہلی دفعہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دی اور برطانوی طاقتوں کے استحصال کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک متحدہ محاذ کی ضرورت کا احساس دلانے کی کوشش کی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا سیاسی میدان میں متفق ہونا اس لئے ضروری تھا کہ سامراج کا ہر سیاسی اقدام دونوں فرقوں کے حقوق اور مطالبات کو یکساں مجروح کر رہا تھا۔ ابوالکلام مسلمانوں کے دلوں سے انگریزوں کی وفاداری کے تصور کو مٹا کر ان کی انسان دشمنی، استبداد اور بربریت کا احساس پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو کلکتے کے ایک جلسے میں انھوں نے یورپی اقوام کے ظلم اور ان کی خون آشام ستم رانیوں کی مذمت کرتے ہوئے کہا تھا:

"اے اقوامِ یورپ! اے دزدانِ قافلۂ انسانیت! اے مثالِ درندگی و بہیمیت! اے مجمعِ وحوش و کلاب! یہ ظلم و عدوان تا کے؟ اور خون ریزی تا چند؟ کب تک خدا کی سرزمین کو اپنے حیوانی غرور سے ناپاک رکھو گے؟ کب تک انصاف ظلم سے اور روشنی تاریکی سے مغلوب رہے گی؟"[1]

تاریکی کو روشنی سے بدلنے کی یہی خواہش دراصل ابوالکلام کی تحریروں اور ان کے انشائیوں کا مرکزی تصور اور ان کا بنیادی عنصر ہے۔ وہ اس تاریکی سے گھبرائے نہیں تھے۔ ان کی نگاہیں روشنی کے ایک نئے مینار پر لگی ہوئی تھیں۔

انگریزوں کی پالیسی نہ صرف سیاسی معاملات میں خود غرضانہ بنیادوں پر استوار ہوئی تھی بلکہ معاشی، صنعتی اور اقتصادی پہلو بھی ان کے مسموم طرزِ عمل کی زد میں آ چکے تھے۔ ہندوستان کی خام پیداوار انگلستان کے کارخانوں کو فروغ دینے کے لئے باہر بھیجی جا رہی تھی اور یہاں کی گھریلو صنعتیں، چھوٹی دستکاریاں اور یہاں کا سارا زرعی اور معاشی نظام اس سے متاثر ہو رہا تھا۔ ابوالکلام "افسانۂ استبدادِ ہند" کا ایک ذیلی عنوان قائم کرتے ہوئے اپنے مشہور انشائیے "ہندوستان کی آزادی اور مسلمان" میں ہندوستان کی عام اقتصادی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"ہندوستان کہ ایک خاص زرعی ملک تھا اس کے کاشتکار تباہ و برباد ہو رہے تھے۔ ملک کی دولت انگلستان کے معدے میں بھری جا رہی تھی اور اس طرح ہضم ہو جاتی تھی کہ چند لمحوں کے بعد ھل من مزید کا نعرہ سنائی دیتا تھا۔ ریلوے کی توسیع کے انگلستان کو ٹھیکے دئے جا رہے تھے تاکہ وہ دولت جذب کرے۔ مگر آبپاشی کے لئے روپیہ نہ تھا کہ ہندوستان اپنی دولت اُگلے۔ ملک کی تمام دولت ستر ہزار سرخ رنگ سپاہیوں کو سونا چاندی کھلا کر لٹائی جا رہی تھی۔ مگر ملک کے فاقہ مست کالے تعلیم اور حفظانِ صحت کے انتظام سے محروم تھے۔ نمک بھی ملتا تھا تو محصول دے کر۔"[2]

جب رولٹ بل پاس کیا گیا تو گاندھی جی نے وائسرائے سے اُسے روک لینے کی خواہش کی لیکن یہ درخواست مسترد کر دی گئی اور گاندھی جی کی رہنمائی میں اس بل کے خلاف ہر جگہ عام ستیہ گرہ شروع کر دیا گیا، جس کا مقصد رولٹ بل ایکٹ کی نافرمانی اور اسے تسلیم کرنے سے انکار تھا۔ ۱۳۔ اپریل ۱۹۱۹ء کو رام نومی کے تہوار کے موقعے پر تمام ہندوستان میں "یومِ ستیہ گرہ" منایا گیا۔ امرت سر کے جلیانوالہ باغ میں اسی ستیہ گرہ کے سلسلے میں ایک وسیع اجتماع ہوا تھا۔ جلسہ کی کارروائی شروع ہوئے کچھ دیر نہ گذری تھی کہ جنرل ڈائر مشین گن اور سپاہیوں کے ساتھ آ دھمکے اور مجمع پر دس منٹ تک مسلسل گولیاں برسائی گئیں۔ اس واقعے نے ہندوستان کے طول و عرض میں آگ لگا دی۔ ہندو اور مسلمان اپنے باہمی اختلافات کو بھول کر ایک نئی سرگرمی اور جوش و خروش کے ساتھ انگریزوں کے جبر و تشدد کو مٹانے کے لئے آگے بڑھے اور اس طرح پہلی بار وطنیت، اتحاد اور قومی مفاد کے تصور نے ان دونوں فرقوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا۔ مولانا محمد علی نے اسی واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

---

[1] "خطباتِ ابوالکلام آزاد" نصراللہ خاں عزیز، ص ۱۳

[2] "حیاتِ آزاد" ص ۵۵

"یہ بات قدرت نے کرنل ڈاٹر کے لئے رکھی تھی۔ تیس سال پہلے
سرسید نے عارضی مقاصد کے لئے جو دیواریں کھڑی کی تھیں اُسے
پوری طرح گرادیں اور ہندوستان کے مسلمانوں کو کانگرس میں شریک
ہونے کی دعوت دی[1]۔"

اس طرح پہلی دفعہ ہندوستان کے سیاسی ناخداؤں کو ہندو مسلم اتحاد کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر آیا۔ آزاد نے مسلمانوں کو اپنے دل سے ہندو اکثریت کا خوف دُور کرنے کی صلاح دی اور اپنے ایک انشائیے میں لکھا :

"ہندو بھائیوں کے عزیت کا خوف اب خدا کے لئے دل سے نکال
دیجئے یہ سب سے بڑا شیطانی وسوسہ تھا جو مسلمانوں کے قلب میں
القا کیا گیا۔ طاقت محض تعداد پہ نہیں بلکہ اور باتوں پہ موقوف ہے
اصل شئے قوموں کی معنوی قوت ہے[2]۔"

ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کے سیاسی اور سماجی خیالات کی تعمیر اور تشکیل میں جو حصہ لیا وہ ایسا نہیں کہ تاریخ اُسے فراموش کر سکے ۔ ابوالکلام آزاد کو اس بات کا پورا پورا احساس تھا کہ مسلمانوں کے سیاسی شعور کو انھوں نے جھنجھوڑا اور بیدار کیا ہے چناں چہ اپنے ایک انشائیے میں اپنی مساعی اور 'الہلال' کی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"میں اس جرم سے کیونکر انکار کر سکتا ہوں جب کہ ہندوستان
کی 'آخری اسلامی تحریک' کا داعی ہوں جس نے مسلمانانِ ہند کے
پولیٹکل مسلک میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا ...... میں نے
۱۹۱۲ء میں ایک اردو جرنل "الہلال" جاری کیا جو اس تحریک کا
آرگن تھا اور جس کی اشاعت کا تمام تر مقصود ہی تھا جو اُوپر ظاہر کر
چکا ہوں۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ "الہلال" نے تین سال کے اندر
مسلمانانِ ہند کی مذہبی اور سیاسی حالت میں ایک بالکل نئی حرکت
پیدا کر دی[3]۔"

مسلمانوں نے علی گڑھ تحریک سے نئی قدروں کا شعور، مغربی تعلیم کی برکتیں اور سماجی دُکھ درد کا مداوا پایا تھا مگر وہ گرمیٔ عمل نہ پائی تھی جو غلامی کی زنجیروں کو پگھلا دے ۔ ابوالکلام آزاد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے ایک ایسے فرقے میں آزادی کی لگن پیدا کر دی جو ابھی تک سیاست کے ہنگاموں سے دامن بچائے ہوئے بیٹھے تہذیبی اور سماجی افکار کی دنیا کو غلامی کی حسین تاویلوں اور فرقہ واریت کے پُرفریب بتوں سے سجا رہا تھا۔ سرسید نے مذہب کو عقلیت اور مادیت سے قریب لانے کی کوشش کی تھی۔ ابوالکلام آزاد نے سیاست کو مذہب سے ہم آہنگ کرنا چاہا۔ 'مقالاتِ الہلال' 'تقریحاتِ آزاد' 'مضامینِ الہلال' 'انتخابِ الہلال' اور 'مضامینِ ابوالکلام آزاد' کے اکثر انشائیوں میں یہی کوشش اظہار کی سطح کو چھو لیتی ہے ۔ ابوالکلام آزاد ہندوستانیوں کے ذہنی معمار ہیں ۔ انھوں نے ہم میں وہ ہیجان، جوش اور آزادی کی وہ تڑپ پیدا کر دی جو "کنجشکِ فرومایہ کو شاہین سے" لڑا دیتی ہے۔ انھوں نے ہمارے سیاسی افکار میں پختگی اور گیرائی پیدا کی اور ہمارے انقلابی تصوّرات کے سانچے بنائے۔

اُردو انشائیہ کو آزاد کی دین

ابوالکلام آزاد نے جس طرح ہندوستانی سیاست کو ایک نئے موڑ سے آشنا کیا اور قومی مزاج میں ایک نئی سیاسی گہرائی پیدا کی اسی طرح وہ انشائیہ نگاری اور انشا پردازی میں بھی ایک نئے اسلوب کے بانی ہیں۔ اصل میں یہ اسلوب جو اب اردو میں شاید کلاسکی اسلوب بن گیا ہے مولانا نے پہلے پہل اپنی صحافتی ضرورتوں کے لئے "الہلال" اور "البلاغ" میں استعمال کیا تھا۔ انگریزوں کی سامراجیت کے خلاف جو دھواں دھار مضامین مولانا نے لکھے تھے۔ ان کی مقبولیت کے باعث یہ اندازِ نگارش صحافت کے لئے بعد میں معیار تو بنا ہی لیکن بعض اُردو انشائیہ نگار بھی اس سے یقیناً متاثر ہوئے ہیں۔ انشائیہ کے ارتقاء میں ابوالکلام آزاد کا حصّہ یہ ہے کہ انھوں نے اسے ایک عالمانہ انداز اور ایک بلند آہنگ علمی سنجیدگی عطا کی۔ ان کے انشائیوں میں تصوّر کی لطافت، انہار کی پُرسکون ملائمت اور مٹھاس اتنی نہیں جتنی کہ بیان کی گرمی اور موضوعات کا رعب و داب ہے اور اس طرح ابوالکلام آزاد نے انشائیہ کی صنف کو شعلوں کی لپک اور بجلیوں کے پُرشور ماحول میں پہنچا دیا۔

انشائیہ ان کے ہاتھوں میں ہلکا پھلکا ادب، شیریں اور لطیف نغمہ پیدا کرنے والی آبجو نہیں، بلکہ طبلِ جنگ اور جوار بھاٹے کا سمندر بن گیا ہے۔ ابوالکلام طبعاً کلاسکی انداز کے رسیا تھے اور یہی عظمت انھوں نے انشائیوں کو بھی عطا کی۔ اس میں ٹھوس اور بھرپور معنویت کا اضافہ کیا اور ہماری نثر میں یہ احساس اُجاگر

[1] 'ابوالکلام آزاد' از بی ایل راجپوت ص ۶۳
[2] انشائیہ : 'ہندوستان کی آزادی اور مسلمان' "مضامینِ ابوالکلام آزاد" ص ۶۱
[3] انشائیہ : 'اسلام اور بیوروکریسی' "مضامینِ ابوالکلام آزاد" ص ۱۰۶

کرنے کی کوشش کی کہ "تصویر بتاں" اور "حسینوں کے خطوط" سے آگے اور غم جاناں سے پرے غم دوراں کی بہت سی جاندار اور متحرک حقیقتیں بھی ہیں۔ انشائیہ نگاری محض تخیل کی حنابندی نہیں اس میں سماج اور سیاست کی نوکیلی داستانوں کا نچوڑ بھی سمویا جا سکتا ہے۔ ابوالکلام آزاد کے انشائیے جیتے، ولولہ انگیز اور تند و تیز ہیں اُن کے خطوط نسبتاً بےکیف، پھیکے اور ٹھنڈے ہیں۔

ابوالکلام آزاد نے انشائیہ نگاری کو ایک خاص لب و لہجہ اور ایک منفرد آہنگ عطا کیا اور اپنے اسلوب کی ذاتی اور انفرادیت سے اس صنعت میں انشا پردازی کا ایک نیا معیار قائم کیا۔ اردو میں اس وقت تک انشا پردازی کے جو نمونے موجود تھے ان میں الفاظ کی گھلاوٹ، جملوں کی جھنکار اور عبارت کا بانکپن زیادہ تھا۔ ابوالکلام نے انشا پردازی میں نئی شان پیدا کی کہ لفظوں، جملوں اور ترکیبوں کے استعمال میں خیال کی اثر انگیزی اور بیان کی پرشکوہ گونج کو ایک سطح پر قائم رکھنے کا سلیقہ سکھایا۔ جو انصاری نے "الہلال" کے انشائیوں کو "نفخ صور" سے تعبیر کیا ہے۔

انداز نگارش

ابوالکلام کے انشائیوں میں انداز نگارش کی جو خصوصیت نمایاں سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے وہ ان کا شاندار اور مرعوب کن انداز بیان ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ پڑھنے والا ابوالکلام کے خیالات اور تصورات سے پوری ذہنی ہم آہنگی نہ پیدا کر سکے لیکن ان کے انشائیوں کے مطالعے کے دوران میں ان کی علمیت، بالغ نظری اور اسلوب کے پرزور آہنگ سے مرعوب اور متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ اپنے مخصوص الفاظ، خود ساختہ ترکیبوں اور آیتوں کی چکاچوند کر دینے والی کیفیتوں کو لئے ہوئے قاری کے ذہن پر اس طرح چھا جاتے ہیں کہ اُسے اپنی کمتری کا احساس ہونے لگتا ہے۔ فارسی اور عربی کے اردو سے نامانوس اور بعض وقت ادق الفاظ کو اس بیباک دستی سے برت جاتے ہیں کہ حسنِ عظمت کا احساس ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ لوگ بھی جو آزاد کی تحریروں کی معنوی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتے ان کے صوری حسن سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور ان پر بھی ابوالکلام آزاد کی علمیت اور تبحر کا رعب چھا جاتا ہے۔ ان کی تحریروں کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ کوئی انوکھی، چبھتی اور اثر کرتی ہوئی بات ضرور کہی گئی ہے۔

ابوالکلام آزاد کی نثر میں مغلق الفاظ، بوجھل ترکیبوں اور جملوں کی گراں باری کی وجہ سے عبارت کا جو مجموعی آہنگ مرتب ہوتا ہے وہ اپنے انفرادی خد و خال اور اپنی شخصی گونج رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الہلالی اردو پر کسی اور مصنف کے طرز کا دھوکا نہیں ہو سکتا۔ اس الہلالی اردو کے پیچھے انشائیہ نگار کے ذہن کا کون سا رجحان کام کر رہا تھا اس کا تجزیہ کرنا آسان نہیں۔ ابتدا ہی سے ابوالکلام سرسید کے سماجی نظریات، ان کے تعلیمی پروگرام اور سیاسی روش سے غیر مطمئن تھے اور انھوں نے اکثر سرسید کے مذہبی افکار پر کھلی تنقیدیں کی تھیں۔ چنانچہ سرسید جو علم کلام کے بانی سمجھے جاتے ہیں اس پر سب سے پُرزور اعتراضات ابوالکلام ہی نے کئے تھے۔ سرسید کے پورے نظامِ فکر پر انھیں اعتماد نہ تھا۔ وہ سیاست، مذہب، سماج اور ادب کے تمام میدانوں میں سرسید اور اُن کے رفقا کی ڈگر سے ہٹ کر ایک نئی راہ تراشنا چاہتے تھے۔ ادب میں سرسید کا نظریہ فن یہ تھا کہ زبان اور بیان میں انشا پردازوں کے اتنے بلند معیاروں کو اکٹھا نہ کیا جائے کہ ادب محض مدرسے کی چیز ہو کر رہ جائے۔ وہ ادب کے عمومی پہلو کو اجاگر کرنا چاہتے تھے۔ دوسری بات جو سرسید اور ان کے مکتب خیال والوں کے انشائیوں میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے انشائیوں میں کہیں جذبات کو عقل پر چھا جانے کا موقع نہیں دیا ہے اسی لئے اس دور کی انشائیہ نگاری میں جذباتیت کم اور سوجھ بوجھ زیادہ ہے۔ ابوالکلام آزاد نے اپنی مخصوص انشا پردازی میں اس راستے سے بھی انحراف کیا۔ انھیں ایک ایسے اسلوب کو اپنانا تھا جو علی گڑھ تحریک کی کسی پرچھائیں سے آلودہ نہ ہو۔ چنانچہ انھوں نے جو اسلوب بیان اختیار کیا اس میں سرسید کی سادگی کے جواب میں مغلق الفاظ اور پیچیدہ ترکیبیں تھیں۔ سرسید نے عقل کو مہمیز دی تھی ابوالکلام نے عقل و جذبات کو ابھارا۔ "تہذیب الاخلاق" کے لکھنے والے عبارت میں سلجھاؤ، دھیماپن، توازن اور نرمی و شگفتگی سے کام لینا چاہتے تھے۔ ابوالکلام نے اس کے برخلاف "الندوہ"، "الہلال" اور "البلاغ" میں جس انشا پردازی سے کام لیا تھا وہ بڑی پُرزور، گرم اور تند و تیز تھی۔ سرسید نے اپنی سہل نگاری اور سلاست پسندی کے سہارے اردو نثر کو اس سطح سے بہت بلند کر دیا جہاں اُسے سرور اور شہید نے چھوڑا تھا۔ انھوں نے مقفیٰ اور مسجع طرزِ تحریر کو جو تشبیہات اور استعاروں کا انبار بن کر رہ گئی تھی بالکل ترک کر دیا اور عربی اور فارسی کے موٹے موٹے الفاظ نکال کر ان کی جگہ خالص اردو، ہندی اور حسب ضرورت انگریزی لفظ استعمال کئے۔ ابوالکلام آزاد نے یورپ کے دورِ احیا کے علما کی طرح ان کلاسکی اسالیب کی طرف رجعت کو

پسند کیا جن سے کہ اردو ادب کو سرسید اور ان کے رفقاء آگے بڑھا چکے تھے۔ "شئون اسلامیہ" "زعیم" "استلہ داجو بتہا" ، "دسیمہ محوّ" اور "تمجیض" وغیرہ الفاظ عربی کے اچھے عالموں ہی کے پلے پڑسکتے ہیں۔

ابوالکلام آزاد کے مشکل اور دقیق الفاظ کو دیکھ کر یہ رائے قایم کرنا درست نہیں کہ ان کی انشاپردازی مشکل پسندی، آورد اور لفاظی کی نمائش ہے۔ ابوالکلام کی تحریروں میں ایک بھرپور معنویت، ایک تیز اثر انگیزی اور ایک مسحور کردینے والی علمیت کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے انشاپردازی کا ایک نیا سانچہ بنانے کی کوشش کی۔ ابوالکلام آزاد جو پیام لے کر آگے بڑھے تھے۔ وہ ایک خاص لفظیات اور طرزِ تخاطب کا متقاضی تھا جس میں پُرزور الفاظ، بلند آہنگ جملوں اور چمکیلے اور بھڑکتے ہوئے انداز کی ضرورت تھی۔ حسن نظامی نے جو بالکل متضاد اسلوب کے مالک تھے، ابوالکلام کی نثر کی صوری حیثیت کے متعلق لکھا تھا:۔

"باعتبار ظاہر اردو زبان میں اس سے اعلیٰ اور شاندار الفاظ آج تک کوئی جمع نہیں کرسکا۔"

اس کے مقابلے میں مہدی افادی نے ابوالکلام کے اسلوب کے بارے میں سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھا تھا:

"مجھ کو تمام عمر اگر کسی پر رشک آیا ہے تو راپنچی والے پر"

"نکتہ سرائی" کی یہ "ادائے خاص" جس کو "الہلال" نے روشناس کیا تھا اردو ادب کے لیے ایک بالکل نئی چیز تھی جس میں خطابت اور انشاپردازی کی بہت سی تابناکیاں سمٹ آئی تھیں۔ رئیس الاحرار محمد علی نے کہا تھا کہ

"میں نے لیڈری ابوالکلام کی نثر اور اقبال کی شاعری سے سیکھی۔"

سجاد انصاری جو اپنے طرزِ تحریر کی سحر بیت، رنگینی اور بانکپن کی وجہ سے مشہور ہیں، ابوالکلام آزاد کے اسلوبِ بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"میرا عقیدہ ہے کہ اگر قرآن نازل نہ ہوچکا ہوتا یا مولانا ابوالکلام کی نثر اس کے لیے منتخب کی جاتی یا اقبال کی نظم" [1]

---

[1] 'محشرِ خیال' ص ۱۲۹

طپش صدیقی

طوبیٰ

عزمِ جہاں گیر کو فکرِ جہاں دار کو
تا نہ فسردہ ہو سکے ولولۂ جستجو
سلسلۂ شوق ہے رزمِ سرور و سکوں

جذبِ یقیں چاہیئے، سوزِ جنوں چاہیئے
رقصِ دمادم آرزو، ولولۂ فزوں چاہیئے
سلسلۂ شوق کو دردِ درونِ چاہیئے

عشق تجلی نوازِ دیدہ ور و خوش نظر
عشق ازل ہی سے ہے تاجور و کجکلاہ
برگِ گل و خار و خس، مہر و مہ و کہکشاں

عقل جہالت مآب کور دل و کور بیں
عقل ہمیشہ رہی بُردہ دغل و نکتہ چیں
عشق ہر اک رنگ میں، عقل کہیں بھی نہیں

دردِ درونِ نام ہے عشقِ جہاں تاب کا
عشقِ جہاں تاب ہے ضربِ عصائے کلیم
عشقِ جہاں تاب ہے برقِ نبرد و برق پا

عشقِ جہاں تاب ہے جلوۂ بدرِ منیر
عشقِ جہاں تاب ہے زمزمۂ بے نظیر
جس کی گدائی میں ہے عقلِ پریشاں فقیر

تابِ تبِ عشق سے سُرخ رخ و سرفراز
تابِ تبِ عشق سے صحن و در و بام تاج
تابِ تبِ عشق سے گل کدۂ کاشمر

لالۂ لبِ آبجو، شمعِ سرِ انجمن
خلد گہہ رنگ و سنگ معجزۂ فکر و فن
عکسِ بہشتِ بریں، رشکِ سوادِ عدن

عقل فتور و قصور، عشق سرور و حضور
عقل ہے دار الجہاد، عشق ہے دار السلام
عقل ظلوم و جہول بستۂ بند زندگی

عقل صلائے گناہ، عشق پیامِ نجات
عقل کی سو کروٹیں، عشق کی بس ایک بات
عشق علیم و خبیر پردہ درِ کائنات

اے ارم کاشمر اے حرمِ رنگ و نور!
حسنِ تمنا سے ہے خاک تری ارجمند
صبحِ سرِ کوہسار، طورِ جناں در کنار

تیری نگاہوں پہ ہیں فاش بہاروں کے راز
تیری نظر جاں فروز، تیرا نفس دل گداز
نغمہ سرا آبشار فطرتِ آہنگ ساز

تیرے مناظر جمیل، تیرے مظاہر جلیل
خلد نظر ہر طرف سرو و سمن صف بہ صف
سیم براں گل رخاں، زہرہ وشاں دلبرا

تیری فضاء عنبریں، تیری ہوا مشکبار
جامِ زر افشاں بکف، شاخِ گل اکبِ نثار
شانہ بہ شانہ رواں، در چمنِ لالہ کار

بادہ بجامم بریز، نغمہ بجانم بزن
جسمِ من و جانِ تو، جانِ من و جسمِ تو
نقشِ کفِ پائے تو سجدہ گہہِ نوبہار

ساقیۂ گل بدن، مطربۂ خوش نوا
ہم نظر و ہم ادا، ہم نفس و ہم صدا
خاکِ درِ نازِ تو سرمۂ چشمِ صبا

شعلۂ میناستی، لالۂ سیناستی
نور تنی و نور جاں صورتِ طوبیٰ ستی

سلیم تمنائی

ٹوٹ گیا سپنا میرا

رحیا دودھ کی پیالی لئے جیسے ہی بند کمرے کے قریب پہنچی، ہاتھ سے پیالی چھوٹتے چھوٹتے رہ گئی اور اس کے کان کی لویں لال ہوگئیں اور اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر کلیاں کھل گئیں۔

"زبیدہ کو رحیا کی شادی کا بڑا خیال ہے" فریدہ کی ماں کی آواز آئی "کل کے خط میں پھر اس کا ذکر کیا ہے کہ ابا سے کہہ کر۔۔۔۔"

"بیگم مٹھائی کھلاؤ۔ کہیں اب جان کہہ گئیں تم؟"

"چلو بھی اس عمر میں کیا نخرے ہو رہے۔ آپ بھی مجھے اماں جان کہہ لیتے۔" فریدہ کی ماں نے ہنستے ہوئے کہا۔

رحیا ہنسی ضبط نہ کر سکی۔ اپنے منہ پر ہتھیلی رکھ لینے کے باوجود ہنسی کی سی آواز آئی۔

"کون ہے؟ رحیا کیا؟"

"جی! جی" رحیا پریشان ہوگئی "کوئی نہیں بی بی۔"

فریدہ کی ماں اپنی ساری ٹھیک سے اوڑھتے ہوئے میاں کے پاس سے ہٹتے ہوئے بولی "چلی آ رحیا"

رحیا کے پاؤں منوں بھر وزن کے ہو گئے۔ بائیں ہاتھ سے آہستہ سے دروازے کے پٹ کو دھکیلا اور نیچی نظریں کئے ہوئے دودھ کا پیالہ لئے آگے بڑھی۔

"ابھی سے مہندی لگا رکھی ہے کیا پاؤں میں؟" فریدہ کے ابا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ارے رے رے پیالی چھوٹ جائے گی ہاتھ سے" فریدہ کی ماں نے رحیا کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پیالی لے لی اور رحیا بت بنی کھڑی رہی

جب ہٹنے کا حکم ہوا تو دروازے تک وہ کچھوے کی چال چلی پھر ہاتھوں نے جیسے ہی دروازے کے پٹ بھیڑ لئے کچھوا خرگوش میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ تیر کی طرح اپنے کمرے میں پہنچی اور فریدہ بی بی کی تصویر کو چوم لیا۔

"تم کتنی اچھی ہو فریدہ بی بی" اس نے دل ہی دل میں کہا پھر وہ شرما گئی۔ اور شہنائیاں جیسے اس کے تصور میں بجنے لگیں۔ وہ ماضی اور مستقبل کے بیچ تصورات کے بیچ کھڑی تھی۔ اور حال سے بیگانہ تھی۔

فریدہ بی بی کے سہرے کے پھول کھل گئے۔ دولھے والوں نے بی بی کو طرح حسین پایا۔ اکلوتی نازوں پلی بیٹی اور دولت کی دیوی سر سے پیر تک پیلی۔ نہ زیور اور زن کا شمار کیوں نہ حسین ہو۔ اور قابل پرستش۔

فریدہ کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ کیونکہ دولھا بھی خوبصورت تھا اور ناز و نعم میں پلا بڑھا ہوا وہ دوسروں کے بھی ناز اٹھائے گا وہ فریدہ کو دل کی رانی بنائے گا۔

رحیا کو خوشی سے زیادہ دکھ تھا فریدہ بی بی سسرال چلی جائیں گی۔ گھر سونا ہو جائیگا کاٹ کھانے کو آئے گا۔

"فریدہ بی بی تمہیں گھر چھوڑنے کا دکھ نہ ہوگا؟" ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے پوچھ ہی ڈالا

فریدہ کو رحیا کے آنسوؤں میں محبت جاگتی نظر آئی۔ وہ اس سے لپٹ کر بولی "ہر لڑکی کی قسمت میں یہی لکھا ہوتا ہے۔ جانا ہی پڑے گا تو بھی ایک دن چھم چھم جائے گی"

فریدہ دولھنیا شرم و حیا سے چھوئی موئی بنی بیٹھی جائے پلنگ پہ گٹھری بنی پڑی رہی۔ رسم شکرانہ میں رحیا نے زیوروں کی نمائش دیکھی۔ ہر تھالی پیلی ہی پیلی تھی۔

اس کا دل خوشی سے بلیوں اُچھلنے لگا۔ مانو سارے زیور اُسی کے لئے آگئے ہوں! وہ دوڑی گئی دولھنیا کے پاس اور کان میں کُھسر پُھسر کرنے لگی۔ دولھن نے اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے صرف اتنا کہا "دیوانی تیرے بھی آجائیں گے۔ انتظار کر ے۔"

" چھوٹی بی بی " رجیا کو شرم سی محسوس ہوئی۔

اسی رات دولھا کی ماں اور دوسری عورتیں بن ٹھن کر مٹھائی اور پھول لئے چلی آئیں۔ رجیا نے دیکھا کہ ہر ایک نے اپنے آپ کو سج دھج میں دولھن بنا رکھا ہے۔ ان کی بڑی خاطر و مدارت کی گئیں۔ انھیں مخملی فرش پر بٹھایا گیا۔ بیویوں سے منہ میٹھا اور شربت سے حلق تر کیا گیا۔ پھر دولھن کی طلبی ہوئی۔ سبھی آپانی دولھنیا کو ایک موٹی تازی عورت گود میں کھلونے کی طرح اٹھائے چلی آئی۔ مخمل کے زرنگار فرش پر بٹھا دیا گیا۔ دولھن اپنے گھٹنے پر تھوڑی رکھے، سر جھکائے آنکھیں بند کئے خاموش بیٹھی رہی۔ نند نے گلے میں ہار ڈالا، ہاتھوں میں گجرے پہنائے اور ایک روپیہ کو پھول جیسے چہرے سے اتار کر نیچے رکھی ہوئی چاندی کی تھالی میں ٹھن سے ڈالا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے دولھن کے ... اور گالوں کو چھو کر اپنے سر سے لگا نٹ نٹ اُنگلیاں چٹخائیں اور دوسری بی بیوں نے نعرہ لگایا۔

" بچی نندیا سب سے بڑا پیسہ ہے تبھی تو ساری اُنگلیاں بول اٹھی تھیں دولھن ذرا خیال رکھنا اور نہ لڑنا نندیا پیاری ہے۔"

سارے رشتہ دار عب و داب کو چہرے پر نمایاں کئے۔ ذرا اپنا پاؤں آگے بڑھا دولھن کے قریب سرک گئیں۔ کمر سے ایک بالشت بھر لمبی کا تھیلی نکال اور اس میں سے دو مٹھی سونے کی اشرفیاں دولھن پر نچھاور کر دیں اور پیچھے کھسک گئیں۔ اسی طرح باری باری سے کئی عورتوں نے چاندی اور سونے کی اشرفیاں اور نوٹ نچھاور کئے۔ اور دولھن کی آنکھیں بھیگتی چلی گئیں اور رجیا کی بھی آنکھیں بھر آئیں۔

صبح سب کو جگا دیا گیا۔ دولھن کے جسم کا مل کر نہلایا۔ اور بڑا پیارا جوڑا پہنایا گیا۔ چاند سی دولھن کو نظر لگ رہی تھی۔ رجیا دل ہی دل میں واری جا رہی تھی اس کا جی چاہ رہا تھا کہ فریدہ بی بی سے چمٹ جائے اور اس کا چاند سا مکھڑا چوم لے۔

رجیا نے دیکھا کہ آنگن میں ڈلے ہوئے شامیانوں میں دعوتی یکے بعد دیگرے آہستہ آہستہ آ کر بیٹھ رہے تھے دیکھتے ہی دیکھتے شہنائیاں بجنے لگیں اور برات بھی چلی آئی۔ دولھا جیسے ہی موٹر سے اترا اس کے سر سے بھیڑ لگ گئی تیم نا... کے حوالے کی گئی۔ سہرا دولھا کے قدم چوم رہا تھا۔ اور دولھن کی طرح دولھا میاں کو سنبھالے چلے آ رہا تھا۔ وہ ٹھوکر کھاتے کھاتے بچ رہا تھا کوئی زبردستی کا سالا بنا رنگین موصل لئے دولھا کے آگے کھڑا تھا۔ کئی ایک حصہ دار بھی ساتھ تھے۔ دولھا سے بیس روپے کا مطالبہ ہو رہا تھا۔ اور وہ آدھ پچاس بھی دینے پر آمادہ تھا۔ مگر والد محترم لینا جانتے تھے۔ (جیسا کہ جوڑے کے لئے پانچ ہزار کی رقم اینٹھ چکے تھے) دینا خلافِ معمول اور اصول سمجھتے تھے۔ وہ لڑکے والے تھے اور ان واہیات رسم و رواج کو شرعی رو سے ناجائز سمجھتے تھے۔ دولھا کے ایک یار غار نے اس کا اشارہ پا کر دولھا کے والد محترم کو شیشے میں اُتارنے کی کوشش کی۔ بڑی مشکل سے پانچ روپے نکلے اور موصل بردار مچل گئے۔ " ہزار کی دولھن لینے آئے ہو، دس بیس روپے دینے میں جیسے جان نکلی جا رہی ہے۔"

دولھا کے ابا نے غصہ کو پی کر فوراً جواب دیا " سوا لاکھ کا دولھا لائے ہیں۔"

موصل بردار نے تنک کر جواب دیا " ہم ہاتھی کو لے کر کیا کریں۔"

دولھا ہاتھی کا خطاب پا کر بھی سہرے میں مسکرا اٹھا اور دوست کا ہاتھ دبایا دوست نے جھٹ سے دس روپے نکال مٹھی بند کر موصل بردار سے کہا " یہ لیجئے اور سوا لاکھ کو اندر آنے دیجئے ورنہ دولھن اُٹھانے میں دقت ہو گی۔"

" لیکن تمہاری مٹھی میں کتنی رقم ہے؟ "

" اطمینان سے بعد میں دیکھ لینا۔ ورنہ بعد کو پچھتاؤ گے کچھ نہ بن آئے۔ دولھا ٹھہرا سوا لاکھ کا " دوست نے موصل کو ہٹاتے ہوئے کہا " یوں بڑے بڑے شہنیروں کو گھسیٹ کر پھینک دو گے۔"

موصل بردار سارے موصل ہٹانے پر مجبور ہو گئے۔ اور دولھا کے والد محترم نے اللہ کا شکر ادا کر اپنے روپے جیب میں رکھ لئے۔ دولھا کے پیچھے براتیوں کا ایک ریلا آیا۔ اور پانچ منٹ طوفانِ بدتمیزی مچی رہی۔ دولھا میاں مسند پر جلوہ فرما ہوئے قاضی صاحب نے وکیل اور گواہوں کو طلب کیا۔ انھیں پان کے بیڑے دے کر دولھن کی اجازت حاصل کرنے کی خاطر اندر بھیجا۔ دولھن نے ہر سوال پر سسکیاں لیں۔ ماں نے اجازت دی۔ قاضی صاحب نے نکاح پڑھایا۔ کچھ کھجور اور بادام دولھا پر سے نچھاور کئے گئے۔ پھر تحفہ تحائف اور مبارک مبارک کا شور و غل رہا اور دعوتی طعام ماحضر کی خاطر ہزاروں کاموں سے ہاتھ دھو لشت اور بدنی کی طرف متوجہ رہے تھے کہ ہاتھ دھوئیں اور ....

نکاح کے فوراً بعد دولھا اندر لے جایا گیا اور رسم تھی دولھن کی جھلک دکھائی

گئی اور درود شریف پڑھ کر پھونک مارنے کی خواہش بھی کی گئی۔ پھر رات آئی۔ سجے سجائے پلنگ پر دولہا دولہن کو ایک دوسرے کے سامنے بٹھا کر ان کے درمیان آئینہ رکھ دیا گیا اور دونوں کے سر پہ زرنگار کپڑا اوڑھا دیا گیا۔ اب دولہا نے دولہن کی آئینہ میں صورت دیکھی اور اس کی نازک انگلی میں چپکے سے انگوٹھی پہنا دی۔ اب چاروں طرف سے دولہا کو عورتوں نے طرح طرح سے ستایا۔

"کہو بھائی نوشاہ پیارے، عارسی (دولہن) بیٹھی کہ مصری؟"

دولہا مسکرایا اور خاموش۔

"ارے یہ تو دولہن کی طرح شرماتے ہیں!"

"نہیں نہیں بے چارہ گونگا معلوم ہوتا ہے۔ چھی چھی، چاندسی دولہن کے پھوٹے نصیب۔"

"کہہ دو بنے پیارے، مصری میٹھی کہ عارسی۔"

"مصری" دولہا نے مسکرا کر جواب دیا۔

"اوئی ماں، یہ ابھی سے شوہر بنا چاہتا ہے۔ ارے وہ بنے پیارے، تجھ پہ اللہ کی سنوار، کہہ کہ عارسی میٹھی۔"

دولہا مسکرایا "مصری تو چکھی ہے۔ دولہن کو کیری یا مصری کیسے کہہ دوں!"

"اوئی توبہ۔ اس مردوے کے دیدے کا پانی مرگیا ہے۔ اللہ کی سنوار ابھی تو زبان چھوٹی موٹی بنی تھی، ابھی تو شیر ہورہی ہے۔"

اب سلامیوں کی بھرمار شروع ہوئی، ہر پانچ منٹ پہ ایک ایک تھالی میں انگوٹھی، چاندی کے پیالے، روپے وغیرہ زرنگار سرپوش اڑھا کر کوئی لڑکی لے آتی۔ دولہے میاں کو ہر سلامی (تحفہ) کے بدلے کورنش بجالانی پڑتی۔ کبھی کبھی تھالی میں ہڈیاں، گھاس اور سوکھے پتے بھی سرپوش ڈھکے آتے، کبھی نیل اور دودھ کی شیشی، دولہا میاں جھٹ سے کورنش بجالاتے اور ایک قہقہہ پڑتا اور بے جان دولہا میاں شرمندہ ہوکر ناک کو مٹی نہ لگنے کا دعوے کرنے کی کوشش کیا ہی چاہتے کہ قہقہوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا اور یہ ہکلا کر تنکے کی طرح بہہ جاتے۔

رخصتی نے غضب ڈھایا، نازوں پلی دولہن وداع ہورہی تھی۔ یہ دنیا کی ریت تھی۔ مگر بچپن کے ساتھیوں، رفیقوں اور دوستوں سے جدائی اس پر شاق گذر رہی تھی۔ در و دیوار سے حسرت برستی نظر آرہی تھی۔ دولہن سسکیوں پہ آگئی۔ باپ نے گلے لگا، منہ چوما۔ اور اس کا ہاتھ دولہا کے ہاتھ میں دے کر کہا

"نازوں کی پلی عمر بھر کی کمائی تمھیں سونپ رہا ہوں۔ خیال رکھنا۔ نازک کلی۔۔۔ مرجھا۔۔۔ نہ جائے۔" اور دولہا کے والدین سے مخاطب ہوکر بولے۔ آج سے یہ آپ کی۔۔۔ بیٹی ہے۔ اس کے قصور کو قصور نہ سمجھنا اور۔۔۔ اور۔۔۔ گر۔۔۔ر۔۔۔!

وہ آگے کہہ نہ سکے۔ اور روتے ہوئے دستی آنکھوں پر رکھے باہر نکل گئے، پھر دولہن کی ماں کی باری تھی۔ وہ ساس کے ہاتھ میں دولہن کا ہاتھ دے کر رونے لگیں۔ کچھ کہہ نہ سکیں۔

موٹر تیار ہوگئی تو دولہن کو معہ جہیز رخصت کیا گیا۔ رحیما بھی ساتھ ہی رہی تاکہ دولہن کی خدمت ہوسکے۔ اور جی بہل سکے۔ وہ فریدہ سے زیادہ روئی تھی۔ ناز آج اسی کی رخصتی ہوئی ہے۔ اور سب سے بچھڑ رہی ہے۔ جب دولہا کا گھر آگیا تو ساری سواریاں رک گئیں۔ دولہا دولہن کے گھر میں داخل ہونے سے پیشتر نظر بد سے بچانے کے لئے چونے اور ہلدی سے لال پیلا کیا ہوا پانی کٹورے سے بیں ڈال اس میں ایک پان تیرا دونوں پر سے اتار زمین پر پھینک دیا گیا۔ بیچ دالان میں دولہن کو بٹھا دیا گیا۔ فرنی کی تھالی لائی گئی۔ دولہن کی حنائی ہتھیلی میں چمچہ بھر فرنی رکھ دولہا میاں سے کہا گیا کہ زبان سے چاٹیں۔ وہ عورتوں کے سامنے شرما سے گئے۔ مگر ماں کی ڈانٹ پہ چاٹنی ہی پڑی فرنی۔ نند نے ہنس کر کہا۔

"نادیدہ بھیا میرا چاٹ گیا فرنی۔ ارے ناک سے بھی کھائی ہے۔ ہا ہا ہا!"

دولہا بھیا نے ناک پہ نیچے ڈالی اور ہنستا رہا۔ اب دولہن کی باری تھی۔ بے چاری پر ڈانٹ ڈپٹ، لجاجت و خوشامد۔ غرض کسی کا بھی اثر نہ ہوا۔ منہ بند رہا۔ نند نے دولہا کی فرنی لگی انگلی دولہن کے پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں پر رکھ دی۔ چکھ لو ورنہ پچھتاؤ گی۔ یہ دن بار بار نہیں آنے۔"

دولہن کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کی لکیر ابھری، اور گردن شرم سے اور جھک گئی۔

حجلۂ عروسی میں دولہن کو پہنچایا گیا۔ رحیما ساتھ رہی۔ نند نے اسے اشارے سے بلا کر کچھ کان میں کہا۔

"اچھا بی بی۔ میں دالان میں سو جاؤں گی" کہہ کر وہ فریدہ بی بی کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

"فریدہ بی بی فرنی سچ مچ نہیں چکھی کیا؟"

"کمرے میں کوئی دوسرا تو نہیں۔" فریدہ نے گردن اٹھائے بغیر رحیما سے پوچھا۔

"کوئی نہیں۔"

"میری گردن درد کر رہی ہے رحیا۔"

"دبا دوں۔" رحیا نے گردن پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ "سچ مانو آپ کی جھکی گردن دیکھ دیکھ کر میری گردن درد کر رہی ہے۔"

"وہ دن بھی آئیں گے تیرے۔" فریدہ نے رحیا کا ہاتھ گردن سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"چلو بھی فریدہ بی بی۔"

"شرماؤ نہیں بنّو۔"

"بی بی" رحیا نے موضوع بدلا۔ "میں آپ کے نوشاہ کو کس رشتے سے پکاروں"

"انھیں سے پوچھ لینا" فریدہ مسکرائی۔

"اوہ میں تو مر جاؤں گی۔" رحیا سینے پر ہاتھ رکھ کر سانس چھوڑتے ہوئے بولی۔

"آپ ہی پوچھ کر کل صبح بتا دیجیو۔"

"چل شیطان"

"آپ نے نوشاہ کو دیکھا بھی فریدہ بی بی۔"

"نہیں، تو نے دیکھا کیا؟"

"ہاں!"

"کیسے ہیں؟" فریدہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔

"کون کون؟"

"شیطان کہیں کی۔"

"آپ ہی دیکھ لینا، اوہ اللہ، وہ دیکھو چلے آ رہے ہیں۔

"کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے لینا بی بی۔ میں دالان میں سو رہوں گی اور۔۔۔" رحیا نے دولھن کے کان کے قریب منہ لے جا کر آہستہ سے مسکرا کر "آپ کو اللہ پر سونپا" کہا اور اپنا جسم چراتی وہاں سے تیر کی طرح نکل گئی۔ دولھا مسکرایا اور دولھن نے گھونگھٹ اور لمبا کر لیا۔

رحیا نے دولھا کو آہستہ آہستہ دروازہ بند کرتے ہوئے دیکھا۔ اور اس کا دل دھڑکا۔ وہ باوجود کوشش کے سو نہ سکی۔ رات کے کوئی بارہ بجے تھے۔ گھر کے افراد کو بے مقصد ادھر اُدھر آتے جاتے اور ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر مسکراتے دیکھا۔ پھر تھکن نے نشہ آور گولی کا کام کیا اور سب کے سب گھوڑے بیچ کر سو گئے۔ لیکن رحیا کے نیند کا گھوڑا بہت اڑیل تھا۔ جاگتے ہی جاگتے اس نے ایک سانپ کو دیکھا جو رینگتا ہوا حجلۂ عروسی کی طرف بڑھا۔ دروازے کے پٹ سے چمٹ گیا۔

"اُف! میرے خدا" رحیا نے دھڑکتے سینے پر ہاتھ رکھا۔ کوئی چور نہ ہو ایسے موقعوں کی تاک ہی میں رہتے ہیں اچکّے۔ لیکن یہ تو کوئی عورت ہے۔" رحیا کی ڈھارس بندھی۔ اور گئی ہوئی ہمت لوٹ آئی۔

"کون ہے۔" یہ اُٹھ کر آگے بڑھی۔

"جی، میں، تم ابھی تک سوئی نہیں؟"

"اوہ!" رحیا نے آواز پہچان کر کہا۔ "کچھ نہیں بی بی۔ سر میں درد ہے۔ نیند نہیں آتی۔"

جب وہ چلی گئیں تو اُس نے اپنے آپ کہا۔ "آخر بند کمرے کی سوراخوں سے کیوں جھانکا؟" اپنے سوال کا تشفی بخش جواب ابھی نہ پایا تھا کہ ایک دوسرا سایہ رینگتا ہوا کمرے کی طرف بڑھا۔ جھانکا اور رحیا کے کھانسنے پر بھاگ نکلا۔ اس طرح اسی رات کئی سایے متحرک ہوئے اور اس کے دل میں بھی سایہ بننے کی خواہش جاگی۔ مگر دل نے ملامت کی۔ صبح اس نے جب دولھن سے کہا تو "اوئی میرے اللہ" کہہ کر سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

"نند کے علاوہ دوسری کون کون تھیں رحیا۔"

"میں کیا جانوں بی بی۔ بس مہمانوں میں سے تھیں۔"

اب رحیا پہلے ڈرتے ڈرتے پھر کُرید کُرید کر پوچھنے لگی۔

آپ کو نوشاہ میاں سے بات کرتے ڈر تو نہیں لگا بی بی۔ انھوں نے کیا کیا کہا، اور آپ نے کیا جواب دیا۔

"تجھے کیا بتاؤں۔" فریدہ نے رحیا کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ "تیرے سوال کا ہر جواب تیری شادی پر ملے گا۔ سمجھی!"

"چلو بھی فریدہ بی بی۔"

"کچھ دن ٹھہر جا۔ ابّا امّی سے کہہ کر تیرے ہاتھ پیلے کر دوں۔"

فریدہ کو واقعی رحیا کا خیال زیادہ تھا۔ وہ ہر خط میں اس کی شادی پر زور دیتی۔ اس ہفتہ اس نے بڑا زوردار خط لکھا تھا کہ رحیا کی جلد از جلد شادی کر دی جائے رحیا کو فریدہ بی بی اور زیادہ پیاری لگنے لگی۔

"وہ کتنی اچھی ہیں۔ مجھ جیسی ایک یتیم لڑکی کو کتنا چاہتی ہیں۔ فریدہ بی بی جیئے، ہزار سال جیئے۔ نہیں قیامت تک جیئے۔"

رحیا کی منگنی ہو گئی۔ فریدہ بی بی آ نہ سکی۔ دشمنوں کے مزاج ٹھیک نہیں تھے دولہا والوں نے خود رحیا کے چاندی کے پازیب پہنا اپنے بیٹے کے حقوق محفوظ کرا لیے شادی چوتھے مہینے طے پائی۔ فریدہ کے ابّا دوسرے ہی مہینے اپنا فرض پورا کر کے ثواب کی دولت لوٹنا چاہتے تھے۔ مگر دولہا والوں نے نہ مانا۔ ان کو دس پانچ جمع کرنے تھے اور اس میں کافی دیر ہوتی نظر آئی اور ادھر فریدہ کے والد نے زور دیا تو کچھ سوچ کر راضی ہو گئے۔ شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔

فریدہ بی بی نے ایک مہینہ پیشتر آنے کا خیال ظاہر کیا تھا مگر پاؤں بھاری ہونے کے سبب کچھ مزاج بھی بگڑ گئے تھے۔ اس لئے وہ شادی سے چار دن پہلے ہی آ سکیں، رحیا کھل اٹھی۔

"فریدہ بی بی۔ جلدی کیوں نہیں آ گئیں۔"

"کیا کروں، مرض مول لیا ہے۔" پُرمعنی انداز سے مُسکراتے ہوئے کہا

"اتنی جلدی بھی کیا تھی فریدہ بی بی۔" رحیا مسکرائی

"ذرا ٹھہر جا، میں بھی پوچھوں گی۔ تجھے جوڑی ہوں گے جوڑی۔"

"جاؤ بھی فریدہ بی بی۔" وہ شرما گئی۔

"سب کچھ ٹھیک، فریدہ بولی، مگر ابھی تک تجھے منجھا رمانجھے یا مائیوں) کیوں نہ بٹھایا گیا۔ نکاح تک یوں ہی کام دھام کرتی پھرو گی کیا۔ اپنا شکرانہ، وہ نکاح اپنی آنکھوں سے ہی دیکھنے کا ارادہ ہے شاید، کیوں!"

"میں کیا جانوں فریدہ بی بی۔"

"بھئی ہماری امّی کو کیا ہوا۔" فریدہ نے اپنی امّی پر ناراضگی ظاہر کی۔ "جل نہا دھو لے، اور ایک جگہ بھلی دلہنوں کی طرح سر جھکا کے بیٹھ رہ۔"

رحیا کو مانجھے بٹھایا گیا۔ چار دن بعد شکرانہ آیا۔

فریدہ نے زیورات دیکھے اور رحیا کے پاس جا کر ان کی تعریف کی۔ بارات آئی۔ دولہا کی ماں، بہن اور کئی عورتیں رسم کی خاطر آ گئیں۔ فریدہ نے ان کی بڑی خاطر مدارت کیں۔ امّی چیختی ہی رہیں کہ اس حالت میں زیادہ چل پھر نہیں۔ مگر اس نے ایک نہ سُنی۔ دولہن کو رسماً کاندھے پر اٹھا کر لانے والی کوئی نہیں ملی۔ فریدہ ہی نے اس کا ہاتھ پکڑ آہستہ آہستہ اُسے چلا کے لے آئی۔ "اگر مجھ سے ہوتا تو منہ چھپا کر ہی میں اٹھا لے چلتی۔"

ساس نے پھول پہنائے۔ نند اور کچھ عورتیں دوڑتی، چڑھتی، اکنی دولہن پر سے وار کر تھالی میں ڈالتی گئیں۔ کسی نے گرم جوشی نہیں دکھائی۔ کسی کی آنکھیں بول نہ اٹھیں۔ محبت کے گیت نہ گا سکیں۔ البتہ فریدہ نے دولھن کی پیشانی چوم ایک روپیہ وار کے تھالی میں بڑی کھن پیدا کی۔ دولہا والیوں کی نگاہیں تھالی پر جم کر رہ گئیں۔ دولھن کی سسکیاں سنائی دیں اور فریدہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

صبح بہت دیر میں سب کی آنکھیں کھلیں۔ فریدہ نے اپنے آپ کو لعنت ملامت کی اور جاگتی رحیا کو جگایا۔ نہلایا، اس کے کپڑے ٹٹولے، آخر اپنا ایک قیمتی جوڑا پہنا دیا۔

"میرا جی چاہ رہا ہے کہ تجھے دل میں رکھ لوں۔ مگر کیا کروں کوئی دوسرا حقدار پیدا ہو گیا ہے تیرا۔"

رحیا نے شرما کر گردن جھکا لی۔

"مجھ سے شرم، اوہو، ٹھہر ابھی دولہا آیا چاہتا ہے۔ میں اُسے دیکھ بتاؤں گی اور اُسے ساتھ لاؤں گی۔ پھر شرما لینا۔"

رحیا مسکراتی ہوئی پڑیا بن گئی

"رہنے بھی دے بےشرم۔ کل پوچھوں گی کل۔ تو میرے ساتھ آئی تھی۔ آج میں تیرے ساتھ چلوں گی۔ تیرے کمرے کے باہر ٹھیک دروازے کے نیچے دھرنا دے کر بیٹھ رہوں گی۔ کسی کی ہمت نہ ہو گی وہاں آنے کی۔ تو اندر اطمینان سے رہ میاں طرح طرح سے تیری خوشامد کرے گا۔ خوب ستائیو بیکو، بات ہرگز نہ کرنا۔ وہ کہے گا۔ "جانِ بہار۔ رفیقِ حیات، میں تیرا راجہ تو میری رانی، پھر کیوں بات کرتی شرماتی تیرے رُخِ روشن کے دیدار کے لئے کتنا انتظار کرنا پڑا۔ کتنی راتیں آنکھوں میں کاٹنی پڑیں۔ چاند تارے گواہ ہیں میرا یہ تڑپتا ہوا دل اپنی خاموش زبان سے سب کچھ کہہ دے گا۔ چلو اب بتاؤ تمہارے جھگے کر سے نین پیا ملن کو بے قرار تھے یا نہیں کچھ تو بولو، رس گھولو، ایسی مصری سے تم کہیں بچی۔" تو چُپ شاہ کا روزہ رکھ لے۔ وہ آخری حربہ استعمال کرے گا۔ سُنا ہے آپ کے گدگدیاں نہیں ہوتیں۔ "امی میرے اللہ میں مری" نہ کہیو۔ سارے کرے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ سمجھی! اوہ ..... ارے یہ شور و غل کیسا، شاید دولہا آ گیا۔ ذرا دیکھ آؤں دولھن تیرے ان کو۔"

شہنائی اور سہرے کے بغیر ہی دولہا آیا۔ کوئی موصل بردار سالا وہاں نہ تھا ایک پوزہ سرت لگا صدقہ ہو گیا۔ دولت کے ساتھ کئی بے روزگار رنگیلے اَن پڑھ نوجوان تھے۔ گھر کے دالان میں نوشاہ کی مسند تھی۔ وہ وہاں متمکن ہو گیا۔ دعوتی کچھ زیادہ نہیں تھے۔ فریدہ کے ابا کے خاص خاص دوست بھی رونقِ محفل نہیں تھے فریدہ کو کچھ بھی نہ بھایا۔ دولہا سے گھن سی لگی۔ غصہ کا سارا زلزلہ دل ہی دل میں اُلٹ

پڑگیا۔ وہ پھر دیر دروازے کی اوٹ ہی کھڑی رہی۔ پھر من من وزنی پاؤں سے رینگتی ہوئی رجیا کے پاس آئی۔ رجیا کے کان کچھ سننے کے لئے منتظر تھے۔ فریدہ بہ مشکل مسکراتے ہوئے بولی۔

"تیرا دولہا تجھے لینے آگیا ہے۔ میرا پاؤں چوم رہا ہے۔ وہ ٹھوکر کھاتے کھاتے بچ رہا ہے۔ اُسے کوئی سنبھالنے والا چاہئے ہے۔ کوئی زبردستی کا سالا بنا رنگین موصل لئے دولہا کے آگے کھڑا تھا۔ تیرا سسر دل والا ہے۔ اُس نے میرے سسر کی طرح پانچ روپے جیب ہی میں نہیں رکھ لئے بلکہ مٹھی بند کر جانے موصل دار سالے کو تھما دیئے۔ وہ ڈھیروں دعا دیتا ہنستا کھیلتا نوشاہ جے کا نعرہ لگاتا چلا گیا۔ اور وہ دیکھ ماں وکیل اور گواہ چلے آ رہے ہیں۔ کہہ دے "ہاں" میں راضی، میرا خدا راضی، پڑھ دے نکاح جلدی قاضی۔"

رجیا نے مسکرا کر فریدہ بی بی کی گود میں اپنا سر رکھ دیا اور عقیدت و محبت کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

نکاح کے فوراً بعد دولہا نے ماں اور بہن کے حکم سے دولہن کو دیکھنا خاندانی ریت کے خلاف جانا، رسم جلوہ آخر کس مرض کی دوا ہے؟

"ٹھیک ہے" فریدہ بی بی نے رجیا سے کہا۔ میں بھی مانتی ہوں جلوۂ محبت رسم جلوہ میں بھی کچھ زیادہ قابل دید ہوتا ہے اور...... اپنا منہ رجیا کے کان کے قریب لے جا کر بولی "ہمارے اُن کی طرح سب صبر نہیں ہے بھٹی دیر آید درست آید"

رجیا فریدہ کے سینے پر سر رکھ کر مسکرا دی۔

رات آئی۔ فریدہ بی بی نے اپنے ہاتھ سے پلنگ سجایا۔ دولہا دولھن کو اس پر بٹھایا اور ان کے بیچ آئینہ رکھ دونوں کے سر پر زرنگار کپڑا اوڑھا دیا۔ دولہا نے آئینہ میں دولھن کی صورت دیکھی اور سوا پانچ روپے دولھن کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔ پھر گھر کی بوڑھی نوکرانی نے فریدہ بی بی کا اشارہ پاکر نوشاہ سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔

"کہو نوشاہ پیار سے عارس بیٹھی کے مہری، شرماؤ نہیں پیار سے۔"

"بگڑیاں (چوڑیاں) پہن کر نہیں بیٹھا ہوں نانی جو شرماؤں۔"

دولہا نے کڑک کر جواب دیا۔ اور اپنی بڑی بڑی گھنی لمبی اور بٹی ہوئی مونچھوں میں مسکراہٹ کھیل گئی۔

"جیو میرے لال" بوڑھی نوکرانی نے کہا۔ بلہار جاؤں میں تم پہ۔ فریدہ بی بی یہ گنبد کی صدا ہے۔ ایک کہو ہزار سنو۔"

اب سلامی کی باری تھی۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ دولہا کی ماں، بہن اور دوسری رشتہ دار خواتین نے ایک دوسرے سے نگاہوں ہی نگاہوں میں باتیں کیں فریدہ چونکی، اندر گئی، اور تھالی میں ایک خوبصورت گھڑی رکھ کر پیش کرتی ہوئی بولی۔ "یہ دولہا کی دولھن کے لئے میرا حقیر نذرانہ ہے۔" خود اس نے دولھن کی کلائی پر باندھ دیا۔

"بی بی، دولھن کی ماں نے کہا۔ "یہ کہیں سنا اور نہ دیکھا۔ بی بی سلامی تو دولہا کو دی جاتی ہے۔"

"ایک ہی بات ہوئی۔" فریدہ نے دل ہی دل میں کڑھتے مگر بظاہر مسکراتے ہوئے کہا۔ "دولھن جیسی بڑی سلامی ہی ہم نے دے دی ہے۔ اور...... یہ لیجئے۔ اماں جان کی طرف سے دولہا کی خدمت میں دس روپے۔ اور میری جانب سے تیس روپے چلو میاں دولہا بابو کورنش بجا لاؤ...... کم از کم سلام تو کر لو۔"

دولہا میاں نے ماں کی طرف دیکھا

"کر لے، کر لے ایک سلام" ماں نے حکم دیا

"اچھا سلام!" دولہا نے جھٹ سے یوں سلام کیا۔ مانو ناک پر بیٹھی ہوئی مکھی اڑا رہا ہو۔

کچھ دیر خاموش رہیں۔ دولہا کی ماں نے پوچھا۔ "کیوں بی بی۔ سلامی کی رسم ختم ہوگئی یا......"

"ہاں! فریدہ چونکی "یہ اماں جان اور میرے وہ...... یعنی دولھن کے دولہا بھائی کی طرف سے تیس روپے آٹھ آنے قبول فرمایئے۔ چلو دولہا بھائی ایک سلام کر دو، دوسرا ہم نے معاف کیا۔"

اب رخصتی کا وقت تھا۔ دولھن وداع ہو رہی تھی۔ فریدہ سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔ سسکیوں سے ہچکیوں پر آگئی۔ فریدہ نے ضبط کرنے کی لاکھ کوشش کی مگر اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی۔ دیکھنے والوں نے بظاہر مالکہ کو نوکرانی کے ساتھ روتے دیکھا۔ مگر حقیقت میں ایک محبت بھرا دل دوسرے پریم بھرے دل کے لئے رو رہا تھا۔ فریدہ کی ماں نے دولھن کے بجائے بیٹی کو سمجھایا اور آہستہ سے بولیں۔ "دیوانی تو نہیں ہوگئی ہو۔ ایسے بھی کوئی روتے ہیں۔ ماں اپنی بیٹی اور بہن اپنی حقیقی بہن کے لئے نہ روئے اتنا۔"

ماں کی یہ باتیں کڑوی نیم معلوم ہوئیں۔ پاس ادب کی بنا پر کچھ نہ کہہ سکی۔ صرف اتنا کہا۔ "امی جان دولھن کا ہاتھ دولہا کے ہاتھ میں دے دو۔ ابا کہاں ہیں؟"

"نہیں بیٹی" ماں نے کہا۔ "اُن کے مزاج ٹھیک نہیں ہیں۔ انھیں آرام کرنے دو۔"

"بی ساس اور میاں دولھا" فریدہ کی ماں بولیں۔ "ہم تمھیں رجیا کو سونپ رہے ہیں۔ اس کا بھلا بُرا تمھارے ذمے ہے۔"

تانگہ تیار تھا۔ فریدہ رجیا کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی۔ مگر ماں نے پہلے سختی سے اور پھر نرمی سے روکا۔ "بیٹی میں نہ روکتی، تمھیں اجازت دے دیتی۔ مگر اس صورت میں تمھارا جانا ٹھیک نہیں۔ خدا نخواستہ کچھ ہو گیا تو تمھاری سسرال کو کیا منہ دکھاؤں گی" پھر دولھا کی ماں سے مخاطب ہو کر بولیں: "تم ہی بتاؤ اس صورت میں کیسے بھیج سکتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے بی بی" دولھا کی ماں نے کہا۔ "چھوٹی بی بی وہاں دولھن کو کوئی کھا نہیں جائے گا۔ ڈرو نہیں۔"

رجیا کے ساتھ وہ جانے پر مصر تھی۔ کیوں کہ وہ اس کے ساتھ آئی تھی۔ اور اس نے وعدہ بھی کیا تھا۔ وہ ہر طاقت سے لوہا لینا چاہتی تھی۔ مگر ساس نے لال لال آنکھیں دکھائیں اور اُدھر ماں نے میاں نے فریدہ کو بلا بھیجا۔ وہاں سے شکست خوردہ سپاہی کی طرح آہستہ آہستہ آنکھیں پونچھتی ہوئی لوٹی۔ اور دولھن کو تانگہ میں بٹھاتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

"رجیا میں ضرور آتی۔ مگر یہ مرض مول لے لیا ہے۔ تم اب پہلے کی طرح شرما نہ جاؤ گی نا کہ اتنی بھی جلدی کیا تھی فریدہ بی بی۔ ٹھہر جا میں بھی پوچھوں گی۔ تجھے جوڑی ہوں گے جوڑی۔ دیکھ کل صبح گیارہ بجے تانگہ بھجواؤں گی۔ جب تو آئے گی تو تیری طرح میں بھی سب کچھ پوچھ لوں گی۔ مجھ سے چھپا ئیو نہیں رانی۔ میری تمام باتوں کا خیال رکھنا وہ آئے گا۔ تیری خوشامد کرے گا۔ خوب ستائیو بچو کو، وہ کہے گا جانِ بہار رفیقِ حیات......"

"تانگے والے گھوڑا بڑھا دو، کافی رات ہو گئی ہے" دولھا کی ماں نے کہا۔

"چھوٹی بی بی پھر کر لینا باتیں اپنی سہیلی سے۔"

تانگہ دولھن کو لئے آگے بڑھا۔ دولھا کے گھر پہ ہی رُک کر اُس نے دم لیا۔ دولھا، دولھن کو ماں کے اشارے پر گود میں لئے اُترا۔ دولھا دولھن پر سے لال پیلا پانی اُتار پھینکا گیا۔ ایک کمرے میں دونوں کو بٹھا فرنی چٹائی گئی۔ دولھا نے دولھن کی ہتھیلی سے یوں فرنی چاٹ لی۔ مانو کوئی بھوکا پیاسا کُتا ہو۔ دولھن نے دولھا کی کھردری ہتھیلی پر رکھی ہوئی فرنی نہیں کھائی۔ دولھا نے زبردستی اُنگلی منہ میں ٹھونس کھلائی۔

دولھن حجلۂ عروسی میں پہنچا دی گئی۔ چاپیوں چرا کرتے ہوئے پلنگ پر وہ گٹھڑی بنے پڑی رہی۔ ذرا سی حرکت پر پلنگ کے انجر پنجر بول اٹھتے۔ رہ رہ کر کمرے کے دروازے کی طرف ہی دیکھتی رہی۔ بیتے واقعات اس کے دماغ میں رینگنے لگے۔ نہ جانے کون دروازے کی درازوں سے جھانکے۔ فریدہ بی بی بھی نہیں کہ ان کو ڈانٹ کر بھگا دے۔ اور خدا جانے کل صبح کیا کچھ پوچھ ڈالیں وہ۔ ہاں۔ اور.....

دروازے کا پٹ چوں چاں کرتا کچھ کھلا پھر کھٹ سے بند ہو گیا۔ اس کا دل دھڑکا۔ "نہ جانے کون دیکھ گیا۔ ہو سکتا ہے ہوا کی کارگزاری ہو، اگر وہ ہوتے تو؟"

"تمھیں نوشاہ بھیا سے بات کرتے ڈر تو نہیں لگا فریدہ بی بی، انھوں نے کیا کیا کہا، آپ نے کیا کیا جواب دیا۔"

"تجھے کیا بتاؤں۔ تیرے سوال کا ہر جواب تیری شادی پر ملے گا، سمجھی؟"

"چلو بھی، فریدہ بی بی۔"

"میرے اللہ!" رجیا کے حسین خیالات کے تار ٹوٹ گئے۔ دروازہ چوں چرا کرتا کھلا اور بند ہو گیا۔ کچھ دیر اُس نے اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو سنبھالا۔

"میاں طرح طرح سے تیری خوشامد کرے گا۔ خوب ستائیو بچو کو۔ بات ہرگز نہ کرنا۔ وہ کہے گا، جانِ بہار، رفیقِ حیات، میں تیرا راجہ تو میری رانی، پھر بات کرتی کیوں شرماتی۔ تیرے رُخِ روشن کے دیدار کے لئے کتنا انتظار کرنا پڑا۔ کتنی راتیں آنکھوں میں کاٹنی پڑیں۔ چاند تارے گواہ ہیں۔ میرا یہ تڑپتا ہوا دل اپنی خاموش زبان سے سب کچھ کہہ دے گا۔ چلو اب بتاؤ۔ تمھارے بھیگے بھرے نین پیا ملن کو بے قرار تھے یا نہیں، کچھ تو بولو، رس گھولو، جیسی مصری سے تم کہیں میٹھی۔ تو چپ شاہ کا روزہ رکھ لے وہ آخری حربہ استعمال کرے گا۔ سنا ہے آپ کے گدگدیاں نہیں ہوتیں؟ اوئی میرے اللہ میں مری۔ نہ کہیو ورنہ سارے کرے کرائے پر.....

خیالات کے تار پھر ایک بار ٹوٹ گئے۔ اب کی بار دروازہ مسلسل چاپوں چرا چاپوں چرا کرتا ہوا کھلا اور حیرت کی سی دروازہ بھڑنے کی زور دار آواز آئی۔ اندھیرے میں ایک سایہ رینگتا ہوا پلنگ کی طرف بڑھا۔ فریدہ سہمی کبوتری کی طرح بیٹھی رہی زبان گنگ اور ہاتھ پاؤں شل، پلنگ کے انجر پنجر چیخ اٹھے، کراہ اٹھے اور سایہ پلنگ پر بیٹھا نظر آیا۔ پھر بچھونے پر دراز ہو گیا۔

"اُسے اُسے!"

"خوب سنا بہو بچو کو۔ بات ہرگز نہ کرنا۔ وہ کہے گا....."

"اسے بوڑی بلا (بہری بلا) کسے کہہ رہا ہوں میں، شرم ورم چھوڑ۔"

"کچھ تو بولو۔ رس گھولو، بھئی مصری سے کہیں تم میٹھی۔"

اسے! آوازگو بھی؟ دوں ایک تھپڑ۔"

"سنا ہے آپ کی گدگدیاں نہیں ہوتیں۔ اوئی میرے اللہ میں مری نہ..."

"اللہ میں مری۔" رچیا کی زبان سے آخر نکل ہی گیا۔

"عورت بیر کی ہوتی۔ میں شیطان کا بچہ بول دوں اور بات ہی نہیں کرتی لاتاں کے بھوت باتاں سے کہاں مانیں۔ پھر نہ بولی تو ایک اور پڑے گی۔"

"چلو اب بتاؤ تمھارے بھیگے بگرے نین پیا من کو بے قرار کیے یا نہیں۔"

"سن جب صبح ساہوکار صاحب کاں (کے ہاں) جائے گی تو ہمارے سارے زیوراں رکھ جا۔ میرے دوست کی جورو کے ہیں۔ سب گلٹ کے۔ کل واپس کرنا ہے گلٹ نکل گئی تو بڑی (بوم) مارے گا۔ سنی "

"جی۔" رچیا نے انتہائی ضبط سے کام لیتے ہوئے ہونٹ کاٹتے اور آنسو برساتے ہوئے کہا۔

"بڑی آس سے ساہوکار صاحب کے یاں شادی کرکو مرے، کچھ نہ ملا رنڈی کیا بُری تھی۔ ا.... اٹھ پاواں (پاؤں) دبا دے، اٹھ!"

"تیرے رُخِ روشن کے دیدار کے لئے کتنا انتظار کرنا پڑا۔ کتنی راتیں کاٹنی پڑیں۔ چاند تارے گواہ ہیں۔"

"اسے زور سے دبا۔ رو کر دلندر لاگی (دلدّر لگی) نہ منگا۔ چپ رہ"

انتہائی کوشش کے باوجود رانی کے منہ سے راجر کے پیر دباتے ہوئے چیخ نکل ہی گئی۔

"اسے دلندر (دلدّر)" راجر چیخا، اور سینے میں ایک لات رسید کی۔

"اوئی میرے اللہ میں مری۔" رچیا کا سر پلنگ کے انجر پنجر کی مسلسل کراہ کے پلنگ کی پٹری سے کھٹ سے لگا اور اس پر غنودگی طاری ہونے لگی اور اُس وقت کوئی اس کے کان میں چپکے سے کہنے لگا۔

"جب تو آئے گی تو تیری طرح میں بھی سب کچھ پوچھوں گی۔ مجھ سے چھپائیو نہیں رانی۔" (کنڑ سے ترجمہ)

بلقیس ظفیر الحسن

غــــزل

جانے کیا کچھ ہے آج ہونے کو	جی مرا چاہتا ہے رونے کو
غرقِ عصیاں ہے جیب تک	عمر شاید ملی تھی کھونے کو
ایک لمحے کو مسکرائے تھے	سالہا سال خون رونے کو
دیکھ کر غنچہ صبح کا انجام	دلِ غنچہ ہے خون ہونے کو
اپنی ہستی کا حال کیا کہیئے	ہم ہوئے آہ! کچھ نہ ہونے کو

کتنے سادہ ہیں ہم کہ بیٹھے ہیں
داغِ دل آنسوؤں سے دھونے کو

منظر حسن دسنوی

اُڑیا ادب

دنیا کی تمام زبانوں کی طرح اڑیا زبان کی ابتدا بھی شاعری سے ہوئی۔ گریرسن لکھتا ہے۔ "کہ قدیم اڑیا ادب کا ذخیرہ زیادہ تر مذہبی شاعری پر مشتمل ہے" بنگال کے محقق ہری پرشاد شاستری نے نیپال میں ایک کتاب بودھاگن ودوہا کا پتہ لگایا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ بنگالی زبان سے اس قدر ملتی جلتی ہے کہ اسے بنگالی زبان کی قدیم ترین کتاب قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر کارونا کر نے کچھ دنوں کے بعد یہ ثابت کر دیا کہ اس کتاب کی زبان اڑیا سے قریب تر ہے اس لئے دراصل یہ اڑیا کی قدیم ترین کتاب ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کا زمانہ دسویں صدی عیسوی بتایا جاتا ہے۔

پندرھویں صدی کے وسط کی ایک تصنیف منظوم مہابھارت ہے جو نہایت ضخیم ہے۔ اس کی تاریخ یوں مقرر کی جا سکتی ہے کہ اس میں اس زمانے کے حکمران کپی لیندر دیو کا ذکر ہے۔ اس کے بعد سولھویں صدی کی مشہور تصنیف "سومنات برتا کتھا" ہے جو نثر میں لکھی گئی ہے اور جس کے مُصنّف کا نام معلوم نہیں ہے۔ یہ پاٹلی پترا کے بکرماجیت کی کہانی ہے۔

قریب قریب اسی زمانے میں مہابھارت، راماٹی اور بھاگوت، اڑیا زبان کی تینوں رزمیہ نظمیں وجود میں آئیں۔ بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سنسکرت کا بالکل ترجمہ ہے۔ لیکن بغور مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اڑیا شاعروں نے اسے اس طرح اپنا لیا ہے کہ اڑیسہ کے خدوخال اس میں صاف نمایاں ہیں۔ ان شاعروں کے نام سرلا داس، بلرام داس اور جگن ناتھ بالترتیب ہیں۔

اس کے بعد گویا ادب کا دور آتا ہے جس کی بنیاد رام چندر پٹنائک برتاپ رائے اور رگھوناتھ ہری چندن نے ڈالی۔ اس زمانے کی مشہور تصنیفیں ہرابتی، ساسی سینا اور نل چرترا ہیں۔ آخرالذکر نل دمن کے مشہور قصے کی منظوم شکل ہے یہ وہی قصہ ہے جسے فیضی نے فارسی میں مثنوی نل دمن کے نام سے نظم کیا۔ گویا ادب کا زمانہ سترھویں اور اٹھارھویں صدی ہے۔

شری رادھاناتھ رتھ، سابق وزیر تعلیم اڑیسہ ایک جگہ رقمطراز ہیں۔ "پرانے اڑیا شاعروں میں اُپندر بھنج اور دور جدید کے شاعروں میں رادھاناتھ، مدھوسودن اور گنگادھر اور ناول نگاروں میں فقیر موہن اڑیا شاعروں اور مُصنّفین کے خیالات رجحانات اور تصورات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اور اُتکل (اڑیسہ) کے سرسبز اور دلکش مناظر اور باشندگان اڑیسہ کے فنکارانہ طبائع کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں۔" اس مختصر مضمون کو میں ان ہی ادیبوں تک محدود رکھنا چاہتا ہوں۔

اپندر بھنج، دھنن جے بھنج کے پوتے تھے۔ دھنن جے بھنج جنوبی اڑیسہ کی ایک دیسی ریاست کے حکمران تھے اور خود ایک بڑے شاعر تھے۔ ان کی دو کتابیں مشہور ہیں۔ "رگھوناتھ بلاس" جس میں راجہ دسرتھ کے بیٹے راجہ رام چندر کی زندگی کی کہانی بیان کی گئی ہے اور دوسری "مان بجری" جو ایک رومانی داستان ہے۔ یہ بھی زمانے کی ستم ظریفی ہے کہ اپندر بھنج کا باپ نیل کنٹھ تاریخ کا ایک بدنام شخص ہے جو اپنی خود غرضی کی بنا پر خون کی ندیاں بہا چکا ہو۔ لیکن چونکہ اُپندر کی تربیت اپنے دادا کی نگرانی میں ہوئی۔ اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کو اُبھرنے کا موقع ملا اور وہ اڑیا کا سب سے مقبول شاعر ہو سکا اور آج بھی "کوی سمراٹ" (شاعروں کا شہنشاہ) کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

اُپندر کی طویل نظموں میں "کلا کاتوکا" سب سے مشہور ہے۔ اس میں

انھوں نے جگمو ناتھ اور کرشن جی کے سوانح حیات نظم کئے ہیں۔ ایک خصوصیت اس نظم کی یہ ہے کہ اس کی ہر سطر حرف "ک" سے شروع ہوتی ہے۔ ان کی رومانی نظموں کی ایک طویل فہرست ہے جس میں "لبن یاتی" اور "رس لیکھا" قابل ذکر ہیں۔ یہ رومانی نظمیں ایک ہی ساخت کے قصّوں پر مشتمل ہیں یعنی شہزادوں اور شہزادیوں کے عشق و محبت کے قصے یا دیوتاناداوں اور نیم دیوزادوں کی رومانی داستانیں۔ ان قصّوں کے پلاٹ میں بھی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ پہلی نظر میں عشق، پھر ہجر و فراق اور آخر میں وصل۔ اپندر بلاغت کے تمام گُر سے واقف ہے چناں چہ اس کی نظموں میں بلاغت کے نمونے بکھرے پڑے ہیں۔ اس کو الفاظ کے انتخاب کا بڑا سلیقہ ہے ذو معنی الفاظ کا وہ بڑا شائق ہے۔ بہت سے الفاظ ملیں گے جس کے دو معنی نک ہوں اور جس معنی کو بھی ذہن میں رکھئے شعر نیا لطف دے جائے گا۔ صنعت تکرار سے بھی اس نے کام لیا ہے اور اس سے کلام میں ترنم پیدا ہو گیا ہے۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اگر ان نظموں کو لکھیں تو کسی بند کی شکل کنول کے پھول جیسی ہو جائے گی تو دوسرے کی مندر کے شکل جیسی اور تیسرے کی ڈھول جیسی، ان صنعتوں کے علاوہ اور بھی بہت سے صنائع بدائع کا استعمال اس شاعر نے کیا ہے۔ اس نے مختصر نظمیں مثلاً "چوتیسا" اور "چوپادی" بھی لکھی ہیں اور یہ نظمیں بھی بہت کامیاب ہیں۔

اڑیا ادب کے دورِ جدید کی ابتدا اس زمانے میں ہوئی۔ جب اڑیسہ میں انگریزوں کی عملداری شروع ہوئی۔ انگریزی طریقۂ تعلیم اڑیا ادب پر اثر انداز ہوا۔ انگریزی شاعری کے مطالعے نے شاعری کا رُخ موڑا۔ فطرت کے سحر کن مناظر شعرا کے ذہن پر اثر انداز ہونے لگے۔ ان اثرات کا نتیجہ رادھاناتھ، مدھوسودن اور گنگا دھر کی شاعری پر ظاہر ہے۔

شاعر رادھاناتھ ۱۸۴۹ء میں پیدا ہوئے بچپن ہی سے ان کی صحت خراب تھی اس کے باوجود انھوں نے اسکول انسپکٹر کا سرکاری عہدہ قبول کر لیا۔ اس سلسلے میں انھیں صوبے کا دورہ کرنا پڑا اور اڑیسہ کی شاداب سرزمین کا بغور مشاہدہ کیا۔ چناں چہ جب وہ چلکا جھیل کے کنارے مقیم تھے تو اُن کی مشہور نظم "چلکا" معرضِ وجود میں آئی۔ چلکا کی پُر سکون سطح آب نے شاعر کو اڑیسہ کی قدیم عظمت کی یاد دلائی۔ اُن کے تصوّر کی آنکھوں نے وہ منظر دیکھا جب پرشوتم دیو اسی جھیل سے کشتی کا بیڑا لے کر کانچی گیا اور وہاں کی شہزادی پدما وتی کو بیاہ لایا شاعر کے دماغ میں وہ زمانہ بھی آیا جب کچھ حملہ آور اسی جھیل کے کنارے اڑیسہ کو تباہ کرنے کے لئے اُترے۔ نظم کے آخر میں شاعر تصوّر کی دنیا سے حقیقت کی دنیا کی طرف لوٹتا ہے۔

مدھوسودن ایک صوفی شاعر ہے۔ اسے مذہب میں غلو تھا۔ "خالق اور مخلوقات" اس کا پسندیدہ موضوع تھا۔ مناظرِ فطرت سے وہ متاثر تھا لیکن فطرت کی بوقلمونی میں اُسے خالق کے کرشمے نظر آتے تھے۔ وہ فطرت کے مناظر کو صرف شاعرانہ انداز میں بیان کر دینے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اُن کی تخلیق کے رازہائے سربستہ کے انکشاف کی بھی کوشش کرتا ہے اپنی تمام نظموں خصوصاً "بسنت گیتا"، "آنکل گیتا" "برسا" "مسرت" میں ایک نظریہ قائم کرتا ہے کہ خدا ہی تمام تخلیقات کا منبع اور سرچشمہ ہے اس لئے مناظرِ قدرت خود پنہاں ہیں۔

ان شاعروں کے بعد گنگادھر مہر کا زمانہ آتا ہے۔ اس شاعر کا موضوعِ شاعری بھی فطرت ہی ہے لیکن زاویۂ نگاہ ذرا مختلف ہے۔ مناظرِ فطرت میں روح کی موجودگی کا وہ قائل ہے۔ فطرت شاعر کی ہمدم و مونس ہے اس سے گفتگو ہو سکتی ہے، اس سے ہمدردی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ شاعر کی نظم "تاپسوینی" کے چند بند ملاحظہ کیجئے یا "کیچا کا بادھ" کے چند اشعار پر غور کیجئے تو معلوم ہو جائے گا کہ شاعر کو فطرت سے کس قدر محبت ہے "تاپسوینی" میں شاعر اس دور کی تصویر پیش کرتا ہے جب سیتا (رام چندر کی بیوی) تنہا جنگل میں رہ جاتی ہے اور رونا شروع کرتی ہے جنگل اس کے غم میں شریک ہے اور تیز و تند ہوا اسے تسلّی دیتی ہے۔ ندیاں تیزی سے رواں دواں ہیں گویا سیتا کو انتقام پر آمادہ کرتی ہیں۔ شاعر نے ماحول کو سیتا کے غم کا ترجمان بنا دیا ہے۔ اسی شاعر کی ایک دوسری نظم "پرانیا بلندی" ہے جس میں راجہ دُسمنت اور شکنتلا کی محبت کی کہانی کا بیان ہے۔ نظم کی ابتدا دسمنت اور شکنتلا کی پہلی ملاقات سے ہوتی ہے۔ اس حالت میں جب کہ دونوں میں محبت کی باتیں ہو رہی ہیں، فطرت ان کی ممد و معاون ہے۔ بہار آ جاتی ہے۔ پھول کھل جاتے ہیں۔ ہوائیں محوِ خرام ہیں۔ شہد کی مکھیاں اس پھول سے اڑ کر اس پھول پر جا بیٹھتی ہیں۔ غرض فطرت بھی ان کی محبت سے لُطف اندوز ہو رہی ہے۔

اُنیسویں صدی کے وسط میں اڑیا ناول وجود میں آیا۔ اس سے پہلے برج ناتھ کی کہانی "چتر ونود" قسم کی کچھ کہانیاں موجود تھیں لیکن اسے ناول نہیں کہہ سکتے۔ اُمیش چندر سرکار نے ایک ناول "پدما مالی" لکھنے کی کوشش کی لیکن وہ صرف ایک کوشش ہی تھی اور فنّی نقطۂ نظر سے اسے ناول نہیں کہا جا سکتا۔ اڑیا کا پہلا اور سب سے زیادہ کامیاب ناول نگار فقیر موہن ہے

بالاسور کا رہنے والا تھا۔ کسی اسکول میں ماسٹر تھا پھر ترقی کرکے ایک دیسی ریاست کا دیوان ہو گیا۔ بچپن ہی سے یہ ایک داستان گو مشہور تھا۔ اس نے اڑیا ناول کا رتبہ بلند کیا۔ پنڈت نیل کنٹھ داس پرو چانسلر آتکل یونی ورسٹی لکھتے ہیں۔

"ناول نگاری میں فقیر موہن کا جانشین اب تک نہ ہو سکا۔" فقیر موہن کے چار ناولوں نے شہرتِ مدام حاصل کرلی ہے۔ "چھما آٹھ گنٹھ" "مامون" "لچھما" اور "پرائشچیت" مصنّف کی شہرت کے ضامن ہیں۔ "چھما آٹھ گنٹھ" ایک گاؤں کے ایک نورباف جاگیہ اور اس کی بیوی سرلا کی کہانی ہے۔ چمپا گاؤں کی ایک لڑکی ہے۔ جس کی مدد سے ایک آوارہ شخص منگراج ان کی پُرسکون زندگی میں مُخل ہوتا ہے اور آٹھ گنٹھ زمین پر غاصبانہ قبضہ کرلیتا ہے۔ ناول کے آخر میں منگراج پاگل ہو جاتا ہے اور چمپا مر جاتی ہے۔ ناول میں جا بجا طنز و مزاح کی چاشنی ہے۔

"مامون" نربری اور سربری نامی دو بچوّں کے ماموں کی کہانی ہے۔ کٹک کچہری کا ایک ناظر مر جاتا ہے اور دو بچّے چھوڑ جاتا ہے۔ نتابر انھیں بچوں کا ماموں ہے۔ وہ ان کی جائداد پر قابض ہو جاتا ہے۔ آخر میں وہ جیل جاتا ہے اور بچّوں کو جائداد واپس مل جاتی ہے۔ "لچھما" ایک تاریخی ناول ہے جس میں اڑیسہ میں مرہٹہ دورِ حکومت کے ظلم و استبداد کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ "پرائشچیت" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مکافاتِ عمل کی تشریح ہے۔

ان ناولوں کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مصنّف "شاعرانہ انصاف" کا قائل ہے یعنی یہ کہ بدمعاش کیفرِ کردار کو ضرور ہی پہنچے گا اور نیک آدمی اپنی نیکی کا صلہ پائے گا۔

موجودہ دور میں متعدد شعرا اور مصنّفین بہت کچھ لکھ رہے ہیں اور ان سے بڑی اُمیدیں وابستہ ہیں۔

ضروری گذارش

۱۔ مضمون پورے سائز کے کاغذ کے ایک طرف، صاف اور خوش خط لکھا ہوا ہونا چاہیئے

۲۔ غیر مطبوعہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جائیں گے جب ان کے ساتھ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ بھیجے جائیں گے۔



دن بھر کاغذ پھاڑنا اِن کا کام ہے !

اس لئے نہیں کہ یہ توڑ پھوڑ کے عادی ہیں۔ ان کا کام ہی یہی ہے۔ کاغذ کے ہزاروں ورق پھاڑ پھاڑ کے سائنس کی رُو سے اِن کی مضبوطی جانچنا!

سرورق، ڈبوں، پیٹیوں اور پیکنگ کے ہر سازوسامان کی مضبوطی کی جانچ پرکھ، ہندوستان لیور میں باقاعدہ کی جاتی ہے۔ اور جہاں تک مصنوعات کا تعلق ہے ان پہ بھی لگاتار نہایت کڑی نظر رکھی جاتی ہے۔ کچے مال سے لیکر مصنوعات کی تیاری کے آخری مرحلہ تک سائنسدان اور ماہر جانکار ان کے تحفظ میں مصروف رہتے ہیں۔

یہ کڑی دیکھ بھال آخر کس لئے؟ اس لئے کہ ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان لیور کی مصنوعات کو آپ اپنے مستقل اعلیٰ معیار کے باعث ہی خریدتے ہیں۔ انہیں برقرار رکھنے کا یہی طریقہ ہے کہ قدم قدم پہ ان کی نگرانی کی جائے۔ اس نگرانی کی بدولت بیش بہا قومی دولت کی بچت بھی ہوتی ہے اور مصنوعات بنانے کے قیمتی وقت کی بھی!

ہندوستان لیور کا آدرش — گھر گھر کی خدمت

HLL. 16.X32 UD

ابوالکلام نمبر کے باب میں

پروفیسر رشید احمد صدیقی

--------- والانامہ صادر ہوا جس میں آپ نے 'آج کل' کے ابوالکلام نمبر پر میری رائے طلب فرمائی ہے مجھے تو تقریباً سبھی مضامین پسند آئے۔ "تقریباً" یوں کہ بعض دلچسپ بھی معلوم ہوئے یعنی ان میں مرحوم سے عقیدت و محبت کے اظہار کے ساتھ جہاں تہاں وہ التزام بھی ملتا تھا جس کی طرف غالب نے اشارہ کیا ہے۔

رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوننشاں کے لیے!

بہرحال لکھنے والوں میں جو شخص جس ذوق اور ظرف کا تھا اس کا اظہار بیش و کم اس کی تحریر میں ملا۔ مسز ارونا آصف علی کا پیغام خاص طور پر وقیع معلوم ہوا۔ کتنے سادے اور مختصر الفاظ میں کتنی اچھی اور سچی باتیں کہہ دیں۔ اب تک ان کو ایک مخلص، نڈر اور کار آزمودہ سیاسی شخصیت کی حیثیت دیتا تھا۔ اب یہ معلوم ہوا کہ ان کو تاریخی عوامل اور تہذیبی اقدار کا بھی کتنا صالح اور صحت مند شعور ہے!

دوسری بات یہ کہنی تھی اور سب سے پہلے کہنے کی تھی کہ اس نمبر کے سرورق پر آپ نے مولانا کی جو تصویر چھاپی ہے وہ چاہے آپ کو کہیں سے ملی ہو اور چاہے کتنی "ذوفنی" ہو یکسر غلط اور بھی "ہے۔ میں تصویر شناسی کے فن سے بے بہرہ ہوں اس لئے اس تصویر کے بارے میں جو ناسزا کلمے لکھ گیا اس کے لئے ارباب فن سے خواستگار معافی ہوں۔ میرے سامنے مولانا کا غیر معمولی باوقار چہرہ اور اس کے حسین و متناسب خدوخال تھے۔ مجھے کیا معلوم کہ فن کے حضور میں ان خوبیوں کی کیا وقعت تھی۔ پھر یہ کہ کسی کی وفات پر جو تصویر شائع کی جاتی ہے وہ رحلت کے قریب سے قریب زمانے کی ہوتی ہے اور ہونی چاہئے۔ جس سے بالعموم لوگ آشنا ہوتے ہیں نہ کہ بعید سے بعید یا اس سے کچھ قریب زمانے کی جس سے کم اشخاص واقف ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک تو یہ کہیں بہتر ہوتا کہ آپ سرورق پر وہ شاندار تصویر شائع کرتے جو محمد اجمل خاں صاحب کا عطیہ ہے اور اسی نمبر کے صفحہ ۷۵ پر شائع ہوئی ہے اور سرورق کی تصویر کو کہیں اندر کے صفحات میں جگہ دیتے۔

بایں ہمہ مجھے اس امر کا اقرار ہے کہ مرحوم کے بارے میں آپ نے معلومات اور تاثرات کا بڑا قابل قدر ذخیرہ یکجا کر دیا ہے۔ اس شمارے کی ترتیب و تہذیب میں آپ کو بڑے اچھے اور مستند اصحاب کا تعاون حاصل رہا ہے۔ جس کے لئے آپ اور آپ کے رفقائے کار تہنیت اور تشکر کے مستحق ہیں۔ آپ سب کو اس مشکل اور مبارک کام کی تکمیل میں کتنی زحمت اٹھانی پڑی ہوگی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے لیکن جو مقصد پیشِ نظر تھا وہ پورا ہو جانے پر یہ زحمتیں اب کتنی خوشگوار معلوم ہوتی ہوں گی۔ جب مجھے بغیر زحمت اٹھائے ہوئے معلوم ہوتی ہیں تو آپ کو کیوں نہ ہوتی ہوں گی۔

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ یہ عریضہ محض آپ کے ارشاد کی تعمیل میں لکھا گیا ہے۔ ممکن ہے اس میں بعض ایسی باتیں راہ پاگئی ہوں جن کا شائع کرنا آج کل کے مقاصد یا مصالح کے منافی ہو۔ مجھے بالکل اس پر اصرار نہیں ہے کہ ان کی خلاف ورزی کی جائے۔ آپ بے تکلف اس عریضے کو تلف فرما کر مجھے شکریے کا خط لکھ دیجئے گا جس کو میں تلف نہ کروں گا!

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی

یوں تو "آج کل" کا ہر شمارہ اپنے پیشرو سے بڑھ چڑھ کر ہوتا آیا ہے لیکن اُس کا "ابوالکلام شمارہ" اوروں سے بمراتب بہتر و برتر ہے اور مرحوم و مغفور مولانا آزاد کی بزرگ اور بلند شخصیت کے ہر لحاظ سے شایانِ شان ہے۔ یہ یادگار شمارہ نظم و نثر کا ایک ایسا قابل قدر مجموعہ ہے جس کی تعریف و توصیف کا پورا پورا حق ادا کرنا بہت مشکل ہے۔ جو مضمون اس مجموعے میں شامل ہیں ملک کے برآوردہ بزرگوں کے تاثرات کا آئینہ ہیں۔ لکھنے والوں کے طرز ادا میں کچھ فرق ہونا تو ضروری ہے لیکن دلوں کا وہ جذبہ جس نے یہ تحریریں لکھوائی ہیں سب میں یکساں ہے۔ اصحاب ادارہ نے اس مجلّے کی ترتیب و تدوین میں جس محنت اور حسن مذاق سے کام لیا ہے وہ مدح و ثنا اور مبارکباد کا مستحق ہے۔

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت ہمایوں کبیر صاحب کے الفاظ میں عہد آفریں شخصیت تھی۔ رسالہ "آج کل" دہلی نے ابوالکلام آزاد نمبر نکال کر گاگر میں ساگر بھر دیا۔ کوزے میں سمندر بند کر دیا۔ مولانا مرحوم کی عظیم اور متنوع شخصیت کے تمام پہلو نمایاں ہو گئے ہیں۔ یہ نمبر ہر لحاظ سے گراں مایہ اور قابل قدر ہے۔

جناب ظفر حسین خاں

"آج کل" کا "ابوالکلام نمبر" موصول ہوا۔ ماشاء اللہ صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے آپ نے پیش کیا ہے۔ دلی مبارکباد عرض ہے۔

مولانا غلام رسول مہر

نمبر ملا اور طبیعت بے حد خوش ہوئی۔ جو کچھ اب تک میری نظر سے گزر چکا ہے کہہ سکتا ہوں کہ ایسا اہتمام اور ایسی جامعیت کہیں بھی نظر نہیں آئی۔ پھر آپ کے پاس وقت بھی کم تھا۔ مولانا کی ذاتِ گرامی کا ذکر ہو تو بڑے بڑے اصحابِ قلم اور اصحابِ زبان کے حوصلہ تحریر و تقریر پر افسردگی سی چھا جاتی ہے۔ آپ نے جو کچھ کیا وہ ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ جزا دے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری

"آج کل" کا ابوالکلام نمبر عنایت ہوا۔ اسے بے حد شوق سے پڑھا۔ یہ نمبر نہایت ہی سلیقے سے مرتب ہوا ہے۔ مولانا کی زندگی ایک عہد ہے۔ بھارت کی آزادی کے سلسلے میں مولانا نے اتنا کچھ کیا ہے کہ ایک خاص نمبر میں ان کا عہد سمویا نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن اسے ادارت کا سلیقہ کہنا چاہیئے کہ مضامین ایسے شامل کئے ہیں۔ جن سے مولانا کی زندگی کے سارے پہلو سامنے آ جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی قابلِ تعریف ہے کہ سارے مضامین مشہور اہلِ قلم حضرات کے لکھے ہوئے ہیں۔

مضامین کے انتخاب کی طرح تصاویر میں بھی یہ خوبی ہے کہ مولانا کے عنفوان شباب سے ان کے آخری ایام تک کے اہم نقوش سامنے آ جاتے ہیں۔ مولانا پر آئندہ لکھنے والوں اور اردو کی ادبی تاریخ کے لئے یہ رسالہ یقین ہے کہ ایک حوالے کی کتاب بن جائے گا۔

پروفیسر تلوک چند محروم

"آج کل" کا "آزاد نمبر" مل چکا ہے۔ جس غرض کے لئے یہ نمبر شائع کیا گیا ہے اُسے بطرز احسن پورا کرتا ہے۔ یعنی ابوالکلام کی زندگی، ان کے فضل و کمال اور ان کی سیرت پر بیر حاصل مضامین خوش سلیقگی سے یکجا کئے گئے ہیں۔ نظموں کی بلند پائگی اُس عظیم المرتبت انسان کے رتبہ سے ہم آہنگ ہے۔ غرض ہر لحاظ سے یہ نمبر بھی حسبِ معمول کامیاب ہے اور ادارہ اس کی اشاعت پر مبارکباد کا مستحق ہے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

آپ کا مرسلہ "آج کل" کا خصوصی نمبر مل گیا۔ ماشاء اللہ خوب نمبر نکالا ہے۔ مولانا کی جامع زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں رہا جو روشنی میں نہ آ گیا ہو۔ بہرحال مولانا پر آئندہ بہت کچھ لکھا جائے گا اور اب بھی لکھا جا رہا ہے لیکن آپ نے ایک ایسا متن تیار کر دیا ہے کہ آئندہ جو کچھ لکھا جائے گا وہ اس کی شرح ہو گی۔ تصاویر مولانا کے خطوط کے عکس اور گٹ اپ ان چیزوں کے متعلق تو کچھ کہنا ہی نہیں "آج کل" کا خاص نمبر ایک سے ایک بڑھ کر ہوتا ہے اور اس اعتبار سے اس ماہنامے نے ہند و پاک کے ادبی رسائل میں جو بلند مقام حاصل کر لیا ہے۔ وہ ہماری حکومت اور اس ملک کی روایات کے بالکل شایانِ شان ہے۔ میں آپ کو اور سب ارکان ادارہ کو اس پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

Epoch

آج کل

اہلِ نظر کی نظر میں

'آج کل' آج کل خوب نکل رہا ہے۔ خصوصاً موسیقی نمبر تو ایسا نکلا کہ پاک و ہند کا کوئی ادبی رسالہ اب تک ایسا نمبر پیش نہیں کر سکا، کیا باعتبارِ فن اور کیا بلحاظ تاریخ فن۔ یہ ترتیب کا کمال ہے۔ خدا آپ لوگوں کا حامی ہو۔ آپ حقیقت میں زبانِ اردو کے محسن ہیں۔
(عبدالمجید سالک)

'آج کل' ان رسالوں میں ہے جو ہر طبقے کے پڑھنے والوں کے لئے کچھ نہ کچھ دل چسپی کا سامان ضرور مہیا کرتے ہیں۔ رسالے کی ادبی حیثیت بہت اچھی ہے۔ اس کے مقالے اور نظمیں بیشتر معیاری ہوتی ہیں۔ ظاہری حسن یعنی کاغذ چھپائی اور تصویروں کے اعتبار سے کوئی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ (مسعود حسن رضوی)

'آج کل' کا موسیقی نمبر دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ اس فن پر خصوصی نمبر نکالنا آسان بات نہ تھی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو جمع و ترتیبِ مضامین میں کن کن صبر آزما منزلوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ آپ کے ذوق و انتخاب دونوں کی داد دیتا ہوں۔
(نیاز فتحپوری)

میں 'آج کل' کو ہمیشہ بہت دل چسپی سے پڑھتا ہوں۔ اس میں اکثر قابل قدر مضامین اور نظمیں شائع ہوتی ہیں۔ علاوہ معنوی خوبیوں کے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بحیثیت مجموعی اس کی لکھائی اور چھپائی وغیرہ بھی خوش مذاقی کا ثبوت دیتی ہیں۔ ہمارے بہت سے رسالے تو اس ظاہری حسن سے بھی عاری ہیں۔ (غلام السیدین)

رسالہ آج کل علمی، لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔ (فراق گورکھپوری)

'آج کل' کا بجا طور پر اردو کے بہترین رسالوں میں شمار ہے۔ اس کے بیشتر مضامین نثر پُر مغز اور دل چسپ معلومات سے لبریز ہوتے ہیں۔ گھناؤنے بیہودہ افسانوں سے اس کا دامن پاک رہتا ہے۔ نظم کے حصے میں بھی ایک امتیازی شان ہوتی ہے۔
(اثر لکھنوی)

'آج کل' اردو کے ان چند مقبول رسالوں میں سے ہے جو ہر ادبی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے عام نمبروں میں علاوہ معلوماتِ عامہ پر مفید مضامین کے ادبی تنقیدیں اور تذکرے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں اور اس میں بلند پایہ نظموں اور پُر کیف غزلوں کا بھی ایک گلدستہ ہوتا ہے۔ (آلِ احمد سرور)

'آج کل' کے لئے میں نے لوگوں کو بے تاب اور منتظر پایا ہے۔ اچھے ادبی اور تنقیدی مضامین تو اس میں شائع ہوتے ہی رہتے ہیں، اکثر ایسے علمی، تہذیبی، فنی اور معلوماتی مضامین بھی نکلتے ہیں جو دوسرے رسائل میں نظر نہیں آتے۔ اس کا یہ تنوع ہی اسے ہر دل عزیز بناتا ہے۔ (احتشام حسین)

فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے	بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکریٹریٹ دہلی	سالانہ چھ روپے

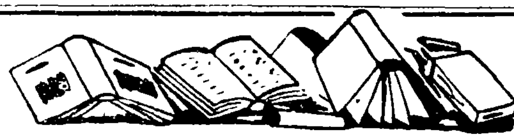
Edited and Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi

Regd. No. D—509





ہماری کتابیں



نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
پنڈت نہرو سے بات چیت	دو روپے	۵۰ نئے پیسے
دیس دیس کی لوک کہانیاں	۷۵ نئے پیسے	۲۵ نئے پیسے
بھارت کی لوک کہانیاں	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
اپنے گھر کو آگ سے بچائیں	۷۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
ہماری کامیابیاں اور نئی منزلیں	۶۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی	۷۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
ناپ تول کا میٹری نظام	۳۵ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
بھارت نئے سکے	۲۵ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
کیلنڈر کی اصلاح	۴۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے

نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
جواہر لال نہرو کی تقریریں (۱)، (۲)، (۳)، (۴)، (۵)	۱۰ نئے پیسے (فی کاپی)	۵ نئے پیسے (فی کاپی)

ہندوستان ترقی کی راہ پر

نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
نئے سماجی نظام کی جانب	۱۰ نئے پیسے فی کاپی	۵ نئے پیسے فی کاپی
آبپاشی اور بجلی		
ہمارے پلان اور سوشلزم		
صنعتی ترقی		
خوراک اور زراعت		
رسل و رسائل		

(رجسٹری خرچ الگ)

پچیس ۲۵ روپے یا اس سے زیادہ کی کتابوں پر ڈاک خرچ نہیں لیا جائے گا قیمت پیشگی اور پوسٹل آرڈر کے ذریعے بھیجنے سے آسانی رہتی ہے

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸

اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آج کل

دہلی

ترتیب

سرورق ع 'دنیا ہے یہ اک بساطِ شطرنج' (ایک پرانی کانگڑہ پینٹنگ)

مجلسِ ادارت

محمد مجیب	جامعہ ملیہ دہلی
محی الدین قادری زور	حیدرآباد
گوپی ناتھ امن	دہلی
خواجہ احمد فاروقی	دہلی
رحمان راہی	سری نگر

یو، ایس موہن راؤ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن
جی، این، ایس راگھون ڈپٹی ڈائرکٹر (ایڈیٹوریل)
جی نجف ناتھ ڈپٹی ڈائرکٹر (پروڈکشن)

بال مکند عرش ایڈیٹر شعبۂ اردو، سیکرٹری
(مدیر مسئول)

اسسٹنٹ ایڈیٹر: مظفر شاہ

دسمبر ۱۹۵۸ء
اگرہائن پوس شک سمت ۱۸۸۰

جلد ۱۷ - نمبر ۵

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں:- چھ روپے
پاکستان میں:- چھ روپے (پاک)
غیر ممالک سے: نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- ہندوستان میں:- ۵۰ نئے پیسے
پاکستان میں:- آٹھ آنے (پاک)

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر 'آج کل اردو' اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

مُلاحظات

ایشیا میں یکے بعد دیگرے کئی ملکوں میں فوجی انقلاب برپا ہو چکے ہیں۔ عراق میں فوجی انقلاب کے ذریعہ شہنشاہی کا خاتمہ ہوا۔ انڈونیشیا اور برما میں حکومت نے اپنے آپ ہی زمامِ کار فوج کے حوالے کر دی۔ پاکستان اور تھائی لینڈ میں فوج نے خود حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ یہ انقلاب ہر جگہ مختلف قسم کے حالات میں ظہور پذیر ہوئے ہیں اور ہر جگہ صورتِ حال کو بہتر بنانے کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کہیں یہ انقلاب خوش آئند ثابت ہوں اور کہیں جمہوریت کا خاتمہ ہی ہو جائے۔ بہر حال ایشیا میں فوجی انقلابات کی یہ رَو جمہوری دنیا کے لئے تشویش کا باعث ضرور ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان انقلابات کا آخری نتیجہ کیا ہوگا۔

الجیریا کے آزادی پسندوں کی طرف سے حال ہی میں صلح کی جو پیش کش کی گئی ہے اس کے بارے میں جنرل ڈیگال نے کہا ہے کہ جو لوگ فرانس کی اعلیٰ کمان سے رابطہ پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ الجیریا میں ایسا کر سکتے ہیں۔ جو لوگ نیلا جھنڈا لے کر آئیں گے ان کا باعزت طریقے سے خیر مقدم کیا جائے گا۔ جنرل ڈیگال نے صلح کی گفت و شنید کے لئے پیرس آنے والے الجیریا کے قوم پرستوں کی جان کی حفاظت کی ذمہ داری بھی لی ہے۔

جنرل ڈیگال کی اس پیش کش کو خوش آئند سمجھا جا رہا ہے اور اقوامِ متحدہ میں اس پر اطمینان کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرانس اپنی نوآبادیوں کے بارے میں ذرا اور آزاد پالیسی اختیار کرنا چاہتا ہے۔

فارموسا میں امریکی وزیرِ خارجہ اور جنرل چیانگ کائی شیک کی گفتگو کے بعد جو مشترکہ اعلان شائع ہوا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ کوموائے اور ماتسو کے جزیروں کا دفاع فارموسا کے دفاع کے لئے ضروری ہے۔ اعلان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ دونوں حکومتیں مل کر کمیونسٹ چین کی جارحانہ کارروائیوں کا مقابلہ کریں گی۔ اس اعلان سے مشرقِ بعید کے امن و سلامتی کے استحکام میں کوئی فائدہ پہونچنے کا امکان نہیں۔ دوسری طرف چین کی حکومت اس کو اندرونی معاملہ سمجھتی ہے اور امریکہ کو فریقِ معاملہ سمجھ کر گفتگو کرنے کو تیار نہیں بلکہ اس کا مطالبہ ہے کہ امریکہ کو چین کے اندرونی معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیئے۔

ہندوستان نے سوشلسٹ طرز کا سماج بنانے کا بیڑہ اُٹھایا ہے اور حکومت کی یہی کوشش ہے کہ ہر قدم اسی منزل کی طرف بڑھے۔ حال ہی میں وزیرِ اعظم پنڈت نہرو نے حیدرآباد میں تقریر کرتے ہوئے پُر زور الفاظ میں کہا کہ سوشلسٹ طرز کے سماج کی منزل کو ہر وقت اپنے سامنے رکھا جائے اور کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیئے جس کی اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو۔ حالات کے مطابق اس کی طرف بڑھنے کی رفتار سست یا تیز ہو سکتی ہے مگر ہمارا رُخ ہمیشہ اسی طرف رہنا چاہیئے۔

کیتھولک عیسائیوں کے مقتدائے اعظم پوپ پائس دوازدہم کا انتقال ہو گیا۔ مذہبی پیشوا کی حیثیت سے آپ بڑے ہر دل عزیز تھے۔ آپ عالمی امن کے زبردست حامی تھے اور اس کے لئے برابر کوشاں رہے۔

سعادت علی خاں

مشرقِ قریب

مشرقِ قریب کے عرب ملکوں کے سفر کا مجھے کئی بار اتفاق ہوا ہے۔ بحیرۂ روم کے ساحلوں پر آباد شہروں کی دلکشی مجھے ہمیشہ لبھاتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی مجھے موقع ملا میں پر تول کر ان شہروں کی پرواز کے لئے روانہ ہو گیا۔ بحیرۂ روم ایک تاریخی سمندر ہے اور اس کی صاف و شفاف لہریں زندگی کو جولانی بخشتی رہی ہیں۔ اس نیلگوں سمندر کی لہروں نے شاعروں کے تخیل کی آبیاری کی ہے اور سینکڑوں تاریخی کارواں اس کے سینے پر سے گذرتے تھے اور ساحلوں پر اپنے نقوش چھوڑتے گئے ہیں۔ اس کے کناروں پر سلطنتیں بنتی اور ٹوٹتی رہیں۔ انسانیت نوازی بھی کی گئی اور مجروح بھی ہوئی۔ اس کے ساحلوں پر وہ تاریخی لڑائیاں لڑی گئیں جن سے انسانیت کی زندگی بدل گئی۔ مشرقی و مغربی تہذیبوں کا تصادم اسی سرزمین پر ہوا اور یہیں سے علم و عمل کے وہ سوتے پھوٹے جو مغربی نشاۃ ثانیہ کا باعث بنے۔

ان ملکوں میں سب سے پہلے مجھے مصر جانے کا اتفاق ہوا۔ پہلی بار جب میں اقوام متحدہ کے اجلاس سے واپس ہوتے ہوئے قاہرہ پہنچا تو یہ احساس جاگ اٹھا کہ میں بھی ایک ایسے ہی قدیم ملک کا باشندہ ہوں جس کا تمدن صدیوں پہلے زمانہ پر اپنے نقوش ثبت کر چکا ہے۔ جہاں زمانۂ قدیم میں تاریخ کی عظیم لڑائیاں لڑی گئیں۔

قاہرہ ایک رنگین شہر ہے جہاں زندگی کی گہما گہمی رات بھر جاری رہتی ہے۔ اس کی بڑی بڑی دوکانیں بونڈ اسٹریٹ اور ففتھ ایونیو کی دکانوں کا مقابلہ کر سکتی ہیں اور اس کی تنگ و تاریک گلیاں، ایشیاء کے غربت و افلاس کی نمائندہ ہیں۔ یہ دنیائے عرب کا سب سے بڑا شہر ہے۔ جہاں قدیم و جدید کا خوشگوار امتزاج ہوا ہے۔ قاہرہ کے مضافات میں جدید وضع کے خوش نما بنگلے ہیں۔ جہاں امیر اور خوش حال لوگ رہتے ہیں۔ سڑکیں کشادہ اور منور ہیں۔ عورتیں اور مرد صاف ستھرے یوروپی لباسوں میں ملبوس گھنٹوں کافی ہاؤس میں گپ ہانکنے میں مصروف رہتے ہیں۔ مگر قاہرہ اصل میں مشرقی شہر ہے۔ لمبے لمبے جبے اور ترپوش پہنے لوگ آپ کو جا بجا نظر آئیں گے۔

یہاں دو مشہور یونی ورسٹیاں ہیں ایک تو الازہر ہے اور دوسری قاہرہ یونی ورسٹی اور ایک بہت بڑا عجائب خانہ بھی ہے۔ جہاں دنیا بھر کے نادرات رکھے ہوئے ہیں۔ ایک طرف دولت و امارت کی فراوانی ہے تو دوسری طرف غربت و افلاس ہے اور حکومت اسی کو مٹانے میں لگی ہوئی ہے۔

عظیم دریائے نیل زمانوں کے انقلاب سے بے پروا اسی پر وقار انداز میں رواں دواں ہے۔ اس کے ساحلوں پر بڑی بڑی کشتیاں سامان لادے مسلسل گشت کرتی رہتی ہیں۔

مصر کے وسیع ریگستان میں عظیم الشان ابوالہول اس طرح کھڑے نظر آتے ہیں جیسے اس سرزمین کی پاسبانی کر رہے ہوں اور صدیوں سے اس طرح کھڑے زمانے کے اونچ نیچ کے تماشائی ہیں۔ اہرام اور ابوالہول قدیم مصری تہذیب کے نمائندہ اور اس تہذیب کے فلسفۂ موت اور حیات بعد الموت کو اجاگر کرتے ہیں۔ ایک طرف غریب عوام پیروں تلے کچلے جاتے تھے تو دوسری طرف فراعنۂ مصر اپنے آپ کو لازوال بنانے کے لئے اپنی لاشوں کی پائندگی کا اہتمام کرتے تھے۔ شاہی جنازے کو ہزاروں من پتھروں کی تہ بہ تہ چادروں کے نیچے رکھا جاتا تھا۔ اس پر بھی خزانے کے متلاشی وہاں پہنچتے رہے ہیں۔ پروفیسر کیلے نے لکھا ہے کہ قبر چور شاہ شعیب Cheops کی ابدی آرام گاہ تک پہنچ گئے اور محفوظ شدہ لاش

اور آس پاس کا خوبصورت منظر۔ بائرن نے بھی ڈان جان میں اس سانحہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ قدیم مصر کے عجائبات اس تہذیب و تمدن کی یاد دلاتے ہیں جو صدیوں تک یہاں نشو و نما پاتا رہا ہے۔

جب بھی میں مصر گیا قاہرہ ہی نے مجھے اپنا مسحور بنائے رکھا اور مجھے بالائی مصر میں جانے کا موقع نہ مل سکا۔ پچھلی بار حکومتِ مصر نے مجھے اور میری بیوی کو مصر آنے کی دعوت دی۔ اتفاق سے ان دنوں سوئز سے برطانیہ کے تخلیہ کی خوشی میں جشن منایا جا رہا تھا۔ ہر طرف چراغاں کی سی کیفیت تھی اور ساری مصری قوم خوشیاں منا رہی تھی۔ حکومت کی طرف سے منعقد کی گئی عظیم الشان تقریبوں میں شرکت کا موقع ملا۔ قاہرہ میں ہمارے یہ دس دن بڑے ہی لطف و مسرت میں گذرے۔ قاہرہ میں مجھے مفتیِ اعظم امین الحسینی اور مراکش کے مشہور و معروف قائد شہزادہ عبدالکریم سے ملنے کا موقع ملا۔

مفتیِ اعظم دنیائے عرب میں ایک ہر دل عزیز شخصیت کے مالک ہیں اور خاص طور پر فلسطین میں ان کے معتقد زیادہ ہیں وہ ذہین اور خوش خلق انسان ہیں۔ ان کی نرم گفتاری کا مقابلہ جب ان کی گرمیٔ جستجو سے کیا جاتا ہے تو اکثر کو ان کی شخصیت ایک معمہ نظر آتی ہے۔ مفتیِ اعظم نے ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات اور ان کے مستقبل سے تعلق خاطر اور پنڈت نہرو کی قیادت پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا مگر انھیں یہ شبہ ہے کہ پنڈت نہرو کے بعد کیا ہوگا۔ میں نے ان کے شبہات یہ کہہ کر دور کر دیئے کہ ہندوستان ایک سیکولر اسٹیٹ ہے اور مفتیِ اعظم کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہندوستان کے مسلمان اپنی خبرگیری آپ کرنے کے قابل ہیں۔ میں نے اجمالاً تقسیم سے پہلے کے واقعات اور جہدِ آزادی کی تاریخ انھیں سنائی اور بتایا کہ کس طرح قومی کانگریس کے جھنڈے تلے ہندو اور مسلمان آزادی کی لڑائی دوش بدوش لڑتے رہے۔ مفتیِ اعظم بڑی دلچسپی سے یہ واقعات سنتے رہے۔

شہزادہ عبدالکریم ضعیف العمر شخص ہیں ان کی عمر ۸۰ سال سے زیادہ ہے مگر اب بھی چاق و چست نظر آتے ہیں۔ ہم نے الجیریا اور نوآبادیاتی نظام پر بات چیت کی۔ شہزادہ صاحب نے پوچھا: "کیا پنڈت نہرو پرتگال کے سلسلہ میں اپنی حکمتِ عملی بدل سکیں گے؟" ان کی رائے میں "گوا کو صرف قوت سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے" شہزادہ نے یہ بھی کہا: "میں لاطینی سامراجیت کو پنڈت نہرو سے زیادہ جانتا اور سمجھتا ہوں۔"

شہزادہ عبدالکریم ایک افسانوی شخصیت ہیں۔ انھوں نے ایک طویل عرصہ فرانسیسی جیلوں میں گذارا۔ ۱۹۴۷ء میں ایک فرانسیسی جہاز میں انھیں لے جایا جا رہا تھا۔ جب جہاز پورٹ سعید پہنچا تو وہ کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وقت سے وہ مصری حکومت کی حفاظت میں ہیں اور قاہرہ میں ایک پناہ گزیں کی حیثیت سے اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ فرانسیسی مائیں اپنے ضدی بچوں کو ان کا نام لے کر چپ کراتی تھیں۔ جہدِ آزادی کے اس معمر سپاہی کے کچھ خواب تو حقیقت بن چکے ہیں اور محبانِ آزادی کی عزت و تکریم بھی انھیں حاصل ہے۔

قاہرہ سے ہم شرقِ اردن کے فلسطینی علاقہ میں پہنچے۔ بیت المقدس، انجیلِ مقدس کی سرزمین ہے اور یہاں دنیا کے تین بڑے مذہبوں کے مقدس مقامات ہیں۔ بیت المقدس میں ہمارا قیام مختصر تھا اس لئے ہم نے جلد جلد سارے اہم مقامات دیکھ ڈالے۔ مسجدِ عمر کے بعد ہم نے اس مقام کو بھی دیکھا جہاں حضرت عیسیٰ اہلِ دنیا کی گمراہی پر رو پڑے تھے اور جہاں انھیں گرفتار کیا گیا۔ ان کی عبادت گاہ اور وہ پتھر جہاں ان کے نقشِ قدم ثبت ہیں اور جہاں سے وہ جنت راہی ہوئے تھے۔ وہ مشہور گلی بھی دیکھی جسے "راہِ صلیب" کہا جاتا ہے۔ اس گلی میں حضرت عیسیٰ کے سر پر صلیب دے کر گذارا گیا تھا۔ اب بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت مسیح اس بوجھ کو اٹھائے اس گلی میں گزر رہے ہیں اور ان کے مقدس قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔

گنبدِ اقصیٰ کی عظیم الشان عمارت ہر زائر کو متاثر کرتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم نے اپنے چہیتے بیٹے حضرت اسمٰعیل کی قربانی دینی چاہی تھی۔ شام ہو گئی جب ہم یہ سب دیکھ کر اپنے ہوٹل لوٹے تو ہوا خنک تھی، ہوٹل سے سامنے کا نظارہ بہت اچھا لگتا تھا۔ چٹانیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں، اور سڑکوں کے برقی قمقمے ان پر اپنی روشنی پھیلائے ہوئے تھے۔

بیت المقدس میں لاکھوں ہی عرب مہاجرین ہیں جو فلسطین سے نکالے گئے ہیں اور یہاں پناہ گزیں ہیں۔ ان کی حالت ناگفتہ بہ ہے اور بغیر کسی خوشگوار مستقبل کی امید کے زندگی گذار رہے ہیں۔ بے کاری اور افلاس سے ان کی اخلاقی حالت بگڑ سی گئی ہے۔ اسرائیل انھیں واپس لینے کو تیار نہیں۔ اور عرب ان کی آباد کاری کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکے ہیں۔ اس کے اسباب بلاشبہ سیاسی ہیں۔ ہم کچھ دن بعد پھر بیت المقدس آنے کا خیال لئے یروشلم سے بیروت روانہ ہو گئے۔ جیسے ہی ہمارا ہوائی جہاز بیروت کے مضافات میں پہنچا بادلوں نے چٹانوں کو ڈھک لیا اور وہ نظروں سے چھپ گئے۔ ہوائی جہاز کئی چکر لگانے کے بعد زمین پر اترا۔

آج کل دہلی

بیروت بحیرۂ روم کے کنارے ایک پُر رونق شہر ہے جو اپنی رنگین راتوں اور نائٹ کلبوں کی وجہ سے مشہور ہے یہ ایک تجارتی شہر ہے اور تجارت ہی کی وجہ سے یہاں کی زندگی عام طور پر خوشحال ہے۔ یہاں ایسے بھی بڑے بڑے تاجر ہیں۔ جن کی آمدنی حکومت کی آمدنی سے زیادہ اور جن کے نوکروں کی تعداد حکومت کے نوکروں سے زیادہ ہے۔ یہاں پھٹے حال لوگ نظر نہیں آتے بلکہ ہر طرف خوشحال اور خوش پوشاک ہی لوگ دکھائی دیتے ہیں۔ لبنان کی آبادی ۱۵ لاکھ سے بھی کم ہے اور یہاں کے لوگ مہم پسند بھی ہیں۔ نیویارک جنوبی امریکہ، مصر اور دنیا کے دوسرے حصّوں میں لبنانی موجود ہیں اور اپنی محنت شاقہ کی وجہ سے ہمیشہ خوشحال رہتے ہیں جو کچھ بچ رہتا ہے اپنے خاندان کی مدد کے لئے لبنان بھیج دیتے ہیں۔ سال بھر دنیا بھر کے مسافر لبنان آتے رہتے ہیں۔ اس طرح بیرونی زرمبادلہ کا موقف مستحکم ہے۔ بیروت مشرقِ قریب کا سب سے بڑا خرید و فروخت کا مرکز ہے جہاں دکانوں میں ہر قسم کی چیزیں سستے داموں مل سکتی ہیں۔ یہاں کے ہوٹل اور ریستوراں بھی بہت صاف ستھرے اور کھانوں کے لحاظ سے بڑا تنوع رکھتے ہیں اور کھانے بھی بڑے لذیذ ہوتے ہیں۔

ہم دمشق جانے کے لئے اپنا رختِ سفر باندھ رہے تھے کہ ہوٹل کے بوائے نے اطلاع دی کہ ایک صاحب ہم سے ملنے آئے ہیں۔ میں جب نیچے پہنچا تو وہاں ڈاکٹر برازی کھڑے تھے۔ ان سے دہلی میں انڈو پاکستان مشاعرہ میں ملاقات ہوئی تھی۔ یہ ڈاکٹر برازی اپنی شاندار ۔۔۔ سے ہمیں ہوائی اڈہ پر لینے آئے تھے۔ مگر کسی غلط فہمی کی بنا پر وقت پر نہ پہنچ سکے اور اب ہمیں تلاش کرتے ہوئے ہوٹل پہنچے تھے۔ بڑی خندہ پیشانی سے ملے وہ فرانسیسی تیزی سے بول رہے تھے اور ہمارے اس طرح مل جانے پر بے حد خوش تھے۔ وہ مُصر تھے کہ ہم انھیں کے ساتھ موٹر میں دمشق چلیں۔ میں نے انگریزی میں ان سے کہا کہ میری فرانسیسی کمزور ہے اور عربی بھی شُد بُد ہی جانتا ہوں۔ بہرحال ان کے ساتھ ہم دمشق کے لئے روانہ ہوگئے۔ ہم جب بیروت شہر سے باہر پہنچے تو ڈاکٹر برازی نے پہلے فرانسیسی اور پھر عربی میں بات چیت شروع کی مگر پندرہ منٹ کے بعد ہی زبانوں کی اجنبیت کی وجہ سے اظہارِ خیال کی دشواری کو ہم نے محسوس کر لیا۔ ڈاکٹر برازی آخر ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنے لگے۔ بار بار وہ یہی کہتے تھے "دہلی بہت ہی خوبصورت شہر ہے میں پھر وہاں آؤں گا"

ہم رومتہ الکبریٰ کے کھنڈروں میں پہنچے تو مجھے علامہ اقبال کا وہ مشہور مصرع یاد آگیا۔

"سوادِ رومتہ الکبریٰ میں دلّی یاد آتی ہے"

ان عظیم الشان کھنڈروں میں وہ تہذیب دفن ہے جس نے کبھی دنیا پر اپنا سکّہ بٹھا دیا تھا۔ بال بیک میں وہاں کے میئر شہر نے جو ڈاکٹر برازی کا دوست تھا ہمیں لنچ پر مدعو کیا۔ کھانے کے دوران میں میئر شہر اور ڈاکٹر برازی تو مقامی حالات پر بات چیت کرتے رہے۔ ہم نے ترجمان سے باتیں کیں جو انگریزی بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے پنڈت نہرو سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بال بیک کے بیسیوں گھروں میں پنڈت جی کی تصویر نمایاں مقام پر رکھی نظر آئے گی۔

دمشق ریگستانی بندرگاہ ہے۔ حاجیوں کے قافلے مکّہ جاتے ہوئے یہاں صدیوں سے ٹھہرتے رہے ہیں۔ یہ مسجدوں درگاہوں اور میناروں کا شہر ہے۔ دمشق کے قیام کے دوران میں زیادہ وقت ڈاکٹر عمر ابو ریشہ کے ساتھ گذرا جو اس وقت ہندوستان میں شام کے سفیر اور اب یونائیٹڈ عرب ری پبلک کے سفیر ہیں۔ ڈاکٹر عمر بڑے عالم ہونے کے علاوہ شاعر بھی ہیں۔ ایک پیدائشی عرب کی طرح وہ بھی زندگی سے زیادہ آزادی کے دلدادہ ہیں۔ اپنے ملک کی آزادی کے سلسلہ میں انھوں نے بڑے مصائب برداشت کئے۔ مگر خاکسار ایسے ہیں کہ کبھی ان واقعات کا ذکر بھی نہیں کرتے۔ وہ بہت اچھے مقرر بھی ہیں اور عربی زبان کے بہت بڑے ماہر اور ادیب۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ عرب شاعروں میں ان کا کوئی مقابل نہیں۔

دمشق میں ایک اور عالم سے بھی ملاقات ہوئی جو ڈاکٹر عمر کے بڑے گہرے دوست اور سابق میں وزیر زراعت رہ چکے ہیں۔ یہ ڈاکٹر ملکی ہیں۔ میں ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ ان میں ذرا بھی علمی تکبّر نہیں۔ حالانکہ ایک عالم کی حیثیت سے ان کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی ہے۔

مجھے وہ ایک شام کبھی نہ بھولے گی۔ جو ڈاکٹر عمر اور ڈاکٹر ملکی کی صحبت میں زہلہ میں گذری۔ یہ مقام شام اور لبنان کی سرحد پر واقع ہے۔ یہاں کافی ہاؤس کے چبوترے سے لگی ہوئی ایک نہر گذرتی ہے اور اس کے اوپر انگور کی بیلیں ہیں۔ یہ منظر بہت ہی دلکش تھا۔ یہاں ہم گھنٹوں بیٹھے عربی کھانے کھاتے اور گپ لڑاتے رہے۔ ڈاکٹر عمر بے مثل میزبان ہیں۔ جب ہم جدا ہو رہے تھے تو ہمیں یہ وعدہ کرنا پڑا کہ ہم پھر شام آئیں گے اور زیادہ دن اُن کے ساتھ گذاریں گے اور اس طرح مختصر

قیام کرکے آئندہ کسی ملک کی توہین نہ کریں گے۔

دہلی سے ہم بیروت لوٹے اور وہاں سے ہوائی جہاز میں بغداد جا پہنچے۔ ہوائی اڈہ پہ ہمارے میزبان سفرانی ہمیں لینے کے لئے موجود تھے۔ سفرانی عراق میں ہندوستان کے سفارتی افسر ہیں وہ ہمیں اپنے گھر لے گئے اور کسی طرح یہ مانتے تھے کہ ہم ہوٹل میں قیام کریں۔

سفرانی حیدرآبادی ہیں اور نیتاجی سبھاش بوس کے رفیقوں میں سے ایک۔ انھوں نے نیتاجی کے ساتھ جرمنی سے جاپان تک آبدوز کشتی میں سفر کیا تھا۔ جو (۲۱) دن میں جاپان پہنچی تھی۔ وہ جنگ کے دوران میں جرمنی میں طالب علم تھے کہ نیتاجی سے ان کی ملاقات ہوئی اور وہ ان کے ساتھ ہوگئے۔ وہ جرمن زبان اچھی طرح بولتے ہیں۔ جب وہ چین کے سفارت گھر میں تھے تو انھوں نے وہاں چینی سیکھی اور اب بغداد میں عربی سیکھ رہے ہیں۔

بغداد جس نے ابھی شاہی کے جوئے کو اتار پھینکا ہے۔ اس وقت معاہدۂ بغداد کا گھر تھا اور اس معاہدے نے اسے شہرت دے رکھی تھی اب یہاں خلفائے عباسیہ کے زمانے کی سی رونق اور رنگینی تو نہیں پھر بھی جدید بغداد مغربی طرز کا شہر ہے۔ جہاں بڑی بڑی دوکانیں، بلند عمارتیں اور بڑے بڑے ہوٹل ہیں۔ یہاں دجلہ فرات بھی زیر یہ خاموش تماشائی کی طرح صدیوں سے سرگرم خرام ہیں انھوں نے بغداد کے بیسوں انقلاب دیکھے اور اب ایک نیا انقلاب بھی دیکھا بغداد میں اب جو خوب نظر قدیم عمارتیں ہیں، کاظمین شریف کی مسجد اور درگاہ ہیں جو شہر سے قریب ہی ہیں۔ درگاہ کے میناروں پر سونے کے غلاف چڑھے ہیں اندازہ ہے کہ منوں سونا اس پر چڑھا ہوگا۔

ہم نے "نجف اشرف" اور کربلائے معلی پر بھی حاضری دی۔ کربلائے معلی میں حضرت امام حسین اور نجف اشرف میں حضرت علی کے مزار مقدس ہیں۔ یہ دونوں مقام ہزاروں زائرین کی زیارت گاہ ہیں۔ جو دنیا کے گوشہ گوشہ سے یہاں حاضری دیتے ہیں۔ نجف اشرف پہنچنے کے لئے ریگستان میں سے ہوکر گزرنا پڑتا ہے۔ نجف اشرف کے قریب پہنچے تو مزار مقدس کے میناروں کا سونا دھوپ میں اس طرح چمکتا ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔

تیل کی دریافت نے مشرق قریب کی دولت میں اضافہ کر دیا ہے مگر اس کے ساتھ ہی بہت سے مسائل اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اور یہ علاقہ مغربی سیاست کی فریب کاریوں کی آماجگاہ بن گیا ہے۔ میں نے اپنے سفر کے دوران میں ہر جگہ یہ محسوس کیا کہ عرب ممالک کے عوام تو افلاس و تنگ دستی کا شکار ہیں اور حکومتی طبقہ موج منا رہا ہے۔ ہر جگہ کے عوام کے دلوں میں مغرب سے بیزاری اور نفرت کا جذبہ موجود ہے۔ بیروت اور خود عراق میں لوگ معاہدۂ بغداد کے خلاف باتیں کرتے تھے اور ہتھیاروں سے زیادہ بہتر معیار زندگی کے خواہاں تھے۔ چناں چہ عراق کا حالیہ انقلاب اور بیروت میں انقلاب پسندوں کی مہم انھیں جذبات کی آئینہ دار ہے اور یہی جذبات کم و بیش ساری دنیائے عرب میں موجود ہیں جو تنزل پذیر شاہی اور مغربی سامراجیت دونوں کو نکالنا چاہتے ہیں۔ مشرق قریب کی سرزمین جو کبھی دنیا کی رشد و ہدایت کی سرزمین تھی، اب پھر انگڑائی لے رہی ہے اور عوام دوست تحریکیں ابھر رہی ہیں۔ ایسی تحریکیں جو اس علاقے کے تنزل کو عروج و ترقی میں بدلنے کی ضامن ہیں۔

عبدالمجید حیرت

غزل

معلوم نہ تھا چارۂ غم ہو نہ سکے گا
اتنا بھی عزیزوں سے کرم ہو نہ سکے گا

معلوم نہ تھا اپنی ہی روداد محبت
لکھیں گے تو اک حرف رقم ہو نہ سکے گا

معلوم نہ تھا ٹوٹ کے شیرازۂ الفت
بکھرے گا کچھ ایسا کہ بہم ہو نہ سکے گا

معلوم نہ تھا آئے گا وہ وقت بھی ہم پر
جب ہم سے مداوائے الم ہو نہ سکے گا

معلوم نہ تھا آئیں گی کچھ ایسی بھی گھڑیاں
جب صبر بہ اندازۂ غم ہو نہ سکے گا

معلوم نہ تھا چارہ گروں کی بھی دعا سے
وہ درد جو سینے میں ہے، کم ہو نہ سکے گا

معلوم نہ تھا اپنی شب غم کا اندھیرا
سورج کی شعاعوں میں بھی ختم ہو نہ سکے گا

معلوم نہ تھا فتنہ طرازوں کو کہ حیرت
بہکا بھی تو آوارہ قلم ہو نہ سکے گا

عرش ملسیانی

شطرنج

یہ دل چسپ کھیل قریب قریب دنیا کے ہر ملک میں مشہور ہے۔ تفریح کے کھیلوں میں اس کا جواب نہیں۔ شطرنج کھیلنے سے غور کرنے کی عادت پڑتی ہے اور سوچنے کی قوت بڑھتی ہے۔

شطرنج کی وجہ تسمیہ کے باب میں مختلف روایات ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ لفظ 'صد رنج' کا معرب ہے کیونکہ اس کھیل میں غور و فکر بہت کرنا پڑتا ہے۔ بعض کا قول ہے کہ یہ لفظ 'شط' اور 'رنج' سے مرکب ہے۔ شط بمعنی دریا اور رنج بمعنی فکر۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہ لفظ اصل میں 'شترنگ' ہے۔ یعنی دشمن پر فتح۔ ایک توجیہ یہ بھی ہے کہ شطرنج اصل میں 'چترنگ' ہے۔ چترنگی سینا اس فوج کو کہتے ہیں جس میں چار قسم کی سینا رتھ، ہاتھی، گھوڑے اور پیدل ہوتے ہیں۔ چونکہ اس کھیل میں ان ناموں کے مہرے ہوتے ہیں اس سبب سے یہ توجیہہ بھی قابل قبول نظر آتی ہے۔ بعض اس کو 'شدرنج' سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی شطرنج کھیلتے وقت آدمی ہر قسم کا رنج بھول جاتا ہے۔

اس میں چھ قسم کے مہرے ہیں۔ شاہ، وزیر، فیل، گھوڑا، رخ اور پیدل اس رعایت سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اصل نام 'شش رنگ' ہوگا۔

مختلف مؤرخوں نے اسے چین، ایران اور مصر کی ایجاد بتایا ہے لیکن ڈبلیو جونس نے اپنے مرتب کردہ رسالہ شطرنج میں لکھا ہے کہ یہ کھیل اہل ہند کی ایجاد ہے۔ اس کے ثبوت میں فردوسی کے شاہنامے کو پیش کیا ہے جس میں ذکر آتا ہے کہ قنوج کے راجا نے نوشیروان شاہ ایران کے پاس بہت سے ہندوستان کے تحائف بھیجے تھے۔ ان میں شطرنج بھی ایک تحفہ تھا جس کو بزرجمہر وزیر نوشیرواں نے حل کر کے اس کے موجد کی دانشمندی کی داد دی اور اس کے جواب میں تحفہ نرد جو اسی طریق سے کھیلا جاتا ہے ہندوستان میں بھجوایا۔

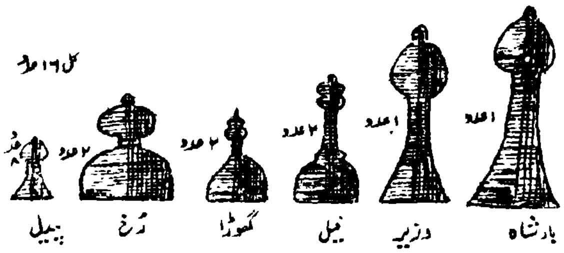
بعض کی رائے ہے کہ ہند کے چودہ ہزار برہمنوں نے مل کر اس کھیل کو ایجاد کیا تھا۔ بعض حکیم مجلاتی کو اس کھیل کا موجد قرار دیتے ہیں۔ مسٹر ٹریگ سٹس اپنی انگریزی کتاب میں لکھتے ہیں کہ اس کو یونان کے ایک فلاسفر فلنی میڈز نے ایجاد کیا تھا۔ فلنی میڈز کے معنی ہیں 'انصاف کا عاشق'۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فلنی میڈز وہی شخص ہے جس کو فردوسی بزرجمہر لکھتا ہے۔ جس کے معنی ہیں "بڑا منصف"۔ یونانی میں میڈز کے وہی معنی ہیں جو فارسی میں مہر کے ہیں۔ مسٹر ڈبلیو جونس کا قول ہے کہ اس کھیل کی موجد لنکا کے راجہ راون کی رانی مندودری تھی جو خلوت میں اپنے شوہر سے شطرنج کھیل کر اس کو معرکۂ رزم کی مشق کراتی تھی۔

ایک اور روایت ہے کہ ہندوستان میں ایک چکرورتی راجہ تھا۔ باقی تمام راجے اس کے خراج گذار تھے۔ ان میں سے جب کوئی نافرمانی یا بغاوت کرتا، چکرورتی راجہ فوج کشی کر کے اسے سزا دیتا۔ اس طرح وہ جنگ و جدل میں مصروف رہ کر خوشی محسوس کرتا۔ ایک روز اس نے اپنے امیروں اور وزیروں سے کہا کہ کوئی ایسا کھیل ایجاد کرو کہ گھر بیٹھے معرکۂ رزم کا لطف آئے۔ چنانچہ داہر کے بیٹے 'ششہ' نامی نے یہ کھیل ایجاد کیا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور اس سے کہنے لگا کہ 'مانگ کیا مانگتا ہے'۔ اس نے بادشاہ کی اس خواہش کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور کہا، 'مجھے کچھ نہیں چاہیئے' لیکن بادشاہ کے زور دینے پر اس نے کہا کہ شطرنج کے خانوں کو اس طرح بھر دیا جائے کہ پہلے خانہ میں ایک، دوسرے میں دو، تیسرے میں چار چاول بھرے جائیں۔ چونسٹھ خانوں تک یہی عمل جاری رہے۔ راجہ نے کہا کہ کتنا ذلیل انعام مانگا ہے۔ حکم دیا کہ فوراً تعمیل کی جائے لیکن ذیل کے نقشے سے پتہ چلے گا کہ صرف آخری خانے میں ۹۲۲۳۳۷۲۰۳۶۸۵۴۷۷۵۸۰۸ چاول آئیں گے یعنی تقریباً ....۴ سو چاول۔ اگر چونسٹھ خانوں کے چاولوں کو جمع کیا جائے تو اتنے چاول کرۂ زمین کی کل پیداوار سے بھی حاصل نہیں ہوں گے۔

۱۹۰۱ء میں ایک کتاب 'معلم الشطرنج' راجا بابو کی تصنیف سے شائع ہوئی تھی یہ مضمون بیشتر اس کتاب سے ماخوذ ہے۔ ع-م

(خانہ نمبر)		(خانہ نمبر)	
(۱)	۱	(۳۳)	۴۲۹۴۹۶۷۲۹۶
(۲)	۲	(۳۴)	۸۵۸۹۹۳۴۵۹۲
(۳)	۴	(۳۵)	۱۷۱۷۹۸۶۹۱۸۴
(۴)	۸	(۳۶)	۳۴۳۵۹۷۳۸۳۶۸
(۵)	۱۶	(۳۷)	۶۸۷۱۹۴۷۶۷۳۶
(۶)	۳۲	(۳۸)	۱۳۷۴۳۸۹۵۳۴۷۲
(۷)	۶۴	(۳۹)	۲۷۴۸۷۷۹۰۶۹۴۴
(۸)	۱۲۸	(۴۰)	۵۴۹۷۵۵۸۱۳۸۸۸
(۹)	۲۵۶	(۴۱)	۱۰۹۹۵۱۱۶۲۷۷۷۶
(۱۰)	۵۱۲	(۴۲)	۲۱۹۹۰۲۳۲۵۵۵۵۲
(۱۱)	۱۰۲۴	(۴۳)	۴۳۹۸۰۴۶۵۱۱۱۰۴
(۱۲)	۲۰۴۸	(۴۴)	۸۷۹۶۰۹۳۰۲۲۲۰۸
(۱۳)	۴۰۹۶	(۴۵)	۱۷۵۹۲۱۸۶۰۴۴۴۱۶
(۱۴)	۸۱۹۲	(۴۶)	۳۵۱۸۴۳۷۲۰۸۸۸۳۲
(۱۵)	۱۶۳۸۴	(۴۷)	۷۰۳۶۸۷۴۴۱۷۷۶۶۴
(۱۶)	۳۲۷۶۸	(۴۸)	۱۴۰۷۳۷۴۸۸۳۵۵۳۲۸
(۱۷)	۶۵۵۳۶	(۴۹)	۲۸۱۴۷۴۹۷۶۷۱۰۶۵۶
(۱۸)	۱۳۱۰۷۲	(۵۰)	۵۶۲۹۴۹۹۵۳۴۲۱۳۱۲
(۱۹)	۲۶۲۱۴۴	(۵۱)	۱۱۲۵۸۹۹۹۰۶۸۴۲۶۲۴
(۲۰)	۵۲۴۲۸۸	(۵۲)	۲۲۵۱۷۹۹۸۱۳۶۸۵۲۴۸
(۲۱)	۱۰۴۸۵۷۶	(۵۳)	۴۵۰۳۵۹۹۶۲۷۳۷۰۴۹۶
(۲۲)	۲۰۹۷۱۵۲	(۵۴)	۹۰۰۷۱۹۹۲۵۴۷۴۰۹۹۲
(۲۳)	۴۱۹۴۳۰۴	(۵۵)	۱۸۰۱۴۳۹۸۵۰۹۴۸۱۹۸۴
(۲۴)	۸۳۸۸۶۰۸	(۵۶)	۳۶۰۲۸۷۹۷۰۱۸۹۶۳۹۶۸
(۲۵)	۱۶۷۷۷۲۱۶	(۵۷)	۷۲۰۵۷۵۹۴۰۳۷۹۲۷۹۳۶
(۲۶)	۳۳۵۵۴۴۳۲	(۵۸)	۱۴۴۱۱۵۱۸۸۰۷۵۸۵۵۸۷۲
(۲۷)	۶۷۱۰۸۸۶۴	(۵۹)	۲۸۸۲۳۰۳۷۶۱۵۱۷۱۱۷۴۴
(۲۸)	۱۳۴۲۱۷۷۲۸	(۶۰)	۵۷۶۴۶۰۷۵۲۳۰۳۴۲۳۴۸۸
(۲۹)	۲۶۸۴۳۵۴۵۶	(۶۱)	۱۱۵۲۹۲۱۵۰۴۶۰۶۸۴۶۹۷۶
(۳۰)	۵۳۶۸۷۰۹۱۲	(۶۲)	۲۳۰۵۸۴۳۰۰۹۲۱۳۶۹۳۹۵۲
(۳۱)	۱۰۷۳۷۴۱۸۲۴	(۶۳)	۴۶۱۱۶۸۶۰۱۸۴۲۷۳۸۷۹۰۴
(۳۲)	۲۱۴۷۴۸۳۶۴۸	(۶۴)	۹۲۲۳۳۷۲۰۳۶۸۵۴۷۷۵۸۰۸

عام طور پر اس کھیل کو ایک مربع بساط پر جس کے چونسٹھ خانے ہوتے ہیں۔ دو شخص آمنے سامنے بیٹھ کر دو مختلف رنگ کے بتیس مہروں سے کھیلتے ہیں جن میں سے ہر سولہ مہرے ہر دو طرف بہ تفصیل ذیل ہوتے ہیں۔



بساط ہندوستان میں اوّل اوّل کپڑے کی بنائی جاتی تھی مگر یورپ میں ایک لکڑی کے تختے پر یا گتے پر روغن پھیر کر بناتے ہیں جس کے بتیس خانے ایک رنگ کے اور ۳۲ دوسرے رنگ کے بنائے جاتے ہیں۔ نیچے کی صف کے دائیں جانب کا اوّل خانہ سفید ہوتا ہے دوسرا سیاہ علیٰ ہٰذا القیاس۔

مہروں کی چالیں

بادشاہ صرف ایک ہی گھر چلتا ہے یعنی ایک خانے سے برابر کے دوسرے خانے میں ہر سمت کو چل سکتا ہے۔ صرف ایک دفعہ گھوڑے کی طرح ڈھائی گھر بھی چلتا ہے یعنی کشت کھانے سے پہلے۔ اور اس چال سے مخالف کے مہرے کو پیٹ نہیں سکتا۔ مخالف کے مہرے کو جو اس کی زد میں برابر کے خانے میں سیدھا یا ترچھا بیٹھا ہو مار سکتا ہے اگر مخالف کا کوئی مہرہ اس پر حملہ کر دے یعنی کشت دے تو دوسرے خانے میں ہٹنا پڑتا ہے یا اعراب ڈالنا پڑتا ہے یعنی بادشاہ کو کشت سے بچانا ہی کھیل کا منتہائے مقصود ہے۔ جب یہ ممکن نہ ہو تو یہی مات سمجھی جاتی ہے۔

وزیر یا فرزیں۔ سب سے طاقتور مہرہ ہے۔ رُخ اور فیل دونوں کی چال چل سکتا ہے یعنی پٹیوں پر سیدھا بھی اور خانوں کے وتر میں ترچھا بھی۔ آگے پیچھے، دائیں بائیں چلنے کا اختیار بھی ہے۔

رُخ۔ علاوہ وزیر کے صرف یہی ایک مہرہ ہے جو بادشاہ کی مدد سے حریف کو مات کر سکتا ہے۔ یہ مہرہ پٹیوں کے متوازی ایک سرے سے دوسرے سرے تک آگے پیچھے چل سکتا ہے۔

فیل۔ یہ مہرہ ترچھا یعنی خانوں کے وتر میں چلتا ہے۔

گھوڑا۔ ایک گھر رُخ کی چال، اور ایک گھر فیل کی چال ملا کر گھوڑے کی چال بنتی ہے۔ اسے اڑھائی گھر کی چال کہتے ہیں۔

پیدل۔ یہ مہرہ ایک گھر سیدھا رُخ کی طرح چلتا ہے اور ایک گھر ترچھا فیل کی طرح مارتا ہے۔ یہ سیدھا آگے کو چلتا ہے پیچھے کو نہیں ہٹتا۔ آتش کی زبان سے ایک شعر میں پیدل کی اس خصوصیت کا ذکر ہے ؎

مجھ سے جاں باز کو غربت ہے بساطِ شطرنج
جو نہ پلٹے کبھی واپس وہ پیادہ میں ہوں

پیدل اگر آخری خانے میں پہنچ جائے تو اسی گھر کا مہرہ بن جاتا ہے۔ وزیر اور شاہ کے گھروں میں پہنچ کر وزیر بن جاتا ہے۔ شرط یہی ہے کہ پیدل کو جو مہرہ بننا ہے وہ مہرہ زندہ نہ ہو۔ رحیم (خانِ خاناں) کا ایک دوہا پیدل کی اس خصوصیت کے باب میں بڑا پُر لطف ہے ؎

رحمن جو اوچھے بڑھے تو اتی ہی اترائے
پیادا سے فرزیں بھیو ٹیڑھو ٹیڑھو جائے

اصطلاحات

اسپ رُخی یا فیل رُخی۔ گھوڑے یا فیل کے عوض رُخ لیا جائے تو اسے اسپ رُخی یا فیل رُخی کہتے ہیں۔

اعراب۔ جب شاہ کو کشت آئے اور کشت کہنے والے مہرے اور بادشاہ کے درمیان کسی اور مہرے کو ڈال دیا جائے تو اسے اعراب کہتے ہیں ؎

آئی اگر بلا تو جگر سے ٹلے نہیں
اعراب دے کے ہم نے بچایا ہے کشت کو

بُرد۔ کھیل کے اختتام کے وقت جب ایک کھلاڑی کے پاس بادشاہ کے سوا ایک یا ایک سے زیادہ مہرے ہوں اور دوسرے کے پاس کوئی مہرہ نہ ہو تو اسے بُرد کہتے ہیں ع

گھڑی بھر میں شاطر کی بازی ہے بُرد

پٹّی۔ بساط کے وہ خانے جو خطِ مستقیم میں واقع ہوں۔

چال۔ مہرے کو ایک خانے سے اٹھا کر دوسرے خانے میں رکھنے کو چال کہتے ہیں اسی سے چال چلنا، چال نکالنا، چال کھانا، چال لگانا مختلف موقعوں پر بولتے ہیں۔ ع یارب زمانہ ہم سے عجب چال چل گیا

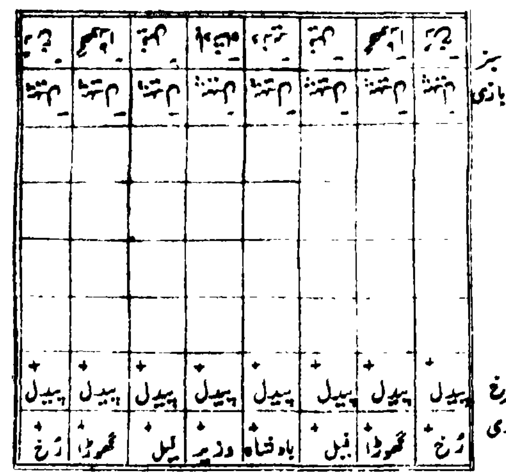
شہ یا کشت۔ بادشاہ پر حریف کے مہرے کی زد پڑنے کو شہ یا کشت کہتے ہیں۔

\

نقشہ: بساطِ شطرنج پر مہروں کی خاص ترتیب کو نقشہ کہتے ہیں ؎

سمجھتے خوب تھے ہم شاطرِ دوراں کی چالوں کو
مگر نقشہ پڑا ایسا کہ بازی ہار بیٹھے ہیں

ذیل کے نقشہ سے مہروں کی ابتدائی ترتیب واضح ہو جائے گی۔



شطرنج کے اقسام

فرنگی شطرنج: اسے انگریزی یا انٹرنیشنل بھی کہتے ہیں۔ اس کے قواعد اور چالیں ہندوستانی کھیل سے کسی قدر مختلف ہیں۔

پیدل کو پہلی چال میں خواہ ایک گھر چلو خواہ دو گھر

کاسل کرنا۔ جب بادشاہ اور رُخ کے درمیان سے گھوڑا اور فیل اٹھ جائیں تو ایک ہی چال میں شاہ کو گھوڑے کے گھر پر اور رُخ کو فیل کے گھر پر لے جاتے ہیں مگر ایک مرتبہ دونوں میں سے کسی کو مل چکے ہوں تو یہ استحقاق باقی نہیں رہتا۔ اگر بادشاہ کو کشت لگی ہوئی ہو یا بیچ کے گھر پر جہاں سے شاہ کو گزرنا ہے مخالف کے مہرے کی زد پڑتی ہو تو اس وقت یہ چال نہیں ہو سکتی۔

سفید رنگ کے بادشاہ کو کھیلنے والے کے دائیں اور وزیر (کوئین) کو بائیں ہاتھ بٹھاتے ہیں اور سیاہ رنگ کے بادشاہ کو سفید رنگ کے بادشاہ کے بالمقابل اور کوئین کو کوئین کے بالمقابل۔

جب پیدل آٹھویں گھر پر پہنچ جائے تو ہر ایک مہرے کے خانے پر وزیر یا کوئی اور مہرہ جو کھلاڑی پسند کرے ہو سکتا ہے خواہ وہ مہرہ موجود ہی ہو۔

انگریزی کھیل میں بازی برد نہیں ہوتی یا مات ہوتی ہے یا قائم

ذیل میں مہروں کی صورتیں ناموں کے ساتھ ملاحظہ فرمائیے۔

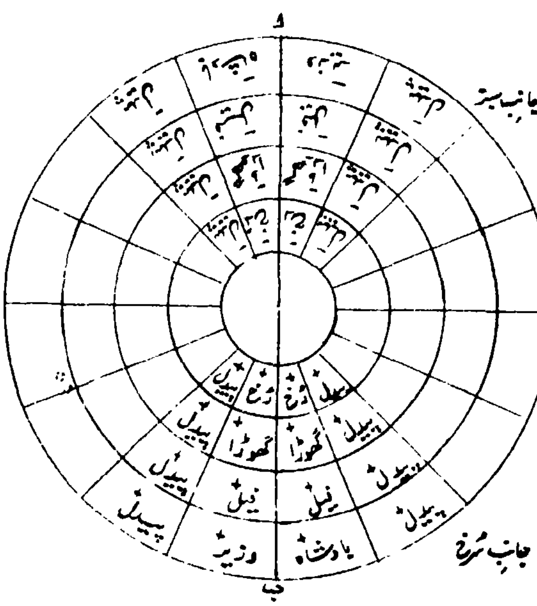


پیدل — رُخ — گھوڑا — فیل — وزیر — بادشاہ

اس کے علاوہ شطرنج کی اقسام یہ ہیں:۔

ہندوستانی، رومی، پارسی، انترنج، چوکھی، بساطِ مدوّر، دو رانِدوری شطرنج، شطرنج دیوانہ شاہ، شطرنج پیادہ پی، شطرنج شیر بکری، شطرنج جان دار، غائب شطرنج، شطرنج جو جنوبی ہند میں کھیلا جاتا ہے۔

شطرنج مدوّر کا نقشہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیے:۔



شطرنج کھیلنے والے کو پیش بندی، ہشیاری، مستعدی اور حفظِ ماتقدم کی عادت پڑ جاتی ہے۔ یہ کہنا کہ اس سے دماغی قوت میں اضافہ ہوتا ہے درست

معلوم نہیں ہوتا بلکہ کمزور دماغ کا آدمی اسے احسن طریق سے کھیل ہی نہیں سکتا۔

شطرنج کے متعلق بہت سی دلچسپ تاریخی روایات ہیں۔ تاریخ اصفہان میں ایک جگہ مذکور ہے کہ قلعے کے اندر دو افغان شطرنج کھیل رہے تھے۔ غنیم نے قلعہ فتح بھی کر لیا اور قتل و غارت کرتے کرتے کچھ سپاہی ان افغانوں تک بھی آپہنچے لیکن انھیں اس کی ذرا بھی خبر نہ ہوئی۔ قلعہ کے فتح ہونے کی خبر سُن کر انھیں ذرا بھی رنج نہیں ہوا۔ دشمن کو آمادۂ قتل پا کر صرف اتنا کہا کہ قتل سے تنک کر دلیکن بازی کو ختم کرنے کی مہلت دے دو۔ سپاہیوں نے کہا تم سے بے خبر اور کون ہو سکتا ہے شوق سے کھیلتے رہو تمھیں قتل کرنے کی ضرورت نہیں۔

آل آبیو خلیفہ بغداد کا تذکرہ ہے کہ جب آل مامون کی فوج نے جو تھوڑے دنوں سے شہر کا محاصرہ کئے پڑی تھی حملہ کر کے شہر کو فتح کرنا چاہا اس وقت وہ اپنے غلام کو ثار سے جس کو آزاد کر دیا تھا شطرنج کھیل رہا تھا۔ جب اس خوفناک واقعے کی خبر لوگوں نے اُسے سنائی تو اس نے جواب دیا کہ ذرا توقف کرو مجھے مات کی چال سوجھ گئی ہے

کہتے ہیں کہ چارلس اوّل کو جب یہ خبر پہنچی کہ سکاٹ لینڈ والوں نے اس کو انگریزوں کے حوالے کر دینے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے اس وقت وہ شطرنج کھیلنے میں مصروف تھا۔ اس نے اس بات کی مطلق پروا نہ کی اور برابر اسی مصروفیت کے ساتھ کھیلتا رہا۔

اس قسم کا استغراق اچھا نہیں۔ اسی وجہ سے یہ کھیل بدنام بھی ہے۔ اعتدال کی حدود میں رہ کر کھیلنا تفریح کا باعث ہے اس سے ذہنی کشادگی بھی حاصل ہوتی ہے۔

گھوڑے کو چونسٹھ گھروں میں پھرانے کے بہت سے نقشے ہیں ذیل میں ایک نقشہ تفریح کے لئے درج ہے۔

۴۵	۲۰	۳۵	۸	۴۷	۲۲	۲۳	۱۰
۳۶	۷	۴۶	۲۱	۳۴	۹	۵۰	۲۳
۱۹	۴۴	۵۷	۴۸	۵۵	۶۲	۱۱	۳۲
۶	۳۷	۵۴	۶۳	۵۸	۴۹	۲۴	۵۱
۴۳	۱۸	۵۹	۵۶	۶۱	۵۲	۳۱	۱۲
۳۸	۵	۴۰	۵۳	۶۴	۱۳	۲۸	۲۵
۱۷	۴۲	۳	۶۰	۱۵	۲۶	۱	۳۰
۴	۳۹	۱۶	۴۱	۲	۲۹	۱۴	۲۷

شطرنج کی اصطلاحات کو شعراء نے اشعار میں شامل کیا ہے۔

نظامی۔ نہ بایست شطرنج بدیا ختن
فرس در تگ پیل انداختن

حالی۔ گردشِ دوراں ہے ہر دم گھات میں
شاطرِ دوراں ہے فکرِ مات میں

سعدی ع چو بیذق کہ ناگاہ فرزیں شود

ایک حمد کے چند اشعار ہیں:-

اس کی قدرت کا ہے عجب نقشا — کس کی طاقت کرے جو چون و چرا
تختِ شاہی پہ ہے کوئی قائم — رہتا ہے انبساط میں دائم
ہے کوئی منعم اور کوئی فقیر — ہے پیادہ کوئی کوئی ہے وزیر
جب دکھلائے وہ رُخ عنایت کا — پیل پہ ہو سوار پیل بیں کا
اس کی قدرت کے دیکھ کر نیرنگ — عقل کا اسپ اس جگہ ہے لنگ۔

اس کھیل کے بہت سے دلچسپ نقشے کتابوں میں درج ہیں۔ فسانۂ آزاد میں بھی چند نقشوں کا ذکر آتا ہے جس میں سب سے دلچسپ نقشے کا ذکر لطف سے خالی نہیں ہوگا۔

بادشاہ اور وزیر بیٹھ کر شطرنج کھیل رہے تھے۔ شرط یہ تھی کہ جو بازی ہارے وہ اپنی بیگم دوسرے کو دے۔ بادشاہ کی بازی مات ہو رہی تھی اس نے اپنی بیگم جہاں آرا سے کہا کہ وزیر کے پاس جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اس نے جواب میں کہا:-

تو پادشاہ جہانی جہاں ز دست مدہ — کہ پادشاہ جہاں را جہاں بکار آید

بادشاہ نے دوسری بیگم حیات آرا سے کہا کہ اچھا تم جاؤ تو اس نے کہا:-

جہاں خوش است ولیکن حیات می باید — اگر حیات نہ باشد جہاں چہ کار آید

بادشاہ نے تیسری بیگم فنا آرا سے کہا کہ اب تمھاری باری ہے تو اس نے کہا:-

جہان و حیات ایں ہمہ بے وفا است — فنا را طلب کن کہ آخر فنا است

سب سے چھوٹی بیگم کا نام دلآرام تھا اس کے لئے کوئی چارہ نہ رہا تو اس نے بادشاہ سے درخواست کی کہ بازی کا نقشہ اسے دکھایا جائے۔ بازی کا نقشہ دیکھ کر معرکہ آرا چال اُسے سوجھی۔ اس نے بے تابی سے کہا:-

شاہا دو رُخ بدہ و دلآرام را مدہ — پیل و پیادہ پیش کن و اسپ کشت مات

یہ نقشہ تاریخی حیثیت تو نہیں رکھتا لیکن جس دماغ کی اختراع ہے وہ

تو جان دار ہے۔ پہلی بازی مات ہونے سے پہلے بادشاہ نے وزیر کو مات دے دی دو رُخ مفت پٹوائے، پھر پیدل کی کشت کی، پھر فیل کی اور پھر گھوڑے کی۔ اس کی آخری صورت ذیل میں درج ہے۔

سبز

شاہ	۵۸	۵۹	۶۰	۶۱	۶۲	۶۳	۶۴
۴۹	۵۰	۵۱	۵۲	۵۳	۵۴	۵۵	۵۶
۴۱	پیدل	پیدل	۴۴	۴۵	۴۶	۴۷	۴۸
۳۳	۳۴	۳۵	۳۶	۳۷	۳۸	۳۹	۴۰
۲۵	اسپ	۲۷	۲۸	۲۹	۳۰	۳۱	۳۲
۱۷	۱۸	فیل	۲۰	۲۱	۲۲	۲۳	۲۴
۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴	۱۵	۱۶
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸

سُرخ

پیدل ۴۲، شاہ کو خانہ ۵۰ میں بڑھ کر کشت کرے۔ شاہ یا خانۂ ۴۹ میں آئے گا یا خانۂ ۵۸ میں۔ ۵۸ میں جائے تو فیل ۱۹ خانۂ ۳۷ میں جا کر کشت کرے۔ لازماً شاہ خانۂ ۴۹ میں آئے گا۔ فیل پھر خانۂ ۲۸ میں آ کر کشت کرے۔ شاہ خانۂ ۵۸ میں جائے گا۔ گھوڑا خانۂ ۴۱ میں جا کر کشت کرے اور مات کرے۔ نقشے میں سبز بازی کا شاہ اور سُرخ کے چار مہرے دکھائے گئے ہیں۔ باقی مہروں کی صورت یہ فرض کی جائے کہ ایک ہی چال میں دوسری بازی مات ہے۔ بائیں طرف کی پٹی میں دو رُخ تھے اور ایک فیل تھا۔ پہلے ایک رُخ پٹوایا۔ پھر فیل کو اٹھا کر رُخ کی مفت کشت کی۔ پھر دوسرا رُخ پٹوایا۔ شاہ سبز خانۂ ۵۷ میں آیا۔ اس کے بعد جو نقشہ ہے وہ اوپر درج ہے۔

شطرنج کا کھیل اتنا دلچسپ اور پیچیدہ ہے کہ زندگی بھر میں جو بازی ایک دفعہ کھیل لی ہو وہ اس طرح کبھی دوبارہ نہیں کھیلی جاتی۔ مقابلہ آمنے سامنے ہوتا ہے۔ کوئی چال چھپ کر یا مہرہ چھپا کر نہیں کی جاتی۔ اچھی چال چلنے والا اور بہتر کھلاڑی ہی بازی جیت سکتا ہے۔ تاش کی طرح نہیں کہ جس کو اچھے پتے بٹ گئے وہ جیت گیا۔

رشید کوثر فاروقی

برسات کی ایک صبح

حسنِ فطرت دے رہا ہے دعوتِ فکر و نگاہ
کر رہی ہے دم بخود موجوں کی انگڑائی مجھے
سامنے منظر ہے پس منظر میں ہے اک شانِ راز
سایۂ اشجار ہے دریا میں کیسا دل نواز

سوندھی سوندھی بھینی بھینی سی مہک اڑتی ہوئی
دو گھڑی برسا، فضا کا منہ دھلا کر تھم گیا
پیاس کی ماری زمیں کے دل سے نکلا ہے غبار
جیسے بچے روتے روتے ہنس پڑے بے اختیار

یہ ہوا کی تازگی، یہ مینہ کی دوشیزگی
ڈالیاں کاندھے پہ مریم کی ردا ڈالے ہوئے
ہر طرف دھانی قبائیں، سبز سنتوں کے کارواں
کونپلوں پر جیسے شرمائی ہوئی معصومیاں

یہ رکوعِ آسماں اور یہ سجودِ کائنات
ایک ہیبت سی مگر تفسیر کا امکاں نہیں
جیسے بے الفاظ نغمہ، جیسے ناگفتہ خیال
ایک حیرت سی جسے تعبیر کرنا ہے محال

زیرِ لب گاتی ہیں لہریں بج رہا ہے جل ترنگ
یہ حسیں پرچھائیاں آئینۂ سیال میں
سینۂ دریا میں پیدا ہلکا ہلکا اضطراب
آسماں ایک اور گویا بن رہا ہے زیرِ آب

یہ جھروکوں میں جھروکے اور پردے تہ بہ تہ
آسماں میں جا بجا پھیلی ہوئی ہیں سرخیاں
جھانکتی ہے جن سے رہ رہ کے عروسِ زندگی
آبنوسی، کاسنی، نیلی، پیازی، گیروی

آ رہے ہیں جھم جھما جھم گھن گھٹا گھن گھور گھور
ان کے لہراتے ہوئے دامن میں بگلے پرفشاں
اک طرف انگڑائیاں لیتے کونج کے قافلے
سرمئی آنچل پہ گویا موتیوں کے سلسلے

ارتعاشِ نغمہ سے کچھ اور بڑھ جاتا ہے کیف
دور کی بستی سے آتی ہے ملھاروں کی صدا
جب پگھل ہوتا ہے امواجِ صبا کا پیچ و خم
آبگینوں پر ہو جیسے بوندیوں کا زیر و بم

پیاری پیاری نیاری نیاری میٹھی میٹھی بولیاں
مدھ بھری تانیں سماعت کی حدیں چھوتی ہوئی
مسکراتی کھیتی بہتی، ہوا میں تیرتی
روح کی بے انتہا گہرائیوں میں تیرتی

یہ پپیہوں کی قطاریں، یہ کنیروں کا ہجوم
جھاؤ دونوں ساحلوں پر سرسراتے جھومتے
اللہ اللہ وادیِ سرجو کی دل آویزیاں
اور ان کے قرمزی پھولوں کی گوہر ریزیاں

کامنی کے نرم ہاتھوں سے پیالے چھٹ پڑے
مولسریوں نے بچھا رکھی ہے پھولوں کی بساط
ساونی تھامے کھڑی ہے سبزہ رنگیں ایاغ
چاندنی کا ہر شگوفہ ہو رہا ہے باغ باغ

ڈھل گئی ہیں ایک ہی نکہت میں ساری نکہتیں
ایک ذرہ بھی غرورِ ذات پر مائل نہیں
پیار میں گم ہو گیا ہے امتیازِ ما و من
جس طرف دیکھو جمالِ مشترک ہے ضوفگن

پتی پتی، ڈالی ڈالی، قطرہ قطرہ، موج موج
یہ سکوں یہ ضبط کا عالم یہ آہنگِ سفر
گامزن ہے جادۂ ہستی پہ بے چون و چرا
یہ کمالِ نظم یہ اعجازِ تسلیم و رضا

ان مظاہر میں شعورِ نوعِ انسانی نہیں
آرزو و مقیاس کی دنیا سے کوسوں دور ہیں
تاہم اپنے مرحلوں پر سب کو حاصل ہے عبور
پھر بھی راہیں جان لیتے ہیں فضاؤں میں طیور

آہ لیکن آدمی کس درجہ بے توفیق ہے
عالمِ اسباب میں پا کر تمیز و اختیار
کوئی رہبر ہے نہ منزل ہے نہ آئینِ خرام
خود نہیں پہچانتا اپنی حدیں اپنا مقام

آپ اپنی شمع اپنا آپ ہی پروانہ ہے
رسم و راہِ زندگی سے کس قدر بیگانہ ہے

نذیر احمد

محمد ظہور بیجاپوری

اردو کا ایک قدیم شاعر

سخاوت مرزا صاحب کی قدیم دکنی بیاض میں ایک غزل ظہور تخلص کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ مرزا صاحب کا خیال ہے کہ یہ ظہور مشہور فارسی انشا پرداز ظہوری کا بیٹا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں:

"ظہور کے متعلق بجز ظہور پر معلوم نہ ہوا کہ یہ کون تھا مگر قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ ممکن ہے یہ وہی مشہور مورخ ظہور ابن ظہوری ہو جس کی ذات محمد نامہ ہو جس کے پدر بزرگوار نے ابراہیم عادل شاہ کے نورس نامہ[1] پر دیباچہ سہ نثر[2] ظہوری لکھا تھا۔ ظہور ہندوستان میں پیدا ہوا یہیں نشو و نما اور تربیت پائی اور اپنے ہم عصر ایرانی شعراء آتش و مقیمی[3] کی طرح دکنی میں بھی شعر کہتا تھا۔ اس لئے جب تک اس کے خلاف کوئی امر متحقق نہ ہو ہم ظہور کو ایرانی دکنی شاعر تسلیم کرتے ہیں۔" (رسالہ اردو۔ اپریل ۱۹۵۴ء ص ۵ - ۶)۔

"کیا تعجب ہے کہ ہماری اس بیاض کا شاعر یہی ظہور ہو جس نے اردو شعرائے بیجاپور کے تتبع میں دکنی میں غزل سرائی کی۔ قدیم دکنی شعرا میں سوائے اس کے اور کوئی شاعر ظہور تخلص کا نہیں گزرا ہے اس کی زبان قدیم ہے۔" (ایضاً ص ۱۰)

گویا وہ قرینے جن کی بنا پر دکنی غزل کا مصنف ظہور ولد ظہوری یا پسر ظہوری ایک ہی ہیں صرف دو ہیں۔ اول یہ کہ دکن میں سوائے ظہور پسر ظہوری کے کوئی اور شاعر اس تخلص کا نہیں گزرا ہے دوسرے یہ کہ اس غزل کی زبان قدیم ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ظہور کی اس غزل کی زبان اپنے دور کی زبان سے کچھ مشکل معلوم ہوتی ہے۔ امکان اس کا بھی ہے کہ یہ اشکال کتابت کی غلطی کی وجہ سے ہو۔ بہر حال یہ دونوں قرینے کافی ضعیف ہیں۔ لیکن فی الحال ان پر اضافہ ممکن نہیں۔ کیوں کہ ظہور کے سلسلے میں تفصیلات نہیں ملتیں اس بنا پر ذیل کے اوراق میں اس کے حالات کی بعض تفصیلات پیش کی جاتی ہیں۔

محمد نامے کے دونوں[1] نسخوں کے خاتمے کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہور کا نام محمد ظہور تھا اور تخلص اس کے نام کا ایک جزء ہے اور ظہور مولف محمد نامہ کا باپ وہی ظہوری ہے جس کی شاعری و انشا پردازی کی ہندوستان میں بڑی دھوم ہے اور جس کی سہ نثر اور ساقی نامہ وغیرہ کو غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔ ابراہیم زبیری بساتین السلاطین لکھتا ہے۔

" بعد از آں ملا ظہور ولد ملا ظہوری تا اینکہ منشات محمد آیاتش

[1] کتاب کا صحیح عنوان کتاب نورس ہے۔

[2] اس کا دیباچہ سہ نثر میں جزو اول ہے باقی دو نثریں دوسری دو کتابوں کے دیباچے ہیں۔

[3] یہ پوری طرح متحقق نہیں ہے کہ مقیمی ایرانی ہی تھا۔

[1] نسخہ سر جادو ناتھ سرکار ص ۴۶۸ اور نسخہ دانش گاہ علی گڑھ ورق ۳۹۲

[2] نسخہ بانکی پور ورق ۲ ونیز ملاحظہ ہو ورق ۲۵:

مشہور و منتیر و مقبول عالمیان است و اشعار بلاغت آثارش

مطبوع و مرغوب سخنوران جہان است الخ

ظہوری نے محمد نامہ میں کئی جگہ اپنا نام ظہور ابن ظہوری لکھا ہے۔ مثلاً[2]

"و شائستۂ[3] این وحی طرازی و الہام پردازی خانہ زاد معنوی و صوری ظہور ابن ظہوری است۔

و قابل این خدمت مرتبت افزائی مجمل پیرائی خانہ زادگی اعتقاد ظہور ابن ظہوری است۔"

ظہوری ملک قمی کا معاصر اور عزیز تھا۔ دونوں احمد نگر میں تقریباً پندرہ سال ایک ساتھ رہے ہیں۔ ساتھ ساتھ بیجاپور آئے یہاں ایک ساتھ تصانیف کیں اور وفات بھی قریب ہی کے زمانے میں واقع ہوئی تھی اوحدی عرفات[1] عاشقین میں لکھتا ہے:-

"ہمیشہ باہم بودند و در مردن ہم باتفاق رفتند در میان نہ سال نکشید۔

عبدالباقی نہاوندی مآثر رحیمی میں کہتا ہے۔[3]

"گویا کہ میانہ ظہوری و مولانا ملک شرط شدہ بود کہ در حیات و ممات باہم بودہ باشد بعد از دو ماہ از فوت مولانا ملک این قضیہ روداد۔"

ان اقوال کے پیش نظر ظہور کے حسب ذیل[4] اشعار سے ایک طرف تو ظہور اور ملک کے رشتے پر روشنی پڑتی ہے اور دوسری طرف ظہوری کا عادل شاہی دربار کا شاعر ہونا مسلم ہو جاتا ہے۔

انچہ و طرف وارث معنی منم — حجت قاطع پئے دعوی منم
کو ملک امروز ظہوری کجاست — فخر بخود میکنم آری بجاست
یافتہ ام نشاء زجام یقین — صاف دلم صافی شرم ببین

ظہور کا وطن

اگرچہ ظہور کی پیدائش ہندوستان کے شہر بیجاپور میں ہوئی اور یہیں

---

[1] ورق ۱۴-۱۵ اور ۲۵۱-۲۵۲

[2] نسخۂ بانکی پور ورق ۴۳۴ و نیز ملاحظہ ہو ورق ۴۲۷

[3] ج ۳ ص ۸۷۳ حاشیہ و نیز ملاحظہ ہو راقم حروف کی کتاب "ظہوری" ص ۱۱۲ ببعد

[4] محمد نامہ نسخۂ علی گڑھ۔ ورق ۱۵۲ الف۔

عادل شاہی دربار میں اس کی تربیت اور نشو و نما ہوئی جیسا کہ خود ظہور کے "خانہ زاد" کے فقرے سے ظاہر ہے لیکن اس کا وطن ایران کا مردم خیز صوبہ خراسان تھا۔ چناں چہ ظہوری کے ان ابیات سے یہ حقیقت بخوبی روشن ہے۔[1]

ہند و شکر بہ طوطی ارزانی — بلبل گلبن خراسانم
بلائے غربت بیماری و غم ہجراں — غریب خاک خراساں کند غمخواری
چہ شود گر بہ جذبۂ خدمت — کربلائی شود خراسانی

لیکن اس باب میں سخت اختلاف ہے کہ ظہوری کا تعلق خراسان کے کس علاقے سے تھا۔ ویسے تو خود ظہوری نے اپنے بعض اشعار میں اپنے وطن قاین[2] کی طرف صراحتاً اشارہ کیا ہے مثلاً ایک جگہ[3] لکھتا ہے

چو لانگر طوس رانند کتل — بہ میدان ز فردوسی آورده پل
زد فش ز مشکواۃ غزنین دمید — سنائی بآن روشنائی رسید
شده گنجہ ویران و معمور اوست — نظامی بآن مایہ گنجور اوست
بہ شریان شروانیان راند شیر — بطفلی ز خاقانی آورده پیر
بہ خم خانۂ جان شد جرعہ نوش — ز نہ جرعہ اش جامی آمد بہ جوش
نظر بر چو من ناتوانی فگند — نفس تافت در صید گردون کمند
بہ رستاق قاین فتادش عبور — ظہوری از و کرد شہری ظہور

ایک قصیدے[4] میں پھر کہتا ہے۔

---

[1] کلیات ظہوری نسخۂ رام پور ص ۲۱۱ / ۳۵

[2] حمد اللہ مستوفی نے نزہت القلوب (ص ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۵) میں اس کو ترشیز کے قہستان و نیمروز و زاولستان کے ذیل میں بیان کیا ہے اور خراسان کے اور شہروں سے الگ کیا ہے۔ لیکن خراسان کے اور شہروں کی طرح یہ بھی اقلیم چہارم میں تھے لیکن ظہوری کے زمانے میں یہ دونوں شہر مع تربت کے خراسان ہی کے حدود میں شامل تھے۔ مشہد سے جو سڑک زاہدان کو آتی ہے۔ اس پر قاین اور تربت واقع ہیں۔ ترشیز آخر الذکر سے تھوڑی دور مغرب میں واقع ہے اور وہاں سے ایک سڑک شاہرود کو جاتی ہے ان مقامات کی جائے وقوع اور ظہوری کے وطن کی بحث کے سلسلے میں ملاحظہ ہو "ظہوری" ص ۸-۱۳ اور راقم کا مقالہ معارف مئی ۱۹۴۷ء

[3] ساقی نامۂ ظہوری ص ۱۴۶

[4] کلیات ص ۱۴۰

شمہ بہ بہت درد دست نسبت ہا — وثنی در شکستن وشن است
ربط حرمت بہ جان پاک دلان — راست گوئی کہ ربط جان تن است
کس ندانم نظیر خود بہ وفا — ہم ظہوری نظیر خویشتن است
در محبت او بسیاں ہستند — ملک قابین قرینۂ قرن است

بہ آثر ابن السلاطین میں بھی ظہوری کی وطنی نسبت کی بابت قاین ملتی ہے مثلاً یہ ملاحظہ ہو۔[1]

"از جملۂ سخنوران آن زمان ملا ظہوری قاینی است کہ شعر و منشآتش در دقت و لطافت و فصاحت و بلاغت مشہور تمامی بلاد ہندوستان بلکہ ممالک ایران و توران است"

لیکن ظہوری کے معاصرین اس کے اس بیان کی ہم نوائی نہیں کرتے ان معاصرین کے تین گروہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ پہلی جماعت جن میں تقی کاشی مؤلف خلاصۃ الاشعار، تقی اوحدی مولف عرفات عاشقین، عبدالباقی نہاوندی مؤلف مآثر رحیمی اور ابوالفضل کے علاوہ اور بہت سے لوگ ہیں جو ظہوری کو ترشیزی جانتے ہیں۔[2] عبدالباقی نہاوندی نے تو ترشیز کے ایک گاؤں جمند[3] کو ظہوری کا مولد قرار دیا ہے دوسرے گروہ کے رکن محمد قاسم فرشتہ ابن احمد رازی صاحب ہفت اقلیم اور رفیع الدین شیرازی صاحب فتوحات عادل شاہی ہیں۔ ان کے نزدیک ظہوری تربت کا باشندہ تھا۔ اگرچہ تاریخ فرشتہ کے مختلف نسخوں میں تربت کی قرأت ترشیز اور تبریز بھی ہے لیکن تربت ہی صحیح قرأت ہے۔ بالفاظ دیگر فرشتہ بھی امین احمد رازی کا ہم خیال ہے۔ تیسری جماعت کا سرگروہ عبدالنبی قزوینی مؤلف میخانہ ہے۔ اس کے نزدیک ظہوری کی پیدائش تہران میں ہوئی۔ اگرچہ میخانہ کے مطبوعہ نسخے اور علم دوست علی گڑھ کے مخطوطے میں تہران ہی ہے لیکن کتاب خانۂ ملک تہران کے نسخے میں ترشیز ہے۔ ممکن ہے یہ کاتب کا تصرف ہو یا خود مؤلف کی ترمیم۔ میخانہ کے قیاس کی تائید کم از کم تاریخ منظومی اور مرآۃ العالم سے بھی

1. ... ورق ۱۲۸-۱۲۹۔ نیز ملاحظہ ہو ورق ۲
2. ملاحظہ ہو "ظہوری" ص ۹، ۱۷-۱۸
3. ایضاً ص ۱۱-۲۰
4. ... خراسان کے حدود سے باہر واقع تھا۔ ... خراسان انتہائی مشرق میں اور تبریز انتہائی شمال مغرب میں ہے۔
5. ملاحظہ ہو "ظہوری" ص ۲۲-۲۴ اور ۲۶-۲۷۔ مگر تہران خراسان سے الگ ہے۔

ہو جاتی ہے۔

ظہوری کے وطن کے ان اختلافات کے علاوہ اور بھی اختلاف پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ معاصرین کے بیان کو بآسانی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ خود ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کی ظہوری سے صرف ملاقات ہی نہ تھی بلکہ جن کے ساتھ وہ عرصہ تک ایک ہی دربار میں رہا بھی۔ مگر میرے نزدیک خود ظہوری کے بیان کی بڑی اہمیت ہے اور اس سے اتنا تو یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ خراسان کے شہر قاین سے ظہوری اور اس کے واسطے سے اس کے ... ظہور کا وطنی تعلق ہے

ظہور کی پیدائش

ظہور کی پیدائش کے سلسلے میں اس کے باپ ظہوری کی شادی کا مسئلہ تفصیل چاہتا ہے۔ عام طور پر تذکرے متفق ہیں کہ ظہوری کی شادی ملک قمی کی لڑکی سے ہوئی اور خود ظہور کے متذکرہ[1] بالا اشعار از دو طرف وارث معنی منم الخ سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ ملک قمی اس کی ماں کا عزیز قریب بلکہ باپ تھا۔ ظہوری باپ ہونے کی وجہ سے ایک جانب تھا۔ جانب مادری ملک تھا۔ اس سے ثابت ہے کہ ظہور اس کا نواسا تھا۔

ظہوری کے معاصرین میں صرف عبدالنبی قزوینی نے ظہوری اور ملک کے اس رشتہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ وہ اپنے حسب ذیل[2] بیان میں میر سنجر کاشی کو ملک کا داماد بتاتا ہے۔

میر سنجر در بیجاپور بہ وسیلۂ شاہ نواز خان ابراہیم عادل شاہ را ملازمت دریافت۔ مولانا ملک قمی در شہر مذکور در خدمت عادل شاہی بود بر احوال او اطلاع یافت۔ دختر خود را بدو داد و او را داماد خود گردانید۔

اس میں شک نہیں کہ میر سنجر ظہوری اور ملک کے ساتھ مدتوں ابراہیم عادل شاہ کا زلہ ربا تھا اور ملک اپنے قیام کاشان میں میر مذکور کے والد حیدر معمائی کے خوان احسان سے مستفیض ہو چکا تھا۔ مگر مندرجہ بالا بیان کو جب میخانہ کے ذیل کے بیان سے موازنہ کیا جاتا ہے تو بات کچھ مشتبہ سی ہو جاتی ہے۔[3]

1. محمد نامہ ورق ۱۰۳۔
2. میخانہ (مطبوعہ) ص ۲۵۰-۲۵۱
3. ص ۲۶۔

ملک در حالت نزع غزل مبنی بر وصیت خود گفت و اشارہ

بدان نمود کہ مرا در پہلوئے میر سنجر بہ خاک سپارید این مطلع ازاں غزل است

جانم بہ روزِ واقعہ پہلوئی او کنید   او قبلۂ من است رخم سوئے او کنید

میخانہ کے ایک نسخے میں حاشیہ پر یہ[1] عبارت موجود ہے۔

این مطلع را مسودہ این اوراق پریشان در دیوان اہلی شیرازی

دیدہ و انسیکہ کہ بر قول او اعتماد تمام بودہ شنیدہ کہ این بیت را

مولانا اہلی در حالت نزع گفتہ و وصیت نمودہ بود کہ مرا در پہلوئے

قبر خواجہ حافظ مدفون سازید۔ اما چون نوان گفت کہ ملک از اہلی

این مطلع بردہ و نقیص حاصل است کہ تو ارد زدہ است۔

اس بیان کی تصدیق تحفۂ ابراہیم سے ہوتی ہے جس میں[2] ہے کہ اہلی کی وصیت کے مطابق جب لوگوں نے اس کو حافظیۂ شیراز میں دفن کرنا چاہا تو مخالفین نے حافظ کے دیوان سے فال دیکھی اور یہ بیت مل گئی ؎

رواق منظر چشم من آشیانۂ تست   بیا بیا و فرود آکہ خانہ خانۂ تست

چناں چہ اہلی کو حافظ کے پہلو میں دفن کر دیا اور قبر پر یہ غزل کندہ کر دی۔ جانم بروز واقعہ پہلوے او کنید الخ۔

تذکرہ باغ معانی[3] ریاض الشعرا مخزن الغرایب، روز روشن و عشق سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ مگر عرفات میں صرف اس[4] قدر ہے

اہلی در مصلای شیراز با خواجہ حافظ در یک مضجع آسودہ اند

و بر مزار وی منقوش است جانم بروز الخ

ان تفصیلات سے ظاہر ہے کہ یہ غزل اہلی کی ہے ملک کی نہیں۔ ممکن ہے ملک نے مستعار کر لی ہو مگر ملک کا اپنے داماد کو او قبلۂ من است کے الفاظ سے یاد کرنا کچھ عجیب سا ہے کیونکہ ہم کو یقین سے معلوم ہے کہ ملک کی عمر اسّی[5] کے قریب ہو چکی تھی اور سنجر تقریباً ۴۰ سال[1] کا رہا ہوگا۔ دوم رشتے کا بھی کچھ اور ہی تقاضا تھا۔ بہر حال میخانہ ہی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک سنجر کی قبر کے کنارے مدفون ہوا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ سنجر ملک سے تین[2] سال قبل وفات پا چکا تھا۔

جیسا عرض کیا جا چکا ہے میخانہ کے علاوہ تمام تذکروں میں ظہوری کو ملک کا داماد بتایا گیا ہے اور یہ رشتہ ہندوستان ہی کے قیام میں قائم ہوا۔ دو تذکروں سے کچھ خیال ہوتا ہے کہ یہ نسبت قیام احمد نگر کے دوران میں عمل میں آئی ہوگی مثلاً ہمیشہ بہار میں ہے۔

"ظہوری باتفاق مولانا ملک قمی در احمد نگر توطن کردند و مولانا دختر خود را بنکاحش آوردہ۔ (ورق ۵۷ - ۵۸)

ریاض الافکار کا بیان یہ ہے:۔

" ظہوری باتفاق مولانا ملک قمی در احمد نگر رنگ توطن ریخت مولانا ملک آثار رشد در سیمای حال ملا ملاحظہ نمودہ دختر خود را بحبالہ نکاحش در آوردہ (ورق ۵۸)"

لیکن اہم مورخوں کے نزدیک یہ شادی بیجاپور میں عمل میں آئی۔ عبدالباقی لکھتا ہے:۔

" بہ بیجاپور افتادند و دران دیار رحل اقامت انداختہ نسبت قرابتی میان ایشان بہم رسید کہ صبیہ قدسیہ مولانا ملک در عقد ملا ظہوری در آمد۔ (ورق ۸۹ ب و ۹۰ الف)"

سرو آزاد میں ہے:۔

" از خوان احسان ابراہیم عادل شاہ نعمت فراوان اندوخت ملا ملک ظہوری را از زیور کمالات محلی دیدہ ۔۔۔ صبیہ خود را در عقد ازدواج مولانا کشید (ص ۳۱ ، ۳۳)

اس خیال کی تائید مراۃ العالم صحف ابراہیم اور شمع سخن وغیرہ سے بھی ہوتی ہے فیضی

---

[1] ایضاً

[2] نسخۂ بانکی پور ورق ۹۹

[3] ملاحظہ ہو کتاب "ظہوری" ص ۲۱۸

[4] ورق ۹۹ ب

[5] میخانہ (ص ۲۴۶) میں وفات (۱۰۲۴ھ) کے وقت ملک کی عمر ۱۰۰ سال کی بتائی گئی ہے۔ ۱۰۰۰ھ کے بعد بیجاپور آیا ہے (معارف "نگار" ستمبر ۴۴ ص ۴۴)

---

[1] وفات (۱۰۲۱ھ) کے وقت سنجر کی عمر ۴۴ سال سے کچھ زیادہ تھی۔ باقر کاشی اس کے مرثیہ میں کہتا ہے ؎

آخر شناس عمر تو ہفتاد گفتہ بود   چل سال روز گشت و چہل شب حساب شد

[2] میخانہ (ص ۲۵۲) پر وفات کا سنہ ۱۰۲۳ نکالا گیا ہے۔ اس میں سے دو گھٹنا چاہئے۔ ملاحظہ ہو۔ تذکرہ باغ معنی ورق ۱۳۸ وغیرہ۔

اور یہ بھی نسبت ملک اور ظہوری کے قیام احمد نگر اور اُن کے دوستانہ تعلقات کے ذکر کے باوجود ان کی قرابت داری نہیں لکھی۔ خود ظہوری نے محمد عادل شاہ کی زبان سے اپنے کو خانہ زاد کہلوایا ہے۔ اس سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے کہ ظہوری کی شادی احمد نگر کے بجائے بیجاپور میں ہوئی اور یہ لڑکا بیجاپور ہی میں پیدا ہوا اور عادل شاہی دربار میں اس کی تربیت ہوئی۔

اس قیاس کی صحت کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ظہوری کی پیدائش ۱۰۰۴ھ کے بعد ہوئی ہوگی اس لئے کہ ملک اور ظہوری تقریباً اس سنہ میں احمد نگر سے بیجاپور آئے تھے۔

ظہوری کی پیدائش کے متعلق ان تفاوت مرزا صاحب نے تذکرہ شعرائے دکن سے تذکرہ یہ اطلاع دی ہے کہ ظہوری کا باپ ظہوری ۹۸۸ ہجری میں بہ زمانہ ابراہیم عادل شاہ ثانی بیجاپور آیا۔ حکیم الحکما مرزا محمد یوسف بیجاپوری کی لڑکی سے شادی ہوئی اس سے ظہوری کے ہندی المولد ہونے میں شک نہیں ہے۔ اس بیان میں ظہوری کے بیجاپور پہنچنے کی تاریخ غلط درج ہے لیکن یہ مرزا صاحب کی غلطی نہیں ان کے ماخذ میں ایسا ہی ہے۔ یہ غلطی صرف تذکرہ شعرائے دکن میں نہیں پائی جاتی بلکہ دوسرے تذکروں میں بھی یہی مستقیم موجود ہے۔ مراۃ الخیال، مرآۃ العالم، تذکرۂ مظفری، باغ معنی اور نتائج الافکار میں اس سال براہ راست بیجاپور میں وارد ہونے کا ذکر ہے۔ لیکن معاصر تذکرہ نویسوں کے بیان اور خود ظہوری کے اپنے اشعار کی روشنی میں اس قیاس کے غلط ہونے میں کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔ تذکرہ شعرائے دکن کی دوسری بات البتہ اپنے ماخذ سے کچھ الگ ہے یعنی ظہوری کی مرزا محمد یوسف بیجاپوری سے نسبت۔ ذیل میں تذکرہ شعرائے دکن کا ایک پورا اقتباس درج کیا جاتا ہے:-

> جب ملک قمی نے احمد نگر سے بیجاپور میں مراجعت کی تب چند روز کے بعد ظہوری بھی بیجاپور میں پہنچا۔ حکیم الحکما مرزا محمد یوسف بیجاپوری کے مکان پر فروکش ہوا۔۔۔ حکیم صاحب نے ظہوری کے ساتھ حسن سلوک فرمایا اور مہمان نوازی کے حق کو کامل طور سے ادا کیا۔ چند روز کے بعد ظہوری نے حکیم صاحب کی مدح میں ایک طویل قصیدہ لکھا۔۔۔ حکیم صاحب[1] نے اس قصیدہ کے ذریعہ سے ظہوری کو بادشاہ عادل شاہ کے دربار میں باریاب کرایا ۔۔۔ ابراہیم عادل شاہ ظہوری کی ملاقات سے بہت خوش ہوا۔ خلعت و منصب سے سرفراز فرمایا۔۔۔ پس ظہوری نے تھوڑے ہی زمانے میں عادل شاہ کے خوان احسان سے بے شمار مال و زر جمع کر لیا۔ ملک قمی نے جو دربار عادل شاہی میں معزز شعرا میں تھا۔ ظہوری کی لیاقت و استعداد ترقی خداداد دیکھ کے محبت و اتحاد کی بنا باہم قایم کی اور اپنی دختر نیک اختر سے مولانا ظہوری کی شادی کر دی۔ پھر خسر اور داماد میں باہم ایسا اتفاق ہوا کہ دونوں تالیف و تصنیف میں شریک رہتے تھے۔"

ـــ رسالہ اردو اپریل ۱۹۵۲ء ص ۱۰

۲ـ اس سلسلے میں ملاحظہ ہو "ظہوری" ص ۷۹ - ۸۰

۳ـ ج ۲ ص ۴۶ - ۷۴۶ (ملخصاً)

اگرچہ اس اقتباس کے بعض تاریخ[2] صحیح نہیں مگر فی الحال ان سے قطع نظر کی جاتی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ تفاوت مرزا صاحب کا یہ قیاس کہ ظہوری کی شادی حکیم محمد یوسف کی لڑکی سے ہوئی غلط ہے۔ ملا ظہوری ماں اور باپ دونوں طرف سے ایرانی ہے البتہ اس کی پیدائش تربیت اور نشو و نما بیجاپور میں ہوئی اس سے زیادہ ہمیں ظہوری کے متعلق کچھ اور معلوم نہیں۔

ظہوری کی تصنیف

ظہوری کی ایک تصنیف جس کا کبھی محمد نامہ کبھی نامۂ محمدی اور کبھی تاریخ محمدی کے عنوان سے ذکر ہوتا ہے دریافت ہو گئی ہے۔ دریافت شدہ حصہ محمد عادل شاہ (۱۰۳۷ - ۱۰۶۷) کے زمانے کی تاریخ ہے جو سلطان مذکور کے حکم سے لکھی گئی لیکن خود ظہوری نے جو تفصیل بہم پہنچائی ہے اس سے یہ طے نہیں ہو پاتا کہ تاریخ محمدی محمد عادل شاہ کے زمانے کی تاریخ ہے یا یہ ایک مکمل تاریخ تھی جس کا ایک جزء محمد نامہ کے عنوان سے محمد عادل شاہ کے حالات پر مشتمل تھا۔ اس کے بیان کا خلاصہ[3] یہ ہے

> " حضرت بادشاہ کی خواہش ہوئی کہ اس حکومت کے آغاز و انجام کی داستان اس طرح بیان کی جائے کہ امن و امان کا رشتہ

۱ـ کلیات ظہوری (رام پور) میں یہ قصیدہ حکیم مصری کے نام سے ہے نیز ملاحظہ ہو ظہوری ص ۱۸۸

۲ـ مثلاً یہ بات صحیح نہیں کہ ملک نے بیجاپور کے قیام میں ظہوری کی لیاقت سے واقفیت حاصل کی

۳ـ محمد نامہ ورق ۲۵۱ - ۲۵۲ -

ہمیشہ کے لیے ڈھونڈنے سے محفوظ رہ آ دوار باب فضل و کمال ہمارے فیض سے مستفیض ہوتے رہیں۔ اس خواہش کے پیشِ نظر ۱۰۵۱ ہجری میں بادشاہ نے نواب[1] خان بابا سے فرمایا کہ اس خدمت کے لائق ظہور ابنِ ظہوری ہے اور شاہی حکم کے مطابق خان بابا نے مجھ حقائق گزین (ظہور) کو اپنے دولت خانے پر طلب فرمایا اور شاہانہ مژدہ کی اطلاع دی پھر رفیع الدین شیرازی کی تالیف احوال[2] السلاطین بیجاپور میرے ہاتھ میں دی اور فرمایا

کہ اے شاعرِ شاہ عالی تبار	جہانِ دگرکن زسر آشکار
کہ باشد درآں عالم دلکشای	زمین را سزا آسمان را و نمای
سخن سرکش از سروران دکن	کہ باشد درخشاں جہاں زین سخن
بہ کش آں چناں خوان انشای مغز	کہ یوں بستہ گردد شود پر ز مغز
زجام معانی بہ جوش آں چناں	کہ گردد فلک مست و غلطاں ازاں

چنانچہ میں نے بادشاہ دکن کے تمام حالات جو تاریخ مذکور میں درج تھے دوبارہ لکھ ڈالے۔"

اس بیان سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ رفیع الدین شیرازی کی تاریخ دکن اور محمد نامے میں کیا تعلق تھا۔ محمد نامے میں سلطان محمد عادل شاہ کے حالات ۱۰۳۷ھ تا زمانۂ آخر پائے جاتے ہیں جب کہ رفیع الدین کی کتاب میں ابراہیم عادل شاہ کے عہد کے سارے حالات نہیں ہیں، محمد عادل شاہ کے حالات کا کیا ذکر ہے چوں کہ محمد نامے کا دریافت شدہ حصہ محمد عادل شاہ کے حالات پر مشتمل ہے اس لئے وہ یقیناً رفیع الدین کی تاریخ پر اضافہ ہے۔ ممکن ہے ظہور نے تاریخ دکن کے دو حصے کرلئے ہوں، پہلا حصہ تو رفیع الدین کی کتاب پر مبنی ہو جو اب نایاب ہے حصہ دوم محمد عادل شاہ کے حالات پر مشتمل ہے جس کے نسخے دستیاب ہو گئے ہیں اس محمد نامہ کی تصنیف کے سلسلہ میں ظہور دوسری[3] جگہ اس طرح لکھتا ہے :-

" حضرت بادشاہ غازی از روی شکوہ بے نیازی با نواب مصطفیٰ خان کہ بخطاب مستطاب خان بابا است چنیں فرمودند کہ نمود اقتدار خسروان ربع مسکون را فہرست شان و شکوہ شرح و بیان جلوس پادشاہی ما متناہی ماست و شائستۂ ایں دقیقہ طرازی و الہام پردازی خانہ زاد معنوی، صوری ظہور ابن ظہوری است۔ تا بمژدۂ ہمایون نواب والا جناب ایں خانہ زاد درگاہ عرش اشتباہ را بدولت خانۂ خود طلب فرمودہ بشارت نگاشتن ایں نامۂ ہنگامہ کہ حضرت خدایگان جہاں محمد نامہ آں را نام نہادہ اند طرازِ شہرتِ ابدی بخشیدہ اند"

بساطین[1] السلاطین میں بھی ہے کہ نواب خان بابا نے شاہی حکم کے بموجب تاریخ احوالات سلاطین دکن مؤلفہ رفیع الدین شیرازی ظہور کے حوالے کرکے تاریخ عادل شاہی کی تدوین کی فرمائش کی اور محمد نامہ کے نام سے یہ تاریخ ۱۰۵۱ ہجری میں لکھنا شروع ہوئی۔ جو ابراہیم عادل شاہ اور محمد عادل شاہ دونوں کے حالات[2] پر مشتمل تھی۔ دریافت شدہ دونوں نسخوں کے ترقیمے کے ابتدائی جملے یہی نسخۂ ثانی این تاریخ محمدی موسوم بہ محمد نامہ مقالۂ سلطنت شاہ سکندر بارگاہ محمد شاہ ابن ابراہیم عادل شاہ[3] سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ پوری تاریخ کئی مقالوں پر مشتمل رہی ہوگی۔ ابتدائی مقالے اور بادشاہوں کے حالات پر مشتمل ہوں گے۔

ان حالات میں محمد نامہ رفیع الدین کی تاریخ کا تکملہ ہوگا۔ ظہور نے اس کی تاریخ پھر سے تدوین کی ہوگی اور محمد نامہ کے نام سے اس کا تکملہ لکھا ہوگا۔

مؤلف کی اپنی اس تصنیف کے متعلق بڑی اچھی رائے تھی۔ جہاں جہاں اکبر نامہ سے اس کا موازنہ کیا ہے۔ خود اس کے[3] الفاظ یہ ہیں :-

" روزی بتقریبی در محفل دل آرای دارای زمین و زمان از اکبر نامہ کہ شیخ ابوالفضل سرمایۂ فضیلت خود را بہ عبارت شگرف صرف آں نمودہ حرف برآمد کہ ہیچ قادر سخن قوی اندیشہ را قدرت نیست کہ در مقابل اکبر نامہ کتاب بہ حیز تحریر درآرد۔ حضرت بادشاہ غازی بامتحان ایں گفتگو انجمن فضل و کمال بکمال جاہ و جلال پیامانستند

---

[1] نواب مصطفیٰ خان داماد ملا محمد لاری (مشہور ملا بابا) جس کا اصل نام محمد امین تھا۔
[2] اس کا اصل عنوان تذکرۃ الملوک اور تاریخ تصنیف ۱۰۰۷ھ ہے۔
[3] ورق ۱۴-۱۵۔

---

[1] نسخۂ بانکی پور ورق ۱۵۳، مطبوعہ ۱۳۳۳، بساتین میں محمد نامے کی عبارت نظم و نثر مع ایک بیت زائد کے، بعینہ نقل ہو گئی ہے
[2] یہ اطلاع دیباچۂ بساتین ورق ۲ سے ماخوذ ہے۔
[3] ورق ۲۵۲ بعد۔

وساير فرمان روايان قلمرو نظم و نثر به پيرهٔ سپاری بخت همايون هم آغوش گرديده و از دو جهان کامياب آمدند و چون به ايوان حضرت شهنشاهی اکبر آمدند وچون هنگامهٔ نکته‌دانی و سخن‌دانی گرم شد حضرت بادشاه غازی ظهوری را منظور نظر عواطف خسروانه گردانيده فرمودند که درين جزو زمان هيچ فردی مثل اکبرنامه کتابی تصنيف تواند نمود جمله تن تسليم و سجود عبوديت گشته بعرض رسانيد که شيخ ابوالفضل از نصرفات طبع وقاد خود مقدمات علمی و صنائع انشا بهم درآميخته اکبرنامه را اکابرانه و متبحرانه نوشته و ديباچهٔ اين نامهٔ محمدی هنگامه درميان هر درج لفظ او دريا دريا گوهر مضامين و معانی ناياب گرديده و از ابتدا تا انتها مشتمل بر توحيد احد لم يزل و نعت احمد مرسل است و عبارت سليس بسان موج سلسبيل سلسل و اکبرنامه را از کتاب‌خانهٔ متراس طلب نموده از روی انصاف به عبارت نامه نسبت کردند.

مقصود ازين سخن طرازی و عبارت پردازی آن که داور کشورکشای ظفرآفرين تحمل پيرای زمان و زمين فرزندهٔ جهان عز و تمکين حضرت بادشاه غازی ماهيت نظم و نثر مراکز اشعار عارفی را در عبارت آرائی خود عارف بيانم دريافتند و سطر سطر اين نامهٔ نامی را به ميزان سنجيدگی سنجيده ابواب نوازش نامتناهی بر روی من کشادند و بزبان فرخنده بيان فرمودند که ملا ظهوری را حق سبحانه تعالٰی برای همين آفريده که به نگارش محمدنامه سرمايهٔ سعادت جاودانی دريابد"

اس سارے بیان میں کوئی ایسا نکتہ نہیں جس سے ابوالفضل اور ظہوری کے طرزِ نگارش کا فرق واضح ہو سکے۔ سوائے اس کے کہ بقول ظہوری ابوالفضل نے مقدمات علمی کو صنائع انشا سے ملا کر اپنے تبحر کا ثبوت دیا ہے۔ ظہوری کے یہاں مضامین کی کثرت ہے الفاظ کم ہیں اور ایجاز بیانی کے ساتھ سلاست کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ ابوالفضل صرف ایک بلند پایہ انشا پرداز ہی نہ تھا۔ وہ مصلح زبان بھی تھا۔ اس نے فارسی زبان کو فساد و نقص سے جس طرح بچایا اس کا اعتراف ایران کے بڑے فاضل ملک الشعرا بہار نے "شروع تجدد نثری در ہندوستان" کے تحت اس طرح کیا ہے۔[1]

"درہندوستان نفسد به نقص و فساد نثر فارسی پے بردند و قديم‌ترين کسے که باين عيب متوجه گرديد و در صدد اصلاح برآمد مردی بود فوق العاده موسوم به شيخ ابوالفضل و قديم‌ترين کسے است که در حل و فهم لغات دری سعی کرد و با آن که در اصل عرب بود و زائيدهٔ هند مع ذالک برآن شد که تا تواند الفاظ عربی را از فارسی بيرون کشيده بجائے لغات مذکور لغات دری بگذارد و به تغيير سبک نثر فارسی آغاز کرد و همان کاری را که در اواخر عهد محمد شاه قاچار ابتدا شده و امروز بوسيلهٔ فضلائی ايران به نتيجهٔ واقعی و عقلائی آن يعنی قيام در نگاهداری زبان فارسی از لغات بيموجب و دخيل رسيده است و رگرفت۔

کتاب فرهنگ و منشآت و چند کتاب ديگر مانند اکبرنامه و آئين اکبری که يکے از نفائس کتب فارسی است تاليف و تصنيف کرد و نامه‌ها ئے که از دربار دہلی باطراف و ممالک ديگر می رسيد همه بدان سبک بود و با آنکه تعمدی در نيا وردن و حذف لغات عربی و تعصبی جاہلانہ بخرج نميداد مع‌هذا بعضے عبارات او بفارسی خالص است و در نثر او لغات عربی که صدی هشتاد سراپای کتب را گرفته بود به صدی ده دوازده بعنف تنزل کرد۔ نيز کتاب کليله و دمنه تهذيب و تلخيص کرد۔

اما سبک ابوالفضل بواسطهٔ اين که تقليدا و مستلزم معلومات کافی بود پيروی نشد مگر بعضے از لغات که او و به ديگر نويسندگان هند سرايت کرد۔"

مختصر یہ کہ ملا ظہوری کو ابوالفضل سے کوئی مناسبت نہیں۔ محمدنامہ کے طرزِ نگارش پر نثر ظہوری کی گہری چھاپ معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس میں وہ معنویت و کشش جو سہ نثر کا طرۂ امتیاز ہے نہیں ہے۔ ملا ظہوری کا یہ دعوی کہ اس کے ہر ہر لفظ میں مضامین کا دریا ہے اس سے زیادہ اس کے باپ کی تحریر پر صادق آتا ہے۔

ظہوری نے محمدنامہ میں اشعار کا استعمال بہ کثرت کیا ہے اور یہ بھی غالباً ظہوری کی تقلید کا نتیجہ ہے۔ ایک بات یہ ضرور ہے کہ اس نے خود اپنے ہی اشعار درج کئے ہیں۔ اور اگرچہ اس کے دیوان کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں ہوا لیکن محمدنامہ

لہ ۔ سبک شناسی ج ۳ ص ۲۹۰-۲۹۱

ہیں کافی مدحیہ اشعار، قصیدے، قطعے، مثنوی وغیرہ اصناف کے آگئے ہیں اور قیاس ہوتا ہے کہ اگر وہ شاعری کی طرف متوجہ ہوتا تو بلاشبہ اپنے باپ کا صحیح جانشین ہوتا۔ ناظرین کی دلچسپی کے لئے چند نمونے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

یہ اشعار ایک قصیدے سے لئے گئے ہیں جو سیتا پیپل گیسو دراز کے روضہ کی مدح اور محمد عادل شاہ کی تعریف میں نظم ہوا تھا۔[1]

روضۂ مخدوم عالم قبلۂ دنیا و دین	عالم آرا گشته همچو للعالمین
قبۂ خورشید سیمائش چو شد عالم فروز	آشکارا گشت راز اولین و آخرین
هر سحر از رفعت و رویِ صحن روح افزای او	جوهر ارواح در دامن کند روح الامین
گنبد او تارک عرش برین را برفراشت	قبۂ او خاتم افلاک را باشد نگین
...ن که دارد خار خار از پایۂ سنگین او	...ر اسی می خلد در سینۂ گاو زمین
آب دریای بقا از خاک و باد گلشت	گنج هستی زیر سنگ پایۂ ش باشد دفین
صبح دم چون سر کشد دود بخور از مجمرش	بر سر گردون شود خورشید چتر عنبرین
گر ز وصف شمه او شمۂ سازم رقم	تا ابد شمس و قمر تا بد مرا بر جبین
دستۂ سنبل شود بر جیب گردون آفتاب	گر ز دود مجمرش گردد هوا نکهت گزین
از هوای روضۂ او می دمد باد بهار	روح عیسی همچو مریم غنچه را در آستین
شد روان چون شاه انجم جلالت گرم سجود	خسرو غازی محمد شاه از روی یقین
از یقین شاه مقصود خلائق حاصل است	ای خوشا صدق شهنشاه تحمل آفرین
بنده بر در شهر یارا عدل گستر خسروا	خسرو وقت خودم ملک سخن زیر نگین
از برای تشنه کامان بیابان خیال	طبعم از معنی بر آرد چشمۂ ماء معین
از پئے آمین نخستم مادحت آن گاه دعا	خیزد از گردیان بر چرخ بانگ آفرین
تا شود حاصل مراد عارفان از اعتقاد	تا چراغ جان پذیرد روشنائی از یقین
بر سر خوان نوالت آسمان چون سائلان	جاودان از انجم ثابت باشد ریزه چین

قصیدہ فتح نامۂ قلعہ جنجی کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔[2]

زہے جمال تو حیرت فزائے حق بینان	بمصر حسن تو گم گشته یوسف کنعان
گذشته موج تجلی ز اوج عرش برین	به جلوه گاه جمالت ز جنبش مژگان
پناه دین محمد شهنشه غازی	توئی که حکم تو بر کائنات گشته روان
ز لجۂ کرمت نیم موج نه گردون	ز رهگذار تو یک مشت خاک ...خاقان

قضا سپردپئے قسمت دوام نشاط	بدست ساقی بزم تو ساغر دوران
چو آفتاب سخاے تو جلوه گر گردد	شود بروی هوا ذرۂ گهر افشان
صدف کشد چو گهر در شکنجه دریا را	بدور جود تو گر آب بوید از نیسان
بآب و تاب توان ریخت شمع کافوری	زمین حفظ تو از ماهتاب تا دکتان
بدور حفظ تو دریا چو حوال موج کشید	دهد ز خطره دهان حباب را دندان
هزار صبح سعادت دمیده از هر سو	ز گرد راه سمندت به عرصۂ دوران
بگاه گرم روی بر دود بقلعۂ کوه	چنان که نشئۂ می در دماغ سرمستان
نگاه دری که به تشبیه نعل او مه نو	بلند نام بود همچو ابروئے خوبان
ز تاب آتش قهر تو گاه حرب و جدال	جهد چو برق ز فرق سپهر کاه کشان
چو می کشتے که کشد جام و میل نقل کند	گرفت قلعۂ جنجی و شد بمدرا بدان
چه قلعۂ که ز بر جیش بود به چشم خرد	سپهر هفتم چون هفت توپ جوش عنان
چون مشت ریگ که گیرد کسی بدامن کوه	نماید از ته برجیش کواکب تابان
جهان پناه شهنشاه دین پناه دوی	دهد به جوهر تیغ تو باج تاج جهان
سخنوری که ز مدحت طراز شهرت یافت	بنیم نقطه مسخر نمود کون و مکان
ز بس که قرب ظهور از مدایح تو فزود	شدم مقرب درگاه حضرت سبحان
همیشه تا که بود گرم عالم افروزی	فروغ مهر نبی از دل عدا بینا
ز اوج قدر شرف باد قبۂ چترت	چو آفتاب جهان تاب تا ابد تابان

محمد نامہ بہت کمیاب تھا۔ بساتین السلاطین میں اس کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے۔

این دو نسخہ یعنی محمد نامۂ ملا ظہوری و تالیف شیخ ابوالحسن کمیاب بلکہ نایاب اند و باوجود تلاش ہنوز بنظر نرسیدہ۔ ص ۴-۱۰۔

خوش قسمتی سے اس وقت اس کے دو نسخے دستیاب ہوئے ہیں ایک کپورتھلہ کے ریاستی کتب خانے میں تھا جو اب پٹیالہ کے آرکائز میں منتقل ہوا ہے۔ اس میں آخر کتاب میں یہ عبارت درج ہے۔

نسخۂ انشاء این تاریخ محمدی موسوم بہ محمد نامہ متعلقہ سلطنت شاہ سکندر بارگاہ محمد شاہ ابن ابراہیم عادل شاہ فرماں روائے دکن تصنیف محمد ظہور پسر مولوی ظہوری بتاریخ ۴ ۲ ربیع الثانی ۱۲۴۔ شاہ عالم بروز سوم واقعۂ ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خان بہادر کہ بخشی الممالک و مختار مہام سلطنت و وزارت بود از دست فقیر

[1] نسخہ علی گڑھ ورق ۱۵۴ ببعد۔

[2] ایضاً ورق ۲۲۸ ببعد۔

ثبات چند کا نسخہ بھٹناگر پانی پتی نے نعماں حقیر میکہ دصورت اتمام پذیرفت

ڈاکٹر سرکار نے اس سے ایک نقل تیار کرائی جو ۲۹۸ صفحات پر پھیلی ہے۔ کاتب محمد فصیح لیا دی اور سنہ کتابت ۱۹۱۹ء ہے۔ پروفیسر بھگوت دیال ورما (پونا) کے پاس ایک نقل موجود ہے جو غالباً سرکار والے نسخے سے حاصل کی گئی ہے۔ دوسرا نسخہ مسلم یونی ورسٹی کے کتاب خانے میں عبدالسلام خان کے ذخیرے میں فن تاریخ ۳۸ / ۱۵۰ کے ذیل میں موجود ہے۔ کل اوراق ۲۹۳ جن میں سے تو ابتدائی غائب ہیں حجم ۲۲×۳۳ سینٹی میٹر اور رحوص ۹×۱۷ سینٹی میٹر ہے۔ ہر صفحہ پارہ سطری خط نستعلیق کاغذ سفید بادامی کتابت کی غلطیاں کاتب کی عدم سوادی پر دلالت کرتی ہیں۔ ترقیمے کے الفاظ اوّل الذکر نسخے سے اتنے متشابہ ہیں کہ قیاس ہو سکتا ہے کہ شاید اس کاتب کے پیش نظر وہی نسخہ ہو۔

تمت تمام شد این نسخہ انشای این تواریخ نمدی موسوم
بہ محمد نامہ متقالہ سلطنت شاہ سکندر بارگاہ محمد شاہ ابن ابراہیم عادل شاہ
انار اللہ برہانہ فرماں روای دکن تصنیف مولانا ظہور ابن ظہوری
ظہوری بتاریخ بست وسوم جمادی الثانی ۳۰ جلوس شاہ عالم
بادشاہ غازی۔

ظہور کا اردو کلام

جیسا کہ ابتدا میں عرض ہو چکا ہے کہ تخاوت مرزا کے بیاض میں ظہور تخلص کی ایک دکنی غزل ہے قرین قیاس یہی ہے کہ یہ غزل محمد ظہور ہی کی ہے۔ اس بات کا افسوس ضرور ہے کہ چونکہ یہ غزل اور کہیں موجود نہیں اس لئے کتابت کی غلطی کی اصلاح نہیں ہو سکی۔ غزل مذکور شوخی اور نزاکت سے خالی نہیں۔

جوبن سنیں سچ کر کچ مست ہو چلی ہے — لنگر سو پنجنا[1] ہور کھنگران کی کھلبلی ہے
مانجھے مکٹ سرک سو موی بند اندو سلکن — زیبا علم ہی سو انجل[2] اسٹاولی ہے
گل بنگری کلا دہ ہار ان میں نارسی — تن پہ نکت[3] کی کسوت یا کہر سو جھلجلی ہے
دلتی[4] چلے تو بجتیاں ہاران میں کھائیاں — سوکن جھوں شون[5] دو تن اسپند ہو چلی ہے
جوبن کی آنچ سے کر تجھ پہ کرم کرو تا — برہے کی ٹھنڈ[6] پر کر سب تن میں تھرتھری ہے
ادمد کے کو ن دیکھو ایتی ہے عاشقاں پہ[7] — سیندور لال چولا زلفاں انکس[8] دھری ہے
دو نین تیرے راوت میلا کریں پرم کا — سرکاٹ عاشقاں کا تن سوں جدا کری ہے

لٹ شوخ بات غافل ہر ہا لہرا ہے مشکل
بکلسں ظہور سوں مل برجیان دلبری ہے

---

[1] الفاظ کی تشریح مرزا صاحب کے شکریے کے ساتھ ان کے مضمون سے منتقاد ہے ملاحظہ ہو ص ۱۰۔ پازیب
[2] ایک قسم کا رنگ
[3] کسمیل
[4] چادر
[5] ڈلتی یعنی جھومتی
[6] جھل۔ جھلن۔
[7] برہے کی ٹھنڈ۔ عشق کا جاڑا برعکس عشق کی آگ (دیکھو تذکرۂ نقش حیدرآباد مخطوطہ کتب خانہ عمر یافعی۔
[8] اپٹنا۔ الٹ پڑنا۔
[9] آنکس جو مہاوتوں کے پاس ہوتا ہے

"ابوالکلام آزاد"

اگست ۱۹۵۸ء میں ہم نے آج کل کا "ابوالکلام نمبر" شائع کیا تھا۔ اس کی مانگ اس قدر زیادہ تھی کہ شائع ہوتے ہی ساری کاپیاں ختم ہو گئیں اور ہم شائقین کی فرمائش پوری نہ کر سکے۔ اب اہل ذوق حضرات کی فرمائش پر اس نمبر کو بعض ترمیمات کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

ضخامت ۲۴۴ صفحات مع تصاویر۔ قیمت دو روپے

ایجنٹ حضرات پہلے سے فرمائش بھیج کر اپنی کاپیاں محفوظ کرا لیں

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

زکی انور

ڈائنامیٹ

دھان کے پودے پیلے ہونے لگے تھے۔

ساون خالی خولی گزر چکا تھا۔ بھادوں میں ایک بوند بھی پانی نہیں برسا تھا اور آسن ختم ہونے کو آیا تھا، لیکن آسمان صاف شفاف تھا۔ البتہ دھان کے پودے پیلے ہونے لگے تھے۔

کسانوں کے چہرے بھی پیلے پڑنے لگے تھے۔

پانی، قحط اور آنے والی تباہیوں کے علاوہ گاؤں میں کوئی اور موضوع نہیں رہ گیا تھا۔ چوپال پر بھی رونا، پنگھٹ پر اسی مصیبت کا تذکرہ، یہاں تک کہ پرائمری اسکول کی طرف جاتے ہوئے بچّے بھی کھیل کود کے تذکرے چھوڑ کر یہی باتیں کیا کرتے تھے۔

لیکن پانی نہیں برسا اور آسن بھی گاؤں کے کسانوں کی طرح خالی خولی، منہ بسورے رخصت ہو گیا!

جب آسن بھی بیت گیا تو لوگوں کی تشویش بہت بڑھ گئی۔

بھکشو جیتن اُن دونوں کو بہت پیار کرتے تھے۔ اور وہ دونوں بھکشو جیتن کو اپنا گرو، دیوتا بلکہ کسی حد تک بھگوان مانتے تھے اور انھیں گرو دیو کہتے تھے چنانچہ جب آسن بھی بیت گیا اور پانی بھی نہیں پڑا تو اُن دونوں نے چپکے چپکے صلاح کی کہ بھکشو جیتن کے پاس چلنا چاہیئے، شاید گرو دیو کوئی جتن کریں۔

بھکشو جیتن کے پاس پہنچ کر رنجنا رو پڑی لیکن بولی کچھ نہیں۔

بھکشو جیتن اُس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہنے لگے۔

"یہ خود غرضی ہے بہن، اور خود غرضی ایک ایسی بیماری ہے جو نہ صرف مریض کو بلکہ اُس کی قوم کو تباہ کر دیتی ہے۔"

"میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا گرو دیو؟" بندر نے حیرت سے بھکشو جیتن کی طرف دیکھا۔ "کیا خود غرضی ہے؟ کس کی خود غرضی ہے؟"

"میری بہن رنجنا کے آنسو۔" بھکشو جیتن کہنے لگا۔ "یہ آنسو ندامت سے بوجھل نظر آتے ہیں۔"

"کاہے کی ندامت گرو دیو۔" اب کے رنجنا نے پوچھا۔ "ہم نے تو کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا جو آپ کے آگے سر جھکانا پڑے۔ ہمارے سر تو صرف عقیدت میں جھکتے آئے ہیں۔"

"لیکن آج اپنی آتما میں رہنے والی رنجنا کا سر مجھے ندامت سے جھکا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔" بھکشو جیتن مسکرائے اور پھر رک رک کر کہنے لگے۔ "میری بہن کے دل کی گہرائی میں یہ سوچ ہے کہ پانی نہیں برسے گا تو دھان نہیں اُپجے گا اور دھان نہیں اُپجے گا تو اُس کا باپ پچھلے قرض تو وصول ہی نہیں کر پائے گا رنجنا کی شادی کیسے کرے گا؟"

رنجنا نے سر اٹھایا اور بھکشو جیتن کی طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جس میں بے پناہ عقیدت تھی لیکن اُس عقیدت میں ندامت بھی شامل تھی اور ندامت التجا بے چارگی اور بے بسی سے رنگی ہوئی تھی۔

"میں بھگوان نہیں رنجنا۔" بھکشو جیتن کہنے لگے۔ "اگر میں بھگوان ہوتا تو سب سے پہلے تمھاری شادی کرا دیتا اور تب کہیں پانی برسانے کی بات سوچتا۔ لیکن میں بھگوان نہیں، میں ایک کمزور انسان ہوں وہی کمزور انسان جس کم بخت کو اپنی طاقت پر بڑا گھمنڈ ہے جو آسمان کی سیر ضرور کرے گا۔ لیکن آکاش کی چھاتی چیر کر پانی برسانے کی بات کبھی

نہیں ہے ــ تپا۔ رنجنا میں کیا کروں؟"

"گرودیو میں آپ سے ایک رائے لینا چاہتا ہوں۔" بنسو بولا۔ "آپ کی رائے کے بغیر میں کچھ کرنا نہیں چاہتا اسی لئے....."

"پوچھو بنسو۔" بھکشو چیتن نے کہا۔ "حالانکہ میرا وشواس ہے کہ اگر انسان کا دل صاف ہے اور ارادہ نیک ہے تو صرف اور صرف اپنے دماغ کی رائے پر عمل کرنا چاہئے۔"

"لیکن میرا دماغ کام نہیں کرتا گرودیو اسی لئے....." بنسو بولا۔

"خیر بات کیا ہے؟" بھکشو چیتن نے پوچھا۔

"گرودیو!" بنسو کہنے لگا۔ "آپ تو جانتے ہیں کہ میں گیارہ سال تک فوج میں کام کرتا رہا ہوں، میں ڈائنامیٹ بنانا جانتا ہوں....."

"کیا زمین دار کے لگان سے بچنے کے لئے اُس کا مکان اڑا دینے کا ارادہ ہے؟" بھکشو چیتن مسکرائے۔

"نہیں گرودیو۔" بنسو کہنے لگا۔ "مجھ پاپی کی قسمت میں جتنے معصوموں کی جانیں تھیں میں لے چکا۔ ہزاروں جانیں ہیں گرودیو۔ ہزاروں جانیں....."

احساسِ ندامت سے بنسو کی آواز اس قدر بھرّا گئی کہ وہ آگے کچھ نہیں کہہ سکا۔ چند لمحوں تک بالکل سکوت طاری رہا، پھر بنسو کہنے لگا۔

"گرودیو برہتی ندی میں زمیندار نے جو باندھ لگا دیا ہے وہ بالکل بدمعاشی ہے برہتی ندی کے اُس پار سارے کھیت زمین دار کے ہیں اور وہ باندھ اُس نے اسی لئے بندھوایا تھا کہ اُس کے کھیت مرنے نہ پائیں۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ندی کے اِس پار اگر بارش نہیں ہوئی تو ایک چھٹانک دھان بھی اُپجنا مشکل ہے وہ باندھ اگر توڑ دیا جائے....."

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم زمین دار کی کوٹھی سے دھان چُرانا چاہتے ہو۔"

بھکشو چیتن مسکرانے لگے۔ "چوری بہر حال چوری ہے بنسو چاہے چور ہی کے گھر کیوں نہ کی جائے اور چاہے اُس کا طریقہ شہد کی مکھیوں کے چھتے سے شہد نکالنے جیسا عام اور بظاہر بے گناہ کیوں نہ ہو!"

"گرودیو آپ چل کے دیکھ لیجئے۔" بنسو جلدی سے کہنے لگا۔ "زمین دار کے کھیتوں کو اب ایک قطرہ پانی کی بھی ضرورت نہیں۔ وہ تو اپنے کھیتوں سے پانی نکال رہا ہے یہ صرف بدمعاشی ہے کہ وہ باندھ توڑنے نہیں دیتا۔"

بھکشو چیتن رنجنا اور بنسو کے ساتھ اُسی وقت چل پڑے۔ برہتی ندی کے اُس پار جا کر انھوں نے زمین دار کے ایک ایک کھیت کا معائنہ کیا اور اطمینان کر لیا کہ اب زمین دار کے کھیتوں کو پانی کی ضرورت نہیں اور تب وہ بولے۔

"یہ لوگ بھگوان کی دی ہوئی عام نعمتوں پر بھی اجارہ داری کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کا بس چلے تو ہوا، دھوپ اور چاندنی کو بھی بند کر کے رکھ لیں۔"

"اور پھر گرودیو۔" بنسو نے کہا۔ "اتنا کافی پانی ہے۔ ہمارے کھیتوں کو سیراب کرنے کے بعد بھی کافی بچ جائے گا۔ کیا یہ بھی چوری ہے؟"

"نہیں۔" بھکشو چیتن کہنے لگے۔ "یہ ایسا ہے جیسے الگنی پر کسی کی دھوتی سوکھ رہی ہے اور کوئی سردی کا مارا غریب دھوتی ایک طرف کھسکا کر دھوپ کھانے لگے۔"

"گرودیو۔" رنجنا اور بنسو جیسے ایک ساتھ چیخے اور اُن کے چہرے خوشی سے دمکنے لگے۔

"لیکن بنسو۔" بھکشو چیتن نے کہا۔ "یہ باندھ توڑنا کوئی آسان کام نہیں زمین دار روکے گا اور خون خرابا ہوگا۔"

"راتوں رات ٹوٹ جائے گا گرودیو۔" بنسو نے بڑی ہمت سے کہا۔

"راتوں رات توڑنے کے لئے کافی آدمیوں کی ضرورت ہوگی۔" بھکشو چیتن کہنے لگے "اور میرا خیال ہے گاؤں کے دوسرے لوگ زمین دار کی مرضی کے خلاف کام میں تمھارا ساتھ نہ دیں گے۔ بغاوت کا جذبہ بھگوان کی دین ہے جو ہر کسی کو نہیں ملتا۔ کبھی کبھی بزدلی کو وفاداری کا خوبصورت نام دے دیا جاتا ہے اور لوگ اِس خوبصورت نام کے پیچھے چھپی ہوئی بزدلی کو نہیں دیکھ پاتے۔ تمھارے گاؤں کے سیدھے سادے لوگ بھی انھیں میں سے ہیں۔"

"گرودیو!" بنسو مسکرایا۔ "مجھے بھگوان کی دی ہوئی شکتی اور بُدھی کے علاوہ اور کسی سے سہارا نہیں لینا ہے۔"

"اوہ اب میں سمجھا۔" بھکشو چیتن مسکراتے ہوئے اُس کی پیٹھ تھپ تھپانے لگے۔ "تم گیارہ سال تک فوج میں رہ چکے ہو اور تمھیں ڈائنامیٹ بنانا آتا ہے۔"

"جی۔ گرودیو!" بنسو نے سر جھکا دیا۔

"کاش مجھے ایسا ڈائنامیٹ بنانا آتا جو رنجنا اور تمھارے خاندان کی پشتوں کی خاندانی دشمنی کو تباہ کر سکتا۔" بھکشو چیتن کچھ سوچ میں پڑ گئے اور رنجنا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ماحول پر کچھ ایسی مردنی چھا گئی کہ بھکشو چیتن بھی اُس مُردنی کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے اور انھوں نے جلدی سے بنسو کی پیٹھ تھپتھپاتے

ہوئے کہا۔ "جاؤ بنسو! بھگوان تمھیں شکتی اور بُدھی سے کام لینے کی صلاحیت دے۔"

"ایک بات میں بھی پوچھنا چاہتی ہوں گرودیو!" رنجنا نے جیسے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"پوچھو بہن۔" بھکشو چیتن نے کہا "کیا تم بھی ڈائنامیٹ بنانا چاہتی ہو؟"

"گرودیو!" رنجنا کی آواز بھاری ہو گئی "میرے اور بنسو کے خاندانوں میں عداوت اور دشمنی کیوں ہے؟ اس کا کارن کیا ہے گرودیو؟ کیا کوئی بہت بڑا کارن ہے جو ہم دونوں کے پریم سے بھی بڑا ہے؟۔ ایسا ہے تو پھر یہ دشمنی کبھی ختم بھی ہو گی؟ اگر ختم نہ ہوئی گرودیو، تو پھر.... تو پھر...."

"میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ تم دونوں آپس میں بے پناہ پیار کرتے ہو۔" بھکشو چیتن کہنے لگے۔ "پیار بس پیار۔ پیار دشمنی سے بلوان ہے، باقی رہے تمھارے سوال، نہ میں اس کا جواب دے سکتا ہوں نہ تمھیں ان سوالوں کے چکّر میں پڑنے کی صلاح دوں گا۔"

"گرودیو۔" رنجنا رو پڑی۔

"رنجنا!" بھکشو چیتن کہنے لگے "ہو سکتا ہے بھگوان ہی کو کچھ لوگ پریم کہتے ہوں۔ تو سنو رنجنا بھگوان بدھ سے کچھ لوگوں نے، آتما اور بھگوان، پرلے اور پُنرجنم وغیرہ کے بارے میں بہت سے سوال کئے تھے۔ لیکن بھگوان بدھ نے کبھی اُن احمقانہ سوالوں کا جواب نہیں دیا۔"

"ایسا کیوں گرودیو؟" بنسو نے پوچھا

"مانو تمھیں ایک تیر آ لگا ہے۔" بھکشو چیتن کہنے لگے۔ "لوگ تمھاری چیخ سُن کر تمھارے پاس دوڑ پڑے۔ ابھی تم میں جان باقی ہے، لوگوں نے تمھارے سینے سے تیر نکال لینا چاہا۔ مگر تم انھیں روکتے ہو۔ پوچھتے ہو۔ مجھ کو کس نے تیر مارا مجھ سے کسے دشمنی تھی، آخر اُس نے تیر کیوں مارا؟ چھُرا بھی تو گھونپ سکتا تھا۔ شاید وہ میرے سامنے آنا نہیں چاہتا؟ وہ کیوں میرے سامنے نہیں آنا چاہتا۔؟ کیا یہ تیر زہر میں بجھا ہوا ہے؟ کتنی دُوری سے اُس نے تیر چلایا.... تم لوگوں کو مجبور کرتے ہو کہ وہ تمھیں یہ سب کچھ بتائیں، لوگ تحقیق کرنے کو روانہ ہی ہوتے ہیں کہ تمھاری جان نکل جاتی ہے۔ حالاں کہ یہ ہو سکتا تھا کہ اگر فوراً تمھارے سینے سے تیر نکال لیا جائے تو تم بچ جاتے۔"

"گرودیو!" رنجنا بڑی بے چارگی سے بولی۔

"رنجنا۔" بھکشو چیتن کہنے لگے "انسان نیکیاں کرنے کے لئے بنایا گیا ہے اگر وہ آتما، روح، بھگوان، پرلے اور پُنرجنم کے چکّر میں پھنسا رہے تو من کی اشانتی دُور نہیں ہو سکتی اور اسی کرب میں دم نکل جائے گا اور آدمی کچھ نہیں کر پائے گا۔ پریم من اور آتما کی شانتی ہے رنجنا۔ پریم اگر آلائشوں سے پاک ہے تو یقیناً پریم ہی بھگوان ہے۔ پریم کے بارے میں تمھارے سوالوں کا میں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ تم دونوں بس پریم کرتے جاؤ۔ بھگوان تمھیں شکتی دے، اس پریم کو آلائشوں سے پاک رکھ سکو....."

"تو میری چھاتی میں جو تیر لگا ہے گرودیو؟" رنجنا نے پوچھا

"پریم کا مقابلہ تیر سے کرتی ہو رنجنا بہن؟" بھکشو چیتن مسکرائے "پریم پھول ہے تیر نہیں۔ ہاں تم اپنی اور بنسو کی خاندانی دشمنی کو اپنی شانتی کی چھاتی پر تیر سمجھ سکتی ہو، نکال دو اُس تیر کو، اور انتظار کرو شاید زخم بھر ہی جائے۔"

بھکشو چیتن کی باتوں سے رنجنا اور بنسو کو بڑی تقویت پہنچی اور جب وہ واپس ہو رہے تھے تو اُن کے دل کا بوجھ کافی ہلکا ہو چکا تھا۔

بنسو شہر گیا اور بارود کا مسالہ لے آیا۔

راتوں رات جاگ کر اُس نے صرف دو دن میں دو ڈائنامیٹ تیار کر لئے۔ یہ سب کچھ وہ گاؤں سے دور ہٹ کر ایک قبرستان کی ٹوٹی پھوٹی خانقاہ میں کر رہا تھا۔ اور رنجنا برابر اُس کے ساتھ تھی۔ چناں چہ جس رات کو باندھ اڑانے کی بات تھی، رنجنا یوں خوش تھی جیسے دیوالی کی آتش بازیاں چھوڑنے کے لئے شام کا انتظار کر رہی ہو!

چناں چہ بنسو نے بڑی خوشامد کر کے ڈائنامیٹ کے فیتے میں آگ اُسی نے لگائی، اور آگ لگا کر وہ دونوں خوب تیزی کے ساتھ دوڑ کر بھاگ آئے۔ اور وہ گاؤں کے قریب ہی پہنچے تھے کہ زوردار دھماکہ ہوا۔

سارا گاؤں آواز کی طرف دوڑ پڑا

باندھ ٹوٹ چکا تھا اور ندی خوشی کا پیغام لئے بہتی ندی گاؤں کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اور رنجنا اور بنسو ایک درخت کے نیچے سہمے کھڑے تھے۔ اس واقعے کی اطلاع رنجنا کے ماں باپ کو ہوئی تو اس کا گھر سے نکلنا بند ہو گیا۔

اور بنسو کے باپ نے اُسے اتنا پیٹا، اتنا پیٹا کہ وہ کھاٹ پر پڑ گیا۔ اور یک بیک پانی آ جانے کی وجہ سے کھیتوں میں جو پھر سے تھوڑا بہت کام کرنا

پیدا وہ بیٹو کے باپ نے تنہا ہی کیا۔

زمیں دار نے پولس میں رپورٹ کردی تھی اور بڑی تندہی کے ساتھ تفتیش ہو رہی تھی کہ یا نہ مگر کس نے اٹھایا۔

رنجنا کی نظر بندی اور بیٹو کے چلے جانے پر بھکشو چیتن اُن دونوں کے ماں باپ سے ملے۔ انھیں سمجھایا، اُن کی خوشامد کی اور اُن کے پاؤں تک چھوئے کہ وہ رنجنا کی شادی کر دیں۔ مگر انھیں کچھ بھی کچھ نہ مل سکا۔

نتیجہ یہی رنجنا نے بھی منہ کھولا۔

"بابو، اِس دن شرم آتی ہے کہ دشمنی دوستی میں بھی تو بدل سکتی ہے۔ میرے لئے تم ایک پرانی دشمنی کا خون نہیں کر سکتے۔"

"نہیں،" اُس کے باپ نے کہا، "میں تیرا خون کر دوں گا اگر تو نے پھر اُس سانپ کے بچے کا نام لیا۔"

رنجنا سسکیاں لینے لگی۔

ایک دن اُس نے ماں سے بھی کہا۔ لیکن ماں نے کوئی جواب نہیں دیا البتہ اُسے چھاتی سے لگا کر رونے لگی۔

اور ایک رات رنجنا بڑی جدوجہد کے بعد گھر سے نکل پڑی۔ وہ سیدھے بھکشو چیتن کے پاس پہنچی۔ بھکشو چیتن سوئے ہوئے تھے۔ رنجنا اُن کے چرنوں میں چہرہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ بھکشو جی جاگ گئے، چونک کر اٹھے تو دیکھا رنجنا رو رہی ہے وہ رنجنا کے ماتھے پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگے۔ لیکن اُن کی زبان جیسے گنگ ہو گئی تھی۔ رنجنا بڑی دیر تک روتی رہی مگر وہ ایک لفظ بھی نہ بولے۔ آخر رنجنا نے سر اٹھایا۔ بھکشو چیتن کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر اُن کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ رنجنا نے اُن کے آنسو اپنی آنکھوں سے لگائے اور اپنے ماتھے پر آنسو کا ٹیکہ لگا کر بالکل چپ چاپ رخصت ہو گئی۔ بھکشو چیتن پھر بھی اُس سے کچھ نہیں کہہ سکے۔ آشیرباد بھی نہ دے سکے۔ اُسے روک بھی نہ سکے۔ اور رنجنا واپس چلی گئی۔

اُس رات ایک زور کا دھماکا ہوا۔

گاؤں کے لوگ آواز کی طرف دوڑ پڑے۔

گاؤں سے کافی دور پہاڑ قبرستان میں ٹوٹی پھوٹی بدھ خانقاہ تھی جو ختم ہو گئی تھی۔

اور رنجنا کے جسم کے ٹکڑے پرزے پرزے ہو کر اِدھر اُدھر پڑے ہوئے تھے۔

انسانی حقوق

۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے انسانی حقوق کا باقاعدہ اعلان کیا تھا۔ یہ اعلان تیس دفعات پر مشتمل ہے جن کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

دنیا کے سب انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں اور عزت و وقار اور حقوق کے معاملہ میں برابر ہیں۔

ان حقوق کے حصول میں جگہ، پیدائش، رنگ و نسل، ذات پات، عمر، حالت دولت، زبان، مذہب یا سیاسی عقائد کا امتیاز نہیں ہونا چاہئے۔ دنیا کے تمام انسانوں کو چاہے وہ آزاد ہیں یا کسی دوسرے ملک کے ماتحت برابر کے یہ حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔

ہر شخص کو زندگی، آزادی اور سلامتی کا حق حاصل ہے۔ دنیا میں کوئی شخص غلام بنا کر نہیں رکھا جائے گا اور غلامی اور بردہ فروشی کو ہر صورت میں ختم کر دیا جائے گا۔

کسی شخص کے ساتھ غیر انسانی، ظالمانہ یا تہذیب سے گرا ہوا سلوک نہ کیا جائے گا اور نہ ایسی کوئی سزا دی جائے گی۔

قانون کی نظر میں سب انسان برابر ہیں کسی کے ساتھ کسی طرح کا امتیاز نہ برتا جائے گا۔

کسی شخص کو مناسب کارروائی کے بغیر نہ تو گرفتار کیا جائے گا اور نہ حراست میں رکھا جائے گا۔ اور نہ جلاوطن کیا جائے گا۔

ہر شخص کو اس کے خلاف لگائے گئے الزاموں کی صفائی پیش کرنے کا حق ہوگا اور اس کا مقدمہ آزاد اور غیر جانب دار عدالت میں سنا جائے گا۔

کسی شخص کے نجی اور خاندانی معاملوں میں کوئی مداخلت نہ کی جائے گی۔

ہر شخص کو اپنے ملک میں گھومنے پھرنے اور سکونت اختیار کرنے کی آزادی ہوگی۔

ہر شخص کو قومیت رکھنے کا حق حاصل ہوگا اور بے اصولی طور سے نہ تو کسی کو قومیت سے محروم کیا جائے گا اور نہ اس سے قومیت بدلنے کا حق چھینا جائے گا۔

ہر شخص کو بلا روک ٹوک شادی کرنے اور اپنا گھر بسانے کا حق ہوگا۔ ہر شخص کو جائداد رکھنے کا حق ہوگا اور بے اصولی طور سے اس کو اپنی جائداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

مذہب، عقیدہ، عبادت اور تبلیغ کی ہر شخص کو آزادی ہوگی کسی بھی قسم کے خیالات رکھنے اور ان کا اظہار کرنے کی ہر شخص کو آزادی ہوگی۔

ہر شخص کو پُرامن طور پر جماعت بنانے اور جلسہ کرنے کی آزادی ہوگی۔ ہر شخص کو براہ راست یا اپنے نمائندوں کی معرفت اپنے ملک کی حکومت میں حصہ لینے کا حق ہوگا۔ حکومت کی بنیاد عوام کی مرضی پر قائم ہوگی۔ اور اس کے اظہار کے لئے وقتاً فوقتاً انتخابات ہوا کریں گے۔

ہر شخص کو معاشی، سماجی اور ثقافتی حقوق حاصل ہوں گے۔

ہر شخص جس قسم کا چاہے کاروبار کر سکے گا برابر کا کام کرنے کے لئے سب کو یکساں معاوضہ ملے گا۔ ہر شخص کو اپنے معاشی حقوق کی حفاظت کے لئے ٹریڈ یونین بنانے اور اس میں شامل ہونے کا اختیار ہوگا۔

ہر شخص کو فرصت پانے اور آرام کرنے اور بیماری وغیرہ کی حالت میں سماجی حفاظت کا حق حاصل ہوگا۔ بڑھاپے، حادثے، بے کاری، موت وغیرہ کی صورت میں سب کو سماجی حفاظت حاصل ہوگی۔

ہر شخص کو تعلیم حاصل کرنے کا حق ہوگا۔ ابتدائی تعلیم مفت اور لازمی ہوگی۔ لوگوں کے دیگر ثقافتی حقوق کی بھی حفاظت کی جائے گی۔

ان حقوق کے ساتھ ہر شخص کو اپنے فرائض بھی ادا کرنے ہوں گے کیوں کہ فرائض کی ادائیگی پر ہی حقوق کی بنیاد قائم ہے۔

حسرت سہروردی

شاہجہاں کی آواز

تم مجھے شاہجہاں کہہ کے پکارا نہ کرو
میں شہنشاہ بھی ہوں، اور ایک انسان بھی ہوں
تم نے تو شاہجہاں ہی کو فقط دیکھا ہے
تم کو سطوت کے نشاں ہی نظر آئے ہر سو
کاش تم دیکھ بھی سکتے میرا کاشانۂ دل
عظمت و شوکتِ انسان کا گہوارہ ہے
یہ میرا تاج محل اور یہ میرا قلعہ
ان کا ہر نقش یہ دیتا ہے گواہی اے دوست
میں نے مزدور کے فن کار کو پہچانا ہے
میں نے مزدور کو بخشی ہے حیاتِ جاوید

جب بھی دو عشق کے ماروں کی زباں پر اے دوست
نام "ممتاز" کا آئے گا بصد حسنِ خلوص
ساتھ ہی عظمتِ مزدور بھی ظاہر ہوگی
لوگ فن کار کے اخلاص کے گن گائیں گے

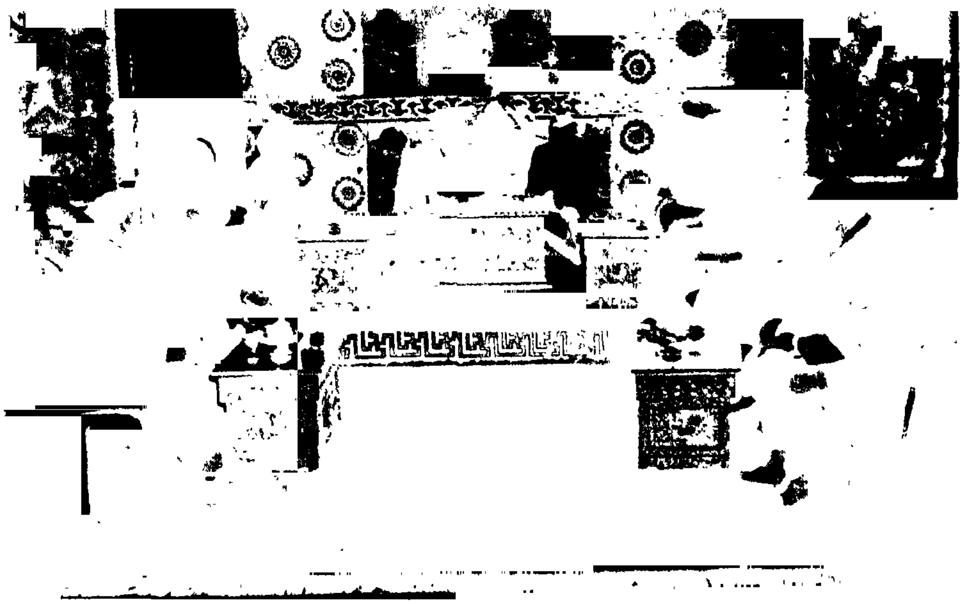
میں تو تاریخ کے صفحات میں چھپ جاؤں گا
کون جانے کہ نئی پود مجھے بھول ہی جائے
لیکن اے دوست میرا تاج محل ہے جب تک
لوگ فن کار کی عظمت کو نہیں بھولیں گے
لوگ فن کار کے اخلاص کے گن گائیں گے

میری تخئیل کو مرمر میں سمونے والے
نہ مٹے ہیں۔ نہ مٹیں گے نہ ہی مٹ سکتے ہیں

تم مجھے شاہجہاں کہہ کے پکارا نہ کرو
میں شہنشاہ بھی ہوں اور ایک انسان بھی ہوں



پراجیکٹ علاقے میں رضاکارانہ محنت



یراعظم پنڈت جواہرلال نہرو
بھوٹان میں

پنڈت نہرو تھمپو زونگ میں مہاراجہ بھوٹان کے ساتھ



پنڈت نہرو اور شریمتی اندرا گاندھی تبت اور بھوٹان کی سرحد پر



پنڈت نہرو گھوڑے پر سوار چیری تھانگ جا رہے ہیں۔



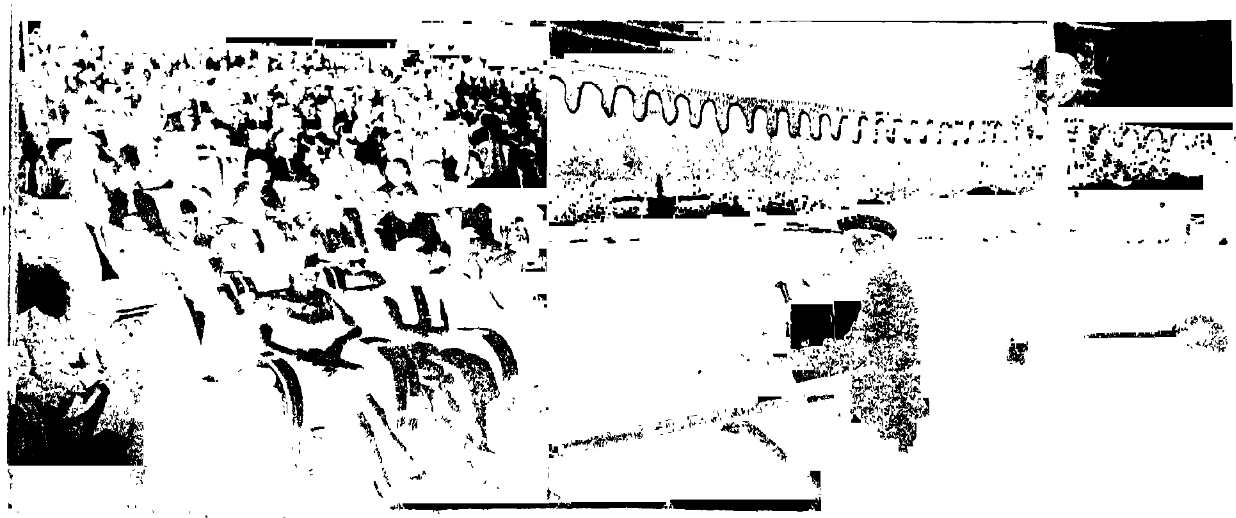
ڈاکٹر راجندر پرساد کا ٹوکیو میں شاندار استقبال

صدر جمہوریہ کا دورۂ جاپان



ڈاکٹر راجندر پرساد شہنشاہ جاپان کے ساتھ

پنڈت نہرو انڈیا ۱۹۵۸ء نمائش کا افتتاح کر رہے ہیں





بدل جرمن ریپبلک کے نائب وزیر اعظم ڈاکٹر لڈوگ ارہارڈ
علی گڑھ یونی ورسٹی کے پرو چانسلر نواب چھتاری
اکٹر آف لیٹرز کی اعزازی ڈگری پیش کر رہے ہیں۔



وزیر اعظم پنڈت نہرو فنڈ بینک کے سالانہ اجلاس کے
افتتاح کے موقع پر وگیان بھون (نئی دہلی) میں

عالمی بنک کے صدر مسٹر یوجین بلیک
بنک کے گورنروں سے خطاب کر رہے ہیں۔



ہمایوں مرزا

شاہ حاتم اور مزاحیہ نسخۂ لاجواب

شاہ حاتم اُردو کے متقدمین شعراء دہلی میں ہیں جنھوں نے ولی دکھنی جدید ریختہ کے باوا آدم کی پیروی کی ہے، اردو شاعری کی شمالی ہند میں داغ بیل ڈالی، جن کے تلامذہ میں مرزا رفیع سودا، میاں رنگین شاہ، اور تاباں وغیرہ اساتذۂ سخن شامل ہیں۔

شاہ حاتم محتاج تعارف نہیں، مختصر حالات درج ذیل ہیں:۔

" شیخ ظہور الدین نام، تخلص حاتم، ابن شخص فتح الدین، پیشہ سپہ گری، ولادت حاتم ۱۱۱۱ھ بمقام شاہجہان آباد، دہلی مادہ تاریخ ولادت "ظہور" ہے (عقدِ ثریا مؤلفہ مصحفی مطبوعہ)
۱۱۱۱ھ

تعلیم و تربیت

تعلیم و تربیت کے متعلق کوئی پتہ نہیں چلتا۔ کتب درسی اور علم عروض و قافیہ پر کافی عبور تھا۔ چناں چہ دیباچۂ فارسی، "دیوان زادہ" ان کی قوتِ تحریر اور معلومات ادبی پر دال ہے، شاہ صاحب کا فارسی دیوان بھی مختصر تھا۔ (آبحیات)

ذریعۂ معاش

نواب عمدۃ الملک امیر خاں انجام کے یہاں ملازم تھے، بکاول یعنی خانسامانی کی خدمت سپرد تھی، نیز ندیم خاص بھی تھے، نواب مرحوم صاحب ذوق اور شعراء کے قدردان تھے۔ اس لحاظ سے شاہ صاحب کو اکثر امراء سے ربط و ضبط تھا، عہد محمد شاہ کی بدنظمی، بے اطمینانی اور ناقدری نے صاحب حوصلہ بنا دیا تھا۔ افلاس کے شکار تھے جس کا ایک مرقع شاہ صاحب نے اپنے ایک مخمس شہر آشوب میں کھینچا ہے جس کے تریپن (۵۳) بند ہیں، دو ایک درج ذیل ہیں:

تو کھول چشم دل اور دیکھ قدرت حق یار
کہ جتنے ارض و سما اور کیا ہے لیل و نہار
نہ کھو تو عمر کو غفلت میں ٹک تو ہو ہوشیار
کہ دور بارہ صدی کا ہے سخت کج رفتار
جہاں کے باغ میں یکساں ہے اب خزان و بہار

کرے ہے چرخ اگر تجھ او پر جفا حاتم
تو سفلے پاس نہ کر جا کے التجا حاتم
ترے ہے رزق کا ضامن سدا خدا حاتم
تو انقلابِ زمانے سے غم نہ کر حاتم
کہ تجھ کو رزق بہت اور روزگار ہزار

شعر و شاعری

ریختہ میں شاہ صاحب کا تخلص حاتم اور فارسی میں رمز تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ریختہ گوئی سے پہلے فارسی میں بطرز مرزا صائب کہا کرتے تھے، مگر حاتم نے اپنے ایک شعر میں اس طرح اشارہ کیا ہے ؎

ریختہ میں ہند کی طوطی کا حاتم ہے غلام
فارسی میں خوشہ چیں ہے بلبلِ شیراز کا

طوطیٔ ہند سے مراد تو ولی دکھنی ہیں کیونکہ انھوں نے ولی کی پیروی کی ہے اور ولی کو ریختہ کا موجد مانتے ہیں۔ مگر بلبلِ شیراز سے ان کی مراد غالباً سعدی شیرازی یا حافظ شیرازی معلوم ہوتے ہیں۔

شاہ حاتم نے اردو شاعری کی ابتداء ولی کی وفات ۱۱۱۹ھ کے دس سال بعد ۱۱۲۹ھ سے گویا اٹھارہ سال کی عمر سے شروع کی۔ مصحفی نے اپنے تذکرہ میں اشارہ کیا ہے کہ ولی کا دیوان ۲ سنہ جلوس محمد شاہی مطابق ۱۱۳۲ھ میں دہلی آیا اس وقت دہلی کے شعراء نے ریختہ میں طبع آزمائی شروع کی۔ مگر حاتم نے بموجب بیان تذکرہ ... ولی کا دیوان وہاں پہنچنے سے دو تین سال قبل ہی سے ریختہ کہنا شروع کیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ولی ۱۱۱۲ھ میں دہلی میں موجود تھے اور حاتم نے ولی کی غزل پر غزل کہی تھی۔ ایک شعر یہ ہے —

اے ولی مجھ سے اب آزردہ نہ ہونا کہ مجھے
یہ غزل کہتے تو اب نے فرمائی ہے

مگر تاریخ سے ثابت ہے کہ ولی عہد محمد شاہی میں دہلی آئے تھے اور شاہ حاتم یا نواب امیر خاں انجام سے بھی ملے تھے۔ موجودہ تحقیقات کی رو سے ولی کا سنہ وفات ۱۱۱۹ھ متحقق ہو چکا ہے اور شاہ حاتم کا سال ولادت بھی ۱۱۱۱ھ مسلم ہے۔ اس لحاظ سے ولی کی وفات کے وقت حاتم کی عمر سات آٹھ سال سے زاید نہ تھی۔

حاتم کی مدتِ شاعری

خود شاہ صاحب نے اپنی مدت شاعری کا دیوان زادہ میں اس طرح تعین کیا ہے :

"از ۱۱۲۹ھ تا ۱۱۶۹ھ کہ چہل سال باشد عمر درین فن صرف کردہ۔"

اور چونکہ ۱۲۰۷ھ میں وفات پائی ہے اس لئے کل مدت شاعری اٹھتر سال قرار پائی ہے۔ شاہ صاحب کو عام طور پر شعراء متقدمین یعنی طبقۂ اول میں شمار کیا جاتا ہے، مگر بقول مولانا محمد حسین آزاد مرحوم، یہ بعد میں اصلاحِ زبان کی طرف متوجہ ہوئے اور بہت سے قدیم الفاظ متروک کر دئے، اور عربی و فارسی قریب الفہم اور کثیر الاستعمال الفاظ باقی رکھے، اور حضرت امیر خسرو قدس سرہٗ نے اعجاز خسروی میں لکھا ہے کہ فارسی میں عربی الفاظ کا ذائقہ اتنا ہونا چاہیئے جیسے کھانے میں نمک تاکہ چٹخارا باقی رہے۔ چنانچہ انگریزی زبان میں بھی لاطینی برجستہ فقرے خصوصاً قانون میں بڑا مزہ دیتے ہیں مثلاً Statusquo In toto Inter Alia وغیرہ اسی طرح اردو شعراء نے فارسی و عربی فقرے اپنے اشعار میں نگینے کی طرح جڑدئے ہیں اور ہماری اردو زبان کے جزو لاینفک ہو گئے ہیں۔ مگر بلا وجہ عربی اور فارسی ناقابلِ فہم الفاظ کی ٹھونس ٹھانس سے وہ سلاست و روانی باقی نہیں رہ سکتی۔ غرض شاہ حاتم نے جس معیار کو آج سے ڈھائی سو سال قبل اختیار کیا تھا اس کی تفصیل دیوان زادہ حاتم میں موجود ہے۔

اخلاق و عادات

حاتم نہایت منکسر المزاج حلیم الطبع تھے۔ تلامذہ کے اعتراضات کو بھی بڑی خوبی سے نبھا لیتے تھے اور بجائے غم و غصہ کے تعریف کر دیتے تھے۔ بیان ہے ان کے ایک شعر پر میاں رنگین کا اعتراض اور اصلاح کچھ نہیں ہے بلکہ اپنے تلامذہ پر بڑا ناز تھا۔ مرزا سودا کی تعریف میں مرزا صائب کا شعر پڑھا کرتے تھے

ازادب صائب خموشم ورنہ در ہر داورے
رتبۂ شاگردئ من نیست استادِ مرا

وضع کے پابند، آزاد منش، بذلہ سنج اور فقیر دوست تھے۔ عہدِ شباب کی غزلیں آپ کی آزادروی کی شاہد ہیں۔ ان کی درویشانہ زندگی کا زمانہ ۱۱۴۳ھ گویا تقریباً بتیس سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے، جب کہ ان کو اہل دول کی صحبت سے نفرت ہو گئی تھی کہ نواب عمدۃ الملک کی ملازمت چھوڑ دی۔ اس کے بعد بھی پانچ سال تک طوعاً و کرہاً نواب ... خاں کے متوسل رہے۔ اہلِ کمال اکثر افلاس کا شکار رہے ہیں جس کا اظہار حاتم نے بھی اپنے اشعار میں کیا ہے۔

شاہ حاتم کو میر بادل علی شاہ سے بڑی عقیدت تھی۔ شاہ تسلیم کے تکیہ میں عمر کا زیادہ حصہ بسر ہوا جہاں دوست احباب اور تلامذہ کا جمگھٹا رہا کرتا تھا۔ اپنی آزاد مشربی کے متعلق کہتے ہیں:

آشنا حاتم غریبوں کا ہوا امراؤں کو چھوڑ
نام کو ذرہ نہیں ہے ان بچاروں میں دماغ

مجھے دیوان خانہ سے کسی منعم کے کیا حاتم
ہے آزادی سے رہنے کو بس تکیہ فقیروں کا

اپنی زندگی کا خاکہ اس طرح کھینچتے ہیں:—

شعر اوستادانہ، حاتم ہے مرنا یانہ وقتِ
طبعِ آزادانہ را اوقات دڑلیشانہ ہے

انجام بڑے ظریف اور خوش طبع تھے۔ ایک لطیفہ بغرض ضیافتِ طبع یہ ہے کہ ایک خان مردان خان نے بادشاہ سے کہ دہمدو کہا کہ جن لوگوں کے نام کے ساتھ لفظ "بان" ہوتا ہے وہ اچھے نہیں ہوتے جیسے فیل بان، شتربان وغیرہ۔ تو انجام نے فرمایا جی ہاں "مہربان" سچ کہتے ہو

معاصرین۔ دوسرے معاصرین سے حاتم کے تعلقات۔

ہدایت علی خاں ضمیر المخاطب بہ نصیر الدولہ بخشی الملک اسد جنگ، جن کی ہولی کی نظم کا ذکر گارساں دتاسی مشہور فرانسیسی مستشرق نے کیا ہے اور اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں "اورنال دی ساواں" کے نام سے کیا تھا۔ دوسرے خاص دوست، اشرف علی خاں فغاں تلمیذ ندیم احمد شاہ بادشاہ دہلی کے کوکہ تھے، یہ بھی بڑے خوش طبع تھے، ان کی ظرافت و بذلہ سنجی سے وہ شہرت پائی کہ دربار سے ظریف الملک کا خطاب پایا۔ ان کا دیوان انجمن ترقی اردو نے طبع کرایا ہے۔ تیسرے میر اسلم بھی حاتم کے خاص دوست تھے۔ معاصرین شعراء میں آبرو، مضمون، مظہر، احسن، ناجی، یکرنگ مشہور شعراء ہیں۔

تلامذہ:۔

مرزا رفیع سودا، تاباں، رنگین وغیرہ بیسیوں شاگرد تھے۔ ان میں سودا کو اردو زبان کا زبردست معمار، رکنِ اعظم اور قصیدہ اور ہجو کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔

حاتم، ناسازگاریٔ زمانہ سے نالاں تھے، ان کی زندگی عسرالحالی میں گزری زمانہ نے بھلا بیٹھنے نہ دیا ؎

یہ وہ چرخ ہے جس سے اہلِ ہنر   صدا چرخ کھاتے ہیں آٹھوں پہر

چنانچہ شاہ صاحب نے زمانۂ حیات میں قطعہ کہا تھا، جو یہ ہے ؎

جس وقت ہم مریں تو بھی دوستاں لکھو   جائے جواب نامہ ہمارے کفن کے بیچ
یعنی کہ یہ غریب زمانے کے ہاتھ سے   جا کر بسا تھا چھوڑ کے شہر کو بن کے بیچ
اس جا بھی آسمان نے نہ دی فرصت اس کے تئیں   مارا جلا کے آگ لگا تن بدن کے بیچ
چاہے تھا کچھ کہے کہ اسی دم میں ناگہاں   یوں آ گئی اجل کہ رہی من کی من کے بیچ

وفات۔

شاہ حاتم نے رمضان ۱۲۰۷ھ میں وفات پائی اور دلّی دروازہ کے باہر دفن ہوئے۔ تاریخِ وفات کے متعلق تذکرہ نویسوں کے بیانات میں اختلاف ہے مولانا محمد حسین آزاد نے گو تاریخِ وفات ۱۲۰۷ھ صحیح لکھی مگر بحوالہ مصحفی ۱۱۹۶ھ بھی بیان کی ہے۔ تذکرۂ مصحفی الموسوم بہ عقدِ ثریا تالیف ۱۱۹۹ھ میں تاریخِ وفات ۱۱۹۷ھ درج ہے اور الفاظ یہ ہیں:۔

"دو یک ہزار و یک صد و نود و ہفت در ماہ مبارک رمضان
رحلت کردہ فقیر تاریخ رحلتش چنیں یافتہ الخ"

نیز مصحفی نے اپنے دوسرے تذکرہ ہندی گویان میں جو فارسی تذکرہ مذکور سے دس سال بعد یعنی ۱۲۰۹ھ میں لکھا تھا۔ حاتم کی وفات کے متعلق لکھا ہے۔

"پیش ازیں در تذکرۂ فارسی احوال او معہ تاریخ رحلتش محرر
تحریر یافتہ، عمر قریب بصد رسیدہ بود، دو سہ سال است کہ
در شاہجہان آباد ودیعتِ حیات بسپردہ غدلیش بیامرزد الخ"

مزلفِ ہر گزشت حاتم نے بھی مصحفی کے اس تضاد و اختلاف پر کافی بحث فرمائی ہے اور ۱۲۰۷ھ صحیح سنہ وفات بیان کیا ہے۔ مگر ہم یہ عرض یہ ہے کہ مصحفی نے جو قطعہ وفات، عقدِ ثریا تالیف ۱۱۹۹ھ میں لکھا ہے۔ اس کے آخر مصرعہ سے دراصل ۱۲۰۷ھ ہی برآمد ہوتے ہیں، جو یہ ہے ؎

"حاتم آں پیشوائے اہلِ سخن   کہ قدم در مقامِ فقر فشرد
حرفِ عمرش قضا بہ کلکِ ہلاک   چو کراز صفحۂ زمانہ سترد
سالِ تاریخش از خرد جستم   تا ازیں مصرعہ بگوشم خورد
کہ بگو مصحفی چو پیوست   "آہ صد حیف شاہ حاتم مرد"

۱۲۰۷ھ

اب سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ ۱۱۹۵ھ کے تذکرہ میں ۱۲۰۷ھ کس طرح درج ہو سکتا ہے۔ مگر دراصل یہ ایک الحاقی چیز ہے جس کا اضافہ مصحفی نے بعد میں یعنی ۱۲۰۷ھ میں کیا ہوگا۔ اور ہمارا خیال ہے کہ کاتب صاحب کی عنایت سے سنہ کے اندراج میں غلطی ہو گئی، اور اس نے اپنی رو میں، بجائے "یک ہزار و دو صد و ہفت" کے "یک ہزار و صد و نود و ہفت" لکھ مارا۔ اس لیے کہ مادۂ وفات "آہ صد حیف شاہ حاتم مرد" کے اعداد ۱۲۰۷ھ ہی برآمد ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے مصحفی نے دراصل بالکل صحیح مادہ تاریخِ وفات لکھا ہے۔ جس کی تائید ان کے تذکرہ ہندی گویان تالیف ۱۲۰۹ھ سے ہوتی ہے۔

کلیاتِ شاہ حاتم

شاہ حاتم کا اپنا ضخیم کلیات تھا جو بہ عنوان من پیشہ مثل تھا جس کے نسخے لکھنؤ اور دہلی کے کتب خانوں میں موجود تھے۔ در آخر عمر میں حاتم نے اپنی غزلوں کا انتخاب کیا اور ایک مقدمہ بہت کارآمد تھا جو "دیوان زادہ" کے نام سے معروف ہے۔ اس کا اپنا نسخہ خود مصنف کا قلمی لندن میں موجود ہے بر گذشت حاتم مولفہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔ زیادہ تر لندن کے نسخہ پر مبنی ہے۔ مولانا آزاد نے آب حیات میں حاتم کی آٹھ غزلوں کا انتخاب درج کیا ہے۔ حاتم کی غزلیں مختلف بیاضوں میں بھی ملتی ہیں۔ شاہ کمال الدین حسینی انبیوری مولف مجموعۃ الانتخاب کے پاس بھی شاہ حاتم کا دیوان موجود تھا جس سے انھوں نے حاتم کی کوئی ہم غزلیں انتخاب کر کے درج تذکرہ کی ہیں بلکہ حاتم ... زیر بحث کو درج کیا ہے جو شاید کہیں اور نہ مل سکے۔ چونکہ یہ ایک قدیم شاعر کی یادگار ہے اس لئے ہم اس کو یہاں تبرکاً نقل کرتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ مزاحیہ نسخہ شاعر کے قلم کا ہے جبکہ حاتم امیر خاں انجام کے ملازم تھے اور اکثر امراء سے ان کی ملاقات ہوا کرتی تھی اور وہ دور شباب تھا جو ان کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی پر دال ہے۔ یہاں چہار تی زمانے میں حاتم نے مثنوی "قہوہ نامہ" و "تحفہ نامہ" بھی لکھی تھی اور ان کے خاص دوست اشرف علی خاں فغاں نے تو اپنی بذلہ سنجی کی وجہ سے "ظریف الملک" کا خطاب پایا تھا۔ ہم یہاں نسخہ زیر بحث جو اب تک پردۂ اخفا میں رہا ہے درج ذیل کرتے ہیں جس سے واضح ہوگا کہ اردو شعراء نثر میں بھی اودھ پنچ وغیرہ سے ایک صدی قبل اردو زبان میں طنز و مزاح کی ابتداء کر چکے تھے۔

اردو زبان میں مزاح و طنز

اردو نثر میں سنجیدہ مزاح نگاری کا سہرا مرزا غالب کے سر ہے اردوئے معلّٰی یعنی مکتوباتِ غالب میں اس کے نمونے ملتے ہیں۔ ان کے بعد بعض خاص اردو اخبارات اودھ پنچ نے اس کو زعفران زار بنا دیا۔ اگر جستجو کی جائے تو ظرافت کے نمونے قدیم دکھنی نظم و نثر میں بھی ملتے ہیں۔ ایک قدیم شاعر نیازی نے معشوق کا سراپا خوب باندھا ہے۔ کہتا ہے ؎

سکھی تو نیر کی تیرنی سو پیٹھک یاں دستے ہیں

(عشق)

غلیفی دو سو یاداماں، نین کو تال دستے ہیں

(کوتوال)

زلف تیری زیبی ہے دوکاناں کے شکر پارے

(حلیبی)

کھجور تجھ ناک ہے پیاری دو خرما گال دستے ہیں

دہی گولکنڈوی کہتا ہے ؎

گرڈی پھیچ کونیاں ٹوٹیاں پیرت کوں دھو دھو د جیا

جی بہار اپس تے نا اوٹھے سو بہار نا جا کیا سبب

عام دکنی اب بھی پیچ مرکو گرڈی کہتے چلے آتے ہیں۔

بعض دکھنی صوفیائے کرام نے پنے چکی ناموں میں طنز و مزاح کے پیرایہ میں عام پند و نصائح بلکہ امراء و شاہان وقت کا خوب خاکا اڑایا ہے۔ ایک شاعر تھے امین بیجاپوری مرید شاہ ظہیر الدین خلیفہ شاہ میراں جی خدا نما گولکنڈا دی (کمر خی گنبد والے) جو شاہ حاتم کے معاصر تھے اور انھوں نے بھی اوائل بارھویں صدی ہجری کا زمانہ پایا ہے اس میں کچھ حاتم کے شہر آشوب کی جھلک نظر آتی ہے۔ نالائق عورتوں اور نا اہل حاکموں کی خوب خبر لی ہے۔ وہ ایک بیت حاضر ہیں جن کو عورتیں چکی پر گاتی پیستی اور مذاق اڑایا کرتی تھیں۔

شہنشاہ اورنگ زیب کا آخری زمانہ بڑی پریشانی کا زمانہ تھا۔ قحط سالی سفلہ پروری، رشوت کی گرم بازاری، افلاس وغیرہ جن کا حاتم نے بھی رونا رویا ہے۔ غرض چکی نامہ میں شاعر کہتا ہے ؎

حاکم ہوئے جھوٹے قاضی چور یولائی ۔۔۔ اورنگ کی بادشاہی رشوت کی دہائی

قیامت آنے کی نشانی دلیس آئی ۔۔۔ بارویں صدی آئی اورنگ کی بادشاہی

حیرت ہے کہ مولوی نصیر الدین ہاشمی نے اس چکی نامہ کو شاہ امین الدین اعلیٰ بیجاپوری (وفات ۱۰۸۶ھ) کی تصنیف قرار دیا ہے جو غلط ہے۔

مگر قدیم اردو میں نثر کا نمونہ نہیں مل سکا۔ شمالی ہند کے شعراء میں شاہ حاتم کا حقہ نامہ، قہوہ نامہ، افیونی نامہ، ممتاز شاگرد سودا کا لاٹھی نامہ ملتا ہے۔ مرزا سودا تو ہجو کے بادشاہ ہی تھے ان کی تیغ زبان سے لوگوں کی روح کانپتی تھی۔ احسن اللہ خاں بیان تلمیذ مظہر جان جاناں نے بھی ایک شخص مرزا فیمو کی ہجو کی ہے۔ افیون اور بھنگ کا تو عام رواج تھا۔ دکنی

نہ زیب نے کس بحر میں ہے (ادارہ)

ہیں ایک شخص نے ایک جنگ نامہ پوستی و بھنگی نثر میں لکھا ہے جس کا ایک قدیم نسخہ ۱۲۷۶ھ ۱۸۵۹ء سے قبل کا کرنول (دکن) کے مجموعۂ رسائل میں میری نظر سے گزرا تھا۔ یہ مزاحیہ قصہ اودھ پنچ کے اجراء سے بھی قبل کا معلوم ہوتا ہے۔ اودھ پنچ مارچ ۱۸۷۷ء میں ایک عنوان "خواب خرگوش" کے تحت افیونیوں کی خوب پھبتی اڑائی گئی ہے جس کے کردار ہیں، مرزا بیہوش خاں، میراولمجھن، مرزا بیکار ...... کہتا ہے خوشی کا ایک چھینٹا تو پلاؤ "...... پے در پے توپوں کی دھوں دھاں جو ہوئی تو افیونیوں کی آنکھ کھلی الخ۔

دکھنی نثر نگار نے جنگنامۂ پوستی مذکور میں سپاہیوں اور پلٹنوں کے عجیب عجیب مزاحیہ نام لکھے ہیں، بلکہ بیگمات کے بھی اور بجائے اصلی گولی بارود کے مٹھائیوں کی بوچھار کر دی ہے۔ مثلاً "آؤ بہادرو، پکڑو، وا یا مذھوا پچھاڑو۔ بھنگی خاں جانے نپائے ...... مقبل پر سے لگے گولی مارنے ...... جب چھوٹنے لگے لڈو کے گولے، اور نقل کی گولیاں تو سوار جو تھے پوستی خاں کے سو گھوڑے ہاتھوں میں لے کر پیادہ ہو کر چلے ——...... کڑپہ وہیب بہادر، کرنول وہیب بہادر، ناندیڑ وہیب بہادر ...... ادونی وہیب بہادر، رائچور وہیب بہادر، دکھن وہیب بہادر ...... تدبیر وہیب بہادر، مصلحت وہیب بہادر .... بیا نید و بگو ئید ...... خشخش اور چینی کی شکر کی باروت، تربوز کی کپی میں بھر کر کوٹ کی بنیاد میں رکھ کر فتیل اڑا دینا ہے الخ۔"

غرض یہ دکن کی پیداوار معلوم ہوتی ہے۔

شاہ حاتم کا مزاحیہ نسخہ "مفرح الضحک" ویسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ مقاصد الصالحین (قصص اولیاء) میں ہے۔ کہ شیخ شبلی ایک مرتبہ بغداد کے دواخانہ میں گئے ایک طبیب کو دیکھا کہ اس کے سامنے دوائیں رکھی ہوئی ہیں، اور بیماروں کا علاج کر رہا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اے طبیب گناہوں کی دوا بھی تیرے پاس ہے۔ اس نے جواب دیا نہیں۔ مگر ایک دیوانہ بول اٹھا کہ اے شبلی وہ میرے پاس ہے۔ سن لو:۔ جڑ نیازمندی کی، پتے پشیمانی کے، چھال شکیبائی کی لے اور توبہ کے ہاون میں کوٹ اور صدق کے پانی میں ڈال کے، محبت کی آگ میں جوش دے کر پرہیزگاری کی ہوا سے ٹھنڈا کر کے بار دے نیاز پی جا، اللہ گناہ بخش دے گا ..... آپ نے فرمایا۔ اے دیوانے تو نے بڑے پتہ کی بات کہی۔"

شاہ حاتم کا نسخہ بالکل ظریفانہ، محض ہنسی اور قہقہہ اور تفریح طبع کے لئے ہے اور اردو زبان میں غالباً پہلی کوشش ہے جس میں مناسب و موزوں استعارے تشبیہات، محاورے، ضرب الامثال موجود ہیں۔ جو بغرض ضیافت طبع پیش ہے:۔

نسخہ مفرح الضحک مقتدل من طب الظرافت

(ہم نے بعض غیر مہذب فقرے حذف کر دئے ہیں)

جو چینگا بھلا کھائے سو ہمارا ہو جائے۔ ایں نسخہ در دیوان شاہ حاتم داخل بود ازیں جہت با نتخاب آوردہ:۔ (مجمع الانتخاب شاہ کمال قلمی)

چاندنی کا روپ، دوپہر کی دھوپ، چوڑیل کی چوٹی، مُچھندر کی لنگوٹی، پریوں کی نظر گزر، دیو کی نظر، جوگی کی پُھرکی، کبوتر کی غٹ کوں، مرغ کی ککڑوں، چیل کی چل چل، کیڑوں کی کلبل، جوگا نی نشتر، بکرے کی بیں، کوے کی ٹیں، آٹھ آٹھ رتی مچھر کا بھیجا، ڈائن کا کلیجا، دریا کی موجوں کا بل، غول بیابانی کی چھل، چچا کی پیر، چڑیوں کی پھیر، کیچوے کی انگڑائی، بچھوؤں کی جمائی، بارہ بارہ ماسہ، تنہائی کا مارا، الو کی جنگی، برف کا انگارا، جونک کی پسلی، فاختہ کی ہنسلی، بڑیا کہل (دیڑ باغ) کے انڈے کی زردی، پرند کا اوٹنا، مرغابی کا تیرنا ساڑھے تین تین عدد، مینڈھک کی ٹرٹر، گلہری کی چرچر، امرد کے دھاڑی کا بال، الو کا ٹھر، چڑیا کی پھر، پانچ پانچ گز باندی کا بڑبڑانا، بی بی کا جھنجلانا، بجلی کی چمک، بادل کا کڑکڑانا، دو دو بالشت شرابی کی بک بک، بھنگی کی جھک جھک، پوستی کی اونگھ، افیمیں کی پینک، لاٹھی کی چوٹ، منہ کی پوٹ، پوروں کی ہمت، مکھیوں کی بھنبھناہٹ، چار چار پل، تریا چرتر، بلبلا بہتر، کلاونت کا الاپ، بابھن کا جاپ، بیکنٹھ کی کیچ، کمہیر کی پینچ، برسات کی گھٹا، راجہ باسک کے سر کا جٹا، دو دو تل ہواصل کے دانت، بھنگی کی آنت، بونگی تل کی ماٹی، بچھو کی آنکھ، سانپ کا پنجا، مچھلی کا پانوں، چیونٹی کا کان، کنجالی کی ناک، پونے دو دو انگل چچر کا انڈا، گدھی کے سینگھ، آدمی کی دم، زنانے کی اوہ، ہجڑے کی تالی، مظلوم کی آہ، سوت کی واہ، اڑھائی اڑھائی گرہ، کنچنی کا نخرا، کٹنے کا مکر، مشاطہ کی دھندیل، شیر خورے کے دانت، چھوکریوں کا آنکھ مچول، ہتھال موٹیکا کا انڈا پا، موت کی پرچھائیں، ظلمات کی اندھیری، بیس بیس بدرے، جونک کی پھیر پھیری، گھڑیال کی ٹھاں ٹھاں، بازار کا چپ، پیچلے کا شعور، احمق کی واہ واہ، اندھے کی سرت، اوزلے

سلہ نواب عبدالوہاب خاں میانہ والی کڑپہ

کی ہوت، بجانے کی چپی؟ آٹھ آٹھ آنسو، موسل کی دھمک، عطر کی مہک، چراغ کی بوت، کھوپڑی کی تلی، شتر غمزہ، طوطی کی تیہوں، پودنے کی ٹوپی، گرگٹ کا رنگ بدلنا، سات سات جریب، زمین کی ناف، آسمان کا شگاف، شفق کی لالی، بادل کی ٹھنک، گنبد کی آواز، بانگی کے اختیار سایہ دیوار قہقہہ، گیارہ گیارہ لب، راکھ کی چھال، لالہ کی چھال، سمندر کی جڑ، امربیل کی جڑ، تشنہ کی بات، عنبر کی بات، سی پی کی پاٹ، توتا فرت، پان کے پھول، بوڑے کے پھول، رازپھل یا دیکھل، دیہلی کے پھل، سنگھاڑے کی گٹھلی، مولی کی کنٹھی، سپاڑی کی مٹی، ایک ایک چلّو بھر رس، گئو رس، رس گورس، ہٹ رس، پوست تقرہ، پوست طلا، زردی کہیا سفیدی مرواریدہ، سرخی یاقوت، پونے تین تین چٹکی، عرق نانا، عرق بابا، عرق ماما، تمرہ قاوہ، ورق نورتن، شربت اجل، آدھی آدھی مٹھی، دھول، پھیرو، لات، ٹلی، گھونا گھونسی گالی گلوچ، استاپچی، تاتا تیزی، بولی ٹھولی، تی آئی، کمی کسی، واتا کل کل کو ہاپچی بچی، پھوٹ، لعنت، پھٹ منہ، چھنتہ دل، ان سب دواؤں کو لے کر نہ رات ہو نہ دن ہو، نہ صبح ہو نہ شام ہو، نہ باسی پانی نہ تازہ پانی اور اس میں سکھا کر کالی کی سل پر منی کے بٹے سے پیسے، پھر مکڑی کے جالے کی صافی میں چھان کر فرشتے کے موت میں خشخاش کے ساتویں حصہ برابر گولی باندھے، وقت نزع کے بلغم کے دودھ سے ایک ایک یا پھانکے، کھاتے پیتے، سوتے بیٹھتے، دیکھنے، سننے، سونگھنے سے پرہیز کرے، جب خوب بھوک لگے، تو اسی نوے ہزار دل سے زیادہ نہ کھاوے، حاتم کہے ایک روگ سے ستہتر روگ کو پیدا کرے جس کا ہزار نام ایک اللہ نسخہ تمام شد۔

(از ورق ۲۹۰ تا ۲۹۲ تذکرہ شاہ حاتم، مجموعۃ الانتخاب شاہ کمال، کتب خانہ سالارجنگ حیدرآباد)

اس مضمون کی تیاری میں ان کتابوں سے مدد لی گئی۔

۱- آب حیات مؤلفہ محمد حسین آزاد۔ مطبوعہ

۲- سرگذشت حاتم۔ مؤلفہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور مطبوعہ

۳- عقد ثریا مؤلفہ مصحفی مطبوعہ

۴- تذکرہ ہندی گویاں مؤلفہ مصحفی مطبوعہ

۵- جنگ نامہ پوستی و بھنگی، قلمی، کتب خانہ حسن محمد صاحب حیدرآبادی

۶- رسالہ نظام الادب، حیدرآباد۔

۷- مجموعہ رسائل اودھ پنچ۔ مطبوعہ ۱۸۷۷ء

۸- چکی نامہ، شاہ امین حیدرآبادی قلمی (سالارجنگ)

۹- رسالہ جوہر، دہلی، عبدالحق نمبر

۱۰- تذکرہ مجموعۃ الانتخاب شاہ کمال مانکپوری قلمی

۱۱- تذکرہ مسرت افزا، مؤلفہ مولوی امراللہ الہ آبادی

(رسالہ معاصر پٹنہ۔ اپریل ۱۹۵۸ء)

چاول کی پیداوار

۱- ۱۹۵۶ء میں دنیا بھر میں تقریباً ۱۲ کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن (میٹرک) چاول پیدا ہوا تھا۔ اس مقدار میں سوویت روس کی پیداوار شامل نہیں۔ لیکن اس میں ایشیا کی ۲۰ کروڑ ٹن چاول کی پیداوار شامل ہے۔

۲- بھارت چاول کی پیداوار کے اعتبار سے دنیا میں دوسرے درجے پر ہے اور چین کا نمبر اول ہے۔ چنانچہ چین میں ۸ کروڑ ۲۰ لاکھ ٹن چاول پیدا ہوا تھا جبکہ بھارت میں چاول کی کل پیداوار ۴ کروڑ ۳۰ لاکھ ٹن رہی۔

۳- بھارت میں چاول کے رقبۂ کاشت میں ۷ کروڑ ۸۰ لاکھ ایکڑ سے زیادہ کا اضافہ ہوا ہے لیکن پیداوار صرف ۴۴۵ کلوگرام فی ایکڑ ہے۔

۴- ۵۸-۱۹۵۷ء میں چاول پیدا کرنے والی چوٹی کی پانچ ریاستوں میں مغربی بنگال ۱۸۵۰۰۰۰ ٹن، آندھرا پردیش ۳۴۶۸۰۰۰ ٹن، مدراس ۳۱۳۱۰۰۰۴ ٹن، اتر پردیش ۲۳۸۴۰۰۰ ٹن اور بہار ۲۱۹۸۰۰۰ ٹن شامل تھیں۔

صحتِ عامہ کی ترقی

گذشتہ دس برس کے دوران میں دکھنی پوربی ایشیا میں صحتِ عامہ کی تحریک نے جو ترقی کی ہے اس سے اس ضمن میں تاریخِ عالم میں ایک ڈراماٹی باب کا اضافہ ہوا ہے۔ آج سے دس برس پیشتر ۱۹۴۸ء میں اس خطۂ ارض کے اکثر ممالک نے نئی نئی سیاسی آزادی حاصل کی تھی۔ اس خطے کی آبادی دنیا کی کل آبادی کا پانچواں حصہ تھی۔ اس میں دس لاکھ سے زائد دیہات میں رہنے والے لگ بھگ پچاس کروڑ انسانوں کا مطالبہ تھا کہ ان کے لئے بھی زندگی بسر کرنے کی سہولتیں با فراط میسر ہونی چاہئیں اور ان کی اپنی ذات اور ان کے بچّوں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے والے اموروں میں انھیں بھی شریک کیا جائے۔ چناں چہ اس پس منظر کی روشنی میں ۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو پانچ ملکوں کے نمائندے نئی دہلی میں اکٹھے ہوئے اور انھوں نے دکھنی پوربی ایشیا کے لئے ایک تنظیم کی بنیاد رکھی جس کا نام "عالمی صحت کی تنظیم سے متعلق صحتِ عامہ کی علاقائی کمیٹی" ہے۔

اس سلسلے میں ایشیا کے اس خطے کے متعلق سب سے زیادہ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہاں کی آبادی کی بسر اوقات زراعت پر ہے اور اس میں انسانی تہذیب و تمدّن کے قدیم ترین زمانے کے طریقے مروّج ہیں۔ اس لئے اس کمیٹی کے سامنے سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ان لاکھوں اشخاص تک کس طرح رسائی حاصل کی جائے جو متواتر بیماریوں اور کم غذائیت کے ہاتھوں پریشان رہتے ہیں۔

ملیریا کی مصیبت

۱۹۴۸ء میں جب اس کمیٹی کا پہلا اجلاس ہوا تو اس وقت ایشیا کے اس خطے میں ملیریا عذابِ جان بنا ہوا تھا۔ ہر برس دس کروڑ لوگ ملیریا میں مبتلا ہوتے تھے اور ان میں سے لگ بھگ دس لاکھ اشخاص لقمۂ اجل بن جاتے تھے۔ اس کی وجہ سے دیہاتی علاقوں کی اقتصادی ترقی اور سماجی بہبود کے کاموں میں بڑی رکاوٹ پیدا ہو جاتی تھی۔ اگرچہ ڈی۔ ڈی۔ ٹی کے استعمال سے گھروں کے اندرونی جراثیم کو ختم کرکے ملیریا کی روک تھام کا طریقہ کئی برس پیشتر سے جاری تھا۔ مگر وہ زیادہ تر شہروں اور بڑے قصبوں تک ہی محدود تھا۔ ڈی۔ ڈی۔ ٹی کے ہوتے ہوئے بھی دیہات میں رہنے والی وسیع آبادی ملیریا سے محفوظ نہیں تھی۔

مگر آج نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ اب اس خطۂ ارض کے ہر ایک ملک میں ہر جگہ ملیریا کے خلاف وسیع پیمانے پر جنگ لڑی جا رہی ہے اور اس میں اس قدر شاندار کامیابی حاصل ہوئی ہے کہ اب ملیریا کی روک تھام کے محاذ کو ملیریا کی بیخ کنی کے محاذ میں بدلا جا رہا ہے۔

سیلون میں ملیریا کے خلاف وسیع پیمانے پر جنگ کا آغاز ۱۹۴۶ء میں ہوا تھا۔ مگر آج وہاں صرف بیماری کا نام ہی رہ گیا ہے۔ افغانستان اور تھائی لینڈ بھی اس قابل ہو گئے ہیں کہ وہ اپنی تمام آبادی کو ملیریا کے مرض سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ برما میں رہنے والے ۹۳ لاکھ اشخاص اس بیماری کے خطرے سے محفوظ

ہو چکے ہیں اور آئندہ تین چار سال کے لئے جو پروگرام بنایا گیا ہے اس کی برکت سے اس ملک کے ملیریا زدہ علاقے میں بسنے والے ایک کروڑ بیس لاکھ اشخاص ملیریا کے حملے سے محفوظ ہو جائیں گے۔ انڈونیشیا میں ساڑھے سات کروڑ اشخاص ملیریا کا شکار ہوتے ہیں وہاں اس موذی مرض کی بیخ کنی کی غرض سے ایک اسکیم بنائی گئی ہے جس پر گیارہ برس میں دس کروڑ ڈالر خرچ ہوں گے۔ یہ اسکیم ۱۹۵۹ء سے شروع ہو جائے گی۔

اسی طرح نیپال کے لگ بھگ پچاس لاکھ اشخاص کو ملیریا سے بچانے کے لئے ملیریا کی بیخ کنی کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔

بھارت میں ملیریا کی روک تھام کے قومی پروگرام کی بدولت تقریباً نصف آبادی تو ملیریا سے نجات پا ہی چکی ہے اور اندازاً ۵۰ کروڑ روپے کی لاگت سے اس مرض کا قلع قمع کرنے سے متعلق ایک ہمہ گیر مہم ۱۹۵۸ء سے ملک بھر میں جاری ہو چکی ہے۔

اس خطے کی حکومتیں پیداواری صلاحیت اور معیار زندگی بلند کرنے کا ضمیمہ ارادہ کر چکی تھیں مگر اس مقصد کے لئے کئے گئے اقدامات کے دوران میں انھیں معلوم ہوا کہ جب تک ان امراض پر قابو نہ پایا جائے جن کے باعث محنت کش انسانوں کی تعداد اور ان کے کام کے اوقات میں بھاری کمی واقع ہو جاتی ہے تب تک اس مقصد کی تکمیل ممکن نہیں ہے۔ اس واسطے زیادہ خطرناک متعدی امراض کی روک تھام کے لئے ہنگامی اقدام کے طور پر فوری تدابیر اختیار کی گئیں۔

ماہر مشیروں کا اہتمام

ان حالات کے پیش نظر صحت عامہ سے متعلق عالمی تنظیم نے پہلے چند برسوں میں ان امراض کے ماہر مشیر مہیا کرنے کی پوری کوشش کی۔ یہ مشیر زیادہ خطرناک متعدی امراض کے خاتمے کے لئے بنائے گئے وسیع پیمانے کے مقامی پروگراموں کی تکمیل میں مصروف مقامی کارکنوں کی بھرپور مدد کرتے رہے۔

۱۹۴۹ء میں سوائے سیلون کے ایشیا کے اس خطے کے باقی تمام ملکوں کو مذکورہ بالا قسم کے ماہرین مہیا کر دیئے گئے تھے۔ تپ دق کے خلاف حفاظتی تدابیر کے مظاہر کرانے اور اسے قابو میں لانے کے لئے مطلوبہ تربیت دینے والے مراکز قائم کرنے میں بھی صحت عامہ کی عالمی تنظیم نے مدد دی۔ بی۔ سی۔ جی۔ کے ٹیکے کی مہم میں اس تنظیم نے اس خطے کے کل سات ملکوں میں سے پانچ کو بھاری امداد دی۔ اس مہم کو مؤثر عملی صورت دینے کے سلسلے میں بھارت کا حصہ دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔

اس مہم میں اب تپ دق کی تحقیق کے خصوصی پروجیکٹ بھی شامل کئے گئے ہیں۔ جن کے ماتحت جدید دواؤں کی مدد سے گھر پر بھی تپ دق کا علاج کیا جاتا ہے۔

ایشیا کے تین ملکوں میں گلٹیوں کی ایک خاص بیماری موجود ہے جو زبردست نقصان دہ ثابت ہوئی ہے ان ممالک میں انڈونیشیا بھی شامل ہے۔ اس بیماری کے خلاف مورچہ لینے کے لئے مذکورہ بالا عالمی تنظیم کی امداد سے پنسلین سے علاج کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں انڈونیشیا کا پروگرام دنیا بھر میں سب سے بڑا پروگرام ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ اس پروگرام کی بدولت ۱۹۶۵ء تک اس مرض کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا۔

اس کے علاوہ چار دیگر ممالک کو پوشیدہ امراض کی روک تھام کے لئے اور پانچ ممالک کو کوڑھ کی بیماری پر قابو پانے کے لئے بھی امداد دی گئی۔ مزید برآں دکھن پوربی ایشیا کے تین ملکوں میں آنکھ کی ایک ایسی بیماری وسیع پیمانے پر پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے مریض عموماً اندھا ہو جاتا ہے۔ اس مرض پر قابو پانے کے لئے بھی مذکورہ بالا تنظیم نے امداد دی ہے۔

بین الاقوامی ماہرین نے نہ صرف مقامی طور پر اختیار کردہ پروگراموں کی تکمیل سے طریق کار کی رہنمائی میں مدد دی ہے بلکہ ہر جگہ مقامی عملے کو تربیت بھی دی ہے تاکہ ان کی عدم موجودگی میں بھی پروگرام جاری رہیں۔

ان سرگرمیوں سے متعلق اکثر کاموں کے لئے بہت زیادہ امداد اقوام متحدہ کے بچوں کے فنڈ سے ملی ہے اور صحت عامہ کی عالمی تنظیم نے ٹیکنیکل امداد دی ہے۔

اس کے علاوہ کولمبو پلان، فورڈ اور راکفیلر فاونڈیشنز نے بھی صحت عامہ کی ترقی کے متعدد امور میں سرگرم مدد کی ہے۔

علاوہ ازیں امریکہ کے انٹرنیشنل کوآپریشن ایڈمنسٹریشن نے بھی عملے اور سازوسامان سے کافی مدد کی ہے۔

بہت مدت سے لوگ اس بات سے آگاہ ہیں کہ متعدد وجوہ سے بچہ اور زچہ کی اموات بکثرت واقع ہوتی رہتی تھیں۔ خصوصاً شیر خوار بچوں کی شرح اموات تو ایک ہزار پر ڈیڑھ اور دو سو کے درمیان تھی۔ بچوں اور حاملہ عورتوں میں غذا کی کمی بہت وسیع پیمانے پر موجود تھی۔ اس لئے اس طرف شروع ہی سے زیادہ توجہ دی گئی۔

تربیت یافتہ عملہ کی کمی

صحت عامہ کے کاموں کو مضبوط اور ٹھوس بنیادوں پر سرانجام دینے کی

راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تربیت یافتہ عملے کی شدید کمی ہے۔ یعنی کہ سیلون اور بھارت میں بھی تربیت یافتہ عملہ دوسرے ملکوں کے مقابلے میں پانچ چھ گنا کم تعداد میں پایا جاتا ہے حالانکہ دکھن پوربی ایشیا میں ان ممالک میں ڈاکٹروں کی تعداد اس خطے کے دیگر ممالک کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہے۔ بہرحال اس خطے میں مطلوبہ تعداد میں تربیت یافتہ ڈاکٹر اور نرسیں وغیرہ تیار کرنے میں ابھی کم از کم اور ۲۵-۳۰ برس درکار ہوں گے۔

اس کے علاوہ دیہاتی علاقوں میں صحت عامہ صفائی اور صحت کے بارے میں تعلیم کے درمیانی فرق کو کم کرنا ضروری تھا۔ بلکہ صحت عامہ کی سرگرمیوں کو کامیاب بنانے کے لئے تربیت یافتہ عملہ تیار کرنا بھی اشد ضروری تھا اور ان کاموں کے لئے صحت عامہ کی عالمی تنظیم کی امداد کی سخت ضرورت تھی۔

اس لئے اس تنظیم نے تربیتی سرگرمیوں اور صحت عامہ کے کام کے مختلف پہلوؤں خصوصاً دیہی علاقوں کی ترقی کے مسائل پر زیادہ توجہ دینا شروع کر دیا۔ یہ اس تنظیم کے کام کا دوسرا دور تھا جس کا آغاز ۱۹۵۲ء میں ہوا تھا اور اب یہ پورے زوروں پر ہے۔

چنانچہ اب صحت عامہ سے تعلق رکھنے والے تقریباً تمام امور میں رہنمائی اور صلاح مشورے کی غرض سے قومی بلکہ بین ممالک کے معاملے میں صوبائی یا ریاستی سطح پر بھی صلاحکار مہیا کئے جا رہے ہیں۔ تقریباً تمام ممالک مذکورہ بالا تنظیم پر لگاتار یہ زور ڈال رہے ہیں کہ وہ انھیں صفائی اور صحت سے متعلق تعلیم کے متعدد اقسام کے پروجیکٹوں کے لئے اور زیادہ امداد دے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دیہات میں رہنے والے لوگوں کے فائدے کے لئے صحت کے وسیع پروگرام تیزی سے روبہ ترقی ہیں۔

عالمی تنظیم کی ان سرگرمیوں کو دیکھنے سے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ صحت عامہ کی ترقی سے متعلق اس تحریک کا مستقبل بہت امید افزا ہے۔

بھارت میں پرائمری تعلیم

۱۔ یہ توقع کی جاتی ہے کہ تیسرے پنجسالہ منصوبے کے آخر تک سارے ملک میں ۶ سے ۱۱ برس تک کی عمر کے تمام بچوں کو مفت اور لازمی پرائمری تعلیم دینے کی سہولتیں مہیا کرنا ممکن ہوگا۔

۲۔ جب دوسرا منصوبہ مرتب کیا گیا تھا تو یہ توقع کی گئی تھی کہ (منصوبے کے آخر تک) ۶ سے ۱۱ برس تک کی عمر کے قریباً ۷۷ لاکھ مزید بچوں کو اسکول کی سہولتیں مہیا کی جاسکیں گی۔ منصوبے کے تیسرے برس کے آخر تک اس زمرے کے بچوں کی تعداد میں ۶۰ لاکھ کا اضافہ ہوچکا ہے۔

۳۔ ۱۹۵۰-۵۱ء میں بھارت میں پرائمری اسکولوں کے طلباء (۶ سے ۱۱ برس تک عمر کے) کی تعداد ۱۸۶۸۰۰۰۰ تھی۔ ۱۹۵۵-۵۶ء میں یہ تعداد ۲۴۸۱۲۰۰۰ تک بڑھ چکی تھی۔ توقع ہے کہ ۱۹۶۰-۶۱ء تک یہ تعداد ۳۲۵۴۰۰۰۰ ہو جائے گی۔

۴۔ ۱۹۵۰-۵۱ء میں بھارت میں پرائمری اسکولوں کی تعداد ۲۰۹۶۷۱ تھی۔ ۱۹۵۵-۵۶ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۲۷۴۳۰۸ ہو گئی تھی اور توقع کہ ۱۹۶۰-۶۱ء تک یہ تعداد ۳۲۶۸۰۰ سے بھی بڑھ جائے گی۔ جونیر بیسک اسکولوں کی تعداد علی الترتیب (۱۹۵۰-۵۱ء) میں ۱۴۰۰۰ (۱۹۵۵-۵۶ء) میں ۲۳۶۰۰ تھی اور (۱۹۶۰-۶۱ء) میں ۳۳۸۰۰ ہو جائے گی۔

اختر علی تلہری

چند قطعے

متفرقات

ہے تیرا ذوق ہی کچھ نامراد سا نادان — نزہتِ گوش و نظر کا کہاں نہیں ساماں
نہیں ہے شوقِ طلب کی فسردگی کا علاج — بھری بہار کے دن اور تو تہی داماں
نہیں نہیں تجھے حاصل تو ہے قصورِ نظر — ہیں مہر و مہ تو اسی طرح چرخ پر تاباں
ہے تیرے بخت کا اک یہ بھی نسخۂ معکوس — زمانہ زمزمہ برلب ہے اور تو نالاں

•

وہی ہے چنگ و بربط کی حکایت — وہی جام و صراحی کا بیاں ہے
وہی ہیں عندلیب و گل کے قصے — وہی یادِ بہارِ گلستاں ہے
وہی ہیں عارض و گیسو کی باتیں — وہی زہرہ وشوں کی داستاں ہے
وہی ہیں چاند سورج کے فسانے — وہی ذکرِ نجوم و کہکشاں ہے
چمن بندِ خیالاتِ پریشاں — ترے نغموں سے دنیا سرگراں ہے

•

پیہم ہے تجھ کو شکوۂ آلامِ روزگار — سرِ حیات تجھ پہ ابھی تک عیاں نہیں
اے ناشناسِ فطرتِ عالم سنبھل سنبھل — درمانِ درد و غم گلۂ آسماں نہیں
عزمِ جواں سے کام لے طوفاں سے نہ ڈر — مانا کہ ٹوٹی ناؤ ہے اور بادباں نہیں

•

آیا سمجھ میں ہے ابھی انساں تہِ نقاب — حدِ شعور کافر و دیندار دیکھ کر
برپا ہو کوئی تازہ قیامت نہ پھر کہیں — دل کانپتا ہے سُبحہ و زنّار دیکھ کر

عرفان صدیقی

پرتھوی راج راسو میں عربی فارسی الفاظ

اردو اپنے ارتقاء کے سلسلہ میں مختلف منازل سے گذری ہے۔ اس نے اپنی موجودہ حالت میں پہنچنے سے پہلے صدیوں تک طرح طرح کے نشیب و فراز اور پیچ و خم دیکھے ہیں۔ زبانیں مہینوں یا سالوں میں نہیں بن جایا کرتیں۔ انہیں اپنی طبعی حالت میں پہنچنے سے پیشتر صدیاں طے کرنا پڑتی ہیں۔ مختلف تمدّنوں اور تہذیبوں کا ملاپ جو ایک نئی زبان کی تشکیل میں بنیاد کا کام کرتا ہے۔ دس بیس یا سو پچاس برس کی بات نہیں ہوتی۔

اردو بھی کئی مختلف تمدّنوں اور تہذیبوں کے ملاپ کے نتیجہ کے طور پر وجود میں آئی ہے۔ یہ مختلف قوموں، مزاجوں اور زبانوں کا سنگم ہے جس میں ہر بنیادی عنصر کی کچھ نہ کچھ خصوصیات بڑے اعتدال، توازن اور حسن کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ اس کی تشکیل و تعمیر میں عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی وغیرہ نے عناصر کے طور پر کام کیا ہے۔ اسی لئے اردو زبان کی تاریخ ہندوستان میں عرب اور ایرانی اثرات کے ساتھ ہی شروع ہوتی ہے۔ ہندوستان میں مسلم حکومت کے شروع ہونے سے بہت عرصہ پیشتر یہاں عرب اور ایرانی تمدّن کا اثر تجارت اور سیاحت وغیرہ کے ذریعہ شروع ہو چکا تھا۔ اور اس میل جول کے سبب سے عربی اور فارسی کے الفاظ نے ہندوستانی زبانوں میں رَگھُل مِل جانا شروع کر دیا تھا۔ یہ تقریباً دسویں صدی عیسوی کا زمانہ تھا۔ جب اس زبان کی نیو پڑنا شروع ہو گئی تھی جس نے بعد میں 'اردو' کا روپ دھارا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی اور دوسری مقامی زبانوں کے قدیم ترین شعراء کے کلام میں بھی عربی اور فارسی الفاظ کا کثرت سے استعمال ہے۔ اس سلسلے میں مشہور ہندی کوی "چند بردائی" کی 'پرتھوی راج راسو' کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔!

چند بردائی مشہور راجپوت سمراٹ پرتھوی راج کا درباری شاعر تھا۔ وہ لاہور میں پیدا ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ پرتھوی راج اور چند بردائی کی پیدائش اور وفات تقریباً ساتھ ساتھ ہی ہوئی تھی۔ اس حساب سے اس کا زمانۂ پیدائش و وفات بھی بارھویں صدی عیسوی کا وسط اور تیرھویں صدی عیسوی کا آغاز سمجھا جانا چاہئے جو تاریخی اعتبار سے پرتھوی راج چوہان کی پیدائش اور وفات کا زمانہ ہے۔

"راسو" کی زبان کے سلسلہ میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہی زبان تھی جو پرتھوی راج کے علاقہ ہائے سلطنت یعنی دلی، اجمیر، آگرہ اور راجپوتانہ وغیرہ میں بولی جاتی تھی۔ اس زبان کو پروفیسر محمود شیرانی مرحوم ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کے نام اپنے ایک مکتوب میں ہریانی کے نام سے موسوم فرماتے ہیں۔ موجودہ ہندی یا برج بھاشا سے یہ زبان بہت کچھ مختلف تھی۔ لیکن پھر بھی ہم اس میں اردو کی بہت ہی ابتدائی حالت کی ایک جھلک ضرور دیکھ سکتے ہیں۔

"راسو" میں پرتھوی راج کی زندگی اور اس کے دورِ حکومت کے کم و بیش تمام خاص واقعات بڑے مؤثر انداز اور پرشکوہ آہنگ میں بیان کئے گئے ہیں جن میں بیشتر حصہ پرتھوی راج اور محمد غوری کی جنگوں کا ہے۔ ان دونوں کے درمیان لڑائیوں کا حال اس میں بڑی تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ اگرچہ "راسو" کی تاریخی اہمیت کوئی خاص نہیں ہے۔ لیکن ادب خصوصاً تاریخ زبانِ اردو کے سلسلہ میں اس سے بہت کچھ مدد لی جا سکتی ہے۔ محمد غوری سے پہلے ہندوستان میں کسی منظم اور وسیع مسلم سلطنت کا قیام نہیں ہو پایا تھا۔ اگرچہ جنوب مغربی پنجاب اور سندھ کے تھوڑے سے علاقہ میں محمود غزنوی اور محمد بن قاسم کے زمانہ کے حاکم

موجود تھے۔ ان کوئی باقاعدہ نظام ... [illegible] ... اس کے باوجود ہندوستان

پر عربی، ایرانی زبان، تمدن اور تہذیب کا اثر شروع ہو چکا تھا جس کی ایک مثال [illegible]

[illegible] پرتھوی راج راسو میں ... عربی اور فارسی کے الفاظ

کی بہتات پائی جاتی ہے۔

راسو کے ایک [illegible] ہیں

نشان۔ فارسی لفظ ہے [illegible]

معنی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

पबल भूप सेजहिं सकल, धुनि निसान बहु साद

اور دیکھئے۔ बजे जीत के नद्द नीसान घोरे

اور۔ धुनि निसान बहु साद नाद सुर पंच बजत दिन

اور [illegible] [illegible] ओर पंचघोर [illegible]

اور دیکھئے۔ [illegible] ठट्ट [illegible] निसानी

[illegible]

محل۔ [illegible] دیکھئے۔

सखियन संग [illegible] फिरत महलनि आग रिवास

اور دیکھئے۔ हरषत अनन्द मन [illegible] महल भीतर गई

اور ملاحظہ ہو۔ तिहि महल रहन भई, [illegible] सब भूल

سلطان۔ [illegible] کو بار بار کثرت سے

استعمال کر کے بالکل [illegible]

खुरासान सुलतान कास काबिलिय मीर धुर

اور دیکھئے۔ तिनं मांहि सुलतान साहाब आप

اور دیکھئے۔ बर गोरी पद्मावती, गहि गोरी सुरतान

اور دیکھئے۔ आयह कारि हकार करि, खुरसान सुलतान दल

اور ملاحظہ ہو۔ खुरासान सुलतान, कंधार मीरं

غرض یہ لفظ "راسو" میں بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔

شاہ اور بادشاہ فارسی الفاظ ہیں۔ ان کا بھی بہت زیادہ استعمال کیا

گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

اور دیکھئے۔ जिहि पकरि साह साहाब लीन

اور دیکھئے۔ ताहि दिन पतिसाह कौ भयौ गजन्ने अवाज

اور دیکھئے۔ जीत भई प्रथिराज की पकरि साहु लै संग

اور ملاحظہ ہو۔ पकरियै साहि जिमि कुलंग बाजं

اور دیکھئے۔ डराइयो साहु [illegible] सहमहबर सुबर

اس میں محمد غوری کا نام شہاب الدین بھی موجود ہے

آواز۔ فارسی لفظ ہے۔ اس کا استعمال بھی بار بار بڑی کثرت سے کیا گیا ہے

دیکھئے۔ ताहि दिन पतिसाह कौ भयौ गजन्ने अवाज

[illegible] गहिं परि पतिसाह की, भई जु आनि आवाज

اور [illegible] भाई जु आनि अवाज आय साहाबदीनं सुर

[illegible]

[illegible]

[illegible] तिनं माहिं सुलतान साहाब आपं

[illegible] जिहि पकरि साहु साहाब लीन

تیر۔ فارسی لفظ ہے۔ [illegible]

[illegible] चुक्के न सबन् बेधंत तीरं

[illegible] अलक सोबलम तेग अचूक तीरं

کمان۔ فارسی لفظ ہے [illegible] ملاحظہ ہو۔

तुरक की महाबान [illegible] कम्मान बान छुट्टिंह अपार

[illegible] नाथ कम्मान प्रथिराज राजं [illegible] कम्मान बाजी

تیغ۔ فارسی لفظ ہے۔ چند نے اسے بھی بہت کثرت سے استعمال کیا ہے

ملاحظہ فرمائیے۔ [illegible] सोबलं तेग अचूक तीरं

اور [illegible] तेग मनो बेग लगत मनो बीज झक्क है घट

اور دیکھئے۔ कहीं कंधबहि तेग कहीं सिर जुहि फूहि उर

اور دیکھئے۔ महा तेग बहुबान हिन्दुवान रानं

غرض تیغ کا استعمال بہت ہے

جنگ۔ فارسی لفظ ہے۔ اس کا استعمال بھی بہت ملتا ہے۔ دیکھئے

जङ्ग जुरन जालिम जुझार भुज सारसार भुअ

اور دیکھئے۔ भुअ मिरन भूप जुरि जोध जङ्ग

فوج۔ خالص عربی لفظ ہے۔ راسو میں متعدد بار استعمال کیا گیا ہے

مثلاً۔ इस रुप से फौज बनाय आपं

लैचल्यौ सिताबी करी फारि फौजं ۱۵۵

شاد۔ فارسی لفظ ہے۔ 'راسو' میں اکثر استعمال ہوا ہے۔ دیکھئے۔

पवल भूप सेवहिं सकल धुनि निसान बहु साद

ہزار۔ فارسی لفظ ہے۔ 'راسو' میں اکثر استعمال ہوا ہے۔ دیکھئے

दस हजार हय चढ़त हेम नग जटित साज तिन

हजारी हजारी इकै जोध भारी — اور دیکھئے

باغ۔ فارسی لفظ ہے اس کا استعمال ملاحظہ ہو

सखियन संग खेलत फिरत, महलन बाग निवास

ساز۔ فارسی لفظ ہے۔ سامان کے معنی میں 'راسو' میں کئی جگہ اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

दस हजार हय चढ़त हेम नग जटित साज तिन

मुख देखत मन में हँसे, कियो चलन को साज — اور دیکھئے۔

زنجیر۔ فارسی لفظ ہے اس کا استعمال ملاحظہ ہو

सिंगिनि सुरंग डुगुन चोढ़ि जंजीर

میر۔ عربی لفظ ہے۔ اس کا استعمال بھی دیکھئے۔

खुरासान सुलतान कास काबिलिय मीर धरं

खुरासान सुलतान कंधार मीरं — اور دیکھئے۔

ظالم۔ عربی لفظ ہے استعمال ملاحظہ ہو۔

जङ्ग जुरन जालिम जुझार भुज सार सार भुअ

خبر۔ عربی لفظ ہے۔ اس کا استعمال دیکھئے۔

भई खबरि नगर बाहर सुनाय

رخ۔ فارسی لفظ ہے۔ استعمال ملاحظہ ہو۔

परे रहत रिन खेत अरि करि दिल्लिय मुख रुक्ख

بازی۔ فارسی لفظ ہے۔ اس کا استعمال بھی ملاحظہ فرمائیے۔

तुरक्की महाबान कम्मान बाजी

باز۔ فارسی لفظ ہے۔ استعمال ملاحظہ ہو

पकरिय साहि जिमि कुलंकू बाजं

شتاب۔ فارسی لفظ ہے۔ اسے شتابی بنا کر استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے

लैचल्यौ सिताबी करी फारि फौजं

تیز۔ فارسی لفظ ہے۔ اس کا استعمال دیکھئے۔

रराकी अरब्बी पटी तेज ताजी

مزاج۔ فارسی ترکیب ہے۔ اس کا استعمال بھی ملاحظہ فرمائیے۔

अलि अनन्द आनन्द सौं हिन्दवान सिरताज

غرض پرتھوی راج راسو میں ان الفاظ اور ان کے علاوہ بہت سے دوسرے عربی اور فارسی الفاظ کی کثرت ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ عربی اور فارسی کے یہ الفاظ اس زمانے سے کافی عرصہ پہلے سے ہندوستانی بولیوں کے ساتھ اتنے گھل مل گئے تھے کہ انہیں بولیوں اور بھاشاؤں کا ایک حصہ بن گئے تھے اور ان کا استعمال کوئی بری بات نہ سمجھا جاتا تھا یعنی ان الفاظ کو غیر ملکی تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ [illegible] اپنی بھاشا اور دیش کے [illegible] ہیں۔ یہ بھی ان عربی اور فارسی الفاظ کو اپنا ہی سمجھتے تھے اور بڑے اچھے انداز میں ان کا استعمال کرتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان میں مسلم حکومت کے قائم ہونے سے بہت پہلے تجارتی میل جول اور دوسرے تعلقات کی وجہ سے ہندوستانی بھاشاؤں پر عربی اور فارسی زبان کا اثر اس زبان کی نیو ڈال چکا تھا جس نے مختلف مدارج طے کرکے شاہ جہاں کے عہد میں "اردوئے معلیٰ" کا لقب حاصل کیا۔

وامق

شاعرِ بسیار گو

شاعرِ بسیار گو سے ہے یہ میری التماس
آپ یوں للہ سامع کو نہ کیجیے بدحواس

آپ کے اشعار ہیں یا ٹڈیوں کی فوج ہے
اک بلائے ناگہانی موج اندر موج ہے

خفتہ سی رسمِ ختنہ اور اُس پر تیس شعر
عقد کے دو بول کی تقریب اور چالیس شعر

اس طرف کوئی مرا اور نطق گوہر بار ہے
لاش بھی اُٹھی نہیں اور نظم اک تیار ہے

شعر کی مجلس میں پہونچے اور فضا تھرّا اُٹھی
ابتری ماحول پر چھائی ہوا گھبرا اُٹھی

ہم نے مانا شاعری کا آپ کو بحران ہے
آپ کی فکرِ سخن پرچون کی دوکان ہے

جس میں مستی بھی ہے کاجل بھی ہے اور صابون بھی
دانت کا منجن بھی ہے گڑیا بھی ہے بیلون بھی

آپ تو چھلنی کر کے رکھ دیتے ہیں نس نس شعر کی
اُف یہ چو غزلہ اور اُس پر ہر غزل دس شعر کی

آپ کو جتنے قوافی مل سکے فرہنگ میں
ان کو ٹھونسا لا کے غزلوں کی قبائے تنگ میں

اور پھر سودا ہوا یہ آپ کے سر پر سوار
اب اُٹھو چل کر نکالیں سننے والوں کا فشار

آپ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ سامع کا دماغ
کاسۂ فولاد ہے یا سنگِ خارا کا ایاغ

جس پہ تیزابِ سخن کا کچھ اثر ہوتا نہیں
جس پہ شعروں کا ہتھوڑا کارگر ہوتا نہیں

آپ کی بسیار گوئی کا تماشہ دیکھ کر
دم بخود ہیں صاحبانِ ذوق و اربابِ نظر

آپ کے سر پر مسلّط جذبۂ تحسین ہے
اور اُدھر سب کی زباں پر سورۂ یٰسین ہے

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

دوفی چند شرما

کانگڑہ کے نئے لوک گیت

ہر علاقے کے لوک گیتوں میں وہاں کے رسم و رواج اور معاشرت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ یہ گیت عوام کے احساسات و جذبات کے ترجمان ہوتے ہیں اور اُن کی تہذیب کے آئین۔ پسماندہ علاقوں میں جہاں علم و تہذیب کی کرنوں کو سرایت کرنے وقت دبیز پردوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ لوک گیت ایک اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ اپنے علاقے کی اپنی ایک خاص طرزِ معاشرت اور مخصوص روایات ہوتی ہیں۔ کانگڑے کے پہاڑی علاقے بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ ان علاقوں کے لوک گیتوں میں ہمیں مقامی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

لڑائی جھگڑا، عشق و محبت، حسد اور نفرت، ماں باپ کا پیار، دشمن کا خوف۔ یہ سب عقلِ حیوانی کے تقاضے ہیں۔ جہاں انسان سب پر بھی فرد رہوں گے شاید ان کے بغیر انسان کا تصور ہی محال ہے۔ اسی نوعیت کا کوئی نہ کوئی جذبہ لوک گیتوں کا محرک ہوتا ہے۔ ان محرکات کی تلاش کرتے وقت ہمیں اُن لوگوں کے بارے میں بہت سے عقلی تجزیے قائم کرنے کا موقع ملتا ہے۔

بدلتے ہوئے حالات اور سماجی تبدیلیوں کے ساتھ لوک گیتوں کا ڈھانچہ اور رُخ بھی بدلتا جاتا ہے۔ لوک کوی وقت کی آواز پر کان دھرتا ہے اور وقتی معاملات اور نظریات پیش کر کے لوک گیتوں میں ایک نیا رنگ بھرتا ہے ہم یہاں کانگڑہ کے ایسے لوک گیت پیش کرتے ہیں جن میں نئی زندگی اور نئے خیالات کا عکس نمایاں ہے۔ ہر ایک گیت کا ایک الگ موضوع ہے۔ ان پورے گیتوں کے علاوہ گیت بول بھی ہیں جن کے چند الفاظ کی تکرار سے ہمارا ذہن متاثر ہوتا ہے اور ہم کچھ سوچنے لگتے ہیں۔ مثلاً چرخی کاتنے والی لڑکی گاندھی واد کی نئی وچار دھارا سے متاثر ہو رہی ہے۔ اس کے دل میں اُونچی پہاڑی پر اسکول قائم کرنے کی لگن ہے اور وہ دیش کے تعمیری کاموں کی سرگرم کارکن نظر آتی ہے دھرتی سے لے کر گگن تک انسانی زندگی کے لئے بم اور سنگینیں بڑا بھاری خطرہ ہیں۔ وہ ان مہلک ہتھیاروں کی ایجاد اور ان سے پیدا ہونے والے خطرات کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتی ہے کانگڑہ کی مہمان نواز عورت مجسم انسان دوست معلوم ہوتی ہے اور کہیں وہ نو بیویوں والے" لوبھی خاوند" کی بری گت بننے کی کہانی سناتی ہے اور جوگی سے اس کا پتہ پوچھتی ہے۔ غرضیکہ ان گیتوں میں عوامی زندگی کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ لوک گیت کا کون سا ایسا بول ہے جو سننے والے کے دل پر گوناگوں کیفیتیں طاری نہیں کرتا۔ کون ہے جو کانگڑہ کی سندر وادی کی دلفریبی اس کا حُسن کرمتاثر نہیں ہوتا۔ یہ سب کچھ لوک کوی کی زبان سے سنئیے۔ وادی کانگڑہ کی دلفریبی کا ذکر یوں کرتا ہے:۔

نی میرا کانگڑہ دیس پیارا

ٹھنڈیاں پہاڑیاں دیاں برفانی چوٹیاں   پہنی جناں نے چٹے دیاں ٹوپیاں

کیڈا ہی چھیال نجارا۔ نی میرا .....

ڈگ ڈگی کھڈاں دے مٹھے مٹھے پانی   اُوچے اُوچے کوہ پہاڑاں دی نسانی

نی میرا کانگڑہ دیس پیارا

سوہنے ماہنوں بانکیاں ناراں   پھوجاں نے پین دُھوماں تے پکاراں

نی میرا کانگڑہ دیس پیارا

میرا کانگڑہ دیش بڑا پیارا ہے۔ ٹھنڈے پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے انھوں نے سفید لٹھے کی ٹوپیاں پہن رکھی ہیں۔ کتنا خوبصورت نظارہ ہے، گہری گہری

ندیوں کے میٹھے پانی اور اونچی اونچی چڑھائیاں پہاڑوں کی نشانیاں ہیں۔ یہاں کے مرد بہادر ہیں اور عورتیں خوبصورت ہیں۔ مردوں کی بہادری کی فوج میں دھوم مچی ہے۔ میرا [illegible] پڑا ہے:

دوسری جنگِ عظیم میں جب آسمان سے بموں کی بارش ہو رہی تھی اور سمندروں کی گہرائیوں میں تارپیڈو چل رہی تھیں تو جنگ کے ان تخریبی پہلوؤں پر کانگڑہ کے کوی نے جنگ کے علمبرداروں کو یوں کہہ کر طعنہ دیا تھا:۔

جنگ لگانی جاندے [illegible] آدمی [illegible] جاندے
اوپر تے [illegible] پانی [illegible] برساتی جاندے
ہیٹھاں تے بیٹھ پانی سرنگاں [illegible] جاندے

"جنگ شروع کر رکھی ہے اور انسانیت کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ اوپر سے پانی اور پرسے بم برسا رہے ہیں۔ نیچے کے پانی [illegible] دور کی [illegible] میں سرنگیں بچھا رہے ہیں۔"

کانگڑہ کے لوگ بڑے مہمان نواز ہیں۔ وہ ہمیشہ خندہ پیشانی کے ساتھ مہمان کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

بنے آنا جی [illegible] آنا [illegible] میرے انگنا [illegible] پانا

"میرا [illegible] تم [illegible] آنا [illegible]
یہ [illegible] آنگن کو اپنے مقدس پاؤں سے پاک کرتے رہنا۔"

پھر ایک یہ چرخے کا گیت ہے:۔

چرخی لیا ئی دے ماسے
کی مینو کتن دا چاؤ
کتن [illegible] چاؤ
کی پونی بٹن دا چاؤ
چرخی لیائی ....
بن تو دے دے ماسے
مینو کھدر دا داج
کھدر دا داج میرا اچھلا رواج

"اے ماں مجھے چرخہ لا دو۔ مجھے چرخے پر [illegible] کا شوق ہے۔ مجھے پونیاں بنانے کا شوق ہے۔ [illegible] روئی کے گالوں کی بھری ٹوکری کاتی اور خود ہی پونیاں بنائیں۔ اے ماں، تم مجھے جہیز میں مشینی کپڑے کی بجائے کھدر ہی دینا کیونکہ کھدر ہی ہمارے بزرگوں کا پہناوا تھا۔"

اس کے بعد اونچی پہاڑی پر تعمیر ہونے والی نئے اسکول کی بلڈنگ کے بارے میں ایک لوک گیت سنئے:۔

اُچیاں پہاڑیاں اسکول بناندی
لمیاں رکھاندی کاتیں
بھلو جی لمیاں رکھاندی کاتیں
پنج نی کرنی دس نی کرنیں
چودہ کرنی جماعتیں
بھلو جی چودہ کرنی جماعتیں

"اونچی پہاڑی پر اسکول کی بلڈنگ زیرِ تعمیر ہے۔ اس کی تعمیر میں عمدہ اور لمبی عمارتی لکڑی برتی جا رہی ہے۔ اسے جی! اس میں لمبی عمارتی لکڑی کا استعمال ہو رہا ہے۔ اس اسکول میں پانچویں یا دسویں تک ہی پڑھائی نہیں ہو گی۔ یہ چودہ جماعتوں کا اسکول ہو گا۔ اسے جی، اس اسکول میں چودہ جماعتوں تک پڑھائی ہو گی۔"

تعلیم کی ترویج کے ساتھ ساتھ پہاڑی عوام کا تعلیمی ترقی کا تصور کتنا سادہ لیکن کتنا پرزور ہے۔

دو شادیوں کی مزے دار بات بھی سنئے۔ مرد کے لئے پہلے دو شادیاں کرنا چنداں معیوب خیال نہ کیا جاتا تھا۔ لیکن اب دیکھئے لوگوں کے خیالات میں تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ دو بیویوں کے بیچ گھرا ہوا مرد گویا ایک طرف سمندر دوسری طرف کھائی کے درمیان ہے۔ دو بیویوں کا بوجھ مرد کو کیسے لے ڈوبتا ہے عوامی شاعر ان خیالات کی یوں ترجمانی کرتا ہے:۔

"اے دو بیویوں کے بیچ میں پھنسنے والے تمھیں بڑی بھاری مشکل درپیش ہے۔ ایک بیوی تو شال مانگ رہی ہے دوسری لہنگا طلب کر رہی ہے۔ اے دو استریوں کے لوبھی مرد، تمھیں مصیبتوں نے آن گھیرا ہے۔ ایک بیوی ناک کی نتھ مانگتی ہے، دوسری ناک کے لئے لونگ (زیور) لینے پر بضد ہے۔"

اس گیت کے بول بھی ملاحظہ ہوں:۔

دو ناراں دسے آدھ بھیّا جی
تجو بڑی بھاری بنی سے
اک تاں منگے سرسے جو سالوا
دوجی گھگرے جواڑی دسے

دو جتاناں دسے آو بھیّا جی
تجو بڑی بھاری بنی سے
اک تاں منگے نکے دی بیر
دوجی ونگے جو اڑی سے

ہندوستان قدیم زمانے سے ہی روحانیت کا پجاری رہا ہے یہاں کے بچّے بچّے کے دل میں تیاگ کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ بھارت کے رشیوں منیوں نے مادّیت سے احتراز کیا ہے۔ انھوں نے سیدھی سادی زندگی کو ہمیشہ آرام و آسائش پر ترجیح دی ہے۔ گوتم اور چانکیہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ ایک راجہ کسی فقیر سے پوچھتا ہے:-

"اے جوگی تمھارے رہنے کے لئے محل تعمیر کروائے جائیں
یا تم کٹیا میں ہی رہنا پسند کرو گے"

تارکِ دنیا فقیر کہتا ہے:- اے راجہ محل تو تمھاری رانیوں کو زیب دیتے ہیں۔ میرا من کٹیا میں ہی مطمئن رہتا ہے۔

راجہ
آکیا دسے جوگی تینوں محل بنائیے
کی تیرا من کٹیا کو راجو

جوگی
محل تاں تیرے سیے راجا
رانیاں کو بن دسے
کی میرا من کٹیا بیں راجو

جب کسی کے ہاں بچّہ پیدا ہوتا ہے تو پہاڑ کی بیٹی اپنی ماں تک بچّے کی پیدائش کی خوشخبری پہنچانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کے لئے اس سے زیادہ خوشی کا اور کونسا موقعہ ہو سکتا ہے۔ پیناں چڑو ہاکر ہے کو ہی اپنا قاصد بناتی ہے۔ اگر وہ اڑ کر اُس کی ماں تک یہ نوید جا لئے۔ اسے پیار سے وہ اُسے بھائی کہہ کر پکارتی ہے۔

اُڈیاں کاگا بھائیا بڈیا بھیا گا
جاتی بولیاں میریا اماں پاس
دھیئے ہولُر دو جائیا بے

ایاز جھانسوی

غزل

دیوانگی نے خوب کرشمے دکھائے ہیں
اکثر ترے بغیر بھی ہم مسکرائے ہیں

اے عشرتِ زمانہ ترا کیا خیال ہے
ہم اپنے ساتھ لے کے غمِ عشق آئے ہیں

اک صبحِ نو نگار کی خاطر تمام رات
ہم نے کئی چراغ جلائے بجھائے ہیں

میخانہ کی طرف جو بڑھے ہیں تو ہوشیار
کعبے کا رُخ کیا ہے تو ہم ڈگمگائے ہیں

ہم پر بھی رہگذارِ محبت کو ناز ہے
ہم نے بھی کچھ نقوش مٹا کر بنائے ہیں

یوں بھی ملی ہے مجھکو مرے ضبطِ غم کی داد
اکثر وہ سر جھکائے ہوئے مسکرائے ہیں

حیرت سے دیکھتا ہے زمانہ ہمیں ایاز
اُس تک پہونچ پہونچ کے جو ہم لوٹ آئے ہیں

ماں تجھے میری پڑھیاں پیندیاں
گیگا بہ ڈیا رامی جائیا بے

"اے کوے لے میرے بھائی تو جلدی سے اڑ کر میری ماں کے پاس جانا اور اسے یہ خوشخبری سنا کہ تمھاری بیٹی کے ہاں بچّہ پیدا ہوا ہے"

"ماں نے یہ خوشخبری سُنی تو پڑھے لکھے پنڈتوں سے پوچھنے لگی کہ ننھا کون سی مبارک ساعت میں پیدا ہوا ہے؟"

یہ اور ایسی ہی دوسری مبارک گھڑیاں بار بار آکر ان لوگوں کی زندگی کو نئی نئی خوشیوں سے بھر دیتی ہیں اور نئے نئے لوک گیتوں کو جنم دیتی ہیں۔

رشیدالدین

کوٹلیہ

عہدِ قدیم کا عظیم ہندو مفکر

وشنو گپت کوٹلیا جسے چانکیہ بھی کہا جاتا ہے، ہندوستان کے عہدِ قدیم [illegible] ہند و دور کا عظیم ترین مفکر تھا۔ [illegible] ایسے شخص بہت کم پیدا ہوئے ہیں کوٹلیہ [illegible] صرف ایک مفکر ہی نہیں تھا بلکہ ایک [illegible] اور حق تو یہ ہے کہ وہ فلسفی یا عالم بھی نہیں تھا [illegible] تاریخ [illegible] میں سقراط اور افلاطون [illegible] ارسطو اور [illegible] جو [illegible] اپنی کتابوں میں [illegible] نظریات [illegible] کوٹلیہ کی طرح ایسے [illegible] کم [illegible] جو سوچتے اور نظریات [illegible] عملی سیاست میں بھی ماہر ہوں۔ اس [illegible] کوٹلیہ [illegible] نظر آتا ہے۔ جسے ہندو سیاسیات کا بابا آدم کہا جاتا ہے۔

کوٹلیہ کی زندگی کے ابتدائی حالات سے ہم قطعی ناواقف ہیں، ورنہ اس سلسلے میں تاریخ ہماری کچھ مدد کرتی ہے بلکہ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ اعلیٰ خاندان کا ایک برہمن تھا اور بہت عالم فاضل تھا۔ بعض لوگ اسے ٹیکسلا کا رہنے والا بتاتے ہیں اور بعض لوگ جنوبی ہند [illegible] ہندوستان میں نند خاندان کی عظیم الشان سلطنت قائم تھی [illegible] نند خاندان کے آخری بادشاہ [illegible] نے ایک بار دربار میں اسے کچھ [illegible] آمیز فقرے کہہ دیئے۔ جس کی وجہ سے یہ نند خاندان کا سخت ترین دشمن بن گیا۔ اور نند خاندان کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا۔ اب اس کے دل میں ایک ہی بات سماگئی کہ کسی طرح نند خاندان سے اپنی اس ذلت کا بدلہ لینا چاہیئے لیکن یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ نند سلطنت کے بادشاہ سے وہ بدلہ صرف اسی وقت لے سکتا تھا جب کہ وہ اسے مغلوب کرے۔ اور اُسے مغلوب کرنے کے لئے ایک بہت بڑی طاقت درکار تھی۔

اس کام کے لئے اس نے اپنے ذہن میں ایک طویل پلان[1] تیار کیا۔ اپنے اس پلان کو روبہ عمل لانے کے لئے اُسے ایک بہادر نوجوان کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ایک ایسے ہی نوجوان کی تلاش میں وہ سرگرداں تھا کہ اُسے چند بچوں کا ایک کھیل کھیلتا ہوا نظر آیا اس نے غور سے دیکھا۔ بچے حکومت کا کھیل کھیل رہے تھے۔ مختلف بچے مختلف رول ادا کر رہے تھے اور ایک ان سب کا سردار تھا۔ یہ خوبرو لڑکا بلا کا ذہین، بہادر اور توانا تھا۔ اس میں سرداری کی کافی صلاحیت تھی۔ بوڑھے مدبر کو یہ لڑکا اپنے پلان کے لئے بہت موزوں معلوم ہوا۔ چنانچہ یہ مشہور ہے کہ اس نے اسی بچے کو بہت دن تک اپنے پاس رکھ کر اس کی تربیت کی اس کے

[illegible] دوسرے [illegible] سیاسی مفکر

نکولو میکیاولی ۱۴۶۹ء تا ۱۵۲۷ء، اطالوی سیاسی مفکر جس نے "حکمران" (دی پرنس) ایسی شہرۂ آفاق کتاب تصنیف کی۔

[1] کوٹلیا نے اپنی ذلت کا بدلہ نند خاندان سے کس طرح لیا؟ چندرگپت موریا اسے کس طرح ملا؟ اس کے متعلق بہت ساری روائتیں مشہور ہیں۔ جن میں سے ایک روایت یہ بھی ہے جس کا ابھی کوئی مستند تاریخی ثبوت نہیں بہم پہنچا ہے۔ لیکن روایت کی جو اہمیت ہے وہ بھی اپنی جگہ مسلّم ہے۔

بعد ایک فوج تیار کی جس کا سردار یہ بہادر نوجوان تھا اور پھر اس نوجوان اور اس کی فوج کی مدد سے اس نے نندا خاندان پر حملہ کیا اور اسے نیست و نابود کر کے اپنی ذلّت کا بدلہ لیا۔ اور یہی نوجوان بعد کو تاریخ میں چندر گپت موریا کے نام سے مشہور ہوا۔ اس طرح ۳۲۳ ق۔م میں ہندوستان کے نقشے پر عظیم موریا سلطنت کا ظہور ہوا۔ جو قدیم ہندوستان کا سنہری دور کہلاتا ہے۔

یوں تو موریا خاندان کا بانی اور شہنشاہ چندر گپت تھا لیکن اس کی پشت پناہی اصل میں کوتلیا ہی کرتا تھا اور اس لئے ڈاکٹر ٹوپا[1] نے کوتلیا سے متعلق اپنی تصنیف میں اسے "کنگ میکر" (بادشاہ بنانے والا) کہا ہے۔ موریا خاندان کا سارا ڈھانچہ اور انتظام کوتلیا کے دماغ کی پیداوار تھا۔ اور ہر لمحہ وہ چندر گپت کو اپنے مفید مشوروں سے نوازتا رہتا تھا۔ موریا خاندان کے شہری، فوجی اور حکومتی غرضیکہ ہر طرح کے انتظام میں کوتلیا کا دخل تھا۔ وہ اپنے زمانے کا بہت بڑا عملی سیاست دان تھا۔ اور کوتلیا ہی کی وجہ سے موریا خاندان وجود میں آیا تھا اور اتنا پروان چڑھا تھا۔

کوتلیا بہت بڑا عالم فاضل اور سیاست دان تھا۔ عملی سیاست کی حد تک اس کی نظر بڑی گہری تھی۔ لیکن اس کا سب سے بڑا کارنامہ اس کی شاہکار کتاب "ارتھ شاستر" ہے۔ اس کے نام سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاشیات سے متعلق ہے لیکن اصل میں یہ کتاب معاشیات پر کم اور سیاسیات پر زیادہ ہے۔ ویسے تو اس کتاب میں ہمیں تقریباً سارے علوم کی جھلکیاں ملتی ہیں لیکن پھر بھی حکومت اور فنِ حکومت پر اس کتاب میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اگر کوتلیا کتنا ہی عالم فاضل اور پڑھا لکھا ہوتا۔ عملی سیاست میں اس کا کتنا ہی اہم رول ہوتا اور اگر وہ موریا خاندان کے وجود کا محرک بھی ہوتا۔ تب بھی یہ کوئی خاص بات نہ ہوتی اور تاریخ میں دو لائن میں یہ ذکر کر دیا جاتا کہ کوتلیا چندر گپت موریا کا وزیر تھا۔ اور کافی پڑھا لکھا اور کامل سیاست دان تھا لیکن اس کی کتاب ارتھ شاستر نے اسے زندہ جاوید بنا دیا۔ اور دنیا کے سیاسی مفکّروں میں اسے ایک بلند مقام دیا۔

"ارتھ شاستر" واقعی کوتلیا کا ایک ایسا کارنامہ ہے کہ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ کتاب نہ صرف سنسکرت زبان و ادب بلکہ ہندوستان کی ساری زبانوں اور ادبوں میں قدیم سے لے کر جدید تک اپنا ثانی یا نعم البدل نہیں رکھتی اس کتاب نے صدیوں تک لوگوں کے دماغوں پر اپنا اثر رکھا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے درمیان میں ایک عرصے تک یہ کتاب بالکل غائب ہو گئی تھی اور ہم یہ جاننے سے بھی قاصر تھے کہ کوتلیا نے "ارتھ شاستر" نامی کوئی کتاب بھی لکھی تھی۔ لیکن اچانک ۱۹۰۵ء میں اس کتاب کا ایک قدیم نسخہ سنسکرت زبان میں مختلف درختوں کے پتّوں پر لکھا ہوا (جس کا کہ اس زمانے میں رواج تھا) میسور کی لائبریری میں پایا گیا۔ اور دنیا ایک بار پھر کوتلیا کے ارتھ شاستر سے متعارف ہوئی۔ لیکن اب بھی بعض لوگ ارتھ شاستر کو کوتلیا کی تصنیف کہتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ حالاں کہ یہ کوتلیا ہی کی تصنیف ہے۔ وہی کوتلیا جس نے ہندوستان کو چندر گپت جیسا بادشاہ اور موریا جیسی سلطنت دی تھی

سب سے پہلے "ارتھ شاستر" کا ترجمہ ایک جرمن نے سنسکرت سے جرمنی میں کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر شیاما شاستری نے (جو اس زمانے میں میسور کے محکمہ آثار قدیمہ کے ناظم تھے) اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا۔ اور اس کے بعد فوراً ہی اس کتاب کو دنیا کی متعدد زبانوں میں منتقل کیا گیا۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ چھ سو صفحات پر مشتمل ہے جس میں پندرہ باب اور ایک سو اسّی حصّے ہیں۔

ارتھ شاستر سنسکرت زبان کی ایک عظیم کتاب ہے۔ جس میں تمام معاشی، معاشرتی اور سیاسی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب میں کوتلیا نے افلاطون اور ارسطو کی طرح کوئی عینی مملکت نہیں پیش کی ہے اور نہ خیالی گھوڑے دوڑائے ہیں بلکہ اس میں اس نے جو کچھ لکھا وہ سب قابلِ عمل تھا اور موریا سلطنت میں اس پر عمل بھی کیا جاتا تھا۔ اس زمانے کے اور لوگوں کی تصنیفات کی طرح کوتلیا کی ارتھ شاستر میں اخلاقیات کا درس نہیں ملتا۔ بلکہ وہ اخلاقیات اور سیاسیات کو الگ الگ تصوّر کرتا ہے۔ میکیاولی نے یہی چیز پندرھویں صدی میں پیش کی۔ لیکن کوتلیا اس سے دو ہزار سال پہلے ہی یہ خیالات پیش کرتا ہے بلکہ بعض اوقات کوتلیا میکیاولی سے بھی نکھرے ہوئے اور قابلِ ترجیح خیالات پیش کرتا ہے۔ کوتلیا عظیم یونانی مفکّر ارسطو کا ہم عصر تھا۔ لیکن ارسطو اور کوتلیا کے خیالات میں زمین و آسمان کا فرق ملتا ہے۔ ارسطو اپنی شاہکار تصنیف "سیاسیات" میں محدود عینی مملکت کا خاکہ پیش کرتا ہے۔ جب کہ کوتلیا اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "ارتھ شاستر" میں وسیع و عریض اور قابلِ عمل مملکت کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ ارسطو کے مرنے کے بعد اُسے ایک مدت تک بھلا دیا جاتا ہے۔ لیکن کوتلیا کے مرنے کے بعد بھی ایک زمانے تک لوگوں کے دماغوں پر اس کی چھاپ رہتی ہے۔

ارتھ شاستر آج سے دو ہزار تین سو سال پہلے لکھی گئی ہے لیکن اُسے پڑھنے

[1] ڈاکٹر ایشور ٹوپا، رجسٹرار عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (آندھرا پردیش)

سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی حالیہ مفکر نے لکھی ہے۔ وہ خیالات جو میکیاولی نے پندرھویں صدی میں اور بودُاں[1] نے سولھویں صدی میں ہمیں دیئے ہیں۔ کوتلیا آج سے دو ہزار تین سو سال پہلے بڑے ٹھاٹ سے اُن کا ذکر کرتا ہے۔ اس کی کتاب میں قانون، حکومت، بادشاہت اور نظم و نسق پر بڑی سنجیدگی سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ غرض اپنے موضوع پر یہ کتاب یکتائے زمانہ ہے۔

ایک بادشاہ کو کیسے رہنا چاہیئے۔ اس کی کیا کیا خصوصیات ہونی چاہئیں اسے کس چیز سے بچنا چاہیئے اور کیا کچھ کرنا چاہیئے۔ ان تمام چیزوں سے متعلق کوتلیا نے ارتھ شاستر میں بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ایک ریاست میں بادشاہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ہر معاملے میں وہ مرکزی رول ادا کرتا ہے۔ اس لئے بادشاہ کو بہت محتاط اور پابند رہنا چاہیئے۔ وہ تمام لوگوں کے لئے "ایک مثالی آدمی" ہونا چاہیئے۔

جہاں تک بادشاہ کے اختیارات کا تعلق ہے۔ وہ اُسے لامحدود اختیارات کا مالک سمجھتا ہے۔ کوتلیا کا بادشاہ لوئی چہاردہم[2] اور فریڈرک دی گریٹ[3] کی طرح طاقتور اور خود مختار ہے۔ اپنی حکومت کی حد تک وہ سیاہ و سفید کا مالک ہوتا ہے۔ مملکت کا کوئی دوسرا فرد اس کی مشیت کو چیلنج نہیں کر سکتا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ کہتا ہے کہ ایک بادشاہ کو ہمیشہ اپنی رعایا کی خوشی اور بہبود کا خیال رکھنا چاہیئے۔ کیوں کہ اس ہی کی وجہ سے وہ بادشاہ ہے۔ اگر رعایا نہ ہوگی تو بادشاہ بھی نہ ہوگا۔ ارتھ شاستر میں وہ ان الفاظ میں لکھتا ہے:-

"کسی بادشاہ کی خوشی اس کی رعایا کی خوشی ہونی چاہیئے۔ اس طرح کسی بادشاہ کی بہبود اس کی رعایا کی بہبود میں مضمر ہونی چاہیئے جو چیز اُسے خوش رکھتی ہے اُسے اس کو اچھی نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ اس بات کو اچھا سمجھنا چاہیئے جسے اس کی رعایا اچھا سمجھتی ہے۔"

ایک بادشاہ کو انتباہ کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ اسے دو چیزوں سے بہت محتاط رہنا چاہیئے۔ ایک اپنی رعایا کی عورتوں کی عصمت دری اور دوسرے اپنی رعایا کی ذاتی جائداد۔ کیونکہ کوتلیا کا خیال تھا کہ لوگ اپنے رشتہ داروں کی موت کو تو جلد بھول جاتے ہیں لیکن جائداد کے جانے کے غم کو جلد نہیں بھولتے۔ اس کا خیال تھا کہ لوگ اپنی ذاتی جائداد سے بہت زیادہ محبت رکھتے ہیں اور اگر وہ ان سے چھین لی جائے تو ان میں بادشاہ کے خلاف کبھی نہ ختم ہونے والا انتقام کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے یہی حال عورتوں کی عصمت دری کا بھی ہے۔ ایک بادشاہ کا معیار اس کے نزدیک یہ تھا کہ اُسے لالچی، حریص، تنگ نظر، غضبناک، منتقم اور کمزور نہیں ہونا چاہیئے

ایک بادشاہ کی خصوصیات گنواتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ بادشاہ کو رحم دل، خدا ترس، سچا، ہوشیار، ذہین، طاقتور، وسیع النظر اور مستقل مزاج ہونا چاہیئے اس کے علاوہ وہ کہتا ہے کہ بادشاہ کو ہمیشہ اعلیٰ خاندان کا ہونا چاہیئے تاکہ اتنی بڑی جگہ رہ کر وہ چھوٹی اور رذیل حرکتیں نہ کرے۔ ایک مکمل بادشاہت کے حصول کے بارے میں وہ مزید لکھتا ہے کہ "ایک بادشاہ کو ہمیشہ عالموں، فاضلوں اور اپنے سے بڑوں کی صحبت میں رہنا چاہیئے۔ بادشاہ کو فن جنگ اور فن نظم و نسق دونوں میں ماہر ہونا چاہیئے۔ وہ اپنی مملکت کے تمام انسانوں میں ممتاز ہوتا ہے۔ اس لئے اسے ایک مثالی آدمی ہونا چاہیئے۔ اس کی زندگی عام لوگوں کے لئے ایک سبق ہونی چاہیئے۔ ایک بادشاہ کو اپنے ماتحتوں پر کڑی نگرانی رکھنی چاہیئے۔ کیوں کہ اُن پر ہی اس کی حکومت کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بادشاہ کو اپنے بڑے بیٹے پر بھی نگرانی رکھنی چاہیئے۔ جو آگے چل کر سلطنت کا وارث ہوگا۔ ولی عہد کا ماحول اس قسم کا نہیں ہونا چاہیئے جس میں اس کا احساس برتری ختم ہو جائے یا وہ اپنی حیثیت بھول جائے

کوتلیا ایک مثالی بادشاہ کا تذکرہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے کہ ایک بادشاہ کو اپنی روزمرہ زندگی میں بہت پابندی کرنی چاہیئے۔ کیوں کہ اس کے دشمن زیادہ اور دوست کم ہوتے ہیں۔ ہر وقت کھانے سے پہلے اپنے کھانے کا کچھ حصہ جانوروں کو کھلانا چاہیئے۔ جس سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ کھانے میں زہر نہیں ملا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ سونے کے معاملے میں بھی ایک بادشاہ کو بہت محتاط رہنا چاہیئے۔ اور اپنی سونے کی جگہ ہمیشہ معین نہیں رکھنا چاہیئے۔ بلکہ بدلتے رہنا چاہیئے۔ تاکہ دشمن کو اس کا علم نہ ہو سکے کہ بادشاہ کہاں سویا ہے۔ چناں چہ چندرگپت موریا بھی کون سی رات کہاں اور کس رانی کے پاس سوتا تھا اس کا کسی کو علم نہیں ہوتا تھا۔ سوائے اُس کے اور اُس رانی کے جس کے پاس وہ سوتا تھا۔ اس طرح کوتلیا نے اپنی کتاب "ارتھ شاستر" میں ایک بادشاہ

---

[1] جین بودُاں ۱۵۳۰ تا ۱۵۹۶ء فرانس کا مشہور قانون دان

[2] لوئی چہاردہم۔ فرانس کا مشہور و معروف شہنشاہ۔ جس کے اس جملے سے کہ "میں خود مملکت ہوں" آج بھی آمریت ٹپکتی ہے۔

[3] فریڈرک دی گریٹ۔ اسپین کا مشہور شہنشاہ

کے لئے جتنی چیزیں بتلائی ہیں چندر گپت ان سب پر سختی سے عمل کرتا تھا۔ اس طرح کوتلیا کے خیالات صرف کاغذ ہی کی حد تک محفوظ نہیں تھے بلکہ کاغذ سے عملی زندگی میں پہنچ گئے تھے۔

بادشاہ کی سلامتی اور ترقی کے لئے وہ جاسوسی کے محکمے پر بہت زور دیتا ہے۔ کوتلیا کہتا ہے کہ ملک کے طول و عرض میں اور ملک کے باہر بھی پڑوسی ممالک میں جاسوسوں کا ایک جال بچھا دینا چاہیئے۔ تاکہ ہر وقت تمام خبریں بادشاہ تک پہنچ سکیں۔ جاسوسوں کو مختلف لوگوں کے لباس میں گھومتے اور رازلیتے رہنا چاہیئے۔ ان کے علاوہ جاسوسوں میں بھی بعض جاسوس ایسے ہونے چاہئیں جو دوسرے تمام جاسوسوں پر نگرانی رکھیں کہ کہیں وہ غلط خبریں تو نہیں پہنچاتے ہیں یا سرکاری عہدہ داروں اور حکام سے تو نہیں مل گئے ہیں چنانچہ چندرگپت کے زمانے میں جاسوسی کا ایسا ہی نظام قائم تھا۔

حکومت اس وقت ترقی کر سکتی ہے جب کہ معاشی نقطۂ نظر سے وہ نہ صرف خود مکتفی بلکہ پوری طرح مستحکم ہو۔ حکومت کی آمدنی کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہوتا ہے اور وہ ذریعہ ہے ٹیکس۔ چناں چہ "ارتھ شاستر" میں کوتلیا ٹیکسوں پر بہت زور دیتا ہے اور عدم ادائیگی ٹیکس کے سلسلے میں وہ سخت سزا کی سفارش کرتا ہے۔ کوتلیا کا کہنا تھا کہ زراعت پیشہ افراد کو اپنی آمدنی کا ۱/۴ حصہ حکومت کو بطور ٹیکس دینا چاہیئے اس کے علاوہ طوائفوں اور ڈرامہ نویسوں وغیرہ کی آمدنی کا آدھا حصہ وہ بطور ٹیکس کے تجویز کرتا ہے۔ مختلف دھاتوں مثلاً سونا، چاندی اور بعض دوسری دھاتوں اور پیداواروں پر بھی وہ ٹیکس وصول کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ ان سب چیزوں کے علاوہ مختلف پیشہ ور فنکاروں مثلاً سنار، لوہار، دواساز اور مختلف چیزیں تیار کرنے والوں سے بھی وہ ٹیکس وصولی کو جائز قرار دیتا ہے۔

اپنی کتاب "ارتھ شاستر" میں کوتلیا نے سفیروں سے متعلق بھی تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دو ملکوں کے تعلقات میں سفیروں کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے اس لئے ہمیشہ قابل اور موزوں لوگوں کو اس عہدے کے لئے منتخب کرنا چاہیئے سفیر کو ایک اچھے کردار کا آدمی ہونا چاہیئے کیونکہ وہ دوسرے ملک میں اپنی قوم کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جس ملک میں اسے مقرر کیا جا رہا ہے اس ملک کے جغرافیائی اور سیاسی و معاشرتی حالات سے بھی اُسے واقف رہنا چاہیئے ان حالات کے تحت ہی کسی ملک کی بیرونی پالیسی کامیاب ہو سکتی ہے۔

اس طرح کوتلیا "ارتھ شاستر" میں حکومت اور فنِ حکومت پر تفصیل سے بحث کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں رہ جاتا جس کا اس میں ذکر نہ ہوا ہو اور جس پر اس نے خامہ فرسائی نہ کی ہو۔ کسی بھی ایک مسئلے کو لے کر وہ اس پر صفحے کے صفحے لکھ دیتا ہے۔ معاشی، معاشرتی اور سیاسی وغیرہ ہر قسم کے خیالات ہمیں اس کتاب میں ملتے ہیں۔ "ارتھ شاستر" کو پڑھتے ہوئے ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم واقعی اسی دور میں پہنچ گئے ہیں۔

"ارتھ شاستر" کو پڑھتے وقت ہمیں یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رکھنی چاہیئے کہ یہ کتاب آج سے دو ہزار تین سو سال پہلے لکھی گئی ہے۔ اور اس کی یہی وجہ اس کے لکھنے والے کو عظمت کی لامتناہی بلندیوں پر پہنچا دیتی ہے چنانچہ آج بھی یہ کتاب اپنی متعلقہ کئی کتابوں پر بھاری ہے۔

زبیر رضوی

غزل

دل کہ ہے کشتۂ نیرنگیٔ حالات بہت
یاد آئے ہے حسینوں کی مدارات بہت

شیشۂ دل میں نہ اترا کوئی عکسِ تحریر
شہرِ خوباں سے صبا لائی ہیامات بہت

شوقِ رسوائیٔ عشاق سلامت رہیو
جی ترستا ہے میرا بہرِ ملاقات بہت

کیجیئے عرضِ تمنا تو ہنرمندی سے
بار ہوتی ہے طبیعت پہ یہی بات محبت

مرغِ آوارہ کو انوارِ سحر کیا معلوم
مان بھی جاؤ کہ باقی ہے ابھی رات بہت

چلئے کیا گذرے گی تقدیسِ مئے و مینا پر
عام ہے انجمنِ پیرِ خرابات بہت

جو دلِ بے مہریٔ احباب بھی دولت ہے زبیر
چھیڑ مت تذکرۂ لطف و عنایات بہت

ن۔م

کتابیں اور رسالے

لکھنؤ کا عوامی اسٹیج

مصنفہ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ ضخامت ۲۲۰ صفحات تقطیع ۲۲×۳۶/۱۶
کتاب مجلد ہے اور جلد پر گردپوش بھی ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ۔ قیمت پانچ روپے
ناشر کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنؤ۔

اس نادر تحقیقی کتاب کے فاضل مصنف محتاج تعارف نہیں۔ موصوف نے اس کتاب میں اندر سبھا کے مصنف اور عوامی اردو اسٹیج کے بانی امانت لکھنوی کے حالات اور تصنیفات کی تفصیل درج کی ہے۔ اندر سبھا کا مستند اور مکمل متن کتاب میں شامل ہے۔ ... اندر سبھا کے متعلق جو غلط فہمیاں اب تک ... تھے ... مثلاً نامکس گرکے مصنفوں اور کچھ دوسرے لوگوں نے لکھا ہے کہ واجد علی شاہ کی فرمائش پر یہ کتاب تصنیف ہوئی اور اس فرمائش کے محرک کچھ فرانسیسی تھے جو واجد علی شاہ کے درباری تھے۔ انھوں نے ہی اوپیرا کا تصور پیش کیا۔ لیکن اس کتاب کے فاضل مصنف نے مستند حوالہ جات سے یہ تحقیق کیا ہے کہ واجد علی شاہ کے دربار میں کوئی فرانسیسی نہیں تھا اور نہ یہ کتاب بادشاہ کی فرمائش پر لکھی گئی۔ اس کتاب میں اندر سبھا کا کھیل، اس کے کردار، پوشاکیں، اسٹیج کا ساز و سامان، اندر سبھا کی مقبولیت، اس کے طرز پر لکھے ہوئے ناٹک، اور بہت سی مزید معلومات درج ہیں۔ شاہی رہس کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ متعدد تصاویر بھی شامل کتاب ہیں۔ ماخذوں کی فہرست سے مصنف کی محنت شاقہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ کتاب ہمارے تحقیقی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ حق یہ ہے کہ اندر سبھا سے متعلق ایسی جامع کتاب لکھنا انھیں کا حصہ تھا۔ ادیب صاحب سے موزوں تر آدمی اور کون ہو سکتا تھا۔ انھوں نے عمر کا ایک بہت بڑا حصہ اسی تحقیق میں گزارا ہے اور اسی کا نتیجہ یہ کتاب ہے۔

لکھنؤ کا شاہی اسٹیج

مصنف سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ ناشر کتاب نگر، دین دیال روڈ لکھنؤ
یہ کتاب بھی ضخامت، کتابت، طباعت وغیرہ کے اعتبار سے پہلی کتاب (لکھنؤ کا عوامی اسٹیج) کا مثنیٰ ہے۔ قیمت بھی پانچ روپے۔

اس کتاب کے مندرجات بھی بڑی محنت شاقہ اور تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ ڈرامے سے پہلے ہمارے تفریحی مشغلوں میں ڈرامائی عناصر، اردو کا پہلا ڈراما واجد علی شاہ کے قلم سے، اردو ڈرامے کا پہلا اسٹیج شاہی محل میں، شاہی ڈرامے کے اداکار، پوشاکیں، زیور اور دوسرا ساز و سامان، شاہی میلا، مستند تاریخی اور تحقیقی معلومات کتاب میں درج ہیں۔ کتاب لکھنؤ کے روایتی ہندو مسلم تہذیبی اتحاد کے نام معنون کی گئی ہے۔ اس سے مصنف کے مزاج صالح اور طبیعت کی سنجیدگی کا پتہ چلتا ہے۔ نصف درجن کے قریب سہ رنگی اور دوسری تصویریں کتاب کی زینت ہیں۔ ماخذوں کی طولانی فہرست مصنف کی محنت پر دال ہے۔ یہ کتاب اردو ڈرامے کی تاریخ میں ایک نادر اضافہ ہے۔ بہت سی تفصیلات جو اب تک منظر عام پر نہیں آئی تھیں اس کتاب میں شامل ہیں۔ رہس سے متعلق تحقیق اور رہس کے جلسوں کا بیان، راس لیلا کے مختلف تصور وغیرہ مختلف معلومات کتاب میں بڑی تفصیل سے درج ہیں۔ یہ دونوں کتابیں اس سال کی بہترین تحقیقی تصانیف میں سے ہیں۔

آج کل دہلی

اردو ادب میں طنز و مزاح

مصنف وزیر آغا۔ شائع کردہ اکادمی پنجاب ٹرسٹ مال روڈ، لاہور
ضخامت ۲۲۷ صفحات۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶۔ کتابت، طباعت، جلد عمدہ۔

قیمت چار روپے بارہ آنے۔

رشید احمد صدیقی کی کتاب طنزیات و مضحکات اب نایاب ہے۔ اس لئے اردو میں اس موضوع پر ایک جامع کتاب کی بڑی ضرورت تھی۔ اکادمی پنجاب نے وزیر آغا صاحب کے اس مقالے کو شائع کر کے اردو کی بڑی خدمت کی ہے۔ پرنسپل حمید احمد خاں صاحب نے تعارف کے آخر میں بڑی پتے کی بات کہہ دی ہے:

"شرارت اور متانت کے قطبین کے درمیان، شرارت کے خط استوا پر مزاح کا آفتاب چمکتا ہے کیونکہ شرارت سے محبت کا اظہار بھی ہوتا ہے اور عداوت کا بھی۔ دیکھنا یہ ہے کہ اردو کی دنیا میں شرارت کا خط استوا کہاں واقع ہے اور اس پر مزاح کا آفتاب کتنی مرتبہ چمکا ہے۔ جس دن ہماری تحقیق نے ان مسائل کا حل پا لیا مشرقی تمدن اس قابل ہوگا کہ جارج میریڈتھ کے دعوے کا جواب دے۔"

کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے، مزاح اور مزاح نگاری، اردو شاعری میں طنز و مزاح، اردو نثر میں طنز و مزاح، اردو ادب کے مزاحیہ کردار، اردو ڈراما میں طنز و مزاح، اردو صحافت میں طنز و مزاح۔

ان تمام عنوانات کے تحت تفصیلی بحث کے ساتھ ساتھ مزاح اور طنز سے متعلق ادب کے نمونے بھی پیش کئے گئے ہیں۔ کتاب لاہور میں تصنیف ہوئی ہے افسوس ہے کہ اردو شاعری اور صحافت کے ضمن میں غیر منقسم ہندوستان کی تخلیقات کے نمونے تو درج ہیں لیکن پنڈت ہری چند اختر کی تخلیقات کا کوئی ذکر نہیں۔ طنز و مزاح کی دنیا میں مرحوم کا ایک خاص مقام ہے۔ شاید مصنف کو ان کی تخلیقات مل نہیں سکیں۔ ہمیں امید ہے کتاب کے اگلے ایڈیشن میں اس کا ازالہ کر دیا جائے گا۔

کتاب ہر صورت سے قابلِ قدر اور لائقِ التفات ہے۔

فردوسئ ہند

پیرایۂ کر شتہ۔ یعنی مرثیہ حضرت فارغ علیہ الرحمۃ کے رزمیہ مراثی کا جائزہ۔ مصنف جناب صفدر آہ۔ ناشر کتاب کدہ ۱۰۰۔۱۳ والکیشور روڈ بمبئی۔

ڈاکٹر صفدر آہ سیتا پوری ایک شاعر اور ادیب کی حیثیت سے منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ اس کتاب میں فارغ کے محاسنِ شعری کی تفصیل کے ساتھ ساتھ مصنف نے مرثیہ اور اس کے جملہ لوازم کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ علی سردار جعفری نے دیباچے میں لکھا ہے کہ "مرثیے کے فن کو جس انداز سے ڈاکٹر آہ سیتا پوری نے پیش کیا ہے (اور جس کا یہ مستحق تھا) اب تک کوئی ناقد نہیں پیش کر سکا ہے"۔

مرثیے کی افادیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ رزمیہ واقعات کا ذکر مردہ قوم کو بیدار کر دیتا ہے۔ کرداروں کے محاسن بیان کرنے سے افرادِ قوم میں مزاج صالح پیدا ہوتا ہے۔ آہ صاحب نے مرثیے کے اجزاء کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ خواندگی اور اداکاری کے تحت بڑی سیر حاصل بحث کی ہے۔ موصوف نے فارغ کے کلام کا جائزہ لیتے وقت محض عقیدت کو ہی سامنے نہیں رکھا بلکہ حق و انصاف سے کام لیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں فردوسی تلسی داس یا ہومر کا ذکر ضمناً آ گیا ہے یہ بدیہی طور پر موازنے کی غرض سے نہیں ہے۔ حفیظ نے خود کو فردوسئ اسلام کہہ کر خود کو مبارکباد بھی پیش کر دی ع مبارک ہو تجھے فردوسئ اسلام ہو جانا۔ اب آہ صاحب نے اگر فارغ کو فردوسئ ہند کہہ دیں تو کوئی بڑی بات نہیں۔ وہ شاعر ہیں، ورنہ شاعرانہ مبالغہ ایک مستند بات ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فارغ کا شعری مرتبہ بہت بلند ہے۔ اور اس کے مقابلے میں انہیں شہرت کا حصہ بہت کم ملا ہے۔

اُردو مرثیہ

مصنف اظہر علی فاروقی صدر شعبۂ اردو ایونگ کرسچین کالج الہ آباد۔ ناشر ادارۂ ادب ۳/۶۲۶ ڈی پروا الہ آباد ۷۔ ضخامت ۴۴۴ صفحات۔ تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶۔ کتابت و طباعت عمدہ، جلد و جلد پوش اوسط۔ قیمت پانچ روپے۔

کتاب مندرجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے۔ مرثیہ، مرثیہ گوئی کے محرکات۔ مرثیہ گوئی کی تکنیک، عناصر مرثیہ، مرثیے کا موضوع، افراد مرثیہ اور ان کے کردار، چند مخصوص افرادِ مرثیہ اور ان کے کردار، نسوانی کردار۔

متعدد تصاویر اور گراف کتاب کی زینت ہیں۔

کتاب طلباء کے لئے لکھی گئی ہے مگر ہر صاحب ذوق کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ ہمارے ادب کے تذکروں میں مرثیے کے باب میں زیادہ نہیں لکھا گیا۔ یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے میں معاون ہوگی۔

دکنی ہندو اور اُردو

از نصیر الدین ہاشمی، ضخامت ۹۰ صفحات تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶۔

قیمت تین روپے پچاس نئے پیسے۔

اردو کے ۲۳۲ دکھنی ہندو شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کے حالات اس کتاب میں درج ہیں۔ اس سے اردو کی ہمہ گیری کا اندازہ ہوتا ہے۔

ملنے کا پتہ۔ سب رس کتاب گھر۔ ادارۂ ادبیات اردو، خیریت آباد حیدرآباد دکن۔

انتخاب اردو

انتخاب ... اردو اکیڈمی سندھ کراچی۔ ضخامت ۲۸۰ صفحے

کتاب ... ہے۔ قیمت دو روپے چار آنے

کتاب اردو ... کراچی ... سے مل سکتی ہے۔

قدیم شعرا کے اس قسم کا انتخاب بڑی مفید چیز ہے۔ بالخصوص اس زمانے میں جبکہ دواوین نایاب ہوتے جاتے ہیں۔

... دوران

قتیل شفائی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ۔ کتاب بڑی حسین و جمیل چھپی ہے اس میں ... اور ... غزلیں ... شامل ہیں۔ قتیل شفائی نوجوان شعراء میں ... تمام رکھتے ہیں ... کے کلام کا نکھرا ہوا رنگ ... چکا ہے زیر نظر کتاب میں ان کی شاعری کے معروف عناصر جدت نگاری، سادگی اور طنز پوری شان سے جلوہ گر ہیں۔

منزل سے پلٹ آئے گی ایک ایک تجلی ہاں شعلۂ رخسار صنم سا کد رہے گا
ویرانیٔ ... سے کبھی ... ہٹ جائے ہم سفر ان کے پھر آئے ہیں ٹھہرے لوگو

قیمت تین روپے ملنے کا پتہ ادارۂ فروغ اردو لاہور

شب ہراد

پنجابی زبان کی مشہور شاعرہ پربھ جوت کور کی منتخب پنجابی نظموں کا مجموعہ ... میں شائع ہوا ہے۔ ناشر ماہنامہ پگڈنڈی امرتسر۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات قیمت دو روپے۔

پربھ جوت کور کے گیتوں میں جذبے کی گہرائی اور بیان کا لوچ دونوں شامل ہیں۔ پہلا گیت ہی خود اعتمادی کا آئینہ دار ہے۔

... کا نوال

... دے گیت

آج میں درد کا نغمہ نہ چھیڑوں۔ آنکھوں کے سامنے یادوں کا میلا لگا ہوا ہے۔

پریت اور رحمت کے متعدد دیوان پڑھے ہیں۔ امیدوں کے کھنڈر ہیبت ناک ہیں۔ اس پر بھی فریاد ... تک نہیں آتی۔ خود اعتمادی کی جوت جگ رہی ہے پنجابی شاعری کے دلدادوں کے لئے یہ کتاب ایک خوش آیند تحفہ ہے

دسکی کی بوتل

موہن یاور کے ... افسانوں کا مجموعہ۔ ناشر مکتبہ نیا سماج جموں۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات۔ قیمت دو روپے

موہن یاور نوجوان افسانہ نگار ہیں۔ وہ افسانہ نگاری کے فن سے اچھی طرح واقف ہیں۔ بقول کوثر چاندپوری "وہ اپنے آس پاس سے کہانیوں کا مواد سمیٹ کر ادر واقعات کی دنیا سے زندہ کردار منتخب کرکے انھیں فن اور تکنیک کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ وہ انسانی نفسیات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔"

عکسِ خیال

مصنف ارشد صدیقی ساگری۔ ناشر مکتبۂ دانش بھوپال۔ اب تک ارشد صاحب غزل کے شاعر تھے۔ انگریزی کی مشہور نظموں کے ترجمے دیکھیے تو معلوم ہوا کہ وہ اس میدان کے بھی مرد ہیں۔ اس مجموعے میں انگریزی نظموں کے دلکش تراجم شامل ہیں۔ کتاب طباعت کے اعتبار سے بھی دیدہ زیب ہے۔ قیمت دو روپے۔

نیم شب

نندلال پروانہ کے کلام کا دوسرا مجموعہ۔ ناشر نندلال بک ڈپو گوبند پورہ گاندھی نگر دہلی۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

پروانہ جناب سحر عشق آبادی کے شاگرد ہیں اس لئے یہ بات تو مسلم ہے کہ ان کے کلام میں فنی اغلاط نہیں ہوں گی۔ یوں بھی پروانہ حسن کلام کی منزلیں تیزی سے طے کر رہے ہیں۔ زیر نظر مجموعے میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ حرف گیری کی گنجائش نہیں۔ داد طلب بہت سے اشعار ہیں۔

رقصِ جام

محمد حنیف سیمابی سہارن پوری کے قطعات و رباعیات کا مختصر مجموعہ قیمت ۱۲ر

کتاب مصنف سے محلہ چوب فروشان سہارن پور کے پتے سے مل سکتی ہے۔

لالہ زار

پیام فتح پوری کے کلام کا مجموعہ ضخامت ۱۱۲ صفحات۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت دو روپے پچیس نئے پیسے۔ اسپیشل تین روپے۔ کتابت، طباعت عمدہ مجلد جلد پوش اوسط۔ مصنف سے ۵۴/۳ ہمایوں باغ کان پور کے پتے سے طلب فرمایئے۔

تعارف پروفیسر سید احتشام حسین صاحب نے لکھا ہے۔ ہرچند پیام کا تغزل مانوس تغزل ہے لیکن اس نے اس روایتی انداز بیان کو بھی نئے تقاضوں کا ترجمان بنایا ہے۔ یہ صرف پیام ہی کا کارنامہ نہیں۔ آج کل بیشتر نوجوان غزل کو زندگی کی نئی راہوں سے روشناس کر چکے ہیں۔ اس مجموعے میں غزلیں بھی ہیں اور

نظمیں بھی۔ تفصیلی تبصرے کی گنجائش نہیں۔ پیام کا کلام سراسر معیاری ہے اور زندگی کے مسائل کا ترجمان۔ لالہ زار مطالعے کی چیز زیادہ ہے اور محاکے کی کم اس لئے غزل کو گردن زدنی قرار دینے والوں کو صرف ایک شعر سنا دینا ہی کافی ہے اور وہ بھی پیام کا ؂

طنز سے مجھ کو اسیرِ خمِ گیسو نہ کہو　　ناصحو! پہلے تم اس زلف کے خم تو دیکھو

مہر و ماہ

شاہد بھوپالی کے کلام کا مجموعہ۔ ناشر قصرِ ادب پبلیکیشنز پیری گھاٹ بھوپال ضخامت ۱۱۲ صفحات۔ پاکیزہ غزلوں کا یہ مجموعہ ہر قسم کی حوصلہ افزائی کا مستحق ہے۔

صدائے مشرق

شمس غازی آبادی کی ایک نظم اور چند قطعات۔ کتابچے کے صفحات ۳۲ قیمت ۶ آنے

چار مقالے

بہار کے ایک نامور فرزند فضل الرحمٰن صاحب کے چار مقالے اس کتاب میں شامل ہیں۔ زبان کی تاریخ، فلسفۂ برگسوں، عرض حال، روایات کلیم الدین احمد صاحب نے پیش لفظ میں ان مقالوں کی تعریف کی ہے۔ کتاب پر نہ قیمت درج ہے نہ ملنے کا پتہ۔

آب و تاب

عثمانیہ یونی ورسٹی نے بہت سے ادیب اور شاعر پیدا کئے۔ سعادت نظیر بھی انھیں میں سے ہیں۔ نوجوان شعراء میں آپ خاصی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ آب و تاب ان کا مجموعۂ کلام ہے جو ۸۰ صفوں پر مشتمل ہے۔ قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے ملنے کا پتہ۔ سعادت نظیر معرفت سلطان شاہی حیدر آباد دکن آندھرا پردیش۔

محبوبِ کبریا کی آمد

مصنف سید اشفاق حسین رضوی۔ قیمت ۲؍ مصنف سے کوچہ میر انیس لکھنؤ کے پتے سے طلب فرمائیے۔

گیتیندر موکھش یا دُکھی کی نجات۔ اَودھوت کا ترانہ یعنی نغمۂ قلندری

یہ دو منظوم ترجمے جناب منوّر لکھنوی کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہیں۔ یہ ترجمے بھی موصوف کے دوسرے تراجم کی طرح معیاری ہیں۔ اوّل الذکر کی قیمت ۷۳ نئے پیسے اور دوسرے کی ۳۵ نئے پیسے ہے۔ ملنے کا پتہ۔ آورش کتاب گھر ۲۹-۱۵۲۸ فیض گنج دریا گنج دہلی۔

قتلِ ولیم فریزر

وہارو خاندان کے ممتاز رکن نواب خسرو مرزا، گلی قاسم جان دہلی کا یہ کتابچہ ولیم فریزر کے قتل کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ حقیقت میں یہ مشہور انگریزی کتاب Twilight of the Mughals کا باب نہم ہے۔ اس کا اردو ترجمہ اس کتابچے کا متن ہے۔ موصوف کو شکایت ہے کہ نواب شمس الدین احمد خاں صاحب کے باب میں ایک فاضل مضمون نگار نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ اب اس کا جواب خود مالک رام صاحب ہی دیں تو بہتر ہے۔

بلندی کی طرف

ہربنس سنگھ دوست کا ایک ناولٹ۔ ۴۴ صفحات، قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ آزاد کتاب گھر جمشید پور

مصنف اُردو کے مقبول و ممتاز افسانہ نگار اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔

یاترا

ایک آزاد نظم، از پریم پال اشک، ناشر مکتبہ مہک ۴۳۶۳ سبزی منڈی دہلی ۶۔ جیبی سائز کے ۹۶ صفحے۔

معرکۂ رباعیات حصہ اول

مس نفیس نوری (حیدر آباد) کی یہ رباعیاں مصنفہ کے پاکیزہ ذوقِ سخن کی آئینہ دار ہیں۔ بہ حیثیت شاعرہ ان کا مستقبل تابناک نظر آتا ہے۔ یہ رباعیاں سودا، انیس، دبیر، غالب، اقبال، ابوسعید ابوالخیر، خیام اور امجد کی رباعیوں کے بالمقابل درج ہیں۔ قیمت ۸؍ ملنے کا پتہ محمد احمد کتاب محل چار کمان حیدر آباد دکن۔

یادِ ایام

مصنف پروفیسر اظہر علی فاروقی ۱۸۶۹ء کے مشاعرے کی ایک تمثیل جس کا ذکر پروفیسر حامد حسن قادری نے نقد و نظر میں گارساں دتاسی کے حوالے سے کیا ہے۔ ضخامت ۶۸ صفحات۔ قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے۔ ناشر اردو اکیڈمی الہ آباد ۷

راکھ اور کلیاں

کوثر چاند پوری کا ایک ناول۔ ضخامت ۲۹۶ صفحات۔ قیمت ۴ روپے۔ ملنے کا پتہ۔ ادارۂ ادبیاتِ جدید۔ ۲۴ کمرشل بلڈنگ دی مال لاہور۔

میٹرک اوزان : تبادلہ چارٹ

(اسے اپنے استعمال کے لیے کاٹ لیجئے)

چھٹانک (ایک چھٹانک = ۵ تولے)	گرام (قریب ترین گرام میں)
۱	۵۸
۲	۱۱۷
۳	۱۷۵
۴	۲۳۳
۵	۲۹۲
۶	۳۵۰
۷	۴۰۸
۸	۴۶۷
۹	۵۲۵
۱۰	۵۸۳
۱۱	۶۴۲
۱۲	۷۰۰
۱۳	۷۵۸
۱۴	۸۱۶
۱۵	۸۷۵

من (ایک من = ۴۰ سیر)	کیلوگرام (قریب ترین کیلوگرام میں)
۱	۳۷
۲	۷۵
۳	۱۱۲
۴	۱۴۹
۵	۱۸۷
۶	۲۲۴
۷	۲۶۱
۸	۲۹۹
۹	۳۳۶
۱۰	۳۷۳
۱۱	۴۱۱
۱۲	۴۴۸
۱۳	۴۸۵
۱۴	۵۲۳
۱۵	۵۶۰
۱۶	۵۹۷
۱۷	۶۳۵
۱۸	۶۷۲
۱۹	۷۰۹
۲۰	۷۴۶

سیر (ایک سیر = ۸۰ تولے)	کیلوگرام		گرام (قریب ترین ۱۰ گرام میں)
۱	—	—	۹۳۰
۲	۱	—	۸۷۰
۳	۲	—	۸۰۰
۴	۳	—	۷۳۰
۵	۴	—	۶۷۰
۶	۵	—	۶۰۰
۷	۶	—	۵۳۰
۸	۷	—	۴۶۰
۹	۸	—	۴۰۰
۱۰	۹	—	۳۳۰
۱۱	۱۰	—	۲۶۰
۱۲	۱۱	—	۲۰۰
۱۳	۱۲	—	۱۳۰
۱۴	۱۳	—	۶۰
۱۵	۱۴	—	—
۱۶	۱۴	—	۹۳۰
۱۷	۱۵	—	۸۶۰
۱۸	۱۶	—	۸۰۰
۱۹	۱۷	—	۷۳۰
۲۰	۱۸	—	۶۶۰
۲۱	۱۹	—	۶۰۰
۲۲	۲۰	—	۵۳۰
۲۳	۲۱	—	۴۶۰
۲۴	۲۲	—	۳۹۰
۲۵	۲۳	—	۳۲۰
۲۶	۲۴	—	۲۶۰
۲۷	۲۵	—	۱۹۰
۲۸	۲۶	—	۱۳۰
۲۹	۲۷	—	۶۰
۳۰	۲۷	—	۹۹۰
۳۱	۲۸	—	۹۲۰
۳۲	۲۹	—	۸۶۰
۳۳	۳	—	۷۹۰
۳۴	۳۱	—	۷۳۰
۳۵	۳۲	—	۶۶۰
۳۶	۳۳	—	۵۹۰
۳۷	۳۴	—	۵۲۰
۳۸	۳۵	—	۴۶۰
۳۹	۳۶	—	۳۹۰

۱ کیلوگرام = ۱,۰۰۰ گرام

DA 58/247



وٹامنوں کی
قوّت کی
رنگین جھلک!

جی ہاں، وٹامن رنگ پیدا کرتے ہیں! اور فوٹو الیکٹرک آلات کے ذریعے، رنگوں کے زیرِ اثر، یہ ماہر جانکار اِنکی قوت کا ٹھیک ٹھیک ناپ تول کر سکتے ہیں۔

لیکن آخر ایسی دقیق چھان بین کیوں؟ اس لئے کہ ہندوستان لیور کی مصنوعات خریدتے وقت آپ انکے مُستقل اعلےٰ اوصاف کی توقع رکھتے ہیں۔

یہ بلند معیار برقرار رکھنے کے لئے ہم بار بار کڑی جانچ پرکھ کرتے ہیں۔ کچے مال کی خرید سے مصنوعات کی تیاری اور اس کے بعد ان کی کارگذاری تک سائنسدان اور ماہر جانکار ان کی نگرانی اور جانچ پڑتال میں مصروف رہتے ہیں۔ اِس نگرانی کی بدولت بیش بہا قومی دولت بھی بچتی ہے اور مصنوعات کے بنانے کا قیمتی وقت بھی!

اس طرح ہم آپ کی قابلِ اعتبار معیاری مصنوعات سستے داموں پر آپکی خدمت میں پیش کرتے رہتے ہیں۔

ہندوستان لیور کا آدرش — گھر گھر کی خدمت

HLL. 17-X56 UD

آج کل

اہلِ نظر کی نظر میں

'آج کل' آج کل خوب نکل رہا ہے۔ خصوصاً موسیقی نمبر تو ایسا نکلا کہ پاک و ہند کا کوئی ادبی رسالہ اب تک ایسا نمبر پیش نہیں کر سکا، کیا باعتبارِ فن اور کیا بلحاظ تاریخ فن۔ یہ ترتیب کا کمال ہے۔ خدا آپ لوگوں کا حامی ہو۔ آپ حقیقت میں زبانِ اردو کے محسن ہیں۔
(عبد المجید سالک)

'آج کل' ان رسالوں میں ہے جو ہر طبقے کے پڑھنے والوں کے لئے کچھ نہ کچھ دل چسپی کا سامان ضرور مہیا کرتے ہیں۔ رسالے کی ادبی حیثیت بہت اچھی ہے۔ اس کے مقالے اور نظمیں بیشتر معیاری ہوتی ہیں۔ ظاہری حسن یعنی کاغذ چھپائی اور تصویروں کے اعتبار سے کوئی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ (مسعود حسن رضوی)

'آج کل' کا موسیقی نمبر دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ اس فن پر خصوصی نمبر نکالنا آسان بات نہ تھی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو جمع و ترتیبِ مضامین میں کن کن صبر آزما منزلوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ آپ کے ذوق و انتخاب دونوں کی داد دیتا ہوں۔
(نیاز فتحپوری)

میں 'آج کل' کو ہمیشہ بہت دل چسپی سے پڑھتا ہوں۔ اس میں اکثر قابلِ قدر مضامین اور نظمیں شائع ہوتی ہیں۔ علاوہ معنوی خوبیوں کے یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بحیثیت مجموعی اس کی لکھائی اور چھپائی وغیرہ بھی خوش مذاقی کا ثبوت دیتی ہیں۔ ہمارے بہت سے رسالے تو اس ظاہری حسن سے بھی عاری ہیں۔ (غلام السیدین)

رسالہ آج کل علمی، لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔
(فراق گورکھپوری)

'آج کل' کا بجا طور پر اردو کے بہترین رسالوں میں شمار ہے۔ اس کے بیشتر مضامین نثر پُر مغز اور دل چسپ معلومات سے لبریز ہوتے ہیں۔ گھناؤنے بیہودہ افسانوں سے اس کا دامن پاک رہتا ہے۔ نظم کے حصے میں بھی ایک امتیازی شان ہوتی ہے۔
(اثر لکھنوی)

'آج کل' اردو کے اُن چند مقبول رسالوں میں سے ہے جو ہر ادبی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے عام نمبروں میں علاوہ معلوماتِ عامہ پر مفید مضامین کے ادبی تنقیدیں اور تذکرے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں اور اس میں بلند پایہ نظموں اور پُر کیف غزلوں کا بھی ایک گلدستہ ہوتا ہے۔
(آلِ احمد سرور)

'آج کل' نکتے ہیں نے لوگوں کو بے تاب اور منتظر بنایا ہے۔ اچھے ادبی اور تنقیدی مضامین تو اس میں شائع ہوتے ہی رہتے ہیں، اکثر ایسے علمی، تہذیبی، فنی اور معلوماتی مضامین بھی نکلتے ہیں جو دوسرے رسائل میں نظر نہیں آتے۔ اس کا یہ تنوع ہی اسے ہر دل عزیز بناتا ہے۔
(احتشام حسین)

ہندوستان کے کلچر اور تعمیر و ترقی

کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے یہ رسالے پڑھئے

انگریزی رسالے

انڈین انفارمیشن
(پندرہ روزہ رسالہ)

اس میں اہم سرکاری اعلانات اور ملک بھر میں پلان کے تحت ہونے والے ترقیاتی کاموں کی خبریں پیش کی جاتی ہیں۔

قیمت فی کاپی ۳۰ نئے پیسے - سالانہ چندہ چھ روپے

مارچ آف انڈیا

"ہندوستان اور اس کی ترقی کا دلچسپ مرقع"
(سنڈے نیوز آف انڈیا)

فی کاپی ایک روپیہ - سالانہ چندہ دس روپے

کشمیر

کشمیر کی زندگی اور اس کے مسائل سے متعلق انگریزی ماہنامہ جو دلکش مضامین اور خوبصورت تصاویر سے مزین ہوتا ہے۔

فی کاپی ۵۰ نئے پیسے - سالانہ چندہ پانچ روپے

بھاگیرتھ

سینٹرل واٹر اینڈ پاور کمیشن کا سرکاری ترجمان — اس میں ہندوستان کے آبپاشی اور بجلی کے منصوبوں سے متعلق معلومات شائع کی جاتی ہیں۔

فی کاپی ۲۵ نئے پیسے - سالانہ چندہ تین روپے

سوشل ویلفیر

سینٹرل سوشل ویلفیر بورڈ کا انگریزی ماہنامہ جس میں ملک کی سماجی بہبود سے متعلق مختلف مسائل پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

فی کاپی ۳۵ نئے پیسے - سالانہ چندہ چار روپے

انگریزی اور ہندی میں ایک ساتھ شائع ہونے والے رسالے

کُروکشیتر

اس مصور ماہنامہ کا مقصد کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کی اشاعت ہے۔

فی کاپی ۳۵ نئے پیسے - سالانہ چندہ چار روپے

گرام سیوک

یہ رسالہ کمیونٹی پراجیکٹ ایڈمنسٹریشن کے تحت کام کرنے والے گرام سیوکوں کی رہنمائی کے لئے شائع ہوتا ہے۔

فی کاپی ۱۵ نئے پیسے۔

— سالانہ چندہ ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے

یوجنا (پندرہ روزہ)

چیف ایڈیٹر - خوشونت سنگھ

اس میں پنج سالہ پلان کے بارے میں ضروری معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں اور ملک بھر میں جو مختلف قسم کے ترقیاتی کام ہو رہے ہیں ان کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ فی کاپی ۱۰ نئے پیسے

سالانہ چندہ دو روپے پچاس نئے پیسے

ہندی رسالے

بھارتیہ سماچار
(پندرہ روزہ رسالہ)

اس میں اہم سرکاری اعلانات اور ملک میں پلان کے تحت ہونے والے ترقیاتی کاموں کی خبریں پیش کی جاتی ہیں۔

فی کاپی ۲۵ نئے پیسے - سالانہ چندہ ۵ روپے

آج کل (ہندی)

یہ ایک ثقافتی رسالہ ہے جس میں ملک کے سماجی ثقافتی مسائل اور غیر ملکی معاملات سے متعلق مضامین کہانیاں اور نظمیں شائع ہوتی ہیں۔

قیمت فی کاپی ۵۰ نئے پیسے۔

سالانہ چندہ چھ روپے۔

بال بھارتی

ہندی میں بچوں کا باتصویر رسالہ - دلچسپ کہانیاں، بچوں سے متعلق مضامین اور چٹکلے اس میں شامل ہوتے ہیں۔

فی کاپی ۳۵ نئے پیسے۔

سالانہ چندہ چار روپے

سماج کلیان

ہندی میں سنٹرل سوشل ویلفیر بورڈ کا ترجمان

فی کاپی ۳۵ نئے پیسے

سالانہ چندہ چار روپے

ان رسالوں میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیجئے

یہ رسالے مشہور کتب فروشوں اور اخباری ایجنسیوں سے مل سکتے ہیں

یا براہ راست اس پتہ پر لکھئے

پبلیکیشنز ڈویژن، اولڈ سیکرٹریٹ، پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی۔

Edited and Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi

'd. No. D—509



ترتیب

سرِورق۔ شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن (غالب)

فروری ۱۹۵۹ء

ماگھ پھاگن شک سمت ۱۸۸۰

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل' اردو اولڈ سیکریٹریٹ دہلی ۸

اردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

جلد ۱۷ — نمبر ۷

سالانہ چندہ:۔ ہندوستان میں۔ چھ روپے
پاکستان میں۔ چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے:۔ ۹ شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:۔ ہندوستان میں۔ ۵۰ نئے پیسے
پاکستان میں۔ آٹھ آنے (پاک)

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ملاحظات

پچھلے دنوں گھانا کے وزیراعظم ڈاکٹر کوامے انکرومہ ۱۵ روز کے دورے پر ہندوستان تشریف لائے۔ یہاں ان کا جس خلوص اور تپاک کے ساتھ خیر مقدم ہوا وہ اس بات کا نشان ہے کہ ہندوستان کو افریقی ملکوں کی آزادی، ان کے اتحاد و اتفاق اور ان کی ترقی سے خاص دلچسپی ہے۔ گھانا افریقہ میں نسلی تفریق کے خلاف جو آواز اٹھا رہا ہے ہندوستان پوری طرح اس کی تائید میں ہے۔ گھانا افریقہ میں آزادی کا ایک جگمگاتا ستارہ ہے جس کی پیش قدمی پورے برّاعظم کے لئے حوصلہ افزا ثابت ہو رہی ہے۔ افریقہ میں جسے تاریک برّاعظم کہا جاتا تھا، بیداری کی تیز لہر دوڑ گئی ہے۔ اب وہاں ایک نئی زندگی کروٹ لے رہی ہے۔ ہر ملک بیرونی اقتدار سے نجات حاصل کرنے کے لئے بے چین نظر آتا ہے۔ نسلی برتری اور انسانی تفریق کا فریب ٹوٹ چکا ہے اور آج سیاہ فام نسلیں مساوی انسانی حقوق کی بجا دعویدار ہیں۔ خود سفید فام نسلوں کے دیانت دار لوگ بھی نسلی امتیاز کی پالیسی کے مخالف ہیں۔ چنانچہ ریورنڈ مائیکل اسکاٹ جنوبی افریقہ میں نسلی تفریق کے خلاف آواز اٹھانے میں پیش پیش ہیں۔ حال ہی میں انھیں ایٹمی جنگ کے خلاف پُرامن مظاہرہ کرتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا۔

اس وقت دنیا بھر میں سرد جنگ کا جو ماحول پایا جاتا ہے، اس کی وجہ سے خوف و نفرت کی فضا پھیلتی جا رہی ہے جس کا نتیجہ زبردست تباہی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ بقول پنڈت نہرو امن و شانتی کی باتیں تو بہت کی جا رہی ہیں مگر امن پسندانہ رویّے کی سخت کمی ہے۔ بڑے زوروں پر جنگ کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ ہر طرف کشیدگی پائی جاتی ہے حالانکہ جنگ کا کوئی بھی خواہش مند نہیں۔ ہر فرد اور قوم اس بات کو مانتی ہے کہ جنگ محض حماقت ہے کیونکہ اگر خوفناک ہتھیاروں کے ساتھ جنگ ہوئی تو زبردست تباہی مچے گی اور اس کے نتیجے میں پوری زندگی برباد ہو جائے گی۔ انسانیت کی بقاء اور بہبود کا راستہ یہی ہے کہ اسلحہ سازی کی دوڑ ختم ہو اور تمام قومیں بقائے باہمی کے اصول پر کاربند ہو کر امن و سلامتی کے ساتھ رہیں۔ ہندوستان نے سمجھ بوجھ کر یہ راستہ اپنایا ہے اور وہ سختی کے ساتھ غیر جانبدارانہ پالیسی کا پابند ہے۔

۲۴ دسمبر کو ممتاز قومی رہنما شری سی راجگوپال آچاریہ کی ۸۰ ویں سالگرہ منائی گئی۔ موصوف نے جنگِ آزادی میں جو نمایاں حصّہ لیا اور ملک و قوم کی جو گراں بہا خدمات انجام دیں اس کے لئے ہر گوشہ سے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔

ادبی دنیا میں پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس کے اچانک انتقال کی خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی گئی۔ مرحوم کی شخصیت گوناگوں خصوصیات کی حامل تھی، اردو اور انگریزی ادب پر انھیں یکساں عبور حاصل تھا۔ بطور صاحبِ طرز ادیب اور مزاح نگار ان کی حیثیت منفرد ہے۔ اگرچہ انھوں نے بہت کم لکھا، لیکن جو کچھ لکھا وہ امتیازی شان رکھتا ہے۔ ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "پطرس کے مضامین" ایک چھوٹی سی کتاب ہے۔ جس کے ذریعہ انھوں نے اردو ادب میں ایسا نام پیدا کیا جو اردو کی تاریخ میں زندۂ جاوید رہے گا۔ درحقیقت بخاری مرحوم نے اپنے مضامین میں لطیف مزاح نگاری کے جو نمونے پیش کئے، اس کی روایات انھیں پر ختم ہو گئیں۔

اثر لکھنوی

غزل

درپردہ کہیں اُن پہ یہ الزام نہ آئے
لب پر گلۂ تلخیٔ ایّام نہ آئے

رقصاں ہوئے میخوار کبھی جام نہ آئے
گردش میں جو وہ نرگسِ خودکام نہ آئے

ساقی مزہ دیتی ہی نہیں بادہ پرستی
جب تک لبِ میکش پہ ترا نام نہ آئے

اس تشنہ لبی پر بھی یہی عشق کو دھن ہے
آسودگیٔ شوق کا ہنگام نہ آئے

عیّار ہے طرّار ہے کہتے نہ تھے اے دل
الزام سے خود تجھ ہی پہ الزام نہ آئے

رندانِ بلانوش کی یہ وسعتِ مشرب
بے بادہ ہوں بدمست اگر جام نہ آئے

یہ جان لے ناپختہ ہے سودائے محبت
بے منّتِ پیغام جو پیغام نہ آئے

پرواز کا ہوتا ہے گماں جوشِ تپش پر
ایسا بھی کوئی صید تہِ دام نہ آئے

آلودہ تبسم سے ہوں جب وہ لبِ میگوں
ممکن نہیں دل میں طمعِ خام نہ آئے

یہ جبر محبت میں ہو کس طرح گوارا
چاہو تو اُنھیں اُن کا مگر نام نہ آئے

کس آس پہ ڈھونڈے کوئی عزیزوں کا سہارا
اپنے جو اثرؔ تھے وہی جب کام نہ آئے

مالک رام

نواب افضل الدولہ بہادر آصف جاہ پنجم

(۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۹ء)

ریاست حیدرآباد دکن کی بنیاد میر قمر الدین خاں نظام الملک آصف جاہ اوّل کے ہاتھوں پڑی۔ اگرچہ بعض ہندستانی مؤرخوں نے انھیں شیخ صدّیقی لکھا ہے اور ان کا سلسلۂ نسب شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے واسطے سے خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدّیقؓ تک پہنچایا ہے، لیکن اس کا یقین نہیں۔ زیادہ صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نسلاً تاتاری تھے۔

سب سے پہلے اس خاندان کے جو بزرگ عہد شاہجہانی میں ہندستان آئے ان کا نام عابد خاں تھا۔ وہ صاحب سیف و قلم تھے۔ یہاں ان کی مناسبت اورنگ زیب سے ہوئی اور وہ اورنگ زیب کے مصاحبوں میں شامل ہو گئے۔ اورنگ زیب بایّام شاہزادگی دکن میں مقیم تھے۔ عابد خاں یہیں ان کے ساتھ رہے۔ انھوں نے اپنی قابلیت اور معاملہ فہمی اور شجاعت کے باعث بہت عروج حاصل کیا اور جلد ہی اورنگ زیب کے خاص معتمد علیہ ملازموں میں شمار ہونے لگے۔ ۱۶۵۸ء میں تخت نشینی کے بعد اورنگ زیب نے ان کی خدمات جلیلہ کے صلہ میں انھیں ممالک محروسہ کی صدارت کا عہدہ تفویض کیا۔ ان کی وفات کا واقعہ بھی ان کے غیر معمولی تہوّر اور قوتِ برداشت پر دال ہے۔

۱۶۸۶ء میں اورنگ زیب نے دکن پر چڑھائی کی۔ جب گولکنڈے کے قریب پہنچے، تو حکم دیا کہ فصیل کے باہر غنیم کے جو لوگ جمع ہو رہے ہیں انھیں منتشر کر دیا جائے۔ عابد خاں نے تعمیلِ حکم میں حسب عادت بڑی سرگرمی دکھائی۔ لیکن جونہی وہ قلعے کے صدر دروازے کے برابر آئے، اندر سے ان سے ایک توپ کا گولہ آیا اور ان کے سیدھے شانے پر آ لگا۔ اگرچہ ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور درد شدید تھا، انھوں نے اس کا اظہار نہیں کیا، تاکہ حادثے کے علم سے فوج بددل نہ ہو جائے۔ اسی طرح اطمینان سے باتیں کرتے، حکم احکام دیتے، گھوڑے پر سوار اپنے خیمے کی طرف چلے آئے۔ تھوڑی دیر بعد جملۃ الملک اسد خاں کو اس کی خبر ملی تو وہ عیادت کے لئے ان کی قیام گاہ پر آئے۔ یہاں آ کے دیکھا کہ دایاں شانہ چُور ہو چکا ہے۔ جرّاح اس میں سے شکستہ ہڈی کی کرچیں ایک ایک کر کے نکال رہا ہے اور یہ خود اطمینان سے فرش پر چار زانو بیٹھے، دوست احباب سے گپیں ہانکنے اور دوسرے ہاتھ میں پیالی لئے قہوہ پینے میں مشغول ہیں اور کہتے جا رہے ہیں کہ جرّاح اپنے فن میں ماہر معلوم ہوتا ہے۔ افسوس کہ یہ شیر دل جواں مرد ان زخموں سے جانبر نہ ہو سکا۔ وہیں ۲۸۔ جنوری ۱۶۸۷ء کو انتقال ہو گیا۔ حیدرآباد سے تین چار میل باہر مدفون ہیں۔

عابد خاں کے بڑے بیٹے میر شہاب الدین خاں تھے۔ غازی الدین خاں فیروز جنگ ان کا خطاب تھا۔ یہ وہی غازی الدین خاں ہیں جنھوں نے دلّی میں اجمیری دروازے کے باہر مدرسہ قایم کیا اور جو اسی لئے مدتوں "غازی الدین خاں کا مدرسہ" کہلایا۔ اس تاریخی عمارت کا ایک زمانے سے اردو ادب کی تاریخ سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں یہاں بعض بڑے معرکے کے مشاعرے ہوئے جن میں اساتذۂ عہد شریک ہوتے تھے۔ مرحوم دلّی کالج بھی ایک عرصے تک اسی عمارت میں رہا اور آج کل بھی دلّی کالج اسی جگہ ہے۔

غازی الدین خاں فیروز جنگ کا ۲۷۔ دسمبر ۱۷۱۰ء کو احمدآباد گجرات میں انتقال ہوا۔ لاش دلّی لائی گئی۔ اپنے قایم کردہ مدرسے میں آسودۂ خواب ہیں۔

سلطنتِ آصفیہ حیدرآباد کے بانی نظام الملک میر قمرالدین خاں آصف جاہ اوّل، انھیں نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ کے فرزندِ اکبر تھے۔ نادر شاہی حملے (۱۷۳۹ء) میں جب نادر شاہ غضبناک، برہنہ تلوار لیے سنہری مسجد روشن الدولہ کی (چاندنی چوک، دلی) کی سیڑھیوں پر بیٹھا تھا اور شہر میں قتلِ عام ہو رہا تھا، تو یہ میر قمرالدین ہی تھے، جو ننگے سر گلے میں تلوار ڈالے، اس کے پاس گئے اور رونے لگے۔ نادر شاہ نے انھیں اس ہیئت کذائی میں دیکھا، تو پوچھا، "چہ می خواہی" انھوں نے جواب میں شعر پڑھا ؎

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغِ ناز کُشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کُشی

نادر شاہ کو رحم آگیا۔ کہا، "بریشِ سفیدت بخشیدم"، اور تلوار نیام میں کر لی۔ یہ گویا قتل بند کر دینے کا اشارہ تھا۔ فوراً چاؤش اعلان کرنے کو چاروں طرف دوڑ گئے۔ ایرانی سپاہ نے خلقِ خدا کی خونریزی سے ہاتھ روک لیا اور امن و امان ہو گیا۔

نظام الملک بڑی خوبیوں اور بلند ارادوں کے انسان تھے۔ جب یہاں شاہی دربار میں ان کی دال نہ گلی، تو انھوں نے دکن کی راہ لی اور لڑ بھڑ کر وہاں حیدرآباد کی خود مختار ریاست قائم کر لی۔ جہانبانی کے علاوہ شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا۔ فارسی میں لکھتے تھے۔ شروع میں تخلص شاکر تھا۔ پھر اسے تبدیل کر کے آصف کر لیا۔ ضخیم دیوان موجود ہے۔ خاصی لمبی عمر پائی۔ شمس العلماء مولوی ذکاءاللہ نے تو ۱۰۰ برس لکھی ہے، لیکن یہ درست معلوم نہیں ہوتی۔ غالباً ۷۹ - ۸۰ زیادہ ٹھیک ہوگی۔ ۲۱۔ مئی ۱۷۴۸ء کو انتقال ہوا۔ "متوجہ بہشت" (۱۱۶۱ھ) مادۂ تاریخِ وفات ہے۔ دولت آباد کے شمال میں پانچ میل کے فاصلے پر قصبہ خلد آباد ہے۔ یہاں حضرت شاہ برہان الدین غریبؒ کے روضے کے باہر پایانِ مرقدِ شیخ زین الدینؒ ایک خاص حظیرے میں دفن ہوئے۔ اورنگ زیب کا مقبرہ اس کے بالکل قریب ہے۔

نظام الملک آصف جاہ اوّل کی وفات کے بعد پہلے ان کے دوسرے بیٹے نظام الدولہ ناصر جنگ میر احمد خاں (۱۷۴۸ء - ۱۷۵۰ء)، پھر نواسے ہدایت محی الدین خاں مظفر جنگ (۱۷۵۱ء) اور آخر میں تیسرے صاحبزادے میر محمد خاں صلابت جنگ (۱۷۵۱ء - ۱۷۶۲ء) یکے بعد دیگرے مسند نشین ہوئے۔ یہ انھی لوگوں کی باہمی چپقلش اور عناد و مخالفت کا نتیجہ تھا کہ دکن میں فرانسیسیوں اور انگریزوں کو مقامی سیاست میں دخل دینے کا موقع مل گیا، جس کے باعث آگے قدم یہاں جم گئے۔

صلابت جنگ کے بعد آصف جاہ اوّل کے چوتھے بیٹے نظام علی خاں آصف جاہ ثانی تخت نشین ہوئے۔ ان کے عہد کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ انگریزوں نے ان کی مدد سے ٹیپو سلطان کا قلع قمع کر دیا۔ سلطان خود میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دیتے شہید ہوئے اور فاتحین نے ان کی ریاست کے حصے بخرے کر لیے۔ غالب کے والد میرزا عبداللہ بیگ خاں انھیں نظام علی خاں کے زمانے میں حیدرآبادی فوج میں ملازم ہوئے تھے۔

نظام علی خاں کا انتقال ۶۔ اگست ۱۸۰۳ء کو ہوا اور ان کی جگہ ان کے بڑے بیٹے نواب سکندر جاہ میر اکبر علی خاں نظام الملک آصف جاہ سوم وسادہ آرائے سلطنت ہوئے۔ مہاراجہ چندو لال کا عروج ان ہی کے عہد میں ہوا۔ حیدرآباد کے باہر سکندرآباد چھاؤنی بھی انھی کے نام پر بسائی گئی تھی۔ ریاست کے اندرونی معاملات میں انگریزی مداخلت بھی اسی زمانے سے زیادہ ہوئی۔ غالب کے چھوٹے بھائی میرزا یوسف انھیں کے عہد میں حیدرآبادی فوج میں ملازم ہوئے تھے۔ ان کا انتقال ۲۱۔ مئی ۱۸۲۹ء کو ہوا اور ان کے فرزندِ اکبر ناصر الدولہ میر فرخندہ علی خاں آصف جاہ چہارم ان کے جانشین ہوئے۔

ریاست کے معاملات جو سابق سے خراب چلے آ رہے تھے، وہ اس عہد میں بد سے بدتر ہو گئے۔ خزانہ خالی اور ریاست پر کروڑوں کا قرض تھا، اور کوئی سبیل نہیں سوجھتی تھی کہ کس طرح اس سے چھٹکارا حاصل ہو۔ امن و امان کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی۔ لوگوں کا جان و مال بالکل غیر محفوظ تھا۔ خاص بلدے اور مضافات میں ہر روز فسادات ہوتے تھے۔ انگریز ریزیڈنٹ سے مشورہ کرنے کے بعد نظام نے ۱۸۴۳ء میں مہاراجہ چندو لال کو الگ کر دیا، جو گذشتہ ۳۵ برس سے گویا ریاست کے سپید و سیاہ کے مالک تھے۔ اس کے تین چار برس بعد مہاراجہ کا انتقال ہو گیا۔

۱۸۴۳ء سے ۱۸۵۳ء تک دس گیارہ برس کے زمانے میں نظام نے مہاراجہ بہادر کے بعد یکے بعد دیگرے سات وزیرِ اعظم (مدارالمہام) تبدیل کیے لیکن کسی کے کیے کچھ نہ بنی۔ آخر مئی ۱۸۵۳ء میں قرعۂ فال مختار الملک میر تراب علی خاں سالار جنگ اوّل کے نام پڑا، جو اس وقت چوبیس سالہ جوان تھے۔ اپنی جواں سالی اور ناتجربہ کاری کے باوجود وہ "مردے از غیب" ثابت ہوئے۔ انھوں نے بہت قلیل عرصے میں حالات پر قابو پا لیا اور معاملاتِ ریاست بتدریج سدھرنے

تھے۔ پھر تو سب ان کا لوہا مان گئے۔ ان کے تدبر اور خوش انتظامی کا شہرہ دور دور تک پہنچا اور انھوں نے ریاست کو پھر سے اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا۔

نواب ناصر الدولہ آصف جاہ چہارم نے ۱۷ مئی ۱۸۵۷ء کو انتقال کیا اور ان کی جگہ ان کے بڑے بیٹے نواب میر تہنیت علی خاں آصف جاہ پنجم مسند نشینِ ریاست حیدرآباد ہوئے۔ یہ تخت نشینی کے وقت ۳۰ برس کے تھے۔ میر تہنیت علی خاں ۱۱ اکتوبر ۱۸۲۷ء دوشنبہ کے دن نواب ناصر الدولہ کی بڑی بیگم جناب دلاور النساء بیگم کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ ابھی سات برس کے تھے کہ جنوری ۱۸۳۵ء میں ان کے والد نے انھیں افضل الدولہ کا خطاب عطا فرمایا۔ ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ کی گئی تھی۔ نواب سالار جنگ اور امیر کبیر نواب شمس الامراء ان کے اتالیق مقرر ہوئے۔ متعدد اساتذہ سے تعلیم پائی، جن میں سے مولانا نیاز الدین احمد بدخشانی کا نام قابلِ ذکر ہے۔

ان کی مسند نشینی سے کوئی ہفتہ بھر پہلے میرٹھ سے وہ شورش شروع ہوئی جسے انگریزوں نے "غدر" سے تعبیر کیا ہے۔ چونکہ حیدرآباد ملک کی سب سے بڑی اور اہم ریاست تھی، اس لئے ناممکن تھا کہ وہ اس ہنگامے کے اثرات سے بچ جاتی۔ معاملے کی نزاکت انگریز سے بھی مخفی نہیں تھی۔ اسے خوب معلوم تھا کہ اگر کہیں حیدرآباد بھی ہمارے خلاف ہو گیا، تو ہمیں پورے جنوبی ہندستان میں کہیں سر چھپانے کو جگہ نہیں ملے گی۔ جب ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو دیسی فوج نے میرٹھ سے دلّی آ کے انگریزوں کو قتل کیا اور لال قلعے پر قابض ہو کر بہادر شاہ ظفر کے شہنشاہِ ہندستان ہونے کا اعلان کیا ہے، تو ان دنوں نواب ناصر الدولہ مرض الموت میں مبتلا ہو چکے تھے۔ وفات سے پہلے انھوں نے بیٹے کو وصیت کی کہ ہمارے خاندان کے ساتھ انگریزوں کا رویہ ہمیشہ دوستی اور صداقت کا رہا ہے، تمھیں بھی چاہیئے کہ سدا اُن کی دوستی اور ہمدردی کا دم بھرتے رہو۔

دلّی کے انگریزوں کے ہاتھ سے نکل جانے کی خبر نواب ناصر الدولہ کی وفات کے بعد یہاں پہنچی۔ جونہی یہ اطلاع ملی، انگریز رزیڈنٹ کرنیل ڈیوڈسن Davidson نے مدار المہام (سالار جنگ) کو مشورہ کے لئے بلایا۔ سالار جنگ نے انھیں اطمینان دلایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں، ریاست کی حکمتِ عملی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ اور یہ صرف قول ہی نہیں تھا، سالار جنگ نے اپنے عمل سے بھی اس کی تصدیق کی۔ نواب افضل الدولہ اور سالار جنگ دونوں کو مخالفوں کی طرف سے طرح طرح کی دھمکیاں دی گئیں کہ اگر تم انگریزوں کی حمایت ترک نہیں کروگے تو قتل کر دئے جاؤگے۔ لیکن انھوں نے اس کی مطلق پروا نہ کی اور اپنے فیصلے پر مضبوطی سے قایم رہے۔ اسی وفاداری کا نتیجہ تھا کہ جب ہنگامہ فرو ہو گیا، تو انگریزی حکومت نے نواب صاحب اور ان کے مدار المہام اور دوسرے رؤسائے حیدرآباد کو بیش قیمت تحفے بھیجے۔

جولائی ۱۸۶۱ء میں ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کی طرف سے ستارۂ ہند Star of India کا ایک نیا خطاب جاری ہوا تھا۔ اس موقع پر ان والیانِ ریاست کو خاص طور پر نوازا گیا جنھوں نے ۱۸۵۷ء کے پُر خطر ایّام میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ نواب افضل الدولہ کو بھی جی، سی، ایس، آئی Knight Grand Commander (of the order) of the Star of India کا خطاب عطا ہوا۔ اس خطاب کے سلسلے میں عجیب لطیفہ پیش آیا۔

ان دنوں لارڈ کیننگ گورنر جنرل اور وائسرائے تھے۔ جب ان کی طرف سے رزیڈنٹ اس خطاب اور تمغے کا خریطہ لے کر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، تو انھوں نے اسے مسند کے نیچے رکھ دیا اور خود بدولت نہایت اطمینان سے اس کے اوپر بیٹھ گئے۔ اس پر بعض اخباروں نے بہت لے دے کی کہ نواب افضل الدولہ نے ملکہ معظمہ کے مراسلے اور اعزاز کی بے قدری بلکہ ہتک کی ہے۔ ان بیچاروں کو یہ خیال بھی نہیں تھا کہ یہ خطاب اور تمغہ کیا اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن اخباروں کو خدا موقع دے سنسنی پیدا کرنے کا۔ انھوں نے زیبِ داستان کے لئے ایسی ایسی خیال آرائیاں کیں کہ خلافِ توقع معاملہ بہت نازک صورت اختیار کر گیا۔ آخر نواب افضل الدولہ نے یہ عذر پیش کیا کہ چونکہ اس تمغے پر ملکہ کی تصویر ہے اور ہم اہلِ اسلام تصویر بنانا اور اسے اپنے پاس رکھنا حرام سمجھتے ہیں، اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ یہ تمغہ جو ہمیں دیا گیا ہے، اس میں سے تصویر حذف کر دی جائے۔ اُدھر سے جواب ملا کہ یہ اعزاز ہم نے صرف والیِ حیدرآباد ہی کو نہیں دیا بلکہ متعدد دوسرے والیانِ ریاست کو بھی عطا ہوا ہے۔ اس لئے محض آپ کی خاطر سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ یہ تو دونوں حکومتوں میں دوستی اور مودّت کا نشان ہے، اگر آپ کو اسے جوں کا توں قبول کرنے میں تامل ہو تو اسے واپس کر دیجئے۔ آخر سالار جنگ نے مداخلت کی۔ اِدھر نواب صاحب کو سمجھایا، اُدھر رزیڈنٹ سے جا کے کہا کہ اگرچہ تمغے کی تصویر شعائرِ اسلام کے خلاف ہے، تاہم حضور پُر نور اسے دونوں حکومتوں کے درمیان نشانِ صداقت سمجھتے ہوئے بخوشی قبول کرتے ہیں۔

یوں معاملہ رفت گذشت ہوا۔ اسی زمانے میں کسی دل جلے نے اس خطاب کی ہجو بھی لکھی تھی اور اسے کاغذ پر لکھ کے نواب صاحب، سالار جنگ اور بعض دوسرے امرا کے محلات کے دروازوں پر چسپاں کر دیا تھا۔

نواب افضل الدولہ بڑے دیندار، خدا دوست اور مذہبی ذہنیت کے دریا دل، فیاض اور رعایا پرور حکمران تھے۔ ریاست کے نظم و نسق میں انھوں نے بہت تبدیلیاں اور اصلاحات نافذ کیں۔ متعدد اولیّات انھی کے عہد میں ظہور میں آئیں۔ محکمۂ تعلیمات بھی ان کے زمانے میں قائم ہوا جس کے تحت خاص دارالخلافے میں مدرسۂ دارالعلوم اور مدرسۂ عالیہ اور اطراف ریاست میں متعدد مدرسے کھولے گئے۔ حیدرآباد کی بعض مشہور عمارتیں ان کی توجہ سے عالم وجود میں آئیں۔ افضل گنج پل، بازار افضل گنج اور اس کی عالی شان مسجد، دارالشفاء اور چادر یا پنج محل تعمیر ہوئے۔ ان پر لاکھوں روپیہ صرف ہوا۔ حیدرآباد کا حالی سکہ بھی انھی کی یادگار ہے۔ اس سے پہلے یہاں مغلیہ سکہ جاری تھا۔ جب ۱۸۵۷ء میں اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا تو انگریزوں نے اصرار کیا کہ حیدرآباد کو اپنا سکہ مضروب کرنا چاہیئے۔ اس پر حالی سکہ مسکوک ہوا۔ اس کے ایک طرف "نظام الملک آصف جاہ بہادر" کے الفاظ تھے اور دوسری طرف "ضرب فرخندہ بنیاد حیدرآباد" اور "۹۲" کا ہندسہ جو "محمدؐ" کے عدد ہیں۔ یہ سکہ ۱۹۴۸ء تک جاری رہا۔

نواب افضل الدولہ بڑے قوی ہیکل اور خوش خور انسان تھے۔ ان کے بہت لطیفے مشہور ہیں۔ ایک مرتبہ بیمار پڑ گئے۔ حکیم صاحب نے ہدایت کی کہ آپ کچھ دن کے لئے غذا کم کر دیں اور خاص طور پر شکر کے استعمال سے کلّی پرہیز کریں۔ یہ انھیں منظور نہیں تھا۔ آخر ان کے بہت اصرار پر معالج نے اجازت دی کہ اچھا آپ منہ کا ذائقہ بدلنے کو دن بھر میں آدھا لڈو کھا سکتے ہیں۔ غرض حسب معمول لڈو بنا رکھا ہوا اور اس میں سے آدھا نواب صاحب نے نوش جاں فرما لیا۔ جب حکیم صاحب پھر آئے، تو انھوں نے دریافت کیا کہ کیا حضور نے لڈو کھایا تھا۔ نواب صاحب نے جواب دیا کہ ہاں، آدھا میں نے کھا لیا تھا اور بقیہ آپ کے لئے اٹھا رکھا ہے۔ ملازم اشارہ پاتے ہی تھال اٹھا لایا جس میں حکیم صاحب کا حصہ رکھا تھا۔ دیکھا تو اس آدھے لڈو کا وزن چھ سیر سے کم نہیں تھا۔ حکیم صاحب حیران کہ اتنی خوراک یہ ہضم کیسے کر گئے۔ لیکن بخیر گذشت، خدا نے فضل کیا اور یہ چند دن میں لوٹ پوٹ کر بھلے چنگے ہو گئے۔

اسی طرح کا ایک لطیفہ علّامہ اقبال مرحوم سے متعلق سالک صاحب نے "یاران کہن" میں نقل کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب آموں کے بہت رسیا تھے۔ جب ایک حادثے کے نتیجے میں ان کا گلا بیٹھ گیا (اور جو آخر تک ٹھیک نہ ہو سکا)، تو ان کے معالج حکیم نابینا صاحب (ڈاکٹر انصاری کے برادر اکبر) نے حکم دیا کہ اب آپ آم کھانا بند کر دیں۔ یہ بچارے سخت مضطرب ہوئے۔ کہنے لگے، مرنا تو برحق ہے ہی، پھر آم نہ کھا کر مرنے سے آم کھا کر مرنا بہتر ہے۔ آخر ان کی بڑی منت سما جت پر حکیم صاحب پسیجے اور انھوں نے روزانہ ایک آم کھانے کی اجازت دے دی۔ سالک صاحب لکھتے ہیں کہ ایک دن میں مزاج پرسی کو جو پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے طشتری میں کوئی سیر بھر کا بمبئی آم رکھا ہے اور ڈاکٹر صاحب چھری ہاتھ میں لئے بس اللہ اکبر کہنے ہی والے ہیں۔ میں نے یہ دیکھتے ہی کہا، حضرت، آپ نے پھر بد پرہیزی شروع کر دی، تو بولے: نہیں تو، حکیم صاحب نے روزانہ ایک آم کھانے کی اجازت دے دی ہے اور یہ آم بہر حال ایک ہی آم تو ہے۔

نواب افضل الدولہ کی تنومندی اور طاقت کا بھی ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔ چونکہ بڑے تن و توش کے تھے، اس لئے ان کے لئے گھوڑے کے انتخاب میں بڑی دقت پیش آتی تھی۔ بالعموم مضبوط سے مضبوط گھوڑا کمر جھکا دیتا تھا۔ ایک مرتبہ یہ گھوڑے پر سوار کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں کسی برگد کے درخت کے نیچے پہنچے، تو رک گئے۔ معلوم نہیں کیا خیال آیا کہ برگد کی لٹکتی ڈاڑھی کو مضبوطی سے پکڑ کے لٹک گئے اور ساتھ ہی گھوڑے کو رانوں میں دبا کر اوپر اٹھا لیا۔ سب حاضرین ان کی طاقت کا یہ غیر معمولی مظاہرہ دیکھ کر اش اش کر اٹھے۔

نواب افضل الدولہ نے چند روزہ علالت کے بعد ۴۲ برس کی عمر میں ۲۶۔ فروری ۱۸۶۹ء کو جمعہ کے دن انتقال کیا۔ مکہ مسجد حیدرآباد میں اپنے دادا نواب سکندر جاہ کی قبر کے سیدھی طرف دفن ہوئے۔ شہید نے تاریخ وفات کہی ہے

افضل الدّولہ شہ ملک دکن رفت ز یں کاخ سپہر نیلگوں
سال رحلت گفت رضواں با شہید او بجنّت رفت از دنیائے دوں
۱۲۸۵ھ

ان کے ڈھائی سالہ کمسن بیٹے میر محبوب علی خان ان کے جانشین ہوئے۔ داغ انھی کے استاد تھے۔ موجودہ نظام میر عثمان علی خاں آصف جاہ ہفتم انھی کے بیٹے ہیں۔

(۲)

یہ بات آج تک علمی دنیا سے مخفی ہے کہ غالب نے نواب افضل الدولہ کی

مدح میں بھی قصیدہ لکھا تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۶۰ء میں حضرت صاحب عالم مارہروی نے انھیں مشورہ دیا کہ نظام دکن نواب افضل الدولہ کی مدح میں قصیدہ لکھ کے بھیجنا چاہیئے۔ اس پر انھوں نے حضرت صاحب عالم کی خدمت میں اپنے حالات ذرا تفصیل سے لکھے۔ پہلے اپنی پوری عمر کے افسوس ناک واقعات بتائے ہیں۔ پھر کہتے ہیں کہ میں جس کا ملازم ہوا، اس پر ادبار آیا۔ جس کی مدح کی، وہ چل بسا اور آخر میں فرماتے ہیں ۵:

"ایسے طالع مرتی کُش اور محسن سوز کب پیدا ہوتے ہیں! اب جو میں والی دکن کی طرف رجوع کروں۔ یاد رہے کہ متوسط یا مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا۔ اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے، تو کوشش اس کی ضائع ہو جائے گی اور والیِ شہر مجھے کچھ نہ دے گا، اور احیاناً اس نے سلوک کیا، تو ریاست خاک میں مل جائے گی اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت انھوں نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا۔ البتہ میرا گمان ہے کہ مختار الملک سر سالار جنگ کی خدمت میں جو قصیدہ انھوں نے ۱۸۶۱ء میں بھیجا تھا اور جو ان کے کلیاتِ فارسی میں موجود ہے (نمبر ۳۳)، وہ غالباً اسی تحریک کے بعد لکھا گیا تھا۔ بہرحال، اس کے ایک مدت بعد انھوں نے نظام کی مدح میں بھی قصیدہ لکھا۔ خدا معلوم، اس پر کچھ صلہ ملا یا نہیں، لیکن ایک بات تو ظاہر ہے کہ ان کی پیشگوئی بڑی حد تک پوری ہوگئی، اگرچہ اس میں کچھ دیر لگی۔

یہ قصیدہ آج تک شائع نہیں ہوا۔ یہ اس مجموعے میں شامل ہے، جو انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں مرتب کرلیا تھا اور جس کا قلمی نسخہ سید وزیرالحسن عابدی صاحب کے پاس ہے۔ اس کا نام "سبدِ باغ دودر" تھا۔ یہ دراصل "سبدِ چیں" کا نقشِ ثانی تھا۔ ان کی وفات کے باعث یہ مجموعہ شائع نہ ہو سکا، اس لئے یہ قصیدہ بھی آج تک پردۂ خفا میں رہا۔ "سبدِ چیں" پہلی مرتبہ ۱۸۶۷ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ قصیدہ اس میں شامل نہیں۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ اس کے بعد لکھا گیا ہو۔

قصیدۂ غالب در مدحِ نواب افضل الدولہ بہادر والیِ حیدرآباد دکن

حیدرآباد دکن روضۂ رضواں شدہ است ‌ ‌ ساز و برگِ طرب و عیشِ فراواں شدہ است
والیِ شہر کہ جاوید بماناد بدہر ‌ ‌ بود و آصف و امروز سلیماں شدہ است
افضل الدولہ بہادر کہ ز فرّ رخِ او ‌ ‌ بارگہ مطلعِ خورشیدِ درخشاں شدہ است
آں کہ در عہدِ وے از کثرتِ ایثار و عطا ‌ ‌ خلق را یافتنِ کامِ دل آساں شدہ است
مردہ را زندہ کند جنبشِ کلکش، گوئی ‌ ‌ کلکِ او موجۂ سرچشمۂ حیواں شدہ است
فرّ و فرہنگِ فریدوں کہ نہاں داشت سپہر ‌ ‌ اینک از پردہ دگر بار نمایاں شدہ است
بہ دکن آمدہ و بہ بیں ریزشِ دستِ کرمش ‌ ‌ کہ زمیں زآبِ گہر غرقۂ طوفاں شدہ است
تا شود روشنیِ چشمِ خلایق افزوں ‌ ‌ گرد در رہگذرش کحلِ صفاہاں شدہ است
نہ ہمیں نیک بود نظمِ امورِ دنیا ‌ ‌ کارِ دیں نیز دریں وقت بساماں شدہ است
نفسِ امّارہ کہ خود کافر و کافر گر بود ‌ ‌ از نہیبِ شہِ دیندار مسلماں شدہ است
می تراشند ز اعضاے بتاں اجزا را ‌ ‌ کفر در راستہ بازیچۂ طفلاں شدہ است
رفت تو قبح بآتش کہ نسوزد جاندار ‌ ‌ ہیزم و خار و خس راتبہ خواں شدہ است
لاجرم از رہِ اخلاص پیہ پیہ دانہ ‌ ‌ شمع را از مژہ باد نگہباں شدہ است
روزگاریست گراں مایہ و فرخ کہ جہاں ‌ ‌ ہم بداں گونہ کہ بایست، ہماناں شدہ است
شاہِ فرخندہ فرا! خسروِ والا گہرا! ‌ ‌ چشم بد دور کہ آدم بہ تو نازاں شدہ است
قدرِ آدم بدلش از تو چناں جاے گرفت ‌ ‌ کہ عزازیل ز انکار پریشاں شدہ است
سنگ فرساست چناں نعلِ سمندِ کہ ترا ‌ ‌ ہر کجا آمدہ، کہسار بیاباں شدہ است
ابر از خشم ست کہ در زیرِ تو جولاں دارد ‌ ‌ برق، تیغ ست کہ در دستِ تو عریاں شدہ است
دہد روشن نفسے ہست ز آلِ سلجوق ‌ ‌ ایں کہ بر مایدۂ فیضِ تو مہماں شدہ است
تو چناں داں کہ غریبے ز دیارِ دہلی ‌ ‌ بہ دکن آمدہ از دور ثنا خواں شدہ است
تیغ تیز است ثنا گوے تو لیکن دانی ‌ ‌ جوہرِ تیغ تہِ مورچہ پنہاں شدہ است
نیست جز گرد و غبار آنچہ بہر سو نگرم ‌ ‌ خواب در دیدۂ من بسکہ پریشاں شدہ است
غنچہ ہست دلِ من از شگفتن نومید ‌ ‌ خود شود سینہ اناں غنچہ کہ پیکاں شدہ است
بدمِ گرم خودم زندہ و بیدل زانم ‌ ‌ کہ دل از فرطِ ریاضت خورشِ جاں شدہ است
غالبِ غمزدہ درویش و تو درویش نواز ‌ ‌ بحلش باد، اگر طالبِ احساں شدہ است
صلہ گرمی نفرستی، بستایش بنواز ‌ ‌ کایں کلامے ست کہ داغِ دلِ حسّاں شدہ است
سخن ایں است کہ قطعِ نظر از حسنِ کلام ‌ ‌ دایہ جوے بسخن سلسلہ جنباں شدہ است

۵ اردوئے معلیٰ، ص ۱۰۵ (بنام عبدالغفور سرور مارہروی)

چشم بر لطف و کرم دوختہ را دریاب کز کاہش بدنش صورتِ مژگاں شدہ است
این کہن پیر بہ آوازۂ شیئاً للہ گدیہ گر بر درِ آں قبلۂ گیہاں شدہ است
در ثنائے تو چہ گفتم اگر آیم بدعا این بدل می سپرم، گر بزبان آں شدہ است

باد جاوید گلستانِ ترا فصلِ بہار
اے کہ از فیضِ تو آفاق گلستاں شدہ است

کتابیات

(۱) تاریخِ حیدرآباد دکن از مولوی محمد نجم الغنی - نولکشور (۱۹۳۵ء)

(۲) سروِ آزاد از میر غلام علی آزاد بلگرامی، مطبع رفاہِ عام، لاہور (۱۹۱۳ء)

(۳) اردوی معلّی از غالب، مطبع کریمی، لاہور (۱۹۲۲ء)

(۴) سبد باغِ دو در از غالب (قلمی)

(۵) نواب افضل الدولہ بہادر آصف جاہ پنجم از سید مراد علی طالع - اعظم سٹیم پریس، حیدرآباد دکن (۱۹۲۳ء)

(۶) یارانِ کہن از مولانا عبدالمجید سالک - اردو پریس، لاہور (۱۹۵۵ء)

آمیر سورتی

نذرِ غالب

بوئے تنک مزاج ہوں رنگِ پریدہ ہوں غم ہائے حسرتِ گُلِ جوہر کشیدہ ہوں
وہ مہرباں ہیں مجھ کو پریشان دیکھ کر خوفِ مآلِ لطف سے میں آبدیدہ ہوں
میری نظر سے دیکھ زمانے کے رنگ ڈھنگ میں تلخئ حیات کا لذت چشیدہ ہوں
میرے بغیر کچھ بھی نہیں حُسنِ کائنات یہ کس نے کہہ دیا کہ میں حرفِ بریدہ ہوں
محفوظ کیا ہوں مجھ سے کسی کے دل و دماغ گو نغمۂ وفا ہوں مگر ناشنیدہ ہوں
کیا پا سکے گی کوششِ دار و رسن مجھے سائے میں زلفِ دوست کے میں آرمیدہ ہوں
یہ زندگی کے حوصلے میرے سوا کہاں مر جاؤں اور سمجھوں کہ منزل رسیدہ ہوں
بے انتہا خوشی میں بھی آجاتے ہیں سرشک تم کو غلط گمان ہوا میں کبیدہ ہوں
مجھ کو نہ چھیڑ اے گُلِ پروردۂ بہار ہوں خار اور وہ بھی خزاں آفریدہ ہوں

آمیر میں اپنی جانتا ہوں قدر و منزلت
بربادگانِ عشق میں اِک برگزیدہ ہوں

طارق اختر انصاری

غزل

اتنے کچھ ان سے مانوس ہم ہو گئے
غم ہی آخر مداوائے غم ہو گئے
اب کہاں وہ خلوص و وفا ڈھونڈیئے
لوگ اچھے زمانے میں کم ہو گئے
لطفِ خاصِ رقابت بھی جاتا رہا
اس قدر عام اُن کے ستم ہو گئے
پھر کوئی تازہ اُفتاد پڑتی نہ ہو
کیوں وہ مائل بہ لطف و کرم ہو گئے
راہیں اس تک پہنچنے کی تھیں اور بھی
ہم ہی پابندِ دَیر و حرم ہو گئے
سوزِ طارق غزل میں نہیں بے سبب
دل کے جذبات شعروں میں ضم ہو گئے

شاہد صدیقی

غالب اور عارف

سبھی جانتے ہیں کہ غالب کی زندگی کے آخری دن بڑی پریشانیوں اور اُلجھنوں میں بسر ہوئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ اکثر زندگی ہی سے بیزار ہوگئے۔ اس کے باوجود اگر ان کے کلام اور حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے، تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انھیں مجموعی طور پر زندگی سے محبت تھی۔ وہ اس کی قدروں کو پہچانتے تھے اور اس سے لُطف اُٹھانا جانتے تھے۔ اُن کی فطرت کا خمیر عشق سے اُٹھا تھا۔ وہ محبت کرنے پر مجبور تھے اور زندگی کی ہر منزل میں ان کے لئے کوئی نہ کوئی محبوب ضروری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کی کئی اولادیں یکے بعد دیگر دنیا سے اُٹھ گئیں۔ تو انھوں نے اپنی بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں کو گود لے لیا، تاکہ قدرت نے ان کے دل میں اولاد کی محبت کے لئے جو گوشہ رکھا تھا وہ خالی نہ رہنے پائے، اور وہ شفقتِ پدری کے مظاہروں کی لذّت سے محروم نہ رہیں۔

زین العابدین خاں عارف کے باپ شرف الدولہ نواب غلام حسین خاں بہادر تھے۔ ان کا پہلا نکاح نواب الٰہی بخش خاں کی چھوٹی صاحبزادی بنیادی بیگم سے ہوا تھا۔ جن کے بطن سے حیدر حسین خان، اور زین العابدین خان عارف پیدا ہوئے تھے بنیادی بیگم کی بڑی بہن امراؤ بیگم غالب کی منکوحہ تھیں اور غلام حسین خاں صاحب غالب کے ساڑھو تھے۔ انھیں موسیقی سے دلچسپی تھی۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ ستار اچھا بجاتے تھے۔ اس زمانے کے امراء کی طرح شاعری کا بھی شوق تھا اور مسرور تخلص کرتے تھے۔ موسیقی اور شاعری میں ان کا درجہ معیّن کرنا تو مشکل بھی ہے اور غیر ضروری بھی، لیکن شاید انھیں دلچسپیوں کے نتیجہ میں ان کے تعلقات بیوی سے بہت خراب ہوگئے۔ اور حالات نے ایسا رُخ بدلا کہ میاں بیوی میں جُدائی ہوگئی، نواب غلام حسین خاں نے ایک مکان اپنی بیوی کے نام کردیا اور وہ اپنے بچوں کو لے کر علیحدہ رہنے لگیں۔

عارف ۱۸۱۷ء مطابق ۱۲۳۲ھ میں پیدا ہوئے۔ والدین کے باہمی تعلقات چونکہ اچھے نہیں تھے اس لئے تعلیم و تربیت پر ضروری توجہ نہ کی جاسکی، ساری ذمہ داری ماں کو سنبھالنی پڑی اور گھر پر ہی تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی طرح عارف کو بھی فطری طور پر حصولِ علم کا شوق تھا اور وہ ابتداء ہی سے اپنے دور کے باکمالوں کی قدر پہچانتے تھے۔ چناں چہ جب انھوں نے خطِ نسخ سیکھنا چاہا تو اُن کی نگاہ یاقوت رقم خاں ثانی میر جلال الدین پر پڑی جو اپنے فن میں یکتائے عصر تھے اور جنھیں بہادر شاہ ظفرؔ کی اُستادی کا امتیاز بھی حاصل تھا جب عارف نے میر صاحب سے خطِ نسخ سیکھنے کی خواہش کی تو انھوں نے یہ شرط رکھی، کہ عارف "معاوضہ" کے طور پر ان کے دونوں لڑکوں کو شاعری سکھائیں۔ عارف نے یہ شرط منظور کرلی اور استادی شاگردی کا دوطرفہ سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس واقعہ سے عارف کے شدید علمی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔

اُردو کے شاعروں کی گھریلو زندگی اکثر و بیشتر پریشان حالی کا شکار رہی ہے اور میرؔ سے لے کر غالبؔ تک سبھی یا تو "مجبوروں پر مختاری کی تہمت" کا رونا روتے رہے ہیں یا ناکردہ گناہوں کی حسرت" پر دادطلب نظر آتے ہیں۔ پھر عارف اس کُلیہ سے کس طرح مستثنیٰ رہ سکتے تھے۔ چناں چہ ان کے حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ اپنے استاد اور رہنما غالب کے مانند، وہ بھی گھر کی طرف سے کچھ زیادہ خوش نہ تھے انھوں نے دو نکاح کئے اور دونوں بیویاں انھیں جوانی کے عالم میں تنہا چھوڑ کر موت کے آغوش میں چلی گئیں۔ پہلی بیوی کی جُدائی کا صدمہ

تو وہ برداشت کر گئے، لیکن چونکہ انھیں اپنی دوسری بیوی سے بہت محبت ہوگئی تھی اس لئے جب ۱۸۵۲ء میں موت کے زبردست ہاتھ نے ان کا یہ سرمایہ بھی چھین لیا تو وہ اس غم کو سہار نہ سکے۔ یعنی اپنی محبوب بیوی کی موت کے چار یا پانچ مہینے بعد ہی ۳۵ سال کی عمر میں انتقال کر گئے اور بوڑھے غالب کو یہ کہنے کے لئے اکیلا چھوڑ دیا ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

عارف نے دو اولادیں چھوڑیں، باقر علی خاں، اور حسین علی خاں، غالب کو عارف سے بڑی محبت تھی، اور وہ انھیں اپنی اولاد سے بڑھ کر سمجھتے تھے۔ جب عارف دُنیا سے اُٹھ گئے۔ تو غالب کی محبت ان کے دونوں بچوں کی طرف منتقل ہوگئی اور غالب نے انھیں اپنے پاس بُلا لیا وہ ان کی ہر ضد پوری کرتے تھے۔ کبھی کبھی ان کی ضد سے مجبور ہوکر انھیں سفر میں بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ غالب کے حالات پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ انھوں نے کس "تنگدستی" بلکہ "فاقہ مستی" میں اپنی عمر گزاری۔ لیکن جہاں تک ان بچوں کا تعلق ہے غالب انھیں کوئی تکلیف نہ ہونے دیتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"دونوں بچے فروری مہینہ کے دو دو روپیہ لے گئے اور خرچ کر ڈالے۔ اب ایک ایک روپیہ بطور قرض دیا ہے۔"

یہاں لفظ "قرض" کے استعمال کو غالب کی ظرافت بیان کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ غالب نے ۱۸ جون ۱۸۵۲ء کو جو عارف کے انتقال کا سنہ ہے، مرزا تفتہ کو ایک خط میں لکھا:-

"تم جانتے ہو کہ زین العابدین خان مرحوم میرا فرزند تھا اور اب اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں۔ میرے پاس آ رہے ہیں اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں۔"

اس چار حرفی لفظ "تحمل" میں محبت اور شفقت کی ایک دُنیا آباد ہے۔

ان دونوں لڑکوں کی تعلیم و تربیت اور ابتدائی حالات کا زیادہ پتہ نہیں چلتا، خمخانۂ جاوید سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں عارف کے بڑے بیٹے نواب باقر علی خان کامل، ریاست الور میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ اور چھوٹے بیٹے حسین علی خاں شاداں دربار رام پور سے وابستہ ہوگئے تھے:-

اس بات پر سب تذکرہ نگار متفق ہیں کہ عارف نے کم سنی ہی میں شاعری شروع کردی تھی۔ اور یہ کوئی حیرت کی بات بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ خود ان کے بزرگ اور استاد غالب مغفور بھی، نو دس سال کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ عارف نے جو سرمایۂ شعری چھوڑا ہے اسے دیکھتے ہوئے بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ کم عمری ہی سے مشقِ سخن شروع کردی تھی بلکہ وہ ایک پُرگو شاعر بھی تھے۔ لالہ سری رام مرحوم مؤلف خمخانۂ جاوید کے خیال میں عارف کے غیر مطبوعہ کلیات میں بیس ہزار سے کم اشعار نہ ہوں گے۔ اکثر غزلیں ساٹھ ساٹھ شعر کی ہیں۔ اس وقت تک عارف کے کلام کا جو پتہ چل سکا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک نسخہ جو پہلے لوہارو کے کتب خانہ میں تھا۔ اب رضا لائبریری رام پور میں ہے دوسرا نسخہ لالہ سری رام کے پاس تھا۔ اور اب ہندو یونی ورسٹی بنارس میں منتقل ہوگیا ہے۔ یہ دونوں نسخے قلمی ہیں۔ اور ان کے علاوہ ایک تیسرا قلمی نسخہ کتب خانہ نواب سالار جنگ (حیدرآباد) میں بھی ہے۔ جس میں ایک ہزار ایک اشعار ہیں اور آخر میں یہ عبارت درج ہے "متفرقات قصائد و غزلیات عارف تمام شد"

اس نسخہ کی کتابت صاف اور واضح ہے۔ اور گو اسے بہت زیادہ خوش خط نہیں کہا جاسکتا پھر بھی گوارا ہے۔ اس کے کاتب نے ہر جگہ قدیم اندازِ تحریر اختیار کیا ہے۔ جس سے اس کی قدامت کا پتہ چلتا ہے۔ مثال کے طور پر یائے معروف و یائے مجہول کے درمیان اکثر مقامات پر کوئی فرق نہیں ہے "ملتی" کو "ملتے" لکھا گیا ہے اور "پہلے" کو "پہلی" لکھنے میں کوئی پس و پیش نہیں کیا گیا۔ پُرانے رواج کے مطابق الفاظ کے حروف کو زیادہ تر ملا کر لکھا ہے۔ یعنی "رکھوں کیوں کر" کو "رکھونکیونکر" لکھ دیا ہے۔ ایک جگہ "بوالہوسوں" کے بجائے "بلہوسوں" لکھ ڈالا ہے۔ املا کی بھی بے شمار غلطیاں ہیں "طرّہ" کو "تُرّہ" لکھا ہے۔ "سفاک" کو "صفاک" اور "سحر" کو "صحر"!

اس نسخہ میں قصیدے ہیں، غزلیں ہیں، مخمس ہیں، مسدس ہیں، قطعے ہیں، رُباعیاں ہیں، متفرق اشعار ہیں۔ غرض کہ سبھی کچھ ہے اور اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ اس میں ابتدائے مشق کا کلام بھی ہے، اور اس زمانے کے اشعار بھی، جب کہ عارف کے سخن میں پختگی پیدا ہوچکی تھی۔

عارف پہلے شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ لیکن جب وہ دکن چلے گئے تو انھوں نے غالب سے رجوع کیا۔ اور اس طرح رہرو کو وہ رہنما مل گیا۔ جو نہ صرف یہ کہ منزل آشنا تھا بلکہ نئے راستے بنانے پر بھی قادر تھا۔ غالب اور عارف کا تعلق صرف استاد شاگرد کا سادہ تعلق نہ تھا بلکہ اسے خاندانی قرابت کے رشتے

نے اپنی کرموں سے اور بھی استوار کر دیا تھا۔ اس لئے عارف کی شاعری کے متعلق سب سے زیادہ مستند رائے خود غالب ہی کی ہو سکتی ہے۔ اور یہ رائے پوری جامعیت کے ساتھ غالب کے اس قطعہ سے ظاہر ہوتی ہے، جو عارف کے لئے کہا ہے اور یوں شروع ہوتا ہے ؎

آں پسندیدہ خوئے عارف نام
کہ رخش شمع دودمانِ من است

اس قطعہ میں یہ اشعار غور طلب ہیں ؎

بہ یقیں داں کہ غیرِ من نبود — گر نظیرِ تو در گمانِ من است
جاوداں باش اے کہ در گیتی — سخت عمرِ جاودانِ من است
اے کہ میراث خوارِ من باشی — اندر اردو کہ آں زبانِ من است
از معانی زمینِ باغ ذہنت — باد آنِ تو ہر چہ آنِ من است

غالب پنج آہنگ میں نواب مصطفیٰ خاں کے نام ایک خط میں کسی مشاعرے کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"از یاران بندہ مرزا زین العابدین خاں عارف، جوانِ سخنگو و بر درمنزلین طرح دو غزل خواندہ نقشِ نغز گوئی بکرسی نشاندند۔"

اس سلسلے میں غالب کے اس فارسی قطعہ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے جو انھوں نے کسی باغ کی تعریف میں لکھا ہے اور جس کے لئے تشبیہات کی تلاش کرتے ہوئے۔ اپنا اور عارف کا ذکر ایک ساتھ کیا ہے ؎

صبا حش چوں دلِ عارف منزہ
نسیمش چوں دمِ غالب معنبر

غالب کی بدنام خود پرستی کی روشنی میں ان حقائق و واقعات کو سامنے رکھا جائے تو یہ یقین پختہ تر ہو جاتا ہے کہ غالب، عارف سے صرف محبت ہی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ان کی شخصیت و صلاحیت کے متعلق ایک نہایت ہی بلند رائے بھی رکھتے تھے۔

یہ بات مسلم ہے کہ عارف نے ابتداء میں شاہ نصیر سے اصلاح لی۔ اور چوں کہ اس زمانے میں شاہ نصیر کا رنگ عام طور پر مقبول تھا۔ اس لئے عارف اس سے متاثر بھی ہوئے اور اسی تاثر کے تحت ہمیں ان کے کلام میں ایسے اشعار ملتے ہیں ؎

کیوں نہ وہ ناک چڑھا دیں کہ پاس آنے سے — ہر رگ گُل سے مرے لپٹے وفا آتی ہے

گہ پاؤں نہیں پر ہے تو گہ عرش پر ان کا — عالم کو وہ کس دن تہہ و بالا نہیں کرتے
اے فلک تو دہ بانٹے غم بھیجا — کچھ بھی ہے، فکر میرے کھانے کی
جنگ نفی مشق دخرو میں کام اپنا ہو گیا — ہے ہماری وہ مثل گھن پس گیا آٹے کے ساتھ

لیکن غائر نظر ڈالی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عارف نے شاہ نصیر سے جو تاثر حاصل کیا وہ محض وقتی اور عارضی تھا۔ صرف یہی نہیں، بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے گویا جس وقت عارف شاہ نصیر کی تقلید کر رہے تھے۔ اس وقت بھی ان کا "آئیڈیل" غالب ہی کا کلام تھا۔ اسی زمانے کی غزلوں میں ہمیں ایسے متضاد اشعار ملتے ہیں جن کا مزاج مختلف ہے۔ اندازِ بیان مختلف ہے، لہجہ مختلف ہے اور طریقۂ فکر مختلف ہے۔ مثال کے طور پر ایک غزل میں وہ کہتے ہیں ؎

کھا گیا ہوں میں غم کروڑوں من
نہ ہوا لیک امتلا مجھ کو

صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ طرزِ فکر اور پیرایۂ بیان شاہ نصیر کی صحبت و تربیت کا نتیجہ ہے اور اس شعر کو پڑھ کر ذہن بے ساختہ "عسل کی مکھی" کے معرکے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن حیرت ہوتی ہے جب ہم اسی غزل میں یہ شعر پڑھتے ہیں ؎

اتنے بیگانہ مت رہو مجھ سے
طعنہ دیتے ہیں آشنا مجھ کو

عارف کے اس دور کا کلام اگر پوری توجہ سے پڑھا جائے تو یہ احساس ہوتا ہے گویا ان کی شاعری ایک کشمکش کی منزل سے گذر رہی ہے ایمان انھیں روک رہا ہے اور کفر انھیں کھینچ رہا ہے۔ وہ شاہ نصیر اور غالب دونوں کے ساتھ چل رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جب شاہ نصیر ہانپ کر پیچھے رہ جاتے ہیں اور عارف غالب کے قدم بہ قدم آگے نکل جاتے ہیں۔

عارف نے شاہ نصیر کے بعد غالب سے اصلاح لی۔ لیکن اس کی نوعیت اور قدر و قیمت سمجھنے کے لئے عہدِ غالب کے اندازِ اصلاح کی نسبت مالک رام صاحب کی اس جچی تلی رائے کو فراموش نہ کرنا چاہئے۔ جو انھوں نے اپنی نئی کتاب "تلامذۂ غالب" میں ظاہر کی ہے۔ مالک رام صاحب لکھتے ہیں:۔

"غالب کے شاگردوں میں بہت کم اپنے استاد کے رنگ میں کہنے والے ہیں اس کا سبب یہی ہے کہ غالب اس نکتے کو خوب سمجھتے تھے۔ کہ چہرے مہرے کی طرح ہر شخص اپنا خاص مزاج اور مذاق بھی قدرت کی طرف سے لے کر آتا ہے ان میں سے کسی کو بھی بدلنے کی کوشش کرنا، اسے مسخ کر دینے کے مترادف ہے

صحیح طریقہ یہ ہے کہ کلام کے ظاہری ردیبت اور فنی و معنوی اسقام کی اصلاح کی جائے، اور اس کے طرزِ سخن کو جوں کا توں قائم رہنے دیا جائے۔"

خود غالب اپنے طریقہ اصلاح کی نسبت قاضی عبدالجمیل کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"فقیر کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر کلام میں اغلاط و اسقام دیکھتا ہوں
تو دفع کر دیتا ہوں، اور اگر سقم سے خالی پاتا ہوں تو تصرف نہیں کرتا۔"

یہ استاد کا اندازِ فکر اور طرزِ عمل ہے۔ لیکن اگر کوئی شاگرد اپنی فطرت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر استاد کی ہمنوائی کے لئے بیتاب ہو جائے، تو ظاہر ہے کہ اُسے استاد بھی نہیں روک سکتے بلکہ فطری طور پر اُسے بے اندازہ مسرت ہوگی۔ یہاں پہنچ کر ہم پھر مالک رام صاحب کے ان الفاظ میں بڑا وزن پاتے ہیں۔ "جب نصیر دکن کو سدھارے تو عارف نے غالب سے استفادہ شروع کیا رنگِ سخن بھی بدل دیا اور پہلا دیوان "مطلع مہرِ سعادت" جو شاہ نصیر کے رنگ میں تھا نظری کر دیا۔ اب وہ شاعری میں غالب کی پیروی کرنے لگے اور دوسرا دیوان مرتب کیا۔ انہی خوبیوں کے باعث مرزا ان پر بہت فخر کرتے تھے۔"

فخر کا اس سے بہتر محل اور کیا ہو سکتا تھا کہ ایک قریبی رشتہ دار جسے غالب بہت ہی عزیز رکھتے تھے، اور جس کی ذہانت و طباعی مسلمہ تھی۔ ان کے اُس رنگ کو اپنائے، جس کی ناقدری کا رونا وہ تمام عمر روتے رہے۔ اور ان کا وہ اندازِ کلام اختیار کرے، جس کی کس مپرسی نے انہیں ع

گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل

کہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

غالب اردو شاعری میں ایک منارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان کی انفرادیت کو کوئی دوسرا شاعر آج تک بھی نہیں پہنچ سکا۔ لیکن جب ہم کامل غیر جانبداری اور صداقت پسندی کے ساتھ، عارف کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس چھوٹی سی شمع نے بھی کہیں کہیں، اور کبھی کبھی اس منارۂ نور سے ٹکر لینی چاہی ہے۔ اور اگر "شکست و فتح" کے فیصلے کو نصیبوں پہ چھوڑ دیا جائے، تب بھی "مقابلہ" کی خوبی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس دعوے کو ثابت کرنے کے لئے کہ آخر زمانے میں عارف اپنے استاد محترم کے نقشِ قدم پر چلنے لگے تھے اور اندازِ فکر و اسلوبِ بیان میں غالب کی پیروی کو انھوں نے اپنا شعار بنا لیا تھا، کسی طویل بحث کی ضرورت نہیں۔ یہاں غالب اور عارف کے متحد المعنیٰ اور مشترک المعنیٰ اشعار درج کئے جاتے ہیں۔ جن کے تقابلی مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ شاگرد نے کس سلیقہ کے ساتھ استاد کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کی ہے اور فطری ذوق کی یکسانیت نے کن نازک مقامات پر دونوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔

غالب	عارف
یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی	ہمیں نہ تھی یہ خبر اس قدر نہ ہو برہم
گر بگڑ جاتے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا	تجھے نہ آج سے کہویں گے یوسفِ ثانی
ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ	اوروں کو ہو تو ہو ہمیں مرنے سے ڈر نہیں
یارب اپنے خط کو ہم پہونچائیں کیا	خط لے کے ہم ہی چلتے ہیں اگر نامہ بر نہیں
دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے	وہ شرم ہے ان کو کہ ہے آئینہ سے نفرت
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے	خود دیکھنا اپنا بھی گوارا نہیں کرتے
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے	اے فلک خانہ خرابی کی ہے پروا کس کو
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا	وحشت میں بسکہ خوش ہیں مدت ہوئی گھر چھوڑ دیا
سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے	اس ضعف کا برا ہو کہ ناکام رہ گئے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے	آج اُس کا اپنے ہاتھ سے داماں نکل گیا
کیوں ردِّ قدح کرے ہے زاہد	پی کر تو دیکھ بیٹھ کہ یہ کیا ہے محتسب
مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے	مت توڑ شیشۂ مئے گلنار بے سبب
آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے	اب تلک آئینہ شاید آپ نے دیکھا نہیں
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے	آپ جو کہتے ہیں ہم رکھتے نہیں اپنا جواب
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب	میں تو مر جاتا وہیں غیرت سے کوہِ طور پر
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی	اس طرح سے صاف گر ملتا مجھے موسیٰ کا جواب
ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم	آنے دو بھلا روزِ قیامت کو بھی اک دن
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں	ناہیں گے ترے قامتِ رعنا کے برابر

عارف کے اس قلمی دیوان میں جو سالار جنگ لائبریری کی زینت ہے۔ اور جس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے ایک فارسی غزل بھی ہے اور حسنِ اتفاق سے ہمیں اس زمین میں غالب کی بھی ایک غزل ملتی ہے، یہاں ان دونوں غزلوں کے اشعار کا مطالعہ دلچسپی اور لطف سے خالی نہ ہوگا۔

غالب کا مطلع ؎

لرزہ دارد خطر از ہیبت دیوانۂ ما   سیل را پائے بہ سنگ آمدہ در خانۂ ما

عارف کہتے ہیں ؎

خوں بدل نیست شراب است بہ پیمانۂ ما		سینۂ ماست ز اندوہ تو میخانۂ ما

جہاں تک شان و شکوہ کا تعلق ہے، غالب کے مطلع کا جواب نہیں، لیکن شاعری کا وہ حسن جسے تاثیر کہتے ہیں۔ عارف کے مطلع میں نسبتاً زیادہ پایا جاتا ہے!

"پیمانہ" کے قافیہ میں دونوں کے شعر غور طلب ہیں:-

غالب:-

مے بانداز حرام آمدہ ساقی برخیز		شیشۂ خود بشکن بر سر پیمانۂ ما

عارف:-

بادہ بر مانہ حرام است کہ از شورش بخت		نشہ زائل شود از بادہ بہ پیمانۂ ما

شراب کے حرام نہ ہونے کا دعویٰ دونوں نے کیا ہے۔ لیکن غالب کے شعر میں تکلف اور تصنع ہے۔ اس کے مقابلہ میں عارف نے اپنے لئے شراب حلال سمجھنے کے سلسلے میں "شورش بخت" کا جو حوالہ دیا ہے اس میں کوئی بناوٹ نہیں۔ اس بحث سے قطع نظر، عارف نے "حلت" کی وجہ بھی بتادی ہے جو بڑی حد تک معقول ہے اور غالب نے محض فتویٰ صادر کر دیا ہے! ایک ہم قافیہ شعر اور ہے۔

غالب ؎

دم تیغت تنک و گردن ما باریک است		آفریں بر تو و بر ہمت مردانۂ ما

عارف نے اس قافیہ میں مقطع کہا ہے ؎

صبح کردیم شب تار جدائی عارف		در غم دوست ببیں ہمت مردانۂ ما

ہمت مردانہ دونوں کے یہاں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن غالب نے اسے تیغ محبوب کی تنک دمی اور اپنی گردن کی باریکی میں الجھا کر شعر کو پیچیدہ کر دیا ہے عارف کے یہاں چونکہ بیان واقعہ ہے اور بات دل سے نکلی ہے۔ اس لئے اس میں اثر ہے، کیف ہے، اور چونکا دینے والی کیفیت ہے!

"افسانہ" کے قافیہ میں بھی دونوں نے طبع آزمائی کی ہے

غالب ؎

خوش فرو میرود افسون رقیبت در دل		پنبۂ گوش تو گردد مگر افسانۂ ما

عارف ؎

آخر اے بخت عدو این ہمہ بیداری چیست		نرسیدا ست بہ گوش تو گر افسانۂ ما

دونوں شعروں کی فضا تقریباً یکساں ہے۔ اور دونوں میں رقیب یا عدو کی شخصیت "وجہ نزاع" نظر آتی ہے، فرق یہ ہے کہ غالب صرف شکایت کر کے رہ گئے ہیں۔ اس سے زیادہ اگر شعر میں کچھ ہے تو وہ محض لفظی صناعی ہے۔ "افسون رقیب" ہے اور "پنبۂ گوش" ہے۔ لیکن عارف نے خود بخت عدو کی بیداری کا سبب بیان کیا ہے، اور ضمنی طور پر اپنی سوئی ہوئی قسمت کا ذکر ایسے انداز میں کر دیا ہے جو خاصہ مؤثر ہے۔ غالب کے شعر میں قطعیت ہے یعنی بات ختم ہو جاتی ہے۔ عارف کے یہاں گنجائش ہے، اور ایسے اشارے ہیں جن سے بات بڑھتی اور پھیلتی ہے!

عارف کی اس غزل کے باقی اشعار بھی اس لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں غالب ہی کا انداز ہے۔ انہی کا لہجہ ہے، اور انہی کا مخصوص اسلوب فکر ہے

صبح پیراہن ہر شمع بگرید خورشید		تا بر و سرمہ ز خاک پر پروانۂ ما

رشتہ از برہمن و دانہ ز شیخ آوردم		تا شد آراستہ این سبحۂ صد دانۂ ما

از قدوم تو بہ خود بالم و خود منفعلم		کہ دلت تنگ شد از تنگی کاشانۂ ما

عارف کا فارسی کلام کم ہے۔ لیکن جتنا کچھ بھی ہے۔ اس پر غالب کی چھاپ ہے فکر کے لحاظ سے بھی اور اظہار کے اعتبار سے بھی، اس کے علاوہ جس طرح غالب اردو اشعار میں بے موقعہ فارسی الفاظ ٹھونس دینے کے سلسلے میں بدنام ہیں عارف کے کلام میں بھی اکثر مقامات پر یہی انداز پایا جاتا ہے اور اس قسم کے مصرعے ملتے ہیں۔

نہ تھا سر گو شیا اعدا کے تن پر

کرے دریوزہ گوہر جس سے نیساں

اردو شاعری کی ایک بدقسمتی یہ بھی ہے کہ غالب نے اپنے ماحول کے خلاف جو بغاوت کی تھی اس کا سلسلہ ان کے بعد جاری نہ رہا۔ اور انھوں نے شعر کو بلند کرنے کے لئے جو تحریک چلائی تھی، بعد کے زمانہ میں اس کے علمبردار پیدا نہ ہوسکے کیا عجب ہے کہ اگر عارف کو ۳۰ سال کی عمر میں موت نہ آتی اور غالب کا یہ "میراث خوار" اور زندہ رہ کر فکر شعر میں مصروف رہتا تو اس کے کلام کے تسلسل سے غالب کی قائم کردہ روایت آگے بڑھتی اور اردو شاعری کو زیادہ توانائی ملتی۔

ضروری گذارش ۱۔ مضمون کاغذ کے ایک طرف اور خوش خط لکھیے۔ ۲۔ غیر مطبوعہ مضامین اُسی صورت میں واپس کئے جائیں گے جب کہ اُن کے ساتھ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ ہوں گے۔ (ادارہ)

عطا کاکوی

غالبِ سخنداں

بسکہ دشوار ہے غالب سا سخنداں ہونا
فلکِ شعر و سخن کا مہِ تاباں ہونا

اس کی ہر بات کا اک برقِ تپاں بن جانا
اس کے ہر شعر کا اک شعلۂ رقصاں ہونا

اس کا آہنگ جدا، رنگ جدا، ڈھنگ جدا
تھا نئے طرز سے اس کا گہر افشاں ہونا

راستہ اس کا دقیق اس کے عزائم دشوار
اس کی فطرت میں نہ تھا مردِ تن آساں ہونا

تھا یہ سے سرحدِ ادراک سے اس کا مسجود
تھا عجب کعبے کا انگشت بدنداں ہونا

مفلسی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہی رہا
اس کو آیا نہیں شرمندۂ احساں ہونا

جلوۂ حسنِ ادب اتنا کہاں روشن تھا
شمعِ غالب ہی سے تھا اس کو فروزاں ہونا

محو کرتا ہے غضب اس کا خرامِ رنگیں
گلشنِ فکر میں وہ اس کا خراماں ہونا

جلوۂ جام میں جوں شاہدِ مے کا پرتو
حسنِ افکار کا شعروں میں نمایاں ہونا

شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا اس کے بعد
غم میں تھا حسن کو بھی چاک گریباں ہونا

بھر گئی دردِ محبت سے فضا دنیا کی
میر کے رنگ میں وہ اس کا غزل خواں ہونا

دیکھو پھیلائے ہیں عرفی و نظیری دامن
عجمی لَے میں وہ اس کا گہر افشاں ہونا

سو قدم آگے زمانے سے تھا اس کا رہوار
شام ہی سے رخِ خورشید کا عریاں ہونا

بڑھتی ہی جائے گی توقیرِ کمالِ غالب
مہِ نو کو ہے عطا مہرِ درخشاں ہونا

محمد خاں شہاب مالیرکوٹلوی

"دیوانِ غالب" اور "گل کدۂ داغ" کی سیر

غالب اور داغ کے چند اشعار کا تقابلی مطالعہ

ہماری زبان اُردو کے دو شاعر بڑے مظلوم ہیں۔ غالب اور داغ۔ غالب کی مظلومیت کی داستان بہت لمبی ہے۔ جس کا سلسلہ ان کی زندگی سے شروع ہو کر اب تک کہ انھیں مرے ہوئے ایک صدی پوری ہونے کو آئی ختم نہیں ہوا۔ مرحوم کے ساتھ انصاف زندگی میں ہوا نہ وفات کے بعد۔ غریب کو چڑھا چڑھا کر گرایا گیا۔ بڑھا بڑھا کر گھٹایا گیا۔ داغ کو شاگردوں کی فوج کی فوج تو ملی لیکن خاص و عام نے انھیں عوام کا نمائندہ کم سمجھا اور عامیانہ شاعری کا الزام زیادہ دیا۔ ہاں خدا بھلا کرے ڈاکٹر اقبال مرحوم کا کہ انھوں نے اپنے مرحوم استاد کے حق میں جرأت کر کے یہ کلمۂ حق کہا اور انصاف یہ ہے کہ خوب کہا ؎

تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے — لیلیٔ معنی وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے
لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت — ہوں گی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت
ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون؟ — اٹھ گیا ناوک فگن، مارے گا دل پر تیر کون؟

سطور ذیل کا مقصد ان الزامات کا جواب دینا نہیں۔ بلکہ مدّعا یہ ہے کہ ان دونوں استادوں کے چند منتخب اشعار کا تقابلی مطالعہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ انھوں نے ایک ہی حقیقت کے لئے کون سے لفظ اور کیسا پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے۔ غلطیوں سے کون بچا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اشعار زیرِ مطالعہ کے سمجھنے میں راقم حروف سے بھی غلطی ہو رہی ہو۔ مگر اتنا مان لیجئے کہ جو غلطی ہو گی وہ بے ارادہ یا نادانستہ ہو گی۔ دانستہ کسی بات کا تبنگڑ بنانے کی مطلق کوشش نہیں کی جائے گی۔

غالب و داغ کے اشعار کے تقابل کا خیال اتفاقاً اس طرح سامنے آ گیا کہ کبھی حیدرآباد سے "گلکدۂ داغ" کے نام سے کلامِ داغ کا ایک انتخاب شائع ہوا تھا۔ جسے ان دنوں پڑھنے کا موقع ملا۔ بعض اشعار نے بے اختیار اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اثنائے مطالعہ میں داغ کا یہ مقطع بھی نظر کے سامنے آیا ؎

نہیں ملتا کسی مضمون سے ہمارا مضموں — طرز اپنا ہے جدا سب سے جدا کہتے ہیں

یہ شعر پڑھتے ہی غالب کا مشہور شعر حافظہ کی سطح پر ابھر آیا ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے — کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

داغ نے صرف اتنا دعویٰ کیا ہے کہ میرا مضمون اور طرزِ بیان سب سے جدا ہے۔ اچھائی اور بُرائی کی بحث نہیں اٹھائی۔ لیکن غالب دنیا بھر کے سخنوروں کو اچھا کہہ کر ان کے کمال کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں کہ "غالب کا اندازِ بیاں اور ہے" یعنی دوسرے شعراء کے اندازِ بیان سے غالب کا اندازِ بیان اچھا ہے۔ اس مفہوم کا گواہ غالب کے شعر کا پہلا مصرعہ ہے۔

ان دونوں شعروں کو دیکھتے ہوئے ناموزوں نہ ہو گا کہ دونوں استادوں کے چند ہم مضمون یا ملتے جلتے شعروں کے اندازِ بیان کا کسی قدر تفصیل سے مطالعہ کر لیا جائے۔

غالب کا مشہور شعر ہے کہ ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق — آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

اور داغ کہتے ہیں ؎

مصحف نہیں یہ نامۂ اعمال ہے مرا — یارب یہ ہے ہزار جگہ کم سے کم غلط

غالب اور داغ دونوں کا بنیادی خیال ایک ہے کہ ہمارے نامۂ اعمال ہمارے خلاف معتبر سند نہیں ہیں۔ مگر دونوں کا انتخاب الفاظ اور پیرایۂ بیان قابل دید اور لائق توجہ ہے۔

غالب کہتے ہیں ہم "ناحق" فرشتوں "کے لکھے پر پکڑے جا رہے ہیں۔ "فرشتوں" کا لکھا اس لئے قابل اعتبار نہیں کہ ان کے لکھتے وقت "ہمارا کوئی آدمی" موجود نہ تھا۔ اس لئے فرشتوں کا نوشتہ ہمارے خلاف کوئی سند نہیں ہو سکتی۔

یہ کہنا کہ ہم بیرونی کے لکھے پر "پکڑے جا رہے ہیں" یا فرشتوں کے یکطرفہ بیان پر ہمیں مستوجب سزا قرار دینا دھاندلی اور حکومت کی بے اصولی ہے۔ گویا حکومت سزا دینے میں حق بجانب نہیں۔ پھر لکھنے والے فرشتے ہیں۔ ان کی تحریر اس لئے مشکوک ہے کہ نہ ہمارے سامنے لکھی گئی نہ ہمارے اعتباری آدمیوں کے سامنے لکھی گئی۔ اس لئے یہ عدالت کی دوسری غلطی ہے کہ ہمیں مجرم قرار دینے کے لئے ایسے غیر مستند بیان کو سند بنایا جا رہا ہے۔

غور کیجئے تو یہ محض شوخی ہے۔ لیکن جب دیکھا جاتا ہے کہ معاملہ خدائی عدالت کا ہے۔ تو دھاندلی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ وہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا رحم و کرم فرماتا ہے اور جب مان لیا گیا کہ لکھنے والے فرشتے ہیں۔ تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ کسی بیان میں کمی یا زیادتی کر ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ فرشتوں سے متعلق تصور ہی یہ ہے۔

اور اگر خدا اور فرشتوں کا وجود ہی نہ مانا جائے تو پکڑے یا نہ پکڑے کا کیا مذکور۔ لیکن جب خدا کو مانا جاتا ہے تو ناحق پکڑے جانے کا خیال ہی نہیں آ سکتا۔

یہ پیرایۂ بیان ایسا ہے کہ ہماری انسانی عدالتیں اسے ہتک عدالت قرار دے سکتی ہیں۔ حق تعالیٰ کی عدالت کے بارے میں ایسا خیال محض شوخی اور حد سے بڑھی ہوئی بے باکی ہے جسے عام حالات میں پسند نہیں کیا جاتا۔

اس کے مقابلے میں داغ کا رنگ ہی اور ہے۔ ان کا بھی نامۂ اعمال عدالت میں پیش ہے اور اسی کی بنا پر داغ سے جواب طلبی ہو رہی ہے۔

داغ حاکم مطلق سے عرض کرتے ہیں کہ میرے نامۂ اعمال کو صحیح سمجھ کر مجھے مجرم ٹھہرایا جاتا ہے۔ لیکن مجھے اپنے نامۂ اعمال کی صحت سے انکار ہے۔ داغ اپنے نامۂ اعمال کا مقابلہ "مصحف پاک" یا "قرآن حکیم" سے کرتے ہیں اور احکم الحاکمین سے کہتے ہیں کہ مصحف پاک آپ کا کلام پاک ہے۔ آپ اس کی صحت کا اعلان فرماتے ہیں اور ہم اس کی صحت کو تسلیم کرتے ہیں۔ جس طرح آپ اپنے مصحف کو جانتے اور سمجھتے ہیں اور ہم بہ یقین مانتے ہیں۔ ہاں بھی اپنے نامۂ اعمال کو خوب پہچانتا ہوں۔ آپ کا مصحف غلطیوں سے پاک و صاف ہے لیکن اس کے خلاف میرا نامۂ اعمال غلطیوں سے داغ دار ہے۔ ہاں عرض کرتا ہوں کہ میرا نامۂ اعمال آپ کا مصحف نہیں کہ جس میں غلطی کا امکان ہی نہیں۔ میرا نامۂ اعمال میری روز و شب کی ڈائری ہے۔ اس لئے مجھے اس کی صحت و عدم صحت پر کچھ کہنے کا پورا حق ہے اس لئے میں بھری عدالت میں عرض کرتا ہوں کہ یہ میری ڈائری ایک جگہ سے نہیں کم سے کم ہزار جگہ سے غلط ہے۔ داغ کے شعر میں ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجھ گنہگار کے نامۂ اعمال میں غلطیوں کے سوا اور ہو کیا سکتا ہے۔ اس میں غلطیاں اور غلط کاریاں زیادہ ہیں اور نیکیاں کم اور اتفاقی۔ اس لئے اس دستاویز کو نہ دیکھئے۔

داغ کے پیرایۂ بیان میں عدالت پر کسی بے اصولی کا الزام نہیں۔ فرشتوں کی دیانت و امانت پر الزام نہیں۔ ہتک عدالت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ صرف ایک باادب گزارش ہے۔ داغ اپنے نامۂ اعمال کو یہ کہہ کر کہ یہ مصحف نہیں، صرف اتنا ہی کہتے ہیں کہ اس کو صحت میں خدائی مصحف کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا جب اس میں میری نسبت سے غلطیوں کا امکان ہی نہیں بلکہ میری معلومات کی حد تک اس کی صحت یقیناً مشکوک ہے۔ تو ایسی مشکوک سند کی بنا پر جرم ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیوں کہ غلطیوں کا تو مجھے اعتراف ہے۔

(۲)

مرزا غالب فرماتے ہیں ؎

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک　　میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

مرزا داغ فرماتے ہیں ؎

یہ ہیں ہزار جگہ حشر میں پکار آیا　　کہ ادھر بھی کوئی مجھ سا گناہگار آیا

غالب اور داغ دونوں خود کو سب سے بڑا گناہگار بتا رہے ہیں۔ غالب کہتے ہیں کہ میں جب گناہوں کے سمندر میں کودا تو میں ڈوب تو کیا؟ میرے دامن کا کنارہ بھی تر نہ ہوا تھا کہ میں نے دیکھا کہ دریائے معاصی خشک ہو چکا تھا یعنی کوئی گناہ نہ تھا جو میں نے نہ کیا ہو۔ لیکن اس کے باوجود میں گناہگار ہی نہ ہوا تھا مجھے گناہگار بنانے کے لئے گناہوں کے سات سمندروں سے کام لیا گیا ہوگا تب کہیں جا کر میرا پورا دامن تو کیا صرف سرِ دامن یا دامن کا کنارہ تر ہوا تھا یعنی مجھے گناہگار کہا ہی نہیں جا سکتا۔ لفظی تناسبات کے لحاظ سے معاصی کو دریا کہنا اور

گناہ گاری کو تر دامنی کہنا معمولی بات نہیں ہے۔ معنوی حیثیت سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ گویا شاعر کہتا ہے کہ میرے موجودہ گناہ گناہ ہی نہیں اور میں بڑا گناہ گار نہیں۔ یہ محض ایک طرح کی خود فریبی ہے اور لفظی صنعت کاری۔

داغ دنیا کی بات نہیں کہتے آخرت کی بات کرتے ہیں۔ میدانِ حشر میں ایک جملہ میں ہزار جگہ پکار آنے کا ذکر کرتے ہیں کہ مجھے اپنے گناہ گار ہونے سے انکار نہیں بلکہ میرا تو دعویٰ یہ ہے کہ حشر میں اگر مجھ سے بڑا کوئی اور گناہ گار ہو تو سامنے آسکے۔ یعنی مجھ سے بڑا گناہ گار اور کوئی نہیں تو مجھے معافی بھی سب سے پہلے ملنی چاہئے۔ کہ مستحق کرامت گناہ گارانند

غالب ابھی ارتکابِ گناہ کے انکار و اقرار کی منزل ہی میں چکر لگا رہے ہیں اور داغ یومِ جزا میں گناہ کی سب منزلیں طے کرنے کے بعد گناہ گاری میں اپنی یکتائی کی دھوم مچا رہے ہیں۔

(۳)

غالب فرماتے ہیں ؎

نہ دے نامے کو اتنا طول "غالب" مختصر لکھ دے   کہ "حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جدائی کا"

داغ کہتے ہیں ؎

لکھیں جو اور کچھ تو ہماری مجال کیا   اتنا ہی لکھ کے بھیج دیا ہے "ترس گئے"

غالب اور داغ دونوں اپنے اپنے محبوب سے ملنا چاہتے ہیں۔ جو مدتوں سے بچھڑے ہوئے اور برسوں دور ہیں۔ غالب عرضِ تمنا کے لئے موقع کی نزاکت کے احساس کی بنا پر طولِ کلامی سے بچنے کے لئے مختصر سے مختصر لفظوں کا انتخاب کرتے اور عرضِ مدعا یوں کر رہے ہیں کہ "حسرت سنج ہوں۔ عرضِ ستم ہائے جدائی کا"۔

غالب نے عرضِ تمنا کے لئے جن الفاظ کا انتخاب کیا اور جس طرح ان کو ترتیب دیا ان میں شوق و بے تابی یا والہیت نام کو بھی نہیں۔

اس کے مقابلہ میں داغ زمان و مکان کی دوریوں کی ستم کاری ظاہر کرنے کے لئے صرف اتنا کہتے ہیں "ترس گئے"

دیکھ لیجئے کس کے لفظوں میں جادو ہے اور کس کا جذبۂ شوق بے تاب و بے کراں ہے۔ کیا "ترس گئے" کہہ کر داغ دوست کی دل نوازی اور اپنی بیتابی کا اس انداز سے نہیں اظہار کرتے کہ اس سے حسن خود اپنی اہمیت اور قدر شناسی کا احساس کر کے بے تاب ہو سکتا ہے۔

(۴)

غالب ؎

"شکل دہلی"

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

داغ ؎

داورِ حشر سے اب تک ہے امیدِ انصاف   کیا کریں گے جو پسند اس کی ادائیں آئیں

قاعدہ ہے کہ جب کوئی دوست اور عزیز سفر پر جانے کے لئے جدا ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے۔ "فی امان اللہ"۔ ہماری عورتیں کہا کرتی ہیں "خدا کی امان" "خدا کے سپرد"۔ "خدا کو سونپا"۔

غالب کہتے ہیں کہ جس عزیز کو میں خدا کو سونپنے کے لئے بھی تیار نہیں یا تو اس لئے کہ اس کی جدائی گوارا نہیں، یا نعوذ باللہ رقابت کا ڈر ہے۔ وہی عزیز ہم سے ایسا بے نیاز ہے یا ایسا بھولا بھالا ہے کہ ہمیں چھوڑ کر، مدعی کا ہم سفر ہے۔ دیکھئے انجام کیا ہو؟

اس شعر کی ساری خوبی خدا کو سونپنے اور مدعی کے ہم سفر ہونے میں ہے۔ کیونکہ ایسا شخص جس کے بارے میں خدا پر بھی بھروسہ نہیں ہو سکتا دشمن کا ہم سفر ہے۔ نتیجہ معلوم۔

داغ کہتے ہیں ہمارے محبوب کی ادائیں دلفریب، آدم فریب اور عالم فریب ہی نہیں، خدا فریب بھی ہو سکتی ہیں۔ یا تو یہ محبت بھرے دل کا جذباتی فیصلہ ہے جو غلط ہو سکتا ہے یا حقیقت پر مبنی ہے۔ بہرحال محب و محبوب، عاشق و معشوق دونوں کا معاملہ خدا کے حضور میں پیش ہونے والا ہے۔ خدا کے انصاف سے اُمید ہے کہ ہمیں داد ملے گی۔ لیکن ڈر ہے تو ایک ہی کہ اگر خدا کو بھی فریقِ ثانی کی معصومانہ ادائیں پسند آگئیں یعنی فریقِ ثانی کی بے گناہی ثابت ہو گئی تو ہم سے کچھ نہ بن پڑے گا۔ ہم بوجہ اپنی کوتاہی کے محبوب کے حضور میں بار پانے سے محروم کر دیئے جائیں گے۔

اس اندازِ بیان میں خوبی یہ ہے کہ خدا کو منصف تسلیم کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ہمیں محبوب سے شکایت ہے اور یہ واقعہ ہے کہ محب کو صرف بجا ہی نہیں بے جا بھی شکایت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ محب غلبۂ شوق کے زیرِ اثر چاہا کرتا ہے کہ بھول محبوب ہی کی نکلی۔ لیکن محب کو حاکم کے متعلق حق الیقین ہے کہ وہ بے لاگ منصف ہے۔ اس لئے اگر ہمارے ملزم محبوب کی وہ ادائیں جن کے ہم قتیل ہیں، مالکِ یوم الدین کے دربار میں معصوم قرار پا گئیں۔ تو ہمارا مطلب بر آنے کی کوئی اُمید ہی نہیں۔

داغ داورِ محشر کی طرف سے بدظن نہیں ہیں۔ انھیں محبوب کی اداؤں کی

معصومیت سے بھی انکار نہیں۔ انھیں ڈر ہے تو اپنے مقدمہ یا دعوے کی کمزوری کا کہ محبوب کی معصومیت خدائی عدالت میں ثابت ہو گی اور محبوب سے مہجور ہی رہیں گے۔

(۵)

لسان الغیب حضرت حافظ شیرازی فرماتے ہیں کہ :۔

شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل   کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا

حضرت مرزا غالبؔ دہلوی فرماتے ہیں کہ :۔

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز   گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفتہ است[1]

حضرت مرزا داغؔ دہلوی فرماتے ہیں کہ :۔

پابرہنہ، دشت ویراں، دور منزل، راہ سخت   تو بتا اے شامِ غربت میں کروں تو کیا کروں

اپنی اپنی جگہ تینوں شعر لاجواب ہیں۔ تینوں شعروں میں ناموافق حالات کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ مگر پہلے دونوں شعروں میں حافظؔ و غالبؔ اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتے کہ ان حشر ساماں حالات میں ان کی جدوجہد کس درجہ کی ہے یا پیش آمدہ مخالف حالات کا کیسے مقابلہ کر رہے ہیں۔ پہلے شعر میں حافظ کو اگر خیال آیا تو صرف اتنا کہ کنارے والوں کو کیا خبر؟ سوال یہ ہے کہ کشتی والے کیا کر رہے ہیں اور کنارے والے جنھیں سبک سار خیال کر رہے ہیں ممکن ہے کہ ان لوگوں کے بچانے کے لئے تدبیروں ہی میں لگے ہوئے ہوں۔

غالبؔ بھی دریا کی طوفانی حالت، وقت کی نزاکت اور وحشتناک کشتی کی شکستگی کے باوجود ناخدا کو خفتہ یا غافل کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں اور خود کشتی کے مسافروں کی حالت کیا ہے، اس کی طرف مطلق اشارہ نہیں کرتے۔ حالاں کہ افراد و اقوام کی زندگی میں ایسے ایسے لمحے آیا کرتے ہیں کہ سب وسیلوں سے منہ موڑ کر اپنے ہی دست و بازو پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ ایسی کسی مذبوحانہ حرکت ہی کا بھی غالبؔ کی طرف سے کوئی نشان نہیں ملتا۔

یوں بھی دیکھا جائے تو ناخدا سویا ہوا ہی تو ہے، مردہ تو نہیں، یہ دیکھنے والا یا بیدار مسافر اگر خود کچھ نہیں کر سکتا۔ مگر اسے ان نازک حالات کا شدید احساس ہے، تو وہ خفتہ ناخدا کو بیدار تو کر سکتا ہے۔ چارۂ کار تو خود اسی کے پاس ہے

اور اگر پایا ہی ہے تو ایسے کے لئے سطحِ زمین سے زیادہ زیرِ زمین اور سطحِ آب سے زیادہ زیرِ آب موزوں جگہ ہے۔

لیکن ان دونوں استادوں کے مقابلہ میں داغؔ دریا میں نہیں دشت ویران میں ہیں۔ دریا میں تیرا جا سکتا ہے۔ کشتی کی سواری تو موجود ہی ہے۔ کشتی ٹوٹ پھوٹ گئی ہے تو تختہ سے مسافر لپٹ سکتا ہے۔ لیکن بیابان میں سواری تو نہیں، مسافر صرف اپنے ہی پیروں یا سینہ یا سر سے کام لیتا ہے۔ نہ منزل کا دور دور پتہ ہے نہ کوئی ہم سفر ہے نہ کوئی پدرقہ ہے، نہ کوئی خفتہ و نیم خفتہ، بیدار یا نیم راہبر ہی ساتھ ہے جو کچھ کام آ سکے۔ تنہائی ہے اور صرف تنہائی۔ یعنی جو کچھ کرنا ہے آپ ہی کرنا ہے۔ ان سب مشکلوں کے باوجود مسافر کے دم خم یہ ہیں کہ اس نے سپراندازی نہیں کی۔ سوچ یہی رہا ہے کہ کونسی تدبیر ہے جس سے مجھے کام لینا چاہیئے اور شامِ غربت اور شبِ فرقت کو صبحِ وطن اور یومِ کامرانی و شادکامی میں بدل دینا چاہئے۔

(۶)

مرزا غالبؔ کہتے ہیں

یہ مسائلِ تصوّف، یہ ترا بیان غالبؔ   تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مرزا داغؔ کہتے ہیں

واقفِ رموزِ عشق و محبت سے داغؔ ہے   ملتا اگر تو پوچھتے کچھ اس ولی سے ہم

غالبؔ کہتے ہیں میرا بیان مسائلِ تصوّف کا بیان ہے۔ میں ولی بھی مان لیا جاتا اگر "بادہ خوار نہ ہوتا"۔ اگر غالبؔ کی "بادہ خواری" سے مراد وہی مےخواری یا عامیانہ زبان میں ٹھرّا بازی ہے۔ تو مسائلِ تصوّف کا بیان نری باتیں اور خالی لفظوں کا گورکھ دھندا ہے اور اگر بادۂ عشقِ الٰہی کی سرشاری ہے۔ تو حقائق حکمت و معرفت کا بیان حسبِ حال ہے۔ پھر ولایتِ غالبؔ کے تسلیم کرنے میں شک و ریب حقیقت کا انکار ہے۔

داغؔ کہتے ہیں کہ داغؔ عشق و محبت کے رموز سے واقف ہے۔ عشق و محبت کے رموز سے آشنائی کا نام ہی تصوّف ہے۔ کہنے والے کا یہ اعتراف ایک حقیقت کا اعتراف ہے۔ اس لئے داغؔ کا مقام شناس شخص کہتا ہے کہ اگر داغؔ ہم کو ملتا تو اس عشق و محبت کے ولی سے ہم بھی عشق و محبت یا تصوّف کا کوئی راز پوچھ لیتے غالبؔ حال و قال میں دو رنگی دکھاتے ہیں جو ان کی ولایت کی طرف سے سائل کو مشکوک کر دیتی ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں داغؔ کے ہاں یکرنگی ہے۔ اور یہی

---

[1] ایک شعر گرامی کا بھی قابلِ ملاحظہ ہے

شرارہ دشمن و رہ پیچ پیچ و منزل دور   عسس براہزناں یار و رہنما خفتہ است

(ادارہ)

بھروسہ اور اعتماد کئے جانے کی چیز ہے۔

(۷)

غالبؔ کا شعر ہے ؎

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے کہ خوش رہا ۔۔۔ یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

داغؔ کا شعر ہے ؎

عاشق کا ذرا سا دل تسکین ہی کیا اس کی ۔۔۔ جھوٹا ہو کہ سچا ہو وعدہ تو کیا ہوتا

غالب کے شعر کا مفہوم بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ میرا مطالبہ تو بڑا تھا مگر محبوب نے یا مقصد دالیہ نے میرے کسی مطالبہ پر مجھے دونوں جہان دے دیئے اور خود یہ سمجھ لیا کہ غالب کے خوش ہو جانے کے لئے یہ بہت کافی ہیں۔ مگر یا تو غالب کہتا ہے کہ دونوں جہان لے کر میرا مطالبہ تو پورا نہیں ہوا۔ مطالبہ کیا تھا؟ اس کی کوئی تصریح نہیں۔ رہی غالب کی خاموشی تو وہ اس کی رضامندی کی علامت نہیں۔ وہ تو محض اس لئے تھی کہ غالب کو اور مطالبہ کرتے ہوئے مطالبہ پر اصرار کرتے شرم آتی۔

کہا جا سکتا ہے کہ غالب کا مطالبہ وصالِ یار کا تھا۔ اور محبوب دونوں جہان دے کر اس کو اپنے حرم سے بھگا چھڑانا چاہتا تھا تو طالب صادق کے لئے صرف ایک ہی راہ کھلی تھی کہ شکریہ کے ساتھ دونوں جہان کا عطیہ قبول کرنے سے انکار کر دیا جاتا اور عرض کیا جاتا کہ حضور یہ لین دین کیا۔ ہم تو محض آپ کی ایک نگاہِ آشنایانہ کے طالب ہیں۔ غرض مانگنے والے کا مطالبہ ممکن ہے ہیژدہ ہزار عالم کا ہو یا محبوب کی ذات کا۔ لیکن دونوں جہان لے لینا اور خاموش رہ جانا ظاہر کرتا ہے کہ ذات کا مطالبہ نہ تھا۔ اگر ہوتا تو لفظ اس کا ساتھ نہیں دیتے۔

داغؔ کے ہاں معاملۂ عشق و محبت کے معاملات میں انتہائی شیفتگی کا ہے۔ داغؔ عاشق کے دل کو محبت اور محبوب کے معاملہ میں ذرا سا دل کہتے ہیں۔ اور مطالبہ بھی ایک عام کسے نہ ہیژدہ ہزار عالم کا۔ نہ ذات کا۔ نہ وصالِ ذات کا مطالبہ ہے بھی تو نہ فقط تسکین کہ محبوب اپنی زبان سے التفات کا وعدہ کرلے اور مطالبہ اتنا ہی ہے کہ وعدہ جھوٹا ہو یا سچا وعدہ کرے تو اتنے سے عاشق خوش ہو جائے گا۔

(۸)

غالبؔ ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی ۔۔۔ کچھ ہماری خبر نہیں آتی

داغؔ ؎

وہ دن کہ مجھے عالمِ بالا کی خبر تھی ۔۔۔ اے بے خبری! خاک نہیں اپنی خبر آج

غالب نے صرف اپنی حالت کا اظہار کیا ہے۔ کہ خود میں غافل ہوں، کب سے غافل ہوں؟ پہلے کیا تھا؟ اس کا کوئی مذکور نہیں۔ لیکن داغؔ اپنے ماضی و حال کی حالت کا موازنہ کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ یا تو کل اپنا یہ عالم تھا کہ ہمیں عالمِ بالا کی بھی خبر تھی۔ گویا ملائک تھے اور آج اپنی بے خبری کا یہ عالم ہے کہ خبر تو کیا خبر دینے والا بھی کوئی نہیں اور بے خبری کو بتایا جا رہا ہے کہ ہمیں اپنی بھی کوئی خبر نہیں۔ بے خبری سے اظہارِ بے خبری انتہائی بے خبری ہے۔

(۹)

غالبؔ فرماتے ہیں ؎

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا ۔۔۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

داغؔ فرماتے ہیں ؎

کمالِ عشق ہے اے داغؔ محو ہو جانا ۔۔۔ مجھے خبر ہی نہیں نفع کیا ضرر کیا ہے

غالب قطرہ کے دریا میں فنا ہو جانے کو "عشرتِ قطرہ" یعنی قطرہ کا نفع حاصل کرنا مانتے اور درد کے حد سے گزر جانے کو اس کا دوا ہو جانا یعنی درد کا فائدہ اٹھانا تسلیم کرتے ہیں یعنی قطرہ کی فنا اس کی عشرت ہے اور درد کا حد سے گزرنا درد کی دوا ہے۔ گویا دونوں کی فنا جو بظاہر فنا ہے درحقیقت دونوں کی عشرت اور دوا ہے۔ اس لئے دونوں فنا کو فنا سمجھ کر نہیں اپنی عشرت اور اپنے مرض کی دوا سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ اس حالت کو عشق کا کمال تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے خلاف داغؔ یہ کہہ کر ؎

کمالِ عشق ہے اے داغؔ محو ہو جانا ۔۔۔ مجھے خبر ہی نہیں نفع کیا ضرر کیا ہے

نفع و ضرر کے احساس سے بالاتر ہو کر صرف اتنا ہی مانتے ہیں کہ عشق کا کمال یہ ہے کہ عاشق راہِ عشق و شوق میں محو ہو جائے۔ اس محو ہو جانے میں کوئی نفع ہو سکتا ہے یا سراسر نقصان ہی ہے۔ یہ عاشق کے سوچنے کی چیز نہیں۔ مقامِ محویت کا حصول عشق کا کمال ہے عاشق کا نہیں۔ عاشق کا وجود عشق میں محو ہو چکا ہے۔ اس لئے عاشق کی تلاش عبث ہے۔ اگر عاشق کا کمال مانا جائے تو معشوق سے برتری کا خیال آ سکتا ہے۔ اور معشوق کی یکتائی کو یہ گوارا نہیں۔ لیکن عشق کا کمال حسن کے کمال کی دلیل ہے۔ اور یہ معیوب نہیں۔

(باقی آئندہ)

وجاہت علی سندیلوی

غالب کے چند قلم زدہ اشعار

بلاشبہ دیوانِ غالب ہماری ایک انتہائی مقبول اور محترم کتاب ہے اور اس کی قدرشناسی میں روز بروز جو اضافہ ہوتا جا رہا ہے وہ کسی دعوے یا بحث کا محتاج نہیں ہے بلکہ خود غالب کے اس خواب کی جیتی جاگتی تعبیر ہے کہ سے

کوکبم را درعدم اوجِ قبولے بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

بازار میں دیوانِ غالب کے بیسیوں اڈیشن ملتے ہیں لیکن بڑے تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ ان میں بیشتر اشعار اور مصرعوں کے جزوی رد و بدل سے قطع نظر بعض بہت اچھے اور معرکۃ آلارا اشعار نہیں ملتے۔ مثال کے طور پر صرف چند بہت مشہور اشعار لکھتا ہوں جو سب کے سب مشکل سے کسی ایک مطبوعہ دیوان میں نظر آتے ہیں حالانکہ یہ سب غالب ہی کے نام سے موسوم ہیں اور ان کے دیوان کے مختلف اڈیشنوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔

شکوۂ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کردیا (۱) غالب ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا
پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے (۲) رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا
اسد بسمل ہے کس انداز کا؟ قاتل سے کہتا ہے (۳) تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر
ہم بے خودیٔ شوق میں کر لیتے ہیں سجدے (۴) یہ ہم سے نہ پوچھو کہ کہاں ناصیہ سا ہیں
ہوں گرمیٔ نشاطِ تصوّر سے نغمہ سنج (۵) میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں
جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن (۶) از بسکہ تلخیٔ غمِ ہجراں چشیدہ ہوں
اہلِ ورع کے حلقہ میں ہرچند ہوں ذلیل (۷) پر عاصیوں کے زمرہ میں اک برگزیدہ ہوں
پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد (۸) ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں
نہ پوچھو حال اس انداز اس عتاب کے ساتھ (۹) لبوں پہ جان بھی آجائے گی جواب کے ساتھ
خدا کے واسطے پردہ نہ کعبے کا اٹھا واعظ (۱۰) کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

ان اختلافات کی ایک وجہ تو یہ سمجھ میں آگئی ہے کہ دیوانِ غالب کا جو ابتدائی انتخاب کیا گیا تھا اس میں رفتہ رفتہ مختلف ناشرین اپنی پسند اور اطلاع کے بموجب غیر منتخب کلام سے بعض اشعار بڑھاتے رہے ہیں۔ نظامی پریس اور مولانا حسرت موہانی کے مرتب کردہ اڈیشنوں میں ایسے اضافے بہت ملتے ہیں۔

دیوان کے انتخاب کے متعلق مولانا محمد حسین آزاد آبِ حیات میں یوں رقم طراز ہیں۔ "سن رسیدہ اور معتبر لوگوں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں غالب کا دیوان بہت بڑا تھا۔ موجودہ دیوان منتخب ہے۔ مولوی فضل حق صاحب اور مرزا خاں عرف مرزا خانی کوتوال شہر مرزا کے دلی دوست تھے۔ ہمیشہ باہم دوستانہ جلسے اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے۔ انھوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مرزا نے کہا کہ اتنا کچھ کہہ چکا اب تدارک کیا ہو سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ خیر ہوا سو ہوا انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا نے دیوان حوالہ کردیا۔ دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا۔ وہ یہی دیوان ہے جو کہ آج ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔" مولانا آزاد کی یہ بات نہ تو دل کو لگتی ہے اور نہ آسانی سے سمجھ میں آتی ہے۔ غالب ایسی منفرد اور خود نما شخصیت سے جو کہ ذوق اور مومن تک کو خاطر میں نہ لاتا تھا یہ توقع مشکل ہی سے کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے حسنِ انتخاب پر بھروسہ نہ کرکے خود اپنے دیوان کے انتخاب کا کام کسی دوسرے شخص کے سپرد کردے۔ غالب کا ایک شعر غلط شائع ہوجاتا تو مہینوں اور برسوں وہ ناشر اور کاتب کو معاف نہیں کرتے تھے۔ پھر بھلا وہ یہ کیسے برداشت کر سکتے کہ ان کا کوئی پسندیدہ شعر کوئی دوسرا شخص جو

ان کا بہت بڑا دوست اور مخلص ہی کیوں نہ ہوتا قلم زد کر دیتا اور وہ خاموش دم بخود دیکھا کرتے۔

خود مرزا غالب اپنے ایک خط میں یوں لکھتے ہیں۔ "قبلہ ابتدائے فکرِ سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا چنانچہ ایک غزل کا مقطع تھا ؎

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا   اسد اللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کئے۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کئے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دئے۔"

مولانا حالی نے اس مسئلہ پر ایک بالکل دوسرے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ "غالب کے دیوان میں کچھ ایسے شعر رہ گئے ہیں کہ اگر نکل جاتے تو بہت اچھا ہوتا اور اگر یہ رائے بعد از وقت نہ ہوتی اور غالب کو اس پر عمل کرنے کا موقع مل جاتا تو غالب کا دیوان بے مثل اور بے نظیر ہوتا۔" مولانا کا یہ مشورہ بہت پُر خلوص اور مناسب تھا لیکن اس کو پیش کرتے وقت وہ غالب کے قلم زدہ اشعار کو بالکل ہی فراموش کر گئے چنانچہ یہ مشورہ صرف نصف صداقت کا حامل ہے۔ یوں تو غالب کا دیوان اب بھی بے مثل اور بے نظیر ہے لیکن یقیناً اگر اس کے کچھ اشعار اور نکال دئے جاتے اور ساتھ ہی ساتھ اس میں سے نکالے ہوئے کچھ اشعار نہ نکالے جاتے تو اس کی لطافتوں اور بلندیوں میں اور بھی چار چاند لگ جاتے۔

دیوانِ غالب جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ (جس میں غالب کے قلم زدہ اشعار بھی درج ہیں) کا عام مروجہ انتخاب دیوانِ غالب سے مقابلہ کرکے بڑی حیرت ہوئی کہ آخر الذکر میں بعض لاجواب اور نادر اشعار یک قلم متروک کر دئے گئے ہیں۔ غالب کے بیان کے بموجب صرف "مضامین خیالی" والے اشعار نکال دئے گئے تھے۔ آزاد کے قول کے مطابق صرف مشکل اور عوام کی سمجھ میں نہ آنے والے اشعار خارج کر دئے گئے تھے لیکن قلم زدہ اشعار کی فہرست دیکھ کر بعض مقامات پہ تعجب اور افسوس ہوتا ہے کہ سنگ ریزوں کے ساتھ دو ایک نہیں بلکہ بہت کافی تعداد میں جواہر پارے بھی نکال کر باہر پھینک دئے گئے ہیں جس کو ایک انگریزی مثل کے تحت یوں کہا جا سکتا ہے کہ اکثر ٹب کے پانی کے ساتھ بچے بھی باہر پھینک دئے گئے ہیں۔

انتخاب کرنے والے نے بھی کیا ہو اس کے اولین مقاصد یہ رہے ہوں گے کہ عامیانہ شکستِ بندش مشکل اور مغلق مطالب کے اشعار دیوان سے علٰحدہ کر دئے جائیں لیکن قلم زدہ اشعار کو سامنے رکھ کر دیکھئے تو خود بقول غالب ؎

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے   ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہئے

مولانا حالی کی اس بہت معقول تجویز سے قطع نظر کہ معیارِ انتخاب کچھ زیادہ اونچا ہوتا اور کچھ اور اشعار نکل جاتے تو انتخاب اور نکھر جاتا۔ انتخاب سے بعض بہت بلند اور بے پناہ اشعار جن پر نہ صرف خود انتخاب بلکہ اردو زبان فخر کر سکتی تھی محذوف کر دئے گئے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر کس جذبے کے تحت اس قسم کے اشعار جو انتخاب کے بہت سے دیگر اشعار سے قطعاً کہیں زیادہ فصیح چست، دلآویز اور شاعرانہ نکتہ سنجیوں کے حامل تھے گردن زدنی قرار دئے گئے ہیں؟ اور دیوان سے بارہ پتھر باہر کر دئے گئے ہیں؟ اگر نسخۂ حمیدیہ شائع نہ ہوتا (کیونکہ اس کی اشاعت بھی محض ایک اتفاقی بات تھی) تو یقیناً ادبِ عالیہ کے یہ بیش بہا موتی ہمیشہ گمنامی کی تہہ ہی میں پڑے رہ جاتے۔ غالب نے ایک جگہ اپنے ایک خط میں کہا ہے کہ میں غلط زمانے میں پیدا ہوا ہوں اور ان کے کلام میں تو اس بات کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے مثلاً ع میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں یا ع کو کبم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است وغیرہ۔ لہٰذا ان اشعار کو قلم زد کئے جانے کی کوئی ایک معقول وجہ سمجھ میں آتی ہے تو یہ کہ غالب نے اپنی پسند سے نہیں بلکہ اس خیال سے کہ ان کے زمانے کے عوام ان اشعار کے صحیح مطالب نہیں سمجھ سکیں گے کسی وقتی جذبے کے تحت ان کو خارج کر دیا تھا۔ لیکن سچ پوچھئے تو یہ بھی کوئی جچی ہوئی سی بات نہیں معلوم ہوتی۔ بہر حال میں اس سلسلے میں نسخۂ حمیدیہ میں سے صرف چند مثالیں پیش کرکے ناظرین کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہوں:- ؎

شوخیٔ رنگِ حنا، خونِ وفا سے کب تک   آخر اے عہد شکن، تو بھی پشیماں نکلا

بہت خوب کہا ہے، اسی صنف کا مولانا محمد علی کا ایک مشہور شعر ہے ؎

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے   میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

———

ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار   سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل ناآشنا

کارخانۂ قدرت کی بے ترتیبی میں بھی بنیادی ربط کی طرف اشارہ کرنا بہت دور رس نگاہوں کا کام ہے۔ اس موضوع پہ پچھلے چند سالوں میں دفتر کے دفتر سیاہ کر ڈالے گئے ہیں۔ سائنس دانوں کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ کارخانۂ قدرت کے پیچھے ایک قادرِ مطلق طاقت اور دماغ کام کرتا نظر آتا ہے۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ قدرت کے عناصر بنیادی طور سے ایک دوسرے کے مخالف اور ضد ہیں اور ان کی ظاہری ترتیب محض اتفاقی اور صرف ایک عارضی بات ہے۔

اسدؔ ارباب فطرت قدر دانِ لفظ و معنی ہیں
سخن کا بندہ ہوں لیکن نہیں مشتاق تحسیں کا

بصورت تکلّف بمعنی تاسف   اسدؔ میں تبسّم ہوں پژمردگاں کا

اپنی پریشاں حالی کی کیا خوب مثالی دی ہے جو تعریف سے مستغنی ہے۔

لے وائے غفلت نگہِ شوق ورنہ یاں   ہر پارہ سنگ لختِ دلِ کوہِ طور تھا

وسعتِ رحمتِ حق دیکھ کہ بخشا جائے   مجھ سا کافر کہ جو ممنونِ معاصی نہ ہوا

اس شعر میں یہ لطیف طنز بھی پنہاں ہے کہ اگر رحمتِ حق نے ایک ایسے شخص کو بخش دیا کہ جس نے کوئی گناہ ہی نہیں کیا تھا تو اس میں کون سی خاص بات ہوئی۔ ع بخیلی ہے یہ رزّاقی نہیں ہے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ میرا ممنونِ معاصی نہ ہونا منکرِ رحمت کے مترادف ہے جو کہ صریحاً کفر ہے۔ رحمتِ حق کی وسعت ملاحظہ ہو کہ اس نے میرے ایسے کافر کو بھی بخش دیا۔

اسد یہ عجز و بے سامانیٔ فرعون توام ہے   جسے تو بندگی کہتا ہے دعویٰ ہے خدائی کا

فرعونیت اپنی انا کے سامنے ساری دنیا کو ہیچ سمجھتی ہے اور کسی سماجی اور اخلاقی پابندی کو نظر میں نہیں لاتی ہے۔ بالکل یہی کیفیت عجز و بے سامانی کی ہوتی ہے وہ بھی ہر قید و بند سے آزاد ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ فرعونیت اور بے سامانی اگرچہ متضاد نظر آتی ہیں لیکن درحقیقت مماثل ہوتی ہیں۔ دونوں ہی کی بنیاد خود غرضی اور نفسانیت پر قائم ہوتی ہے اور یہ ایک ہی جذبہ انانیت یا ہم چو من دیگرے نیست کے دو پرتو ہیں۔

علاوہ ازیں بندگی کی ایک قسم نفسانیت پر بھی قائم ہوتی ہے۔ دیکھنے میں تو وہ بندگی ہوتی ہے لیکن اپنے پندار کی وجہ سے وہ جذبۂ عبودیت کے بجائے جذبۂ فرعونیت کو تقویت پہنچاتی ہے ؎

عیب کا دریافت کرنا ہے ہنرمندی اسدؔ   نقص پر اپنے ہوا جو مطلع کامل ہوا

بہت خوب کہا ہے حق گفتی و در سفتی۔ عام لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ غالب نے اپنی عظمت کے زعم میں اپنے معترضین سے کچھ نہیں سیکھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ غالب کا آسان ترین کلام جس پر ان کی مقبولیت کی اساس قائم ہے ان کی مشکل گوئی کے معترضین ہی کی دین ہے۔

گل کھلے غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی   سرخوشِ خواب ہے وہ نرگسِ مخمور ہنوز

شاعر کے قلم پر مصوّر کے برش کو رشک آنے لگا ہوگا۔ انتہائی پُر کیف شعر ہے۔

لے اسدؔ خود ہم اسیرِ رنگ و بوئے باغ ہیں
ظاہراً صیّادِ ناداں ہے گرفتارِ ہوس

کتنی بڑی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ شاعر کا مشاہدۂ زندگی کس قدر فلسفیانہ اور دور رس تھا۔

رسیدن گلِ باغِ واماندگی ہے   عبث محفل آرائے رفتار ہیں ہم

انگریزی ضرب المثل ہے کہ سب راستے قبر ہی کی طرف جاتے ہیں۔ انسان اگر اپنی منزل کو صحیح طور سے سمجھ لے تو زندگی کے بیشتر تنازعات ختم ہو جائیں۔

تماشائے گلشن تمنائے چیدن   بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم

بے پناہ شعر ہے۔ انسانی زندگی کی تفسیر اس سے بہتر نہیں ہو سکتی کہ تماشائے گلشن تمنائے چیدن! ہر پیدا ہونے والا دنیا کو بڑے استعجاب سے دیکھتا ہے اور پھر کچھ کر ڈالنے کی تمنا دل میں لئے چلا جاتا ہے۔ شاعر خدا سے فریاد کرتا ہے کہ بس اتنی ہی سی بات پر ہم گنہگار ہو گئے!

نہ ذوقِ گریباں نہ پروائے داماں   نگاہ آشنائے گل و خار ہیں ہم

اسدؔ شکوہ کفرِ دعا ناسپاسی   ہجومِ تمنا سے لاچار ہیں ہم

دعا کو ناسپاس کہنا بڑا لطیف طنز ہے۔

نہیں معلوم کس جذبہ کے ماتحت یہ پوری غزل قلم زد کر دی گئی۔ غالباً انتخاب کے وقت یہ غزل غالب کے پیشِ نظر نہ ہوگی۔ ان کے لئے یہ بھی تو ایک مصیبت تھی کہ قدردانوں کی کثرت کی وجہ سے ان کے پاس اپنی غزلوں کے مسودے بہت کم ہی رہا کرتے تھے۔

ہیں چشمِ واکشادہ و گلشن نظر فریب   لیکن عبث کہ شبنمِ خورشید دیدہ ہوں

"شبنمِ خورشید دیدہ" کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ کتنا بہت دیکھنا ہے اور کتنی کم فرصت ہے۔

ہے طلسمِ دہر میں صد حشرِ پاداشِ عمل   آگہی غافل کہ یک امروز بے فردا نہیں

پاداشِ عمل کو صد حشر کہنا کمال نکتہ سنجی ہے۔ شاعر نے نفسیات کا جدید ترین اصول بیان کیا ہے کہ انسان کا ہر فعل بالنفسہٖ خود اپنی جزا یا سزا کا حامل ہوتا ہے۔

کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے   ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ

انسان کے باطن یا تحت الشعور کو ورقِ ناخواندہ یعنی لکھا ہوا تو ہے لیکن پڑھا نہیں جاتا کہنا اعجاز بیانی ہے۔ شاعر نے باوجود اس کے کہ جدید علم نفسیات نے

اس کے زمانہ میں اپنی موجودہ شکل اختیار نہیں کی تھی اس کا ایک بنیادی کلیہ بیان کیا ہے

نظر بہ نقصِ گدایاں کمال بے ادبی ہے — کہ خارِ خشک کو بھی دعویٰ چمن نسبی ہے

اخلاقیات کا ایک زریں اصول بیان کیا گیا ہے۔ اردو ادب کو اس قسم کے اشعار پر بجا طور سے ناز ہو سکتا ہے۔

خوشا وہ دل کہ سراپا طلسم بے خبری ہو — جنون و یاس و الم رزقِ مدعا طلبی ہے

مدعا طلبی یعنی خود غرضی اور نفسانیت ہی تمام پریشانیوں کی جڑ ہیں۔

ہم نشینی رقیباں گرچہ ہے سامانِ رشک — لیکن اس سے ناگوارا تر ہے بدنامی تری
رنگ ریزی لمسۂ گل ہے وضعِ زر افشاندنی — باج لیتی ہے گلستاں سے گل اندامی تری

نگہ معمارِ حسرت ہا چہ آبادی چہ ویرانی — کہ مژگاں جس طرف وا ہو کفِ دامانِ صحرا ہے

شاعر نے یہ حقیقتِ کبریٰ بیان کی ہے کہ انسان کی خوشی خارجی اسباب پر نہیں بلکہ داخلی اسباب پر مبنی ہوتی ہے۔ اگر نگہ حسرت زدہ ہے تو وہ ہر طرف حسرت انگیز ہی مناظر پیش کرے گی۔ یہ ایک انگریزی ضرب المثل بھی ہے۔

رشک ہے آسائشِ اربابِ غفلت پر اسدؔ — پیچ و تابِ دل نصیبِ خاطرِ آگاہ ہے

شاعر کی یہ تحقیق اب ایک انگریزی مقولہ بن چکی ہے۔ "ناواقفیت ایک نعمت اور واقفیت ایک غلطی ہے"۔

صبح سے معلوم آثارِ ظہورِ شام ہے — غافلاں آغازِ کار آئینۂ انجام ہے

ہندی، اردو اور انگریزی زبانوں میں تھوڑے سے تغیر کے ساتھ یہی بات ضرب المثل بن چکی ہے۔۔۔

مستعدِ قتلِ یک عالم ہے جلادِ فلک — کہکشاں موجِ شفق میں تیغِ خوں آشام ہے

شرکیب ہے کرڑی کمان کا تیر ہے۔

عجز و نیاز سے تو نہ آمادہ راہ پر — دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

کیا تیور ہیں۔ اپنی نوعیت کا بے مثل شعر ہے۔

نہ حیرت چشمِ ساقی کی نہ صحبت دورِ ساغر کی — مری محفل میں غالبؔ گردشِ افلاک باقی ہے

اپنی اجڑی ہوئی محفل کی کیا تصویر کھینچی ہے؟

زندانِ تحمل ہیں مہمانِ تغافل ہیں — بے فائدہ یاروں کو فرقِ غم و شادی ہے

جن لوگوں نے زندگی کے بنیادی حقائق کو پا لیا ہے وہ جانتے ہیں کہ غم و شادی محض عقل و نظر کے دھوکے ہیں۔

اوپر میں نے جو چند اشعار پیش کئے ہیں ان میں سے نہ تو کسی کو مہمل کہا جا سکتا ہے اور نہ مشکل اور کم و بیش ان میں سے ہر کوئی اپنی مستقل ادبی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ فہرست مکمل بھی نہیں ہے۔ ابھی ایسے اور بہت سے اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں۔ یہ اشعار مروجہ دیوان کے اشعار سے ہرگز پست نہیں ہیں بلکہ بعض تو ایسے لاجواب ہیں کہ ان کی ٹکر کے چند ہی اشعار منتخب دیوان میں بھی مل سکیں گے۔ پھر عقل کام نہیں کرتی کہ آخر یہ منتخب دیوان سے کیوں نکال دئے گئے تھے اور اس ناانصافی پر اب بھی کیوں عمل کیا جا رہا ہے۔ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ ان اشعار کو منتخب دیوان میں ان کی جگہ دی جائے اور مولانا حالی کے مشورے کے بموجب بعض اشعار موجودہ دیوان سے کم کر دئے جائیں تاکہ موجودہ دیوان کا معیار بھی بلند ہو جائے اور اس کے اختصار کی نزاکت بھی ختم نہ ہونے پائے۔

مظہر امام

غزل

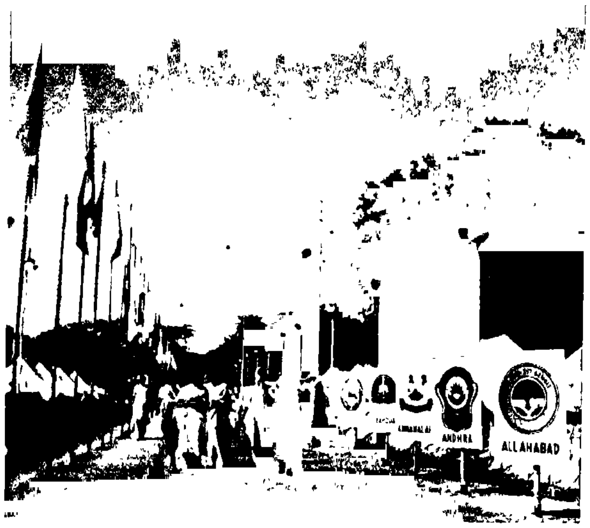
اب بھی پردے ہیں وہی پردہ دری تو دیکھو — عقل کا دعویٰ بالغ نظری تو دیکھو
سر پٹکتے ہیں کہ دیوارِ خمستاں ڈھا دیں — حضرتِ شیخ کی آشفتہ سری تو دیکھو
آج ہر زخم کے منہ میں ہے زبانِ فریاد — میرے عیسیٰ کی ذرا چارہ گری تو دیکھو
قیدِ نظارہ سے جلووں کو نکلنے نہ دیا — دوستوں کی یہ وسیع النظری تو دیکھو
اُن سے پہلے ہی چلے آئے جنابِ ناصح — میرے نالوں کی ذرا زود اثری تو دیکھو
ہے تغافل کہ توجہ انہیں کھلنے پاتا — حُسنِ معصوم کی بیداد گری تو دیکھو
جاوداں وصل کے لمحات ہوئے ہیں مظہرؔ
طائرِ وقت کی بے بال و پری تو دیکھو

دلّی میں نوجوانوں کا پانچواں سالانہ میلہ

بائیں اوپر - میلے کا دروازہ

بائیں نیچے - منی پوری رقص

نیچے - راجستھان کا بنجارہ ناچ









غزال اور غزال چشم

انتظار



بسوہلی فنِ مصوّری کے چند نمونے



نائکہ



راج نرتکی

دوتی اور نائکہ



نقشکار







دو مہاتما — گاندھی اور ٹالسٹائے ۔ اس عنوان سے خواجہ احمد عباس کا مضمون صفحہ ۲۹ پر ملاحظہ فرمائیں۔

نواب افضل الدولہ بہادر آصف جاہ پنجم

آپ کے بارے میں جناب مالک رام کا مضمون صفحہ ۴ پر درج ہے



خواجہ احمد عباس

دو مہاتما

گاندھی اور ٹالسٹائے

ماسکو کی اونچی اونچی عمارتیں سڑک کی ڈھلان کے پیچھے گم ہو جاتی ہیں۔ ہری ہری گھاس سے ڈھکے ہوئے نشیب و فراز کو پار کرتی سڑک چلتی رہتی ہے، چلتی رہتی ہے، یہاں تک کہ اونچے اونچے برچ کے پیڑوں کا جنگل آ جاتا ہے۔ مگر اس جنگل میں سے سڑک ایسے گزرتی ہے جیسے وہ سڑک نہ ہو بلکہ ایک اندھیری سُرنگ ہو۔ اور ایسا لگتا ہے کہ ہم وقت کے پہاڑ کا سینہ چیرتے ہوئے ماضی کی طرف جا رہے ہوں۔

اور پھر دفعتاً جنگل کا اندھیرا سورج کی کرنوں سے جگمگا اُٹھتا ہے۔ اب ہم اونچے اونچے پیڑوں کی اندھیری سرنگ میں سے ایک حسین وادی میں آ نکلتے ہیں۔

چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ، دھوپ میں چمکتا ہوا دریا کا پانی، ایک گہرا سناٹا، خاموش ماحول میں ہماری موٹر کی غیر متعلق آواز، ایک عجیب طلسمی سکون۔ مگر یہ موت کا سکون نہیں ہے۔ فطرت کے اس حسین پیکر میں زندگی کی نبض چل رہی ہے۔ نہیں یہ سکون نیند کا سکون بھی نہیں ہے۔ دریا کی سطح پر کرنیں ناچ رہی ہیں۔ پیڑ دھیرے دھیرے جھوم رہے ہیں۔ ہوا کے ہلکے جھونکوں کے ساتھ گھاس سرسرا رہی ہے۔ نہیں، فطرت سو نہیں رہی اور نہ اس پر خود فراموشی کا نشہ چھایا ہوا ہے۔ یہ طلسمی سکون روحانی سرگرمی سے بھرپور ہے۔ اس خاموشی میں بہت سی ابدی حقیقتیں اپنا اعلان کر رہی ہیں۔ فطرت ایک گہری سوچ میں کھوئی ہوئی ہے، جیسے کوئی مہان آتما سمادھی لگائے کائنات کے اہم ترین مسائل پر غور و فکر میں غرق ہو۔

ہم یاسنایا پولیانا کے گاؤں میں مہاتما ٹالسٹائے کے مکان کی زیارت کرنے آئے ہیں۔

وسیع باغ کے کونے میں ایک مٹی کا ڈھیر جس پر گھاس اُگی ہوئی ہے اور خود رو جنگلی پھول، نہ سنگ مرمر کی سِل نہ نام و تاریخ وفات کا کتبہ، نہ صلیب کا نشان "بریزا ہماغزیاں نے پڑھنے نے گئے"... یہ ٹالسٹائے کی قبر ہے...

ٹالسٹائے جو ایک امیر نواب کا بیٹا تھا، جس کو کاؤنٹ کا خطاب ملا ہوا تھا۔ جس نے اپنی لاکھوں کی جائداد اپنے غریب کسانوں میں بانٹ دی تھی۔

ٹالسٹائے جو دُنیا کے عظیم ترین ادیبوں میں شمار کیا جاتا ہے اور جس کے ناول "جنگ اور امن" War and Peace کے بارے میں نقادوں کا کہنا ہے کہ یہ دُنیا کا بہترین اور لافانی ادبی شاہکار ہے۔ اور جس کا ٹیکنی کلر فلم بنا کر ہالی وڈ کے ایک پروڈیوسر نے کروڑوں ڈالر کا منافع کمایا ہے۔

ٹالسٹائے جو عیسائی مذہب میں پیدا ہوا تھا اور جو حضرت عیسیٰ کا سچا پیرو تھا اور اُن کی طرح عدم تشدد اور امن کا حامی اور جنگ اور ظلم کا دشمن تھا ٹالسٹائے جس نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ اُسے ایک غریب کسان کی طرح کچی قبر میں دفن کیا جائے، اور اس پر پتھر کی ایک سِل بھی نہ رکھی جائے اور نہ ہی صلیب کا نشان لگایا جائے۔

مگر ٹالسٹائے جیسی مہان آتماؤں کی یادگار قائم کرنے کے لئے، سنگ مرمر کے مزاروں، مقبروں، سمادھیوں اور صلیبوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کی کچی قبر پر بھی کبھی شمع روشن نہیں کی جاتی۔ لیکن ٹالسٹائے نے اپنی زندگی اور اپنے ادب کے ذریعے انسانیت کی جن ابدی قدروں کو اُجاگر کیا وہ دُنیا کے کونے کونے میں اب تک روشنی پھیلا رہی ہیں۔ اور آج بھی نہ صرف ہزاروں روسی بلکہ سینکڑوں غیر ملکی بھی۔ چینی اور انگریز اور فرانسیسی اور جرمن اور جاپانی اور اطالوی اور عرب اور ہندوستانی۔ اس گاؤں میں آتے ہیں، اس باغ

میں گھومتے ہیں جہاں ٹالسٹائے ٹہل ٹہل کر غور و فکر کیا کرتا تھا۔ اس "غریبوں کے پیڑ" Tree of the poor تلے سستاتے ہیں جس کے سائے میں ٹالسٹائے اپنے کسانوں کو سماجی اور اقتصادی اُلجھنوں اور مسئلوں کو سلجھانے میں دوستانہ صلاح، مشورہ دیتا تھا۔

پھر وہ اس مکان کے کمروں میں سے ہوتے ہوئے اُس کمرے میں آتے ہیں جہاں ٹالسٹائے اپنا ادبی کام کیا کرتا تھا۔ اُس میز کو دیکھتے ہیں جس پر "جنگ اور امن" جیسے لازوال شاہکار لکھے گئے تھے۔ اُس میز کے سامنے دیوار پر الماری ہے۔ اور اس الماری میں آج بھی وہ کتابیں رکھی ہوئی ہیں جو موت سے چند روز پہلے ٹالسٹائے کے زیر مطالعہ تھیں۔ ان میں سے کئی کتابیں ہندوستان کے ویدانت فلسفے کے بارے میں ہیں۔ اور ایک گوتم بدھ کی سوانح حیات ہے اور اُس وقت دفعتاً ہندوستانی سیاح یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ کتابیں اور اُن میں لکھا ہُوا فلسفۂ حیات جس کا اتنا گہرا مطالعہ ٹالسٹائے نے کیا تھا، ایک سنہرا پُل ہے جو روس کے اس چھوٹے سے گاؤں کو ہندوستان کے فلسفہ و تہذیب کے مرکز دل سے جا ملاتا ہے۔ اور گو ٹالسٹائے بذات خود کبھی ہندوستان نہیں آیا لیکن مشترک روحانی اور اخلاقی قدروں کے اس پُل کے ذریعے وہ عمر بھر ہندوستان کی روح کے بہت قریب رہا۔

جنھوں نے گاندھی جی کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اہنسا اور ستیہ گرہ کی تشکیل میں وہ ٹالسٹائے سے بہت حد تک متاثر ہوئے تھے جنوبی افریقہ میں جب اُنھوں نے اپنا پہلا ستیہ گرہ آشرم قائم کیا تو اس کا نام 'ٹالسٹائے فارم' رکھا۔ ان دونوں میں برسوں تک خط و کتابت چلتی رہی اور یہ خطوط آج بھی ٹالسٹائے میوزیم میں محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ گاندھی جی کی تقریروں اور تحریروں میں بار بار ٹالسٹائے کے اعتقادات کے حوالے ملتے ہیں۔ ٹالسٹائے کی سو سالہ برسی کے موقع پر گاندھی جی نے ایک مضمون میں اپنے روسی دوست اور ہم خیال کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ یہاں میں اس مضمون کے چند اقتباسات پر اکتفا کرتا ہوں۔ گاندھی جی لکھتے ہیں،

"چالیس برس پہلے جب میں تشکیک اور بے اعتقادی کے ایک نازک دور سے گزر رہا تھا میں نے ٹالسٹائے کی کتاب پڑھی، جس کا عنوان ہے "خدا کی سلطنت خود تمھارے دل میں ہے" The Kingdom of God is within you اس وقت تک میں تشدد میں اعتقاد رکھتا تھا لیکن اس کتاب سے میں از حد متاثر ہُوا۔ اس کتاب کو پڑھنے سے میرے دل کے شکوک دور ہو گئے اور میں عدم تشدد کا قائل ہو گیا۔ مجھے ٹالسٹائے کی زندگی میں جس بات نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ جو کہتے تھے اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ اور اپنی تلاشِ حق کے لئے ہر قیمت ادا کرنے کے لئے تیار رہتے۔ مثال کے طور پر ان کی زندگی کی حیرت انگیز سادگی کو لے لیجئے۔ وہ پیدا ہوئے ایک امیر گھرانے میں، جوان ہوئے عیش و عشرت کے ماحول میں، جہاں کسی چیز کی کمی نہیں تھی، اور پھر بھی جب انھوں نے ایک بار اپنی اس زندگی کو خیر باد کہا، تو کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا....

"ٹالسٹائے اپنے زمانے کے سب سے سچے انسان تھے......

"وہ اس دور کے سب سے بڑے اہنسا وادی تھے...... ان کی زندگی سے ہم عدم تشدد کے فلسفے کے بارے میں بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں......

"ایک اور مسئلہ جس پر ہم ٹالسٹائے سے سیکھ سکتے ہیں وہ ہے محنت اور روٹی کا مسئلہ۔ ان کا کہنا تھا کہ دنیا میں اتنی غربت اور تکلیف اس لئے ہے کہ انسانوں کو ان کی محنت کا صلہ نہیں ملتا۔ وہ خیرات اور دان پُن کے بالکل قائل نہیں تھے۔ جو امیر غریبوں کی محنت مزدوری سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر خود عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور پھر اپنے ضمیر کو تسلّی دینے کے لئے دان پُن کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو وہ ڈھونگی اور ریاکار کہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب امیر اور رئیس طبقے کا بوجھ غریب محنت کشوں کی پیٹھ سے ہٹ جائے گا تب خیرات اور بخشش کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہے گی ....

"ٹالسٹائے کی زندگی کے یہ وہ روشن پہلو ہیں جن سے ہمارے نوجوان بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔"

یہ تو ہے گاندھی جی کی رائے ٹالسٹائے کے بارے میں، جس سے ہم ان دو عظیم شخصیتوں کے روحانی تعلق کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روسی ٹالسٹائے اہنسا کے ہندوستانی فلسفے کا قائل کیسے ہو گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ محبت، اخوت اور انسان دوستی

کے تصورات حضرت عیسیٰ کی اصلی تعلیم میں بھی پائے جاتے ہیں جس تعلیم پر بعد میں چرچ کے ٹھیکیداروں نے اپنی ریاکاری اور فریب کا ملمع چڑھا دیا تھا۔ لیکن عدم تشدد کا وہ تصور جو ٹالسٹائے نے پیش کیا وہ خالص ہندوستانی تھا۔ روسی مورخوں اور محققوں نے ٹالسٹائے کی زندگی کے بارے میں جو نیا مواد حال ہی میں شائع کیا ہے۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہنسا کے بارے میں ٹالسٹائے کی دلچسپی اور واقفیت ایک اتفاقیہ امر نہیں تھا۔ دراصل انھوں نے ہندوستان کے ویدانت کے فلسفے اور مہاتما بدھ کی تعلیمات دونوں کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔

ٹالسٹائے کی لائبریری میں ہندوستانی مذہب اور فلسفے کے بارے میں بیشمار کتابیں ملتی ہیں۔ انھوں نے سارے ویدوں اور اپنشدوں کو پڑھا تھا۔ ان کے بارے میں سوچا تھا اور ان کے بارے میں لکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وید اور اُپنشد دُنیا کی لازوال اور اہم ترین کتابوں میں سے ہیں۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ،

"ویدوں کے اشلوک اونچے خیالات اور پاکیزہ احساسات کا اظہار کرتے ہیں لیکن یہ اظہار اس سلیس انداز سے کیا گیا ہے کہ ہر پڑھے لکھے اور اَن پڑھ کی سمجھ میں آسکتا ہے۔"

ویدوں اور اُپنشدوں کے سینکڑوں مقولے اور اقتباسات ٹالسٹائے نے اپنے مرتب کئے ہوئے مجموعوں "دانشوروں کے مقولات" Thoughts of wise men اور "مطالعہ کی وسعتیں" Range of reading میں شامل کئے۔ اور اس طرح ویدانت فلسفے کا نچوڑ لاکھوں بلکہ کروڑوں روسی دماغوں تک پہنچ گیا۔

ویدوں کے علاوہ ٹالسٹائے مہابھارت اور رامائن سے بھی واقف تھے آج بھی یاسنایا پولیانا کی لائبریری میں رامائن کے فرانسیسی ترجمے کی جلدیں رکھی ہوئی ہیں۔ مہابھارت میں وہ بھگوت گیتا سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے تھے اس بارے میں انھوں نے لکھا ہے "میں بھگوت گیتا کے فلسفۂ عمل کا سو فی صدی قائل ہوں۔ انسان کی زندگی کا اوّلین مقصد یہی ہے کہ وہ اپنے فرض کی تکمیل میں مصروف رہے۔"

ان کے علاوہ ٹالسٹائے نے مہاتما بدھ کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ شنکر آچاریہ، راما کرشنا، سوامی وویکانند، اور دوسرے پُرانے اور نئے فلسفیوں کو پڑھا تھا۔ ماہنامہ ویدک میگزین جو کانگڑہ سے نکلتا تھا اس کے وہ مستقل خریدار تھے اور درجنوں ہندوستانی فلسفیوں، ادیبوں، اخبار نویسوں، سیاسی اور سماجی رہنماؤں سے اُن کی خط و کتابت تھی۔ آج بھی ان خطوں کے پلندے ٹالسٹائے میوزم میں رکھے ہوئے ہیں۔ اور ان میں آپ مدراس، کلکتہ اور بمبئی کے علاوہ، بنگلور، مراد آباد، گورداسپور اور گوروکل کانگڑی سے آئے ہوئے خط دیکھ سکتے۔ لیکن ان خطوں میں سب سے اہم خطوط وہ ہیں جو جنوبی افریقہ سے گاندھی جی نے ٹالسٹائے کو لکھے تھے۔ ضرورت ہے ان خطوں کو یکجا کرکے شائع کیا جائے تاکہ ٹالسٹائے اور گاندھی کے خیالات کس طرح اور کس حد تک ایک دوسرے پر اثر انداز ہوئے، اس کا صحیح اندازہ کیا جاسکے۔

گاندھی جی عمر میں ٹالسٹائے سے بہت چھوٹے تھے۔ اور ان کے خطوط کا بڑا ہی مودبانہ لہجہ ہے۔ ایک خط میں وہ لکھتے ہیں "میں آپ کا ادنیٰ شاگرد ہوں" یہ ۱۹۱۰ء کا واقعہ ہے جب گاندھی جی جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے حقوق کے لئے ستیہ گرہ کی ابتدا کر رہے تھے انھوں نے اپنا پمفلٹ "ہندوستانی قومی حکومت" Indian Home Rule ٹالسٹائے کو بھیجا تھا۔ اُس کی رسید میں ٹالسٹائے نے لکھا "پیارے دوست۔ تمہارا خط اور کتاب ملی، جو میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھی۔ مجھے تمہارے نقطۂ نظر سے پورا اتفاق ہے اور تمہاری جدوجہد سے پوری ہمدردی ہے۔" برسوں بعد ٹالسٹائے کی بیٹی گاندھی جی سے ملیں اور اُن سے کہا "میرے والد آپ کے بڑے مداح تھے اور اکثر آپ کا ذکر کرتے تھے۔ اور آپ کے اور آپ کی تحریک آزادی کے بارے میں سوچتے تھے۔"

ٹالسٹائے اور گاندھی۔ دو مہان آتمائیں۔ ایک روسی اور ایک ہندوستانی۔ ایک ادیب جس نے سیاسی اور سماجی جدوجہد میں عوام کا ساتھ دیا۔ ایک سیاسی رہنما جس نے اپنی قوم کی آزادی کے لئے جان دے دی۔ دونوں نے اپنے ذاتی مفاد کو عوام کے لئے قربان کیا دونوں نے اپنی زندگی میں سادگی اور فقر کی مثال قائم کی۔ ان کی دوستی اور ہم خیالی میں روس اور ہندوستان کے عوام کی دوستی اور اتحاد کا پیغام ہے۔

مہاتما گاندھی ٹالسٹائے کے فلسفۂ حیات سے متاثر ہوئے۔ اور خود ٹالسٹائے نے ہندوستانی فلسفے کے مطالعے سے اپنے فلسفۂ حیات اور اپنی عملی زندگی کی تشکیل کی۔ جیسے بدی اور شر کا ایک شیطانی چکر (Vicious Circle) ہوتا ہے، اسی طرح نیکی اور علم اور انسان دوستی کا بھی ایک لامتناہی سلسلہ ہوتا ہے۔ مہاتما ٹالسٹائے اور مہاتما گاندھی اسی سلسلہ کی دو کڑیاں تھے۔ آج وہ دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کے خیالات، محسوسات، ان کی لازوال تخلیقیں، ان کی قربانیوں کی مثالیں ہمارے پاس ہیں اور یہ وہ انسانی سرمایہ ہے جس میں ہندوستان کے عوام اور روس کے عوام ہی نہیں، ساری دنیا کے عوام حصہ دار ہیں۔

علی عباس حسینی

اختر علی تلہری کا تنقیدی شعور

اختر علی صاحب تلہری میرے مخلص دوستوں میں سے ہیں۔ میں نے اُن کو بہت ہی قریب سے دیکھا ہے۔ بارہ برس ہم نے ایک ہی کالج میں تعلیم وتدریس کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ سالہا سال ہم ایک ہی مکان میں ہم نوالہ وہم پیالہ رہے ہیں اور تیس برس سے زائد ہوئے ہیں کہ ہم ایک دوسرے سے اکثر ادبی و فلسفیانہ مسائل میں متفق الرائے رہے ہیں اور ہمارے فروعی اختلافات ہمارے اصولی اتفاقات کو متزلزل نہ کرسکے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں مجھے اختر علی صاحب کی کسی کتاب کے متعلق اظہارِ خیال کرتے جھجک سی محسوس ہوتی ہے۔ دنیا سمجھے گی دوستی کا پاس کیا۔ لوگ کہیں گے جنبہ داری کر گئے۔ لیکن کیا ادبی و علمی بحثوں میں بھی دوستی و دشمنی جیسے جذبے کارفرما ہوتے ہیں؟ کیا حقیقت کا اظہار ایک فریضہ نہیں؟ کیا حق کا چھپانا ایک گناہ نہیں؟ اور تقریباً چالیس برس سے علم وادب کی خدمت کرنے کے بعد مجھے اتنا تو حق ملنا ہی چاہیئے کہ جب میں خدالگتی کہوں تو مجھے صادق اللہجہ سمجھا جائے اور مجھ پر ایک حد تک اعتبار کیا جائے اس لئے ایک ایسے طالب علم کی پوری ذمہ داری کے ساتھ جس نے سب کا کلام دیکھا ہے، جس نے سرسید، آزاد، حالی، شبلی، نذیر احمد، ذکاء اللہ، محسن الملک سارے اساطینِ نثر اُردو کے افادات وتصنیفات کا بغور مطالعہ کیا ہے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اختر علی تلہری میں وہ تمام صفات بہ جامعیت موجود ہیں جو انہیں ان عمادِ ادب کے پہلو بہ پہلو لا بٹھاتی ہیں۔ افسوس ہے کہ سرکاری ملازمت کی پابندیوں نے، نیز اُن کی بے ریا طبیعت کی بے پروائیوں نے ان کے علمی و ادبی مقالات کو کتابی صورت میں جمع کئے جانے کا موقع نہ دیا۔

پروفیسر مسعود حسن صاحب ادیب کی ادب نواز و جوہر شناس نظروں کے ہم شکر گزار ہیں کہ تلہری صاحب کے چند ادبی مضامین پہلی بار "تنقیدی شعور" کے نام سے مجتمع ہو کر ہمیں دستیاب ہو رہے ہیں۔ جن بارہ مضامین پر یہ کتاب مشتمل ہے۔ اُن میں سے پانچ مضامین الگ الگ موضوعات کے حامل ہیں۔ لیکن سات مضامین اُردو میں "ترقی پسندی" کے علامات مرض، اور اُس کی تشخیص وعلاج سے مخصوص ہیں۔

"ترقی پسندی" کیا شے ہے۔ اس کے صحیح مفہوم کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے اس لئے کہ یہ بندۂ ناچیز بھی اس کے اس وقت کے سب سے پہلے منشور پر دستخط کرنے والوں میں سے ہے جب کہ وہ اشتراکیت کی مخصوص ملکیت نہ بنی تھی اور سرکاری ملازم اسے ادبی کی جگہ سیاسی تحریک تسلیم کر کے اس سے قطع تعلق پر مجبور نہ ہو گئے تھے۔ ہمارے نزدیک ترقی پسندی ادب وعلم کے صالح اقدار کو فروغ دینا اور آگے بڑھانا تھا، ادب کو زندگی سے ہم آہنگ بنانا تھا اور دنیا کو پیغام امن وآشتی، مساوات وانسانیت سنانا تھا۔ اور اگر سب سے پہلے ریزولیوشن کو جو رفاہ عام لکھنؤ میں پریم چند کی صدارت میں پاس کیا گیا تھا۔ بغور دیکھا جائے تو اس کا لبّ لباب بھی یہی نکلے گا۔ اسی کانفرنس کی بنا پر مصنّفین وناقدین وشعراء کی وہ انجمن وجود میں آئی جس کی شاخیں ہندوستان کے گوشے گوشے میں ہر زبان میں آج قائم ہیں۔ اُردو کی شاخ کے ساتھ یہ ظلم ہوا کہ ایک تو اسے ایک خاص سیاسی نقطۂ نظر کے لوگوں نے ہتھیا لیا۔ دوسرے اس طرح کے نوجوان اس میں بکثرت شامل ہو گئے۔ جو ہر طرح کی پابندی کو خواہ مذہبی ہو یا اخلاقی اختساب سے موسوم کرتے تھے اور جو اعتدال واحتیاط پر بھی "قدامت پسندی" کا نام دھرتے تھے۔ ان لوگوں نے ایک خاص سیاسی نظریہ کو ترقی پسندی کا جزو لاینفک قرار دے دیا۔

اور اپنے مزعومہ تعصبات سے بغاوت کے جوش میں عریانی و فحاشی کو بھی ترقی پسند کلام کے محاسن میں داخل کر دیا۔

اختر علی صاحب جو مجسّم اعتدال و عقلیات ہیں۔ بھلا ایسے موقع پر کہاں خاموش رہ سکتے تھے۔ اُن کی عربی تعلیم، ان کا رچا ہوا فلسفیانہ ذوق، ان کا مفکّرانہ انداز نظر، اور استدلال و استقراء میں اُن کی مہارت انھیں اس عامیانہ روش کو برداشت کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ وہ رزمگاہ بحث و انتقاد میں شمشیر قلم لے کر کود پڑے اور حقیقت یہ ہے کہ جس پامردی سے وہ اس محاذ پر تنہا تقریباً پچیس سال سے ڈٹے رہے ہیں اس کی داد دینا سخت ترین ناانصافی ہو گی۔ اس کتاب کے سات مضامین اسی جنگ نقد و نظر کی یادگار ہیں۔ یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ اب یہ بحثیں پُرانی ہو گئیں۔ ترقی پسند انجمنوں کا تو وہ نظریہ نہ رہا جو اب سے پہلے تھا۔ اب انھوں نے بھی ؎

آنچہ دانا کند کند ناداں　　لیک بعد از خرابیٔ بسیار

کے مصداق اپنے بہت سے پہلے مزعومات سے دست کشی کر لی۔ اس لئے ان مقالوں کو کتابی صورت دینے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ لیکن مری عرض ہے کہ ادبی بحثیں پیٹنٹ دواؤں کی طرح کبھی پُرانی نہیں ہوتیں۔ اس لئے کہ وہی غلطیاں جو نوجوانوں کے ایک گروہ سے ارتکاب میں آ چکی ہیں، وہی ان کے بعد آنے والی نسلوں کو بھی پیش آ سکتی ہیں۔ اس لئے امراض کے علاج کی طرح اغلاط سے احتراز کے نسخے بھی تیار موجود رہنا چاہئیں، اور "تنقیدی شعور" کا مجموعہ اسی فریضہ کو ادا کرتا ہے۔

ان مبارزاتِ ادبی کے سلسلے میں حضرت مجنوں گورکھپوری کا ایک منقول ٹکڑا دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ مجنوں صاحب نے مارکس کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ:۔

" اس کا یہ کہنا بہت صحیح ہے کہ فلسفہ اور ادب دونوں صدیوں تک دنیا کی یا تو بجنسہٖ تصویریں پیش کرتے رہے ہیں یا اس کی تاویلیں کرتے رہے ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ دنیا پر تنقیدی نظر ڈالی جائے اور اس کو بدلا جائے اور بہتر سے بہتر بنایا جائے۔"

جناب مجنوں کے منقولہ ٹکڑے میں " اس کا یہ کہنا بہت صحیح ہے " اس عام غیر مفکّرانہ روش کی بہترین مثال ہے جو اختر علی صاحب کی منطقی و استدلالی ذہنیت کو نبرد آزمائی پر اُکساتی اور اُبھارتی ہے وہ "من قال" کے نہیں "ما قال" کے قائل ہیں محض مارکس کے احترام کی وجہ سے وہ اس کے قول پر نظر غائر ڈالنے سے ترک نہ سکتے تھے۔ اوّل تو انھوں نے مارکس کی تصنیفات کی چھان بین کر کے یہ بات ثابت کی کہ مارکس نے یہ بات محض فلسفے کے لئے کہی ہے اور ادب کے لئے نہیں کہی ہے۔ پھر اس ارشاد مارکس کی استدلالی کمزوریوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ مجھے بھی سخت حیرت ہے کہ جناب مجنوں جیسے فہیم ادیب نے مارکس کے اس قول کو "بہت صحیح" تسلیم کر لیا ہے۔ یونانی، چینی ہندی، عربی، انگریزی، فرانسیسی اور جرمن فلسفیوں کے جو نظریات ہم تک پہنچے ہیں انھیں زندگی کی تاویل یا تصویر کہنا قطعی طور پر خلافِ عقل ہو گا۔ کیا سقراط کے مباحث زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے نہیں تھے۔ کیا افلاطون نے اپنی "جمہوریت" لکھ کر ایک تعمیری کوشش نہیں کی تھی۔ کیا منو کا شاستر اور چانکیہ کا ارتھ شاستر ایک نئے نظام کو وجود میں لانے کی سعی نہیں۔ کیا کنفیوشس، ارسطو، ہیگل، اسپنوزا، فارابی، بوعلی سینا، برگساں، لاک اور کانٹ نے ایک بہتر دنیا کا خواب نہ دیکھا تھا اور انھوں نے انسانیت کو فروغ دینے کی کوشش نہیں کی۔ کیا دنیا کے سارے مذاہب ایک فلسفیانہ نظریۂ حیات کے علاوہ کچھ اور ہیں۔ سارے مذاہب اس جادے کے بتانے کے مدعی ہیں جن پر چل کر ہم حیاتِ دائمی حاصل کر سکتے ہیں۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ مذاہب نے معاش سے زیادہ معاد پر زور دیا ہے۔ مارکس ایک اقتصادی فلسفی کی حیثیت سے معاش کو زیادہ اہم قرار دیتا ہے۔ اور ایک مادّی کی طرح حیات بعد الممات کے مسائل کو ترک کر کے صرف اسی زندگی کے مسائل کے حل پر زور دیتا ہے۔ مہاتما بدھ نے بھی سارے مابعد الطبیعیاتی مسائل کی بحث سے گریز کیا تھا۔ ان کا موضوع بحث بھی صرف انسانی زندگی تھا۔ لیکن ان کے ہاں ہمارے دکھوں کا علاج مادّی نہیں روحانی تھا۔ مگر دوا کے اختلاف کی وجہ سے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ آج تک مرض کا علاج ہی نہیں تجویز کیا گیا۔ اسلام اس کا مدعی ہے کہ اس نے معاد و معاش دونوں کے لئے صحیح راستے بتلائے ہیں۔ اس کی دعوت کو قبول کرنا یا نہ کرنا دوسری بات ہے۔ اگر اسے زندگی کی عکاسی اور تاویل کہنا اسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا جس طرح مارکس کے سیاسی نظریات سے اختلاف کے باوجود یہ کہنا کہ اس نے زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کا کوئی طریقہ ہی نہیں بتایا یہی حالت مارکس سے پہلے کے ان سارے ادب پاروں کی ہے جنھیں ہم آفاقی کہتے ہیں۔ ہومر کی اڈیسی اور ایلیڈ، دانتے کی انفرنو، شیکسپیر کے ڈرامے، بیکن

کہ مثلاً بے والیٹر، کنہ، ہیوگو، روسو کی تصنیفات، رومی کی مثنوی، فردوسی کا شاہنامہ، سعدی کی گلستاں، خود ہندوستان کے اپنشد سے لے کر کالی داس کی شکنتلا، وتلسی داس کی رامائن تک وغیرہ وغیرہ مختلف ملکوں اور زبانوں کا پائندہ ادب سب ترقی پسند ہے۔ سب انسانیت کو فروغ دینے والا ہے۔ تعجب ہے کہ جناب مجنوں نے مارکس کے اس قول کو کیوں کر "بہت صحیح" تسلیم کر لیا۔

اختر علی صاحب نے اس مجموعے میں اس طرح کی نہ جانے کتنی سخن گسترانہ باتیں ہیں جو ہمارے منکر ادیبوں کے غور و فکر کی مستحق ہیں۔ اور جن سے مزعومہ ترقی پسند خواہ مجروح ہوتے ہوں مگر ترقی پسندی کسی طرح مجروح نہیں ہوتی اس لئے کہ انہوں نے جن خیالات کا اظہار "شاعری کے نئے رجحانات" کے سلسلے میں کیا ہے۔ وہی ترقی پسندی کا صحیح جادہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

"نئی شاعری کے حامیوں کو البتہ اسے بھولنا نہیں چاہئے کہ شاعری کے ان نئے رجحانات سے اختلاف رکھنے والوں میں وہ لوگ بھی ہیں جو نئی تحریکوں کا خیر مقدم کرنے کو تیار رہتے ہیں مگر سوچ سمجھ کر۔ ان نئے رجحانات پر ایمان لانے سے پہلے وہ ان کی حقیقی افادیت پر نظر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ رجحانات کن مادی و تاریخی حالات کا نتیجہ ہیں وہ انھیں نظر انداز نہیں کرنا چاہتے۔ البتہ وہ انھیں سامنے رکھنے کے بعد ان کے نتائج کی نفع بخشی کے پہلو پر بھی غور کر لینا ضروری سمجھتے ہیں۔"

مظہری کے نزدیک زندگی کی کچھ مستقل قدریں ہیں اور حقیقی شاعری تمام طور سے اپنی عمارت انھیں کی بنیادوں پر کھڑی کرتی ہے:

"حقیقی شاعر زندگی کی مستقل قدروں کا پجاری ہوتا ہے "ترقی پسند ادیب "مستقل حقیقتوں" کے قائل ہوں یا نہ ہوں لیکن انسان کے حیاتی نظام پر جن کی گہری نگاہیں ہیں، وہ ان کے وجود سے انکار نہیں کر سکتے۔ اس ہر آن بدلتی ہوئی دنیا میں، اس ہر لحظہ نئی شان سے جلوہ گر ہونے والی کائنات میں کچھ مستقل حقیقتیں بھی ضرور ہیں۔ مستقل حقیقتوں کا مطلب صرف اتنا ہے کہ ان کی تغیر پذیری پر اب تک کا تجربہ مہر تصدیق ثبت کر چکا ہے اور جس کی بنیاد پر آئندہ کی غیر تغیر پذیری کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔ ایک وقت تک کے لئے" جب تک کہ یہ "حیاتی نظام" موجود ہے۔

"انسانی جذبات و احساسات میں آفرینش سے اساسی جذبے ہیں۔ اُن میں اشتراکی و غیر اشتراکی، نازی، فسطائی، استبدادی، جمہوری، پُرانے اور نئے سب یکساں طور پر شریک ہیں۔ مقام و زمانہ کے اثر اور دوسرے مدنی و معاشرتی دباؤ کی وجہ سے اُن کی ظاہری شکلیں بدل سکتی ہیں۔ اُن میں جزئیاتی تغیر ہو سکتا ہے۔ مگر اُن کا باطن اور اُن کی کلیاتی حیثیت نہیں بدل سکتی۔ کوئی عزیز دوست اگر ہمیشہ کے لئے بچھڑ جاتا ہے تو دل غم و الم کے جذبات کا گہوارہ ہی بنتا ہے۔ جذبے کی شدت و ضعف کے توازن سے اس کے خارجی آثار کا ظہور بھی شدت و ضعف اختیار کرتا ہے۔ زمانے کا تغیر، تمدن کا تغیر، جغرافیائی حالات کا تغیر اس جذبے اور اس کے خارجی مظاہر کی آفرینش میں کوئی تغیر پیدا نہیں کرتا۔ اگر انسانی زندگی کے مختلف شئون و حالات پر نظر کی جائے گی تو اس قسم کی مستقل حقیقتوں کی ایک دنیا نظر آئے گی جس سے شاعری اپنے کو موقع و محل کی مناسبت سے وابستہ کر کے استقلال و آفاق گیری کی مالک ہو سکتی ہے۔"

اسی سلسلے میں "موجودہ ادیبوں اور شاعروں سے آزاد ہندوستان کا مطالبہ" ترقی پسند و تعمیری ادب کی پوری پوری نمائندگی کرتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"متوازن انسانی ارتقا وانھیں تحریکوں سے حاصل ہو سکتا ہے جو اپنے بنیادی عناصر کے لحاظ سے امن پسند اور صلح جو ہوں اور موجودہ دراز دست سرمایہ داری، تباہ کن رجعت پسندی، خون آشام فرقہ واریت اور فتنہ انگیز قومیت کی بربادیوں کا سلسلہ ایسے ذریعوں سے روکنے کی کوشش کریں جو غارت پسند نہ ہوں۔ ایسے ہی پُرامن وسیلوں کے راستے پر جو انقلاب چلے گا وہ ہمارے سماج کے لئے ہمہ رُخی ترقی کا سامان ہوگا۔ امن و آشتی کے سائے میں نشو و نما پانے والا انقلاب یا ارتقاء جو چاہے کہئے آہستہ خرام سہی، بے ہنگامہ تیز سہی، مگر یہی وہ انقلاب جو ہمارے سماج کی کراہیں، ہمارے معاشرے کے دُکھ درد دُور کرے گا اور ہمارے لئے مستقل آسائشوں کے دروازے کھولے گا۔ ...

کاش کہ ہمارے شاعر اور ادیب انسانیت دوستی کے فلسفے کی

مدح اپنا لیں اور اس کی نرم آمانہ اپنے شعر و ادب کے نتیجے ہیں تو لطیف ترقی سے تحلیل کریں۔"

اب اگر یہ ترقی پسندی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ ممکن ہے کہ آپ اسے "مارکسزم" نہ کہیں۔ اسے "گاندھی ازم" اور "جواہر ازم" کہیں مگر میری ناقص رائے میں اسی متوازن انسانیت دوستی کی ادبی تبلیغ سب سے بڑی ترقی پسندی ہے۔

وہ مضامین بھی جو ادبی مجادلوں سے خالی ہیں، معیاری اور وزنی ہیں۔ مثلاً "تخلیقی ادب اور تنقیدی ادب" "موجودہ ادیبوں اور شاعروں سے آزاد ہندوستان کا مطالبہ" "چکبست ایک انشا پرداز کی حیثیت سے" اور "صفی لکھنوی کی نظم نگاری" تلہری صاحب کی شگفتہ طرزِ نگارش، دقتِ نظر اور وسعتِ مطالعہ کی پاکیزہ مثالیں ہیں۔ ان کی طرزِ تحریر کی خوبیاں خواجہ اطہر حسین صاحب نے بجا طور پر یوں بیان کی ہیں:

"ایک اچھے انشا پرداز کی حیثیت سے تلہری نے ایک انفرادی اسلوبِ بیان اور طرزِ تحریر کو اس طرح اپنا لیا ہے کہ اگر کسی مقالے یا مضمون پر ان کا نام نہ بھی درج ہو تو بھی پڑھنے والے بلا تامل جان لیتے ہیں کہ یہ تحریر کس کی ہے۔ اس تحریر میں پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ تلہری کی عبارت کسی مقام پر گنجلک نہیں ہوتی۔ قاری کو ان کے صحیح مفہوم تک پہنچنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا کرنا نہیں پڑتا۔ دوسری خصوصیت قدم قدم پر مناسب اور برمحل استعاروں اور تشبیہوں کے ذریعہ مطالب کو واضح کرنے اور عبارت کو شگفتہ اور رنگین بنانے کا ایسا خوشگوار سلیقہ ہے جس کی وجہ سے، فراوانی کے باوجود، تلہری کی انشا پردازی میں ان محاسنِ کلام کی موجودگی بالکل فطری اور غیر ارادی رہتی ہے۔ ایک اور نمایاں خصوصیت اندازِ بیان کی مسلسل متانت اور سنجیدگی ہے۔ جس میں کہیں کہیں طنز کی ہلکی سی چاشنی بھی ہوتی ہے۔"

تلہری بحیثیت انشا پرداز کے صاحبِ طرز کہے جا سکتے ہیں۔ ان کے اشہبِ قلم کی جولانیاں ادبی آویزشوں میں خاص طور سے نمایاں ہوتی ہیں۔ مگر بقول خواجہ صاحب ان کی "عبارت کا معیار ہمیشہ بلند اور عالمانہ ہوتا ہے" ان کے اسلوبِ طرز کی طرح ان کی عقلیت پرستی و اعتدال پسندی ایک مینارِ روشنی کی مانند ہمیشہ ضیا پاشی کرتی رہتی ہے۔ وہ حریتِ فکر کے قائل ہیں۔ لیکن وہ نظریے اور مسئلے کو عقل کے معیار پر جانچنے اور اس کے حسن و قبح پر غائر نظر ڈالنے کے بعد اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی تحریریں صرف انشاء کی خوبیوں سے مرصع نہیں ہوتیں بلکہ وہ دعوتِ فکر و نظر بھی دیتی ہیں۔ "تنقیدی شعور" انھیں ساری خوبیوں کا حامل ہے۔

ایک مخلص سے آپ تلہری کے ہنر تو سن چکے، اب ذرا "عیبش نیز بشنو" اُن کی فطرت میں ایک جرنلسٹ کی جلد بازی ہے۔ وہ بڑے سے بڑا مقالہ ایک ہی نشست میں ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ الفاظ پر بے پایاں قدرت و دست رس ہونے کی وجہ سے انھیں اظہارِ خیال کے لئے۔ خواہ وہ کتنے ہی دقیق و عمیق ہوں۔ جملے تراشنے اور فقرے مانجھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مختلف طرح کے مسائل بیک وقت اُن کی توجہ کا مرکز بنے رہتے ہیں۔ اس لئے وہ کسی خاص موضوع پر ایک محقق کی طرح جم کر وقت نہیں صرف کرتے۔ بس انھوں نے ایک مسئلے پر فی البدیہہ ایک مقالہ لکھ ڈالا اور جھٹ کسی دوسرے مضمون کے متعلق سوچنے یا بحث کرنے میں منہمک ہو گئے۔ کبھی مذہب موضوع بن جاتا ہے، کبھی فلسفہ، کبھی تاریخ عرب سے بحث ہے تو کبھی زبان و ادب سے، کبھی نثر کے دامن پر گل افشانیاں فرما رہے ہیں، تو کبھی نظم کے حجلہ میں غزل خوانیاں۔ اُن کی یہی ہمہ رُخی اور گوناگونی اس کا باعث ہے کہ انھوں نے اب تک کسی موضوع پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی۔ کئی سال سے ان سے برابر عرض کیا جا رہا ہے کہ اردو میں اصول انتقاد پر ایک معیاری کتاب لکھئے۔ آپ مشرق و مغرب جدید و قدیم، دونوں اصولوں سے واقف ہیں۔ ہماری زبان کی اس کمی کو پورا کرنا آپ پر واجب عینی ہے۔ مگر وہ ہمیشہ وقتی بحثوں میں پڑ کر۔ اور بحث میں انھیں انبساطِ روحی حاصل ہوتا ہے۔ اس گزارشِ معقول کو بھی قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ اُن کے ادبی مجادلوں کی افادیت کا جس حد تک میں قائل ہوں اس کا یہ پورا مضمون شاہد ہے۔ لیکن تلہری نے اب تک جتنا کام کیا ہے، گو کہ اس کی مقدار اور اس کا وزن کافی سے زیادہ ہے، پھر بھی اس سے انھیں ہمارے ادب میں وہ جگہ نہ ملے گی جس کے وہ مستحق ہیں۔ خدا کرے میری نحیف آواز انھیں مستقل تصنیفات کی طرف متوجہ کرنے میں اب کے بھی صدا بصحرا نہ ثابت ہو، اور اردو کے اس صاحبِ علم و فضل باکمال ادیب کو اپنی زبان کی چمن آرائی و گلستان آفرینی میں وہ درجہ و مقام حاصل ہو جائے جس کا وہ صحیح طور پر حق دار ہے!

پیام فتحپوری

غزل

ہے فضائے روح میں عنبر فشاں گیسوئے دوست
مل رہی ہے آج ہر موجِ نفس میں بوئے دوست

ہے جمالِ زلف و عارض آئینہ در آئینہ
اور نظارہ بہ نظارہ بہارِ روئے دوست

قرب میں ہوتا ہے اس کے شہر یاری کا گماں
طالعِ بیدار ہے یا سایۂ گیسوئے دوست

رزم گاہِ زندگی ہو یا کہ محرابِ حرم
آہی جاتا ہے خیالِ سجدۂ ابروئے دوست

کر گئے رنگیں زمانے کو شہیدانِ وفا
زینتِ عالم بنے ہیں کشتگانِ کوئے دوست

تھے کسی عالم میں بھی، پاسِ تعلق تھا وہی
منزلِ دار و رسن میں بھی تھیں نظریں سوئے دوست

رک گیا بالیں پہ اس کی آکے شورِ حشر بھی
جس کی قسمت میں ہے خوابِ بالشِ زانوئے دوست

گو تغیر پہ مدارِ دہر ہے لیکن پیام
خندہ زن خلد و ارم پہ آج بھی ہے کوئے دوست

محمود ایاز

سوغاتِ غم

طعنِ اغیار کے، بے مہریٔ احباب کا غم
غمِ ایام کی تلخی، غمِ دوراں کے ستم
تیرے ملنے کی تمنا، تری دوری کا الم
میں نے ہر آگ کو گلزار بنا رکھا ہے
حسرتِ دید کو دیدار بنا رکھا ہے

سختیٔ راہ سے گھبرا کے جو ڈھونڈا ہے تجھے
دل نے ہر منزلِ دشوار میں پایا ہے تجھے
ایک اک زخم زمانے کا دکھایا ہے تجھے
دور ہوں گو مرے ماتھے پہ ترا ہاتھ رہا
تجھ سے چھٹ کر بھی ترا عہدِ وفا ساتھ رہا

اب مزاجِ غمِ ہستی کی خبر کس کو ہے
شب ہے تاریک تو پروائے سحر کس کو ہے
تیرا غم ہے تو دو عالم کی خبر کس کو ہے
اب اسی یاد کا پرتو ہے تب و تابِ حیات
میرا سرمایۂ ہستی ترے غم کی سوغات
چند داغوں سے ہے آبادیٔ ویرانۂ دل
چند اشکوں سے ہے روشن شبِ تاریکِ حیات
یوں ترے درد کو سینے سے لگا رکھا ہے
حسرتِ دید کو دیدار بنا رکھا ہے
میں نے ہر آگ کو گلزار بنا رکھا ہے!!

فرخ جلالی

کچھ غالب کے بارے میں

غالب کی شخصیت کے نقوش روز بروز روشن ہوتے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ غالب سے متعلق میں نے کچھ مواد فراہم کیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ متفرقات پیش کئے جاتے ہیں۔

فرقانی اور غالب

انیسویں صدی میں میرٹھ میں ایک نامی شاعر سیّد احمد حسن گذرے ہیں ابتداء میں صادم تخلص تھا۔ مگر بعد میں فرقانی تخلص اختیار کیا تھا۔ فارسی زبان اور فنِ شاعری میں خاص دستگاہ بہم پہنچائی تھی۔ اردو میں تشا کی اور آبا کی تخلص تھا۔ ۱۲۵۱ھ مطابق ۱۸۳۶ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے، والد کا نام سیّد کفایت علی تھا۔ سیّد کفایت علی تنہا اور راشد تخلص کرتے تھے۔ ان کا اردو دیوان کلیاتِ فرقانی کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔ سیّد احمد حسن فرقانی نے علومِ متداولہ کی تحصیل کی۔ اپنے زمانے کے شعراء اور علماء سے اچھے تعلقات تھے۔

انشائے فرقانی میں دبیر کے نام خط موجود ہے۔ ۱۸۶۳ء سے ۱۸۶۹ء تک سیّد کفایت علی تنہا کمشنری دہلی میں میرمنشی رہے۔ اس دوران میں فرقانی کا قیام بھی دہلی میں رہا۔ فرقانی کے فرزندِ اصغر سیّد محمد کرار حسین روحانی نے رحمت اللہ رعد کے مطبع نامی سے ۱۹۰۴ء میں کلیاتِ فرقانی مع حالات کے شائع کیا تھا۔ فرقانی نے اردو میں بھی چند کتابیں لکھی تھیں، تہذیب النساء، انشائے میسورا و رطاق کسریٰ وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

فرقانی کا انتقال ۴ ستمبر ۱۸۸۳ء میں میرٹھ میں ہوا۔ سیّد محمد مرتضیٰ بیان یزدانی بھی فرقانی کے خاندان کے ایک فرد تھے۔

سید مہدی علی مصنّف شہاب ثاقب جنھوں نے غالب اور فرقانی کے جلسے دیکھے تھے فرماتے ہیں:

"بھائی صاحب مرحوم (فرقانی) نے دہلی میں مرزا غالب مرحوم کو یہ قصیدہ سُنایا؂

شد وقت کہ در طرۂ سنبل شکن افتد ‏ ‏ ‏ ‏ باغرّہ گل ژالہ چہ در مقترن افتد

مرزا صاحب سخن گوئی میں، تو نامی تھے مگر سخن فہمی بھی ان کی کسی طرح کم نہ تھی جب انھوں نے یہ مطلع سُنا ایک جوش پیدا ہوا اور باوجود ضعف اور کبر سنی سروقد کھڑے ہوگئے اور بھائی صاحب کی پیشانی پہ بوسہ دیا اور حاضرین سے مخاطب ہوکر فرمایا "غالب زندہ سید احمد حسن ہیں۔ اسد اللہ خاں، غالب مردہ ہے سب لوگوں کو ان سے استفادہ کرنا چاہیئے۔ میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں" اور اثنائے داد میں یہ بھی فرمایا کہ گل کے ساتھ غرّہ کا لفظ کم سے کم تین دن کی تلاش میں ملا ہوگا اس جلسہ سے اٹھ کر میں نے بھائی صاحب سے پوچھا کہ جناب مرزا نے جو تشخیص فرمائی تھی کہ غرّہ کا لفظ تین دن میں ملا ہوگا۔ کہاں تک صحیح ہے جناب فرقانی نے فرمایا کہ مجھ کو اس زمین میں قصیدہ کہنے کا خیال کئی روز سے تھا اور اوقات فرصت میں مکرّر سہ کرّر غور کرنے کے بعد یہ لفظ ملا تھا۔ مجھ کو جناب مرزا کی تشخیص اور جناب مصنّف کی قدرت شاعری پہ حیرت ہوگئی۔"

سیّد محمد کرار حسین روحانی نے لکھا ہے۔

"راقم الحروف بمقام دہلی ۱۲۸۱ھ میں آزادی عدم سے قیدِ حیات میں آیا۔ مرزائے مرحوم نے اپنے باکمال دوست کے فرزند کا تاریخی نام نیک اختر[1] تجویز کیا

---

[1] نیک اختر کے متعلق میں نے کہیں اور بھی پڑھا ہے۔

حضرت زرقانی نے بعد ادائے شکر یہ عرض کیا کہ یہ نام اور یہ لغت محاورے میں دختر کے لئے مناسب ہے اور مرزا کے نکتہ سنج نے اس کو تسلیم کیا ہے۔"

غالب نے اکثر لکھا ہے کہ تاریخ گوئی میرا فن نہیں ہے۔

۳۱ جولائی ۱۸۶۶ء میں سیاح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"تمہاری جان اور اپنے ایمان کی قسم کہ فنِ تاریخ گوئی و معمّہ سے بیگانہ محض ہوں۔"

روحانی ۱۲۸۱ھ میں پیدا ہوئے اور غالب نے ۱۲۸۵ھ میں وفات پائی۔ اس حساب سے غالب کے انتقال کے وقت روحانی کی عمر چار سال کچھ ماہ کی تھی۔ روحانی کا بیان ہے۔

"گو راقم بہت کم سن تھا مگر ہنوز مرزائے موصوف کی نرالی وضع قطع، سفید سفید بال پالکی میں سوار آنا اور گھنٹوں پہروں نہیں دنوں حضرت فرقانی کے ہمراہ ایک وسیع تہ خانے میں مصروف شعر و سخن رہنا کہ جس میں وہ دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے تھے بخوبی یاد ہے۔"

غالب آخری دنوں میں بہت بیمار رہے لہذا گھنٹوں کی صحبت بھی مشکل ہے اور زندگی کے آخری ایام میں غالب بیشتر گھر پر رہتے تھے۔ بچپن کی یاد ایسی ہوتی ہے۔

عصائے غالب

نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں کی رُباعی

اوستادِ من پیرِ حق آگہ غالب	اقلیمِ کلام را شہنشہ غالب
می داشت عصائے کندہ بر دست	بدنقش برآں یا اسد اللہ الغالب

مالک رام نے ذکرِ غالب میں بھی اُس کا ذکر کیا ہے ۱۹۰۶ء تک یہ روحانی کے پاس تھا اُن کا بیان ہے۔

"اکثر باہم تحف و ہدایا کی رسم جاری تھی۔ از انجملہ ایک طلائی کام کی مہنال جس پر یا اسد اللہ الغالب منقوش ہے ہنوز راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔"

مشتاقانِ غالب کو اس کی تلاش جاری رکھنا چاہیئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ملک میں انگریزی تہذیب اور تمدن کے اثرات تیزی سے بڑھنے لگے تھے۔ انگریزی کتابوں کے سرکاری اور غیر سرکاری ترجموں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ مسلم یونیورسٹی لائبریری علی گڑھ میں جواہرِ منظوم نامی کتاب ہے۔ کتاب کا سرورق یہ ہے

جواہرِ منظوم

یعنی

ترجمہ منظوم اُردو منتخبات نظم انگریزی حصۂ اوّل

جو

مدارس سرکاری میں پڑھائی جاتی ہے

حسب الارشاد فیض بنیاد جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک مغربی

مقام الہ آباد

گورنمنٹ پریس میں چھاپا گیا

دفعہ دوم ۔۔ ۵ جلد ۱۸۶۸ء قیمت فی جلد ۳ ر

یہ انگریزی کی چند نظموں کا ترجمہ ہے جو غلام مولیٰ (قلق) نے حسب الحکم صاحب انسپکٹر بہادر قسمت اوّل میرٹھ کیا تھا۔ ۱۸۶۴ء میں دوسری مرتبہ شائع ہوا تھا۔ حکومت ہند کے محکمۂ تعلیم سے غالب کے تعلقات قدیم تھے، پنجاب اور ممالک مغربی (اتر پردیش) کے تعلیم کے محکموں سے غالب کے پاس اکثر فرمائشیں آتی رہتی تھیں۔ غلام غوث بیخبر کو لکھتے ہیں۔

"جناب کیمسن بہادر افسر مدارس غرب و شمال (اتر پردیش) کا باوجود عدم تعارف خط مجھ کو آیا کچھ اُردو زبان کے ظہور کا احوال پوچھا تھا اُس کا جواب لکھ بھیجا۔"

شیو نرائن آرام کو دوسری جگہ لکھا ہے۔

"جناب ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب (ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم یو۔پی) کو ابھی خط نہیں لکھ سکتا ان کی فرمائش کہ اردو کی دو نثر انجام پلنے۔"

جواہرِ منظوم کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

"یہ ترجمہ واسطے اصلاح کے دہلی میں مرزا اسد اللہ خاں غالب کے پاس جو شاعر نامی گرامی ہیں بھیجا گیا۔"

ترجمہ میں غالب کا رنگِ سخن کہیں کہیں نمایاں ہے۔ نظموں کے عنوان ہیں۔

۱۔ اوصاف اخلاق شتر	۲۔ بیان کرمک
۳۔ حکایت پسرِ ناخدا	۴۔ بیان جنت
۵۔ میرا باپ کشتی بان ہے	۶۔ بیانِ ہندوستان
۷۔ داستان اندھے لڑکے کی	۸۔ داستان شاہ کینیوٹ
۹۔ قصۂ ولیم ٹیل	۱۰۔ خواہش طفل
۱۱۔ عرضی موش محبوس	۱۲۔ لڑکپن کی پہلی مصیبت

۱۳۔ دربیان تمیز حق و باطل۔ ۱۴۔ ذکر ابابیل بدیسی۔ ۱۵۔ سادگی طبیعت کی خواہش

اس ترجمہ کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے بھی مفید ہوگا۔ کہ ۱۸۷۴ء کے مناظرۂ پنجاب کے مشاعروں کے سامنے انگریزی شاعری کے کچھ نمونے شاید ہوں۔

سیدہ طاہر صدیقی

غالب کی شاعری میں جنّت کا تصوّر

جنّت اور دوزخ کی بحث کس نے نہیں چھیڑی لیکن غالبؔ کی وسعتِ فکر نے جنّت کے تصوّر کو ایک نیا رنگ دیا۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن — دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

دیتے ہیں جنّت حیاتِ دہر کے بدلے — نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے — حورانِ خُلد میں تری صورت اگر ملے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ — یہ جنّتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

نکلنا خُلد سے آدم کا سُنتے آئے ہیں لیکن — بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

غالبؔ کے نزدیک جنت کوئی آسائش گاہ نہیں تھی بلکہ نفسِ مطمئنہ کا ایک ایسا لمحہ اُن کے لئے ایک مکمّل فردوس تھا جو کسی نیکی کی بدولت انھیں میسّر آجاتا وہ "جنّتِ نگاہ" اور "فردوسِ گوش" جیسی ترکیبیں روائتی طور سے وضع کر کے جنّت کے تصوّر کو مادی اور حقیقی بنادیا کرتے تھے اور مُلّاؤں کی دکھائی ہوئی جنّت کا مذاق اُڑاتے تھے اور اس طرح مذہبی کٹرپن کی ایک نفسیاتی مخالفت میں کامیاب رہتے تھے۔

یہ ورثہ انھیں مولانا رومؔ سے لے کر بیدلؔ اور صائبؔ تک عظیم صوفیائے کرام سے ملا تھا۔ جن کی شاعرانہ حیثیت بھی اتنی ہی غیر معمولی تھی جتنی کہ ان کی روحانی حیثیت۔ اس لئے غالب کے طرزِ بیان میں جنّت کا تصوّر اپنا ایک علٰحدہ کردار رکھتا ہے جس کو ہمارے رجعت پسند عقیدت گذار اس لئے اجاگر نہیں کرتے کہ کہیں غالبؔ جنّت کا منکر نہ ثابت ہو جائے۔

غالبؔ کا مذہبی نقطۂ نظر کٹرپن سے مبرّا اور ایک ہمہ گیر انسانیت نواز نقطۂ نظر ہے۔ انھوں نے اپنے مذہب کی توجیہہ اور تشریح کے لئے بعض بہت ہی راست اشعار کہے ہیں ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

یہ وہی تصوّر ہے جو دوسرے وسیع النظر مستشرقین کے یہاں ایک مشترک حیثیت میں پایا جاتا ہے۔ یہ مسلک زمین کے تمام بسنے والوں کو بلا امتیازِ نسل و رنگ ایک لازوال قوت کے بندے مانتا ہے اور ان کی یکسانیت کا اعلان کرتا ہے۔ اس مسلک نے ہی صوفیائے کرام کی ایک ایسی جماعت بھی پیدا کر دی جس نے جاگیردارانہ ظلم کے خلاف پُرانی شرع اور پُرانے اصولوں کی سختی کے خلاف تاریخی انقلابی تحریکوں میں حصہ لیا اور انسانی فکر و نظر کو بے شمار حجابات اٹھا کر نئی وسعتوں اور پہنائیوں سے آگاہ کیا۔

اسی مسلک نے مغلیہ دور کے بُحرانی زمانے میں غالب کو ایک منتہی صوفی اور ایک سحر آفریں فن کار کی حیثیت میں اسی طرح جنم دیا جیسے فردوسی کو محمود غزنوی کے زمانے میں۔

غالب کے ضمیر، خلوص اور حسیّات پر کائنات کی ساری لطافتیں ہر وقت وارد رہتی تھیں جس سے کہ اس کے فکر کی پختگی مختلف مدارج طے کرنے لگی اور اس کا تمام وجود مشاہدہ کے ذریعہ ہمیشہ کائنات سے بہت قریب رہا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ غالب کا وجود اور کائنات دو مختلف چیزیں نہیں رہیں۔ کیونکہ فن کار شعور کو پہنچنے کے بعد اپنے آپ کو فکر سے اور مشاہدہ سے کبھی علٰحدہ نہیں کر سکتا۔ غالب نے اپنے اس احساس یگانگی کو بڑے حسن کے

ساتھ "بانیِ بیداد" الفاں سے" والے مطلع میں باندھا ہے جس سے کائنات اور اُن کی نظر بازی کے ربط کا ثبوت ملتا ہے وہ اپنے "حلقۂ دامِ خیال" کو ایک عالم نہیں "تمام عالم" کہہ دیتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ صرف دامِ خیال کا وجود ہے اور عالم کا وجود نہیں بلکہ اس لئے کہ عالمِ خیال کی وسعتوں کا پرتو ہے اور اس کی رسائی فاصلوں کی قید سے آزاد ہے۔ یہ بات اب معیّن ہو جاتی ہے کہ غالب نے اپنا مسلک ہمیشہ واضح رکھا جیسے ؎

کعبے کس منہ سے جاؤگے غالب   شرم تم کو مگر نہیں آتی

غالب کی نگاہیں وجودِ کائنات کے دل تک پیوست ہو جاتی تھیں اور ہر مبنی شئے کی تفصیل اور حسن کی وسعتوں پر چھا جاتی تھیں۔ جیسے ایک پتھر اور بوسے ذریعہ یہ تخیل ؎

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا   جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا

بجلی اِک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا   بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک   میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے   آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے   کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی   چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

ذہن کی تمدنی کیفیات اور نیچر کا مطالعہ غالب نے غیر مذہبی انداز میں کیا ہے ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو   بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اس طرح اس کی نگاہیں آسمان کے مختلف طبقوں تک نہیں پہنچتیں۔ وہ تصور کی جنّت یا وہ ساکنانِ عرش جن کا ذکر ایک نہایت ہی ڈرامائی انداز میں کیا جاتا ہے یہ سب کچھ غالب کی شاعری میں تقریباً مفقود کیوں ہے؟ غالب کی عظمت کا راز اسی زمینی وابستگی اور مادّی حقائق سے متاثر ہونے کی قابلیت میں ہے۔

غالب کے اشعار میں اس کے شہر کا تمدّن، اس کے محلے، گلیاں، وضع قطع لوگوں کے چہرے مہرے یہ سب کچھ دکھائی دیتا ہے۔ اس لئے غالب کا کلام ایک تاریخی تمدّنی اور مادّی حقائق کا ریکارڈ ہے۔ اور ہماری حُبِ وطنی اور ادب کی ایک ایسی قدر ہے جس کی قیمت کوئی ادا نہیں کر سکتا۔

اے بندِ قبائے یار ہے فردوس کا غنچہ   اگر وا ہو تو دکھلا دو کہ اک عالم گلستاں ہے

اس شعر پر غالب کا تصورِ فردوس ختم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ شعر ان تمام مادّی علامتوں کے ذریعہ کہا گیا ہے جس میں زندگی کی تمام لطافتیں اور مادّی برکات سمٹ آئی ہیں۔ اسی طرح عام بول چال اور دو چاہنے والوں کی چھیڑ چھاڑ، شکوہ شکایت بڑے حسین روزمرّہ میں پیش کر دیا کرتے تھے۔ اس شعر کا لب و لہجہ ملاحظہ کیجئے۔

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا   ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

یہ تمام اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ غالب کا معشوق "حور" نہیں عورت ہے۔ انھوں نے در و دیوار کو بھی انسان کی آنکھوں سے سجانے کی کوشش کی۔

جو کچھ ہے محوِ شوخیِ ابروئے یار ہے   آنکھوں کو رکھ کے طاق پہ دیکھا کرے کوئی

"ابرو" "محراب" "طاق" جیسی علامتیں۔ "گل صد رنگ کترنا" "تیغِ ادا" "بندِ قبائے یار" "عالم گلستان" یہ ہیں وہ اجزائے ترکیبی جو غالب کو زمین کے مادّی مشاہدات کا ایک جری ترجمان ثابت کر دیتی ہیں نہ کہ ایک روحانی ابابیل۔

غالب اسی زمین کی زندگی کو اپنے ذہن میں پرکیف، پرعیش اور رنگین بنا کر لاتے تھے اور اسی حسین پرتو کو اپنے اشعار میں جھلکاتے تھے ؎

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

یہ ہے غالب کی جنّت!

ابوالکلام آزاد

اگست ۱۹۵۸ء میں ہم نے "آج کل" کا "ابوالکلام نمبر" شائع کیا تھا۔ اس کی مانگ اس قدر زیادہ تھی کہ شائع ہوتے ہی ساری کاپیاں ختم ہوگئیں اور ہم شائقین کی فرمائش پوری نہ کر سکے۔ اب اہلِ ذوق حضرات کی فرمائش پر اس نمبر کو بعض ترمیمات کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

ضخامت ۲۲۴ صفحات مع تصاویر۔ قیمت ڈیڑھ روپے۔ ایجنٹ حضرات پہلے سے فرمائش بھیج کر اپنی کاپیاں محفوظ کرا لیں۔

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸

شہزاد معصومی

اُردو کی کہانی

شمالی ہند میری جنم بھومی   مری ترکیب ایرانی و رومی
کھڑی بولی کے دامن میں پلی ہوں   اُسی آغوش میں پھولی پھلی ہوں
برج بھاشا کی منہ بولی بہن ہوں   رسیلی مدھ بھری شیریں سخن ہوں
علاقائی مقامی بولیوں سے   میں کھیلی ہوں انھیں ہمجولیوں سے
کسی کو ہندوی کا نام بھایا   کسی نے ریختہ مجھ کو بتایا
مراٹھی، بھوجپوری، میتھلی سے   ہر اک تہذیب کی شیدا ہوئی ہے
ہر اک بھاشا سے پیارے شبد چن کر   بنایا اپنے گھر کو میں نے سندر
مغل دربار میں لائی گئی میں   نئی تہذیب کا دھارا بنی میں
سنوارے ارتقا نے میرے گیسو   کہا جانے لگا پھر مجھ کو اُردو
نظر مجھ پر پڑی شاہِ جہاں کی   چہیتی بن گئی ہندوستاں کی
نکل کر بزم سے پہنچی چمن تک   ہوئی مشہور دلی سے دکن تک
نکھرتا ہی گیا حسنِ لسانی   سنورتی ہی گئی زلفِ معانی
کبھی ہیں دلبروں کی بانکی چتون   کبھی ہیں عاشقوں کے دل کی دھڑکن
کبھی گوپال کی مُرلی بجائی   کبھی رادھا کی دھن پر گنگنائی
کبھی چُنری کبھی بندیا میں آئی   کبھی گھونگھٹ میں شرمائی لجائی
کبھی گھنگھرو کبھی پائل میں چھم چھم   کبھی کنگن کبھی جھومر میں چھم چھم
کہیں شامِ اودھ صبحِ بنارس   کہیں کاجل میں نیندوں کا بھرا رس
ملن کے گیت میں نے گنگنائے   برہ کے راگ سے ہر سو جلائے
کھلیں کلیاں سبھی آنند کی   بسیں پھلواریاں ہر زندگی کی

کہیں نرگس کہیں سنبل کہیں گل   کہیں لحنِ ہزار و صوتِ بلبل
کہیں شیر و شکر اور شہد شربت   کہیں لطفِ فارسی صنعت اور برقِ نکہت
کبھی ابر دیپک میں جابرانہ   کہ جس سے کانپ اٹھے اک زمانہ
کہیں بازی گرِ فرشِ سیاست   کہیں پر شعلۂ عزمِ بغاوت
کہیں پر حریت کا ایک نعرہ   کہیں چڑھتے ہوئے دریا کا دھارا
محاذِ جنگ میں للکار میری   سرِ بزمِ طرب گفتار میری
دلوں کی ترجماں ہوں انجمن میں   زبانِ بزم ہوں بزمِ سخن میں
کبھی عاشق کے نالوں میں اثر ہوں   کبھی معشوق کی نیچی نظر ہوں
کبھی بانگِ درا کے کارواں ہوں   کبھی میں قومیت کی پاسباں ہوں
حدی خوانِ حیات و تربیت ہوں   پیامِ ابر و بادِ حریت ہوں
دلِ ہندوستاں کی راگنی ہوں   ہمیر کارواں کی بانسری ہوں
میں تہذیب و تمدن کا ہوں سنگم   مرا آئین نئے بھارت کا پرچم
مری تعمیر میں کاشی کی زینت   مری تکمیل میں ہے کعبہ کی عظمت
جمنا کی ساز پہ تھرا رہی ہوں   سبو ہندی میں شیرازی سے ہوں
گلوں کا حسن کلیوں کا تبسم   نسیمِ صبح کا دلکش ترنم
ہمالہ کا وقارِ عزم پیدا   جلالِ پُر شکوہ سندر ساگر
ترنگِ گنگا کی دلکش ملاحت   بنارس شہر کی رنگیں صباحت

سبھوں کی چھاپ ہے میری زباں پر
مری تعمیر میں ہے سب کا جوہر

میں ہی کھا ڈالے۔ کہانی بکی نہیں۔ دِلّی کا رہنے والا ہے ایک شخص، پنّالال نام ہے۔ بڑی چلتی رقم ہے۔ کہانی بکوانے میں وہ بہت مدد دیتا ہے۔ کہانی بِک جاتی ہے تو اپنا کمیشن لے لیتا ہے۔ میری تو پنّالال بھی مدد نہ کر سکا۔ آج کل وہ بھی دِلّی میں ہے۔ اُس کے بھائی کی شادی تھی پچھلے دِنوں، پرسوں میں اُس سے ملا تھا۔ اُس نے یہی جواب دیا۔ تمھاری ہاتھ کی لکھی کتاب سیٹھ کے پاس ہے۔ وہ بمبئی پہنچ کر تمھارے لدھیانہ کے پتے پر بھجوا دوں گا۔ کیونکہ سیٹھ کی اتنی لمبی خاموشی کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ وہ کہانی خریدنے کو تیار نہیں۔ خیر چھوڑیئے۔ اپنے گاؤں جاتا ہوں تو وہاں دل نہیں لگتا۔ لدھیانہ کی اُس فرم نے پچھلے سات مہینے تک میری جگہ ایک ٹیمپریری کلرک رکھ کر بھر لی تھی اور میرے ساتھ اُن کا وعدہ تھا کہ میں یہ سات مہینے کی چھٹی کاٹ کر واپس اپنے کام پر حاضر ہو سکتا ہوں۔ لیکن اِدھر سُنتا ہے کہ انھوں نے مجھ سے ناراض ہو کر اُس ٹیمپریری کلرک کو ہی ہمیشہ کے لئے رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اِس صورت میں اگر میں کہوں کہ زندگی ہزار لعنت ہے تو تمھیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟" میں نے کوئی جواب نہ دیا، بیرے کو دوبارہ بُلا کر کہا "دو کافی!" پاس والی میز پر وار اینڈ پیس کو شیطان کی آنت جیتنی لمبی کتاب گرداننے والے صاحب فرما رہے تھے "جب کام بننے پر آتا ہے تو دیر نہیں لگتی۔ عمر خیام کہتا ہے۔ وقت کا پرندہ پھدک رہا ہے۔ یہ ایک مہاکوی کا وچن ہے۔ اکنا ہی پوتر جتنا رگ وید میں کسی رِشی کا وچن، عمر خیام کے وچن کی تعریف میں اتنا ہی عرض کروں گا کہ کبھی تو وقت کا پرندہ اُونچی اور تیز اڑان بھرتا ہے اور کبھی وقت کا پرندہ تھک کر سستانے کے لئے بیٹھ جاتا ہے۔"

"واہ واہ!" اُس میز پر زور کا قہقہہ پڑا "کیا نازک خیالی ہے۔ واہ سیٹھ جی!"

"پہلے یہ تو بتاؤ کہ کل وار اینڈ پیس دکھا رہے ہو یا نہیں؟" شاعر نے سیٹھ جی کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے کہا "ٹکٹ کا انتظام آج ہی ہو جائے۔ کل پہلے شو میں چلا جائے۔ پکچر دیکھ کر یہاں کافی ہاؤس میں آپ ہمیں پھر کافی پلائیں۔ تب ہم کہیں گے، نیا سال مبارک ہو، سیٹھ جی!"

"منظور ہے!" سیٹھ جی مُسکرائے۔

پنچم کا دھیان نیچے کافی ہاؤس سے آتے ہوئے پُر شور آرکسٹرا کی طرف چلا گیا تھا۔ میں نے ہنس کر کہا "بہت بھیڑ ہے۔ اِس سال کی آخری شام کا جشن منانے کے انداز میں لوگ کافی کے پیالے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتے ہوئے کافی پی رہے ہیں۔ اور دیکھو پنچم! وہ بیرا جانے کہاں گُم ہو گیا!"

"آ جائے گا۔" پنچم نے آہستہ سے کہا۔

دوسری میز پر شاعر کہہ رہا تھا "وار اینڈ پیس کا شمار دُنیا کے بہترین ناولوں میں ہوتا ہے۔ اور ہمیں ہالی وڈ کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے ایک بہترین ناول کو فلمایا۔ کہتے ہیں ہالی وڈ نے اب تک کے اپنے اسٹینڈرڈ کو خود ہی بیٹ کر ڈالا!"

اِس کے جواب میں اِن لوگوں کے کھلنڈرے قسم کے ساتھی نے میز پر طبلہ بجانے کے انداز میں کہا "دھن دھاگ دِھن دِھن ناناکت تادِھن دِھن نادھاگے نادھا ترکٹ دِھن! — ہاں تو سیٹھ جی یار اسواری کے تال پر ہماری تو یہی درخواست ہے کہ ہمیں کل نئے سال کی خوشی میں فلم کے پردے پر مہارشی ٹالسٹائے کا یہ ناول ضرور دکھا دیں۔"

سیٹھ جی کا ایک ہاتھ جیب میں تھا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ چٹکی بجانے کی کوشش کر رہے تھے۔

شاعر بولا "میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ٹالسٹائے کو آخری عمر میں وار اینڈ پیس اُتنا پسند نہیں رہ گیا تھا۔ تمھارا کیا خیال ہے۔ ترکی دِھن دھاگ دِھن دِھن!"

"جب کلاکار کوئی چیز لکھ کر دُنیا کے سامنے پیش کر دیتا ہے تو پھر اُسی چیز کے بارے میں کلاکار کی اپنی رائے سے دُنیا ضرور متفق ہو، یہ تو ضروری نہیں۔" کہتے کہتے ترکی دِھن دھاگ دھن دھن نے آنکھیں نیچی کر کے کہا۔ "سیٹھ جی پیسے خرچیں گے تو ہم نپولین کے روس پر حملہ کرنے کا منظر دیکھ سکیں گے۔ اور یہ بھی دیکھ سکیں گے کہ کس طرح نپولین اپنی پوری طاقت سے بھی روس کو کچل نہیں سکا تھا اور یُدھ پریشانی کی وجہ ہو کر رہی تھی۔"

"یُدھ تو سنسار سے کبھی سماپت نہیں ہو سکتا!" سیٹھ جی نے فلسفہ بگھارا۔ "کبھی یُدھ کبھی شانتی، پھر یُدھ پھر شانتی! یہی تو سنسار کا چکّر چلا آیا ہے!"

شاعر نے سیٹھ کی بات کاٹ کر کہا "انسان کی کوشش تو یہی ہے۔ کہ یُدھ کا دھیان ہی سماپت کر دیا جائے۔"

اِتنے میں بجلی فیل ہو گئی۔ اور کافی ہاؤس میں اندھیرا چھا گیا۔ شور کا آرکسٹرا اور بھی اُونچا اُٹھ گیا۔

بیرے موم بتّیاں جلا جلا کر ہر میز پر رکھ رہے تھے۔

ایک موم بتی اب ہماری میز پر بھی جل رہی تھی۔ بیرا بتا گیا تھا کہ کافی کے لئے تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا کیونکہ پانی ختم ہو گیا ہے۔

پاس والی میز پر موم بتّی کی روشنی میں بیٹھے ہوئے لوگ کسی مندر کے پجاری معلوم ہو رہے تھے۔ شاعر کہہ رہا تھا "ٹالسٹائے کی زندگی کا آخری واقعہ رونگٹے کھڑے

کرنے والا حادثہ ہے۔ گھر سے تنگ آکر وہ ایک دن نکل پڑا۔ ریلوے اسٹیشن پہنچ کر اُس نے ٹکٹ مانگا۔ ٹکٹ بابو نے پوچھا۔ کہاں کا ٹکٹ چاہیئے۔ ٹالسٹائے بولا جہاں کا ٹکٹ ۱۰ پیسوں میں مل سکتا ہے! خیر صاحب ٹالسٹائے نہ جانے کہاں کا ٹکٹ لے کر گاڑی پر سوار ہو گیا اور کہیں راستے میں ہی وہ چل بسا۔ تب بڑے بڑے نامہ نگار وہاں پہنچے۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ میں پوچھتا ہوں، کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ ٹالسٹائے کی بیوی جلی کٹی سنانے سے باز آ جاتی، ایسا کیوں ہوتا ہے والتنے عظیم المرتبہ ادیب کی دھرم پتنی نے اپنے پتی کا گُن کیوں نہیں پہچانا تھا؟ کیا وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ ایک دن اُس کے پتی کا لکھا ہوا وار اینڈ پیس دُنیا کے بہترین ناولوں میں شمار کیا جائے گا اور ایک دن ہالی وڈ والے اُس ناول کو فلمانے کے لئے لاکھوں روپے خرچ کریں گے؟"

ہماری میز پر موم بتی یوں جل رہی تھی جیسے اندھیرے کے ماتھے پر تلک لگا رہی ہو۔ پنچم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا: "ٹالسٹائے بیوی کی جلی کٹی باتوں سے تنگ آ کر گھر سے نکل پڑا۔ لیکن میری تو شادی ہی نہیں ہوئی۔ میری منگیتر نے شادی سے پہلے ہی مجھے ٹھکرا دیا تھا۔"

میں نے حیرت سے پوچھا: "تو تمہاری کہانی کی منگیتر تمہاری اپنی منگیتر ہے؟"

"یہی سمجھ لیجئے۔"

دسمبر کی ٹھنڈ میں پہلی کافی ہمارے پیٹ میں جا کر کبھی کی ٹھنڈی ہو چکی تھی، دوبارہ کافی ملنے کی اُمید میں ہم کافی ہاؤس میں جمے بیٹھے تھے۔ پیچھے والی میز سے کوئی کہہ رہا تھا: "کافی ہاؤس کی جیومٹری نہیں بدل سکتی۔ کرسیوں کی جگہ مقرر ہے۔"

میں نے کہا: "جب کام بننے پر آتا ہے تو حالات اُس کے مطابق ڈھلنے لگتے ہیں۔ نراش ہونے کا تو کوئی کارن نہیں۔"

پنچم کہتا چلا گیا: "دل کا کیا رنگ کروں" بیرا کافی لے کر نہیں آیا۔ اب بیرا کافی لے کر نہیں آئے گا۔ گاؤں کی زندگی اور شہر کی زندگی میں ہمیشہ ایک خلیج رہی ہے۔ خیر چھوڑو! کسی ودّوان کا پُرانا وچن ہے۔ قرض لے کر بھی گھی پیو، جب تک جیو سُکھ سے جیو! فارسی کا شاعر کہتا ہے ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق — کہ یاراں فراموش کردند عشق

دمشق کے اندر قحط پڑا اور یاروں کو عشق بھول گیا۔ ہاں تو میری کہانی نہیں بکی اب مجھے مر جانے کی مکمل آزادی ہے۔

پورب کا لوک کوی اپنے برھا میں کہتا ہے۔

بُھکھیا کے مارے برھا بسر گیا بھول گئی کجری کبیر
دیکھی کی گوری کی موہنی صورتیا اُٹھے نہ کرتی کو مان پیر

برھا کا بسر جانا بہت بڑی قحط سالی ہے۔ کجری کے ساتھ کبیر بھی شامل ہے۔ کبیر ارتھات، دھرم اور بھگوان کو انسان آسانی سے نہیں بھولتا۔ چاروں طرف سے نراش ہو کر انسان آسمان کی طرف منہ اُٹھاتا ہے۔ لیکن برہا کے لوک کوی کو اب اُس پر بھی بھروسہ نہیں رہا۔ اس ایک سال کے عرصے میں سات مہینے تو میں نے بمبئی میں گزارے۔ بمبئی میں ہر چیز دوڑ رہی ہے۔ لیکن میری کہانی ایک جگہ پہنچ کر ایسی اٹکی کہ اب اُس کا چیک تو خیر ملنے سے رہا، اب تو کہانی کا مسودہ بھی واپس ملنے کی اُمید نہیں رہی۔"

مجھے اُس کی کہانی کے سارے خد و خال اُس کے چہرے پر صاف دکھائی دینے لگے۔ آرکسٹرا بج رہا تھا۔ آہستہ آہستہ شور دبتا گیا۔ کافی نہ ملنے سے نراش ہو کر لوگ باہر جا رہے تھے۔

"دُنیا اُمید پہ قائم ہے۔" میں نے اُس کے خیالات میں رچی ہوئی وقتی سی تلخی کو ختم کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارے لئے کافی ضرور آئے گی۔ تمہاری کہانی ضرور بِک کر رہے گی۔ وقت اور جگہ کی قید سے آزاد ہے فن کار کا جوہر قابل۔ نہیں تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وار اینڈ پیس دُنیا کے بہترین ناولوں میں شمار کیا جاتا۔ خیر تمہاری رچنا بھی کل پھل لائے گی۔ کل جو بہت دُور ہوتے ہوئے بھی ناممکن نہیں۔"

اچانک بجلی کے قمقمے جل اُٹھے، اور موم بتیاں بجھنا شروع ہو گئیں۔ پنچم نے ایک میز پر بیٹھی ایک لڑکی کی طرف میرا دھیان دلاتے ہوئے میرے کان کے پاس منہ لا کر کہا: "ٹھیک ویسی ہی تھی میری منگیتر۔ میں تو نہیں مانتا کہ رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہماری زندگی یہاں کافی ہاؤس میں سمٹ کر آ گئی ہے۔ یہ کھلی ہوئی کتاب ہے۔ یہ سب میرے کردار ہیں۔ میں ایک اور کہانی لکھوں گا اور اُسے فلم میں بیچنے کی کوشش کروں گا۔"

کافی اب تک نہیں آئی تھی۔ پنچم نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور کہا۔ "ساڑھے آٹھ ہو رہے ہیں!"

"ابھی بہت وقت ہے۔" میں نے کہا۔ "گاڑی گیارہ بجے چھوٹتی ہے۔ سونے کی جگہ دلانا میرا ذمّہ رہا۔"

پاس والی میز پر شاعر کہہ رہا تھا: "وار اینڈ پیس کی سیٹیں بُک کرا کے بنا ہم کل پہلے شو میں کیسے جا سکیں گے؟ اُٹھنا چاہیئے سیٹھ جی۔"

پیچھے والی میز سے کسی کی آواز آئی: "بھوک کے سے کسی نے پوچھا۔ دوا و دوام"

اور وہ بولا۔ چار روٹیاں!"

پنچم ہر آنے جانے والے کو بڑے دھیان سے دیکھنے لگتا۔ وہ لڑکی کافی دیر سے ناراض ہوکر چلی گئی تھی۔

اُس نے گھڑی میں دیکھ کر کہا "پونے نو ہوگئے۔"

اتنے میں ایک شخص بالکونی پر آیا تیر کی طرح آکر وہ ہماری میز پر بیٹھ گیا

"آپ یہاں" اُس نے پنچم کی طرف دیکھ کر کہا۔ اُس نے اپنے بازو پنچم کے گلے میں حمائل کر دیئے۔

"آپ ہیں پنّالال جی۔" پنچم نے تعارف کرایا۔ "جنم دلّی میں ہوا۔ تعلیم کلکتہ میں پائی۔ کام بمبئی میں کرتے ہیں۔ بڑی بڑی فلم کمپنیوں میں ان کی پہنچ ہے۔ ڈائرکٹر کو پروڈیوسر سے ملانا، پروڈیوسر کو فینانسر سے جڑانا، کہانی کار کی کہانی بکوانا، گیت کار کے گیت لگوانا۔ یہ سب ان کے بائیں ہاتھ کے کھیل ہیں۔"

"یہ سب پنچم جی کی ذرّہ نوازی ہے۔" پنّالال مُسکرایا۔

"پھر تو تمہاری کہانی ضرور بک جائے گی!" میں بھی مُسکرایا۔

پنّالال کے گول مٹول چہرے پر چمک آگئی۔ پنچم بولا۔ "دیکھئے اب مجھے ایسی ویسی کہانی تو مت سُنائیے کہ برابر وچار ہو رہا ہے۔ اور ابھی تک فیصلہ نہیں ہو سکا میں نے واپس لدھیانہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں آج ہی جا رہا ہوں۔ گاڑی گیارہ بجے چھوٹتی ہے۔ آپ کا کمیشن آپ کو نہیں مل سکا۔"

"اَن جل کی بات ہے!" پنّالال نے قسمت کا رونا رو دیا۔ "دیکھئے کافی ملتی ہے یا نہیں۔"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے بیرے کو کافی لانے کو کہا۔

کافی آگئی۔ کیونکہ اب پانی گرم ہو چُکا تھا۔

کافی پیتے ہوئے پنّالال نے جیسے کسی سیٹھ کے سامنے کسی کہانی کی سفارش کی: "اَن جل کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

"دنیا ہی اَن جل پر قائم ہے۔" میں مُسکرایا۔

پنّالال نے آنکھیں نچائیں۔ پنچم جیسے اپنی کہانی کو بُھلانے کی کوشش میں تھا۔

"میں تو شام سے آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں۔" پنّالال مسکرا کر پنچم سے مخاطب ہوا۔

"نیا سال مبارک ہو کہنے کے لئے۔"

"ہاں۔"

"سیٹھ کو بذریعہ تار مبارک بھیج دو۔"

"وہ تو میں نے تین دن پہلے ہی بھیج دی تھی۔ تاکہ میری مبارک باد سب سے پہلے پہنچے۔ اور دوسری مبارکبادوں کے ڈھیر تلے دب کر نہ رہ جائے۔"

"جواب بھی آگیا؟"

"ہاں۔ آج رجسٹرڈ خط ملا۔ یہ دیکھو۔"

پنچم نے آنکھیں بند کئے جواب دیا۔ "دیکھ لیا۔"

میری جھلکتی ہوئی آنکھیں بند ہوگئیں۔ پنّالال کے ہاتھ میں چیک تھا۔ شاید سیٹھ نے پنچم کی کہانی خرید لی تھی۔

میں نے کہا "پنچم بھائی، آنکھیں کھول کر دیکھو۔ نیا سال خود چل کر آیا ہے مبارک باد دینے۔"

پنچم چونک اٹھا۔

اب چیک پنچم کے ہاتھ میں تھا۔ اُس نے پنّالال کو دیکھا۔ پنّالال ہی تھا۔ مجھے دیکھا میں ہی تھا۔ چیک کو دیکھا۔ اُسی کے نام کا چیک تھا۔

میں نے کہا "نیا سال شروع ہونے میں ابھی وقت ہے۔"

پنچم نے کوئی جواب نہ دیا۔

میں نے گھڑی میں دیکھ کر کہا "نیا سال شروع ہونے میں ابھی تین گھنٹے سات منٹ باقی رہتے ہیں۔"

پنچم نے کوئی جواب نہ دیا۔ جیب سے پُرانا فونٹین پن نکال کر بیٹھا رہا۔ وہ یوں بیٹھا تھا جیسے اُس نے زندگی کا دوسرا ہی نکتہ پا لیا ہو۔

پنّالال نے گھڑی دیکھی اور وہ مسکرایا۔ یہ تین گھنٹے اور سات منٹ بھی گزر جائیں۔

پھر میرے اور پنّالال کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"اَن جل کی بات ہے۔"

رقص نمبر

ماہ اگست ۱۹۵۹ء کا شمارہ "رقص نمبر" ہوگا۔ مضمون نگار حضرات ہندوستانی رقص سے متعلق مضامین ارسال فرمائیں۔ یہ شمارہ نہایت اچھے مضامین اور تصاویر پر مشتمل ہوگا۔ (ادارہ)

بھاکڑہ ننگل

تقریباً نصف صدی سے دریائے ستلج پر بند باندھنے کی اسکیمیں بنائی جا رہی تھیں۔ ۱۹۰۸ء میں پہلی بار سر لوئی ڈین گورنر پنجاب نے بھاکڑہ پر بند باندھنے کی اسکیم سوچی۔ ۱۹۱۹ء میں اس کا پلان بنایا گیا اور مختلف منزلوں سے گذرتی ہوئی یہ اسکیم ۱۹۴۸ء میں آخری شکل اختیار کر سکی اور اس پر کام شروع کر دیا گیا۔

پنجاب میں یہ بند اوپر سے پچاس میل دور اس جگہ بنایا جا رہا ہے۔ جہاں دریائے ستلج ہمالیہ کو کاٹتا ہوا بہتا ہے۔ ہمالیہ کا یہ سلسلہ نینی دیوی کے نام سے موسوم ہے۔ اس اسکیم کے پانچ حصے ہیں۔ بھاکڑہ بند، ننگل بند، ننگل ہائیڈل چینل، ننگل پاور ہاؤس اور بھاکڑہ نہر۔

سیمنٹ اور کنکریٹ سے بنائے گئے اس بند کی بلندی ۷۴۰ فٹ ہوگی جو قطب مینار کی اونچائی سے تقریباً ۳ گنا زیادہ ہے۔ یہ دنیا کا دوسرا سب سے اونچا بند ہوگا (سب سے اونچا بند بولڈر ڈیم ہے جو شمالی امریکہ میں دریائے کولوراڈو پر بنایا گیا ہے) اس سے ۴,۰۰۰ ۴ کلوواٹ بجلی پیدا ہوگی اور ۶۰ لاکھ ایکڑ زمین کی سینچائی ہو سکے گی۔ سرہند نہر کو زیادہ پانی ملنے کی وجہ سے پنجاب اور راجستھان کی مزید ایک کروڑ ایکڑ زمین کو پانی مل سکے گا۔

آب پاشی کے لئے اس بند سے نکالی جانے والی نہروں کی مجموعی لمبائی ۸۳۵ میل ہے چھوٹی نہروں کی مجموعی لمبائی ۲۰۰۰ میل ہے۔

اس اسکیم کے تحت بجلی پیدا کرنے والے ۵۰ سب اسٹیشن قائم کئے جائیں گے بجلی پہنچانے والے تاروں کی مجموعی لمبائی تقریباً ۲ ہزار میل ہوگی۔ اس سے دہلی اور پنجاب کے تقریباً ۵۰ شہروں کی بجلی کی ساری ضرورتوں کو پورا کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان میں جتنی ندی گھاٹی اسکیمیں زیرِ عمل ہیں اس میں بھاکڑہ ننگل کی اسکیم سب سے بڑی ہے۔ ہندوستان میں اب تک اتنی عظیم الشان مہم شروع نہیں کی گئی تھی۔ اندازہ ہے کہ اس پر ایک ارب ۷۰ کروڑ روپیہ خرچ ہوگا لیکن ان سے جو بے شمار فائدے حاصل ہوں گے وہ اس خرچ کو حق بجانب ثابت کر دیں گے

۴ کروڑ مکعب گز زمین کی کھدائی کی جائے گی ننگل کی نہر اور دوسرے کاموں میں تقریباً ۱۷ ہزار مزدور ایک وقت میں کام کر رہے ہیں۔ ننگل بند، ننگل نہر، پاور ہاؤس اور دوسرے کاموں پر اب تک ایک کروڑ ۴ لاکھ مکعب گز سیمنٹ اور کنکریٹ کا استعمال ہوا ہے۔ ۲ لاکھ ۵۷ ہزار ٹن سیمنٹ اور ۲۵ ہزار ٹن اسپات اب تک استعمال ہو چکا ہے۔ صرف لوہا اور سیمنٹ ڈھونے کے لئے ۴ ہزار مال گاڑی کے ڈبوں کی ضرورت ہے۔

اُمید ہے کہ ۱۹۶۰ء تک سارا کام پورا ہو جائے گا۔ یہ بند دورِ فراغت و خوشحالی کا نقیب ہوگا۔ کیونکہ اس سے بے شمار فائدے پہنچیں گے جو علاقے پانی کی کمی کی وجہ سے قحط، غربت اور افلاس کے شکار تھے وہاں کھیتیاں لہلہا اٹھیں گی اور لاکھوں ایکڑ پیاسی زمین کو پانی مل سکے گا۔ غلے کی پیداوار زیادہ ہوگی۔ تخمینہ ہے کہ اس طرح جو زائد پیداوار ہوگی اس کی قیمت ۱۳۰ کروڑ سالانہ ہوگی۔ صرف آبیانہ سے حکومت کو ۱۰ کروڑ سالانہ کی آمدنی ہوگی۔ کاروبار کی نئی منڈیاں کھل جائیں گی اور سستی بجلی ملنے کی وجہ سے سینکڑوں گھروں میں روشنی آ جائے گی۔ بجلی کے پنکھے، کپڑے دھونے، سکھانے اور استری کرنے کی مشینیں، ریفریجریٹر اور دوسرے بہت سے جدید سامان کا استعمال وسیع پیمانے پر ممکن ہو جائے گا۔ بڑی بڑی فیکٹریاں اور مل کھولے جائیں گے۔ روزگار بڑھے گا۔ زندگی کا معیار بلند ہوگا۔ اور ہم صحیح معنوں میں آزادی کی برکتوں سے مستفید ہوں گے۔

ع م

نئی کتابیں

ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں)

مؤلفہ: محمد عتیق صدیقی ۔ ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۔ ضخامت ۵۱۶ صفحے ۔ تقطیع ۲۲×۱۸/۸ ۔ کتابت، طباعت عمدہ ۔ جلد اور جلد پوش عمدہ ۔ قیمت بارہ روپے ۔ ۳۳ نادر تصویریں بھی کتاب کی زینت ہیں جن میں ہکیز گزیٹ (۱۷۸۰)، جامِ جہاں نما فارسی، جامِ جہاں نما اردو، اودنت مارتنڈ (ہندی) سراج الاخبار، صادق الاخبار، اخبار دربار معلّٰی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اس کتاب میں اٹھارویں صدی کے انگریزی اور فارسی اخباروں سے لے کر کمپنی کے عہد کے خاتمے تک کی ہندوستانی اخبار نویسی کی تاریخ بڑی محنت سے درج کی گئی ہے۔ مصنف نے بڑی جستجو سے مواد جمع کیا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرکاری مسلوں اور پرانے اخبارات سے مواد جمع کرنے میں بڑی محنت کی گئی ہے۔ اہلِ علم و تحقیق سے بھی استفادہ کیا ہے۔ کتاب کے آخری حصّے میں اخباروں کی فہرست درج کی گئی ہے جو بقولِ مؤلف طویل ہونے کے باوجود مکمل نہیں کہی جا سکتی۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں ایسے صاحبِ نظر حضرات نے اس کتاب کے مؤلف کو دادِ تالیف دی ہے۔ اپنے موضوع پر اردو میں یہ پہلی جامع کتاب ہے اور ہر قسم کی

موصلہ افزائی کی مستحق ہے۔

مجمع اللغات فارسی

مرتبہ مولوی محمد رفیع فاضل دیوبند و مولوی حکیم ابوالفضل محمد فاضل صاحب۔ ناشر رائے صاحب لالہ رام دیال اگروالا کٹرہ الہ آباد۔ چھوٹی تقطیع۔ صفحات ۴۸۹۔ کتابت، طباعت، جلد، جلد پوش عمدہ۔ قیمت تین روپے۔

اس میں فارسی اور عربی کے قدیم و جدید تقریباً پچاس ہزار الفاظ کے معانی طلبہ کی آسانی کے لیے آسان اردو میں پیش کیے گئے ہیں۔ آج سے تقریباً پچیس برس پہلے یہ چھپی تھی جو نایاب تھی۔ ناشر نے اسے اب شائع کرکے ایک مفید کام کیا ہے۔ لغت کی کم یابی کے اس زمانے میں یہ کتاب طلبہ کے لیے بالخصوص اور عوام کے لئے بالعموم مفید خدمت انجام دے گی۔

جنوبی ہند کا بہترین ادب

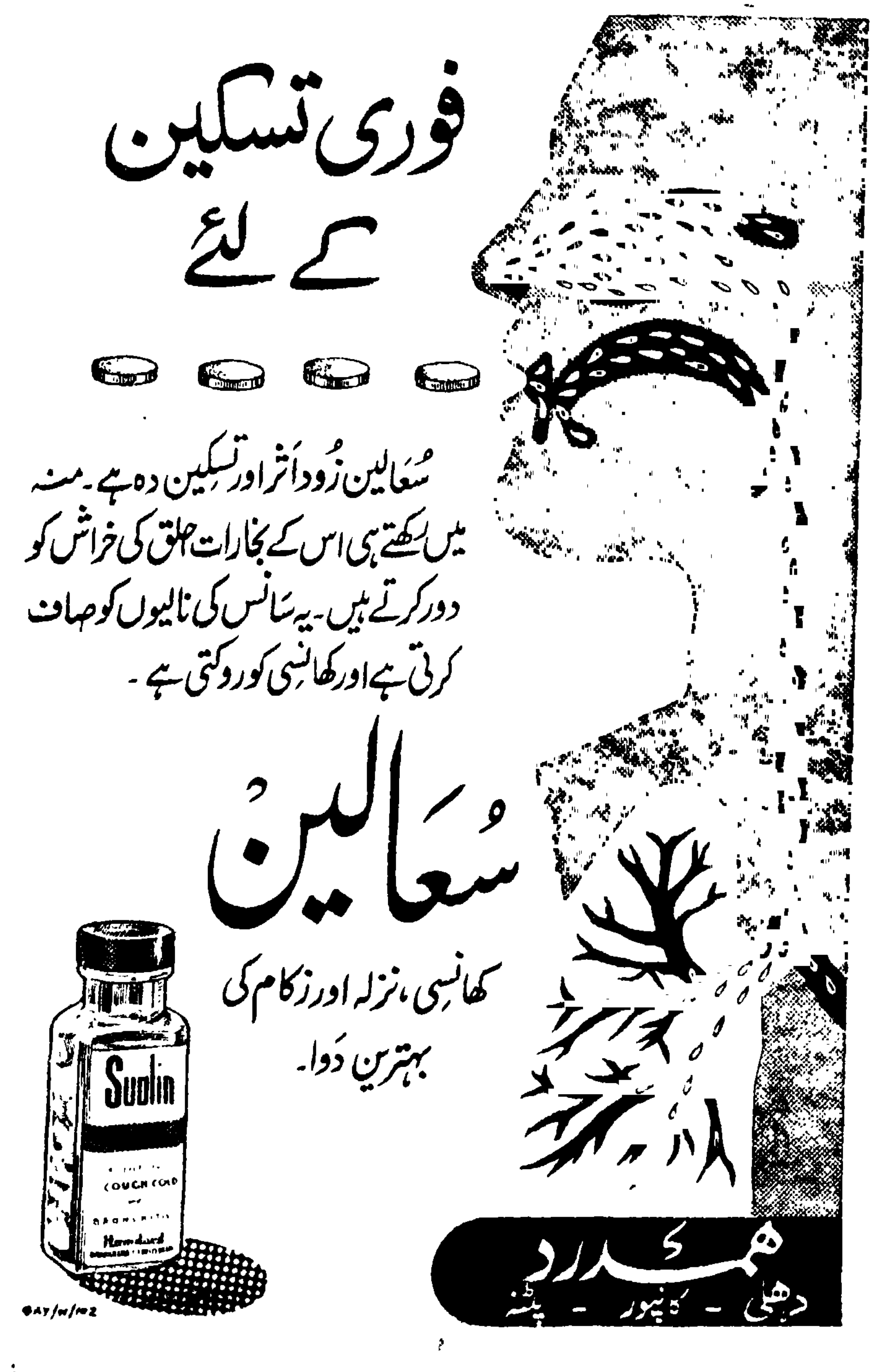
ناشر مجلس ادب 70/8 مین روڈ پبلیکیشنز۔ غلامی پالیم بنگلور ۲۔ ضخامت ۲۳/۸ کے ۱۰۰ صفحات۔ کاغذ، کتابت، طباعت اوسط۔ قیمت ڈھائی روپے

جنوبی ہند والے اردو کی خدمت میں پیش پیش رہے ہیں۔ یہ انتخاب اسی ذوقِ صحیح کا نتیجہ ہے۔ انتخاب میں مضامین، نظمیں، غزلیں، افسانے سبھی کچھ موجود ہے۔ اس کے علاوہ کنڑی، ملیالم، تمل اور تلگو ادب کے تراجم بھی شامل ہیں۔ یہ ایک ایسی خدمت ہے جس کے لئے اردو سے محبت رکھنے والا ہر فرد ادارے کا شکرگزار ہوگا۔ ہمیں امید ہے کہ یہ مجموعۂ انتخاب قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

کلام بے نظیر

حضرت سید محمد بے نظیر شاہ وارثی بے نظیر کے کلام کا مجموعہ۔ مرتب محمد اکبرالدین صدیقی لکچرر جامعہ عثمانیہ۔ ضخامت ۲۰/۲۶×۳ کے ۵۰۰ صفحات۔ کتابت، طباعت، جلد وغیرہ اوسط۔ قیمت پانچ روپے۔

حضرت سید بے نظیر صوفی منش اور قادرالکلام شاعر ہوئے ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں انتقال ہوا۔ "مرقدِ عالی مقبرہ بے نظیر" تاریخ وفات ہے۔ موصوف کا کلام بڑا مستند ہے۔ مثنوی، غزل، مسدس، ساقی نامہ، مرثیہ، قصیدہ غرض مختلف اصنافِ سخن میں آپ نے دادِ سخن دی ہے۔ مثنوی جواہرِ بے نظیر سے مناظرِ فطرت کا جو انتخاب کتاب میں درج ہے وہ اردو نظم کے لئے سرمایۂ فخر ہے۔ فارسی کا کلام بھی معیاری ہے۔ مرتب اور مصنف کے فرزند سید عابد بے نظیر شاہ شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ان نوادر کو شائع کردیا اور تاراجِ زمانہ کا ہدف ہونے سے بچا لیا۔



فوری تسکین
کے لئے
سُعالین زُود اثر اور تسکین دہ ہے۔ منہ
میں رکھتے ہی اس کے بخارات حلق کی خراش کو
دور کرتے ہیں۔ یہ سانس کی نالیوں کو صاف
کرتی ہے اور کھانسی کو روکتی ہے۔
سُعالین
کھانسی، نزلہ اور زکام کی
بہترین دوا۔
Suolin
ہمدرد
دہلی - کانپور - پٹنہ



آج کل

اہلِ نظر کی نظر میں

"آج کل" آج کل خوب نکل رہا ہے۔ خصوصاً موسیقی نمبر تو ایسا نکلا کہ پاک و ہند کا کوئی ادبی رسالہ اب تک ایسا نمبر پیش نہیں کر سکا، کیا باعتبارِ فن اور کیا بلحاظِ تاریخ فن۔ یہ ترتیب کا کمال ہے۔ خدا آپ لوگوں کا حامی ہو۔ آپ حقیقت میں زبانِ اردو کے محسن ہیں۔

(عبدالمجید سالک)

"آج کل" ان رسالوں میں ہے جو ہر طبقے کے پڑھنے والوں کے لئے کچھ نہ کچھ دلچسپی کا سامان ضرور مہیا کرتے ہیں۔ رسالے کی ادبی حیثیت بہت اچھی ہے۔ اس کے مقالے اور نظمیں بیشتر معیاری ہوتی ہیں۔ ظاہری حسن یعنی کاغذ چھپائی اور تصویروں کے اعتبار سے کوئی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ (مسعود حسن رضوی)

"آج کل" کا موسیقی نمبر دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ اس فن پر خصوصی نمبر نکالنا آسان بات نہ تھی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو جمع و ترتیبِ مضامین میں کن کن صبر آزما منزلوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ آپ کے ذوق و انتخاب دونوں کی داد دیتا ہوں۔

(نیاز فتحپوری)

میں "آج کل" کو ہمیشہ بہت دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ اس میں اکثر قابلِ قدر مضامین اور نظمیں شائع ہوتی ہیں۔ علاوہ معنوی خوبیوں کے یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بحیثیتِ مجموعی اس کی لکھائی اور چھپائی وغیرہ بھی خوش مذاقی کا ثبوت دیتی ہیں۔ ہمارے بہت سے رسالے تو اس ظاہری حسن سے بھی عاری ہیں۔ (غلام السیدین)

رسالہ آج کل علمی، لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔ (فراق گورکھپوری)

"آج کل" کا بجا طور پر اردو کے بہترین رسالوں میں شمار ہے۔ اس کے بیشتر مضامین نثر پُر مغز اور دلچسپ معلومات سے لبریز ہوتے ہیں۔ گھناؤنے بیہودہ افسانوں سے اس کا دامن پاک رہتا ہے۔ نظم کے حصے میں بھی ایک امتیازی شان ہوتی ہے۔

(اثر لکھنوی)

"آج کل" اردو کے ان چند مقبول رسالوں میں سے ہے جو ہر ادبی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے عام نمبروں میں علاوہ معلوماتِ عامہ پر مفید مضامین کے ادبی تنقیدیں اور تذکرے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں اور اس میں بلند پایہ نظموں اور پُر کیف غزلوں کا بھی ایک گلدستہ ہوتا ہے۔ (آلِ احمد سرور)

"آج کل" کے نثے میں نے لوگوں کو بے تاب اور منتظر پایا ہے۔ اچھے ادبی اور تنقیدی مضامین تو اس میں شائع ہوتے ہی رہتے ہیں، اکثر ایسے علمی، تہذیبی، فنی اور معلوماتی مضامین بھی نکلتے ہیں جو دوسرے رسائل میں نظر نہیں آتے۔ اس کا یہ تنوع ہی اسے ہر دل عزیز بناتا ہے۔ (احتشام حسین)

فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے	بزنس مینیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی	سالانہ چھ روپے

Edited and Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Governments of India, Old Secretariat, Delhi

Regd. No. D—509

آجکل



مارچ ۱۹۵۹ء

پھاگن چیتر شک سمبت [illegible]

آج کل

دہلی

فہرست

سرورق: جشنِ جمہوریہ کے موقع پر ایک پنجابی دوشیزہ لوک گیت گا رہی ہے۔

جلد ۱۷۔ نمبر ۸

مارچ سنہ ۱۹۵۹ء

پھالگن چیتر شک سمبت ۱۸۸۰

سالانہ چندہ:۔ { ہندوستان میں چھ روپے / پاکستان میں۔ چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے:۔ نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:۔ { ہندوستان میں۔ ۵۰ نئے پیسے / پاکستان میں۔ آٹھ آنے (پاک)

مرتبہ وشائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومتِ ہند

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتہ

بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر 'آج کل' اردو اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ملاحظات

صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر راجندر پرساد نے جشنِ جمہوریہ کے موقع پر قوم سے اپیل کی کہ وہ اپنے خوابوں کے ہندوستان کی تعمیر کے لئے ہر ممکن ایثار کے لئے تیار رہے، کیونکہ آج سب سے زیادہ ضرورت جس چیز کی ہے وہ جذبۂ ایثار ہے، یعنی یہ خواہش اور جذبہ کہ اس وقت ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے اس کو مستقبل کی تعمیر میں لگانے کو تیار رہیں۔ اگر منصوبہ بندی سے عوام کو کچھ دقتیں اٹھانا پڑ رہی ہیں تو امید ہے کہ وہ ملک کے وسیع مفاد کے پیشِ نظر ان کو خندہ پیشانی سے برداشت کریں گے، کیونکہ اس نسل کے لوگ ہی نئے ہندوستان کے معمار ہیں اور ایک شاندار مستقبل کی تعمیر کی ذمہ داری انھیں پر آ پڑی ہے۔

اس سال ۲ جنوری کو روس نے جو کونیاتی راکٹ چھوڑا ہے اس نے خلا پر انسانی فتح کے لئے دروازے کھول دئے ہیں۔ اب تک اس سلسلے میں ایک بڑی مشکل یہ درپیش تھی کہ زمین اور چاند کی کشش پر کیسے قابو پایا جائے۔ اس روسی تجربہ نے بتا دیا کہ انسان اس کشش پر قابو پا سکتا ہے کیونکہ یہ راکٹ چاند کی دنیا کو پیچھے چھوڑ کر نظامِ شمسی میں داخل ہو گیا اور اس نظام کا ایک مستقل سیارہ بن کر سورج کے گرد چکر کاٹ رہا ہے۔ سائنس کی دنیا میں روس کی اس عظیم الشان کامیابی پر منجملہ دیگر لوگوں کے امریکی صدر آئزن ہاور نے بھی مبارکباد دی ہے۔ روس کا وعدہ ہے کہ وہ ان تجربات سے حاصل شدہ معلومات کو اپنے تک محدود نہ رکھے گا بلکہ عام اطلاع کے لئے شائع کرے گا۔ ہمیں امید کرنا چاہیئے کہ فطرت پر انسان کی یہ فتوحات بالآخر دنیا کی عام فلاح و بہبود کا ذریعہ ثابت ہوں گی۔

جنوری میں دہلی یونیورسٹی میں ہندوستانی سائنس کانگریس کا ۴۶ واں اجلاس منعقد ہوا۔ وزیراعظم پنڈت نہرو نے اس اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ سائنس کو صرف انسان کی مادی ترقی ہی کو سامنے نہیں رکھنا چاہیئے بلکہ انسانوں کے دل، دماغ اور روح کی ترقی کی طرف بھی توجہ دینا چاہیئے اور اس طرح مجموعی ترقی کی طرف قدم بڑھانا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ سائنس کی اس تیز رفتار ترقی کے ساتھ ساتھ انسان کے دل و دماغ کی خاطر خواہ پرداخت نہ ہوئی تو انسانیت کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے گا۔ پنڈت نہرو کے الفاظ میں سائنس کی موجودہ ترقی باعثِ مسرت ہے لیکن جب اسے تخریبی مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو اس بات پر دلی رنج ہوتا ہے۔

انڈین نیشنل کانگریس کے ۶۴ ویں سالانہ اجلاس کی کارروائی میں دو باتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو زمینی اصلاحات کا انقلابی پروگرام بنایا گیا ہے۔ دوسرے، تیسرے پنج سالہ پلان کا ایک سرسری خاکہ بھی پیش کیا گیا، جس پر پوری طرح عمل درآمد ہوا تو ملک میں غریبی اور بیکاری کا مسئلہ کافی حد تک حل ہو جائے گا۔ زمینی اصلاحات میں امدادِ باہمی کی تحریک بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ موجودہ حالات میں منظّم ترقی کا یہ ایک مؤثر طریقہ سمجھا گیا ہے، اور سوشلسٹ سماج کی منزل تک پہونچنے کا یہی راستہ ہے۔

صدر کانگریس شری ڈھیبر نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ اگر ملک نے صورتِ حال کے تقاضوں کو پورا نہ کیا تو وہ آگے نہ بڑھ سکے گا۔ وقت دوڑ میں ہمارا مقابلہ کر رہا ہے اور ہمیں نہ صرف یہ کہ صدیوں کی پسماندگی کی تلافی کرنا ہے بلکہ دنیا کے برابر آنا ہے جو دوڑ نہیں رہی بلکہ بے پناہ رفتار سے اڑ رہی ہے۔

ساہتیہ اکادمی نے ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۷ء تک کی بہترین تصنیفات پر انعامات کا جو اعلان کیا ہے اس میں اردو کے مشہور شاعر حضرت جگر مرادآبادی کا نام بھی شامل ہے۔ انھیں اُن کے دیوان "آتشِ گل" پر پانچ ہزار روپیہ کا انعام دیا گیا ہے۔ جگر صاحب اس دور کے عظیم المرتبت شاعر ہیں اور ہر اعتبار سے وہ اس اعزاز کے مستحق ہیں۔ ساہتیہ اکادمی نے یہ انعام دے کر اُن کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ ادارۂ 'آج کل' جگر صاحب کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

جمیل مظہری

فکرِ جمیل

تھی ابھی صبح ابھی شام ہوئی جاتی ہے — زندگی گردشِ ایّام ہوئی جاتی ہے
زندگی "مہلتِ توفیقِ خم آشامی" تھی — زندگی "فرصتِ یک جام" ہوئی جاتی ہے
زندگی طائرِ صحرا تھی بہ شوقِ پرواز — زندگی صیدِ تہِ دام ہوئی جاتی ہے
زندگی ڈال رہی تھی جو ستاروں پہ کمند — اب تماشائے لبِ بام ہوئی جاتی ہے
زندگی یہ ہے کہ با این ہمہ سودائے سفر — زندگی حسرتِ یک گام ہوئی جاتی ہے
زندگی یہ ہے کہ جس ریت پہ جلتے تھے قدم — اب وہی بسترِ آرام ہوئی جاتی ہے
زندگی یہ ہے کہ سویا تھا مسافر تھک کر — سو کے اُٹھا ہے تو اب شام ہوئی جاتی ہے

مظہری فن کا تقاضا ہے کہ لکھئے کچھ اور
یہ غزل کوششِ ناکام ہوئی جاتی ہے

(۲)

کج ادائی تری بدنام ہوئی جاتی ہے — بندگی تجھ پہ اک الزام ہوئی جاتی ہے
اس بہ موسم کی نہیں قید کہ اب آپ کی یاد — فاتحِ گردشِ ایّام ہوئی جاتی ہے
تری بیگانہ نگاہی کا یہ انجام ہے دوست — کہ محبت ہوسِ خام ہوئی جاتی ہے
تھا محبت کے لئے موت کا ارماں مخصوص — مگر اب تو یہ ہوس عام ہوئی جاتی ہے
حسن بالا پہ ہمہ پندار بلندی کیا ہے — اک تجلّی جو لبِ بام ہوئی جاتی ہے
اب تو شرمائے تری پردہ نشینی کا غرور — بندگی فتنۂ اصنام ہوئی جاتی ہے
اک وہ ابہام جو حسرت کشِ تفصیل رہا — اک وہ تفصیل جو ابہام ہوئی جاتی ہے

مژدہ اے ذوقِ سخن جنبشِ لب ہائے جمیل
جنبشِ پردۂ الہام ہوئی جاتی ہے

ظفر حسین خاں

ماہیتِ ذوق و جمال

اگر پھولوں سے رنگ و بو، پرندوں سے زمزمہ سرائی، سبزہ سے ہریالی، شفق سے لالی، ستاروں سے چمک، چشموں سے روانی چھین لی جائے تو پھر اس کائنات بے آب و رنگ میں حیاتِ انسانی کے نشاط کا ساز و سامان کیا رہ جائے گا؟ ہمارے سارے کیف و سرور کا مایۂ خمیر یہی "جنتِ نگاہ" یا "فردوسِ گوش" ہی کے دم سے ہے جن کی رنگین اور سریلی فضاؤں کے باہر بس ہو کا عالم ہے۔

سائنس کی دنیا بھی دنیائے بے آب و رنگ ہے جو یکسر کیف و سرور اور حیاتِ انسانی کی نشاط کاریوں سے خالی ہے۔ سائنس کی نظریں حسن کے دلفریب نگوں کی حقیقت کیا ہے بجز ماوہ کا مرتب و مربوط کی لہر رسائیاں کیا ہیں، ایک رقت شر ہوا متحرک ہے تو باولوں کے حسین و لطافت کی حقیقت کیا ہے؟ پوست اور استخواں، خون اور اعصاب کی ایک ہیئتِ اجتماعیہ۔ سائنس کی نظر میں کارخانہ عالم کی ساری چہل پہل اپنی آخری تحلیل میں حرکت اور اس کی سادی دلکشیاں اپنی آخری اصلیت میں چند خطوطِ سے زیادہ نہیں۔ حرکت اور خطوط ہی کے ذریعے تمام حیاتِ انسانی کی تمام گوناگوں مظاہر کی سائنسی تعبیر و ترجمانی ہو جاتی ہے۔

جمالیات، سائنس کی ضد اور رد عمل ہے۔ وہ حسن و جمال کو جنھیں سائنس نے حیاتِ انسانی سے بے دخل کر دیا تھا از سرِ نو بحال کرنے کی فلسفیانہ سعی ہے۔ جمالیات اس بستی کو جو سائنس کے ہاتھوں تاخت و تاراج ہو چکی تھی از سرِ نو آباد کرتا ہے مسمار عمارتوں کو از سرِ نو تعمیر کرتا ہے اور سائنس کے ویرانوں کو پھر سے رونق بخشتا ہے۔

چنانچہ جمالیاتی نقطۂ نظر سائنس کے نقطۂ نظر سے مختلف ہے۔ جمالیات کی نظر زمان و مکان کے قیود سے آزاد ہے۔ وہ کائنات کو تخیل کی عینک سے دیکھتا ہے۔ ... کے مشہور فلسفی اور ماہرِ جمالیات کے لفظوں میں:

"یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر ہم کائنات کے جمال سے محظوظ ہونا چاہتے ہیں تو چاہیے کہ ہم کسی قدرتی مناظر کو اپنا سر ٹانگوں کے بیچ میں کر کے دیکھیں تاکہ ہمارا معمولی نقطۂ نظر بدل جائے اور وہ منظر ہم کو معمول سے مختلف ایک خیالی منظر سا نظر آنے لگے فطرت کا جمال صرف اُن لوگوں کو نظر آتا ہے جو اہلِ فن کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ماہرینِ حیوانیات اور نباتیات کو حیوانوں اور پھولوں میں جمال نظر نہیں آتا۔ قدرتی جمال کا انکشاف کیا جاتا ہے اور یہ انکشاف اہلِ ذوق و تخیل کے کارناموں کا رہینِ منت ہے۔ یہی کارنامے آگے چل کر بتیوں کی زیارت گاہیں اور سماجی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں (تخیل کے بغیر قدرت کا کوئی حصہ حسین نہیں اور تخیل کی کارفرمائی کے بعد وہی "قدرتی شے" نفسیاتی رجحان کے مطابق کبھی حسن خیز، کبھی بے حسن، کبھی محزون، کبھی مسعود، کبھی سنجیدہ، کبھی مضحک بن جاتی ہے۔ الغرض ایسا قدرتی جمال جس میں فن کار کے ہاتھوں نے کچھ نہ کچھ اصلاح نہ کی ہو، مفقود و معدوم ہے"

(جمالیات صفحہ ۹۹)

آگے چل کر ایک اور مقام پر کروچے کہتا ہے:

"کوئی شخص اگر اس قدرتی منظر کو حسین کہتا ہے جہاں نظر ہریالی سے آسودہ ہوتی ہے یا جہاں جسم آفتاب کی کرنوں کے بوسوں سے مست ہو کر تیز حرکت کرنے لگتا ہے تو وہ حقیقت میں اس قدرتی منظر کی جمالیاتی تعبیر نہیں کر رہا ہے۔"

(جمالیات صفحہ ۱۸۹)

سائنس کی بنیاد عقل پر ہے۔ وہ تمام تر قوانینِ منطق کی پابند ہے۔ اس کے تصدیقات واقعات کے متعلق ہوتے ہیں، جن میں پسندیدگی و ناپسندیدگی اچھائی اور برائی، حسن اور قبح کو کچھ دخل نہیں۔ جو کچھ بھی واقعی ہے، "ہے" خواہ کسی کو اچھا لگے یا برا۔ "آکسیجن ایک گیس ہے"۔ یہ ایک واقعی تصدیق ہے جس میں ہماری پسندیدگی یا ناپسندیدگی کو مجالِ گفتگو نہیں۔

اس کے برخلاف جمالیات کی بنیاد ذوق پر ہے جو اگرچہ اپنی نوعیت میں عقل کا شعبہ ہے، اس لئے کہ وہ بھی عقل کی طرح کچھ فیصلہ کرتا ہے۔ مگر اس کی تصدیقات عقلِ محض سے مختلف ہیں۔ ذوقی تصدیقات میں رد و قبول، پسندیدگی و ناپسندیدگی، حسن و قبح کو خاص دخل ہے۔ چنانچہ جمالیاتی تصدیقات کو سائنس کے واقعی تصدیقات سے ممتاز کرنے کے لئے قدری تصدیقات کہنا بجا نہ ہوگا اس لئے کہ قدری تصدیق میں کسی شے کی قدر و قیمت ہی کا فیصلہ ہوتا ہے۔

جمالیات کی طرح اخلاقیات کی تصدیقات بھی قدری ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے جمالیات اور اخلاقیات ہم نوع ہیں۔ جو قدری ملکہ جمالیاتی تصدیق میں کارفرما ہے ذوق کہلاتا ہے جبکہ اخلاقیاتی تصدیق کے قدری ملکہ کو ضمیر کہتے ہیں۔

شعورِ انسانی کی ساری کارفرمائیاں انھیں تین ملکاتِ نفس کے دم سے ہیں یعنی ذوق، ضمیر، عقل۔ فنونِ لطیفہ کی تمام حسن آرائیاں ذوق کی رہینِ منت ہیں۔ مذہب کے نفوذ و اثر کا دار و مدار تمام و کمال ضمیر پر ہے اور فلسفہ و سائنس کی نازک خیالیوں اور موشگافیوں کی ذمہ دار تمام تر ہماری عقل ہے۔ ذوق، ضمیر، عقل کے موضوعاتِ بحث علی الترتیب، جمال، خیر اور حق ہیں۔ اگر انسان اپنی فطری ساخت میں ذوق، ضمیر اور عقل سے محروم ہوتا تو پھر دنیا میں فنونِ لطیفہ، مذہب و اخلاقیات اور فلسفہ و سائنس کا وجود نہ ہوتا۔

اس لئے بجا طور پر نشاۃِ جدیدہ کے اکثر فلاسفہ نے جمال، خیر اور حق کی ماہیت کی تحقیق سے قبل ذوق، ضمیر اور عقل کی ماہیت کی تحقیق کو ضروری سمجھا ہے اور ذہنی کاوشوں کے نقشِ قدم پر ان کاوشوں کے نتائج کا سراغ لگانے کی سعی کی ہے۔

سراغِ تعبِ نالہ لے داغِ دل سے

فلسفہ کا فریضہ کل علوم کی نگرانی ہے کہ وہ اپنی راہ سے بھٹکنے نہ پائیں۔ اس لئے اس کا طریق کار تمام تر جائزہ اور تنقید ہے۔ اس لحاظ سے فلسفہ کے فیصلہ اور محاکمہ، قضیہ اور تصدیقیں واقعی بھی ہوتی ہیں اور قدری بھی۔ عام

درسی رواج کے مطابق منطق، اخلاقیات اور جمالیات فلسفہ کی شاخیں سمجھی جاتی ہیں چنانچہ دنیا کی کسی یونیورسٹی میں جمالیات، اخلاقیات یا منطق کے علیحدہ علیحدہ شعبہ نہیں ہوتے۔ فلسفہ کے عام شعبہ ہی میں ان کا ضمنی مقام قرار دیا گیا ہے تعجب ہے کہ فنونِ لطیفہ جو جمالیات کے خوشہ چیں ہیں اپنی اپنی بڑی بڑی درسگاہیں رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہمارے ملک میں موسیقی کی ایک یونیورسٹی ہے مگر جمالیات کو کسی یونیورسٹی میں کرسی نصیب نہیں۔ اس مسئلہ کی تفصیلی بحث میں جانے کا یہ محل نہیں۔ تعلیمی پالیسی ہمیشہ کچھ عملی اغراض سے وابستہ ہوتی ہے اور نظری و علمی مقاصد تعلیمی پالیسیوں میں اکثر نظرانداز ہو جاتے ہیں۔

بہرطور یہاں بحث فلسفہ اور علم کے باہمی علاقہ کے متعلق تھی۔ ہر علم کا بالا اس کا ایک فلسفہ ہو سکتا ہے، چنانچہ سائنس کے اوپر اس کا فلسفہ بھی ہے جس کی جانب زمانہ حال میں وائٹ ہیڈ اور ایڈنگٹن نے خاص اعتنا کیا ہے اسی طرح فلسفہ حق یا علمیات Epistemology ہے جو کہنا چاہئے منطق کا فلسفیانہ محاکمہ ہے علی ہذا فلسفۂ جمال بھی ایک فلسفیانہ شعبۂ تحقیق ہے جو جمالیات کے مختلف نظامات کا جائزہ ہے۔

فلسفہ کا سارا کارنامہ یہ ہے کہ وہ کسی علم کے بنیادی تصورات کو لے کر ایک منظم ہیئت Pattern میں پیش کر دے جس میں مختلف تصورات علی قدرِ مراتب ظہور پذیر اور ان تصورات کے باہمی علائق اجاگر ہو جائیں۔ لیکن کیا فلسفۂ جمال فکر کی گرفتِ امکان میں آ سکتا ہے۔ جرمنی کے مشہور فلسفی کانٹ کا تو خیال ہے کہ:

"اگر ہم کائناتِ عالم کا جائزہ محض تصوراتِ کلیہ کے ماتحت لینا شروع کر دیں تو جمال کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ایسا کوئی عقلی کلیہ نہیں ہو سکتا جس کے مطابق ہم کسی شے کو حسین کہنے پر مجبور ہو جائیں۔ ہم کسی دلیل یا کسی بنیادی اصول کی بنا پر لوگوں کو یہ ماننے پر مجبور نہیں کر سکتے کہ فلاں لباس، فلاں عمارت یا فلاں پھول حسین ہے۔ اس کام کے لئے انسان کو اپنی آنکھیں استعمال کرنا ہوں گی یعنی کسی شے کی دل پسندی کا مدار ادراک پر ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ جب ہم کسی شے کو حسین کہتے ہیں ہم اپنی جگہ یقین کرتے ہیں کہ ہم رائے عامہ کا اظہار کر رہے ہیں اور یہ کہ ہماری رائے سے ہر شخص متفق ہے چونکہ نفس نفی ادراک کی بساط بس اتنی ہے

کر وہ منزہ ہو سکے ہے یا اس کی ذاتی پسندیدگی کے لئے قولِ فیصل ہوسکتا ہے۔" (تنقید قوتِ تصدیق صفحہ ۵۰-۴۹۔ جرمن ایڈیشن از کرشمن)

المانیہ کا فلسفی کروچے بھی اس باب میں کانٹ کا ہم خیال ہے۔ وہ کہتا ہے:

"وہ تمام کتابیں جن کا موضوع بحث فنون کے انواع اور نظامات کا تعین کرنا ہے بغیر کسی نقصان کے نذرِ آتش کی جا سکتی ہیں۔"

(جمالیات ص ۱۲۴۔ انگریزی ترجمہ)

ان دونوں فلسفیوں کی رائے کے مطابق تو جمالیاتی تنقید کا سارا دفتر بے معنی ہوگیا۔ کانٹ اور کروچے کی رائے سے کس کو اختلاف ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے منطق کے تصوراتِ کلیہ اور سائنس کی تقسیم و تنویع کی گرفت میں جمال کس طرح آسکتا ہے اور جس کے وسیلہ سے ہم دوسروں سے جمال کی ماہیت بیان کرسکتے ہیں۔

شعورِ انسانی میں کبوتروں کے کابک کی طرح علیحدہ علیحدہ خانے نہیں بلکہ وہ ایک ایسی دھارا ہے جس میں مختلف جانب سے چشمے آکر شامل ہوتے ہیں۔ ہر کیفیتِ نفس ایک مرکب کیفیت ہے۔ سہولتِ بیان کے لئے ہم، شعور میں جس کیفیت کا غلبہ ہوتا ہے، اسی کے نام سے اس کیفیت کو موسوم کرلیتے ہیں۔ مثلاً تصور، جذبہ، ارادہ لیکن اگر غور سے دیکھئے تو ہر تصور میں جذبہ اور ارادہ کا شائبہ ملے گا ہر جذبہ میں تصور اور ارادہ شامل ہوگا اور ہر ارادہ میں تصور اور جذبہ کا عکس نمایاں ہوگا۔

توجہ ایک عقلی عمل ہے مگر توجہ کو قائم رکھنے کے لئے دلچسپی ایک ضروری جزو ہے مگر دلچسپی عقلی نہیں بلکہ ایک جذبی کیفیت ہے اور ارادہ تو توجہ کا خاص عنصر ہے۔ اسی طرح جذبۂ محبت کی تحلیل کیجئے تو اس میں محبوب کا "تصور" اور "خواہشات" اور "ارادوں" کے عناصر ملیں گے۔ علیٰ ہذا کسی ارادہ کے عمل کو لیجئے، مثلاً آپ کا قصد ایک طویل سفر پر جانے کا ہے اس قصد کی تحلیل کیجئے تو اس میں تصورات اور جذبات کے اجزا ملیں گے۔

تخیل کی قوت عقل اور جذبات کے برزخ میں ہے۔ چنانچہ اس کا دائرۂ تصرف ایک طرف ہمارے تمام احساسات، ادراکات، تصورات اور دوسری طرف ہماری خواہشات، جذبات، تمناؤں اور آرزوؤں کی جانب پھیلا ہوا ہے۔ چناں چہ تخیل تصورات اور جذبات کو سمو کر کچھ ایسے خیالات پیش کرسکتا ہے جنھیں ہم تخیلی تصورات کہہ سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان تخیلی تصورات کی تصدیق عالمِ آب و گل کے واقعات سے نہ ہو جو سائنس کا عالم ہے۔ مگر عالمِ خیال کے امکانات اس قدر وسیع ہیں کہ یہاں سب ممکن ہے بشرطیکہ وہ تخیلی سیاق و سباق کے مطابق ہوں۔ تخیل کی منطق کوئی نئی منطق نہیں وہی پرانی ارسطا طالیسی منطق ہے جو سائنس کی آخری عدالتِ مرافعہ ہے۔ تخیلی منطق میں مقدمات اور مفروضات کی نوعیت جداگانہ ہوتی ہے اس لئے نتائج کی نوعیت بھی جداگانہ ہوتی ہے۔ زمین وہی مادی حقیقت کی ہوتی ہے مگر اس پر تخیل ہر بار نئے طرز سے باغ لگاتا ہے۔ انھیں چمن آرائیوں کا نام کہیں شاعری، کہیں مجاز بیانی اور استعارہ طرازی، کہیں مصور و بت تراش کا تخیل، کہیں ماہر موسیقی کا خیال ہو جاتا ہے۔ چناں چہ تخیلی عالم کے زمان و مکاں بھی مجازی ہوسکتے ہیں۔ تخیلی مکان کا تصور اس مکان سے کیجئے جو آپ آئینہ میں دیکھتے ہیں جو ہے بھی اور نہیں بھی اور تخیلی زمان کا تصور عالمِ رویا کے زمان سے کیجئے جو منٹوں میں مہینوں کی روئداد من و عن پیش کر دیتا ہے۔ کلاک کے سیکنڈ خواب میں گھنٹے اور منٹ دن بن جاتے ہیں۔ چناں چہ مصور کا کمال مجازی مکان کی تخلیق اور ماہر موسیقی کا کمال مجازی زمان کی تمثیل ہے۔ اس مجازی یا تخیلی مکان و زمان کے آلۂ پیمائش، انچ، فٹ، گز یا سیکنڈ، منٹ اور گھنٹے نہیں بلکہ ہماری شعوری کیفیات ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ خوشی کے گھنٹے اس قدر جلد گزرتے ہیں کہ گزرتے نہیں معلوم ہوتے، جبکہ غم کے لمحے کاٹے نہیں کٹتے پہاڑ ہو جاتے ہیں۔ جیسے یار میں:

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

غرضکہ عالمِ تخیل کا شستش جہت نرالا ہے۔ حافظ نے اسی عالم کو بسانے کا بیڑہ ان الفاظ میں اٹھایا تھا:

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ نو در اندازیم

ضروری گذارش ۱۔ مضمون کاغذ کے ایک طرف اور خوش خط لکھئے۔ ۲۔ غیر مطبوعہ مضامین اُسی صورت میں واپس کئے جائیں گے جب کہ اُن کے ساتھ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک ٹکٹ ہوں گے۔ (ادارہ)

محمد عمر یوسفی

ذکرِ امجد

دکن کا مردم خیز خطہ دُنیائے ادب میں امتیازی خصوصیات کا حامل ہے اس کی خاک سے اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ اٹھا۔ جس کا زمانہ وَلی سے تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے کا ہے۔ تلنگانہ کے باعظمت قطب شاہوں نے "دکھنی" یعنی قدیم اُردو کی دل وجان سے خدمت کی اور ایرانیوں کو چھوڑ کر عوام کے ساتھ گھل مل گئے۔

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے لے کر آج تک ایسے شاعروں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ جو اپنے کلام میں وحدانیت، تصوّف اور عرفان کے ساتھ ساتھ عوامی دور کی ترجمانی کرتے چلے آرہے ہیں جن کا کلام پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ انسان آج سے صدیوں قبل کی دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

امجد بھی اسی سلسلے کی شاید آخری کڑی ہیں جو قطب شاہوں کے لگائے ہوئے چمن بے خزاں کی آبیاری کرتے چلے آرہے ہیں۔ جن کا کلام مایوس دلوں کے لئے پیامِ حیات ہے۔ ہند و پاک میں آپ رُباعی گو شاعر مشہور ہیں مگر یہ تصویر کا ایک ہی رُخ ہے۔ آپ نے نظمیں، غزلیں، قصائد اور قطعات بھی اسی پیمانے پر کہے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو نثر میں آپ کے بے شمار جواہر پارے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

سیّد احمد حسین امجد ۵ رجب ۱۳۰۵ھ بروز دوشنبہ بوقت صبح حیدرآباد فرخندہ بنیاد (موجودہ آندھرا پردیش کی راجدھانی) کے قدیم تاریخی محلے بازار گھانسی میاں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد صوفی سیّد رحم علی ایک خدا ترس بزرگ تھے جن کی چار بیویاں تھیں۔ جن سے بیس بچّے پیدا ہوئے اور فوت ہو گئے۔ حضرت امجد اکیسویں ہیں۔ چلہ کے دن گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ آپ کے والد مسجد سے گھر آرہے تھے کہ راستے میں فالج کا حملہ ہوا اور گھر پہنچ کر انتقال کر گئے۔ انتقال سے قبل اپنی رفیقۂ حیات سے کہنے لگے کہ "ہمارا غم نہ کرنا بچّے سے جی لگا لینا، یہ بچّہ جئے گا اور کچھ ہو کر رہے گا۔" غالباً یہ انھیں کی دُعاؤں کا اثر ہے کہ آپ نے شاعری میں اتنا بڑا کمال حاصل کیا۔ جو پانی زچہ بچّہ کے غسل کو گرم کیا گیا تھا وہ مرحوم کے غسل میّت کے کام آیا۔ اب اور قرآن حکیم محلہ کی مسجد میں ختم کیا۔ چوں کہ آپ سے پہلے آپ کی والدہ کی ایک لڑکی فوت ہو چکی تھی۔ اس لئے آپ کی پرورش بڑے لاڈ چاؤ سے ہوئی۔ پھر آپ دکن کی قدیم دینی درس گاہ جامعہ نظامیہ میں تعلیم پاتے رہے۔ یہاں تک کہ چھ سال گذر گئے۔ ان دنوں دکن میں بڑی سخت گرانی تھی۔ آپ ایک لڑکی کو پڑھانے صرف دو روپے ماہوار پر چار میل جایا کرتے۔ ہر روز صبح آغا سیّد علی شوشتری کے پاس درس لینے کوہ مولا علی پیدل جاتے۔ جو دارالسلطنت سے تقریباً دس میل دُور واقع ہے۔ انھیں حالات میں زندگی کے اٹھارہ سال گزر گئے۔ پھر آپ نے پنجاب منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ آپ نے شادی کی اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کے دو سال بعد والدہ سے ناراض ہو کر بنگلور چلے گئے۔ پردیس میں کہاں ٹھکانہ ملتا مجبوراً ایک عیسائی مشن کے ساتھ ہو لئے۔

ہزاروں کوشش کے لوگ شہر جاکر عیسائیت کا پرچار کرتے ساتھ امجد بھی ہوتے۔ ایک طرف تو عیسائیت کا پرچار ہوتا اور دوسری طرف حضرت امجد لوگوں کو دعوتِ اسلام دیتے اور لُطف یہ کہ واپسی مشن کی گاڑی میں ہوتی۔ اس طرح کئی لوگ آپ کے حامی اور کئی مخالف پیدا ہو گئے۔ پھر آپ نے وہاں ۱۵ روپے مہینہ پر ایک مدرسہ میں ملازمت شروع کی۔ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ بنگلوری مولویوں کا ایک وفد صدر مدرسہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا کہ "یہاں کوئی امجد نامی نائک کا ایکٹر رہتا ہے اُسے نکال دیا جائے" مگر ان کو ناکام لوٹنا پڑا چوں کہ اس وفد میں تو صدر مدرسہ کے علاوہ کئی عہدہ داران تعلیمات امجد کے شاگرد ہو چکے تھے۔ اس طرح چار ماہ گذار

کی والدہ کی وجہ سے دوبارہ حیدرآباد واپس ہوئے اور ایک روز "رباعیات امجد" مطبوعہ آگرہ کی ایک جلد مولوی عزیز مرزا کی خدمت میں پیش کی اس پر انھوں نے دریافت کیا: "کیا مولوی امجد نے بھیجا ہے" یہ سن کر آپ نے جواب دیا "جی ہاں یہ کتاب بھی امجد ہی نے بھیجی ہے اور پیش کرنے والا بھی امجد ہے" اس طرح اُن سے تعلقات پیدا ہوئے اور انھیں کی سفارش پر بیس روپے مہینہ پر دارالعلوم ہائی اسکول میں مدرس مقرر ہوئے۔ اس دوران میں آپ نے ایک مکان بھی خرید لیا اس طرح چند سال گذرے کہ ۱۹۰۸ء میں رودِ موسیٰ کی طغیانی کا درد انگیز سانحہ پیش آیا۔ آپ کا مکان رودِ موسیٰ سے تقریباً ساٹھ گز کے فاصلہ پر واقع تھا۔ شعبان کی آخری رات تھی موسیٰ ندی جلال میں آنے لگی اور بے تحاشہ بڑھ کر اپنے دونوں کناروں کی طرف بڑھنے لگی۔ رات کے ۸ بجے پانی گھر میں گھٹنوں گھٹنوں تک چڑھ آیا۔ اُس وقت آپ نے والدہ سے چلنے کو کہا مگر وہ مکان چھوڑنے پر کسی صورت میں راضی نہ تھیں۔ پانی برابر چڑھتا جا رہا تھا۔ رات کے دس بجے تک مکان چاروں طرف سے محصور ہو گیا۔ آپ نے مکان کے قریب ایک گھر میں پناہ لی جو بہت پختہ ہونے کے علاوہ پہلے ہی رودِ موسیٰ کے طوفانی تھپیڑوں سے ٹکر لے چکا تھا۔ چونکہ مکان پناہ گیروں سے بھر گیا تھا اس لئے آپ کے خاندان کو جس میں والدہ، بیوی اور بیٹی شامل تھیں دیوان خانہ میں پناہ ملی۔ تھوڑی ہی دیر بعد قبلہ رُخ کی دیوار شق ہوئی اور پانی دندناتا ہوا کمرے میں گھس آیا جب پانی بھر گیا تو کمرے کے بیچ میں تخت ڈال کر بیٹھ گئے۔ اور چھت کا یہ حال تھا کہ اب گری کہ اب گری۔ اُس وقت سب لوگ آنکھیں بند کئے ہاتھوں سے سر کو تھامے موت کے انتظار میں بیٹھے" کہا سُنا معاف کرانے ماؤں سے دودھ اور بیویوں سے مہر بخشوانے میں مصروف تھے۔

دفعتاً اس خیال نے ذہن میں انگڑائی لی کہ کمرے میں دب کر مرنے کے بجائے کھلے میدان میں کیوں نہ جان دی جائے۔ آپ نے اس کو عمل میں تبدیل کیا اور میدان کی طرف شق شدہ دیوار کے راستے باہر نکلے۔ جونہی آپ نے مکان کے باہر قدم رکھا مکان کی چھت بیٹھ گئی۔ آپ اندھیرے میں پیروں سے راستہ ٹٹولتے ہوئے ایک چبوترے تک پہنچ گئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ پانی چڑھتا جا رہا تھا۔ چاروں طرف گھُپ اندھیرا چھایا ہوا تھا مینہ لگاتار برس رہا تھا، موجوں کے شور اور گرتے ہوئے مکانوں کے دھماکوں سے جو کبھی بجلی کی کڑک کبھی توپوں کی گرج کے مشابہ تھے۔ دل سینہ میں دہل دہل کر رہ جاتا تھا۔ جب آپ چبوترے پر آئے تھے تو پانی اس کی منڈیر سے نیچے تھا لیکن وقت کے ساتھ دو بجے تک پانی کمر تک پھر کمرت گردن تک آن پہنچا۔ اس خیال سے کہ بہہ نہ جائیں سب آگے بڑھے اور پانی میں ڈوب گئے۔ اتفاقاً آپ کے قدم پھوس کے چھپر پر جا پڑے اور ساتھ ہی اُبھر آئے اور دوسرے ڈوبتے ہوؤں کو بچایا۔ یہاں تک کہ صبح کاذب نمودار ہوئی دُور دُور کی مسجدوں سے اللہ اکبر کی صدائیں آنے لگیں۔ سب سمجھ رہے تھے کہ دن کے اُجالے میں بچاؤ کی کوئی صورت نکل آئے گی۔ مگر وہ صبح بھی صبح قیامت سے کچھ کم نہ تھی۔ شہر پناہ جو اپنے دامن میں بہت سارے پانی کو سمیٹے ہوئے تھی۔ موسیٰ کی سرکش موجوں سے ٹکراتے ٹکراتے نڈھال ہو کر گر پڑی اور پانی دُور دُور تک پھیل گیا۔ اب تک پانی میں ٹھہراؤ باقی تھا مگر فصیل کے گرنے سے اس میں روانی آگئی جس میں لاکھوں بندگانِ خدا بہے چلے جا رہے تھے۔ ایک شہتیر بہتا ہوا چلا آ رہا تھا، بچاؤ کے خیال سے آپ اُس کی طرف لپکے مگر اس کے پیچھے بہنے لگے۔ بہتے بہتے ایک درخت کی ٹہنی ہاتھ لگی جس پر سوار ہو کر ڈوبنے والوں کی طرف نظر کی اور والدہ کو آواز دی کہ کوئی بہتا ہوا صندوق مل جائے تو بچی کو بند کر کے اِدھر بہا دیں شاید وہ نکال لیں اور خود کو بھی کسی تختہ کے سہارے سرکش موجوں کے حوالے کرنے کا مشورہ دیا۔ قسمتوں کی بات ایک بڑا صندوق آپ کی والدہ کے ہاتھ لگا۔ مگر وہ مقفل نکلا پھر ساس اور بہو ایک تختہ کے سہارے دھارے میں بہنے لگیں۔ بچی دادی کی کمر سے بندھی ہوئی تھی ڈرامہ کا خطرناک منظر شروع ہی ہوا تھا کہ بہو کے ہاتھوں سے تختہ چھوٹ گیا اور تہ آب ہو گئیں —— تھوڑی دیر بعد والدہ بھی نہ سنبھل سکیں، کبھی ڈوبتیں کبھی اچھلتیں، کبھی صرف سر کے بال نظر آتے۔ پھر بہتے بہتے بیٹے کے قریب پہنچ گئیں اور کہا کہ "بچی کمر سے بندھی ہوئی ہے جو پانی میں لٹک گئی ہے جس کی وجہ سے میں اُبھر نہیں سکتی" پھر فرمایا "بیٹا میرے دونوں چاند ڈوب گئے" یہ تھے وہ آخری الفاظ آپ نے اپنی ماں سے سُنے۔ اُس بات چیت کے دوران میں جس ڈالی پر امجد تکیہ کئے ہوئے تھے وہ ٹوٹ گئی۔ ماں سے یہ منظر دیکھا نہ گیا اور ہیبت کے مارے ڈوب گئیں۔ اب حضرت امجد تیز دھارے میں بہے چلے جا رہے تھے۔ دفعتاً آپ تیز دھارے سے نکل کر دوسرے کمزور دھارے میں جا پڑے۔ دیر تک بہتے رہے یہاں تک کہ وکٹوریہ زنانہ ہسپتال کے احاطہ میں پہنچ گئے جہاں بیمار عورتوں نے بڑی مشکل سے آپ کی جان بچائی۔ اس دردناک سانحے پر آپ نے ایک مرثیہ "قیامتِ صغریٰ" تحریر فرمایا جو اب شعر و ادب کا بے نظیر شاہکار ہے۔

اس سانحے نے آپ کے دل پر بڑی کاری ضرب لگائی اور آپ دنیا کے جھمیلوں سے دامن چھڑا کے خدا کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگے۔ اس واقعے نے امجد کو حضرت

امجد بنا دیا۔ بیعت میں آپ کا سلسلہ حضرت شمس الدین فیض دہلوی سے ملتا ہے۔

پھر ایک طویل عرصہ تک گھر بار بسانے کا خیال بھی ذہن میں نہ لاسکے۔ اتفاقاً بغیر کسی کوشش کے آپ کا عقد ثانی مولانا سیّد نادر الدین کی دختر نیک اختر بی بی جمال النسا سے قرار پایا۔ وہ ۲۲ ربیع الاول ۱۳۴۰ھ کو امجد کو داغ مفارقت دے گئیں۔ آپ بڑی خدا ترس بی بی تھیں۔ مولانا نادر الدین جیسے جیّد عالم کی بیٹی تو تھیں ہی شوہر ملا تو وہ بھی امجد۔ گویا پیاسے کو دریا مل گیا، آپ بہترین شاعرہ تھیں۔

اس حادثے نے امجد کے دل کو بڑی ٹھیس پہنچائی۔ دن رات ماضی کی باتوں میں گم رہتے اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد آپ کا تیسرا عقد ہوا۔

اب آپ دفتر محاسبی میں مہتمم ہو گئے مگر اس شان قلندری کے ساتھ کہ عمارت کی اونچی سیڑھیوں پر سے اپنی سائیکل خود کندھے پر اٹھا کر لے جاتے ۱۳۵۱ف میں آپ وظیفۂ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ آپ نے یکے بعد دیگرے چار عقد کئے اور متعدد اولادیں ہوئیں مگر سب فوت ہو گئیں۔ آپ کی پوری زندگی ایک امتحان ہے اور آپ ہر امتحان میں مردِ مومن کی طرح سرِ تسلیم خم کر کے منزل بہ منزل آگے بڑھتے جاتے ہیں

ایک صاحب آپ کے کلام سے متاثر ہو کر بیرون ہند سے ملنے آئے اور کہا کہ "قبلہ آپ کا کلام تو بڑا استادانہ ہے! کچھ اپنا شجرہ بیان فرمایئے۔" اس پر فوراً آپ کی زبان سے نکلا۔

سیّد احمد حسن ہوں امجد ہوں　　　حسان الہند ثانیِ سرمد ہوں
کیا پوچھتے ہو حسب اور نسب کو میرے　　　میں بندۂ لم یلد و لم یولد ہوں

امجد نے سرمدؒ کا اثر بہت قبول کیا ہے یہی وجہ ہے کہ دونوں کی فکروں کے سانچے کہیں کہیں ایک معلوم ہونے لگتے ہیں۔ مگر دونوں میں فرق ضرور ہے۔ امجد کے پاس احساس کے ساتھ زور اور تڑپ موجود ہے اور یہ چیزیں کلام میں نمایاں ہیں۔ سرمدؒ کے یہاں سوز و گداز جذب و مستی کے ساتھ شدید تلخ تجربات کی جھلک پائی جاتی ہے مگر مسلک کے لحاظ سے دونوں میں فرق ضرور ہے۔

امجد اپنے منکسرانہ انداز میں فرماتے ہیں اور یہی کلام امجد کی تفسیر ہے۔

نہ ذکرِ بلبل ہے نہ داستانِ بہار　　　نہ وصفِ سنبل و ریحاں نہ مدحِ بادِ شمال
نہ کوئی لطفِ بیاں ہے نہ خوبیِ مضموں　　　نہ حسن و عشق کا قصہ نہ شاعرانہ خیال

آپ نے عام فہم سادہ اور سلیس زبان استعمال کی ہے جسے بچے، بوڑھے عورت، مرد سبھی سمجھتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ عربی اور فارسی کے تشبیہ اور استعارے اس طرح برتتے ہیں کہ پڑھنے والے پر گراں نہیں گذرتے، رُباعی کے تعلق سے کہا جاسکتا ہے کہ رُباعی کا ہر مصرع چُست ہونا چاہئے اور دوسرا مصرع پہلے سے بلند پایہ ہونا ضروری ہے اور چوتھا مصرع تو رُباعی کی جان ہے جس پر رُباعی کے پورے مطلب کا دار و مدار ہے۔ حضرت امجد رُباعی کے فن کے اعتبار سے پورے اترتے ہیں اس صنف میں ان کا کوئی مدمقابل نہیں۔

کلامِ امجد کے مطالعے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان کے پاس تین قسم کے مضامین ہیں۔ پہلی قسم میں آیات و احادیث کے مطالب ہیں۔ دوسری میں تصوف کے مسائل جیسے عبد و رب و جبر و قدر اور وحدۃ الوجود وغیرہ، تیسری قسم میں اخلاقی اور حکیمانہ مضامین کے ساتھ ساتھ زندگی کے تلخ تجربات سے بحث کی گئی ہے۔

اس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے　　　کیا ذکر صفات ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی، جاہل سہی، نادان سہی　　　سب کچھ سہی تیری بات رکھ لی میں نے

"یعنی خدائے تعالےٰ نے کوئی شے بے کار نہیں بنائی۔"

ہیں دونوں جہاں کسی کی رونق کے لئے　　　ہر قید ہے یاں بیانِ مطلق کے لئے
پہلے تو وجود ہی نہیں باطل کا　　　گر ہے بھی تو ہے معرفتِ حق کے لئے

وحدۃ الوجود کے مسئلے پر شعراء نے خوب طبع آزمائی کی ہے مگر ان میں ایک حد تک پھیکا پن پایا جاتا ہے۔ لیکن امجد کا فن خشک ترین مضامین کو بھی رُباعی کے سانچے میں ڈھال کر شیریں کر دیتا ہے۔

ذرّہ ذرّہ میں خدائی دیکھو　　　ہر بُت میں شانِ کبریائی دیکھو
اعداد تمام مختلف ہیں باہم　　　ہر ایک میں مگر اکائی دیکھو

ہیں مستِ مئے شہود تو بھی میں بھی　　　ہیں محوِ نمود تو بھی میں بھی
یا تو ہی نہیں جہاں میں یا میں ہی نہیں　　　ممکن نہیں دو وجود تو بھی میں بھی

عبد و معبود کے رشتہ کو یوں بیان فرماتے ہیں۔

بے خود رہوں تو وہ قریں آتا ہے　　　اس پردہ میں وہ پردہ نشیں آتا ہے
جب وہ آتا ہے میں نہیں رہتا ہوں　　　جب میں رہتا ہوں وہ نہیں آتا ہے

غم میں ترے زندگی بسر کرتا ہوں　　　زندہ ہوں مگر ترے لئے مرتا ہوں
ہر ایک قدم تری ہی طرف بڑھتا ہے　　　ہر سانس کے ساتھ تیرا دم بھرتا ہوں

اسلام مسئلہ تقدیر اور خدائے تعالےٰ کی ماہیت سے متعلق بالکل خاموش رہنے کا حکم دیتا ہے۔ اکثر صوفیائے کرام اور شعرائے قدیم نے اس میدان میں خوب طبع آزمائی کی ہے مگر کوئی ندرت پیدا نہ کر سکے۔

ناحق پھیر پھیر کے سر پھرایا میں نے　　　اپنی کوشش سے کچھ نہ پایا میں نے

طوفان میں ہے کشتیٔ امید مری
لے تو ہی سنبھال ہاتھ اٹھایا میں نے

پابندِ خیال میری تقدیر رہی
آزادی پہ بھی پاؤں میں زنجیر رہی

تو نے یعنی خدا کا حکم کوشش کر لی
تدبیر بھی وابستۂ تقدیر رہی

خدا تعالےٰ کی ماہیت سے متعلق فرماتے ہیں۔

ذرہ ذرہ پہ فضلِ کبریا ہوتا ہے
اک چشم زدن میں کیا سے کیا ہوتا ہے

اصنام دبی زباں میں یہ کہتے ہیں
وہ چاہے تو پتھر بھی خدا ہوتا ہے

آپ اپنی شاعری سے متعلق فرماتے ہیں۔

لازم ہے کہ آہ بھی لبوں سے نکلے
اک واہ ہی شاعری کا مقصود نہیں

یوں تو آپ کی بے شمار رُباعیاں اور قطعات ضرب المثل بن گئے ہیں صرف ایک قطعہ بطور مثال پیش ہے۔

قطعہ

کچھ کئے جاؤ لے کے نام خدا
کچھ نہ کرنا بڑی خرابی ہے

کامیابی کچھ اور چیز نہیں
کام کرنا ہی کامیابی ہے

تم چاہتے ہو حیاتِ جاوید اگر
امجد صاحب کسی پہ مر کے دیکھو

دنیا کو ثبات دنیا میں نہیں
اک لحظہ قرار موجِ دریا میں نہیں

عالم کا وجود صورتِ لا سمجھو
لفظاً موجود ہے اور معنی میں نہیں

اپنی جانِ عزیز اپنی نہ ہوئی
عقل و خرد و تمیز اپنی نہ ہوئی

ہم ہی کچھ اُن کو نہ رکھتے امجد
افسوس کہ کوئی چیز اپنی نہ ہوئی

یہ نالۂ شب ہے کہ فغاں ہے کیا ہے!
اعجاز ہے سحر ہے فسوں ہے کیا ہے؟

منہ موت نے بند کر دیا آخرکار
ہم کہتے ہی رہ گئے یہ کیوں ہے کیا ہے؟

بچپن ہی کے پہلو میں جوانی بھی تو ہے
باقی ہی کے آغوش میں فانی بھی تو ہے

سمجھے ہو غلط روح جدا جسم جدا
جو برف کی شکل ہے وہ پانی بھی تو ہے

جب سے ظہورِ شکلِ امکانی ہے
وحدت میں دوئی کا وہم نادانی ہے

دھوکہ ہے نظر کا ورنہ ہر شے ہمہ اوست
گرداب، حباب، موج سب پانی ہے

ہر شخص کو خوش دیکھو عید یہ ہے
ہر چیز کو اچھا کہو تمہید یہ ہے

مخلوقِ خدا ہے سب خدا کی مخلوق
سب کو تم ایک کہو توحید یہ ہے

ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے
آرام سے سونا بھی بڑی دولت ہے

افلاس نے سخت موت آساں کر دی
دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے

امجد صاحب راہبوں کی طرح بڑی سادہ، گوشہ نشینی کی اور درویشانہ زندگی گذارتے ہیں۔ انتہا یہ کہ خود گھر کے مشاعروں میں شرکت نہیں کرتے۔ امجد ذی وقار کا آستانۂ عالی ہر وقت تشنگانِ دید سے بھرا رہتا ہے، ان جبیں سائی کرنے والوں میں کجکلاہ، صوفی، خداپرست، دہریے، بُت پرست، غرض سبھی شامل رہتے ہیں۔ ۱۹۳۳ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ کی جانب سے آپ کی شعری خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے "حکیم الشعراء" کا خطاب عطا کیا گیا۔ حضور نظام کے دربار سے گرامی، امیر مینائی، داغ، جلیل اور فانی تو فیض یاب ہوتے رہے مگر دکن کے اس کوہ نور کی کسی نے خبر نہ لی وہ صرف اہلِ دل کی خلوتوں کو گرماتا رہا۔

ادارۂ ادبیات اردو قابلِ مبارکباد ہے کہ اس کے تحت ۳۱ جنوری ۱۹۵۵ء کو آپ کا جشنِ ڈائمنڈ جوبلی منایا گیا۔ جس میں ملک بھر کے جامعات ادبی اور ثقافتی اداروں کے نمائندوں کے علاوہ ایران کے نمائندے نے شرکت کی۔ جوش ملیح آبادی نے امجد کے حضور میں نذرِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا:

"حضرت امجد کا شرف و مجد دراصل اس کا مقتضی تھا کہ ان کی قدر شناسی کی جاتی۔ میں آپ تمام حضرات کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے امجد کی جوبلی مناکر اپنے ذوق کی صحت اور ذہن کی شرافت کا کتنا بڑا ثبوت دیا ہے جس کا ذکر ناممکنات سے ہے۔ حضرت امجد میرے پُرانے دوست ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اپنے عقیدے کی بنا پر ایک ایسے جادہ پر گامزن ہیں جس کے دونوں طرف بوڑھی عورتوں کی سی عقیدت رکھنے والے درویشوں کے خیمے نصب ہیں۔

لیکن اس اختلافِ مسلک کے باوجود جب میں امجد کی رُباعیاں پڑھتا ہوں اور سُنتا ہوں تو جھوم جھوم جاتا ہوں۔ یہ امجد کی شاعرانہ عظمت کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ میں بھی ان کے اشعار پر وجد کرتا ہوں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ میں اپنے آپ کو خدا نخواستہ کوئی بڑا آدمی سمجھتا ہوں۔ میرا مقصد اس سے یہ ہے کہ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں ان کے اشعار کی معنویت سے غیر متفق ہونے کے باوجود میں ان کے اشعار پر سر دھنتا ہوں اور وہ شاعر جو منکر و مخالف کو بھی داد دینے اور قدر کرنے پر مجبور کرے کوئی معمولی شاعر نہیں ہو سکتا۔

اختلافِ مسلک کی بنا پر میں نے اکثر چاہا کہ میں ان کے اشعار سے لطف اندوز ہونا ترک کر دوں مگر جنابِ والا جادو وہ جو سر پڑھ کر بولے۔ مجھے اس کا اقرار ہے کہ میں اس پر قادر نہ ہو سکا۔ اور کیسے ہو سکتا ؎

ہم نے برسات کے موسم میں جو چاہی توبہ
ابر اس زور سے گرجا کہ الٰہی توبہ

ایک اچھے شاعر کے دوش بہ دوش امجد صاحب ایک اچھے اور بہت اچھے انسان ہیں اور ان کی ذات میرے قول کی بانگ دہل تصدیق کرتی ہے۔ ...... یہ میرا دعویٰ ہے کہ اچھا شاعر کبھی بُرا آدمی نہیں ہو سکتا۔ اور جب امجد کی طرف نظر اٹھاتا ہوں تو اپنے دعوے کی تصدیق کو زندہ و مجسم دیکھ لیتا ہوں۔ امجد شاعر ہیں، انسان ہیں نیک نفس اور رقیق القلب انسان ہیں۔ یہ رقیق القلبی ان کی خوش قسمتی بھی ہے اور بدبختی بھی۔ خوش قسمتی اس لحاظ سے ہے کہ ؏

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

کے دور میں بھی وہ انسان ہیں، صحیح معنی میں انسان، اور بدبختی اس لحاظ سے ہے کہ وہ بیچارے افسانہ و فسوں میں مبتلا ہو کر وہاں پہنچ گئے ہیں جہاں یہ دردناک آواز گونجا کرتی ہے ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

اس کے علاوہ امجد میں ایک آن بھی ہے۔ ایسی آن کہ اس سن و سال میں بھی محبوبیت پائی جاتی ہے اور شاید حافظ نے انہی کے لئے کہا تھا ؎

بندۂ طلعتِ آں باش کہ آنے دارد"

خلیل الرحمٰن اعظمی

غزل

آج ڈوبا ہوا خوشبو میں ہے پیراہنِ جاں
اے صبا کس نے یہ پوچھا ہے مرا نام و نشاں

اس کڑی دھوپ میں اک ان کو ہی سایہ نہ ملا
تجھ پہ اے گیسوئے ایّام ہوئے جو قرباں

زہرِ غم پی کے بڑھی اور بھی جینے کی ہوس
زندگی بھر نہ کبھی موت پہ لائے ایماں

دیکھ متاعِ مرے رنگِ شکستہ پہ نہ جا
اس سے بہتر نہیں تصویر کا کوئی عنواں

شمع کیا جانے کہ کب ہوتی ہے ہجراں کی سحر
رات کٹ جاتی ہے کٹتا نہیں یہ کوہِ گراں

پھر مرے شہرِ طرب پر نہ کوئی آنچ آئے
آج کیوں خیمۂ افلاک سے اٹھتا ہے دھواں

کتنی سادہ ہی سہی تیری جبیں کی تحریر
اس سے اکثر مرے افکار کو ملتی ہے زباں

دیویندر اسر

جدید فلسفہ اور ادب

لفظ جدید سے مراد ہے روح میں جدید، یا وقت میں جدید۔ انسانی فکر ہمیشہ رواں ندی کی طرح ہے جو جوں جوں آگے بڑھتی ہے اس میں کئی نئے موڑ آتے ہیں اور اس میں کئی معاونین شامل ہوتے رہتے ہیں اور ان معاونین کی خصوصیات بھی اس ندی میں جذب ہوتی رہتی ہیں۔ ایک وقت ایسا آتا ہے جب اُس میں کمیت کی افزونی کیفیت کی تبدیلی بن جاتی ہے اُس کی سطح میں تبدیلی آجاتی ہے اور ہم اُسے 'جدید' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس لئے جدید محض وقت میں جدید نہیں بلکہ روح میں بھی جدید ہے۔ جدید ادب کے تجزیہ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ جہاں اس پر نفسیات اور سیاست کا اثر پڑا ہے وہاں یہ فلسفہ سے بھی متاثر ہوا ہے۔ اعلیٰ نقاد کسی فنی تخلیق کی پرکھ محض اُس کے اسٹائل کی بنا پر ہی نہیں کرتا بلکہ اُس کی اخلاقی اقدار کی اہمیت کو بھی عیاں کرتا ہے۔ اس لئے نقاد یہ ہی نہیں بتاتا کہ فنی تخلیق کتنی حسین ہے بلکہ یہ بھی کہ وہ خیر اور صداقت کی اقدار کو کس انداز سے پیش کرتی ہے۔ نقاد کو یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ اس تخلیق کی انسانی اہمیت کیا ہے۔ اُس کا نظریہ اخلاقی ہے یا غیر اخلاقی ہر اعلیٰ تخلیق میں ادیب کے نظریات اور اعتقادات پر مبنی اخلاقی اقدار کی ترجمانی ملتی ہے اسی لئے اعلیٰ تخلیق ادیب کے نظریۂ حیات اور اقدارِ حیات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

جدید فلسفے کا پس منظر

<u>انسانیت پرستی، عقل پرستی اور سائنس</u>۔ جدید فلسفہ کے اجزائے ترکیبی میں انسانیت پرستی، عقل پرستی اور سائنس کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ انسانیت پرستی نے قرونِ وسطیٰ کی اقدار کو ختم کرنے میں نمایاں رول ادا کیا اور زندگی اور سماج کا مثبت نظریہ پیش کیا۔ انسانیت پرست فلسفیوں اور ادیبوں نے مذہبی اقتدار اور روایت پرستی کے خلاف یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان اپنے معیار کا تعین خود کرتا ہے اور اپنی صداقت کو جنم دیتا ہے۔ فن اور ادب پر انسانیت پرستی کا گہرا اثر پڑا ہے۔ لیکن جدید فلسفہ میں انسانیت پرستی سے زیادہ عقل پرستی اور سائنس کے اجزا شامل ہیں عقل پرستی کی رُو سے انسان اپنے تجربے اور مشاہدے کے دائرے میں ہر چیز کا شعور حاصل کر سکتا ہے۔ کائناتی عمل انسان کے منطقی اور خارجی فکر سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس میں مافوق الفطرت عناصر کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اس میں نامعلوم عناصر شامل ہیں جن کا علم کبھی ہو جائے گا۔ جو کچھ فطری ہے اس کا مطالعہ سائنسی تجزیے سے کیا جا سکتا ہے۔ فطرت سے باہر کسی خدا یا متصوفانہ اعتقاد کا وجود نہیں۔ عقل پرستوں کے نظریے کی رُو سے انسان کی مکمل زندگی کی تفسیر مادّی کائنات یا فطرت کے دائرے کے اندر کی جا سکتی ہے مابعدالطبیعیاتی نظریہ کے خلاف عقل پرستی کی نشو و نما علوم طبیعیات سے وابستہ رہی ہے نیوٹن کی دریافتوں نے کائنات کا نیا تصور پیش کیا اور فلسفے میں بھی تبدیلی رونما ہوئی جس سے روشن خیالی کا دور شروع ہوا۔ روشن خیالی نے انسان کو فردوس بر روئے زمین کا یقین دلایا۔ تمام انسان برابر ہیں۔ رنگ، نسل اور قوم کے امتیازات سطحی اور غیر فطری ہیں۔ ڈارون نے قدرتی انتخاب کے نظریے کے ذریعے جہدِ حیات کے عمل میں سرگرم نسلوں کی بقا کا ارتقائی عمل اور تحقیقی طریقہ پیش کیا۔ ہکسلے نے اس نظریہ کی وضاحت کی اور ہربرٹ اسپنسر نے اس ارتقائی

عمل کو سماج اور زندگی کے مختلف شعبوں میں پیش کیا۔ اسپنسر نے نامیاتی عمل کو ڈارون سے پہلے ہی اپنے نظریے کی بنیاد بنایا تھا۔ اسپنسر نے اِس نظریہ کو جس طرح پیش کیا اُس سے جیک لنڈن اور ڈریزر جیسے ممتاز ادیب متاثر ہوئے اور انھوں نے شہری زندگی کی مہاجنی جد و جہد کو اسی نقطۂ نظر سے پیش کیا۔ اس نظریے کے باعث انسان کا احساسِ گناہ بھی کم ہوا۔ کیونکہ اس بات پر زیادہ زور دیا گیا کہ گناہ کی ترغیب جدّی ہے یا ماحول سے جنم لیتی ہے، ہارڈی، میری ڈینتھ اور بالخصوص سیموئیل بٹلر، ڈارون سے متاثر ہوئے۔ لانگ فیلو کی نظم "آگے بڑھو" کی فنکارانہ صداقت کی سائنسی انسپریشن ڈارون کا ہی نظریہ ہے۔ ڈارون کے نظریہ نے جہاں انسانی زندگی کے لئے نئی راہیں کھول دیں وہاں اس نے روشن خیالی کے مقاصد کو نقصان بھی پہنچایا اور کسی حد تک "برتر نسل" کے نظریہ کے تحت نسلی امتیاز کو تقویت بھی ملی۔

نطشے اور مارکس

فکرِ جدید کی تشکیل میں پچھلی صدی کے جن دو فلسفیوں کا اثر سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے وہ ہیں نطشے اور مارکس۔ نطشے کا نظریہ ارادہ اقتدار سماجی جبلت اور اقتدار سے انحراف ہے۔ نطشے کے خیال میں انفرادی اور خود پسندانہ خواہشوں کو فلسفے کی بنیاد پر استوار کرنا چاہیئے۔ عورت کے بارے میں اُس کا نظریہ انتہائی غیر فطری اور غیر عقلی ہے۔ سیاسی طور پر وہ 'اشرافیہ' کو آدرش سرکار مانتا ہے۔ مشینوں اور آلات کو انسانی بدصورتی اور تنزّل کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ ان نظریات پر مبنی فلسفہ ایک ایسے فوق البشر کے تصوّر کو جنم دیتا ہے جو حقیقت میں آمریت کا نشان بن جاتا ہے۔ نطشے کے جامع فلسفہ میں جدید فکر کے تقریباً سبھی اہم رجحانات کے بیج ملتے ہیں۔ اثریت سے لے کر سرریلزم تک سب رجحانات نطشے کے فلسفہ سے متاثر ہیں۔ ایسن، شا، اسپنگلر اور آندرے ژید نطشے کے فلسفہ سے کافی متاثر ہوئے۔

مارکس کے نظریات عملی شکل میں انسانوں کے ایک بہت بڑے گروہ کی زندگی کا جزو بن چکے ہیں۔ مارکس کے خیال میں خارجی دُنیا حقیقی ہے۔ جو فکر اور خیال سے آزاد اپنا وجود رکھتی ہے۔ شعور مادہ کو جنم نہیں دیتا بلکہ انسانی سماج کے ارتقا کے ایک خاص دور میں مادہ شعور کو پیدا کرتا ہے۔ اس لئے رائج فکری رجحانات کا سائنسی تجزیہ کرنے کے لئے اس دور کے سماجی اور معاشی حالات کا شعور لازمی ہے۔ نئے سماجی حالات کچھ لوگوں کی ذہنی حالت بدلنے سے ظہور میں نہیں آتے۔ جیسے جیسے ذرائع پیداوار میں انسان تبدیلیاں کرتا ہے نئے سماجی تعلقات پیدا کرتا ہے اور اس تغیّر کے عمل میں خود بھی بدل جاتا ہے اُس کے خیالات اور اُن سے متعلقہ اشیاء میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ مارکس نے ہیگل کے جدلیاتی طریقۂ کار کو فکر کی دنیا سے آزاد کر کے مادیت پر منطبق کیا ہے اس لئے اس کا نظریہ "جدلیاتی مادیت" کے نام سے مشہور ہے۔ کاڈویل، رالف فاکس، ہاورڈ فاسٹ، گورکی اور اراگوں مارکسیت سے کافی متاثر ہوئے آندرے مارلو اور اگنیزیو سلونے مارکسیت سے کنارہ کش ہو کر انسانیت پرستی کے وسیع دائرے میں شامل ہو گئے۔ کیونکہ اُن کے خیال میں اشتمالی پالیسی سے متاثر اشتراکی حقیقت نگاری ایک محدود اور پروپیگنڈسٹ رجحان سے بالاتر نہیں ہو سکتی۔ اراگوں اور پال ایلوار سرریلزم کے بانیوں میں سے تھے۔ انھوں نے آندرے بریتوں سے الگ ہو کر مارکسیت کو قبول کر لیا۔ اگرچہ پال ایلوار سرریلزم سے مکمل طور پر علیحدگی اختیار نہیں کر سکا۔ ہندوستان میں ترقی پسند نقطۂ نظر بھی زیادہ تر مارکسیت سے متاثر ہے۔ برنارڈ شا اور جیک لنڈن پر مارکس اور نطشے دونوں کا کافی اثر پڑا ہے۔ شا غیر طبقاتی سماج قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ نیا سماج پُرتشدد انقلاب کے ذریعہ نہیں بلکہ اصلاحی طریقہ سے جنم لے گا۔ نطشے کے اثر کے باعث شا عوام میں اعتقاد نہیں رکھتا۔ وہ 'اشرافیہ' کو تسلیم کرتا ہے۔ اسی طرح جیک لنڈن کے ناولوں میں فوق البشر، پسماندہ طبقہ، طبقاتی جدوجہد، سرمایہ داری سے بغاوت وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ جیک لنڈن کے مشہور ناول "آئرن ہیل" کا ہیرو نطشے کے فوق البشر کا نمائندہ ہے۔ لیکن شا کے نظریے کے برعکس جیک لنڈن کا ہیرو جمہوریت کا شعور رکھتا ہے۔

جدید فلسفہ

جدید عینیت پرستی۔ یورپ میں جدید عینیت پرستی ہیگل کے فلسفہ سے متاثر ہوئی۔ اُس کے بعد عینیت پرستی میں دو رجحانات رائج ہوئے۔ یعنی دائیں بازو کی عینیت پرستی اور بائیں بازو کی عینیت پرستی۔ دائیں بازو کی عینیت پرستی نے قدیم مذہب اور اخلاق کا سہارا لیا اور بائیں بازو کی عینیت پرستی نے مذہب، اخلاقیات اور دوسرے شعبوں میں انقلابی رجحانات کی ترویج کی، جدید عینیت پرستی کے ممتاز پیروکاروں میں سٹرلنگ، گرین کیرڈ اور میک ٹاگرٹ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ جدید عینیت پرستی و امریکہ میں جو سیا رائس سے بڑی مدد ملی۔ بریڈلے نے اس نظریہ کو تقویت پہنچائی کہ عقل کے ذریعہ دنیا کا ادراک ٹھوس صداقت نہیں بلکہ دائم

ہے حقیقی صداقت قطعی ہے۔ اٹلی میں زنٹایل کا نظریہ تبدیلی اور نشو و نما کو کائنات کا لازمی عمل تسلیم کرتا ہے۔ اس سلسلے میں برگساں اور کروچے کے نظریات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

برگساں

برگساں کے خیال میں ہم مادّیت کی جانب اس لئے راغب ہوتے ہیں کیونکہ ہم اصلاحِ مکان کے بارے میں فکر کرتے ہیں۔ برگساں کے نزدیک وقت کی اہمیت بھی اتنی ہی بنیادی ہے۔ زندگی اور تمام حقائق کا جوہر وقت ہے۔ وِل ڈورانٹ نے اپنی تصنیف "فلسفے کی داستان" میں تحریر کیا ہے کہ برگساں کے نظریے کے مطابق "زندگی مقام کی بجائے وقت پر مبنی ہے۔ یہ سکوت نہیں بلکہ تغیر ہے۔ یہ کمیت سے زیادہ کیفیت ہے۔ یہ محض مادہ اور حرکت کی از سرِ نو تقسیم نہیں بلکہ ایک سیّال اور مسلسل تخلیق ہے... وقت اجتماع ہے مستقبل ماضی کی طرح کبھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہر قدم پر نیا اجتماع پیدا ہوتا ہے۔" تمام حقائق ارتقاء، عمل، وقت اور تغیر ہیں۔ انسان مجہول طریقہ پر ڈھل جانے والی مشین نہیں بلکہ از سرِ نو مجتمع قوت اور تخلیقی ارتقاء کا مرکز ہے۔ اس لئے آزادانہ ارادے سے مراد اپنے عمل کا شعور ہے۔ آئین سٹائین نے بھی نظریۂ اضافیت میں وقت کی اس اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ برگساں کے نقطۂ نظر سے مادہ کے بجائے نفس، مقام کے بجائے وقت، مفعولیت کے بجائے عمل، میکانکی عمل کی بجائے شعوری عمل برتر ہے۔ اس طرح مادیت کے خلاف برگساں کا احتجاج ساری سائنسی فکر کے خلاف احتجاج بن جاتا ہے۔ اُس کے نزدیک ذہنی تجربے کے لئے وجدان ہی براہ راست ذریعہ ہے جو فکر کے مقابلہ میں مقدّم ہے۔ روسو، نطشے اور جیمز بھی اسی خیال کے حامی ہیں۔ جب ہم آزادانہ عمل کرتے ہیں یا انتخاب عمل کرتے ہیں تو تخلیق ہوتی ہے۔ انسانی زندگی کے تمام اعمال اور خواہشات ہماری اندرونی Elan vital کے مظہر ہیں Elan Vital وہ توانا اور زندگی سے بھرپور خواہش ہے جو ہماری نشو و نما کرتی ہے اور جو مسلسل تخلیق کا سرچشمہ ہے۔ برگساں کا فلسفہ جدید عقل پرستی سے انحراف ہے۔ اُس کے نزدیک داخلی صداقت ہی خارجی حقیقت ہے۔

ورجینیا وُلف کے ناولوں کے شعور کے بہاؤ پر بھی برگساں کا اثر پڑا ہے اس اسلوب کے مطابق "ماضی کے تجربے ہر متحرک لمحے (حال) کا ساتھ دیتے ہیں۔ نفس اسنو بال" ہے جو کہ اپنی حرکت کے ساتھ ساتھ حجم اکٹھا کرتا رہتا ہے۔" تصویریت پسند شاعر ٹی۔ ایس۔ ہیلم پر بھی برگساں کا اثر ہے۔ برگساں سے متاثر ہو کر ادیبوں نے نفسیات کی جامع شکل کو چھوڑ دیا۔ کچھ ادیب عقلی تجزیے سے کنارہ کشی کر کے زماں کے اجتماع میں مکمل روحانی کائنات کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کروچے

کروچے نے بھی ذہن کو بنیادی اور اصل حقیقت تصوّر کیا ہے۔ اُس کے نزدیک تمام حقیقت خیال ہے۔ ہم اس کے بارے میں سوائے اُس شکل کے جو اس نے ہمارے محسوسات اور خیالات میں اختیار کی ہے۔ کچھ نہیں جان سکتے۔ کروچے خیال کی وضاحت اُس کے عملی نتائج سے نہیں بلکہ عملی معاملات کو خیالی رشتوں Category (احساس کے ذریعہ حاصل کردہ خیال کے لئے ذہنی قالب) میں پیش کرتا ہے۔ اُس کا نظریہ تجدیدی اور غیر عملیت پسندانہ ہے۔ کروچے نے فن کو سائنس پر ترجیح دی ہے۔ سائنس افادیت کی قائل ہے اور فن حسن کا۔ حسن افادیت سے برتر اور ارفع ہے۔ اس خیال کی رُو سے فن برائے حسن (فن برائے فن) کا نظریہ جنم لیتا ہے۔ کروچے کے خیال میں حُسن خارجی مظہر نہیں بلکہ داخلی تصویر کشی کا عمل ہے۔ کروچے کے نظریے سے فن برائے فن کے رجحان اور اظہاریت کو بڑی تقویت ملی ہے۔ اناطول فرانس نے اسی نظریہ کو اپنے فن میں پیش کیا۔

جدید حقیقت پرستی۔

عینیت پرستی کے برعکس جدید حقیقت پرستی کا نظریہ امریکہ اور انگلستان میں رائج ہوا۔ جدید حقیقت پرستی کے ممتاز مؤسس مور اور برٹرینڈ رسل ہیں۔ مُور نے اپنے تجرباتی طریقہ کار سے عینیت پرستی کی تنقید کی اور منطقی مثبتیت کی ترقی میں مدد دی سنتاینا نے تنقیدی حقیقت پرستی کا پرچار کیا۔

برٹرینڈ رسل

برگساں کے نظریہ میں وقت اور حرکت کو جو مقام حاصل ہے۔ رسل نے اُس سے کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ اس کے برعکس وہ ریاضیات میں دلچسپی لیتا رہا۔ رسل کے ابتدائی نظریات میں ریاست کے خلاف سخت احتجاج ملتا ہے اور وہ جنگ کے خلاف امن کے فلاسفر کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ پہلی جنگِ عظیم سے پیشتر اُس کا فلسفہ قنوطیت سے بھرپور تھا۔ رسل نے نجی جائداد کے خلاف اشتمالی نظریات کی حمایت کی اور پھر روسی تجربے سے مایوس ہو کر انفرادی

آزادی کی اقدار کی حمایت کی۔ اُس کے خیال میں آزادی کے بغیر شخصیت کی تکمیل ممکن نہیں۔ آزادیٔ تحریر و تقریر اور فکر کی آزادی جدید ذہن کی کمزوریوں کو دُور کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ رسل نے جدید فکر میں امن اور آزادی کی اقدار کو فلسفیانہ نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ رسل نے حواس اور خارجی دُنیا کے بارے میں جو خیالات پیش کئے ہیں جدید فکر پر اُن کا گہرا اثر پڑا ہے۔ بقول رسل ہر انسان میں تخلیقی قوت موجود ہوتی ہے۔ جو کہ سائنس، فن اور ادب کے ذریعے انسانی بہبودی کے لئے عمل میں آتی ہے۔ رسل کا قول ہے کہ مذہب، شادی، تعلیم، قوم پرستی اور جائداد کا اس کے علاوہ کوئی مقصد نہیں کہ وہ انسانی سماج کی بھلائی کریں۔ اس لئے ہر ادیب کو اپنے ادب میں 'سماجی ذمّہ داری' اور 'ذاتی اظہار' کا امتزاج پیش کرنا چاہیئے۔

سنتائن

سنتائن کے قول کے مطابق ادراک فطری تحریک اور تصوّر کے عناصر کا خوش کُن ملاپ ہے۔ جو اگر مکمل طور پر الگ ہو جائیں تو انسان وحشت یا پاگل پن کی سطح پر آ جائے گا۔ سائنس میں تمام قابلِ یقین علم جمع ہے اور سائنس ادراک کی بنیاد ہے۔ فطرت کو موت کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ حیات کے نقطۂ نظر سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ سنتائن برگساں کی Elan vital تھیوری کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھتا ہے۔ کہ یہ Elan vital کیا ہے۔ کہ درجۂ حرارت کے ذرا سے گرنے کے باعث کائنات سے ہوا ہو جاتا ہے۔ مذہب کے بارے میں اُس کا خیال ہے کہ یہ انسانی تخیّل کا مظہر۔ ایک انسانی تجربہ ہے۔ سنتائن جدید فکر کا نمائندہ فلسفی ہے جس نے کافی حد تک روحِ عصر کو محسوس کر لیا ہے۔ سنتائن خود ایک بلند پایہ ادیب ہے اور اُس کا اثر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ پر بھی پڑا ہے۔ گو کہ ایلیٹ کے خیالات پر رِچرڈ اور اشرڈ کے اثرات بھی ہیں۔

عملیت پسندی

جیمز۔ جیمز نظریۂ عملیت کا پیروکار ہے۔ اُس کے نزدیک صداقت اشیائے اولیٰ، اُصول Category مفروضہ ضروریات کے بجائے اشیائے آخر نتائج اور انجام اور حقائق کو دیکھنے کا طریقہ ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم ان باتوں پر غور کریں کہ یہ کیا ہے، اس کا وجود کیسے ظہور میں آیا۔ اگر ہم یہ سوچیں اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوا۔ جس سے خیال عمل اور مستقبل کی طرف راغب ہوتا ہے تو ہم صحیح طرزِ فکر کے مالک ہیں۔ جیمز کے خیال میں کثرت الوجود خدا پرستی، نرم دِل اور سخت دِل کے تضاد کو ختم کر دیتی ہے۔ اُس کے نزدیک ہر فرد میں قوت محفوظ ہوتی ہے جس کا مکمل استعمال کرنا چاہیئے۔ یہ قوت جنگ و جدل میں ناکارہ اور تباہ ہو جاتی ہے۔ اِس کا استعمال فطرت کے خلاف جہاد میں کرنا چاہیئے جس سے انسانی ترقّی کی نئی راہیں کُھل سکیں۔ کیونکہ جیمز کے نزدیک یہ سب کچھ تکمیلِ بشر کا ذریعہ ہے اور انسان سب سے مقدم ہے۔

ڈیوی

ڈیوی کا نظریۂ عملیت بنیادی طور پر ایسا اخلاقی فلسفہ پیش کرتا ہے جو کہ مابعد الطبیعیات اور علمیات کے خلاف شدید ردّ عمل کے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ ڈیوی کا نقطۂ آغاز ڈارون کا نظریہ نامیاتی ارتقائی عمل ہے۔ جس کی بنیاد پر اس نے ذہن اور جسم کو جہد حیات کے عمل میں ارتقا پذیر تسلیم کیا ہے۔ ڈیوی نے بحیثیت عملیت پرست ہر شے کی وضاحت اُس کے مقام اور ماحول کی مناسبت سے کی ہے۔ اُس کے نزدیک مافوق الفطرت نظریہ کسی بھی شے کی وضاحت کرنے سے قاصر ہے۔ وہ برگساں کے Elan vital کو بھی مابعد الطبیعیاتی ہئیت کا پوشیدہ روپ سمجھتا ہے۔ ڈیوی نے تحریر کیا ہے کہ ماحول سے ہم آہنگی موت ہے ہر عمل کا اصلی نقطۂ نظر ماحول کو تابع کرنے کی خواہش ہے۔ اس لئے اُس نے ارتقاء کو زندگی کا جوہر تسلیم کیا ہے۔ جس سے کسی شے کی پرکھ کی جا سکتی ہے۔ اس لئے ارتقائی عمل سے زندگی کا اخلاقی معیار متعین ہوتا ہے۔ اپنے اعمال کے شعور سے انسانی آزادی جنم لیتی ہے۔ سیاسی طور پر ڈیوی جمہوریت پر اعتقاد رکھتا ہے اور وہ کثرت الوجود سیاسی نظام کو جمہوریت کا فساد سمجھتا ہے۔ اُس کے نزدیک ایسا نظام انفرادیت پسندی اور اشتراکیت میں موجود ہے۔ وہ بین الاقوامیت کا قائل ہے اور اُس کی تکمیل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ علٰحدگی پسند قومی خودمختاری کو سمجھتا ہے۔ اُس کے نظریے کی رُو سے فلسفہ انسان کی سماجی اور اخلاقی نشوونما کا بہترین اور موثر آلۂ کار ہے اور اس کا استعمال بھی اسی غرض سے ہونا چاہیئے۔ ڈیوی کا فلسفہ نئی زندگی کی آواز ہے۔ اس لئے اسے موجودہ دور کو ازسرِ نو تعمیر اور انسانی زندگی کی ہر پہلو سے ازسرِ نو تشکیل کے فلسفہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

کسی ادیب کی فکری ساخت کے بارے میں یہ کہہ دینا صحیح نہیں کہ اُس کی تخلیقات میں کسی ایک مفکّر یا فلسفی کا بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر پڑا ہے۔ مثال کے طور پر ایچ۔ جی۔ ویلز کی تحریروں میں تحلیلِ نفسی اور اشتراکیت کے

رجحانات موجود ہیں۔ اُس کی تخلیقات میں فرائڈ، مارکس اور ڈارون کا اثر ہے۔ ہندوستان میں بھی نیا ادب فرائڈ، مارکس اور ڈارون کے نظریات سے متاثر ہوا ہے۔ بہت سے ادیبوں کی تخلیقات میں فرائڈ اور مارکس کے نظریات بیک وقت نظر آتے ہیں۔ آزادی کے بعد جو ادب ہندوستان کی تعمیرِ نو میں حصہ لے گا۔ وہ ڈیوی کے نظریات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس طرح اقتدار پرست پالیسی کے خلاف رسل کے نظریات، ذہنی نشوونما کا باعث بن رہے ہیں۔ فلسفے سے بصیرت حاصل کئے بغیر آج کا ادب ترقی پذیر اور حیات بخش ادب کا مقام حاصل نہیں کر سکتا۔

بھارت میں دستکاریوں کا فروغ

دستکاریوں کی منصوبہ بندی کے ساتھ ترقی کی صورت اور راہیں پہلی بار پہلے پنج سالہ منصوبہ کے تحت ہی متعین ہوئیں۔ اور دستکاریوں کی تیاری اور فروغ کے پروگرام مرتب کرنے کے لئے دستکاریوں سے متعلق ایک بورڈ قائم کیا گیا۔

دستکاریاں اپنے نمایاں اور فن کارانہ ڈیزائنوں کی وجہ سے بالعموم پسند کی جاتی ہیں۔ اس بیش بہا ورثے کو فروغ دینے کے لئے جو کوششیں حال ہی میں بروئے کار لائی گئی تھیں ان کے نتائج بڑے حوصلہ افزا رہے ہیں۔ دوسرے پنج سالہ پلان کے تحت ڈیزائنوں کو بہتر بنانے اور ڈیزائن تیار کرنے کے علاقائی مراکز قائم کرنے کی اسکیمیں اختیار کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ آرٹ کے اسکولوں کو ڈیزائن کے شعبے کھولنے کے لئے امداد دینا اور کارکن دستکاروں کو اعلیٰ ڈیزائن سازی کی تربیت حاصل کرنے کے لئے وظائف دینا بھی اس اسکیم میں شامل ہے۔

دستکاری کی تکنیکوں میں خصوصی تحقیق کے لئے تکنیکی تحقیق کے اداروں کو امداد بھی دی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ متعدد تحقیقی مراکز بھی قائم کئے گئے ہیں۔ اس غرض سے کہ دستکار ترقی یافتہ تکنیکیں اختیار کر سکیں۔ بہتر آلات و ساز و سامان تیار کر کے ان لوگوں کو مہیا کیا جا رہا ہے۔ دستکاریوں کو بڑھاوا دینے پیداوار کے طریقوں اور تکنیکوں کو بہتر بنانے اور تیار شدہ مصنوعات کی فروخت کے اضافہ میں معاونت کے لئے ماہ اپریل ۱۹۵۸ء میں ایک ادارہ انڈین ہینڈی کرافٹس ڈیویلپمنٹ کارپوریشن (پرائیویٹ) لمیٹڈ کے نام سے قائم کیا گیا۔

دستکاریوں سے متعلق بورڈ کے مشورے پر قدیم اور نئی دستکاریوں کے فروغ کے لئے ریاستی سرکاروں کو امداد دی گئی ہے نیز قالین بافی، پتھر و مرمر پر کندہ کاری، کشیدہ کاری اور متعدد دیگر دستکاریوں کے لئے تربیتی اور پیداواری مراکز بھی قائم کئے گئے ہیں۔

دستکاریوں کی بکری کو بڑھاوا دینے کے لئے بھی متعدد اسکیمیں اختیار کی گئی ہیں۔ ان اسکیموں کے تحت نئے امپوریم کھولے جائیں گے موجودہ امپوریموں کو توسیع دی جائے گی اور دیہاتی علاقوں میں دستکاریوں کی مانگ کو پورا کرنے کے لئے گشتی گاڑیاں استعمال میں لائی جائیں گی بکری کو بڑھاوا دینے کی غرض ہی سے سیاحوں کی دلچسپی کے مقامات پر نمائش کے لئے یہ چیزیں رکھی جاتی ہیں۔ میلے منعقد ہو رہے ہیں اور مصنوعات کی فروخت کے لئے دکانیں کھولی جا رہی ہیں۔

بین الاقوامی نمائشوں میں بھارتی دستکاریوں کو بھی شریک کیا جا رہا ہے تاکہ ملکی دستکاریوں کی غیر ممالک میں مانگ پیدا ہو اور اُن کی برآمد کو بڑھاوا ملے۔

شاد عارفی

گیہوں نے کہا

پہلے میں بو دیا گیا جوتے ہوئے اک کھیت میں
مل گئی آسودگیٔ زندگانی ریت میں
کچھ دنوں طاری رہا اعصاب کے اوپر جمود
خوابِ راحت کا مرادف تھا طلسمِ "ہست و بود"
ابر کھیتوں میں لگا جس وقت موتی ڈھولنے
راہ دی مجھ میں رطوبت کو مرے ماحول نے
"خلقِ فطرت" نے صدائے "قم باذن اللہ" دی
ٹھوس اعضائے بدن میں جڑوں کو راہ دی
دی شعاعِ مہر نے تابندگی ادراک میں
بیٹھا بیٹھا درد جاگ اٹھا دلِ نمناک میں
کوششِ روئیدگی نے بھر دیا چولا بدل
قلب کے پہلو سے شاخِ آرزو آئی نکل
اب یہ "کلا" دل میں گھبرا کر سکوتِ ارض سے
قوتِ نشو و نما کو لے کے طول و عرض سے
عرصۂ ہستی سے مصروفِ نظارہ ہو گیا
دامنِ عافیت دل پارہ پارہ ہو گیا

دھوپ کی کوشش سے جب "آب و ہوا" راس آ گئی
زرد پودے کے رگ و ریشہ پہ سبزی چھا گئی
کھیت کے آغوش میں پروان چڑھتا ہی رہا
تھا ترقی کے لئے میدان، بڑھتا ہی رہا
رفتہ رفتہ نرم و نازک بالیاں آنے لگیں
سبز پتوں میں ہوا کے ساتھ لہرانے لگیں
بالیوں میں "دودھیا دانے" نظر آنے لگے
مظہرِ جوشِ جوانی بن کے گدرانے لگے
ہوتے ہوتے نقشِ انجامِ شباب آ ہی گیا
فصل پک جانے سے کھیتوں پر عذاب آ ہی گیا
کھیت کو پامال کرنے پر تلے دہقاں کے ہاتھ
میری گردن بھی کٹی اپنے "جگر گوشوں" کے ساتھ
پھر مجھے باندھا گیا، کوٹا گیا، جھٹکا گیا
"صرصرِ مواج" کی امداد سے پھٹکا گیا
اڑ گیا بھوسہ ہوا میں رہ گیا غلے کا ڈھیر
"پھیر لایا" اصل کی جانب مری قسمت کا پھیر

شہر کی دنیا میں مستلزم ہے خرمن کو شرر
کھا گئی لیکن مجھے سرمایہ داروں کی نظر
"کاروبارِ" حال سے تخیل کا رخ پھر گیا
تو د غرض جیبوں میں عنقائے تفکر گھر گیا

ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا، سوچ لوں! یاد آ گیا!
"پھر لباسِ اولیں میں" ہو کے برباد آ گیا
محفلِ ہستی میں افسانہ در افسانہ ہوں میں
آج ان تبدیلیوں کے بعد پھر دانہ ہوں میں

مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی

دیوانِ غالب اور گُل کدۂ داغ کی سَیر

غالب اور داغ کے چند اشعار کا تقابلی مطالعہ

(۲)

(۱۰)

غالب کا قول ہے ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم　　اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

داغ کا قول ہے ؎

ہیں وضع کا پابند ہوں مر جائے تو جائے　　جب کوئی بُلانے نہیں آتا نہیں جاتا

غالب اپنی "بندگی" کے اعتراف کے بعد آزادگی و خودبینی کا دعوےٰ کرتے ہیں حالانکہ "بندگی" میں آزادگی و خودبینی بندگی کا نقص ہے۔ ہاں بندگی کی زنجیریں توڑ کر آزادی حاصل کرنے کا ارادہ اور عزم بالکل حق اور بجا ہے۔ لیکن بندگی یا تعبیر کمالِ محبت، عشق میں احساسِ خودی و خودبینی اپنی بندگی، تعبد، محبت اور عشق سے لگا نہیں کھاتا۔

لیکن داغ کے ہاں ایسا کوئی پہلو نہیں۔ کہتے ہیں تسلیم کہ بندہ ہوں۔ ہر مقام پہ میرا طرۂ امتیاز پابندیِ وضع اور اس مقام کے شایانِ شان میری روش ہوتی ہے ہیں توصب ہوں، جب محبوب کا اشارہ ہو تو قدم بڑھاتا ہوں کیونکہ ہر مقام میں یہی مقام اور ہر وضع میں یہی وضع صراطِ مستقیم ہے۔

(۱۱)

غالب کا مطالبہ ہے کہ ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد　　یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

داغ کا اعتراف ہے کہ ؎

ہے گنہگارِ عشقِ مجازی بے گناہ　　ہیں خطا کار اگر اس کو خطا کہتے ہیں

غالب دو باتیں کہتے ہیں اوّل یہ کہ میں نے گناہ کئے۔ مجھے ان کی سزا دی جا رہی ہے۔ یہ غیر بہت مناسب۔ دوم، لیکن ایسے گناہ بھی تو ہیں جن کا کسی وجہ سے میں ارتکاب نہ کر سکا۔ اور دل میں ان کے کرنے کی حسرت پا رہا ہوں۔ اس لئے ان کی داد بھی ملنی چاہئے۔ قانونِ مکافات یہ ہے کہ جو کرو، اس کا پھل پاؤ۔ بُرائی کرو اس کی سزا پاؤ، نیکی کرو اس کی جزا پاؤ۔ لیکن کسی شخص کی ایسی حالت کہ اس کی نیکی اور بدی دونوں میں سے کوئی بھی ظاہر نہ ہوئی ہو۔ اس بیچ کی شکل ہوتی ہے جو نہ یہی میں پا اور رہ جیسے ختم ہو گیا۔ اس کی داد کیسی؟

تاہم اتنا ضرور ماننا پڑتا ہے کہ غالب کے بیان میں شوخی ضرور ہے کہ سزا دینے والے حاکم سے بھری عدالت میں چُہل کی گئی ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ غالب ہی نہیں عموماً شعراء کا یہ اندازِ بیان محبوب پیرایۂ بیان ہے۔

اس کے مقابلے میں محولہ شعر میں داغ کا انداز ہی اور ہے۔ وہ اپنے گناہ کو گناہ اور خطا کو خطا اس رنگ میں پیش کرتے ہیں کہ گویا ان کا گناہ گناہ اور خطا خطا ہی نہیں، کیونکہ ان کا اعلان ہے کہ انھیں حسنِ مطلق کا جلوہ مظہرِ فطرت میں نظر آتا ہے۔ لہٰذا جب عشقِ حقیقی کی منزل تک ان کی رسائی نہیں تو عشقِ مجازی کی منزل ہی میں زندگی بیت جانا خطا نہیں ہوا، اسی لئے کہتے ہیں کہ میں نے اگر کسی بُتِ ہزار شیوہ کی پرستاری کی تو یہ عشقِ مجازی ہی کا کرشمہ تھا۔ میرے نزدیک یہ گناہ اور خطا ہی نہیں۔ تاہم اگر اسی پر اصرار ہو کہ یہ ضرور گناہ اور خطا ہے تو بسم اللہ۔ میں سزا بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔

(۱۲)

غالبؔ ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں　　خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

داغؔ ؎

قاتل نے دیکھے اس میں ہزاروں پری جمال　　دل چاک کیا ہوا کہ پری خانہ کھل گیا

غالبؔ کا محولہ شعر ان کے بہترین اشعار میں سے ہے۔ انھیں لالہ و گل دیکھ کر بے شمار لالہ رُخ اور گلعذار یاد آ جاتے ہیں ان کی یاد غالبؔ کو عین عالمِ بہار میں گلستان میں سوگوار بنا دیتی ہے اور وہ بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ زمین نے جو سرمایۂ حُسن دبا رکھا ہے وہ بہت زیادہ ہے اور زیرِ زمین سے اُبھر کر جو لالہ و گل سطحِ زمین پر نظر آ رہے ہیں وہ مدفون حسن کا ظہورِ کامل نہیں۔ ہاں اس کی یاد دلانے والے کچھ نمونے ضرور ہیں۔ اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہا ہے کہ خدا جانے اور کیسی کیسی اور کتنی حسین صورتیں ہوں گی جو خاک میں چھپی ہوئی ہیں۔ غالب کا یہاں حقیقت پر مبنی بیان ہے۔

لیکن داغؔ حسن اور حسینوں کا خاک میں ملنا گوارا نہیں کر سکتے۔ ان کے نزدیک حسینوں کا صحیح مقام زمین نہیں انسانی دل ہے۔ اس لئے کہتے ہیں کہ قاتل نے میرا دل چاک کیا۔ تو اس دل کے کیمرے یا آئینہ خانہ میں ہزاروں پری جمال جلوہ فرما پائے۔ قاتل سمجھتا تھا کہ داغ کا دل نکمّا دل ہے اس کا چیر پھاڑ کر پھینک دیا جانا ہی مناسب ہے۔ چناں چہ وہ بے دردانہ جرّاحی کر ڈالتا ہے لیکن داغؔ کے دل کا چاک ہونا اس کی آنکھوں سے پردہ اٹھا دیتا ہے اور وہ ویران بیابان کی بجائے وہاں ایک پری خانہ پاتا ہے۔ وہ دل جسے وہ اپنی کم نگہی اور بدفہمی سے نکمّا سمجھتا تھا۔ کام کا دل نکلا کہ اس میں صنعت خداوندی کے کتنے نوادر جمع کر کے ترتیب وار رکھے ہوئے تھے

اس سلسلہ میں داغؔ کا یہ مطلع بھی قابلِ غور ہے ؎

وہی تو ہے شعلۂ تجلّی کہ دشتِ ایمن سے تنگ ہو کر
جب اس نے اپنی نمود چاہی کھلا حسینوں پہ رنگ ہو کر

اس شعر پر غور کرنے سے پہلے غالب کا شعر ایک بار پھر پڑھ لیجئے۔ فرماتے ہیں۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں　　خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

دیکھا آپ نے۔ غالباً غالبؔ صرف انسانی صورتوں ہی کو صرف لالہ و گل میں نمایاں پاتا ہے۔ مگر داغ "دشتِ ایمن" کے شعلۂ تجلّی کو جو وادیِ ایمن میں سما نہ سکا تھا۔ حسن کے ہر رنگ روپ اور صورت و شکل میں اُس کی نمود پاتا ہے، ذرّہ سے آفتاب، ماہی سے تا بہ مہتاب، ذرۂ بے بود سے خدائی صنعت کی نادرہ کاری کے مظہرِ انسانِ کامل تک میں علیٰ قدرِ مراتب اس کی کرشمہ کاری اور جلوہ فرمائی دیکھتا ہے۔

لیکن ناانصافی ہو گی کہ غالبؔ و داغؔ کے ان دو نوں شعروں پر ہی بحث کو ختم سمجھا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ داغؔ کا ایک اور مقطع بھی اس وقت سامنے آ گیا جو اسی مضمون کا ہے جس میں اسی مضمون کو یوں ادا کیا گیا ہے ؎

داغؔ اب یوسف کہاں لیلیٰ کہاں شیریں کہاں
جو حسیں شکلیں تھیں زیرِ خاک پنہاں ہو گئیں

انصاف یہ ہے کہ غالبؔ کے محولہ شعر کے مقابلے میں کئی وجہوں سے اس شعر کی کوئی حیثیت نہیں۔ اوّل اس لئے کہ غالب مختلف پھولوں کو دیکھ کر بے شمار حسینوں کا تصوّر کرتے ہیں جو خاک میں پنہاں ہیں اور کہتے ہیں "کیا صورتیں ہوں گی۔" حسن کی بے پناہی و بے پایانی کا اعتراف کرتے ہیں اور داغ حسینانِ عالم میں سے صرف تین نام لے کر کہتے ہیں۔ جو حسین شکلیں تھیں زیرِ خاک پنہاں ہو گئیں۔ گویا دُنیا میں حسین تھے تو یہی تین تھے۔ اس کے بعد اندھیرا ہے۔ حالاں کہ حسن ان تینوں پر نہ ختم ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ غالبؔ کا شعر اپنی ہمہ گیری کے لحاظ سے داغؔ کے اس شعر سے بدرجہا بہتر و برتر ہے۔

(۱۳)

انسانی نفسیات کی کارستانیوں کو سمجھنے کے لئے غالب کا یہ شعر کتنا اچھا شعر ہے ؎

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو؟

اسی کیفیت سے متکیف ہونے والوں کے لئے داغؔ کا یہ شعر بھی کچھ کم ترشی نہیں ؎

اے داغؔ ان سے جور و جفا کا گلا عبث
تیرے کہے سے ہو گی نہ رسم قدیم بند

غالبؔ صرف اپنا کام نکالنے کے لئے کسی "بے مہر" کو یعنی ایسے کو جو ظالم تو نہیں مگر صرف سائل کی طرف سے کسی وجہ سے بے پروا ہے، اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے ایک طعنہ سے نہیں طعنوں سے کام لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ طعنہ زنی ہمیشہ سامنے والے کو چڑانے کے لئے ہوتی ہے۔ طعنہ بے جا بھی ہو سکتا ہے بلکہ بالعموم طعنہ ہوتا ہی بے جا ہے، ظالمانہ اور خود غرضانہ بھی ہو سکتا ہے۔ غرض کسی "بے مہر" کو "مہرباں"

بتانے سے ان طعنوں سے کام لینا۔ کام نکالنے والے کی کھلی غلطی ہے۔ الزام کسی بے مہر پر نہیں۔ خود عاشق ہی پر آتا ہے۔

لیکن داغ جہاں صحیح جذبات اور معقول مطالبہ کرتے ہیں وہاں محبوب کی طرف سے معقول معذرت بھی پیش کرتے ہیں۔ جو عاشق کا کمالِ عشق ظاہر کرتی اور خلوصِ محبت کا لوہا بھی منواتی اور محبوب کو متوجہ کرنے کے لئے سمجھ میں آجانے والا موقع دیتی ہے۔

داغ کام نکالنا نہیں چاہتے۔ جور و جفا کا گلہ کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ محبوب کی ذرا سی بے التفاتی کو وہ اس عاشق محبوب کا ظلم و جور سمجھ بیٹھا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ محبوب کڑا امتحان لے رہا ہو۔ عاشق جو کچھ بھی ہو عاشق کسی قسم کی بے زاری کا اظہار نہیں کرتا۔ اس لئے عاشق کا گلہ اپنائیت کا ثبوت ہے۔ کیوں کہ گلہ شکوہ اپنوں سے ہی ہوا کرتا ہے۔ داغ کا قول محبوب کی طرف سے معذرت یوں ہے کہ محبوب کی دل آزاری پرانی عادت ہے اور پرانی عادتیں آہستہ آہستہ ہی دور ہوا کرتی ہیں ورنہ محبوب دل کا برا نہیں ہوتا۔ اس لئے عاشق کو دل شکستہ ہونے کی ضرورت نہیں اسے چاہئے کہ اپنی سی کئے جائے کہ عاشق کا مذہب قربانی کے سوا کچھ نہیں، محبوب کیا کرتا ہے اسے نہیں دیکھنا چاہئے۔ بس عاشق کو اپنا فرض بجا لاتے رہنا چاہئے۔ الصبر مفتاح الکنوز۔

(۱۴)

مذہبِ محبوب کے طعن و تشنیع کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں ؎

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے ‌ ‌ یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

داغ غالب کے بنیادی خیال کے اظہار کے لئے یہ لفظ انتخاب کرتے ہیں ؎

ہم مٹ گئے تو پرستشِ نام و نشاں ہے اب ‌ ‌ اس کی تلاش کر کہ محبت کہاں ہے اب

غالب کے منثور شعر کو مکرر پڑھئے اور جتنے شعر اوپر نقل ہو چکے ہیں ان پر بھی دوبارہ ایک نظر ڈالی جائے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے یہاں عموماً محبت و شوق میں سپردگی اور عشق میں فنا اور خود فراموشی کا عنصر ذرا نظر سے اوجھل ہی رہتا ہے۔ اور اس کی بجائے لین دین اور معاملہ بازی اور ناپ تول کی گفتگو کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

اسی شعر کو دیکھئے۔ کہیں محبوب نے کہہ دیا کہ میاں عاشق بے ننگ و نام شخص ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر محبوب کا یہ خیال مجھے اپنے متعلق پہلے سے معلوم ہوتا تو میں اپنا گھر بار نہ لٹاتا۔ کسی محبوب کے متعلق یہ خیال کہ وہ محب کی جیب ہی پر نظر رکھتا ہے محبوب کے کردار کی بلندی و پاکیزگی کا مظہر نہیں۔ پھر خود جناب عاشق ہیں۔ اگرچہ عاشق کا جذبہ قربانی بے پناہ اور بے کراں ہوتا ہے جیسا کہ کسی نے کہا ہے ؎

مال سے جان سوا جان سے ایمان سوا

مال سے جان سے ایمان سے بڑھ کر تو ہے

غالب کے شعر میں مذکور عاشق گھر بار لٹانے پر افسوس کرتا اور "بے ننگ و نام" ہونے کے لئے بے گھر ہونا کوئی وجہ معقول نہیں ہوتی۔ بے گھر انسان مفلس تو ہو سکتا ہے بے ننگ یا "بے ننگ و نام" نہیں کہلا سکتا۔ بے ننگ کہلانے کے لئے کچھ اور حرکات ہوا کرتی ہیں۔ پھر راہِ دوست میں مال و متاع اور گھر بار اور ناموری اور عزت و جاہ سے محروم ہو جانے کو لٹانا نہیں کہا جا سکتا۔ اگر قربانی خود ہماری نظر میں بھی لٹانا ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہم خود اپنی قربانی کو اپنی نادانی سمجھنے لگے ہیں۔ ایسی صورت میں محبوب سے داد پانا تو ممکن نہیں۔ الٹا الزام ہم ہی پر عائد ہوگا۔

اس کے مقابلے میں داغ بھی محبوب کی راہ میں مٹ جانے کا ذکر کرتے ہیں، ان کے ہاں اپنا مٹنا، عاشق کی فنائے مطلق کا ثبوت ہے اس فنائے کامل کے بعد محبوب متوجہ ہوتا ہے۔ بمصداق ؎

جب ملے خاک میں دانہ تو شگوفہ نکلے

کیوں کہ کوئی مخلصانہ قربانی ضائع نہیں ہوا کرتی۔ قربان ہو جانے والے عاشق کا تیقن اس شان کا ہوتا ہے کہ ہم فنا ہو گئے لیکن ہماری قربانی سے محبوب پر ہماری محبت و اخلاص کا راز بھی روشن ہو گیا۔ دوئی کے پردے اٹھ گئے اور اب محبوب ہمارے نام و نشان کی پوچھ گچھ کرنے لگا۔ اس پر داغ کہتے ہیں کہ اب ہمارے نام و نشان کی پرستش سے کیا حاصل کیونکہ ہم تو مٹ چکے ہیں۔ ہاں اس راکھ کے ڈھیر یا مٹی کے پتلے میں کوئی متاع قابلِ قدر ہے تو وہ محبت ہے۔ بس اگر ڈھونڈنا ہے تو اسے ڈھونڈ کہ وہ نہ ضائع ہو جائے۔ اور محبت بھی اس لئے متاعِ عزیز ہے کہ وہ تیری محبت ہے، ہمارے مٹنے میں اگر ڈر ہے تو صرف اتنا کہ محبت اور پھر تیری محبت کی جنسِ گراں مایہ نہ مٹ گئی ہو۔ ہمارا یا ہماری مملوکات کا مٹ جانا قابلِ پرستش اور لائقِ توجہ نہیں۔ اگر کوئی متاعِ عزیز پرستش کے قابل ہے تو وہ محبت ہے اور صرف محبت۔ ہم نے اسی کو سینہ سے لگا رکھا تھا۔ دل میں چھپایا ہوا تھا، روح میں بسایا ہوا تھا، اب اس کو ڈھونڈ کہ وہ کہاں ہے۔ ہم مٹ گئے تو مٹ گئے لیکن محبت کو نہیں مٹنا چاہئے۔ ہمارے نام و نشان کو نہ ڈھونڈ۔ ہماری محبت یعنی اپنی محبت کو ڈھونڈ، اگر تجھے ہماری یا اپنی محبت کا کھوج مل گیا تو کونین کی سب سے بڑی متاعِ عزیز گم شدہ مل گئی۔ شعر کو پھر پڑھئے اور مزہ لیجئے ؎

جب مٹ گئے تو پرسشِ نام و نشاں ہے آپ — اس کی تلاش کر کہ محبت کہاں ہے اب

(۱۵)

غالبؔ فرماتے ہیں ؎

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے۔ شراب تو دے

داغؔ فرماتے ہیں ؎

کب گدائے درِ میخانہ کو عار آتی ہے
اوک سے پی جو میسّر قدحِ گل نہ ہوا

غالبؔ کے ہاں ساقی سے بحث و تکرار ہے کہا جاتا ہے اگر ہم سے نفرت ہے اور اس لئے ہمیں جام شراب نہیں دیا جا رہا تو خیر پیالہ نہ دو، پیالہ اپنے پاس رکھو ہمیں اس کی ضرورت نہیں، ہمیں تو شراب اور صرف شراب کی طلب ہے۔ تمہارا التفات و عدم التفات تو صرف پیالہ، دینے یا نہ دینے میں محدود ہے مگر ہماری نظر پیالہ پر ہے ہی نہیں شراب پر ہے۔ کہ وہی اصل چیز ہے بس وہ ہمیں دے دو۔ ہم اوک سے پی لیں گے۔ اس شعر میں مطلب نکالنے ہی کی بات ہے حالاں کہ گردشِ جام اور ساقی کا اندازِ خرام اور طریقِ اعطاء و نظر شراب ناب سے زیادہ نشہ آور کیفیات ہیں۔ اور غالبؔ کے اس شعر میں اسی نکتہ پر نظر نہیں۔ اگر ساقی کو آپ سے نفرت ہے تو پھر شراب تلخ زہر ہلاہل کا گھونٹ ہے۔ آپ نے "ہم سے نفرت" کے لفظ استعمال کر کے ساقی کی تمام ساقیانہ اداؤں کو بالائے طاق رکھ دیا ساقی کی طرف سے اس کا جواب کئی طرح کا ہو سکتا ہے مثلاً یہ کہ شراب بھی کیوں دیں یا یہ کہ وہ دھری ہے۔ ہم سے کیا مانگتے ہو، اٹھاؤ اور پی لو۔ خود اٹھانے کی تو ہمت نہیں۔ طلب بھی ساقی ہی سے کی جا رہی ہے اور وہ بھی حسنِ طلب اور سلیقہ کے ساتھ نہیں بلکہ اُسے چڑا اور غصہ دلا کر۔ آپ ہی فرمایئے ایسے سائل کا کیا کرے کوئی؟ پھر اور دیکھئے آپ شراب پینے میخانہ میں گئے ہیں تو وہاں کس کا راج ہے؟ ساقی کا۔ ہر شخص تسلیم کرے گا کہ اس سے گفتگو کا انداز وہ نہیں ہو سکتا جو اختیار کیا گیا یا اگر ساقی آپ کے گھر میں ہے تو وہ آپ کا بندہ اور غلام ہے۔ اس بیچارے کی نفرت و محبت کا سوال ہی بے کار ہے۔ وہ تو آپ کے اشارے پر ناچے گا۔ اس کے دلی جذبات و کیفیات و میلانات تو اسی وقت مر گئے یا سو گئے، یا مرجھا گئے یا بجھ گئے یا راکھ کا ڈھیر ہو گئے جب وہ اپنا گھر چھوڑ کر آپ کے دولت کدہ کی رونق یا آپ کے گھر کے فرنیچر کا جز ہو جانے پر مجبور ہو گیا۔

داغؔ اپنی حیثیت گدائے میخانہ کی بتاتے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں کہ رحیم و کریم ساقی میں گدا نوازی کا جذبہ ہے۔ وہ ملتفت ہوتا اور کہتا ہے لا اپنا پیالہ۔ جام نہیں، یا اپنا کلکول یا ٹھیکرا کہ اس میں شراب اُنڈیل دوں۔ آہ بدنصیب سائل کا ہاتھ ٹھیکرے سے بھی خالی ہے۔ ساقی کی رحمت و رافت یا بلند نظری ہے کہ وہ سائل کی بے چارگی سے متاثر ہو کر ادھر اُدھر دیکھ رہا ہے کہ کوئی برتن ملے تو اسے شراب دے دوں۔ ساقی کو شراب دینے میں ہچکچاہٹ ہے اس لئے کہ سائل کو کہیں اپنی بے مائیگی کا احساس نہ ہو اور یہ تصوّر ساقی کو ناگوار ہے۔ سائل ساقی کی اس بلند نظری کو بھانپ جاتا ہے۔ اس لئے کہتا ہے۔ اگر ہمیں قدح میسّر نہیں تو آپ خدا نخواستہ کیوں ہماری بے مائیگی و بے چارگی کی وجہ سے پریشان یا حیران ہوں۔ آپ کا اتنا ہی کرم بہت ہے کہ آپ پیاسے کو پلانے کے لئے صراحی لئے کھڑے ہیں آپ شراب دیجئے۔ جام و سبو نہیں نہ سہی آپ انڈیلئے۔ اوک موجود ہے اس سے پئیں گے۔

(۱۶)

غالبؔ کی التجا ہے ؎

سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

داغؔ کا اعتراف ہے ؎

برسوں سے لگ رہی تھی لبِ بام ٹکٹکی
تھک تھک کے گر پڑی نگہِ انتظار آج

غالبؔ نا اُمیدی سے اپیل کر رہے ہیں کہ اری ظالم ذرا تو مجھے سنبھلنے دے اور کچھ نہیں کم سے کم یار کا دامنِ خیال تو میرے تصوّر کے ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے یعنی خیالِ یار میرے دل سے دور نہ ہونے پائے۔ اُمید و بیم کی کشمکش کا بہترین مرقع ہے لیکن داغؔ برسوں کے انتظار کے بعد نگہِ انتظار کے گر پڑنے کا اقرار کر کے اپنے مایوس ہو جانے کا اعتراف کر لیتے اور جد و جہد جاری نہ رکھنے کا اعلان کر دیتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ غالبؔ کے ہاں دمِ آخر تک کوشش جاری رکھنے کے جو تیور اور عزائم ہیں وہ داغؔ کے ہاں نہیں۔

(۱۷)

غالب فلسفیانہ انداز میں فرماتے ہیں ؎

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

داغؔ عارفانہ انداز میں فرماتے ہیں ؎

حقیقت میں ہے ماسوا چیز ہی کیا ادھر تو اُدھر تو۔ یہاں تو وہاں تو

غالب کا بیان ہے کہ اگر اسے خدا تیرے وجود کے سوا اور کسی کا وجود ہی نہیں۔ تو پھر من و تو اور شاہد و مشہود کا یہ ہنگامہ کیا اور کیوں ہے؟ بہت اہم سوال ہے جس میں عامی تو عامی۔ اخص خواص بھی متحیر و مبہوت ہو جاتے ہیں۔ یہ سوال اسی انداز کا سوال ہے جو قرآن حکیم نے جناب ابراہیم خلیل اللہ اور خدا تعالیٰ کے مکالمہ کی صورت میں (بقرہ ۲/۳۴) نقل فرمایا ہے۔ ابراہیم نے کہا رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ۔ خدایا یہ تو دکھا دیجئے کہ آپ مُردوں کو کیسے جلاتے ہیں اُدھر سے کہا گیا اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۔ کیا یہ تمھارا ایمان نہیں کہ ہم مُردوں کو زندہ کیا کرتے ہیں کیا تمھیں اس میں شک ہے۔ عرض کیا گیا بلیٰ لِیَطْمَئِنَّ قَلْبِی۔ شک مطلق نہیں، قطعی ایمان ہے کہ آپ مُردوں کو جلاتے ہیں لیکن اس ایمان و ایقان کے علاوہ ایک اور درجہ اطمینان قلب کا اس کی کمی ہے۔ غالب کا محولہ شعر اسی ابراہیمی فطری تقاضہ کا اظہار ہے۔

مگر داغ یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ ماسوا کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ بس جو کچھ ہے وہ آپ ہی آپ کا ظہور ہے یا بلفظ دیگر ہمہ اوست کی جلوہ گری ہے۔ غالب کا بیان ہر انسانی دل کی کسک کا اظہار ہے۔ لیکن داغ کا بیان صاف ہوتے ہوئے بھی انسانی روحی کرب اور عالم کون و فساد کی ہنگامہ آرائیوں میں سکون بخش نہیں ہے کیونکہ ایسا کہنا آسان ہے اور اس حقیقت کے مطابق برتنا مشکل ہے۔ جب اپنے اردگرد نظر ڈالو گے تو دیکھو گے کہ جتنا اس کا پُرزور اعلان کیا جاتا ہے اتنا ہی باہمی چھوٹے بڑے معاملات میں اس حقیقت سے نہ صرف چشم پوشی کی جاتی بلکہ دھڑلّے سے برتی بھی جاتی ہے۔

(۱۸)

غالب ؎

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

داغ ؎

ڈوب کر سینے میں اس رنگ سے پیکاں نکلا دل سے بے ساختہ نکلا کہ "وہ ارمان نکلا"

اس وقت میرے سامنے غالب کے دیوان کا وہ نسخہ ہے جسے جناب سیّد ابوالبیان سیّد حامد حسین صاحب بیدل شاہجہان پوری نے تصحیح کے بعد ۱۹۱۹ء میں مفید عام پریس لاہور سے شائع کیا تھا۔ اس دیوان میں "پرافشاں" کو "پُرافشاں" لکھا گیا ہے جو کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ اگر غلطی نہیں تو تیر کے "افشاں" سے پُر ہونے کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ تیر کے انسانی خون میں سے تیر کے آنے سے خون کی جو بوندیاں یا دھبّے سے تیر پر آ گئے ہیں انہی کی وجہ سے تیر کو افشاں سے پُر ہونے سے تشبیہ دی گئی ہے واللہ اعلم۔

ورنہ غالب کے شعر کا سیدھا سادا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ یار کا تیر دل پر آ کر بیٹھا، دل گھائل ہو گیا، مگر تنگیٔ دل کی داد محبوب کے ہاتھ کے تیر کے زخم نے نہ دی، یعنی اسے دل میں جگہ نہیں ملی، وہ تیر دل میں ٹھہرا نہیں۔ گھبرا کر پھڑپھڑاتا ہوا دل سے نکل گیا۔ غالب یار کے تیر کے دل میں لگنے اور چھیدکر اُڑتے ہوئے نکل جانے کو تیر کا گھبرا کر نکل جانا بتاتے ہیں۔ ورنہ تیر کا سینہ و دل سے پار ہو جانا تیرانداز کا کمال ہے۔ زخم کیا زخمی کو بھی داد دینی چاہیئے تھی۔ غالب تو تیر نیم کش کی آویزش کی لذّت کو مانتے ہیں۔ اس لئے گو تیرانداز کا کمال تو ظاہر ہو گیا۔ مگر مطلب تو پورا نہ ہوا۔ جو اسی صورت میں پورا ہو سکتا تھا کہ تیرا تیر میرے سینہ و دل میں ترازو بنا رہتا۔

داغ بھی تیر و تیرانداز اور سینہ و دل کی داستان بیان کرتے ہیں۔ کریار کی کڑی کمان کا تیر آیا۔ اور میرے سینہ میں ڈوبا اور ڈوب کر اس شان سے جھومتا ہوا یا اٹھتا ہوا نکل گیا کہ دل زخمی نے تیرانداز محبوب کی تیراندازی کی داد دی کہ تمھارا تیر میرے دل میں آیا۔ میرا دل "زخمی" نہیں ہوا بلکہ میرے دل کی تمنّا پوری ہو گئی۔ کیونکہ جب تیرا تیر میرے دل و سینہ میں سے تیرتا ہوا نکلا وہ گویا تیر نہ تھا میرے دل کی کوئی تمنّا اور کوئی ارمان تھا جو نکل گیا یعنی ارمان پورا ہو گیا اور تمنّا بر آئی۔ داغ کے نزدیک تیر کا دل سے نکلنا تیر کا نکلنا نہیں، دل کے ارمان کا پورا ہونا ہے۔

(۱۹)

غالب کا دعویٰ ہے ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

اور داغ کا اعلان ہے ؎

معرکہ ہے آج حُسن و عشق کا دیکھئے وہ کیا کریں ہم کیا کریں

غالب کے اس شعر کی داد بڑے بڑوں نے دی۔ انتہا یہ ہے کہ ہماری زبان میں گویا ضرب المثل کے طور پر استعمال ہونے لگا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ شعر ہے بھی اس قابل کہ دل کھول کر اس کی داد دی جائے۔ اس شعر کا وہ مفہوم ہمیں بہت پسند ہے۔ جو ہماری زبان کے امام فنِ تنقیدِ ادب و شعر شمس العلماء مولانا حافظ خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم و مغفور نے "یادگارِ غالب" میں بیان فرمایا ہے یعنی۔

اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مرگیا ہوں ۔مردِ افگنِ عشق کا ساقی یعنی معشوق بار بار صلا دیتا ہے یعنی لوگوں کو شرابِ عشق کی طرف بُلاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے بعد شرابِ عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا۔ اس لئے اس کو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر زیادہ غور کرنے کے بعد جیسا کہ مرزا (غالب) خود بیان کرتے تھے۔ اس میں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرع ہی ساقی کے صلا کے الفاظ ہیں اور اس مصرع کو وہ مکرّر پڑھ رہا ہے۔ ایک دفعہ بلانے کے لہجہ میں پڑھتا ہے۔ "کون ہوتا ہے حریفِ مے مردافگنِ عشق" یعنی کوئی ہے جو مے مردافگنِ عشق کا حریف ہو؟ پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اس مصرع کو مایوسی کے لہجے میں مکرر پڑھتا ہے۔ "کون ہوتا ہے حریفِ مے مردافگنِ عشق" یعنی کوئی نہیں۔

اس میں لہجہ اور طرزِ ادا کو بہت دخل ہے۔ کسی کو بُلانے کا لہجہ اور ہے اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے۔ جب اس طرح مصرع مذکور کی تکرار کروگے تو فوراً یہ معنی ذہن نشین ہو جائیں گے۔ یہ سب اپنی جگہ بجا اور درست۔ لیکن اگر لہجہ اور طرزِ ادا سے جناب مرزا غالب کے ذہن میں شعر کے معانی کا ایک پہلو یا رُخ آسکتا ہے تو اسی لہجہ اور طرزِ ادا سے اور بھی بہت سے معانی و مطالب پیدا ہو سکتے ہیں گو مرزا صاحب کے مفہوم کو اولیت کا درجہ حاصل ہوگا۔ مگر دوسرے مفاہیم سے بھی انکار آسان نہ ہوگا۔ مثلاً پہلے مصرعہ کے بہ لہجۂ حزن و یاس دوبارہ پڑھنے سے اگر قربان ہو جانے والے عاشق کا حریف نہ ملنا قابلِ افسوس سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر عاشق کی قربانی کو قابلِ فخر و ناز سمجھ کر اسی انداز سے پڑھا جائے تو مفہوم بالکل بدل جائے گا۔ پھر ساقی یا معشوق کے عاشق کے بعد محزون ہونے کی بھی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ اوّل افسوس ہم خالی ہاتھ رہ گئے۔ اگر کوئی اور مل جاتا تو ہماری حالت کس مپرسی کی نہ رہتی۔ دوم یہ کہ دُنیا اتنے بڑے انسان سے خالی ہو گئی اب اس کے بعد جینا بے کار ہے۔ اس مفہوم کے علاوہ اور بھی کئی مفہوم خیال میں آسکتے ہیں یعنی مجمعِ عشاق دیکھ کر ساقی نے نعرہ لگایا کہ یہ رہا عشق کا بادۂ مردافگن۔ اس مجمع میں کوئی ہے جو اس کو بڑھ کے اٹھائے اور چڑھا جائے۔ میں بڑھا اور ساقی کے ہاتھ سے میں نے جام لے لیا، اور بے تکلف پورے کا پورا چڑھا گیا۔ ساقی یہ دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا اور مان گیا کہ عاشقوں میں میرا جواب نہیں اسی حیرت کے عالمِ سرشاری میں بے اختیار اس کی زبان سے نکلا تو یہی نکلا۔

کون ہوتا ہے حریفِ مے مردافگنِ عشق

یعنی میدان میں عاشقوں کا مجمع نہیں تماشائیوں کا انبوہ ہے مگر مدعیانِ عشق ہیں بھی تو ان میں میرے درجے کا ایک بھی نہیں۔ اس لئے میں ہی عاشقوں کے خاندان اور قبیلہ کا فخر ٹھہرا۔

اس شعر پر غور کرتے ہوئے تین چیزیں قابلِ توجہ معلوم ہوتی ہیں۔

۱۔ ساقی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ ہیت لک (ادھر آؤ) کی دعوت دے رہا ہے۔

۲۔ دوسری طرف عشق کا بادۂ مردافگن ہے یعنی عشقِ صادق و کامل ہے۔ جو قربانی اور صرف قربانی کا مطالبہ کرتا ہے۔

۳۔ وہ عاشقِ صادق ہے جس نے عشق کی شرابِ آتش رنگ کا خُم خانہ خالی کر دیا تھا۔ اس کے گذر جانے کے بعد ساقی کو اس عاشق کے ہم پایہ مدمقابل کی تلاش تھی۔ جو شرابِ صافیٔ عشق کو اس کی تلخیوں کے باوجود بغیر منہ بنائے پی کر خود فنا ہو گیا تھا۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ساقی یا معشوق نے یہ چیلنج کیا کہ کوئی ہے جو بادۂ مردافگنِ عشق پیے" یعنی امتحانِ عشق میں پورا اُترے۔ اور مرحوم عاشق نے بڑھ کر جامِ عشق پی کر اپنا عاشقِ شیدا و کامل ہونا ثابت کر دیا۔ تو ساقی نے عاشق کی اس قربانیٔ عظیم کی کیا قدر کی۔ کیا بس اسی قدر کہ اس کی جگہ کسی اور کو تلاش کر لیا جائے۔ یا معشوق کا یہ فیصلہ موزوں ہوتا کہ وہ خود عاشق کی راہ میں اپنا بلیدان کر دیتا؟ کیونکہ ہمارے نزدیک عاشق کی اس قربانی کے بعد معشوق کا فرض تھا کہ عاشق کے ساتھ ستی ہو جاتا۔ یہ تو نہیں ہوا۔ اس کی بجائے ساقی کو ایسے عاشقِ صادق کو ٹھکانے لگا کر ایک اور عاشق کی تلاش ہے۔ تبھی تو اس مرحوم بسمل یا نیم بسمل کی لاش کے سامنے اعلان ہو رہا ہے کہ کوئی اور ہے جو عشق کی شراب پی سکے۔

اور اِدھر عاشق کی حالت یہ ہے کہ اپنے گذر جانے کے بعد ساقی کو یوسفِ بے کارواں بتاتا ہے۔ کہ خیر تم نے ہم کو تو کھو دیا۔ لو اب تم بھی چراغِ رُخِ زیبا لے کر صدا لگاتے پھرو۔ ہم ایسا عاشق تم کو مل چکا۔

اگر یہ مفہوم صحیح ہو تو ساقی نے اپنے بیرد کی کوئی قدر نہ کی اور عاشق نے اپنی یکتائی کا اعلان کر دیا کہ معشوق یکتا نہیں بلکہ عاشق کا جواب نہیں۔ عاشق کا قربانی کے باوجود خودستائی کرنا حسن و عشق کی سرشاریوں، شیفتگیوں اور فنا پذیریوں سے لگا نہیں کھاتا۔

یہ مسلمات میں سے ہے کہ غالب کا کلام سہل بہل ممتنع ہے اور مشکل عسیر الفہم۔ اسی وجہ سے اس کے مشکل کلام کے مفہوم کا اکثر بڑی دیر سے بہت دور جاکر کچھ کچھ اتا پتہ لگتا ہے۔ اسی لئے غالب کے کلام کی تشریح میں عموماً یہ دعویٰ مشکل ہوتا ہے کہ غالب کا فی الضمیر یہی ہے جو شارح نے بیان کیا۔ اسی لئے ہماری ہر تعبیر و تشریح کلام غالب محل نظر ٹھہر سکتی ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں داغ ہر قسم کے حقائق و لطائف سادہ ترین مگر دل نشین پیرایہ میں بیان کرتا ہے جسے لوگ بجا طور پر بدقسمتی سے عامیانہ سمجھنے لگتے ہیں۔ آپ نے غالب کا شعر پڑھ لیا اب داغ کا شعر دیکھئے یہاں معاملہ صاف ہے ؎

معرکہ ہے آج حسن و عشق کا
دیکھئے وہ کیا کریں ہم کیا کریں

حسن و عشق کی ازل سے یہ معرکہ آرائی چلی آ رہی ہے اور یوں ہی ابد تک چلتی رہے گی یہاں فیصلہ نہ ہوا ہے نہ ہوگا اور نہ ہو سکتا ہے حسن و عشق کی اس معرکہ آرائی ہی کا نام "حیات" ہے۔ اسی کو مذہب کی زبان میں الایمان بین الخوف والرجا کہا گیا ہے۔

کامل بہزادی

غزل

ٹھہری ٹھہری سی ہے رفتارِ الم رات گئے
آ رہا ہے کوئی مائل بہ کرم رات گئے

تیرہ و تار فضاؤں پہ ٹھہر جاتے ہیں
کہکشاں بن کے ترے نقشِ قدم رات گئے

سایۂ زلف میں تھے محوِ کتابِ عارض
ہم نے دیکھے ہیں بہم دیر و حرم رات گئے

ہم کہ تلچھٹ سے بھی محروم رہے اوّلِ شب
کھنکھناتے ہیں وہاں ساغرِ جم رات گئے

رقص کرتی رہیں آنکھوں میں گھنیری پلکیں
یاد آئے ہیں بہت زلف کے خم رات گئے

عرش سے سلسلۂ فکرِ رسا ملتا ہے
جب بھی فن کار اٹھاتا ہے قلم رات گئے

فیضِ صہبا ہے کہ سجدوں کا کرشمہ کامل
بولنے لگتے ہیں پتھر کے صنم رات گئے

ذکی کاکوروی

غزل

فکرِ معاش لائی ہے مجھ کو وطن سے دور
صحنِ چمن سے دور تری انجمن سے دور

اُلجھی تھیں جب نسیم سے کلیاں خبر نہ تھی
پہنچے گی بوئے ناز مرے پیرہن سے دور

حاصل نہ ہوگا دل کی لگی سے کہیں فراغ
چاہے ترے چمن میں رہوں یا چمن سے دور

پھر آج بڑھ چلی ہیں مرے دل کی دھڑکنیں
شاید نہیں ہوں اب میں تری انجمن سے دور

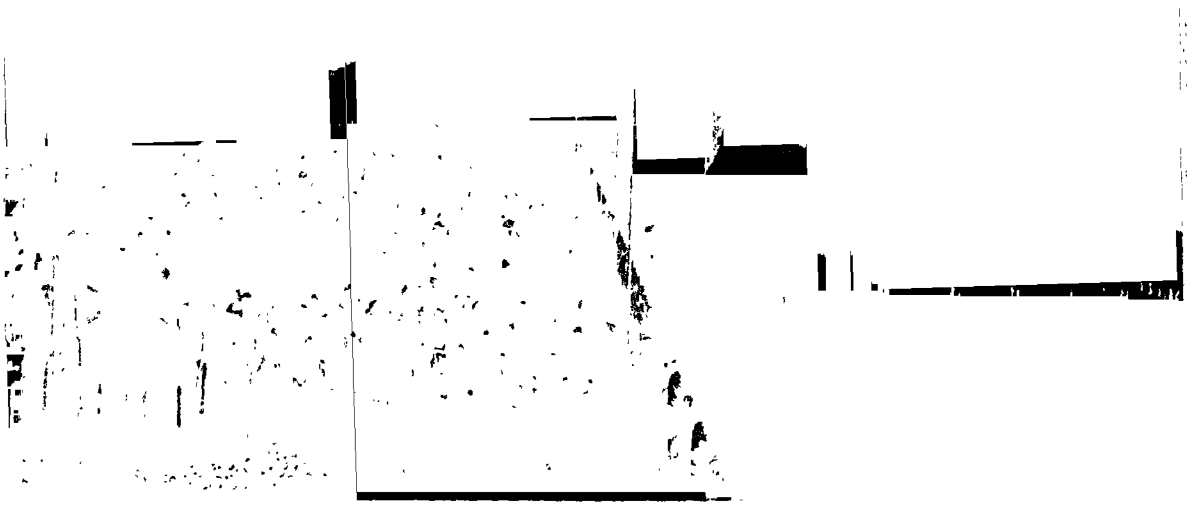
ہر گام پر بچھا دئے ہیں رنگ و بو کے دام
جاؤں کہاں میں اس بتِ گل پیرہن سے دور

ہم پہلوئے نشاطِ محبت رہے ذکی
لیکن گئے نہ سرحدِ رنج و محن سے دور



امجد حیدر آبادی

آپ کے بارے میں محمدؐ عمر یوسفی کا مضمون ذکرِ امجد صفحہ ۔ پر ملاحظہ فرمائیں۔



یوم جمہوریہ کی فوجی پریڈ کا ایک عام منظر ۔ صدر جمہوریہ بائیں طرف تشریف فرما ہیں۔



ڈیوک آف ایڈنبرا
وزیر اعظم کے ساتھ
جن پتھ سے گذر رہے ہیں

دلّی میں جشنِ جمہوریہ

اسکول کے بچوں کی پریڈ

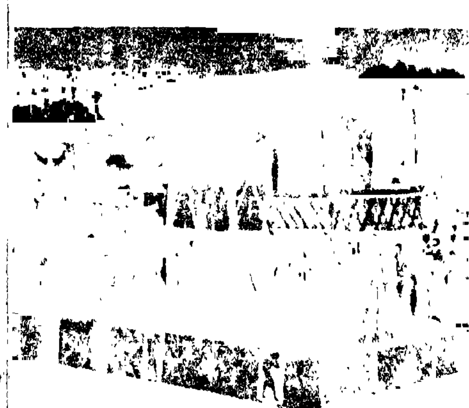


ہاتھیوں کا جلوس





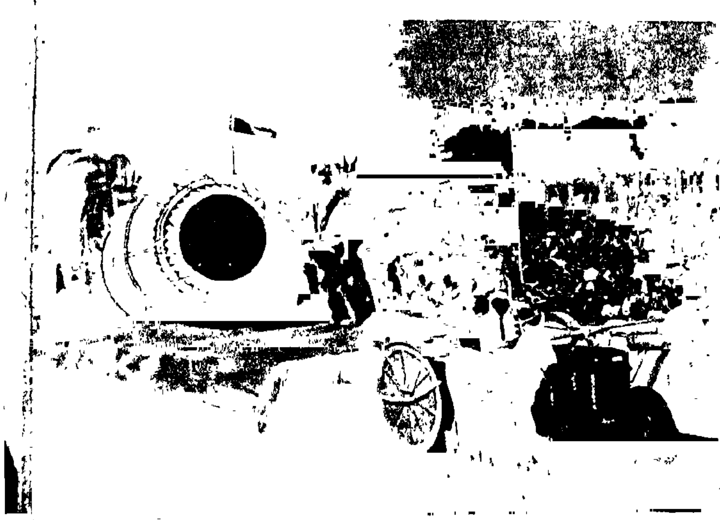
آندھرا پردیش کی جھانکی



تری پورہ کے گاؤں کا منظر



انڈومان نکوبار کی جھانکی



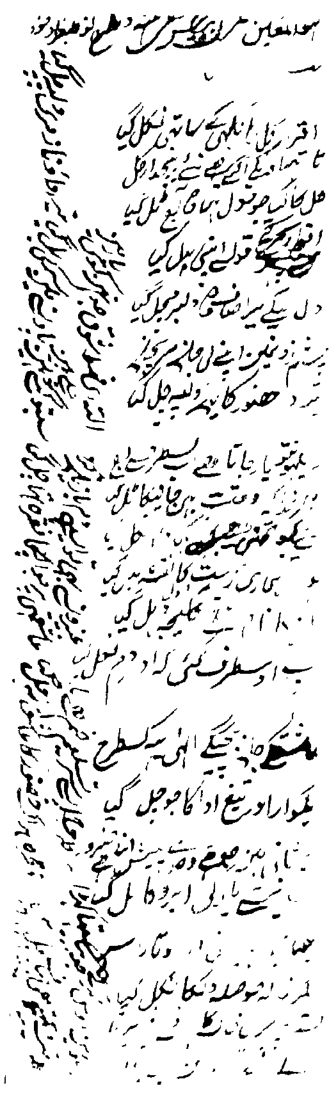
راجستھان کی جھانکی



شہزادہ برجیس قدر کی شاہی مہر
جو بہادر شاہ ظفر نے عطا کی تھی



ملکہ حضرت محل کی مہر



شہزادہ برجیس قدر کی تحریر

شہزادہ برجیس قدر اور اُن کے بڑے صاحبزادے خورشید قدر (کُرسی نشین)
بیلو میں وفادار مصاحب ہیں جو لکھنؤ اور نیپال میں شہزادہ برجیس قدر کے ساتھ رہے۔ اور آخرکار
سانحۂ عطا باغ میں ۱۴۔ ۱۵۔ اگست ۱۸۹۳ء کو اُن کے ساتھ زہر سے ہلاک ہوئے۔



محوی صدیقی لکھنوی

غزل

کیا پوچھتے ہیں آپ کہ کیوں رو رہے ہیں ہم
اک داغ ہے حیات اُسے دھو رہے ہیں ہم

اشکوں سے پائے ناز اگر دھو رہے ہیں ہم
کیا آبروئے عشق و وفا کھو رہے ہیں ہم

احساسِ غم ہے اور مداوائے غم نہیں
دل اپنا جاگتا ہے مگر سو رہے ہیں ہم

نوکِ مژہ پہ اشک مچلتے ہیں بار بار
کانٹے یہ اپنی راہ میں خود بو رہے ہیں ہم

عُرسِ شہیدِ ناز ہے، جلوے نظر نواز
یہ جشن اور زیرِ زمیں سو رہے ہیں ہم

اپنی نظر بھی اب ہمیں دینے لگی فریب
برسوں ادا شناسِ نظر گو رہے ہیں ہم

وہ زندگی تھی اور یہ انعامِ زندگی
روتے تھے رات رات بھر، اب سو رہے ہیں ہم

محرومِ دید، چشمِ امید اور صبحِ عید
دنیا تو ہنس رہی ہے مگر رو رہے ہیں ہم

ہشیار اپنی قیمتِ عمرِ عزیز سے!
یہ اور بات ہے کہ اسے کھو رہے ہیں ہم

یہ بھی ہے کیا مقامِ محبّت کہ سب خفا
اپنے کئے پہ آپ ہی خوش ہو رہے ہیں ہم

یہ جبر و اختیار کے آئین الاماں
لب پر ہنسی ہے، دل میں مگر رو رہے ہیں ہم

کس نے تھپک تھپک کے سُلایا ہے یوں ہمیں
ہر فتنہ جاگ اُٹھا ہے مگر سو رہے ہیں ہم

منزل بھی اک فریب نہ ہو ہم سفر کہیں
منزل کی سمت شوق سے جا تو رہے ہیں ہم

کونین اک نگاہ کی قیمت نہیں تو پھر
یہ زندگی جو تیرے لئے کھو رہے ہیں ہم

زنداں میں کون پوچھنے آتا ہے اب ہمیں
محوی وطن میں یاد ہی کس کو رہے ہیں ہم

ایم کوکب

اودھ کا آخری تاجدار

یوں تو خوش حالی کا دور بتدریج آ رہا ہے۔ لیکن اس میں کسی افسردہ خاطر کو کلام ہو تو ہو، ہندوستان کی آزادی کے بعد اس اعتبار سے ہماری خوش نصیبی میں کوئی کلام نہیں کہ ہم نے تاریخ کو اس انقلابی دور سے گذرتے دیکھا جس کو آئندہ نسلیں یاد کریں گی، ان غلط نظریات کو بدلتے دیکھا جن کو انگریزوں نے اپنے زمانے میں اپنی حکومت کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لئے عمداً پیش کیا اور پروان پڑھایا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے وہ افراد جنھوں نے اپنے خون سے گنگ و جمن کی وادیوں کو لالہ زار بنایا اور باغی و غدار قرار پائے آج مجاہدِ ملت و شہیدِ قوم ہیں اور انگریزوں کے خلاف آواز بلند کرنے والا ہر فرد خواہ ہندو ہو یا مسلم، مرد ہو یا عورت، ذی رُتبہ ہو یا گمنام یکساں طور پر ہندوستانی عوام کی عقیدت کا حقدار ہے، اُجڑی ہوئی دلی، لٹے ہوئے لکھنؤ اور جلتی ہوئی جھانسی کے فرماں روا، آج بھی عوام کے دلوں میں اپنا مسکن بنائے ہوئے ہیں اور اس گھر سے ان کو جلاوطن کرنا اب انسانی طاقت سے باہر ہے۔

تاریخ کے اُس یادگار دور میں جس کو ہم آج پہلی جنگِ آزادی کے نام سے یاد کرتے ہیں ہندوستان میں مسلمانوں کی مٹتی ہوئی حکومت کے دو ہی مرکز باقی بچ رہے تھے۔ دلی کی شہنشاہی اپنی روایات، قدامت، عظمت اور سب سے بڑھ کر اپنے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی سیرت کی بدولت ہندوستانی عوام کو عزیز تھی۔ ظلِ سبحانی کا سایہ کنجِ عافیت تھا کہ جس سے الگ ہونے کو کسی کا دل نہ چاہتا تھا۔ حاکم وقت سے عقیدت کا یہ حال اس زمانے میں اگر کہیں ملتا ہے تو اودھ میں جو دلی کے بعد دلی سے کسی قدر مختلف مسلمانوں کی تہذیب کا دوسرا اور مقبول مورِی مبدا لجلیم شرر ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ تھا۔ سرزمینِ بنگال کو اودھ کے معزول بادشاہ جان عالم واجد علی شاہ اختر کا میزبان بنے سو سال پورے ہو گئے۔ اگر وہ چاہتے تو اپنی معزولی کے خلاف احتجاج کرتے اور غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے غدر برپا ہو جاتا۔ لیکن مثل بہادر شاہ ظفر انھوں نے بھی ع اگر کچھ کہا آسماں سے کہا، اگر ۱۸۵۷ء میں یہ لکھنؤ میں ہوتے تو بہادر شاہ کی طرح یقیناً عوام انھیں کو انگریزوں کے خلاف اپنا قائد منتخب کرتے اور غالباً ان کا بھی وہی حال ہوتا جو آخری مغلیہ تاجدار کا ہوا۔ جان عالم نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں کیوں کوئی حصہ نہیں لیا اور ان کے بعد عوام نے کیوں ان کے کم سن لڑکے برجیس قدر کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا یہ ایک طویل بحث ہے جس پر اظہارِ خیال مقصود نہیں۔ برجیس قدر کی شاہی جو ۱۸۵۷ء کی تحریک کے ساتھ شروع ہوتی اور اسی تحریک کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ ایک ایسی حقیقت تھی جو گذشتہ صدی میں تاریخی حیثیت سے تشریح طلب رہی اور اب موجودہ ریسرچ نے وہ حقائق بے نقاب کئے ہیں جس پر زمانے نے پردہ ڈال رکھا تھا۔ معزول بادشاہ جان عالم کی ہر دل عزیزی انگریزوں کے غلط پروپیگنڈے کے باوجود کم نہ ہوئی تھی اور عوام جان عالم ہی کو اپنا آخری تاجدار تسلیم کرتے تھے۔ خود خاندان شاہی اور انگریزوں نے شہزادہ برجیس قدر کو بادشاہ تسلیم نہ کیا جس کا نفسیاتی و سیاسی پس منظر کچھ زیادہ تحقیق طلب نہیں ہے۔ جان عالم کے عقیدت مندوں میں اکثر کا تو یہ خیال تھا کہ وہ شہزادہ برجیس قدر کو صرف انگریزوں کا ہی کا باغی خیال نہ کرتے تھے بلکہ باپ اور بادشاہ کے خلاف بھی ان پر بغاوت کا الزام عائد کیا جاتا تھا۔ ان متلون الزامات، اس شاہی کی حقیقت اور اس کی اہمیت کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ اس دور کی تاریخ کا اجمالی طور پر ذکر کر دیا جائے۔

شاہانِ اودھ کے مورثِ اعلیٰ میر محمد امین سعادت خاں برہان الملک جن کے مبارک ہاتھوں نے ۱۷۲۲ء میں حکومتِ اودھ کی داغ بیل ڈالی شاہانِ دہلی کے جانباز معتمد لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے اور یہ انھیں کا دم تھا کہ اودھ کے سرکش جاگیرداروں کو انھوں نے اپنی تلوار کے آگے سر جھکانے پر مجبور کیا۔ دلی کے تخت کو سیّد برادران کی منحوس سازشوں سے پاک رکھنے اور بہر نازک وقت میں اس کے کام آنے والوں میں ان کے داماد ابو المنصور خاں نے جو خدمات انجام دیں اُن کے صلے میں میر محمد امین کے جانشین ابو المنصور خاں کو صفدر جنگ کا خطاب آگرہ و اودھ کی صوبے داری اور وزارت کی سند عطا ہوئی اور یہی وجہ تھی کہ صوبہ دارانِ اودھ نواب وزیر کے لقب سے مشہور ہوئے۔ دلی سے وفاداری و جانثاری کے صلے میں ملی ہوئی اودھ کی صوبہ داری اور نواب وزیر کا خطاب چار نسلوں تک صفدر جنگ کی اولاد کے لئے طرۂ امتیاز بنا رہا، اودھ کے نواب وزیر اگرچہ اپنے علاقے میں مطلق العنان حکمراں کی حیثیت رکھتے تھے لیکن دلی سے جو رشتۂ اخوت قائم ہوا تھا وہ ہنوز باقی تھا۔ اودھ کی صوبہ داری عطا ہونے کے پورے سو سال بعد ۱۸۱۹ء میں جب دلی کی شاہی دم توڑ رہی تھی انگریزی گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز کی شہ پر ساتویں نواب وزیر غازی الدین حیدر نے اپنی شاہی کا اعلان کر دیا اور اپنا سکہ جس پر مندرجہ ذیل شعر کندہ تھا بادشاہ دہلی کی خدمت میں مع دیگر تحفہ تحائف کے بھیجا ؎

سکہ زد بر سیم و زر از فضلِ ربِّ ذوالمنن
غازی الدین حیدر عالی نسب شاہِ زمن

اکبر شاہ ثانی نے ان تحائف کو قبول فرما کر خلعت عطا کیا اور چوں کہ بقول شخصے برجانِ درویش، دلی کی فوجی طاقت اس سرکشی کا جواب دینے کی اہل نہ تھی۔ بادشاہ دہلی نے اس سکہ کے جواب میں ایک سکہ بھیجا جس پر یہ شعر کندہ تھا ؎

سکہ زد در جہاں زجورِ فلک
غازی الدین شہ حرام نمک[1]

یہ تھی اس شاہی کی ابتدا جس کی چھتیس سال بعد واجد علی شاہ پر انتہا ہوتی ہے۔ انگریزوں کی اطاعت میں یہ شاہی وزارت سے بدتر ثابت ہوئی اور شاہانِ اودھ انگریزوں کے ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ گئے۔

چھتیس سال میں عروج و زوال کی یادگار منزلیں طے کرتی اودھ کی شاہی ایک خواب تھی جس کو دل بھر کر دیکھنے بھی نہ پائے تھے کہ ؎

جواں سال سلطانِ لکھنؤ ہوا[1]
نصاریٰ پہ قہرِ خدائی ہوا

کے فلک شگاف نعروں نے ساکنانِ اودھ کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا، ۱۸۱۹ء سے ۱۸۵۶ء کے درمیانی سالوں میں پانچ بادشاہوں نے مسندِ اودھ کو زینت بخشی اور اس مختصر سے دور میں عوام کے دلوں پر علم و ادب کی دنیا میں تہذیب و تمدن کی تاریخ پر وہ گہرے نقش کندہ کئے جس کو استبدادِ زمانہ کے یخ بستہ ہاتھ اب تک نہ مٹا سکے۔ بدنظمی اور عیاشی کے الزام میں گرفتار اپنی نگاہوں میں خود شرمسار معزول بادشاہ واجد علی شاہ اہلِ وطن کے حق میں دعائیں کرتا عازمِ کلکتہ ہوا چاہئے تو یہ تھا کہ اس بے حرمتی پر اودھ کی سرفروش کفن بردوش رعایا ان غلط الزامات کو اپنے خون سے دھوتی جو ان کے تاکردہ گناہ حکمراں پر ناحق عائد کئے گئے تھے لیکن رقیق القلب بادشاہ کی تلقین اور قومی کمزوری کے احساس نے اس برہمی کو ظاہر ہونے کا موقع نہ دیا، غبار نے طوفان کی شکل اختیار کی اور سال بھر بعد اس تحریک نے سر اُبھارا جس نے انگریزی سامراج کی چولیں ہلا دیں۔

مورخین نے الحاقِ اودھ کو ۱۸۵۷ء کی تحریک کا ایک بڑا سبب بتایا ہے۔ ۱۸۵۷ء میں جب جنگِ آزادی کے شعلے بھڑکے تو اضلاعِ اودھ سے لوگوں نے لکھنؤ کا رخ کیا۔ آج وہ اس تخت پر اپنی جان نثار کرنے آئے تھے جس سے ان کو بدگماں بتایا جاتا تھا۔ حمیّتِ ملی اور حرارتِ دینی نے تمام مصلحتوں سے بے پروا بنا دیا تھا صرف ایک مقصد پیشِ نظر تھا اور وہ یہ ؎

مجاہد کو خدا کی راہ میں قربان ہونا ہے

۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو بادشاہ کے نابالغ لڑکے شہزادہ برجیس قدر کو محلاتِ شاہی اکابرِ فوج اور مدبرینِ ریاست کے مشورے اور عوام کی خواہش کے مطابق تخت پر بٹھایا گیا۔ مولوی احمد حسین اس کے محرک تھے نواب ممو خاں مولوی شہاب الدین اور سید برکات احمد رسالدار نے مندیلِ شاہی مرزا برجیس قدر کے سر پر رکھی اور اس طرح ان ہنگامی حالات میں وہ انتخاب عمل میں آیا جس میں امراء سے زیادہ عوام کو دخل تھا۔ شہزادہ برجیس قدر میں اس وقت اس سے بڑی اور کوئی خصوصیت نہ تھی کہ وہ معزول بادشاہ کے لکھنؤ میں سب سے بڑے لڑکے تھے

---

[1] تحفۂ شاہنگاں ج ۲ ص ۴۵۲

[1] سکۂ شاہ برجیس قدر ۱۸۵۷ء کے ہیرو، ص ۲۹۔

اور اس سے پہلے بادشاہ کی نیابت کے فرائض انجام دے چکے تھے[1]۔ ان کی ماں حضرت محل کی طرح اس وقت لکھنؤ میں تحریک کے چلانے والے مولوی احمد اللہ شاہ، آزمودہ جنگ راجہ بینی مادھو، راجہ مان سنگھ و مدبر راجہ جیا لال جیسی مقتدر ہستیاں موجود تھیں۔ پھر کیا وجہ تھی کہ عوام نے ۱۸۵۷ء کے پُر آشوب زمانے میں ایک کم سن بچے کو اپنا قائد منتخب کیا؟ حضرت محل اور شہزادہ برجیس قدر پہ عوام نے جو اعتماد کیا تھا ان کے ایثار، استقلال، قیادت، مردانگی نے ثابت کر دیا کہ وہ ہر طرح اس کے اہل تھے۔ انگریزی سامراج کے خلاف جدوجہد ان کی زندگی کا نصب العین تھا اور تا دم آخر ان سے اس معاملے میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اگر حضرت محل کی زندگی اس شعر کی زندہ تفسیر ہے ؎

جس پہ یہ تاج مرصع تھا وہ سر کیسا تھا
عورتیں ایسی تھیں جس گھر کی وہ گھر کیسا تھا

تو شہزادہ برجیس قدر نے پینتیس سال جلاوطنی کی کٹھن گھڑیاں گذار کر اور زہر فرنگ سے ہلاک ہو کر یہ ثابت کر دیا کہ ؎

مجھے اسیر کرو یا مری زباں کاٹو
میرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے

تخت نشینی کے دوسرے دن ۹ جولائی ۱۸۵۷ء کو شہر میں منادی ہوئی۔ "خلق خدا کی، ملک شاہ دلی کا، حکم برجیس قدر کا"[2] ۱۸۵۶ء میں دلی سے تعلقات منقطع ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اہل لکھنؤ کو دلی کا تخت یاد آیا، فوج کے اعلیٰ افسران نے شہزادہ برجیس قدر سے تخت نشینی کے وقت جن شرائط پر دستخط کروائے ان میں پہلی شرط یہ تھی[3]۔

"ما بادشاہ دلی کو ہم اس باب خاص میں عرضداشت کرتے ہیں۔ بشرط منظوری وہاں کے پیرو رہیں گے، خواہ بادشاہ کریں یا وزیر تابع فرمان شاہ دہلی رہے۔"

شہزادہ برجیس قدر کی تخت نشینی کی اطلاع بہادر شاہ دلی کو پہلے ہی دی جا چکی تھی اور اس باب میں بہادر شاہ کی منظوری بھی ۱۰ ذی الحجہ ۱۲۷۳ھ کو آ چکی تھی۔ ۲۳ ذی الحجہ ۱۲۷۳ھ کو ارکان دولت کے مشورہ سے یہ طے پایا کہ ایک عرضداشت

[1] اخبار طلسم لکھنؤ ج ۱ ن ۲۲، ۱۹ دسمبر ۱۸۵۶ء

[2] [3] قیصر التواریخ ج ۲ ص ۲۲۷

سرکار برجیس کی طرف سے شہنشاہ دلی کی خدمت میں اس مضمون کی پیش کی جائے[1]

"حضرت ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ، اس خاکسار عقیدت نہاد نے کافران فرنگ کو تہ تیغ بے دریغ کیا، چند کفار بدنہاد یہاں کالہ میں باقی ہیں وہ بھی مارے جاتے ہیں مگر امیدوار عنایت خسروانہ کا ہوں کہ جو مہربانی سرکار سے میرے بزرگوں کے ساتھ رہی تھی وہی پرورش حضور کو میرے حق میں بھی چاہیئے اور کچھ تحفے واسطے خدام ذی الاحترام کے گو کہ لائق حضور نہیں مع عرضداشت گذرانتا ہوں، اگر قبول افتد زہے عز و شرف۔"

عباس مرزا سفیر شہزادہ برجیس قدر خراج ملک سے زیادہ سالکان اودھ کا خراج عقیدت لئے بڑے تزک و احتشام سے ۲۶ محرم الحرام ۱۲۷۴ھ کو شہر دلی میں داخل ہوئے، لوگوں میں مشہور ہوا کہ صوبہ اودھ نے خزانہ بھیجا ہے۔ انھیں کیا معلوم کہ یہ وہ نذر تھی جو عہد شاہ غازی الدین حیدر سے بند ہو چکی تھی اور جس کے بعد اب نہ نذر کے دینے والے رہیں گے اور نہ پانے والے۔ بدنصیب بہادر شاہ نے خلوت میں سفیر سے ملاقات کی، نذر قبول کی، حال سنا اور پنسل سے عرضداشت مزین بہ دستخط خاص فرمائی کہ ؎

"فرزند ارجمند برجیس قدر بہادر شاہ اودھ[2] آفریں ہو کہ چھوٹے سے سن میں تم نے بڑا کام کیا۔ آئندہ پیچھے سے تمہارے واسطے مہر خطاب بھیجی جائے گی، خاطر جمع رکھو، جو ملک قدیم تمہارا تھا اس سے زیادہ عطا ہوگا۔"

سفیر مرزا برجیس قدر کو سفیر الدولہ خطاب عنایت فرمایا اور کہا "وہ (برجیس قدر) فرزند دلبند میرا ہے۔ میں نے تاج بخشی کی" آخری مغلیہ تاجدار کا بخشا ہوا تاج وہ تاج افتخار تھا جو کسی شاہ اودھ نے اب تک زیب فرق نہ کیا، یہ وہ تاج نہ تھا جو بقول[3] ملکہ کشور انگریزوں نے بخشا تھا اور جس کی بخشش کا

[1] قیصر التواریخ ج ۲، ص ۲۳۴-۲۳۵

[2] آج کل جنگ آزادی نمبر اگست ۱۹۵۷ء میں مضمون ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ پر کیا بیتی کے مصنف نے یہ خط نقل کرتے ہوئے ان الفاظ کو سہواً یا عمداً حذف کر دیا تھا۔ خط اپنی اہمیت کے پیش نظر قیصر التواریخ ج ۲ ص ۲۳۴ سے صحت کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔

[3] نجم الغنی، تاریخ اودھ ج ۵ ص ۲۰۴

اعتراف کرتے ہوئے[1]

دکھوں گا میں تو دیپش ملکہ یہ تاج — انھیں کا ہے بخشا ہوا مجھ کو راج

اس کی واگذاری کی استدعا واجد علی شاہ نے مرزا ولی عہد سے ان الفاظ میں کروائی تھی[2]

تمھیں کاش دے تاج و کٹوایا — تو گویا پھر اس نے مجھی کو دیا

ہندوستان کے آخری شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کی عطا کردہ مہر خطاب شاہی مرزا برجیس قدر آج ان ہندوستانی مورخین کی شاکی نظر آتی ہے جو انگریزوں کی تقلید میں انگریزوں کے منظورِ نظر واجد علی شاہ کو آخری تاجدار کہتے آئے اور اپنے وارثِ تخت و تاج تیموری کے قول کا احترام نہ کیا۔ ہندوستان کے وہ عوام جنھوں نے برجیس قدر کو ۱۸۵۷ء میں تاج پہنایا تھا آج ۱۹۸۲ء میں بھی اس تاج کی اہمیت کو قبول کرتے ہیں اور انھیں کو اودھ کا آخری تاجدار تسلیم کرتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کا تاج تاجِ ملک گیری تھا تاجِ افتخار اب بخشا گیا ہے اور اس کے بخشنے والے وہ ہیں جن کی بخشش کے آگے اور کسی شے کی طلب باقی نہیں رہتی۔[3]

برجیس قدر کی تاج پوشی کے بعد اودھ کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ برجیس قدر نواب وزیر نہ تھے۔ وزارت کا غازی الدین حیدر پر خاتمہ ہو گیا۔ یہ مثل غازی الدین حیدر بادشاہ بھی نہ تھے۔ تاج پوشی اور بہادر شاہ ظفر کی تاج بخشی کے باوجود خود مرزا برجیس قدر نے بادشاہ کا لقب بھی اختیار نہ کیا۔ شہزادہ برجیس قدر کے الفاظ توں پر ان کے دورِ حکمرانی میں مختلف اوقات میں جاری ہوئے۔ شہزادہ برجیس قدر کی ذاتی مہر ثبت ہے اور ان میں ان کو والیٔ ملک اودھ یا والیٔ لکھنؤ بتایا گیا ہے۔ شاہ کا لقب کہیں نہیں نظر آتا۔ لیکن اس بات سے اس بحث کو کوئی تقویت نہیں پہنچی کہ وہ اودھ کے آخری تاجدار نہ تھے۔ برجیس قدر کی شاہی کو اگر آپ آج کے فلسفۂ سیاست پر جانچئے تو معلوم ہوگا کہ ۵ جولائی ۱۸۵۷ء سے ۱۶ مارچ ۱۸۵۸ء تک کے مختصر سے دورِ حکومت میں متعدد احکام و فرمان جاری ہوئے اور ان کی تعمیل بھی ہوئی۔ نظامِ مملکت اسی طرح چلتا رہا جیسا کسی

---

[1] مثنوی حزنِ اختر، واجد علی شاہ

[2] مثنوی آئینِ اختر، منشی غلام حیدر صغیر

[3] اخبار قومی آواز (لکھنؤ) سیاست (کانپور) اتر پردیش حکومت کا رسالہ اتر پردیش یو۔این۔آئی، پی۔ٹی۔آئی کی خبریں، مضامین جو اگست ۱۹۸۲ء میں دہلی، کلکتہ، لکھنؤ وغیرہ کے مختلف اخباروں رسالوں میں شائع ہوئے۔

شخصی حکومت میں چلتا ہے۔ سکہ جاری ہوا اور سکۂ رائج الوقت قرار پایا اور سب سے بڑھ کر مطلق العنان حکمراں مثل بہادر شاہ، نانا راؤ، فیروز شاہ، جنرل بخت خاں روہیلہ اور حکومت نیپال وغیرہ نے اس شاہی رتبے کا اعتراف کیا۔ انگریزی دورِ حکومت کے متعدد مستند تذکروں میں ان کا نام بہ حیثیت آخری تاجدار کے درج ہے[1]۔ سیاست کے یہ وہی اصول ہیں جن پر آج کی حکومتوں کے عدم و وجود کا اقرار کیا جاتا ہے۔

سرکار برجیس کے شاہی مراسلات میں شاہ کا لقب نہ ملنے اور والیٔ لکھنؤ لکھنے میں جو مصلحت پوشیدہ تھی اس پر بہت کم حضرات نے غور کیا ہے۔ عوام نے برجیس قدر کو مسندِ شاہی پر اس لئے بٹھایا تھا کہ وہ ان کے نام سے اپنوں میں اتحاد باقی رکھیں اور ان کی سرپرستی میں منظم و متفق ہو کر انگریزوں کا مقابلہ کریں۔ عوام کا ہرگز یہ مقصد نہ تھا کہ یہ شاہی کا لقب اختیار کر کے شاہی کے مزے اٹھائیں اور عیش و عشرت میں غافل ہو جائیں۔ مرزا برجیس قدر کے ہم عصر مؤرخ میرزا مؤلف قیصر التواریخ اس شاہی کو مصنوعی و جبری بتاتے ہوئے بھی اس حقیقت سے انکار نہ کر سکے۔ تخت نشینی سے قبل مرزا برجیس قدر اور امرائے فوج سے جو قول و قرار ہوئے ان کی بابت یوں لکھتے ہیں:[2]

"کوئی کہتا تمہارا لڑکا بہت چھوٹا ہے، کوئی کہتا تھا تو بصورت
سے اس سے کیا کام ہوگا، کوئی آواز کرنے لگا کہ تم عیش و عشرت
میں ہو کر غافل نہ ہو جانا ہم تم کو سلطنت دیتے ہیں۔"

تخت نشینی کے بعد بھی عوام کی بار بار تاکید یہی تھی کہ ان کا نوجوان سال حکمراں گمراہ کن اراکینِ دولت کے ہاتھوں تباہ نہ ہو جائے۔ مؤرخ مذکور عوام کی عقیدت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:[3]

"بہت سے تلنگے جمع ہو کر ڈیوڑھی پر آتے تھے مرزا برجیس قدر
کو کھڑے ہو کر سلام کرتے تھے۔ کہتے تھے تم کنہیا ہو، غافل نہ ہو جانا
اپنے نمک والوں سے ڈرتے رہنا وگرنہ تم کو خراب کریں گے۔"

مطلب اس تمام قول و قرار کا یہ تھا کہ تم بادشاہ تو ضرور ہو لیکن وہ راہ اختیار نہ کرنا جس پر دیگر شاہانِ اودھ گامزن رہے۔ خلافِ شاہی جس کو برابر

---

[1] گنج شائگاں، دت دائے چودھری وموتیاد کی بین ایڈوانس ہسٹری آف انڈیا، حکومتِ ہند (لکھنؤ میوزیم) کے سکوں کی فہرست وغیرہ۔

[2]، [3] قیصر التواریخ ج ۲ ص ۲۲۵ و ۲۳۰

اودھ تک شاہی معاملات میں دخل رہا اس موقع پر بھی چین سے نہ بیٹھ سکیں۔

"بعض نے کہا واجد علی شاہ کے ہوتے ہوئے کسی کو بادشاہ بناؤ
گفتگو اب یہ ہے بعض کہیں کہ سلطان عالم کا بیٹا ان کے سامنے تخت پر بیٹھ
رہا ہے اور باپ کو تاج و تخت دلانے کا سامان کر رہا ہے"[1]

عوام کے مطالبات، بیگمات کی دلجوئی اور اودھ کی گذشتہ تاریخ یہ تمام چیزیں ان لوگوں کے پیش نظر تھیں جنھوں نے شہزادہ برجیس قدر کو مسند نشیں کیا تھا اور ضرورت تھی کہ شہزادہ برجیس قدر کے لئے ایسے لقب کا انتخاب کیا جائے جس سے ان تمام مقاصد کی تکمیل ہو سکے۔ اگرچہ لقب والی لکھنؤ یا ملک اودھ شاہ اودھ سے لفظی اعتبار سے مختلف ہے لیکن معنوی اعتبار سے کچھ زیادہ اختلاف نہیں ہے، والی کے معنی اگر حاکم مالک مختار کے ہیں تو سرپرستی، نیابت و قربت کے لئے بھی یہ لفظ عام طور پر مروج ہے۔ شہزادہ برجیس قدر اگر مملکت اودھ میں شاہ دلی کے نائب، عوام کے سرپرست اور وہاں کے حاکم تھے تو واجد علی شاہ کی نیابت کے بھی مدعی تھے اور بذاتِ خود ان کی ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ واجد علی شاہ پھر اودھ کے بادشاہ ہوں جب تک لکھنؤ میں رہے انگریزوں سے اپنی آبائی زمین کو بزور شمشیر واپس لینا ان کا اور ان کے متعلقین کی زندگی کا واحد مقصد تھا۔ لکھنؤ سے شکست کھا کر جب نیپال کا رخ کیا جب تو جانتے تھے کہ زور بازو سے کھوئی ہوئی سلطنت کو واپس لینا اب ممکن نہیں ہے۔ جلاوطنی کے دوران میں متعدد بار بادشاہ کی سلامتی اور اودھ واپس ملنے کی دعا کی ہے ؎

وہ دن خدا دکھائے کہ اخترؔ اودھ میں ہیں … زندہ و تو لیش و ساتھ برابر سلے ہوئے
برجیس روز و شب ہے خدا سے یہی دعا … دیکھوں جمال اخترِ عالی وقار کو
اس کا نہیں سوال کہ تو ملک و مال دے … حبِ نبی و آلِ نبی ذوالجلال دے
برجیس کی یہ آرزو ہے دل نکال دے … جام وصال اخترِ اوج و کمال دے
اختر سماسے تا بہ سمک حکمراں رہیں … برجیس روز و شب یہ دعا ماہ و سال دے
جشن یہ تا اسی و سی سال مبارک ہوئے … تخت و تاج و زور و اقبال مبارک ہوئے
روز و شب چین سے گذرے نہ ہو کچھ غم یارب … عیش و عشرت یہ مہ و سال مبارک ہوئے
ہم وطن جتنے ہیں خورسند ہوں و رشاد رہیں … سب رہیں چین سے خوش حال مبارک ہوئے
عرض کرتا ہے خدا سے یہ شہیدِ عاجز … یہ دعا میری بہرحال مبارک ہوئے

شہزادہ برجیس قدر المتخلص بہ شہید کے غیر مطبوعہ دیوان کے یہ چند اشعار اس خلوصِ نیت کے آئینہ دار ہیں جس نے انھیں انگریزوں سے نبرد آزما ہونے پر مجبور کیا اور معترضین کی اس تنگ نظری کا کہ شہزادہ برجیس قدر نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مظلوم باپ اور معزول بادشاہ واجد علی شاہ کی سلطنت پر قبضہ کرنا چاہا، بذاتِ خود ایک تشفی بخش جواب ہیں۔

میر محمد امین بانیٔ خاندانِ شاہی سے شہزادہ برجیس قدر آخری تاجدار اودھ تک ہر نسل میں فرمانروائے وقت علم دوست و شاعر نظر آتا ہے۔ جو بذاتِ خود ایک قابلِ ذکر بات ہے لیکن جب ہم شہزادہ برجیس قدر کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی صرف ابتدائی زندگی کے بارہ یا تیرہ سال لکھنؤ اور باقی ایام نیپال کے غیر ادبی ماحول میں بسر ہوئے تو یہ بات عجیب تر نظر آتی ہے کہ کیوں کر ان کے ذوقِ لطیف نے اس ماحول میں نشو و نما پائی کس نے اس گیسوئے سخن کو سنوارا اور کیوں کر انھوں نے ان خصوصیات کو برقرار رکھا جو لکھنؤ اسکول کا طرۂ امتیاز ہیں۔ عرصۂ دراز تک تذکرہ نگاروں کے پیش نظر ان کی ایک ہی غزل تھی جس کو مولوی نجم الغنی نے اپنی تاریخ اودھ جلد پنجم میں درج کیا تھا اور جس کا مطلع ہے ؎

فرقت نصیب رہتا ہوں جس نازنیں سے دور … یارب نہ کیجیو مجھے اس مہ جبیں سے دور

راقم السطور نے اترپردیش پبلی کیشنز بیورو کے رسالہ نیا دور جنگ آزادی نمبر (اگست ۱۹۵۷ء) میں ان کا ایک منظوم خط واجد علی شاہ کے ایک منظوم خط مطبوعہ آج کل (ستمبر ۱۹۵۶ء) سے موازنہ کرتے ہوئے شائع کیا تھا جس کو اکثر شائقین نے پسند اور اخبارات نے نقل کیا۔ شہزادہ برجیس قدر کے قلمی دیوان کا بیشتر حصہ جو تقریباً سات آٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے آج بھی شائقین و نقادانِ فن کی نگاہ سے محفوظ ہے۔ دیوان کے کرم خوردہ کاغذوں اور مسودات کے دیکھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شہزادہ برجیس قدر نے ان اشعار کو دیوان کی صورت میں خود ترتیب دینا شروع کیا تھا لیکن بدنصیبی نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا، دیوان کے یہ نامکمل اوراق آج بھی اس ۱۵۔ اگست ۱۸۹۳ء کی یاد دلا رہے ہیں۔ جب انگریزوں کے کرم فرما "کسی عزیز"[2] نے ان کے غدار وہ پرانے سیاسی مجرم اور اس کے بچوں کو زہر دے کر موت کی ابدی نیند سلا دیا اور بقول مولوی عبدالحلیم شررؔ "دنیا ان لوگوں سے خالی ہو گئی جنھوں نے کبھی تخت و تاج کی صورت دیکھی تھی۔"[2]

---

[1] سرفراز بیگم کا خط بنام جان جان بیگم، بیگمات اودھ کے خطوط ص ۴۳

[2] گذشتہ لکھنؤ

کشور زیدی

وہ ایک لمحۂ جاوداں

آج اتوار تھا اس لئے پدما کو زیادہ کام کرنے تھے۔ اضافہ صرف کیم چند کی فرمائشوں کا تھا۔ مثلاً ذرا سر میں تیل لگا دو، ذرا پیر دبا دو، میری جرابیں دھو دو۔ وغیرہ وغیرہ۔

گیلی دھوتی نچوڑ کر اس نے منڈیر پر پھیلا دی۔ دُھلنے سے اس کی خوبصورتی اور نفاست نکھر آئی تھی۔ پدما نے ایک نظر تحسین اس پر ڈالی پھر بچوں کے فراکوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ دونوں بچیوں کی فراکیں گو کہ معمولی سوتی کپڑے کی تھیں لیکن سلیقے اور صفائی سے دُھلی اور سلی تھیں۔ انھیں جھٹک جھٹک کر پھیلاتے وقت وہ مسکرا دی۔ بچیاں میلی ہو رہی تھیں، نہا دھو کر دُھلی فراکیں پہن کر وہ کتنی اچھی لگیں گی۔ یہی خیال اس کے ہونٹوں پر بھولا بھٹکا تبسم لے آیا۔

آج کل وہ بہت پریشان تھی۔ اس کی مشینی زندگی میں پھر دل و جذبات کی دھڑکنیں گھسنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُمنگیں اور خواہشیں پھر سے اٹھ رہی تھیں اور پھر وہ آج کل خوابوں کا شکار ہو گئی تھی۔ حادثے میں والدین کے اچانک ختم ہو جانے سے اُس کا بوجھ بھیا پر آ گرا اور جلد سے جلد وہ کسی صورت بیاہ دی گئی۔ والدین کی موت نے یوں ہی اس کے اعصاب پر ایک جمود کی کیفیت قائم کر دی تھی پھر یہ شادی تو گویا اسے اپنی دُنیا سے باہر نکال لے گئی۔ کیم چند مستری تھا مشین کے پُرزے گھستے گھساتے وہ بھی بس انسانی مشین بن گیا جس کے یہاں ہر چیز ضرورت کے تحت تھی۔ پدما کے نرم و نازک تخیل کے پردے کیم چند کے مشینی چکر میں پس کر بالکل ہی شکستہ و پژمردہ ہو گئے۔ یکے بعد دیگرے دو لڑکیاں ہو گئیں۔ لیکن پدما کے دل کے دروازے ہمیشہ بند ہی رہے اس کے جذبات کے تار کبھی مرتعش نہ ہوئے۔ بس کبھی کبھی اس پر دورے سے پڑتے اور ان دوروں میں اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ پھر سے زندہ ہو رہی ہے یا کسی بھیانک خواب سے چونکی ہے۔ وہ پھر وہی دل کش شیریں خواب دیکھتی۔ آرزوؤں کے جال بچھاتے زندگی میں حسن و لازوال محبت کے نقوش بنتے۔ کلیاں حیا سے مسکراتیں اور شفق کے گال لال ہو جاتے۔ اس کی دل پسند کامنی کی خوشبو اس کے گرد رقص کرتی اور پدما کے ذہن کے اُفق پر دہی دو اُداس پُر شوق آنکھیں تارا بن کر جھلنے لگتیں۔ ان میں فریاد تھی، حسرت تھی، اُمنگیں اور مستقبل کے پُر اُمید دنوں کے ساتھ تھے اور وہ لازوال محبت کا سحر تھا جو عورت کے لئے دُنیا کا سب سے بیش بہا خزانہ، دُنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ ماضی دبے پاؤں آتا اور حال کی آنکھیں بند کر لیتا۔ ماضی کے ورق جذبات کی آندھیوں میں ادھر اُدھر اُڑتے پھرتے کبھی یہ ورق سامنے آتا اور کبھی وہ۔

کالج جاتے وقت روز وہ لڑکا اسے دیا ناتھ کی دوکان کے سامنے کھڑا ملتا بغل میں دو ایک کتابیں فائلیں دبی، کوٹ کے کالر میں سپید گلاب کی ننھی سی کلی۔ بلند قد اور صحت مند جسم کے ساتھ وہ اُن دل کش آنکھوں کا بھی مالک تھا جنھوں نے پدما پر سحر سا کر دیا۔ پدما کی نظریں ایک سکنڈ کے لئے اس پر ٹھہرتی، لڑکے کے ہونٹوں پر وہ بیٹھی، کچھ شرمیلی سی، کچھ مرعوب سی اور بے حد پیاری سی مسکراہٹ دوڑتی جو بڑی عظیم دوستی کی پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اس تبسم میں انتظار کا کرب تھا، ملنے کی مسرت تھی، محبت بھرا استقبال تھا اور ہمیشہ کے لئے اپنانے کی آرزو آنکھوں میں چمک بن جاتی تھی۔ لیکن پدما حسب معمول نظریں نیچی گردن اُونچی کئے پُر وقار چال چلتی آگے بڑھ جاتی۔ مگر اسے احساس ہوتا کہ وہ پُر شوق اُداس آنکھیں اب بھی اس پر جمی ہیں لیکن اس نے کبھی مڑنا پسند نہیں کیا حالاں کہ اس کے دل

ہیں یہ شدید خواہش تھی کہ وہ ایک بار مڑ کر اس پیاری میٹھی شرمیلی مسکراہٹ کو دیکھے جو اُن آنکھوں سے اس کا تعاقب کر رہی تھی۔

اُنھی سکوں سے اس کا تعارف ہو گیا لیکن پدما کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ حالانکہ پدما اپنے تخیل میں اسے ہر صورت سے دیکھ چکی تھی۔ دولھا بنا ہوا۔ اس کا گھونگھٹ اٹھاتا ہوا، اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا۔ ساتھ ساتھ چلتا ہوا اس کو سہارا دیتا ہوا۔ اس کی یاد میں اُس کے آنسو پیار سے پونچھتا ہوا۔ ہر تصویر جس کے تخیل میں مکمل تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ پدما کی شادی بہت پہلے ہو چکی تھی۔ اُس نے اپنا ہر جذبہ اس کے سپرد کر دیا تھا۔ زندگی کی راہ میں ایک تبسم دیے کر اس لڑکے نے پدما کی ساری زندگی ہی اپنا لی۔ لیکن جب نگاہیں ملتیں تو حسبِ معمول اس کی گردن اونچی ہو جاتی۔ لبوں کے گوشے خفیف سا لرزتے اور ایک خفیف سی لہر تبسم کے پھول چُن کر اپنی جھولی بھر لیتی اور مطمئن، مسرور، مگن، سرشار گھر چلی جاتی۔

لڑکے کے احساسِ محبت نے پدما کے شباب پاکیزگی میں غرور بھر کر اسے بہت بڑھا دیا۔ اس کی چال اور زیادہ پُر وقار ہو گئی۔ رخساروں پر گلاب کے سائے گہرے ہوتے گئے اور سوئی سوئی کالی آنکھوں میں حسن اور برکت کی پُراسرار زندگی بس گئی۔ اور ایک دن اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ آج وہ ضرور اس کے جواب میں مسکرا دے گی اور اس کے کسی زبانی اظہار پیار سے وہ بھی اپنی آنکھوں سے بتا دے گی کہ وہ اسے اپنی ساری زندگی کے تبسم سونپ چکی ہے۔

لیکن جب وہ دیا ناتھ کی دوکان کے سامنے پہنچی تو وہ لڑکا نہیں تھا۔ وہ بے ارادی طور پر جا کر اس کی جگہ پر کھڑی ہو گئی۔ بازار کی چہل پہل، رونق ویسی ہی تھی۔ لڑکے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں اسکول جا رہے تھے۔

لیکن پدما کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ سیرا بازار مرگھٹ معلوم ہو رہا تھا۔ اور بچوں کے ہنسی سے رسیلے قہقہے بیمار لوگوں کی آواز کی طرح اس کی سماعت پر ضرب لگا رہے تھے۔ اس نے اپنی سب اختیار سسکیاں اور کراہیں ضبط کر لیں اور آنسو پی کر جب پہنچی تو اُسے ایسا لگا کہ جیسے اس نے صدیوں کے حاصل شدہ خزانے کو کھو دیا ہے۔ زندگی اور تخیل میں ایک ناقابلِ بیان کرب ناک خلا ہو گیا ہے۔ پھر اسی ہفتے اس کے والدین اچانک چھت گر جانے سے دب کر مر گئے۔

اور بے چاری تخیلی نرم و نازک لڑکی کے پاس سوائے جمود یا خوابی دنیا کے کچھ نہ رہا۔ شادی نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ کھیم چند کے ساتھ وہ کل مشین بن گئی۔ کھانا پکاتی، کپڑے دھوتی، جھاڑو لگاتی اور بچے پالتی۔ اور کھیم چند کی ہر ضرورت کو پورا کرتی۔ مگر وہ ایک نظر، وہ ایک تبسم اُس کے حصے میں کبھی نہ آیا جس کی وہ منتظر تھی۔ اگر کھیم چند اسے اپنے پیار سے سنبھال لیتا تو شاید اس کی زندگی میں اتنی مردنی، اتنی تشنگی اور جمود نہ ہوتا۔ مگر کھیم چند نہ اُسے جذبات سمجھ سکا نہ درد غم کے کھلونوں سے بہلا سکا۔ ستر روپے کے منتری کی بساط ہی کیا۔ ایک تنگ کوٹھری کا مکان اور ایک رسوئی گھر۔ صحن ایسا کہ ہوا کے تازہ جھونکے آتے ڈرتے، مبادا ایسا نہ ہو کہ اس پنجرے میں اسیر ہو جائیں۔ رسوئی کا دھواں ہر وقت ہوا کی تازگی، طراوت اور لطافت کو شکست دینے پر تُلا رہتا۔ راتوں کے اندھیرے میں جب کھیم چند کا ہاتھ وہ اپنی طرف بڑھتا ہوا محسوس کرتی تو ناقابلِ بیان کراہت سے اُس کا رونگٹا رونگٹا لرز اٹھتا لیکن پتی ورتا دھرم کے مطابق وہ اپنے لبوں کو سختی سے بھینچ کر اپنی چیخ کو روک لیتی جو اُس کے گلے میں پھندا سا بن جاتی کسی محبوب تصور کو وہ اپنی ہر طاقت سے شکست دینے کی کوشش کرتی۔ لیکن جب کھیم چند مطمئن ہو کر سو جاتا تو اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلنے لگتے۔ وہ اُن سے ڈرتی اس کے گلے سے سوکھی ہچکیاں نکلتیں، ضمیر کا لعنتی سلسلہ اُسے محاذ قائم کرتا۔ کسی کی بیوی ہو کر غیر کا تصور، وہ ایک گھٹی چیخ کے ساتھ پٹی پر سر پٹخ دیتی۔ اور اس کے خواب جیت جاتے۔ وہ ایک چھوٹا سا پیارا گھر، وہ اُس کا باغیچہ، گلاب کی مہک، نازک سی کلی جیسے مسکراتی ہوتی جو لوٹ کے کالر سے نکل کر اس کے جوڑے میں آلگتی۔ ہوا گلاب اور کیتکی کی خوشبو سے بوجھل، صاف ستھرے چبوترے پر وہ ستار لیے بیٹھی ہے۔ سپید آنچل سر سے سرک رہا ہے۔ کالی کالی گیلی زلفیں پشت پر بکھر رہی ہیں۔ اُس نے جوگیا چھیڑ رکھا ہے۔ ہائے وہ دل میں اُتر جانے والی لے۔ اور وہ اُداس پُرشوق آنکھیں اس پر پیار برسا رہی ہیں۔ اُنگلیاں اُس کے بالوں میں شانہ کر رہی ہیں پیار کا نشہ، کیا زہر کے نشے سے زیادہ قاتل نہیں ہوتا؟

وہ تصویر بنا رہی ہے۔ کینوس پر نقوش اُبھر رہے ہیں۔ عورت کے پیار کا ہر رُخ ایک چہرے میں جمع کر رہی ہے۔ لیکن۔ لیکن یہ کیا۔ یہ تو عورت کا چہرہ غائب ہوتا جا رہا ہے۔ وہی اداس آنکھیں، پُر نور آنکھیں۔ جیسے اُس کے دل پہ عکس آ رہا ہے اُن آنکھوں کا۔ یہ آنکھیں اس سے کیا کچھ کہہ رہی ہیں۔ یہ مدھم دیئے کی لو کی طرح جھلملاتی مسکراہٹ کیا کہہ رہی ہے اس سے۔ کائنات کا حسن ہو تم زندگی کا سنگار ہو تم، زندگی کا نشہ ہو تم، زندگی کی لذت، زندگی کا فریب اور زندگی کا تبسم ہو تم۔

اچانک کھیم چند کے بھیانک خراٹے سے اس کی آنکھ کھل جاتی۔ اور دیر تک وہ اپنے دھڑکتے دل کو سنبھالتی رہتی دل اور ضمیر کی جنگ میں دل کو پسپا

کرتی اور کسی بچّی کو سینے سے لگا لیتی اور ذرا دیر کے لئے اُس کے اعصاب کا تناؤ کم ہو جاتا، برف کچھ پگھلنے لگتی اور درد موتی بچّی کے بالوں میں کھو جاتے۔ باوجودیکہ تقریباً میڑ سے ہل کا کام لیا جا رہا تھا پھر بھی اس کے حُسن کی تازگی اور شگفتگی برقرار تھی۔ برتن مانجھنے اور کپڑے دھونے سے اس کے ہاتھوں کی نرمی میں ضرور فرق آ گیا تھا لیکن چہرے کی بے داغ ملاحت و صباحت، رخساروں کا ریشمی گداز اب تک قائم تھا۔ چہرے پر جذباتی تشنگی اور اُس کے ضبط و ایثار نے ایک تقدّس آمیز معصومیت پیدا کر دی تھی جس میں بڑی کشش تھی، آنکھوں میں بلا کی مظلومیت تھی جیسی اسیر پرندے کی آنکھوں میں ہوتی ہے جو حسرت سے چمن اور نشیمن کی طرف دیکھتا ہے اور سر جھکا لیتا ہے۔ بچّیوں کے پیار میں بھی اسے وہ تسکین نہ مل سکی جسے اُس کی روح صدیوں سے تلاش کر رہی تھی۔ وہ اندھا دھند اپنے کو کام میں لگا دیتی اور تھکن سے چور چور جب وہ نہا دھو کر کرشن جی کی تصویر کے سامنے اپنی نکھری ہوئی معصومیت اور پھڑپھڑاتی روح کو جھکاتی تو کرشن کی آنکھوں میں بھی وہی اداس آنکھیں نظر آتیں جو راہ رہا کو ابدی محبّت سے سرشار نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ گھبرا جاتی، بھگتی میں بھی سکون نہ ملتا۔ اور دُنیا کی سب سے بڑی ہمدرد اور دوست نیند اس کی پلکوں پر اپنا محبت بھرا ہاتھ رکھ دیتی۔ کیا اس سے محبت کرنے والا کوئی نہیں۔ کیا وہ اداس آنکھیں بھی ایک دھوکا تھیں۔ کیا اسے اس کے پیار کا جواب نہیں ملے گا۔

اسے احساس تھا کہ وہ شادی شدہ ہے۔ دو بچّوں کی ماں ہے۔ اور اب کسی کا تصوّر بھی اس کے لئے گناہ ہے۔ لیکن جتنا وہ اپنے کو مصروف کرتی گئی، بہلاوے دیتی گئی اتنا ہی غیر شعوری طور پر محبت کی محرومی اس کے اعصاب میں ایک تشنج اور مردنی پیدا کرتی گئی، تشنگی میں اضافہ کرتی گئی۔ وہ بھگوان سے صرف ایک لمحہ مانگتی تھی۔ بس ایک لمحہ زندگی کے حُسن و محبّت سے سرشار صرف ایک لمحہ۔ اے کائنات کے مالک تیرے عظیم منبع حسن میں کچھ کمی نہ ہو جائے گی۔

لیکن اس کی پیاسی آرزوئیں روح پیاسی ہی رہی اور ایک دن دنوں نسیم اپنے ایک رشتے کے بھائی کو اپنے یہاں ٹھہرانے کے لئے لایا، جس کی تبدیلی حال میں ہی یہاں ہوئی تھی۔

فرطِ جذبات و حیرت سے وہ دونوں ایک لمحے کے لئے مبہوت کھڑے رہ گئے یہ وہی اداس آنکھوں والا لڑکا تھا۔ اور اُس کی آنکھوں میں وہی پیار اور انتظار کی شمع جل رہی تھی۔ کھیم چند کے تعارف کرانے پر وہ نمستے کر کے رسوئی میں چلی گئی اور وہ چٹائی پر گر پڑا۔

سب کے لئے دُنیا وہی تھی لیکن پدما کے لئے مسلسل شورش و اضطراب بن گئی تھی، کیونکہ منیش کی آنکھوں میں اب بھی وہی سوز تھا۔ وہی شوق تھا۔ وہی حسرت اور وہی ناقابلِ بیان مسحور کر دینے والی مظلوم پیاری مسکراہٹ تھی۔

اس سے اور منیش سے رسمی باتوں کے علاوہ کوئی بات نہ ہوتی لیکن نگاہیں مقابل میں دل کا راز محل محل کر بتا دیتی تھیں۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا۔ لیکن جب وہ آنکھیں اٹھاتی اور منیش کی پُرسحر آنکھیں ملتیں تو اُس کے وجود کا ذرّہ ذرّہ مسکرا اُٹھتا۔ ایک انبساطی نشہ آلود لہر اس کے اوپر غلبہ کرتی محبت کی کرنیں اس کے اندھیرے ٹھنڈے دل میں لالہ زار کر دیتیں کہ دوسرے لمحہ ضمیر اس کی آنکھیں زبردستی نیچی کر دیتا۔ بڑی سخت کشمکش تھی اور پدما کا دل دو حریفوں کی چوٹیں سہہ رہا تھا۔

کھانا کھا کر کھیم چند نے نُو گھومنے کا پروگرام بنایا۔ بچّیوں کے فراک سُو کھ گئے تھے۔ انھیں بنا سجا کر پدما نے اپنی پسندیدہ سپید نیلے کنارے والی ساڑی باندھی اور پیشانی پر آئے ہوئے بالوں کے لچھے یوں ہی رہنے دیئے۔

نُو پہنچ کر وہ سب ایک کنارے گھاس پر بیٹھ گئے۔ نُو کی تازی ہوا نے پدما کے زرد رخساروں میں ایک ہلکی سی سُرخی کی جھلک پیدا کر دی۔ کھیم چند کو اس کے کارخانے کا ایک ساتھی اپنے ساتھ کسی کام کو لے گیا۔ شام کا دھندلکا بادلوں کے کہر کی طرح گہرا ہوتا گیا۔ پدما اور منیش دونوں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ بچیاں سامنے والے پارک میں کھیل رہی تھیں۔ جھول رہی تھیں ان کے معصوم قہقہے بھی پدما کو چونکانے میں ناکام رہے تھے۔ کہ اچانک اس نے ایک نرم ہاتھ اپنے شانے پر محسوس کیا جس کی نرمی و گرمی اسے اپنے دل میں اُترتی محسوس ہوئی۔ یہ منیش تھا۔

پدما۔ پدما۔ وہ بے اختیار اس پر جھک گیا۔ بتاؤ قسمت نے ہمیں پھر کیوں اکٹھا کر دیا۔ پدما میں نے تمھاری آنکھوں میں اپنا جواب پا لیا ہے۔ میں نے تم کو چاہا نہیں پوجا ہے تم میری زندگی کی ایک ایک سانس میں بسی ہو۔ تم میری جنم جنم کی ساتھی ہو تمھاری یہ گھنی پلکوں کے سائے، یہ لرزتے ہوئے خوبصورت لب یہ کالے بالوں کی بھینی خوشبو یہ سب تو میرا ہے ہمیشہ سے میرا ہے۔ تم تو ہمیشہ سے میرے پاس تھیں۔ یہ تم یکایک کہاں چلی گئیں۔ میں نے تمھارا سب پتہ لگایا اور اپنے باپو جی کے پاس گیا تاکہ تمھارا پیام بھجواؤں لیکن وہ واپس آیا۔ پدما یہ کیا ہوا

میری روح تم نے یہ ظلم کیوں کیا پدما۔

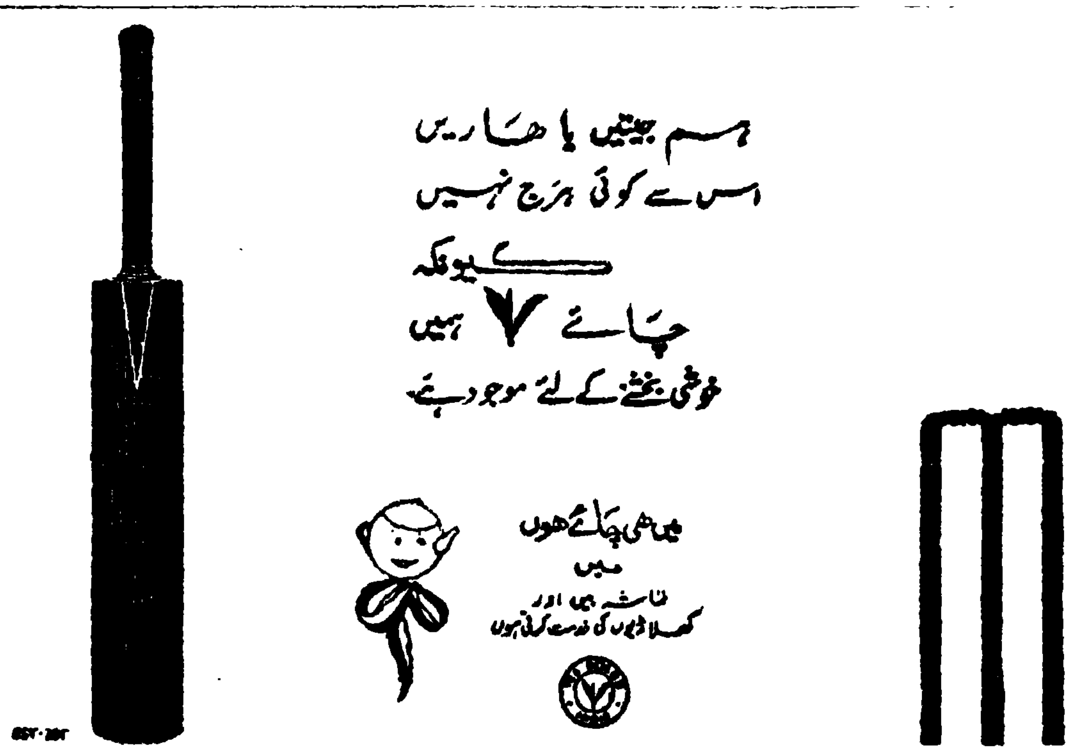
پدما کی آنکھیں بند تھیں۔ رخسار آنسوؤں سے تر تھے لیکن دل میں ایک جلترنگ سا بج رہا تھا۔ ٹپ ٹپ سیال مسرت کی بوندیں، ابدی مسرت کی شراب اس کے دل پر گر رہی تھی۔ یہی تو وہ نغمہ تھا، یہی تو وہ آواز تھی، یہی تو وہ منزل تھی جس کی وہ صدیوں سے جویا تھی۔

پدما اب کیا ہوگا۔ میں گنہگار ہوں اپنے بھائی سے دغا کر رہا ہوں۔ میں بہت جلد یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تمھیں تمھاری یہ گرہستی، تمھاری یہ ننھی کلیاں مبارک ہوں۔ بس ایک نظر ادھر دیکھو کہ ہماری روحیں ہمیشہ کے لئے مل کر بچھڑ جائیں۔ بس اسی ایک نظر کی اُمید نے اب تک زندہ رکھا تھا۔ دیکھو پدما میری طرف دیکھو کہ میں اس نزاکت کو اپنے دل میں چھپا لوں۔

پدما نے مشکل آنکھیں کھولیں۔ شام کے اندھیرے میں اسے منیش کی آنکھیں نظر آئیں جن میں عمر بھر ایک ہی لو جلتی رہی تھی۔ زندگی کی ساری مردہ حسرتیں سسکتی آرزوئیں اسی نظر میں تھیں جو بے بسی اور پیار کی قاتل ایک تھی وہ ایک تیز دھار کی طرح اس کے دل میں اترتی چلی گئی۔ زندگی کے حسن و مسرت و بہجت کا اذیت کا لاثانی پیار کا بے بسی اور حسرت کا ایک نادر تمثیلی لمحہ بھگوان نے اسے عطا کر دیا۔

وہ مسکرا دی۔ اس کو اس کی محبت مل گئی۔ وہ پیاس جس سے روئیں روئیں میں کانٹے سے پڑ گئے تھے۔ بجھ گئی۔ اس کی روح سیراب ہو گئی۔ وہ دل ہی دل میں چیخ اٹھی۔ بھگوان تیرا شکر تو نے میری تپسیا رائگاں نہ جانے دی اُس کے ہاں بھی وہی آگ لگی ہے جس نے میرے تن بدن کو جلا رکھا تھا۔ اب زندگی سوارتھ ہو گئی۔ اس جنم کی بہاروں کی اُمیدیں یہ کانٹوں والا جنم بھی پھولوں کی سیج بن جائے گا۔ منیش کا یہ اقرار اسی کی بشارت ہے۔

اور دوسرے دن جب وہ چلا گیا تو پدما کو کوئی خاص تکلیف محسوس نہ ہوئی۔ موجودہ پتی ونتا مستقبل کی پریم ونتا کی عارضی ٹریننگ اور تربیت کا عہد بن گیا۔



محمد شفیع الرحمٰن

ہندوستان کا سمندری راستہ

قرونِ وسطیٰ میں تمام یورپ میں ہندوستان کی دولت اور یہاں کی صنعتوں کی بہت شہرت تھی۔ یورپ اپنی قیمتی صنعتوں اور مشرق کے سامانوں سے پوری طرح واقف تھا۔ خشکی کے راستوں سے جو سامان اور مال کبھی ہندوستان سے یورپ کے ملکوں میں پہنچتا تھا اُس کو دیکھ کر وہاں کے بادشاہ، امراء اور تاجر حیران ہوتے تھے۔ یورپ کے تاجروں اور بادشاہوں کو اس کی کوشش اور جستجو تھی کہ ہندوستان کا بحری راستہ دریافت ہو کہ وہاں کی مصنوعات اور مال آسانی سے یورپ لائے جائیں اور یورپ کے ملکوں میں کثیر منافع سے فروخت ہوں۔ خشکی کا راستہ بھی نہ تھا اور دوسرے ملکوں کے راستے سے ہندوستان کا مال یورپ پہنچانا نہایت سخت دشوار تھا۔

بہت قدیم زمانے سے ہندوستان میں مغربی ایشیا کے ملکوں سے آمدورفت، تعلقات، رسل و رسائل اور تجارت کا سلسلہ موجود تھا۔ اور مغربی ایشیا کے ممالک کے لوگ ہندوستان کے خشکی اور بحری دونوں راستوں سے واقف تھے۔ یورپ کے لوگوں کی مشرق اور ہندوستان کے متعلق معلومات بہت محدود تھیں۔ یورپ میں خشکی کے راستوں اور سمندر کے راستوں کی کوئی معلومات نہ تھیں۔ وہاں کے لوگ ایشیا اور افریقہ کے ملکوں سے واقف نہ تھے۔ جو کچھ اُن ملکوں کی نسبت سنا تھا اُس کی وجہ سے اُن ملکوں کا اشتیاق، اُن ملکوں کی دولت، تہذیب، فنون، مصنوعات اور پیداوار سے فائدے حاصل کرنے کا زیادہ شوق تھا۔ اس لئے ان کے دلوں میں مشرقی ممالک اور خصوصاً ہندوستان اور چین کے سمندری راستوں کی تلاش کی خواہش اور جستجو پیدا ہو گئی۔ لیکن یورپ میں رواج یا ضرورت قریبی سمندر والی تک جہازرانی کی تھی، اور یورپ کے جہازرانوں کی واقفیت ساحلی کشتی رانی اور یورپ کے گرد کے سمندروں کے راستوں تک محدود تھی۔

اسپین میں مسلمانوں کے مقابلے میں کیسٹائل اور آریگان کی حکومتوں کا اتحاد ہو گیا۔ فرڈیننڈ نے ازبیلا سے شادی کر لی۔ (۱۴۶۹ء) متحدہ قوت سے مسلمان سلطنت کو، جو ۸۰۰ برس کے قریب اُس ملک پر سلطنت کرنے کے بعد کمزور ہو گئی تھی، ۱۴۹۲ء میں شکست دے کر غرناطہ کو فتح کر لیا۔ اُس ہی سال کرسٹوفر کولمبس نے ملکہ ازبیلا سے درخواست کی کہ وہ ہندوستان کے بحری راستہ کی دریافت کے لئے مہم پر جانا چاہتا ہے ملکہ اُس کی سرپرستی، کفالت اور امداد کرے۔ بادشاہ جان اور شہزادہ ہنری نے بھی کولمبس کی امداد کی اور کولمبس بڑی دشوار گذار اور محنت مہم کے لئے روانہ ہوا۔ کولمبس کی کوشش یہ تھی کہ افریقہ کے گرد راس امید کے راستے سے ہندوستان پہنچ جائے۔ یہ مہم روانہ ہوئی۔ شدید اور طویل دشواریوں اور صعوبتوں کا سامنا کیا لیکن ہندوستان کا راستہ نہیں ملا۔ یہ خوش قسمتی تھی کہ اس گمراہی کا ہی عجیب غیر متوقع نتیجہ نکل آیا کہ کولمبس ایک غیر معلوم سرزمین میں پہنچ گیا اور وہ ایک نئی دُنیا تھی لیکن اصل مقصد یعنی ہندوستان کا بحری راستہ حاصل نہ ہوا۔

پرتگال کے بادشاہ کو ہندوستان کے بحری راستے کی دریافت کی بڑی فکر تھی اُس نے ۱۳ جہازوں کا ایک بیڑا پیڈرو آل ویرز کابرال کی سرکردگی میں ہندوستان کے بحری راستہ کی تلاش میں بھیجا۔ وہ بھی راستہ بھٹک کر دوسرے سمندر میں پہنچ گیا۔ اس کی گمراہی بھی خوش نصیبی کا باعث ہوئی۔ وہ ہندوستان کے بجائے ایک غیر معلوم ملک اور نئی دنیا میں پہنچ گیا۔ وہ بھٹک کر برازیل پہنچا لیکن بالآخر برازیل سے وہ ہندوستان کے مغربی ساحل پر کالی کٹ پہنچ گیا۔ کالی کٹ

میں کابرال نے ایک تجارتی کوٹھی اور فیکٹری قائم کی۔ پرتگیزوں نے ہندوستان کے باشندوں کے اوپر ایسے سخت وحشیانہ مظالم کئے کہ ہندوستانی نہایت برافروختہ ہوگئے اور کابرال کے مقرر کردہ سب آدمیوں کو قتل کردیا۔

ہندوستان کا راستہ پرتگیزوں کو معلوم نہ ہوا اور پرتگال کے بادشاہ نے علاوہ ہندوستان کے بحری راستے کی تلاش کے، کالی کٹ کی فیکٹری کے شدید واقعہ کے بدلہ لینے کا ارادہ کیا۔ اس مہم کے لئے بادشاہ نے پرتگال کے سفر آزمودہ اور ماہر جہازرانی واسکوڈی گاما کو منتخب کیا۔ دس جہازوں کے بیڑہ پر واسکوڈی گاما کو امیرالبحر (ایڈمرل) بناکر ۹۔ جولائی ۱۴۹۷ء کو ٹیگس دریا کے راستہ سے یہ مہم روانہ کی۔ واسکوڈی گاما لزبن سے روانہ ہوکر افریقہ کے مغربی ساحل کا سفر کرکے راس امید کے راستہ سے جنوبی افریقہ میں خلیج سینٹ ہیلینا پہنچا اور دوسرے سال کے شروع میں افریقہ کے مشرقی ساحل پر مالیندی پہنچ گیا۔ یہ مقام خلیج فارموسا میں موجودہ زمانہ کے کینیا کے ملک میں ہے۔

پرتگال سے افریقہ کے دو طرف کا راستہ بھی سخت دشوار گذار اور ایسا تھا کہ اس امیرالبحر نے نہیں دیکھا تھا۔ اس راستے کی دریافت ہی کرنی تھی یہ ایک شدید تجربہ تھا۔ قطب الدین النہروالی نے اپنی کتاب "البرق الیمانی فی فتح العثمانی" میں لکھا ہے کہ یورپ والوں کی چند مہمیں ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کرنے کی کوشش میں افریقہ کے مشرقی ساحل تک پہنچیں لیکن وہاں سے بحر ہند کو عبور کرنے اور ہندوستان پہنچنے میں ناکام رہیں۔ یہی صورت واسکوڈی گاما کو مالیندی پہنچ جانے کے بعد درپیش تھی۔

واسکوڈی گاما کی سفر کی دشواریوں، اُس مہم کے ارکان کی محنت، جفاکشی اور تجربات کا حال۔ کیولانا اور کیپٹیلوڈی پیوا اور بیراس اور ڈیمی آڈ ڈی گوز نے
(Rolciro de viagen de Vosco de
Gama by A. Herculano)
(Da Asia By Barros)
اپنی کتابوں میں لکھا ہے۔ افریقہ کے مشرقی ساحل تک کے سفر کی کچھ معلومات یورپ والوں کو فراہم ہوچکی تھیں یہ سفر نسبتاً اس وجہ سے آسان بھی تھا کہ افریقہ کے ساحلی لوگوں کی امداد رہنمائی کے لئے ملتی جاتی تھی۔ لیکن بحر ہند کا سفر یورپ والوں کے واسطے اب تک لاینحل مرحلہ تھا۔ اور اس سمندر کی قطعی ناواقفیت کی وجہ سے سخت دشوار گذار تھا۔ بیراس نے واسکوڈی گاما کے مشرقی افریقہ تک کے سفر کی تفصیل کے علاوہ لکھا ہے کہ مالیندی پہنچ کر واسکوڈی گاما کو آگے راستہ تلاش کرنے میں حیرانی اور دشواری تھی۔ مالیندی میں پرتگیزوں کی ملاقات ہندوستانی تاجروں سے ہوئی۔ یہ تاجر ایک دیوی کی پرستش کرتے تھے جس کا بُت حضرت مریم کے بُت کے بالکل مشابہ تھا۔ پرتگیزوں نے بُت کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ یہ لوگ بھی عیسائی ہیں اور اُن لوگوں کی اولاد میں ہوں گے جو ہندوستان میں سینٹ ٹامس کے زمانہ میں عیسائی ہوئے ہوں گے۔

ان ہندوستانی تاجروں کے ساتھ واسکوڈی گاما کی ملاقات ایک عرب معلم سے بھی ہوئی۔ یہ شخص عرب جہازران، بحری راستوں کا مستند ماہر، نجوم اور ہیئت کا عالم شہاب الدین احمد بن مجید تھا۔ واسکوڈی گاما عرب معلم کی بحری واقفیت جہازرانی کے علم اور ان سمندروں کی وسیع معلومات سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ شہاب الدین احمد بحر عرب، بحر ہند اور دوسرے سمندروں کے راستوں اور بحری فرودیات کے تمام علوم سے اچھی طرح واقف اور ان کا ماہر تھا۔ واسکوڈی گاما نے کوشش کی کہ شہاب الدین احمد اُس کی مہم کی راہ نمائی میں امداد کردے اور وہ اس ذریعہ سے ہندوستان پہنچنے میں کامیاب ہوجائے۔ واسکوڈی گاما نے مالیندی کے بادشاہ کی سفارش حاصل کی اور بادشاہ کے اثر سے شہاب الدین احمد واسکوڈی گاما کی راہ نمائی اور امداد پر آمادہ ہوگیا۔

شہاب الدین احمد کے پاس ہندوستان کے تمام ساحل کے نقشے موجود تھے۔ جن میں طول البلد اور عرض البلد کے خطوط درج تھے۔ اور نہایت تفصیل سے ہواؤں کے رُخ اور سمتیں بہت صحیح درج تھیں۔ واسکوڈی گاما نے شہاب الدین احمد کو اپنی لکڑی کی بہت بڑی اور بھدّی اصطرلاب دکھائی تو شہاب الدین احمد نے اُس کو دیکھ کر تعجب کیا اور بتایا کہ عربوں کے پاس پیتل کی اصطرلاب اور ربع دائرہ موجود ہے۔ اور یہ بتایا کہ عرب جہازران اور کمبے (ہندوستان) کے جہازران ستاروں کو دیکھ کر سمندر کا راستہ طے کرتے ہیں۔ اور ایسے آلات سے کام نہیں چل سکتا جیسے واسکوڈی گاما کے پاس تھے۔ شہاب الدین احمد کے آلات کی تفصیل ری ناڈ نے اپنی کتاب میں لکھی ہے۔

واسکوڈی گاما کو شہاب الدین احمد بن مجید کی راہ نمائی کی اُمید سے گویا ایک غیر مترقبہ نعمت اور بے قیاس خزانہ مل گیا۔ شہاب الدین احمد کی راہ نمائی میں واسکوڈی گاما بحر ہند کے سفر کے لئے ۲۴۔ اپریل ۱۴۹۸ء کو مالیندی سے روانہ ہوا اور اس عرب رہنما کی امداد سے ۲۰ مئی ۱۴۹۸ء کو ہندوستان کے مالابار ساحل پر کالی کٹ پہنچ گیا۔ اُس وقت کالی کٹ میں زمورن کی سلطنت تھی۔ واسکوڈی گاما

نے بہت کوشش کی کہ بادشاہ سے کالی کٹ میں تجارتی کوٹھی اور فیکٹری قائم کرنے کی اجازت مل جائے لیکن ہندوستان کے لوگوں کو پرتگیزوں کا تجربہ ہو چکا تھا۔ اس لئے بادشاہ نے منظور نہیں کیا۔

شہاب الدین احمدؐ بن مجید کا حال لکھنے میں گوئیڑو، کیسٹی ہیڈا ور بیراس نے غلطی کی ہے۔ قطب الدین النہروالی نے وضاحت اور تفصیل سے صحیح حالات لکھے ہیں۔ بیٹرز نے سیدی علی کی کتاب محیط کا مع نقشوں کے ترجمہ کیا ہے۔ سیدی علی ترکی امیرالبحر نے اپنی کتاب المحیط میں لکھا ہے۔ کہ میں اپنے بصرہ کے قیام کے زمانہ میں (۱۵۵۴ء) اور بصرہ سے ہندوستان کے سفر میں (۲۰ جولائی لغایت ۲۴ ستمبر ۱۵۵۴ء) بحرِ ہند کے واقف جہازرانوں سے سمندری راستوں کی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا اور اُس کی جستجو کرتا رہا کہ پُرانے ہرمز اور ہندوستان کے جہازران اور لیث بن کہلان، محمد بن شاضان اور سہل بن آبان کس طرح بحرِ ہند کو عبور کرتے تھے۔ اور میں نے زمانہ حال کے ماہر جہازرانوں کی کتابیں مہیا کیں اور اُن کا عمیق مطالعہ کیا۔ شہاب الدین احمد بن مجید کی کتاب فوائد حاویۃ اور سلیمان بن الاحمد المہری ساکن شہر (جیروز۔ عرب جنوبی) کی کتاب تحفۃ الفحول منہاج تلادۃ الشموس کی امداد کے بغیر بحرِ ہند میں سفر کرنا نہایت سخت دشوار ہے دوسرے غیر ملکوں کے ناخدا، امیرالبحر اور جہازران نہیں جانتے کہ اس سمندر میں کس طرح سفر کریں۔ کیونکہ اُن کو اس سمندر کی مطلق واقفیت نہیں ہوتی سیدی علی نے احمدؐ بن مجید کی بڑی عظمت سے تعریف کی ہے اور اُن کو سب جہازرانوں میں قابلِ اعتماد، بحرِ ہند کا معلم اور زمانہ حال کے بحری ہدایات لکھنے والوں میں سب سے زیادہ "مستند" لکھا ہے۔

عربی مسودات میں احمدؐ ابن مجید کی بحری راستوں اور بحری نجوم اور ہیئت کے علوم و فنون پر ۱۹ کتابوں کی تفصیل لکھی ہوئی ہے۔

کتاب الفوائد فی اصول علم البحر والقواعد (مورخہ ۸۹۵ھ مطابق ۱۴۸۹ء) (اس کتاب کو سیدی علی نے مرتب کیا) اس کتاب میں ۱۲ باب ہیں۔ بحری سفر کی ابتدائی تاریخ شروع کے حالات، مقناطیسی سوئی کی تاریخ اور اصلیت ۳۲ خطوط راست اور ۲۸ قصور قمری اور اختان کی تفصیل، بحرِ ہند کے راستوں کی تفصیل، بحرِ ہند کے مختلف بندرگاہوں اور مغربی بحرِ چین کی کیفیت، چڑیاں جو ساحلوں پر علامات اور اشارات مہیا کرتی اور بتاتی ہیں، اُن کی وضاحت، ہندوستان کے مغربی ساحل کے آثار زمین ــــ اور مدغاکی تفصیل لکھی ہے۔

دس مشہور بڑے جزیروں، جزیرہ نمائے عرب، جزیرۂ قمر (مدغاسکر) سماترا، جاوا الفور (فارموسا) لنکا (سیلون) زنجبار، بحرین، ابن گاوان، اور سقوطرہ کا حال لکھا ہے۔ اُن ہواؤں کا تذکرہ اور تفصیل اور علامات لکھی ہیں جن میں ان سمندروں کا سفر مناسب ہے۔ بحر احمر کی تفصیل لکھی ہے کہ کون سے مقامات لنگر اندازی کے لئے مناسب ہیں۔ کون سے حصّے اُتھلے ہیں۔ کنارے، اور پہاڑیاں کہاں ہیں ڈی سلین نے لکھا ہے کہ یہ کتاب وسیع معلومات اور فنّی اصطلاحات سے پُر ہے جس کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ جنھوں نے بحرِ ہند کا سفر کیا ہو اور جو اصطلاحات اور بحری الفاظ اس کتاب میں لکھے ہیں وہ عربی قاموسوں اور لغات کے لئے اضافہ ہیں۔

شہاب الدین احمد بن مجید کی دوسری کتاب حاویۃ الاختصار فی اصول علم البحر نظم میں ہے۔ ۱۱ فصلیں ہیں۔ زمین کے قرب کی علامات جن کو جہازران کو جاننا ضروری ہے ــــ قصور قمری اور خطوط راست کی تفصیل، عربی، قبطی، بازنطینی، فارسی سالوں اور جنتریوں کی تفصیل اور مقابلہ، ستاروں کا ہواؤں پر اثر، کن مہینوں میں کون سے ستارے نظر آتے ہیں۔ کن عرض البلدوں میں مثلاً اور اُن کے مطابق کن ہواؤں کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ عرب کے ساحلوں کے راستے، حجاز، سیام، ملایا اور حبش کے ملکوں کے راستے، مغربی ہندوستان اور راس کموری کے راستوں کی تفصیل، سماترا، چین اور فارموسا کے بحری راستوں کی کیفیت اور تشریح، ملک دیپ، جزیرہ قمرؐ (مدغاسکر) یمن، حبش سومالی لینڈ، الطواح، مکران اور اُس کے اطراف کے بحری راستوں کا حال مغربی ہندوستان اور عرب کے ساحلوں کے درمیان کے بندرگاہوں اور قیام گاہوں کے فاصلے، بحر المحیط کی بندرگاہوں کے عرض البلد اور جائے وقوع کی تفصیلات، جہازرانی کے قواعد و اصول، حبش، ہندوستان اور چین کے درمیانی سمندروں کے عمق، اور دیگر معلومات اور آخر میں نجوم، ہیئت اور فلکیات کے علوم کی تفصیل، مُسلّمات اور نظریے لکھے ہیں۔

شہاب الدین احمد بن مجید اپنے آپ کو اسد البحر کی اولاد لکھتا ہے۔ عربی مخطوطات سے ثبوت ملتا ہے کہ اُس کے اجداد علم البحر کے ماہر، معلم البحر اور جہازرانی کی کتابوں کے مُصنّف تھے۔ اُس نے اپنے والد کے علم، مہارت اور تجربات کی تفصیل لکھی ہے اور لکھا ہے اُس کے والد مجید معلم الساحلین مشہور تھے اور اُس کے اجداد اپنی مہارت اور علم بحری کی وجہ سے اسد البحر کہلاتے تھے مجید

کی ایک ہزار شعروں کی تصنیف الحجازیہ بحر احمر کے ساحلی مقامات کے حالات اور تعینات کے موضوع پر تھی۔ احمد بن مجید نے لکھا ہے کہ بحر احمر میں ۲۰۰ عرض البلد پر، جزیرۂ مرما ء سے ملحق ایک پہاڑی واقع ہے اُس کا نام حجر مجید اس لئے ہے کہ وہاں مجید نے اپنا جہاز ٹھیرایا تھا۔

شہاب الدین احمد جلفار (علاقہ عمان ـ خلیج فارس) کا رہنے والا تھا اُس کا نسب یہ ہے کہ شہاب الدین احمد بن مجید بن محمد بن عمر بن فضل بن دویق بن یوسف بن حسن بن حسین بن ابی ملک السعدی بن ابی الرکیب النجدی۔ اس کے خاندان کی اصل نجد سے ہے۔ کتاب حاویہ لکھنے کے وقت اُس کی عمر (۱۴۶۲ء) ۳۰ برس تھی اور کتاب الفوائد لکھنے کے وقت (۱۴۹۰-۹۵ء) ۶۳ برس کی عمر تھی اس کتاب کے لکھنے کے تین چار سال بعد اپریل میں (۱۴۹۸ء) واسکوڈی گاما سے مالیندی میں ملاقات ہوئی۔

احمد بن مجید نے عباسیوں کے عہد کے علوم بحر کے علماء (۷۵۰ء) محمد بن شاضان، سہل بن آبان، اور لیث بن کہلان کا ذکر لکھا ہے، اور اسمٰعیل بن حسن بن سہل بن آبان کی کتاب رہمانی (۸۴۸ - ۱۱۸۵ء) کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان لوگوں نے بحر احمر میں سراف سے مکران تک کا سفر سات دن میں کیا اور مکران سے خراسان تک کا سفر ایک مہینہ میں کیا۔ بغداد سے یہ سفر تین مہینے کا تھا۔ ان لوگوں نے اس سفر کو مختصر کیا۔ اپنے زمانہ کے معلم ابن عبدالعزیز بن احمد المغربی موسیٰ الکندرانی، میمون بن خلیل کا تذکرہ لکھا ہے اور یہ کہ ان سے پہلے ہزاروں تھے۔ احمد بن تبرویہ کی علم البحر میں تصانیف کا موجود ہونا لکھا ہے۔ ان مصنفوں کی نسبت لکھا ہے کہ انھوں نے پہلے مصنفوں کی تصانیف سے مواد حاصل کیا۔ اور معلم خواشیر بن یوسف بن صلاح الفکری کی تصانیف سے فائدہ حاصل کیا جس نے (۱۱۸۹ء) میں 'دیوکارہ' ہندوستانی جہاز پر سفر کیا تھا۔

اپنے زمانے کے مشہور ناخدا احمد بن محمد بن عبدالرحمٰن بن ابوالفضل بن ابی المغبری کے ذکر میں احمد بن مجید نے لکھا ہے کہ ان کا خاص علم ساحلوں کے حالات اور اُن کی وسعت کے بارے میں تھا جن ملکوں کا انھوں نے حال لکھا ہے اُن میں سے اکثر ہوائی ملک ہیں۔ جہاں ہواؤں کا خاص اثر ہوتا ہے یعنی بحر احمر سے راس کماری تک اور وہاں سے چین تک۔ احمد بن مجید نے لکھا ہے کہ جن متعلقات کے نام انھوں نے لکھے ہیں وہ اب موجود نہیں ہیں۔ اور جو علامات انھوں نے لکھی ہیں وہ ہمارے زمانہ (پندرھویں صدی) میں باقی نہیں ہیں۔ ہماری تحقیقات اُن کے علاوہ ہیں، اور میں نے اپنے تجربات کے نتائج اور اپنی اصطلاحات کا اُن کی تصنیفات میں اضافہ کیا ہے۔ بحری علم کے تجربہ کاروں نے میری تصنیفات کی تصدیق اور تعریف کی ہے۔ اور جو کچھ مشکلات پیش آئی ہیں ان میں میری تحریروں سے امداد ملی ہے۔ مثلاً پہاڑوں اور ساحلی طبقات جری کی حیثیت، نجومی تجربات اور معائنہ، ستاروں کے علم اور اسماء اور ستاروں کی امداد سے جہازرانی کے طریقے۔ میرے زمانہ کے لوگوں کو ان معلومات کے علاوہ کچھ علم نہیں تھا جو کہ پچھلے لوگ چھوڑ گئے تھے۔ مثلاً صحیح بحری راستے، ترفات اور رسمات۔ فاصلوں کا حال اُن کو صحیح معلوم نہیں تھا جس کا ذکر میں نے نظم ذہبیہ میں لکھا ہے۔

احمد بن مجید نے لکھا ہے کہ حقیقت میں گذشتہ زمانہ کے لوگوں میں بہت زیادہ جرأت اور قوت تھی۔ لیکن وہ صرف ساحل کے کشتی رانوں کی امداد سے سفر کرتے تھے۔ کشتی ران اپنی کشتیوں کو اچھی طرح مرتب کرتے تھے اور کبھی موافق ہواؤں کا موسم گذرنے نہیں دیتے تھے۔ اور دماغ اور گنجائش سے زیادہ اپنے جہاز کو نہیں لادتے تھے لیکن ہمارا تجربہ ان سے زیادہ ہے۔ بحری فرضیات میں جو بھی ترقی ہوئی اس کا کوئی نہ کوئی موجد تھا۔ کشتی بنانے والے حضرت نوح علیہ السلام تھے۔ مقناطیس کے بغیر کشتی رانی ممکن نہیں اُس کی ایجاد حضرت داؤد علیہ السلام نے کی۔ قصور قمری اور منتقلۃ البروج کی علامات کے متعلق حضرت دانیال علیہ السلام نے کتاب لکھی جس کی تکمیل نصیر الدین الطوسی نے کی (۱۲۷۴ء) قطب نما کے متعلق یہ روایت ہے کہ حضرت دانیال علیہ السلام نے ایجاد کیا۔ کیونکہ اُن کو لوہے کے استعمال اور اُس کے اجزاء کا علم تھا۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس کے موجد حضرت خضر علیہ السلام ہیں۔ انھوں نے اُس وقت اس کی تحقیقات کی۔ جب اُن کو چشمۂ حیات اور ظلمات کے علاقہ کو جاننے کی ضرورت پیش آئی اور جب وہ قطب کو گئے جہاں سورج اُن کو نظر نہیں آیا۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہاں اُن کو سمت معلوم کرنے میں قطب نما سے امداد ملی۔ اُس ہی نے لکھا ہے کہ اصطرلاب کے ذریعہ سے قیاس (نجومی معاینہ) کا موجد ادریس ہوا ہے۔ اس نے اس اصطرلاب پر منزلیں بنائی تھیں۔ پُرانے عالموں نے ان منزلوں کو عصبات پر تقسیم کیا ہے۔

سلیمان تاجر کے سفرنامہ (شائع شدہ ۸۵۱ء) ابوزید حسن کے سفرنامہ (مرقومہ ۹۱۶ء) اور محمد بن شاضان اور اُن کے ساتھی سہل بن آبان اور لیث بن کہلان (بارھویں صدی) کی تصنیفات جو عرب سے راس کماری ہندوستان

اور دریائے گنگا کے علاقہ، انڈونیشیا اور چین کے سفرناموں پر مبنی ہیں۔ ان کے متعلق احمد بن مجید نے لکھا ہے کہ جن مقامات کا انھوں نے ذکر کیا ہے۔ ان سے بطلیموس اور چینی مُصنفوں کے لکھے ہوئے ناموں کی مطابقت ہوسکتی ہے۔ لیکن صرف یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ ان ناموں کے مقامات کبھی موجود تھے یا اُن کی جائے وقوع کا اندازہ ہوسکتا ہے ورنہ وہ مقامات اکثر موجود نہیں ہیں۔

احمد ابن مجید کی تصنیفات کا مختصر تذکرہ بھی اس مختصر سے مضمون میں نہیں ہو سکتا۔ اُس کی یاد اُنیسویں صدی کے وسط تک ہندوستان اور مالدیپ میں بھی موجود تھی۔ جیمس پرنسپ نے لکھا ہے کہ میں نے عربی قطب نما (وہ قطب نما نہیں جو آج ہر جہاز میں لگا ہوا ہے) کی تلاش کی تو میرے دوست سید حسن سیدی نے کتاب مجیدی سے اُس کا نقشہ دکھایا۔

برٹن نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ۲۹ اکتوبر ۱۸۵۴ء کو معالی بندر (عدن) سے روانہ ہوتے وقت سمندر میں داخل ہونے سے پہلے ہم نے ملاحوں کی قطب نما کے موجد شیخ مجید کی فاتحہ پڑھی اور شام کو باد موافق ہمارے ساتھ ناچ رہی تھی۔ آگے برٹن نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ بات تعجب انگیز ہوگی اگر مشرق کے باشندے دائرہ کی عظیم الشان ایجاد کو بھول جائیں۔ شیخ مجید ایک شامی ولی اللہ تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے ایسی قدرت دی تھی کہ وہ زمین کو اس طرح سمجھتے تھے گویا کوئی نقشہ اُن کے ہاتھ میں ہے۔ بیشتر مسلمان اس پر متفق ہیں کہ دائرہ اُن کی ایجاد ہے۔

یہ مضمون برٹن نے لکھا ہے لیکن جبرائیل فرانڈ نے لکھا ہے کہ یہ بات تے کرنے کے لیے ہر دلیل موجود ہے کہ شیخ مجید شام کے کوئی بزرگ نہیں ہیں۔ بلکہ درحقیقت وہ مسلم احمد ابن مجید ہیں جنھوں نے اپنی بحری تصانیف سے جہاز رانوں کو بہت بڑا نفع پہنچایا ہے۔ اور مسلمان سوانح نگاروں کی نظر میں ایک اعلیٰ مرتبہ پایا ہے۔

جبرائیل فرانڈ نے سلیمان المہری کے متن اور ترجموں سے چند مثالوں میں اس بیان کی تصدیق کی ہے کہ عربوں کو ساتویں صدی عیسوی سے یورپ اور ہندوستان کا بحری راستہ معلوم تھا اور واسکوڈی گاما کے ذریعہ سے عرب نے ہی ہندوستان کا بحری راستہ یورپ کو دکھایا۔

رقص نمبر

۱۵ اگست ۱۹۵۹ء کا شمارہ رقص نمبر ہوگا۔ مضمون نگار حضرات ہندوستانی رقص سے متعلق مضامین ارسال فرمائیں۔ یہ شمارہ نہایت اچھے مضامین اور تصاویر پر مشتمل ہوگا۔ (ادارہ)

حیات اللہ انصاری

نیا کشمیر —— اقتصادی حلقے میں

کشمیر کے باشندوں کی آمدنی کا ایک بہت بڑا سہارا سیاحوں کی آمدورفت ہے۔ ہندوستان کی ریاستوں سے اور ہندوستان کے باہر سے ہزاروں کی تعداد میں سیاح دنیا کی اس حسین ترین وادی کے مشاہدۂ جمال کے لئے ہر سال آتے ہیں۔ جنگلوں، شہروں، وادیوں، باغوں اور برفستانوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ یہ لوگ جب تک قیام کرتے ہیں اپنی ضروریات کا سب سامان کشمیر کی دوکانوں سے خریدتے ہیں۔ سفر کے لئے گھوڑے، خیمے اور ہر طرح کا سامان کرایہ پر لیتے ہیں۔ باورچی، خانساماں اور قلیوں کو ملازم رکھتے ہیں اور پھر جب رخصت ہونے لگتے ہیں تو کشمیر کی دستکاری کی خوبصورت چیزیں خرید کر ساتھ لے جاتے ہیں۔ اس طرح سیاحوں کی آمدورفت سے کشمیر کے ہر طبقے کی کچھ نہ کچھ آمدنی ہو جاتی ہے۔ اس لئے کشمیریوں کی مالی حالت کا بہت کچھ انحصار سیاحوں کی تعداد پر ہے۔ اس میں اگر اضافہ ہوگا تو کشمیری عوام کی حالت بہتر ہوگی اور اگر اس میں کمی ہوگی تو ان کی مفلسی میں اضافہ ہو جائے گا۔

۱۹۴۷ء کا سال سیاحوں کے لحاظ سے اچھا سال تھا۔ اس سال وہاں ۴۰ ہزار سیاح آئے تھے لیکن پاکستانیوں کے حملے کے بعد وہ فوراً وہاں سے چلے گئے۔ ۱۹۴۸ء میں سناٹا رہا جس کی وجہ سے وہاں کے باشندوں کا حال بہت خراب ہو گیا۔ ۱۹۴۹ء میں ان کی تعداد ساڑھے تین ہزار ہو گئی۔ پھر وہ بڑھتے بڑھتے ۱۹۵۲ء میں ۱۳ ہزار پہنچ گئی یعنی ۱۹۴۷ء کے لگ بھگ آ گئی۔ کشمیری عوام اس کو بہت غنیمت سمجھے۔

حکومت کشمیر نے پہلے اور دوسرے پنج سالہ منصوبے کے تحت سیاحوں کی آمدورفت کو بڑھانے کے لئے باقاعدہ جدوجہد شروع کی۔ ان کی آمدورفت میں سہولتیں پیدا کیں۔ کشمیر کی وادیوں میں گھومنے پھرنے کے لئے سڑکیں بنائیں اور قیام کرنے کے لئے جگہ جگہ قیام گاہیں تعمیر کیں اور ان سہولتوں کا اشتہار بھی دیا۔ اس جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاحوں کی تعداد سال بہ سال بڑھتی گئی۔ ہوتے ہوتے ساڑھے ۱۴ ہزار سے ۲۱ ہزار ہوئی۔ پھر ۳۴ ہزار پھر ۵۱ ہزار اور اب ۷۰ ہزار ہو گئی ہے۔

غیر ملکی سیاحوں کی تعداد پہلے سوا تین ہزار تھی اور اب ساڑھے سات ہزار یعنی دگنی ہو گئی۔ صرف اس ایک ترقی کو دیکھ کر ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ کشمیر کے عوام کی حالت پہلے سے اب ضرور بہتر ہو گئی ہے۔ یعنی اب پہلے سے زیادہ سامان فروخت ہوتا ہے۔ زیادہ لوگوں کو اجرت ملتی ہے اور زیادہ لوگوں کو دستکاری سے روزی کمانے کا موقع ملتا ہے۔

کشمیر کی دستکاری صدیوں سے ہندوستان میں اور باہر مشہور ہے۔ کشمیر کی شالیں اور دوشالے، قالین، لکڑی کی بنی ہوئی چیزیں، پیپر ماشی کی چیزیں، کھالیں، نمدے، کوٹ، ریشمی کپڑا، چاندی کا کام، یہ سب چیزیں بہت خوبصورت ہوتی ہیں اور ہر جگہ بہت قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔

کشمیر میں چار مہینے سخت برف باری اور سردی رہتی ہے۔ اس زمانے میں کشمیری دستکار اپنے گھروں میں بیٹھے گرمیوں میں آنے والے سیاحوں کے لئے دستکاری کے شاہکار بناتے رہتے ہیں۔ ان چیزوں کی تیاری میں محنت زیادہ ہوتی ہے اور کچا مال کم صرف ہوتا ہے۔ اس وجہ سے غریب سے غریب دستکار بھی کچھ نہ کچھ بنا کر رکھ لیتا ہے۔

حکومتِ کشمیر نے اپنے پنجسالہ منصوبوں میں اس بات کو خاص طور سے ملحوظ رکھا کہ دستکاری کو ترقی دینے سے کشمیری عوام کی حالت بہتر ہو سکتی ہے۔ اور یہ کہ اس طرح جو آمدنی ہوگی وہ بہت بڑے حلقے میں تقسیم ہو جائے گی۔ حکومت نے اس غرض سے کشمیر آرٹس امپوریم قائم کیا جس کی شاخ دہلی میں کھولی گئی۔ پھر رفتہ رفتہ ہندوستان کے چودہ بڑے شہروں میں اس کی شاخیں قائم ہو گئیں۔ اور ۴۰ لاکھ سالانہ کا مال ان شاخوں میں فروخت ہونے لگا۔

جب کشمیری دستکاری کی مانگ ہندوستان میں بڑھنے لگی تو حکومتِ کشمیر

مال کو فروخت کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی پیداوار کا بھی بندوبست کرنے لگی۔ پنجسالہ منصوبے کے تحت اس نے کشمیر کے اندر ۲۰ دستکاری گھر کھول دئے جہاں ڈیڑھ ہزار آدمی کام کرنے لگے اس کے علاوہ ایکہزار کاریگروں کو ان کے گھروں پر بھی کام ملنے لگا۔

کشمیر میں جو لوگ گئے ہیں اور جنھوں نے وہاں مال خریدا ہے وہ جانتے ہیں کہ وہاں کا مال اور قیمت کے بارے میں خریداروں میں کیسی بے اطمینانی تھی۔ یہ شکایتیں تو بہت عام تھیں کہ شال خریدی تو اس کا رنگ کچا نکل گیا۔ فرکا کوٹ لیا تو سال بھر کے اندر ہی اس کے بال گر گئے ـــــ چاندی کے مال میں کھوٹ نکلا ـــــ لکڑی جو خریدی وہ ٹیڑھی ہو گئی۔ دوسری طرف قیمتوں کا بھی یہی حال تھا۔ ایک چیز ایک جگہ دس روپے کو خریدی دوسری طرف پر گئے تو وہی چیز پانچ چھ روپے میں نظر آئی۔ ان باتوں کی وجہ سے کشمیری دوکان دار بہت بدنام ہو گئے تھے اور خریدار کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا دام لگائے۔ کشمیری حکومت نے محسوس کیا کہ جب مال کا معیار اور دام مقرر کئے ہوئے نہ اس کی بکری میں اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ برآمد میں ـــ اس وجہ سے حکومت نے دونوں باتوں کی طرف توجہ دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیرونی ملکوں میں بھی کشمیری مال کی مانگ پیدا ہو گئی۔ ایک سال میں دس لاکھ کا مال صرف سوویت روس میں فروخت ہوا۔ ابھی اس سلسلے میں کئی منصوبے اور ہیں جن کو عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ ان ترقیوں کی وجہ سے شرح اُجرت میں بھی اضافہ ہوا ہے اور دستکاروں کی کھپت میں بھی

اس دور میں زراعت ہو یا حرفت کسی کی بھی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک صنعت اور مشین سے براہ راست یا بالواسطہ اس کو سہارا نہ دیا جائے اس وجہ سے حکومت نے صنعت کی طرف بھی کافی توجہ دی ہے۔ بجلی کی پیداوار میں کافی اضافہ کیا ہے۔ وادیٔ کشمیر کے اندر بجلی کی پیداوار تگنی ہو گئی ہے اور جموں میں تگنی سے زائد۔

بجلی کی پیداوار کے معنی ہیں، کارخانوں میں اضافہ۔ چناں چہ حکومت نے مختلف قسم کے کارخانے ریاست میں قائم کئے ہیں جو ترقی کر رہے ہیں اور جن کا مال ریاست سے باہر اور ہندوستان کے باہر بھی جا رہا ہے۔

کشمیر ایک ایسی وادی ہے جو چاروں طرف سے بہت بلند پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے اور جب برف پڑتی ہے تو وہ ایک زنداں سا بن جاتی ہے۔ پہلے نکاسی کا صرف ایک راستہ تھا جو راولپنڈی کی طرف تھا۔ پاکستان بن جانے کے بعد وہ بند ہو گیا اس طرح اس کے بعد اس کی وجہ سے وادی کے اندر سے مال کا آنا جانا کئی مہینے بند رہنے لگا۔ جاڑوں میں سوائے ہوائی جہاز کے اور کوئی ذریعۂ آمد و رفت نہیں رہ گیا۔ پنج سالہ منصوبے کے ماتحت ایک زمین دوز راستہ پہاڑوں کو کاٹ کر تیار کر لیا گیا ہے۔ اس راستے سے جاڑوں میں بھی موٹر اور بسیں اور ٹرک آ جا سکتے ہیں۔ یہ راستہ گذشتہ سال جاڑوں سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس چیز کا اقتصادیات پر بہت خوش گوار اثر پڑے گا۔ بلکہ پڑنا شروع ہو گیا ہے۔

ترقیوں کے لئے صرف منصوبہ بنانا اور اس کے وسائل مہیا کرنا ہی کافی نہیں ہے اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ عوام کو اپنی ترقی کی جدوجہد میں حصہ لینے کے لئے آمادہ کیا جائے۔ ورنہ ساری کوششیں بے کار ثابت ہوتی ہیں۔ یہاں تک ہوتا ہے کہ اسکول کھول دیا گیا ہے لیکن لوگ اپنے بچوں کو پڑھنے کے لئے بھیجتے ہی نہیں ہیں۔ یا اسپتال قائم کر دیا گیا ہے لیکن عوام جھاڑ پھونک سے علاج کراتے ہیں اور اسپتال نہیں آتے۔ اسی طرح چیچک کے اور دوسری بیماریوں کے ٹیکے کا بندوبست کر دیا جائے لیکن لوگ ٹیکے لگوانے کے بجائے اس سے خوف زدہ رہتے ہیں اور دور بھاگتے ہیں صنعتی اور زراعتی ترقی کے ذرائع مہیا کرو۔ لیکن وہ ان سے فائدہ اٹھانے کے بجائے دور بھاگتے ہیں

اس غرض سے کہ لوگوں میں خود بہ خود ترقی میں حصہ لینے کی اُمنگ پیدا ہو، دوسری ریاستوں کی طرح کشمیر میں بھی اجتماعی جدوجہد کے لئے مختلف قسم کے ادارے قائم کئے گئے ہیں جو آٹھ سال سے برابر کام کر رہے ہیں۔ ساتھ ساتھ تعلیم کو بھی پھیلایا جا رہا ہے۔ ان دونوں چیزوں نے عوام میں کافی بیداری اور ترقی کے لئے اُمنگ پیدا کر دی ہے۔ کسی شاعر نے کشمیر کی شان میں کہا ہے کہ وہ ایک جنت ہے جو روئے زمین پر اُتر آئی ہے۔ خوب کہی ہے یہ بات، اس وادی میں گھومنے والے محسوس کرتے ہیں کہ جنت کے تصور کی انسانی حد یہی ہے۔ اس خوبصورت وادی کے باشندے بھی حور اور غلمان ہیں۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ تاریخی حالات نے ان کو دبائے رکھا اور ان کی قدرتی خوبیوں کو اُجاگر ہونے کا موقع نہ دیا۔ چند دور حکومت کو چھوڑ کر ان پر غلامی اور مفلسی برابر مسلط رہی۔ اگر یہ دونوں بلائیں نہ ہوتیں تو جانے یہاں کے باشندے کیسے اچھے انسان ہوتے۔ میرا ذاتی تجربہ تو یہ ہے کہ ایسے ہوشیار عوام مشکل ہی سے کہیں ملیں گے آج کشمیری اور مرکزی حکومت اس وادی کو مفلسی، جہالت، بیماریوں اور پستیوں سے نکالنے کی زبردست جدوجہد کر رہی ہیں اور اس میں کافی کامیابی بھی ہوئی ہیں۔ لیکن ہر کام آسان نہیں ہے۔ اتنی کامیابی کے بعد بھی ابھی کام بہت پڑا ہے۔ لیکن اس کامیابی کو دیکھ کر اتنا تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں ؎

شبِ غم تو منائے خیر اپنے جیب و دامن کی
رہے دستِ جنوں باقی تو کر لیں گے سحر پیدا

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو، لکھنؤ)

چھوت چھات کے خاتمے کی مہم

ملک میں گذشتہ گیارہ سال کی مدت میں جو زبردست اصلاحی اقدامات کئے گئے ان میں چھوت چھات کو ختم کرنے کی مہم ایک انقلابی اقدام کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگرچہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ مہم پوری طرح کامیاب ہو چکی ہے پھر بھی اب تک بڑے وسیع پیمانے پر کام ہوا جس کے نتائج نہایت حوصلہ افزا ہیں۔

ہمارے سامنے یہ مقصد ہے کہ اس صدیوں پرانی لعنت کو یکسر مٹا کر پُرامن طور سے سماجی انصاف قائم کیا جائے۔

آج ان لاکھوں پس ماندہ لوگوں میں جو بیداری پائی جاتی ہے وہ مہاتما گاندھی کے پیدا کردہ سماجی انقلاب کا نتیجہ ہے۔ مہاتما گاندھی کا کہنا تھا کہ چھوت چھات ہندوستانی سماج پر ایک نہایت بدنما داغ ہے۔ جس کو دور کرنے کے لئے انھوں نے مذہبی، تعلیمی اور سیاسی میدان میں پوری جد و جہد کی۔

مہاتما گاندھی کا قول تھا:

"میں ایسے ہندوستان کی تعمیر کروں گا جس میں غریب سے غریب آدمی بھی یہ محسوس کرے گا کہ یہ ملک اس کا ہے، اور اس کی تعمیر میں اس نے بھی حصہ لیا ہے۔ اس ہندوستان میں ہر فرقہ کے لوگ پورے امن و اطمینان کے ساتھ رہیں گے اور یہاں چھوت چھات کے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی۔"

گاندھی جی عمر بھر پس ماندہ لوگوں کی بھلائی کے کام میں لگے رہے، انھوں نے ان لوگوں کو "ہری جن" یعنی "خدا کے پیارے" کہہ کر ذات پات کا نظریہ ہی بدل ڈالا، اور اس طرح ایک ذہنی انقلاب پیدا کر دیا۔ وہ ہریجنوں کے ساتھ رہے اور ان کے غم اور خوشی میں برابر شریک رہے۔

بلا شبہ گاندھی جی کی اس تحریک نے ایک ایسی خوشگوار فضا پیدا کر دی تھی، جس کی وجہ سے آزادی کے فوراً بعد انقلابی سماجی اصلاحات بروئے کار لائی گئیں۔

چنانچہ ملک کی آزادی کے بعد انسانی حقوق کے بارے میں انقلابی نظریہ پیش کیا گیا۔ ملک کے دستور میں بنیادی حقوق کے تحت شہریوں میں مذہب، نسل، ذات پات، جنس یا جائے پیدائش کی بنا پر امتیاز کرنا ممنوع قرار دے دیا گیا۔

دستور نے چھوت چھات کو ممنوع قرار دیا اور کسی صورت میں اس کا رواج روا نہیں رکھا۔ دستور کے مطابق پردیشوں کو پس ماندہ طبقوں کی فلاح و بہبود اور ان کے تعلیمی، اقتصادی اور سماجی مفاد کی ترقی کے لئے خاص انتظامات کرنے کا حق دیا گیا۔ پس ماندہ طبقوں کے لئے پارلیمنٹ، پردیشوں کی مجالسِ قانون ساز اور سرکاری ملازمتوں میں جگہ محفوظ کر دی گئیں۔

چنانچہ پردیشوں میں چھوت چھات کے انسداد کے لئے قوانین وضع کئے گئے اور پس ماندہ طبقوں کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری قدم اٹھائے گئے۔ دستور میں یہ بھی سفارش کی گئی تھی کہ صدرِ جمہوریہ ایک کمیشن مقرر کریں جو سماجی اور تعلیمی اعتبار سے پس ماندہ طبقوں کی حالت کا اندازہ لگائے اور ان کی اصلاح کے لئے اقدامات تجویز کرے۔ یہ کمیشن قائم ہے اور اپنے کارِ منصبی میں مصروف ہے۔

ان دستوری اور قانونی اقدامات کے علاوہ بالغان کی عام رائے دہندگی کے حق نے صورتِ حال پر بہت زبردست اثر ڈالا ہے کیونکہ اس حق کے ذریعہ پس ماندہ طبقوں کے ہاتھ میں انقلابی قسم کے سماجی اور اقتصادی پروگراموں کو بروئے عمل لانے کی قوت آگئی ہے۔

حکومت کی طرف سے چھوت چھات کو ختم کرنے کی سہ رخی مہم جاری ہے یعنی قانونی، انتظامی اور تعلیمی تین میدانوں میں چھوت چھات کے خلاف جنگ لڑی جا رہی ہے۔

۱۹۵۴ء سے حکومت ہند چھوت چھات کو ختم کرنے کی تحریک کو مالی امداد دے رہی ہے۔ اس مقصد کے لئے سرکاری اور غیر سرکاری دونوں قسم کے اداروں سے کام لیا جا رہا ہے۔ اس مہم میں مصروف رضا کار انجمنیں جیسے ہریجن سیوک سنگھ، بھارتیہ ڈپریسڈ کلاسز لیگ، ہریجن آشرم الٰہ آباد وغیرہ کی امداد و تعاون حاصل کیا گیا۔ پہلے پلان کے عرصہ میں ان انجمنوں کو ۶۱,۵۰,۷۴۶ روپیہ کی امداد دی گئی۔ اس میں ۱,۴۷,۲۰۰ روپیہ کی رقم مرکزی حکومت نے دی۔ اس مقصد کے لئے دوسرے پلان میں ۵۰ لاکھ روپیہ کی رقم رکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ۲۵ لاکھ روپیہ مختلف ذرائع سے چھوت چھات کے خلاف پبلسٹی کرنے کے کام پر صرف کیا جائے گا۔

۱۹۵۶-۵۷ء میں مرکزی حکومت نے غیر سرکاری اداروں کو براہ راست ادائیگی کے لئے ۹,۲۲,۲۲۵ روپیہ کی رقم منظور کی تھی۔ اس کے علاوہ اسی عرصہ میں ۴,۵۰,۰۰۰ روپیہ کی مزید رقم چھوت چھات کے خلاف پروپیگنڈا کی فلمیں بنانے کے لئے بھی دی گئی۔ اس مقصد کے لئے پردیشوں کی سرکاروں کو بھی خاص امداد دی جا رہی ہے۔

عبدالقادر سروری
ع۔م

نئی کتابیں

جوش ملسیانی (ابھینندن گرنتھ)

ماہ دسمبر ۱۹۵۷ء میں اردو کے مشہور شاعر پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی کی شعر گوئی کی ساٹھ (۶۰) سالہ جوبلی ان کے شاگردوں اور قدردانوں کی جانب سے منائی گئی تھی۔ اس موقع پر ایک ضخیم جلد "جوش ملسیانی ابھینندن گرنتھ" کے نام سے اردو کے اس مسلّم الثبوت استاد کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔ یہ ضخیم کتاب کوئی ۵۰۰ صفحات پر حاوی ہے۔ اس موقع کے لئے ملک بھر کے ادیبوں نے مضامین لکھے اور سربرآوردہ پبلک ہستیوں نے قدر و منزلت کے جو پیغامات بھیجے تھے انھیں اکٹھا کر کے اس کتاب میں شائع کر دیا گیا ہے۔

کتاب کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ محض ایک ادبی تحفہ نہیں بلکہ پچھلی پون صدی کی ادبی تاریخ ہے۔ جوش ملسیانی کی عمر اس وقت ۷۷ برس کی ہے اور خدا انھیں صد سالہ سلامت رکھے۔ شعر گوئی انھوں نے پندرہ سال کی عمر سے شروع کی تھی۔ اس طویل مدت میں زمانے نے کیسی کیسی کروٹیں لیں اور حالات نے کیسے کیسے پلٹے کھائے لیکن جناب جوش انہماک کے ساتھ اپنے فن کو سنوارنے اور نکھارنے میں معروف رہے جس کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کا شمار آج اردو کے اساتذہ میں ہوتا ہے اور ان کے شاگردوں میں کئی ایسے ہیں جو خود استادی کا مرتبہ حاصل کر چکے ہیں۔ پنجاب میں اردو شعر و سخن کا ذوق پھیلانے میں جوش کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔

جوش ملسیانی کی شعر گوئی کی ابتدا غزل سے ہوئی اور گو انھوں نے اقتضائے زمانہ کے لحاظ سے نظمیں بھی لکھی ہیں لیکن حقیقت میں وہ غزل ہی کے استاد مانے گئے ہیں۔ انھوں نے معرکے کے مشاعروں میں اپنا کلام سنا کر بڑے بڑے دقیقہ سنج نقادوں سے دادِ سخن حاصل کی ہے جن میں سر شیخ عبدالقادر، سر رضا علی، جوش ملیح آبادی، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، گوپی ناتھ امن وغیرہ شامل ہیں۔ سر شیخ عبدالقادر جو شعر و سخن کا نہایت ستھرا مذاق رکھتے تھے جوش کے خاص قدردانوں میں تھے۔ سائل دہلوی جو داغ کے داماد تھے اور داغ کے رنگ میں کہنے والوں میں بڑے استاد مانے گئے ہیں ایک خط میں نوح ناروی کو لکھتے ہیں "جن چار ہستیوں کو وہ عزیز رکھتے تھے ان میں ایک جوش ملسیانی بھی ہیں۔" پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اردو کے ادیب، محقق اور شاعر نے جوش کا کلام پڑھ کر کہا تھا: "پڑھتے وقت مجھے تو یہی محسوس ہوا کہ رام پور میں مشاعرہ ہو رہا ہے۔ داغ، امیر، تسلیم، ظہیر کی خوش بیانیوں سے مسرور ہو رہا ہوں۔ زبان شیریں، بیان برجستہ، سلاست میں رنگینی اور رنگینی سے سادگی مجھے ہم آغوش نظر آئی ہے۔"

جوش ملسیانی کی طویل مشق و مہارت نے انھیں حقیقتاً ہیں اپنے فن کو سنوارنے اور بلند کرنے کا موقع عطا کیا۔ اس کے علاوہ جیسے جیّد اساتذہ کے دوش بدوش انھوں نے میدانِ سخن کے معرکے سر کئے، اس کا اقتضا یہی تھا کہ شعر کے فن، زبان اور محاورے بیان کو استادانہ قدرت حاصل ہو گئی۔ اسی لئے اس وقت سے زمینِ غزل پر بلا شرکتِ غیرے ان کا قبضہ ہے۔

جوش ملسیانی نے داغ دہلوی سے غائبانہ تلمذ اختیار کیا تھا۔ ان کا یہ انتخاب دراصل ان کے جذبۂ "جستجوئے خوب تر" کا نتیجہ تھا۔ داغ حیدرآباد میں

تھے لیکن عام محاورے کے مطابق سارے ہندوستان میں ان کا طوطی بول رہا تھا اور ان کی غزل کا شہرہ سارے ملک میں پھیلا ہوا تھا۔ جوش کو داغ سے ملاقات کا موقع غالباً کبھی نہیں ملا اور ان کی ہم صحبتی کبھی نصیب نہ ہو سکی۔ یہ جوش کے لئے شاید اچھا ہی ہوا۔ داغ کے شخصی اثر سے دور رہ کر انھوں نے غزل کو اپنے انداز پر نشو و نما دیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ داغ میں اور جوش میں سوائے سادگیٔ زبان اور بیان اور لطفِ گویائی کے کوئی خصوصیت مشکل سے مشترک ملے گی۔ داغ کی شوخی جوش کے یہاں سنجیدگی کی صورت میں نمودار ہوئی ہے لا اُبالی پن، جوش کی غزل میں پاسِ وضع کی شکل میں اور داغ کا زعم قادر الکلامی جوش کے یہاں انکسار کے روپ میں نکھرا ہے۔ یہ دراصل دونوں کے اپنے اپنے ماحول کا نتیجہ ہے۔

جوش ملسیانی پنجاب کے ایک چھوٹے سے قصبے ملسیاں کے رہنے والے ہیں۔ بعد میں جب وہ نکودر میں فارسی کے مدرس مقرر ہو کر گئے تو وہ بھی کوئی بڑا مقام نہ تھا۔ اس طرح ظاہر ہے کہ انھیں اردو کے مرکزوں میں رہنے بسنے کا کوئی موقع نہیں ملا۔ اس کے باوجود اردو زبان کے مزاج کو سمجھنے اور اس کی شاعرانہ نزاکتوں پر قدرت حاصل کرنے میں جو جہادِ نفس یا صدرِ جمہوریۂ ہند کے الفاظ میں ریاضت انھوں نے کی وہ حقیقت میں ادبی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ ہے۔

ا ... گرنتھ میں سب سے پہلے پیغامات ہیں اور پیغامات میں سب سے پہلا پیغام ہندوستان کے پہلے شہری صدر جمہوریۂ ہند کا ہے۔ جسے خود انھوں نے اردو میں اپنے قلم سے لکھا ہے۔ اس پیام میں صدر جمہوریہ نے جوش ملسیانی کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے: "جوش صاحب نے ایک طویل مدت اردو ادب کی خدمت میں گزاری ہے اور ان کی یہ ریاضت ملک کے نوجوانوں اور ادیبوں کے لئے مشعلِ ہدایت ہے۔" جوش صاحب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم ہند کے علاوہ اکثر ریاستوں کے ایسے سارے گورنروں کو اردو شعر و ادب سے دلچسپی ہے ادیب اور شاعر سب ہی نے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے صحیح لکھا کہ "حضرت جوش کی خدمات اردو شاعری کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ آپ نے نہ صرف داغ کی روایت کو سلیقے سے نبھایا بلکہ دورِ حاضر کے سوز و گداز کو بھی دلنشیں اور پُر کیف انداز میں پیش کیا ہے۔"

پیغامات کے بعد حضرت جوش اور ان کی شاعری کے بارے میں مضامین ہیں۔ پہلا مضمون پنڈت ہری چند اختر کا ہے جس میں جوش کے اخلاق و عادات اور زندگی پر بہت خوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ پنڈت اختر جیسا نغز گو شاعر اب ہم سے چھین لیا گیا۔ علی عباس حسینی نے عقیدت غائبانہ پیش کی ہے۔ حضرت جوش کے متروکاتِ شعری پر سید فاضل زیدی شاہ پوری نے اپنے مضمون میں بڑی دیدہ ریزی سے روشنی ڈالی ہے۔ اس مضمون کو پڑھنے سے اردو زبان پر حضرت جوش کے عبور اور ان کے ذوق کی صحت کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت جوش ملسیانی کی شاعری پر جناب جمیل مہدی کا مضمون بھی ان کے مطالعہ کی گہرائی کا ثبوت ہے۔ جوش کے فرزند عرش ملسیانی نے بھی اپنے والد محترم کی نظم گوئی پر ایک مضمون لکھا ہے۔ جوش ملسیانی اپنے بدلتے ماحول سے کبھی بے گانہ نہیں رہے۔ چنانچہ ان کی موضوعی نظموں کے علاوہ خود غزل کے اندازِ فکر اور زبان کے ارتقاء سے اس کا بخوبی ثبوت ملتا ہے۔

حضرت جوش کے کچھ شعر جو اُن کی قادر الکلامی کا ثبوت ہیں یہاں پیش کئے جاتے ہیں ؎

شکرِ نعمت کے لئے خلد میں آنا ہی پڑا ___ ورنہ اس گلشنِ بے کیف میں کیا رکھا ہے
حرم سے کچھ آگے بڑھے ہم تو دیکھا ___ جبیں کے لئے آستاں اور بھی ہیں
موت ہی انساں کی دشمن نہیں ___ زندگی بھی جان لے کر جائے گی
اے شیخ اگر خلد کی تعریف یہی ہے ___ میں اس کا طلبگار کبھی ہو نہیں سکتا

گرنتھ کا آخری حصہ حضرت جوش کے شاگردوں کے حالات پر مشتمل ہے

(عبدالقادر سروری)

نقشِ آزاد

ناشر: کتاب منزل لاہور، مؤلفہ غلام رسول مہر، تقطیع ۱۸×۲۲ ضخامت ۴۰۳ صفحات، کتابت، طباعت اچھی، کاغذ اوسط، جلد، جلد پوش عمدہ۔ قیمت چھ روپے۔ ملنے کا پتہ: کتاب منزل، پوسٹ بکس ۵۰۲، لاہور۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں کا یہ نادر مجموعہ غلام رسول مہر صاحب نے تالیف کر کے اردو ادب کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ابوالکلام کی نثر کے باب میں حسرت موہانی فیصلہ کر گئے ہیں ؎

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر ___ نظمِ حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

اگر یہ جواہر پارے جمع نہ ہوتے تو زمانے کی دست بُرد کی نذر ہو جاتے۔ یہ تالیف تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ۱۸۱ خطوط مولانا غلام رسول مہر کے نام

ہیں۔ ان خطوط میں ادبی نکات ہیں، سیاسی معلومات ہیں اور ایک عہد کی تاریخ ہے۔

[illegible] میں [illegible] تحریریں [illegible] جن میں کلام غالب پر مختلف پہلوؤں سے [illegible] ہے [illegible] میں [illegible] ہیں جو مشاہیر و بادشاہوں کے نام [illegible] ذکر ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ [illegible] بڑی مقبول ہوگی۔

تمہید

[illegible] شوق کی ایک طویل نظم ہے [illegible] مرفروشوں کی محبت وطن [illegible] عقیدت پیش کی گئی ہے۔ [illegible] صفحات [illegible] کی تقطیع [illegible] عمدہ [illegible] قیمت [illegible] ملنے کا پتہ [illegible] بھوپال [illegible] بھوپال۔

[illegible] ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے جو ہر صاحب نظر کے لئے مطلوب و پسندیدہ ہے۔ یہ نظم [illegible] کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے۔ [illegible] آزادی [illegible] ملکوں میں [illegible] کی وہ تنبیہ بھی ہے، وہ اس وقت فراموش [illegible] ہے۔ اس [illegible] تو نظم کا پہلا مصرع ہی ساری نظم پر حاوی ہے ع

[illegible] تو اک مشعل بھی ہے یرقد بھی ہے

[illegible] کے متعلق فرمایا ہے

تیری [illegible] میں [illegible]	[illegible]
خل زاروں [illegible] میں کہ پراب ملا	ذرہ ذرہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] انقلاب پر [illegible] ہے

کانپ اٹھا [illegible] ہونا پاگل	انقلاب آ [illegible]
[illegible]	[illegible]

[illegible] توڑ دیا جبر و تشدد کا نظام

[illegible] شب کی سیاہی کو دیا صبح کا جام

[illegible] کرکے ایشیا اور افریقہ کی بیداری کا ذکر کیا ہے۔

جاگ اٹھا ایشیا افریقہ نے انگڑائی لی	پا بہ زنجیر غلاموں کے بھی جاگ اٹھے بھاگ
اس کے نام پہ ٹوٹی ہوئی دنیا چونکی	[illegible] نہیں سکتے ہیں اب قوموں کی تہذیب کے راگ

آخر میں [illegible] مشرق سے انوار کی بارش ہوگی" کا نعرہ لگا کر شاعر ہدیۂ سلام پیش کرتا ہے

[illegible] شہیدوں کے مقدس منظر	تجھ کو اک شاعر ہندی کا بصد شوق سلام

[illegible] ایسی نظمیں کم لکھی گئی ہیں۔ اس میں جوش ہے ولولہ ہے۔ افادیت کا پہلو تو ظاہر ہی ہے ہر صاحب ذوق اس نظم سے لطف اٹھائے گا۔

اُردو کی ادبی تاریخ

مصنف [illegible] عبدالقادر سروری صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ ناشر نیشنل فائن پرنٹنگ [illegible] چار مینار حیدرآباد دکن۔ ملنے کا پتہ نیشنل بک ڈپو [illegible] حیدرآباد دکن یا کتاب خانہ انجمن ترقی اردو [illegible] حیدرآباد۔ [illegible] صفحات [illegible] طباعت [illegible] قیمت تین روپے [illegible] آنے

مصنف کا قول ہے کہ [illegible] ادبی تاریخ لکھنے والے کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ادبی مظاہر کو سیاسی معاشی سماجی اور فنی ماحول میں پیش کرنے کی کوشش کرے چنانچہ اس کتاب میں مصنف نے یہ کوشش کی ہے۔ کتاب کے ابواب یہ ہیں: قدیم ہندستان، عظیم ہندستان، نئی [illegible] تہذیبی [illegible]، نئی تہذیب نئی زبان، فاتح، مفتوح، شمال کی [illegible] [illegible]، پہلے [illegible] نئی تہذیب اور نئی لسانی روایات، [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] مثلاً [illegible]

[illegible] ہندستان [illegible] اور [illegible]

[illegible] تاریخ سے متعلق [illegible] کتابیں لکھی گئیں لیکن یہ کتاب [illegible] تاریخی اور [illegible] عوامل کے پیش نظر [illegible] تاریخ مرتب کرنا ایک قابل صد احترام [illegible] ہے [illegible] علمی [illegible] کو سر آنکھوں پر [illegible]

[illegible]

[illegible] رقم [illegible] کھا [illegible] نیا گاؤں لکھ [illegible] تنقید کے [illegible] صفحے۔ [illegible] صاحب کے پہلے [illegible] [illegible] ہوگا۔

اُردو افسانہ نگاری کا مقابلہ

ایک ہزار تین سو روپے کے نقد انعامات

پہلا انعام	درجہ اوّل کے ایک افسانہ پر	پانچ سو روپے
دوسرا انعام	درجہ دوم کے ایک افسانہ پر	تین سو روپے
تیسرا انعام	درجہ سوم کے ایک افسانہ پر	دو سو روپے
چوتھا انعام	درجہ چہارم کے تین افسانوں پر بحصہ مساوی	تین سو روپے

اِس مقابلہ میں شرکت کے لیے فیس داخلہ کچھ نہیں ہے۔ مقابلہ میں شامل ہونے کی آخری تاریخ ۲۵۔اپریل ۱۹۵۹ء ہے

شرائط

(۱) اس مقابلہ میں صرف وہی افسانے شامل کیے جائیں گے، جو کسی طبی یا صحتی موضوع پر لکھے گئے ہوں۔

(۲) اس مقابلہ میں ہر ایک افسانہ نگار کا صرف ایک ہی افسانہ شریک کیا جائے گا۔

(۳) افسانہ ہر ایک پہلو سے طبع زاد (اوریجنل) اور اُردو زبان میں لکھا ہونا چاہیے اور "ہمدرد صحت" کے چار صفحات سے زیادہ طویل نہ ہو۔

(۴) افسانہ صاف اور خوش خط حروف میں کاغذ کے صرف ایک طرف لکھا ہونا چاہیے اور صفحہ پر کچھ حاشیہ چھوڑا ہوا ہونا چاہیے۔

(۵) احتیاط کے خیال سے افسانے رجسٹرڈ پوسٹ سے روانہ کیے جائیں تو بہتر ہے۔ ڈاک میں گم شدہ افسانہ کی ذمہ داری ادارہ پر نہ ہوگی۔

(۶) افسانہ کے مسودہ میں افسانہ کے ختم پر اپنے دستخط اور پورا پتہ ضرور لکھ دیا جائے اور افسانہ کی پیشانی پر یہ الفاظ تحریر کر دیے جائیں:

"ہمدرد صحت کے افسانوی مقابلہ میں شرکت کے لیے"

(۷) ہمدرد دواخانہ کے ملازمین اس مقابلہ میں شرکت کا حق نہیں رکھتے۔

(۸) افسانوں کا انتخاب اور انعامات کا فیصلہ ایک کمیٹی کرے گی جس کے ممبران کے ناموں کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔ اس کمیٹی کا فیصلہ آخری اور قطعی ہوگا اور مقابلہ میں شامل ہونے والے ہر ایک افسانہ نگار کو وہ فیصلہ قبول کرنا لازمی ہوگا۔

(۹) انعام پانے والے افسانوں کے جملہ حقوق طبع و اشاعت دائمی طور پر ہمدرد دواخانہ (وقف) کے لیے محفوظ ہوں گے اور وہ ان کو کسی بھی شکل میں جہاں چاہیے گا، استعمال کر سکے گا۔

(۱۰) غیر منتخبہ افسانے واپس نہیں کیے جائیں گے بلکہ ضائع کر دیے جائیں گے، اس لیے بہتر ہوگا کہ افسانہ نگار افسانہ بھیجنے سے پہلے اپنے افسانہ کی نقل خود محفوظ کر لیں۔

(۱۱) انعامات ہمدرد منزل، لال کنواں، دہلی میں جلسہ انعامات میں تقسیم کیے جائیں گے جس کی تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔ انعامات حاصل کرنے والوں کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اس جلسہ میں شریک ہو کر انعام حاصل کریں۔

(۱۲) دہلی سے باہر مستقل مقیم انعام پانے والے افسانہ نگاروں کو جلسہ انعامات میں شرکت کی صورت میں ان کے قریبی ریلوے اسٹیشن سے دہلی جنکشن تک کا سیکنڈ کلاس کے یک طرفہ ریلوے ٹکٹ کا خرچ ہمدرد دواخانہ کی طرف سے دیا جائے گا۔ قیام و طعام کا انتظام ان کو خود کرنا ہوگا۔

(۱۳) اس مقابلہ میں شامل ہونے کی آخری تاریخ ۲۵۔اپریل ۱۹۵۹ء ہے۔ جو افسانے ۲۵۔اپریل کے بعد دفتر میں پہنچیں گے، اُن کو مقابلہ میں شامل نہیں کیا جائے گا۔

(۱۴) اس مقابلہ میں اُردو زبان کے صرف وہ افسانہ نگار شریک ہو سکتے ہیں، جو نیشنلٹی کے اعتبار سے ہندوستانی شہری ہیں۔

(۱۵) افسانے مندرجہ ذیل پتہ پر روانہ کیے جائیں۔

ایڈیٹر "ہمدرد صحت" (افسانوی مقابلہ) دہلی ۶

"بھاگو... دوڑو... قیامت آئی!"

سوکھے پتوں پر، درخت سے، پھل جو گرا تو خرگوش سہم گیا۔ "قیامت آرہی ہے!" اس کا دل دھڑکنے لگا۔ "جان بچانی ہے تو یہاں سے بھاگو!"

پاس ہی کھیتوں میں ایک ہرن چہل قدمی کر رہا تھا۔ خرگوش کو اندھا دھند بھاگتے دیکھ کر وہ پکارا "بھائی، کیا مصیبت آپڑی!"

"جانتے نہیں، قیامت آرہی ہے!" خرگوش سانس



سنبھالتے ہوئے بولا "جان بچانی ہے تو میرے پیچھے پیچھے آؤ!"

ہرن اس کے پیچھے دوڑنے لگا اور دیکھتے دیکھتے ان کے ساتھ ایک بھینسا، جنگلی بیل، گینڈا، چیتا، ہاتھی اور شیر بھی آملے۔ یوں سمجھئے کہ جنگل کا جنگل ایک جلوس میں بھاگا جا رہا تھا!

دیوانوں کی طرح وہ کوسوں بھاگتے گئے۔ جب تھکنے لگے تو ہاتھی کو تعجب ہونے لگا کہ قیامت کی اور کوئی نشانی کیوں نظر نہیں آرہی؟ اُس نے چیتے سے پوچھا "بھائی چیتے، تمہیں یقین ہے کہ قیامت آرہی ہے؟"

چیتا رک گیا "ہاں، گینڈے نے تو ایسا ہی کہا تھا۔"

"مجھے کیا پتہ!" گینڈا بولا "مجھے تو جنگلی بیل نے بتایا تھا!"

جنگلی بیل چڑ کر بولا "مجھے الزام نہ دو! جو بھینسے نے کہا وہی میں نے دہرا دیا!"

بھینسے نے ہرن کا نام لیا۔ ہرن منہ ہی منہ میں منمنایا "خرگوش نے اس کہانی کی شروعات کی تھی۔"

ہاتھی نے خرگوش کو آواز دی "اے بھائی خرگوش میاں! تم سے کس نے کہا کہ قیامت آرہی ہے؟"

"مجھ سے کون کہتا!" خرگوش نے گویا جواب کرتے ہوئے کہا "میں تو دھماکہ ہوتے ہی جان گیا تھا! میں نے سوچا کہ یقیناً قیامت آرہی ہے!"

ہاتھی کھلکھلا کر ہنس پڑا "خوب صاحبزادے! تمہاری سوچ کا بھی جواب نہیں!" اس پر سبھی جانوروں کو بے اختیار ہنسی آئی اور وہ ہنستے ہنستے اپنے گھروں کو چل دیئے۔

اس کہانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ایسی باتیں جنکی جانچ پرکھ آسانی سے ہو سکے، ان کے بارے میں بازاری افواہوں پر کان مت دھریئے۔

ڈالڈا ہی کو لیجئے۔ اس کے متعلق حقائق کیا ہیں؟ خالص وناسپتی تیلوں سے، سرکاری ہدایات کے مطابق بنائی ہوئی کھانا پکانے کی یہ چکنائی ہر قسم کا کھانا پکانے کے کام آتی ہے۔

زائد غذائیت کے لئے اس کے ہر اونس میں وٹامن اے کے ۷۰۰ اور وٹامن ڈی کے ۵۶ بین الاقوامی یونٹس ملائے جاتے ہیں۔ لاکھوں عورتیں اپنا کھانا ڈالڈا وناسپتی میں پکاتی ہیں کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ یہ محض کھانا پکانے کا ذریعہ ہی نہیں — غذا بھی ہے!

(ہندوستان لیور لمیٹڈ، بمبئی)

DL. 470-X 52 UD

قدرِ جوہر

یوں تو آج کل کا ہر شمارہ اپنے پیشرو سے بڑھا چڑھا ہوتا آیا ہے، لیکن اس کا 'ابوالکلام شمارہ' اوروں سے بمراتب بہتر و برتر ہے اور مرحوم و مغفور مولانا آزاد کی بزرگ اور بلند شخصیت کے ہر لحاظ سے شایانِ شان ہے۔ یہ یادگار شمارہ نظم و نثر کا ایک ایسا قابلِ قدر مجموعہ ہے، جس کی تعریف و توصیف کا پورا پورا حق ادا کرنا بہت مشکل ہے۔ (عبادت رضیفی)

رسالہ آج کل علمی، لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔ (فراق گورکھپوری)

آج کل کا موسیقی نمبر دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی اس فن پر خصوصی نمبر نکالنا آسان بات نہ تھی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو جمع و ترتیب مضامین میں کن کن صبر آزما منزلوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ آپ کے ذوق و انتخاب دونوں کی داد دیتا ہوں۔ (نیاز فتحپوری)

آج کل اردو کے بہترین رسائل میں سے ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ آپ ہمیشہ اسے خوب سے خوب تر بنانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اس کے خاص نمبر عموماً اچھے ہوتے ہیں اور بعض تو بہت اچھے۔ (قاضی عبدالودود)

آج کل کا خاص نمبر ایک سے ایک بڑھ کر ہوتا ہے اور اس اعتبار سے اس ماہنامے نے ہند و پاک کے ادبی رسائل میں جو بلند مقام حاصل کر لیا ہے وہ ہماری حکومت اور اس ملک کی روایات کے بالکل شایانِ شان ہے۔ (سعید احمد اکبرآبادی)

آج کل اردو کے ان چند مقبول رسالوں میں سے ہے جو ہر ادبی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس کے عام نمبروں میں علاوہ معلومات عامہ پر مفید مضامین کے ادبی تنقیدیں او زندگی سے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں اور اس میں بلند پایہ نظموں اور پُر کیف غزلوں کا بھی ایک گلدستہ ہوتا ہے۔ (آلِ احمد سرور)

میں آج کل کو ہمیشہ بہت دل چسپی سے پڑھتا ہوں۔ اس میں اکثر قابلِ قدر مضامین اور نظمیں شائع ہوتی ہیں۔ علاوہ معنوی خوبیوں کے یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بحیثیت مجموعی اس کی لکھائی اور چھپائی وغیرہ بھی خوش مذاقی کا ثبوت دیتی ہیں۔ ہمارے بہت سے رسالے تو اس ظاہری حسن سے بھی عاری ہیں۔ (غلام السیدین)

آج کل کے خاص نمبر اردو ادب میں خاص اہمیت رکھتے ہیں لیکن ابوالکلام نمبر نہ صرف ادبی بلکہ تاریخی حیثیت سے بھی بہت اہم ہے اور ہر حیثیت سے مولانا کے شایانِ شان ہے۔ ان کی ادبی، سیاسی اور نجی زندگی کے بہت سے اہم گوشوں پر اس نمبر سے روشنی پڑتی ہے جو اب سے پہلے منظرِ عام پر نہیں آئے تھے (مکین اکبرآبادی)

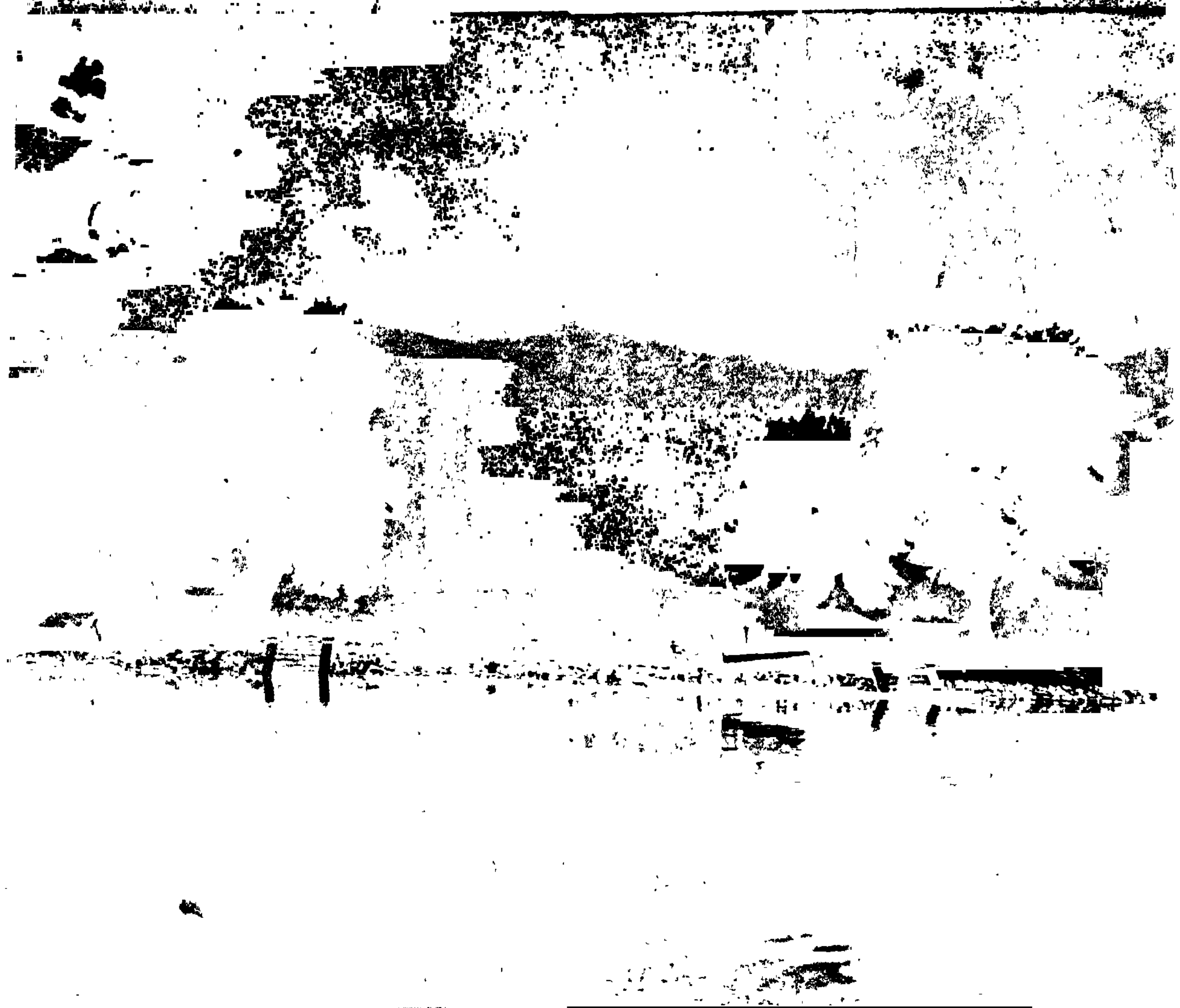
آج کل ان رسالوں میں سے ہے جو ہر طبقے کے پڑھنے والوں کے لئے کچھ نہ کچھ دل چسپی کا سامان ضرور مہیا کرتے ہیں۔ رسالے کی ادبی حیثیت بہت اچھی ہے۔ اس کے مقالے اور نظمیں بیشتر معیاری ہوتی ہیں۔ ظاہری حسن اپنی کاغذ چھپائی اور تصویروں کے اعتبار سے کوئی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ (مسعود حسن رضوی)

فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے	بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکریٹریٹ دہلی	سالانہ چھ روپے

آجکل

اپریل ۱۹۵۹

چیت شک ۱۸۸۱



۵۰ نئے پیسے

ترتیب

سرورق - چار چنار (سری نگر)

اپریل ۱۹۵۹ء
چیتر شک سمت ۱۸۸۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آجکل اردو اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸

اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آجکل
دہلی

سالانہ چندہ:— ہندوستان میں۔ چھ روپے / پاکستان میں۔ چھ روپے (پاک)
غیر ممالک سے:— نو شلنگ یا ایک ڈالر
فی پرچہ:— ہندوستان میں۔ ۵۰ نئے پیسے / پاکستان میں۔ آٹھ آنے (پاک)

جلد ۱۷۔ نمبر ۹

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

مُلاحظات

۲۲ فروری کو ملک بھر میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کی پہلی برسی منائی گئی، جگہ جگہ جلسے ہوئے اور عوام کی طرف سے آزادیٔ ہند کے عظیم معمار کو پرخلوص خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ دلی کے ایک عام جلسے سے خطاب کرتے ہوئے صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے فرمایا کہ مولانا جنگِ آزادی کے کارآزمودہ سپہ سالار تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ نہ صرف موجودہ بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے بھی سرچشمۂ فیض بنے رہیں گے۔

پنڈت نہرو نے آزاد میموریل لیکچرز کی ابتدا کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ مولانا آزاد ثقافتی میل جول اور رواداری کے سب سے بڑے نمائندے تھے اور انھوں نے ہم کو تنگ نظر قوم پرستی کے دائروں سے نکلنے اور اپنا نقطۂ نظر وسیع کرنے میں مدد دی۔

صدرِ جمہوریہ نے پارلیمنٹ کے نئے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے اپنے خطبہ میں ترقیاتی پروگرام کے مندرجہ ذیل نتائج کی وضاحت کی: قومی آمدنی میں قابلِ لحاظ اضافہ، تیز رفتار صنعتی ترقی، روزگار کی فراہمی میں توسیع، آمدنی اور دولت کی نابرابری میں کمی۔ یہ سب باتیں ایک صحت مند پالیسی کی نشان دہی کرتی ہیں۔ صدر نے امید ظاہر کی کہ تیسرے منصوبے کے آخر تک بنیادی صنعتوں، زرعی پیداوار اور دیہی ترقی کی مضبوط بنیاد پڑ جائے گی۔ دوسرے منصوبے کے پہلے تین سال میں جو زبردست کام ہوا ہے یعنی رورکیلا اور بھلائی کے کارخانوں کا قیام، تیل کی دریافت، ایٹمی قوت کے حصول کے لئے ابتدائی اقدامات، بیرونی زرِ مبادلہ کے انتظامات اور زرعی پیداوار میں اضافہ کے واضح امکانات — ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے شاندار مستقبل کی توقع حق بجانب ہے۔

قبرص کے مستقبل کے بارے میں لندن میں یونان، ترکی اور برطانیہ کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوگیا اور اس طرح چار سال کے بعد قبرص کی ہنگامی صورتِ حال ختم ہوگئی۔ اس سمجھوتے کی رو سے آئندہ بارہ مہینوں میں قبرص ایک جمہوریہ بن جائے گا، جس کی آزادی کی بنیاد فرقہ وارانہ توازن پر رکھی گئی ہے۔ وہاں کا صدر ایک یونانی نسل کا قبرصی ہوگا اور نائب صدر ترکی نسل کا۔ قبرص کے دو فوجی اڈوں پر برطانیہ کا قبضہ رہے گا۔

پچھلے دنوں غرب الہند کی کرکٹ ٹیم کے مقابلے میں ہندوستانی ٹیم کو جو شکست ہوئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں کرکٹ کے کھیل کا معیار گر گیا ہے جس کی آوازِ بازگشت پارلیمنٹ کے موجودہ اجلاس میں بھی سنی گئی۔ موسمِ گرما میں جو ہندوستانی ٹیم انگلستان کا دورہ کرے گی اس کے کپتان دتا گائکواڑ منتخب ہوئے ہیں۔ ہمیں امید کرنی چاہئے کہ ان کی سرکردگی میں ہندوستانی ٹیم اپنے کھیل کا معیار بلند کرے گی اور اپنی شاندار روایات کو برقرار رکھے گی۔

اس سال ۲۶ جنوری کو صدرِ جمہوریہ نے جن لوگوں کو اعزازات عطا کئے، ان میں حیدرآباد کے مشہور ادیب اور ماہرِ آثارِ قدیمہ جناب غلام یزدانی بھی شامل ہیں، آپ کو 'پدم بھوشن' کا اعزاز ملا ہے۔ ادارۂ 'آج کل' یزدانی صاحب کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور جناب الیاس برنی کے انتقال سے دنیائے علم و ادب کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم اسلامی فلسفہ کی ایک اہم شخصیت تھے۔ آپ کو ہندوستانی فلسفہ سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ حال ہی میں ان کی جامع کتاب 'فکرِ اقبال' شائع ہوئی ہے۔ آپ اقبال کے رفیقوں میں سے تھے اور اقبال کو صحیح طور پر سمجھنے اور اسے دنیائے ادب میں پیش کرنے والوں میں آپ کا درجہ ممتاز تھا۔ جناب الیاس برنی نہ صرف معلمِ ادب تھے بلکہ انھیں اقتصادیات سے بھی دلچسپی تھی۔ انھوں نے اکبر کی شاعری کا بہت اچھا انتخاب تین جلدوں میں شائع کیا تھا۔

آلِ احمد سرور

قطعہ

(جشنِ جمہوریت کی نذر)

گوشے میں قفس کے جو تھے آرام کے خوگر
اب معرکۂ زیست کا لیتے ہیں مزا بھی

صدیوں سے جو صیدِ زبوں دستِ قضا ہیں
چھو لیتے ہیں خود بڑھ کے وہ دامانِ قضا بھی

زندانیٔ ظلمات کی الٹے رہے پرواز
ٹھوکر میں ہے رحمت کدۂ آبِ بقا بھی

کچھ زخمِ جگر کی بھی ہے یہ لالہ فشانی
لو دیتی ہے کچھ سرخیٔ خونِ شہدا بھی

مستی میں بھی کچھ ہوش کا آیا ہے قرینہ
بدلی نظر آتی ہے گلستاں کی فضا بھی

غنچوں میں بھی کچھ جلوہ نمائی کی ادا ہے
دمساز ہوئی جاتی ہے کچھ بادِ صبا بھی

کہنے میں بھی اک لطف ہے سننے میں بھی اک بات
کس درجہ دل آویز ہے رودادِ وفا بھی

منزل کی کشش جادۂ پُرخم کے مراحل
کیا چیز ہے یہ کشمکشِ بیم و رجا بھی

بے نور ہوئی جاتی ہے کچھ سطوتِ پرویز
کچھ تیشۂ فرہاد پہ آئی ہے جلا بھی

اب حشر پہ موقوف نہیں جنت و دوزخ
اک اک نفسِ گرم، سزا بھی ہے جزا بھی

دونوں میری سنگیت کے آہنگ میں شامل
ناقوسِ برہمن بھی مؤذن کی صدا بھی

مانوس اُجالے بھی ہیں اور تازہ کرن بھی
مشرق کی ادائیں بھی ہیں، مغرب کی ضیا بھی

مستوں کے بہکنے میں بھی اک رمزِ جنوں ہے
کام آتی ہے اس راہ میں کچھ لغزشِ پا بھی

ہاں اور بڑھے اور بڑھے لذتِ تعمیر
ہر نقش میں ہو رنگ پرانا بھی نیا بھی

دونوں رہیں اس بزمِ جہاں تاب کی رونق
سرمایۂ تحقیق بھی، شاعر کی نوا بھی

خواجہ غلام السیدین

مولانا آزاد کا تعلیمی فلسفہ

کشمیر کے لئے سعادت اور مبارک باد کا مقام ہے کہ اُس نے "آزاد سیمینار" کے انعقاد میں پہل کی اور میں شکر گذار ہوں کہ آپ نے اس موقع پر مجھے بُلا کر میری عزت افزائی کی۔ مولانا آزاد کی یاد کی پُکار اور عقیدت کے جوش میں جو کشش ہے اس کے پیشِ نظر مجھے یہاں حاضر ہونا ہی تھا۔ جو زندگی میں نے اختیار کی ہے اس میں لکھنے اور بولنے کی ذمہ داریوں سے تو کیسے بچ سکتا ہوں لیکن شاید ہی کسی مضمون پر قلم اٹھاتے، اپنی کوتاہ قلمی کا، اور ذہنی اور نظر کی تنگ دامنی کا، اس درجہ شدید احساس ہوا ہو۔ انکار نہیں کر سکتا تھا اقرار کیوں کر کروں کہ بغیر کافی وقت اور تیاری اور قابلیت کے اس شاداب موضوع کے ساتھ انصاف کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے آج صرف اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ اُن کے فکر و نظر کے سمندر میں سے چند سنگ ریزے جو ساحل ہی سے نظر آتے ہیں آپ کے سامنے پیش کر دوں اور اُمید رکھوں کہ شاید زندگی کبھی اتنی مُہلت اور توفیق دے کہ گوہر شناسوں کے سامنے اس کے بے بہا موتیوں کی نمائش بھی کر سکوں۔ اس لئے آج کی تقریر دراصل اُن کے تعلیمی فلسفہ کی تفسیر نہیں بلکہ اُن کے تعلیمی خیالات پر ایک مختصر سا تبصرہ ہے۔

مُعلّم اور ماہرِ تعلیم کا لفظ دو معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک تو وہ لوگ جو تعلیم کے اصولوں اور نظریوں کا باقاعدہ مطالعہ کرتے ہیں اور اسکولوں اور کالجوں میں اس کا عملی تجربہ حاصل کرتے ہیں۔ ان کو تعلیم کا فنی ماہر سمجھا جا سکتا ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جن کو قدرت نے ایک خلاق فکر دیا ہے۔ جو فلسفہ، مذہب، سیاست میں گہری نظر رکھتے ہیں جو جانتے ہیں کہ دُنیا میں انسان کا کیا مقام ہے اور جن کی اُنگلیاں انسان کی زندگی اور اس کے امکانات کی نبض پر رہتی ہیں۔ یہ لوگ زندگی کو نئی قدروں اور نئی سمتوں سے روشناس کرتے ہیں اور تعلیم کو اُن کے حصول کا ایک ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ اُن کے ذہن میں زندگی کی ایک حسین، واضح تصویر ہوتی ہے، ماضی کی بنیادوں پر قائم، حال کے تقاضوں سے آشنا، اور مستقبل کی طرف نگران، جس میں اُن کا تخیل دلکش رنگ بھرتا ہے اور کبھی کبھی اُن کو یہ سعادت بھی نصیب ہوتی ہے کہ وہ اسے عمل میں لانے کے لئے جد و جہد کریں؛

مردِ حُر سے نہیں پوشیدہ ضمیرِ تقدیر ۔۔۔ خواب میں دیکھتا ہے عالمِ نَو کی تصویر
اور جب بانگِ اذاں کرتی ہے بیدار اسے ۔۔۔ کرتا ہے خواب میں دیکھی ہوئی دُنیا تعمیر

مولانا آزاد کا شمار انھیں صاحب عزم معلّموں میں ہے۔ اُن کی ساری زندگی شاید ۱۳-۱۴ سال کی عمر ہی سے اسی تعلیمی جد و جہد میں یعنی دلوں اور دماغوں کے بنانے میں گذری۔ اس خواب کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لئے انھوں نے کیا کچھ نہیں دیا؟ اپنے علم و فضل کی گہرائی، اپنا مذہبی اور فلسفیانہ نظر، اپنی سیرت کی بلندی اور وقار، اپنی سیاسی سُوجھ بُوجھ، اپنی حق پرستی اور انصاف پرستی، اپنی خدمت اور ایثار، اپنی انسان دوستی، اپنی خرد کی تمکین اور اپنے عشق کا حوصلہ۔ اور اس تمام ساز و سامان کے ساتھ اور فقر کا علم ہاتھ میں لئے انھوں نے اپنی زندگی کا شاندار جہاد شروع کیا جس کا ایک ہی مقصد تھا۔ اور وہ تھا بہتر افراد کی تربیت جن کی ذات میں بلند نظری، جرأت، رواداری اور دیانت داری کے چراغ روشن ہوں۔ اور ان کے ذریعہ اور ان کی خاطر ایک بہتر سماج کی تشکیل جس میں انصاف، محبّت، فراخ دلی اور حقوق پسندی کی کارفرمائی ہو۔ اس لئے انھوں نے اپنی تقریروں میں بار ہا کہا کہ ہماری پنچ سالہ یوجنا کا مرکزی مقصد مادّی وسائل اور ذرائع کی توسیع اور ان کا بہتر استعمال نہیں بلکہ ایک نیا ذہن اور نئی سیرت پیدا کرنا ہے۔ اور اس کے لئے صنعت و حرفت، تجارت اور زراعت، بجلی اور پانی سے بھی زیادہ ضروری صحیح تعلیم کا رواج ہے۔

اس نے صحیح تعلیم کے خدوخال کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس امر کا جائزہ لینا ہوگا کہ مولانا کے خیال میں انسان کا کیا تصور ہے اور اس کے آئینے میں انسانی تقدیر کی کیا تصویر نظر آتی ہے۔ یوں تو ان کی تمام تحریروں اور تقریروں میں یہ بحث بکھری ہوئی ہے لیکن انھوں نے اس کا ایک جامع اور مختصر نقشہ اس یونیسکو سمپوزیم کے سامنے پیش کیا تھا جس کا موضوع تھا "مشرق و مغرب میں انسان کا تصور اور اس کا تعلیمی فلسفہ"۔ وہ کسی گہری نظریے تو نہیں مان سکتے تھے کہ مشرق و مغرب کے فلسفے میں کوئی بنیادی فرق اور فصل ہے یا ایک کو دوسرے پر کوئی مطلق افضلیت حاصل ہے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ دونوں کے فکری اور جذباتی رجحانات میں بعض اعتبار سے اہم فرق ہے۔ جس کا تعلق انسانی فطرت کی اس تفسیر اور تعبیر سے ہے جو دونوں کے مفکروں نے کی ہے۔ گزشتہ چند ہزار برس میں انسان نے اپنی کوشش اور جستجو سے فطرت کے چہرے پر سے ہزاروں پردوں کو اٹھایا ہے لیکن اسے ابھی تک خود اپنی فطرت کے خدوخال اور اس کی گہرائیوں اور پیچیدگیوں کو سمجھنے میں اتنی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نے جو آئینہ بنایا ہے اس میں اسے سبھی کچھ دکھائی دیتا ہے سوائے اپنی فطرت کی سچی اور واضح تصویر کے یعنی

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا!
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا!

لیکن اس کی خودشناسی کی یہ کوشش برابر جاری رہی ہے۔ مختلف فلسفوں نے انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ چینی فلسفے نے انسانوں کے باہمی رشتوں کو سمجھنے پر زور دیا۔ یونانی فلسفے نے جو مغربی فلسفے کا سرچشمہ ہے عالم خارجی میں انسان کا مقام اور مرتبہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ہندوستانی فلسفے نے اپنی توجہ کا مرکز انسان کے داخلی اور باطنی تجربے کو بنایا۔ ظاہر ہے کہ یہ تینوں پہلو ایک دوسرے سے جدا نہیں بلکہ ایک ہی وحدت کے مظاہر ہیں لیکن ان کی اضافی اہمیت کا شعور ہر قوم اور عہد کے فکری رجحان پر روشنی ڈالتا ہے۔ مغرب نے نظر اٹھا کر اپنے خارجی ماحول کو دیکھا مشرق نے نظر جھکا کر اپنے من میں نگاہ ڈالی۔ مغرب نے سائنس کے علمی مزاج کی مدد کی اور اس کی بے اندازہ قوت پر ایمان لایا۔ اس کے ثمرۂ فکر ڈارون، فرائڈ اور مارکس قرار پائے۔ ڈارون نے ارتقاء کے تصور کو اپنے فکر کی بنیاد قرار دیا۔ فرائڈ نے بتایا کہ انسانی ذہنیت ابھی تک ان پوشیدہ اور غیر شعوری جبلتوں کی تابع ہے جو اس کے ابتدائی حیوانی آغاز میں اس کی زندگی پر حاوی تھیں۔ مارکس کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان اور اس کی تہذیب تمام تر اپنے مادی ماحول اور تاریخی اور اقتصادی تحریکوں کی پیداوار ہے۔

لیکن باوجود اس مادیت پرستی کے اور باوجود فطری طور پر جبر کا قائل ہونے کے مغرب نے عملاً تقدیر پرستی کا شیوہ اختیار نہیں کیا بلکہ سائنس کو خضرِ راہ بنا کر سماج کی تعمیرِ نو کے لئے ایک شاندار جد و جہد کی۔ یہی چیز دورِ حاضر میں مغرب کے فکر کا امتیازی نشان ہے جس میں ہمارے لئے بھی عبرت اور ہدایت ہے۔

مشرق کی کہانی اس سے مختلف ہے۔ اس نے دنیا کو تصوف اور ویدانت کی نظر سے دیکھا اور اسے اس میں انسان کی روحانیت اور باطنی حقیقت کا جلوہ نظر آیا۔ صوفی انسان کو اس بحرِ ناپیدا کنار کی ایک موج، اس مہرِ جہاں تاب کی ایک کرن سمجھتا ہے جس میں اصل ذاتِ الٰہی ہے۔ وہ خود کو خدا سے جدا محض اس لئے سمجھتا ہے کہ اس کی آنکھوں پر جہالت کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ وہ محض ایک حیوان نہیں جس نے ارتقاء کی بہت سی منزلیں طے کی ہوں بلکہ اس میں ذاتِ خداوندی کا پرتو ہے یعنی اس جرمِ صغیر میں ساری کائنات سمائی ہوئی ہے۔ اس طرح مشرق کے فکر نے انسان کا رشتہ خدا سے جوڑا اور اسے اس بلند مقام پر پہنچا دیا جہاں وہ خدا کا نائب اور افضل مخلوقات بن جاتا ہے۔ لہٰذا مشرقی تصور کے مطابق تعلیم کا اعلیٰ ترین مقصد یہ قرار پاتا ہے کہ وہ انسان کی بنیادی لیکن سوئی ہوئی روحانیت کو تلاش اور بیدار کرے اور اسے اس کی زندگی میں قوتِ محرکہ بنا دے۔

لیکن مشرق نے بھی اس مقام پر ٹھوکر کھائی۔ اس نے انسان کے بلند مقام کو تو پہچانا لیکن اس کے ذہن کو تقدیر پرستی کے بندھنوں سے آزاد نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے مدتوں تک اس کی مادی اور سماجی ترقی مسدود ہو کر رہ گئی۔ جب انسان ذاتِ الٰہی کا ایک جزو ہے تو وہ جو کچھ کرتا ہے یا نہیں کرتا سب امرِ الٰہی سے ہے۔ ذرا غافل ہو کر اس خیال سے ایک قدم آگے بڑھائیے تو انسان تقدیر کے ہاتھ میں ایک بے بس کھلونا معلوم ہوتا ہے۔ جب کسی سماج کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ انسانی دکھ درد اور محرومیوں کی جو تصویریں چاروں طرف نظر آتی ہیں وہ مایا کا کھیل ہیں تو افراد میں ان کی طرف سے بے حسی اور بے بسی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی ذہنیت گذشتہ دو سو برس میں مشرق کے ملکوں میں رائج ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس وقت ایک عجیب بات یہ ہے کہ مغرب باوجود مادیت اور جبر کے قائل ہونے کے سائنس، صنعت، حرفت اور سماجی ترقی میں پیش پیش ہے اور مشرق باوجود انسان کی روحانی عظمت کا قائل ہونے کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی پس ماندگی کا شکار ہے!

مولانا کے تعلیمی فلسفے کا بنیادی خیال یہ ہے کہ مشرق اور مغرب کے نظریے

میں میل پیدا کیا جائے تاکہ انسان سائنس کا صحیح استعمال کرنا سیکھے اور اس کے ذریعہ ان مقصدوں کو حاصل کرسکے جو اس کی فطرت کے بہترین تقاضوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ سائنس تو ایک طاقت ہے جو بذاتِ خود غیر جانب دار ہے۔ اس کے انکشافات کو تعمیر اور تخریب دونوں کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ انسان کون سا راستہ اختیار کرتا ہے زندگی کا یا موت کا، انصاف اور رحم کا یا ظلم اور خودغرضی کا، یہ اس کی ذہنیت اور نیک و بد کے تصوّر پر منحصر ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ تعلیم کے ذریعہ اس کے اندازِ فکر و نظر اور اس کے معیارِ خوب و زشت کو بدلا جائے۔ یعنی سوال ہر آرزو کے پورا ہونے کا نہیں بلکہ آرزو کے صالح ہونے کا ہے۔

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری — مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے!

مولانا کا کہنا ہے کہ اگر انسان محض ایک "ترقی یافتہ حیوان" ہے تو وہ سائنس کے ذریعہ صرف انھیں اغراض و مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گا جن کی بنیاد اس کے حیوانی جذبات اور جبلّتوں پر رکھی گئی ہے۔ برخلاف اس کے اگر وہ ذاتِ الٰہی کا ایک پرتو ہے تو سائنس کو بھی مشیّتِ الٰہی کی تکمیل کا وسیلہ بنائے گا یعنی کاوش کرے گا کہ کس طرح اس کی مدد سے دنیا میں امن اور سلامتی اور انسان دوستی کی کارفرمائی قائم ہوسکتی ہے۔ اس لئے ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ مشرق اور مغرب کے تعلیمی فلسفوں کو ایک وسیع تر تمدن میں جذب کرکے ایک ایسے متوازن اور مکمل نظامِ تعلیم کی بنیاد ڈالی جائے جو فرد اور سماج کے مطالبات میں ہم آہنگی پیدا کرسکے۔ اگر افراد کی شخصیت میں وحدت، ہم آہنگی اور یک جہتی نہ ہوگی تو اس کا اثر سوسائٹی پر پڑے گا اور سماج میں باہمی اختلافات پرورش پاتے رہیں گے۔ تعلیم کا اصل کام یہ ہے کہ وہ ایک صالح اور مربوط سوسائٹی کے لئے ایسے افراد کی تربیت کرے جن کی شخصیت ہم آہنگ اور مربوط ہو، ایسی مربوط جیسی خود مولانا کی اپنی شخصیت تھی۔

باوجود اس امر کے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ان کو مذہب میں گہری نظر تھی وہ ایک صالح دیانتدارانہ اور بیدار زندگی کی بنیاد مادی خوش حالی کی سرزمین میں رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن اس خوش حالی کو وہ کسی خاص جماعت یا گروہ کی میراث نہیں بلکہ سب لوگوں کا حق مانتے تھے۔ اس لئے ان کے تعلیمی تصوّر میں مذہب، سائنس، ادب، فلسفہ، ٹکنولوجی سب کے لئے جگہ تھی۔ یہ وسعتِ نظر، یہ ہمہ گیری، کثرت میں وحدت کی یہ پہچان اور وحدت میں کثرت کی اہمیت کا یہ احساس ان کے فکر کے ہر گوشے میں پایا جاتا ہے۔ ان کی نظر میں ادب، آرٹ، سائنس، فلسفہ کی اس دنیا کی ایک امتیازی اور حسین خصوصیت یہ ہے کہ وہ جنگ و جدل کی دنیا نہیں صلح اور میل جول کی دنیا ہے۔

ان کے ذہن میں صرف فراخی ہی نہیں بلکہ انصاف پسندی بھی کمال کی تھی۔ وہ ہر معاملے کے دونوں پہلوؤں بلکہ سب پہلوؤں کو بالکل غیر جانبداری کے ساتھ دیکھتے تھے۔ لیکن غور کرنے کے بعد ان کا فیصلہ بالکل محکم اور دوٹوک ہوتا تھا۔ مثلاً سرسید کے شاندار علمی، تعلیمی اور مذہبی کارناموں کا انھیں اعتراف تھا لیکن ان کی سیاست کے بعض پہلوؤں سے اور تعلیمی نظریوں سے اختلاف تھا اور اعتراف و اختلاف دونوں کا اظہار انھوں نے معقولیت اور اعتدال کے ساتھ کیا۔ مغربی تعلیم کے جواز کا مسئلہ مدتوں ہندوستانیوں میں زیرِ بحث رہا۔ ابتدا میں مذہبی خیال کے لوگوں نے اس کی شدید مخالفت کی اور حال میں آزادی حاصل کرنے کے بعد بعض لوگوں نے قومیت کے اندھے جوش میں اس کو بالکل رد کرنا چاہا۔ لیکن ہر موقع پر مولانا نے اس معاملے میں ایک متوازن رویّہ رکھا جو تعصب اور تنگ نظری سے پاک تھا۔ ان کے نزدیک اس وقت انگریزوں کی اندھی نقالی بھی اتنی ہی قابلِ اعتراض تھی جتنی آج مغربی علوم اور زبانوں کو خارج کرنے کی کوشش۔ انھیں احساس تھا کہ اس تعلیم کی بدولت ہماری قومی اسپرٹ کا احیاء ہوا ہے اور جدید علمی اور سائنٹیفک ذہنیت کی بنیاد پڑی ہے لیکن ساتھ ہی اس کی وجہ سے ہمارے سماج میں عوام و خواص کا فصل پیدا ہوا اور بڑی حد تک ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اپنی قومی میراث سے بے تعلق ہوگیا۔ اس میں نہ ایک قومی ذہن پیدا ہوسکا نہ قومی ایکتا۔ اس لئے انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہماری تعلیم کی روح مشرقی اور ہندوستانی ہونی چاہیئے تاکہ لوگ اپنی تہذیب کی قدروں کو پہچانیں اور اس کے سرچشموں سے فیض حاصل کریں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ جانتے تھے کہ مغرب سے سبق لے کر ایک سائنٹیفک ذہن پیدا کرنے کی ضرورت ہے جس کے بغیر عصرِ حاضر کے تقاضے پورے نہیں ہوسکتے اور زندگی میں فراوانی نہیں آسکتی۔ اسی وجہ سے گو مولانا نے خود خالص مشرقی تعلیم پائی تھی انھوں نے انگریزی کی تعلیم پر بعض مغربی تعلیم یافتوں سے زیادہ زور دیا۔ وہ مانتے تھے کہ یہ نہ صرف مغربی علوم اور سائنس کے لئے بلکہ بین الاقوامی تعلقات کے لئے بھی ایک کنجی کا کام دیتی ہے۔ انھوں نے ایک موقع پر لکھا تھا کہ ہم اپنی مادی دولت اور ساز و سامان کو جغرافی حد بندیوں میں قید کرسکتے ہیں لیکن علم اور تہذیب کی دولت پر مُہر نہیں لگا سکتے۔ وہ تو تمام انسانوں کی میراث ہیں۔ تہذیب کے میدان میں تنگ نظری سے بڑھ کر کوئی جُرم نہیں اور قوموں کی ترقی میں بھی

سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ آزادی کے اس دور میں جو ابھی شروع ہوا ہے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس مرض سے (طاعون کی طرح) پناہ مانگیں۔ یہ بیماری فکر و عمل کے ہر گوشے میں مختلف بھیس بدل کر نمودار ہوتی ہے۔ مذہب کے میدان میں اندھی مذہبیت کی شکل اختیار کرتی ہے اور عقیدے کے نام پر ہمیں دھوکا دیتی ہے۔ سیاست کے میدان میں قومیت کا ڈھونگ رچا کر ہمارے ذہن پر چھاپا مارتی ہے۔ علم و فن کے میدان میں قوم اور ملک کا واسطہ دے کر ہمیں گمراہ کرنا چاہتی ہے۔ لیکن ہمارا فرض ہے کہ ان دل کش ناموں کا فریب نہ کھائیں کیونکہ ان سب چیزوں کی جڑ تنگ نظری ہے۔ ... ٹیگور شانتی نکیتن میں ہر جلسے کے آغاز میں ایک جملہ دہرایا کرتے تھے "یہ وہ مقام ہے جہاں تمام دنیا ایک گھر بن گئی ہے۔" مولانا کا خیال تھا کہ اس انسانی وحدت پر خلوص کے ساتھ ایمان لانا اور دل اور دماغ کی کھڑکیوں کو کھلا رکھنا ہماری تہذیب کی مخصوص جبلّت میں شامل ہے۔ اور تعلیم کا مقدس فرض ہے کہ وہ اس روایت کو قائم رکھے اور مضبوط کرے۔

دوسرے مذہبی خیال کے لوگوں کی طرح مولانا کا عقیدہ بھی یہ تھا کہ ہر گہری تبدیلی خواہ وہ افراد میں ہو یا جماعتوں میں، اندر سے شروع ہوتی ہے۔ وہ افراد کی سیرت میں انقلاب چاہتی ہے اور خدا اُس وقت تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اندر سے اپنی ذہنی اور جذباتی کیفیت میں تبدیلی نہ کرے۔ اوّل تو کوئی دیرپا انقلاب محض بیرونی دباؤ یا جبر سے وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ اور اگر کسی طرح ایسا ہو بھی جائے تو اس کی جڑیں مستحکم نہیں ہوتیں اور اس کی رگوں میں صالح خون نہیں دوڑتا۔ بہت عرصہ ہوا قومی احتساب نفس کے موڈ میں انھوں نے بہت قوت کے ساتھ اس خیال کا اظہار کیا تھا۔ "مسلمان اگر آزادی کے لئے آسمان کے تارے بھی توڑ لائیں اور ان کے ایک جانب سونے کا ڈھیر ہو اور دوسری جانب فوج کی قطاریں کھڑی ہو جائیں پھر بھی وہ کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک وہ خود اپنے اندر ایک مضبوط اور سچی تبدیلی نہ کریں اور ان تمام گناہوں اور جرموں کے ارتکاب سے باز نہ آئیں جن کی وجہ سے یہ تمام مصیبتیں ان کو گھیرے ہوئے ہیں۔"

اسی وجہ سے ان کا عقیدہ تھا کہ ہر میدان میں کامیابی کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ ایک صالح سیرت کی تعمیر کی جائے اور یہ صرف تعلیم کے ذریعے ممکن ہے بشرطیکہ ہمارا تعلیم کا تصور تخلیقی ہو میکانیکی نہ ہو۔ ہمارا ماحول کوئی بنا بنایا سانچا نہیں جس میں کسی نہ کسی طرح فرد کو ٹھیک بٹھانا ہے۔ یہ انسان کی شان کے خلاف ہے کہ وہ اس بنی ہوئی دنیا کو جو ظلم اور جبر سے بھری ہوئی ہے چپ چاپ اور بھولے انداز میں قبول کرلے۔ اس کی حیثیت ایک

خلاق کارکن کی ہے جو مشیت الہی کی تکمیل میں مشیت کا شریک کار بن سکتا ہے۔ مولانا کا ایک محبوب شعر ہے جس کو انھوں نے اپنی تحریر اور تقریر میں بار بار استعمال کیا ہے اور جو ان کے فلسفۂ زندگی پر واضح روشنی ڈالتا ہے ؎

طبعے بہم رساں کہ بسازی بہ عالمے
یا ہمتے کہ از سرِ عالم تواں گذشت

زندگی کے دو ہی راستے ہیں جن میں سے انسان ایک کو اختیار کر سکتا ہے۔ یا تو وہ اپنی طبیعت ایسی بنا لے کہ زمانے کی ہوا کے ساتھ چلے اور پانی کے ساتھ بہے۔ دنیا سازی میں کمال حاصل کرے اور جوں جوں دنیا بدلتی جائے خود کو بے چوں و چرا اس کے مطابق ڈھالے یا اپنے اندر ایسی ہمت اور حوصلہ پیدا کرے کہ دنیا کی تمام تحریصوں کو ٹھکرا کر ان سے بلند ہو جائے۔ اس کی خودداری باطل کے ساتھ معاملہ نہ کرے بلکہ حق کی خاطر سارے عالم کا مقابلہ کرنے کو تیار رہے۔ مولانا کے نزدیک سیدھا اور سچا راستہ یہی ہے۔ اس بارے میں ان کا اور اقبال کا ایک ہی مسلک ہے۔ اقبال نے اس کو دبانی شعروں میں بہت سے حسین اندازوں میں پیش کیا ہے ؎

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

کافر اور مومن کا فرق بھی یہی ہے کہ کافر ہمیشہ زمانے کے سانچے میں ڈھلتا ہے اور مومن زمانے کو اپنے سانچے میں ڈھالتا ہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

مولانا نے اپنی ایک تقریر میں اپنے ہم وطنوں کو اس نئے زمانے کی بشارت دی تھی جو آنے والا ہے اور بتایا تھا کہ اس کے لئے دل و دماغ کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کی ضرورت ہوگی۔ "ہندوستان ماضی کی سرحد سے نکل چکا ہے اور مستقبل کے دروازے پر دستک پڑ چکی ہے۔ یہ تغیر کا موسم ہے، تخم کا موسم ہے، تخم ریزی کی فصل ہے۔ خود ہم اس کی کارفرمائیاں محسوس نہیں کر رہے لیکن مستقبل کا مؤرخ انھیں محسوس کرے گا وہ ہمارے عہد کے ایک ایک حادثے کا سراغ لگائے گا اور انھیں میں نئے عہد کی ساری بنیادیں دیکھتی جا رہے گا۔ اس وقت جو نقشے بھی ہم بنائیں گے جو چال ڈھال بھی اختیار کریں گے، جیسی کچھ صدائیں ہماری زبان سے نکلیں گی انھیں سے ہماری ذہنیت کا سانچہ بنے گا اور اس سانچے میں ہمارا مستقبل ڈھلے گا۔ پس ضروری ہے کہ ہم اپنے دل و دماغ کی نگرانی کریں۔ ہمیں جو روش بھی اختیار کرنی ہے قصد و عزم کے ساتھ

اختیار کرنی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ہمیں زمین پر چلنا ہے ہواؤں میں اڑنا نہیں۔"

جس شخص کے سامنے تعلیم کا یہ تصور ہو اور وہ زندگی میں نظری حیثیت سے اسے اس قدر بلند مقام دے اس کے لئے لازم تھا کہ وہ قوم کو اس کی عملی اہمیت سے بھی روشناس کرے اور قومی تعلیم کے نقشے میں اس کے لئے مناسب جگہ نکالے چنانچہ انھوں نے برسوں تک اس خیال کو مقبول بنانے اور پرانے ذہنی سانچوں کو توڑنے کی کوشش کی لیکن اس میں انھیں مختلف وجوہ سے پوری کامیابی نہیں ہوئی ۔ اپنے انتقال سے کچھ روز پیشتر انھوں نے سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کے آخری جلسے میں اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا اور مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی اس امام ضبط کو اس قدر جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں کسی چیز کی وکالت کرتے سنا ہو۔ وہ جانتے تھے کہ ایک متوازن نظام تعلیم کے بغیر قوم کی اصلاح کی کوشش ریت پر عمارت بنانا ہے ۔ انھیں یہ بھی اندازہ تھا کہ اس نظام تعلیم کا کیا نقشہ ہونا چاہیئے تاکہ وہ پوری قومی زندگی کے بوجھ کو سنبھال سکے ۔ اس میں انھوں نے پانچ بنیادی عناصر کو جگہ دی تھی ۔ ۶ سے ۱۴ برس تک کے بچوں کے لئے لازمی تعلیم، جمہوریت کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے ناخواندہ بالغوں کے لئے سماجی تعلیم، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی توسیع کے ساتھ ساتھ ان کے معیار کو بلند کرنا، ملک کی ضرورتوں کے شایان شان ٹکنیکل اور سائنٹیفک تعلیم کا اہتمام اور قومی تہذیب کو مالا مال کرنے کے لئے آرٹ اور فنون لطیفہ کی ترویج۔ یہ بھی ان کی قیادت کا ہی نتیجہ تھا کہ آزادی کے بعد پہلی مرتبہ آرٹ اور کلچر کو وزارت معارف کا جزو بنایا گیا ورنہ انگریزی حکومت کے دور میں اس کا تعلق محض اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم سے ہی رہا تھا۔

بہر حال گذشتہ دس سال میں باوجود ہر قسم کی مشکلوں کے ان کے عہد وزارت میں تعلیم نے جو ترقی کی اس کا اعتراف ہر غیر جانب دار نقاد اور مبصر کرے گا۔ اس بے رنگ انداز میں جو ان کے فکر اور فیصلوں کا خاصہ تھا انھوں نے ایڈوائزری بورڈ کے اس آخری جلسے میں موجودہ تعلیمی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر ہم ان مشکلوں پر غور کریں جن سے ہم گزر رہے ہیں اور دیکھیں کہ ہمارے لئے کیا کرنا ممکن تھا تو ہمیں معذرت کی ضرورت نہیں اور ہم سر اونچا کرکے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اپنا فرض ادا کیا ۔ لیکن بہ حیثیت ایک امیر کارواں کے، جس کی نظر میں صرف ماضی ہی نہیں بلکہ مستقبل بھی تھا، جس کو صرف پیچھے کا طے کیا ہوا راستہ ہی نہیں بلکہ منزل مقصود بھی نظر آتی تھی، انھوں نے صاف گوئی سے اعتراف کیا کہ ہمیں جو کچھ کرنا ہے اس کے مقابلے میں ہم بہت کم کر سکے ہیں ۔ اور منزل تک پہنچنے کے لئے بہت زیادہ مادی اور انسانی وسائل اور بہت زیادہ محنت کی ضرورت ہے تاکہ ہم ممکن اور مطلوب کے بیچ میں ایک پل بنا سکیں ۔ یہی ان کی وصیت ہے اور یہی ان کی یاد کا چیلنج!

مولانا نے جس خوبصورتی کے ساتھ اپنی فکر کا نقش تعلیم و تربیت کے ہر پہلو پر ثبت کیا اس کا اندازہ محض تعلیمی رپورٹوں اور اعداد و شمار دیکھ کر نہیں ہوتا بلکہ یہ سوچ کر ہوتا ہے کہ اس نازک دور میں وقت کے اس سخت موڑ پر ان کی رہنمائی کی دولت نصیب نہ ہوئی ہوتی تو ہماری تعلیم اور کلچر کا تصور کس قدر مسخ اور مختلف ہوتا۔ چند چیزوں کی طرف اشارہ کرنا کافی ہے ۔ انھوں نے بالغوں کی تعلیم کے تصور میں وسعت پیدا کی اور اس میں رنگ بھرا۔ مشرقی علوم اور ادب میں ریسرچ کو فروغ دیا ۔ فنون لطیفہ کی ترقی اور ترویج کے لئے اکادمیاں قائم کیں ۔ ہندی میں سائنس کی اصطلاحیں بنانے کا کام بڑے پیمانے پر شروع کیا ۔ ذریعۂ تعلیم کے نازک مسئلے اور ہندی اور غیر ہندی زبانوں کے جھگڑے کو جس میں عقل کی جگہ جذبات نے لے لی ہے بڑی دانشمندی سے سنبھالا اور لوگوں کو افراط و تفریط کے خطروں سے آگاہ کیا ۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن قائم کرکے نہ صرف اعلیٰ تعلیم کو زیادہ وسائل بخشے بلکہ یونیورسٹیوں کی آزادی کا تحفظ کیا ۔ عورتوں کی تعلیم کو مردوں کی تعلیم سے زیادہ اہم ٹھہرایا کیونکہ اس کے ذریعے قوم میں نئی زندگی اور نیا شعور پیدا ہو سکتا ہے ۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبا کو جو ایک افسردگی اور پریشانی کے دور سے گزر رہے تھے ہمت، خودداری، خدمت اور امید کا پیغام دیا اور بتایا کہ ایک غیر مذہبی جمہوری ریاست میں ہر شہری کے لئے سارے راستے کھلے ہیں، کوئی دروازہ بند نہیں بشرطیکہ دیکھنے کے لئے آنکھیں، سننے کے لئے کان اور انصاف کرنے کے لئے دل ہو ۔ آزادی سب کے لئے کھلے دروازوں کا پیغام لے کر آئی ہے بشرطیکہ ہم اسے سمجھیں اور اس کے پیغام کو پہچانیں ۔

تفاوت است میانِ شنیدنِ من و تو
تو بستنِ در و من فتحِ باب می شنوم

مذہبی تعلیم کا مسئلہ برسوں سے بحث کا موضوع بنا ہوا ہے ۔ مولانا کے دل اور دماغ کے ہر گوشے میں اس کی اہمیت کا احساس پیوست تھا ۔ لیکن ملک کے حالات اور مصلحتوں کو دیکھ کر انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ سرکاری طور پر درسگاہوں میں مذہبی تعلیم کو رائج کرنا مناسب نہ ہوگا ۔ مگر ان سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا کہ مذہب کی سچی روح کو نہ صرف تعلیم بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں رائج ہونا چاہیئے اور اس کے ذریعے لوگوں میں رواداری، وسیع مشربی اور گہری انسانی ہمدردی پیدا کرنی چاہیئے ۔ جب

وشو بھارتی یونیورسٹی کا ایکٹ تیار ہو رہا تھا تو قانونی رائے کے مطابق اس میں خدا کا نام شامل نہیں کیا گیا تھا۔ اس موقع پر انھوں نے کہا تھا کہ خواہ قانون کی موشگافیوں کی وجہ سے ایکٹ میں خدا کا نام نہ ہو لیکن ٹیگور کی اس یونیورسٹی میں خدا کا تصور اور مذہب کی روح ہر جگہ جاری و ساری رہے گی اور "شانتم، شیوم، ادویتم" کے لفظوں میں ذاتِ الٰہی کا جو تصور ہے وہ نسل، رنگ، مذہب اور وقت کی حد بندیوں سے بلند اور آزاد ہے۔ انسان کی عظمت اور سب انسانوں کی قرابت کا یہ عقیدہ گاندھی جی کی تعلیم میں بھی پایا جاتا ہے اور چونکہ ان کی بنیادی قدروں میں بہت بڑا حصہ مشترک ہے اس وجہ سے ان دو مردانِ خدا میں جن میں سے ایک ہندو مذہب کا اور دوسرا مذہبِ اسلام کا مثالی نمونہ تھا اس قدر یک جہتی اور مفاہمت پائی جاتی ہے۔

تعلیم کے اس بلند اور ہمہ گیر تصور کو عمل میں لانے کے لئے سب سے زیادہ روشن دماغ اور بلند سیرت استادوں کی ضرورت ہے۔ مولانا کے دل میں استادوں کی بڑی عزت تھی اور ان کے ساتھ بہت ہمدردی تھی اور انھیں اس بات کا دکھ تھا کہ سماج نے انھیں وہ مرتبہ نہیں دیا جس کے وہ مستحق ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں بلکہ ان کے بنیادی عقیدے کا اظہار تھا کہ انھوں نے وزیر تعلیم کی حیثیت سے ۱۹۴۸ء میں جو پہلی تقریر کی تھی اور ۱۹۵۸ء میں اپنے انتقال سے چند روز پیشتر جو آخری تقریر کی، دونوں میں اس بنیادی مسئلے کا ذکر ہے۔ اس میں انھوں نے بہت وضاحت اور زور کے ساتھ کہا تھا کہ جب تک ہم استادوں کے معیار کو بلند نہ کریں ہم تعلیم کے نظام کو بہتر نہیں بنا سکتے۔ ہم نے ان کی مالی اور سماجی حالت کو سدھارنے اور علمی، ذہنی اور اخلاقی معیار کو بہتر کرنے کے لئے کچھ ذرائع اختیار کئے ہیں لیکن وہ ہرگز کافی نہیں۔ ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ انھوں نے ساتھ ہی اس چیز کی مذمت کی کہ اکثر بے سوچے سمجھے عام استادوں کے خلاف تلخ اور بے فیض نکتہ چینی ہوتی رہتی ہے جس سے ان کی ہمت شکنی ہوتی ہے۔ مانا کہ ان میں سے بعض کی تعلیم ناقص ہے اور بہت سے اس پیشے میں مجبوری سے آتے ہیں لیکن ان میں بہت سے ایسے بھی تو ہیں جنھوں نے احساسِ فرض اور قومی خدمت کا قابلِ تعریف جذبہ دکھایا ہے۔ ان کی مناسب قدر کرنا قوم کا فرض ہے۔ مولانا کے یہ الفاظ اپنی قوم کے لئے ایک تلقین اور ملک کے استادوں کے لئے تحسین کا الوداعی پیغام ہیں۔

ہندوستان کے عہدِ نو کا یہ معمار اپنا کام ختم کر کے جوارِ رحمتِ الٰہی میں جا پہنچا۔ جن کا کام تو کبھی پورا نہیں ہوتا اور ہر موت ناتمامی اور خلا کا ایک احساس چھوڑ جاتی ہے۔ لیکن مولانا نے ایک زندگی کے ساغر میں ایسی اور اتنی شراب بھر دی ہے جس کا حیات بخش خمار مدتوں تک قائم رہے گا۔ قدرت نے انھیں ایک ایسے زمانے میں پیدا کیا جو کشمکش اور جدوجہد اور دار و گیر کا زمانہ تھا۔ نسل اور امتحان کا زمانہ تھا۔ سیرت کے سونے کو ایثار کی بھٹی میں تپانے کا زمانہ تھا۔ ہمیں مولانا اس زمانے کی آگ میں سے اس بلا کی شان کے ساتھ گزرے کہ مکمل سوز و گداز سے گرمیٔ رزم اور نرمیٔ بزم سے، باطل سوز جلال اور حق کوشی جمال سے یکجا ہو۔ اُن کی زندگی کے دورِ اول کا خیال کرتا ہوں جو آزادی کی منزل پہ پہنچ کر تمام ہوا تو یہ شعر ذہن میں آ جاتا ہے ؎

آوازۂ خلیل ز بنیادِ کعبہ نیست
مشہور گشت زاں کہ بہ آتش نکو نشست

اور دورِ آخر کا خیال کرتا ہوں جب وہ نئے ہندوستان کی تعمیر اور تہذیب کو سنوار رہے تھے جب وہ محبت اور انصاف کے راستے سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو محبت اور انصاف کے راستے کی طرف بلا رہے تھے۔ جب وہ ہوس میں دنیا ہار رہے تھے اور حق کی خدمت میں تحسین اور ملامت دونوں سے بے نیاز ہو چکے تھے تو ظہوری کا ایک شعر یاد آتا ہے جو خود انھوں نے ایک مرتبہ نقل کیا ہے ؎

شد است سینۂ ظہوری پُر از محبتِ یار
برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست!

جل کھمبی سے مرکب کھاد کی تیاری

جل کھمبی ایک سدا بہار پودا ہے۔ اس کو جلا کر مرکب کھاد تیار کیا جا سکتا ہے۔ اس کھاد میں ۵ فی صدی نائٹروجن ہوتی ہے اور یہ تناسب گوبر سے بھی زیادہ ہے۔ ۵۸-۱۹۵۷ء کے دوران میں ۱۷ ہزار ٹن سے زیادہ جل کھمبی کا مرکب کھاد تیار کیا گیا جبکہ ۵۹-۱۹۵۸ء میں ایسے کھاد کے ۲۰ ہزار ٹن کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ آسام، بہار، اتر پردیش میں جل کھمبی سے وسیع پیمانے پر مرکب کھاد بنایا جاتا ہے۔ چنانچہ اتر پردیش میں ۵۹-۱۹۵۸ء میں ۳۰ ہزار ٹن جل کھمبی جمع کرنے کا نشانہ مقرر کر دیا گیا ہے۔

جبیب الرحمٰن شاستری

ویدانت اور یوگ کی روشنی میں راس لیلا کی تصویر

مجھے بہ حیثیت مسلمان کرشن کی راس لیلا سے وہ تعلق نہیں ہو سکتا، جو ایک ہندو کو ہونا چاہیئے۔ لیکن ایک خاص معنی کے لحاظ سے اوتار یا مظہر کمالاتِ ربانی مہاراج کرشن کی اعلیٰ روحانی منزل کا یہ عجیب و غریب مظاہرہ صرف ظاہر بینی کی بناء پر آج کل قابل اعتراض خیال کیا جاتا ہے۔ اس لئے میرے خیال میں ہر منصف شخص کی یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ وہ اس روحانی فعل کی للٰہیت کو واضح کرے

نظریہ اہل ہندوستان کی مشہور روحانیت اور تصوّف (ویدانت) سے ذوق رکھنے والے حضرات کی خدمت میں مفہوم دانی بتانے کے سلسلے میں خیالات ذیل کا پیش کرنا بے موقع نہ ہوگا۔

زبان سنسکرت میں تشبیہ اور استعارہ کی بھرمار کی وجہ سے کسی حد تک بہکنے کا موقعہ ضرور ہو سکتا ہے ارجن اور گوپیوں سے مراد انسان اور اس کی خواہشات ہیں جو اُسے طرح طرح کے ناچ نچایا کرتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی تاویلات سے بعض لوگوں کی تسکین ہو جایا کرتی ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ تاویلات اُس جماعت کے لئے کافی نہیں ہیں۔ جو گہرائی میں گھسنے کی عادی ہے اور شری ویاس جی کے سیدھے سادے الفاظ سے ہٹنا نہیں چاہتی اور نہ اسی کو ماننے کے لئے تیار ہے کہ جناب ویاس ذہنی قصوں کے پیرائے میں اپنی ہدایتیں پیش کیا کرتے تھے۔ نیز راس لیلا میں اگر انسان کے لئے کوئی خاص اہم ہدایت اور روحانی اسرار مضمر نہیں تھے۔ تو یہ چیز کرشن جیسی مہتم بالشان ہستی کے ساتھ منسوب ہی کیسے ہو گئی؟ اور نہ صرف منسوب ہو گئی بلکہ آج تک نظرِ عقیدت سے دیکھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ میں جانتا ہوں کہ خدا کی طرف لے جانے والا علاوہ سلوک (کرم کانڈ) کے کبیر، سور اور میرا بائی والا ایک راستہ عشق بھی ہے۔ اس سلسلے میں حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں علیہ الرحمۃ کے خیال سے متفق ہو کر نہایت آزادی سے کہہ سکتا ہوں کہ بادیہ و تمامی طریقوں سے واقف ہونے کے بھی کرشن کی اپنی بہاں مسجد اور مندر سے الگ صرف ایک نسبتِ عشقی تھی۔ لہٰذا اس نسبتِ عشقی کی غیر معمولی کشش اور اس کے ضروری لوازم پر غور کرنے کے بعد میرا غالب خیال ہے کہ اگر اصلی گوپیاں ہی کرشن کی شیدائی ہو کر راس لیلا کا باعث ہوئی ہوں تو بھی کسی معترض کو اعتراض کا حق نہیں ہو سکتا۔

اس مختصر تمہید کے بعد گذارش ہے کہ مہاراج کرشن چونکہ جوگیوں کے سرتاج تھے اس لئے اُن کی راس لیلا (ایک روحانی کرشمہ جس کو لوگ رقص و سرود تک محدود جانتے ہیں) کی اندرونی حقیقت جاننے کے لئے جوگیانہ ادراک سے آشنا ہونے کی ضرورت ہے۔ کون نہیں جانتا کہ انسان انفرادی (اشیاء عالم میں باہمی فرق دکھانے والی نظر جس کی وجہ سے زید عمر سے الگ معلوم ہوتا ہے) اور اجتماعی (وہ باطنی نظر جس کی وجہ سے عالم میں ایک ہی نا دکھائی دیتی ہے) دونوں اداکوں کا سرچشمہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُس کے ارادوں اور افعال میں بھی ان دونوں کی نمایاں جھلک پائی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ جب انسان پر انفرادیت یا خود غرضی کا غلبہ ہوتا ہے تو اپنے ذاتی فائدے کے لئے اس بیٹے تک کے قتل کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ جسے اس نے خود اپنا ہی خون اور پسینہ ایک کر کے پالا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ بعض اوقات کسی غیر کے بھی شیر خوار بچے کس بچے کو بھوک اور پیاس سے تڑپتا دیکھ کر اُسی انسان کا کلیجہ پھٹ جاتا ہے۔ اس کی بھوک اس کی بھوک اور اس کی پیاس اس کی پیاس ہو جاتی ہے۔ اور اس اتحادی کیفیت کے سیلاب میں انفرادیت کی دیواریں متزلزل ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ یہی اپنے بیٹے کے قتل کا ارادہ کرنے والا انسان اس مصیبت زدہ کی راحت کے لئے اُس دولت کے خرچ سے بھی دریغ

نہیں کرتا جس کے لئے خود اپنی اولاد سے بھی برسرپیکار ہو جاتا تھا۔ غرض کہ اپنے گوشت و پوست کی روح اور جوہر اصلی سے بیخبر ہوئے اپنے کو غیر سمجھنے اور غیر کو اپنا جان کر گلے لگانے کا مادہ فطرت انسانی میں موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے پہلے کا سرچشمہ ادراکِ انفرادی یا خود غرضی ہے اور دوسرے کی بنیاد وہ اجتماعی یا عالمگیر باطنی انا کا اندرونی ادراک ہے جس کی تحریک سے انسان موجودہ قومی ہنگاموں کی طرح وقتاً فوقتاً دوسروں پر قربان ہوتا ہوا نظر آتا ہے نیز اپنے عمل سے دنیا و مادی و انفرادی کے سبب زود اثر اور ہیبت ناک اسلحہ یعنی تیر تلوار توپ اور تفنگ کو خاک کے ذرّوں سے بھی زیادہ بے وقعت سمجھ کر اشیاء عالم اور اُن کے اثرات کی واقعیت نا غیر واقعیت کی قلعی کھولتا رہتا ہے۔ پس ان دونوں ادراکوں میں سے عوام تو پہلے کو واقعی اور اصلی سمجھ کر اسی پر جم جاتے ہیں۔ لیکن جوگی یا صوفی اس خواب کی سی ہستی سے اُبھرتا ہے اور اپنے باطن سے متحد ہونے کی وجہ سے اس کیفیتِ بیداری کا احساس کرتا ہے جس میں خواب آسا انفرادیت عالمگیریت میں محو ہو جاتی ہے۔ اس ساری تحریر سے میرا مطلب یہ ہے کہ جوگی یا دلی کی اصلی حالت عام طالبانِ خدا کی حالت سے مختلف ہوتی ہے۔ گیتا بھی کہتی ہے:-

ا۔ سب جگہ مساوی نظر رکھنے والا جوگی اپنے کو موجوداتِ عالم میں اور اپنے میں موجوداتِ عالم کو دیکھتا ہے۔

۲۔ جو شخص وحدت سے وابستہ ہو کر مجھ کُل موجودات میں رہنے والے کی بندگی کرتا ہے وہ جوگی ہر حالت میں رہتا ہوا بھی مجھ ہی میں رہتا ہے۔

۳۔ جو رنج سے رنجیدہ نہیں ہوتا اور راحت کا آرزومند نہیں ہوتا۔ نیز جو رغبت و خوف اور غصہ سے بری ہو چکا ہے۔ وہ سلیم النفس مُنی درجوگی کہلاتا ہے۔

۴۔ تمام جانداروں کی جو رات ہے اُس میں متقی جوگی جاگتا رہتا ہے اور جس رات (لذّاتِ مادّی میں غافل ہو جانے کی رات) میں تمام جاندار جاگتے ہیں وہ حقیقت بیں جوگی کی رات ہے۔

خلاصہ یہ کہ تمام مادّی لذات کے دل دادہ جو چیزوں کے حصول میں ضرورت سے زیادہ بیدار مغزی سے کام لینے کی وجہ سے حقیقت شناسی سے غافل رہتے ہیں۔ جوگی کی حالت اُن کے برعکس ہوتی ہے یعنی وہ لذّاتِ مادّی سے غافل رہتا ہے اور حقیقت کی جستجو میں بیدار مغزی سے کام لیتا ہے۔ گیتا کے یہ اقوال جوگی کی حالت ظاہر کرتے ہیں کہ عوام سے برعکس ہے۔ جوگیانہ ادراک کے معنی بیان کرنے کے بعد اب میں راس لیلا کی لفظی تحقیقات کر کے ہندو شاستر کے مطابق اُس کا صحیح مفہوم پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں گذارش ہے کہ برادرانِ وطن کا بعض مذہبی کتب کی بناء پر یہ قدیم عقیدہ ہے۔ کہ راس لیلا کے دیکھنے، سننے، پڑھنے اور نقل کرنے سے نروان یعنی نجاتِ کامل حاصل ہوتی ہے۔ نیز اُن کا ادب یعنی ویدانت سوتر اور اپنشدیں وغیرہ یہ بھی بتاتی ہیں کہ نجات یوں کہ مفروضاتِ دنیا سے چھٹ کر واصل بالذات (ब्रह्म में लय) ہونے کا نام ہے۔ اس لئے اس کا حصول بغیر عرفانِ الٰہی (ब्रह्मज्ञान) کے ممکن نہیں۔ ان خیالات کے ہوتے ہوئے ہر جویائے حقیقت کا فرض ہے۔ کہ وہ سب سے پہلے راس لیلا کے ایسے مفہوم کی جستجو کرے جو خیالاتِ مذکورہ سے پورے طور پر چسپاں ہو کر اُن کے پہلو بہ پہلو چلنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور چوں کہ مفہوم مذکور کی تشریح سے پہلے اوتار کا مسئلہ مدّنظر رکھنا ضروری ہے اس لئے مختصراً گذارش ہے کہ ہندو محققین نے اوتار کو حسبِ ذیل طریقہ سے سمجھا ہے۔

خدائی طاقتیں ہر ذی شعور اور غیر ذی شعور میں اپنا ظہور کرتی ہیں۔ ان طاقتوں کا باہمی تناسب سمجھنے کے لئے اُن کے سولہ درجے فرض کئے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی مانا گیا ہے۔ کہ عام مخلوق میں ایک سے لے کر کمالاتِ ربّانی کے آٹھ درجے تک ظاہر ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد اوتار کا مرتبہ ہے یعنی نو درجے سے لے کر سولہ تک کے کمالات جس ہستی میں ظاہر ہوں گے، وہ اصطلاحاً اوتار، برہم یا خدا کہی جائے گی۔ اس تشریح سے یہ امر واضح ہو گیا۔ کہ سولہ درجے کے اوتار (جیسا اوتار کرشن جی کا مانا جاتا ہے) میں چوں کہ نو سے لے کر پندرہ تک یعنی سات اوتاروں کے درجات کمالیہ بھی شامل ہیں۔ اس لئے اس اوتار کو مجازاً خدا، برہم یا کامل اوتار بھی کہا جا سکتا ہے۔ اوتار کی اس حقیقت اور راس لیلا کے مفہوم کو مدّنظر رکھتے ہوئے اس کی لفظی تحقیق یوں ہونی چاہئے۔ اس لفظ کے دو ٹکڑے ہیں راس اور لیلا۔ پہلا لفظ راس صرف و نحو کی مشہور کتاب اشٹا دھیائی کے سوتر دمقصود مختصر ا نمبر ۳ ...

---

१. सर्वं भूतेषुआत्मानं सर्वे भूतानि चात्मनि ।
ईक्षते योग युक्तात्मा सर्वत्र समदर्शिन ॥
(गीता॰ अ॰ ६-२६)

२. सर्वभूतस्थित यो मां भजत्येकत्वमास्थितः ।
सर्वथा वर्तमानोऽपि सयोगी मयि वर्तते ॥
(गीता॰ अ॰ ६-३१)

३. दुःखेष्वनुद्विग्न मनाः सुखेषु विगतस्पृह ।
वीतराग — भयक्रोध स्थितधीर्मुनिरुच्यते ॥

४ या निशा सर्वभूतानां तस्यां जागर्ति संयमी ।
यस्यां जाग्रतिभूतानि सा निशा पश्यतो मुनेः ॥

१. भागवत पुराण २ तत्त्वेदम्

لہ

۴-۳-۱۰) کی رو سے لفظ رس کے ر کو دا کرنے سے بنتا ہے۔ اس تغیّر کے بعد یعنی رس کو راس کرنے پر اس میں اضافت کے معنی پیدا ہو کر لفظ راس کے معنی رس کی چیز کے ہو جاتے ہیں۔ اب لفظ رس کے مفہوم پر غور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ بالکل واضح ہو جائے کہ راس دراصل کس کو کہتے ہیں۔ تیترییہ نامی اُپنشد میں رس برہم (خدا) کو کہا گیا ہے لہٰذا طریق مذکور سے راس کے معنی خدائی طاقتوں کے اُس مکمل ظہور کے ہوتے ہیں جو ہزاروں سے ہندو اوتار شری کرشن جی میں نمایاں طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کرشن جی مظہر کمالات ربانی ہونے کی وجہ سے ہندوؤں میں خدا کا اوتار مانے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ خدا ہر جگہ کو چھوڑ کر شری کرشن جی میں آ کر نزول کر گیا تھا۔

اب دوسرے لفظ پر غور فرمائیے۔ لیلا مرکب ہے لی اور لا کا۔ لی مصدر کے معنی ہیں فنا ہو جانا۔ اور لا کے معنی ہیں لینے کے۔ اس طرح یہ لفظ فنائیت حاصل کرنے والے فعل یا رقص مخصوص کے معنی ظاہر کرتا ہے۔ اس لئے راس لیلا کے معنی ہوئے برہم اوتار میں فنائیت حاصل کرنے والا رقص مخصوص۔ مقصد یہ ہے کہ اس لیلا کے ذریعے سے کامل اوتار یا کرشن برہم نے گوپیوں کو اپنے میں فنا کر کے درجۂ فنا فی اللہ تک پہنچا دیا۔

گوپیاں اس میں فنا ہو کر درجہ فنائیت تک کیسے پہنچیں۔ اس کی تشریح حسب ذیل ہے۔

پُرانوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کرشن جی کے ساتھ گوپیوں کی محبت کا درجہ عشق کامل تک پہنچ گیا تھا۔ اور اس درجہ کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ عاشق کا قلب ماسوا محبوب سے خالی ہو کر اس میں سما جائے۔ کیوں کہ عشق کامل کے معنی ہیں کسی چیز کی انتہائی پوری چاہت یا طلب کا ہونا اور چاہت اُس وقت تک پوری چاہت نہیں کہی جا سکتی جب تک کہ قلب مرتکز یکسو ہو کر اپنی پوری قوت اور توجہ ایک ہی طلب میں نہ لگا دے۔ اور جب قلب کی پوری توجہ ایک ہی چیز میں لگ گئی تو پھر اس میں سوائے محبوب کے کسی کا گذر ہی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہ بالکل صحیح ہے کہ عشق کامل میں عاشق کا قلب محبوب کے سوا جملہ اشیاء سے خالی ہو جاتا ہے

در دلِ عاشق چو عشق آتش فروخت   ہر چہ جز معشوق بود آں را بسوخت

اور یہی مطلب ہے "العشق نار یحرق ماسوا المحبوب" کا یعنی عشق ایک آگ ہے جو محبوب کے سوا دُنیا و مافیہا کو جلا دیتی ہے۔ اس حالت میں عاشق کا دل دوسری تمام چیزوں سے ٹوٹ کر صرف ہستیِ محبوب سے مربوط ہو جاتا ہے۔ لذاتِ نفسانی کی تمنا کیسی؟ جسم و جسمانیات کا احساس کہاں۔ انسانی ہستی کُل کی کُل تا بحرِ بے پایاں عشق میں غرق ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ شعر ذیل[1] سے ظاہر ہے۔

"جب میں سر سے پیر تک تیری تمنا میں غرق ہو چکا تو کچھ باقی ہی نہ رہا کہ دوسری تمنا کروں"

اس محویت تامّہ کے عالم میں جب محب و محبوب کے بیچ کا پردہ اُٹھ جاتا ہے تو نہ محب وہ محب اور محبوب وہ محبوب نہیں رہتا بلکہ اس وقت کی حالت قوتِ گویائی کے حدود سے بالاتر ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ ذیل کے شعر سے معلوم ہوتا ہے

کہوں کیا کہ خلوتِ خاص میں جو حجاب بیچ سے اُٹھ گیا
نہ وہ تم رہے نہ وہ ہم رہے یہ رہی سو بے خبری رہی

مصرعہ ثانی سے ثابت ہوتا ہے کہ عاشق کا اصلی مقصود محبوب کا تم نہیں ہوتا بلکہ اس کا منتہائے نظر ہونا و چونا کے حدود سے پرے ہو کر ... اور ... جس کے ... کی طرف "نہ وہ تم رہے نہ وہ ہم رہے" میں اشارہ کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ آفتاب حقیقی ہے جس کی کرنوں کی چمک سے عالم کے چہرے روشن ہیں اور جو تمامی موجودات کے ذرہ ذرہ کو چمکا رہا ہے۔

اس کی شوخی شرار میں ہے اس کی گرمی چنار میں ہے
وہ آب ہر سبزہ زار میں ہے وہ لالہ ہر کوہسار میں ہے

سنسکرت کے مشہور شاعر شری بھوبھوتی بھی اس خیال کی تائید کرتے ہوئے اپنے مالتی مادھو ناٹک میں لکھتے ہیں "کوئی اندرونی دلچسپی سبب دُنیا کی چیزوں کو ایک دوسرے کی طرف مائل کرتی رہتی ہے جنہیں ظاہری اسباب کی پروا نہیں کرتیں۔ کنول سا نرم و نازک پھول سورج کے نکلنے پر اس کی تیز کرنوں کے اتصال سے کھل جاتا ہے اور چندر کانت[2] پتھر چاند کے نکلتے ہی اس کی ٹھنڈی کرن پڑنے سے پگھل جاتا ہے۔

---

[1] چوں من ز سر تا پائے خود غرقِ تمنائے شدم   ہیچم نہ ماند تا کنم من تمنائے دگر

[2] व्यतिषजति पदार्थानान्तरः कोऽपि हेतुर्नखलु
बहिरुपाधीन् प्रीतयः संश्रयन्ते ॥
विकसति हि पतङ्गस्योदये पुण्डरीकं,
द्रवति च हिमरश्मावुद्गते चन्द्रकान्तः ॥

عشق کی اسی منزل کے لئے کہا گیا ہے "العشق نارٌ واصل فی الذات رب العالمین" یعنی عشق ذاتِ خداوندی سے ملا دینے والی ایک آگ ہے۔ بعضوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ "العشق ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ"[1] انیس العاشقین میں ارشاداتِ حضرت مخدوم شاہ حسام الحق مانک پوری رحمۃ اللہ علیہ میں بھی اس خیال کی وضاحت کی گئی ہے اسی کو پلٹ کر بعض مغربی شعرا نے یوں کہا ہے کہ عشق خدا ہے اور خدا عشق۔

اس مقام پر یہ خیال پیدا ہونا صحیح نہیں کہ ہر عاشق اپنے محبوب میں فنا ہو کر درجۂ فنا فی اللہ تک پہنچ جاتا ہے۔ کیونکہ یہ اس کا درجہ ہے جو جسم سے پرے دریائے وحدت و یک رنگی میں غرق ہو چکا ہو، یا یہ کہ گوپیوں کی طرح اس کی لو کسی ایسے مظہرِ کامل سے لگی ہو جس کے جسم مادی سے بھی آتشی شیشے کی طرح آفتاب یک رنگی کی کرنیں نکل رہی ہوں۔ اس عینیتِ محبوبی کے مسئلے کو یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ مذاہب نے روح کو متفقہ طور پر ایک انتہائی جوہر لطیف تسلیم کیا ہے اور فلسفۂ طبیعیہ کی تحقیقات سے یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ جو چیز جتنی زیادہ لطیف ہوتی ہے اُس میں اتنی ہی زیادہ نرالی طاقت بھی پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ ہوا بھاپ اور بجلی وغیرہ لطیف اشیاء کے حیرت انگیز واقعات سے ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا روح چونکہ تمام اشیاء سے زیادہ لطیف ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس میں طاقت بھی سب سے زیادہ محیر العقول اور نرالی پائی جائے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ روح کی اس غیر معمولی طاقت کا صدور کسی ایک متنفس سے بھی نہیں ہوتا؟ اس کی وجہ سوا اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ روح غلبۂ عشق میں جسمِ انسانی سے مربوط ہو کر اسی طرح جسم ہو گئی ہے جس طرح قلمی پودے بندھ کر تخمی پیڑ بھی قلمی ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ روح کی اپنی اصلی طاقت اس وقت ضرور اُبھر آتی ہے جب کہ اُس کے اوپر سے جسم اور جسمانیات کے خیالات کا تسلّط اٹھ جاتا ہے۔

جوگی یا صوفی جب دُنیا و مافیہا سے مُڑ کر اپنی اصلی اَنا یا حقیقتِ روحانی میں ڈوب جاتا ہے تو اس کی روح کی اُبھری ہوئی طاقتِ مذکورہ ہی سے وقتاً فوقتاً حیرت انگیز تماشے ہونے لگتے ہیں۔ ورنہ اگر انسان کی روح میں غیر معمولی طاقت پہلے سے موجود ہی نہ ہوتی تو اب کہاں سے آ کر کمالاتِ مذکورہ کو ظاہر کرتی؟

یوگ درشن باب ایک۔ منقولہ مختصر (سوتر) اکتالیس[2] سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح بلّور اپنی متصل چیز کا اثر قبول کر کے اس کے رنگ روپ میں رنگ جاتا ہے اسی طرح وہ قلب جو دنیا و مافیہا سے خالی ہو جاتا ہے جس چیز کی طرف مائل ہوتا ہے اسی کی شکل میں ڈھل جاتا ہے۔ اس امر کی مفصل توضیح ہو جانے کے بعد کہ عاشق محبوب کی صفات سے متصف ہو کر عینِ محبوب ہو جاتا ہے، یہ امر خود بخود صاف ہو گیا، کہ ہر عاشق درجۂ فنا فی اللہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ کیوں کہ جب عاشق میں محبوب کی صفات کا آنا ضروری ہے، تو جو شخص کسی خواہشاتِ نفسانی کے مجسمہ سے محبت کرکے اس کے جسم ہی کو مقصودِ اصلی قرار دے گا۔ اس میں بھی لازمی طور پر نفسانیت اور انفرادیت وغیرہ اس کے ادنیٰ صفات ہی سرایت کریں گے اور ظاہر ہے، کہ ان صفات سے فنائیت فی اللہ کوسوں دُور ہے۔ لیکن برخلاف اس کے گوپیوں کی لَو ایک ایسے جوگیوں کے سرتاج سے لگی تھی جو کمالاتِ ربّانی کا آئینہ تھا۔ لہٰذا ان کے لئے جوگیشور (جوگیوں کے سرتاج) کرشن کی صفت جوگ سے متصف ہو کر فنائیت تک پہنچ جانا ایک معمولی امر تھا۔ گوپیوں اور کرشن کی محبت کے سلسلے میں مجھے یہ اور عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ گوپیوں کو کرشن سے محبت تھی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کرشن کو کیا محسوس کرتی تھیں۔ ایک محیطِ کُل عالمگیر روحانیت (آتما) یا جسمِ محدود؛ اس کا جواب خود انھیں کی زبان سے سُنئے۔

"آپ یقیناً یشودا (نند کی بیوی)[3] کے لڑکے نہیں ہیں۔ بلکہ آپ تو تمام ارواح میں اپنے آپ کو دیکھنے والے ہیں۔"[4] گوپیوں کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کرشن کو وہی محیطِ کُل روحِ اعظم یا اصلی ہستی سمجھتی تھیں جس کے بیان سے گیتا کے ابواب پُر ہیں۔ ایسی حالت میں غور طلب یہ مسئلہ ہے کہ وہ اُن کے جسم محدود سے محبت رکھتی تھیں، یا اُن کی اصلی اور محیطِ کُل ہستی سے، جواب ظاہر ہے کہ جسے وہ کرشن سمجھتی تھیں۔ اسی سے محبت کرتی تھیں۔ نیز جب اصلیت اور صفاتِ کمالیہ سے متصف عالمگیریت سامنے آگئی تو جسمی حد بندی اور نمائشی وجود کا گذر ہی کہاں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اصلیت کی موجودگی میں کوئی شخص فرضی یا نمائشی چیز کو پسند کرے؟ بلکہ واقعہ تو یہاں تک ہے کہ حقیقت اور اصلیت کھُل جانے پر فرضی اور نمائشی چیز کی نوعیت کی تمام چیزیں، دل سے اُتر کر کالعدم ہو جاتی ہیں۔ چناں چہ بھاگوت کو بغور پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ گوپیوں کا دل جسم و جسمانیت کی گرفت سے کسی حد

---

[1] عشق اللہ ہے اللہ ہے الخ

२ भीरप्र कृतेरभिजातस्येवमणोर्गृहीतग्रहण
ग्राह्येषु तत्स्थ तदञ्जनता समापतिः ।

[3] نند جی کی بیوی کا نام ہے جنھوں نے کرشن جی کی پرورش کی تھی۔

१ न खलु गोपिकानन्दनो भवान् । अखिल
देहिनामन्तरात्मदृक् (श्रीमद्भागवत स्कं०
१० अ० ३१ श्लो० ४)

تک آزاد ہو چکا تھا اور اس میں اجسام کی غیر واقعیت کا خیال اس حد تک بڑھ گیا ہو چکا تھا کہ بعض اوقات، وہ واقعی اور غیر واقعی میں کوئی فرق نہیں محسوس کرتی تھیں اور جسم واقعی کا کام غیر واقعی (خیالی جسم) سے لینے لگی تھیں جیسا کہ کرشن کے غائب ہو جانے پر اُن کے قول "میں ہی کرشن ہوں"[1] سے ظاہر ہوتا ہے کیوں کہ گوپیوں کا جسم عام نقطۂ نظر سے تو کرشن تھا ہی نہیں۔ لیکن پھر بھی انھوں نے اپنے کو کرشن کہا۔ اس سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام اجسام عالم کے ساتھ ساتھ کرشن کے جسم محدود کے بھی نمائشی و اعتباری ہونے کا راز کسی حد تک اُن پر کھل چکا تھا اور اعتباری و خیالی چیزیں چوں کہ ایک جگہ کے بجائے دوسری جگہ بھی فرض کی جا سکتی ہے۔ اس لئے انھوں نے اپنے میں کرشن یا کرشن میں اپنے کو دیکھ لیا۔

اے زاہد ظاہر بیں از قرب چہ می پرسی
او در من و من در وے چوں بو بہ گلاب اندر

"اے ظاہر بین زاہد تو نزدیکی کے متعلق کیا سوال کرتا ہے۔ وہ مجھ میں اور میں اُس میں اس طرح رہتا ہوں جیسے خوشبو گلاب کے پھول میں۔" اس واقعہ کی یہ توجیہ صحیح نہیں ہو سکتی کہ محض کرشن کے پوشیدہ ہو جانے کی وجہ سے گوپیوں کی یہ صرف اضطراری حرکت تھی۔ کیوں کہ کرشن کی موجودگی میں بھی ایک گوپی کا آنکھیں کھول کر کرشن کا نظارہ کرنے کے بجائے اُن کی خیالی تصویر کے تصور میں آنکھیں بند[2] ہونے پر بھی متشعر الاعضاء (بدن پر رونگٹے کھڑے ہونا) ہو جانے کا واقعہ بھی کسی ایسے نقطۂ نظر کا پتہ دیتا ہے کہ جہاں دنیائے واقعاتی کا بڑا اور دنیائے خیالی میں فرق ہو جاتا ہے۔ ہاں یہ سوال ضرور ہو سکتا ہے کہ جب گوپیاں عالمگیریت اور یک رنگی سے آشنا ہو چکی تھیں۔ تو پھر کرشن کے جسم کی تلاش میں جنگلوں کی خاک چھاننے کے کیا معنی ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کرشن کی عالمگیر روحانیت سے آنکھ لڑتے ہی اُن کی آنکھوں میں کچھ ایسی عالمگیریت سما گئی کہ تشبیہ (ساکار) میں تنزیہہ (نراکار) اور تنزیہہ میں تشبیہ (ساکار) کا تماشہ دیکھنے لگی تھیں۔ نیز عالمگیریت کی گرہ کھل جانے پر بھی اس دُنیا میں بالعموم جسمانیت ہی کا غلبہ رہنے کی وجہ سے بغیر کسی

وقت کے لگاتار اور مسلسل مشاہدہ جسم ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر طالبان یک رنگی نے یک رنگی کی کامل گرفت نہ کر سکنے کی وجہ سے جسم ظاہری ہی کو حقیقت کا زینہ بنا لیا، جیسا کہ ایک عشقی نسبت کے بزرگ کو کسی چہرہ کے نظارہ میں محو دیکھ کر کسی نے سوال کیا کہ یہ کیا ہے؟ جواب ملا "آفتاب[1] کے چشمہ کو دیکھتا ہوں لیکن پانی کے طشت میں دیکھ رہا ہوں۔" اب ذرا اس طرف بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ گوپیوں کی محبت کوئی معمولی محبت نہیں تھی۔ بلکہ اس کی تہ میں یوگ کی اعلیٰ حقیقتیں کام کر رہی تھیں۔

دیکھئے دل میں اٹھتے ہوئے خیالات کے روکنے کو یوگ درشن میں یوگ[2] کہا گیا ہے اور خیالات روکنے کی دو ترکیبیں[3] بتائی گئی ہیں۔ اوّل اشیاء دُنیا کی مدّت بے حقیقتی و بے ثباتی دیکھ کر، ان سے قلب کا برگشتہ ہو کر منحرف ہو جانا۔ دوسرے جس حقیقت کی تحریک نے ان چیزوں سے دل کو برگشتہ کیا ہے۔ اس سے وابستگی پیدا کرنے والے ذرائع کا متواتر عمل درآمد یعنی تصور مقصود میں ڈوب جانے کی مشق۔ ذرائع مذکورہ میں سے مہارشی پتنجلی نے منظور نظر شے کے تصور[4] و لذات دنیا سے برگشتہ[5] انسان کامل کی روح سے وابستگی کو بھی بیان کیا ہے۔ نیز[6] یہ بھی فرمایا ہے کہ جسے یوگ کی دُھن ہوتی ہے۔ وہ جلد کامیاب ہو جاتا ہے۔ خیالی[7] واہمہ میں محویت کو، بیماری سُستی اور بے قراری وغیرہ، یوگ سے روکنے والی اشیاء کا مانع قرار دیا گیا ہے۔ کسی[8] خاص جگہ دل کے باندھنے یا لگانے کو دھارنا اور تصور مراقبہ یا دھیان کہتے ہیں۔ یہی مراقبہ مسلسل یا لگاتار قائم ہو جانے پر لفظ دھیان[9] سے

۱؎ چشمۂ آفتاب را بینم — لیک در طشت آب می بینم

२. योगश्चित्तवृत्तिनिरोधः (यो० सू)
३. अभ्यास-वैराग्याभ्यां तन्निरोधः (यो० सू १२)
४. [illegible] (यो० सू० ३०)
५. वीतरागविषयंवाचित्तम् (यो० सू० ३७)
६. तीव्र संवेगानामासन्नः (यो० समा० सू० २१)
७. तत्प्रतिषेधार्थ-एकतत्त्वाभ्यासः (यो० समा० सू० ३२)
८. देशबन्धश्चित्तस्य धारणा (यो० वि० सू० १)
९. तत्र प्रत्ययैकतानता ध्यानम् (वि० २)

---

१. असावहं-त्वित्यबलास्तदात्मिका, न्यवेदिषुः कृष्ण विहार विभ्रमाः। (श्री भा० स्क० १०)

२. तं काचिन्नेत्र-रन्ध्रेण हृदिकृत्य निमील्य च
पुलकाङ्ग्युपगुह्यास्ते (भागवत स्क० १० अ० ३ श्लो ?)

موسوم کیا جاتا ہے اور جب مُراقبہ مراقبہ میں کمالِ محویت کے ذریعہ شئے مقصود کی شکل میں کر قائم ہو جاتا ہے تو یہ حالت جوگ کی آخری منزل یعنی سمادھی کہلاتی ہے۔ اب خود جوگ کے ان بنیادی اصولوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے گوپیوں کی حالتِ عشق پر نظر ڈالیے، تو معلوم ہوگا کہ یہ تمامی اصول ان کے عشق طرزِ عمل میں بغیر کسی کوشش کے خود بخود موجود تھے۔ ابھی ابھی ظاہر کیا گیا ہے کہ کرشن کی اصلی اور عالمگیر ہستی کے احساس کی وجہ سے گوپیوں کے دل سے جسم و جسمانیت کا تخیل کالعدم سا ہو گیا تھا۔ اور اشیاءِ دُنیا سے دلچسپی کا دار و مدار اسی تخیل پر ہے، لہٰذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ گوپیوں کے دل میں دُنیا سے مکمل بے تعلقی کا وجود تسلیم کر کے ان کو دُنیا سے کامل کنارہ کش نہ مانا جائے۔ چناں چہ بھاگوت کے پڑھنے سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کرشن کا ادنیٰ رابطہ بھی گوپیوں کے دل سے تمام دیگر خواہشات مادّی کو بھلا دینے والا تھا جو کامل ویراگ کا روشن ثبوت ہے۔ دوسری چیز یعنی تصوّرِ مقصود، تو اس کا تو عاشقِ کامل کے لئے کہنا ہی کیا ہے۔ عاشق سے زیادہ تصورِ محبوب میں اور کون مستغرق ہو سکتا ہے۔ اب رہا منظورِ نظر شئے کا تصوّر اور انسانِ کامل کی روح سے وابستگی۔ تو ان دونوں چیزوں کی تکمیل تو گوپیوں نے کرشن ہی کے تصوّر کے ذریعہ سے کر لی تھی۔ کیوں کہ کرشن گوپیوں کو محبوب بھی تھے اور کاملِ ویراگ کی تصویر بھی۔ اب باقی رہی محویت، تو وہ عاشق سے زیادہ اور کسی میں ہوتی ہی نہیں۔ اور گوپیوں کا صرف کرشن ہی میں محو رہنا جوگ کی رکاوٹوں کے روکنے کے لئے بھی کافی تھا۔ نیز "تم ہی میں دل رکھنے والی گوپیاں"[1] اس جملے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گوپیوں نے کرشن میں چِتّ (دل) لگا کر دھارنا (مُراقبہ) کے منازل کو بھی طے کر لیا تھا۔ کیوں کہ اسی کے معنی چِتّ (دل) کے ہیں اور چِتّ کو کسی جگہ (رشتے میں) رکھنے ہی کو دھارنا کہتے ہیں۔ دھارنا کی ترقی یافتہ حالت ہی دھیان اور سمادھی ہو جاتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ خیالات دُنیا سے کنارہ کش گوپیاں اس عشقی جوگ کی تکمیل کرنے پر بھی کرشن میں لے ہو کر درجہ فنائیت تک نہ پہنچیں؟ یہ ہے گوپیوں کی مذہبیت، عشقِ صادق اور فنائیت کی تشریح اور یہ ہے اصلیت اس کرشمۂ عشق کی جسے دُنیا اب تک راس لیلا کے نام سے یاد کرتی ہے۔

१. तदेवार्थमात्र निर्भासं स्वरूपशून्यमिव समाधिः
(यो० वि० सू० ३)
२. इतर रागविस्मारणं नृणां वितर वीर नस्ते ऽधरामृतम्
(भा० स्क० १० अ० ३१ पृ० १४)
३. त्वाय भुवामवस्त्वां विचिन्वते (भागवत १०-२-३१)
४. अश्वार्थ चिन्तामणि पृ २२६

شاہ مصباح الدین شکیل

اقبال اور آزادی

ماہ اپریل ۱۹۰۰ء میں حیدرآباد میں یومِ اقبال منایا گیا تھا۔ اس تقریب کی صدارت وزیرِ مرکز شری گوپالا ریڈی نے فرمائی تھی۔ آپ نے اپنے بصیرت افروز خطبے میں اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اقبال کی تصنیفات اور رجحانات شعری پر ایک مفصل محاکمہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ولاّ طول، بھارتی اور ٹیگور کی طرح اقبال کی تخلیقات بھی اعلیٰ شعری ادب کا نمونہ ہیں۔ اسی تقریب میں مصباح الدین شکیل صاحب نے ذیل کا مضمون پڑھ کر حاضرین سے دادِ تحسین وصول کی تھی۔ (ادارہ)

اقبال دورِ انحطاط کا شاعر نہیں، آغازِ بیداری کا شاعر ہے۔ اسی لئے اس کے پاس غالب اور داغ کی نشاط انگیزی، حالی کا مورّخانہ انداز یا اکبر کی قنوطیت نہیں۔ اس کے پاس روحِ عصر ہے۔ مقصدیت اور فکر کی گہرائی ہے۔ جوں جوں اس کی نظر بلند ہوتی گئی اور فکر مرتّب ہونے لگی اس کے فکری سانچوں میں ایک فطری تبدیلی نمایاں ہوئی۔ داغ کا شاگرد غزل کے پرانے دبستان سے دامن بچاکر چلا تو کبھی حالی نے اور کبھی اکبر نے روکا۔ بالآخر اسے برتری ہری، گوئٹے، نٹشے، برگساں، کانٹ، ابنِ عربی اور رومی جیسے رازداں ملے اور پھر اس نے وہ منزلیں طے کیں جو ایک جبرئیل صید اور یزداں شکار اہلِ نظر کا مقدر ہوتی ہیں۔ اقبال بھی ان دانش وروں کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جو کائنات کے مربوط نظامِ حیات کے تحت اپنے اپنے وقت پر پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا کے ان عظیم انسانوں میں چاہے وہ اعیانِ ادیان و ملل ہوں یا صاحبِ علم و فن، جذبۂ حریّت اور تسخیرِ حیات کا احساس بہت نمایاں ہوتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ان کی فکر و نظر کی رسائی کا انداز خاصے کی چیز ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ان کی قدآور شخصیت کے جوہر کھلتے ہیں اور ان کی عظمت کا معیار قائم ہوتا ہے

اقبال کے احساسِ حریّت اور جذبۂ آزادی کا تجزیہ کرنے کے لئے اس کے ذہنی پس منظر پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ ورنہ اس کی ایمائیت اور اشاریت پرکھنے میں ایک اُلجھن سی محسوس ہوگی اور اُس کے کلام کے مختلف ادوار کے تدریجی ارتقاء کو سمجھنے میں قومی اور بین قومی نظریاتی کشمکش کی وجہ سے بادی النظر میں ایک تضاد سا معلوم ہوگا۔

سر شیخ عبدالقادر کے حوالے سے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ابتدائی مشق کو چھوڑ کر اقبال کا اردو کلام بیسویں صدی کے آغاز سے کچھ ہی پہلے شروع ہوتا ہے۔ ۹۹-۱۸۹۸ء کے لگ بھگ وہ پہلی مرتبہ لاہور کے مشاعروں میں دیکھے گئے اور ان ہی دنوں ایک ادبی مجلس میں شریک ہونے لگے۔ جس میں لاہور کا اُونچا علمی طبقہ شریک ہوا کرتا تھا۔ یہیں انھوں نے اپنی وہ نظم جس میں کوہِ ہمالیہ سے خطاب ہے پڑھ کر سنائی۔ جو کچھ ہی دنوں بعد 'مخزن' کے پہلے شمارہ میں نکلی اور ہندوستان کے طول و عرض میں شاعر کی ذہانت کا ڈنکا پیٹ گئی۔ اس زمانہ میں وہ گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہو چکے تھے۔

جب انھوں نے شعر کہنا شروع کیا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان میں داغ کا طوطی بولتا تھا لیکن آزاد کی کوششوں سے ۱۸۷۴ء میں نئے طرز کے مشاعرے کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ حالی کا مسدّس قبولیتِ عامہ کے معیار پر پورا

اُتر چکا تھا۔ اکبر اپنے خاص رنگ میں سماجی اور سیاسی مسائل پر کھل کر تنقید کرنے لگے تھے۔ سرسیّد کی تحریر اور تقریر نے ذہن و فکر کے گھور اندھیاروں کو دُور کرنے میں بڑا کام کیا تھا۔ ادھر ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے کی اسکیم کے مطابق ولیم بینٹنگ کے ہاتھوں مغربی تعلیم کا رواج ہو چکا تھا۔

عبدالوہاب اور سیّد احمد شہید کی تحریک اگرچہ دم توڑ چکی تھی۔ جمال الدین افغانی کا نام لیوا کوئی نہ تھا لیکن شاہ ولی اللّٰہ اور راجہ رام موہن رائے کی تعلیمات کا رنگ تازہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کی کشمکشِ آزادی دماغوں سے محو نہ ہوئی تھی۔ کانگریس کی بنیاد پڑے پندرہ ایک سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور سریندر ناتھ بیزجی، دادا بھائی نوروجی، فیروز شاہ مہتا اور بدرالدّین طیّب جی کی کوششوں سے ہماری سماجی زندگی ایک نیا روپ دھار رہی تھی۔ گوکھلے کی گھن گرج سے ایوانِ حکومت میں ایک غلغلہ پیدا ہو رہا تھا۔

سماج کے رگ و پے میں جوش و خروش کی پیہم لہریں اُبھر رہی تھیں۔ کچھ یہ ذہنی پس منظر تھا جب بقول میتھو آرنلڈ ہماری دُنیا ایک نئے تمدّن کے جنم کا درد محسوس کر رہی تھی۔ اس فضا میں اقبال نے آنکھیں کھولیں تو فصیلِ کشورِ ہندوستان ہمالہ! اس کی چشمِ بینا کو سراپا تجلی نظر آنے لگا اور اس نے محیطِ آبِ گنگا کو گوارہ بنا کر صدائے ورد بلند کی۔ ۶

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے

ادراک کی یہ چبھن اس کے ذوقِ آگہی کے لئے ایک مہمیز تھی جس نے بالآخر اس سے کہلوایا ؎

سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے   خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

اب یہ شعر کا اعجاز کچھ اس انداز میں ظاہر ہونے لگا ؎

رُلاتا ہے ترا نظّارہ اے ہندوستاں مجھ کو   کہ عبرت خیز ہے ترا فسانہ سب فسانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے   تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

اس کے بعد شاعر کے لب پر "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کا ترانہ ہے اور پھر ہندوستانی بچّوں کا قومی گیت، جس نے اس کے فکر کے سانچوں میں ایک نئے شوالہ کا ہیولےٰ کھڑا کیا۔ یہ کم و بیش وہ زمانہ ہے جب مسلم لیگ کی بنیاد پڑ چکی ہے۔ ملک کی آزادی کی جد و جہد میں کانگریس اپنے نظریۂ اساسی میں حالات کے تقاضوں کے ساتھ مسلسل تبدیلیاں کر رہی ہے۔ گوکھلے ملک کی آزادی کی تحریک میں سر بکف طول و عرضِ ہمالیہ میں سرگرداں ہے۔ ابھی ۱۹۰۶ء کا وہ دن نہیں آیا جب کانگریس کے پلیٹ فارم سے پہلی مرتبہ برطانوی سامراج کو ایک بڑا کھلا چیلنج دیا جائے۔ ابھی محبِ وطن گوکھلے کی زبان سے نوآبادیاتی درجے کا مطالبہ ہونے والا ہے اور اقبال ہوشیار کرتا ہے ؎

یہ خاموشی کہاں تک لذّتِ فریاد پیدا کر   زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو   تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یہی آئینِ قدرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے   جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے

اب وہ دور آتا ہے کہ بنارس اور علی گڑھ کی قومی درس گاہیں برگ و بار لا چکی ہیں۔ مسلم لیگ کی بنا پڑ چکی ہے۔ تلک، مسز اینی بیسنٹ، موتی لال نہرو، سی۔ آر۔ داس اور مہاتما گاندھی افقِ سیاست پر اپنی جگہ بناتے جا رہے ہیں۔ علی برادران ساتھ ہیں، حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری بھی جلو میں ہیں۔ اُدھر عالمی اُفق پر نئے گل بوٹے کھل رہے ہیں۔ دنیا جنگِ عظیم کی قیامت خیزیوں کا سامنا کرنے کو ہے۔ سیاسی بحران کے نتیجے کے طور پر مکمل سوراج کا عزم بیباکانہ ظاہر ہوا۔ ترکِ موالات کی تحریک چلی۔ خلافت کی تحریک اُبھری۔ ابوالکلام آزاد علمی اور ذہنی سطح پر تیر نے لگے۔ ادھر اسپنسر اور مل کی تعلیمات نے حُرّیت اور آزادی کی قندیل روشن کی۔ نٹشے، کانٹ اور برگساں کے فلسفے نے بھی ہندوستان کا رُخ کیا۔ انگلستان، فرانس اور جرمنی کی ادبی تحریکوں میں نئے نعرے بلند ہوئے۔ ادب اور زندگی کے تانے بانے کو قریب تر کیا جانے لگا۔ اس دوران میں اقبال یورپ ہو آئے۔ مابعدالطبیعاتی فلسفہ پر انھوں نے تحقیقی کام کیا۔ وطن لوٹے تو برطانوی سامراجیت کے بوجھ تلے دم توڑتی ہوئی سماج کے توسط سے دُنیا کے آگے، انھوں نے اپنی فکر و نظر کی بساط کا ایک ایک گوشہ وا کرنا شروع کیا۔

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ انّ الملوک   سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری

مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق   طبِّ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ   خواجگی نے خوب چُن چُن کر بنائے مسکرات

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے   قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا   جہاں میں جس تمدّن کی بنا سرمایہ داری ہے

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں   جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات   جب جھکا تو غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود   کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

خودی کے نگہباں کو ہے زہرناب   وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب

خودی کی یہ ہے منزلِ اوّلیں — مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر — طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر

اقبال کے ذہنی پس منظر کے سلسلے میں جن تحریکوں اور واقعات کا سرسری تذکرہ کیا گیا ہے۔ شاعر نے ان کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ شمس العلماء میر حسن اور پروفیسر آرنلڈ کے امتزاج سے جو اندازِ نظر پیدا ہو سکتا تھا اسے ذہن میں رکھئے پھر اقبال جیسے دانش ور کی بے پناہ ذہنی تڑپ اور فطانت کا اندازہ لگائیے تو پیامِ مشرق اسرارِ خودی اور جاوید نامہ کا اقبال سمجھ میں آتا ہے۔ کیا اردو اور کیا فارسی اقبال کے تمام کلام پر اس کا جذبۂ حرّیت طاری و ساری ہے۔ کہیں راست اپنے قاری کے ذہن و دماغ پر ضرب لگاتا ہے کہیں شعر کے پردے میں چھپ کر مسکراتا ہے۔ یہ اس کے طنز کا بھرپور انداز ہے۔ انسان کے احساسِ خودداری اور جذبۂ حرّیت کو بیدار کرنے کی اس سے بہتر شاید ہی کوئی اور صورت ہو۔ 'ارمغانِ حجاز' میں ایک مقام ہے کہ جہاں تو بہت غمزدہ سے مخاطب ہے ؎

آہ ظالم تو جہاں میں بندۂ محکوم تھا — میں نہ سمجھی تھی کہ ہے کیوں خاک میری سوز ناک
تیری میّت سے مری تاریکیاں تاریک تر — تیری میّت سے زمیں کا پردۂ ناموس چاک
الحذر محکوم کی میّت سے سو بار الحذر — اے سرافیل اے خدائے کائنات اے جانِ پاک

شدّت اور تلخی کے ساتھ سا تھ طنز و استہزا کی یہ تراش خراش رید دلوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے والا اندازِ سخن اس کے فنِ اک جذبۂ حرّیت کا وہ بے پناہ تیر ہے جو زندہ رود ہی پر نہیں بلکہ بدلے طرح پر بھی کارگر نظر آتا ہے۔ اقبال کے پاس حربتِ کاری کے ایسے لا تعداد وار ہیں :

نے نصیبِ مار و کژدم نے نصیبِ دام و دد — ہے فقط محکوم قوموں کے لئے مرگِ ابد
بانگِ اسرافیل ان کو زندہ کر سکتی نہیں — روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد
مرکے جی اٹھنا فقط آزاد مردوں کا ہے کام — گرچہ ہر ذی روح کی منزل ہے آغوشِ لحد

اقبال طرح طرح سے ہمارے قلب و دماغ کو منتقل کرتا ہے۔ کبھی کہتا ہے

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی — جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر — کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا
محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید — آزاد کا دل زندہ و پُر سوز و طربناک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش — وہ بندۂ افلاک ہے یہ خواجۂ افلاک
اے کہ غلامی سے ہے روح تری مضمحل — سینۂ بے سوز میں ڈھونڈ خودی کا مقام

اقبال کے ہاں انقلاب کی کھوکھلی نعرہ بازی ہے اور نہ قنوطیت کا احساس۔ اپنی حالت بدلنے کے لئے وہ دہشت پسندی یا تباہی اور غارت گری کے طوفانوں کو بھی دعوت نہیں دیتا۔ اس کے جذبۂ حرّیت میں فکر کی گہرائی، عقل کا شعور اور احترامِ آدمیت ہر جگہ ملحوظ ہے۔ جب وہ کہتا ہے

آدمیت احترامِ آدمی — باخبر شو از مقامِ آدمی
یا
برتر از گردوں مقامِ آدم است — اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

تو اس کی نظر نٹشے کے مافوق انسان سے بھی ماوراء کسی آدم کو دیکھتی ہے۔ اس کا یہ معیارِ نظر ہی ہے جو جذبۂ حرّیت کے احساس اور استحکام کے لئے سب سے پہلے انسان کی خودی کو بیدار کرتا ہے۔ یہ اندازِ نگاہ اقبال کی قدآور شخصیت کا آئینہ دار ہے اور عہدِ حاضر کے دانشوروں میں اس کی عظمتِ فکر کی بلندیوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ مادے اور شعور کے ٹکراؤ میں اقبال نے کانٹ کے فلسفۂ ثنویت کے وحدت کو اثباتی اقدار کی طرف موڑا ہے اور نٹشے کی قوت پرستی اور اقتدار پسندی کو تہذیب اور اخلاق کی گرفت میں لاکر "قاہری" میں "دلبری" کا وہ جوڑ دیا ہے کہ جلال و جمال کا ایک نکھرا ستھرا امتزاج معاشرے کے ہر مکتبِ خیال کے لئے قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ اقبال کا یہ زندگی سے قریب تر تعمیری نقطۂ نظر دراصل اس کے احساس کا وہ لطیف پرتو ہے جو اس کی ساری شاعری پر سایہ فگن ہے اور خصوصیت سے جذبۂ حرّیت کی تشکیل اور استحکام میں اس کا اساسی اور بنیادی تصور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اقبال کی تعلیمِ حرّیت میں بالعموم اور نٹشے اور کارل مارکس کے تعلق سے بالخصوص "قلبِ مومن" اور "دماغ کافری" کی اصطلاحوں کی آویزش دیکھتے ہیں۔ یہ اقوام و ملل کی تقدیر سازی کے لئے انتہا پسندی کے مہلک حربے سے بچاؤ اور تہذیبی اور ثقافتی اقدار کو برقرار رکھتے ہوئے حرّیت، خودشناسی اور خود نگہداری کی منزل پر پہنچنے کا ارتقائی فلسفہ ہے جو اصل تہذیب اور عین انسانیت ہے۔

اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است!

'آج کل' کا اگست ۱۹۵۹ء کا شمارہ 'رقص نمبر' ہوگا

شمس الرحمٰن فاروقی

سانٹ

انگریزی اور یورپی ادب میں سانٹ کی روایت کافی پرانی ہے۔ افسوس ہے کہ اب انگریزی ادب میں اس کا رواج عام نہیں، غالباً اس وجہ سے کہ یہ صنفِ سخن اتنی ہی مشکل ہے جتنی کہ رُباعی۔ اس کے علاوہ اس میں ہر طرح کے مضمون کا ادا کرنا مشکل ہے۔ اردو میں سانٹ کا رواج انگریزی ہی کے اثر سے ہوا لیکن اس کے غیر مقبول ہونے کی غالباً دو وجہیں ہیں۔ دونوں کا تعلق اس کی ہیئت سے ہے۔ اردو میں سانٹ لکھنے والوں نے ترتیبِ قوافی (Rhvme Schcme) اور بحر کی اہمیت پر دھیان نہیں دیا۔ اردو غیر مانوس ترتیبِ قوافی کو قبول نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ اس کے مزاج (Genius) سے ہم آہنگ نہ ہو اور خود سانٹ ایسی کسی بحر میں کامیاب نہیں ہو سکتی جس میں انگریزی کی سانٹ کی بحر (Iambic Pentameter) کی ایسی لچک اور لہروں کا سا اُتار چڑھاؤ نہ ہو۔ میں نے اس سانٹ میں شیکسپیئر اور ملٹن کے سانٹ کی ہیئت کو ملا کر ایک نیا تجربہ کرنے کی کوشش کی ہے اور بحر بھی ایسی رکھی ہے جو اگرچہ بہت سے معنوں میں انگریزی سانٹ کی بحر سے بہت دور ہو تو بہت سے معنوں میں نزدیک تر بھی ہے: ویسے ورڈز ورتھ کے تجربے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ Iambic Pentameter کی سی بحر اردو میں نہیں آ سکتی، جس کی وجہ اردو کی ساخت اور آوازوں کے 'کھرے پن' میں مضمر ہے۔ اس سانٹ کی حیثیت محض ایک تجربے کی سی ہے۔ اگر تجربہ ناکام سمجھا جائے تو قصور میرا ہے نہ کہ سانٹ کا۔

میں نے اس سانٹ کا موضوع بھی ویسا ہی رکھا ہے (یعنی عشقیہ) جیسا کہ اس کے خالقِ اوّل پٹرارک (Petrarch) نے رکھا تھا

جواں نظر میں زہرۂ جمیل و دل ربا ہو تم
حسیں بہار تم سے ہے جہاں میں رنگ تم سے ہے
دلِ جنوں طراز میں نئی امنگ تم سے ہے
زمانے کے کریہہ[1] عمل میں صوتِ جاں فزا ہو تم

حیات کی یہ وحشتی ریت مثلِ سنگ تم سے ہے
تمہاری آنکھ میں زمیں کے رقص کی ہیں مستیاں
محبتوں کی دیویوں کی گیسوؤں میں بستیاں
جہاں کا تپتا ریگ زار فرشِ رنگ تم سے ہے

مری نگہ میں کچھ نہیں جہان کی چیرہ دستیاں
بلیغ مسکراہٹوں میں ہیں پڑی ہی راحتیں
جو درک سکوں گا گر کہیں تری صباحتیں
ہمالیہ کا اوج ہو کہ وادیوں کی پستیاں

سیاہ ہجر کی شبوں میں نور کی ردا ہو تم
ہے عشق منزلِ حیات راہ کا پتا ہو تم

---

[1] یہ ترکیب بذاتِ خود کریہہ ہے (ع - م)

حیات اللہ انصاری

کوّا پری

"وہ دیکھو۔ وہ بیٹھی ہے۔"

"کون؟"

"کوّا پری۔"

"کہاں؟"

"وہ پیڑ کے نیچے، جھاڑی کے پیچھے۔ دیکھتے نہیں ہو اس کی دال کنارے کی ساری۔"

موہن نے جھک کر دیکھا تو ایک مرد کی گود میں کوئی عورت بیٹھی تھی جس کی ساری کا کنارا لال تھا۔

"وہی ہے؟"

"میرا من کہتا ہے کہ وہی ہے۔ آؤ چل کر دیکھیں۔"

"کیا وہ کیچڑ پار کر کے آسکتی ہے؟"

"ہو سکتا ہے یا کوئی کندھے پر لاد لایا ہوگا۔"

"کیسی کہی کی —— چلو دیکھیں۔"

موہن اور سوہن دونوں نے تھوڑا سا چکر لگایا اور پھر ایسے رخ پر آگئے کہ دونوں نے لال ساری والی عورت کے منہ کی جھلک دیکھ لی۔

"دیکھا وہی ہے نا۔"

"ہاں وہی ہے۔"

ان دونوں کو کسی سے دلی نفرت تھی۔ کالا رنگ اس پر اتنے بھڑکیلے کپڑے۔ بس یہیں وہ ان دونوں کی ماں کے برابر تھی۔ تبھی ہی وہ ان کی ماں کی ہی سی لگی۔ گاؤں کے ... گھرانے کی بہو ہو کر آج پیشہ کر رہی تھی اور وہ بھی اس طرح کہ پیشہ

والیوں کے بھی چراغ اس کے سامنے ٹمٹمانے لگے۔ یہ پکا چہرا اور اس پر دکھانے کے لئے مسکراتا اور اتراتا۔ گھن آتی تھی ان دونوں کی نوجوانی کو اسے دیکھ کر۔

موہن اور سوہن پسینے پسینے ہو رہے تھے۔ کیوں کہ ایک تو کاندھوں پر بیس بیس پچیس پچیس سیر کی گٹھڑیاں تھیں اور دوسرے کیچڑ میں پاؤں چپک چپک جاتے تھے۔ جن کو نکالنے کے لئے کچھ زور لگانا پڑتا تھا۔ دوپہر کو یہ لوگ شہر سے آنے والی لاری سے اتر کر اس پانی اور کیچڑ والے راستہ میں گھسے تھے۔ یہ چھ میل طے کرتے آدھا دن بیت گیا تھا۔ اور سورج افق پر پہنچ چکا تھا۔ لیکن اب بھی ذرا سی پٹی طے کرنے کو باقی تھی۔

پندرہ منٹ میں یہ لوگ جلی کلی کی عارضی آبادی کی سرحد پر آگئے۔ یہاں زمین ذرا اونچی ہو گئی تھی اور اسی جگہ نکڑ پر ان لوگوں کا ڈیرا یا چائے خانہ تھا۔ اس وقت وہاں پندرہ بیس آدمی بیٹھے چائے پی رہے تھے اور ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے چار پانچ تو سرکاری ٹھیکیدار تھے اور باقی ایسے لوگ جن کو گھروں سے بھاگتے وقت نقد یا زیور یا اور فروری سامان لینے کا موقع مل گیا تھا۔ ان کے علاوہ کچھ محنت مزدوری کرنے والے کسان تھے۔

دریاؤں کا زور اب بھی کم نہیں ہوا تھا۔ خاص کر ٹونج ندی تو اب بھی خشکی کو کاٹے چلی جا رہی تھی اور ذرا ذرا دیر بعد کگاروں کے کٹ کٹ کر گرنے کی خوفناک آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ان آوازوں کے ساتھ بیماروں کے کراہنے، بھوکے بچوں کے رونے، دردِ زہ میں مبتلا ہونے والیوں کی ہائے ہائے، اور لڑنے والوں کی گالی گلوچ کا مسلسل شور گڈمڈ ہو رہا تھا۔

سورج ڈوبتے ہی جلی کلی کا کاروبار قریب قریب بند ہو جاتا تھا۔ کیوں کہ

انسانوں کی طرح سانپوں نے بھی سیلاب سے بھاگ کر اسی سرزمین پر پناہ لی تھی۔ دن کو تو وہ جھاڑیوں اور درختوں میں چھپ جاتے تھے اور راتوں کو ہر طرف گھومتے تھے۔ یہاں روشنی کہاں کہ لوگ ان کو دیکھ سکتے۔ چراغ یا تو دو چار چائے خانوں میں جلتے تھے یا بنیوں کی دکانوں پر یا ان زمینداروں کے ڈیروں پر جو سیلاب کے منہ سے بھی اپنی دولت چھین لائے تھے۔ البتہ آٹھ دس روز سے اس بستی میں رات کو ایک خاص قسم کی چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ پیٹرومیکس لے کر سرکاری آدمی ادھر سے اُدھر گھومتے تھے۔ آہستہ آہستہ باتیں کرتے تھے۔ اور خاموشی سے کسی طرف سے آکر کسی طرف نکل جاتے تھے۔ یہ لوگ لاشیں اٹھواتے تھے۔ نوزائیدہ بچوں کی لاشیں، نوجوانوں اور بوڑھوں کی لاشیں، فاقوں سے مرنے والوں کی لاشیں، سانپوں سے مرنے والوں کی لاشیں اور اُن سُنی بیماری، پاؤں کی سڑن سے مرنے والوں کی لاشیں۔

پاؤں کی سڑن کی بیماری ان لوگوں کو ہوتی تھی۔ جو پانی لانے کے لئے کیچڑ پار کرکے دریا تک جاتے تھے اور وہاں سے گھڑے بھر بھر کر لاتے تھے۔ یہ کیچڑ دھیرے دھیرے ان کے پاؤں کو کھا جاتی تھی اور پھر دو تین دن کی بیماری کے بعد وہ ان تکلیفوں سے ہمیشہ کے لئے چھُٹ جاتے تھے۔

اس سیلاب کی ماری زمین پر کھانے کے ساتھ ساتھ پانی کا قحط بھی تھا۔ کیوں کہ دریا اور خشکی کے بیچ میں کیچڑ اور دلدل کی ایک لمبی پٹی پڑی تھی۔ اس وجہ سے پانی کا گھڑا کافی مہنگا بکتا تھا۔

موہن اور سوہن اپنی گٹھڑی لے کر چولھے کے پاس گئے۔ جہاں ان کا بوڑھا دادا بیٹھا خریداروں کے لئے چائے بنا رہا تھا۔ دادا نے پوچھا۔

"سودا کیسا رہا ؟"

"اچھا رہا دادا۔ اچھا اب تم جاکے آرام کرو ہم کام دیکھ لیں گے۔"

دادا کھانستا ہوا چائے خانے ایک گوشے میں جاکر پڑ گیا۔ وہ صبح سے مسلسل کام کرنے کی وجہ سے بہت تھک گیا تھا۔ موہن چائے بنانے اور سوہن اسے خریداروں تک پہنچانے میں لگ گیا۔ چائے کے علاوہ پان، سگریٹ، بیڑی، دیا سلائی، کھانے اور پینے کی تمباکو بھی بیچتے تھے۔ شہر سے آنے والے بیوپاریوں، سرکاری افسروں، مہاجنوں، زمینداروں اور ٹھیکیداروں کے کام کا صرف یہی ایک چائے خانہ تھا یہاں وہ پوریاں اور بھاجی بھی کھاتے تھے۔

موہن اور سوہن کو آئے ذرا ہی دیر ہوئی تھی کہ ہوری پانی کا گھڑا لے کر آیا اس کے دونوں پاؤں ٹخنوں تک کیچڑ سے اتنے لت پت تھے کہ وہ اگر پورا گھڑا ان کے دھونے میں خرچ کر ڈالتا تو جاکر صاف ہوتے۔ لیکن اس گھڑے کی قیمت سے اسے دال بھات خرید کر بچوں کا پیٹ بھرنا تھا۔ وہ بیٹھ کر لکڑی سے کیچڑ چھڑانے لگا۔

ہوری بولا "سوہن بھیا یہ دریا کا تیسرا پھیرا ہے۔ تین پھیروں سے کم میں اتنا نہیں ملتا کہ آدھا پیٹ بھی بھر جائے۔ مجھے دو ہفتے پاؤں کی سڑن کی بیماری نہ ہو۔ سُنا ہے کہ میرے بیل سرکاری آدمیوں نے بچائے ہیں اور پانی اُترنے پر شناخت اور گواہی کے بعد وہ مجھے مل جائیں گے۔ وہ مل گئے تو بچوں کے پیٹ بھرنے کا سہارا ہو جائے گا۔ پھر چاہے بھگوان مجھے اُٹھا لیں۔"

سوہن ڈھارس دینے لگا اور بولا:۔

"آج جو سرکاری افسر آئے ہیں وہ کہہ رہے ہیں کہ آٹھ دس دن میں سرکاری مدد آنے والی ہے۔"

"ایک ہفتہ سے یہی سُن رہے ہیں۔ مدد آئے تو جانیں۔ اور مدد کیا کرے گی کیا ہمارے کھیتوں کو پانی سے نکال لے گی، اور گھروں کو پھر بنوا دے گی؟ بیٹا بھگوان نے تم کو بچا لیا۔ نہیں تو آج بڑے بڑے مہاجن اور زمیندار فاقے کر رہے ہیں۔ لاکھوں اَوتار تک گھڑے بھر بھر گذارہ کر رہے ہیں۔"

قسمت کا یہ کھیل بھی عجیب تھا جس نے موہن اور سوہن کو ان بُرے دنوں میں بھی اچھی حالت میں رکھا تھا۔ بیس دن کے اندر اندر ان کا چائے خانہ چلنے لگا تھا۔

(۲)

ٹونیج ندی میں کہتے ہیں کہ سو سال ہوئے جب باڑھ آئی تھی اس کے بعد سے کبھی نہیں آئی۔ لوگ اس باڑھ کو بالکل بھول چکے تھے اور ندی کے کنارے کنارے مکان بھی بنا لئے تھے۔ موہن اور سوہن کے دادا بسیا کھی کا مکان بھی اسی کے کنارے ایک چھوٹے سے گاؤں میں تھا۔ ایک دن موہن جو پندرہ برس کا تھا پاس کے قصبے میں لگنے والے بازار گیا تھا۔ وہاں اس نے چائے، شکر، تمباکو، دیا سلائی اور دو ایک اور چھوٹی موٹی چیزیں خریدیں اور ان کو ایک پوٹلی میں باندھ کر واپس ہوا جب پکی سڑک پر پہنچا تو چیخنے پکارنے کی آوازیں سُنیں۔ ان کو سُنتے ہی وہ اپنے گاؤں کی طرف بھاگا۔ لیکن جب پکی سڑک سے اُتر کر گاؤں کی طرف جانے لگا تو لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔ کیوں کہ پانی کا دھارا بہت تیز بہہ رہا تھا۔ اس میں گاؤں کے چھپر، کھٹیاں، تخت، گاڑیاں، جانور بہہ رہے تھے۔ پکی سڑک کے کنارے سب لے کر

گھٹنوں تک پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ اس کا ریلا اتنا تیز تھا کہ قدم جمانا ناممکن تھا۔ وہ بہتے زمین درختوں تک کو جھکا رہا تھا اور اکھاڑ رہا تھا۔ انسان بہتے نظر آرہے تھے۔ جن میں سے کچھ لوگ درختوں کو پاکر ان پر چڑھ جاتے۔ بچانے والے بڑے درختوں سے رسیاں ادھر اُدھر پھینک رہے تھے اور جو چیز یا جانور یا انسان اس سے اٹک جاتا تھا بچ جاتا تھا۔ موہن سڑک کے کنارے روتا رہا اور بھائی، دادا، باپ، ماں سب کو آوازیں دیتا رہا۔ رات گئے انگریز افسر کی نگرانی میں سرکاری کشتیاں آئیں اور آدمیوں اور سامان کو بچانے لگیں۔ آدھی رات کے بعد پکی سڑک پر بھی پانی آنے لگا اور بارش بھی ہونے لگی۔ سرکاری کشتی نے سڑک پر پناہ لینے والوں کو لے جاکر جلی کل کے میدان میں اُتار دیا۔ جو آس پاس میں سب سے اُونچا مقام تھا۔

صبح موہن کو پتہ چلا کہ اس کے خاندان میں صرف بڈھا دادا بیسا کھی اور چھوٹا بھائی سوہن بچے ہیں۔ باقی گھر، اناج، بیل اور سامان، ماں باپ اور بہن ان میں سے کسی کا کوئی پتہ نہیں۔

جلی کل کے میدان میں جو اس وقت بہت پتلا اور بہت لمبا جزیرہ بن گیا تھا۔ ہزاروں آدمی ادھر اُدھر چادریں اور ٹاٹ کے ڈیرے تانے ہوئے پڑے تھے۔ جن میں چھ چھ سات سات مرد اور عورتیں اور بچے گھسے رہتے تھے ان ہی میں حاملہ عورتوں کو درد زہ ہوتا تھا۔ ان ہی میں مردہ یا زندہ بچے پیدا ہوتے تھے۔ ان میں ان کی مائیں مر جاتی تھیں۔ اور ان ہی میں انفلوئنزا، ملیریا اور کالرا سے لوگ مرتے تھے ۔۔۔ نہ تو بیماروں کو دوا ملتی تھی اور نہ مرنے والوں کو چتا یا قبر۔

بیسا کھی کو اس جزیرے کے بالکل کنارے جہاں کیچڑ ہی کیچڑ تھی بیٹھنے بھر کو جگہ مل گئی۔ دونوں لڑکوں نے کیچڑ میں پتے اور گھاس ڈال ڈال کر اس کو بیٹھنے کے قابل بنا لیا۔ رات بیٹھے بیٹھے کٹ گئی۔ صبح پانی ذرا کم ہوا تو موہن اور سوہن نے موہن کی پوٹلی کے سرمائے سے وہاں چائے کی دوکان کھول دی۔ شام تک ان لوگوں نے کافی پیسہ کما لیا۔ آدھے سے تو پیٹ بھرا اور آدھے سے اور سامان خریدا۔

ایک اتفاق یہ ہوا کہ جہاں بیسا کھی کا ڈیرا تھا۔ ادھر ہی سے شہر کو راستہ جاتا تھا۔ اور اس کے پاس ہی آکر سرکاری کشتیاں ٹھہرتی تھیں۔ چند روز کے بعد مہاجن جو کوڑیوں کے مول زیور خریدتے تھے اور سو فی صدی سود پر روپیہ قرض دیتے تھے اور زمیندار جو معمولی شرطوں اور چھوٹی چھوٹی رقموں میں کھیت خریدتے تھے اور بنئے جو کھڑی فصل ہی دیکھے خرید لیتے تھے۔ اور ٹھیکیدار جو جانے کن کن چیزوں کا ٹھیکہ سرکار سے لے کر آتے تھے مگر سوائے چائے پینے اور گھومنے کے کچھ نہیں کرتے تھے اور سرکاری افسر جو ادھر اُدھر گھومتے پھرتے تھے اور طوائفوں کے دلال جو کوڑیوں کے مول لڑکیاں خریدتے تھے اور باتیں بناتے تھے اور ان کے علاوہ وہ لوگ جو اپنے ساتھ روپیہ اور پیسہ بھی بچا لائے تھے یہ سب کے سب بیسا کھی کے یہاں آتے تھے اور چیزیں خریدتے۔

دو روز کے بعد جلی کل کا میدان جزیرے سے جزیرہ نما بن گیا۔ یعنی شہر جانے والا راستہ ایک طرف سے کھل گیا۔ لیکن راستے میں گھٹنوں گھٹنوں کیچڑ اور پانی تھا۔ موہن اور سوہن اسی راستے سے شہر سامان خریدنے جاتے اور خرید کر شام کو واپس آجاتے۔ یہ سامان دو چار روز چلتا اس کے بعد پھر ان دونوں کو جانا پڑتا تھا۔

موہن اور سوہن کو ہوری پر ترس آگیا۔ انھوں نے اسے ایک گلاس پانی دیا کہ اپنے پاؤں دھو ڈالے اور ایک پیالی چائے کی بھی مفت دے دی۔ یہ وہ دیا تھی جو اس علاقے میں ویسے ہی کم یاب تھی جیسے خشکی۔

جب شام بچپن سے گذر کر جوانی کو پہنچی تو محنت مزدوری کرنے والے تو چائے خانے سے رخصت ہو گئے۔ مہاجن بنئے اور ان کے تگڑے تگڑے ملازم ٹھیکیدار اور سرکاری افسر آگئے۔ اس وقت چائے خانہ کے پال کے نیچے دس بارہ آدمی جمع تھے۔ اور چائے، سگرٹ اور بیڑی چل رہی تھیں۔

لالہ بلونت نے جن کا سودا آج بہت ابھار رہا تھا۔ اپنے پہلوان ملازم سے جسے ننگوں اور بھوکوں سے اپنے روپیہ اور اپنی جان کی حفاظت کے لئے ساتھ لائے تھے کہا

"دیکھو وہ آتی ہے یا نہیں؟"

پہلوان نے چائے خانہ سے کچھ دُور جاکر ایک درخت کے سائے میں بیٹھی ہوئی عورتوں کو دیکھا اور پھر آکر خبر دی۔

"اس کا تو پتہ نہیں۔"

"کیا بات ہے۔ کئی دنوں سے اس کا پتہ نہیں چلتا۔ کچھ معلوم ہے کہ کہاں رہتی ہے وہ؟"

"پوچھوں"

"ہاں"

پہلوان نے باہر سے آکر کہا "کسی کو نہیں معلوم کہاں رہتی ہے"

پھر پہلوان کہنے لگا "ایک تازہ مال ہے۔ بڑی جوانی ہے اس پر۔"

"جانے بھی دو۔ دس دن میں سب دیکھ ڈالا ہے۔ یہ سب عورتیں نہیں ہیں گوبر کا چھوت ہیں۔ بس ایک ہے دبی۔"

یہ کہہ کر وہ گنگنانے لگا۔

"مجھ کو تو تم پسند ہو، اپنی نظر کو کیا کروں۔"

"بات یہ ہے کہ کل صبح واپس چلنا ہے۔ ذرا رخصت ہونے کے ــــ مگر کیا نام رکھا ہے ان لونڈوں نے کوآپری۔"

یہ آواز موہن اور سوہن کے کانوں میں جیسے ہی پڑی دونوں نے آہستہ سے کہا "کمینی۔"

یہ دونوں کوآپری سے سخت نفرت کرتے تھے۔ بات یہ تھی کہ وہ ان کے گاؤں کی مکھیا کی بہو تھی جس کی سارا گاؤں عزت کرتا تھا۔ جس کے پاس پیسہ بھی تھا اور علم بھی۔ ایسی عورت دس پندرہ دن کے اندر اندر رنڈی ہو کر ان کے چائے خانہ کے گرد منڈلانے لگی تھی۔ ان دونوں کو جب بھی موقع ملتا تھا اس کو جلی کٹی سنانے سے نہ چوکتے تھے۔ لیکن وہ تھی کہ سب کچھ گردن جھکا کر سن لیتی مگر اپنے طریقوں سے باز نہ آتی تھی۔

جلی کٹی کا سب سے بڑا اچکلا بیساکھی کے چائے خانہ کے سامنے درخت کے نیچے لگتا تھا۔

یہیں عورتیں آکر بیٹھ جاتی تھیں یا ٹہلتی رہتی تھیں۔ ان کی نہ کوئی الگ جگہ تھی نہ کوٹھے تھے نہ ڈیرے تھے اور نہ دلال۔ ان عورتوں میں نہ ترسانے والی نظریں تھیں نہ لگاوٹ کی باتیں اور سپردگی کی گھاتیں۔ ان کا ہر کام بہت سیدھا سادا ہوتا تھا۔ بس اگر مسکرانا اور رجھانا آتا تھا تو کوآپری کو ــــ اس لئے شہر سے آنے والوں میں سے جو اس کے پاس پہلے جاتے ان کو پھر اس کی چاٹ پڑ جاتی تھی۔

لالہ بلونت ایک بجے رات تک اس کی تلاش میں رہے اور پھر گالیاں دیتے ہوئے اپنے خیمے کو چلے گئے۔

(۳)

کوآپری جس کا اصلی نام لکشمی تھا دو دن سے ادھر نہیں آ رہی تھی۔ ہوا یہ کہ ایک دن بیساکھی کسی کام سے جا رہا تھا کہ اس کی نظر ایک ٹاٹ کے ڈیرے پر پڑی جس کے نیچے لکشمی بیٹھی ہوئی تھی۔ لکشمی نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔ بیساکھی کو بھی اس پر غصہ تھا لیکن گاؤں کا پاس کر کے وہ ٹھہر گیا اور پوچھا:۔

"تمہارے ساتھ کون کون ہے؟"

لکشمی نے اندر کی طرف اشارہ کر کے کہا "بس بچے ہیں۔ رامو، کلو اور مینا اور اور کوئی نہیں بچا۔"

"وہ بچ گئے تھے لیکن چوتھے دن پرلوک سدھار گئے۔"

"کیا ہوا تھا؟"

"پاؤں سڑن کی بیماری۔ رات بھر میں زہر پھیل گیا اور صبح ختم ہو گئے۔"

"کچھ مال زیور نہیں تھا۔"

"زیور بچا تھا۔"

"وہ کیا ہوا ہے۔"

"ان کے انتم سنسکار میں اونے پونے بک گیا۔ سو روپے کی تو صرف لکڑی آئی۔"

"تجھے اور کوئی دھندا نہ ملا؟"

لکشمی خاموش رہی۔

"رامو اور کلو پانی ہی بھر سکتے تھے۔"

لکشمی خاموش رہی۔

"ایک لڑکے کو چائے خانہ میں کام کرنے بھیج دو۔ اس کا تو پیٹ بھر ہی جائے گا۔"

لکشمی خاموش رہی۔

بیساکھی آگ بگولا ہو کر بولا۔

"ادھر آئی تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔ ذرا ڈیرا تو کوئی دیکھے۔ ہم کو تو چائے خانہ کے باوجود میسر نہیں ہوا۔"

یہ کہہ کر وہ غصے سے پاؤں پٹکتا ہوا چلا گیا۔

اس دن سے کوآپری چائے خانہ کے سامنے دکھلائی نہیں دی۔

جب پہلے دن نہیں آئی اور پھر دوسرے اور تیسرے دن نہیں آئی۔ تو بیساکھی، موہن اور سوہن سمجھے کہ وہ راستہ پر آ گئی ہے۔ لیکن اس دن شہر سے آتے ہوئے اسے موہن اور سوہن نے اپنے دھندے میں لگا ہوا دیکھ لیا۔

موہن اور سوہن کو اپنے گاہکوں کی زبانی کوآپری کی جو باتیں معلوم ہوئیں ان سے پتہ چلا کہ اب اس کو گاہکوں کے انتظار میں اس کے چائے خانہ کے سامنے آکر بیٹھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ کیونکہ گاہک خود اس کی تلاش میں گھومتے رہتے ہیں اور دو ایک پیسہ والوں نے تو اسے بالکل اپنا لیا ہے۔

ایک دن بیساکھی کے گاؤں کے وہ سب لوگ جن کا شمار آج کل صاحب حیثیت لوگوں میں تھا۔ چائے خانہ میں اکٹھے تھے۔ اس وقت کوآپری کی بات نکلی۔ سب نے اسے گالیاں دیں۔ اگر گاؤں کی کوئی معمولی لڑکی ہوتی تو کوئی خاص بات نہ ہوتی۔ لیکن مکھیا کی بہو ہو کر اس طرح پیشہ کرے یہ چیز بہت شرمناک ہے۔ کہنے والے کوآپری کا تو کچھ نہ

بگاڑ سکتے تھے۔ ان ہی لوگوں کی طرف انگلیاں اٹھاتے تھے کہ دیکھو یہ ان ہی کے گاؤں کے مکھیا کی بہو ہے۔ اس موقع پر جوانوں نے گالیاں دیں اور بڈھوں نے اس پر تھوکا۔ آخر یہ طے پایا کہ دو چار بڑے بوڑھے چل کر اسے شرمندہ کریں اور اس کو یہ کام چھوڑنے پر مجبور کریں۔

دوسرے دن صبح کو گاؤں کا مہاجن لالہ پکوڑی مل، بڑے زمیندار شوبھا سنگھ ایک اور زمیندار مہاراج سنگھ اور بیساکھی لکشمی کے گھر چلے۔ جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ اس کا ڈیرا اپنی جگہ پر نہیں ہے۔ آس پاس پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ جس دن بیساکھی نے کوا پری کو بُرا بھلا کہا تھا۔ اسی رات کو کسی وقت وہ کچھ مردوں کی مدد سے اپنا ڈیرا کسی اور جگہ لے کر چل دی۔ یہ لوگ یہ خبر سُن کر کوا پری کو بُرا بھلا کہتے ہوئے واپس آنے لگے۔ لیکن مہاراج سنگھ نے جس کی رگوں میں جوانی کا خون جوش مار رہا تھا کہا کہ اسے چلو پتہ لگائیں کہ کہاں گئی ہے۔ زیادہ دُور نہیں گئی ہوگی۔ اس وقت سبھوں پر غیرت کچھ ایسی سوار تھی کہ بیساکھی اور پکوڑی مل اپنا کاروبار بھول گئے اور شوبھا سنگھ اپنا حقہ۔ تینوں پیچھے پیچھے اور شوبھا سنگھ آگے پوچھ گچھ کرنے لگے کہ کہیں کوئی نیا ڈیرا تو نہیں لگا ہے۔

اب پانی بڑھنا رُک گیا تھا اس وجہ سے پناہ گزینوں کا آنا بند ہو گیا تھا۔ اس صورت میں نیا ڈیرا ایسی چیز تھا جس پر لوگوں کی نگاہ پڑنا چاہیئے تھی۔ دھوپ سخت تھی اور سائے کے درخت برائے نام تھے۔ اس وجہ سے دو گھنٹہ میں پکوڑی مل اور مہاراج سنگھ جو آرام کے عادی تھے تھک گئے اور کوئی سایہ کی جگہ آرام کے لئے ڈھونڈنے لگے۔ آخر دور پر ایک چھوٹے سے تال کے پار جس کا پانی سب پیا جا چکا تھا۔ اور اب صرف کیچڑ ہی کیچڑ رہ گئی تھی۔ انھیں ایک ٹین کا شیڈ نظر آیا۔

تال کے گرد کیچڑ اور بھیگی گھاس سے گزر کر یہ لوگ چیخوں، آہوں، کراہوں اور ہائے ہائے کے نرغے میں آگئے۔ اس جگہ شیڈ کے نیچے وہ سرکاری اسپتال تھا جو ابھی چند دن ہوئے پاؤں کی سڑن کے مریضوں کے لئے کھولا گیا تھا۔ اس کے اردگرد کوئی دیوار نہیں تھی۔ سُنا گیا کہ دو روز ہوئے یہاں سے کوئی سیار یا لکڑ بگھا کسی بچے کو اٹھا لے گیا تھا۔ اسپتال میں ریلوے سلی پر ڈال ڈال کر بستر بنا دیئے گئے تھے جن پر مریض لیٹے ہوئے ہائے ہائے کر رہے تھے۔ اس وقت ان کی دیکھ بھال کے لئے ڈاکٹر، نرسس یا کمپونڈر کوئی نہیں تھا۔ ان ہی کراہوں اور آہوں کے ملنے میں کوا پری کو جگہ ملی تھی۔ سامنے درخت کے نیچے اس کا مریٹوں کا پال پڑا ہوا تھا۔ اس سے پندرہ ہی بیس گز پر دریا کا تیز دھارا تھا۔ جو خشکی کو کاٹتا چلا آ رہا تھا۔ اور ہر گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد وہاں سے کگاروں کے کٹ کٹ کر گرنے کی بھیانک آوازیں آتی تھیں۔

پال کے باہر بیٹھی کوا پری کھانا پکا رہی تھی ——— اسے دیکھتے ہی بڑے زمیندار شوبھا سنگھ گرجے ———

"کیوں ری کلموہی۔ گاؤں کی ناک کٹوا رہی کر رہی ہے گی۔ ارے کیا کوئی تجھے دو روٹی دینے والا نہ ملا جو اس پیشے پر اُتر آئی۔"

کوا پری نے دبی ہوئی آواز سے کہا۔

"بابو جی آپ نے تو میرے ہزار کے زیور کے سو روپے لگائے تھے۔"

"اور کیا لگاتا۔ جو مال خریدا جاتا ہے وہ تو بازار کے بھاؤ ہی پر خریدا جاتا ہے۔"

"شہر کے مہاجن نے تو تین سو میں خرید لئے۔"

"جھوٹ بکتی ہے۔"

"لالہ جی سے پوچھ لو ان سے میں نے کاغذ پر گواہی لگانے کے لئے کہا تھا۔"

لالہ جی بولے "میں نے نہ گواہی دی اور نہ جانوں۔"

"گواہی تو نہیں دی تھی مگر تم جانتے تو ہو۔ تو دو پچا تھا خریدنے والے سے۔"

بیساکھی۔ "اب تو وہ بک گئے۔ وہ بات ختم ہو گئی۔ اب تو کیا کہتی ہے۔"

"میں کیا کہوں۔ تم کیا کہتے ہو۔ کون مجھے اور میرے بچوں کو رکھے۔ اور پڑھائے گا۔"

"پانی اُتر جانے دو۔ یہ بات پنچائت کے سامنے رکھی جائے گی۔"

"پانی اُترنے تک میں کیا کروں۔"

"کہا تو کہ بڑے لڑکے کو میں کھلا سکتا ہوں۔"

"باقی دو اور ہیں۔"

بیساکھی نے شوبھا کی طرف دیکھا۔ وہ دھیرے سے بولے:۔

"بھئی میرے ڈیرے میں ذرا جو جگہ ہو۔ لڑکیاں، بہوئیں سب ہیں۔ اگر اس نے دھندا نہ کیا ہوتا تو دوسری بات تھی۔"

لالہ۔ "اگر تم اسے کوئی کام دلا دو تو میں رکھ لوں گا۔"

بیساکھی۔ "ٹھیکیدار صاحب مٹی ڈلوانے کا کام کرا رہے ہیں۔ کہو تو وہاں رکھوا دوں۔"

کوا پری۔ "میں اور میرے بچے کیا صبح سے رات تک ٹوکری ڈھو سکتے ہیں۔"

شوبھا۔ "تجھے تو آرام کی روٹیوں کی چاٹ لگ گئی ہے۔ لے جاؤ اسے زبردستی ٹوکری والوں میں بھرتی کرا دو۔"

مہالنچ- "میں رکھ سکتا ہوں۔ اگر تم پنچوں کی رائے ہو۔ (آہ سرد بھر کر) میرے گھر میں تو اب کوئی نہیں رہا۔ میرا ڈیرا تو بالکل خالی پڑا ہے۔"

بیساکھی۔ "جاؤ وہاں چلی جاؤ۔"

کواپری۔ "پھر تو تم لوگ انگلیاں نہیں اٹھاؤ گے؟"

اب تو شوبھا کو غصہ آ گیا۔ "آوارہ، کمینی، جانے کیسے بڑے گھرانے میں پیدا ہو گئی۔ اگر ذرا بھی غیرت ہوتی تو نوکری ڈھونڈتی، پانی بھرتی۔ جو کام بھی مل جاتا کر لیتی، لیکن یہ دھندا نہ کرتی۔"

"اس کی اصلاح کیا ہو گی۔ آؤ بھائی بیساکھی۔ تم کتے کی دُم کو سیدھا نہیں کر سکتے ہو۔"

شوبھا لال اور بیساکھی آگے آگے چلے مہالنچ پیچھے۔ چلتے وقت مہالنچ نے کواپری کو غور سے دیکھا اور کہا۔ "آ جاؤ۔ جو انگلی اٹھائے گا سالا اُس کی انگلی توڑ دوں گا جیسا وقت ہوتا ہے ویسا کام کیا جاتا ہے اور جو یہ نہ دیکھے وہ اندھا ہے۔"

کواپری نے کوئی جواب نہیں دیا۔

(۴)

لالہ بلونت دس دن کے بعد پھر شہر سے آئے۔ لیکن اب ان کے تیور دوسرے تھے۔ انھوں نے آتے ہی موہن اور سوہن سے کہا۔ "یہ چائے خانہ اس جگہ سے ہٹا لو۔ اس جگہ سرکاری گودام بنے گا۔ یہاں سے کشتیوں کے اڈے تک سیلی پٹ بچھا کر راستہ بنایا جائے گا۔ کشتیوں سے سامان لا لا کر یہاں ڈھیر کیا جائے گا۔ یہ انگریزی سرکار کا حکم ہے اور میں اب سرکاری ٹھیکیدار ہوں۔"

بیساکھی کی آمدنی دس دن سے بہت اچھی ہو رہی تھی اور کچھ روپیہ اخراجات سے بچ کر ایک ہانڈی میں جمع بھی ہونے لگا تھا اور یہ اُمید ہو چلی تھی کہ اگر یہی دو مہینہ اور رہ گئی تو اتنا اکٹھا ہو جائے گا کہ بیساکھی اپنا گھر پھر بنا لے۔ لیکن اب جو یہ حکم ملا ٹھیکیدار صاحب کا تو اس کا دم سوکھ گیا۔ یہاں سے کہاں جاؤں گا۔ جب اس سرزمین پر آیا تھا تب کی بات دوسری تھی لیکن اب تو ہر طرف چائے اور کھانے کی اور ہر طرح کی دکانیں نظر آتی ہیں۔ بہت سے دکاندار تو شہر سے ہر طرح کا سامان لے کر آ گئے ہیں۔ ان کے مقابل جمنا ناممکن ہے۔ بیساکھی کی دکان میں نہ تو ٹھیک برتن تھے اور نہ بیٹھنے کا کوئی اچھا انتظام۔ سرکی کا پال لگا ہوا تھا۔ لیکن جہاں بارش ذرا سے ہونے لگتی وہ جگہ جگہ سے ٹپکنے لگتا۔ یہ دکان تو صرف اپنے محل وقوع کی وجہ سے چل رہی تھی اگر وہ یہاں سے ہٹی تو سمجھو کہ ختم ہو گئی۔

لالہ بلونت کی بات سن کر بیساکھی، موہن اور سوہن تینوں پر بجلی گر پڑی مکان بنانے اور اپنا کام پھر سے شروع کرنے کے خواب بھول کر اپنے گھر والوں کی موت پر آنسو بہہ گئے۔

اُترے ہوئے چہروں اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے یہ لوگ کام کر رہے تھے ہر چائے کی پیالی ٹھنڈی سانس کے ساتھ رکھی جاتی اور ڈیرے کی دیواروں اور چھت پر جو نظر پڑتی وہ واپس نہیں پڑتی۔

منت سماجت، گڑگڑانا، قدموں پہ گرنا یہ سب کام ختم ہو چکے تھے اور اب کوئی اُمید نہ تھی۔

رات ڈھل چکی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے مارے مارے گھوم رہے تھے جن سے چاند کبھی چھپتا اور کبھی ظاہر ہوتا۔ لالہ بلونت کا ابھی جی گھبرا رہا تھا اور رات کاٹنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ بیساکھی کے چائے خانے کے سامنے کے اور دوسری جگہوں کے وہ کئی چکر کاٹ چکے تھے۔ ایسے موقع پر پہلوان ہوا ان کے ساتھ تھا وہ کھسک کر چائے خانے کے اندر موہن اور سوہن کے پاس پہنچا اور کہنے لگا۔

"کیوں جی اب وہ تم لوگوں کی کواپری نہیں آتی۔ کہاں ہے وہ؟"

"ہم کیا جانیں۔ ہو گی کہیں۔"

"تم لوگ ابھی تک بدھو ہو۔ تم سے چھوٹے لڑکے شہروں میں ایسی باتوں کو سمجھنے لگتے ہیں۔"

"اور یہ بھی جانتے ہو کہ لالہ جی اس کے لئے تڑپتے رہتے ہیں۔"

"ہوں گے۔"

"ہوں گے نہیں۔ وہ مل جائے تو تمھارا کام بن سکتا ہے۔"

"یہ کیسے؟"

"یہ اپنے دادا سے پوچھ لو۔"

موہن اور سوہن بدستور کام کرتے رہے۔ کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔

پہلوان کھنکھارتا ہوا بیساکھی کے پاس پہنچا اور دیر تک اس کو سمجھاتا رہا۔ بیساکھی چُپ چاپ بیٹھا سنتا رہا۔

پہلوان۔ "بھائی بیساکھی، اگر لالہ جی چاہیں تو اسی زمین کو جو تمھاری دکان کے سامنے ہے مٹی ڈلوا کر یا سلیپٹ رکھوا کر اونچا کرا سکتے ہیں اور وہاں گودام بنوا سکتے ہیں۔ لیکن یہ کام تو اس وقت ہو گا جب ان کے دل کے بہلنے کا ہم لوگ کوئی انتظام کر دیں۔"

بیساکھی۔ "عورتیں بہتیری ہیں۔ کوئی وہی ایک تو رہ نہیں گئی ہے۔"

پہلوان: "بات ٹھیک ہے۔ لیکن دیا تو اس میں ملتا ہے جو جی پر چڑھ جائے۔"

بیساکھی: "اس لکھو جی میں کیا دھرا ہے۔"

"یہ تو تم لالہ جی سے پوچھو — جس دن یہاں سے چلے ہیں ایک بجے رات تک اسے بستی میں ڈھونڈتے پھرے اور آج بھی جب سے شام ہوئی ہے ان کی نظریں اسی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔"

"تو کیا اب مجھ سے یہ کام بھی ہوگے؟"

"یہ تو دنیا کا رنگ ہے۔ اب تم سے کیا بتاؤں کن ترکیبوں سے لالہ جی نے مارٹین صاحب سے یہاں کا ٹھیکہ لیا ہے۔"

بیساکھی کا چہرہ شرم سے کسی زخمی کی طرح تپنے لگا۔ وہ کچھ بولا نہیں۔

جب رات اور چڑھ گئی تو پھر پہلوان چائے خانے میں آیا اور لڑکوں سے کہنے لگا...

"تم لوگ چاہتے ہو کہ دکان رکھو۔ کبھی پنپ نہیں سکتے ہو یہ سمجھو۔"

بڑا بھائی موہن کہنے لگا۔

"کو ہی آگئی۔"

"کیا مطلب؟"

"پرسوں بازار میں شیو چھٹی ساری پہنے ہوئے ملی تھی۔ نہ ہونٹوں پر لالی تھی نہ آنکھوں میں سرمہ۔ نہ ہاتھوں میں چوڑیاں اور نہ کانوں میں زیور اور نہ بالوں میں تیل۔ اس نے مجھے دیکھ کر پکارا "موہن بیٹا ذرا میری بات سنو۔" میں جب اس کے پاس نہیں گیا تو وہ خود آکر کہنے لگی۔ "بیساکھی دادا سے کہہ دینا کہ میں اب ان کی بتلائی راہ پر چل رہی ہوں۔ کل یا پرسوں شہر جا کر کی اور دوبارہ دکان رکھ کر بچوں کو پڑھاؤں گی۔ اس طرح کو اپنی اب پھر لکشمی بن گئی ہے۔"

پہلوان پریشان کر زور سے ٹھٹھا مار کر ہنسا۔

"تم بھولے دیہاتی اس کی باتوں میں آگئے۔ اس کی پارسائی واہ وا۔ ستر چوہے کھا کر بلی حج کو چلی۔ کبھی ایسا دنیا میں ہوا ہے جو اب ہوگا۔"

پہلوان نے پھر کر بیساکھی سے دیر تک باتیں کیں۔ لیکن نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔

دوسرے دن جیسے ہی صبح ہوئی دس مزدور بیساکھی کی دکان پر آگئے اور بولے اپنا سامان ہٹا لو ورنہ یہ سب خراب ہو جائے گا ہم یہ زمین صاف کریں گے۔

مزدوروں پر خوشامد کا کیا اثر ہوتا۔ وہ کہنے لگے۔ اوپر سے حکم ملا ہے وہ ہم کریں گے۔

بیساکھی اور موہن اور سوہن نے ان لوگوں کو اتنا راضی کر لیا کہ ہم لوگ لالہ جی سے ایک بار اور کہہ لیں۔ اگر وہ نہ مانے تو اپنا سامان لے کر کہیں چلے جائیں گے۔

لالہ جی نے تو ان لوگوں سے بات بھی نہ کی۔ البتہ پہلوان ان کے پاس آکر بیساکھی سے کھسر پھسر کرنے لگا۔ دو چار راہ گیر بھی جن میں ایک بیساکھی کے گاؤں کا تھا۔ اس موقع پر اکٹھے ہوگئے تھے اور وہ بھی بیساکھی کو سمجھانے لگے۔

گھنٹے بھر کے بعد بات چیت نے دوسرا رخ اختیار کیا۔ پہلوان لالہ جی کے پاس گیا ان کے کان میں کچھ کہا پھر بیساکھی، موہن اور سوہن کے پاس آیا اور ان کو لے کر لالہ جی کی خدمت میں گیا۔

لالہ جی ان کی صورت دیکھتے ہی کہنے لگے "اچھا جاؤ۔ آج دن بھر کی اور رات بھر کی اور کل دن بھر کی چھٹی ہے۔ اگر کل رات کو بھی کام نہ بنا تو پھر میں پرسوں صبح کوئی بات نہ سنوں گا۔"

آگے آگے موہن اور سوہن اور پیچھے پیچھے بیساکھی اور اس کے گاؤں کے آدمی باتیں کرتے چلے۔ پہلوان بھی ساتھ تھا۔

"لکشمی تو ایسی ہے ہی۔"

"ایسی نہ ہوتی تو یہ حرکت کیوں کرتی۔"

"اس کے نخروں میں آنا بے وقوفی ہوگی۔"

"مگر کیا کہنا مان جائے گی؟"

"کیوں نہ مانے گی پیسے بھی تو ملیں گے اور پھر گھری بنیں گے۔"

پہلوان: "لالہ جی پیسے دینے میں تو اپنے وقت کے مہاراجہ ہیں۔ اس بستی میں جب تک لالہ جی ہیں اس کی چاندی رہے گی۔"

"لکشمی تو ایسے موقع کی تلاش ہی میں رہتی ہے۔ وہ تاکید کرنے لگی۔"

بیساکھی: "پھر کون جائے اس سے کہنے؟"

پہلوان: "موہن کو بھیجو۔ وہ اسے بہت کچھ کہتا سنتا رہا ہے۔ اس وجہ سے اس سے بے تکلفی بھی ہے۔ اسی نے اس کا نام کو اپری رکھا ہے اور چھیڑ چھاڑ ہوا کرتی تھی۔"

بیساکھی: "بیٹا موہن، جاؤ گے؟"

موہن: "مجھ سے کہتے نہ بنے گا۔"

"بیٹا پھر دکان جاتی ہے اور اس کے ساتھ گھر بسانے کا سپنا بھی۔"

گاؤں والے: "چلے بھی جاؤ۔ جب وہ یہ کام کرتی ہی ہے۔ تو اس کو ایک نیا گاہک

دلا دینا تو دَیا کا کام ہے۔"

"اور وہ یہ کام چھوڑ چکی ہے تب۔"

"کیا بات کہی ہے تم نے۔ کہیں جنگل بن پاپو ہوتے ہیں۔ کہیں شرابی کے منہ سے شراب چھوٹتی ہے۔"

"اور جاؤں تو کیسے بات کروں۔"

پہلوان۔ "یہ مجھ سے سنو۔"

پہلوان دنیا دیکھے ہوئے تھا۔ اس نے بتایا کہ جا کے پاس بیٹھنا۔ اس کی تعریف کرنا کہ تم نے مردوں کی طرح حالات کا مقابلہ کیا۔ پھر کہنا کہ تم نے جو کچھ کہا تھا وہ مذاق تھا۔ ورنہ تم تو چاہتے تھے کہ اس کے پاس پیسہ آئے۔ اس کے بعد کہنا کہ لالہ جی تم پر عاشق ہیں اور بہت سا روپیہ دینے کو تیار ہیں۔ ان کو خوش کردو گی تو پھر اتنا پیسہ مل جائے گا کہ گاؤں جا کر بچوں کے لئے چھوٹی موٹی دکان کھول دو اس کے بعد چپکے سے رازدارانہ کہنا کہ کسی کو اس بات کی کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ اس کا ذمہ میرا ہے۔

پہلوان نے بات پھر اس طرح سمجھائی کہ دماغوں پر جو گرد و غبار تھا وہ صاف ہو گیا۔ بیساکھی اور موہن اور سوہن تینوں کو کام آسان نظر آنے لگا۔

بیساکھی۔ "اور یہ بھی کہہ دینا کہ پنچایت کو ہم دیکھ لیں گے اس کی طرف سے بے فکر رہے۔"

چائے خانہ آکر پہلوان نے مزدوروں کو واپس بھیج دیا۔ بیساکھی اور موہن اور سوہن کے دل سے غم کا پہاڑ سرک گیا۔ کیوں کہ اب تینوں کو یقین تھا کہ کام ضرور بن جائے گا۔

جب موہن چلنے لگا تو سوہن کا جی بھی للچانے لگا کہ میں بھی اس کے ساتھ جا کر جیتی ہوئی بازی میں حصہ بٹاؤں۔ اس نے کہا "بھیا میں بھی چلوں گا۔"

لکشمی سادی ساری میں کام کاج میں لگی ہوئی تھی اور اس کے بچے میلی مٹی سے گھروندا بنا رہے تھے۔

لکشمی موہن اور سوہن کو دیکھ کر خوش ہو گئی۔ ان دونوں کو پہلی مرتبہ لکشمی میں ایک باوقار حسن نظر آیا۔ لکشمی نے دونوں کو بٹھایا اور ڈلی کے دو دو دانوں سے ان کی خاطر کی۔

موہن نے بات شروع کی۔ پہلے تو اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ لیکن لکشمی جب توجہ سے سننے لگی اور ہاں ہاں کر کے اس کی ہمت افزائی کرنے لگی تو موہن کی زبان کھل گئی اور ساتھ ساتھ سوہن کی بھی، دونوں نے پہلوان کی بتائی ہوئی تقریر کو خوب پیش کیا۔ الفاظ میں ادا کیا۔

لکشمی اصل بات سن کر خوش ہونے کے بجائے آب دیدہ ہو گئی۔ ساری کے پلو سے آنسو پونچھ کر بولی۔

"موہن بھیا، تمہاری بڑی دیا ہو گی۔ اگر تم اب ان باتوں کو بھول جاؤ۔ میں تو بچوں کے پتا جی کے ساتھ گاؤں کو بھی پھونک چکی۔ اب تو ان بچوں کو شہر میں پالنا ہے دیکھوں کیا ہوتا ہے۔"

ان آنسوؤں کو دیکھ کر موہن اور سوہن کی ہمتیں ٹوٹ گئیں اور وہ لوٹ آئے۔

پہلوان ان دونوں کی رپورٹ سن کر بہت جھنجلانے لگا۔ "ارے تم لوگ کس کام کے ہو۔ آخر ہو نا بچے۔ بیساکھی بھائی اب تم۔ یہ بیل بچوں سے نہیں منڈھے چڑھے گی۔"

بیساکھی نے گردن ہلا کر ہاں کر دی۔

لکشمی نے بیساکھی کا سواگت ویسے ہی کیا جیسے ہر کا کیا جاتا۔ بیساکھی نے پہلے تو پہلوان والی تقریر چلائی۔ لیکن وہ بہت جلد اصل بات پر آگیا اور بتلا دیا کہ دکان کھد رہی ہے۔ موہن اور سوہن کا مستقبل خطرے میں ہے۔ بلکہ برباد سمجھو۔ بس اگر کوئی امید ہے تو صرف لکشمی کی ذات سے اگر وہ شرافت دکھلائے اور اس آڑے وقت میں کام آ جائے تو بگڑی بن جائے گی۔

لکشمی پیٹھ پھیرے بیٹھی رہی اور بیساکھی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

بیساکھی نے پھر بہت دردناک طریقہ پر اپیل کی۔

"میں نے جو کہا سنا ہو وہ معاف کرو۔ اب اس بڑھاپے میں در در کی بھیک نہ منگواؤ۔ آخر ہم لوگ کیا کریں گے اگر دکان کھد گئی۔ میں تو تیرے بچوں کو اپنا سمجھ کر دکان پر رکھنے کو تیار ہو گیا تھا اس وقت تو کبھی دیا کر۔"

لکشمی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

جب بیساکھی چلنے لگا تو اس نے پوچھا۔ اس کی آواز میں بڑا درد تھا۔

"رات چائے خانے پر آؤ گی؟"

"نہیں۔"

یہ رات بھی لٹے چہروں، کانپتے ہاتھوں اور سرد آہوں والی رات تھی آج بات پھوٹ گئی تھی اور مستقل آنے والے گاہکوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ کل یہ چائے خانہ نہیں رہے گا۔ سب کو افسوس تھا۔ اور افسوس سے زیادہ سب کو لکشمی پر غصہ تھا۔ اس کے لئے کون سی بڑی بات تھی اگر ایک رات صرف ایک رات سہی۔ تو یہ اس کے بعد بھی کی جا سکتی تھی۔ اور اس تو یہ ہیں سب ہاتھ بٹانے کو تیار رہتے۔

ایک گاہک نے سب حال سن کر کہا۔

"جو چیز وہ کھو چکی ہے۔ اب وہ واپس ملنے سے رہی۔ پھر اگر اس بربادی سے کوئی گھر بس جائے تو اس کا کیا بگڑے گا۔ ؟ شرافت اور دیا تو ہوتی ہی نہیں ایسوں میں۔"

"ہو تو وہ اس نوبت کو کیوں پہنچیں۔"

دوسرے دن شوبھا اور مہاراج نے کہا چلو ہم سمجھائیں یہ لوگ گئے تو دم بکے ہو کے رہ گئے۔ بیساکھی اور موہن اور سوہن انتظار کرتے رہے۔ ہوتے ہوتے شام ہو گئی اس وقت چائے خانے میں بہت سے نئے آدمی آگئے اور یہ لوگ ان کے لئے چائے اور پوریاں تیار کرنے میں لگ گئے۔ بہت دیر کے بعد شوبھا اور مہاراج واپس آئے بیساکھی کی مہاراج سے آنکھیں چار ہوئیں تو مہاراج نے مسکرا کر گردن ہلا کر ہاں کر دی۔

جب گاہکوں کا زور ختم ہو گیا تو شوبھا نے کہا کہ وہ بچوں کو لے کے جانے کہاں چلی گئی تھی۔ شام کو لوٹ کر آئی۔ بہت سمجھایا۔ آخر راضی ہو گئی کہا ہے۔ گیارہ بجے رات کے بعد چائے خانے کے پچھواڑے آؤں گی۔

پھر اڑے ہوئے چہروں پر رنگ اور کانپتے ہاتھوں میں زور آگیا اور سرد آہیں مسکراہٹ سے بدل گئیں۔ نئے گاہک ہنسی اور قہقہے اٹھاتے رہے۔ پانی گھٹ رہا تھا اس لئے آج اجڑے ہوئے کسانوں کو دوبارہ بسانے کے لئے قرض دینے نئے نئے صاحب آگئے تھے۔ آتے ہی ایک دن میں ان کا کاروبار کافی جم گیا تھا۔ دس بجے رات کے قریب یہ لوگ رخصت ہو گئے۔ تب شوبھا نے کہا: "اب آتی ہوگی۔"

چائے اور حقہ چلتا رہا۔ دوبارہ بسنے کی اسکیمیں بھی بنتی رہیں۔ رات ڈھلتی رہی۔

آدھی رات کے بعد پہلوان نے لالہ جی سے آکر پوچھا۔

"آئی نہیں۔"

"نہیں، مگر آتی ہوگی۔ اس نے وعدہ کر لیا ہے۔"

رات ڈھل گئی، مگر وہ آئی نہیں۔ اب تو ان لوگوں میں بے چینی پیدا ہونے لگی۔ چہروں کے رنگ پھر اڑنے لگے۔ ہاتھ پھر کانپنے لگے۔ اور سرد آہیں پھر نکلنے لگی تھیں۔ وہ لوگ کشتی کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے تھے۔ شوبھا، مہاراج اور پہلوان بھی ان سے کچھ کم بے چین نہ تھے۔

رات اور ڈھل گئی اور وہ نہیں آئی۔

پھر رات اور ڈھل گئی اور وہ نہیں آئی۔

منہ لٹکا کر پہلوان نے کہا: "لالہ جی تو اب کل صبح دکان ہٹوا کے رہیں گے۔ اب وہ نہیں ماننے کے۔"

جب کشتی پھر بھی نہیں آئی تو ان لوگوں کو طرح طرح کے اندیشے ہونے لگے۔

کہیں وہ بیمار پڑ گئی ہو۔

کہیں اسے سانپ نے نہ ڈس لیا ہو

کہیں زیادہ اچھا گاہک نہ مل گیا ہو۔

آخر میں طے پایا کہ سب چل کر دیکھیں کہ کیوں نہیں آئی۔

اندھیری رات تھی، انسانوں کی چہل پہل غائب ہو چکی تھی۔ کنگارے کٹ کٹ کر گر گئے تھے۔ بیمار ہائے ہائے کر رہے تھے۔ ڈیروں میں بھوکے بچے رو رہے تھے اور سرکاری آدمی ادھر ادھر پیٹرومیکس لئے ڈیوٹی دے رہے تھے۔

ان چاروں آدمیوں کا قافلہ ایک لالٹین، دو لاٹھیاں لئے ڈیروں سے کتراتا سانپوں کو دیکھتا اور رونے کی آوازوں کو سنتا چلا جا رہا تھا۔ بیچ بیچ میں ایک دو فقرے زبان سے نکل جاتے تھے۔

"کیوں نہیں آئی۔"

"وعدہ کر کے پورا نہ کیا۔"

"شام کو آخر وہ تھی کن تیاریوں میں۔"

"دوسرے کی طرح جو مرد اس کے ساتھ آیا تھا وہ کون تھا۔"

اسپتال کی ہائے ہائے سے گھرا ہوا آخر کشتی کا پال نظر آگیا۔ اس کے نیچے بالکل اندھیرا تھا اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ شوبھا نے موہن سے لالٹین چھین کر اندر جھانکا۔ نہ وہاں بچے تھے نہ فرش اور نہ سامان وہاں تو سوائے سناٹے کے کچھ نہ تھا۔ بس صرف سرکیوں کا پال رہ گیا تھا اور اس کا ایک بانس کسی ضرورت سے نکال لیا گیا تھا۔ ظاہر تھا کہ کہیں بستی کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ورنہ اگر جل کی میں کسی جگہ جاتے تو یہ ممکن تھا کہ پال کی ایسی چیز جو اس زمانے میں بہت قیمتی ہے چھوڑ جاتے۔

کشتی کے کمینہ پن پر ان لوگوں کے دلوں میں آگ لگ گئی۔ لیکن کر ہی کیا سکتے تھے۔



مولانا آزادؒ کی پہلی برسی

۲۲۔فروری ۱۹۵۹ء کو دلّی اور ملک کے مختلف مقامات پر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی پہلی برسی منائی گئی۔

مولانا آزاد کی پہلی برسی کے دن صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد دلّی کے اردو پارک میں ایک جلسے سے خطاب کر رہے ہیں۔ اس جلسے کی صدارت مولانا احمد سعید نے کی جو دائیں طرف بیٹھے ہوئے ہیں۔



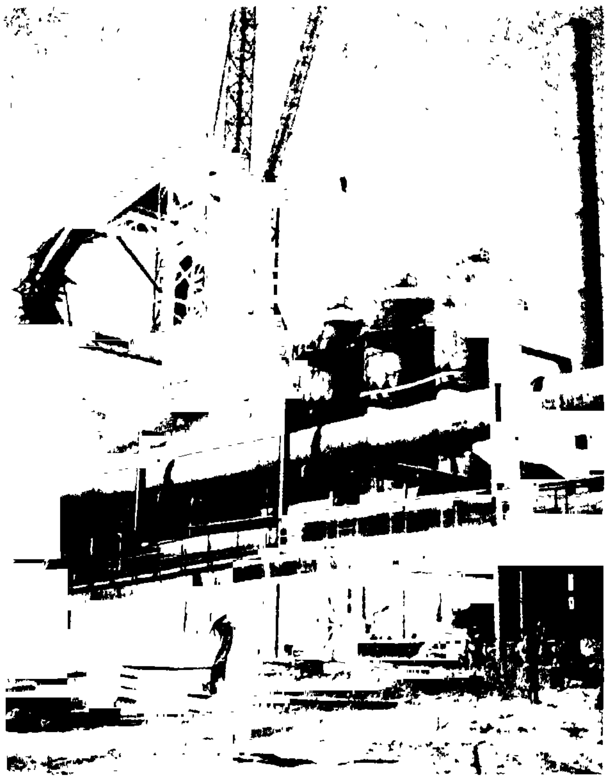
جلسے کا ایک عام منظر

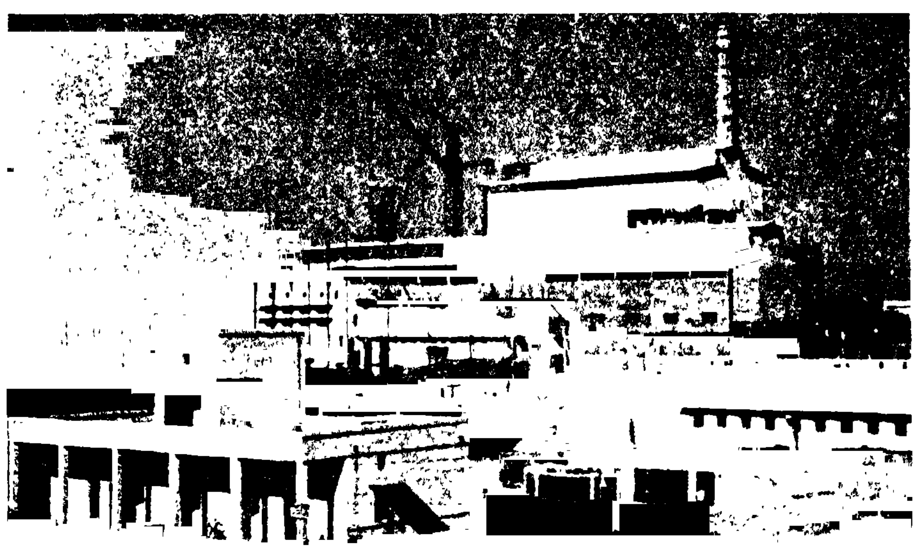
روڑکیلا اور بھلائی میں فولاد کے کارخانے



روڑکیلا میں صدر جمہوریہ کے ہاتھوں پہلی آہن بھٹی کا افتتاح

روڑکیلا میں فولاد کے کارخانے کی آہن بھٹی





بھلائی میں فولاد کے کارخانے
کا
ایک عام منظر



پاسی گھاٹ کا نظارہ

شمال مشرقی سرحدی ایجنسی کے آدی باسی
اس عنوان سے سچین رائے کا
مضمون صفحہ ۹۴ پر ملاحظہ فرمائیں



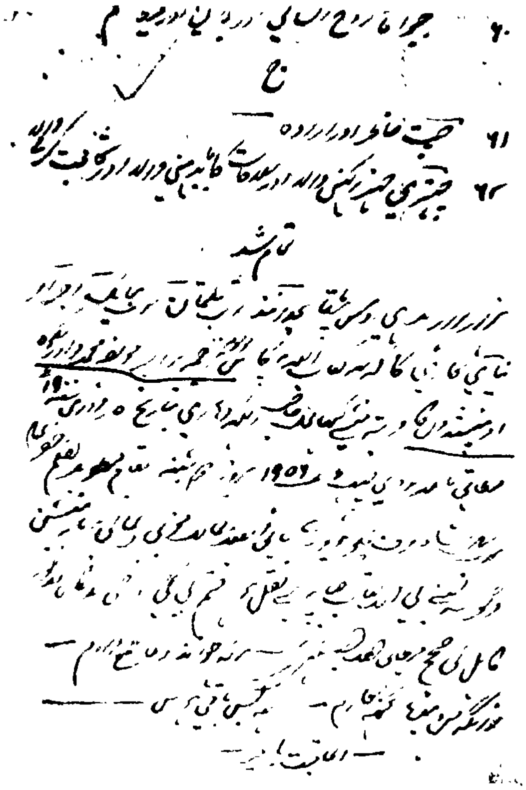
ایک آدی دوشیزہ



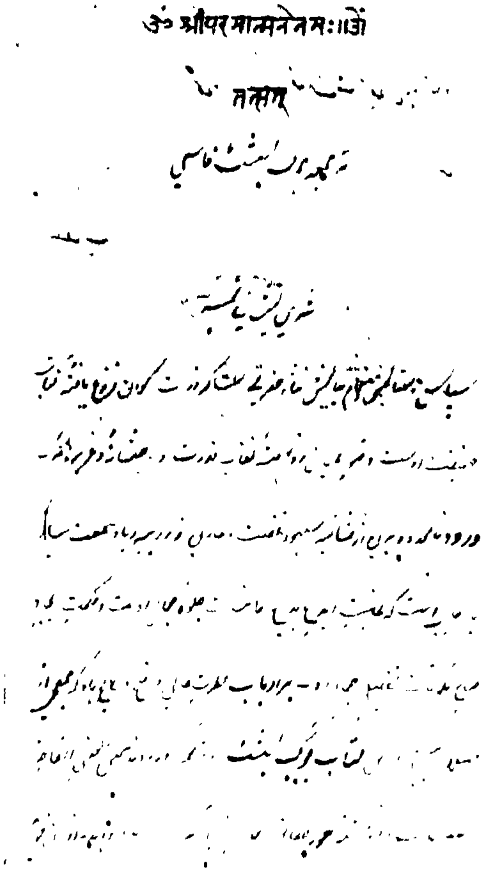
ایک آدی باسی جوان مرد

آدی باسیوں کا ناچ





تمام شد



ॐ श्रीपरमात्मने नमः

داراشکوہ کی تصانیف کے دو صفحات کا عکس

بمبئی میں ادیبوں کا اجتماع



کرسی نشین (دائیں سے بائیں) زہرہ جمال ۔ اعجاز صدیقی ۔ پرکاش پنڈت ۔ جاں نثار اختر ۔ مہندر ناتھ ۔ احتشام حسین ۔ نجیب اشرف ندوی ۔ عصمت چغتائی ۔ کیفی اعظمی ۔ ذکیہ عادل ۔

فرش پر (دائیں سے بائیں) فاروق شجاع ۔ لاجپت رائے ۔ حمید سورتی ۔ سلیمان ظفر ۔ اختر راہی ۔ مقبول عالم (صرف چہرہ) عبدالقوی دسنوی ۔ ظفر گورکھپوری ۔ بھیم سین ۔ رحیم الدین ۔

سبط الحسن

اودھ کا شاہی کتاب خانہ

شمالی ہندوستان میں اودھ کی حکومت معارف پروری کے اعتبار سے ایک خاص امتیاز رکھتی تھی۔ اکثر شاہانِ اودھ صاحبِ علم و فضل تھے اور تصنیف و تالیف کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ اس عہد میں لکھنؤ اسلامی علوم و ادبیات کا ایک مشہور مرکز تھا جہاں اسلامی ممالک مشرقِ وسطیٰ کے طلبا بھی علومِ مشرقیہ کی تکمیل کے لئے آیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے کتابوں کا جتنا زبردست ذخیرہ یہاں فراہم ہو سکا کسی دوسرے مقام پر مشکل سے مجتمع کیا جا سکا۔ والیانِ اودھ صرف اپنے دورِ شاہی میں فراہمیِ کتب کی طرف متوجہ نہیں رہے بلکہ عہدِ وزارت و نیابت میں بھی اپنے شوقِ کتب کا ثبوت دیتے رہے۔ خود وزیر المما لک نواب شجاع الدولہ کتابوں کے انتہائی شائق تھے وہ اپنے مفتوحات میں خزائنِ کتب پر قبضہ کرنا عین مراد سمجھتے تھے جیسا کہ روہیلہ سردار حافظ رحمت خاں پر فتحیاب ہونے کے بعد اُن کے کتب خانہ کو اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا گیا۔ اسی طرح جب نواب بہو بیگم صاحبہ وزیر الممالک کے حبالۂ عقد میں دہلی سے اودھ تشریف لائیں تو اُن کے ہمراہ بھی کتابوں کا کافی ذخیرہ آیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیگم خود بھی تعلیم یافتہ تھیں۔ علم دوست نواب شجاع الدولہ اور اُن کی بیگم کی تعلیم و تربیت ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ نواب آصف الدولہ کو کتابوں کا بہت شوق تھا۔ لوگ کتابوں کو پیش کر کے نواب سے تقرب حاصل کرتے اور انعام و اکرام پاتے اسی وجہ سے نواب موصوف کا کتاب خانہ اس عہد میں اپنی مثل و نظیر نہیں رکھتا تھا۔ عہدِ آصفی کا مؤرخ انعام اللہ ابن محمد محرم شاہ "اوصاف الآصف" میں لکھتا ہے۔

کتبِ ہفت کشور در کتب خانۂ آں خرد دو گنجینۂ قدرت دارد است و

ہفت اقلیم کی کتابیں اس ہوشمند و عاقل نواب کے کتاب خانہ میں موجود ہیں اور یہ عظیم

پیشتر مروم نجیب ترتیب آں مکاتیب مقید و باخبر، کتب خانہ است ترجمۂ لوحِ محفوظ و دفینہ از معنی مبرہن ملفوظ، باوصف چندیں صحف تحف ہرگاہ در نشیمن شاہ گذر شہر گذر دارند ہر رقعے یا جزوے از نسخۂ کلی یا جزوی از نظر بگذارند نظر نیکہ بے چارہ از مال تو دہبا، فزوں یابد برضا مندی مالک می ستانند و اکثر اوقات ہمایوں بامطالعۂ کتب معروف و بصنوف عواطف با معنی رسال مالوف "

(اوصاف الآصف مخطوطہ ورق ۸۰ ذخیرہ عبدالسلام مسلم یونیورسٹی لائبریری نمبر ۲۰۲ مصنفہ ۱۱۹۹ھ کتابت ۱۲۱۸ھ عہد آصف الدولہ)

وغیرہ خزینۂ قدرت و ادر کی حیثیت رکھتا ہے اور بہت سے فضل و کمال والے اس کی دیکھ بھال پر متعین ہیں۔ کتب خانہ کیا ہے گویا لوحِ محفوظ ہے جس میں سب کچھ ہے اور وہ ایک ایسا دفتر ہے جس کے لفظوں میں معانی سموئے ہوئے ہیں۔ باوجود اس قدر نایاب ذخیرۂ کتب ہونے کے یہ حالت ہے کہ جب کوئی مسافر و نو وارد اس شہر میں آتا ہے تو وہ اپنے ہمراہ کامل نسخہ یا ناقص جز یا کل ضرور لے کر آتا ہے اور اس خیال سے نواب کے حضور میں پیش کرتا ہے کہ اصل قیمت سے بھی زیادہ اس کے صلہ میں انعام ملے گا۔ اکثر اوقات میں خود نواب بھی مطالعۂ کتب میں مشغول رہتے ہیں اور علما و فضلا کو اپنی صحبت میں رکھتے ہیں۔

اس کتاب خانہ کے دلچسپ حالات معلوم کرنے کے لئے عہدِ آصفی کے مشہور سیاح و ایرانی عالم عبداللطیف ابن ابی طالب شوشتری کے سیاحت نامہ

کو دیکھنا چاہیئے جس میں سیاح مذکور نے اپنے چشم دید حالات لکھے ہیں، وہ لکھتا ہے:-

"از اوضاع و سامان و اسباب و اثاث در خانۂ او اگر شمہ نگاشتہ شود، موجب اطناب و ملال خوانندگان است، مجملاً سہ لک کتب منتخب، خوشخط پاکیزہ کہ بہر صد جلد یک کس گماشتہ بود در کتاب خانۂ او دیدم و اکثرے را بروقت خان (مراد آصف الدولہ بکلی خان) سیر کردم، از اقسام فنون و اصناف علوم عربی و فارسی و انگریزی نظم و نثر تاریخ و دیوان در آں ہا بود و قطعات زیبا بقلم خوشنویسان اولین و آخرین و تصاویر مصوران ایران و ہند و روم و فرنگ آں قدر داشت کہ با عمرے از دیدن آنہا فارغ نہ شد آں ہا حاصل نمی شد مجلدات بسیارے از کتب علمی بانظر در آمد چوں شرائع و مدارک و مسالک و مفاتیح و کشکول و بعض مجلدات بحار الانوار کہ بخط مؤلفین بودند، از کسے کہ کتاب خانہ در تحویل او بود شنیدم کہ ہفت صد مجلد کتب علمی اند کہ بخط مصنفین اند و از کتابخانۂ سلاطین تیموریہ بعد از تخریب سلطنت بدست او افتادہ اند، و الحق آں ہمہ خزائن و دفائن و اسباب طلا و جواہر کہ داشت معادلہ با عشر عشیر کتاب خانۂ او نمی کردند"

"اگر نواب آصف الدولہ کے در دولت کا سامان اور ہر قسم کے اسباب و اشیاء کا ذکر مختصراً بھی کیا جاوے تو بہت طویل ہو جائے گا اور پڑھنے والے کی پریشانی طبع کا سبب ہوگا مختصر یہ ہے کہ تین لاکھ خوشخط و نفیس منتخب کتابیں تھیں کہ ہر سو جلد پر ایک کتابدار مقرر تھا۔ ان کتابوں کو خود میں نے آصف الدولہ کے ہمراہ کتاب خانہ میں جاکر دیکھا۔ یہ کتابیں مجملاً اقسام علوم و اصناف فنون پر عربی، فارسی، انگریزی زبانوں میں نظم و نثر، تاریخ و دیوان کی صورت میں تھیں، اس کے علاوہ اولین و آخرین کے بہترین خوش نویسوں کے لکھے ہوئے بہتر سے بہتر قطعات تھے اسی طرح ایران و ہندوستان، اٹلی اور یورپ کے دیگر ممالک غرضیکہ ہر جگہ کے مصوروں کی بنائی ہوئی عمدہ سے عمدہ تصویریں اور مرقعے اس قدر تھے کہ تمام عمر دیکھنے پر بھی ختم نہ ہوں۔ کتب علمیہ کے ایسے مجلدات بکثرت نگاہوں کے سامنے آئے جو موجودہ مصنفین و مؤلفین کے تحریر کردہ تھے جیسے شرائع، مدارک، مسالک، مفاتیح، کشکول اور بعض مجلدات بحار الانوار جو اپنے مؤلفین کے تحریر کئے ہوئے تھے۔ کتاب خانہ کے مہتمم نے مجھے یہ بھی بتلایا کہ سات سو نوادر کتب علمیہ اس کتاب خانہ میں اپنے مصنفین کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے ایسے ہیں جو سلاطین تیموریہ کے کتاب خانہ سے تخریب سلطنت کے بعد یہاں آکر محفوظ ہوئے، حق یہ ہے کہ وہ تمام خزانے دفینے، جواہرات اور سونے کا سامان سب کا سب جو نواب کے پاس تھا اس خزینۂ کتب کے دسویں حصہ کے برابر بھی نہیں سمجھا جا سکتا"

(کتاب تحفۃ العالم عبد اللطیف شوشتری صفحات ۹۴۳، ۵۰۳ مطبوعہ شرکت الاسلام حیدرآباد بعہد محبوب علی خان نظام الملک طبع گردید)

یہ ایک مشہور سیاح اور عالم کا چشم دید بیان ہے جس کی نگاہ سے عرب و عجم کے دوسرے کتب خانے بھی گذر چکے تھے جیسا کہ تحفۃ العالم میں جا بجا ان کا ذکر موجود ہے۔ اس بیان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب خانہ کتنا مہتم بالشان تھا جو علوم و فنون پر تین لاکھ کتابیں تھیں جن میں سے سات سو ایسے نوادر علمیہ تھے جو خود اپنے مصنفین کے مکتوب تھے۔ کتاب خانہ کے اشرف کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سو کتابوں پر ایک محافظ مقرر تھا اس اعتبار سے تین لاکھ کتابوں پر تین ہزار محافظ مقرر تھے۔ کتاب خانہ کو روز بروز ترقی ہوتی رہی اس کے علاوہ بادشاہ اودھ غازی الدین حیدر کے زمانہ میں لکھنؤ میں سب سے پہلے شاہی مطبع قائم کیا گیا۔ اس میں کتابیں لوہے کے حرفوں سے چھپتی تھیں، شاہی مطبع سے عربی فارسی اور اردو کی بکثرت کتابیں شائع کی گئیں۔ غازی الدین حیدر شاہ اودھ نے ایک مجلس علمیہ (اکادمی) بھی قائم کی تھی جس کے ارکان بڑے بڑے اہل علم تھے اسی مجلس علمیہ کے ارکان نے عربی کی ایک مشہور و مایۂ ناز لغت "تاج اللغات" مدون کی تھی جس کو شاہی مطبع سے سات جلدوں میں بڑی تقطیع پر شائع کیا گیا تھا[1]

---

[1] ہر جلد کی ضخامت حسب ذیل ہے جلد اول ۵۲۷ صفحات، جلد دوم ۴۲۴ صفحات جلد سوم ۳۵۲ صفحات، جلد چہارم ۱۷۰ صفحات، جلد پنجم ۴۹۵ صفحات، جلد ششم ۴۰۸ صفحات، جلد ہفتم ۱۳۸ صفحات مجموعی صفحات ۲۹۱۷، اس لغت کی تصنیف میں زیادہ حصہ مولوی سید علی نقی زیدپوری متوفی ۱۲۵۲ھ کا ہے جو سید العلما سید حسین بن سید دلدار علی غفران مآب کے شاگرد تھے ان کو لغت عرب و فنون ادبیہ میں تبحر عظیم حاصل تھا صاحب تذکرۃ العلما سید مہدی عظیم آبادی جو مولوی سید علی نقی زیدپوری کے تلامذہ میں سے تھے لکھتے ہیں:- از تصانیف عالیہ اش (باقی دیکھیں اگلے صفحہ پر)

خود غازی الدین حیدر بھی مشاغل علمیہ میں مصروف رہتے تھے اور "تاج اللغات" کی طرح انھوں نے بھی فارسی کی ایک لغت مدون کی تھی جس کا نام "ہفت قلزم" ہے یہ لغت بھی تاج اللغات کی طرح سات جلدوں میں ہے اور اُس سے کچھ چھوٹی تقطیع پر ٹائپ کے حروف میں شاہی مطبع سے شائع کی گئی بقول ڈاکٹر اسپرنگر ہفت قلزم کی شہرت اور قدر جتنی یورپ میں ہوئی اس قدر ہندوستان میں نہیں ہوئی۔

شاہانِ اودھ کے زمانہ میں لکھنؤ علمی دُنیا کا ایک مشہور مرکز تھا۔ مذہب و ملت کے بڑے بڑے علما یہاں رہتے تھے۔ مدارس علمیہ تھے۔ ادباء و شعراء کا جمگھٹ تھا۔ حکومت حوصلہ افزائی کرتی، وظائف ملتے، مدد معاش معافیاں بخشی جاتیں، عطایا اور جاگیریں ملتیں۔

امراء دولت بھی صاحبانِ علم و فضل اور علم دوست و علم نواز تھے ہر عالم و امیر کے پاس کتابوں کے بہترین ذخائر بھی تھے آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ بھی علم و فضل سے آراستہ اور بے مثل ادیب تھے، اردو، ہندی، فارسی میں شعر کہتے۔ انھوں نے نظم و نثر میں بہترین کتابیں تصنیف و تالیف کرکے شائع کرائیں۔ مذہب، تاریخ، شاعری اور دیگر فنونِ لطیفہ پر کتابیں لکھیں۔ علم دوست شاہانِ اودھ کی سرپرستی کی وجہ سے لکھنؤ نہ صرف علوم مشرقیہ کا مرکز بلکہ کتابوں کا مخزن بھی تھا۔ حالت یہ تھی کہ انگریزوں کی للچائی نگاہیں اس پر پڑ رہی تھیں اور یہ فکر میں تھیں کہ اس خزینۂ علم و دانش کو کیوں کر اپنے قبضہ میں کر لیا جائے چناں چہ اس سلسلہ میں انگریزی تدبر نے پہلا اقدام یہ کیا کہ ۲۸ دسمبر ۱۸۴۷ء کو تاج برطانیہ کی نمائندہ "نواب کمپنی بہادر" نے ڈاکٹر اسپرنگر کو اودھ کا اکسٹرا ریزیڈنٹ مقرر کرکے لکھنؤ بھیجا اور اُن کے سپرد یہ خدمت کی کہ شاہ اودھ کے کتب خانوں میں عربی فارسی کتابوں کا جو وسیع ذخیرہ موجود ہے اُس کی فہرست مرتب کریں۔ اُن کو یہ بھی ہدایت کی گئی تھی کہ شاہی کتب خانوں کے علاوہ لوگوں کے ذاتی کتب خانے بھی دیکھیں جن میں کثیر التعداد نوادر علمی موجود ہیں۔ ۱۴ جنوری ۱۸۴۸ء کو اسپرنگر لکھنؤ میں وارد ہوئے اور یکم جنوری ۱۸۵۰ء تک مقیم رہے اس عرصہ میں یہاں کے کتب خانہ کی فہرست مرتب کی۔ اس مدت میں بقول اسپرنگر صاحب دس ہزار کتابیں ان کی نظر سے گذریں۔ ڈاکٹر اسپرنگر کی مرتبہ فہرست* کی پہلی جلد ۱۸۵۴ء میں طبع ہوئی ہے جو تین ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں فارسی اور اردو شعراء کے تذکرے ہیں دوسرے میں شعرائے زبان فارسی کی تصانیف ہیں اور تیسرے میں اردو شعراء کی کتابیں۔

ڈاکٹر اسپرنگر نے اپنی فہرست کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ لکھنؤ کا شاہی کتب خانہ پہلے اُس محل میں تھا جو پُرانا دولت خانہ کہلاتا تھا۔ یہ محل رومی دروازے اور آہنی پُل کے درمیان واقع تھا۔ بقول ڈاکٹر اسپرنگر اس کتب خانہ میں روہیلہ سردار حافظ رحمت خاں کا تمام علمی خزانہ بھی موجود تھا جس میں شاہانِ اودھ اور خاص کر بادشاہ غازی الدین حیدر نے بہت اضافہ کیا تھا جس زمانے میں ڈاکٹر اسپرنگر لکھنؤ میں تھے اُن کے بیان کے مطابق شاہی کتب خانہ تین ذخیروں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ ایک ذخیرہ "موتی محل" میں تھا، دوسرا ذخیرہ "فرح بخش محل" میں تھا، جس میں خود شاہ اودھ رہتے تھے۔ یہ اُن کا ذاتی کتب خانہ تھا اور یہاں کی کتابیں بہت ہی نفیس تھیں۔ تیسرا ذخیرہ ریزیڈنٹ کی کوٹھی کے قریب "توپ خانہ" میں تھا یہاں کتابوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس ذخیرہ میں بیشتر کی کتابیں جلی تھیں جو نہایت خوشخط لکھی ہوئی تھیں، بقول اسپرنگر صاحب فرح بخش کے کتب خانہ کا داروغہ باقی کتابوں کا بھی نگراں تھا۔ تقریباً ایک سال دس ماہ تک اس کام پر ڈاکٹر اسپرنگر لکھنؤ میں مقیم رہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے ہمراہ ایک مسلمان فاضل علی اکبر پانی پتی کو بھی لائے تھے جو شروع سے آخر تک اس امر میں ان کا معین و مددگار رہے اور جن کو اس خدمت کے صلے میں یہ معاوضہ دیا گیا کہ وہ آگرہ کالج میں عربی فارسی کے پہلے پروفیسر مقرر کئے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب تمام کتابوں کی فہرست مرتب نہیں کر سکے۔ اس لئے کہ صرف عہد آصفی ہی میں اودھ کے شاہی کتب خانے میں تین لاکھ منتخب کتابیں تھیں جو نواب آصف الدولہ کے محل دولت خانۂ خاص میں تھیں۔ جس کا تذکرہ تحفۃ العالم کے حوالہ سے کیا جا

* Catalogue of the Arabic, Persian and Hindustany manuscript in the Imperial Library of Oudh by A. Sprenger, M.D. Vol I

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ سے) رسالہ فرقیہ در لغت است کہ دراں فرق میان لغات قریب المعنی را بیان فرمودہ بہ نہجے کہ اہل اکثر علوم از طب و فقہ و منطق و حکمت وغیرہ آں بکار آید و در تصنیف کتاب تاج اللغات کہ مجمع از کملائے عرب لغت یا مر سلطانی در چندیں مجلدات ضخیمہ بجستہ آں پرداختہ بودہ اند، مشارکت غالب داشت حتیٰ کہ اجزائے آں بعد اصلاح و تصحیح آں جناب بہ بیاض مے رسید بلکہ گویند کہ تصنیف بعض مجلدات تش مختص بآں جناب است" (تذکرۃ العلماء مخطوط جلد ثانی محمود آباد لائبریری، و مخطوطہ دیگر در کتاب خانہ سید تقی لکھنؤ)

چکا ہے اور بقول ڈاکٹر اسپرنگر بعد میں شاہان اودھ نے خاص کر غازی الدین حیدر نے بہت اضافہ کیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر اسپرنگر کی نگاہوں سے صرف دس ہزار کتابیں گذر سکیں۔ عہد آصف الدولہ سے لے کر آخری بادشاہ واجد علی شاہ کے زمانہ تک لکھنؤ میں نہایت امن و سکون رہا۔ کوئی حادثہ ایسا نہیں رونما ہوا جس سے یہاں کے کتاب خانوں کو تباہی سے دوچار ہونا پڑتا۔ خصوصاً شاہی کتاب خانہ نہایت محفوظ تھا کیوں کہ یہاں کتابوں کی حفاظت کا خاص اہتمام تھا ہر سو کتاب پر ایک محافظ مقرر تھا۔ خود شاہان اودھ دانش مند و ہنر پرور تھے۔ کتابوں کا شوق تھا۔ کسی نواب یا بادشاہ کو علوم و فنون سے بے تعلقی نہ تھی بلکہ ہر ایک علوم و فنون کا سرپرست تھا اسی طرح امرا و وزرا میں سے کون تھا جو صاحب فضل و کمال یا ہنر پرور نہ تھا۔ علما بھی منتخب و مرد یگانۂ روزگار تھے۔ اس لئے خزانۂ کتب کی حفاظت میں کوئی کوتاہی نہیں ہو سکتی تھی۔ ان حالات میں کوئی وجہ نہیں ہے کہ ڈاکٹر اسپرنگر نے اس عظیم الشان شاہی کتاب خانہ کو بالاستیعاب نہ سہی لیکن سرسری طور پر نہ دیکھا ہو، مگر نہ معلوم کس مصلحت سے انھوں نے لاکھوں کی تعداد کو صرف دس ہزار تک محدود رکھا۔ اور اس دس ہزار کی فہرست بھی ڈاکٹر صاحب نے نہیں پیش کی۔ صرف پہلی جلد کو شائع کر کے فارسی اور اردو شعراء کے تذکرے و تصانیف کی فہرست پیش کر دی اور ساتھ ہی ساتھ یہ اعتراف بھی کیا کہ اس جلد میں بھی نقص اور کمی رہ گئی ہے۔ حالاں کہ ڈاکٹر صاحب کے سپرد جو کام کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ شاہی کتاب خانوں میں عربی و فارسی کتابوں کا جو وسیع ذخیرہ موجود ہے اس کا احصاء فرما کر ایک فہرست مکمل کریں۔ صرف شاہی کتاب خانہ ہی نہیں لوگوں کے ذاتی کتب خانوں کو بھی دیکھنے کا حکم دیا گیا تھا جس میں کثیر التعداد نوادر علمیہ موجود تھے۔ کچھ بھی رکاوٹیں پیدا ہوئی ہوں لیکن ڈاکٹر صاحب کا کسی مکمل فہرست کا منظر عام پر نہ لانا انتہائی مشکوک ہے، کاش وہ دس ہزار ہی کی فہرست پیش فرما دیتے۔

بھارت میں سماعی بصری تعلیم

— بھارت میں سماعی بصری تعلیم کا آغاز حال ہی میں ہوا ہے مگر اس کی اہمیت کا اعتراف اس سے بہت پہلے ۱۹۴۳ء میں کر لیا گیا تھا جب عالمی جنگ کے بعد تعلیمی ترقی کا پلان بنایا گیا تھا۔

— آزادیٔ وطن کے بعد اس تحریک کی رفتارِ ترقی تیز ہو گئی ہے چنانچہ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں سماعی بصری تعلیم کے موضوع پر ایک آل انڈیا کانفرنس منظم کی گئی تھی جس نے متعدد سفارشیں پیش کیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ اس کے لئے ایک نیشنل بورڈ بنایا جائے۔ چنانچہ ۱۹۵۲ء میں یہ بورڈ قائم ہو گیا اور مئی ۱۹۵۳ء میں اس کی پہلی میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ میں بورڈ نے بصری تعلیم کے سرکاری بورڈ، تعلیمی اداروں کے لئے مقامی میوزیم اور ریاستی مواد فلمی ذخیرے رکھنے والی لائبریریاں قائم کرنے نیز فلموں اور فلم سٹرپس کے بارے میں یکساں پالیسیاں بنانے کی سفارش کی۔

بورڈ کی دوسری میٹنگ میں دیگر امور کے علاوہ درج ذیل باتیں بھی شامل تھیں:

ساتذہ کی تربیت کے اداروں میں سماعی بصری تعلیم کی ترویج، ہائی اسکولوں یا ہائر سیکنڈری اسکولوں کو ریڈیو سیٹ اور تمام ضلعوں میں سماعی بصری تعلیم کے چلتے پھرتے ویگن مہیا کرنا، سماعی بصری تعلیم کا رسالہ شائع کرنا، ۳۵ ملی میٹر فلم سٹرپس تیار کرنا۔ کچھ چنے ہوئے اداروں کے صلاح مشورے سے تعلیم میں فلموں کی قدر و قیمت کے بارے میں تحقیق کرنا اور بصری تعلیم میں مدد و معاون ساز و سامان پیدا کرنے والے پرائیویٹ اشخاص یا اداروں کی حوصلہ افزائی کرنا۔

— دوسرے پنج سالہ منصوبے کے تحت وزارتِ تعلیم نے ترقی کا جو پروگرام بنایا ہے اس کے ایک جزو کے طور پر سماعی بصری تعلیم کے لئے ایک قومی ادارہ قائم کیا جا رہا ہے جس میں سماعی بصری تعلیم سے متعلق ساز و سامان کی تیاری اور استعمال کی غرض سے اساتذہ کو تربیت دی جائے گی۔ اس ادارے کے قیام کے لئے ۵۰ لاکھ روپے منظور کئے گئے ہیں۔

مومن محی الدین

اک ترے جانے سے پہلے اک ترے جانے کے بعد

جاگتے جاگتے مجھ کو آیا خیال!
آج ساری فضا کتنی بے نور ہے
منزلِ شب پہ تاریکیوں کا پڑاؤ
اور سویرے کا ڈیرا بہت دور ہے

وقت کا دیو مجھ کو اڑا لایا تھا
لا کے پھینکا ہے یادوں کی کس راہ میں
اپنے دکھ سکھ کی گٹھری اٹھائے ہوئے
آن پہنچا ہوں ماضی کی درگاہ میں

دکھ سے بوجھل دنوں کے تھکے کارواں
دھیان کی رہگزاروں پہ چلنے لگے
غم کی مشعل لئے آنسوؤں کے جلوس
میری آنکھوں سے بہہ کر نکلنے لگے

زندگی کے گھنیرے کڑے کوس پر
سارے چہرے نہ جانے کہاں کھو گئے
میرے معبود، میرے صنم، میرے بت
وقت کی خانقاہوں میں گم ہو گئے

رسمِ یوسف چلی بک گیا بارہا
سنتِ قیس میں سر جھکاتا گیا
دل لٹا یا کہیں لٹ گیا راہ میں
خیمہ میں رہزنوں کی مناتا گیا

پھر وفاؤں کے لمحات یاد آ گئے
دل کی دھڑکن میں بجتے تھے جب جلترنگ
اس کی زلفوں نے گوندھے تھے رت جگے
اس کے بوسوں میں ڈوبے بہاروں کے رنگ

کتنی راہوں کے اسرار کھلتے رہے
کتنے عنوان میں رات ڈھلتی رہی
اس کے ہونٹوں کے رنگین محراب میں
میرے بوسوں کی قندیل جلتی رہی

وقت کا دیو نظروں کی سرحد سے پار
آج آخر اسے بھی اڑا لے گیا
میرے ہونٹوں پہ اب تک دہکتا ہے پیار
میرے احساس کو جو جِتا دے گیا

آج کی رات کتنی الم ناک ہے
محملِ شب کا ڈیرا ابھی ہے وہیں
صبح کے راستے پہ کوئی ہم سفر
اب چلے بھی تو کیا اب چلے بھی کہیں؟

مجاہد کمال خاں

مولانا آزاد

مولانا آزاد کے پُرانے رفیق اور سیکرٹری اجمل خاں صاحب کے صاحبزادے مجاہد کمال خاں اس مضمون کے مصنف ہیں۔ مولانا کی ذات قابلِ مطالعہ تھی۔ مشاہیر ادبا کا بہت نے ان کے باب میں کیا کچھ نہیں لکھا یہ ایک بچے کا مطالعہ ہے۔ اُمید ہے ناظرین کے لئے دلچسپی کا موجب ہوگا (ادارہ)

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد سے مجھ کو سب سے پہلے ملنے اور انھیں قریب سے دیکھنے کا اتفاق اُس وقت ہوا جب کہ میری عمر غالباً نو سال کی تھی۔ وہ الہ آباد سے قریب نینی جیل میں نظر بند تھے۔ میں والد صاحب کے ہمراہ اُن سے ملنے گیا۔ مجھ کو ٹھیک یاد نہیں کہ میں اور والد صاحب وہاں کتنی دیر ٹھہرے اور کیا کیا باتیں ہوئیں البتہ نینی جیل کی بڑی اور اُونچی اُونچی دیواریں اور پولیس کا زبردست پہرہ اب بھی ذہن میں محفوظ ہے۔ اس کے بعد مئی یا جُون ۱۹۲۰ء میں حضرت مولانا جیل سے رہا ہو کر کلکتے تشریف لے گئے۔ کچھ مدّت وہاں قیام کیا۔ جیل میں باوجود آرام کے وہ کمزور ہو گئے تھے۔ ادھر کلکتے آ کر اُن کی زندگی اور بھی معروف ہو گئی تھی کام بہت تھا۔ ضرورت تھی کہ کچھ دن آرام کریں تاکہ اُن کی صحت ٹھیک ہو جائے اور پھر وہ اپنے کام میں مشغول ہو جائیں۔ لہٰذا مولانا صاحب والد صاحب کے ساتھ بندھیا چل تشریف لے گئے۔ یہ جگہ الہ آباد سے تیس یا چالیس میل پر واقع ہے۔ ضلع مرزاپور میں بنارس کے قریب ہے جہاں بہت سے پُرانے مندر ہیں۔ ہر سال ہزاروں ہندو یاتری یہاں آتے ہیں۔ یہاں کی آب و ہوا بہت اچھی ہے پانی بھی صحت کے لئے بہت عمدہ ہے۔ ایک چھوٹا سا ڈاک بنگلہ تھا جس میں حضرت مولانا اور والد صاحب مقیم تھے۔ بنگلے سے کچھ دُور ایک ٹوٹا ہوا مندر تھا۔ جس میں بہت سے ٹوٹے ہوئے بُت پڑے تھے۔ اُن کی حفاظت سرکاری طور پر ہوتی تھی۔ اس کے باوجود لوگ موقع کی تاک میں رہتے تھے اور نگراں سے آنکھ بچا کر لوگ ہاتھ بُت اٹھا کر لے جاتے اور اُن کو بیندور میں رنگ کر پُوجا کرتے۔ والد صاحب کا خیال ہے کہ یہ مندر پُرانے زمانے کا ہے اور بُدھ مذہب کے ماننے والوں نے اس کو تعمیر کیا تھا۔ اُن کا خیال ہے کہ یہ بُت دُنیا کے نہایت ہی خوبصورت بُتوں میں سے ہیں کیوں کہ ان کے تراشنے کا ڈھنگ نہایت صاف اور دلکش ہے۔

میں اور میرا چھوٹا بھائی سیف الاسلام الہ آباد میں پرائمری اسکول میں پڑھتے تھے۔ اُس وقت کانگریس اور مسلم لیگ کا بہت زور تھا۔ کچھ لوگ مسلم لیگی جھنڈا لئے اور کچھ کانگریسی جھنڈا لئے اپنی اپنی جماعت کے نعرے لگایا کرتے تھے مسلم لیگیوں کے جہاں بہت سے نعرے ہوا کرتے تھے وہاں نعرۂ تکبیر اللہ اکبر بھی شامل رہا کرتا تھا۔ لہٰذا ہم قدرتی طور پر ہم اپنے آپ کو مسلم لیگی خیال کرنے لگے تھے۔ مگر یہ نہ جان پائے تھے کہ مسلم لیگ یا کانگریس ہے کیا اور ان کا مقصد ہے کیا۔ اس دوران میں ہم والد صاحب سے ملنے بندھیا چل گئے اور دونوں بھائی ڈاک بنگلے میں والد صاحب اور مولانا صاحب کے ہمراہ ٹھہرے۔ دوسرے دن صبح کو ہم نے مولانا صاحب کے ساتھ ناشتہ کیا۔ مجھ کو پہچان کر اور دیکھ کر خوش ہوئے اور خیریت معلوم کی ناشتے سے فارغ ہو کر مولانا صاحب کے پاس کچھ اور حضرات آ گئے اور اب ہم سب لوگ حضرت مولانا کے ہمراہ پہاڑی سے نیچے اُترے۔ لمبے اور کچے راستے سے گذر کر ہم سب لوگ ایک اچھی سڑک پر آ گئے تھے۔ صبح کا وقت تھا، موسم بھی اچھا تھا لہٰذا ہم سب لوگ پیدل کافی دُور نکل گئے۔ مولانا صاحب کی بات چیت زیادہ تر آنے ہوئے لوگوں سے ہو رہی تھی۔ بارہا کانگریس اور مسلم لیگ کا ذکر آیا۔ اُسی دوران میں مولانا صاحب نے ہم سے سوال کیا کہ تم لوگ کیا ہو؟ ہم نے فوراً

کہہ دیا کہ مسلم لیگی۔ اس پر مولانا صاحب مسکرائے اور فرمایا: یہ مسلم لیگ کیا ہے اور تم مسلم لیگی کیوں ہو؟ ظاہر ہے کہ ہمارے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ لہٰذا ہم نے کہہ دیا کہ بس ویسے ہی۔ فرمایا، یہ غلط ہے کہ ابھی سے تم لوگ مسلم لیگی ہو یا کانگریسی۔ تم سے اگر کوئی سوال کرے کہ تم کون ہو تو اُن سے کہہ دو کہ ہم طالب علم ہیں، مسلمان ہیں، ہندوستانی ہیں۔ تمہارا کام ابھی پڑھنا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اُس کے بعد سے ایک عرصہ تک ہم نے مسلم لیگ یا کانگریس کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔ ان تمام باتوں کے بعد ہم لوگ ڈاک بنگلے میں واپس آ چکے تھے۔ ہم نے مولانا صاحب کے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران میں زیادہ تر خاموش رہے۔ کچھ باتیں والد صاحب سے ضرور ہوئیں۔ دورہ ختم کر کے ہم لوگ واپس الٰہ آباد آ گئے۔

غالباً پھر کچھ عرصے کے بعد مولانا صاحب کلکتہ چلے گئے اور ایک سال کے بعد والد صاحب مولانا صاحب کے ہمراہ کشمیر گئے اور ہم دونوں بھائی الٰہ آباد سے دہلی جامعہ ملیہ میں آ گئے تھے۔ والد صاحب واپسی پر ہم دونوں کے لئے جہاں بہت سی چیزیں لائے اُن کے ساتھ دو عدد سوئٹر بھی لائے۔ یہ سوئٹر ہمارے قومی جھنڈے کے رنگ پر تھے۔ لہٰذا اُن کو جب ہم نے پہنا تو ہمارے ساتھیوں نے ہم کو تنگ کرنا شروع کیا کہ کانگریسی ہو، وغیرہ۔ ہم نے پریشان ہو کر سوئٹر پہننا ترک کر دیا۔

والد صاحب دہلی میں مولانا صاحب کے ساتھ مقیم تھے۔ اور ہم لوگ چھٹی میں والد صاحب سے ملنے آتے تو مولانا صاحب ہی کے یہاں ٹھہرتے۔ اس بار جامعہ سے جو آئے تو ایک دن کھانے پر مولانا صاحب بھی تشریف لائے۔ کھانے کے دوران میں ہم نے اُن سے ذکر کیا کہ ہم یہ ترنگا سوئٹر پہنتے ہیں تو لڑکے ہم کو کانگریسی کہتے ہیں اور پریشان کرتے ہیں۔ فرمایا تم اُن لوگوں کی پروا نہ کرو۔ جو جی میں آئے کہنے دو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ غرض کہ ہم نے سوئٹر پھر پہننا شروع کر دیئے۔

جب کبھی ہم مولانا صاحب کے یہاں گئے اور ملنے کا اتفاق ہوا تو ہم سے بہت محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا اور پھر فسادات میں ہمارا گھر بھی لُوٹ لیا گیا۔ والدہ صاحبہ دہلی میں تھیں۔ جامعہ ملیہ میں چھٹیاں تھیں لہٰذا ہم بھی گھر پر تھے۔ کوئی ایک ماہ تک ہم لوگوں نے مولانا صاحب کے یہاں پناہ لی۔ پھر ہم لوگ شیر شاہ مسیح مقیم ہو گئے اور مولانا صاحب نے بھی اپنا ۱۰ اکبر روڈ کا مکان چھوڑ دیا تھا اور اب وہ ۴ کنگ ایڈورڈ روڈ پر آ گئے تھے۔ جہاں آخیر وقت تک رہے۔

جامعہ کی چھٹیاں ختم ہو گئیں اور حالات ٹھیک ہو چکے تھے۔ ہم نے پھر جامعہ ملیہ میں داخلہ لے لیا تھا اور وہاں بورڈنگ میں رہنے لگے تھے۔ جب بھی چھٹی ہوتی تو ہم گھر آتے مگر مولانا صاحب سے ملنے ضرور جاتے۔ اُن کا کہنا تھا کہ جب کبھی چھٹی میں آیا کرو مل لیا کرو۔ اس لئے اب ہمارے لئے اجازت لینے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ہم بلا روک ٹوک مولانا صاحب کے کمرے تک چلے جاتے ہم سے مل کر خوش ہوتے، کچھ دیر بیٹھتے۔ ہم سے جامعہ کے حالات معلوم کرتے کھانے وغیرہ کے بارے میں بھی اکثر سوال کیا کرتے کہ جامعہ میں کیسا ملتا ہے اس کے بعد نوکر کو بُلا کر ہم لوگوں کو مٹھائی وغیرہ کھلواتے اور ہم تھوڑی دیر کے بعد رخصت ہو جاتے۔ مولانا صاحب کی مرحومہ بیوی کی بہن جو کہ مولانا صاحب کے ساتھ تھیں وہ بھی ہمارے ساتھ بہت محبت کے ساتھ پیش آتی تھیں۔ نماز کی پابند اور بہت نیک خاتون تھیں۔ اکثر ہمارے گھر بھی آیا کرتی تھیں۔ یہ سب محبت اور خلوص والد صاحب کی وجہ سے تھا۔ کیوں کہ والد صاحب ایک زمانے سے مولانا صاحب کے ساتھ تھے۔ اور مولانا صاحب والد صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ اپنا عزیز تصور کرتے تھے۔

مولانا صاحب تیرنا بھی بہت اچھا جانتے تھے۔ اس کا ذکر انھوں نے جب کیا جب ہم جامعہ میں تھے۔ ایک مرتبہ ہم مولانا صاحب سے ملنے آئے حسبِ معمول ہم سے خیریت معلوم کی۔ گرمی کے دن تھے۔ ہم سے پوچھا کہ کیا کیا کھیلتے ہو۔ ہم نے کہا کہ آج کل گرمیاں ہیں اور چونکہ جامعہ سے کچھ فاصلے پر نہر ہے اس لئے اسکول کی طرف سے ہم سب لڑکے نہر میں تیرنے جاتے ہیں۔ ابھی ہم کو اچھی طرح تیرنا نہیں آیا ہے۔ مولانا صاحب یہ سُن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ جب میں چھوٹا تھا اور کلکتہ میں تھا تو اکثر "ہگلی" میں جا کر تیرتا تھا۔ شروع شروع میں جب تیرنا نہیں آتا تھا تو تُھلیاں باندھ کر تیرا کرتا تھا۔ بعد میں اچھا تیرنے لگا تھا۔ پھر کہا کہ یہ بہت اچھی ورزش ہے خوب تیرا کرو۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد ہم لوگ علی گڑھ آ گئے اور داخلہ لے لیا۔ کوئی سال بھر کے بعد چھٹی میں مولانا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں کو دیکھ کر کچھ دیر کے لئے رُکے پھر بولے کہ بہت بڑے ہو گئے ہو۔ علی گڑھ کی بابت معلوم کرتے رہے۔ ہم سے پوچھا کہ کیا پڑھتے ہو؟ ہم نے کہا کہ فرسٹ ایر سائنس میں داخلہ لیا ہے۔ آئندہ انجینئرنگ کا خیال ہے۔ فرمایا بہت ٹھیک ہے۔ اب ہمارے ملک کو انجینئروں کی بہت ضرورت ہے۔ انجینئر بن جانے کے بعد اپنے ملک کی خدمت کرنا۔ محنت سے اور دل لگا کر پڑھو۔ اُس کے بعد ہم علی گڑھ میں رہے۔ دہلی جانا ہوتا مگر حضرت مولانا مشغول بہت رہتے لہٰذا ہم لوگ اُن سے بہت کم ملتے۔ البتہ عید پر ملتے۔ ہم جاتے تو ہم کو خود اصرار کر کے عیدی دیتے اور کہتے کہ اس کی مٹھائی کھانا

عطر وغیرہ جو کہ خاص طور سے اس دن کے لئے اُن کی میز پر ہوتا ہم سے لگانے کو کہتے۔ غرض کہ جب بھی گئے وہ مشغول ہونے کے باوجود ہم سے ملتے اور مل کر بہت خوش ہوتے۔ جب بھی دیکھتے یہ ضرور کہتے کہ بڑے ہو گئے ہو۔ ابھی دسمبر ۱۹۵۷ء میں ملاقات ہوئی تو بھی اُن کے یہی الفاظ تھے کہ بڑے ہو گئے ہو۔

مولانا صاحب کے مکان کو ہم بالکل اپنے گھر کی طرح سمجھتے تھے۔ جہاں اور جس کمرہ میں چاہتے چلے جاتے۔ اکثر میں مولانا صاحب کے کمرے میں اُن کی غیر حاضری میں چلا جاتا وہاں اُن کی میز پر جہاں اور کتابیں ہوا کرتیں میں نے انگریزی اور فرانسیسی زبان کی شکل ترین کتابیں بھی "ادب" پر دیکھیں۔ وہ انگریزی کا اخبار بہت پابندی سے پڑھتے تھے۔ انگریزی کے الفاظ میں نے اکثر اُن کو اپنے ساتھی وزراء کے ساتھ کثرت سے بولتے سُنا تھا۔ ایک بار انگریزی میں بھی گفتگو کرتے ہوئے بھی میں نے سُنا تھا۔ ابھی حال میں کیرالہ کے کچھ طالب علم آئے تھے۔ یہ طالب علم حضرت مولانا سے ملنے آئے اور آکر باہر کے کمرے میں بیٹھ گئے۔ ۱۰ بجے دفتر کے وقت مولانا صاحب اپنے کمرۂ خاص سے باہر نکلے اور ان طالب علموں سے انگریزی میں اُن کے سفر کے بارے میں سوالات کرتے رہے اور پھر کار میں بیٹھ کر دفتر چلے گئے۔ میں نے دیکھا کہ مولانا صاحب اچھی اور صاف انگریزی بول رہے تھے جس پر اُن طالبعلموں کو بھی تعجب تھا۔ ایک طالب علم نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا مولانا صاحب انگریزی بولتے رہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آج پہلی بار آپ حضرات سے میں نے ان کو انگریزی بولتے سُنا ہے۔ دفتر جانے سے پہلے کا وقت لوگوں سے ملنے کا وقت ہوتا تھا اور وہ بھی جن کو بہت ضروری کام ہو۔ ورنہ ملنے کے خواہش مند تو اتنے تھے کہ اگر وہ اجازت دیتے تو دن رات میں کوئی لمحہ ایسا نہ جاتا جب کہ کوئی نہ کوئی موجود نہ ہوتا۔ اور اُن خاص خاص ملنے والوں میں سے بہت سے ایسے تھے جو کہ برسوں سے ملنے کے خواہش مند ہوتے تھے۔

دفتر ۱۰ بجے جاتے، اور ایک بجے واپس آکر کھانا کھاتے تھے کچھ دیر آرام کرکے پھر دفتر جاتے اور ۵ بجے واپس آتے تھے۔ واپس آتے ہی اُن کو ان کی مخصوص چینی چائے تیار ملتی۔ ہم بھی کبھی کبھی منہ کا مزہ بدلنے کو بقول حضرت مولانا "سیاہ پتی کا جوشاندہ" چھوڑ کر مولانا کے یہاں اُن کی چائے پیتے۔ ۵ بجے سے شام تک پھر ملنے والوں کا ہجوم رہتا۔ اور مولانا سرکاری کام کرتے۔ دس گیارہ بجے تک خود کچھ پڑھتے ہی رہتے۔ میں نے ان کو بے کار کبھی ایک منٹ کے لئے بھی نہیں دیکھا۔ تنہائی، پڑھنا اور چائے اُن کی زندگی تھی۔ دفتر وغیرہ سے آنے کے بعد اپنے کمرے میں قید ہو جاتے پھر اُن کو خبر نہ ہوتی کہ اُن کے کمرے سے باہر ان کے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ رات کو سو کر صبح سویرے اُٹھ جاتے۔ یہ صبح اُٹھنے کی پُرانی عادت ہمیشہ قائم رہی۔ یہ صبح اُٹھنے کی عادت اُن کو اُس وقت پڑی جب کہ وہ دس سال کے تھے۔ مولانا صاحب غبارِ خاطر میں اس کا ذکر یوں کرتے ہیں "میری ابھی دس گیارہ سال کی عمر ہوگی کہ یہ باتیں کام کر گئیں۔ بچپنے کی نیند سر پر سوار رہتی تھی۔ مگر میں اس سے لڑتا رہتا۔ صبح اندھیرے میں اُٹھنا" کہیں آنا جانا انھوں نے بہت کم کر دیا تھا۔ ہزاروں لوگ فکر میں رہتے کہ وہ کہیں آئیں جائیں اور ان سے ملنے کا موقع نصیب ہو۔ مگر اُن کو اپنا کام اور اپنا کمرہ بہت عزیز تھا۔ اور اگر کہیں آتے جاتے بھی تو جب کہ بہت ضروری کام ہوتا اور بقول خود اُن کے "میں اگر عوام کا رجوع و ہجوم گوارا کرتا ہوں تو میرے اختیار کی پسند نہیں ہوتی۔ اضطرار و تکلف کی مجبوری ہوتی ہے۔"

ادھر چند سالوں سے اکثر بیمار ہو جاتے۔ مگر اُن کے اوقات میں فرق نہ آنے پایا۔ ملنے جلنے کا سلسلہ بھی مجبوراً جاری رہا، ہزاروں آتے اور اُن کا کام پیدا ہو جاتا۔ مگر کسی سے یہ نہ چاہا کہ کوئی کہے کہ یہ کام مولانا صاحب نے کیا ہے۔ ان کو اب اپنے نام کی تمنا نہ رہی تھی۔ خدمت اپنا فرض جانتے تھے، اس مقام سے گذر چکے تھے جہاں لوگ ذرا ذرا سی بات پر اس بات کے تمنی رہتے ہیں کہ ان کا نام ہو۔ مولانا صاحب جن سے نہیں مل سکتے تھے ان کا حکم تھا کہ وہ والد صاحب کو لکھ کر دے دیں وہ اس کو مولانا صاحب تک پہنچا دیتے اور مولانا صاحب اس پر ضروری ہدایت دے دیتے۔

اُن کا بات کرنے کا ڈھنگ بالکل الگ تھا جب وہ باتیں کرتے تو نگاہیں باتیں کرنے والے کی طرف نہ ہوتی تھیں۔ وہ ہر ایک سے بہت تپاک سے ملتے تھے۔ کسی بڑے آدمی کو اچھی طرح جاننے کے لئے جہاں اور دوسری چیزیں دیکھی جاتی ہیں وہاں اُس کا اپنے خادموں کے ساتھ سلوک بھی دیکھنا اشد ضروری ہے۔ مولانا صاحب کے اپنے خاص خادم تھے جن کی تعداد علاوہ سرکاری ملازم کے پانچ تھی اور وہ اُن کے ساتھ ایک عرصے سے تھے۔ مگر میں نے ان کو ذرا سی بھی سختی کے ساتھ بات کرتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اکثر اگر نوکر دیر سے صبح اٹھتا تو خود کیوں کہ بہت جلدی اٹھتے تھے جا کر جگا دیا کرتے تھے۔ اُن کے ایک نوکر نے خود مجھ سے ذکر کیا کہ میں یوں کہ صبح کو چائے وغیرہ تیار کرتا ہوں گھڑی رکھنے کے باوجود اٹھ نہیں پاتا لہٰذا مولانا صاحب اٹھا دیتے ہیں۔ دو ایک خادم ایسے بھی تھے جو اور جگہ کام کر چکے تھے وہ روتے تھے کہ اب ہم کو ایسا محبت کرنے والا اور مہربان آدمی ملنا مشکل ہے۔ پولیس کے جو آدمی تھے وہ بھی بہت خوش تھے کہ کبھی ہم کو تکلیف نہ دی اور ہم نے یہاں رہ کر یہ خیال ہی نہ کیا کہ ہم نوکر ہیں۔

انھوں نے ۱۹۱۱ء سے ہندوستان اور اس کے ساتھ ساتھ دُنیا کی آزادی اور خوشحالی کا جو نقشہ بنایا تھا اُس پر آخر دم تک قائم رہے۔ کاش وہ چند سال اور انسانیت کی خدمت کے لئے زندہ رہتے۔

نثار احمد فاروقی

.... مولوی مدن کی سی

"حقیقت یہ ہے کہ آزاد (محمد حسین) ابوالکلام اور حسن نظامی کا طرزِ انشا اُن کی ذات ہے، صفت نہیں، یہی معاملہ اکبر کے ساتھ ہے۔ جس طرح دُنیا میں ایک طرح کی دو ذات یا انفرادیت نہیں ہوتی اسی طور پر اردو ادب میں ان بزرگوں کا جواب نہیں پیدا ہوا ممکن ہے ایسا ہونا ناممکن بھی ہو۔ یُوں کہنے کو آزاد کے متبع آغا طاہر، ابوالکلام کے عبدالرزاق ملیح آبادی اور حسن نظامی کے ملا واحدی دہلوی کھینچ تان کر قرار دیئے جاتے ہیں لیکن مولوی مدن کی داڑھی کا جواب کب نظر آیا؟"

یہ الفاظ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ہیں جو اُن کی تصنیف "طنزیات و مضحکات" کے صفحہ ۱۲۴ سے نقل کر لئے گئے ہیں۔ رشید صاحب کے فرمودات سے اختلاف یا اتفاق کرنا مجھے منظور نہیں، سرِدست صرف آخری جملے سے سروکار ہے۔

"مولوی مدن کی داڑھی کا جواب کب نظر آیا؟" یہ جملہ پڑھتے ہی ذہن اکبر کے مشہور شعر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے:-

اگرچہ شیخ نے داڑھی بڑھائی سن کی سی
مگر وہ بات کہاں، مولوی مدن کی سی

اس شعر کی تعبیر ہمیشہ غلط کی گئی ہے۔ رشید صاحب کا یہ جملہ تو میں نے مثال کے طور پر نقل کر دیا، علی العموم اس شعر کا یہی مطلب لیا جاتا ہے اور یہ سمجھا گیا ہے کہ مولوی مدن کی داڑھی نہایت "معیاری" اور اپنی ضخامت، حجم اور عرض و طول میں غیر معمولی یا "فرمائشی" قسم کی رہی ہوگی جس کا مقابلہ "شیخ" کی داڑھی نہیں کر سکتی! رشید صاحب کی مذکورہ بالا عبارت سے بھی یہی مستنبط ہوتا ہے۔

لیکن اس شعر میں ایک تلمیح ہے جسے سمجھے بغیر شعر کا پورا لطف نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اور اس مقصد کے لئے ہمیں تاریخ کا ایک ورق پڑھنا پڑے گا۔ اس کے بعد ہی اندازہ ہوگا کہ دراصل شعر میں "مزاح" کا عنصر اتنا نہیں جتنا بلیغ "طنز" پوشیدہ ہے۔

مولوی مدن سے اس شعر میں سید شاہ مدن مراد ہیں جو شاہ آباد ضلع ہردوئی کے باشندے اور سید صحیح النسب تھے ان کا شجرہ نسب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی غوث اعظم قدس سرہٗ پر منتہی ہوتا ہے۔ وہ کسی زمانے میں سلطنتِ اودھ میں بڑا رسوخ رکھتے تھے۔ صفدر جنگ وزیر اودھ کے مشیر اور مصاحب تھے۔ اس کی وفات کے بعد بنگال کے ناظم الہ وردی خاں سے توسل پیدا کر لیا ہو اس کی ریاست کا بھی شیرازہ بکھرا تو لکھنؤ آئے اور شجاع الدولہ کے مقرب ہو گئے تھے۔ اُن کے مختصر حالات محمد نجم الغنی رام پوری نے "اخبار الصنادید" میں لکھے ہیں یہ بھی لکھا ہے کہ "اُن کے ہاں ہر سال حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا عرس ہوا کرتا تھا۔ ہندوستان کے شہروں سے ہزارہا علما، طلبا، مشائخ، پیرزادے، آتے اور شریک ہوتے۔ ان سب کی آمد و رفت کے مصارف شاہ صاحب کے یہاں سے ادا کئے جاتے اور اُن کو کھانا دیا جاتا تھا تین روز تک بڑا انبوہ رہتا تھا اور صبح سے شام تک آدمیوں کو جنس تقسیم ہوتی رہتی تھی۔ کئی بقال اس کام پر مقرر تھے بہت سے ناگے اور بیراگی بھی اس میں شریک ہوتے تھے جن کو سوائے خوراک کے بھنگ، چرس، اور بوزہ بھی ملتا تھا۔ تین ہزار کے قریب آدمی جمع ہوتے تھے روہیلے بھی اُن کی پیرزادگی کی وجہ سے ہمیشہ تحفے بھیجتے رہتے تھے۔"

یہی وہ مولوی مدن ہیں جنھوں نے چالیس لاکھ کے "تمسک" کے معاملے میں شجاع الدولہ اور حافظ رحمت خاں والیٔ روہیل کھنڈ کے درمیان سفارت کے

فرائض انجام دیئے تھے۔

تمسک کا یہ قصہ بہت دلچسپ ہے۔ اس کے لئے تھوڑی سی تمہید باندھنا ضروری ہے۔ میں نہایت اختصار کے ساتھ پیش کروں گا۔ تاکہ واقعات کا تسلسل اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔

پانی پت کی تیسری جنگ (۱۷۶۱ء) میں احمد شاہ ابدالی کے ساتھ نجیب الدولہ، حافظ رحمت خاں اور شجاع الدولہ بھی مرہٹوں کے بالمقابل ہوئے تھے۔ اس جنگ میں مرہٹوں کو اس بری طرح شکست ہوئی [illegible] میں کوئی [illegible] تھا جس [illegible] مرہٹے تازہ دم ہو گئے اور انھوں نے اپنی منتشر [illegible] کر کے ایک لاکھ سے زائد لشکر جمع کیا اور ان سرداروں سے انتقام لینے کی نیت سے شمالی ہندوستان کی طرف بڑھنے لگے۔ یہ نجیب الدولہ کی زندگی کا آخری زمانہ تھا۔ اس نے [illegible] سے کام لے کر دہلی کو مرہٹوں کی زد سے [illegible] فرخ آباد [illegible] اس لشکر کے ساتھ روانہ ہوا [illegible] آگیا۔ مرہٹوں کا لشکر فرخ آباد پر حملہ کرنے کے لئے بڑھا تو احمد خاں بنگش والی فرخ آباد سے قدیمی تعلقات کی بنا پر حافظ رحمت خاں مزاحمت کرنے کے ارادے سے اپنا لشکر لے کے مرہٹوں کے راستے پر آ ڈٹے۔ انھوں نے ضابطہ خاں کی [illegible] مرہٹوں کے قبضے میں تھا صلح کی شرائط پیش کیں اور یہ طے پایا کہ حافظ رحمت خاں اٹاوہ اور شکوہ آباد کے علاقے سے مرہٹوں کے حق میں دست بردار ہو جائیں۔ اس شرط کو تسلیم کرنے میں حافظ رحمت خاں کو تامل اور تردد تو ضرور ہوا مگر ضابطہ خاں کی وجہ سے اس پر آمادہ ہو گئے۔ ضابطہ خاں نے پھر بھی [illegible] کا ثبوت دیا اور [illegible] لشکریوں کے ساتھ چپکے سے نجیب آباد کی طرف بھاگ گیا۔ اٹاوہ اور شکوہ آباد مفت میں حافظ رحمت خاں کے ہاتھوں سے نکل گئے۔

اِدھر مرہٹوں نے شاہ عالم کو پورب سے بلا کر ۲۵ دسمبر ۱۷۷۱ء کو تخت نشین کر دیا۔ اور ضابطہ خاں کے استیصال کی فکر میں لگ گئے۔ ضابطہ خاں اسی سال اپنی فوج لے کر دہلی پر قبضہ جمانے کے لئے نجیب آباد سے چلا، سکرتال کے میدان میں شاہی فوجوں سے مڈبھیڑ ہوئی اس کے اہل و عیال گرفتار ہوئے۔ وہ مال و اسباب جائداد و املاک سب ضبط ہو گئے۔ جب مرہٹے اس کا تعاقب کرتے ہوئے روہیل کھنڈ کی طرف آ رہے تھے تو حافظ رحمت خاں نے اپنے اور اپنے سرداروں کے اہل و عیال کو ایک محفوظ پہاڑی مقام (رنگا پور) میں بھیج دیا۔ اب نجابت خاں، نواب فیض اللہ خاں (رام پور) اور حافظ رحمت خاں نے آپس میں مشورہ کیا کہ مرہٹوں سے ملک کو محفوظ رکھنے کے لئے شجاع الدولہ سے امداد حاصل کی جائے۔ اِدھر یہ مشورے ہو رہے تھے اُدھر مرہٹوں کی فوج روہیل کھنڈ کے علاقے میں داخل ہو گئی اور دیکھتے دیکھتے حسن پور، امروہہ، مراد آباد، سنبھل سب پر قبضہ کر لیا۔ اب اُن کا ارادہ یقیناً شجاع الدولہ کے مقبوضات پر تصرف کرنے کا تھا۔ مگر شجاع الدولہ نے فوج کا خرچ اپنی جیب سے ادا کرنے کے وعدے پر کمپنی کی فوج طلب کر لی جس کے کمانڈر سر رابرٹ بارکر تھے۔ انگریزوں کی فوج اور شجاع الدولہ کا لشکر متحد ہو کر شاہ آباد ضلع ہردوئی میں خیمہ زن ہوئے۔ ضابطہ خاں نے بہت اصرار کیا تو حافظ رحمت خاں ۲۰ مئی ۱۷۷۲ء کو خود شاہ آباد گئے تاکہ شجاع الدولہ سے معاونت اور مشارکت کا معاہدہ کر سکیں۔ نواب شجاع الدولہ، نواب ضابطہ خاں، نواب رحمت خاں اور سر رابرٹ بارکر، یہ چاروں سر جوڑ کر بیٹھے اور مرہٹوں کے دفیعہ کی تدبیریں سوچنے لگے۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ ضابطہ خاں کے اہل و عیال مرہٹوں کی قید سے رہا ہو جائیں اور یہ ملک پامالی سے محفوظ رہے۔ آخر یہ طے ہوا کہ صلح و آشتی کا پیغام بھیجا جائے۔ مرہٹہ سرداروں نے چالیس لاکھ روپیہ تاوان کے عوض ان شرائط کو منظور کرنے کا وعدہ کیا۔ ضابطہ خاں تو خود لٹا پٹا تھا، اس کے پاس چالیس لاکھ کہاں؟ اس لئے مرہٹوں نے شجاع الدولہ سے کہا کہ وہ اپنی مہر کے ساتھ ایک تمسک [illegible] کر دے۔ شجاع الدولہ نے کہا میں حافظ رحمت خاں کے بھروسہ پر درمیان میں آگیا ہوں، اگر وہ اس رقم کی واپسی کا اقرار نامہ مجھے لکھ دیں تو میں مرہٹوں کو چالیس لاکھ کا تمسک دے دوں گا۔ حافظ رحمت خاں نے یہ اقرار نامہ لکھ دیا کہ وہ دس لاکھ روپیہ نقد اور بقیہ تیس لاکھ روپیہ تین سال کی قسطوں میں شجاع الدولہ کو ادا کریں گے بشرطیکہ مرہٹوں کو اُن کے علاقے سے نکال دیا گیا، خواہ صلح کر کے خواہ جنگ سے۔ وہ عہد نامہ یہ تھا کہ:-

> "وزیر سلطنت شجاع الدولہ تمام سرداران روہیل کھنڈ کو اُن کے ملک پر قابض کر دیں گے اور اُن کو اختیار ہے کہ خواہ صلح، خواہ جنگ کے ذریعے اس امر کو انجام دیں اور اگر مرہٹے جنگ یا صلح کئے بغیر دریا عبور کریں گے اور موسم برسات ختم ہونے پر دوبارہ روہیلوں کے ملک میں داخل ہوں گے تو اُن کا دفع کرنا وزیر کا کام ہوگا۔ روہیلہ سردار مذکورہ بالا امور کے بعد اقرار کرتے ہیں کہ وہ چالیس لاکھ روپیہ بشرائط ذیل وزیر سلطنت کو دیں گے۔ چوں کہ مرہٹے روہیلہ سرداروں کے ملک میں ہیں اس لئے وزیر شاہ آباد

سے روانہ ہو کر ان مقامات تک جائیں گے جہاں تک جانے سے روہیلوں کے اہلِ خاندان جنگل سے آ کر اپنے اپنے جائے قیام کو واپس آ سکیں۔ جب یہ امر صورت پذیر ہو جائے گا تو مذکورہ بالا رقم میں سے دس لاکھ روپیہ نقد ادا کیا جائے گا اور باقی تیس لاکھ روپے تین سال میں شروع ۱۱۸۶ھ سے ادا کئے جائیں گے۔ یہ عہد نامہ سر رابرٹ بارکر کے روبرو مہر ثبت ہو کر مکمل ہوا۔"

(حیاتِ حافظ رحمت خاں، از سید الطاف علی بریلوی ص ۱۶۹)

معاہدہ تو ہو گیا۔ لیکن شجاع الدولہ کو مرہٹوں کے نکالنے میں کوئی محنت کرنی نہیں پڑی۔ برسات شروع ہو گئی تھی اور ندیوں کے ناقابلِ عبور ہونے کا اندیشہ تھا اس لئے مرہٹے خود ہی گنگا پار چلے گئے اور ضابطہ خاں کے اہل و عیال رہا ہو گئے۔

لارڈ کلائیو نے ۱۷۶۵ء میں ایک معاہدہ شاہ عالم سے کیا تھا جس میں یہ طے ہوا تھا کہ انگریز بنگال کا خراج ۲۶ لاکھ سالانہ شاہ عالم کو ادا کریں گے اور کوڑا اور الہ آباد کے اضلاع پر شاہ عالم کا قبضہ ہوگا۔ لیکن ہیسٹنگز نے اس معاہدے کے خلاف ان اضلاع، کوڑا اور الہ آباد، کچھ رقم لے کر شجاع الدولہ کو بخش دیئے۔ شاہ عالم نے ان کو بچانے کی یہ تدبیر سوچی کہ دونوں علاقوں کا فرمان مرہٹوں کے نام لکھ دیا اور مرہٹہ سردار اپنی ٹڈی دل فوج لے کر ان اضلاع پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ ضابطہ خاں پہلے ہی مرہٹوں سے مل گیا تھا۔ انھوں نے حافظ رحمت خاں کو لکھا کہ اگر آپ شجاع الدولہ کے خلاف ہماری مدد کریں تو مفتوحہ علاقے میں آدھا حصہ آپ کا۔ اور وہ چالیس لاکھ کا تمسک بھی ہم آپ ہی کو دے کر اس رقم سے دستبردار ہو جائیں گے۔ اگر یہ منظور نہ ہو تو دوسری صورت یہ ہے کہ آپ بغیر مزاحمت کئے ہمیں اپنے ملک سے گزر جانے دیجئے۔ آپ کے ملک سے گزرنے کا معاوضہ آپ کو پیش کر دیا جائے گا۔

جب یہ پیغام ملا تو حافظ رحمت خاں نے جواب کے لئے مہلت مانگی اور شجاع الدولہ کو خط لکھا کہ مرہٹے تمھارا ملک چھیننے کے لئے آ رہے ہیں۔ اور یہ شرائط ہم سے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اگر تم میرا لکھا ہوا چالیس لاکھ کا تمسک مجھے واپس کر دو تو میں تمھاری حمایت کروں گا اور مرہٹوں کو اپنے ملک سے گزرنے نہیں دوں گا یہی نہیں بلکہ جنگ میں تمھارا معاون رہوں گا اور ان کا مقابلہ کروں گا۔

ان حالات میں شجاع الدولہ کا پریشان ہو جانا لازمی بات تھی اس نے سید شاہ مدن کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا اور ایک خط لکھا:-

"مجھ کو مرہٹوں کے ساتھ آپ کی عدم مشارکت کا حال معلوم ہو کر پورا اطمینان ہوا اور میں آپ کی رائے کے موافق میدانِ جنگ میں پہنچتا ہوں آپ مرہٹوں کے مقابلے میں پہنچنے میں توقف نہ کریں۔ نوشتۂ مُہری کے متعلق سید شاہ مدن سے زبانی عرض کر دیا ہے جو کچھ سید موصوف بیان کریں اس پر یقین فرمایئے میں اس سے سرمو انحراف نہ کروں گا۔"

سید شاہ مدن نے یہ خط دیا اور زبانی پیغام سنایا کہ مرہٹوں کا فتنہ فرو ہو جائے پھر شجاع الدولہ آپ سے خود ملاقات کریں گے اور وہ تمسک واپس کر دیں گے آپ کسی قسم کا اندیشہ خاطرِ مبارک میں نہ لایئے کیوں کہ دونوں فریق کے مابین کوئی مغائرت نہیں ہے۔"

مولوی سید مدن، منصب ہونے کے ساتھ شجاع الدولہ کے معتمد بھی تھے اور بڑے ثقہ انسان تھے۔ حافظ رحمت خاں نے ان کے زبانی پیغام کو باور کیا اور شجاع الدولہ کی امداد کرنے کا قطعی وعدہ کر لیا۔

ادھر شجاع الدولہ نے انگریزوں سے امداد طلب کی۔ انگریزوں نے ایک لاکھ پندرہ ہزار روپیہ ماہوار کے حساب سے فوج کا خرچ طے کر کے اپنی فوج بھیج دی۔ ادھر سے حافظ رحمت خاں میدان میں آ گئے۔ مارچ ۱۷۷۳ء میں مرہٹوں سے چھاپ شروع ہوئی اور کسی نہ کسی طرح فتنہ فرو ہو گیا۔ مرہٹے اودھ کا علاقہ چھوڑ گئے مگر چلتے چلتے حافظ رحمت خاں سے دو لاکھ روپیہ احمد خاں کی رہائی کا وصول کر لیا جو رحمت خاں نے اپنی جیب سے ادا کیا (مئی ۱۷۷۳ء)۔

جب بلا سر سے ٹل گئی تو شجاع الدولہ نے چالیس لاکھ والا تمسک واپس کرتے میں لیت و لعل کیا اور حافظ جی کے لئے بہانہ یہ تراشا کہ روہیلوں نے مرہٹوں سے ساز باز کر لی تھی۔ ادھر اس نے ہیسٹنگز کو یہ جتایا اور سمجھا کر لیتے سے دولت اکٹھا کرنے کی دھن میں لگا رہتا تھا یہ لالچ دیا کہ کمپنی میری مدد کرے اور روہیلوں کے ملک پر میرا قبضہ ہو جائے تو میں کمپنی کو پچاس لاکھ روپیہ نذرانہ نقد دوں گا۔

جب شجاع الدولہ لکھنؤ واپس پہنچ گیا تو حافظ رحمت خاں نے حسبِ توقع تمسک واپس لانے کے لئے خاں محمد خاں اور عبداللہ کشمیری کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ شجاع الدولہ ان سفیروں کے سامنے صاف مکر گیا اور کہنے لگا میں نے ایسا کوئی زبانی وعدہ نہیں کیا تھا۔ حافظ رحمت خاں کے سفیروں نے سید شاہ مدن کے حاضر کئے جانے کی درخواست کی۔ وہ دربار میں بلائے گئے۔ جب مولوی مدن آئے تو شجاع الدولہ نے انھیں آنکھ

سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: "کیوں شاہ صاحب تمسک کے سلسلے میں آپ نے حافظ رحمت خاں سے کیا قول و قرار کیا تھا؟" یہاں مولوی مدن کی بلند کرداری اور انصاف پسندی ظاہر ہوتی ہے کہ انھوں نے نہایت جرأت اور حق گوئی سے کام لیا اور کھلے لفظوں میں اقرار کیا کہ "میں نے آپ کے ارشاد کے بموجب حافظ الملک سے پکا وعدہ کر لیا تھا کہ تمسک انھیں واپس کر دیا جائے گا۔" شجاع الدولہ طیش میں لال پیلا ہو گیا اور غصے میں آکر بولا، معلوم ہوتا ہے تم لوگوں نے سازش کر لی ہے۔ میں نے ایسی بات ہرگز نہیں کہی تھی۔ لیکن مولوی مدن نے تین بار یہی دہرایا کہ نہیں، حضور نے تمسک کی واپسی کا اقرار واثق کیا تھا۔" جب شجاع الدولہ اپنی دھاندلی پر اڑا رہا تو مولوی مدن بھی خاموش ہو گئے۔ حافظ الملک کے سفیر خان محمد خاں سے شجاع الدولہ کی تلخ کلامی بھی ہوئی اور نواب برافروختہ ہو کر محل سرا میں چلا گیا۔

شجاع الدولہ نے انگریزوں سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر یہ چالیس لاکھ روپے روہیلوں نے دے دیئے تو آدھے کمپنی کو دے دوں گا اور نہیں دیئے تو میری امداد کر کے اُن کا ملک فتح کرا دیا تو پچاس لاکھ نقد نذرانہ پیش کر دوں گا۔ انگریز بھی اس لالچ میں شجاع الدولہ کی ہم نوائی کر رہے تھے۔

چناں چہ کمپنی اور شجاع الدولہ کی سازش سے ۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء کو کٹرہ میران پور کی جنگ شروع ہوئی جس کا حسرت ناک انجام حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی شہادت کے المیہ پر ہوا۔ سلطان خان نامی ایک شقی القلب فوجی، حافظ رحمت خاں کا سر لے کر شجاع الدولہ کے پاس آیا تو اُسے انعام و اکرام سے نوازا اور کہا کہ جاؤ یہ سر، نواب ضابطہ خاں اور مظفر جنگ سے شناخت کراؤ اور مولوی مدن کو بھی دکھا دینا۔

ضابطہ خاں نے شہید کا سر دیکھ کر صرف اتنا کہا "واقعی یہ سر حافظ رحمت خاں کا ہے کسی دوسرے کا نہیں۔" نواب مظفر جنگ نے شجاع الدولہ کی نمک خواری کا زیادہ ثبوت دیا اور تمسخر کے لہجے میں کہا "ایں ریش دنش جناب عالی سے لڑنے کو آمادہ ہوئے تھے"!

جب یہ سر سید شاہ مدن کے سامنے لایا گیا تو بے اختیار رونے لگے اور گلوگیر آواز میں فرمایا:-

"ہاں یہ اُسی مسلمان کا سر ہے!" پھر بلند آواز سے یہ شعر پڑھا

سرِ کشتہ بر نیزہ ، می زد نفس

کہ معراجِ مرداں ہمیں است و بس!

سید شاہ مدن کی اسی راست گوئی، بے باکی اور اعلائے کلمۃ الحق کے جذبے کی

غفار عزمی

غزل

ملا نہ غم بھی بقدرِ خوشی تو کیا ہوگا
یونہی رہی جو مری زندگی تو کیا ہوگا

اُٹھے ہیں دشت نوردی کو آج اہلِ جنوں
ملی جو راہ میں فرزانگی تو کیا ہوگا

بوقتِ صبح ستاروں کو نیند آنے لگی
مریضِ غم کو بھی نیند آگئی تو کیا ہوگا

جنابِ شیخ یہ پندارِ زہد ٹھیک نہیں
دکھا دیں رند بھی اپنی خودی تو کیا ہوگا

بھٹک رہی ہے اندھیروں میں زندگی اب تک
ملی نہ اس کو کہیں روشنی تو کیا ہوگا

بگولے اُٹھ تو رہے ہیں بفرطِ جوشِ فروغ
یہ گرد اُڑ کے فلک تک گئی تو کیا ہوگا

یہاں یوں تو سارے غموں کو قریب کر لوں گا
ہوئی نہ دور تری برہمی تو کیا ہوگا

بنا ہے خاک سے جائے گا خاک میں عزمی
فرشتہ ہو بھی گیا آدمی تو کیا ہوگا

سزا شجاع الدولہ نے یہ دی کہ اُن کی تمام جاگیر، مال و منال اور اسباب ضبط کر لئے اور انھیں قید خانے میں ڈال دیا، جہاں مشقت جھیلتے جھیلتے اُن کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

یہ تمہید اور پس منظر کی روداد قدرے طویل تو یقیناً ہو گئی ہے لیکن اس شعر کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ اکبر نے دراصل اس شعر میں "ظاہر دار بیگ" قسم کے علما کی تضحیک کا پہلو نکالا ہے جو عمامہ و عبا اور ریش دراز کا تو بڑا اہتمام کرتے ہیں لیکن باطنی تقویٰ اُن میں مفقود ہے۔ حق گوئی اور بے باکی جو "آئینِ جواں مرداں" ہے اُن کی مصلحتوں کی غلام بن چکی ہے۔ اس طرح اُن کا کردار گندم نما اور جو فروش کا سا ہو گیا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ "شیخ" سے اکبر نے پچھلی سیاست کے کسی خاص کردار پر طنز کیا ہو۔ جیسا کہ اُن کے بعض شعروں میں پایا جاتا ہے۔

محبوب اللہ مجیب

دارا شکوہ اور اس کی تصانیف

۱۷ جون ۱۶۳۱ء کا دن تھا، ملکہ ممتاز محل کی سانسیں بالکل اکھڑ چکی تھیں اس نے حسرت اور مایوسی سے شاہجہان کی طرف دیکھا اور بمشکل تمام یہ کہہ پائی :

"شاہا در ایام محبوسی تا ایں دم آخر ہمدرد شما بادم - ایزد تعالیٰ بادشاہی نصیب شما کردہ فرمان روائی جہاں بخشید - ما بجہت انتقال می کنیم - بنا بریں دو وصیت ما است امید کہ ہر دو قبول شود - خدیو جہاں اقبال نمودہ استفسار کردند - حق تعالیٰ شمارا چہار پسر و چہار دختر عطا کردہ - حاجت نکاح دیگر نیست و دیگر آنکہ بہ سپہر قدمن بناں مقبرہ بشا زید کہ از من یادگار ے بماند -"

اس کے بعد اس بانوئے آفاق اور بلقیسِ عہد کی آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں - شاہجہان نے ملکہ کی دونوں وصیتیں پوری کیں - بچوں سے اتنا پیار کرنے لگا کہ وہ ماں کی محبت بھول گئے اور اپنی محبت کو ایک ایسا خراج پیش کیا کہ وہ زمانے میں مثال بن گیا۔

شہزادہ دارا شکوہ شاہجہان کا بڑا لڑکا تھا جو اُسے بہت عزیز تھا - اور لڑکیوں میں جہاں آرا بیگم سے اُسے بڑی محبت تھی، دارا شکوہ کی پیدائش اجمیر سے کچھ دور ایک مقام پر ۲۰ - مارچ ۱۶۱۵ء کو ہوئی - "سفینۃ الاولیاء" میں دارا شکوہ نے اس بارے میں بھی اشارہ کیا ہے :

"ولادت ایں فقیر در خطۂ اجمیر بالائی ساگر تال روی دادہ در سلخ صفر نصف شب دو شنبہ سال یک ہزار بیست و چہار ہجری -"

(سفینۃ الاولیاء)

جب شاہزادہ بڑا ہوا تو اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا گیا - ملا لطیف سلطان پوری اس کے معلم مقرر ہوئے - جب وہ سن بلوغ کو پہونچا تو نادرہ بیگم سے اس کی شادی ہوئی - نادرہ بیگم کون تھی ؟ کیا تھی ؟ زیادہ تفصیل معلوم نہیں - معتمد خاں بخشی نے اپنی کتاب "اقبال نامۂ جہانگیری" میں درج اتنا لکھا ہے :

"از سلطان پرویز طفلی دختری بود - طفل پس از پدر بزودی رحلت نمود دختر در عقد ازدواج شاہزادہ دارا شکوہ است (ص ۲۳۲)

دارا شکوہ شروع سے ہی معرفت کی راہ کا دلدادہ تھا - ملا لطیف سلطانپوری کی تعلیم نے اس کے مذاق کو اور بلند کر دیا :

"خاطر . . . . از کتب اہل سلوک و طریقت ملوک گردیدہ بود و جز توحید صرف منظور نبود و اندر دوئی وجد و ذوق اکثر کلمات بلند حقائق و معارف سر بر میزد" (حسنات العارفین)

چندر بھان برہمن اور دارا شکوہ

دارا شکوہ چونکہ خود شاعر تھا اسی لئے اس کی نظر میں دوسرے شاعروں کی بھی بڑی عزت تھی - دارا شکوہ کی تصانیف میں ایک دیوان بھی شامل ہے جو "اکسیرِ اعظم" کے نام سے موسوم ہے - اسے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے بڑی عقیدت تھی اسی لئے اس نے اپنا تخلص بھی قادری رکھا - اس کی ہر کتاب میں جگہ جگہ مولانا جامی حکیم سنائی اور جلال الدین رومی کے برمحل اشعار ملتے ہیں - "مرأت الخیال" کا مصنف لکھتا ہے کہ ایک بار شہزادے کے سامنے دانش نے ایک غزل پڑھی، اس کا مطلع یہ تھا :

موسمی آں شد کہ ابر تر چمن پیدا شود   نکہت گل مایۂ شور جنوں در سر شود

اور یہ شعر :-

ما بذوقِ گریۂ مستی دریں بزم آمدیم — عشوہ بدہ ساقی بقدرے کہ چشم تر شود
رازِ پوشیدن نشاید داغِ آتش از بیتابیِ عشق — در میانِ انجمن پروانہ خاکستر شود

اس غزل کو سن کر شاہزادہ اچھل پڑا اور اس نے شاعر کو ایک لاکھ روپے بطور انعام دیئے۔

شاعری میں بھی دارا شکوہ کا مزاج اس کی فکر سے بغل گیر ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کی غزلیں اس کی فکر کی ترجمانی کرتی ہیں:

خویشتن را جدا نمی دانم — لیک خود را خدا نمی دانم
قطرہ را نسبتی کہ با دریاست — بیشتر زیں روا نمی دانم

مسافر ہر قدر باشد سبکسار — نیاید در سفر تصدیع و آزار
تو ہم اندر جہان ہستی مسافر — یقیں می دان اگر ہستی تو ہشیار

تا دوست رسیدیم چو از خویش گزشتیم — از خویش گزشتن چہ مبارک سفرے بود

بہشت آنجا کہ ملائی نباشد — ز ملا شور و غوغائی نباشد
در آں شہرت کہ ملا خانہ دارد — در آنجا ہیچ دانائی نباشد

ہر شے کہ نظر کنی ہمہ اوست — وجہ اللہ عیانست رو بروئے

چندر بھان برہمن اپنے زمانے کا صاحب طرز انشا پرداز تھا۔ شاہجہانی عہد میں اس نے بہت دنوں تک دفتر انشاء میں کام کیا۔ جب تک دارا شکوہ حیات رہا، چندر بھان اس کا میر منشی رہا۔ برہمن کی پیدائش لاہور میں ہوئی اور تعلیم و تربیت رواج زمانہ کے مطابق ہوئی۔ ملا سیالکوٹی کی شاگردی اختیار کی۔ شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ شاہجہان کے سامنے ایک بار اس نے اپنی ایک غزل کا مطلع پڑھا:

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندیں بار — بکعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

شاہجہان اس شعر کو بار بار پڑھواتا تھا اور سر دھنتا تھا۔

برہمن کی غزلوں میں بڑی نفاست اور رنگارنگی ہے۔ وصف غزل پر اتنے لطیف اشاروں کی حنابندی شاید ہی دوسرے شاعروں کے یہاں ملے۔ اس کی طبیعت کی سرمستی رخسارِ غزل پر جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔

رسید موسم گل فکر مے پرستاں چیست؟ — من از صلاح گزشتم صلاح مستاں چیست؟
گزشت عمر دریں فکر من ندانستم — کہ جرم کفر کدام و ثواب ایماں چیست؟
بیا و نرگس مستے چو ایں برہمن را — بہ سبز باغ چہ کار است کشت بستاں چیست؟

خواہم از سلسلۂ زلف بتاں تارے چند — کہ بہم تابہ دہم رشتۂ زنارے چند
زلف بکشا کہ بود در غم ہر رشتۂ آں — خطِ آزادیِ دلہائے گرفتارے چند
نرگسِ مست تو در بزم حریفاں بنگاہ — دارد مے بیہوشی آورد بہ ہشیارے چند

برہمن باز دل ما بنگاہے بردند
دلبرے لب شکرے چیدہ دل آزارے چند

کسے ز حالِ پریشانِ ما خبر دارد — کہ ہمچو بادِ صبا کار با سحر دارد
دماغ منتِ پیرِ مغاں نماند مرا — کہ جام خونِ جگر لذتِ دگر دارد
بجلوۂ خواب برہمن ببینید خابینید — کہ چشمِ نیم مستی حالتِ دگر دارد

"مکالمہ بابا لال بیراگی و دارا شکوہ" کا ترجمہ سنسکرت سے فارسی میں چندر بھان برہمن نے ہی کیا تھا۔ آخر عمر میں وہ گوشہ نشین ہو گیا اور بنارس ہی میں ۱۶۶۲ء میں اس کا انتقال ہوا۔ دارا شکوہ نے ایک بار بابا لال بیراگی سے سوال کیا۔ "ہندو عقیدے کے مطابق دسرتھ، کرشن جی آج بھی گوپیوں کے ساتھ بندرا بن میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ کیا ہماری آنکھیں بھی ان کو دیکھ سکتی ہیں؟" بابا لال بیراگی نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "یہ کوئی ناممکن چیز نہیں۔ لیکن جب تک انسان حرص و ہوس کا بندہ رہے گا وہ انھیں نہیں دیکھ سکتا۔ اس سلسلے میں پہلی شرط فقیر کامل ہونے کی ہے۔" اس طرح دارا شکوہ نے بابا لال بیراگی سے سیکڑوں سوال کئے اور ان سوالات کا بمع جوابات فارسی میں ترجمہ کرایا۔

اسی طرح سے راہ سلوک میں جو دقتیں پیش آتی تھیں وہ کسی نہ کسی فقیر کامل سے اس بارے میں پوچھ کر اطمینان کر لیا کرتا تھا۔ اسلامی تصوف کے بارے میں بہتیرے سوال اس نے شاہ محب اللہ الہ آبادی سے کئے جو اپنے وقت کے فقیر کامل تھے۔

یوگ وششٹ کا فارسی ترجمہ

دارا شکوہ کو اسلامی تصوف کے ساتھ ساتھ ہندو مذہب و فلسفہ سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ جب اس نے ہندو فلسفے کا مطالعہ شروع کیا تو اسے اس فلسفے سے محبت پیدا ہوئی۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتا ہے:

"معلوم شد کہ در میانِ ایں قوم قدیم، بیش از ہمہ کتب سماوی، چہار کتاب آسمانی کہ رگ وید و یجروید و سام وید و اتھروید باشد بر انبیائے آں وقت کہ بزرگ ترین آنہا برہما کہ آدم صفی اللہ است، با جمیع احکام نازل شدہ و ایں معنی از ہمیں کتاب ہا ظاہر است و از قرآن مجید نیز معلوم شود کہ ہیچ قومے نیست کہ بے کتاب و پیغمبر

باشد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ و ہیچ امتی نیست کہ دراں پیغمبرے نگذشتہ۔"

چنانچہ داراشکوہ نے بالمیک کی کتاب یوگ وشسشٹ کا ۱۶۵۶ء میں ترجمہ کیا۔ کتاب کے شروع میں دیباچہ مضامین شامل ہے جس میں سے کچھ مضمون اس طرح سے ہیں :۔

۱۔ ویراگ پرکرن اول ۔ یعنی وحشت ونفرت از عالم

۲۔ تشریح اقسام واسنا یعنی خطرات کہ مراد از خواہشات است ۔

۳۔ درخواست سری رامچندر جی و وشوامتر رشی برائے رہنمائی خود۔

۴۔ داستان عشق راجہ اندر با اہلیا زن گوتم رکھشیر ۔ تمثیلاً ہمیں دل جسم لطیف است و ہویت محل حرکت آتما است ۔

۵۔ حکایت معرفت راجہ سرگہہ و راجہ پرگھہ

۶۔ تغیر و تبدل دیدہا و دیگر علوم بعد ہر قیامت

۷۔ حکایت در طریق پوجا کہ مہادیو جی بہ بشسشٹ ارشاد فرمودند۔

اس کے بعد اصل مضمون جہاں سے شروع ہوتا ہے اس کے اوپر سنسکرت میں "سری گنیش آئینمہ" جلی حروف میں لکھا ہوا ہے ۔ کتاب کے ترجمے کے بارے میں وہ ایک واقعہ نقل کرتا ہے :

"ایک رات میں نے دو بزرگ صفت لوگوں کو دیکھا۔ ایک کے بال بالکل سفید تھے اور دوسرے کے کچھ کم سفید۔ دونوں یکے بعد دیگرے ایک بلندی پر کھڑے تھے ۔ چونکہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد وشسشٹ (جی) کی شکل و صورت سے بخوبی واقف ہو چکا تھا لہٰذا انھیں دیکھتے ہی میں کچھ آگے بڑھا ۔ وشسشٹ (جی) نے مجھے دیکھتے ہی بغل گیر کر لیا اور شفقت کا ہاتھ پھیرا اور پھر رامچندر (جی) نے بھی بڑی محبت سے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔"

(کتاب یوگ وشسشٹ فارسی قلمی ۔ دیباچہ صفحہ ۲ و ۳)

اس ترجمہ کی وجہ خاص

مصنف نے اس ترجمے کی وجہ از خود رقم کی ہے :

"برادر باب فطرت عالی واضح دلایاد کہ پیش از پیش از ایں کتاب جوگ بشسشٹ را ترجمہ کردہ بودند ۔ ہمیں ہمیں الفاظ سنسکرت را نوشتہ بود بر حقایق و معارف ایں کتاب نرسیدہ بودند۔ ازآں فوائدآں کہ مطلب است پوشیدہ و معطل ماندہ ۔ بنا بر آں در ۱۰۶۶ھ شاہ گیتی پناہ خدا آگاہ محمد داراشکوہ خلف شاہجہان پادشاہ فرمودند کہ ترجمہ ہائے کہ سابق نوشتہ اند، چوں طالباں را نفعی نمی رسانند۔ می خواہم کہ ایں کتاب مستطاب را بہتر ازاں ترجمہ کنند و سخناں ایں طائفہ مطابق تحقیق کردہ اکثر مواضع تفسیر کنم بنویسند۔"

سفینۃ الاولیاء

اس کتاب کا سال تصنیف ۱۶۴۰ء ہے ۔ داراشکوہ نے اس کتاب میں صوفیائے کرام کے حالات زندگی اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی ہے ۔ اور اس کے علاوہ جو روایتیں ان صوفیاء کرام سے وابستہ ہیں، ان سب کے حوالے درج ہیں ۔ مثلاً منصور حلاج، ذوالنون مصری، شیخ عبداللہ مصری، شیخ سلیم الدین چشتی اور شیخ عبدالقادر جیلانی وغیرہ ۔

داراشکوہ کا اولیاء کرام کے بارے میں یہ خیال ہے "شب و روز کا ماحصل بس انھیں بزرگوں کا تصور ہے اور بس ۔" اور اسی وجہ سے "میں ان کے کارناموں کی طرف متوجہ ہوا ۔"

اولیاء کرام کو کس طرح جانا جا سکتا ہے؟ ان کی شناخت کیا ہے؟ اس سلسلے میں داراشکوہ نے خود ہی ایک واقعہ نقل کیا ہے ۔ وہ کہتا ہے : کسی نے ایک بار عبداللہ سلامی سے دریافت کیا "ہم اولیاء کرام کی کس طرح شناخت کر سکتے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا "وہ جو خطاؤں کو معاف کر دیا کرتے ہیں، خلق اللہ سے محبت کرتے ہیں اور کردار کے بندے ہوتے ہیں ۔"

سکینۃ الاولیاء

شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی سے صوفیوں کے سلسلے باقاعدہ وجود میں آئے ۔ انھیں کے ماننے والوں میں سے شیخ بندگی محمد غوث ۱۴۸۲ء میں ہندوستان تشریف لائے ۔ اس وقت یہاں سکندر لودی کی حکومت تھی ۔ پھر شاہجہان کے زمانے میں اس سلسلے کے ماننے والوں میں سے شاہ میاں میر اور ملا شاہ بدخشانی تھے ۔

داراشکوہ کو شاہ میاں میر سے بڑی عقیدت تھی ۔ اس نے اپنے پیر کا نام ہر جگہ بڑی عقیدت سے لیا ہے اور ان کو "قبلہ ما" کہہ کر خطاب کیا ہے چنانچہ اس کتاب میں داراشکوہ کی تمام تر کوشش یہی رہی ہے کہ اس میں خاندان قادریہ کے سارے صوفیائے کرام کا ذکر کیا جائے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوا ۔

رسالۂ حق نما

اس رسالے میں دارا شکوہ نے راہِ سلوک کی مختلف منزلوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ عالم ناسوت، عالم ملکوت، عالم جبروت اور عالم لاہوت پر مدلل بحث شامل ہے۔ علاوہ ازیں مراقبہ کے طریقوں کا ذکر بھی تفصیل سے کیا گیا ہے۔

کتاب کے خاتمے پر ایک رباعی درج ہے جس سے اس کا سالِ تصنیف معلوم ہوتا ہے

این رسالۂ حق نما باشد تمام	در ہزار و پنج و شش شد تمام
ہست از قادر مدام از قادری	آنچہ ما گفتیم تا فہم والسلام

حسنات العارفین

اس کتاب کا سالِ تصنیف ۱۰۶۲ھ ہے۔ اس کتاب میں خصوصیت سے صوفیائے کرام کی باتوں کو شامل کیا ہے مجموعی طور سے اس طرح کے ایک سو سات عارفین سے متعلق روایتیں اور حکایتیں درج کی گئی ہیں۔

طریقۃ الحقیقت

اس کتاب میں جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے طریقت کی مختلف منزلوں کا تذکرہ ہے۔ اور جگہ جگہ کوئی نہ کوئی شعر، رباعی یا فرد منزل کو خوبصورت بنانے کے لئے استعمال کی گئی ہے۔

مجمع البحرین

اس کتاب میں ویدانت اور تصوّف کی روح کو یکجا کر کے پیش کیا گیا ہے۔ روح کیا ہے؟ دارا شکوہ اس کا جواب اپنی اس کتاب میں دیتے ہوئے کہتا ہے: "روح ایک جوہر ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ روح اور ابو الارواح جس کو آتما یا پرم آتما بھی کہتے ہیں۔"

نجات کے بارے میں وہ آگے چل کر کہتا ہے کہ نجات اور مکتی ایک چیز ہے۔ کیونکہ رضوانِ اکبر میں داخل ہونے کی خواہش اور مکتی یعنی نجات پانا ایک ہی چیز ہے

اس طرح جہاں بھی کسی چیز کو بیان کیا گیا ہے اس میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ دونوں مذاہب کے مشترک نظریے اور خیال کو ایک جگہ پیش کیا جائے

۱؎ اس کتاب کے نسخے ہر زبان میں ملتے ہیں۔ ابھی ایک نسخہ ایران میں ڈاکٹر تارا چند کی وساطت سے اشاعت پذیر ہوا ہے۔

سرِّ اکبر

اس کتاب کی تکمیل ۱۰۶۷ھ میں ہوئی۔ جس طرح شہزادے نے یوگ بششٹ کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا اسی طرح سے اس نے چوّن اپنشد کا اس نام سے فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کتاب کے شروع میں دیباچہ ہے اور پھر ان اپنشد کے نام ہیں جن کا اس نے ترجمہ کیا ہے۔ اس کے چار ابواب ہیں جن میں الگ الگ وید کے ترجمے ہیں۔ مثلاً پہلا رگ وید ہے۔ دوسرا یجر وید ہے تیسرا سام وید ہے اور چوتھا اتھر وید ہے۔

دارا شکوہ کے بیان کے مطابق جب وہ کشمیر میں مقیم تھا اس وقت اسے مختلف پیشواؤں کی تعلیمات کا تفصیل سے مطالعہ کرنے اور سمجھنے کا موقع ملا چنانچہ اس نے ہر مذہب کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ویدانت فلسفے کا مطالعہ شنکر آچاریہ کی تعلیمات، مقدّس ویدوں کے باریک نکات اس نے پنڈتوں کی مدد سے سمجھے اور ان کی طرف راغب ہوا۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے:

"این ترجمہ را کہ بہ سرِّ اکبر مسموم است، ترجمۂ کلام الٰہی دانستہ ترک تعصّب نمودہ بخوانند و بفہمند، بیزوال و بے خوف و بے اندوہ رستگار موئید خواہد شد۔"

پیدائش عالم اور وید

پیدائش عالم کے بارے میں وید کا نظریہ درج ذیل ہے۔ اس کو دارا شکوہ نے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ اسے ہُو بہو نقل کیا جاتا ہے:

"اوّل از ہمہ پیدائش آتما یگانہ بود و ہیچ نبود۔ آتما خواہش کرد کہ پیدائش عالم کنم۔ این ہمہ عالمہا پیدا کرد و اوّل این چہار چیز پیدا کرد۔ انبھ، مرتیچ، مرو، آپ۔ انبھ آ بیست کہ جائے بودن آں بالائے بہشت است و مرتیچ عالم فضا ست کہ پائین بہشت است و مرو عالم زمین است کہ میرندہا مدوی باشد و آپ آبیست کہ در زیر جمیع طبقات عالم زمین است۔"

اس طرح دارا شکوہ نے مقدّس وید کے چیدہ چیدہ جزو کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات مدّ نظر رکھنی ہے۔ وہ یہ کہ دارا شکوہ کے اس ترجمے نے بہت بڑا کام سرانجام دیا۔ وہ مستشرقین جو ہندوستانی فلسفے سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور اس پر کچھ کام کرنا چاہتے تھے انھوں نے دارا شکوہ کی تصانیف سے مدد لی ہے۔

شمال مشرقی سرحدی ایجنسی کے آدی باسی

آدی باسیوں کا ملک گھنے جنگل اور دشوار گذار جھاڑیوں اور پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ گہری وادیوں میں ندی نالے، جنگل کی طرف جسے آدی باسی سیانگ کہتے ہیں، بہتے ہیں۔ دریائے دہانگ اس علاقے کی آب رسانی میں بہت ہی کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ یہ ندی برہم پتر کی معاون ہے۔ آسام کے شمال مشرقی سرحدی علاقے میں کوہ ہمالیہ کا یہ ایک مخصوص حصہ ہے جس کے شمال میں برہم پتر کا ایک معاون دریا بہتا ہے۔ کوہ ہمالیہ کا یہ حصہ اور وہ علاقہ جہاں سے برہم پتر کا معاون دریا بہتا ہے آدی باسیوں کا مسکن ہے۔ یہاں آدی باسیوں کے بہت سے گروہ آباد ہیں۔ آدی باسیوں کے علاقے کو دریائے دہانگ جو پہلے جنوب کی طرف بہتا ہوا مشرق کی طرف مڑ جاتا ہے، دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اسی دریا کے شمالی حصے کو سیانگ، جنوبی حصے کو دہانگ اور مشرقی حصے کو برہم پتر کے الگ الگ ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اس علاقے کے پہاڑوں میں ہمہ اقسام کے گھنے جنگل پائے جاتے ہیں۔ ان جنگلوں میں گھاس اور بہت ہی کارآمد اور مفید ساگوان کے درخت پائے جاتے ہیں۔ کہیں کہیں دلدل بھی دکھائی پڑتی ہے۔ ہمہ اقسام کے پرندے جو ہند، ہمالہ اور برما کے علاقائی نمائندے کہے جا سکتے ہیں یہاں پائے جاتے ہیں۔

اس علاقے کی آب و ہوا آسام کی آب و ہوا سے مختلف نہیں ہے۔ ماہ جنوری کے وسط سے لے کر فروری کے نصف مہینے تک یہاں کا موسم بہت ہی ٹھنڈا ہوتا ہے لیکن آسمان صاف اور شفاف نظر آنے لگتا ہے۔ اسی موسم میں پاسی گھاٹ کی پہاڑی وادیوں میں ہوائیں زور سے چلنے لگتی ہیں۔ فروری کے آخری ہفتے میں کبھی کبھی مینہ برسنے لگتا ہے۔ مارچ کے آخری ہفتے سے برسات شروع ہو جاتی ہے اور جولائی کے اختتام تک جاری رہتی ہے۔ ان دنوں آسمان کبھی صاف دکھائی نہیں دیتا، ابر آلود رہتا ہے اور زوروں کی بارش ہوتی رہتی ہے۔

سال کا یہ حصہ اس علاقے کا بہت ہی خوشگوار اور صحت بخش موسم ہے۔ ان دنوں دریاؤں میں سیلاب آنے کی وجہ سے آمد و رفت کے وسائل بالکل ختم ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے یہاں کی پہاڑیاں باقی دنیا سے بالکل کٹ جاتی ہیں۔ اکتوبر کے مہینے سے دریاؤں میں پانی اترنے لگتا ہے۔ اکتوبر کے آخری ہفتے سے لے کر جنوری تک کا موسم بہت سہانا ہوتا ہے۔ ان دنوں راتوں میں پالا اور کہرا پڑنے لگتا ہے۔ انہی دنوں میں پہاڑی وادیوں میں کئی مہینوں تک مسلسل ہوائیں زور سے چلنے لگتی ہیں۔ بارش ایک رفتار سے نہیں ہوتی لیکن یہ دیکھا گیا ہے کہ ان دنوں میں پہاڑوں کے نچلے حصے میں بہت زوروں کی بارش ہوا کرتی ہے۔

آدی باسیوں کا ملک کئی سو میل دور تک پھیلا ہوا ہے لیکن ان کی آبادیاں صرف دریائے دہانگ اور دریا مئی کے دونوں کناروں پر ہی پائی جاتی ہیں۔ ان کی آبادیاں شمال میں گیلنگ تک جو ہندوستان اور تبت کی سرحد پر ہند کا آخری سرحدی گاؤں ہے اور جنوب میں پاسی گھاٹ تک پھیلی ہوئی ہیں۔

دہانگ اور سبانسری آبشار کے درمیانی علاقے میں جو آدی آباد ہیں ان کے خاندان کئی گوتوں میں منقسم ہیں۔ ان گوتوں کو لسانی طور پر دو اہم گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک گروہ جو بہت ہی بڑا ہے اور مشرق کی طرف آباد ہے آدی کے نام سے موسوم ہے۔ دوسرے گروہ کا نام گالنگ ہے۔

دہانگ کے دائیں طرف کے علاقے میں پہاڑیاں بہت ہی کم پائی جاتی

ہیں لیکن وہ علاقہ جو دامانگ اور دبانگس کے درمیان ہے بہت ہی اونچے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ آدی باسی بہت سے گروہوں میں منقسم ہیں جن میں سے بہت ہی اہم اور مشہور گروہ [illegible] مینیونگ پاسی [illegible] اور بوری [illegible] دوسرے گروہوں میں پاسی مینیونگ [illegible] پانگی اور کارکو شامل ہیں۔

آدی باسی پستہ قد مگر طاقتور ہوتے ہیں۔ ان کے سر کے بال جو سیدھے اور سیاہ رنگ کے ہوتے ہیں، کان کے کوئی اڑھائی انچ اوپر گرداگرد کٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے جسم کا رنگ گندمی اور منگول لوگوں کی آنکھوں کی سی خاص خصوصیت ان کی آنکھوں میں پائی جاتی ہے۔

آدی باسیوں کے گاؤں پہاڑوں کی چوٹیوں پر [illegible] کی طرف آباد ہیں۔ ندی نالوں کے کنارے [illegible] پانی [illegible] دستیاب رہتا ہے۔ پہاڑوں کے اوپر [illegible] جو گاؤں آباد ہیں ان میں کہیں کہیں پتھر کی دیواریں نظر آتی ہیں جو دشمنوں کا مقابلہ کرنے [illegible] کام آتی ہیں [illegible] پہاڑوں کے نیچے [illegible] کے گاؤں میں دکھائی نہیں دیتیں۔ گاؤں سے ملحقہ [illegible] پہنچ سکتے ہیں کہ تقریباً سبھی جگہ گاؤں بنانے سے پہلے [illegible] رکھا ہے کہ ان گھروں میں [illegible] لوگوں کو دشمنوں کے حملوں سے بچنے کے لئے [illegible] ثابت ہوسکتی ہیں۔

آدی باسی کھیتوں [illegible] لگاتے ہیں اور جنگلی جانوروں سے [illegible] بچانے کے لئے ان کے اطراف بانس کی باڑ لگا دیتے ہیں۔

ان کے گاؤں میں عموماً ایک کنبے کے لئے ایک گھر تعمیر کیا جاتا ہے جس میں میاں بیوی اور ان کے کمسن بچے رہتے ہیں۔ بن بیاہے لڑکے اور لڑکیوں کے لئے الگ الگ گھر تعمیر کئے جاتے ہیں جنھیں علی الترتیب موشپ اور راشنگ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

آدی باسیوں کے ہاں گاؤں کے آباد کرنے کے لئے کوئی خاص منصوبہ بندی نہیں پائی جاتی۔ ان کے گھر [illegible] کے اندر [illegible] پر تعمیر کئے جاتے ہیں۔ جو لوگ گھروں کی تعمیر میں مدد دیتے ہیں ان کو کوئی صلہ دینے کا وعدہ نہیں کیا جاتا۔ جب کوئی شخص شادی کرنے کے بعد اپنا گھر الگ تعمیر کرنا چاہے یا جب کبھی کوئی پرانا مکان از سرِ نو تعمیر کیا جائے تو گاؤں کے مرد اور عورتیں اس تعمیری کام میں ہاتھ بٹاتی ہیں۔

موشپ اور عام گھروں میں خاص فرق صرف یہی ہے کہ موشپ کے ایک طرف لکڑی کی دیوار کھڑی کی جاتی ہے اور باقی تین طرف کھلا چھوڑا جاتا ہے۔ موشپ عام گھروں سے لمبائی میں کچھ زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ راشنگ مکان بھی موشپ ہی کی طرح کا ہوتا ہے۔

یہ لوگ بلا امتیازِ جنس کان کے اڑھائی انچ اوپر سر کے گرداگرد بال کاٹتے ہیں لیکن پوبڑ آدی باسی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ پوبڑ آدی باسیوں میں مرد سر کے بال زلف نما رکھتے ہیں اور عورتیں اپنے سر کے بالوں کو بڑھنے دیتی ہیں انھیں کاٹا نہیں جاتا۔

مرد اور عورتیں الگ الگ قسم کے کپڑے پہنتی ہیں کپڑا ان کے گھروں میں ہی بُنا جاتا ہے۔ مرد عموماً سفید لنگوٹی کے ساتھ بلا آستین کا کوٹ پہنتے ہیں۔ جنوبی علاقے کے گاؤں میں عورتیں لہنگے کے ساتھ کوٹ پہنتی ہیں لیکن شمالی حصے کے گاؤں میں عورتیں چھوٹے لہنگے کے ساتھ چولی پہنتی ہیں جو صرف ایک بالشت چوڑی ہوتی ہے۔ ان لوگوں کے لباس کے لئے جو اشیاء درکار ہوتی ہیں وہ بازار سے نہیں خریدی جاتیں۔ یہ لوگ کپاس کی کاشت کرتے ہیں۔ کپاس سے بیج الگ کرنے اور سوت کاتنے کا کام عورتیں انجام دیتی ہیں۔ ان کا عام پسندیدہ رنگ گہرا بھورا رنگ ہے۔ آدی باسی یہ رنگ جڑی بوٹیوں سے حاصل کرتے ہیں۔

پارچہ بافی کا کام تانا بانا تنگ پٹیوں پر کیا جاتا ہے۔ یہ پٹیاں کمبلوں اور لہنگوں کے کپڑے بُننے کے لئے بہت ضروری ہیں۔

آدی باسی رنگوں کی آمیزش کے بارے میں خاص خیال رکھتے ہیں۔ رنگریزی میں انھیں کمال حاصل ہے۔ کپڑوں پر عموماً رنگوں کی ٹیڑھی میڑھی اور سیدھی لکیریں ڈالی جاتی ہیں لیکن میدانی علاقوں سے نزدیک رہنے والے آدی باسیوں نے وہاں کے نمونوں کو اپنا لیا ہے۔

آدی باسی اپنے گہنوں میں منکوں کا استعمال کرتے ہیں جنہیں وہ یا تو تبتیوں سے یا پاسی گھاٹ کے بازار سے خریدتے ہیں۔ سونے کے گہنوں کا رواج نہیں ہے لیکن میدانی علاقوں سے نزدیک رہنے والی عورتیں چاندی کے سکوں سے بنے ہوئے ہار جن میں روپیہ اور اٹھنی کے پرانے سکوں سے بنے ہوئے ہار شامل ہیں پہننے لگی ہیں۔ تانبے کی بنی ہوئی چوڑیاں مرد اور عورتیں دونوں شوق سے پہنتے ہیں اور یہ مقامی طور پر ہی تیار کی جاتی ہیں۔

آدی باسی گودنے کو مذہبی رسم میں شریک نہیں کرتے لیکن جب لڑکے اور لڑکیاں گدوانے سے انکار کرتے ہیں (اس لئے کہ تکلیف برداشت نہیں کر سکتے) تو ان سے کہا جاتا ہے کہ موت کے بعد دوسری دنیا میں وہ لوگ جن کے جسم پر گودنے کے نشانات ہیں اس کے بدلے غذا حاصل کر سکتے ہیں اور ان لوگوں کے لئے جن کے جسم پر یہ نشانات نہیں ہوتے غذا کا حاصل کرنا محال ہوگا۔

آدی باسیوں میں کوئی پیشہ ور گودنے والا نہیں ہوتا کیونکہ تقریباً ہر ایک گاؤں میں اس کام میں تجربہ کار مرد اور عورتیں ملتی ہیں جو مرد یا عورتیں اس کام کو انجام دیتی ہیں انھیں نقد یا جنس کی صورت میں معاوضہ دیا جاتا ہے۔

آدی باسی پانچ قسم کے برتن استعمال کرتے ہیں جو بانس، لکڑی، کدو، مٹی اور دھات سے بنائے جاتے ہیں۔ گھریلو ضروریات کے لئے ٹوکرے جیسی چیزیں وہ خود ہی بنا لیتے ہیں۔ ٹوکرے اور ٹوکریاں بانس اور بید سے بنائی جاتی ہیں۔

اگرچہ ٹوکرے اور ٹوکریاں بنانے کا کام مردوں ہی کے لئے مخصوص ہے لیکن عورتوں کو یہ کام منع نہیں ہے۔ ٹوکرے بُننے کا کام کسی خاص جماعت یا ذات کے لئے مخصوص نہیں۔ فرصت کے اوقات میں مرد گھریلو ضروریات کے لئے ٹوکرے بُنتے ہیں۔ ٹوکرے اور دیگر ضروری اشیا رکھنے کے لئے [illegible] آدی باسی صرف داؤ (ڈبوک) اور ایک چھوٹا سا چاقو استعمال کرتے ہیں۔ یا تو گاؤں کے لوہار ہی تیار کرتے ہیں۔

آدی باسی جو ایک زمانے میں نامور جنگجو تھے آج کل امن پسند بن گئے ہیں اور آرام کی زندگی گزارنے لگے ہیں۔ اب یہ لوگ دوسروں سے دوستانہ تعلقات قائم رکھتے ہیں اور امن و امان کی زندگی گزارتے ہیں۔ ان میں بیشتر لوگ اپنے علاقے سے [illegible] کی خاطر [illegible] اور [illegible] کرنے لگے ہیں۔

آدی باسیوں کے کئی [illegible] ہتھیار ہیں جنھیں وہ دشمنوں کے مقابلے کے لئے اور اپنے آپ کو بچانے کے لئے اپنے پاس رکھتے ہیں۔ مندرجہ ذیل سطروں میں ہم ان ہتھیاروں کا تفصیلی ذکر کریں گے:

آدی باسیوں کی ڈھالیں تیر اور تلوار کے واروں سے بچاؤ کی خاطر استعمال کی جاتی ہیں۔ یہ بانس سے بنائی جاتی ہیں۔ ان کے بیچ میں بید کی پٹیاں لگا کر انھیں زیادہ مضبوط بنایا جاتا ہے۔

جنگ میں سر کو بچانے کے لئے آدی باسی ایک خاص قسم کی ٹوپی پہنتے ہیں۔ روزمرہ استعمال کے لئے جو ٹوپی استعمال کی جاتی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ جنگ میں استعمال کی جانے والی ٹوپی گول ہوتی ہے۔ یہ بید کو موڑ توڑ کر بنائی جاتی ہے۔ اس ٹوپی کے اوپری حصے پر [illegible] لگائی جاتی ہیں۔ جنگ کے موقع پر خاص قسم کا کوٹ پہنا جاتا ہے۔ یہ [illegible] اون سے بنایا جاتا ہے۔ اس کی بنائی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ [illegible] کے حصوں کو خوش نما بنایا جاتا ہے۔ یہ کوٹ [illegible] کمبل کی طرح دکھائی دیتا ہے۔

آدی باسیوں کا بھالا تین حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اوپری حصہ، درمیانی حصہ اور نچلا حصہ۔ [illegible] ان تیروں کی دو اقسام ہیں۔ [illegible] ہوتا ہے۔ [illegible] آدی باسیوں کی تلوار تیز دھار والی اور سیدھی ہوتی ہے۔

ایک آدی باسی [illegible] کی طرح تیز ہوتا ہے۔

ان لوگوں [illegible] ناچ اور گانے [illegible] موقع پر ہوتا ہے [illegible]

[illegible] آدی باسی [illegible] اپنے قبیلے کے قصے [illegible] دوسری پشت کو [illegible] قصے اور کہانیاں [illegible] ہوتی ہیں جن [illegible] لوگوں کو [illegible] قبیلوں کے [illegible] تجربے [illegible] شامل ہوتی ہیں۔ ناچ کے موقعوں پر [illegible]

ناچ کے موقع پر [illegible] تلوار (Yoksa) لئے ہوئے کھڑا ہوتا ہے [illegible] دائرے کی شکل میں ناچنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں [illegible] دائرے کے مرکز میں کھڑا [illegible] تلوار [illegible] چھوٹے چھوٹے ٹکڑے [illegible] ہوتے ہیں [illegible] ایک خوشگوار [illegible] پیدا کرتے ہیں [illegible] دائرے کی شکل میں کھڑی ہوتی ہیں [illegible] ساتھ [illegible] ناچتی ہیں۔

ان ہمراہ [illegible] میں شریک ہونے والے دائرے کی شکل میں
شانے سے شانہ ملائے ہوئے مرکز میں کھڑے مری کی طرف دیکھتے ہوئے ناچتے ہیں۔

اگرچہ آدی باسیوں کی غذا میں شکار کیا ہوا گوشت اور مچھلی شامل ہے لیکن درحقیقت یہ لوگ زراعت کرکے اپنی غذا مہیا کرتے ہیں۔

زراعت کا عام طریقہ جھوم Jhuming ہے۔ جنگل میں کسی جگہ ایک [illegible] جنگل کو صاف کیا جاتا ہے [illegible] کے بعد آدی باسی اپنے طریقوں کے مطابق کاشت کرتے ہیں۔ دو تین فصلیں کاٹنے کے بعد کھیت کو دو سال کے لئے بلا کاشت چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ہر ایک خاندان اپنے اپنے کھیتوں کے انتخاب کے وقت اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ اس کھیت کے رقبے سے جو پیداوار حاصل ہو وہ پورے خاندان کے لئے سال بھر کی غذا مہیا کرسکے۔ کھیتوں کی ملکیت بانچ [illegible] گاؤں کی پنچایت جس کا سرپنچ گاؤں کا بڑا آدمی کہلاتا ہے کاشت کاری کے لئے کھیتوں کے لئے زمینیں مختص کرتی ہے۔ کاشت کاری [illegible] اور حکومت کی طرف سے پہلی دفعہ اس علاقے [illegible] پاسی گھاٹ اور ڈامرو کے اطراف و اکناف میں [illegible] طریقہ کے ساتھ پرانے طریقہ سے بھی کاشت کی جاتی ہے۔

دھان، [illegible] کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ دھان اور اناج اس علاقے کے نچلے حصوں کی اہم غذا ہے۔ اناج اور ٹاساٹ اس علاقے کے اوپری حصہ کے باشندے اہم غذا کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ مکئی کی بھی کاشت کی جاتی ہے لیکن یہ صرف قحط سالی کے موقع پر ہی کھائی جاتی ہے ویسے اس کو سوروں کو کھلایا جاتا ہے۔

[illegible] آدی باسی اپونگ شوق سے پیتے ہیں۔ اسے ایک لحاظ سے "قومی شراب" سمجھتے ہیں [illegible] تیار کی جاتی ہے۔ میروم کو دھان کے کھیتوں میں [illegible] کبھی کبھار [illegible] آدی باسی چیاؤں کے ساتھ [illegible] استعمال کرتے ہیں۔

اس علاقے میں [illegible] کی کاشت ہوتی ہے۔ [illegible] کولو کاسیا، رتالو، کدو، بینگن، سویابین، کیلے کا پھول وغیرہ۔ [illegible] کولو کاسیا سارے علاقے میں [illegible] جاتے ہیں۔ [illegible] اور دیگر سبزیاں جن کی کاشت حال ہی

آرچ گول ڈالی

میں شروع ہوئی ہے۔ صرف علاقہ کے نچلے حصے کے گاؤں میں دستیاب ہوتی ہیں۔ اسی علاقے میں سنترے کے باغ بھی پائے جاتے ہیں۔ پھنس کثرت سے ملتا ہے

آدی باسیوں کی غذا میں پروٹین کی حامل اشیاء کی فہرست زیادہ لمبی ہے یہ لوگ متھن، سور، چوزے اور بکرے پالتے ہیں۔ جنگلی سور، مختلف قسم کے ہرن، جنگلی چوزے، پیرد کو بین وغیرہ کا شکار کرکے گوشت حاصل کرتے ہیں ہر اقسام کی مچھلی ان کی غذا میں شامل ہے۔ مچھلی ان کی بہت ہی پسندیدہ غذا ہے۔

پروٹین سے ملی ہوئی غذا یا تو [illegible] کر کھائی جاتی ہے یا دھوئیں میں سینک کر محفوظ کر لی جاتی ہے۔ سبزیاں اور بانس پکا کر کھائی جاتی ہیں۔ ان میں دودھ پینے کا رواج نہیں۔ اس کے بدلے اپونگ حسب ضرورت پی لی جاتی ہے۔

پاسی گھاٹ کے اطراف و اکناف میں آباد گاؤں میں آج کل تیل اور چربی استعمال کی جانے لگی ہے [illegible] اوپری حصے میں اس کا استعمال کوئی نہیں جانتا

آدی باسیوں کے پالتو جانور متھن، گائے، پالتو سور اور چوزے ہیں بلی اور بکرے چند گاؤں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ جانور بعض خاص ضرورتوں کے لئے پالے جاتے ہیں۔ جیسے قربانی، گوشت حاصل کرنا اور انھیں فروخت کرکے روپیہ حاصل کرنا یا [illegible] ضروری اشیاء حاصل کرنا۔

یہ لوگ ماہی گیری صرف [illegible] ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہی کرتے ہیں۔ ماہی گیری [illegible] نہیں کی جاتی۔ سارے علاقے میں مچھلی کے شکار کا رواج ہے۔ [illegible] اور اس کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ہم ان لوگوں کی [illegible] زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ماہی گیری سے غذا حاصل کرنے کا طریقہ زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ مچھلیوں کو دھوئیں میں سینک کر [illegible] استعمال کرنے کی غرض سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ مرد اور عورتیں دونوں مچھلی کا شکار کرتے ہیں

آدی باسیوں کا گرام [illegible] مختلف خاندانوں کے نمائندے مرد عورتوں، گاؤں کے صدر جسے گام [illegible] اور گاؤں کے بکیم مری پر مشتمل ہوتا ہے۔ گاؤں کے صدر کو پنچایت چنتی ہے پنچایت گاؤں میں آباد گوتوں میں سے کسی بھی گوت کے فرد کو اس کی شخصیت، قوت، تقریر اور سیاست دانی کی صلاحیت کی بنا پر منتخب کرتی ہے۔

سارے گاؤں کی فلاح و بہبود کی ذمہ داری گاؤں کے صدر پر ہوتی

ہے۔ گاؤں سے متعلقہ تمام ضروری اور اہم معاملات پنچایت کو جسے کے بانگ Kembang کہتے ہیں بھیجے جاتے ہیں۔ پنچایت کے تمام ارکان کو بحث ومباحثہ میں حصہ لینے اور اپنی اپنی رائے پیش کرنے کا حق حاصل ہے۔ پنچایت کے فیصلے کو لازماً عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔

آدی باسیوں میں دوسرے گوتوں میں شادی کا طریقہ رائج ہے۔ ایک سے زیادہ شوہر کا رواج ان میں نہیں پایا جاتا لیکن ایک سے زیادہ بیویوں کا رواج ضرور ہے۔ شادی حسب پسند کی جاتی ہے لیکن شادی کے لئے والدین کی اجازت لازمی ہے جو آسانی سے حاصل ہو جاتی ہے۔ شادی کے بعد لڑکے کو اپنے سسر کے گھر میں کچھ دن کے لئے خدمت انجام دینا پڑتی ہے اور اس کے بعد وہ اپنے لئے الگ گھر تعمیر کر سکتا ہے۔

یہ لوگ مردوں کو گاؤں کے باہر دفن کرتے ہیں۔ قبر کے اوپر ایک چھوٹا سا بانس کا جھونپڑا کھڑا کیا جاتا ہے اور کچھ دنوں تک آپونگ اور چاول وغیرہ اس میں رکھا جاتا ہے۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ مردے کی روح آکر اسے کھا پی جائے گی۔

سیانگ وادی میں بسنے والے آدی باسیوں کا اعتقاد ہے کہ ان کی زندگی کئی اچھی اور بری روحوں سے گھری ہوئی ہے۔ ان روحوں میں سورج اور چاند اور دیونی پولو Donyi-Polo قابل ذکر ہیں لیکن ان دونوں میں سے کسی کو بھی یہ امتیاز حاصل نہیں ہے کہ وہ اس دنیا کی تخلیق کا دعویٰ کر سکے۔ یہ امتیاز کائیم کو حاصل ہے۔ آدی باسی کائیم کو اپنی بڑی مائی سمجھتے ہیں۔ کائیم کو قدامت کا فخر حاصل ہے۔

آدی باسیوں کے آج کل کے تخیل کے مطابق دیونی پولو کو اللہ تعالےٰ کی حیثیت حاصل ہے۔ وہ جنت میں پوری مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کرتا ہے۔ "وہ دنیا کی آنکھ ہے۔" جس طرح جسم کے لئے آنکھ اہم ہے وہی اہمیت دونی پولو کو حاصل ہے۔ وہ سب کچھ دیکھتا ہے اور ہر ایک چیز کے لئے گواہ ہے۔ وہ انسان کی رہبری اور رہنمائی کرتا ہے۔ وہ انسان کا محافظ ہے اور اس پر مہربانی کرتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ سچائی کا شہنشاہ ہے۔ دونی پولو کے نام کی قسم سے بڑھ کر اور کوئی قسم نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ دونی پولو کے نام پر خاص قربانیاں نہیں کی جاتیں (اس لئے کہ انھیں اس کی ضرورت نہیں ہے) پھر بھی صرف اس کا نام ہی سبھی کے لئے قابل احترام ہے کسی بھی رسم کو انجام دینے سے پہلے اس کا نام نہایت عاجزی کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ آدی باسیوں کی دینیات میں دیونی پولو کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سچائی اور اچھائی جو دیونی پولو کی اہم خصوصیات ہیں آدی باسیوں کی مذہبی زندگی کی بنیاد بن گئے ہیں۔

شارق میرٹھی

غزل

بنا کر مجھے بے نیازِ حیات ۔۔۔ مجھے اس نے دیکھا بصد التفات
ہوا جب غمِ عشق وجہِ حیات ۔۔۔ مجھے مل گئی جیسے کل کائنات
وہاں امتحانِ محبت نہ تھا ۔۔۔ جہاں جان دینا نہ تھی کوئی بات
تری برہمی کا گلہ کیا کریں ۔۔۔ نظر میں ہے اپنی ترا التفات
رہی یوں تو اُن سے شکایت بہت ۔۔۔ نہ آئی لبوں پر شکایت کی بات
ہر اک گام اک عالمِ شوق ہے ۔۔۔ محبت کی منزل میں دن ہے نہ رات
نہ سمجھا کوئی اُس کو میرے سوا ۔۔۔ تغافل تھا یا وہ ترا التفات
کسی سے کہوں تو نہ آئے یقیں ۔۔۔ مرے دل پہ گذرے ہیں وہ حادثات
مقدر کو رونے سے کیا فائدہ ۔۔۔ کسی کو ملی بھی ہے غم سے نجات
یہ کیا ہو گیا ہے دلوں کو ترے ۔۔۔ نہ ذوقِ نظر ہے نہ سوزِ حیات
مجھے دینے والے نے کیا دے دیا ۔۔۔ یہ نازک سا دل اور غمِ کائنات

زمانے کو شارق یہ کیا ہو گیا
نہ پہلی سی چاہت نہ پہلی سی بات

فولاد کے نئے کارخانے ـــ روڑکیلا اور بھلائی

روڑکیلا میں جو فولاد کا کارخانہ لگایا جا رہا ہے اس میں دس لاکھ ٹن وزنی فولاد سے سات لاکھ بیس ہزار ٹن کی پلیٹیں، چادریں اور سلاخیں وغیرہ بنائی جاسکیں گی۔

کارخانہ کی پیداوار، کلوں میں کچھ اضافہ کرنے کے بعد دس لاکھ تیس ہزار ٹن تک بڑھائی جاسکتی ہے اور پلان میں بالآخر بیس لاکھ ٹن تک اضافہ کی گنجائش ہے۔

اس کارخانہ کے لئے خام لوہا نہیل کی دوری پر واقع مقام بارسواں سے آئے گا جہاں اس مقصد سے کان تیار کی جا رہی ہے۔ کوئلہ بہار کی بوکارو، کارگلی اور جھریہ کی کانوں سے حاصل ہوگا۔ بوکارو اور کارگلی سے آیا ہوا کوئلہ کارگلی کے مقام پر صاف کیا جائے گا۔ جھریہ کا کوئلہ بھی ایک برس کے بعد صاف ہو کر استعمال ہونے لگے گا۔ اس مقصد سے دگدا کے مقام پر ایک کوئلہ صاف کرنے کی مشین لگائی جائے گی اور صاف شدہ کوئلہ ایک نئی ریلوے لائن کے ذریعے سے دگدا سے روڑکیلا لایا جائے گا۔

چونے کا پتھر د، میل کی دوری پر واقع ہاتھی باڑی اور بیرمترا پور کے علاقے سے آئے گا۔ خام اشیاء لانے والی گاڑیاں پہلے ایک گودام میں ٹھہریں گی جہاں سے کوئلہ تو کوک کی بھٹیوں میں چلا جائے گا اور خام لوہا و چونے کا پتھر بلاسٹ کی بھٹیوں میں۔ کوئلہ ۳ بیڑیوں میں جن میں سے ہر ایک میں ۷۰ کوک کی بھٹیاں ہوں گی تیار کیا جائے گا۔ یہاں سے کوک خود بخود انجن بھٹیوں میں چلا جائے گا، یہ تین ہوں گی ان میں سے ہر ایک بھٹی خام مصالحہ کو پگھلا کر ۱۰۰۰ ٹن روزانہ لوہا بنائے گی، لوہے کو پگھلا کر ڈلوں کی شکل دی جائے گی اور انھیں دوبارہ پگھلا کر فولاد بنائے جانے کے لئے ایک دوسرے پلانٹ میں بھیجا جائے گا۔ روڑکیلا میں" اوپن ہرتھ" طریق کار سے ۲۵۰,۰۰۰ ٹن فولاد تیار ہوگا۔ بقایا ۷۵۰,۰۰۰ ٹن فولاد ایل۔ڈی نامی طریق کار سے تیار ہوگا۔ کینیڈا اور امریکہ کے کئی کارخانوں میں یہی طریقِ کار استعمال ہوتا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس طریق کار سے فولاد بنانے کے لئے سرمایہ اور لاگت کم درکار ہیں۔ پیداوار کی رفتار تیز ہوتی ہے اور اس کے لئے متعلقہ مشینری اور مقبرہ کی بھی کم ضرورت ہوتی ہے۔

اس کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ایل۔ڈی نامی طریق کار سے فولاد تیار کرنے کے دوران میں جو فالتو چیزیں بنیں گی انھیں کھاد اور دیگر کئی اہم کیمیائی اشیاء تیار کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکے گا اور اس طریق سے ایک بھاری کیمیکل انڈسٹری کی بنیادیں قائم ہونے میں مدد ملے گی۔

مذکورہ بھٹیوں میں فولاد کو پگھلا کر ڈلوں کی شکل دی جائے گی جنھیں گڑھوں میں جمع کیا جائے گا جہاں وہ بجلی کی حرارت سے گرم رہیں گے۔ ان گڑھوں سے فولاد کے ڈلوں کو ایک رولنگ مل میں جسے بلومنگ اور سلیبنگ مل کہتے ہیں منتقل کیا جائے گا۔ اس کے بعد ان سے بھاری پلیٹیں، چادریں اور سلاخیں بنائی جائیں گی جو ان مقاصد کے لئے مخصوص تین مختلف ملوں میں تیار ہوں گی۔

پیداوار کی تفاصیل مندرجہ ذیل ہیں

۱۔ پلیٹیں	۳/۱۶ اور اس سے زیادہ وزنی	۲۰۰,۰۰۰ ٹن
۲۔ چادریں اور سلاخیں	(گرم ڈھلے ہوئے فولاد سے)	۳۰۰,۰۰۰ ٹن
۳۔ " "	(سرد ڈھلے ہوئے فولاد سے)	۱۷۰,۰۰۰ "
۴۔ ٹین کی پلیٹیں		۵۰,۰۰۰ "
میزان		۷۲۰,۰۰۰ ٹن

بھلائی میں فولاد کا جو کارخانہ قائم کیا جا رہا ہے اس میں دس لاکھ ٹن نیم پختہ فولاد تیار کیا جائے گا جس سے بعد میں ۷۵۰۰۰۰ ہزار ٹن کی سلاخیں، سریا اور بعض دیگر اشیاء تیار کی جائیں گی۔ بعض تبدیلیوں کے ساتھ اس کارخانے کی پیداواری صلاحیت کو ۱۲½ لاکھ ٹن تک پہنچانا ممکن ہو گا۔ بالآخر اس کی پیداواری صلاحیت ۲۵ لاکھ ٹن تک پہنچ جائے گی۔

بھلائی کے کارخانے کے لئے خام لوہا یہاں سے ۶۰ میل کے فاصلے پر ڈلی راجہرا کے مقام پر ایک نئی کان سے برآمد کیا جائے گا۔ کوئلہ بوکارو، کارگلی، جھریا اور کوربا کی کانوں سے حاصل کیا جائے گا۔ چونے کا پتھر بھلائی سے صرف ۱۲ میل کی دوری پر نندنی کے مقام سے حاصل ہو گا۔ ان خام اشیاء کو ڈھونے والی گاڑیوں کے ٹھہرنے کے لئے ایک بڑا یارڈ تعمیر کیا جا رہا ہے۔

یہ کارخانہ حکومت روس کی مالی اور ٹیکنیکل امداد سے قائم کیا جا رہا ہے۔ پلانٹ اور دیگر متعلقہ مشینری جس کی مالیت ۶۴ کروڑ ۱۰ لاکھ روپیہ ہے اس شرط پر حاصل کی گئی ہے کہ بھارت اس رقم کو بارہ سالانہ قسطوں میں ادا کرے گا۔ اس کی شرح سود ۲½ فیصدی ہو گی۔ کچھ ایسا سامان جو بھارت میں وقت پر فراہم نہیں کیا جا سکتا تھا وہ نقد قیمت دے کر حاصل کیا جا رہا ہے۔

ایک بھارتی چیف انجینئر اس کارخانے کی تعمیر کا انچارج ہے۔ تعمیر کے سلسلے میں ٹیکنیکل امور کی نگرانی اور بھارتی عملے کی تربیت کے سلسلے میں ٹیکنیکل امداد بہم پہنچانے کے لئے حکومت روس نے ایک روسی چیف انجینئر کی خدمات مہیا کی ہیں اور کچھ روسی انجینئر ان کی امداد کے لئے بھی مقرر کئے گئے ہیں۔ معاہدے کے تحت حکومت روس نے روس کی طرف سے سپلائی کئے گئے تمام سامان کے ٹھیک حالت میں کام کرنے کی گارنٹی دی ہے۔ کارخانے کے چالو ہونے کے بعد بھی تین سال کے عرصے کے لئے حکومت روس کافی تعداد میں روسی ماہرین کی خدمات مہیا کرے گی۔ یہ ماہرین ضرورت کے مطابق بھارت سرکار کو مشورہ دیں گے اور ٹیکنیکل نگرانی کے فرائض بھی انجام دیں گے۔

پلانٹ کے بڑے بڑے شعبوں میں سول انجینئرنگ کا زیادہ تر کام بھارتی فرموں کے سپرد کیا گیا ہے۔ دوسرے متعلقہ کام چھوٹے ٹھیکیداروں کے ذریعے انجام دیئے جا رہے ہیں۔

بھلائی اور رورڑکیلا کے فولاد کے کارخانوں کی خصوصیات یہ ہیں

نام مشین	روڑکیلا پلانٹ	بھلائی پلانٹ
کوک کی بھٹیاں	۳ بیٹریاں جن میں سے ہر ایک میں ۷۰ بھٹیاں ہیں	۳ بیٹریاں جن میں سے ہر ایک میں ۶۵ بھٹیاں ہیں
انجن بھٹیاں	۳ عدد جن میں سے ہر ایک میں ۱۰۰۰ ٹن کی گنجائش ہے	۳ عدد جن میں ہر ایک میں ۱۱۳۵ ٹن کی گنجائش ہے
فولاد پگھلانے کی مشینیں	۲ مکسر جن میں سے ہر ایک میں ۱۱۰۰ ٹن فولاد پگھلایا جاسکتا ہے ۳ ایل۔ڈی کنورٹرز جن میں سے ہر ایک ۴۰ ٹن کا ہے ۴ بنیادی ساکن اوپن ہرتھ بھٹیاں جن میں سے ہر ایک ۸۰ ٹن کی ہے۔	ا مکسر ۶ او۔ایچ بھٹیاں جن میں سے ہر ایک ۲۵۰ ٹن کی ہے۔
رولنگ ملز	ایک بلومنگ اینڈ سلیبنگ مشین ایک بھاری چادر بنانے کی مشین ایک مسلسل سٹرپ مل ایک کولڈ رولنگ مل بمعہ مدد سیٹ سٹینڈز کے	ایک بلومنگ ۴۶ انچ مشین ایک بڑی اور درمیانی مشین ایک مرچنٹ مل ایک مسلسل بلٹ مشین
بجلی گھر	۷۵۰۰۰ کلوواٹ	۲۴۰۰۰ کلوواٹ

نوٹ:- ۱۔ بھلائی میں ایک سنٹرنگ پلانٹ ہو گا۔ بھارت سے جو مشن اس سلسلے میں روس گیا تھا اس نے دیکھا کہ خام لوہے کو اگر سنٹر کر لیا جائے تو انجن بھٹی سے زیادہ کام نکلتا ہے۔ روڑکیلا کے کارخانے میں بھی سنٹرنگ پلانٹ کے لئے گنجائش رکھی گئی ہے۔

۲۔ بھلائی کے کارخانہ کی انجن بھٹی میں اوپر سے بھاری دباؤ ڈالنے کی مشین بھی ہو گی۔ یوں کہ روس میں دیکھا گیا ہے کہ اس طریق پر انجن بھٹی سے زیادہ کام لیا جا سکتا ہے۔

۳۔ روڑکیلا میں ایک کھاد بنانے کا پلانٹ ہو گا جو کہ فولاد بنانے کی مشینوں کی ضمنی پیداواروں کو کھاد بنانے کے لئے استعمال کرے گا۔

ر۔ع۔م

نئی کتابیں

واجد علی شاہ اور ان کا عہد

مصنف رئیس احمد جعفری۔ ناشر کتاب منزل لاہور۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات تقطیع $\frac{20 \times 26}{8}$ کتابت، طباعت عمدہ۔ کاغذ اوسط۔ کتاب مجلد ہے اور جلد پوش کی حامل۔ قیمت ۱۲ روپے آٹھ آنے۔

موضوع کے اعتبار سے یہ کتاب اپنی نوعیت کی پہلی اور جامع کتاب ہے۔ واجد علی شاہ سے متعلق تفصیلات و حالات کے اوراقِ پریشاں ہر طرف سے جمع کرکے مرتب نے بڑا کام کیا ہے۔ اس مؤرخانہ کاوش میں تحقیق کا عنصر زیادہ مستند نہیں لیکن اس کے باوجود تحقیق کرنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک رہنما کا کام دے گی۔ فہرست مضامین سے ظاہر ہے کہ واجد علی شاہ سے متعلق ہر قسم کی واقفیت بہم پہنچا دی گئی ہے۔

۱۔ تزک واجد علی شاہ، اس میں انکے خود نوشت حالات کا تذکرہ ہے۔

۲۔ واجد علی شاہ کی بزمِ سخن، نظم طباطبائی کی تحریروں سے یہ حصہ مرتب ہوا ہے۔ بارہ مشہور شعراء کا ذکر تفصیل سے ہے۔

۳۔ واجد علی شاہ اختر کی شاعری

۴۔ واجد علی شاہ کا ایک نایاب دیوان گلدستۂ عاشقاں

۵۔ دورِ واجدی کے ہنرمندانِ اودھ

اس کے بعد عہدِ واجد علی شاہ کی شاعری، صحافت، مطبوعات و کتب، حدیقۃ الشہداء، تاریخ اودھ کا ایک سیاہ باب، زوالِ اودھ کی کہانی، دورِ حیاتِ دلی، قیدِ فرنگ، تاریخ انقلاب کا ایک گم شدہ ورق بڑے دلچسپ باب ہیں۔ پندرھویں باب میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے متعلق بڑی جامع تفصیلات ہیں۔ آخر میں لکھنؤ کا مرثیہ کے تحت متعدد نظمیں ہیں جن میں میر یار علی رند کی مشہور نظم جو کمل ہے کہ قفس میں مری زباں صیاد، بھی درج ہے۔

رئیس احمد جعفری اس سے قبل بہادر شاہ ظفر اور اُن کا عہد پیش کرچکے ہیں۔ آپ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی یہ تصنیف تاریخ اور ادب کے طالب علموں کے لئے ایک نادر تحفہ ہے۔ کتاب میں متعدد تصویریں بھی شامل ہیں۔

۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ

مرتب خلیق احمد نظامی استاذ شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ناشر ندوۃ المصنفین اردو بازار دہلی۔ قیمت مجلد چار روپے پچاس نئے پیسے۔ غیر مجلد تین روپے پچاس نئے پیسے۔ جلد، جلد پوش، کتابت، طباعت، کاغذ عمدہ۔ تقطیع $\frac{20 \times 26}{8}$ ضخامت ۲۱۲ صفحات۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے متعلق معاصر تذکروں اور رسالوں میں سرسید کا رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند، غالب کا دستنبو، معین الدین اور منشی جیون لال کے روزنامچے اور ظہیر دہلوی کی کتاب داستانِ غدر خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔

اس کتاب میں مرتب نے دہلی کے معزز گھرانے سے تعلق رکھنے والے ایک شخص عبداللطیف کا روزنامچہ درج کیا ہے۔ روزنامچہ فارسی میں ہے۔ مرتب نے اس کا اردو ترجمہ بھی درج کر دیا ہے۔ عبداللطیف نے لال قلعے سے حالات کا جائزہ لیا ہے۔ روزنامچے کا جو حصہ مرتب کو ملا ہے اسی میں ۴ ستمبر ۱۸۵۷ء تک کے حالات درج ہیں۔ عبداللطیف کے تذکرے سے بہت سی نئی باتیں بھی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے متعلق معلوم ہوتی ہیں۔ کتاب کے آغاز میں فاضل مرتب نے ایک بسیط مقدمہ بھی لکھا ہے جس سے اس ہنگامے کے اسباب و علل اور گرد و پیش کے حالات پر بہت روشنی پڑتی ہے۔ کتاب بڑے سلیقے سے مرتب ہوئی ہے اور نہایت مفید معلومات کی حامل ہے۔

معانیٔ سخن

سلطان محمد قلی قطب شاہ معانی کے کلام کا انتخاب۔ مرتب ڈاکٹر سیدہ جعفر (؟) ...

قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے۔ ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن۔ ضخامت ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۱۷ صفحے۔ کتاب مجلد ہے۔

فاضل مرتب نے دیباچے میں دکنی کی اردو شاعری کا جائزہ ایسے اجمال سے کیا ہے جو تفصیل کا محتاج نہیں۔ اس کے بعد محمد قلی قطب شاہ کے حالات درج ہیں۔ معانی اردو زبان کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ اس کی زبان فارسی اور ہندی کا ایک حسین امتزاج ہے۔ مثلاً

بندہ ہوں گنہگار خدا میرا گنہ بخش
تجھ لطف کرا فیض خدا مجھ کو سدا بخش
مجھ جیو کے پھل بن کو کر اپ شوق سوں تازہ
مجھ نین کے درپن کوں تو توفیق نوا بخش
مجھ بخت کے تارے کو سدا رکھ تو جھلکتا
مجھ عیش کے سورج کو سورن دن تو ضیا بخش

اس لحاظ سے یہ کتاب دورِ حاضرہ میں مطالعے کی چیز ہے۔ زور صاحب قلی قطب شاہ کی مکمل کلیات کے بھی مرتب ہیں اور وہ مدت ہوئی شائع ہو چکی ہے یہ انتخاب ان لوگوں کے لئے مفید ہوگا جن کی دسترس کلیات تک نہیں ہوئی۔

ادب میں "ترقی پسندی" (ایک ادبی تحریک یا سازش؟)

از گوپال متل۔ پبلشرز نیشنل اکاڈمی۔ ۹۔ انصاری مارکیٹ، دریا گنج دہلی۔ ضخامت ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۴۴ صفحات، کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ جلد، جلد پوشش اوسط۔ قیمت ۲/-

مصنف نے حرفِ اول میں کتاب کی شانِ نزول بیان کر دی ہے۔ ان کا قول ہے کہ کمیونسٹ ادبی محاذ کا دوسرا نام انجمن ترقی پسند مصنفین ہے۔ چنانچہ انھوں نے کمیونسٹ ادیبوں اور ان کے سرکاری مطبوعات کے حوالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے لائحہ عمل میں ہنگامی تبدیلیاں یا ان کی غلطیاں کوئی معمہ نہیں بلکہ ایک طے شدہ منصوبے کا حصہ ہیں۔ یہ کتاب پہلے انگریزی میں چھپی تھی پھر جرمن میں، اب اردو، ہندی اور پنجابی میں شائع ہوئی ہے۔

اردو میں قصیدہ نگاری

مصنف ابو محمد سحر لکچرار شعبۂ اردو گورنمنٹ حمیدیہ کالج بھوپال۔ ملنے کا پتہ خیابان ۱۷۵، سبزی منڈی الہ آباد۔ ضخامت ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۸۴ صفحات۔ کاغذ اوسط، کتابت عمدہ، جلد، جلد پوش اوسط، قیمت ڈھائی روپے۔

موضوع کے اعتبار سے کتاب ایک صنفِ شعر پر سیر حاصل معلومات کی حامل ہے۔ کتاب کے ابواب یہ ہیں:

قصیدہ صنفِ سخن کی حیثیت سے، اردو قصیدے کا پس منظر، اردو قصیدے کے ابتدائی نمونے، سودا اور ان کے معاصرین، انشا و مصحفی کا زمانہ، ذوق اور ان کے دہلوی معاصرین، سحر، منیر اور امیر کا زمانہ، قصیدہ نگاری دورِ جدید میں، اردو کا طویل ترین قصیدہ، قصیدے کی تاریخی اور ادبی حیثیت۔

یادگار۔ یوم محمد قلی قطب شاہ۔

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن نے یہ مختصر رسالہ یوم قلی قطب شاہ کی تقریب کے سلسلے میں شائع کیا ہے، مقابر قطب شاہی اور دیگر مفید معلومات پر مشتمل ہے۔ قیمت ۱۵ نئے پیسے۔

حرفِ غزل

از مسیح الزماں لکچرار الہ آباد یونی ورسٹی، ناشر خیابان ۱۷۵، سبزی منڈی الہ آباد ۳۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے، کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ، ضخامت ۱۹۲ صفحات ۲۰×۳۰/۱۶۔ اس کتاب کے مندرجات یہ ہیں:

اردو غزل کی ساخت، اردو غزل کے چند پہلو مثلاً تسلسل، بے ربطی، تغزل، مذکر افعال، جدید غزل کا لب و لہجہ، علامتیں، غزل اور سیاست، اردو غزل کا دہلی اسکول، اردو غزل کا لکھنؤ اسکول اور اس کے بعد میر، درد، ناسخ، آتش، مومن، غالب اور داغ کی غزل گوئی پر بحث و تمحیص۔

سوویٹ نظام کی چند کنجیاں

از برٹرم ڈی ولف، مترجم گوپال متل۔ ناشرین نیشنل اکاڈمی، ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی۔ قیمت ۲/- ضخامت ۳۲۴ صفحات۔ ۲۰×۳۰/۱۶

کتاب کا مقصد سوویٹ نظام کی خامیاں ظاہر کرنا ہے خوبیاں نہیں اس لئے یہ کتاب زیادہ تر یک طرفہ بات کی حیثیت رکھتی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اتفاق کلی یا جزوی ہو یا نہ ہو کتاب پڑھنے کی چیز ہے اور اس کا مطالعہ اس سے اتفاق رکھنے والوں اور اس کے مخالفوں دونوں کے لئے مفید ہے۔


پھول کی طرح...
شاداب حسن کے لئے
رکسونا
رکسونا صابن میں کیڈل یعنی تیلوں کا ایک خاص مرکب ملا ہے، جو جلد کو تندرست بنانے کے ساتھ ساتھ آپ کے اصلی حسن کی رونمائی میں مدد دیتا ہے۔
کیڈل آمیز واحد صابن



ویدک زمانے سے
"तंतुं तन्वन्, रजसो भानुमन्विहि,
ज्योतिष्मतः
पथो रक्ष धिया कृतान् ॥
अनुल्बणं वयत,
जोगुवामपो, मनुर्भव, . . ."
ऋग्वेद
سوت کاتتے ہوئے
چمک دار رنگ کا انتخاب کیجئے
گٹھیلا دھاگہ مت بُنئے، اور
ہنرمندی کی قدیم روایت کی حفاظت کیجئے۔
سوچئے ...
یہ فن کاروں کا کام ہے !
رگ وید
ALL INDIA HANDLOOM BOARD
ہاتھ کھڈی
خوبصورتی کی
جان ہے
آل انڈیا ہینڈلوم بورڈ
شاہی باغ ہاؤس ویٹ روڈ بمبئی
DA-58/449

قدرِ جوہر

یوں تو آج کل کا ہر شمارہ اپنے پیشرو سے بڑھا چڑھا ہوتا آیا ہے۔ لیکن اس کا 'ابوالکلام شمارہ' اوروں سے بمراتب بہتر و برتر ہے اور مرحوم و مغفور مولانا آزاد کی بزرگ اور بلند شخصیت کے ہر لحاظ سے شایانِ شان ہے۔ یہ یادگار شمارہ نظم و نثر کا ایک ایسا قابلِ قدر مجموعہ ہے، جس کی تعریف و توصیف کا پورا پورا حق ادا کرنا بہت مشکل ہے۔ (عبدالستار صدیقی)

رسالہ آج کل علمی، لسانی اور ملکی [illegible] کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔ (فراق گورکھپوری)

آج کل کا موسیقی نمبر دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ اس فن پر خصوصی نمبر نکالنا آسان بات نہ تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو جمع و ترتیب مضامین میں کن کن صبر آزما منزلوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ آپ کے ذوق و انتخاب دونوں کی داد دیتا ہوں۔

(نیاز فتحپوری)

آج کل اردو کے بہترین رسائل میں سے ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ آپ ہمیشہ اسے خوب سے خوب تر بنانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اس کے خاص نمبر [illegible] ہیں اور بعض تو بہت اچھے۔

(قاضی عبدالودود)

آج کل کا خاص نمبر ایک سے ایک ہوتا ہے اور اس اعتبار سے اس ماہنامے نے ہند و پاک کے ادبی رسائل میں جو بلند مقام حاصل کر لیا ہے وہ ہماری حکومت اور اس ملک کی روایات کے بالکل شایانِ شان ہے۔

(سعید احمد اکبرآبادی)

آج کل اردو کے اُن چند مقبول رسالوں میں سے ہے جو ہر ادبی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس کے عام نمبروں میں علاوہ معلوماتِ عامہ پر مفید مضامین کے ادبی تنقیدیں اور تذکرے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں اور اس میں بلند پایہ نظموں اور پُر کیف غزلوں کا بھی ایک گلدستہ ہوتا ہے۔ (آلِ احمد سرور)

میں آج کل کو ہمیشہ بہت دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ اس میں اکثر قابلِ قدر مضامین اور نظمیں شائع ہوتی ہیں۔ علاوہ معنوی خوبیوں کے یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بحیثیتِ مجموعی اس کی لکھائی اور چھپائی وغیرہ بھی خوش مذاقی کا ثبوت دیتی ہیں۔ ہمارے بہت سے رسالے تو اس ظاہری حُسن سے بھی عاری ہیں۔ (غلام السیدین)

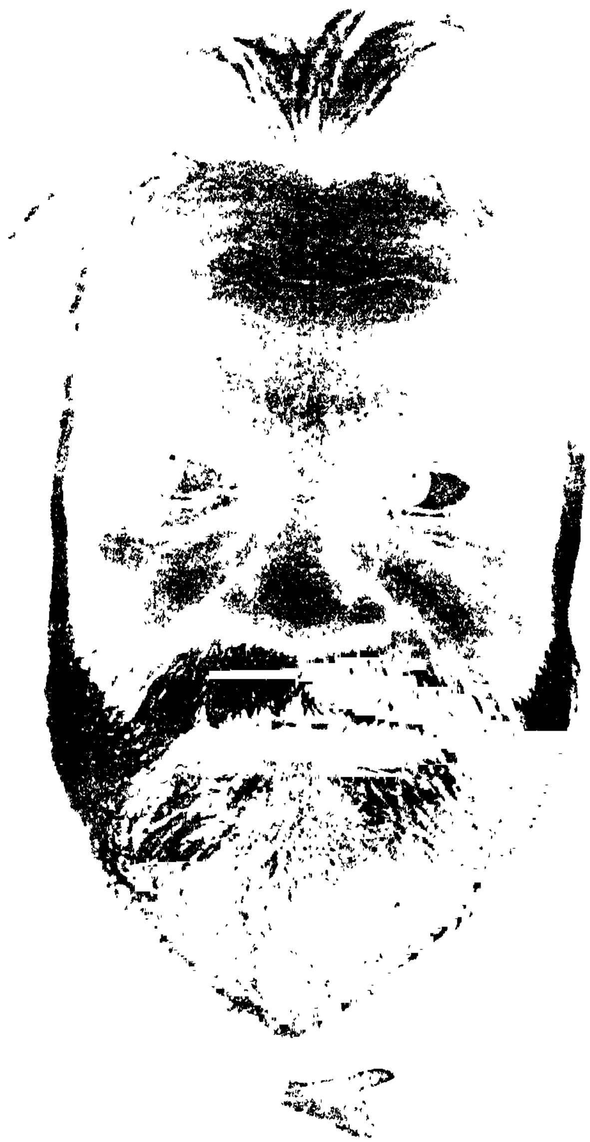
آج کل کے خاص نمبر اردو ادب میں خاص اہمیت رکھتے ہیں لیکن ابوالکلام نمبر نہ صرف ادبی بلکہ تاریخی حیثیت سے بھی بہت اہم ہے اور ہر حیثیت سے مولانا کے شایانِ شان ہے۔ ان کی ادبی، سیاسی اور نجی زندگی کے بہت سے اہم گوشوں پر اس نمبر سے روشنی پڑتی ہے جو اب سے پہلے منظرِ عام پر نہیں آئے تھے۔ (جگر؟ جگن ناتھ آزاد)

آج کل ان رسالوں میں ہے جو ہر طبقے کے پڑھنے والوں کے لئے کچھ نہ کچھ دلچسپی کا سامان ضرور مہیا کرتے ہیں۔ رسالے کی ادبی حیثیت بہت اچھی ہے۔ اس کے مقالے اور نظمیں بیشتر معیاری ہوتی ہیں۔ ظاہری حُسن یعنی کاغذ، چھپائی اور تصویروں کے اعتبار سے کوئی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ (مسعود حسن رضوی)۔

Edited and Published by the Director, Publications Division, Old

آجکل

ویشاکھ شک سمت ۱۸۸۱
مئی ۱۹۵۹ء



۵۰ نئے پیسے

ترتیب

سرورق: حضرت جگر مراد آبادی
جنھیں ساہتیہ اکادمی نے ان کے مجموعۂ کلام
"آتشِ گل" پر پانچ ہزار روپیہ کا انعام دیا۔
(فوٹو بشکریہ کانتی چند سونی رکس)

اردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آجکل

دہلی

مجلسِ ادارت

محمد مجیب — جامعہ ملیہ دہلی
محی الدین قادری زور — حیدرآباد
گوپی ناتھ امن — دہلی
خواجہ احمد فاروقی — دہلی
رحمان راہی — سری نگر
یو۔ ایس موہن راؤ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن
جی۔ این۔ ایس رگھون ڈپٹی ڈائرکٹر (ایڈیٹوریل)
جی بیجناتھ ڈپٹی ڈائرکٹر (پروڈکشن)
بال مکند عرش ایڈیٹر شعبۂ اردو (سیکریٹری)
(مدیر مسئول)

اسسٹنٹ ایڈیٹر۔ مظفر شاہ

سالانہ چندہ:۔	ہندوستان میں	چھ روپے
	پاکستان میں۔	چھ روپے (پاک)
غیر ممالک سے:۔	نو شلنگ یا ایک ڈالر	
فی پرچہ:۔	ہندوستان میں	۵۰ نئے پیسے
	پاکستان میں	آٹھ آنے (پاک)

جلد ۱۷۔ نمبر ۱۰

ویشاکھ شک سمت ۱۸۸۱
مئی ۱۹۵۹ء

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ حکومت ہند

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر "آجکل" اردو، اولڈ سیکریٹیریٹ دہلی ۸

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

مُلاحظات

روس کے وزیرِاعظم مسٹر خروشچیف نے سربراہوں کی کانفرنس منعقد کرنے کیلئے مغربی طاقتوں کے سامنے جو تجویز رکھی تھی اس پر مغربی طاقتیں رضامند ہوگئی تھیں۔ مگر اُن کا مطالبہ تھا کہ وزرائے خارجہ کی کانفرنس پہلے کی جائے جبکہ روس کا کہنا تھا کہ سربراہوں کی کانفرنس ہی بُلائی جائے۔ اب روس وزرائے خارجہ کی کانفرنس کے لئے راضی ہوگیا ہے، جو ۱۱ مئی کو شروع ہونے والی ہے۔ ہمیں امید کرنی چاہیئے کہ یہ کانفرنس اپنے مقصد میں کامیاب ہوگی اور سربراہوں کی کانفرنس کے لئے راہ ہموار ہو جائے گی۔

کانگریس نے اپنے ناگپور اجلاس میں زرعی اصلاحات سے متعلق جو تجاویز منظور کی تھیں ان میں امداد باہمی کے طریقے پر کاشت کرنے کی تجویز بڑی اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ تحریکِ امداد باہمی اور سوشلزم کا گہرا تعلق ہے اور سوشلسٹ سماج کا قیام ہماری منزل ہے۔ لوک سبھا نے اپنے بجٹ اجلاس میں کانگریس کی اس قرارداد کی توثیق کردی جس میں کواپریٹو کھیتی سے پہلے خدمتی کواپریٹو سوسائیٹیاں بنانے پر زور دیا گیا ہے۔ وزیرِاعظم نے اس موقعہ پر زوردار الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ ہمارے مستقبل کا دارومدار امداد باہمی طریقہ پر ہے اور یہ طریقہ نہ صرف آراضی بلکہ صنعتوں میں بھی اپنایا جانا چاہیئے۔

ملک میں زرعی پیداوار بڑھانے کے لئے جو زبردست کوششیں کی جا رہی ہیں ان کے نتائج نہایت حوصلہ افزا ہیں۔ سرکاری طور پر جو اندازے لگائے گئے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ اس سال ۵۹-۱۹۵۸ء میں اناج کی پیداوار پچھلے کئی برسوں کے مقابلے میں زائد ہوئی ہے۔ اس سال سات کروڑ ٹن اناج پیدا ہوگا۔ جبکہ ۵۸-۱۹۵۷ء کے سال میں اچھی فصل کا ریکارڈ ۶.۸ کروڑ ٹن تھا۔ اس بار خریف کی اچھی فصل ہونے کی وجہ سے اناج کی پیداوار اتنی زیادہ ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ربیع کی فصل کو کامیاب بنانے کے لئے جو مہم چلائی گئی تھی وہ بھی کامیاب رہی ہے۔

ہر سال سنگیت ناٹک اکادمی کی طرف سے ایسے فن کاروں کو اعزازات عطا کئے جاتے ہیں، جنھوں نے موسیقی، رقص اور اداکاری کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور نام پیدا کیا ہے۔ چنانچہ اس سال بھی دس فن کاروں کو اعزازات دئے گئے ہیں جن میں مشہور طبلہ نواز اُستاد جہانگیر خاں، عظیم موسیقار کرشن شنکر راؤ پنڈت اور پختہ کار فلمی اداکار اشوک کمار بھی شامل ہیں۔

حکومتِ ہند نے اس سال یکم اپریل سے کشمیر میں داخلے کے لئے پرمٹ کا طریقہ ختم کردیا ہے۔ بارہ برس پہلے جب کشمیر پر پاکستان نے حملہ کیا تھا، اس وقت سے ریاست کی سلامتی کے خیال سے یہ طریقہ رائج تھا۔ اس طریقہ کے ختم ہو جانے سے ریاستی عوام اور بقیہ ہندوستان کے لوگوں پر ایک خوش گوار نفسیاتی اثر پڑے گا اندرونی تجارت بڑھے گی اور سیاحوں کی آمد میں بھی اضافہ ہوگا۔

مثنوی "مہر و ماہ"

از

نواب علی بہادر (باندہ)

نواب علی بہادر شعر کہتے اور علیؔ تخلص کرتے تھے۔ تذکرۂ نادر (ص، ۱۴۳) سے معلوم ہوا کہ ان کا دیوان بھی شائع ہوا تھا لیکن نظر سے نہیں گذرا۔ البتہ ان کی مثنوی "مہر و ماہ" دیکھنے کو ملی۔ یہ درسی کتب کے سائز پر ۹ سطر کے مسطر پر ۱۴۰ صفحوں کو محیط ہے اور "حاجی حرمین شریفین مولوی محمد حسین کے مطبع محمدی کانپور" سے "بست و نہم رجب ۱۲۷۶ھ" کو شائع ہوئی۔

مثنوی میں ۱۱۲۵ شعر ہیں اور یہ نواب مرزا شوق کی مثنوی "زہر عشق" کی بحر میں ہے۔ شروع میں حمد و نعت ہے۔ اس کے بعد "منقبت آلؑ اصحاب کرام آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام" ہے جس میں خلفائے راشدین کی مدح ہے اور ان سب کو "مہر عالم" اور "برج ایمان کے نیر اعظم" کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر عقیدۂ اہلسنت والجماعت کا پابند ہے۔

سبب تالیف بیان کرتے ہیں:

ایک دن بیٹھے تھے کئی شاعر — نکتہ سنجی کے فن میں سب نادر
ہو رہا تھا شعر و شاعری کا ذکر — تیزیاں کر رہا تھا توسن فکر

. . . .

اس میں سب نے کہا یہ ہو کے بہم — عرض کرتے ہیں اک حضور سے ہم
مثنوی کوئی آپ فرمائیں — تیزی تیز فکر دکھلائیں
خاص استاد رشک ان زماں — عاشق حق، غلام حیدر خاں
سب کمالوں میں بے مثال ہیں وہ — واقعی صاحب کمال ہیں وہ

. . . .

وہ بھی کرنے لگے بہت اصرار — مثنوی کہنے کا لیا اقرار
ایک نسخے کو منتخب کر کے — لائے وہ جلد تر مرے آگے
مجھ کو ہر چند اس میں تھا انکار — پر وہ کرتے تھے دم بدم اصرار
ہو کے ناچار میں نے قصد کیا — ہاتھ میں کلک نکتہ سنج لیا

اس کے بعد پہلے اپنے حسب نسب کا بیان کیا ہے:-

جانتے ہیں اسے خواص و عوام — کہ ہے میرا علی بہادر نام
نام پر ہے اسی تخلص ہے — سب سے اعلیٰ یہی تخلص ہے
وہ جو ہیں سب سے تھے والد ماجد — قلزم فیض و عابد و زاہد

. . . .

وہی بحر شکوہ کے دُر تھے — ذوالفقار علی بہادر تھے

اپنے تلمذ[*] کا ذکر یوں کرتے ہیں:-

نوٹ:- آج کل کے فروری ۱۹۵۸ء کے شمارے میں میرا ایک مضمون نواب علی بہادر (باندہ) سے متعلق شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون اُسی کا تتمہ سمجھا جائے۔

[*] بعد کی تحقیق سے ثابت ہوا کہ نواب علی بہادر نے آغاز میں اپنا کلام غالب کو بھی برائے اصلاح دکھلایا تھا۔ کلیات نثر غالب نول کشور کانپور ۱۸۸۴ء ص ۲۳۲۔ اس لئے نواب کا نام بھی "تلامذۂ غالب" میں شامل ہونا چاہئے۔

شاعری میں جو ہے مرا استاد	جیدِ معنی کا ہے وہی صیّاد
جب وہ مشہور شاعرِ ہے میر	کہتے ہیں نکتہ سنج اوس کو میر

اس کے بعد قصّہ کا آغاز ہوتا ہے۔ قصّہ یوں [illegible] ہے۔ ملکِ مصر میں ایک سلطان تھا۔ سخاوت میں حاتم ثانی تھا تو رعب و جرأت میں رستمِ ثانی۔ حق نے اُسے ایک فرزند عطا [illegible] اور کیا فرزند!

گویا [illegible] اوس [illegible]	سلطنت کا وہی تھا چشم و چراغ
[illegible] میں تھا وہ [illegible]	اوس کی صورت تھی دل پذیر جمال
اوس کی ابرو کی دیکھ کر تصویر	سر جھکاتی تھی خوف سے شمشیر
مار تھی اوس کے [illegible] تھی	آنکھ آہو کی [illegible] کی [illegible]
[illegible] کا کیا کہوں نا [illegible]	جس طرح سے کڑی کمان کا تیر
دست و بازو کی کیا کروں مدحت	شاخِ گل میں کہاں ہے یہ رنگت
دیکھ کر جلوہ [illegible]	گہر و لعل [illegible]
[illegible] میں اس قدر قوت	شیر پنجہ ملائے کیا طاقت
گرد [illegible]	حُسن میں طاق نور سے مملو
قد و قامت کا [illegible] عالم	[illegible] اوس کے آگے سرو ارم
عقل و علم و [illegible] روز افزوں	اوس کا شاگرد ایک افلاطوں
[illegible] میں فائق	زور و جرأت میں [illegible] آفاق
[illegible] بازی میں سب پر غالب تھا	تیر اوس کا شہاب ثاقب تھا
تیغ بازی میں اس قدر [illegible]	جس سے مریخ [illegible] کو لرزا
اس قدر حُسن کی تجلی تھی	رات کو چاندنی سی رہتی تھی
جس طرف وہ [illegible] میں نکلا	اردگرد اوس کے ہو کبھی [illegible]
حسنِ یوسف کے اوس میں تھے آثار	ساتھ رہتا تھا مصر کا بازار
باغِ شاہی کا نونہال تھا وہ	الغرض مجمعِ کمال تھا وہ

یہاں تشبیہات کی جدّت اور تازگی قابلِ تعریف ہے۔ اگرچہ اس سے ایک مکمل تصویر تو نہیں بن سکتی لیکن اس سے شاعر کی یہ کوشش نمایاں ہے کہ شاہزادے کی صورتی اور معنوی خوبیوں کا بیان جس حد تک ہو سکے مکمل کر دیا جائے۔ اس "مجمعِ کمال" کا نام مہر تھا۔

جب شاہزادہ جوان ہوا تو بادشاہ کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ وزیروں سے مشورہ کیا، تو انھوں نے عرض کیا کہ جہاں پناہ، دمشق کی شاہزادی حُسن و خوبی میں بے نظیر بلکہ رشکِ ماہ منیر ہے۔ وہ شاہزادے کے لئے بہت موزوں ہوگی، وہیں پیغام دیا جائے۔ لیکن جب بادشاہ نے خود شاہزادے سے استفسار کیا، تو اس نے شادی سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے نکاح سے نفرت ہے، سب عورتیں بدطینت ہوتی ہیں مجھے اس جنجال سے معاف رکھا جائے۔ بادشاہ اس پر بہت خفا ہوا اور اس نے غصّہ میں حکم دیا کہ شاہزادے کو قید کر دو۔ کوئی اس سے ملنے جلنے یا بات تک نہ کرنے پائے، اور جب تک یہ شادی پر رضامند نہ ہو اسے رہا نہ کیا جائے۔

قلعے کے جس بُرج میں شاہزادہ قید تھا، وہ بلاؤں سے معمور اور آسیب زدہ تھا۔ یہاں ایک اندھا کنواں تھا جس میں ایک پری کا مسکن تھا۔ ایک رات وہ پری جو سیر کو نکلی، تو اس کی نظر مہر پر پڑی۔ وہ اس کا بے مثال حُسن دیکھ کر لاکھ جان سے اس پر فریفتہ ہو گئی۔ مہر سو رہا تھا، وہ سوتے ہی میں اس کی بلائیں لینے لگی۔ اتنے میں وہاں ایک دیو سیاہ کا بھی گزر ہوا۔ دونوں آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ دیو نے بتایا کہ میں چین کے مُلک سے آ رہا ہوں۔ خاقانِ چین کی ایک بیٹی ہے، جس کے حُسن کا کیا ٹھکانا ہے۔

حسن ایسا کہیں نہیں دیکھا	قاف سے قاف تک ہے وہ یکتا
کیا کہوں صورت اوس کی کیسی ہے	نہ پری ہے نہ حور ایسی ہے
نام اوس گل کا ماہ ہے مشہور	اوس کی ہر زلف ہے شبِ دیجور
کیا کہوں اُس کا حسن کیسا ہے	رشکِ خورشید ہر کہیں یا ہے

خاقانِ چین اس کی شادی کرنا چاہتا تھا، لیکن شاہزادی نے انکار کر دیا۔ چنانچہ بادشاہ نے ناراض ہو کر اسے قید کر دیا ہے۔

پری اپنے محبوب شہزادے کے مقابلے میں اس شہزادی کے حُسن کی تعریف سُن کر آگ بگولا ہو گئی اور دیو سے کہا، ارے بے وقوف ادھر آ، میں تجھیں دکھلاؤں، حُسن کسے کہتے ہیں۔ تو نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے۔ دیو نے مہر کو دیکھا، تو پھر بھی یہی کہا کہ چین کی شاہزادی اس سے زیادہ حسین ہے۔ آخر یہ ٹھہری کہ دیو جا کے ماہ کو ملکِ چین سے اُٹھا لائے اور مہر اور ماہ دونوں کو ایک دوسرے کے سامنے رکھا جائے تاکہ فیصلہ ہو سکے کہ ان دونوں میں سے کون حسین تر ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ دیو اور پری نے کچھ ایسا سحر کیا کہ ایک وقت میں دونوں میں سے ایک ہی جاگے اور دوسرا جگانے پر بھی خوابِ راحت سے بیدار نہ ہو۔ مہر اور ماہ دونوں نے ایک دوسرے کو

دیکھ کر خیال کیا کہ ہمارے والدین نے یہ جوڑا ہمارے لئے انتخاب کیا ہے۔ البتہ ماہ نے مہر سے والہانہ عشق و محبت کا اظہار کیا اور جب مہر کی باری آئی تو اس نے صرف انگوٹھی بدل لینے پر اکتفا کی اور پھر سو رہا۔ جب دونوں سو گئے تو دیو شاہزادی کو واپس ملکِ چین میں چھوڑ آیا۔

صبح کے جب عیاں ہوئے آثار　　ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلی اک بار
ہر طرف نور کا ہوا عالم　　لگی دھونے گلوں کا منہ شبنم
ہوا بے نور آسماں پہ قمر　　ہر طرف بولتے تھے مرغِ سحر
دل کو پروانوں کے بھی یاس ہوئی　　روشنی شمع کی اداس ہوئی
تھا اذاں کا کسی طرف کو غل　　کوئی پیتا تھا اوٹھ کے ساغرِ مُل
جاگ کر کوئی آنکھ ملتا تھا　　گھر سے بن کر کوئی نکلتا تھا
کوئی سوتا تھا کوئی سُبحہ بکف　　بھیرویں اوٹھ رہی تھی ایک طرف
کوئی محوِ نماز تھا اوس آن　　کوئی پڑھتا تھا اک طرف قرآن
چرخ پر ڈوبنا ستاروں کا　　باغ میں زمزمہ ہزاروں کا
وہ درختوں پہ طائروں کی دھوم　　شاخِ گل پر وہ بلبلوں کا ہجوم
یار کے ساتھ کوئی سوتا تھا　　غمِ ہجراں سے کوئی روتا تھا
وہ کرن آفتابِ تاباں کی　　ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا گلستاں کی
مہر بھی خوابِ ناز سے چونکا　　پر نہ پایا وہ چاند کا ٹکڑا

مہر نے جب پہلو میں ماہ کو نہ پایا، تو اس نے خدمت گزار غلام سے دریافت کیا۔

سچ بتا، کیا ہوئی وہ غیرتِ ماہ　　شب کو سوئی تھی جو مرے ہمراہ؟

غلام بیچارہ حیران کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس نے عرض کی کہ حضور، دروازے سب بند تھے، یہاں پرندہ تو پر مار نہیں سکتا، کوئی آدم زاد کس طرح اندر آ سکتا تھا۔ اس پر شاہزادہ بہت بگڑا اور اول فول بکنے لگا۔ غلام کو یقین ہو گیا کہ صاحبِ عالم کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس نے حیلے سے چھٹکارا حاصل کیا اور سارا ماجرا بادشاہ سلامت کو جا سنایا۔ بادشاہ نے جب سنا کہ مہر کا دماغ چل گیا ہے، تو قدرتی طور پر اسے بہت قلق ہوا۔ پوچھ گچھ کرنے پر مہر نے انگشتری دکھائی کہ یہ دیکھیے، یہ اس حسینہ کی انگشتری ہے، جو میں نے کل رات بدل لی تھی۔ آنکھوں دیکھی وہ کس طرح جھٹلا سکتے تھے۔ اب تلاش شروع ہوئی کہ آخر یہ کون تھی۔ لیکن کسی کو کچھ معلوم ہو، تو وہ بتائے۔ ادھر شاہزادے کا بُرا حال تھا۔ غم و الم نے اس کی زندگی اجیرن کر دی۔

حسرتوں نے کیا گزر اپنا　　غم نے دل میں بنایا گھر اپنا
عشق بازی نے اپنا کام کیا　　اشک نے آنکھوں میں مقام کیا
دلِ مضطر میں درد ہونے لگا　　چہرے کا رنگ زرد ہونے لگا
چند روزوں میں یہ ہوئی حالت　　نہ رہی بات کرنے کی طاقت
سب حکیم و طبیب عاجز تھے　　سب عزیز و قریب عاجز تھے
دال تدبیر کی نہ گلتی تھی　　عاملوں کی بھی کچھ نہ چلتی تھی
حال اوس کا ہوا کمال زبوں　　کوئی کہتا تھا عشق، کوئی جنوں
زور و طاقت کو مہر کھو بیٹھا　　کھانے پینے سے ہاتھ دھو بیٹھا
روز ہوتے تھے اوس کے بد آثار　　نقش تعویذ سب ہوئے بیکار
اشک جاری تھے آب کی مانند　　زندگی تھی حباب کی مانند
ہڈیاں پوست سے ہویدا تھیں　　تارِ مسطر کی طرح پیدا تھیں

آخر یہ طے ہوا کہ انگوٹھی جوہریوں کو دکھائی جائے، تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ کہاں کی ساخت ہے۔ بہت مدت کے بعد ایک سیاحِ جہاں گرد شہر میں وارد ہوا۔ اس نے انگوٹھی کا نگینہ دیکھ کر کہا کہ یہ زمرد لاثانی ہے، اسے ریحانی کہتے ہیں۔ میں نے اسے صرف خاقانِ چین کے پاس دیکھا ہے۔ جب شاہِ مصر کو یہ معلوم ہوا تو انھوں نے بعض امرا اور چند سوداگر ملکِ چین کو روانہ کئے کہ وہاں جا کے جستجو کریں کہ یہ نگینہ اور انگشتری مصر میں کس طرح پہنچی۔

اُدھر جب شاہزادی صبح اپنے خوابِ راحت سے بیدار ہوئی، تو پہلو خالی دیکھ پہلے تو یہ خیال کیا کہ وہ کہیں قریب ہی ہوگا۔ پھر اس نے خادمہ کو بلا کر اس سے کہا کہ جا کے میرے والد کو مطلع کر دو کہ میں بصد شوق اس نوجوان سے شادی کرنے پر تیار ہوں، جو رات میرے ساتھ تھا۔ خادمہ نے عرض کی کہ حضور ایسی بات منہ سے نہ نکالیے، جہاں پناہ سن پائیں گے، تو میری کھال اُدھڑوا دیں گے۔ کیسا نوجوان اور کون شخص۔ رات کو تو یہاں کوئی آیا، نہ گیا۔ آپ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہیں۔ شاہزادی اس پر بہت برہم ہوئی۔ جب بادشاہ کو اس کی خبر پہنچی تو اسے بھی بہت رنج ہوا۔ لیکن شاہزادی کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔

کوششیں گرچہ سب نے کیں صدہا　　شاہزادی کا بڑھ گیا سودا

ہوئے عاجز طبیب بھی یکسر　　عاملوں کا چلا نہ کوئی ہنر
ملکہ کی یہ ہو گئی صورت　　مثلِ تصویر بے حس و حرکت
زلفیں سنبل نمط پریشاں تھیں　　آنکھیں نرگس کی طرح حیراں تھیں
آئینہ دیکھنے سے سکتہ تھا　　کنگھی سے دل اُلجھتا تھا اوس کا
آنکھیں سُرمے سے وہ چُراتی تھی　　پان تو بھی نہ منہ لگاتی تھی
گہنے کو طوق اور رسن سمجھے　　اچھی پوشاک کو کفن سمجھے

آخر مہر نے اپنے والد شاہِ مصر سے کہا کہ اگر مجھے خود ملکِ چین جانے کی اجازت دی جائے تو میں شاہزادی کو تلاش کروں گا۔ بادشاہ کو طوعاً کرہاً اسی کی درخواست منظور کرنا پڑی۔ شاہزادے نے وزیر کے بیٹے کو، کہ اس کا یارِ غار اور رازدار تھا، ساتھ لیا اور دشت نوردی کے لئے چل نکلا۔ ہر جنگل اور پہاڑ، وادیاں اور بستیاں طے کرتا اسی طرح تلاشِ یار میں سفر کرتا رہا۔ لیکن اسے دُرِ مقصود ہاتھ نہ آیا۔ آخر ایک دن اسی پری نے آکے اسے بتلایا کہ تمہاری تمام مصیبتوں کے لئے میں ذمہ دار ہوں۔ اب تم چین کا رستہ لو۔ تمہارا گوہرِ مراد تمہیں وہیں ملے گا۔ مہر راستے میں ایک دن ایک باغ میں پہنچا۔ شاعر یہاں مہر کے دل کی کیفیت خارجی مناظر کو الٔف کے رموز سے یوں بیان کرتا ہے :

بعد مدت کے مل گیا اک باغ　　ہوا آشفتہ اور اس کا دماغ
دل میں تھی یادِ قامتِ دلدار　　سرو آنکھوں میں تھا بصورتِ دار
داغِ دل تھے نظر میں غنچہ و گل　　شورِ محشر تھا نغمۂ بلبل
نکہتِ گل تھی دودِ نالہ و آہ　　زلفِ سنبل نظر میں مارِ سیاہ
پتا پتا نظر میں خنجرِ غم　　نمکِ زخم ، قطرۂ شبنم
ہر رگِ گل تھی اوس کو نشترِ خار　　لالہ آنکھوں میں تھا چراغِ مزار
دیکھ کر اوس کو مبتلائے محن　　نیلگوں پوش ہو گئی سوسن
اوس کے اشکوں کا کر کے نظارہ　　شور سے رو رہا تھا فوارہ
دیکھی اوس کی جو گریہ وزاری　　اشک نہروں کے ہو گئے جاری
باغ میں طرفہ حشر تھا برپا　　خاک اوڑاتی تھی سر پہ بادِ صبا
بسکہ شہزادہ تھا پریشاں حال　　مثلِ سنبل کھلے تھے سر کے بال
غم سے بلبل کے ہوش کھو دیتا　　دیکھ کر گل کو رو دیتا
کبھی شمشاد سے لپٹ جاتا　　کہ قدِ یار کا ہے تو نقشا

چشمِ محبوب کا جو آتا دھیان　　گلِ نرگس پہ ہوتا تھا قربان

غرض کتنی مصیبتیں برداشت کرنے کے بعد شاہزادہ ابنِ وزیر کے ساتھ دارالسلطنتِ چین میں وارد ہوا۔ شاہِ مصر کے روانہ کیے ہوئے سوداگر اور امراء ابھی یہیں تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ شاہزادی بھی تباہ حال ہے۔ اس کی وحشت میں کسی طرح کی کمی نہیں اور وہ دیوانگی کی حد تک پہنچ چکی ہے۔ شاہزادے نے یہاں مقامی امیروں سے میل جول پیدا کیا اور آخرکار سب سے مشورہ کرکے خاقانِ چین کی خدمت میں یہ خط لکھا :

بعد حمدِ خدا و نعتِ نبی　　بعد شرحِ مراسمِ عرفی
اوس کی خدمت میں یہ گذارش ہے　　جس کے ابرِ کرم کی بارش ہے
شاہِ انجم سپاہ ، عرش سریر　　خسروِ تاج بخش ، عالم گیر
عقلِ اوّل ، سکندرِ ثانی　　شاہِ شاہان ، ظلِّ سبحانی
آسماں تخت و آفتاب کلاہ　　یعنی خاقانِ چین و شاہنشاہ
خلّد اللّٰہ ملکہ ، کہہ کر　　عرض کرتا ہے بندۂ احقر
ہے جو حضرت کا شہرۂ اخلاق　　بادشاہانِ عصر ہیں مشتاق
اسی صورت پہ مبتلائے بلا　　کر کے ترک اپنا مسکن و ماوا
لے کے کچھ احتیاج آیا ہے　　چھوڑ کر تخت و تاج آیا ہے
ظاہراً گو کہ بے حقیقت ہوں　　پر میں نقشِ نگینِ دولت ہوں
ہو اگر حکمِ حضرتِ سلطاں　　چوم لوں آ کے گوشۂ داماں
طوفِ درگاہ بے ہراس کروں　　مطلبِ دل کی التماس کروں
اخترِ دولتِ شہ شاہاں　　اے خدا حشر تک ہے تاباں

پڑھیں حضرت حقیر کی عرضی
ہے یہ مہرِ منیر کی عرضی

غرض دونوں طرف سے نامہ و پیام ہوئے۔ خاقانِ چین نے آخر اپنی لختِ جگر کو مہر کے حبالۂ عقد میں دینا منظور کر لیا۔ ساعتِ سعید آئی اور مہر و ماہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ تھوڑی مدت چین میں ٹھہر کے بعد مہر نے وطن واپس جانے کی خواہش ظاہر کی۔ خاقان نے بادلِ ناخواستہ اسے منظور کیا اور مہر اپنی ماہ پارہ دلھن کو ساتھ لے کر مصر پہنچا۔ یہاں کی خوشیوں کا کیا کہنا ؟ گویا سوکھے دھانوں پانی پڑا۔ بادشاہ اور ملکہ اپنے امراء وزیر ، گدا اور فقیر ، سب نے شاہانہ استقبال کیا۔ بادشاہ تخت سے

بطیبِ خاطر دست بردار ہو گیا۔

شاہ نے شاہزادے کو لاکر — آپ بٹھلایا تختِ دولت پر
نذریں دینے لگے امیر تمام — سکّہ خطبہ ہوا اوسی کے نام
ایک گوشے میں شاہ آ بیٹھا — حکمِ شاہی سے ہاتھ اوٹھا بیٹھا
طاعتِ کردگار کرتا تھا — یوں بسر روزگار کرتا تھا
شاہزادہ ہوا جو شاہِ جہاں — اوس کا دروازہ تھا پناہِ جہاں
سب رعیت تھی خرم و مسرور — کیا انصاف سے جہاں معمور
جس طرح سے وہ گھر ہوا آباد — یوں ہی ہوں پڑھنے سننے والے شاد

(۲)

مثنوی کے آخر میں پہلے خود علی کی تاریخ ہے ع

باغِ معنی کھلا ہے اب زیبا (۱۲۶۷ھ)

اس کے بعد ان کے استاد منشی اسمٰعیل حسین منیر کی سات تاریخیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک سے ہجری تاریخ (۱۲۶۷) برآمد ہوتی ہے۔ محمد نواز علی سجّاد نے ہجری عیسوی اور فصلی تینوں سے متعلق چار تاریخیں لکھی ہیں۔ نثر میں ایک خاتمہ بطور تقریظ بھی انھیں کے قلم سے ہے۔ صاحبِ مطبعِ محمدی (جہاں مثنوی چھپی تھی) مولوی محمد حسین کے صاحبزادے محمد عبدالرحمٰن احسن نے بھی منظوم تقریظ اور تاریخ لکھی ہے اور اسی پر مثنوی (ص ۱۴۱) ختم ہو جاتی ہے۔

(۳)

اقتباسات سے واضح ہو گیا ہوگا کہ اگرچہ ہم اس مثنوی کو اردو کی مشہور اور صفِ اوّل کی مثنویوں کے ساتھ تو نہیں رکھ سکتے، لیکن شاعر کی حیثیت کو دیکھتے ہوئے یہ قابلِ قدر ضرور ہے۔ اس کی زبان بہت پختہ ہے حشو و زوائد سے بالکل پاک ہے، بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر خاص طور پر ایجاز و اختصار کی کوشش کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ کم سے کم الفاظ میں اپنا مطلب بیان کر دے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ اس میں کامیاب رہا ہے۔

وشوا ناتھ درد

ماوراء

آسماں کی رفعت سے
میں زمیں پہ آیا ہوں
خود سے جو گریزاں ہو!
میں وہ ایک سایا ہوں
لیکن اپنے دامن میں
گیت بھر کے لایا ہوں

بے سبب ہنسی اپنی
میں نے خود اڑائی ہے
ہر کسی سے دانستہ!
ہنس کے مات کھائی ہے
بات خود مجھے اپنی
کب سمجھ میں آئی ہے

زندگی کے صحرا میں!
میں بھی اک بگولا ہوں
آسماں کی وسعت میں
بجلیوں کا جھولا ہوں
کون جانے کیا کھویا؟
اور کیا میں بھولا ہوں

منتشر خیالوں کے
جال بُن رہا ہوں میں
پھول چُن لیے تم نے
خار چُن رہا ہوں میں
آپ اپنے ہونٹوں کی
بات سن رہا ہوں میں

مرزا غالب

(رباعیات)

نامِ تو پیامِ اعتبارِ ادب است — نیرنگِ نوائے تو بہارِ ادب است
آں را کہ تو ننگِ خویش گفتی روزے — امروز کلاہِ افتخارِ ادب است

یاد دل ترے نام کا گرجتا ہے ابھی — ڈنکا تری شاعری کا بجتا ہے ابھی
ہر موسمِ گل میں اے غزل خوانِ بہار — پھولوں سے ترا مزار سجتا ہے ابھی

کب حسنِ کلام بے اثر جاتا ہے — کام اپنا بے دریغ کر جاتا ہے
شاہد ہے ترا سخن نگاہِ خوباں — جو دل سے تا جگر اُتر جاتا ہے

گو سہل نہیں ترا سمجھ میں آنا — ممتاز ہوا وہ جس نے کچھ بھی جانا
دن رات کی بے خودی کے طالب، تجھ کو — اسرارِ خودی کے عاشقوں نے مانا

آئے ہیں بہت سخن سرا تیرے بعد — انداز ترا نہ چل سکا تیرے بعد
خونِ دلِ عشّاق سے ابھرا نہ گیا — ارزندہ ہوا رنگِ حنا تیرے بعد

حافظ علی بہادر خاں

طلسم ہوش رُبا

طلسم ہوش ربا ہندوستان کے افسانوں میں سب سے طویل ہے اور اگر اُن افسانوں کو بھی شامل کر لیا جائے جو طلسم ہوش ربا کے ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں اور جن کے قصے طلسم ہوش ربا کے قصہ سے پیدا ہوئے ہیں یا جن سے طلسم ہوش ربا کے قصے کا جوڑ ملا ہوا ہے تو غالباً نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا کے افسانوں میں طویل ترین ثابت ہوگا۔ یہ تمام داستانیں فیضی کے ہشت دفتر پر مبنی ہیں جو فارسی زبان میں شہنشاہ اکبر کی تفریح طبع کے لئے لکھے گئے تھے اور اکبر کے دور میں نیز اس کے بعد تقریباً تین سو برس تک سلاطین و امرا کے درباروں میں باعث رونق محفل رہے۔

جب اردو زبان نے ہمہ گیر مقبولیت حاصل کی تو ان داستانوں کا ترجمہ اردو میں ہوا اور ان میں لکھنؤ کے داستان گویوں نے دلچسپ اضافے کئے۔ فیضی کی داستان اور اردو کے دفتروں میں وہی فرق ہے جو شہنشاہ اکبر اور امرائے لکھنؤ کے زمانوں میں پایا جاتا ہے۔ چونکہ ہر زمانے کا ادب اس زمانے کے حالات کا ترجمان ہوتا ہے اسی لئے فیضی کی داستان اور اس پر مبنی داستان طلسم ہوش ربا کا مقابلہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

فیضی کے تیار کردہ دفاتر کو اردو میں ڈھالنے کا نتیجہ حسب ذیل کتابوں کی شکل میں آج ہمارے سامنے ہے:

(۱) نوشیرواں نامہ جلد اوّل (۲) نوشیرواں نامہ جلد دوم (۳) ہرمز نامہ (۴) ہومان نامہ (۵) کوچک باختر (۶) بالا باختر (۷) ایرج نامہ جلد اوّل (۸) ایرج نامہ جلد دوم (۹) طلسم ہوش ربا جلد اوّل (۱۰) ہوش ربا جلد دوم (۱۱) ہوش ربا جلد سوم۔ (۱۲) ہوش ربا جلد چہارم (۱۳) ہوش ربا جلد پنجم حصہ اوّل۔ (۱۴) ہوش ربا جلد پنجم حصہ دوم (۱۵) ہوش ربا جلد ششم۔ (۱۶) ہوش ربا جلد ہفتم (۱۷) بقیہ طلسم ہوش ربا حصہ اول۔ (۱۸) بقیہ طلسم ہوش ربا حصۂ دوم (۱۹) صندلی نامہ (۲۰) تورج نامہ جلد اوّل (۲۱) تورج نامہ جلد دوم (۲۲) لعل نامہ جلد اوّل (۲۳) لعل نامہ جلد دوم (۲۴) دفتر آفتاب شجاعت (۲۵) طلسم فتنۂ نور افشاں جلد اوّل۔ (۲۶) طلسم فتنۂ نور افشاں جلد دوم (۲۷) طلسم فتنۂ نور افشاں جلد سوم (۲۸) طلسم ہفت پیکر جلد اوّل (۲۹) طلسم ہفت پیکر جلد دوم (۳۰) طلسم ہفت پیکر جلد سوم (۳۱) طلسم خیال سکندری جلد اوّل (۳۲) طلسم خیال سکندری جلد دوم (۳۳) طلسم خیال سکندری جلد سوم (۳۴) طلسم نوخیز جمشیدی جلد اوّل (۳۵) طلسم نوخیز جمشیدی جلد دوم (۳۶) طلسم نوخیز جمشیدی جلد سوم (۳۷) طلسم زعفران زار جلد اوّل (۳۸) طلسم زعفران زار جلد دوم (۳۹) گلستان باختر جلد اوّل (۴۰) گلستان باختر جلد دوم (۴۱) گلستان باختر جلد سوم

فیضی کے آٹھ دفتر (یعنی نوشیرواں نامہ، کوچک باختر، بالا باختر، ایرج نامہ، طلسم ہوش ربا، صندلی نامہ، تورج نامہ، لعل نامہ) بھی نہایت طویل تھے مگر ان میں لکھنؤ کے داستان گویوں نے نئے نئے پیوند لگا کر ان داستانوں کی ضخامت میں بہت اضافہ کر دیا جس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف داستان طلسم ہوش ربا ۲۰×۲۶/۴ سائز کے ۴۵۴۸ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور یہ آٹھ دفتروں میں سے صرف ایک دفتر ہے اگرچہ دوسرے ہر دفتر سے

زیادہ ضخیم ہے۔ مگر تمام دفتروں اور متعلقہ داستانوں کی بابت اندازہ کیا گیا ہے کہ "اگر روزانہ دو تین گھنٹے کوئی داستان کو سنائے تو بلا مبالغہ برسوں میں یہ داستانیں تمام ہوں گی۔" اس کے باوجود احمد حسین قمر جنھوں نے طلسم ہوش ربا کی پنجم، ششم اور ہفتم جلدیں لکھی ہیں جلد پنجم حصہ اول شروع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"طولانی داستان سرائی کی یہ صورت ہے کہ نہ ایسا ہو کہ سامع و خوانندہ ملول ہو۔ نہ بالکل مختصر ہو کہ مطالب عبارت میں فرق آئے اچھی طرح نہ سمجھا جائے۔" جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ منشی احمد حسین قمر نے پانچویں جلد کو اتنا بڑھا دیا کہ اسے دو حصوں میں شائع کرنا پڑا تو ان کے قول کی صداقت پر شبہ ہوتا ہے اور یہ تسلیم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ طول کو داستان سرائی کا نقص سمجھتے تھے لیکن جب ہم ان کے بیان کو بغور پڑھتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ صرف ایسے طول کو معیوب سمجھتے تھے جس سے "سامع و خوانندہ ملول ہو" اور یہ واقعہ ہے کہ جو طویل داستانیں ان کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں وہ طویل ضرور ہیں مگر ان کو سننے یا پڑھنے والا کسی جگہ بھی ملول نہیں ہوتا۔ لاہور سے ایک کتاب "انتخاب طلسم ہوش ربا" کے نام سے جناب حسن عسکری صاحب کی شائع ہوئی ہے لیکن یہ مقبول نہ ہو سکی کیونکہ طلسم ہوش ربا کی طویل داستان میں بہت کم حصے ایسے ہیں جن کو اس کی جاذبیت قربان کئے بغیر حذف کیا جا سکے۔

واضح رہے کہ ایک مختصر کتاب "داستان امیر حمزہ" کے نام سے انگریز حکام کے ایماء پر خلیل علی خاں نے بھی ۱۸۰۱ء میں لکھی تھی۔ یہ فیضی کی "داستان امیر حمزہ صاحبقراں" سے مختلف ہے اور اس کا ادبی معیار بلند نہیں ہے نیز بعض دیگر مہمل باتیں اس میں شامل ہو گئی ہیں مگر ان نقائص کے باوجود یہ کتاب بھی کافی حد تک مقبول ہے اور عوام کے نچلے طبقے کے ذوق کو حظ و رنگینی دیتی ہے۔

مختلف جلدوں میں امیر حمزہ صاحبقراں کے بیٹے پوتے نواسے ہیرو کا رول ادا کرتے ہیں لیکن ایک جلد کے واقعات کا جوڑ دوسری جلد کے واقعات سے اس طرح لگا ہے کہ تمام کتابیں ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں بن جاتی ہیں مثلاً طلسم ہوش ربا کی جنگوں میں طلسم نور افشاں کا شاہی خاندان اسد غازی نبیرۂ صاحبقراں کی مدد طلسم ہوش ربا میں کرتا ہے۔ بعد فتح ہوش ربا اس شاہی خاندان کے خلاف جب بغاوت ہوتی ہے تو خاندان صاحبقراں امداد کو پہنچتا ہے اس طرح نئی جنگوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس سے طلسم فتنۂ نور افشاں کی تین جلدوں کے لئے مواد فراہم ہوتا ہے۔ ان جلدوں کو ختم کرتے ہوئے داستان گو ایک نیا جوڑ طلسم ہفت پیکر کے لئے لگا دیتا ہے طلسم ہفت پیکر کی داستان جہاں ختم ہونے لگتی ہے وہاں سے طلسم خیال سکندری کی داستان شروع ہو جاتی ہے اس طرح "افسانہ از افسانہ می خیزد" کے مطابق کڑی سے کڑی ملتی اور ایک کتاب کا اختتام دوسری کتاب کا افتتاح بنتا جاتا ہے۔

ہوش ربا مقبول ترین

چونکہ فیضی کے ہشت دفتر کا نام "داستان امیر حمزہ صاحبقراں" ہے اور صاحبقراں کے بیٹے، پوتے، نواسے ان باہم مربوط داستانوں کے ہیرو ہیں لہٰذا اس مقالے کا عنوان "داستان امیر حمزہ صاحبقراں" بھی ہو سکتا تھا لیکن "طلسم ہوش ربا" کو اس لئے ترجیح دی گئی ہے کہ ان تمام داستانوں میں طلسم ہوش ربا ہر لحاظ سے بہترین اور اس لئے مقبول ترین ہے۔ زبان، تخیل، ترتیب واقعات، تنوعِ مضامین، عیاریوں اور جنگوں، خصوصاً کردار نگاری کا جو معیار طلسم ہوش ربا میں ملتا ہے وہ سلسلہ کی دوسری داستانوں میں نہیں پایا جاتا۔ اگرچہ لکھنے والے زورِ کلام میں بعض دوسری داستانوں کو طلسم ہوش ربا کے مقابل بلکہ اس سے افضل بتا گئے ہیں۔ مثلاً احمد حسین قمر جنھوں نے طلسم ہوش ربا کی آخری تین جلدیں لکھی ہیں "طلسم ہفت پیکر" کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"منشی پراگ نرائن صاحب دام اقبالہٗ نے ..... بعنایت مرحمت ارشاد فرمایا کہ طلسم ہفت پیکر کا اشتہار آپ نے طلسم فتنۂ نور افشاں کے آخر میں دیا ہے۔ فرمائشیں بھی اس کی آگئیں لہٰذا قلم اٹھائیے جودتِ طبع دکھائیے ناظرین مشتاق ہیں۔ حقیر نے ارشاد فیض بنیاد مالک مطبع بسر و چشم قبول کیا۔ یقین کامل ہے کہ اس طلسم ہفت پیکر کو دیکھ کر ناظرین با تمکین طلسم ہوش ربا کو بھول جائیں۔ تین جلدیں اس طور سے قرار پائی ہیں کہ جلد اول چالیس جزو، جلد دوم پینتالیس ۴۵ جزو، اور جلد سوم پچپن ۵۵ جزو"

یہ احمد حسین قمر کی رائے ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ خود قمر کی لکھی ہوئی طلسم ہوش ربا کی آخری جلدوں کا مقابلہ ہفت پیکر کی جلدیں نہیں کر سکتیں۔ ہاں بے شک طلسم ہوش ربا کی ابتدائی چار جلدوں سے جن کے مؤلف محمد حسین جاہ ہیں، ہفت پیکر کی جلدوں کا مقابلہ ہو سکتا ہے۔

احمد حسین قمر کی اس تحریر سے ضمناً یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان کتابوں کی مقبولیت اور مانگ بہت زیادہ تھی۔ واضح رہے کہ کتابوں کا پلاٹ مسلمانوں کو زیادہ اپیل کرتا ہے چونکہ اُس میں اسلامی تبلیغ وجہاد کی چاشنی ہے تاہم ان کتابوں کو رقم کثیر صرف کرکے لکھانے اور چھپانے والے ہندو تاجر تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تجارتی پہلو سے یہ منافع کا کام تھا۔ کتابوں کے مطالعہ اور تصنیف تالیف کے متعدد تذکروں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ ہندو تاجر داستان وافسانہ کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ منشی نول کشور اور اُن کے فرزند منشی پراگ نرائن داستانوں کے مسودوں کا پورا جائزہ لیتے اور تنقید وتبصرہ کرکے مؤلفین کو مشورے دیتے رہتے تھے۔ مثلاً جب منشی احمد حسین قمر کا انتقال ہُوا تو وہ داستانِ طلسم زعفران زار لکھ رہے تھے اور اس کے ساٹھ جزو لکھ چکے تھے۔ اس کی تکمیل کے لئے منشی تصدق حسین کو منشی پراگ نرائن نے بُلایا مگر اُن کو ہدایت کی کہ داستان میں جب جوڑ لگائیں تو آگے لکھنے سے پہلے یہ دکھالیں کہ جوڑ ٹھیک لگا ہے۔ منشی تصدق حسین لکھتے ہیں :

"اس وقت تو بہ خیال اس امر کے کہ الامر فوق الادب کچھ انکار نہ کیا بموجب حکم کے اقرار کیا۔ اب جو اپنے مقام پر آکر اس کو دیکھا تو بڑی دقت پائی۔ اوّل تو دوسرے کی تحریر پر قلم اُٹھانا اور اس کو تحریر کرنا۔ معلوم نہیں اس نے کیا خیال کرکے سلسلۂ تحریر کو آغاز کیا تھا اور کیا اس کا منشا تھا۔ کیا واقعات وہ تحریر کرتا اور تم کیا تحریر کروگے۔ چونکہ خداوند کریم کو میری عزت رکھنا تھا اور میں نے جو اُس کی ذات پر بھروسہ کرکے اقرار کرلیا تھا اس نے آسان کیا۔ خیال میں آیا، تحریر تو کر خدا مالک ہے۔ چنانچہ قلم اُٹھا کر نامِ خدا لے کر تحریر کرنا شروع کیا۔ اس خدا نے آسان کیا۔ ایک جزو تحریر کرکے داخل کیا۔ پسند آیا۔ بہت تحسین وآفریں سے سرفراز فرمایا۔" (طلسم زعفران زار۔ صفحہ ۲)

کتابوں کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک کتاب کے کئی کئی ایڈیشن چھپ کر فروخت ہوچکے ہیں۔ ۱۹۱۳ء تک سب دفتروں کے کم از کم تین یا اس سے زیادہ ایڈیشن چھپ چکے تھے اور طلسم ہوش ربا کا ہر ایڈیشن بڑی تعداد میں چھپا تھا۔ قمر کی داستان آرائی کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ان کی لکھی ہوئی پہلی ہی کتاب یعنی طلسم ہوش ربا کی جلد پنجم کا پہلا حصہ ۱۸۹۳ء تک ہی دوبار چھپ چکا تھا۔

ان کتابوں کی اندرونی شہادت سے بھی قبولِ عام کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً طلسم ہوش ربا کی چھٹی جلد میں داستان گو احمد حسین قمر ملک الطلس گلگوں پوش اور تاریک شکل کش کی جنگ کے حالات لکھنے کے بعد یہ الفاظ قلمبند کرتے ہیں :

"راویانِ معتبر نے اس داستانِ حیرت بیان کو اور طور سے تحریر کیا تھا لیکن حقیر مصنف نے اس مقام پر نہایت زور دیا ..... حقیقت میں اوّل میں مصنف نے چند حصے اس کے یہ کیفیت لکھے آخر میں لطف نہ رہا۔ راقم کو ناگوار ہُوا پس عروج شہرۂ فیلسرد داستان ملک الطلس گلگوں پوش بصد جوش وخروش اس مقام پیدا کی۔ بعنایت پروردگار رئیسانِ شہر لکھنؤ یعنی شہزادگان والاقدر، رئیسانِ عظام وجملہ خاص وعام نے اس داستانِ حیرت بیان کو نہایت پسند فرمایا۔ اکثر ذوق وشوق سے فرمائشیں ہوتی ہیں کہ داستان حیرت بیان خروج الطلس گلگوں پوش کے مشتاق ہیں۔" (طلسم ہوش ربا جلد ششم)

اسی سے یہ بھی ثابت ہے کہ لکھنؤ کے داستان گویوں نے فیضی کی داستانوں میں کافی تبدیلی کردی ہے اور اکثر دلچسپ حصے ان ہی کی جدتِ طبع کی پیداوار ہیں۔

مختلف مؤلفین

ان داستانوں کے مؤلفین میں یوں تو متعدد نام لئے جاسکتے ہیں لیکن ابوالفیض فیضی فیاضی وزیر شہنشاہ اکبر کا نام سب سے اس لئے نمایاں ہے کہ پہلے انھوں نے ہی یہ مبسوط داستان شہنشاہ اکبر کی تفریحِ طبع کے لئے فارسی زبان میں تصنیف کی تھی۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں فیضی کی مصروفیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اتنی ضخیم ودلچسپ کتاب کی تصنیف سے ظاہر ہوتا ہے کہ فیضی کو مبدءِ فیاض سے غیر معمولی ذہانت عطا ہوئی تھی۔

جب رفتہ رفتہ فارسی کا رواج کم ہُوا اور اردو نے ہمہ گیر مقبولیت حاصل کی تو ہر طرف سے اردو ترجمے کا مطالبہ ہونے لگا اور منشی نولکشور نے لکھنؤ کے مشہور داستان گو تصدق حسین اور پھر محمد حسین جاہ کو اس اہم کام پر مقرر کیا۔ چنانچہ طلسم ہوش ربا کی پہلی چار جلدیں جاہ کے ہی زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ محمد حسین جاہ نے ان جلدوں میں کمال دکھایا ہے اور عام طور سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے

لیکن آخری تین جلدیں جو احمد حسین قمر نے لکھی ہیں پہلی چار جلدوں سے بہتر ہیں۔ زبان کے لحاظ سے بھی اور اوصاف نویت کے نقطۂ نظر سے بھی۔ ایک بار شروع کیجئے تو پھر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ دراصل طلسم ہوشربا کی داستان شروع سے آخر تک اتنی دلچسپ ہے کہ ایک بار شروع کرنے اور دس بیس صفحات پڑھنے کے بعد ختم کئے بغیر جی نہیں مانتا اور اکثر لوگ تو بار بار پڑھتے اور قند مکرر کا مزا پاتے ہیں۔ ہر جلد میں نیا رنگ نظر آتا ہے۔ بار بار رزم و بزم کا نقشہ نئے طور سے پیش ہوتا ہے۔ میلوں اور تماشوں کا تذکرہ ہر جگہ نئے انداز سے ہوتا ہے۔ عیاریوں کا کیا کہنا ہر مقام پر فکر رسا کی داد دینی پڑتی ہے۔ مکاریوں کی جدت پر آفرین کہنی پڑتی ہے۔ پہلوانوں کی لڑائیاں، بہادروں کی جانبازیاں ایسے طور سے پیش کی ہیں کہ گویا سارا واقعہ عالم اصلیت میں سامنے ہی ہو رہا ہے طلسمات و عجائبات اور ساحروں کے کرشمے حیرت انگیز ہیں۔ وصل کی راتیں، حسن و عشق کی کرامائیں، فراق و وصالِ محبوب کے حالات اس فصاحت و بلاغت سے بیان کئے گئے ہیں کہ گویا سمندِ مضامین پر تازیانے لگ رہے ہیں یا سحر بیانی کے دریا بہہ رہے ہیں۔ سیکڑوں موقعوں پر صبح سے شام اور شام سے صبح ہوتی ہے مگر ہر جگہ انداز نیا اور قصہ کے واقعات کے مطابق ہے۔ اگر حسینوں کا سراپا پیش کیا ہے تو سبحان اللہ اور بہار کا سماں دکھایا ہے تو ماشاء اللہ۔ المختصر اگرچہ ساری داستان قابلِ تعریف ہے مگر نسبتاً قمر کو جاہ پر فضیلت ہے۔

خود منشی نولکشور جن کے سرمایہ سے یہ کتابیں شائع ہوئیں منشی احمد حسین قمر کو محمد حسین جاہ پر ترجیح دیتے تھے چنانچہ جلد پنجم حصۂ اول کی ابتدا میں جو باب سببِ تصنیف کے متعلق شامل کیا گیا ہے اس کے الفاظ قابلِ توجہ ہیں:

"منشی نولکشور نے احمد حسین قمر سے ازراہ قدر دانی ارشاد فرمایا کہ براہ مہربانی جلد پنجم و ششم و ہفتم کتاب طلسم ہوشربا بعبارت لطیف و نفیس کہ پسند خاطر خاص و عام ہو تحریر فرمائیے کہ ناظرین بلند بین و مشتاقانِ خوش آئین اس سے لطف اٹھائیں مگر تعجب کا مقام ہے کہ آپ ایسا کامل و اکمل داستان گو وحید عصر شاعر و نثار ہر فن میں ذیوقار لکھنؤ میں موجود ہے۔ افسوس ہم کو قبل خبر نہ ہوئی۔ اب زبانی اکثر رؤسائے ذیوقار و شہزادگانِ والاتبار کے ظاہر ہوا۔ آپ کے کمال سے بخوبی ماہر ہوا۔ اس وجہ سے اپنے دوست جناب میر صاحب موصوف مذکورہ کو ذریعہ کرکے آپ کو تکلیف دی۔ اگر قبل اس کے آپ سے نیاز ہوتا تو یہ جو چار جلدیں طبع ہوئی ہیں آپ ہی سے اُن کا ترجمہ کراتے اور لکھواتے۔ خیر اب تامل نہ فرمائیے بسم اللہ قلم اُٹھائیے ...... ہر کہ و مہ آپ کا مدح خواں ہے۔ واضح ہوا اس شہر میں سب داستان گو آپ کے پیرو ہیں۔ دفتر ہوشربا آپ ہی کی سحر بیانی سے مشہور عالم ہوا۔ ورنہ کوئی اس کے نام سے بھی آگاہ نہ تھا۔ اب آپ کو انکار بیکار ہے ناظرین کو ہر جلد کے طبع ہونے کا بہت بڑا اصرار ہے۔ الاشتیاق اشد الموت مشہور ہے بہر نوع ترجمہ کرنا آپ کو ضرور ہے۔"

مذکورہ بالا عبارت سے یہ بھی ظاہر ہے کہ احمد حسین قمر اور لکھنؤ کے متعدد دوسرے داستان گو طلسم ہوشربا کی طباعت سے قبل ہی اس کی داستانوں کو جو فارسی دفتروں سے اخذ کی گئی تھیں رؤسا کی مجلسوں میں سنایا کرتے تھے۔ خود احمد حسین قمر نے داستان گوئی کو اپنا پیشہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد اس طرح بنایا کہ ان کا گھر لوٹ لیا گیا اور خاندان کے لئے کوئی ذریعہ معاش نہ رہا تھا۔ داستانوں سے ان کو دلچسپی تھی لہذا فقر و فاقہ سے بچنے کے لئے یہ پیشہ شروع کیا اور اپنے ذوق و صلاحیت کے باعث شہرتِ عام حاصل کر لی۔

فیضی کی داستان امیر حمزہ صاحبقراں کا دفتر ششم صندلی نامہ کے نام سے میر محمد اسماعیل اثر نے لکھا ہے۔ یہ دفتر منشی نولکشور کے زمانہ میں اُن کے حکم سے لکھنا شروع ہوا اور ان کے فرزند جناب پراگ نرائن کے زمانہ میں ختم ہوا۔ اس وقت تک نوشیرواں نامہ، کوچک باختر، بالا باختر اور ایرج نامہ شیخ تصدق حسین داستان گو نے لکھے تھے اور سب شائع ہو کر مقبول عام ہو چکے تھے۔ ۱۹۱۳ء تک اس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ طلسم ہوشربا کی آخری داستان کے ساتھ اس کے قصہ کا آغاز وابستہ ہے اور اس طرح سلسلہ کی کڑی سے کڑی مل گئی ہے۔

طلسم ہوشربا کی زبان

فیضی کی داستان امیر حمزہ صاحبقراں کے آٹھ دفتروں کو جب اردو کے قالب میں ڈھالنے کا فیصلہ ہوا تو زبان کے لئے فسانۂ عجائب کا معیار پیشِ نظر رکھا گیا تھا۔ اس وقت رجب علی سرور کے فسانۂ عجائب کی زبان

کی دھوم تھی اور نہ صرف عوام و خواص بلکہ خود ترجمہ کرنے والے داستان گو فسانۂ عجائب کی زبان کی تقلید کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جب یہ دفتر اردو میں تیار ہوئے تو ان کی زبان کو فسانۂ عجائب کی زبان سے بہتر تسلیم کیا جانے لگا۔ خصوصاً طلسم ہوشربا یعنی داستانِ امیر حمزہ صاحبقراں کے دفتر پنجم کی زبان یقیناً فسانۂ عجائب کی زبان سے بہتر مانی گئی۔

ذیل میں طلسم ہوشربا سے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں جن سے لکھنؤ کے محاورات پر خاصی روشنی پڑتی ہے:

[ایک جابر و قاہر بادشاہ فولاد نامی اپنی شہزادی کو باغ میں درخت سے باندھ کر تازیانوں سے مارتا ہے کیونکہ صاحبقراں کے پر پوتے ایرج نوجوان سے اس کا عشق ثابت ہوا ہے۔ ہوشربا جلد پنجم سے یہ منظر ملاحظہ ہو۔] "فولاد کو غصہ آیا مثلِ بید کانپا۔ ہرچند اُس گلعذار رشکِ بہار نے فریاد کی یہ خار بیابان کفر و ضلالت کب مانتا ہے جھپٹ کر کوڑا مارا۔ وہ جسم نازک وہ گل سا چہرہ کہ جو جھونکے سے ہوائے تُند کے مُرجھاتا تھا بدھیاں پھولوں کی جسمِ نازک پر ابھریں۔ کوڑا جو پڑا خون کی چھینٹیں گلے کا ہار تھیں۔ رنگ دگرگوں ہوا۔ لالے کا اس غم سے جگر خون ہو گیا۔ سنبل کو پریشانی، چشمِ نرگس کو حیرانی۔ شمشاد رنج و ملال سے پابگِل، قمری اس صدمۂ جاں گزا سے مثلِ مرغِ بسمل۔ ہر نخل نخلِ ماتم، ہر گل بوٹا مبتلائے رنج و الم۔ پتّے کفِ افسوس ملتے ہیں۔ رنگ سے پھولوں کے شعلے نکلتے ہیں۔ عندلیبانِ چمن نغمہ سرائی بھولیں، نرگس کی آنکھیں روتے روتے سوج گئیں۔ نہروں کو جوشِ ملال۔ موجوں کے کلیجہ پر خنجرِ بے آب چل رہے ہیں، حباب بدحواسی میں اُبل رہے ہیں۔ لبِ ساحل سے صدائے افسوس بلند، مچھلیاں اس ماہیت سے ماہر ہو کر رو مندہ جھونکوں سے ہوا کے رونے کی آواز آتی ہے، زمینِ چمن اس بدعت پر تھرتھراتی ہے۔ طفلانِ غنچہ چٹک کر غل مچاتے ہیں، نخل شاخوں سے اُس سمنبر کے بچانے کو ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ باغ میں ہنگامۂ قیامت خیز بدعت انگیز برپا ہے ....."

ایک نازنین کا سراپا ملاحظہ ہو:

"ابرپارۂ نوری شق ہوا۔ دیکھا ایک نازنین سرو قد خورشید خد، کبک رفتار شیریں گفتار، چشم جادو خال ہندو غنچہ دہن خوشبو مشکیں مو ..... جوڑا ترچھا بندھا ہوا، دریائے جواہر میں غرق لباسِ فاخرہ زیبِ جسم طاؤس زرّیں بال پر سوار، وہ ماہ رخسار جب آنکھوں کو گردش دیتی ہے گردشِ لیل و نہار آنکھوں سے گر جاتی ہے، باغ میں چشمِ نرگس شرماتی ہے۔ زلفِ معنبر کو دیکھ کر سنبل پیچ و تاب کھاتی ہے ....."

ذیل میں وہ نصیحت ملاحظہ ہو جو نورافشاں اپنے ایک شاگرد ملک احول مربع نشین کو کرتا ہے۔ یہ نصیحت ایسے وقت کی جاتی ہے جب لشکرِ اسلام مبتلائے مصیبت ہے اور تمام لشکر کی نجات صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ ملک احول اپنی جان قربان کر دے۔ نورافشاں اس قربانی کے لئے اپنے شاگرد کو تیار کرنے کے لئے بے ثباتیٔ عالم کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے:

"اے مردِ مردانہ شیرِ فرزانہ یہ دنیا حباب سے بھی کم ہے ہرچند دریا دلی میں آکر صاحبانِ آبرو بصد جستجو حباب لبِ دریا سے زندگی کو مثال دیتے ہیں سراسر غلط۔ بقول مصنّف ؎

فنا لگی ہے پئے سرکشانِ تردامن
ابھر چلے تھے کہ بس خاک میں حباب ملے

انسان کی لیاقت اس سے بھی کم ہے۔ غنچۂ گل سے بھی مثال کا رنگ نہیں جمتا۔ نسیمِ سحری کہوں، آمدِ بہار سے مثال دوں۔ اے فرزند یہ سب سراسر حماقت ہے۔ دنیا مقام سرائے فانی ہے، شہرِ عدم مقامِ جاودانی ہے۔ سرا میں اُتر کر دیکھا شام کو صدہا مسافر آئے۔ بھٹیارا بھٹیارنوں نے خوب خاطر کی، آب و دانہ مہیا کیا۔ جب رات کٹی مسافروں نے کمر باندھی، کوئی بہتر بھٹیارنی خلق سے نہیں پیش آتا بلکہ

جاروب کشی کرکے خاک اڑاتے ہیں مسافر کو جھگاتے ہیں۔ اسی طرح خیال کرو جب لڑکا بطنِ مادر سے پیدا ہوا، ماں باپ کا دل شیدا ہوا، کوئی پیار کرتا ہے کوئی جانی پیارے کہتا ہے، ہر وقت صد ہا حسنِ دآرام میں رہتا ہے، جب شبِ حیات بسر ہوئی، سب سے منھ پھیرا، حسرت و یاس نے آکر گھیرا۔ وہی چاہنے والے کہتے ہیں چلو اس کو پھینکو۔ عزیز و اقارب ساتھ ہوئے مکان تنگ و تاریک میں جا کر بند کر دیا۔ ماں باپ کو بھی نہ اتنا خیال آیا کہ آج ہمارا فرزند بیہاں تنہائی میں آرام کرے گا آج کی شب اسی جا بسر کریں شاید ہمارا فرزند ہمیں پکارے جواب دیں، جا کر آغوش میں لیں محبت فدیہ نہ صرف کریں۔ یہ نہیں ہوتا تنہائی میں چھوڑ کر چلے آتے ہیں، پھر کوئی خبر لینے نہیں آتا۔ نہیں معلوم اس پر کیا گذری۔ نہیں معلوم اس نے آرام پایا یا مصیبت سہی۔ محبت عاشق و معشوق کا دنیا میں فسانہ ہے۔ مجنوں نے عشقِ لیلیٰ میں آرام دنیوی ترک کیا۔ عمر بھر صحرا نورد رہا۔ یہ عشق تمام عالم میں مشہور ہے۔ ہر اہلِ دل اس کا ذکر کرتا ہے لیکن قبر میں ان میں بھی ایک نے ایک کا ساتھ نہ دیا۔ اگر کسی معشوق کا انتقال ہوا۔ عاشق پہر دو پہر رو دیا سمجھانے والوں نے سمجھایا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ‟

ایک جگہ میلے کا نقشہ پیش کیا ہے۔ جوہریوں، بزازوں، شرابیوں وغیرہ کا تذکرہ کرنے کے بعد دھوبیوں اور سقوں کا مقابلہ دکھایا ہے۔ لکھتے ہیں :-

”ایک جانب سقے کھارے کی لنگیاں، دہری مرزائی، پگڑیاں سروں پر، نری کے جوتے ڈٹے ہوئے ہیں۔ دوسری جانب دھوبیوں کا پرا جما ہوا ہے۔ انگرکھے جامدانی کے اُجلے صاف شفاف، پائجامے تین تین گھیر کے سر پر ایک پاپچہ چڑھا ہوا ایک اُترا ہوا، تیوریوں پر بل پڑا ہوا، ہاتھوں میں چاندی کے کڑے، گلے میں نقری زنجیریں، گلوریاں کھائے ہوئے، کنٹھے دار جوتی چڑھائے ہوئے دونوں فرقے ڈٹے ہوئے ہیں۔ بڑے لطف سے یہ کمنڈ تصنیف میر شوکت حسین صاحب سحر کے گا رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سامعین میں چرچے ہو رہے ہیں کہ آج تیسرا دن ہے سقے دھوبیوں کی جان کو کلپ رہے ہیں، پیڑا کرنے پر آمادہ ہیں، کہتے ہیں خوب گنڈی کریں گے، ان کی استری لیں گے، دھوبی پاٹ کریں گے جب تو پیچ میں آئیں گے۔ ایک کہتا ہے بھائی دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ اُدھر دھوبی بھی جوش میں کہتے ہیں۔ ہم بھشتیوں کو سوندن میں ڈالیں گے، ڈول مشک چھوڑ کر بھاگیں گے۔ خاک چھانتے ہیں ابھی سے کنوئیں جھانکتے ہیں۔ اب آبرو پر بنیگی ہماری ان کی خوب چھنیگی پناہ پانی مشکل ہوگی۔ ہمارے اُن کے تکرار لب ساحل ہوگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ‟

سب سے بڑی خوبی

طلسم ہوشربا اور اس کی متعلقہ داستانوں سے اس قسم کے سیکڑوں نمونے پیش کئے جا سکتے ہیں جن کے لئے ایک مقالہ میں گنجائش نہیں۔ ان اقتباسات میں زبان کی تو خوبی جیز عیاں ہی ہے مگر سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سماج کے ہر کردار کو اس طرح پیش کیا ہے گویا کہ زندگی میں خود مصنف کا یہی کردار تھا کیونکہ وہ اس کے ہر پہلو ہر اونچ نیچ ہر راگ گھاٹ سے واقف ہے۔ اگر ایک نجومی کا کردار پیش کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کوئی نجومی تھا، ایک بادشاہ کا کیریکٹر ہے تو شاہی کے ہر راز سے واقف ہے، اگر کسی طوائف کی زندگی پیش کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ساری عمر مصنف نے طوائفوں میں ہی گزاری ہے۔ سپاہی، افسر، مسخرا، عاشق و معشوق، پاگل، دھوبی، سقہ، خادم غرضکہ کوئی بھی کردار نہیں جو ہزاروں صفحات کی ان داستانوں میں نہ ہو لیکن ہر کردار کو پیش کرنے میں قلم توڑ دیا ہے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کے مطالعہ کے بعد ایک انگریز مبصر نے اس کی سب سے بڑی خوبی یہ بیان کی تھی He was one in many and many in one یعنی اس کی شخصیت کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت کا نمونہ تھی۔ لیکن طلسم ہوشربا میں یہ کمال شیکسپیئر کے ڈراموں سے بھی زیادہ نظر آتا ہے۔ لکھنے والا ایک ہے مگر خود کو ہر کردار میں اس طرح جذب کر لیتا ہے کہ گویا زندگی میں اس کا وہی شغل تھا اور وہ اس کیرکٹر کی تمام خصوصیات کا حامل ہے۔

طلسم ہوشربا کے نقائص

سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ حد سے زیادہ طویل ہے، بقول کسے ع

طولِ شبِ فرقت سے بھی دو ہاتھ بڑی ہے

اس نقص کے باعث دوسری زبانوں میں اس کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ مولانا محمد علی مرحوم نے بعض حصوں کے ترجمہ کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ جتنی محنت، قابلیت و دولت اس کام کے لئے درکار تھی وہ ناممکن الحصول ثابت ہوئی۔

طویل ہونے کے ہی سبب ایسے لوگ مطالعہ سے گریز کرتے ہیں جن کے پاس دیگر مشاغل سے وقت کم بچتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جو آدمی داستان کا ایک حصہ پڑھ لیتا ہے وہ مطالعہ جاری رکھتا ہے لیکن بہت لوگ محض طوالت کی وجہ سے طلسم ہوشربا کے قریب نہیں آتے۔

ایک اور نقص یہ ہے کہ داستان پر اسلامی رنگ چھایا ہوا ہے۔ اس کا پلاٹ غیر مسلموں کو زیادہ اپیل نہیں کرتا۔ اگرچہ تمام فرضی قصے ہیں اور صرف تفریحِ طبع کے لئے لکھے گئے ہیں لیکن توحید اور اسلام کے لئے نہایت غلط، خلافِ اصول اور بھونڈا پروپیگنڈا بھی داستانوں کا جزو ہے۔ یہ غنیمت ہے کہ مسلمانوں کے مقابل میں ہندوؤں کو نہیں پیش کیا گیا ہے بلکہ سامری پرست جادوگروں کی ایک نئی دنیا میں یہ تمام تبلیغ ہوتی ہے۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ اس زمانہ میں سوسائٹی فرقہ وارانہ رنگ سے پاک تھی اور ہندو قارئین کے جذبات کا بھی پورا پورا خیال تھا۔ نیز یہ بات بھی تھی کہ ان کتابوں کے لکھانے اور چھاپنے والے ہندو تھے۔ بہرکیف کتاب سے ہندوؤں کو کوئی شکایت نہیں ہو سکتی مگر مسلمانوں کو بے شک شکایت ہو سکتی ہے کہ اسلامی تعلیمات کو مسخ کر دیا گیا ہے۔ مثلاً شراب کی عام اجازت ہے۔ مگر یہ عجیب اصول اسلام کا پیش کیا گیا ہے کہ مشرک کے ہاتھ سے خواہ وہ معشوقہ اور شہزادی ہی کیوں نہ ہو شراب پینا جائز نہیں ہے۔ تلوار موت یا اسلام کا عجیب اصول بھی اسلامی شعار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

طلسم ہوشربا میں متعدد تاریخی شخصیتوں کو پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً نوشیروان، امیر حمزہ، ابراہیم خلیل اللہ وغیرہ۔ لیکن ان کے تاریخی واقعات کو الٹی چھری سے ذبح کیا گیا ہے۔ مثلاً نوشیروان کی موت طاقِ کسریٰ کی دیوار کے گرنے سے دکھائی گئی ہے۔ اور بھی نہایت احمقانہ و مہمل باتیں ہیں لیکن ان تمام نقائص کے باوجود وہ شاندار ادبی شاہکار ہے۔ اور اس سے تاریخِ ہند کے ایک خاص دور کے سماجی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ ہندوستانی تہذیب کے ایک ارتقائی مرحلہ کی ترجمان طلسم ہوشربا ہے اور اس لحاظ سے ہماری تاریخ ادب و تہذیب کے طالب علموں کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

امداد باہمی اور ہتھ کرگھے کی صنعت کی ترقی

جب سے ہتھ کرگھے کی صنعت کو مالی امداد دینے کے پروگرام کو عملی جامہ پہنایا جانے لگا ہے۔ تب سے کواپریٹو سوسائٹیوں کی تعداد دگنی ہوگئی ہے۔ ستمبر ۱۹۵۳ء کے آخر میں ۶۸۲۰۸۳ ہتھ کرگھے کواپریٹو سوسائٹیوں سے وابستہ تھے جبکہ جون ۱۹۵۸ء کے اختتام پر ان کی تعداد بڑھ کر ۱۱۹۸۷۴۶ ہوگئی۔ یوں سمجھئے کہ آج کل ملک بھر میں جتنے کرگھے چالو ہیں ان کا ۴۰ فی صد حصہ کواپریٹو سوسائٹیوں سے وابستہ ہے۔

فی الحال سارے دیش میں ۹۶۰۰ سے بھی زیادہ کواپریٹو سوسائٹیاں کام کر رہی ہیں۔ ۱۹۵۳ء میں ہتھ کرگھے کی پیداوار ۱۲۰ کروڑ گز تھی جو ۱۹۵۹ء میں بڑھ کر ۱۸۷ کروڑ گز ہوگئی۔ ۵۴-۱۹۵۳ء سے ۵۸-۱۹۵۷ء تک یعنی گذشتہ پانچ مالی سال میں اس صنعت کی ترقی کے لئے بھارت سرکار کی طرف سے ۳۸ء۲۸ کروڑ روپے بطور قرض و امداد دیئے گئے۔ اس عرصہ میں ریاستوں نے ۲۷ء۴۶ کروڑ روپے خرچ کئے۔ رواں مالی سال یعنی ۵۹-۱۹۵۸ء میں اب تک ۴۱ء۷۲ کروڑ روپے کی رقمیں امداد اور قرض کے طور پر منظور کی جا چکی ہیں۔

کوثر چاندپوری

امّاں جان

رضیہ سال بھر سے اپنی نئی امّاں جان کے پاس رہ رہی تھی۔ ایک برس پہلے وہ بہو کو بہت زیادہ چاہتی تھیں شادی کے قبل بھی انھوں نے اپنے اکلوتے بیٹے حبیب سے کہا تھا۔

"حبیب! دلھن کے گھر میں آتے ہی دیا سا جل اٹھے گا میرے اندھیرے مکان میں۔ بڑی بڑی آنکھیں ـــ گھنی اور کالی بھونرا سی بھنویں، پتلے سنترے کی پھانکوں جیسے ہونٹ، اور لال لال انگارہ سے گال!"

اور حبیب نے مسکرا کر کہا تھا۔

"امّاں جان میں ان انگاروں سے کیوں کر کھیل سکوں گا۔"

"تو بات نہیں سمجھا میری۔ مورکھ کہیں کا ـــ ارے اس کے گال گلاب کی پتیوں جیسے ہیں۔"

"اور مجھے خوشبو سے نزلہ ہو جاتا ہے امّاں جان!"

"اس سے نہیں ہوگا!"

"میں چاہتا ہوں ایک نظر اسے دیکھ لوں۔"

"وہ کوئی ایسے ویسے گھرانے کی نہیں ہے۔ پرندہ پر بھی نہیں مار سکتا جہاں وہ رہتی ہے۔ پھر تو کیا کرے گا دیکھ کر، میں جو دیکھ چکی ہوں۔"

"آپا جان کی شادی کے وقت بھی آپ ہی نے ان کی طرف سے یہ فرض انجام دیا تھا اور بھائی جان کو دنیا کا حسین ترین بانکا سجیلا نوجوان سمجھ کر اپنا داماد بنا لیا تھا۔"

"پھر کیا ہے وہ!"

"ہر اعتبار سے اچھا ہے صرف حسین ہی نہیں ہے۔"

"اور حسین سے ہمیں کیا کام جب وہ ہر طرح سے اچھا ہے تو بس ہمیں پسند ہے۔"

"اگر آپا جان بھی آپ کی پسند سے مطمئن ہیں تو ٹھیک ہے لیکن میں آپ کے انتخاب سے نہیں اپنی پسند سے شادی کروں گا۔"

"ایسا نہیں ہو سکے گا!"

اور واقعی ایسا نہ ہو سکا۔ یہ محض حبیب کی خوش قسمتی تھی کہ رضیہ بالکل ویسی ہی نکلی جیسا امّاں جان نے کہا تھا وہ ان کے آرٹ کا قائل ہو گیا اور زندگی نہایت لطف سے گذرنے لگی۔ البتہ امّاں جان رضیہ کے مقابلے میں بڑی تیزی سے بدلنے لگیں۔ اور اس تبدیلی کی بنیاد وہ محبّت تھی جو رضیہ اور حبیب کے دلوں میں چنبیلی کے درخت کی مانند پھول رہی تھی۔ جس کی ہری بھری شاخوں پر دن رات کلیاں چٹکتیں اور پھول بن جاتیں ـــــ اور امّاں جان کو اب ان کی مہک ہی سے نزلے کی شکایت رہنے لگی تھی۔ ان کا غصّہ بہت بڑھ گیا تھا وہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھیں۔ ہر وقت رضیہ کے پیچھے پڑی رہتی تھیں۔ کبھی کپڑوں پر نکتہ چینی کرتیں کبھی اس کے بناؤ سنگار پر بگڑ جاتیں۔

"بہو، یہ آڑی ترچھی مانگ تو ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔"

"اور یہ آدھی آستینوں کا کرتہ اب میں نہ دیکھوں کبھی تمھارے بدن پر۔"

"ساری باندھنا گناہ ہے، شریفوں کی بہو بیٹیاں کبھی ایسے کپڑے نہیں پہنا کرتیں۔"

حالاں کہ ان کی بیٹی شاہدہ جس کے شریف ہونے میں خود انھیں بھی کوئی شبہ نہیں تھا اکثر ساری باندھ لیا کرتی تھی۔

رضیہ اپنی امّاں جان اور نئی امّاں جان میں اب نمایاں فرق محسوس کرنے لگی تھی۔ جہاں تک ناک نقشے کا تعلّق ہے یہ فرق پہلے بھی تھا۔ اس کی امّاں بہت پتلی دُبلی، گوری چٹی اور ہنس مکھ تھیں اور یہ نئی امّاں جن کو رضیہ نے حبیب کی خاطر امّاں جان کہنا شروع کر دیا تھا۔ بہت موٹی اور بھاری بھرکم تھیں، اب کچھ دنوں سے ان کی عادت بھی بدلتی جا رہی تھی۔

وہ بڑی آنکھوں کو بُرا سمجھنے لگی تھیں، گھنی اور کالی بھنویں بھی انھیں اچھی نہ معلوم ہوتی تھیں۔ اور رخساروں کی سُرخی میں وہ شلجم اور چقندر کی جھلک دیکھ کر ان سے گھن کھلنے لگی تھیں۔ ایک دن امّاں جان نے حبیب کو باورچی خانہ میں بٹھا کر کہا۔

"حبیب جورو کے پیچھے بالکل دیوانہ مت بنا جا۔"

"آپ کو کیوں کر پتہ چلا کہ میں دیوانہ بنا جاتا ہوں۔"

"تیرے طور طریق سے" وہ تنک کر بولیں: "تو ہر وقت اس کے گھٹنے سے لگا کیوں بیٹھا رہتا ہے۔"

"امّاں جان!" حبیب نے بڑی سنجیدگی سے کہنا شروع کیا "میں دس بجے سے پانچ بجے تک دفتر میں رہتا ہوں، شام کو چائے پیتے ہی کلب چلا جاتا ہوں، وہاں سے لوٹ کر ان فائلوں میں سر کھپاتا ہوں جو آفس سے آئی ہوئی میز پر رکھی رہتی ہیں۔ اس کے بعد وقت ہی کتنا بچتا ہے کہ میں کسی کے گھٹنے یا شانے سے لگا بیٹھا رہوں۔ آپ کہیں تو رات کو باہر سو رہا کروں، ویسے بیوی کے بازو پر سر رکھ کر سو جانا یا اس کے گھٹنے سے ٹک کر غم دُنیا کو للکارنا کوئی بُری بات بھی نہیں ——— اس حد تک تو ہرگز نہیں کہ اسے دیوانگی کہا جائے۔ پھر اگر یہ پاگل پن بھائی جان اور آپا جان کے درمیان سے اُبھرتا ہے تو آپ بھولی نہیں سمائیں۔ مجھے معلوم ہے کہ بھائی جان کے سر میں یہ سودا پیدا کرنے کے لئے آپ نے کیا کیا جتن کئے ہیں ——— کیا آپ نے کبھی بھائی جان سے کہا ہے کہ وہ آپا جان کے گھٹنے سے لگ کر نہ بیٹھا کریں، میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کی ہمیشہ یہ آرزو رہی ہے کہ وہ ان کے پیروں پر سر رکھے پڑے رہا کریں۔"

"حبیب بس——— وہ شیرنی کی مانند گرج کر بولیں" تو نے پہلے کبھی یوں میری زبان نہ پکڑی تھی۔ جانتی ہوں یہ سب بہو کے کرتوت ہیں۔ اس نے تجھے بالکل اپنی مٹھی میں لے لیا ہے جب ہی تو وہ بھی پاؤں نکالتی جا رہی ہے۔ میری کسی بات پر کان ہی نہیں دھرتی۔"

"دعا کیجئے بھائی جان بھی اسی طرح آپا جان کی مٹھی میں آجائیں اور میں جانتا ہوں کہ اب بھی آپ کے دل سے یہ دعا نکل رہی ہے۔"

"ارے چل دُور ہو میرے سامنے سے اسی دن کے لئے پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا کہ جورو کے آتے ہی اس طرح آنکھیں پھیر لے۔ ہم نے تو دن رات ایک کر کے دیکھ بھال کی ہے تیری، ذرا کان بھی گرم ہو گیا ہے تو رات بھر پٹی کے نیچے بیٹھے رہے ہیں اور تیرا یہ حال ہے ابھی سے۔"

"اماں جان!" حبیب بولا "مجھے خوشی ہے کہ میں باپ ہی کے نقشِ قدم پر چل رہا ہوں اور آپ کی ان ہدایات پر عمل کر رہا ہوں جو آپ بھائی جان کو کرتی رہتی ہیں۔ اگر وہ اپنی بدقسمتی سے آپ کا حکم نہ مانیں تو کیا میں بھی نہ مانوں۔"

حبیب ماں سے ڈرتا ضرور تھا۔ مگر بہت زیادہ ڈرانے سے بھی آدمی دلیر بن جاتا ہے۔ اس وقت انھوں نے آپ ہی اس کی زبان کھلوائی۔ وہ سمجھ دار تھا اور جانتا تھا کہ وہ داماد سے کیا توقع رکھتی ہیں۔ پھر جو اپنی بیٹی کے لئے چاہتی ہیں اگر وہی بہو کو بھی مل جائے تو کیا ہرج ہے؟ ——— اماں جان کی بے تکی باتیں سُن کر حبیب نے سمجھ لیا کہ ان کے سینے میں دو دل ہیں۔ ایک بیٹی کے لئے ایک بہو کے لئے، بیٹی والے دل میں محبّت ہے پیار ہے، وہ سہانی آرزوئیں ہیں جو اسے پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتی ہیں۔ اس کے آرام پر خوش ہوتی ہیں تکلیف پر کُڑھتی ہیں اور بہو والے دل کا حال اس کے بالکل خلاف ہے۔ اس میں سنگ دلی ہے، جلن اور کُڑھن ہے اور اپنی محبت میں بہو کے شریک ہو جانے کا غم ہے ——— ماں کے ہاتھ سے بیٹے کو چھین لینے کا خطرہ ہے۔ حبیب نے پہلے ہی دن ماں اور بیوی کی حیثیت الگ الگ کر دی تھی۔ اس نے ایک کو عزّت دے دی تھی، ایک کو محبّت، ماں کے سامنے پیشانی جھکائے رکھنے کا عہد کر لیا تھا اور بیوی کے دل میں اپنے دل کی دھڑکن سمو دینے کا ——— یہ کیوں کر ممکن تھا کہ وہ دونوں چیزیں ایک ہی کو دے ڈالتا۔

اماں جان کی عمر پچاس سے کچھ اوپر ہی تھی۔ وہ اس وقت بیوہ ہو گئی تھیں۔ جب بیٹا تین سال کا تھا اور بیٹی پانچویں میں لگ چکی تھیں۔ عمر کے لحاظ سے وہ بہت عقل مند اور تجربہ کار تھیں۔ لیکن بیٹی اور بیٹے کی شادی کرتے ہی ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے سٹھیا گئی ہوں۔ ان کی بیٹی شاہدہ خوبصورت بالکل نہ تھی۔ اس کی آنکھیں چھوٹی تھیں، پیشانی تنگ تھی، ہونٹ بہت بھدے اور موٹے تھے، گال پھولتے جا رہے تھے۔ آنکھیں اور چھوٹی ہوتی

جا رہی تھیں۔ اسے خوبصورت بنا کر شوہر کی نگاہوں میں محبوبہ" کے درجہ پہ لانے کے لئے بڑی کاوش کی ضرورت تھی۔ شاہدہ کا قد ذرا چھوٹا تھا۔ غرارہ یا پاجامہ اس پر بالکل نہ سجتا تھا۔ ایک مرتبہ نہ جانے کیوں اس کے شوہر نے کہہ دیا تھا۔

"شاہدہ ساری پہن کر تم ذرا گوارا بن جاتی ہو!"

اسی دن سے ساری اس کے لئے اخلاقی اور مذہبی نقطۂ نظر سے جائز ہو گئی تھی اور امّاں جان یہ چاہتی تھیں کہ شاہدہ ہر وقت ساری ہی پہنے رہا کرے۔ اس کے لئے پاجامہ پہننا حرام ہو گیا تھا۔ ادھر اس کا شوہر اس کی بانیت سے ... رہنے لگا تھا۔

بیٹی سے ناراض ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ خوبصورت تھی اور بغیر کسی سہارے کے جیب کے دل و دماغ پہ خمار بن کر چھا گئی تھی۔ وہ ہر لباس میں اچھی معلوم ہوتی۔ امّاں جان دل ہی دل میں کڑھتی رہتیں اور سوچتی رہتیں ... کہ میں نے اتنی حسین لڑکی کو بہو بنایا، نہ وہ اتنی حسین ہوتی نہ جیب بُری طرح اس پہ ریجھتا۔ یہ بات تو ان کے قابو میں نہ تھی کہ رضیہ کا رنگ کبھی سیاہ ہو جاتا یا اس کی آنکھیں چھوٹی ہو کر گالوں میں دھنس جاتیں وہ جو کچھ کر سکتی تھیں صرف یہ تھا کہ رضیہ بہت زیادہ بنی سنوری نہ رہے تاکہ اس کی دلکشی میں غیر معمولی اضافہ نہ ہو۔ اس خیال کے پیشِ نظر انھوں نے ایک دن رضیہ سے کہا۔

"شریف گھروں کی بہو بیٹیوں کو بہت زیادہ بناؤ سنگار کرنا ٹھیک نہیں۔"

"صرف بہو یا بیٹیوں کو بھی؟"

"رضیہ!" امّاں جان آپے سے باہر ہو کر بولیں "تو بڑی زبان دراز ہو گئی ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں تیری زبان اب قینچی کی طرح چلنے لگی ہے۔"

"اور اس قینچی پر دھار آپ ہی رکھ رہی ہیں۔"

"دیکھو میں زیادہ باتیں پسند نہیں کرتی آج سے شادی کا کوئی بیا جوڑا نہیں نکالا ہوگی، اور کام کاج کے وقت بالکل معمولی کپڑے پہنو گی۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر امّاں جان!" اسی دن رضیہ نے دھلے ہوئے کپڑے پہن لئے اور غازہ بالکل نہیں لگایا، سُرخی یوں بھی وہ کم ہی لگایا کرتی تھی مگر اس دن بالوں میں کنگھی بھی نہیں کی، شام کو جیب آیا تو اُسے یہ سادگی اچھوتی اور تتلی کی سی قدرتی سادگی بہت پسند آئی، اس نے کہا۔

"رضیہ کتنی بھلی معلوم ہو رہی ہو تم، کاش ہفتہ میں ایک دن اسی روپ میں آجایا کرو۔"

"میں نے ارادہ کیا ہے روز ہی اس روپ میں نظر آیا کروں۔"

"یہ بھی کچھ بُرا نہیں، مورنی کو جنگل میں کون سنگار کرانے جاتا ہے پھر بھی وہ حسین ہی معلوم ہوتی ہے ——— مگر میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"پوچھئے"

"امّاں جان نے تو یہ حکم نہیں دیا تمھیں؟"

"وہ کیوں ایسا حکم دینے لگیں، آپ کو نہیں معلوم آپا جان کو وہ کیسا ہدایات کرتی رہتی ہیں اس سلسلے میں۔"

"وہ بیٹی ہیں ان کی اور تم بہو ہو ——— ماں جب بیٹی اور بہو پر حکومت کرتی ہے تو الگ الگ دو قانون بناتی ہے ——— بیٹی پر گویا قانون چلتا ہے اور بہو پہ کالا، ان دونوں میں بھی گورے کالے کا امتیاز باقی رہتا ہے۔"

"آپ سچ مچ گستاخ ہوتے جا رہے ہیں۔ ٹھیک ہی تو کہتی ہیں امّاں جان۔"

امّاں جان روز بروز چڑچڑی ہوتی جا رہی تھیں۔ داماد اُن کی بیٹی کے ساتھ جو تغافل برت رہا تھا اور اس کے مقابلے میں بیٹا اپنی بیوی کے ساتھ جس التفات، محبّت اور گرویدگی کا ثبوت دے رہا تھا اس نے امّاں جان کے دماغی توازن کو بگاڑ دیا تھا۔ وہ اب ہر معاملے میں غیر متوازن بنتی جا رہی تھیں بیٹے اور داماد ... یا بیٹی اور بہو پر جب وہ اظہارِ خیال کرتیں اس میں بڑی ناہمواری نظر آتی، عورتوں کے سامنے داماد کی تعریف وہ ہمیشہ ان عجز و اقری الفاظ میں کرتیں۔

"داماد ہو تو ایسا ہو بیوی جو کہہ دیتی ہے وہی کرتا ہے، کیا مجال جو اس کا کہنا ٹال دے۔"

اور بیٹے کی برائی کا موضوع یہ ہوتا۔

"جورو کا مرید ہو کر رہ گیا ہے، جو وہ کہتی ہے وہی کرتا ہے میری تو اب کوئی حیثیت ہی نہیں رہی۔"

ادھر بہو کو حکم تھا کہ معمولی کپڑوں میں رہے، بناؤ سنگار نہ کرے اور دوسری طرف بیٹی کو ذرا میلے کپڑے پہنے دیکھ لیتیں تو خفا ہو کر کہتیں۔

"شاہدہ تو بھنگن کیوں بنی رہتی ہے، خدا کے دیئے بیسیوں جوڑے موجود

ہیں وہ کس دن کے لئے رکھ چھوڑے ہیں، انوار تمھیں اس روپ میں دیکھ لے تو کیا کہے؟"

"وہ تو جس روپ میں دیکھتے ہیں ایک ہی بات کہتے ہیں، ان کی راے میں میں جامہ زیب نہیں ہوں۔ میرے جسم پہ کوئی کپڑا نہیں سجتا۔"

یہ سُن کر امّاں جان گہرے سوچ میں پڑ جاتیں۔ کیوں کہ خود اُن کے متعلق بھی ان کے شوہر کا یہی خیال تھا۔ وہ تو خیریت ہوتی کہ وقت اچھا تھا اس زمانے میں لوگ بیویوں میں خوبصورتی سے زیادہ سیرت کی نقاشی دیکھا کرتے تھے۔ اور اس پردے میں بڑی بڑی بدصورت عورتیں عمر بھر پلی رہتی تھیں مگر اب تو قدم قدم پر نگاہوں کو ٹھوکریں لگتی ہیں۔ یہ چھوٹی آنکھوں والی کالے رنگ کی بیویاں کب تک اپنے شریکِ حیات کی وفاداری کو آزماتی رہیں گی۔ امّاں جان بہت زیادہ رنجیدہ ہو جاتیں اور کبھی کبھی آنکھوں میں آنسو بھی آ جاتے۔ مگر اُن کے پاس کوئی علاج نہیں تھا، وہ بیٹی کو قیمتی کپڑوں میں لپیٹنے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکتی تھیں، لیکن وہ اندر ہی اندر جس قدر کڑھتیں اتنا ہی رضیہ کی مصیبتوں میں اضافہ ہوتا۔ وہ اس سے شاہدہ کی ناکامی کا بدلہ لیتی رہتیں۔ اور جب کبھی موقع ملتا داماد کے سامنے بیٹی کے ناک نقشے کی تعریفیں بھی کر دیا کرتیں جو زیادہ بدنما ہوتیں، وہ کہتیں:

"آنکھیں تو بس میری شاہدہ کی ہیں۔ چھوٹی ہیں تو کیا ہوا، چمک ان میں ایسی ہے کہ دل موہ لیتی ہے۔ اور ہونٹ بھی خدا رکھے بڑے رسیلے ہیں!"

امّاں جان رضیہ سے جس قدر بگڑتی گئیں جمیل اتنا ہی اُس پر متوجہ ہوتا گیا۔ گھر کا پورا کام رضیہ ہی کے سپرد تھا۔ امّاں جان آرام سے پلنگ پر بیٹھی رہتی تھیں۔ رضیہ اور تو سارے کام آسانی سے کر لیا کرتی تھی مگر جھاڑو دینے اور مسالا پیسنے میں اسے بڑی تکلیف ہوا کرتی تھی، گرد و غبار اُڑ کر ناک میں پہنچتا تو اس کا سانس گھٹنے لگتا اور ہاتھوں کی کھال ذرا کچی تھی، مرچیں سل پر رگڑتے وقت ہتھیلیوں میں آگ سی لگ جاتی، آنکھوں سے پانی بہنے لگتا۔ اور جب سے اس کی یہ کمزوری امّاں جان کے علم میں آئی تھی انھوں نے کہنا شروع کر دیا تھا۔

"رضیہ مرچیں ذرا زیادہ ڈالا کرو بغیر مرچوں کا سالن بالکل مٹی معلوم ہوتا ہے۔

میں چٹپٹی ترکاری کھانے کی عادی ہوں۔"

انھوں نے تین مرچیں بڑھانے کا حکم دے دیا۔ رضیہ کو اب مسالا پیسنے میں اور زیادہ تکلیف ہوتی۔ وہ مرچیں رگڑتے وقت ہاتھوں پر کپڑا لپیٹ لیا کرتی۔ ایک دن جمیل نے اُسے یوں مسالا پیستے دیکھا تو پوچھا۔

"کیا بات ہے ہاتھوں پر کپڑا کیوں لپیٹ رکھا ہے؟"

رضیہ اپنی تکلیف چھپانا چاہتی تھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے اور جمیل نے آپ ہی اس کے ہاتھوں سے کپڑا اُتار کر دیکھا۔ —— ہتھیلیاں بالکل سرخ تھیں اور جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھیں۔

"اس عالم میں بھی تم مرچیں پیستی ہو؟ —— امّاں جان کوئی نوکرانی ڈھونڈ دیجئے جلدی سے۔"

"نوکرانی؟" وہ چونک گئیں، "کیا ہوگا بیٹا؟"

"گھر کا کام کاج کرنے کے لئے۔"

"کہیں کی بادشاہت ہاتھ آ گئی کیا —— بہو بیٹیاں کس لئے ہوتی ہیں گھروں میں؟"

"وہ بھی اسی لئے ہوتی ہیں۔ لیکن جب کوئی مجبوری پیش آ جائے تو اس کا بھی تو کوئی حل ہونا چاہئے۔"

"کیا مجبوری ہے ایسی؟"

"ان کے ہاتھوں میں تکلیف ہے امّاں جان!"

"ایسی تکلیفیں سبھی کو ہوا کرتی ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنا گھر بار ہی لٹا دے۔ جانتے ہو ایک نوکرانی پر کیا خرچ ہوگا مہینے میں؟"

"کیا ہوگا؟"

"کم سے کم چالیس روپئے"

"اتنا خرچ میں آسانی سے برداشت کر لوں گا، آپ فکر نہ کریں، اگلے مہینے سے میری ترقی بھی ہو رہی ہے۔"

"لیکن ہمارے باپ دادا نے کبھی نوکرانی نہیں رکھی تھی۔"

"انھوں نے دفتر میں کلرکی بھی تو نہیں کی تھی۔"

"میں نوکرانی کا گھر میں آنا اچھا نہیں سمجھتی۔"

"کیوں؟"

"چال چلن پر اثر پڑتا ہے بہو بیٹیوں کے۔"

"اس کی آپ بالکل پروا نہ کیجئے، میں آپ سمجھ لوں گا۔"

"اور بھی بہت سی باتیں ہیں بیٹا، جس چیز پر نوکرانیوں کی نگاہ پڑ جاتی ہے وہ انگ نہیں لگا کرتی، اِدھر برکت اٹھ جاتی ہے گھر کی۔"

"ان باتوں کو بھی چھوڑیئے برکت تو اسی دن اُٹھ گئی جب بڑوں نے چھوٹوں کا خیال چھوڑ دیا، اور ابھی غذا نوکرانی کو نہیں شبیر کو بھی دکھا کر کھایئے تو وہ اپنا اثر ضرور دکھاتی ہے۔ اور مصنوعی گھی میں پکی ہوئی چیزوں پر نوکرانیوں کی نظر بھی نہ پڑے تو بھی وہ انگ نہیں لگ سکتیں۔"

"میں تیرے منہ کہاں تک لگوں، بس ایک بات کہے دیتی ہوں، نوکرانی اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکے گی جب تک میں زندہ ہوں۔"

"اور میری آرزو ہے کہ آپ کی زندگی ہی میں ہمارا معیارِ حیات اتنا اُونچا ہو جائے کہ وہ کم سے کم ایک نوکرانی کا بوجھ سنبھال سکے۔"

اگلے دن نوکرانی آگئی۔ اس نے سب کام سنبھال لیا۔ جھاڑو سے لے کر روٹی پکانے تک کی پوری ذمہ داری اسی پر ڈال دی گئی، اماں جان اپنی جگہ کڑھتی رہیں اور ایک وقت انھوں نے کھانا بھی نہ کھایا لیکن اس طرح وہ زندگی کے بڑھتے ہوئے دھارے کو روک نہ سکیں۔ مجبور ہو کر پندرہ روز بعد انھوں نے حبیب سے کہا۔

"شاہدہ کی طبیعت خراب ہے بیٹا۔"

"کیا بات ہے؟"

"سُنا ہے شام کو طبیعت گر جاتی ہے۔"

"یہ تو کوئی نئی بات نہیں۔ پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا ہے۔" حبیب نے اُن کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

"پہلے کی بات اور ہے، سب باتیں عمر سے تعلق رکھتی ہیں۔ اب ماشاءاللہ اس کی عمر تیس سے اوپر ہو چکی ہے۔ بدن میں وہ طاقت اور ہڈیوں میں کس بل نہیں رہا۔"

"پھر انھیں جوان کیوں کر بنایا جائے۔"

"میں چاہتی ہوں اس کے آگے بھی ایک نوکرانی ہو!"

"بالکل نہیں اماں جان، ایک گھر ہی اس نحوست سے بچا رہے تو غنیمت ہے۔ پھر بھائی جان ویسے ہی ایک ہڈی کے آدمی ہیں نوکرانی کا دیکھا ہوا کھانا ان کے انگ نہ لگا تو بڑی مصیبت ہو گی۔"

"ارے ہر بات کی عادت ہو جاتی ہے۔"

"آپ جانئے پھر میں بھائی جان سے کہہ دوں گا کہ نوکرانی رکھ لیں مگر ان کا خیال ہے کہ عورتیں گھر کا کام کرتی رہتی ہیں تو تندرستی ٹھیک رہتی ہے۔"

"انھیں میں نے رضامند کر لیا ہے۔"

"پھر اب سوچنا کس بات کا، نوکرانی ضرور رکھ لینی چاہئے۔"

"تنخواہ کا کیا ہو گا؟"

"یہ بات بھائی جان سے پوچھنے کی ہے۔"

"نہیں اس کا تعلق تم سے اور مجھ سے ہے۔"

"آپ سے ہو گا مجھ سے تو بالکل نہیں ہے۔"

"میں اور تو الگ الگ نہیں ہیں۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے، پھر کیا چاہتی ہیں آپ؟"

"تنخواہ اسے بھی تم ہی دو گے!"

"بہت اچھا ضرور دوں گا۔"

نوکرانی کے آجانے سے رضیہ کو کئی قسم کا آرام ملا، اوّل تو وہ کام پورا کرتی رہی دوسرے اماں جان کا غصّہ بھی اکثر اسی پر اترنے لگا۔ وہ بات بات پر اس سے اُلجھتیں، بُرا بھلا کہتیں وہ اسی قسم کے جواب دیتی، امّاں جان کو محسوس ہونے لگا کہ عورتوں کے بھی زبان ہوتی ہے۔ وہ بھی بات کا جواب دینا جانتی ہیں۔ ایک دن جب نوکرانی ان کے لئے گرم دودھ کا پیالہ لے کر آئی نجانے کس کی غلطی سے ہاتھ ہل گیا اور دودھ اماں جان کے اوپر گر گیا۔ بس پھر کیا تھا ایک قیامت ہی تو آگئی۔

"تو اندھی ہے!" وہ کڑک کر بولیں

"نہیں تو اندھی ہے" نوکرانی نے کہا۔

"تیری آنکھوں پر چربی چھا گئی ہے!"

"اور تیرا دماغ چل گیا ہے۔"

"میں تیری چٹیا کاٹ لوں گی"

"اور میں تیری جیب پکڑ کر کھینچ لوں گی گدی سے!"

نوکرانی نے ہر بات کا نہایت معقول جواب دیا۔ جس وقت یہ مناظرہ ہو رہا تھا۔ رضیہ غسل خانے میں تھی وہ جلدی جلدی بدن پونچھ کر گیلے بال شانوں پر بکھیرے دوڑتی ہوئی آئی۔ اماں جان نے اُسے دیکھتے ہی ایک جوتا پھینک کر مارا جو رضیہ کی پیشانی پر لگا پھر بولیں۔

"یہ تیری کون ہے؟"—— ان کا اشارہ نوکرانی کی طرف تھا "دادی نانی، آخر کون ہے بتا تو سہی؟"

"کوئی بھی نہیں امّاں جان۔" رضیہ نے پیشانی سہلاتے ہوئے کہا۔

"پھر تو نے اسے کیوں اتنا سر چڑھا رکھا ہے؟"

"سر تو آپ نے چڑھایا ہے آج، میں نے کہاں چڑھا رکھا ہے۔"

"آج سے یہ گھر میں نہیں آئے گی —— میں اب اس کی صورت نہیں دیکھوں گی۔"

رضیہ بولی: "اپنے بیٹے سے کہئے گا شام کو، میں کیا جانوں؟"

"اسے تو سب کچھ جانتی ہے —— میرا بیٹا اب تیرا شوہر ہے۔"

شام کو یہ معاملہ حبیب کے سامنے پیش ہوا تو اس نے ذرا دیر چپ رہ کر کہا۔

"اب پتہ چلا امّاں جان کہ ہمارے باپ دادا کیوں نوکرانیاں نہیں رکھتے تھے۔ تھے بے چارے بہت شریف، رکھتے تو ہماری دادی، نانی کو گالیاں کھانی پڑتیں۔ میں اس نوکرانی کو تو ابھی الگ کر دوں گا، مگر دوسری اس کی جگہ ضرور آئے گی اور مجھے اندیشہ ہے کہ اس سے آپ کی زیادہ لڑائی ہوگی۔"

"میں کہتی ہوں تم شاہدہ کی نوکرانی بلا لو ان کے یہاں کوئی اور آ جائیگی۔"

"لیکن وہ جوان عورت ہے اماں جان۔ شاید آپ چاہتی ہیں کہ اس کی موجودگی سے شاہدہ آپا کو جو خطرہ پیش آیا ہے اسی سے رضیہ کو دوچار ہونا پڑے۔"

"کیا خطرہ پیش آیا ہے اسے، خدا نہ کرے جو اسے کوئی خطرہ پیش آئے۔ اس کے دشمنوں کو آئے، برا چاہنے والوں کو آئے اس کے۔"

"مصیبت یہ ہے کہ انہیں کو آگیا۔ سن رہا ہوں بھائی جان اپنی ملازمہ کو بیوی بنانے کی فکر میں ہیں۔"

"دیکھ ذرا چونچ بند رکھ اپنی!"

"میں بند بھی رکھوں تو کیا ہوتا ہے۔ آپ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ نوکرانی بہت منحوس چیز ہے اس نے دونوں جگہ یہ نحوست پھیلائی، یہاں آپ کی عزت لی اور وہاں آپا جان کی جگہ لینے کو تیار ہے۔"

اماں جان رونے لگیں اور حبیب نے اسی وقت نوکرانی کو الگ کر کے انوار کو پیغام بھیجا کہ اپنی نوکرانی کو یہاں بھیج دیجئے آپ کوئی اور رکھ لیجئے۔

وہاں سے جواب آیا کہ میری نوکرانی آپ کے یہاں نہیں آ سکتی، آپ چاہیں تو اپنی بہن کو بلا سکتے ہیں۔

امّاں جان بیٹے اور بہو دونوں سے ناراض رہنے لگیں بلکہ اب داماد سے بھی خفا ہو گئیں کیونکہ وہ نوکرانی کی جگہ شاہدہ سے کام لے رہا تھا اور شاہدہ کی جگہ نوکرانی سے۔ ناراضی کے ساتھ ہی ان کی کمزوری اور بیماری بڑھتی گئی حبیب پوری توجہ سے ان کا علاج کراتا رہا، تیسرے دن طاقت کے انجکشن لگتے روزانہ پھلوں کا رس اور چکن ایسنس پلایا جاتا۔ لیکن وہ پرہیز کی قائل نہیں تھیں۔ انھیں چیزوں کے ساتھ اپنی پسندیدہ ترکاریاں مثلاً کریلے، بینگن اروی کی دال بھی کھائے جا رہی تھیں۔ نئی نوکرانی آ چکی تھی اور امّاں جان کی اس سے خوب نبھ رہی تھی۔ اول تو وہ سب کے سامنے قسم کھا کر کہتی تھی۔ کہ امّاں جان نے کھانا بہت کم کھایا ہے۔ دوسرے رضیہ کی چغلیاں خوب کھاتی تھی۔ اور یہ دونوں کام امّاں جان کو بہت پسند تھے۔ رضیہ پر ان کی ناراضی میں اضافہ ہوتا گیا تھا۔ اور روز ہی سوتے وقت وہ کہہ دیا کرتی تھیں کہ جی چاہتا ہے کچھ کھا کر سو رہوں، کئی دن سے امّاں جان بالکل گم سم تھیں۔ گھر کے سب آدمیوں سے بولنا چھوڑ دیا تھا۔ کئی مرتبہ کھانا پینا بند کرنے کا ارادہ کر کے اس میں ناکام ہو چکی تھیں۔ امّاں جان میں جہاں اور بہت سی خوبیاں تھیں ایک یہ بھی تھی کہ وہ بھوک کی بہت کچی تھیں۔ ایک روز انھوں نے کھانا لوٹا دیا اور صاف کہہ دیا کہ اب میں اس گھر کی کوئی چیز نہیں کھاؤں گی۔ میرے نام کا رزق یہاں سے اٹھ چکا ہے۔ رضیہ جانتی تھی کہ یہ ارادہ پورا ہونے والا نہیں ہے وہ نہ چاہتی تھی کہ رات کو انھیں کھانا ڈھونڈنے میں مشکل پیش آئے اس لئے چپکے سے نوکرانی سے کہہ دیا کہ ان کا کھانا ڈھانک کر باورچی خانہ میں رکھ دو اور گھر چلی جاؤ، کیوں کہ اماں جان نے جوں توں کر کے دن گذار لیا تھا اور خیال تھا کہ رات کو وہ صبر نہ کر سکینگی۔ کسی وقت بستر سے اٹھ کر کھانا ضرور کھائیں گی اور صبح کو اعلان ہو جائے گا کہ بلی کھا گئی۔ نوکرانی کھانا رکھ گئی اور جب سویرے ہی وہ آئی تو رضیہ کو اطلاع دی کہ رات کا کھانا غائب ہے۔ برتن بالکل صاف ہیں۔ کیا امّاں جان نے کھا لیا تھا۔ امّاں جان نے اسے باتیں کرتے دیکھ کر انداز سے سمجھ لیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے بولیں۔

"کہ میں رات کو برتن سنگوا کر نہیں گئی تھی کیا؟"

"نہیں امّاں جان میں تو —— چیزیں بند کر کے گئی تھی۔"

"جھوٹی ہے تو —— رات بھر بلی نے کھڑ بڑ کی ہے۔"

"بلی نے؟" — کرمین نے پوچھا

"اور کیا میں نے؟"

"لیکن بلی نے دودھ بھی تو پی لیا — دودھ تو کم پیا ہے وہ بالائی سب چاٹ گئی ہے۔"

"کیا ہوا ضرور پی لیا ہوگا۔"

"مگر دودھ تو بند کرکے گئی تھی نعمت خانہ میں، خوب کس کر زنجیر لگا دی تھی اور کنڈے میں لکڑی بھی ٹھونس دی تھی۔"

"پھر رضیہ اٹھی ہوں گی رات کو!"

"کون ہیں اماں جان؟"

"ہاں تم اور کون؟ — بس دو ہی بلیاں تو ہیں اس گھر میں، ایک میں دوسری تم!"

امّاں جان اس تحقیق سے بہت زیادہ بگڑ گئی تھیں پھر بھی الزام تنہا اپنے سر نہ لینا چاہتی تھیں وہ منہ سجا کر پلنگ پر پڑ رہیں اور ایک پڑیا جو نہ جانے کہاں سے اُن کے ہاتھ لگ گئی تھی احتیاط سے دوپٹے کے پلو میں باندھ لی۔ رات کو اُسے کھول کر سرہانے رکھ لیا اور تکیہ پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ ذرا دیر بعد بولیں۔

"کرمین کیا پکایا ہے؟"

"کریلے پکائے ہیں اماں جان، بھرے ہوئے!"

"کیا بھرا ہے؟ — چنے کی دال؟"

"جی نہیں، قیمہ اور پیاز ہے!"

"ذرا سی چنے کی دال کیوں نہ ملا لی تھی"

"کیا کرتی آپ کو تو کھانے ہی نہ تھے؟"

امّاں جان نے پڑیہ سرہانے سے اٹھا کر پھر پلو میں باندھ لی اور بولیں۔

"کرمین میرے لئے کھانا لے آ"

"مونگ کی دال پکی ہے آپ کے لئے"

"نہیں میں کریلے ہی کھاؤں گی، مونگ کی دال کھانے سے تو یہی اچھا ہے کہ آدمی زہر کھا کر سو رہے۔"

امّاں جان نے پیٹ بھر کر کھانا کھا لیا اور چادر تان کر آرام سے سو گئیں

اگلے دن پھر یہی صورت پیش آئی۔ اس دن بینگن پکے تھے۔ تقریباً روز یہی ڈرامہ ہوتا رہا۔ پندرھویں دن پڑیہ تکئے کے نیچے رکھتے ہوئے انھوں نے اعلان کر دیا۔ کہ آج وہ کھانا بالکل نہیں کھائیں گی۔ طبیعت بہت زیادہ خراب ہے۔ ممکن ہے کہ صبح کو وہ زندہ ہی نہ اٹھیں۔ انھوں نے وصیّت کے طور پر رضیہ کو دو چار باتیں بھی بتا دیں۔

"رضیہ! — دیکھ میں مر جاؤں تو حبیب کے ماموں کا قرضہ سب دے دینا۔ سو روپے سے اوپر ہی ہوں گے۔"

"اور میرے کپڑے بھی کسی غریب کو دے ڈالنا۔"

"اور یہ کڑے؟ — انھوں نے کلائی میں پڑے ہوئے سونے کے کڑے کو گھماتے ہوئے کہا۔

"یہ میں رکھ لوں گی امّاں جان!"

"آئی بڑی رکھنے والی، یہ شاہدہ کی امانت ہے — تیرے لئے قرضہ کی ایک اور فہرست رکھ چھوڑی ہے میں نے۔ دو، دو۔ چار چار کر کے دیتی رہنا — یہ کہہ کر امّاں جان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں جیسے واقعی وہ رات ہی کو کسی وقت رخصت ہو جائیں گی۔ رضیہ جانتی تھی باورچی خانہ میں ارہر کی دال کے علاوہ کوئی اور ایسی چیز نہیں ہے جو امّاں جان کی موت کو پیچھے دھکیل سکے۔ اس نے کرمین کو بازار بھیج کر ایک پلیٹ بریانی، اور ایک پلیٹ مرغ کا گوشت منگا لیا — اور چپکے سے نعمت خانہ میں بند کرا دیا۔ کرمین یہ کام کر کے اُن کا سر دبانے بیٹھ گئی۔

"تیرے ہاتھ میں خوشبو آ رہی ہے کرمین — یہ بریانی کیا آگئی ہے کہیں سے۔"

"ابھی بازار سے لائی ہوں۔"

"کیوں؟"

"نہ جانے کیوں منگایا ہے!"

یہ رات بھی اماں جان نے خیریت سے گذار لی۔ لیکن کھانا پھر بلی کھا گئی۔ اب وہ پڑیہ تو اماں جان کے پاس ہے مگر پلو سے کھولنے کی نوبت نہیں آتی۔ روز ہی ان کے حسبِ پسند کھانے پک جاتے ہیں اور وہ مجبوراً جئے جا رہی ہیں۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ نوکرانی کا دیکھا ہوا کھانا انگ نہ لگتا ہو۔ دیکھنے میں وہ پہلے سے فربہ معلوم ہوتی ہیں۔



منی پوری لوک ناچ کی کلاکار

جسونت سنگھ کے



فرار





مخلوقِ مجبور

ہلاکِ خ

فنی شاہکار



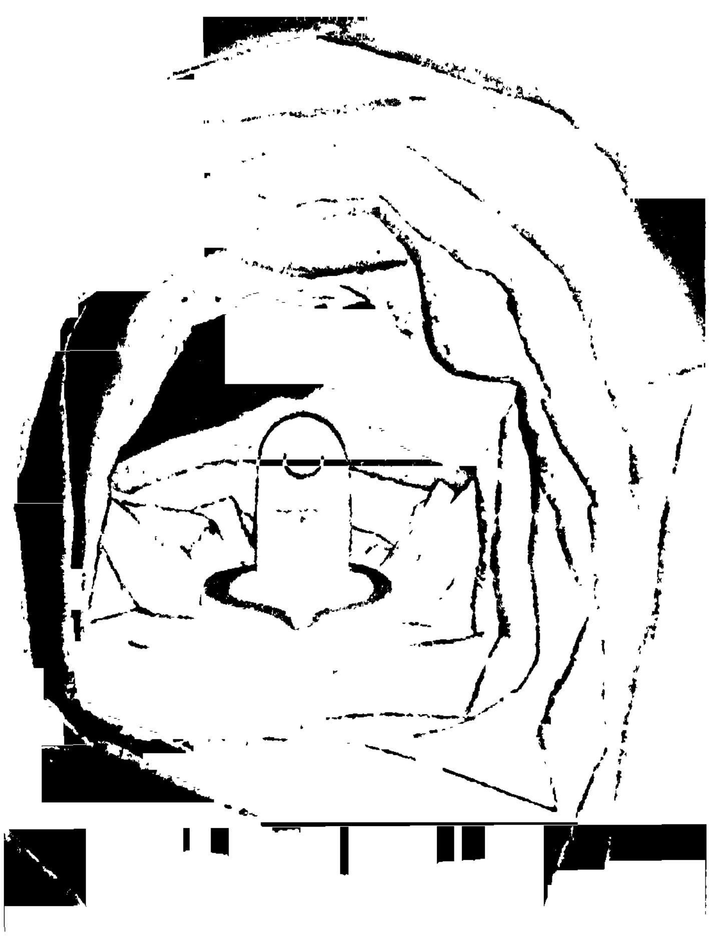
ماضی



گلِ نغمہ



فطری



راگ بھرو



اُماشنکرشاؔداں گوالیاری
آپ کے باب میں ساغر زیدی
کا مضمون صفحہ ۱۳۱ پر مُلاحظہ فرمائیں

ٹیڑھی گڑھوال کی ایک دوشیزہ



سکندر علی وجد

حیدرآباد

فضا جاں فزا، ذرّہ ذرّہ حسیں ہے — حقیقت میں ملکِ دکن گل زمیں ہے
ہر اک نقشِ تہذیب جو دل نشیں ہے — دلِ حیدرآباد اس کا امیں ہے
اگر مہر و الفت کی جنّت کہیں ہے — تو بے شک یہیں ہے یہیں ہے یہیں ہے
عروسِ وفا، ہوش آیا ہے جب سے — ترا آستانہ ہے میری جبیں ہے
زمانہ دل آزار ہے بھی تو کیا غم — مجھے تیری دل داریوں کا یقیں ہے
ترے لطف کا معجزہ ہے کہ میری — زباں گل فشاں ہے سخن آتشیں ہے
نفاست برستی ہے دیوار و در سے — تری خاک میں نکہتِ یاسمیں ہے
تری یاد یادِ وطن سے ہے خوش تر — ترا ذکر تسکینِ قلبِ حزیں ہے
بہشتِ نظر، مرغزارِ غزالاں — ہوا تیری موجِ مئے و انگبیں ہے

بہت خوش نما شہر دیکھے ہیں میں نے
مگر تیرا جادو کہیں بھی نہیں ہے

من موہن تلخ

صاحبِ اسلوب مصوّر

جب باہر کی ویرانیاں دل کی ویرانیوں کے ساتھ مقابلے پر اُتر آتی ہیں۔ جب بقول استاد علاؤ الدین خاں[1] سُر کے اندر تو سُر گونجے لیکن باہر آتے آتے آدھا رہ جائے۔ جب تنہائیوں کا یہ عالم ہو کہ پچاس پچاس میل کے فاصلے پر کوئی اپنا نظر نہ آئے۔ ایسے عالم میں جینے والا شخص اگر کبھی کبھار کی تعریف پر رو پڑے تو کیا عجب ہے۔ جسونت سنگھ کا بھی یہی عالم ہے۔ اپنے منہ پر تعریف سُن کر اُن کا یہ حال ہو جاتا ہے گویا زمین میں گڑ جائیں گے۔ جسونت سنگھ کو مصوّری نہ ورثے میں ملی ہے نہ کسی گورو کی دین ہے۔

جب وہ اسکول میں پڑھتے تھے تو ڈرائنگ کے مضمون میں بے حد دلچسپی لیتے تھے۔ چودہ پندرہ برس کی عمر میں جسونت سنگھ نے فنِ مصوّری کی مشق شروع کر دی تھی۔ دوسرے فن کاروں کی تصویروں کو سامنے رکھ کر تصویریں بنانے لگے۔ ایامِ تعلیم میں جیب خرچ کے لئے گھر سے جو پیسہ ملتا اُسے رنگ اور برش خریدنے کے کام میں لایا کرتے۔ جب شوق کی دستکیں بڑھیں تو گھر سے باہر نکل کر کھیتوں میں بیٹھنے اور حسنِ قدرت کی عکاسی کرنے لگے۔ ابھی مشکل سے زندگی کی بیس بہاریں بھی نہ دیکھی تھیں کہ گھر کے حالات ناگفتہ بہ ہو گئے اور جسونت سنگھ روزی کمانے کے لئے راولپنڈی سے لاہور چلے آئے اور کمرشل آرٹ شروع کر دیا۔ ایک عرصے تک لوگوں کی دکانوں کے لئے بورڈ لکھے۔ مصنفوں کی کتابوں کے سرورق تیار کئے۔ دربدر دھکے کھائے۔ قدم قدم پر اُن کی دل شکنی کی گئی۔ لیکن دل میں جو آگ سُلگ رہی تھی اُس کو کسی طرح بجھنے نہیں دیا اور سب سے بڑا کمال یہ کیا کہ خود بھی اُس آگ میں جل کر راکھ ہونے کے بجائے کُندن ہو گئے۔ دن بھر اپنے چھوٹے سے اسٹوڈیو میں بیٹھے کمرشل آرٹ میں مصروف رہتے اور ساری ساری رات جاگ کر جو کچھ چشمِ تخیّل کو سوجھتا اُس میں رنگ بھرتے رہتے۔ جسونت سنگھ نے بہت صبر آزما زندگی بسر کی ہے۔ زندگی کی کشمکش انھیں کہاں کہاں لے گئی۔ لیکن دلِ حسّاس جس منزل کے لئے تڑپ رہا تھا اُس کی راہ پر گامزن رہا۔ راولپنڈی میں تھے تو سردار سجان سنگھ لائبریری میں جا کر اساتذۂ مصوری کے شاہکار دیکھا کرتے اور من ہی من میں سراہا کرتے۔ لاہور پہنچے تو خیر — لاہور میں کب کسی چیز کی کمی واقع ہوئی ہے۔ سنگیت، شاعری، مصوّری سبھی کچھ وہاں موجود ہے اور تھا۔ جسونت سنگھ کی نگاہِ تیز نے اپنا مرکز ڈھونڈنا شروع کیا۔ اور لاہور سے انھیں بہت کچھ ملا۔ جسونت سنگھ کی زندگی پر لاہور اور کلکتہ دونوں شہروں نے بہت اثر ڈالا۔ سرزمینِ بنگال کو ہم بجا طور پر سرچشمۂ علم و تمدّن کہہ سکتے ہیں۔ وہاں فنونِ لطیفہ کے ایک سے ایک استاد موجود ہیں۔ ۱۹۳۹ء میں جب جسونت سنگھ کلکتہ پہنچے تو وہاں آتشِ شوق اور بھڑکی اور اُس شوق کے اظہار کی انھیں بہت سی راہیں ملیں۔ کیونکہ اُسی زمانے کی بات ہے جب جسونت سنگھ نے واٹر کلر کی بجائے آئل پینٹنگ شروع کی۔ راولپنڈی اور لاہور میں جسونت سنگھ کو اردو اور پنجابی زبان کے ممتاز ادیبوں کی صحبت حاصل تھی اور کلکتہ میں آکر سنگیت بھی اُن کی زندگی میں داخل ہو گیا، گویا سونے پر سہاگہ۔

جہاں آنکھ کے دیکھے ہوئے عالم کو زبان ادا کرنے سے قاصر ہو جاتی

---

[1] ہندوستان کے عظیم صوفی منش سرود نواز

ہے وہاں سے فنِ مصوّری کی حدیں شروع ہوتی ہیں۔ جسونت سنگھ کو نگہِ انتخاب اور پیرایۂ اظہار تو شعراء و اُدبا حضرات کی محبت نے دیا لیکن کسی چیز کے اظہار سے پہلے جو سادھنا اور تپسیا درکار ہوتی ہے وہ انہیں سنگیت نے دی۔

تان سین کے بارے میں ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تان سین ایک بار شہنشاہ اکبر کے ہمراہ کشتی میں بیٹھے دریائے جمنا کی سیر کر رہے تھے۔ اکبر نے تان سین سے پوچھا کہ "تان سین سنگیت کی دُنیا میں تمہارا کیا رُتبہ ہے؟" تان سین نے دریا میں ہاتھ ڈالا اور پھر دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پہ پانی کا ایک قطرہ ٹپکاتے ہوئے بولے۔ "ظلِّ سبحانی۔ شاید اتنا بھی نہیں ہے۔" کہنے کو تو تان سین اتنا کہہ کر چُپ ہو گئے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر تان سین بوند برابر بھی نہیں تھے تو وہ دریا کیا تھا۔ فن کار کے اس انکسار کا جواب انسان کا دماغ ازل سے ڈھونڈ رہا ہے۔ فلسفیوں نے کتابوں کے انبار لگا دیئے ہیں خیر ہمیں اس قطرہ و دریا کی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن تان سین کے جواب سے ایک راز کھلتا ہے اور وہ یہ کہ انسان کے اندر وحدت کتنی ہے اور فن کار کی تو غالباً تکمیل ہی اسی میں ہے کہ وہ وحدت کے سمندر میں اپنے آپ کو تحلیل کر دے۔ جسونت سنگھ کے اندر کتنی وحدت ہے اس کا اندازہ اُن کی تصویر "راگ بھیرو" دیکھنے سے ہوتا ہے۔ اور اس حقیقت سے کس کو انکار ہے کہ جس نے سُر پہچان لیا اُس نے سب کچھ پہچان لیا۔

حال ہی میں جسونت سنگھ نے پہلی بار دہلی میں اپنی تصویروں کی نمائش کی۔ تمام تر تو نہیں تاہم بیس برس کے ریاض کی کچھ جھلک ہمیں ملی۔ رنگوں کے امتیاز اور اُن کی آمیزش پر جس قدر قدرت جسونت سنگھ کو حاصل ہے بہت کم لوگوں کو یہ کمال نصیب ہوا ہے۔ رنگوں کی زبان میں بات کرنا اور اس انداز سے کہ وہ بات بھی جانی پہچانی نظر آئے اور اُس میں آرٹسٹ کی شخصیت بھی نظر آئے جان جوکھم کا کام ہے۔ یہ وہ معراج ہے جس کے متعلق کبیر کہہ گئے ہیں کہ دلی کو یُوں وصال نصیب ہوتا ہے جیسے آئینے سے نگاہ پلک کے نکل جائے اور آئینہ منہ دیکھتا رہ جائے۔ جسونت سنگھ کی کئی تصویروں میں کچھ ایسی ہی کیفیت کسی ایسے ہی عالم کی غمازی کرتی نظر آتی ہے۔ رنگوں کی پرکھ اور استعمال کے متعلق میں آگے جا کر کچھ بیان کروں گا۔ فی الحال میں جسونت سنگھ کی اُن تصویروں کا ذکر کروں گا جن میں وحدت و کثرت کے جلوے آنکھوں کو چکا چوند کر دیتے ہیں۔ اُن کی تصویر "ابدیت" دیکھنے والے کو جکڑ کے رکھ لیتی ہے۔ کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر ایسا عالم واقعی نظر آ جائے تو آدمی ٹھٹک ٹھٹک جائے وہ تصویر ہے کیا! محض یہی تو کہ کچھ ایسی چٹانیں بھرپور سیاہی لئے ہوئے ہیں جن سے انکار ممکن نہیں اور اُن کے پیچھے سے سورج کی شعاعیں یوں لپک رہی ہیں جیسے ابھی تصویر سے باہر نکل پڑیں گی اور آپ کو اپنی لپیٹ میں لے کر بھسم کر دیں گی۔ لیکن جس آگ نے جسونت سنگھ سے یہ تصویر بنوائی ہے وہ بھسم کرنے والی نہیں ہے زندگی عطا کرنے والی ہے اور تمام دُکھ درد کے باوجود جسونت سنگھ کے ہاں بے پناہ زندگی ہے جو اُمڈتی ہوئی نظر آتی ہے "راگ بھیرو" جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں جسونت سنگھ کی پرستش کی بھرپور آئینہ دار ہے ایک گپھا جس میں شو مہاراج اپنا دھیان اور گندھار سے براجمان ہیں۔ گپھا کے پیچھے نور پھوٹ رہا ہے۔ اُس نور کی جگمگاہٹ میں ایک چٹان سی نظر آتی ہے گویا ساتوں سُر ٹھیک لگے ہیں۔ شو کے متعلق ہندوستان کے کسی مصوّر نے طبع آزمائی نہیں کی۔ جسونت سنگھ کی تصویر "شو" دیکھ کر رابندر گھوش کی نظم "شو" کی آخری لائن یاد آ جاتی ہے One must Foresee, Dread and dare

یہ تمام تصویریں جسونت سنگھ نے چٹانوں کے روپ میں تیار کی ہیں چٹانوں کا ذکر آیا ہے تو یہاں جسونت سنگھ کی اُن بے شمار تصویروں کا ذکر لازم ہو جاتا ہے۔ جن میں انسانی فطرت کی جھلک ملتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں اُن تصویروں کے متعلق کچھ کہوں یہ بتانا بہت ضروری ہے کہ جسونت سنگھ اس شدّت سے چٹانوں کی جانب کیوں کھنچے ہیں۔ جیتے جاگتے ہنستے بولتے انسانوں کے پہلو میں پتّھر جیسا دل دیکھ کر فن کار کی آنکھ اس عقدے کو وا کرنا چاہتی ہے۔ شاعر کو اس معاملے میں بہت آسانی ہے کہ شکوہ کر لیا اور پھر چین مل گیا۔ لیکن مصوّر کیا کرے چٹانیں جسونت سنگھ کے لئے صرف بے حسی اور سرد مہری کی علامتیں ہی نہیں ہیں۔ ان میں حُسنِ فطرت بھی بکھرا پڑا ہے۔ اور کوئی کوئی پتّھر تو واقعی اپنے اندر انسانی کردار سموئے ہوئے ہوتا ہے آئیے دیکھئے پتّھر کن کن کیفیتوں کا حامل ہوتا ہے۔ سنّاٹا، بے حسی، طاقت، چُپ لیکن بُلوانے والا چاہیئے پتّھر بولتے ہیں۔ پتّھروں میں کیا نہیں ہوتا۔ پتّھروں میں شو ہوتا ہے۔ جسونت سنگھ کی تصویر "ہلاکِ خودی" میں پتّھر اس شدّت سے بول رہا ہے کہ ہم ایسے کتنے ہی نظر بے خودی رہائی پا لیتے ہیں۔ پتّھر کی صورت میں ایک منجمد و ساکت اور نہ ٹوٹنے والا انسان اپنے آپ میں لپٹا لپٹایا کھڑا ہے۔

اور جسونت سنگھ نے اُسے کہاں لا کھڑا کیا ہے۔ دیکھنے کی تو یہی چیز ہے! تا حدِ نظر لامکانی ہی لامکانی ہے۔ کچھ ایسی سطح ہے جیسے پانی اور زمین آپس میں گھل مل گئے ہوں۔ تنہائی واقعی اپنی انتہا پہ پہنچ کر رُک گئی ہے اور یہ تصویر تو کچھ ایسی ہے جیسے کیٹس پکار پکار کے کہہ رہا ہو سے

Then on the shore of the wide world
I stand alone, and think
Till love and fame to Nothingness do sink

جسونت سنگھ کی تصویروں میں ایک فلسفہ کارفرما ہے اور اُس فلسفے کی شرح خود جسونت سنگھ کی تصویریں ہیں۔ "مخلوق مجبور" میں کچھ صورتیں ردّی ہوئی اور بگڑی ہوئی یوں اُبھر آئی ہیں جیسے کچھ سوالیہ نشان حرفِ غلط کی مانند آسمان کی طرف لپک رہے ہوں۔ یہاں ان گونگے پتھروں کی قوتِ گویائی کچھ ایسی ہے کہ منہ میں زبان رکھنے والوں کو چُپ لگ جائے "ماضی" بھی ایک ایسی ہی تصویر ہے جس میں ہم سب بیٹھے اپنا دُکھ درد سہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تصویر میں خراب در محراب ایک ویران خلا ہے۔ بام کی دیواروں کی پپڑیاں اُتر چکی ہیں۔ یہ تصویر کچھ ایسی ہے جیسے بے شمار گنبد بے در گونج گونج کے خاموش ہو گئے ہوں۔ اور دیکھنے والوں کو وہ کہے بتاتے ہوں کہ ماضی سب کا ہے اور کسی کا نہیں، جو اس میں گم ہو کے رہ جائے وہ کہیں کا نہیں رہتا جو اس کا تعاقب کرے وہ کہیں نہیں پہنچا۔

لیکن یہ اُداسیاں، ویرانیاں، یہ تنہائیاں، یہ تحیّر، کوئی موت کی پرستش نہیں ہے۔ ان کے پیچھے زندگی کی بے شمار لکیریں کارفرما ہیں۔ جسونت سنگھ کچھ کر گزرنے والوں میں سے ہیں۔ اور کر گزرنے والا شخص کبھی موت کی دعائیں نہیں مانگا کرتا۔ جسونت سنگھ حسنِ فطرت کے شیدائی ہیں۔ سنگیت اُن کی سادھنا کا بہت بڑا ذریعہ ہے اور یہ سنگیت ہی کی دین ہے کہ جسونت سنگھ نے اپنی تصویروں میں خوب خوب سُر جگائے ہیں۔ یہاں رنگوں کا ذکر لازم ہے رنگوں کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اُن میں جمال و جلال ہوتا ہے۔ بے پناہ وسعتیں اور کیفیتیں ہوتی ہیں۔ جسونت سنگھ رنگوں کی تلوّن کیشی سے خوب خوب آشنا ہیں۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس جس کیفیت کو Sun-Fullness کہتے تھے وہ جسونت سنگھ کی تصویروں میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ کچھ تصویریں تو ایسی ہیں جو محض رنگوں کے مختلف اثرات لئے اُجاگر ہو گئی ہیں۔ تکنیک کے بیسیوں پہلو ہیں اور ہر پہلو کے بیسیوں رُخ ہیں۔ تکنیک اُس چابک دستی کا نام ہے جس کا استعمال عمر بھر کے ریاض سے پہلے نہیں آتا۔ تکنیک پر عبور حاصل کرنے کے بعد ہی فن کار کچھ اپنی بات کہتا ہے۔ اور تکنیک کی سب سے بڑی کامیابی جو ہوتی ہے اُس کا نام ہے سادگی۔ اور جسونت سنگھ کی تصویریں ہیں جو حقیقت کو حیرت کر دیتی ہے وہ یہی ہے کہ جس چابک دستی کے ساتھ یہ بلا کا فن کار اپنی بات کہہ جاتا ہے اُس میں انکار کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ موج ہوا کے ساتھ کچھ اڑتے ہوئے پتے، برف سے ڈھکی چوٹیاں، ابر آلود آسمان، برف سے ڈھکا چھپا ایک چھوٹا سا ڈاک بنگلہ — یا اُن کی تصویر "اکیلا" — اپنے اندر بے کراں وسعتیں سموئے ہوئے ہے۔ اسلوب ایک ایسا روگ ہے جس نے پال لیا پھر وہ تمام عمر اُسے اپنے خون سے سینچتا ہے اور شدت منوتا ہے۔ جسونت سنگھ کا اپنا انداز ہے، اپنا اسلوب ہے۔ بعض بعض تصویروں میں تو ایسے دھیمے رنگ استعمال کئے گئے ہیں کہ انسانی فطرت کی تمام نرمیاں مسکراتی ہوئی نظر آتی ہیں اور کیوں نہ ہو۔ جسونت سنگھ جن موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں وہ انسانی زندگی کا لطیف ترین سرمایہ ہیں۔ مثلاً جمالیات حُسنِ فطرت، سنگیت، اُداسیاں اور انسانی ناکامیاں۔ ان تمام موضوعات میں جھلاہٹ کا کوئی امکان یا عنصر نہیں ہے۔ اور جو شخص بنیادی طور پر Outsider ہو وہ بھلا کیوں جھلانے لگا یہی وجہ ہے کہ فطرت نے اُن کے ہاتھوں میں ایسا حُسن عطا کیا ہے کہ کوئی بھی خط کوئی بھی نقش نہیں یا سطحی جذبات کی عکاسی نہیں کرتا۔ سنجیدگی کا یہ انگ اور فن کارانہ وقار یہ ہیں وہ دو عناصر جو جسونت سنگھ کو صاحبِ اسلوب مصوّر قرار دیتے ہیں۔

ضروری گذارش ۱۔ مضمون کاغذ کے ایک طرف اور خوش خط لکھئے۔ ۲۔ غیر طلبیدہ مضامین اُسی صورت میں واپس کئے جائیں گے جب کہ اُن کے ساتھ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ ہوں گے۔ (ادارہ)

ساغر زیدی

اُما شنکر شاداں گوالیاری

اُما شنکر شاداں گوالیاری مدھیہ پردیش کے ایسے پختہ کار اور دل سوز شاعروں میں سے ہیں جنھیں زمانے کی مجموعی طاقتوں نے اُبھارا کم اور دبایا زیادہ۔ اگر اُردو کے اداروں اور نقادوں نے جانب داری اور گروہ بندی کے جذبات و احساسات سے بالاتر ہو کر تمام اُبھرتے ہوئے شاعروں و ادیبوں کا ساتھ دیا ہوتا تو آج اُما شنکر شاداں کا نام اطرافِ ملک میں شہرت و مقبولیت کے لحاظ سے پیش پیش نظر آتا۔ کاش ہمارے ناقدین اُن تمام شعراء و اُدباء کو جو اپنے اندر ادبی ترقی کی صلاحیت رکھتے ہیں منظرِ عام پر لانے کی سعی فرمائیں۔

شاداں گوالیاری کو شاعری ورثہ میں ملی ہے۔ آپ کے جدِّ بزرگوار منشی نیک رام صاحب ریٹائرڈ تحصیل دار برٹش گورنمنٹ و ڈسٹرکٹ سیشن جج سابق ریاست جودھ پور اپنے زمانے کے اچھے کہنے والوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ مرحوم کا ایک شعر مجھے یاد ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

مبارک شیخ کو کعبہ ہو بُت خانہ برہمن کو
کہیں بیٹھے ہوئے ہم بھی کسی کی یاد کرتے ہیں

شاداں صاحب کے والد محترم منشی مہادیو پرشاد صاحب المتخلص بہ خنجر ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر سابق ریاست گوالیار بھی پُرانے رنگ میں اچھا شعر کہتے ہیں اور باوجود کبر سنی و پیرانہ سالی شعر سُننے اور سُنانے کے بے حد شوقین ہیں۔ نہایت متواضع خلیق اور شاعر نواز واقع ہوئے ہیں۔ موصوف کے دو شعر جو میرے حافظہ میں محفوظ ہیں پیش کئے جاتے ہیں ؎

غبارِ کارواں بدلا نہ راہِ کارواں بدلی ۔۔۔ حالت تھک کے رہ جانے پہ دنیا غور کیوں کرتی
آپ کی صورت نہ ورنہ ہر نظر کا شے ۔۔۔ اپنا اپنا ہے تصوّر اپنا اپنا امتیاز

دراصل شاداں صاحب اور اُن کے بزرگوار نے اُردو زبان کی جو خدمت کی ہے۔ وہ نہ صرف قابلِ ستائش بلکہ قابلِ تقلید بھی ہے۔ حضرت شاداں اور اُن کے آب و جد کی ادبی خدمات اور اُردو نوازی کو خراجِ تحسین نہ دینا بڑا ظلم ہے۔ مجھے اس خصوص میں جناب ریاض چودری، رضا قریشی اور منشی دنو بہادری لال طالب سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفیسز گوالیار سے بطورِ خاص شکایت ہے کہ شاداں صاحب اور اُن کے بزرگوار سے قریبی اور گہرے روابط ہونے کے باوجود مذکورۂ بالا صاحبانِ ذوق میں سے کسی ایک نے بھی جناب شاداں جیسے ہونہار اور فن کار شاعر کو ملک و قوم سے روشناس نہیں کرایا۔

جنابِ شاداں اپنے والدِ محترم کی طرح خوش خلق، خوش کلام اور بذلہ سنج واقع ہوئے ہیں۔ اُن کی بے تکلفی میں نکلف اور تکلف میں بے تکلفی ہے۔ وہ ایک مذہبی آدمی ہیں۔ مگر اُن کی مذہبیت میں فرقہ پرستی کا ہلکا سا بھی شائبہ نہیں پایا جاتا۔ شاعر علامہ اقبال کی طرح اپنے مذہب پر قائم رہ کر مضمون کبھی نوعِ انسان سے محبت کرتا دیکھا ہے۔ اکثر وہ علامہ مرحوم کے اس شعر کو گنگنایا کرتے ہیں ؎

آدمیّت احترامِ آدمی ۔۔۔ باخبر شو از مقامِ آدمی

شاداں صاحب ایک غزل گو شاعر ہیں اور محبت کرنے والا دل لیے سینے میں رکھتے ہیں۔ اُن کے کلام کو اگر تنقید کی کسوٹی پر کسا جائے اور اُن کی زندگی سے اُن کے اشعار کا موازنہ کیا جائے تو اُن کا ہر شعر اُن کی زندگی کا آئینہ دار نظر آئے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے شعر کہتے وقت اُن ہی واردات و معاملات کو پیشِ نظر رکھا ہے جن سے کہ وہ منسلک و وابستہ ہے۔ اُن کی شاعری کا عامیانہ و سوقیانہ رنگ سے بالکل پاک ہے اور کم از کم میری نظر سے اُن کا

ایک شعر بھی ایسا نہیں کہ جس نے ہیجانِ نفس کے سایہ میں پرورش پائی ہو۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس جادۂ پُرخار سے خود فراموشانہ طور پر اپنے دامن کو بچا کر گذر گئے ہیں۔ ان کے اشعار میں ادبی حُسن، واردات، معاملات، سنجیدگی، معنویت، زبان کا لوچ، زندگی کے تلخ و شیریں تجربات اور دل کو گرما دینے والا ترنم۔ غرض کہ وہ سب کچھ نظر آئے گا جو ایک صحیح المذاق غزل گو شاعر میں ہونا چاہئے وہ اپنی ہر غزل میں انتہائی حساس اور جذباتی نظر آتے ہیں۔ چنانچہ جس وقت اس شعر پر نظر جاتی ہے ؎

اے فریبِ التفاتِ حسن بس رہنے بھی دے

اور کچھ بن جا مری اُمید کی دُنیا نہ بن

تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تنقید و تجزیہ کی ساری قوتیں جواب دے چکی ہیں۔ اس حقیقت کو اہل دل ہی سمجھ سکتے ہیں۔ کہ مذکورۂ بالا شعر میں جو خیال پیش کیا گیا ہے وہ بہت کم ایسے نپے تُلے الفاظ میں کہیں نظر آئے گا۔ دوسرے مصرع میں "اور کچھ بن جا" کا ٹکڑا ایک ایسا ٹکڑا ہے کہ جس نے ایک معمولی بات کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ اور اسی کا نام ہے اِرتقائے شاعری۔

اس قسم کے بلند پایہ اشعار شاداں صاحب کے قلم سے بکثرت نکلے ہیں وہ احسان دانش کی طرح نہ مزدور کا رونا روتے ہیں اور نہ سردار جعفری کی طرح قتل و غارت پر آمادہ ہو کر تخریبی عناصر کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ بلکہ اس کے برخلاف وہ نہایت سکون و اطمینان اور غیر متزلزل عزم و استقلال کے ساتھ فرماتے ہیں ؎

دل کو احساسِ شکستِ دل نہ ہو شاداں اگر

ہر قدم منزل ہے اپنا ہر قدم منزل میں ہے

نہ دامنِ گلچیں نہ تم نہ رکھیں اعتبار اپنا

خزاں کے روپ میں بھی کام کرتی ہے بہار اپنا

حضرت شاداں کی سب سے بڑی خصوصیت اعتدالِ مذاق ہے۔ خیالات نہ تو سطحی ہیں اور نہ اتنے عمیق کہ خود بھی غائب ہو جائیں۔ کلام میں بلندی ہے مگر اس حد تک۔ کہ ہر صاحبِ نظر اُسے دیکھ سکے۔ آپ کی سخن آفرینیاں لکھنوی شعراء کی طرح فرضی اور خیالی نہیں ہیں بلکہ واقعی و یقینی ہیں۔ آپ کے قلم نے بہت سے سوئے ہوئے مضامین جگا دیئے ہیں اور پُرانی شراب کو نئے پیالہ میں بڑے سلیقہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ آپ نے اپنے شاعرانہ الفاظ سے وہی کام لیا ہے جو ایک مصوّر گوناگوں رنگوں سے لیتا ہے۔ آپ کے اشعار سے ظاہر ہے

کہ وہ انھیں جذبات و احساسات کو شعر کا جامہ پہناتے ہیں جن میں اثر کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ اور یہی وہ معیار ہے جہاں کھوٹا اور کھرا پرکھا جاتا ہے۔ آپ کے کلام کو بہ نظرِ غائر دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے شاعری کچھ کھو کر سیکھی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بنی ہے ایک مسلسل پیامِ بیداری

وہ نیند جو تری آنکھوں سے چھین لی میں نے

دل کیا لیا کہ خرمنِ ایماں ہی لے لیا

اللہ! پڑ گئی تری کافر نظر کہاں

اک زمانہ ہوا بربادیٔ دل کو، لیکن

زندگی اب بھی نظر آتی ہے ویرانے میں

مجھے گماں بھی نہ تھا تلخیٔ حقیقت کا

یہ تم نے کیوں مری بربادیوں کا نام لیا

ایک قطعہ اسی رنگ کا ملاحظہ ہو ؎

تمھیں جب اُلفت کسی سے ہوگی ہنسے گا تم پر بھی اک زمانہ

میری مصیبت پہ ہنسنے والو کبھی ہنسی کو ترس نہ جانا

اکثر شعراء نے اس خیال کو نظم کیا ہے۔ لیکن جس مؤثر پیرائے میں جناب شاداں نے کہہ دیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر وہی کہہ رہا ہے جو خود اس پر گذری ہے۔

اسی سلسلہ میں مندرجہ ذیل اشعار خصوصیت کے ساتھ دادطلب ہیں:-

ناکام کیا پھرا ہوں تری جلوہ گاہ سے

سب نے بنا لیا ہے حریفِ نظر مجھے

دلوں کی بے حسی برحق مگر یہ بھی تو ممکن ہے

تری نیچی نظر نے کھو دیا ہو اعتبار اپنا

سُنانا چاہتا تھا دل کا افسانہ انھیں لیکن

وہ اٹھ کر چل دیئے جب درمیاں تک بات آپہنچی

نگاہِ شوخ! کدھر تھا ترا خیال ابھی

بچا ہے شیشۂ دل میرا بال بال ابھی

آتے ہی بزمِ غیر میں دُنیا بدل گئی

اک اجنبی سے آپ میں اک اجنبی سے ہم

ہزار حشر میں پرسش ہوئی، مگر میں نے

نہ دل کے داغ دکھائے نہ اُن کا نام لیا

بیان کی پختگی اور سہل عربیّ ی کوئی آسان بات نہیں۔ ہر ذمہ دار اور محتاط شاعر کی یہ انتھک کوشش ہوتی ہے کہ وہ ایسے الفاظ کا انتخاب کرے جن کے معنی اور ترنم میں چولی دامن کا ساتھ ہو۔ شاعری اور موسیقی ایک دوسرے سے بہت مماثلت رکھتی ہیں۔ دونوں روح و قلب کی وسعتوں پہ چھا جاتی ہیں۔ جس شاعر نے موسیقی کو پیشِ نظر رکھا وہی کامیاب شاعر کہلاتا ہے۔ جناب شاداں کے کلام میں موسیقیت کو کس درجہ دخل ہے، ناظرین خود اندازہ لگا سکتے ہیں ؎

پاس رہتے وہ مجھ سے لیکن پھر بھی اُن سے دور رہا ہوں

اکثر وہ مجبور رہے ہیں اکثر میں مجبور رہا ہوں

بہرصورت ہمیں تو ہے اُسی محفل سے پیار اب بھی
جہاں ہوتا ہے دل کی دھڑکنوں پر اعتبار اب بھی
میری جانِ تمنا کو ہے میرا انتظار اب بھی
خزاں کی روح کو آواز دیتی ہے بہار اب بھی

بجھی شمع خود اپنے سوزِ نہاں سے چمن کی ہوا میں اُڑا آشیانہ
سفینے کی قسمت میں گر ہو تباہی تو ساحل بھی طوفان سے کم نہیں ہے

ہماری یاد میں اُن کے سرشکِ غم ارے توبہ!
چلی دامن سے اور آبِ رواں تک بات آپہونچی

سمجھ نہ پائے یہ اہلِ محفل کہ لب پہ ساقی کے نام میرا
زباں پہ آیا تھا دل سے پہلے کہ دل میں آیا زباں سے پہلے

بے نقاب آؤ کہ جی بھر کے نظارہ کرلوں   پھر بہار آئے نہ آئے مرے کاشانے میں

تم نے ہنس کر فرق ڈالا ہے یہ سوز و ساز میں
ورنہ دونوں نغمہ زن تھے ایک ہی آواز میں

سر رکھ سکے پاسِ نازِ بہ روپینے دیجئے   ناآشنا رہے ہیں ابھی تک خوشی سے ہم

الفاظ و معانی کا ارتباط ہی شعر کے حُسن کا ضامن ہوتا ہے۔ شاعر اپنی قوتِ متخیلہ سے ایسے بولتے، بجتے اور کھنکتے ہوئے الفاظ ڈھونڈ کر لاتا ہے کہ سامع کا ذہن متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ الفاظ کی ترتیب اور اُن کا باہمی تناسب معانی کی نوعیت سے مشروط ہوتا ہے۔ جس قسم کے معانی ہوں گے اُسی قسم کے الفاظ کا انتخاب کرنا ایک شاعر کے لئے نہایت ضروری ہے۔ محبّت کی کیفیتِ صحیح کو حضرت شاداں ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں ؎

نثار اُن پہ ہزار دن ہیں فدا ہیں اُن پہ ہزار راتیں
اگر محبّت کے چار دن ہوں اگر محبّت کی چار راتیں
ہوئے ہو تم جب سے اجنبی سے کوئی بھی اپنا نہیں رہا ہے
وہی پرائے سے دن ہیں اپنے وہی ہیں بیگانہ وار راتیں

میں نے اس ڈر سے محبّت میں کبھی آہ نہ کی   میرا غم تیرے لئے باعثِ آلام نہ ہو

جناب شاداں سنیاسی قسم کے شاعر نہیں ہیں کہ دوسروں کے جذبات کی ترجمانی کرتے وقت خود سے بے خبر ہو جائیں۔ بلکہ آپ کا کلام دیکھنے کے بعد ہر صاحبِ ذوق یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ آپ ایک ایسے شاعر ہیں جو زیادہ تر اپنے ذاتی تاثرات و جذبات کو غزل کے روپ میں پیش کرتے ہیں اور عام شعراء کی طرح نقالی نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

کوئی بے خود، کوئی مغموم، کوئی خوش خاطر   بزمِ ساقی میں بھی تفریق نظر آتی ہے

یُوں ہے اُن کے روئے زیبا پر نگاہوں کا اثر
پُھول جیسے ہاتھ لگ جانے سے کُمہلا جائے ہے

اور رہنے دیجئے کچھ دیر دل پر دستِ ناز
میرے دل سے درد کا احساس مٹتا جائے ہے

دامن چھڑا کے جائیں گے اک ناتواں سے آپ   اک ناتواں کے ہاتھ سے دامن چھڑا نا کیا

میری خاطر دوسرے غمگیں نہ ہوں یہ سوچ کر
مجھ پہ جب روتی ہے دُنیا مسکرا دیتا ہوں میں

جو نہیں ہوتے امینِ رازِ غم اے چشمِ تر
ایسے آنسو اپنی نظروں سے گرا دیتا ہوں میں

زمانہ جب کسی کے قلب کو مجروح کرتا ہے
تڑپ اُٹھتا ہے سینے میں دلِ بے اختیار اب بھی

جو نہیں وہ دل نصیب میں غم ہجر ہی سے قریب ہو
کوئی زندگی ہے یہ زندگی غمِ ہجر ہے نہ وصال ہے

اتنا تو ہو کہ جس میں سما جائے کائنات   ظرفِ نگاہ و دل کے برابر بنایئے

کسی کی زیرِ لب آہیں بھی بار خاطر ہیں   کسی کے ظلم بھی انسانیت پہ بار نہیں

ممکن ہے کہ مدھیہ پردیش کی بعض نکتہ سنج و نکتہ چیں نگاہوں کو جناب شاداں کے آئینۂ سخن میں وارداتِ قلبی کی حرارت، جذبات کی تپش اور محبّت کے فلسفیانہ مسائل نظر نہ آئیں، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قدرت کی طرف سے اُن کو ایک ذوقِ آشنا اور حساس قلب ودیعت کیا گیا ہے اور جہاں تک عشق و محبّت کے اخلاقی پہلو کی پاکیزگی اور خیالات کی شائستگی کا تعلق ہے جناب شاداں مدھیہ پردیش کے شعراء میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ وہ صرف کسی بُتِ طنّاز کے گیسوئے خمدار کے اسیر نہیں ہیں بلکہ عشق و محبّت کے حقیقی میخانے کے محرم راز بھی ہیں۔ اُن کی اخلاقی اور روحانی بلندی ان کے اشعار سے ظاہر ہے۔ یعنی اُن کا عشق عام شعراء کا عشق نہیں ہے جو بزدلی، کم ہمتی، پست خیالی، بے غیرتی اور نفس پرستی کی مجسّم تصویر ہوتا ہے۔ بلکہ ان کا عشق وہ عشق ہے جس کی بنیادیں، عزم و ثبات خلوص و یقین، صدق و وفا اور ضبط و استقلال پر قائم ہیں۔ جو موت کو زندگی

سمجھتے ہے۔ یہ خوددار، جانباز اور وفا بنیاد دل ہے جو ناکامیوں کی ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی اُسی والہانہ انداز سے اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اس قسم کے چند اشعار دیکھئے:-

رازِ غم افشا کروں یارا نہ رکھوں آہ نہیں
غم ہو تو کچھ سناؤں آپ کی آواز نہیں

میں تو اچھا ہوں مگر اے چارہ گر یہ تو بتا
فرق کیوں محسوس کرتا ہوں تری آواز میں

کبھی جلوؤں کی کم تابی کبھی نظروں کی کم بینی
محبت پر کہیں کھیلے ہیں کبھی تم نے کبھی ہم نے

دل ہی لٹتے ہوں یہاں تو زمانے کی دولتیں
لیکن وہ اُن کی ایک نظر کچھ نہ پوچھئے

سجدے سے تو کر رہا ہوں مگر یہ خبر نہیں
میری جبیں کہاں ہے ترا سنگِ در کہاں

نہ کیجئے مجھے واقفِ ستم کی لذت سے
بڑھا دیجئے نہ مری وسعتِ خیال ابھی

تمھیں کچھ وہ بھی لمحے یاد ہیں عہدِ محبت کے
تمھارے آستاں سے جب اٹھائی تھی جبیں ہم نے

کسی کامیاب نگاہ کا تری بے رُخی سے یہ حال ہے
جو کبھی خدائے نصیب تھا وہی آج دستِ سوال ہے

کلیوں کا تبسم گل کی ہنسی کیا یہ بھی فریبِ دام نہیں
گلشن کی فضائے رنگیں میں صیاد کبھی ناکام نہیں

کر دیا کیا یہ مرے ذوقِ طلب نے مجھ کو
نام پر تیرے گماں ہے کہ مرا نام نہ ہو

کون سمجھے گا حقیقت ترے دیوانوں کی
ان کے دامن بھی گریباں سے نظر آتے ہیں

بہاریں کے خزاں میں کبھی نکل آؤ
خزاں کا رنگ بدل جائے عمر بھر کے لئے

جہاں ہوش بھی دیدۂ ہوش کھوئے
وہاں دل کو تابِ نظر آج بھی ہے

ابھی تو کئی منزلیں ہیں وفا کی
کہاں رہ گیا جانے تھک کر زمانہ

خطا کر کے ہم نے وہاں داد پائی
پرستاریاں تھیں جہاں سر جھکائے

وہی ہے تو جسے اہلِ نظر بتا نہ سکے
قریب آ کے بھی تیرے قریب آ نہ سکے

اور کچھ ہو جاؤ میری زندگی پر مہرباں
اور کچھ دشوار کر دو زندگی میرے لئے

خلاصۂ کلام یہ کہ جناب شاداں نے ہر غزل میں اپنے جذبات کا اظہار نہایت روانی اور صفائی کے ساتھ کیا ہے جس کی خوبیوں سے یقیناً کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا کلام معائب و اغلاط سے پاک ہے۔ بلاشبہ اُن کے کلام میں زبان و بیان کی خامیاں اور فنی غلطیاں موجود ہیں۔ مگر مجموعی اعتبار سے محاسن زیادہ ہیں اور معائب کم۔ اور جہاں تک اکتسابِ فن اور مہارتِ شعری کا تعلق ہے وہ ایک کامیاب شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اللہ کی دین ہے جسے دے
میراث نہیں بلند نامی

سلام جرأت انجنگاوی

غزل

دلِ ستم زدہ رسمِ جہاں تباہ تو دے
مگر خدائے عالم مجھے پناہ تو دے

حسین مناظرِ عالم پہ کیا نگاہ کروں
ترا خیال مجھے فرصتِ نگاہ تو دے

مجھے بچھڑنے کا اپنے نہیں ہے غم لیکن
سُراغ قافلے والوں کا گردِ راہ تو دے

ملا وہ ظرف مجھے باوجودِ شدتِ درد
مجال کیا کہ کبھی ضبط اذنِ آہ تو دے

مجھے قبول ہیں یہ داغہائے عشق مگر
مرے حبیب انھیں نورِ مہر و ماہ تو دے

ثبوت پاکیٔ فطرت کا دوں تو کس کو دوں
نگاہِ شوق کبھی دعوتِ گناہ تو دے

خلوص گو نہیں اب دوستی میں اے جرأت
مگر یہ رسمِ جہاں ہے اسے نباہ تو دے

جواب

(تذکرۂ سرزمینِ کانگڑہ)

گلہ گذار تو ہیں دوستوں کی تحریریں
وہ کر رہے ہیں مری واپسی کی تدبیریں

کہ اُن سے دُور بہت دُور ہو گیا ہوں میں
دیارِ غیر میں محصور ہو گیا ہوں میں

بس اُن کی بزم میں میری کمی کے چرچے ہیں
خطوط میں بھی مسلسل یہی تقاضے ہیں

"وطن کا ہے یہ تقاضا وطن میں لوٹ آؤ
چمن اُجاڑ پڑا ہے چمن میں لوٹ آؤ"

وہ کہہ رہے ہیں بڑے پیار سے "اُتر آؤ
اب آؤ رفعتِ کہسار سے اُتر آؤ"

بُلا رہے ہیں ابھی میرے غم گسار مجھے
پکارتے ہیں ابھی تک وہ رہگذار مجھے

جہاں شروع ہوا تھا سفر جوانی کا
بنے جو فقرۂ اوّل مری کہانی کا

مگر یہ ارض یہ رنگین وادیٔ کہسار
سکون و امن کی ضامن ہے عافیت کا حصار

یہ دھولا دھار حسیں اور یہ کانگڑے کی زمیں
سفید برف کا ہے تاج جس کے زیبِ جبیں

اس ارضِ پاک کا اک اک اشتر جفاکش ہے
رہینِ تلخیٔ آلام ہے بلاکش ہے

یہ کانگڑے کی زمیں ہے زمینِ مردم خیز
ہیں اس چمن کی بہاریں بڑی ترنم خیز

ٹکے ہوئے ہیں گہر دامنِ سوالک میں
مہک رہی ہے فضا گلشنِ سوالک میں

یہ سرزمیں ہے پربت کے نازنینوں کی
یہ سرزمین ہے محشر ادا حسینوں کی

طلسمِ ہوش ربا جن کی ہر ادا میں ہے
جو آنکھ دیکھئے ڈوبی ہوئی حیا میں ہے

یہ سورماؤں کی دھرتی یہ ڈوگروں کا وطن
یہیں پہ تیغ دستاں ہیں یہیں پہ سرو دمن

وہ ڈوگرے کہ ہیں شمعِ وطن کے پروانے
ہیں عام جن کی شجاعت کے پاک افسانے

بہ ہر پہلوئے مضطر اداشناس ہے دل
یہ ملک چھوڑ دے کیونکر وفاشناس ہے دل

میں زہر نوش کروں اور نبات سے روٹھوں؟
صدائیں موت کو دوں اور حیات سے روٹھوں؟

گلے سے غم کو لگا لوں قرار کے بدلے؟
خزاں کو اپنا بنا لوں بہار کے بدلے؟

ہے اس زمیں سے وہ رشتہ جو کٹ نہیں سکتا
خطا معاف! رُخ اپنا پلٹ نہیں سکتا

پیامبر مرے احباب کو بتا دینا
مرے اقارب بے تاب کو بتا دینا

جو کر رہے ہیں مجھے یاد اُن سے کہہ دینا
مرے سبب جو ہیں ناشاد اُن سے کہہ دینا

نظر نواز مناظر میں کھو گیا ہے شباب
کسی کی گود میں سر رکھ کے سو گیا ہے شباب

شاکر پرشارتھی

پنجاب کا لوک سنگیت

لوک گیت اور سنگیت لازم و ملزوم ہیں۔ لوک گیت سُر کے بغیر اُدھورا ہے۔ ادھر چند سالوں میں لوک گیتوں پر جو تحقیق ہوئی ہے اُس میں لوک گیتوں کے ادبی اور سماجی پہلوؤں پر تو کافی کچھ لکھا گیا ہے۔ مگر لوک گیتوں کے سنگیت کا فنی اعتبار سے جائزہ مشکل سے ہی ملتا ہے۔ حالاں کہ لوک گیت کا تاثر جتنا اس کے سنگیت میں مُضمر ہے۔ اتنا منظوم جذبات میں نہیں۔ پنجاب کا ایک مشہور گیت ہے۔ "ٹاہلیاں وے پتاں والیاں" (شیشم کے پیڑ ہیں ہرے بھرے شیشم کے پیڑ) اس میں ایک مہجور عورت کے یاس انگیز جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔ شیشم کے پیڑوں پر پتے اُگ آئے ہیں۔ اس کی ہم جولیاں بہار کی آمد پر کھل اٹھی ہیں۔ ان کی گودیوں میں نومولود بچے کھیل رہے ہیں مگر وہ بدبخت کیا کرے؟ اس کا شوہر تو پردیس میں ہے۔ بے بسی کے عالم میں وہ اپنے دل کو کیا کیا فریب دیتی ہے! غسل کرتے وقت آٹے اور مٹی کی آمیزش سے بچے کا پُتلا بناتی ہے مگر یہ مٹی دا باوا ' (مٹی کا بچہ) نہ تو بولتا ہے نہ کھیلتا ہے۔ اس کا باپ تو پردیسی ہے۔ وہ ایک لمحہ اسے دیکھتی رہ جاتی ہے۔ مگر آہ! یہ سب تو ایک کھیل تھا۔ ایک دھوکا تھا! وہ غسل کرنے لگی تو مٹی کا باوا گل گیا۔ طلسم ٹوٹ گیا!

یہ سارا گیت عورت کی بے لوث محبت، ماں بننے کی فطری خواہش اور سماج کی گھٹن کا ترجمان ہے۔ جہاں تک اس گیت کے فنی پہلو اس کے الفاظ کی بندش کا تعلق ہے، وہ تو ٹھیک ہی ہے مگر جب تک ان الفاظ کو اس گیت کی دھن کے ساتھ پڑھا نہیں جاتا، ان کا اثر پورا نہیں ملتا۔ ہم ان جذبات سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ اس ایک گیت پر ہی موقوف نہیں۔ ٹپہ، ترنجن گیت، بولیاں اور ڈھولے وغیرہ سب ہی ایسے گیت ہیں۔ جن کی دھنیں اتنی زوردار اور پُرتاثیر ہیں کہ ان کا صرف پہلا مصرعہ ہی اکتارے پر بجایا جائے تو سامعین جھوم جھوم جائیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کسی بھی گیت کو پڑھنے اور اس کے مطالب سمجھ لینے سے ہی اس کی روح کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ سنگیت لوک گیت کی جان ہے۔ اُس کے بغیر گیت کا پورا تاثر معلوم نہیں ہوتا۔

کہا جاتا ہے کہ سنگیت دیوتاؤں کی دین ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عوام کی مشترکہ محنت، ان کا شعور، مل بیٹھنے اور مل جل کر کام کرنے کی عادت نے بتدریج موسیقی کو ترقی دی۔ اور وہ اس معراج پر پہنچی کہ اسے دیوتاؤں اور پیغمبروں سے منسوب کیا جانے لگا۔ سنگیت کے محققین اور ماہرین برسوں کی تحقیق کے بعد اس رائے پر متفق ہوئے ہیں کہ شاستریہ سنگیت (کلاسیکی موسیقی) کی بنیاد ہمارا لوک سنگیت ہے۔ لوک دھنوں کو ہم کلاسیکی موسیقی کے بچپن سے موسوم کر سکتے ہیں۔ آج بھی بہت سے لوک گیت ایسے راگوں میں گائے جاتے ہیں۔ جو "مارگ راگوں" میں شمار ہوتے ہیں۔ مثلاً بنگال اور مدھیہ پردیش میں ملہار ایک لوک دھن ہے جسے کلاسیکی موسیقی میں ایک اعلیٰ راگنی مانا جاتا ہے۔ اسی طرح شمالی پنجاب میں سوہنی، جوگ، تلنگ اور بھیرویں میں بیسیوں لوک گیت ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ برناوے کی راگ، راگنیاں موجودہ شکل میں اپنی سادگی، اثر انگیزی اور عوام پسندی کی بناء پر لوک دھنوں سے لی گئی ہیں۔ تمام لوک دھنیں کسی نہ کسی راگ یا راگنی میں ہوتی ہیں ان سے

باہر نہیں۔ ہندوستان کے مشہور ماہرِ موسیقی اور محقق کمار گندھرو کا نظریہ ہے کہ راگ بنائے نہیں جاتے بنتے ہیں۔ لوک دھنوں میں ہم راگوں کو چھپا ہوا پاتے ہیں جب انھیں منظرِ عام پر لایا جاتا ہے تو ان کا کلاسیکی انداز سامنے آتا ہے۔ لوک دھن چوں کہ فطری تخلیق ہے۔ اس لئے فطرت کی طرح ہی یہ مکمل ہوتی ہے۔ ان میں کوئی نہ کوئی راگ ضرور ہوتا ہے جیسے دیدۂ بینا کی سنجو رہتی ہے۔ راگ کے بنیادی سُروں کو پہچان کر جب انھیں حدِ تکمیل تک پہنچایا جاتا ہے تو کلاسیکی اعتبار سے راگ کا روپ نکھر آتا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ شاستریہ سنگیت لوک دھنوں میں مضمر راگوں کی ترقی یافتہ صورت ہے فرق صرف اتنا ہے کہ لوک دھنوں کے انداز کی سادگی سُروں کی ترتیب کا سجھاؤ۔ انھیں کلاسیکی انگ Style سے جدا کرتا ہے۔ لوک دھنیں ہماری کلاسیکی موسیقی کی ابتدا ہیں اور کلاسیکی موسیقی ہماری لوک دھنوں کی معراج۔

ہمارے مقبولِ عام لوک گیتوں اور لوک دھنوں میں وہ صفات بدرجۂ اتم موجود ہیں جن کی بنیاد پر کلاسیکی موسیقی کی عظیم عمارت استوار ہوتی ہے۔ یورپی موسیقی کی نشاۃ ثانیہ میں موزارٹ، بی تھوون، وگنر اور باک وغیرہ مشہور موسیقاروں نے اپنے اپنے ملک کے لوک سنگیت کو ہی بنیاد قرار دیا۔ اوّل اوّل وہاں چرچ میں گائے جانے والے گانوں اور عوام میں مقبول گیتوں کے امتزاج پر صدائے احتجاج بلند ہوئی مگر اس نئے شکیت نے مستقبل کی مانگ پوری کی اور مقبول ہوا۔ اس برِ عظیم کی موسیقی کی روایات کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں بھی شاستریہ سنگیت (کلاسیکی موسیقی) ہمیشہ لوک گیتوں سے ہی کچھ نہ کچھ مستعار لیتا رہا ہے۔ حال ہی میں مشہور موسیقار بڑے غلام علی خاں نے کوہاری کلیان راگ کی تخلیق کی ہے۔ اس میں دیگر کلیان کی مختلف راگ راگنیوں سے ہٹ کر یہ فرق رکھا ہے کہ اور وہ میں رنگی کو مل لگا کر ہی انھوں نے راگ کی ہیئت بدل دی۔ کوہاری درحقیقت سندھ کا پہاڑی لوک سنگیت ہے جس میں شاہ لطیف کے اشعار سسی پنوں کی رومانی داستان گائی جاتی ہے۔ اس طرح 'میاں کی ٹوڈی' کی بنیاد بھی ایک بنگالی لوک دھن ہے۔ اس سے بخوبی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ لوک سنگیت ہی ہمارے شاستریہ سنگیت کی بنیاد ہے۔ اور لوک گیتوں سے ہی شاستریہ سنگیت کا روپ نکھرتا رہا ہے۔

پنجابی لوک گیتوں کو اگر ہم شاستریہ سنگیت کی کسوٹی پر پرکھیں تو پتہ چلیگا کہ پنجاب کا لوک سنگیت زیادہ تر مندرجہ ذیل مارگ اور دیسی راگوں اور راگنیوں میں گایا جاتا ہے:-

پہاڑی، سندھڑا، مانڈ (یہ دیسی راگنی راجستھان میں بہت مقبول ہے۔ اسی سے ملتی جلتی لوک دھن بھٹیالی بنگال میں بہت مقبول ہے) بھیرویں (یہ راگنی سدا سہاگن ہے یعنی کسی بھی وقت گائی جاسکتی ہے۔ یہ مارگ راگنی ہے) سندھی بھیرویں (یہ بڑی دردناک راگنی ہے سندھ بھیرویں سے قدرے مختلف ہے مگر اس سے زیادہ تیکھی ہے۔ اس میں عموماً ماہیا گایا جاتا ہے) کافی (یہ راگنی بھی ہے اور پنجابی نظم کی ایک صنف بھی ہے جس میں تصوف کے مسائل بیان کئے جاتے ہیں) بھیم پلاسی (یہ بھی مارگ راگنی ہے کچھ گیت اور ملتانی کافیں اس میں گائی جاتی ہیں) سوہنی (یہ مارگ راگنی ہے جس میں کچھ خاص قسم کے گیت گائے جاتے ہیں۔ اس کی دھن بڑی دکھ بھری ہے) سندھڑا، مانڈ اور پہاڑی دیسی راگنیاں ہیں۔ ان میں ہمارے بیشتر گھریلو گیت، گھوڑیاں، مہندی اور ماہیے گائے جاتے ہیں۔ ان راگوں کے نہایت خالص اور ملے جلے دونوں روپ ملتے ہیں۔

لوک گیت اور تال

جس طرح شاستریہ سنگیت میں تال کے بغیر گائکی نہیں ہوتی۔ اسی طرح لوک گیتوں میں بھی تال ناگزیر ہے۔ تال اور لَے چال کی وہ پیمائش ہے۔ جس کی پابندی گانے بجانے میں لازمی ہے۔ کلاسیکی موسیقی میں اس پیمائش کے آلات کار ہیں۔ پکھاوج، مردنگ، دف اور طبلہ وغیرہ۔ اور لوک سنگیت میں ڈھولک، ڈھول، ڈمرو اور گھڑا وغیرہ۔ تال اور لے سازوآواز کا پیمانہ ہے اور اس پیمانے کی اکائی ماترا ہے۔ لے کی رفتار کے مطابق ماترا کا وقت گھٹایا بڑھایا جاسکتا ہے۔ شاعری میں جس طرح بحر کے ارکان ہوتے ہیں۔ اسی طرح تالوں میں ماترا رُکن کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر ماترا کا ایک نام بھی ہوتا ہے۔ جسے بول کہتے ہیں۔ ماترا کے بولوں کی مختلف تراکیب سے مختلف تال بنائے گئے ہیں۔

پنجاب کے لوک سنگیت میں نہایت سیدھے سادے تال برتے جاتے ہیں۔ مثلاً:-

کہروا - دھا تن تاک دھن

منتقی (ڈھائی تال) تا دھن دھن دھا دھا تن دھا یا

تا تا دھن دھن دھادھا تے دھن

جھومر - دھن تاک تن تاک یا دھن دھاک تاک تن تاک تک

دادرا۔ دھا دھن نا دھا تن نا

دھمال۔ دھا دھگے نگ تن تا دھگے نگ دھن

عام طور پر یہ تال ہلکی پھلکی موسیقی میں بھی استعمال ہوتے ہیں مثلاً غزلوں گیتوں اور کافیوں میں۔ بنیادی طور پر یہ تال لوک سنگیت کے تال ہیں۔ کلاسیکی تالوں کی نسبت ان عام فہم تالوں میں فنی موشگافیاں کم ہوتی ہیں۔ ان میں ضرب تقسیم کی دقتیں نہیں ہوتیں اور ان کا تعلق ہماری روزانہ زندگی میں ملتا ہے۔ گندم کی کٹائی، چکی کی چال، رہٹ کا چکر، گھوڑے کی ٹاپ اور سرپٹ رفتار وغیرہ کی اپنی اپنی چالیں ہوتی ہیں اور یہی چالیں جب ڈھولک کی تھاپ بن جاتی ہیں تو تال بن جاتی ہیں۔ انھیں سادہ تالوں کو دوہرا تہرا کرکے ان میں خالی اور سم کی پابندی لگاکر بڑے تال بنائے گئے ہیں۔ مثلاً تیوتال سولہ ماتروں کا ہوتا ہے۔ یہ کہروا کی چار چار ماتراؤں کی تین ضربوں اور چار ماتروں کی ایک خالی سے بنتا ہے۔ اسی طرح جھپ تال دس ماتراؤں کا ہوتا ہے۔ اسے دوہرا قوالی کہا جاسکتا ہے۔ آڑا چوتال چودہ ماتراؤں کا ہے۔ یہ مغلئی کا دوہرا تال ہے۔ اسی طرح دادرا کو دوہرا کرکے ایک تال، بارہ ماتراؤں کا بنا لیا گیا ہے۔ المختصر انھیں تالوں کو ترقی دے کر اور ان میں کچھ مشکلات پیدا کرکے بڑے تال بنائے گئے ہیں اور ان کے جھگڑے پن اور توڑے تو باقاعدہ ریاضی کے سوال بن گئے ہیں۔ بہرحال شاستریہ سنگیت کے تال دیوتاؤں کے سورگ سے اتر کر جنتا تک آئے۔ راج درباروں سے نکل کر صوفیوں کی محفلوں اور دیہات کے میلوں ٹھیلوں میں پہنچے اور ان کی چال سے ہم آہنگ ہو گئے۔ عوام کے گلے نے انھیں سنگھاسن پر بٹھایا اور وہ پھر سے ان کے دلوں کی دھڑکن بن گئے۔ تالوں کی اس تشریح کے بعد آیئے اب لوک گیتوں کے سنگیت پر ایک نظر ڈالیں۔

پورے برِ عظیم میں سامو ہک گیت ہی زیادہ تر پائے جاتے ہیں۔ یہ ہماری اجتماعی زندگی کے عکاس اور مشترکہ محنت کی دلیل ہیں۔ انفرادی طور پر گائے جانے والے گیت (یعنی گنگنائے جانے والے) بہت کم ملتے ہیں دراصل تریخن، پنگھٹ اور بیراگ کے گیت انفرادی طور پر گانے بجانے والے گیت نہیں ہوتے۔ ان کے گانے کا انداز اجتماعی اس لئے ہوتا ہے کہ جب وہ باقاعدہ گائے جاتے ہیں تو باری باری ایک دوسرے کے جواب میں گائے جاتے ہیں۔ ان میں بولیاں، ماہیا، ڈھولا اور ٹپے گاؤن (بلبے گیت) شامل ہیں۔ ہندوستان میں بنگال کی بھٹیالی۔ یو۔ پی کے منڈھے یا رخصتی کے گیت، اور دھرتی کی کجریاں، اسی انداز میں گائی جاتی ہیں۔ پنجاب کے زیادہ تر گھریلو گیت، گھوڑیاں، مہندی، سہاگ اور بابل، عموماً سندھڑا، مانڈا اور پہاڑی میں گائے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک مشہور سہاگ گیت "گھر آیا ماں والا ڈلا راج مانے بنّا" مانڈ میں ہے اور اس کی دھن بڑی دلکش ہے۔ رخصتی کا ایک بڑا پیارا گیت۔ "نہ میں لڑی ستے نہ میں بولی نی ماں

ہنی رکھ سے میری ڈولی نی ماں"

مانڈ راگنی میں ہے جو مغربی پنجاب میں بہت مقبول ہے۔

لوریاں

لوریاں صرف انفرادی گیت ہوتے ہیں۔ پنجاب کی مشہور لوریاں عام طور پر بھیرویں اور تلنگ راگنی میں گائی جاتی ہیں۔ ان کی چال نہایت دھیمی اور گنگناہٹ لئے ہوئے ہوتی ہے اور ان کا تاثر خواب آلود۔ ایک مقبول عام لوری ہے:۔

دِر دِر کُتیا

جنگل سُتیا

جنگل پئی لڑائی

کتے دی مرگئی تائی....

یہ بھیرویں میں ہے۔ اس کی لَے نہایت دھیما کہروا ہے۔ لڑائی کی ئی کھینچتی کھینچتی سولہ ماتراؤں پر پھیل کر تحلیل ہو جاتی ہے اور نیند کے ہلورے دینے لگتی ہے۔

ایک اور مشہور لوری 'جتی لوریاں دین دریا چلی' تلنگ میں ڈھائی تال یعنی غلطی کی لوری ہے۔ کہیں کہیں اسے پیلو میں بھی گایا جاتا ہے۔ اسے آہستہ لَے میں گایا جائے تو بڑے بڑے جی دار بھی نیند کی آغوش میں جا پڑیں۔

ایک اور مشہور لوری جو بچے کی پیدائش پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے میراثنیں گاتی ہیں ڈھولک کی

دِھن تاکے تاکے دھِن

گھِن دھادی گِدھی نادھی

گدھی گھِن ناکدی گھِن نا'

تھاپ پر ناچتے ہوئے وہ بچے کی بلائیں لیتی ہیں۔ چٹکیوں اور تالیوں

کے ساتھ ڈھولک کی تھاپ اور چکارے یا ہارمونیم کی دھن رقص کو اُجاگر کردیتی ہے۔ پہاڑی راگنی میں یہ گیت بہت مقبول ہے۔

لوری لال نوں میں دیواں
جمدے لال نوں میں دیواں
میرا کاکا جیوے!!

منظوم داستانیں

پنجاب میں عام طور سے منظوم داستانیں سُننے اور گانے کا بڑا رواج ہے میلوں ٹھیلوں یا احباب کی محفل میں پیشہ ور گویّے، ڈھاڈی اور موسیقار انہیں گاتے ہیں۔ ہیر بغیر کسی لے کے سندھی بھیرویں میں سُنائی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ڈھولک یا طبلہ کی سنگت نہیں ہوتی۔

مرزا دو طرح سے گایا جاتا ہے۔ پُرانی دھن پولیوں کی دھن اور کہروا تال میں ہے (اسے سُراں والا مرزا کہتے ہیں) پولیوں کی دھن سارنگ سے ملتی جلتی ہے اور کبھی کبھی اس کے ڈانڈے مانڈ سے جا ملتے ہیں۔ مرزا کی نئی دھن تلنگ راگنی اور آڑے چوتالے میں ہے۔ یہ تال چودہ ماتراؤں کا ہے اور کہروا کی نسبت کافی مشکل ہے۔

سوہنی مہیوال پہاڑی سُر میں بغیر Rythm کے گایا جاتا ہے۔

رومانی داستانوں کے علاوہ دیگر تاریخی داستانوں سے بھی عوام کو کچھ کم دلچسپی نہیں۔ دیہات کے میلوں میں تو انھیں خاص طور پر حلقہ باندھ کر سُنا جاتا ہے۔ میراثی، ڈھاڈی، جوگی، فقیر اور بھرائی، ان داستانوں کو سینہ بسینہ ایک دوسرے کو منتقل کرتے آئے ہیں۔ یہ عوام کی امانت ہے جو ان پیشہ ور گانے والوں نے مستقبل کے تاریخ دانوں کے لئے سنبھال کر رکھی ہے تاکہ وہ اس میں سے اضافہ اور حقیقت کو الگ کرکے صحیح جائزہ لے سکیں۔ ہمارے لوک گیتوں میں سازوں کا استعمال بہت کم ہوتا ہے۔ تاہم پیشہ ور گانے والے اپنا رنگ جمانے کے لئے اُن سے ضرور کام لیتے ہیں۔ پنجاب کی ایک بہت مشہور تاریخی داستان ہے "راجہ رسالو کی کتھا"۔ اس کا کچھ حصّہ نثر میں ہے اور کچھ حصّہ نظم میں۔ ڈھاڈیوں کی ایک ٹولی اسے گا کر سُناتی ہے۔ ایک گانے والا الغوزوں کی جوڑی بجاتا ہے اور دوسرا کہانی کا منظوم حصّہ گاتا ہے۔ پھر کچھ وقفہ کے لئے سنگیت بند ہو جاتا ہے اور گانے والا داستان کے نثری حصّہ کو ڈرامائی انداز میں پیش کرتا ہے۔ پھر الغوزے بجتے ہیں اور گیت گایا جاتا ہے۔

مشہور داستان سیف الملوک کا قصّہ پہاڑی اور بھیرویں میں کہروا تال پر گایا جاتا ہے۔ یوسف زلیخا کا قصّہ بھی بھیرویں میں کہروا تال پر ہی گایا جاتا ہے۔

رومانی داستانوں کے انداز پر خیال، ٹھمریاں اور ٹپّے بھی لکھے گئے ہیں۔ بلاشبہ پنجاب کے لوک سنگیت میں ان رومانی داستانوں کی روح بسی ہوئی ہے۔ اساوری کا ایک مشہور خیال ہے —"مجھی والیا سائیاں! ساڈوں تیری نانگ وے"!! یہ ہیر کی درد بھری آواز ہے۔ سہاگ کے دل فریب بولوں میں سی یوں گاتی سُنائی دیتی ہے۔

ڈاہڈا ای چپے گیا نی پیچ اولڑا
نی میں کاہنوں گلاں کیتیاں بلوچاں دے نال
سہاگ ایک خیال ہے اور یہ اس خیال کے بول ہیں

لمّے گاؤن (لمبے گیت) اور ڈھولے، مغربی پنجاب کے پوٹھوہاری لوک گیتوں کے ضمن میں آتے ہیں تقسیم کے بعد چونکہ مغربی پنجاب سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ مشرقی پنجاب میں ہجرت کرکے آئے ہیں۔ اس لئے اِدھر بھی اب ان گیتوں کے بول گونجنے لگے ہیں۔ ان لمبے گیتوں میں ایک ٹپّے کا مصرعہ ہوتا ہے جو گیت کی جان ہے۔ درمیان میں انترے کے طور پر مختلف ٹپّے لگائے جاتے ہیں۔ پھر استھائی میں سب گانے والیاں شامل ہو جاتی ہیں۔ ایک مشہور گیت۔

چٹی منڈی وینی۔ کالیاں ونگاں چھڑنک کیتا
اد کھے ویلے کدی نہ ماہیا سنگ کیتا

اس کی دھن اورے ایک جیسی ہوتی ہے۔ انترے اور دوہے بھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ عام طور پر انھیں بھیم پلاسی میں گایا جاتا ہے۔

پنجاب کے لوک ناچوں میں زیادہ تر لمّے گاؤن اور ڈھولے ہی گائے جاتے ہیں۔ مشرقی پنجاب میں گِدھا کے ساتھ عام طور پر بولیاں گائی جاتی ہیں۔ جو تلنگ راگنی میں کسی قدر ملاوٹ کے ساتھ ہوتی ہیں۔

ڈھولا پنجابی لوک گیتوں کی ایک صنف ہے جس میں عشق و محبت کے جذبات کی وجد آفریں ترجمانی ہوتی ہے۔ مختلف ڈھولے، مختلف راگ راگنیوں میں گائے جاتے ہیں۔ ایک ڈھولا — "ڈھول کھٹّا۔ دل پردیسیاں دا راضی رکھنا" بڑا مشہور اور مقبول ہے۔ اسے پہاڑی دھن اور کہروا تال میں گایا جاتا ہے۔ تا۔ دھی۔ دھن۔ تا، کہروا تال کے بول ہیں۔

ایک اور بہت مشہور ڈھولا ہے۔

دگدی راوی ماہی وے، وچ دو پھل کالے ڈھولا
اک پھل منگیا ماہی وے سارا باغ حوالے ڈھولا

(میرے محبوب! راوی دریا بہہ رہا ہے۔ اس میں کالے رنگ کے دو پھول بہہ رہے ہیں۔ میرے محبوب! تو نے تو ایک پھول ہی مانگا۔ ہم نے سارا باغ ہی تیرے حوالے کر دیا) یہ پنجاب میں بہت مقبول ہے۔ اسے تلنگ راگنی میں گایا جاتا ہے۔

تلنگ راگنی اور کہروا تال میں ایک اور مقبول ڈھولا، ناچ کے ساتھ گایا جاتا ہے۔ اس میں دیہات کے نکھٹو اور کاہل مردوں کو طعنے دے کر طنز کا رنگ بھرا گیا ہے۔ اس کے بول ہیں۔

نیوں نہ لائیے ماہیا نال فقیراں ڈھولا
(میرے محبوب! فقیروں سے کبھی محبت نہیں کرنی چاہئے)

ماہیا

پنجابی شاعری کی ایک صنف ہے جس میں ڈیڑھ مصرعہ میں پوری کیفیت سمو دی جاتی ہے۔ ماہیا کی موسیقی نے بہت سے رُوپ دھارے ہیں۔ نہ معلوم کب سے ماہیا نے پنجاب کے وسیع میدانوں اور سرسبز شاداب کھیتوں میں اپنا جادو بکھیر رکھا ہے۔ کوئی بیس پچیس[25] سال پہلے بالو اور محمد علی ماہیا کے رومان نے اسے دوبارہ مقبول کر دیا۔ صدیوں بعد سوہنی مہینوال کی سرزمین میں پھر ایک رومانی قسم کا رومان پروان پڑھا۔ بالو اور ماہیا جب چکی اور بیل میں ماہیا گا کر سوال جواب کرتے تو پنجاب اس نغمے پر سر دھنتا۔ ان کے ریکارڈ بھی بھروائے گئے۔ کمپنی نے ان کی خدمات حاصل کیں۔ زمانہ پنجاب میں ماہیا کی پرانی دُھنیں مدھم پڑ گئیں اور پہاڑی کے دردناک سروں میں ماہیا گلی گلی گاؤں گاؤں پھیل گیا۔

ماہیا اُٹھنے نہ دتا ای ... پردیس نی بالو کدی یاد وی کیتا ای
تیری کھڑی آں وچ بیلے ... قسم خدا دی چناں۔ یاد کرتی آں ہر ویلے

(دکھ تو کر پرندہ بکتا ہے۔ پردیس جا کر بالو! کیا تم نے کبھی یاد بھی کیا ہے مجھے ؟)

(میں تیری گاہ میں کھڑی ہوں۔ میرے چاند! میرے محبوب! خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں، کہ میں تو ہر وقت تجھے ہی یاد کیا کرتی ہوں)

ان دنوں مختلف اور عجیب عجیب دھنوں میں ماہیا گانے کی کوشش کی گئی مگر یہ دُھنیں مقبول نہ ہو سکیں۔ کیوں کہ شاعری کی طرح سنگیت کا بھی اپنا الگ مزاج ہوتا ہے اور جب یہ مزاج عوام کے مزاج سے ہم آہنگ ہوتو وہ اُسے قبول کر لیتے ہیں۔ سنگیت پر ماحول حتےٰ کہ جغرافیائی حالات تک کا بھی اثر ہوتا ہے۔ ایک علاقے کے لوگ دوسرے علاقہ کے سنگیت کو اس کے مخصوص انداز میں نہیں اپنا سکتے۔ اس لئے اس قسم کی اجنبی دُھنیں ماہیا کا ساتھ نہیں دے سکیں۔

اوپر ماہیا کی پہاڑی دُھن کا ذکر کیا گیا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اور تجربات کی خاطر ان دُھنوں میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ صرف وہی دُھنیں مقبول ہوئیں جو پنجاب کے مزاج کے مطابق تھیں۔ جن میں جھرنوں کی رم جھم ستوں کی سرسراہٹ۔ بادلوں کی گھن گرج اور گمبھیرتا۔ ٹیلوں کی اٹھان اور کھیتوں کی وسعت تھی۔ ان میں تبدیلی اور ترقی ہوئی لیکن پنجاب کے مزاج کے مطابق۔

ماہیا کی مقبول دُھنیں لوک گیتوں کی ہی طرح پہاڑی، مندھرا اور سندھی بھیرویں میں گائی جاتی ہیں، پنجاب میں ایک دُھن مانڈ میں بھی ہے جو راجستھان کی دیسی راگنی ہے۔ اسے اپنا لیا گیا ہے کیونکہ یہ پنجاب کے مزاج کے مطابق ہے۔ یہ سندھ کے راستے پنجاب میں داخل ہوئی۔ سرحدوں پر مختلف علاقوں کا کلچر آپس میں گلے ملتا ہے۔ اس لئے مانڈ کو بھی پنجاب نے اپنا لیا ہے۔ دو پرانی دُھنیں مارگ راگنیوں میں بھی ہیں۔ بھیرویں اور بھیم پلاسی میں ان کے سروں کے مزاج بھی پنجاب سے ہم آہنگ ہیں اس لئے ایسی راگنیوں کو "پنجاوے" کی راگنیاں مانا گیا ہے۔

پنجاب کے لوک سنگیت میں ماہیا کا سنگیت نہایت دلکش، دلفریب اور ... سے مکمل ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ جس طرح تخیل کے لحاظ سے مردوں اور عورتوں کا ماہیا جُدا جُدا ہے اسی طرح اس کی دُھنیں بھی جداجدا اور ... ہیں۔ اگر دونوں دُھنیں ایک ہی راگنی میں ہوں تو بھی ان کی چال میں فرق ہوتا ہے۔ جو دُھنیں عورتیں گاتی ہیں ان میں ایک قرینہ، سبھاؤ اور چنچل پن پایا جاتا ہے۔ وہ بیاہ شادیوں میں کورس میں یا مکالمے کی صورت میں کہروا تال، دُرت لے میں ڈھولک کی سنگت میں فضا میں اپنی نرم آوازوں سے ارتعاش پیدا کرتی ہیں۔ ان کی رس بھری نرم آوازیں اور نازک مزاج، انترے کی اٹھان کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس لئے وہ زیادہ تر استھائی میں ہی گاتی ہیں۔ ہاں

کبھی کبھی کوئی گانے والی انترے کی ایک جھلک سی دکھا کر پھر استھائی کے کورس میں شامل ہو جاتی ہے۔

ماہیا کے بول الاپتے ہوئے مرد اپنے مزاج کے مطابق ڈھولک کی تھاپ سے بے نیاز بلمپت لے میں وسیع کھیتوں، شاداب جنگلوں اور چاندنی راتوں کی حساس خوشبوؤں میں اپنی پاٹ دار اور مرکیلی آوازوں میں ایک ہاتھ کان پر دھرے اور دوسرا آسمان کی طرف اٹھائے ماہیا کے ہیجان خیز بول دور دور تک بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی دھنوں میں ایک اٹھان، وسعت اور گمبھیرتا پائی جاتی ہے۔ ماہیا کی دھنوں کی تلاش کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پرانی دھن شدھ بھیرویں میں ہے اس کی لے بلمپت ہے اور یہ مردانہ دھن ہے اس میں 'سا' اور 'پا' قائم سُر ہیں اور باقی سب اترے۔ اس کی سرگم اس طرح ہے:

پہلا آدھا مصرعہ۔ دھا دھادھا دھادھادھا دھا دھا پاپا ماما ما

دوسرا سالم مصرعہ۔ ساسارے ما پاپادھا پاپاماما پا ماپاگارے گاما

گامارے گاما گاسارے سا

یہ دھن آج کل متروک ہے۔ ماہیا کی ایک اور متروک دھن بھیم پلاسی میں ہے۔

بھیم پلاسی میں ماہیا کی ایک زنانہ دھن مروج ہے۔ جو مردانہ دھن کے ساتھ ساتھ ہی بڑھی لیکن مردوں کے دوش بدوش نہ چل سکی۔

ماہیا کی ایک دھن جو بالو اور محمد علی ماہیا نے گائی ہے پہاڑی میں ہے اور خاصی مقبول ہوئی تھی۔ اس کی سرگم بھی دیکھئے۔

پا دھادھاسا سارے گاگا ما گاگا رےرے رے

گاگا ماگا ساساساسا پاپا دھادھا ساساگاگا ماگاگا

رےرے رے

یہ دھن اب کبھی کبھار ہی سننے میں آتی ہے۔ آج کل کی مروجہ دھنیں جو مختلف علاقوں میں گائی جاتی ہیں وہ سندھڑا، اور سندھی بھیرویں میں ہیں۔ سندھڑا میں ماہیا کی دھن کے سروں میں ایک کرب کی سی کیفیت ملتی ہے۔

ایک دھن مانڈ میں ہے جسے جھنگ کے علاقہ کے ساربان رات کی تنہائیوں میں سفر کرتے ہوئے مرکیلی آوازوں میں بڑھتے چڑھتے اور پھیلتے ہوئے سروں میں گاتے ہیں۔ اس کی چال بہت دھیمی ہوتی ہے۔

ماہیا کی ایک اور رائج الوقت دھن آسا اور مانڈ کے امتزاج سے

وفا ملکپوری

غزل

مانا کہ تیرگی شب غم مہیب ہے
اے دل نہ فکر کر کہ سحر بھی قریب ہے

ملتی ہے غم سے روح کو اک لذتِ حیات
جو غم نصیب ہے وہ بڑا خوش نصیب ہے

تم کو جفا پہ ناز ہے اس کو وفا کی دھن
تم بھی عجیب ہو میرا دل بھی عجیب ہے

دکھلا رہا ہے شوق محبت کا معجزہ
آنکھوں سے ہے جو دور وہ دل سے قریب ہے

سو دردِ سر ایک نظر میں ملی نجات
ہے عقل اک مرض تو محبت طبیب ہے

اے عشق آفریں کہ مری پا شکستگی
کعبہ سے دور رہ کے خدا سے قریب ہے

مل تو گئے ہیں دونوں مگر یہ خبر نہیں
تم خوش نصیب ہو کہ وفا خوش نصیب ہے

بنی ہے۔ جسے مرد، عورتیں، میراثی اور ڈوم سب ہی گاتے ہیں۔ یہ اور ایسی تمام دھنیں ایک ہی دن میں مرتب نہیں ہوئیں۔ بلکہ مدتوں میں مختلف حالات سے متاثر ہو کر نغموں کی صورت میں ڈھلتی رہی ہیں۔

محمود عزیز

امدادِ باہمی اور منصوبہ بندی

یہ حقیقت اب کسی دلیل کی محتاج نہیں رہی کہ سیاسی آزادی بغیر معاشی آزادی کے بے معنی ہے اور معاشی آزادی اس وقت تک نامکمل ہے جب تک کہ عوام کا معیارِ زندگی ایک خاص حد تک بلند نہ ہو جائے۔ ہر ملک میں کسی نہ کسی سیاسی اصول کے تحت معاشی منصوبہ بندی کی جا رہی ہے اور ہر ملک اپنے حالات اور ماحول کی مناسبت سے منصوبہ بندی کی پرورش کر رہا ہے۔

پلاننگ کمیشن نے پنج سالہ پلان میں اشارہ کیا ہے کہ "ایک کم ترقی یافتہ معاشی نظام میں دو خصوصیات ساتھ ساتھ رہتی ہیں، ایک طرف کم یا زیادہ درجات میں، غیر مستعمل یا کم مستعمل انسانی طاقت ہوتی ہے اور دوسری جانب غیر استعمال شدہ قدرتی وسائل ہوتے ہیں"۔ ہندوستان کا معاشی نظام اسی قسم کا ہے اس لئے منصوبہ بندی لازمی ہو جاتی ہے تاکہ ملک کی بہتری کے لئے دستیاب قدرتی وسائل کو زیادہ مؤثر طریقے سے اس ڈھنگ سے استعمال کیا جائے کہ لوگوں کا معیارِ زندگی بلند ہو اور انھیں آرام و آسائش میسّر ہو۔ مخصوص اوقات میں ملک کے اقتصادی حالات کا سماجی ماحول سے گہرا رشتہ ہوتا ہے اور اس وقت معاشی اور سماجی زندگی میں تبدیلی لانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں پہلوؤں میں ایک ساتھ تبدیلیاں پیدا کی جائیں۔

معاشی اور سماجی تبدیلیاں اس لئے لازمی ہیں کہ موجودہ حالات میں آمدنی، دولت اور مواقع کی تقسیم انتہائی غیر مساوی ہے اور جس کا نتیجہ عام غریبی کی صورت میں ظاہر ہے۔ مفلسی صرف اس طرح سے دور نہیں ہو سکتی کہ موجودہ دولت کو تقسیم کر دیا جائے اور نہ ہی صرف اس طریقے سے کہ ایک ایسا پروگرام اپنایا جائے جس میں صرف پیداوار ہی کو بڑھا دیا جائے بلکہ ان دونوں طریقوں سے ایک ساتھ کام لینا ہوگا۔ یعنی ایک طرف تو پیداوار میں اضافہ ہو اور دوسری طرف دولت کی مساوی تقسیم کی جائے۔ اسی طرح ملک ترقی کر سکتا ہے۔ چنانچہ مسئلہ صرف یہی نہیں ہے کہ معاشی تحریک کو موجودہ سماجی اور اقتصادی ڈھانچہ کے اندر ایک نیا روپ دیا جائے بلکہ ضرورت یہ ہے کہ اس ڈھانچہ کو بذاتِ خود اس طرح تبدیل کیا جائے کہ جس میں عوام کی تمام ضروریات ترقی یافتہ شکل میں سموئی جا سکیں جن کا اظہار، تعلیمی حقوق، کام کرنے کا حق، مساوی آمدنی وغیرہ قسم کے حقوق کے مطالبہ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔

کامیاب منصوبہ بندی کے مختلف لوازمات ہیں۔ قومی منصوبہ، ملک میں بنیادی متحدہ مقاصد کا مظہر ہوتا ہے اور یہی اتحاد ہے جو منصوبہ کے پیچھے قطعی اور فیصلہ کن طاقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ عوام اس کو قوت بخشتے ہیں اور اس میں اپنی قربانیوں سے رنگ بھر کر اسے مؤثر بناتے ہیں۔ مقاصد کے اس اتحاد کے ساتھ ساتھ حکومت کے پاس با اثر عملہ بھی ہونا چاہیئے جو بڑی لگن اور مضبوط ارادے کے ساتھ سرگرمِ عمل رہے تاکہ مقررہ پروگرام پر ترقی کے ساتھ عمل درآمد ہونے کا یقین ہو، اور اس تعمیری طاقت کا تعمیری استعمال انتظامی معاملات میں ذمہ داری کے احساس اور جوابدہی کو لازمی قرار دیتا ہے۔

حکومت کے ہاتھ میں اس مؤثر طاقت کو دے دینا کامیاب منصوبہ بندی کی پہلی اور لازمی سیڑھی ہے۔ قومی ترقیاتی کونسل کا فرض ہے کہ وہ دیکھے کہ ملک میں منصوبے پر باقاعدہ عمل ہو رہا ہے۔ منصوبہ بندی کا

مطلب یہ ہوا کہ حکومت کے زیر اثر اور حکومت کے زیر نگرانی ملک کی معاشیات ترقی پذیر رہے اور جس میں دوسری تنظیموں اور دوسرے تمام اداروں کو اُن کے مقررہ حلقے میں کام کرنے دیا جائے۔

تحریکِ امداد باہمی دوسری طرف ایک ایسی رضاکارانہ تنظیم ہے جس کی بنیاد اصولِ مساوات پر رکھی جاتی ہے اور جس کی نشوونما مشترکہ اقتصادی پیداوار کے سہارے کی جاتی ہے اور وہ سب لوگ جو اس میں شریک ہوتے ہیں اپنے مشترکہ وسایل کو استعمال کرکے اپنی ذاتی کمزوریوں پر غالب آجاتے ہیں۔ اس طرح اخلاقی یکجہتی کو بڑھاوا ملتا ہے۔ انفرادی مدد باہمی امداد کے ذریعے اثر پذیر ہو جاتی ہے۔ وہ لوگ امداد باہمی کے بل بوتے پر مفلسی کا جوا اُتار پھینکتے ہیں سرمایہ داری کی لعنت کو جمہوری نظام کے ذریعے دُور کرتے ہیں، جو ایک فرد کا ایک ووٹ کے اصول سے ظاہر ہے۔ وہ سرمایہ کے پھیلاؤ کو مناسب نہیں سمجھتے اس لئے کہ یہی تمام اُلجھنوں کی جڑ ہے۔ وہ اس لئے ایک دوسرے کے شریک نہیں ہوتے کہ منافع کمائیں، بلکہ ان کا مقصد ضروریات کو مہیا کرنا ہوتا ہے۔ وہ اس لئے یہ تنظیم نہیں بناتے کہ اس کے لئے انھیں مجبور کیا جاتا ہے بلکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کے اپنے مفاد کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔ وہ بڑی سچائی سے فرد کیلئے سماج اور سماج کے لئے فرد کے اصول پر عمل کرتے ہیں۔ یہ اس لئے نہیں کہ اس قسم کا اصول اُن پر ٹھونسا جاتا ہے، بلکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ اصول اُن کے اپنے فائدے کے لئے ہے۔ وہ رضاکارانہ تنظیم اور رضاکارانہ امداد پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ جماعت سے باہر کسی اور وسیلے کا سہارا نہیں ڈھونڈتے؛ بلکہ اپنے ذرائع اور وسائل پر نظر رکھتے ہیں۔ حکومت سے امداد لینا بُرا نہیں ہے بشرطیکہ اُن کی اپنی آزادی پر اس کا غلط اثر نہ پڑے۔ حکومت کا دخل انجمنوں کے اندرونی معاملات میں کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ امداد باہمی کی انجمنوں کے ممبروں کا خیال ہوتا ہے کہ وہ خود منصوبے بناتے ہیں اور اُن پر اس لئے عمل کرتے ہیں کہ وہ سب مل کر اس پر عمل کرنا پسند کرتے ہیں۔ دراصل وہ لوگ خود ہی حکمران ہوتے ہیں اور خود ہی رعایا۔

بادی النظر میں یہ دونوں خیالات ایک دوسرے سے متضاد معلوم ہوتے ہیں۔ منصوبہ بندی لازمی طور پر حکومت کی ہدایات اور نگرانی کو ضروری قرار دیتی ہے جبکہ امداد باہمی اس قسم کی کسی بھی کوشش کو شدّت کے ساتھ رد کرتی ہے۔ ایک منظم معیشت میں امداد باہمی کی صرف ایسی انجمنیں قائم رہ سکتی ہیں جن کو منصوبہ بندی جائز سمجھتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس قسم کی معاشی منصوبہ بندی میں امداد باہمی کی انجمنوں کا قیام ممکن نہیں۔ یا اگر اُن کو قائم کیا جائے تو پھر امداد باہمی کی خصوصیات کو نظر انداز کرنا پڑے گا اور اس بات پر مطمئن ہونا پڑے گا کہ یہ انجمنیں حکومت کے ہاتھ میں اس کے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے آلۂ کار بنی رہیں۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم کوئی آخری فیصلہ کریں ہمیں متعدد مسائل پر غور کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم سوال ہے کہ منصوبہ بندی کا مقصد کیا ہے؟ اس کا جواب بہت واضح ہے اور وہ یہ کہ منصوبہ بندی کا مقصد ایک فلاحی ریاست کا قیام ہے۔

زیادہ سے زیادہ پیداوار، انسانی محنت کا مکمل استعمال، معاشی مساوات اور سماجی انصاف کا حصول یہ سب منصوبے بندی کے تسلیم شدہ مقاصد ہیں۔ اس لئے منصوبہ بندی کا اصل مقصد اُن حالات کو جنم دینا ہے جن میں معیارِ زندگی معقول طریقہ سے بلند ہو اور تمام عوام مرد، عورت سب کو یکساں مواقع حاصل ہوں تاکہ وہ آگے بڑھ سکیں اور ترقی کر سکیں۔ پلاننگ کمیشن نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ دراصل ہمیں صرف ایسا انتظام کرنا ہے جس سے پیداوار کے معقول اضافہ کے ساتھ ساتھ صحتِ عامہ، صفائی اور تعلیم میں بھی ترقی ہو، اور ہم ایسے سماجی حالات پیدا کرنا چاہتے ہیں جن میں امتیازی طور پر ثقافتی ترقی ہو سکے۔ منصوبہ بندی کے معنی یہ ہونا چاہئیں کہ ان تمام شعبوں میں بیک وقت اور مسلسل ترقی ہو، جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان تمام کوششوں کا مقصد ایک خوشحال ہندوستان کو جنم دینا ہے۔ دوسری اہم بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ یہ مقاصد کن طریقوں سے پورے کئے جائیں یقینی طور پر جمہوری منصوبہ بندی ان مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ جولائی ۱۹۵۱ء میں پلاننگ کمیشن نے پلان کے مسودہ کو خاکے کی شکل میں شائع کیا تھا کہ اس پر ملک میں عام بحث ہو اور لوگ اپنی اپنی رائے دے سکیں۔

جمہوری ملک میں منصوبہ بندی ایک سماجی طریقۂ کار ہے جس کے بعض شعبوں میں ہر آدمی کو حصّہ لینے کا موقع ملنا چاہیئے۔ مستقبل کے لئے تعمیر و ترقی کا ڈھانچہ بنانے کا کام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اور اس کو ملک کی رائے عامہ اور عوام کی خواہشات کا آئینہ دار ہونا چاہیئے۔ قبل اس کے کہ تمام تجاویز پوری طرح سامنے آئیں، کمیشن نے لازمی سمجھا کہ منصوبے کا خاکہ اور مسودہ عوام کے سامنے رکھا جائے۔ مسودہ کو پیش کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اس پر

عام بحث ہو اور اس سلسلے میں رائے عامہ معلوم کی جا سکے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابتداء ہی سے عوام پر یہ ذمہ داری لازمی طور پر ڈالی گئی کہ وہ منصوبہ پر اپنی رائے کا اظہار کر کے اُسے مؤثر بنائیں۔ جہاں تک جمہوری منصوبہ بندی اور اس میں حکومت کے حصہ لینے کا تعلق ہے کمیشن اس سلسلے میں لکھتا ہے کہ منصوبہ بندی کے لئے کسی بھی تکنیک کو اختیار کرنے کا سوال ان بنیادی اقدامات سے منسلک ہے جن کو کوئی قوم اپنے مقاصد کے حصول کے لئے اختیار کرتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ایسا پلان اپنایا جائے جس کی بنیاد ایسے قاعدوں اور فوری مسائل پر ہو جو پہلے تو سماج میں اونچ نیچ کو مٹا سکیں اور بالآخر معیارِ زندگی کو بلند کر سکیں۔

عوام میں جوش و خروش اس وقت تک نہیں پیدا کیا جا سکتا جب تک کہ قوم کے اُن پس ماندہ طبقوں میں جن کے ساتھ ہمیشہ غیر مساوی برتاؤ روا رکھا گیا ہے اور پُرانے حکمرانوں نے ان کی ترقی میں روڑے اٹکائے ہیں۔ اس تاریخی فرق کو ختم کر کے ان میں یہ احساس بیدار نہ کر دیا جائے کہ وہ بھی سماج کے لئے اتنے ہی اہم ہیں جتنے دوسرے لوگ لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ جمہوری منصوبہ بندی کا بنیادی مقصد سماجی یکجہتی ہے اور اس کے پیشِ نظر یہ بات رہتی ہے کہ وقتی امتیازی برتاؤ سے سماج کے مختلف فرقوں میں کوئی خطرناک یا زہریلا عنصر اپنے کو برتر نہ سمجھ بیٹھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کوئی تبدیلی جو غلط طریقے سے کسی بھی مخصوص فرقے کو بے جا طور پر بڑھاوا دے یقیناً قابلِ اصلاح ہے۔ بلا شبہ اس فرق کو ختم ہونا چاہیئے مگر اس طریقہ سے کہ مختلف فرقوں میں کوئی رنج و عداوت پیدا نہ ہو اور نہ ہی کسی قسم کے دباؤ سے کام لیا جائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس تبدیلی کا فوری اثر ہو اور یقیناً حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ اُس کو بڑھاوا دے۔ اور اس سلسلے میں اپنے تمام اثرات اور وسائل سے کام لے۔ اس قسم کی منصوبہ بندی کی کامیابی دراصل سماج کے ایسے طبقات پر منحصر ہے جو پلان کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور با اثر ہیں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ حکومت کو معاشی ڈھانچے کی اس تبدیلی کے کام میں نہایت ہی اہم اور دشوار فرائض انجام دینا ہیں۔

پلاننگ کمیشن ایک دم سے مکمل بنیادی تبدیلیوں کو بروئے کار لانے کا ارادہ نہیں رکھتا اور نہ ہی کسی ایک کو براہِ راست عوام کی افسوس ناک معاشی حالت کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے، اور نہ ہی ان کے خلاف کسی عداوت، نفرت یا ظالمانہ اقدام کے بارے میں سوچتا ہے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ جس طرح ہمارے ملک میں سیاسی تبدیلی بغیر کسی خون خرابے کے ہوئی ہے ویسے ہی پُرامن طریقے سے سماجی و معاشی مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔ یہ سب کس طرح ہوگا؟ اس کا طریقہ واضح طور پر بتلایا گیا ہے یعنی عوام کا امداد باہمی کا جذبہ اور ان کی صائب رائے یہ دونوں چیزیں پلان کی پشت پناہ ہیں۔ ایک ایسی جمہوریت جو سماجی بہبود کے لئے کوشاں ہے عوام کی رائے پر ہی قائم ہوتی ہے نہ کہ اس کی بنیاد حکومت کے ظالمانہ اور غیر منصفانہ اثرات پر رکھی جاتی ہے اور یہ بات امداد باہمی کے اصول اپنانے کے لئے رہبری کرتی ہے تاکہ یہ اصول سماجی تحریکات اور ایسے کاموں میں استعمال ہوں جن سے کہ تمام افراد ایک مشترک مقصد کے حصول کے لئے مل جل کر کام کریں۔ عوام کو مل جل کر اپنے تمام ذرائع سے اس طرح کام لینا ہے کہ منصوبہ بندی اور اس پر عمل درآمد میں مدد مل سکے۔ اس سلسلے میں جو کوئی پروگرام بنایا جائے، پیش کیا جائے اور پھر اس پر عمل درآمد کیا جائے تو یہ بات واضح طور پر پیشِ نظر رہے کہ حکومت کے ذرائع سے جو کام پورے کئے جائیں گے ان میں عوام کی بہبود اور ان کی فلاح سب سے مقدّم ہوگی اور اس خیال کے پیشِ نظر عوام کا جوش اور ان کی رائے اور عملی تعاون ان کی پُر جوش امداد کے مترادف ہوگا۔ منصوبے پر عمل درآمد کرتے وقت یہ خیال رہے کہ اس کی بنیاد حکومت کے با اثر لوگوں سے زیادہ عوام کے امداد و تعاون اور ان کی رائے پر قائم رہے۔ منصوبے کو مؤثر بنانے کے لئے ہر طرح کی امداد باہمی کی انجمنوں کو بڑھاوا دیا جائے اور یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس قسم کی تحریکات عوام کو اپنی مشترکہ ضروریات پوری کرنے کے لئے متحد کرتی ہیں۔ مشہور ماہر اقتصادیات باربرا ووٹن کے اس قول کو پلاننگ کمیشن نے دہرایا ہے کہ "منصوبہ بندی میں کشش پیدا کر کے" اور اس میں فلاح کی جاذبیت سمو کر عوام کی توجہ اس کی طرف مبذول کرانا ہمیشہ اچھا ہوتا ہے بہ نسبت اس کے کہ عوام کی توجہ زبردستی اور غلط اثر ڈال کر اس طرف مبذول کرائی جائے۔"

منصوبہ بندی کی طرف توجہ کی ترغیب دلانے کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً حکومت عوام سے عملی تعاون کے لئے اپیل کرے یا ان لوگوں کو اس قسم کے حقوق دینے سے انکار کر دے جو ایک طے شدہ پروگرام میں ۱۰
شامل نہ ہوں۔

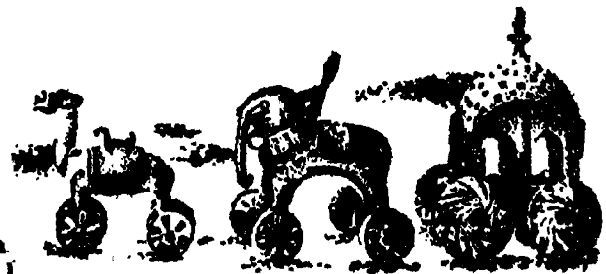
امداد باہمی منصوبہ بندی کمیٹی نے اس لحاظ سے باہمی امداد کی انجمنوں کی اہمیت پر زور دیا ہے کہ اس کے ذریعہ منصوبے کی اسکیموں کو پورا کیا جائے کیونکہ انجمنیں اس مقصد کے حصول کے لئے موثر آلہ کار ہیں۔

امداد باہمی جمہوری منصوبہ بندی کے لئے نہایت ہی اہم اور موزوں ترین ذریعہ ہے۔ امداد باہمی دو نہایت اہم کام انجام دینے میں موثر آلۂ کار ثابت ہو سکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ رائے عامہ کو اصولی طور پر پرورش کرنا، دوسرے رائے عامہ کو منصوبہ کے لئے تعمیری طریقہ سے استعمال کرنا۔ حکومت لازمی طور سے اس کی خواہاں ہوگی کہ سماج کے سب ہی طبقوں کی فلاح و بہبود کا خیال رکھا جائے جن کے لئے اور جن کے ذریعہ منصوبے کو عمل میں لایا جا رہا ہے۔ انجمن امداد باہمی منصوبے کا مطالعہ کر کے اپنے اراکین کو سمجھا سکتی ہے اور اس طرح ان کی عام ہمدردی اور مدد حاصل کر سکتی ہے تاکہ وہ کامیاب طریقے پر منصوبہ چلایا جا سکے۔ ان انجمنوں کا ایک عام فائدہ یہ ہے کہ ان میں ایک ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر انجمن کے کاموں میں بھی اس قسم کی ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے کہ مختلف معاشی و سماجی درجوں کے اور ایسے افراد ہیں جن کے طور طریقے اور جن کی ضروریات الگ الگ ہوا کرتی ہیں اور ان کے معاشی تعلقے بھی مختلف ہیں ان میں بھی ایک مناسبت اور موزونیت پیدا کی جا سکے۔

اس سلسلہ میں گورنمنٹ کی ہدایات یقیناً قابل قدر ہیں۔ ان پر عمل پیرا ہونا ہندوستانی کسان کو خود انحصار بنانے کی راہ میں ایک دانشمندانہ اقدام ہے۔ دوسرے پلان میں ۴۷ کروڑ کی جاری رقم امداد باہمی کے لئے مخصوص ہونے سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت واضح طور پر اس تحریک کی اہمیت کو مانتی ہے۔



ہماری دستکاریوں سے متعلق





بھارتی دستکاری ـــــ بھارت کا قدیم ورثہ

صدیوں پہلے "فولادِ ہند" ناقابلِ تسخیر طاقت کی علامت سمجھا جاتا تھا

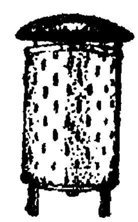
لیکن اس پہلو سازی کے علاوہ بھارت میں دھات کو طرح طرح کی چیزیں بنانے کے لیے بھی بڑی خوش اسلوبی سے برتا گیا ہے۔

دھات جس میں ہماری چند اہم دستکاریاں رہی ہیں۔ چاندی، پیتل اور تانبے کے تصویری پیالے اور رکابیاں، سیاہ سطح پر چاندی کے خوبصورت نقش و نگار والی بیدری چیزیں، پھولدان اور سگریٹ کے راکھ دان، پیتل کا مراد آبادی آرائشی سامان، جانوروں کے ملمع شدہ یا سادہ پیتل سے تیار ہونے والے چھوٹے چھوٹے مجسمے اور دلکش میناکاری کی چیزیں، مصری نگینوں کی کلاسیکی دستکاری، چاندی پر کھدائی کے کام والی کشمیری اشیاء اور کشمیر و اڑیسہ کا جالی کا کام، ممبئی میں تیار ہونے والی آکسیجن زدہ تانبے کی چیزیں اور مدھیہ پردیش میں بننے والے دھات کے کھلونے۔

عام استعمال کے کسی شکل اور سائز کے پھولدان وغیرہ ہوں یا منقش ظروف اور ملمع شدہ آرائشی سامان ہو، ہماری دھاتی دستکاری میں کسی چیز کی کمی نہیں۔ دھات کوئی ہو اور بنانے کا طریقہ چاہے کیسا ہو، بھارتی دستکاری کے ہر نمونے سے ہنرمندی کا ایک انوکھا اسلوب جھلکتا ہے۔



کُل بھارت دستکاری بورڈ
وزارت تجارت و صنعت
بھارت سرکار




روز بہ روز بہ روز ...
ریکسونا
صابن
آپ کی جلد کو
نکھارے چلا جاتا ہے
Rexona
BLENDED WITH CADYL
R.P. 158-X52 UD

Edited and Published by the Director, Publications Division., Old Secretariat, Delhi—8
and Printed by the Model Press Private Ltd., Delhi.

Regd. No. D-509.

آجکل



۵۰ نئے پیسے

جیٹھ شک سمت ۱۸۸۱
جون سنہ ۱۹۵۹ء

ترتیب

سرورق۔ دارجلنگ کی شاداب وادی

جیٹھ شک سمت ۱۸۸۱

جون ۱۹۵۹ء

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر "آج کل" معرفت اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸

اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آج کل

دہلی

سالانہ چندہ — ہندوستان میں: چھ روپے؛ پاکستان میں: چھ روپے (پاک)
غیر ممالک سے: دس شلنگ یا سوا ڈالر
فی پرچہ — ہندوستان میں: ۵۰ نئے پیسے؛ پاکستان میں: آٹھ آنے (پاک)

جلد ۱۷۔ نمبر ۱۱

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند
پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ملاحظات

ہم نے ملک کو سوشلسٹ طرز پر ڈھالنے کا بیڑا اٹھایا ہے اور ایسا سماج بنانے میں لگے ہوئے ہیں جس کے ہر شعبہ میں مساوات کا برتاؤ ہو، عوام کا معیارِ زندگی بلند ہو اور چاروں طرف خوشحالی کا دور دورہ ہو۔ بقول پنڈت نہرو ہم جس ہندوستان کا خواب دیکھ رہے ہیں اس میں ہر شخص کو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے مساوی مواقع حاصل ہوں گے۔ وہاں نہ تو بہت زیادہ امیر لوگ ہوں گے اور نہ بہت زیادہ غریب۔ بلکہ ان میں مساوات ہوگی۔ اس کے ساتھ ذات پات کے اختلافات سے بھی نجات مل جائے گی اور سب لوگ دیس اور دیس والوں کی ترقی کے لئے کام کریں گے۔ اس وقت ہمارے پاس تقسیم کرنے کے لئے غریبی کے سوا کیا ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ پہلے ملک کی دولت بڑھائیں تاکہ اُسے مساوی طور پر تقسیم کرکے ملک کے عوام کا معیارِ زندگی بلند کیا جا سکے۔

ملک کی تعمیر و ترقی کے جو بڑے بڑے کام کئے جا رہے ہیں، ان میں فولاد کے کارخانے قائم کرنے کا کام بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ فولاد کو صنعتی ترقی میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ رورکیلا اور بھلائی میں فولادی کارخانوں کی تیز رفتار ترقی نہایت حوصلہ افزا ہے۔ ۱۶۔ اپریل کو وزیرِ داخلہ پنڈت پنت کے ہاتھوں رورکیلا کے کارخانے کی پہلی بھٹی کا افتتاح ہوا۔ بقیہ تین بھٹیاں بھی قریب تیار ہیں۔ ان میں سے ہر ایک بھٹی اسّی ٹن فولاد پیدا کر سکے گی۔ امید ہے کہ ان چاروں بھٹیوں کی مجموعی پیداوار ۲½ لاکھ ٹن سالانہ ہوگی۔ اس کارخانے میں فولاد کی سلاخیں تیار ہوں گی جو جہازوں کی تیاری میں کام آئیں گی۔

بلاشبہ فلمیں عوام کی تعلیم و تربیت کا بہترین ذریعہ ہیں اور اس ذریعہ سے کام لے کر سماجی زندگی میں انقلاب پیدا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ آزادی کے بعد سے ملک میں معلوماتی فلمیں بنانے کی طرف بڑی توجہ کی جا رہی ہے اور حکومت ان کی قدر اور ہمت افزائی کرتی ہے۔ ہر سال راشٹرپتی کی طرف سے اچھی فلموں کو انعام دئے جاتے ہیں۔ ۱۹۵۸ء کی بہترین فیچر اور دستاویزی فلموں کے پروڈیوسروں کو حال ہی میں انعامات ملے ہیں۔ ان میں بنگالی فیچر فلم "ساگر سنگمے" خاص کر قابلِ ذکر ہے جس کو راشٹرپتی گولڈ میڈل اور ۲۰ ہزار روپے کا نقد انعام ملا۔ اس کے علاوہ دستاویزی فلم "رادھا کرشن" (انگریزی) کو بھی راشٹرپتی گولڈ میڈل اور ۴ ہزار روپے کا انعام دیا گیا ہے۔

قاضی عبدالودود

تذکرۂ صادقہ

اور

لسان الصدق

ریویو بر کتاب مستطاب تذکرۂ صادقہ از مجمع فضائل و محاسن شاعر با کمال سخنور بے مثال مولوی ابو الکلام محی الدین احمد صاحب آزاد دہلوی مقیم کلکتہ صانہ اللہ عن شر در الحوادث[1] ....

وضعِ زمانہ قابلِ دیدن دوبارہ نیست رو پس نکرد ہر کہ ازیں کارواں گزشت

"تذکرۃ الاسلاف تبصرۃ الاخلاف" عربی کا ایک اعلیٰ درجہ کا مقولہ ہے جس کا سچا مصداق یہ "تذکرۂ اہلِ صادقپور" ہے۔ اس کے مؤلف اس خاندان کے یادگار جناب مولانا عبدالرحیم صاحب صادقپوری ہیں جنھوں نے اپنی لائف اس کتاب کے صفحہ ۱۳۰ سے صفحہ ۱۵۰ تک درج کی ہے۔

فاضل مؤلف نے اس تذکرہ میں اس خاندان کی تمام کیفیت اور تمام اہلِ خاندان کے حالات نہایت عمدگی سے تحریر کئے ہیں بالخصوص ایسی حالت کہ تمام خاندان کا شیرازہ پریشان ہو چکا ہو۔ اور واقفیت و تحقیق کے بہت کم ذرائع باقی رہ گئے ہوں۔ اُن کی یہ کتاب نہایت مفید اور خاندان کے بقائے دوام کا عمدہ ذریعہ ہے۔ غور سے دیکھو تو جس قدر یہ تذکرہ عبرت کا یقین دلاتا ہے اور جس قدر اس خاندان کے تمام واقعات انسان کی طبیعت کو متأثر کرتے ہیں۔ غالباً بہت کم ایسے تذکرے اور ایسے واقعات ہوں گے اول تو عروج و زوال کی تصویر جس قدر بہتر اس تذکرہ سے کھنچ سکتی ہے کسی واقعہ سے نہیں کھنچ سکتی۔

ایک خاندان کا یہاں تک ترقی کرنا کہ دولتِ علم اور دولتِ مال میں ان کی نظیر نہ ہو، ہزاروں ان کے جاننے والے ہوں۔ ہزاروں جان نثاری کے لئے موجود ہوں۔ خاندان کا خاندان ایک موقع پر مسکن گزین ہو جائے۔ اور اتفاقی صورت کا نام صادقپور اختیار کرے۔ باوجودیکہ یہ نام ایک شہر کے کسی حصے سے تعلق رکھتا ہو مگر اس کی ترقیات جزئی شہرت سے بڑھ کر کلی شہرت سے بھی بڑھ جائے علمی حیثیت سے دیکھو تو بڑے بڑے مصنف اعلیٰ درجہ کے واعظ خاندان میں موجود ہوں۔ دولت کے لحاظ سے دیکھو تو تمام موجودہ دولت مندوں میں ان کے ڈنکے بجتے ہوں۔ پھر یکایک اس خاندان کا ایسے درطۂ تنزل میں آ پڑنا جس سے ان کی تمام ترقیات پر پانی پھر جائے یعنی سرے سے بیڑا ہی ڈوب جائے، کوئی نام لیوا نظر نہ آئے۔ خود بیچ پراگندہ ہو جائیں۔ دم کے دم میں کارخانہ ہی پلٹ جائے۔ اور ایک آنکھ کی طرح بند کرنے والا جب ایک پل کے بعد آنکھ کھولے تو اُسے بجائے ایک خوبصورت محل کے ایک وحشت ناک لق و دق میدان چٹیل نظر آئے۔ نہ اوس کے سربفلک محلوں کا کچھ نشان معلوم ہو اور نہ اس صادقپوری دیواروں کی کچھ یادگار باقی ہو، بس ایک انقلابی صورت دیکھنے والے کو حیرتی اور مبہوت بنا دے۔ ہائے آں صادقپور یہ کجاست و اہلِ صادقپور یہ کجا اند!

: مکاں را مشکنے، و نہ مکیں را مکنے۔ الہی ایں چہ بیت !!

یہ سب کچھ کیوں ہوا کس نے ہوا ہوا بس بس! یہ کچھ نہیں معلوم! ہاں اُس حکیم علی الاطلاق خالق دو جہان کی یہ جو آنجا قدرتوں میں سے ایک انقلاب کنندہ قدرت ہے کہ اقبال کو تنزل سے بدل دیتا! مگر اس کا سبب ظاہری تیرہ نا انصافی کے اور کچھ نہیں قرار پاسکتا۔

---

[1] اس کے بعد عربی عبارت جس کا تعلق مصنف یا تبصرہ نگار سے نہیں۔

اب دیکھو کہ یہ بیان انسان کو اُس کی بے انتہا قدرت کاملہ اور نا انصافی کی برائیوں کا یقین دلاتا ہے اور سننے والے کو کس قدر مؤثر کرتا ہے! ہاں! اور نہیں تو تم ذرا اپنے ہی دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھو کہ کیسا کانپ رہا ہے! کیسی ہولناک کیفیت پیدا کر رہا ہے۔ اس سے اور اس سے بہتر اور اس سے بڑھ کر اور کیا حالت مؤثرہ ہوگی!!

پھر اس خاندان کے جو پس ماندہ تھے ان کے ساتھ کس طرح یہ فلک کج رفتاری سے پیش آیا؟ اور کون سی مصیبت تھی کہ اُن پر نہ آئی ہو اور وہ کون سی سختی تھی کہ انھوں نے جھیلی نہ ہو مگر ساتھ ہی اون کا بے نظیر صبر و تحمل۔ اور اس ناگفتہ بہ حالات میں بھی اللہ کا شکر ادا کرنا صبر و شکر کی ایسی عمدہ تعلیم دیتا ہے کہ اس سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتی!! اس کے بعد پھر اتفاق اور استقلال کا ساتھ دینا۔ ایک کوشش کرنے والے کی کوشش سے خاندان کا پھر ترقی کرنا اسکول کا جاری ہونا علم کا ساتھ دینا۔ اس سب کچھ کا ایک اتفاق کی بدولت ہونا کیا اتفاق کی تعلیم نہیں دیتا؟

واقعی یہ کتاب اول سے آخر تک خاص خاص کیفیتوں اور حالتوں کا فوٹو پیش نظر کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مولف موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ انھوں نے یہ کتاب تالیف فرمائی ادھر ادھر سے کوشش کر کے واقعات اکٹھا کئے چٹھیوں کے ذریعے سے شائع کر کے تذکرہ تیار کیا اور ہم لوگوں کو مستفیض ہونے کا موقع دیا۔ میرے مکرم دوست جناب مرزا محمد یوسف صاحب جعفری جیسے مولوی بورڈ آف اگزامنرس کلکتہ کی فرمائش سے میں نے ایک مثنوی فارسی تقریظ میں نظم کی تھی مگر قلت گنجائش کے سبب سے یہاں درج نہ ہو سکی۔ تین قطعہ تاریخ درج کرتا ہوں۔

قطعہ تاریخ تقریظ تذکرہ صادقہ

مژدہ اے والہان صادقپور — مژدہ اے عاشقان روئے وطن
حضرت مولوی عبد الرحیم — صاحب علم و ماہر ہر فن
تذکرہ یہ انھوں نے لکھا ہے — جس کی تعریف میں زبان الکن
نقطہ نقطہ ہے خال روئے بتاں — صفحہ صفحہ بیاضِ صبحِ چمن
واقعات صحیح لکھے ہیں — جس میں کچھ بھی نہیں ہے جائے سخن
تذکرہ یہ وطن کا نامہ ہے — اس پہ شیدا ہیں عاشقان وطن
اس میں لکھا ہے حال صادقپور — جو کبھی تھا علوم کا گلشن
جو بزرگوں کا تھا کبھی ملجا — جو بزرگوں کا تھا کبھی مسکن
عالم و فاضل و ادیب و حکیم — الغرض کاملوں کا تھا مخزن

شمعِ بزمِ کمال جیسے تھے — جن سے بیت العلوم تھا روشن
اس کو کہیے ذرا کمال اگر — اس کو کہیے کمال کا معدن
ہائے دیکھو یہ گردش دوراں — ہائے دیکھو زمانہ کے یہ چلن
اک خزاں لوٹ لے گئی سب کچھ — اب نہ وہ پھول ہیں نہ وہ گلشن
ان فقط یادگار ہیں باقی — جن سے اب نام اون کا ہے روشن
بیست و ششم حضرت مخدوم — جن کی توصیف کیجئے تا ممکن
اون کا ارشاد تھا لکھو تاریخ — اون کا اصرار تھا کہ تعجیل
تھی اسی فکر میں پریشانی — خود میں تھا کہ ناگہاں ندا
دل سے آزاد کے ملی تاریخ — ہے طرازندہ ذکر اہل وطن

ولہ

اس رسالے کی کس سے ہو تعریف — واقعی فیض کا مقالہ ہے
ہر روایت ہے مستند اس کی — معتبر اس کا ہر حوالہ ہے
سر سے آزاد لکھ دو ہجری سال — خیر آفاق یہ رسالہ ہے

ولہ

قطعہ تاریخ طبع کتاب مذکور

چاپ گردید این کتاب نفیس — فکر شاں را صد آفرین بادا
از غیب ہاتف این ندا آمد — سرمۂ چشم ناظرین بادا

ص ۱۷۱ تا ۱۷۲

الدر المنثور فی تراجم اہل صادقپور معروف بہ تذکرۂ صادقہ
از عبد الرحیم مطبوعہ ہادی المطابع نمبر ۱۴۱ ہریسن روڈ کلکتہ
سنہ ۱۳۱۹ھ ۱۹۰۱ء

یہ تبصرہ لسان الصدق میں ہے

الدر المنثور فی تراجم اہل صادقپور۔ عظیم آباد پٹنہ میں صادقپور ایک قدیم محلہ ہے جس کی ایک زمانے میں عظیم آباد سے بھی زیادہ شہرت تھی اور عظیم آباد کو لوگ صادقپور کے پٹنے سے جانتے تھے۔ (ایک نقطہ کم [illegible]) علماء صلحاء اطباء اسی صادقپور کی خاک پاک سے پیدا ہوئے اور پیوند خاک ہو گئے۔ جب سید احمد مرحوم رائے بریلوی سکھوں سے جہاد کرنے کی غرض سے ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے اور ان کا کچھ عرصے تک قیام پٹنہ میں بھی ہوا تو خاندان صادقپور کے تمام افراد نے سید صاحب

کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی اور جان و دل سے فدا ہونے کو تیار ہو گئے۔ تاریخ ہند کا وہ عجیب زمانہ جب کہ وہابیت کے مضمون نے جہاد و بغاوت کی صورت سے گورنمنٹ کے دل میں جگہ پائی تھی۔ ایسا پُر آفت زمانہ تھا کہ کسی شخص کو وہابی کہنا یہ مفہوم رکھتا تھا کہ اب بیچارے کا ارادہ بحرِ اسود کی سیر کا ہو چلا ہے۔ اسی زمانے میں گورنمنٹ ہند کو اس خاندان پر شبہ ہوا کیونکہ سید صاحب کے ہمراہیوں میں سب سے زیادہ پُرجوش اور جان و دل فدا کرنے والے اکثر صادق پوری تھے۔ چند واقعات نے اس شبے کو یقین تک پہنچایا اور شبے کا اثر عمل تک پہنچا۔ پھر نہ پوچھو کہ اس خاندان کا حال کیا ہوا۔ جتنے بزرگ خاندان میں موجود تھے وہ قید ہو گئے اور عورتیں بچے ادنیٰ حالت پر چھوڑ دیے گئے۔ بیس بیس برس تک قید رہے۔ کیسی کیسی مصیبتیں اُٹھائیں لیکن باوجود اس کے سچائی اور صبر کا رشتہ ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہی گورنمنٹ ہ آپ سے بیٹھے اس پر مہربان تھی مہربان ہو گئی۔

الدر المنثور فی تراجم اہل صادق پور کے اسی خاندان کے ایک یادگار جناب مولانا عبدالرحیم صاحب عظیم آبادی مصنف ہیں جس میں انھوں نے اول بمقدمۂ وہابیان بنگالہ کی کیفیت بیان کی ہے اور ان مصائب کا ذکر کیا ہے جو اُن پر اور اُن کے خاندان پر اس زمانے میں گزرے۔ اس کے بعد تمام خاندانی بزرگوں کا جن میں بہت سے پیوند خاک ہو چکے ہیں اور کچھ موجود ہیں، حالات لکھے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کتاب بہت دلچسپ ہے اور ترقی و تنزل (در و تین الفاظ کرم خوردہ)۔ افسوس ہے تو اس کا ہے کہ کتاب کی طرزِ عبارت اور طریقِ ترتیب بالکل قدیم طریقے پر رکھی گئی ہے اور اس لئے جدید اردو کے مزے لینے والے اسے دلچسپی کے ساتھ نہیں پڑھ سکتے۔ غالباً اس کے مصنف کی ایک عرصے تک گوشہ نشینی اور اس لٹریری انقلاب سے ناواقفیت اس کا باعث ہوئی ہو گذشتہ صدی کی اخیر چوتھائی میں واقع ہوا ہے۔ باوجود اس کے چونکہ اس موضوع پر اور کوئی کتاب نہیں ہے، اس کی قدردانی کرنی ضروری ہے۔ جو حضرات اس کتاب کو خریدنا چاہیں ۸ قیمت پر مصنف ممدوح سے پٹنہ، محلہ دیوان محلہ میر شکار ٹولہ کے پتے سے منگوائیں۔ ایڈیٹر۔

لسان الصدق

لسان الصدق کا ایک شمارہ جس کے کچھ اوراق ضائع ہو چکے تھے، میری نظر سے گزرا تھا اور مجھے یاد ہے کہ اس میں حیاتِ جاوید مصنفہ حالی کی تنقید کا ایک حصہ تھا۔ مگر یہ شمارہ جہاں تھا، وہاں سے منگوایا تو اس کے صرف ۴ صفحے ملے، جس میں تنقید مذکور نہیں۔ یہ رسالہ ابتدا میں ۱۶ صفحوں کا ہوا کرتا تھا لیکن اپریل ۱۹۰۴ء کا شمارہ ۲۴ صفحوں کا ہے۔ یہ ہادی المطابع واقع ہیرسن روڈ نمبر ۱۴۱ کلکتہ میں چھپا کرتا تھا اور اس کا کاغذ اور اس کا چھاپا کسی طرح قابلِ تعریف نہ تھا۔

شمارۂ اپریل کے باقی ماندہ صفحات کے مندرجات یہ ہیں: (۱) کرزن گزٹ دہلی یا چراغ دہلی مصنفہ حیرت دہلوی کا تبصرہ از ایڈیٹر۔ اس کا ایک اقتباس یہ ہے:

"بعض واقعات بھی غلط لکھے گئے ہیں مثلاً میرزا غالب مرحوم کے حالات میں ان کے سفرِ کلکتہ کی اصلی وجہ شاگردانِ قتیل سے مباحثہ بیان کی ہے، حالانکہ میرزا غالب محض اپنی خاص ضرورتوں سے کلکتہ جانے پر مجبور ہوئے تھے۔ ان کو اپنی پنشن اور خطابات متعلق گورنمنٹ انگریزی سے کچھ خط و کتابت کرنی تھی اور اس لئے دار السلطنت میں آنا ضرور تھا اور غالباً مرزا حیرت صاحب نے مولانا حالی کی یادگارِ غالب ملاحظہ نہیں فرمائی ہے، ورنہ ایسی غلطی نہیں ہوتی۔" (۲) "الدر المنثور فی تراجم اہلِ صادق پور" کا تبصرہ از ایڈیٹر۔ (۳) "لسان الصدق کے متعلق بعض معزز ہمعصروں کی رائے" (الف) تبصرۂ "دلچسپ" بابت دسمبر ۱۹۰۳ء (ب) ریڈورڈ گزٹ شاہجہانپور بابت ۲۹ جنوری ۱۹۰۴ء:

"ہمارے لائق مہربان ابو الکلام مولوی محی الدین صاحب آزاد دہلوی نے لسان الصدق جاری فرمایا ہے۔ اس کے مقاصد نہایت عمدہ اور مفید ہیں۔ اول اصلاحِ معاشرت... دوسرا مقصد ترقیٔ اردو... تیسرا مقصد علمی مذاق کی اشاعت بالخصوص بنگالہ میں... چوتھا مقصد تنقید... ضخامت ۱۶ صفحے، قیمت سالانہ مع محصول عہ ... خط و کتابت اس پتے سے ہونی چاہیے: نمبر ۱۶ تارا چند دت اسٹریٹ کلکتہ، ابو الکلام مولوی محی الدین صاحب آزاد" (ج) نظام الملک مراد آباد بابت ۱۶ مارچ ۱۹۰۴ء۔ صفحۂ آخر میں "دلچسپ معلومات (اخبارات کے متعلق)" ہیں۔

ل۔ احمد

کلامِ وحشت کا ترقی پسندانہ پہلو

یہ مضمون ۲۰ جولائی ۱۹۵۵ء کو جناب وحشت کلکتوی کی پہلی برسی کے موقع پر پڑھا گیا تھا۔ اور معمولی حذف و اضافہ کے بعد پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ اعتراف کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ موضوعِ کلام اس سے زیادہ تفصیلی نظر چاہتا تھا۔ مگر اُس وقت اتنی مہلت نہ تھی۔ (ل۔ احمد)

یادگارِ وحشت کے اس اجتماع کو دیکھ کر ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ اپنے قومی ہیرو اور جوہرِ قابل کی قدر و منزلت کرنا زندہ قوموں کا شیوہ ہے۔ بحمد اللہ کہ ہماری قوم میں زندگی کے آثار ہیں لیکن معاً دوسرا خیال یہ ہوتا ہے کہ مردہ قومیں مردہ پرست بن جاتی ہیں۔ زندگی میں اپنے جوہرِ قابل کو مردود ٹھہراتی ہیں اور مر جانے کے بعد انھیں کو علیہ الرحمۃ کہتی، مزار بناتی اور عرس کرتی ہیں۔ تاریخ ہمارے حق میں یہی فیصلہ دیتی ہے۔

بحمد اللہ کہ وحشت اپنی زندگی میں مردود نہیں کئے گئے لیکن اُن کی خاطر خواہ قدر و منزلت بھی نہیں ہوئی۔ انھیں تا دمِ آخر تنخواہ اور پنشن سے سہارا لینا پڑا۔ حالاں کہ اس صدی میں اُردو کے کسی شاعر کا پہلا مجموعۂ کلام اتنا مقبول نہیں ہوا جتنا وحشت کا ہوا۔ حالی اور اقبال جیسی ہستیوں نے ان کے جوہرِ قابل کی کما حقہ داد دی۔ مگر اردو بولنے پڑھنے والی پبلک نے دیوانِ وحشت کی خرید سے انھیں بے نیازِ معاش نہیں کر دیا۔ زندہ قوموں کے کسی شاعر و مصنف کی ایک کتاب مقبول ہو جائے تو عمر بھر حاجت و ضرورت اسے نہیں ستاتی ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ وحشت کا جوہرِ قابل جو ستارہ بن کر رہ گیا اُس کی قدر دانی کی نوعیت اگر اس طرح کی ہوتی تو وہ آفتاب بن کر چمکتا۔

ذکرِ وحشت میں ایک اور حیرت میں ڈالنے والی بات یہ ہے کہ کلچری ترقی اور صناعت نوازی میں بنگال دوسرے ہندوستانی صوبوں سے بہت آگے ہے۔ لیکن اس فرزندِ بنگال کا کلام بنگلہ زبان میں جہاں تک میرا علم ہے منتقل نہیں ہوا۔ آج کے اس یادگاری مجمع میں بھی بنگلہ ادب کے نمائندے نظر نہیں آتے اور یہ حقیقت بیان اس لئے زیادہ قابلِ افسوس ہے کہ جناب وحشت کے تلامذہ میں حبیب مکرم جمیل مظہری، پروفیسر بیخود اور جناب شاکر جیسی ممتاز ہستیاں شامل ہیں۔ جن کا فرض تھا کہ وہ اس طرف توجہ فرماتے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ اگر بنگلہ ادب جناب وحشت سے روشناس ہوتا تو اُن کی پہلی برسی کے اس اجتماع کی شکل اور نوعیت دوسری ہوتی۔

حافظہ بہت سے تو محفوظ نہیں رہا لیکن جب جناب وحشت کا دیوان شائع ہوا تو میرے پاس ایسے وقت پہنچا کہ وہیں ادب پرست احباب موجود تھے۔ پیکٹ کھولا گیا اور ایک دوست نے پہلی غزل بلند آواز سے پڑھنا شروع کی اور جب یہ شعر پڑھا گیا:-

پایہ بہت کیا بلند اس نے حریمِ ناز کا
تا نہ پہنچ سکے غبار رہگزرِ نیاز کا

ذوقِ سلیم کا جس کو ذرا سا بھی بہرہ ملا ہے کون ہے جس کا سر نیاز شاعری کی ادبی عظمت کے سامنے نہ جھک جائے گا۔ یہی حالت و کیفیت ہم لوگوں کی ہوئی: سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ خموشی چھا گئی اور ہر شخص وہاں پہنچ گیا تھا جس مقام پر سے حضرت وحشت نے یہ شعر کہا تھا۔

مجھے اپنے ناقص حافظے کی شکایت ہے۔ لیکن اس وقت سننے کے بعد یہ شعر حافظے سے محو نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ نشست الفاظ میں بھی کبھی مغالطہ نہیں ہوا۔ اس

شعر کا موضوع ظاہر ہے کہ متصوفانہ ہے۔ اس لئے مغربی ذہنوں کو شاید کچھ دقت محسوس ہو۔ ورنہ یہ شعر دنیا کے منتخبات میں شمار ہو سکتا ہے۔

شاعرانہ کلام شاید بالاستیعاب مطالعہ کرنے کی چیز ہے بھی نہیں۔ بہرحال مجھے یہ موقع نصیب نہیں کہ کلامِ وحشت کا تفصیلی مطالعہ کرتا۔ لیکن ذہن و خیال پر اُن کی جو ادبی عظمت قائم ہو چکی تھی اس کی بناء پر جب میں نے [illegible] میں کلکتہ کا پہلا سفر کیا تو اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر عرضِ نیاز کرنا بھی ضروری سمجھا۔ اس وقت وہ برسرِ ملازمت تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی ملاقات مختصر ہی ہو سکتی تھی۔ لیکن اس مختصر ملاقات کے بعد میں پلٹا تو وحشت کی ادبی عظمت کے ساتھ اُن کی انسانی عظمت کا بھی گہرا اثر لے کر پلٹا۔

اس موقع پر جناب وحشت کے شاعرانہ کمال پر اظہارِ خیال کرنے کے لئے اُن کے دوسرے مجموعے پر نہایت سرسری نظر ڈال سکا ہوں اور اس لئے کوئی سنجیدہ بات کہنے کا اہل تو ہو نہ سکتا تھا۔ بہرحال عاجلانہ ورق گردانی سے جو اثرات مرتب ہوئے، عرض کئے دیتا ہوں۔

میرا پہلا تاثر تو یہ ہے کہ اتباعِ غالب پر وحشت کا فخر و انبساط حقیقت پر مبنی ہے۔ اس میدان میں اُترنے والوں کی تعداد کم نہ تھی۔ جو چند قدم چل چل کر بے حال بھی ہو گئے۔ مگر وحشت کامیاب ہی نہیں ہوئے بلکہ اس اعتبار سے منفرد بھی ہیں۔ غالب کو طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا قیامت نظر آیا تھا۔ لیکن غالب کے اتباع میں وحشت نے طرزِ بیدل کی تکمیل کی ہے۔ "پایہ بہت کیا بلند الخ" کی ذیل کے اشعار طرزِ بیدل کا کامیاب نمونہ کہے جا سکتے ہیں۔ دوسروں نے فارسی الفاظ اور ترکیبیں استعمال کرنے ہی کو اتباعِ غالب سمجھا۔ مگر جناب وحشت نے اس حقیقت کو پا لیا کہ غالب کی خصوصیت اُن کا فلسفیانہ اندازِ فکر ہے۔ وحشت کا اندازِ فکر تفلسف کے سانچے میں ڈھل گیا تھا۔ ان کی یہ خصوصیت مجموعۂ کلام کے ہر صفحے پر بکھری نظر آ جاتی ہے۔

وحشت نے قدماء کی روایاتِ شعری کو بجنسہٖ قائم رکھتے ہوئے موضوعاتِ غزل کو اپنے اندازِ بیان سے سنجیدگی بخشنے کے ساتھ تغزل کی خصوصیات برقرار رکھیں۔ اس اعتبار سے وہ قدامت پرست تھے، خود فرماتے ہیں ؎

جدّت پسندیوں کی طرف رُخ کروں گا کیا
اُترا نہیں ہے نشۂ جامِ کہن ابھی

لیکن روایتی تغزل اور فلسفیانہ تفکر کے ساتھ وحشت کے کلام میں مجھے ایک نئی چیز بھی ملتی ہے۔ جو اُن سے پہلے کے اساتذہ کے ہاں نہیں ہے۔ اور شاذ نظر آ بھی جاتی ہے تو وہ غیر ارادی یعنی نامحسوس شدہ ہوتی ہے۔ وحشت کے یہاں دوسری تمام خصوصیات اور محاسنِ شعری کے ساتھ فکر و خیال کا ترقی پسندانہ پہلو ملتا ہے! اور یہ ایک امرِ حقیقت ہے کہ جس وقت اُن کی شاعری کا شباب تھا۔ ترقی پسندی کی اصطلاح وضع نہ ہوئی تھی بلکہ ترقی پسندی کے مفہوم کا کسی کو خیال اور خواب بھی نہ آیا تھا۔ اس اعتبار سے وحشت کو اگر اردو شعر و ادب میں امامِ ترقی پسنداں کہا جائے تو بالکل حق بجانب ہوگا۔

شعرِ وحشت کا جزوِ غالب تغزل ہے۔ وارداتِ حسن و عشق دوہرائی گئی ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ اخلاقی قدریں بھی نظر انداز نہیں ہوتی ہیں۔ لیکن یہ سب تو دوسرے اساتذہ کے یہاں بھی ہے۔ میری نظر میں وحشت کو ممتاز بنانے والی چیز ان کے تفکر کی ترقی پسندانہ خصوصیت ہے۔

مادی فلسفے میں انسان سے تخلیقی محنت کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ روحانیت کے معلموں نے بھی عملِ صالح کو راہِ نجات بتایا ہے۔ اس جگہ مادی اور روحانی فلسفہ بالکل ہم زبان نظر آتا ہے۔ وحشت جدید دور کی مادی ترقیات کو دیکھ رہے تھے اور اُن کے مخالف یا معاند بھی نہ تھے۔ لیکن مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اُن کی ترقی پسندی مذہبی تعلیم کی صحیح فہم کی ممنون ہے۔ وحشت نے سب سے زیادہ فکر تعمیرِ عمل پر صرف کی ہے۔

ہر مسافرِ راہ رو کو رفیقِ سفر کی آرزو ہونا قدرتی بات ہے۔ لیکن وہ رفیقِ سفر اگر واقفِ منزل بھی ہو تو دوگونہ مقصد حاصل ہوتا ہے۔ مگر وحشت کی خود اعتمادی و خودداری رفیقِ سفر تو درکنار کسی راہبر کے ساتھ ہونے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتی، کوئی راہبر نہیں ملتا تو خوش ہیں کہ تنہا دشت پیمائی زیادہ پُرلطف ہوگی! خود اعتمادی کی یہ شاعرانہ توجیہ بے مثال ہے، کہتے ہیں ؎

نہ کیوں خوش ہوں کہ بڑھ جائے گا لطفِ دشت پیمائی
کوئی رہبر کہ جو ہو واقفِ منزل، نہیں ملتا

فارسی اور اُردو شاعری میں حقیقت و مجاز کے موضوع پر کتنا کچھ کہا جا چکا ہے۔ اور مجاز ہی کو حقیقت ماننے والے بھی بہت گزرے ہیں لیکن وحشت نے اس فرسودہ مضمون میں تفلسف کا رنگ دے کر ندرتِ بیان کا نمونہ سامنے رکھ دیا ہے ؎

نکل سکا نہ کبھی حلقۂ مجاز سے میں — اگرچہ مجھ کو حقیقت نما مجاز رہا

راہِ عمل میں پائے طلب بڑھانا ہی کلیدِ کامیابی ہے۔ پائے طلب کا اٹھنا ہمّت و حوصلہ پر مبنی ہے۔ اس خیال کا تکمیلی درجہ یہ ہے ؎

مژدہ اے پائے طلب، ہمّت کا پیغام آگیا
اُٹھ کہ فرمانِ عمل اے دل ترے نام آگیا

وحشت کے مسلک میں سعیِ باطل مہمل لفظ ہے۔ وہ محنتِ برباد پر متاسف نہیں ہوتے۔ کرم کا فلسفہ یہی ہے اور "اسعیٰ منی" کی تعلیم بھی اس کو سرگرمیِ عمل کی معراج کہتی ہے ؎

لطف ہی آتا رہا ہے سعیِ باطل میں مجھے
ہے یہاں افسوس کس کو محنتِ برباد کا؟

وحشت کا عقیدہ ہے کہ سعی میں پورا انہماک قضا و قدر کو شکست دے سکتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

راہِ اُلفت میں قضا حیران ہو کر رہ گئی
راہرو کی سرعتِ قطعِ منازل دیکھ کر

دعا و التجا وحشت کے مسلک میں مردود و مسترد ہیں کیوں کہ خود اعتمادی کے منافی ہیں۔ وہ اگر دست گیری چاہتے بھی ہیں تو ہمّتِ مردانہ سے :۔

بس اب اے ہمّتِ مردانہ آکر دست گیری کر
ہوائے التجا کب تک، تقاضائے دعا کب تک

اور پھر محرومی و نامرادی سے خود داری کا سبق سیکھتے ہیں :۔

تجھے محرومیوں نے بھی نہ دی تعلیم خودداری
ہوسِ تاثیر کی اے میری آہِ نارسا کب تک؟

وحشت کے عقیدے میں حیات نام ہے جہد کا جو غیر منقطع ہے۔ ساحل سے ٹکرا کر منجدھار میں لوٹ جانا ہی حیاتِ عمل ہے۔ اس لئے کہتے ہیں کہ :۔

جستجو کے ولولوں کو عافیت سے کام کیا
بار ہا ٹکرا کے پھر پھر ہی گئے ساحل سے ہم

قوتِ بازوئے انساں ہی بالِ سعادت ہے اور وحشت اسے بالِ ہما کی توہم پرستی سے افضل مانتے ہیں۔ علوئے خیال اور تکمیلِ موضوع کے اعتبار سے شعر کی بندی خاص کر بالِ سعادت کی ترکیب بے نیازِ تعریف ہے۔

ہے قوّتِ بازو میں ترے بالِ سعادت
تو ڈھونڈھتا پھرتا ہے اُسے بالِ ہما میں!

زمانے کی نامساعدت کا احساس ہے اور اپنی خطر پسندی کو جانتے ہیں مگر وحشت پھر بھی حیران ہوتے ہیں کہ بارِ حیات اٹھایا کیسے جا سکا! اس شعر کو اگر فضیلتِ انسان کا قصیدہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

زمانہ بھی مجھ سے نامساعد، میں آپ بھی دشمنِ سلامت
تعجب اس کا ہے بوجھ کیوں کر میں زندگی کا اٹھا رہا ہوں

اسی مضمون کو دوسرے شعر میں کہہ کر "زورِ مجبوری" کو قوت و طاقت بنا دیا ہے۔

اللہ رے زورِ مجبوری، خود مجھ کو حیرت ہوتی ہے
جو بار اٹھانا پڑتا ہے، کیوں کر وہ اٹھایا جاتا ہے

شکایتِ روزگار نہایت پامال مضمون اور شکست خوردگی کا ثبوت ہے مگر وحشت اس سے درسِ محبت یعنی درسِ انسانیت لیتے ہیں :۔

تو کسی کا ہو کے دیکھ اے شکوہ سنجِ روزگار
کیوں یہ کہتا ہے کہ دُنیا میں مرا کوئی نہیں

دُنیا بامید قائم کی حکیمانہ تعبیر اس طرح کرتے ہیں۔

ہمارے عقدۂ مشکل کے حل ہونے کا ایما ہے
پس از تاریکیِ شب، جلوۂ نورِ سحر ہم کو

حرکت ہی حیات ہے اور سکون کے معنی موت ہیں۔ وحشت نے اس نکتے کو یوں واضح کیا ہے :۔

نشانِ زندگیِ دل ہے، بے قراریِ دل
ہے اس کی موت اگر چین آگیا دل کو

اوپر بھی کہا جا چکا ہے کہ وحشت کے عقیدے میں سعیِ عمل کو پیہم ہونا چاہیئے، انھوں نے اپنے عقیدے کی بار بار تکرار کی ہے :

وہ کام میرا نہیں جس کا نیک ہو انجام
وہ راہ میری نہیں جو گئی ہو منزل کو

تھک کر کام چھوڑ دینے سے راحت نہیں ملتی۔ وحشت کا عقیدہ ہے کہ حقیقی راحت سعی و جہد کے اندر ہی ہے۔ کیوں کہ انسان کی مشقت پر دُنیا کی اور خود محنتی کی بھی آسائش کا انحصار ہے۔ اس جذبۂ علویہ کی کیا داد دی جا سکتی ہے۔ کہتے ہیں :۔

محنت ہی پہ موقوف ہے آسائشِ گیتی
کھوئی میری راحت، میری راحت طلبی نے!

آرزو یعنی طلبِ صادق میں الوہیت ہے۔ ایک مسلّمہ قول ہے کہ انسان کی خواہش اگر صادق و صحیح ہو تو پوری ہو کر رہتی ہے۔ وحشت اپنی حسرتِ تعمیر کو اسی لئے بنائے عشرت خانۂ اُمید کہتے ہیں۔

پڑ گئی بنیاد عشرت خانۂ اُمید کی
دل کے ویرانے میں کیا کیا حسرتِ تعمیر ہے

نامرادی پر وحشت دل فرود دُکھاتے ہیں لیکن شوقِ بہار میں جان دے دینے ہی کو معراجِ شوق جانتے ہیں:-

دی جان عندلیب نے شوقِ بہار میں
دیکھی نہ بدنصیب نے آمدِ بہار کی

وحشت کا مسلکِ زیست رجائی ہے۔ اس لئے بے بال و پری کو مجبوری کہتے اور وجہِ مایوسی نہیں بننے دیتے ہیں۔ ہوسِ بال و پر ہے تو بال و پر مل جائیں گے فرماتے ہیں:-

مجبور ہے مگر نہیں مایوس دل مرا
بے بال و پر ابھی ہوسِ بال و پر میں ہے

نامرادی میں آہ و فغاں کو وحشت فعلِ عبث اس لئے کہتے ہیں کہ قوتِ بازو سے کار برآری ضرور ہو گی:-

کام جو نکلا ہے زورِ بازوئے فرہاد سے
وہ نکلتا کیا فغان و نالہ و فریاد سے!

اپنے رجائی مسلک کے جواز و تائید میں وحشت جو گہری اور نازک دلیلیں تلاش کرتے ہیں، رجائیت کے فلسفے کے شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ اداسی گھر کی رونق اس لئے ہے کہ اس سے چشمِ بصیرت کو نویدِ خرّمی ملتی ہے۔

دیتی ہے چشمِ بصیرت کو نویدِ خرّمی
وہ اداسی جو ہماری رونقِ کاشانہ ہے

وحشت عافیتِ ساحل کو مسترد کر دیتے اور موجوں سے متقابل ہو کر زندگی کا مفہوم سمجھاتے ہیں:-

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موجِ دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

عشق کا حاصل مسلکِ وحشت میں ذوقِ عشق کے سوا کچھ نہیں ہے لیکن حسن اس راز سے واقف نہیں اس لئے بے مقصدی کو سعیِ بے حاصل سمجھتا ہے۔

مدعائے عشق میرا کچھ نہیں جز ذوقِ عشق
حسن کو حیرت، کہ یہ کس سعیِ بے حاصل میں ہے

وحشت کے عقیدے میں انسان کے علوئے ظرف کا رتبہ اس کے کام کی دشواری سے قائم ہوتا ہے۔

ہے شاید امتحاں منظور میرے ظرفِ عالی کا
فلک دیتا ہے مجھ کو کام جو دشوار ہوتا ہے

صبحِ عشرت کی اُمید میں شبِ غم بسر کر دینے ہی کو وحشت حقیقی عیش مانتے ہیں:-

نہ ہو اندوہ سے اندوہگیں ہے عیش گر مقصد
اُمیدِ صبحِ عشرت میں شبِ غم کو بسر کر دے

انسانی زندگی وحشت کے عقیدے میں کسی مقصدِ خاص کے لئے ملی ہے اور وہ اسے رائیگاں کر دینا جرم سمجھتے ہیں:-

ہے ایک مخصوص مقصد زندگی کا، یہ نہیں غافل
کہ اپنی عمر کو تو جس طرح چاہے بسر کر دے

انسانی عظمت کو گورکی نے یہ کہہ کر بیان کیا ہے کہ "انسان! اس لفظ میں کیسی گونج ہے" یا "اس لفظ کی صدا کتنی بھلی ہوتی ہے۔" وحشت نے اسی احساس و خیال کو کمالِ شاعرانہ انداز میں نظم کیا ہے۔ فرق جو ان دونوں کے اندازِ بیان میں ہے اسے مغربیت اور مشرقیت کا فرق کہا جا سکتا ہے:-

مری ہستی کی کیا ہستی مگر اے دیدۂ بینش
ذرا رنگینیاں تو دیکھنا اس نقشِ باطل کی!

مشکل سامنے آتی ہے تو حل ہونے کے لئے ہی آتی ہے۔ اور وہ حل اسی مشکل میں مستور ہوتا ہے۔

کلیدِ عقدۂ مشکل اسی عقدے میں پنہاں ہے
محرک تیز گامی کے لئے خود دوریِ منزل ہے

سعی و جہد وظیفۂ فطرت ہے۔ وحشت کی حقیقت بیں نظر کائنات کے ہر ذرے کو مقصدِ حیات کی تکمیل یعنی سعی و جہد میں دیوانہ وار مصروف دیکھتی ہے:-

نہیں اک ذرہ بھی عالم میں جدّ و جہد سے خالی
کشاکش سعی کی ہے عام، گویا سب کو سودا ہے

حیاتِ انسانی میں حق اور فرض لازم ملزوم ہیں۔ استقرارِ حق کے لئے ادائے فرض ضروری ہے اور فرض ادا کر دینے کے بعد حق از خود قائم ہو جاتا ہے اور ادائے فرض کے معنی ہیں عمل! اس لئے ادائے فرض کر کے حق قائم کرنے کے بعد خوش خلقی کی بھی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے۔ اس تعلیم سے وحشت نے انسانی وقار کو بہت بلند کر دیا ہے۔ یعنی مانگنا خودداری کی نفی ہے۔

اسی کا حق ہے جو ثابت کرے حق زورِ بازو سے
یہ نظریۂ فریبِ خلق معنیٰ سے مبرّا ہے

اپنا رنج و غم دوسروں کو سناتے پھرنا وحشت کی نظر میں خودداری کے منافی ہے اس لئے فعلِ مذموم ہے۔ اس لئے کہ کوئی کسی دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو نہیں سکتا یا نہیں ہوتا ہے۔ تو پھر دوسروں کو غمگین بنانے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں ؎

کوئی ہمدرد بھی دیکھا کوئی غم خوار بھی پایا؟
سُنائی تو نے سب کو درد و غم کی داستاں تو نے!

مشکل اوقات میں انسان امتحان میں پڑ جاتا ہے۔ اس وقت پست ہمت ہو جانا اور ہاتھ پاؤں ڈال کر بیٹھ جانا امتحان میں فیل ہو جانے کا مترادف ہے جو انسان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ فرماتے ہیں ؎

مصیبت کیا پڑی تجھ پر کہ گویا دست و پا ٹوٹے
دکھائی سخت کمزوری بوقتِ امتحاں تو نے

انسان کا شوق شور انگیز ہو اس لئے کہ زندگی کا ایک لمحہ ضائع ہو جانا تقاضئے عمل یعنی تقاضائے حیات کے خلاف ہے۔

شوقِ شور انگیز نے دم بھر نہ دم لینے دیا
عمر بھر مصروف ہم قطعِ منازل میں رہے

عملِ صالح کے لئے وحشت کے یہاں ہمت کا پیہم فرمان یہ ہے کہ توقف نہ کیا جائے۔ اس لئے کہتے ہیں کہ:۔

کر گزر بے توقف اگر کرنے کے قابل کام ہے
رد نہ کر لے دل اسے ہمت کا یہ پیغام ہے

وحشت کے عقیدے میں جبر و قدر کی گفتگو بس ایک فریب ہے۔ کیونکہ وہ حیاتِ انسانی کو جہانِ کار باور کرتے ہیں۔ فرمایا ہے کہ:۔

جہانِ کار ہے یہ اور تو دلِ ناداں
فریبِ مسئلۂ جبر و اختیار میں ہے

اور جہانِ کار میں آسائشِ تن کی آرزو جہل و نادانی ہے۔ یہاں تو تندہی کا مطالبہ ہوتا ہے۔

یہاں تو تندہی درکار ہے اور حیف اے غافل
جہانِ کار میں مطلوب آسائش تجھے تن کی

کام بگاڑتا آدمی خود ہے اور الزام دیتا ہے مقدر اور روزگار کو، اس کا حمق ظاہر ہے۔

جب اپنے ہاتھوں بگاڑے ہوں میں نے اپنے کام
پھر کیا محل رہا گلۂ روزگار کا؟

انسان اپنے ہر اچھے بُرے کام میں دُنیا سے موافقت چاہتا ہے مگر وحشت کا فیصلہ ہے کہ خود اس کے سوا انسان کا کوئی دشمن نہیں ہے ؎

موافقت کی توقع ہے مجھ کو عالم سے
نہیں ہے دہر میں میرے سوا عدو میرا

حیات موت پر غالب و مظفر ہے۔ اس پر وحشت کا حسین استعارہ واقعی سننے کے قابل ہے۔

رہ جائے گا فسانۂ رنگینیِ چمن
زائل خزاں سے رنگ نہ ہوگا بہار کا

اسی ذیل کے چند اور اشعار سنیئے:۔

آساں مٹانا اس کا نہیں مٹتے مٹتے ہی گا نقشِ اُمید — کل پھر وہ بنایا جائے گا جو آج مٹایا جاتا ہے
عجب کیا ہے کہ جھکتا ہو رہ ٹکرا کے ساحل سے — مری کشتی جو اب نزدیکِ ساحل ہوتی جاتی ہے
اگرچہ ہے تیرگی ہر سو کہیں تو کچھ روشنی ملیگی — رہی تری جستجو جو قائم تو راہ ایک دن کھلی ملیگی

یہ عالم ہر لحظہ منقلب ہے اس لئے ہر انقلاب سے ایک نیا پیغام حاصل کیا جائے۔

جانتا ہوں میں کہ جب ہر لحظہ ہے اِک انقلاب — ایک نیا پیغام آئے دم بدم میرے لئے

اردو شاعری کا عاشق التزاماً نامراد رہتا ہے یا روایتاً نامراد رکھا جاتا ہے مگر وحشت کی شاعری میں وہ نامراد اس لئے نہیں رہتا کہ اس کی مراد ہی نامرادی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

بس اُن کی بزم سے کچھ نامراد بھی پھر — بقدرِ شوق اگر بامراد آ نہ سکا
یا
نہ جانے لایا مجھ کو جانا اُن کی محفل میں — کہ باصد نامرادی بھی وہاں سے شادماں آیا

میں نہیں کہہ سکتا کہ جناب وحشت کی شاعری کے اس مخفی پہلو کے متعلق میں اپنے تاثرات کو آپ تک پہنچا سکا یا نہیں۔ اس لئے کہ بہت کم وقت میں اپنے خیالات و محسوسات کو قابلِ فہم شکل دینا بڑا ہی مشکل ہے۔ لیکن اس موقع پر میں اپنے کرم فرما جناب رضا مظہری کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ اگر وہ اصرار نہ کرتے تو میں کلامِ وحشت کی اس خصوصیت سے بے خبر ہی رہتا۔

مغیث الدین فریدی

چراغِ لالۂ طور

پیامِ مشرق کے پہلے حصے میں علامہ اقبال نے لالۂ طور کے عنوان سے تقریباً دو سو رباعیاں کہی ہیں۔ ان تمام فارسی رباعیوں کا منظوم ترجمہ عنقریب کتابی صورت میں شائع ہونے والا ہے۔ چند منتخب رباعیوں کے منظوم ترجمے حسبِ ذیل ہیں۔ (فریدی)

اقبال — **ترجمہ**

شہیدِ نازِ او بزمِ وجود است　　نیاز اندر نہادِ ہست و بود است
نمی بینی کہ از مہرِ فلک تاب　　بسیمائے سحر داغِ سجود است

بزمِ وجود اس کی اداؤں کی ہے شہید　　وقفِ نیازِ کارگہِ ہست و بود ہے
اعلانِ بندگی ہے نمودِ آفتاب کی　　پیشانیٔ سحر پہ بھی داغِ سجود ہے

(۲)

دریں گلشن پریشاں مثلِ بویم　　نمی دانم چہ می خواہم چہ جویم
بر آید آرزو یا بر نہ آید　　شہیدِ سوز و سازِ آرزویم

گلستاں میں پریشاں مثلِ بو ہوں　　نہ جانے کیوں ہلاکِ جستجو ہوں
برآئے آرزو یا بر نہ آئے　　شہیدِ سوز و سازِ آرزو ہوں

(۳)

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش　　براہِ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دستِ تو کارِ نادر آید　　گنہ ہم اگر باشد ثواب است

خود اپنے تیشے سے پیدا کر اپنی راہِ نجات　　کہ راہِ غیر پہ چلنا عذاب ہوتا ہے
وہ کام جس میں ہو کچھ ندرتِ عمل کی جھلک　　اگر گناہ بھی ہو تو ثواب ہوتا ہے

(۴)

بیا با شاہدِ فطرت نظر باز　　چرا در گوشۂ خلوت گزینی
ترا حق داد چشمِ پاک بینے　　کہ از نورش نگاہے آفرینی

اسیرِ گوشۂ خلوت ہے کیوں نگاہ تری　　نکل کے شاہدِ فطرت سے راہ پیدا کر
خدا نے تجھ کو عطا کی ہے چشمِ پاک نگہ　　تو اس کے نور سے زورِ نگاہ پیدا کر

(۵)

دلِ من روشن از سوزِ دروں است　　جہاں بیں چشمِ من از اشکِ خوں است
ز رمزِ زندگی بیگانہ تر باد　　کسے کو عشق را گوید جنوں است

ہے دل روشن مرا سوزِ دروں سے　　جہاں بیں آنکھ بھی ہے اشکِ خوں سے
وہ رمزِ زندگی کیا خاک سمجھے　　جو نسبت عشق کو دے جنوں سے

آغا اشہر لکھنوی

مختصر ذکرِ سفرِ واجد علی شاہ اختر سوئے کلکتہ

اور

واقعۂ تصنیفِ اشعار

یوں تو نواب واجد علی شاہ مغفور کا اقتدارِ حکومت ۴ - فروری ۱۸۵۶ء کو عملاً ختم ہو چکا تھا جب جنرل اوٹرام چند فوجی افسروں کے ساتھ دربارِ شاہی میں داخل ہوئے اور نشقۂ سرکار کمپنی پیش کیا جس کا مفہوم یہ تھا :-

"معاہدۂ ۱۸۰۱ء کی پابندی آپ سے نہ ہو سکی - لہٰذا انتظامِ سلطنت اودھ خود کمپنی کرے گی - اگر آپ کو بطورِ عذر کچھ کہنا ہو تو کلکتہ پہنچ کر گورنر جنرل سے کہہ سکتے ہیں ۔"

جس کے بعد نواب مغفور نے اپنے متعدد نمایندے گورنر جنرل کے پاس کلکتہ بھیجے مگر سب ناکام واپس آئے - آخر میں برجیس الدین کو یہ پیغام لے کے بھیجا کہ گورنر جنرل سے یہ عرض داشت لیں کہ نواب اودھ خود کلکتہ آ کر سپریم کونسل (عدالتِ عالیہ) میں اپنا معاملہ پیش کر کے تصاف طلب ہونا چاہتے ہیں - جواب ملا کہ وہ کلکتہ آ سکتے ہیں لیکن (۵۰۰) افراد سے زیادہ اون کے ہمراہ نہ ہوں - نیز یہ کہ اون کو عدالتِ عالیہ میں بذاتِ خود آنے کی اجازت نہیں دی جائے گی - اس جواب سے دربارِ نواب اور پھر لکھنؤ بھر میں مایوسی کی ایک لہر دوڑ گئی - اور بعض ارکانِ سلطنت نے یہ مشورہ دیا کہ آپ کلکتہ نہ تشریف لے جائیے۔ اوس کے بعد دوسری تدابیر سوچی جائیں گی جیسے سفرِ لندن وغیرہ - لیکن چونکہ اس وقت مبسوط واقعات معزولیت نواب اودھ سے بحث نہیں صرف غرض یہ ہے کہ موصوف کے ان اشعار کے موقع و محلِ تصنیف کا صحیح صحیح ذکر کیا جائے تاکہ باعثِ دلچسپی ناظرین ہو اور ہر شعر کے مفہوم پر کافی روشنی پڑ سکے - آخر کار وہ غم انگیز ساعت آ پہونچی جبکہ جانِ لکھنؤ کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا - یعنی ۱۳ - مارچ ۱۸۵۶ء کو قیصر باغ اور چھتر منزل میں خاک اُڑنے لگی جس کو صاحبِ مثنوی "اختر جان" نے جو ۱۳۰۵ھ ہجری سالِ وفاتِ واجد علی شاہ لکھنؤ میں طبع ہوئی اور جس کے مصنف نواب زکی علی خاں زکی سے شاگرد

میر فضل مرحوم نے یوں نظم کیا ہے :   (وقتِ روانگی)

نہ کوئی چین سے سوتا تھا گھر میں   اندھیرا ہو گیا اختر نگر میں
یہ قیصر باغ پر چھائی تھی زردی   کہ رنگت مُردنی کی جیسے بھر دی
گلستانِ ارم کا رنگ رم تھا   چھتر منزل پہ چھایا دردِ غم تھا
فرح بخش جہاں عبرت نما تھی   زغن بیٹھے جہاں جائے ہُما تھی
اداسی چار سو ہر باغ میں تھی   تپک لالے کے دل کے داغ میں تھی
مُثمن بُرج ششدر ہو رہا تھا   ظہورِ مادر واتر در ہو رہا تھا
بہاتی اشکِ حسرت گومتی تھی   تلاش شہ میں ہر سو گھومتی تھی
فقیروں کا تھا مسکن بادشاہ باغ   نہ دکھلائے کوئی ایسا خدا باغ
جلو خانوں میں ویرانہ ہوا تھا   وہاں مجنوں کا کاشانہ ہوا تھا
طلائی برج جو جلوہ فگن تھے   وہاں پر مجمعِ زاغ و زغن تھے

صعوباتِ سفر

جب یہ قافلۂ درد انگیز، نالہ و بکائے محبانِ شاہی کے صفوں کے درمیان حرکت کرتا ہوا کان پور کی سڑک پر پہونچا تو ایک کربلائے میر خدا بخش راہ میں پڑی جہاں خیر خواہان بادشاہ نے ایک الوداعی مجلس کا انعقاد پہلے سے کر رکھا تھا۔ خود بدولت سواری سے اتر پڑے اور شرکتِ مجلس کی جس میں خود انھیں کا مرثیہ (سفرِ شہید کربلا از مدینہ) پڑھا گیا۔ اس کے بعد فلک شگاف نالوں اور آسمان آویز دعاؤں کے درمیان ایک کھلی ہوئی فٹن پر سوار ہوئے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ کوچ بکس پر بیٹھنے والے راجہ یوسف علی خاں اور مسٹر برانڈن (بادشاہ کا وہ وفادار انگریز ملازم جس کو ریذیڈنٹ لکھنؤ نے بہ جرمِ وفاداری شہر بدر کر دیا تھا اور جس نے کان پور میں سکونت اختیار کر لی تھی) آگے پیچھے مصاحبین و اعزائے خاص گھوڑوں پر سوار تھے اور محلات کی شکرم میں پھر عملہ جات کی سواریاں اور سامانِ سفر کی گاڑیاں عقب میں۔

مثنوی مذکور نے اس منظر کو یوں نظم کیا ہے :-

صعوباتِ سفر نازوں کے پالے   خدا اس طرح کی آفت نہ ڈالے
وہ تھکانے میں ہر جا دم کا گھٹنا   کسی شب کو ملنا، دن کو چھٹنا
وہ گرمی الحذر چلنا وہ لو کا   ہر اک منزل پہ تھا ہر نخل لو کا
وہ کنکر کی سڑک دن رات چلنا   وہ اس پہ گاڑیوں کا رُک کے چلنا

مسافر چاندنی سی ریتی میں ایسے   پڑی ہو گرد آئینوں پہ جیسے
مہیا ہر جگہ راحت کے اسباب   مگر تھے خود بدولت بے خور و خواب

جب دوسرے دن صبح کو قافلہ کان پور پہونچا تو خود بدولت نے اپنے اور محلات کے لئے مسٹر برانڈن کا بنگلہ پسند کیا اور دوسرے ہمراہیوں کے لئے وسیع مکانات پہلے سے بہ کرایہ لئے گئے تھے۔

ہوئی تھی اس قدر حضرت کو دوری   برانڈن کا وہ بنگلہ کا نپوری
ہوا وہ مقدمِ سرکارِ شاہی   لگا تھا چار سو دربارِ شاہی
لکھوں کیا کانپور ان روز وں کیا تھا   کہ خطِ لکھنؤ سے بس گیا تھا

لکھنؤ اور اطرافِ لکھنؤ سے جوق جوق متوسلین اور نمک خواران قدیم کانپور آ کے شرفِ ملاقات حاصل کرتے تھے۔ ان میں مدبر الدولہ راجہ جوالا پرشاد آنجہانی صدر دیوان خزانۂ شاہی بھی تھے جنھوں نے ہمراہ رکاب کلکتہ چلنے کے لئے گذارش کی۔ لیکن جانِ عالم نے فرمایا آپ بہت ضعیف ہیں اس قابل نہیں کہ مصائبِ سفر برداشت کریں لہٰذا آپ اپنے فرائض حسام الدولہ کے سپرد کر دیجئے اور خود آرام کیجئے جو انھوں نے طوعاً و کرہاً منظور کیا۔

قیامِ بنارس

کان پور میں تقریباً ایک ماہ قیام کے بعد عازمِ سفرِ کلکتہ ہوئے اور منزل بہ منزل الٰہ آباد پہونچے اور ایک عمارت میں جس کا نام پنج گھر تھا قیام کیا۔ ۱۶-اپریل کو بنارس پہونچے اور مہاراجہ شری ایشوری پرساد نرائن سنگھ کے مہمان ہوئے۔ مہاراجہ صاحب موصوف نے شایانِ شان ضیافتِ شاہی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جس کو مثنوی مذکور میں یوں نظم کیا گیا ہے :-

بنارس جب گئے سرکارِ شاہی   ہوئی دونی بہارِ جلوہ گاہی
مہاراجہ نے سارے حق نباہے   پھرے جو گرد، دوڑے ساتھ گھیے
کئے تھے پیش پا اسبابِ نایاب   بچھایا چار سو زربفت و کمخواب
رہے جو وہ دن اس جا شاہ والا   مہاراجہ کے گھر میں تھا اجالا

مہاراجہ بہادر نے وقتِ ورودِ بنارس جانِ عالم کے سامنے ساڑھے پانچ ہزار روپیہ کی نذر پیش کی اور وقتِ روانگی کلکتہ شاہ منزل سے خلعت و عطیۂ جواہر پایا اور آرام مسافرت کا مزید شکریہ۔

واقعۂ تصنیفِ اشعار

گرمیوں کا زمانہ تھا۔ دورانِ قیام بنارس میں ایک روز عمارت قیام گاہ خاص کے خانہ باغ میں بعد مغرب تشریف فرما تھے۔ مہاراجہ موصوف اور ان کے وابستگانِ خاص اور خود مصاحبین تمام موجود تھے کہ اثنائے گفتگو میں مہاراجہ نے فرمایا "آپ کو اتنے دور و دراز کلکتہ کے دوران میں بڑی تکلیفوں کا سامنا ہوگا۔" جانِ عالم نے فرمایا "کیا کروں، اللہ کی یہی مرضی ہے۔ جو قسمت میں لکھا ہے وہ ہو کے رہے گا۔" یہ فرماکے خود بھی آبدیدہ ہو گئے اور دوسروں کو بھی مع مہاراجہ رولا دیا۔ کچھ دیر فضائے خاموشی کے بعد پھر ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں اور کمپنی کے بے جا طرزِ عمل پر نکتہ چینیاں۔ اسی عالم میں جانِ عالم نے فرزند علی خان مُنشی (میر منشی ذاتِ خاص) کی طرف خطاب کر کے فرمایا: ذرا قلمدان اور کاغذ تو منگائیے۔ اس وقت طبیعت کچھ اشعار موزوں کر رہی ہے۔ منشی صاحب موصوف نے چوبدار سے قلمدان و کاغذ فوراً منگایا اور دار دانت نکل خود لکھنے کو تیار ہو گئے۔ جس ترتیب سے یہ اشعار کہے گئے ہیں اصل ورق میں نمبر وار سے ظاہر ہیں۔ اس مقام پر یہ ضروری ہے کہ نظم اشعار کی عینی شہادت پیش کر دی جائے۔ چنانچہ راقم مضمون کے حقیقی نانا مرزا امداد اللہ مرحوم بھی لکھنؤ سے ہمراہ رکابِ شاہی تھے اور آخرِ حیات جانِ عالم تک کلکتہ میں رہے اور بعدِ وفات گورنمنٹ نے بہ مصاحبین خاص سیاسی وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ ۱۹ میں لکھنؤ آئے اور دو سال کے بعد انتقال کیا۔ میرا طالب علمی کا زمانہ تھا۔ ایک مرتبہ یہی غزل کا ورق ہاتھ میں لئے پڑھ رہے تھے اور زار و قطار رو رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کیوں رو رہے ہیں۔ انھوں نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ پہلے اشعار سنائے اور جا بجا مطلب بھی سمجھایا اور فرمایا کہ بنارس کے دورانِ قیام میں جانِ عالم نے یہ اشعار نظم کئے تھے۔ اس وقت میں بھی موجود تھا۔ بعض بعض اشعار پر تو خود بھی روئے اور حاضرین کو بھی رلا دیا۔ جب کچھ دیر کے بعد خود بدولت نے دربار ختم کیا اور خود کوٹھی کے اندر تشریف لے گئے۔ تو میں منشی فرزند علی مرحوم کے ساتھ اپنی چھولداری کی طرف آ رہا تھا کہ میں نے اضطراراً اُن سے خواہش کی کہ

ان اشعار[1] کی ایک نقل مجھے بھی دے دیجئے۔ انھوں نے جواب دیا کلکتہ تو چل رہے ہو وہاں لے لینا۔ کیا جلدی ہے۔ میں نے کہا آپ کے ساتھ چلتا ہوں اپنے خیمے میں بیٹھ کے لکھ دیجئے۔ انھوں نے میرے اصرار پر خیمہ میں پہونچ کر ایک کاغذ پر یہ اشعار نقل کر کے مجھے دے دیئے تھے۔ بیٹا! جب جانِ عالم یاد آتے ہیں ان کو پڑھ کے رو لیتا ہوں۔ میرے بعد یہ ورق اپنی ماں سے لے لینا اور عزت و احترام کے ساتھ رکھنا۔ یہ ان اشعار کی تاریخِ نظم ہے جو پیش کی گئی۔ القصہ ۲۵ - اپریل ۱۸۵۶ء کو مہاراجہ سے رخصت ہو کے براہ گنگا دُخانی بوٹ پر مع وابستگانِ خاص سوار ہوئے۔ بعض افراد بجروں پر اور کچھ براہ خشکی گاڑیوں پر کلکتہ روانہ ہوئے۔ اور ۱۰ مئی کو موچی کھولا (گارڈن ریچ) پہونچے اور مہاراجہ بردوان کی ایک وسیع کوٹھی میں ٹھہرے۔ اطراف کی کوٹھیوں میں دوسرے ہمراہیوں نے قیام کیا۔ رفتہ رفتہ عمارتیں تیزی سے تیار ہو گئیں جن میں قافلۂ شاہی کا مستقل مسکن ہو گیا۔ علی نقی خاں وزیرِ اعلیٰ جو بادشاہ کے ساتھ نہیں گئے تھے، بعد تکمیل حساب فہمی ریذیڈنٹ لکھنؤ سے اجازت لے کے کلکتہ آئے اور ۲۹ جولائی ۱۸۵۶ء کو حاضرِ دربارِ شاہی ہوئے۔ شاہ معزول (۳۲) سال عالمِ غربت و کشاکشِ حیات میں مبتلا رہ کے (۲ محرم ۱۳۰۵ھ) کو عازمِ جنت ہوئے اور تاریخ اودھ میں ایک سیاہ ورق چھوڑ گئے۔ مٹیا برج میں ایک امام باڑہ بنام سبطین آباد (حسین آباد لکھنؤ کی یاد میں) تعمیر کرایا تھا۔ وہیں خوابِ عدم میں مصروف ہیں۔

صاحبِ "مثنوی اخترِ جناں" نے وقتِ شبِ جلوسِ ماتمی اور تجہیز و تکفین کا ذکر تشریح کے ساتھ کیا ہے جس کے آخری اشعار یہ ہیں:-

نقیبِ آدابِ بولے یہ بڑھ کر	قدم با قاعدہ / حدِّ ادب پر
سواری ہے شہِ والا گہر کی	سواری ہے شہِ اخترِ نگر کی
سواری ہے شہنشاہِ اودھ کی	غنیمت شام ہے ماہِ اودھ کی
سواری ہے محبِّ مرتضیٰ کی	سواری آخری ہے بادشاہ کی
سواری ہے سلیمانِ زمن کی	سواری ہے غریبِ بے وطن کی

---

[1] صفحہ ۵ پر ملاحظہ فرمائیے۔

غزل

واجد علی شاہ اخترؔ

کام خنجر [illegible] سے شوقِ بسمل دیکھ کر
ہاتھ اٹھانا چاہیئے تھا روئے سائل دیکھ کر

[illegible] ہم کریں گے پہلا گردن کا ہو
جان دیں گے قوتِ بازوئے قاتل دیکھ کر

لے چلا مجنوں سا کر عشق صحرا کی طرف
چارہ گر حیرت میں ہیں ٹکڑے سلاسل دیکھ کر

بہت [illegible] بیخودی میں مجھ کو اتنا یاد ہے
آپ نے نیچی نظر کی تھی مرا دل دیکھ کر

رہ گئے جب دیدِ جاناں سے پھرے محروم ہم
دل بھر آیا اپنی امیدوں کا حاصل دیکھ کر

لطف کیا فریاد کا جب ہو نہ کوئی ہم خیال
ہم بھی چپ ہیں خامشیٔ شمعِ محفل دیکھ کر

آنکھوں [illegible] بر آئیں کارِ خنجر ہو چکا
ہنس دیئے وہ سرخیٔ خونِ رگِ گل دیکھ کر

ذبح کرنا اور لینا قوتِ بازو سے کام
لیکن اے قاتل مرا حسرت بھرا دل دیکھ کر

لمعۂ انوارِ رخسارِ صنم پر کی نظر
بجھ گئے انجم ہیں شکلِ بدرِ کامل دیکھ کر

تو جو دریا دل ہے ساقی ہیں بھی دریا نوش ہیں
گر پلانا ہے مجھے تو ظرفِ سائل دیکھ کر

حکم ہے شعلے اٹھیں دل سے مگر نکلے نہ اُف
عشق نے سونپا ہے کیسا کام مشکل دیکھ کر

ہم نہ کہتے تھے کہ آئینہ نہ رکھو سامنے
اب یہ غصہ کس لئے اپنا مقابل دیکھ کر

روشنی کرتے لحد پر آپ آتے تو مگر
بجھ نہ جائے شمع مرجھایا ہوا دل دیکھ کر

چاہتا ہے دل کہ اس دلبر کی خوبی ہو بیاں
کچھ نہیں کہہ سکتے تاب نطق زائل دیکھ کر

دیدِ لیلیٰ میں مخل ہے ناتوانی قیس کی
دل مگر جنبش میں ہے رفتارِ محمل دیکھ کر

دیکھیں اخترؔ گردشِ گردوں تماشا کیا دکھائے
پاؤں کچھ تھکنے لگے دوریٔ منزل دیکھ کر

[illegible] میں یہ قافیہ موجود ہے تعجب ہے ع م-

میر قمر الدین علی خاں شاکر — ترجمہ: حمید الماس

کرناٹک

یہ نظم میر قمر الدین علی خاں فتح جنگ آصف جاہ اوّل (بانی آصفجاہی حکومت) کی لکھی ہوئی ہے۔ موصوف آصف اور شاکر تخلص فرماتے تھے۔ مرزا عبدالقادر بیدل سے تلمذ تھا۔ بعض تذکرہ نگاروں نے بیان کیا ہے کہ آپ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی فرماتے تھے لیکن ان کا اردو کلام دستیاب نہیں ہوا ہے۔ مرآۃ الصفاء کے مؤلف نے تحریر کیا ہے کہ آپ موزوں الطبع اور شعر گوئی اور شاعری کے دلدادہ تھے۔ [illegible] اور [illegible] کے درمیان یہ نظم لکھی گئی ہے جس کے ایک ایک شعر سے کرناٹک کی زرخیزی، خوبصورتی اور رعنائی کی مہک آتی ہے۔ چونکہ اب کرناٹک کے تصور کے مطابق ایک علیحدہ ریاست قائم ہوئی ہے اور آج بھی اس خطۂ شاداب کو پھولوں کا شہر کہا جاتا ہے اس لئے پیش نظر اس کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔

نشاطِ دیدہ و دل ہے ہوائے کرناٹک — کہ جیسے خلد ہے عشرت سرائے کرناٹک
نصیب ہو نہ سکا خسرو و جم کو بھی — یہ طمطراق یہ شانِ گدائے کرناٹک

لئے ہوئے ہے جلو میں جوانیٔ [illegible] — ہوا گلشن بہشت فضائے کرناٹک
علاجِ قلبِ شکستہ ہے برگِ گل لیکن — یہ وصفِ گل نہ ملے گا سوائے کرناٹک

ہر ایک سمت ہے ہجومِ بتانِ ماہ جبیں — کہ شہرِ حسن ہیں یہ کوچہ ہائے کرناٹک
یہ آرزو ہے چکھیں میوہ ہائے خلد مگر — کہاں وہ اور کہاں اثمار ہائے کرناٹک

یہاں نشاط کسے مل سکی ہے دنیا میں — [illegible] ہوا ہے سوائے کرناٹک
قتیلِ غم نہ شکایت گزار ہے کوئی — خوشا کہ سایہ فگن ہے ہوائے کرناٹک

یہاں کی گرد بھی ہے [illegible] — نہ پوچھ دور سے یوں میکدائے کرناٹک
نثارِ بادہ ہوئے ہیں فقیہہ و زاہد بھی — چھلک گئے جو کبھی شیشہ ہائے کرناٹک

عروسِ ملک کو ہے ناز جامہ زیبی پہ — کہ سی ہے حور و ملک نے قبائے کرناٹک
پسند آ نہ سکیں گے یہ قاقم و سنجاب — لگیں جو سر پہ فلک خیمہ ہائے کرناٹک

سما سکا نہ نظر میں [illegible] کو نہیں — ہوا ہے جو بھی [illegible] ہمائے کرناٹک
یہ سرزمیں ہے جہاں موتیوں کی بارش ہے — کسے نصیب ہیں یہ خزینہ ہائے کرناٹک

بن آئی جیسے پرستارِ بزمِ فطرت کی — خطِ نگاہ ہیں یہ سبزہ ہائے کرناٹک
کسی بھی شہر میں شاید ہمیں سکوں نہ ملے — سکوں طراز فقط ہے ہوائے کرناٹک

[illegible] — تمام بوئے وفا ہے فضائے کرناٹک
بس ایک شاکر و الماس ہی پہ کیا موقوف

[illegible] خود ہی — ملے جو مجھ کو محبت خوش ادائے کرناٹک
یہاں جو آئے [illegible] کرناٹک

کرتار سنگھ دگل

ٹیرس

ٹیرس پر کھڑے ہو کر دور اُفق تک نیلا آسمان دکھائی دیتا۔ سامنے میلوں تک پھیلی ہوئی جھیل دکھائی دیتی۔ نیچے سڑک دکھائی دیتی جس پر اندھیرے سویرے لوگ چلتے رہتے۔ جب وہ ٹیرس پر کھڑی ہوتی تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آ کر اس کے ساتھ کھیلنے لگتی جھیل کی اٹکھیلیاں کرتی ہوئی لہروں کی موسیقی اس کے کانوں میں سنائی دیتی۔ گہرے آسمان میں کبھی سفید سفید بدلیاں تیرتی ہوتیں، کبھی گھنگھور کالی گھٹائیں چھا جاتیں۔ ٹیرس پر کھڑے ہو کر اس پر ایک جادو سا ہو جاتا۔

اس فلیٹ میں ٹیرس ہی تو تھی۔ صرف دو کمرے اور تھے۔ تنگ اور گھُٹے گھُٹے سے کمرے۔ ایک ان کے سونے کا کمرہ تھا دوسرا گول کمرہ تھا اور کھانے کا کمرہ بھی یہی تھا۔ بچوں والے گھر میں دو کمروں سے کیسے گزارا ہو سکتا ہے!

مایا سارا دن گھر کے جنجال میں پھنسی رہتی۔ کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ ایک چیز کو ٹھیک کرتی تو دوسری خراب ہو جاتی۔ اس کو سنوارتی تو کوئی اور چیز بگڑ جاتی۔ گھر جتنا چھوٹا ہو اتنا زیادہ گندہ لگتا ہے۔ ہر وقت اس کے ہاتھ میں یا تو جھاڑو ہوتی یا جھاڑن۔ اس گندگی سے اس کا دل اوب جاتا۔ بچوں کو وہیں کھیلنا وہیں پڑھنا اور وہیں آرام کرنا ہوتا۔ جو چیز مایا جہاں رکھتی پھر اسے وہ کبھی اس جگہ پر نہ ملتی اور اس کا دل گھبرانے لگتا۔ غسل خانہ بھی چھوٹا سا تھا۔ نہا کر تو اس میں سے کوئی نکل آئے لیکن جب کپڑوں کی ایک گٹھڑی دھونی ہو تو برا حال ہو جاتا تھا۔ غسل خانہ تو پھر بھی غنیمت تھا۔ باورچی خانے کی حالت اس سے بھی خراب تھی جیسے کبوتروں کا ڈربہ۔ ہر وقت اندھیرا ہر گھڑی دھواں۔ وہ لاکھ شکایت کرتی لیکن مالک مکان انگیٹھی ٹھیک نہیں کرواتا تھا۔ جتنی دیر مایا باورچی خانے میں رہتی اس کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہتے رہتے۔ سونے والے کمرے میں انھوں نے چارپائیوں کے نیچے چارپائیاں جما رکھی تھیں۔ جب رات کو سب کے بستر بچھ جاتے تو کھٹیا سے نیچے اُترنے کے لئے جگہ ڈھونڈنا پڑتی تھی۔

اور پھر بچوں کی ضرورتیں ختم ہونے میں نہیں آتی تھیں۔ کسی کو بھوک لگی ہے تو کسی کو پیاس۔ کسی کو سبزی اچھی لگتی ہے تو کسی کو سبزی اچھی نہیں لگتی۔ کسی کے پیٹ میں درد ہے تو کسی کی آنکھیں دُکھ رہی ہیں۔ کسی کا پاجامہ پھٹا ہوا ہے اور کسی کے بٹن ٹوٹے ہوئے۔ بچے اگر ہنستے تو بس ہنستے ہی جاتے۔ ہنس ہنس کر گھر سر پر اُٹھا لیتے۔ جب رونے پہ آتے تو سب کے سب رونے لگتے۔ مار کھانے والا بھی روتا اور مارنے والا بھی۔ جو بیچ بچاؤ کرتا وہ بھی روتا ہوا دکھائی دیتا۔ کھیلتے تو اس طرح کے اُلٹے سیدھے کھیل کہ آفت مچ جاتی اور کوئی چیز گھر میں اپنی جگہ پر نہ رہتی۔ کبھی کسی بچے کی سالگرہ ہے تو کبھی کسی کے دوست کی سالگرہ اور کبھی کسی کی سہیلی کی۔ کبھی امتحان ہوتے کبھی چھٹیاں ہوتیں۔ کبھی بچے باہر لے جائے جاتے کبھی ناٹک کی تیاریاں شروع ہوتیں۔ کبھی کچھ کبھی کچھ۔ غرضیکہ ایک نہ ایک مسئلہ ہمیشہ مایا کے سامنے رہتا۔

اور مایا سارا دن جوڑ توڑ کرتی رہتی۔ ادھر سے بچاتی اُدھر خرچ کرتی۔ ایک سے چھینتی دوسرے کا کام چلاتی۔ کبھی رسوئی میں سر دیئے رکھتی تو کبھی غسل خانے میں۔ وہاں سے فرصت پاتی تو کمروں کو ٹھیک کرنے میں لگ جاتی۔ جس جگہ پاؤں رکھتی وہیں پہ دس کام اس کے سامنے آ جاتے۔ اس طرح مایا دن بھر مٹی کے ساتھ مٹی ہوتی رہتی۔ گھر کے ان کاموں میں اس کا جوڑ جوڑ دکھنے لگتا۔

لیکن اس فلیٹ میں ایک ٹیرس تھی یہاں آ کر وہ جب کھڑی ہوتی تو

اس کا دل پھول کی طرح ہلکا ہو جاتا۔ جھیل کی میٹھی میٹھی ہوا، لہروں کا مدھ سنگیت، دُور تک پھیلا ہوا آسمان۔ اس کا من شانت ہو جاتا۔ اسے ایسا لگتا جیسے اس کے آس پاس خوشبوئیں بچھ گئی ہوں۔

جب ٹیرس پر کھڑی ہوتی تو ہوا اس کے بالوں کے ساتھ آ کر کھیلتی اور اس میں ایک مدہوشی سی آ جاتی۔ ٹیرس پر کھڑی ہو کر وہ دُور تک پھیلے ہوئے آسمان کو تکتی اور اس کی آنکھوں میں ایک چمک آ جاتی۔ اس کے رخسار مہک اُٹھتے اور اس کے ہونٹوں میں رس بھر جاتا۔

ٹیرس پر کھڑی ہو کر مایا سوچتی کہ اس طرح ہر جیون میں ایک ٹیرس ہونی چاہیئے۔ جیون کے تنگ گھٹے گھٹے کمروں کے باہر ایک پھیلاؤ ہونا چاہیئے جہاں سے کھلا ہوا آکاش نظر آئے۔ جہاں دُور بہت دُور کوئی گاتا ہوا سنائی دے۔ جہاں بیخودی اور انجان ہو کر ہم تنہا [illegible] دے۔

مایا کو بہت فرحت ہوتی جب اس کا جی گھٹنے لگتا اور وہ گھر کی اُلجھنوں سے تنگ آ کر نڈھال ہو جاتی تو باہر ٹیرس پر آ کر کھڑی ہو جاتی۔ چاندنی راتوں میں باہر ٹیرس پر ٹہلتے ہو کر اپنے پتی کا انتظار کرنا اسے بڑا اچھا لگتا۔ ساون کی جھڑی میں بھی وہ ٹیرس پر اکیلی کھڑی رہتی۔ اسے بھیگ بھیگ جانا اچھا لگتا۔ دن کو جب بچے اسکول چلے جاتے اور اس کا پتی کام پر جاتا تو وہ ٹیرس پر کھڑی ہو جاتی۔ اس کو گھر کا سونا پن ذرا بھی محسوس نہ ہوتا۔

باورچی خانے کے دھوئیں سے، اس ننھے سے گھر کی تنگی سے، کمروں کی گھٹن سے جب مایا کا دل گھبرانے لگتا تو وہ باہر ٹیرس پر آ کر کھڑی ہو جاتی۔ بچوں کے شور، گھر کے دھندوں اور اُلجھنوں سے جب وہ تھک جاتی تو باہر ٹیرس پر آ کر سستا لیتی۔ [illegible] کسی وقت ٹیرس پر کھڑے ہو کر ایک نشے میں کھو سی جاتی۔ وہ ایک کیف میں ڈوب جاتی۔

مایا ٹیرس پر ذرا سی دیر کھڑے ہو کر اندر آتی اور شیشے میں اپنے آپ کو دیکھتی۔ اسے اپنا آپ [illegible] اچھا لگتا۔

اس طرح زندگی کی گاڑی اس عجیب سہارے پہ چل رہی تھی کہ ایک دن ٹیرس پر کھڑی ہو کر مایا نے دیکھا سامنے سڑک پر کوئی آدمی کھڑا ہو کر اس کی طرف گھور رہا ہے۔ مایا کو اس طرح کسی پرائے مرد کا اس کی طرف دیکھنا اچھا نہ لگا اور وہ اندر چلی گئی۔ اس دن شام کو مایا ٹیرس پر آ کر پھر کھڑی ہوئی۔ اس کی نظر پھر سڑک پر پڑی۔ وہی مرد پھر کھڑا ہوا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مایا پھر جلدی سے اندر گھر میں چلی گئی۔ رات کو سونے سے پہلے اس نے دیکھا چاندنی کی دودھ سی سفید چاندنی چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اپنے آپ اس کے قدم باہر ٹیرس کی طرف بڑھنے لگے۔ ابھی ٹیرس پر جا کر وہ کھڑی ہوئی تھی کہ وہی صبح والا پرایا مرد ویسے ہی سڑک پر کھڑا ہوا اسے اپنی طرف تاکتا دکھائی دیا۔ اس کی نظروں میں پاپ تھا، اس کے اشاروں میں کپٹ تھا۔ مایا نے اس کی طرف دیکھا اور اسے دفعتاً ایک جھٹکا سا لگا اور وہ چڑ کر سہمی سی، کسمسائی سی اندر کمرے میں آ گئی۔

اس طرح ہر روز ہر وقت وہ آدمی وہاں کھڑا ہوا نظر آتا۔ بےچاری مایا کی ٹیرس اس سے چھن گئی۔

مایا اب چڑچڑی اور تھکی تھکی سی رہتی۔ اس کا دل اُلجھا اُلجھا سا رہنے لگا۔ لاکھ محنت کر کے وہ اپنے بال سیٹ کرتی، گھر کے کام دھندوں میں لگ جاتی۔ کبھی وہ کڑھ رہی ہوتی، کبھی کھیج رہی ہوتی۔ دو دن میں اس کے بال پھر سیدھے ہو جاتے، اس کے گھونگھر نکل جاتے۔ اور اسے یاد آتا کہ جب وہ ٹیرس پر کھڑی ہو کر سستا لیتی تھی تو اس کے اُلجھے ہوئے بالوں میں بھی کیسی رونق آ جاتی تھی!! اس کے ایک بار سیٹ کئے ہوئے بال ہفتہ ہفتہ بھر چل جایا کرتے تھے۔

مایا سوچتی وہ اپنے شوہر سے کہے کہ یہ آدمی کیوں سڑک پر آ کر کھڑا ہو جاتا ہے، صبح سے لے کر شام تک وہ وہاں کھڑا رہتا ہے۔ لیکن تین بچوں کی ماں اپنے شوہر سے کیا کہتی۔ اسے بار بار اپنی ایک سہیلی کے بول یاد آتے۔ دودھ پر مکھی ضرور آتی ہے۔ اور مایا سوچتی جب تک کہیں مٹھاس ہے مکھیوں کو کیسے روکا جا سکتا ہے۔ وہ مرد نہیں کھڑا ہوگا تو کوئی اور آ کر کھڑا ہو جائے گا۔ کس کس کو وہ روکے گی۔ کس کس سے اس کا شوہر لڑائی لڑے گا — اس طرح مایا کی ٹیرس مایا سے چھن گئی تھی — وہ مجبور تھی۔

پھر مایا نے سوچا نیچے گھر کی چار دیواری کو اگر اونچا کروا دیا جائے تو سڑک سے کھڑے ہو کر کوئی اس کو نہیں جھانک سکے گا۔ اور اسے ایسا لگا جیسے یہ بات نہایت آسان ہو۔ اس نے اپنے شوہر سے کہا۔ اس کے شوہر نے کسی مستری سے پوچھا۔ چار دیواری کو اونچا کرنے میں ڈیڑھ سو روپیہ خرچ آتا تھا۔ مایا یہ سن کر چپ ہو گئی۔ مالک مکان ڈیڑھ سو روپیہ کیوں خرچ کرنے لگا تھا؟ اور خود اپنے شوہر کی تنخواہ سے اتنی رقم مایا کبھی نہ بچا سکی تھی۔

اور مایا کی ٹیریس مایا سے چھن گئی۔

کبھی مایا سوچتی اسے اس آدمی کا کیا ڈر۔ اور نڈر ہو کر وہ ٹیریس پر جا کر کھڑی ہو جاتی لیکن پھر جب اسے کسی کی جھانکتی ہوئی دو آنکھوں کا خیال آتا تو لگتا ایسے لگتا جیسے وہ اس کا تعاقب کر رہی ہیں۔ وہ سر سے لے کر پاؤں تک کانپ جاتی۔ اس کا سانس پھول جاتا اور وہ اندر کمرے میں جا کر پلنگ پر اوندھے جا پڑتی۔ اور اس وقت تک ایسے ہی پڑی رہتی جب تک گھر کی دس مہرابیاں اس کو اٹھنے پر مجبور نہ کرتیں۔

مایا سے مایا کی ٹیریس چھن گئی تھی۔

کئی دن اس طرح گزر گئے۔ فکروں کے دن، الجھنوں کے دن، بے مزگی کے دن، مصیبتوں کے دن بات بات پر رنجیدہ ہونے کے دن۔

اور پھر مایا جیسے اپنی ٹیریس کو بھول گئی اور اب جب مایا نے ٹیریس پر کھڑا ہونا چھوڑ دیا تو بچوں کے کپڑے دھوتی، انھیں سکھاتی، ان پر استری بھی کرتی۔ کھانا پکا کر اس کو برتنوں میں سجاتی، اچھی طرح چن کر کھانے والوں کے سامنے رکھتی۔ ہر روز سوچ سوچ کر کوئی نئی خوبصورتی پیدا کرتی اپنے آپ میں، اپنے گھر میں، اپنے بچوں میں۔ جتنی دیر بچے گھر میں رہتے وقت نکال کر ان کے ساتھ کھیلتی، ان کی پڑھائی میں مدد دیتی۔ جتنی دیر اس کا شوہر گھر ہوتا اس کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کو بڑی دلچسپی کے ساتھ پورا کرتی رہتی۔

اس طرح جب مسالہ بھون رہی ہوتی تو خاص طور پر دھیان رکھتی کہ وہ ٹھیک۔ نہ بھنے۔ نہ کچا رہے نہ جلے۔ ایک خاص رنگ ایک خاص خوشبو اس میں آ جائے۔ اور اگر مسالہ ٹھیک بھن جائے تو پھر بھاجی کبھی خراب نہ ہونے پائے۔ اس کی بنائی ہوئی روٹیاں اب ساری کی ساری گول اسکی ہوئی ہوتیں۔ رسوئی کی انگیٹھی میں سے دھواں اگرچہ اب بھی نکلتا تھا مگر مایا کے پھولے میں دھواں آج کل ہوتا ہی نہ تھا۔ اب اس کا دودھ وقت پر آتا۔ دہی ٹھیک جمتا۔ اب مایا پڑوسیوں کے ہاں کچھ بھیجتی رہتی۔ ان کی طرف سے اس کے ہاں کچھ آتا رہتا۔

اب مایا جب بچوں کے کپڑے دھونے بیٹھتی سب کے سب کپڑے ایک گٹھڑی کی شکل میں اس کو نظر نہ آتے۔ ہر کپڑا کسی نہ کسی کا ہوتا۔ اس کے کسی نہ کسی دن کے ٹکڑے کا۔ اب مایا جب پکانے بیٹھتی کوئی چیز کسی کو خوش کرنے کے لئے پکاتی تو کوئی چیز کسی کی مرضی کے مطابق۔ اب مایا جب گھر میں شورمچتی تو خوش ہوتی۔ اس کو ہر بات پیاری لگتی۔ ہر دل میں سنگیت سنائی دیتا۔ گھر کے کمرے اب مایا کو تنگ اور گھٹے گھٹے سے نہ لگتے۔ مایا کا دل جو بڑا ہوا تو جیسے کمرے بھی پھیل کر بڑھ گئے۔ اب مایا ہر گھڑی خوش خوش رہتی۔ خوشیاں بکھیرتی رہتی۔ مایا کا ہر کام اب وقت پر ہوتا۔ ہر بات ٹھیک ہوتی۔ ٹھیک ٹھیک بلکہ کچھ اور زیادہ۔ اب مایا ہر بات پوری کرتی پوری اور کچھ زیادہ۔ جیسے چھت ہوتی ہے اور چھت کے آگے اس کا نکلا ہوا حصہ۔ ٹیریس۔

حسن عباس فطرت

آلھا

(عوامی رزمیہ)

برسات کے موسم کا وہ وقت جب ساون کا مہینہ اپنی بھرپور جوانی پر ہوتا ہے۔ گھنے گھنے بادلوں کے قافلے ہر وقت آسمان پر دوڑتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ دن رات کی موسلا دھار بارش بادلوں کی گھمبیر گرج ماحول کو ڈراونا بنائے رہتی ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی اور رسیلی ہوا مستی اور ترنگ کے خزانوں کا منہ کھول دیتی ہے۔ انہیں دنوں میں اکثر ہوا کی تیز سائیں سائیں کے ساتھ جوش و خروش سے بھری ہوئی کچھ لہردار آوازیں فضا کو چیرتی ہوئی سنائی دیتی ہیں۔ لیکن کبھی آپ نے آگے بڑھ کے دیکھا بھی کہ یہ کیا ہے؟ اگر نہیں دیکھا تو آئیے میں آپ کو بتاؤں یہ بھارت کے مشہور عوامی رزمیہ آلھاکھنڈ کی گنجار اور للکار ہے جسے شمالی ہند کے ہر چھوٹے بڑے دیہات و شہر میں آپ بچہ بچہ کی زبان سے سن سکتے ہیں۔ اور اگر کہیں آپ ان کی محفل میں جا بیٹھیں جہاں چند ننگے بدن اور میلی دھوتی باندھے ہوئے کسانوں اور مزدوروں کے مجمع میں آلھا گایا جا رہا ہو تو میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی مستی اور چہکار کو دیکھ کر آپ بھی چند منٹ کے لئے اپنے خون کے دوران میں تیزی محسوس کرنے لگیں گے۔

آلھاکھنڈ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے بھارت کے دو مشہور جیالے سورما آلھا اور اودل کے کارناموں کی طویل و دلچسپ داستان ہے۔ اگرچہ اس کی تصنیف کو لگ بھگ آٹھ سو برس سے زائد بیت چکے ہیں۔ پھر بھی ہزاروں اشعار کا یہ طویل منظومہ آج بھی اتنا ہی زندہ اور مقبول ہے جتنا شروع عہد میں رہا ہوگا۔ اگرچہ ابتداءً یہ وہ بندیلی زبان میں لکھا گیا تھا لیکن عوام میں اس کی بے پناہ مقبولیت نے اس میں بہت کچھ مقامی حالات و رسم و رواج کے مطابق تبدیلیاں بھی کر ڈالی ہیں اور اب اس کی موجودہ زبان اتنی سہل اور سادہ ہے جسے بس ہندوستانی کہا جا سکتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آلھاکھنڈ کے نسخے اردو رسم الخط میں بھی اتنے ہی ہیں جتنے ہندی میں اور ساتھ ہی یہ بات بھی لائق ذکر ہے کہ اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہو چکا ہے لیکن پھر بھی اصل آلھا وہی مستند مانا جاتا ہے جو پشت ہا پشت سے سینہ بسینہ چلا آتا ہے اور جس کی کتاب ہماری جنتا کا مضبوط حافظہ ہے۔ اسی لئے آپ دیکھیں گے کہ ہر علاقے اور ہر صوبے کے آلھا میں باوجود بنیادی واقعات کی یکسانیت کے طرز اظہار، تشبیہات وغیرہ میں کافی فرق ہے۔ اور ہر جگہ وہاں پر وہی آلھا مستند مانا جاتا ہے۔ یہی ایک وحدتِ مکاں کی تمامی اگر نہ ہوتی تو بلاشبہ آلھا دنیا کی مشہور ایپک نظموں کے مقابل میں رکھا جا سکتا تھا۔ خیر یہ بات تو بیچ میں آ گئی مجھے کہنا یہ تھا کہ وہ آلھا جو نہ جانے کتنی بار کہاں کہاں اور کتنی تعداد میں کتابی صورت میں چھپ چکا ہے اس سے کہیں زائد تعداد ان کتابوں کی ہی ہے جسے میں نے عوام کا حافظہ بتایا ہے۔ اس طرح اگر قبولیت عامہ اور روایت کسی تخلیق کی خوبی پر دلیل و سند بن سکتی ہے تو میں آج صدیوں بعد بھی آلھا کی جیتی جاگتی اور ہمہ گیر مقبولیت کو دیکھ کر بآسانی کہہ سکتا ہوں کہ آلھاکھنڈ ہندوستانی عوام کا شاہنامہ ہے۔ یہ نظم جس کا ظاہری ہیکل مثالاً مثنوی کا سا ہے اور جیسا کہ میں نے بتایا کہ ہزارہا ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے پڑھنے اور گانے کی بھی ایک مخصوص البیلی اور انوکھی لے ہے جس میں عجیب ناقابل بیان گرفتگی اور گہرائی ہے۔ آپ اس کے گانے والوں کو دیکھیں۔ ان کا جوش و طنطنہ اور بانکی طرز ادا دیکھیں تو یہ معلوم

ہوگا کہ گانے والا آلھا کے کارنامے نہیں بیان کر رہا بلکہ بجائے خود آپ ہی
آلھا بنا ہوا پاگل ہوکر   میدان
جنگ میں دشمن کی کاٹ میں مصروف ہے۔ آخر یہ ولولہ، یہ مستی، یہ اُبال کہاں سے آجاتا ہے۔ یہ آلھا کھنڈ کے الفاظ کا زیر و بم اصوات کی ہم آہنگی لفظ و معنی کا حسین رچاؤ اور پُر تاثیر موسیقیت کا چلتا پھرتا جادو ہے جو دھیرے دھیرے سر پر چڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور دم کے دم میں پڑھنے اور سننے والے کو مدہوش و سرشار کر دیتا ہے۔ آلہ کھنڈ میں یہی ایک صوتی خصوصیت مرکزی حیثیت رکھتی ہے اور یہی چیز دراصل اس نظم کا محور ہے۔ جس کی گردش اتنی تیز ہے کہ دیگر خصوصیاتِ شعری اس کے ارد گرد ناچتے نظر آتے ہیں۔ اس کے الفاظ اور اُن کی آواز۔ واقعات کی تصویر کشی اور جذبات و خیالات کے بیاکانہ اظہار میں ایسا بدھرملان اور گھلاوٹ ہے جس کا رس کانوں سے اُترتے ہی اپنا جادو بھرا عمل شروع کر دیتا ہے مگر یہ مستی کی حد تک نہیں بلکہ رگوں میں خون کی روانی تیز کر دینے اور ولولہ کو شکتی بھر دینے تک۔ اس کا آنکھوں دیکھا ثبوت آپ کو روہیل کھنڈ و گوالیار کے علاقے میں مل سکتا ہے جہاں آلھا گانے کا سنتے یکبارگی گوجر اور بھاٹ تلواریں چمکا کر اور بھنویں تان کر غرّا اُٹھتے ہیں اُن کی آنکھیں سُرخ ہوجاتی ہیں نتھنے پھول جاتے ہیں اور منہ سے جھاگ بہہ نکلتا ہے۔ یہ ہے آلھا کی دین اور چمتکار۔ وہی آلھا جس کی گرج دار تان فضاؤں کو چیرتی ہوئی آکاش او پاتال سے ٹکراتی ہے، ہمارے شاندار ماضی کی یاد دلاتی اور مستقبل کے لئے مہمیز کا کام دیتی ہے اور ہمارے جذبۂ عقیدت کو جگاتی اور جھنجھوڑتی ہے۔ ہمارے لئے حرارتِ عمل اور جرأتِ اقدام کی معلّم بنتی ہے شاید یہی اسباب ہیں کہ اتنا طویل رزمیہ ہمارے عوام کی زبان پر ہمہ وقت رقصاں و متحرک رہتا ہے بظاہر یہ ایک اعجاز بھی ہے اور عظیم مصنّف "جگنائک" کے زبردست ماہرِ صوتیات و موسیقیت ہونے کا نشان اور زندہ ثبوت بھی کہ اس نے ان اشعار کو ڈھالتے وقت اس کا خاص دھیان اور التزام رکھا کہ اس کی حقیقی حلاوت و صحیح تاثر بیان و ادا پر موقوف رہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا، یہ خزانہ ہمیشہ متحرک رہے گا اور سنتے آتا ہے گا اور پھر اس فسوں کاری کی تو داد دینا ہی محال ہے کہ اس قدر برقی سرعت کے ساتھ اتنا طویل منظومہ حافظہ اور دماغ میں کیسے اپنی مستقل اور انمٹ جگہ بنا لیتا ہے اور عموماً لوگ اسے نسلاً بعد نسلاً ایک دوسرے کو گاتے ہوئے سُن کر ہی یاد کر لیتے ہیں۔ اس فلسفہ کے تحت میں نہیں سمجھ پاتا کہ اس نظم کی تحریری حوالۂ اقتباس ناظرین کے سامنے پیش کرنا میرے لئے جائز بھی ہے یا نہیں جب کہ مزید دشواری یہ بھی ہے کہ اتنی لمبی نظم میں سے جس کا ہر حصّہ ایک دوسرے پر فوقیت رکھتا ہے کتنا اور کون سا جزو پیش کیا جائے۔ مگر صرف اس خوف سے کہ آپ مجھ پر خلا میں باتیں کرنے کا الزام نہ لگا دیں چند اشعار پیش کرتا ہوں جس سے آلھا کی مخصوص صوتی صفت کا کچھ اندازہ ہو سکے گا میدانِ حرب و ضرب کا ایک سماں ملاحظہ کیجئے جس میں الفاظ کے تناسب ٹکراؤ اور ترتیب کی ہنرکاری کے ذریعے یوں نقشہ کھینچا گیا ہے۔

کٹ کٹ سر دھرتی پر گر گے سب کا پھوٹ گیا ابھیمان
کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ تیگا بولے رن مان چھپک چھپک تروار
سن سن سن سن گولی برسے ٹھن ٹھن بھالن کی جھنکار
کٹ بھج ڈنڈ گئی چھترن کی جو بیٹھے بڑے بڑے سردار
جیسے سکیلا پانی پت کے تیہہ پہ دو انگل کی باڑھ
چلے جنوبی اور گجراتی رونا چلے ولایت کیسار

آلھا کھنڈ کا موضوع حبِ وطن، کلچرل یکرنگی، ایثار و قربانی، ایکتا اور بھائی چارا، اخلاق و محبت اور خود پرستی ہے۔ اس نظم میں جگہ جگہ "رام بنائیں تو بن جئیں بگڑی بنت بنت جائے" ٹیپ کے بند کی طرح آتا ہے اور ہندو قدیم کے گہرے مابعد الطبیعیاتی فلسفہ کو دوہراتا ہے اور مافوق البشر طاقت کی یاد دہانی اور اس پر اعتماد کی تلقین کرتا رہتا ہے اس کے علاوہ اس میں بے شمار امثال و حکم، محاورات و ضرب المثل کے استعمال کے ساتھ اجتماعی و انفرادی زندگی کے لئے لائحہ عمل پیش کیا گیا ہے اور زندگی کی مشکلات کا حل بتایا گیا ہے۔ ہمّت و جرأت اور فدا کارانہ زندگی کی تلقین و تبلیغ کے لئے حکیمانہ طریق کار استعمال کیا گیا ہے اس رزمیہ کی ایک اور لائقِ توجہ خصوصیت تفصیل جزئیات بھی ہے۔ ایک جگہ دو شعروں میں عوامی مثالوں کے ساتھ یہ بتا کر کہ دنیا کی ہر شے کی طرح انسان بھی فانی ہے بہادرانہ موت اس کی جنّت ہے اور بستر کی موت ذلّت و عذاب۔ اس طرح جذبۂ مردانگی کو بیدار کیا جاتا ہے۔

سدا تریاں نا بن پھولیں یارو سدا نہ ساون ہوئے
سدا نہ ماتا جنے پیٹ سے یارو سدا نہ جیون ہوئے

کھٹیا پر جو تم مرجیہو تمرا ماس کاگ نہیں کھاسے
جو مرجیہو سمر بھوم ماں تم کا اندر پری لے جاسے

میں نے کہیں پر آلہا کھنڈ کو ہندوستانی عوام کا "شاہنامہ" کہا ہے۔ وہ محض جوش، عقیدت مندی یا استعارہ نہیں بلکہ بہت کچھ حقیقت پر مبنی ہے۔ آپ اگر دوسری زبانوں میں آلہا کی ہم جہت مثال ڈھونڈھیں گے تو کوئی ایک چیز مستقل طور سے آلہا کے ہم پلہ یا ہم مثال نہیں ملے گی ویسے تو یورپ کے اکثر و بیشتر رزمیہ نظومات میں آپ آلہا کی جھلکیاں دیکھ سکتے ہیں مگر فردوسی کا شاہنامہ اور خصوصاً بہرام و شگمس کی داستان بہت کچھ آلہا کھنڈ سے میل کھاتی ہے اور بہ اعتبار ت شگمس نامہ کی منظر کشی، مکالمات کا زور، بے باکانہ انداز، رزم و بزم کی مصوری میں لفظ و معنی کی گھلاوٹ اور عمومیت و موسیقیت کا خاص التزام جو آلہا کھنڈ کی مخصوص و نمایاں صفت ہے کافی حد تک یکساں و ہم رنگ نظر آتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ شگمس نامہ کی خالص پہلوی زبان اتنی سخت و مشکل ہے کہ باوجود سمجھ لینے اور حل کر لینے کے اس کی صحیح لذت و کیفیت ہمیں نہیں مل پائی ورنہ اس سلسلہ میں لسانیات اور افادہ و استفادہ کے نقطۂ نظر سے مطلب خیز بحث کی جا سکتی تھی۔

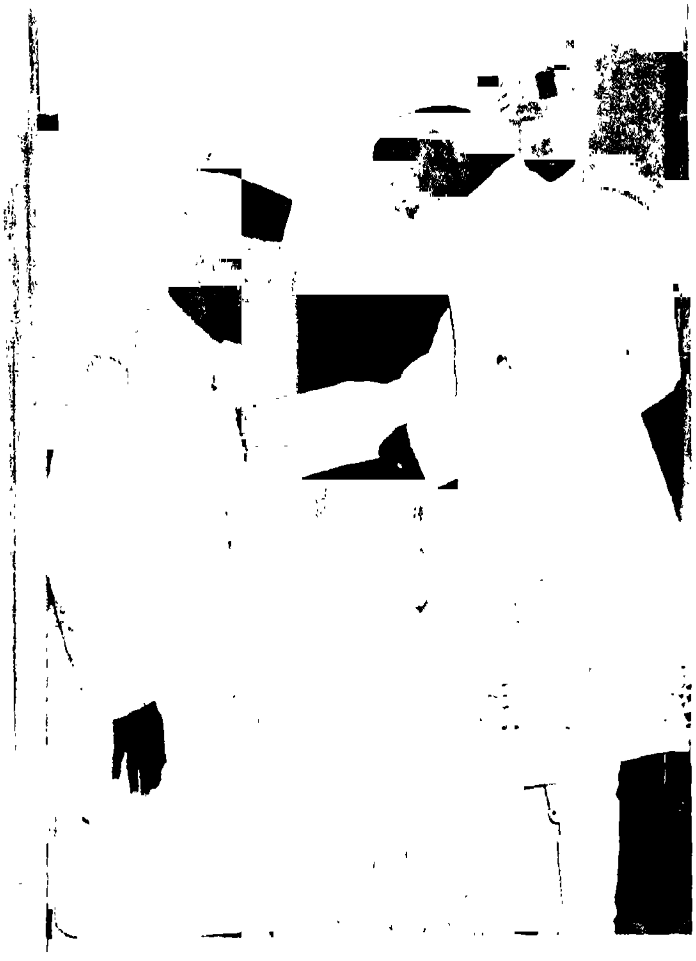
آلہا کھنڈ کی ایک اور خصوصیت انگلستان کے مشہور شاعر کولرج کی نظموں کا بھی عنصر مشترک ہے اور وہ پڑھنے اور سننے والوں کی طے شدہ بے اعتقادی کا بہ رضا و رغبت تھوڑی دیر کے لئے معرض التوا میں پڑ جانا۔ جس طرح کولرج کی اکثر نظمیں، مافوق العادات واقعات اور مافوق البشر ہستیوں کے ذکر سے بھری ہیں مگر اس نے انھیں کچھ ایسے نفسیاتی، جذباتی اور حساسی تاثرات کی رنگ آمیزی کر کے زیب و زینت پیش کیا ہے کہ تھوڑی ہی دیر میں پڑھنے والے کے سامنے وہ حقیقی پیکر کی صورت میں آ جاتا ہے اور وہ اس کے یقین پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہی بات آلہا کھنڈ میں بھی پائی جاتی ہے کیوں کہ میں نے اکثر لوگوں کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ آلہا تو یا نفر کی پوت ہے مگر انھیں کو اس محفل میں ایسا کھویا ہوا مسحور پایا ہے جیسے ان کے تمام یقینی غلط واقعات و قصص کو زبردستی کسی جادوگر نے اپنی لکڑی پھیر کر سچ منوا لیا ہو اور وہ یقین کر لینے پر مجبور ہو کر رہ گئے ہوں۔

اردو میں انیس کی شاعری کے وہ نمونے جو ہنگامہ کارزار کی عکاسی سے متعلق ہیں بجا طور پر آلہا کا جواب ہو سکتے ہیں البتہ فرق صرف مزاج اور ماحول کا پڑ جاتا ہے۔ مگر دقتِ لحاظ و توجہ بات تو یہ ہے ہندی شاعری بھی سولھویں صدی تک اس کا نمونہ نہیں پیش کر پائی البتہ سترھویں اور اٹھارہویں صدی کے مشہور رزمیہ شاعر بھوشن اور لال کوی کی نظمیں اس کا اثر قبول کئے ہوئے ملتی ہیں۔ بھوشن کی مشہور رزمیہ نظم "شیوراج بھوشن" اور وہ نظمیں جن میں اس نے شیواجی کی بہادری، اُن کی جنگ اُن کے لشکر اور جاہ و جلال کی عکاسی کی ہے۔ اس کا الفاظ کی نشست و ترتیب اور تکرار سے ہیبت ناک ماحول پیدا کرنے کا انداز اور نظم کی آن بان اور تیور صاف بتاتے ہیں کہ بھوشن نے آلہا کھنڈ سے کافی اثر قبول کیا ہے۔

آخر میں مجھے آلہا کھنڈ کی کردار نگاری کے بارے میں بھی کچھ کہنا ہے آلہا کا ہر کردار اپنی جگہ پر مضبوط اور اٹل ہے اور شروع سے آخر تک اپنے مخصوص معیار پر قائم رہتا ہے۔ پھر کردار جتنے ہیں ان میں کوئی بعید از قیاس نہیں سب ایسے ہیں جنھیں ہم اپنی عام زندگی میں دیکھتے اور سنتے رہتے ہیں۔ وفا اور اخلاص جانبازی و دلاوری کا غازہ عورت، مرد، بچے، بوڑھے ہر کردار کے چہرے پر ملا ہوا ملتا ہے۔ اور یہی ایک رزمیہ نظم کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ سب سے زیادہ اہم اور قابل ذکر کردار سید ہے جس کی حیثیت ایک لشکر اور آلہا کے مددگار و قوت بازو کی ہے۔ سید کا کردار حب وطن، جاں فروشی اور ثبات و استقلال کا ایسا عظیم و مکمل خاکہ ہے جس کا فوری تاثر یہ ہوتا ہے کہ ہمیں اپنی قدیم تہذیب کلچر اتحاد و ایثار، حق پرستی و بے لوث پرست پایاں فخر و مسرت ہونے لگتی ہے اور اس کے تحت تمام ایسے سچے کردار جیسے مرہٹوں کا ابراہیم گاردی، رانی جھانسی کا غوث وغیرہ نظروں کے سامنے گردش کرنے لگتے ہیں۔ سید کا کردار باوجود سخت ترین مصائب و آفات کے مرتے دم تک بے میل اور بے لچک نظر آتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج بھی آلہا گانے والے عوام روزانہ کی کاروباری زندگی میں بھی سید کا نام بڑے احترام سے لیتے ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے سید کے کردار نے ان پر انمٹ چھاپ لگا دی ہے جسے وہ کسی وقت بھی فراموش نہیں کر پاتے۔

آج جب ہم اپنے ماضی کی کھوج میں اٹھے ہیں اور ہمیں موقع بھی ملا ہے تو ضرورت ہے آلہا کھنڈ اور اس کے پس منظر و پیش منظر کا گہرا جائزہ لیا جائے اس سے بہت سے مفید و بامقصد نتائج نکلیں گے اور آلہا اودل کی حقیقی عظمت و منزلت بھی معلوم ہو سکے گی۔ آلہا جو ہمارے عوام کے دلوں میں رہتا ہے۔ آلہا جو امر ہے نہ وہ مرا ہے نہ مرے گا۔ کیوں کہ وہی تو ہمارے شیر دل ساونتوں کا دیوتا ہے اور دیوتاؤں پر موت کا بس نہیں چلا کرتا۔ (بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

راشٹرپتی بھون میں اعزاز دینے کی تقریب



صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد مشہور ادیب اور ماہرِ آثارِ قدیمہ جناب غلام یزدانی کو "پدم بھوشن" کا تمغہ عطا فرما رہے ہیں۔

اعزاز پانے والے راشٹرپتی بھون میں



کوڈائی کنال میں جھیل کا منظر





شملہ کا ایک بازار



جھیل نگین (کشمیر)

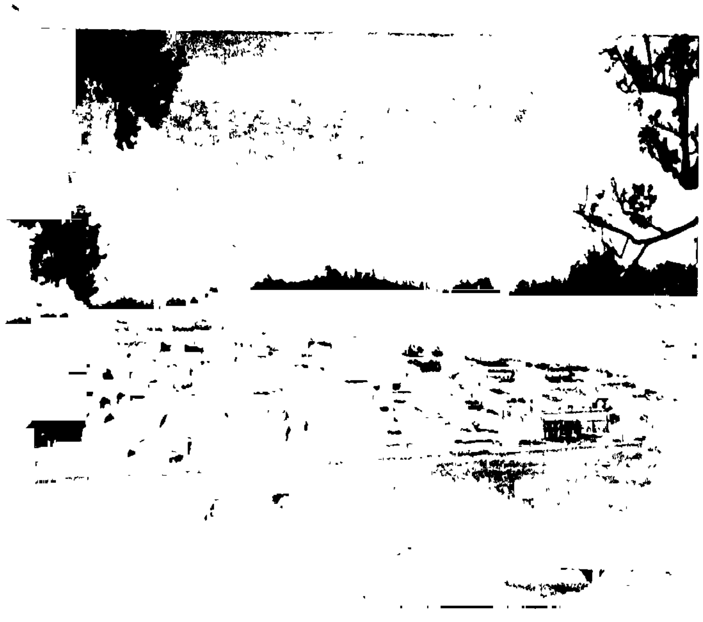




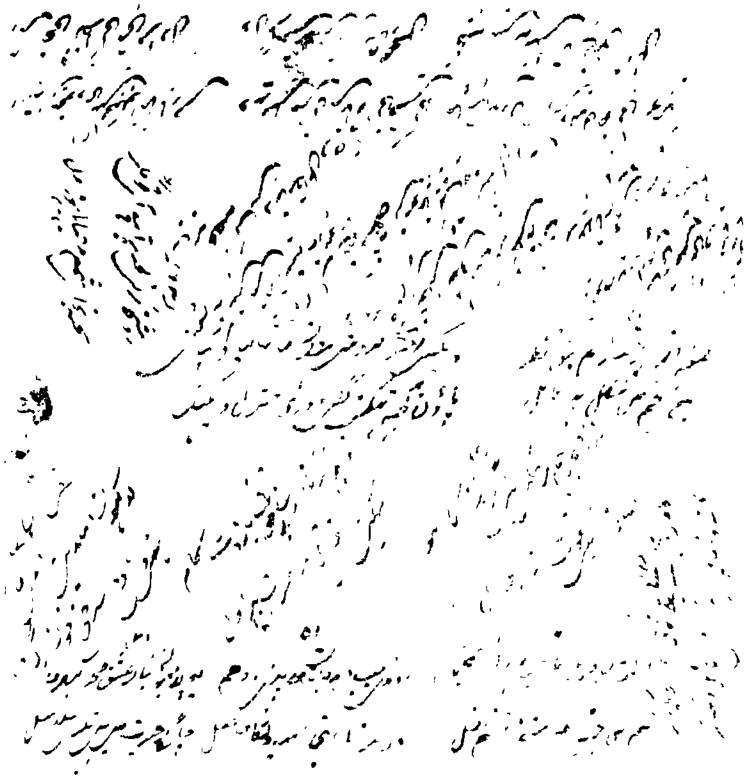
مال روڈ (مسوری)







اوٹاکمنڈ



واجد علی شاہ اختر کی ایک غزل کا عکس

جو انھوں نے کلکتہ جاتے ہوئے بنارس
کے قیام میں تصنیف کی تھی۔

اس سے متعلق آنند اشیہ لکھنوی کا
مضمون صفحہ ۱۲ پر ملاحظہ فرمائیں



لندن یونیورسٹی میں اردو کی
طالبہ مس میری ولیمس
وزیر ثقافتی امور و سائنسی
تحقیقات پروفیسر ہمایوں کبیر
کے ساتھ۔ آپ حال ہی
میں ہندوستان آئی تھیں۔

شفقت کاظمی

غزلیں

جہاں جہاں مجھے تیرا خیال آیا ہے
قرارِ تام کی دولت بھی ساتھ لایا ہے

ترا جمال کہاں جلوۂ بہار کہاں
مری نگاہ نے کتنا فریب کھایا ہے

وفا کے نام پہ اب کانپ جاتا ہوں
ترے سلوک نے اتنا مجھے ڈرایا ہے

اب اور کوئی توقع نہیں رہی تجھ سے
مری وفا نے تجھے خوب آزمایا ہے

حریمِ دل پہ بٹھائے ہیں پاسباں تیرے
ترا خیال نہ جانے کدھر سے آیا ہے

یہی بہار ہیں ہے ترے جمالوں کی
اسی بہار سے تیرا سراغ پایا ہے

ہزار بار پڑا ہے تجھی سے کام ہمیں
ہزار بار ترا نام لب پہ آیا ہے

نگاہِ شوق سے دیکھا تھا ہم نے کب لیکن
جمالِ یار پہ اب تک حجاب چھایا ہے

نشاطِ روح کا ضامن بھی ہے وہی شفقت
وہ غم کہ جس نے مجھے عمر بھر رُلایا ہے

زندگی اور بھی ستائے گی
جب تری یاد بھول جائے گی

پھر نہ جاگیں گے جاگنے والے
ایک ایسی بھی نیند آئے گی

تیرے غم کی گھڑی طویل سہی
آخرِ کار بیت جائے گی

جب کبھی آپ یاد آئیں گے
عمرِ رفتہ بھی لوٹ آئے گی

چارہ نا چار دیکھنا ہوگا
ہم کو تقدیر جو دکھائے گی

پھر نہ پائے گی ایک بھی مجھ سا
مجھ کو دنیا اگر مٹائے گی

موت کا انتظار کون کرے
آنے والی ضرور آئے گی

وہ گھڑی بھی عجب گھڑی ہوگی
تجھ سے تقدیر جب ملائے گی

مُنہ سے نکلی اگر کبھی شفقت
دُور تک اپنی بات جائے گی

محمد مرتاض الدین

قطب مشتری

ایمرسن نے ایک بار کہا تھا —— "جب کسی نئے فن کار کی شہرت ہوتی ہے میں کسی قدیم فن کار کے رشحاتِ قلم اٹھا لیتا ہوں کسی کلاسکس کو پڑھنے لگتا ہوں۔"

وجہی کی مثنوی قطب مشتری کا مطالعہ نہ صرف اس جہت سے اہم ہے کہ اس مثنوی کو اردو ادب میں کلاسکس کا درجہ صحیح معنوں میں حاصل ہے بلکہ اس کی اہمیت کے اور بھی اسباب ہیں -

کہا جاسکتا ہے کہ قطب مشتری ہمارا قدیم ادبی سرمایہ ہے اور کلاسکس ہے۔ سب صحیح و درست، مگر آج کی دُنیا میں اس کے مطالعے کی ضرورت ہی کیا ہے ؟ ہماری توجہات کا مرکز عہد جدید کی ادبی تصنیفات ہی اتنی ہیں کہ انھیں دیکھنے سے فرصت نہیں مل سکتی - لیکن میں تو قدیم ادبی سرمائے کا مطالعہ نہایت ہی ضروری سمجھتا ہوں - کیوں کہ یہ قدیم ادبی سرمایہ ہی ہے جو نہ صرف ہمارے لطیف ذوق کی تسکین کا سامان ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ انسانی کاوش کا وہ سرمایہ ہے جس کے بغیر موجودہ ادبی اور تمدنی ترقی ناممکن تھی۔ تخیل اور ذہانت کی پُرانی تاریخ جو قدیم ادب کے اوراق میں وجہی جیسے فن کاروں نے اپنے زورِ قلم سے بند کر رکھی ہے ، انسانیت کا سب سے قیمتی ورثہ ہے اور ہمیں لازماً اس کی قدر کرنا ہے

وجہی کا آرٹ اس وقت کی یاد دلاتا ہے جب عقل و دانش پر پہرے بٹھلا کر تخیل اور ذہانت کو زنجیروں میں جکڑا نہیں گیا تھا بلکہ وجہی کے اشعار میں ان جذبات کا دل دھڑک رہا ہے۔ جنھیں حسن و صداقت اور آزادیٔ فکر و ضمیر سے محبّت ہے۔

ہم نے کہا تھا ، وجہی کا مطالعہ کئی جہت سے اہم ہے۔ ایک وجہ اہمیت کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اُس نے جو معیارِ شعر و سخن پیش کیا اُس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آج سے لگ بھگ ۴۰۰ سال پیشتر بھی اُردو شاعری کے خط و خال اتنے ہی حسین تھے جتنے آج ہیں - حالاں کہ سماج میں اتنی بڑی سیاسی اور تمدنی تبدیلیاں آچکی ہیں - قطب مشتری (جس کا سنِ تصنیف تقریباً ۱۶۰۸ء ہے) کے چند ایسے اشعار ملاحظہ ہوں جن میں وجہی نے اپنا معیارِ شعر و سخن پیش کیا ہے ۔

جو بے ربط بولے تو بتیاں پچیس —— بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس

جے بات کے ربط کا نام نیٹں —— اُسے شعر کہنے سے کچھ کام نیٹں

نکو کر تو لئی بولنے کا ہوس —— اگر خوب بولے تو یک بیت بس

ہنر ہے تو کچھ نازکی بیت یاں —— کہ موتیاں نیٹں باندتے رنگ کیاں

دو کچھ شعر کے فن میں مشکل اچھے —— کہ لفظ ہور معنی یو سب مل اچھے

اگر نام ہے شعر کا تجکوں چھند —— چُھنے لفظ لیا ہور معنی بلند

ہنر ونداسکوں کہیا جائے گا —— جو کوئی اپنے دل تے نوالیائے گا

دیوانہ ہوں میں اس رنگی بات کا —— کہ ہر دل میں جیو ہو کرے ٹھار آ

سخن گو وہی جس کی گفتار تھے —— اُچھل کر پڑے آدمی ٹھار تھے

زبان قدیم دکنی ہے۔ پھر بھی مطلب صاف ہے تقریباً یہی معیار میر کے تذکرہ نکات الشعراء میں بھی ملتا ہے۔ یعنی زبان سلیس ہو، باتوں میں ربط ہو، زیادہ بکواس کی ضرورت نہیں (نکو کر تو لئی بولنے کا ہوس) اشعار میں نازکی ہو، چُھنے لفظ ہوں اور معنی بلند، بات ایسی ہو جو دل میں گھر کر جائے وغیرہ وغیرہ۔

قطب مشتری کے مطالعہ کے بعد شاید اس بارے میں کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی کہ وجہی ایک مقصدی فن کار تھا۔ اور اس کے پیشِ نظر تمدن نہا اُونچے طبقے، رئیسوں، امیروں اور حکمرانوں کے کشتِ دل میں اخلاق، ایمان اور خوفِ خدا کی تخم ریزی۔ وجہی نے اپنے مقصد کا ہمیشہ خیال رکھا ہے۔ خواہ منظر نگاری ہو، کردار نگاری یا جذبات نگاری۔ یہ بھی صاف ہے کہ وجہی کے قلب و ذہن پر قرآنی احکام اور مذہبی ارشادات چھائے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں فحش نگاری اور عریاں نگاری کے باوجود وجہی کی اکثر باتیں مذہبی حکمت پر مبنی ہیں اور انھیں اس نے شعریت کا جامہ عطا کیا ہے۔ آپ اس مصرعے ہی کو لیجئے۔ ع وفادار سو یار کرتا رہے۔ قرآنی آیت ہے۔ "مالکم من دون اللّٰہ من ولی ولا نصیر" (اللہ کے سوا تمھارا کوئی دوست نہیں، مددگار نہیں) یہی بات وجہی نے بھی پیش کی۔ قرآن پاک میں ستاروں کو ایک جگہ "سراجاً وہاجاً" یعنی روشن چراغ کہا گیا ہے۔ وجہی کے ذہن پر اس کا اثر دیکھئے۔

سورج شمع ہور تھال گھن ہفت رنگ
دوا چند گِنہ کا ستارے ہے پتنگ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان ایک ہفت رنگ طشتری ہے اور اس میں آفتاب کی شمع روشن ہے یا ہلال شمع ہے اور ستارے پروانے، وجہی کی منظر نگاری اور مرقع نگاری نہایت ہی دلچسپ آفاقی پردے پر ہوتی ہے۔ وہ بار بار آسمانوں ستاروں، چاند، سورج اور کہکشاں کی طرف ہماری توجہ منعطف کراتا ہے ؎

شفقِ صبح کا نائی ہے آسمان میں
کہ لائے کھِلے سنبلستان میں

جوش نے ترقی کی تو یہ کہا ؎

اُفق پر یہ رنگین شفق کا ظہور
نگارِ ازل کے تبسم کا نور

اس سلسلے میں وجہی کا صرف ایک اور مصرعہ ملاحظہ ہو۔
ع سو سبزا ہے کہکشاں کر خنجر ہلال۔ وجہی کے بعد اگر کسی شاعر نے اس طرح آسمانی پردے پر چاند، ستاروں اور کہکشاں کے نقش و نگار بنائے ہیں تو وہ اقبال ہے۔

وجہی پر ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ فحش نگاری کا آغاز اردو ادب میں یہیں سے ہوتا ہے۔ بات صحیح بھی ہے۔ اگر وجہی نہ ہوتا تو اُردو ادب میں میر اثر، مرزا شوق اور مومن کی مثنویوں کی وہ فحش نگاری اور عریاں نگاری نہ ہوتی جو کہیں کہیں ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ یہ وجہی کی مثنوی میں عریاں نگاری تھی جس نے اُردو غزل کو بھی برباد کیا۔ اُردو ادب میں "بوسہ کاری" اور اس کے جملہ لوازم کی روایات کا منبع قطب مشتری ہے۔ اس آغاز کا انجام شان دار طریقے سے آتش کے ہاتھوں ہوا اور بات کمر بار کی پیٹیں ہو تک پہنچی۔ یہ ساری باتیں اور یہ اعتراضات ایک حد تک صحیح ہیں لیکن وجہی کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ یہ بتا رہا ہے کہ عریانی اس کا مقصود نہیں بلکہ یہ ایک مقصد کے تحت ہے اور وہ ہے اصلاحِ اخلاق ؎

عطارد منا آپ کا شاہ کوں | بھوت دھات سوں پند دیا شاہ کوں
کہ شہ عشق بازی توں کر اس اصول | کہ تجتے خدا خوش اچھے ہور رسول

"خدا خوش اچھے (رہے) ہور (اور) رسول"۔ یہی بنیادی چیز تھی جو وجہی کے پیشِ نظر تھی۔ اب یہ بات بحث طلب ہے کہ فن کار کو مذہبی موضوع کے پیش کرنے کا اختیار ہے یا نہیں ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ فن کے دائرے میں بڑی وسعت ہے۔ اس دائرے میں کسی کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ، کسی حسینہ کے جسم کے دلاویز خطوط بھی آ سکتے ہیں۔ ہماری زندگی صد پہلو ہے۔ اس زندگی میں "شرارِ بولہبی" ہی نہیں "چراغِ مصطفوی" بھی ہے۔ اس لئے وجہی نے اگر مذہبی موضوعات و مسائل کو چھیڑا ہے تو ہمیں اس پر اعتراض نہیں، ہاں دیکھنا یہ ہے کہ ادب و فن کا بھی فن کار نے کچھ خیال رکھا ہے یا نہیں کیوں کہ فن کار نے جو کچھ کہا ہے اگر وہ اس کی فنی حیثیت کو بالکل فراموش ہی کر گیا ہے تو وہ فن کار کیا ہوا۔ تصوف، فلسفہ، مارکسی خیالات، عیسائی اور اسلامی نظریئے یہ تو خام مواد ہیں اور ان کے موضوعِ سخن ہونے میں کسی طرح کی قباحت نہیں ——— ہاں مگر اتنی شرط ہے کہ اُن کی ترجمانی میں اصلیت، حسن اور سچائی ہو۔ وجہی اس لحاظ سے بڑا کامیاب شاعر ہے کہ اس کے تجربے میں شاعرانہ سچائی ہے، باتوں میں ربط و تسلسل ہے، قطب مشتری میں تعمیری یکسانی، اسلوب کی بے ساختگی، تکنیک کی حسن کاری یہ سب چیزیں موجود ہیں۔ ان خوبیوں نے مل ملا کر اس مثنوی کو بحیثیت نظم ایک امتیازی حیثیت دے دی ہے۔ یہاں تسلسل تو ہے ہی۔ اس کے علاوہ جامعیت ہے، خیال کی وضاحت ہے اور ان کے ساتھ ساتھ الفاظ کی سادگی، جذبات کی شدت

اور پھر جذبات پر شاعر کا قابو۔ یہ خوبیاں ایسی ہیں کہ ہم انھیں آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بہرحال! موضوع اور فن کی اس بحث کو یہیں چھوڑیئے اب آیئے پھر قطب مشتری پر ایک نظر ڈالیں۔

قطب مشتری میں وجہی نے قلی قطب شاہ کے معاشقے کو افسانوی پیراے میں پیش کیا ہے اور قدیم دستور کے مطابق دیو اور پریوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ مشتری شاہ بنگال کی لڑکی ہے۔ قطب شاہ اپنے مشیر عطارد کی معیت میں ایک فوج کثیر لے کر دکن سے بنگالے کو روانہ ہوتا ہے۔ راستے میں اژدہا اور دیو کو مارتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ ایک پری مہتاب نامی کے یہاں قیام پذیر ہوتا ہے اور وہاں قطب شاہ کو چھوڑ کر عطارد اکیلے بنگالے کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ قطب شاہ نے مہتاب سے اپنے [illegible] اور ظالم دیو کے مارنے کا تذکرہ کیا۔ مہتاب نے جب سنا کہ دیو مر گیا تو وہ اس دیو کے متعلق کہتی ہے ؎

مو گیا وو دیو کہ نہیں جانتا
پریاں کوں جی آ کے رنجانتا

یعنی کم بخت کا دیو مرا، اچھا ہوا۔ اس کی حالت یہ تھی کہ پریوں کو بھی آکر اذیت دیتا تھا، "رنجانتا" یعنی تنگ دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس عہد میں دیو اور پری کے تذکرے سے ہمیں دلچسپی نہیں رہی ہو۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہمارے قدیم فن کاروں نے دیو، پری، بھوت، جنات اور جادو [illegible] کے پردے میں زندگی کے مختلف معاملات و مسائل کو پیش کیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ "دیو" پریوں کو "رنجانتے" تھے۔ کیا آج ہمارے سماج میں مختلف شکل و صورت اور مختلف ہیئت کے "دیو" موجود نہیں ہیں۔ آج بھی لاکھوں لیلائیں اور عذرائیں ایسی ہیں جو اپنے مجنوں اور وامق تک نہیں پہنچ سکتی ہیں۔ فرہاد نے تیشے سے سر پھوڑ لیا۔ فیض نے یہ کہہ کر اپنی تسکین کر لی۔

"راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا"

دیو اور پری، علیؑ اور عنترہ، محمدؐ اور ابولہب، مزدور اور سرمایہ دار زندگی کے مختلف رخ ہیں، مختلف پہلو ہیں۔ جب تک زندگی باقی ہے۔ انسان زندہ ہے۔ یہ پیش ہوتے ہی رہیں گے۔ اب فن کار خواہ وجہی ہو، ورڈسورتھ ہو یا فیض ہو، زندگی بہرحال فن کار کا احاطہ کئے رہتی ہے، وہ اسے اپنی آغوش سے نکلنے نہیں دیتی۔ فن کار کوشش بھی کرے تو زندگی سے بھاگ نہیں سکتا۔ ارمانوں کی روشنی خون سے منہ پھیرتی رہے۔ شاعر اور فن کار لیلاؤں کی خیر مناتے ہی رہیں گے۔

ہمارے سماج میں دیووں کی موجودگی وجہی کے وقت میں بھی تھی۔ آج بھی ہے۔ مگر زندگی کی شب تاریک میں فن کار شروع ہی سے اپنی مشعلِ دل روشن کرتا آیا ہے اور ناامیدی کے سیلاب میں ڈوبتے دلوں کو اُمید کا ساغر بناتا ہے۔ وجہی نے بھی ایک عظیم فن کار کی طرح ستم ظریفیٔ حالات سے نپٹنے "دیو" کو تہ تیغ کرنے اور نئی نسل کی ترغیب دی ہے۔

مثنوی قطب مشتری لکھنے کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ وجہی درس اخلاق دینا چاہتا تھا۔ اس میں قطب شاہ اور مشتری کی عشق و عاشقی تو تھی لیکن ایک صلائے خاص بھی تھی یعنی اعلیٰ اور مثالی کردار پیش کی [illegible] لوگوں کے دل میں پیدا کرنا۔ یہی سبب ہے کہ رنگینی، دلچسپی، قصہ، کہانی اور مختلف مناظر کی پیش کش کے ساتھ ساتھ وجہی نے اپنے آدرش کو بھلایا نہیں۔ موقع بہ موقع ایک اعلیٰ کردار کی جھلک وہ پیش کر دیتا ہے اور پند و نصیحت سے بھی باز نہیں آتا ؎

سچے مومن مسلمان دل نرم ہے — نشان اس کے ایمان کا شرم ہے
جو کم ذات اس تے وفا نہیں ہوتا — اصیلاں تے ہرگز خطا نہیں ہوتا
ہوا دیو جیو سے وہاں تے جدا — کہ ظالم تے راضی نہیں ہے خدا
دنیا میں توں آیا تو کچھ نام کر — خدا کوں جو بھاتا ہے سو کام کر
بلند مرتبا جھوٹ تے ہوئے پست — دنیا میں نہیں سچ تے کچھ خوب بست
کہ تجھ عشق بازی توں کر اس اصول — کہ تجھتے خدا خوش اچھے ہور رسول

آج ہم ۲۰ ویں صدی کے انسان ہیں۔ یہ سائنٹفک دور ہے۔ زندگی پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی جا رہی ہے۔ ان اخلاقی قدروں کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ گئی ہے جنھیں وجہی نے پیش کیا ہے۔ ہماری موجودہ تہذیبی اور اخلاقی سطح کو دیکھتے ہوئے ایسا کہنا حقیقت کا اظہار ہے۔ لیکن یہ بھی تو دیکھئے، ہم اپنے خیالوں میں، اپنے خوابوں میں، اپنی تخلیق کے لحاظ سے صرف آج ہی کے انسان تو نہیں ہیں۔ ماضی سے ہمارا اٹوٹ رشتہ قائم ہے۔ آج ہم نبی نہ ہوں، پیغمبر نہ ہوں، مگر ہمارے اسلاف، ہمارے آبا و اجداد تو رسولوں اور ہادیوں کا زمانہ دیکھ چکے ہیں۔ ہمارے تحت الشعور میں اعلیٰ اخلاقی اور روحانی قدریں اب تک دبی دبائی موجود ہیں۔ وجہی انھیں [illegible]

کو حیات نو عطا کرتا ہے۔ انھیں زندگی و پائندگی عطا کرتا ہے۔ انھیں درخشندگی و تابندگی بخشتا ہے۔ اور اخلاق کی بجھتی ہوئی چنگاریوں کو ایک بار پھر وہ شعلہ افشاں کرتا ہے۔ یہ بڑی بات ہے۔

مثنوی قطب مشتری کے ہیرو قلی قطب شاہ نے دکن سے بنگالے تک کا سفر کیا۔ یہ ایک طویل سفر تھا۔ اس مثنوی میں منظر نگاری کی بڑی گنجائش تھی لیکن اس لحاظ سے منظر نگاری کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ پھر بھی جہاں جہاں منظر نگاری کے نمونے ملتے ہیں۔ ان میں شاعرانہ تازگی موجود ہے۔

یکایک دسا ایک نزدیک باغ　　ہوا اس کی باساں تے ترسب دماغ
(نظر آیا)　　(خوشبو سے)

کہ پاتاں کے پڑیاں کو سب پھاڑ کر　　پھلاں جھانکتے تھے سراں کاڑ کر
(پتے)　(پردے)　　(نکال)

سرود اں سو مرغاں کے نالے تھے واں　　صُراحیاں کلیاں، پھول پیالے تھے واں
(صراحیاں)

برگ بار آتے تھے اس دھانت سب　　کہ چھپ گئے پھلاں کے تلے پات سب
(طرح)

ٹھواں کوئی نہ تھا آگے اس ٹھار ٹھار　　بہار اور بھیتر تھا سب بہار
(جگہ، موقع)　　(باہر)　(اندر)　(تھا)

یاسن دو چمن سرد دو راست تھے　　کلیاں سر خوش ہور پھول سو مست تھے
[illegible] پانی اس ٹھار کا [illegible] تھا　　کہ امرت پہ بھی اسے لاف تھا
پھلاں باغ میں جتے تھے شوق سوں　　جتا اور پڑھتے تھے سب ذوق سوں
ڈبیاں پھول رنگ رنگ کا تاں چمن　　کہ خوش بوئی فروشی اپی واں پون
(چمن کی دوکان میں مختلف پھول ڈبیوں کے طور پر تھے اور ہوا خود عطر فروشی کر رہی تھی)

اور ویسے میں لب بام کوئی آ جاتا ہے۔

انتھا محل واں ایک ایسا بلند　　پون سار نا ہو سکے سٹ کمند
یکایک اس محل پہ ایک نار　　کنک چھت سوں آئی ایسیں سنگار

ان مثالوں سے وجہی کی شاعرانہ منظر کشی اور زبان و بیان کی خوبیاں اوج کمال پر نظر آتی ہیں۔

عطارد نے مشتری شاہ کے محل کی آرائش کی۔ اس آرائش کا جو بیان وجہی نے کیا ہے وہ پڑھنے کی چیز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یہ دہ [illegible] پر [illegible] حسین مناظر تیزی سے گذر رہے ہیں۔ وجہی کی یہ ساحری ہے کہ آج اس کی زبان ہماری زبان سے بہت حد تک مختلف ہے پھر بھی ہم اس کی کتاب میں کھو جاتے ہیں۔ ہاں تو عطارد نے مشتری کے محل کی دیواروں پر جو نقش و نگار بنائے وہ مصوری کے شاہکار پیش کئے۔ ان سے متعلق محض ایک دو اشعار ملاحظہ ہوں۔

کہیں بن بیاباں کہیں سمد بھار　　کہیں مرغ ماہی کہیں پھول جھاڑ
کہیں شیر شرزا کہیں گج تر تک　　کہیں بادبری کہیں باد کلنگ
کہیں شاعراں شعر کہتے اچھیں　　کہیں چشمے امرت کے بہتے اچھیں
کہیں ہیں ملائے کہیں ہیں خمار　　کہیں ہیں دوا سے کہیں ہیں ہشیار

وجہی کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر چند اس نے اس کو نثر کا ادب نہیں سمجھا۔ ادب کو برائے ادب نہیں بنایا پھر بھی اس کے یہاں تشبیہ، تمثیل، رمزیت اور گمان آپ سبھی کچھ پا سکتے ہیں۔

یہاں اس کا موقع نہیں کہ وجہی کی عریاں نگاری اور جذبات نگاری کی مثالیں پیش کی جائیں یا اردو ادب کی دوسری مثنویوں سے قطب مشتری کا مقابلہ یا موازنہ کیا جائے۔ لیکن یہاں قطب مشتری اور گلزار نسیم کی تہذیبی فضا اور اس کی تفصیل کا ایک مختصر سا حوالہ دے دیا جائے تو شاید بے موقع نہ ہو۔ آخر تو سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ فن کار بہر حال اپنے ماحول سے وابستہ رہتا ہے۔ اس لئے اس کے کارناموں میں "روح عصر" کسی نہ کسی طرح سے موجود ہی رہتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مختلف ادوار کے ادب پاروں میں ہمیں اس عہد کی سوسائٹی سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے قطب مشتری (تقریباً ۱۶۰۸ء) سے گلزار نسیم (تقریباً ۱۸۴۰ء) تک ایک لمبا سفر ہے۔ قطب مشتری اور گلزار نسیم دونوں کی فضا اور اس کی تفصیل ارض دکن اور لکھنؤ کی تمدنی اور سیاسی فضا کی تفصیل ہے۔

گلزار نسیم کی فضا میں شراب کی بو ہے۔ عورت مرد کھل کر داد عیش دیتے ہیں۔ مرد کے چاروں طرف عورت ہی عورت ہے۔ کسی طرف دلبر کسی طرف محمودہ، اور کسی طرف بچترا وت ہے تو کسی طرف بکاؤلی ہے۔ اس فضا کی تفصیل کو مزید واضح کرنے کے لئے اس میں اندر سبھا کی فضا کی شمولیت کر لی جائے تو بس پھر کچھ نہ پوچھئے، پکھراج، نیلم، لال اور سبز پری کی دھوم ہے۔ شمشیر و سناں کا کہیں پتہ تک نہیں، بس جدھر دیکھئے طاؤس و رباب کی

بات ہے۔ حد ہو گئی کہ تلوار تک خوبصورت نیام میں رکھ دی گئی۔

"پھینک سے قبا یار کی تلوار سنتی" (اندر سبھا امانت) گلزار نسیم نے ایک ایسی دُنیا پیش کی جس کے افراد ہاتھ پاؤں ہلانے سے بہتر یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی ایسا دیو مل جائے جو "گلزار ارم" کی انھیں سیر کرا دے اور ایسا چھومنتر کا نسخہ ہاتھ لگے کہ لمحے بھر میں "کاشیِ نگاریں" تیار ہو جائے۔

لکھنوی ہیرو کے برعکس قطب مشتری کا ہیرو دیو، پری، گنڈے تعویذ طلسم اور چھومنتر کے پھیر میں نہیں رہتا، وہ لیتا نہیں، عطا کرتا ہے۔ "دیو ماموں" کو حلوے کھلا کر رام نہیں کرتا بلکہ اُسے تہ تیغ کرتا ہے۔ اژدھے سے طلسماتی جنگ نہیں کرتا۔ اپنے زورِ بازو سے اس کا سدِّ باب کرتا ہے۔ منتر، بال اور دیو کی مدد سے وہ "گلشنِ نگاریں" یا دھوکے کی ٹٹی نہیں کھڑا کرتا ہے۔ وہ اپنے زورِ بازو سے، اپنی صلاحیت، شرافت اور نجابت سے قابلِ میراث پیدا ہے۔

وجہی کا ہیرو قطب جوان ہے صحت مند اور توانا ہے۔ اُس کی بھی خواہشیں ہیں۔ مگر کروٹ کروٹ، دلیر، محمودہ، جزاوت اور بکاؤلی کو لئے نہیں پھرتا۔ راستے میں مہتاب اُسے ملتی بھی ہے تو منہ بولے بھائی بہن کا رشتہ قائم کر کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ اپنی دھن کا پکا ہے اور جس کی تلاش میں روانہ ہوتا ہے اُسے ہی حاصل کرتا ہے۔ راستے راستے گلزار نسیم کے ہیرو کی طرح "چراغ اور فتیلے" کی بلائیں گرفتار نہیں ہوتا۔

لکھنو کی دُنیا دکن سے بالکل ہی مختلف ہے۔ یہاں آرائش ہے، سجاوٹ ہے۔ رنگینی اور دلبستگی کے ہزاروں سامان ہیں۔ پھر بھی ایک عجیب بات ہے۔ کہ لکھنوی چمن کدوں کا تنفس اور گلاب زار کی سانس سے اُس فضا کا مقابلہ نہیں ہو سکا جو ارضِ دکن کی فضا ہے اور جہاں ع

خوشبوئی فروشی اپی واں پون ، یہاں لکھنؤ اور دکن کا تذکرہ یوں ہی چھڑ گیا۔ اس سے کسی دبستان کے فن پاروں کی عظمت کا موازنہ مقصود نہیں لکھنؤ ہو یا دلّی، دکن ہو یا عظیم آباد سبھی دبستانوں نے اپنی بساط بھر ادبِ اردو کی خدمت کی ہے اور آج تک کر رہے ہیں اور سب کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ آج کی فضا میں نجات کا راستہ سیاسی معاملات ہی میں نہیں ادبی مسائل میں بھی "پنج شیل" ہی کی روشنی میں دکھائی دیتا ہے۔

بہرحال! قطب مشتری کا ایک سرسری خاکہ ذہن میں رکھتے ہوئے وجہی کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک عظیم فن کار گذرا ہے۔ سچ پوچھئے تو ایسے ہی فن کار منصبِ کام و دہن کو بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ وجہی نے عملی طور پر یہ ثابت کر دیا کہ فنّی حدود کے اندر بھی ادب سوسائٹی کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ ادبی محاسن کے ساتھ ساتھ ادب برائے زندگی کی بات کس طرح ہو سکتی ہے۔ اس کی عمدہ مثال ہمیں قطب مشتری میں ملتی ہے۔ اس شہ پارے سے ہمارے ذوقِ جمال کی تسکین ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ ہمارے لئے ایک فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ تمدّن اور حیات سے متعلق ایک خاص مطمحِ نظر بھی موجود ہے۔ اور اس حیثیت سے وجہی آسکر وائلڈ اور لارڈ آبیری (ادب برائے ادب کے علمبردار) برنارڈ شا اور ابسن (ادب برائے زندگی کی صدا بلند کرنے والے) ان سبھوں سے عظیم تر نظر آتا ہے۔ وجہی کی عظیم وراثت اور اس کے سرمائے پہ ہم جتنا بھی فخر کریں وہ کم ہے۔ کیوں کہ دانایانِ مغرب بھی اس کے سامنے سفیرِ سلوم ہونے لگتے ہیں۔ آسکر وائلڈ اور لارڈ آبیری فن برائے فن کے اس حد تک علمبردار ہوئے کہ ادب کا زندگی کے ساتھ جو نازک رشتہ ہے، وہ مجروح ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اسی طرح اس عہد کے عظیم فن کار شا اور ابسن پر زندگی اس حد تک پیرِ تسمہ پا کی طرح سوار ہوئی کہ باریک اور لطیف فنّی رکھ رکھاؤ اور حسن کا گلا اکثر گھٹنے لگا ہے لیکن وجہی کے یہاں شروع سے آخر تک ایک حسین توازن، بات میں ٹھہراؤ، جذبے پہ فنّی ضبط، یہ سب کچھ اس حد تک ہے کہ تعجب ہوتا ہے۔ اتنی صلاحیتوں کا وہ اس زمانے میں کیسے حامل ہو سکا۔ ایک نابغہ کی طرح ایک "جینیس" کی طرح وجہی اردو ادب پر اس طرح اثر انداز ہوا ہے کہ صرف تاریخی حیثیت سے ہی نہیں۔ ادبی اور فنّی حیثیت سے بھی ہم اُسے کسی قدم پہ نظر انداز نہیں کر سکتے۔

ضروری گذارش (۱) مضمون کاغذ کے ایک طرف اور خوش خط لکھئے (۲) غیر مطلوبہ مضامین اُسی صورت میں واپس کئے جائیں گے جب کہ اُن کے ساتھ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ ہوں گے (ادارہ)

ایس چندر شرما

رباعیاتِ محروم

حضرت محروم دورِ حاضرہ کے شاعروں میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں آپ کا شمار ہندوستان کے بلند پایہ اور نامور اساتذۂ سخن میں ہے۔ محروم کو شعر و شاعری سے طبعی دلبستگی ہے۔ یہ ملکہ ان کی فطرت میں ودیعت ہے۔ ایک انگریزی مقولہ ہے۔ "شاعر پیدا نہیں کئے جاتے بلکہ پیدا ہوتے ہیں"۔ محروم کی ذات اس مقولے پر پوری اُترتی ہے۔ انھوں نے کسی کے سامنے زانوئے شاگردی تہ نہیں کیا اُن کی شاعری کسی کی اصلاح کی مرہونِ منّت نہیں رہی۔ فارسی میں بیسیوں ایسے شاعر گذرے ہیں جنھوں نے محض رُباعی گوئی کی بدولت لازوال شہرت حاصل کی۔ شیخ ابوسعید، خیّام، افضل کاشانی سحابی اور سرمد کی عالمگیر شہرت صرف رُباعی کی بناء پر ہے۔ اُردو میں اگرچہ شاعری کے دوسرے شعبوں نے بے انتہا ترقّی کی لیکن رُباعی کو وہ رُتبہ نصیب نہ ہوا جو اُسے فارسی میں حاصل ہے۔

بڑی خوشی کا مقام ہے کہ رُباعیاتِ محروم کی اشاعت سے اُردو شاعری اور خصوصاً اُردو رُباعیوں کے ذخیرے میں ایک گراں قدر اضافہ ہو رہا ہے۔ حضرت محروم کی ذات محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ اس عہد کے بڑے اہم اور ممتاز رُباعی نگاروں میں سے ہیں۔ ان کے کلام کی پختگی اور زبان کی دلآویزی اُدبائے ادب کے ارباب نظر سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے۔

بقول اکبر الہ آبادی:۔

ہے داد کا مستحق کلامِ محروم لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے اُن کا سخن مفید و دانش آموز ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم

رُباعی ایسی صنف ہے جو تخیّل کی بلندی اور بیان کی پختگی چاہتی ہے۔ "اس صنف کی تخلیق اس غرض سے ہوئی ہے کہ پختہ زندگی کے ژولیدہ و وسیع تجربات کو ہموار کر کے اور رسیدہ فکر کے عجیب و عمیق افکار کو ترتیب دے کر قلیل، لیکن بے حد جگردار الفاظ کی معرفت ایسے اُستادانہ اختصار اور ایسے حکیمانہ لہجے میں ادا کیا جائے کہ اس کے اجمال کے آستانۂ جمال پر تفصیل کا جلال سربسجود ہو کر رہ جائے۔۔ اور جو شاعر کہ حضرت محروم کے مانند خبرِ دمشق و وارائے نظر نہ ہو اُسے بیلائے رُباعی کی پابوسی سے محروم کر دیا جائے"[1]

بہرحال اُردو نظم کا ذخیرہ رُباعی کے مجموعوں سے خالی نہیں۔ میر انیس نے بہت رُباعیاں کہیں اور ایسی کہیں کہ رُباعی کہنے کا حق ادا کیا۔ ان کے ہاں اکثر چوتھا مصرع رُباعی کو چوتھے آسمان پر پہنچا دیتا ہے۔ حالی صاحب بہت مطلب رکھتے تھے۔ اُن کی رُباعیاں ان کے اصلاحی مفہوم کی پوری عکاسی کرتی ہیں۔ اکبر اپنے رنگ میں چوکھے ہیں۔ رواں لکھنوی اور آثر صہبائی کے ہاں شباب کے ولولے، جذبات کی بے تابی کے ساتھ حُسنِ ادا اور خیالات کی بلندی بھی موجود ہے۔ رُباعیوں کے چند مجموعے اس صدی میں شائع ہوئے ہیں۔

حضرت محروم دُنیائے ادب میں تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ اُردو ادب کی دُنیا میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں جس کی وقعت اور عظمت سب کو تسلیم ہے۔ آپ کی طبیعت ہمہ گیر اور آپ کا تخیّل بلند و مستحکم اور بیان دلکش ہے۔ آپ کا شمار ان اساتذہ میں ہے جن کی غائر نظر حالی اور

---

[1] جوش ملیح آبادی، سرورق رُباعیاتِ محروم

مستقبل تک پہنچتی ہے۔ حسنِ ترکیب، ندرتِ خیال، سادگی و سلاست زبان، چستی بندش، جدتِ اسلوب، نزاکت، بلندیٔ تخیل، شوکتِ الفاظ، شوخی و خوبیٔ محاورہ، صحتِ روزمرہ، حقیقت نگاری، منظر کشی، جوشِ جذبہ، صنائع بدائع، تنوع، خوش مذاقی، علمیت، فلسفۂ حیات، مسائلِ زندگی، الغرض کسی چیز کی کمی نہیں۔ انھوں نے ہر رنگ میں اور ہر موضوع پر شعر کہے ہیں۔

محروم کے کلام میں تصنع اور آورد مطلقاً مفقود ہیں۔ وہ حقیقت اور فطرت کے پرستار ہیں۔ روانی اور سلاست ان کے کلام کا خاص جوہر ہیں۔ الفاظ کی موزونیت اور محاورہ کی برجستگی ان کے اشعار میں جابجا نمایاں ہے۔ صفائیٔ کلام اور پختگیٔ مشق بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ فنِ شاعری کے استاد ہیں اور عروض و اوزان پر کامل قدرت رکھتے ہیں۔ عروض و قوافی پر انھیں پوری دسترس حاصل ہے۔[1]

خیال کی پاکیزگی، بیان کی روانی، عام جذباتِ انسانی کی ترجمانی، اخلاقی تلقین اور حسنِ فطرت کی نقاشی محروم کی رباعیات کی اہم خصوصیات ہیں۔ آپ کی ذہنیت توازن اور آپ کا شعور اعتدال سے مزین ہے۔ جن اوصاف اور اقدار کی رباعی کے لئے ضرورت ہے، وہ آپ میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے اور کلام کی طرح رباعیاں بھی نہایت پسند کی جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ خالقِ کائنات، قادرِ مطلق کارساز، ہر شے کا حکمران ہے۔ خدائے کریم مشکل کشا ہے۔ بجز ذاتِ کبریا کوئی سچا رہنما نہیں ہے۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ ہر کمالِ تردان میں مدد رساں ہے۔ "آہ" اور "واہ" دونوں میں اس کا عکس موجود ہے۔ متقی و مجرم ہر دو اس غفور کی رحمت کے طالب ہیں۔ محروم ابتدا میں پروردگارِ عالم کی حمد و مناجات اس طرح کرتے ہیں کہ صدقِ نیت یقینِ محکم و اعترافِ گناہ کا بیّن ثبوت ملتا ہے۔

ہر راہ میں ہے راہ نما نام تیرا
ہر آہ میں ہے عقدہ کشا نام تیرا
تسکیں میں ترا خیال تسکیں افزا
اندوہ میں اندوہ رُبا نام تیرا

اور:-

مجرم ہوں، سیاہ کار ہوں، رحمت کر
عاجز ہوں، گناہ گار ہوں، رحمت کر
حاضر ہے در پہ لے خداوند کریم
با دیدۂ اشک بار ہوں، رحمت کر

محروم مشرقی تمدن کی پیداوار ہیں اور ادبی و قومی، اصلاحی تحریکیں اکبر الہ آبادی کے ہم نوا معلوم ہوتے ہیں۔ کئی رباعیوں میں تعلیم نسواں اور عورتوں کی بے باکی و بے حجابی کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے یہاں غم و یاس کی عکاسی بھی کہیں کہیں ملتی ہے۔ پھر بھی بہ حیثیت مجموعی ان کی رباعیات کا انداز مصلحانہ ہے۔ مثلاً

دُنیا نے عجب رنگ جما رکھا ہے
ہر اک کو غلام اپنا بنا رکھا ہے
پھر لطف یہ ہے کہ جس سے پوچھو وہ کہے
اس عالمِ آب و گِل میں کیا رکھا ہے

رُباعیاتِ محروم کا شاعرانہ معیار بہت بلند ہے۔ فلسفۂ اخلاق، مذہب اور روحانیت کے نکتے جنھوں نے فارسی رُباعیوں کو اس قدر پُر معنی بنایا ان میں جا بجا ملتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

دروازہ نجات کا بیاباں میں نہیں
دل کا آرام قصر و ایواں میں نہیں
تسکیں جنّت میں بھی نہیں مل سکتی
جب تک موجود قلبِ انساں میں نہیں

دم اکثر پارسائی کا بھرتا ہے
حیراں ہوں کہ دل مرا یہ کیا کرتا ہے
خوف اس کو گناہ سے نہیں ہے لیکن
الزامِ گناہ سے بہت ڈرتا ہے

انکارِ گناہ بھی کئے جاتا ہوں
تکرارِ گناہ بھی کئے جاتا ہوں
حاصل ہو ثوابِ مفت، اس لالچ میں
اقرارِ گناہ بھی کئے جاتا ہوں

ظاہر میں قضا بہت ستم ڈھاتی ہے
جاں حسن کے اجل کا نام ڈر جاتی ہے
لیکن یہ موت کا نتیجہ ہے حیات
ہر شام پیامِ صبحِ نو لاتی ہے

بدخواہ نہیں خالقِ اکبر اپنا
غائب ہو کر بھی ہے وہ رہبر اپنا
ہم خود ہیں بُرے تو ہے مقدر بھی بُرا
اچھے ہیں تو اچھا ہے مقدر اپنا

ادبار کا گھر، کہ جائے اقبال ہے دہر
جیسا نظر آتا ہے بہر حال ہے دہر
کیوں زشتیٔ دہر پہ ہے برہم اتنا
ناداں ترا آئینۂ اعمال ہے دہر

آئینۂ دل کو گردِ کیں سے رکھ صاف
کر دے اہلِ دنیا کے کینوں کو معاف
دُنیا میں نہ کر کسی سے بے انصافی
دُنیا سے مگر نہ رکھ اُمیدِ انصاف

---

[1] جنوں القلندر نمبر ا صفحہ ۱۳۴ ادبی دنیا ... دہلی نومبر۔

محروم کو اپنی زندگی میں بہت سے جانکاہ صدمے دیکھنے پڑے ہیں جن کی بدولت اظہارِ یاس و الم ان کے کلام کا ممتاز جوہر بن گیا ہے۔ رباعیات[1] میں بھی بعض جگہ اس کی جھلک نظر آتی ہے:-

درکار جگر تھا زخمِ کاری کے لئے تیار نہ تھا جگر فگاری کے لئے
محروم، خوشی اس کو کس طرح ملتی جو عمر ملی تھی سوگواری کے لئے

حیراں ہوں کیا کیا خدایا میں نے بے فائدہ عمر کو گنوایا میں نے
پیری بھی قریبِ خاتمہ آ پہنچی منزل کا نشاں بھی نہ پایا میں نے

کب کوئی جہاں میں چھوٹتا ہے غم سے دل آخرِ کار ٹوٹتا ہے غم سے
صدمات سے کھلتی ہیں بشر کی آنکھیں پھوڑا غفلت کا پھوٹتا ہے غم سے

بلند آہنگی اور لفظی گورکھ دھندے سے آپ ہمیشہ دُور دُور رہے۔ چناں چہ ان کا نشان آپ کی رباعیوں میں بھی نہیں ملے گا۔ دقتِ نظر اور معنویت کی آپ کے ہاں کمی نہیں چند رباعیاں بطور نمونہ یہاں پیش کی جاتی ہیں بندگی کے احساس کے ساتھ جذبۂ خودی کے تیور ملاحظہ ہوں۔

زندہ ہیں تری رضا پہ مرنے والے یہ ڈوب کے ہیں پار اترنے والے
بے خوف وہی ہیں جن کو ہے تیرا ڈر کس سے ڈرتے ہیں تجھ سے ڈرنے والے

آج کل کے تمدن میں انسان جس حالت کو پہنچا ہے اس کا نقشہ کس صفائی اور سچائی سے کھینچا ہے۔

حاصل کتنا کمال انساں نے کیا افلاک کو پائمال انساں نے کیا
یہ عقل مگر ابھی نہیں آئی کہ کیوں انساں کو تباہ حال انساں نے کیا

اور:-

بے رحم و کرم سے آج بیزار انساں انساں سے ہے خود برسرِ پیکار انساں
دُنیا کو بنا دیا ہے دوزخ اس نے کس منہ سے ہے جنّت کا طلبگار انساں

اخلاقِ حسن کے باب میں کیا خوب کہا ہے:-

آئینۂ دل کو گردِ کیں سے رکھ صاف کر دے اہلِ دنیا کے کینوں کو معاف
دُنیا میں کسی سے کر نہ بے انصافی دُنیا سے مگر نہ رکھ اُمیدِ انصاف

دنیا کو اس کی خرابیوں کی وجہ سے برا نہیں کہا بلکہ اور کسی کو ملزم ٹھہرایا ہے

دُنیا تھی یہی صدق و صفا کی دُنیا رحم و کرم و مہر و وفا کی دُنیا
انساں نے بنا دیا بالآخر اس کو جور و ستم و کذب و ریا کی دُنیا

فکر و نظر کی وسعتیں ملاحظہ ہوں:-

کھلتا یہ راز علم و حکمت پہ نہیں جب تک کرمِ خاص بصیرت پہ نہیں
معلوم ہوا ہے بعد فکرِ بسیار پردہ آنکھوں پہ ہے حقیقت پہ نہیں

تقدیر کا رونا کون نہیں روتا مگر آپ کا نقطۂ نظر عاملانہ ہے:-

کیوں سب کو سنائیں حالِ ابتر اپنا جب اس میں قصور ہو سراسر اپنا
ہم کوستے ہیں عبث مقدر کو ندیم اعمال سے بنتا ہے مقدر اپنا

اور

پاداشِ عمل کی ہے یہ منزل اے دوست قدرت کا ہے انتظام کامل اے دوست
اعمالِ بد اپنے بھول جاتے ہیں ہم قدرت ان سے نہیں ہے غافل اے دوست

جبر و اختیار بہت پامال مسئلہ ہے۔ آپ نے اس میں قدرت کا رنگ چمکایا ہے۔

مختار تھا کر گیا جو دل کو بھایا ہو کر مجبور پھل بھی اس کا پایا
یوں جبر سے اختیار مغلوب ہوا یوں عالمِ اختیار میں جبر آیا

مذہب کے بارے میں کیا خوب فرمایا ہے۔

مذہب کی زباں پہ ہے نکوئی کا پیام حسنِ عمل اور راست گوئی کا پیام
مذہب کے نام پر لڑائی کیسی مذہب دیتا ہے صلح جوئی کا پیام

پچھلی جنگ عظیم کے بعد سے جو بدعنوانیاں ہماری تہذیب و تمدن میں داخل ہو گئیں۔ ان کی شکایت اس طرح کرتے ہیں:-

تغیر پسند ہے زمانے کا مزاج تبدیل ہوئے جاتے ہیں سب رسم و رواج
پہلے تھا جنونِ عشق عریانی کوش ہم زنِ ہوشِ حسنِ عریاں ہے آج

وہ یہ مانتے ہیں کہ:-

اس دورِ کمالات میں پیدا ہوں میں نقشِ قدمِ قدم کا جویا ہوں میں
سائنس کی تم ترقیاں گنواؤ انساں کی مصیبتوں کو گنتا ہوں میں

حضرت محروم جیسے بڑے زاہد خشک بھی نہیں ہیں کس تڑپ کے ساتھ کہتے ہیں:-

جب کالی گھٹائیں جھوم کر آتی ہیں ساون کا گیت کوئلیں گاتی ہیں
تب یاد میں گزری ہوئی برساتوں کی آنکھیں مری سیلِ اشک برساتی ہیں

---

[1] دیباچہ طبع اول صفحہ ۱۳ تا ۱۵ از ڈاکٹر محمد اقبال

کوئی یہ نہ سمجھے کہ حضرت محروم "ادب برائے زندگی" کے قائل نہیں۔
ان کی یہ دو رباعیاں ملاحظہ ہوں:-

آٹا مصنوعی اور گھی مصنوعی   مل جاتے ہیں دودھ اور دہی مصنوعی
مصنوعی ہیں زندگی کے سامان   کیوں کر نہ ہو اپنی زندگی مصنوعی

ہرگز نہیں دور بیں نگاہِ انساں   روشن تقدیر پر ہے راہِ انساں
تقدیر نے کس بہم کو کیا ہے گمراہ   گندم تھی باعثِ گناہِ انساں[1]

حضرت محروم نے اپنی رباعیوں میں گوناگوں مضامین کو سمو دیا ہے
مثلاً انسان فلک کا ٹوٹا ہوا تارا ہے:-

ہے نازشِ کائنات یہ پیکرِ خاک   دھوم اس نے مچا رکھی ہے تا پیرِ افلاک
یہ دارِ فنا، یہ اس کی بزم آرائی   غافل انجام سے ہے یا ہے بیباک

اپنی حد میں رہنا عین انسانیت ہے:-

انساں ہے تمیزِ نیک و بد سے انساں   ورنہ بدتر ہے دام و دد سے انساں
عقلِ محدود کا تقاضا ہے یہی   گزرے نہ ہرگز اپنی حد سے انساں

عصرِ حاضر کا انسان، غیر انسانیت اور اخلاق سوز حرکات و اعمال کا مرتکب ہے:-

ہے رحم و کرم سے آج بیزار انساں   انساں سے ہے خود برسرِ پیکار انساں
دنیا کو بنا دیا ہے دوزخ اس نے   کس منہ سے ہے جنت کا طلبگار انساں

انسان کی خدمت کے لئے کائنات کا ذرہ ذرہ رات دن گردش میں ہے۔

خدمت گرِ انساں ہے زمانہ سارا   ہر ذرہ زمیں کا، چرخ کا ہر تارا
راحت کی ہوس میں چھوڑ کر راحت کو   پھرتا ہے کہاں کہاں یہ مارا مارا

مذہب کی بناء پر نسلِ انسانی کی تفریق بڑا جرم ہے:-

دنیا کے حق آگاہوں کا مذہب ایک   تعلیمِ خدارسی کا مکتب ہے ایک
تفریق کے ہیں یہ بہت بہانے، ورنہ   اللہ کہو کہ اوم مطلب ہے ایک

ہندو مسلم اتحاد کی تلقین بھی ملاحظہ کیجئے:-

قائل ہم ذاتِ پاکِ یزداں کے ہیں   عامل فرمودہ ہائے شیطاں کے ہیں
کہنے کو تو ہندو بھی مسلماں بھی ہیں ہم   پابند نہ دھرم کے نہ ایماں کے ہیں

دنیا کی بے ثباتی کا ذکر اس طرح کیا ہے:-

سب جانتے ہیں کہ بے بقا ہے دنیا   سب مانتے ہیں کہ بے وفا ہے دنیا
ترکِ دنیا کے مدعیوں میں بھی   اکثر ہیں کہ جن کا مدعا ہے دنیا

دنیا منزل نہیں ہے:-

ہے بحرِ رواں، نہیں ہے ساحل دنیا   ہے راہِ سفر، نہیں ہے منزل دنیا
رہتا آخر کوئی تو محفوظ اس میں   ہوتی جو مقامِ امن اے دل دنیا

گذری ہوئی باتوں کی یاد غم زا ہے:-

جب کالی گھٹائیں ہجوم کر آتی ہیں   ساون کا گیت کوئلیں گاتی ہیں
تب یاد ہیں گذری ہوئی برساتوں کی   آنکھیں مری سیلِ اشک لاتی ہیں

نقصان سے رنجیدہ نہ ہونا چاہئے۔

کیا چیز تری ہے جس کو تو کھوتا ہے   نقصان نقصان پکار کر روتا ہے
اک ذرہ بھی دہر میں نہیں جب تیرا   بے تاب غمِ زیاں سے کیوں ہوتا ہے

عمل سے تقدیر بنتی ہے:-

کیوں سب کو سنائیں حالِ ابتر اپنا   جب اس میں قصور ہے سراسر اپنا
ہم کوستے ہیں عبث مقدر کو ندیم   اعمال سے بنتا ہے مقدر اپنا

امید پر دنیا قائم ہے:-

تاخیرِ مزید یاس سے اچھی ہے   ہر گفت و شنید یاس سے اچھی ہے
ہر چند فریبِ محض ہے، دھوکا ہے   پھر بھی امید یاس سے اچھی ہے

استاد کا ادب لازم ہے۔ اس دور میں ہادی نوکر سے بھی بدتر ہے۔

وہ لائقِ احترام و برتر استاد   اس دور میں ہو گیا محقر استاد
اے وائے یہ انقلابِ عبرت انگیز   پہلے ہادی تھا اب ہے نوکر استاد

رام کی عظمت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:-

کیا سالکِ با صفا شری رام ہوئے   مشہورِ جہاں خدا شری رام ہوئے
حیرت ہے کہ وہ ذلیل ہو دنیا میں   جس قوم کے پیشوا شری رام ہوئے

عمر بچپن اور جوانی سے گذر کر آخری منزل میں ہے اور حکمِ رحلت کی منتظر ہے۔

طفلی سے، شباب سے گزر آئے ہیں   سیرِ چمنِ حیات کر آئے ہیں
آتا ہے یہ ویرانۂ پیری میں نظر   صیادِ اجل کی شست پر آئے ہیں

محروم اپنی نظر میں کیا ہے؟

شاعر ہوں، شاعری میں استاد نہیں   گو نقدِ سخن ہے پاس، نقاد نہیں

---

[1] دیباچہ طبع ثانی صفحہ ۱۹ تا ۲۲ از علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی۔

سودا کب سے ہے شاعری کا مجھ کو　　مدّت اتنی ہوئی کہ کچھ یاد نہیں

قوّتِ تخیّل شعر کی خالق ہے۔

پاشندہ حقائق کو بزورِ تخئیل　　جذبات میں کرتا ہے سخنور تحلیل
پھر قالبِ موزوں میں ہیں ڈھلتے جذبات　　یوں ہوتی ہے نظمِ دل نشیں کی تشکیل

شاعر کا دل بنی نوعِ انسان کی مصیبتوں پر کڑھتا ہے اور بلا لحاظ مذہب و ملّت مصیبت زدگان پر ہمدردی کے آنسو بہاتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کی تقسیمِ ہند نے ہندوستان کے غریب باشندوں پر جو مصیبت ڈھائی اور جو فساد برپا کیا اس کے تاثرات ملاحظہ کیجئے۔ ۴۷ ۱۹ء کے بعد ہندوستان میں فتنہ و فساد کی تباہی اپنی مثال آپ ہے۔ ذیل کی رُباعیاں ان کے غم کی داستان ہیں:-

بے کل موجوں کو مثلِ سیماب کیا　　دریاؤں کو منبعِ تب و تاب کیا
اپنے ہاتھوں سے اہلِ پنجاب نے خود　　پنجاب کی آبرو کو غرقاب کیا

راولپنڈی کو اے بسانے والو　　جنّت اس شہر کو بنانے والو
ویرانی دیکھ جاؤ اس کی آکر　　راولپنڈی کو چھوڑ جانے والو

اور:-

گلیاں برباد اور کوچے ویران　　دہشت زدہ چوک اور سڑکیں سنسان
خاموش مکانوں کے دریچے دیکھو　　جیسے کسی غم زدہ کی چشمِ حیران

اور:-

آج اپنے وطن سے جا رہا ہے محروم　　ماسن پیشِ نظر نہ منزل معلوم
ہنگامِ وداع ہم نے دیکھا اُس کو　　حسرت زدہ، دل شکستہ، حیران، مغموم

گندم کی کمیابی کے بارے میں اظہارِ خیالات ملاحظہ کیجئے:-

ہرگز نہیں دُوربیں نگاہِ انساں　　روشن تقدیر پہ ہے راہِ انساں
تقدیر نے گندم کو کیا ہے کمیاب　　گندم تھی باعثِ گناہِ انساں

عدمِ تشدّد کے پیغامبر مہاتما گاندھی نے جنگ میں عدمِ شرکت کا اعلان کیا۔ اس کا بیان بھی ملاحظہ فرمائیں۔

گاندھی جی لڑائی کو بُرا کہتے ہیں　　ظاہر ہے، بُرائی کو بُرا کہتے ہیں
حیرت ہے تو ان کی عقل پہ ہے جو لوگ　　دُنیا کی بھلائی کو بُرا کہتے ہیں

محروم کی رُباعیاں ان کی ادھیڑ عمر کا کلام ہیں۔ اس لئے ان میں عشقیہ یا ظریفانہ عنصر موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے نئی تہذیب خصوصاً طبقۂ نسواں کی بے حجابی اور بے باکی پر نفرین کی ہے۔ لہٰذا ہمیں یقین ہے کہ نوجوان طبقہ کے لئے ان کے خیالات قابلِ قبول نہیں ہوں گے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ صرف وقت کی تاثیر ہے۔ اخلاق اور حکمتِ عملی کی جو صداقتیں انھوں نے بیان کی ہیں خواہ کسی کو اچھی لگیں یا نہ لگیں لیکن آخرالامر وہی انسانی زندگی کا دستورالعمل بنتی ہیں[1]۔"

"دُنیا میں معاشرت کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔ ادب کی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ لوگوں کے ذوق اور پسند بھی بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن ادب کے وہ کارنامے جو جان دار ہوں اور شعور کی سچائی کا جوہر رکھتے ہوں اُن کی قدر اور وقعت ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ لوگ شاعر کو بھول جاتے ہیں مگر اُس کے شعر گنگناتے رہتے ہیں۔ اُمید ہے کہ صحیح مذاقِ سخن رکھنے والے محروم کے ادبی کارناموں سے ہمیشہ مستفید ہوتے رہیں گے اور اُردو نظم میں اس اضافہ کو مبارک سمجھا جائے گا[2]۔" اس میں کوئی شک نہیں کہ جناب محروم کی رُباعیاں ان کے دوسرے کلام کی طرح بہت جلد دلوں کو مسخّر کریں گی۔

سر شیخ عبدالقادر مرحوم کی بیش قیمت رائے حضرت محروم کی شاعری کے متعلق قارئین ملاحظہ فرمائیں اور اُن کی سخنوری کی داد دیں۔

"بڑے بڑے سخنوروں نے ان کی شاعری کو سراہا ہے اور ان کے حسنِ بیان کی تعریف کی ہے۔ الفاظ کی برجستگی، بندش کی چُستی، خیالات کی پاکیزگی حضرت محروم کے اشعار کی خصوصیات ہیں۔ مگر ان کی شاعری کا خاص وصف جو مجھے خاص طور پر پسند ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس میں صلح و محبّت کی تلقین ہے۔ ایک اور چیز جو ان کے کلام میں زیادہ پائی جاتی ہے وہ کیفیتِ غم ہے۔ محروم کی درد بھری طبیعت دوسروں کے درد کو بھی معمول سے زیادہ محسوس کرتی ہے۔ انھوں نے اپنے بعض ہم عصروں کے بے وقت انتقال پر آنسو بہائے ہیں۔ جن میں سچّی محبّت اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔

یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ شاعر صرف تصویرِ غم کھینچنے ہی میں اُستاد ہے۔ قوّتِ بخش خوشی کے منظر دکھانے سے بھی قاصر نہیں۔

---

[1] دیباچۂ طبعِ اوّل صفحہ ۱۵ تا ۱۶، از ڈاکٹر اقبال۔
[2] دیباچہ طبعِ ثانی صفحہ ۲۲ تا ۲۳ از برج موہن دتاتریہ کیفی۔

طبع زاد نظموں کے علاوہ محروم کی ہمہ گیر طبیعت نے چمن اُردو کی آرائش کے لئے ہر باغ سے پھول لئے ہیں۔ انگریزی میں شکسپیر کے ڈراموں سے بعض دلچسپ اشعار ترجمے کے لئے انتخاب کئے ہیں اور اُن کو اُردو لباس ایسی خوبی سے پہنایا ہے کہ ان میں سے کئی پہچانے نہیں جاتے کہ اصل میں یہ انگریزی نثر ہیں۔ محروم نے چونکہ عمر بھر محکمہ تعلیم میں بسر کی ہے اس لئے خود ان کے کلام میں بہت سے حصّے جوانوں اور بچوں کے لئے نصیحت آمیز ہیں۔ آج کل نقادانِ فن کا میلان اس رائے کی طرف ہے کہ نصیحت آمیز شاعری اصلی معنوں میں شاعری نہیں ہوتی۔ ان کے نزدیک شاعری جذبات کے طوفانِ بے پایاں کا نام ہے یا تخیل کی نزاکتوں اور معنی آفرینیوں کا۔ البتہ اگر کوئی اُستاد معمولی مضامین میں بھی اپنی کاریگری سے رنگ بھر دے تو وہ پند آمیز کلام کا رتبہ بلند کر دیتا ہے۔ محروم جا بجا اس فن میں کامیاب ہوئے ہیں۔

جناب محروم ان ہندو ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی عمر بھر کی محنت سے یہ ثابت کیا ہے کہ اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک بیش قیمت ملبہ ہے۔ جس سے دونوں کو فائدہ اٹھانے کا حق ہے اور جس کی خدمت دونوں کے ذمّہ ہے۔ خدا کرے آپ دیر تک اُردو کی خدمت کے لئے زندہ سلامت رہیں۔[لہ]

ہم اپنے تبصرہ کو جوشؔ ملیح آبادی کی رائے گرامی سے تقویت پہنچاتے ہیں۔

"مجھے یقین ہے کہ یہ رُباعیاں، بعض مقامات پر اپنی "روحانیت" کے باوجود اُردو کے سنجیدہ ادب میں جو بہت قلیل ہے ایک گراں بہا اضافہ کر دیں گی اور اُن حضرات کو لطف اندوز ہونے اور فائدہ اٹھانے کا بھرپور موقع دیں گی جو بجا طور پر اس کا یقین رکھتے ہیں کہ شاعری، حیاتِ انسانی کو آرائش، آسودگی اور اُستواری کی دولت بخش سکتی ہے۔

ہر چند ان میں اکثر و بیشتر رُباعیاں، شاعرِ محروم کو "صلاح کار" محروم کے روپ میں پیش کر رہی ہیں، اور ہر چند ع "صلاح کار کجا و منِ خراب کجا" کا نعرہ بھی اپنی جگہ درست و اہم ہے، پھر بھی چوں کہ حضرت محروم ایک پختہ شاعر ہیں۔ اس لئے اُن کی شان، اور اُن کی آن بان میں کوئی فرق نہیں آ سکا ہے اور وہ اس جامۂ صلاح میں بھی خوش وضع و خوش قطع نظر آ رہے ہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جسے جامہ زیبی کی انتہا کہا جاتا ہے۔ من اندازِ قدت را می شناسم![لہ]"

غرض حضرت محروم کی رُباعیات زندگی کے کئی پہلوؤں پر محیط نظر آتی ہیں جو رُباعیات پیش کی گئی ہیں وہ ان کی طبعِ زخّار کے چند گوہر پارے ہیں۔ ان جواہر ریزوں کو جو حیات کے اکثر مسائل پر حاوی ہیں۔ چند صفحات میں ظاہر کرنا مشکل ہے۔

فی البدیہہ شعر کہنے میں حضرت محروم کو کمال حاصل ہے۔ ۱۹۳۹ء کا ذکر ہے راولپنڈی میں انجمن اسلامیہ کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا قبلہ محروم صاحب بھی شریکِ بزم تھے۔ حفیظ اپنی نظم پڑھ چکے تو حضرت محروم نے کہا:۔

حفیظِ خوش نوا بزمِ سخن میں   قیامت تک رہے گی یادِ تیری
نشاط آگیں تیرے نغماتِ رنگیں   غم افزائے جہاں فریاد تیری

علّامہ اقبال کا مرثیہ انھوں نے اقبال کی موت کی خبر سنتے ہی فی البدیہہ کہا تھا۔ مرثیے کے دو شعر بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

شاعر کی آنکھ سے جو نہاں ہو گیا تو کیا   احساس میں سما گیا دل میں اُتر گیا
محروم کیوں ترے دلِ حرماں نصیب کو   یہ وہم ہو گیا ہے کہ اقبال مر گیا

دوسرے دن اقبال کے انتقال پر ماتمی جلسے کا پروگرام طے ہوا گارڈن کالج کے ہال میں جلسہ کرنے کا فیصلہ ہوا۔ لیکن عین وقت پر کالج کو کوئی ایسی ضرورت پیش آگئی کہ وہ ہال جلسے کے لئے نہ مل سکا۔ سارا انتظام مکمل تھا۔ اسے ملتوی کرنا اب کسی کے بس میں نہ تھا۔ چناں چہ طے پایا کہ کالج کے قریب میونسپل باغ میں جلسہ منعقد کیا جائے۔ تمام لوگ کالج ہال سے ہو کر باغ میں پہنچ رہے تھے۔ حضرت محروم بھی کالج سے ہو کر باغ میں آئے اور اپنی نظم سے پہلے مقام جلسہ کی تبدیلی پر یہ شعر پڑھا ؎

بلبلِ گلزارِ معنی بود آں رنگیں سخن
ماتمِ اقبال باید کرد در صحنِ چمن

دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ وقارؔ انبالوی نے یونہی باتوں باتوں میں ان سے کہا کہ اس جنگ کا انجام کیا نظر آ رہا ہے۔ قبلہ محروم صاحب ایک آدھ منٹ خاموش رہے پھر یہ رُباعی کہی:۔

ہو لاکھ نئے خودی سے ہٹلر سرمست   ہو جائیں گے اس کے حوصلے آخر پست
جب گھر میں خوراک ختم ہو جائے گی   کیا کھائے گا وہ اگر نہ کھائے گا شکست

لہ دیباچہ گنجِ معانی از سر شیخ انقاد۔

لہ سرورق رُباعیات محروم از جوش ملیح آبادی

شاعری میں حضرت محروم نے کسی سے اصلاح نہیں لی اور نہ ہی عروض کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔ فنِ عروض کے متعلق شروع ہی سے آپ کے دل میں یہ خیال ہو گیا کہ جب تک کوئی قابل اُستاد نہ ملے اسے حاصل کرنا مشکل ہے۔ لہٰذا یہ کہہ کر ہمیشہ کے لئے دامن چھڑا لیا۔

محروم ہم کو عشق نے شاعر بنا دیا بے ساختہ زباں سے نکلتی دل کی بات
کرتے رہیں گے مولوی صاحب تمام عمر مفعول فاعلات مفاعیل فاعلات

اس قطعے کے بارے میں اب ان کی رائے یہ ہے کہ میری سہل انکاری تھی ورنہ عروض سے واقفیت کی اہمیت سے کسے انکار ہے۔[1]

اپنی شاعری کے بارے میں اکثر انھوں نے یہ کہا ہے کہ میں نے شاعری کو نہ تو بطور فن حاصل کیا ہے اور نہ اس پر فنی نظر سے توجہ کی۔ ایک رُباعی میں کہتے ہیں۔

شاعر ہوں، شاعری میں اُستاد نہیں گو نقدِ سخن سے پاس، نقّاد نہیں
سودا کب سے ہے شاعری کا مجھ کو مدّت اتنی ہوئی کہ کچھ یاد نہیں

حضرت محروم کی رُباعیات سوز و گداز، یاس و الم، دقّتِ نظر اور معنویت سے مملو نظر آتی ہیں۔ فلسفۂ اخلاق، مذہب اور روحانیت کے نادر مسائل کے موزوں حل بھی پیش کرتی ہیں۔ ایک حقیقی و فطری شاعر کا کلام اس کی اپنی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے، وہ زبان اور خیال دونوں کے اعتبار سے عظیم شاعر ہیں۔ آپ کے کلام سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک صلاح کار، غم زدہ، خدا ترس اور پاک باطن انسان ہیں۔

---

1. رسالہ نقوش لاہور۔ مقالہ از جگن ناتھ آزاد
2. متعدد رباعیاں اختلافِ عنوان سے مکرر درج ہوئی ہیں۔

نئے پلان

فرید تنویر

دلوں میں نورِ محبّت، نظر میں پیار لئے
عمل میں حسن لئے، عزم میں نکھار لئے
نئے نظام کا آئینِ زرنگار لئے

نئے افق پہ نئے چاند لا رہے ہیں ہم
"نئی حیات کے نقشے بنا رہے ہیں ہم"

ہمارے علم نے دُنیا کو آگہی بخشی
ہماری فکر کی مشعل نے روشنی بخشی
ہمارے امن کے نعروں نے شانتی بخشی

جہاں کو نت نئے نغمے سنا رہے ہیں ہم
"نئی حیات کے نقشے بنا رہے ہیں ہم"

ہمارے دم سے بھلائی[1] میں زندگانی ہے
ہمارے عزم کی ہیرا[2] نئی کہانی ہے
ہمارے خون سے ننگل[3] میں اک روانی ہے

نئے پلان سے دنیا سجا رہے ہیں ہم
"نئی حیات کے نقشے بنا رہے ہیں ہم"

ریلوے اور ایجنسیاں ہمارے فن کی دلیل
عروسِ تاج کا چہرہ ہمارا نقشِ جمیل
نئے جہان کی کرنا ہے پھر ہمیں تشکیل

جبینِ ارض پہ قشقہ لگا رہے ہیں ہم
"نئی حیات کے نقشے بنا رہے ہیں ہم"

روش روش پہ نئے پھول ہم کھلائیں گے
قدم قدم پہ نئی جنتیں بنائیں گے
نئے اُجالوں سے دنیا کو جگمگائیں گے

ابھی تو غم کے اندھیرے مٹا رہے ہیں ہم
"نئی حیات کے نقشے بنا رہے ہیں ہم"

رہِ حیات کو ہموار کر کے دم لیں گے
ہر ایک دشت کو گلزار کر کے دم لیں گے
فضائے تیرہ کو ضو بار کر کے دم لیں گے

جہاں کو امن کی راہوں پہ لا رہے ہیں ہم
"نئی حیات کے نقشے بنا رہے ہیں ہم"

1. بھلائی اسٹیل پروجیکٹ (مدھیہ پردیش) 2. ہیرا کڈ (اڑیسہ) 3. بھاکڑا ننگل (پنجاب)

نسیم (دیتہ)

دوشیزۂ موسیقی کے نام

(ایک محفلِ سرود میں شعراء کے ساتھ)

جھوم اٹھے ابر، میگھ ذرا ایک بار گا!
ساغر اٹھا "ستار" بجا ہاں ملہار گا

کیوں ماں کونس چھیڑ کے خاموش ہو گیا؟
یہ محفلِ سرود ہے، گا میرے یار گا!

ققنس کی جان جل گئی دیپک کی تان سے
یہ راگ آتشیں ہے، نہ بے اختیار گا

یار ایسا راگ چھیڑ فرشتے تڑپ اٹھیں
سورٹھ کی دھن الاپ ذرا دیس کار گا

اے دل! تو اپنے وقت کا اک تان سین ہے
ہنڈول کے سُروں میں دمِ انتظار گا

درباریاں نہ چھیڑ یہ درباریِ نازہے
ٹوڈی میاں کی صبح کے پروردگار گا

جھوم اٹھیں تیری نے پہ کدارا کے زیر و بم
ایسا کچھ آج ڈوب کے اے موسیقار گا

آسا کا رنگ گھول سماعت کے جام میں
کہتی ہے تجھ سے "چیت" کی کومل بہار گا

سندھڑا، تلنگ یا کوئی بھاگیسری کی دھن
ان میں سے ایک چھانٹ کے دل کی پکار گا

تانی! ملہار چھیڑ دے "رم جھم" کے ساز پر
ساون کی تجھ سے کہتی ہے الھڑ پھوار گا

"بھولوں کے بیج بادیے!" جوگی کا روپ دھار
جنگلہ کا راگ بیٹھ کے دریا کے پار گا

بھیرویں میں چھیڑ کوئی غزل بھیرویں کے بعد
پھر سے تڑپ اٹھا ہے دلِ بے قرار گا!

رقاصہ "محوِ رقص ہے طبلے کی تھاپ پر
جھنکار سن کے تو بھی بجا "تین تار" گا

وہ بانسری سے شام کی تانیں برس پڑیں
تو بھی کسان کاندھے سے ہل کو اتار گا

جوگی! وہ جوگ الاپ کہ پتھر پگھل پڑیں
یہ شہرِ حسن ہے یہاں دل کو نہ ہار گا

میں نے دہاگ میں جو الاپی غزل نسیم
فرمائشیں ہوئیں کہ اسے بار بار گا

ست پرکاش سنگر

اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا

یہ نہیں کہ شام لال نے ساپنی آنے کے لئے مجھے محض ایک بار مدعو کیا ہو۔ جب کبھی ان سے ملنے کا اتفاق ہوتا وہ میرے ساپنی نہ آنے کا گلہ کرتے۔ اُن کی منطق یہ تھی کہ چین اور جاپان ہوں تو دور افتادہ سیام، تبت اور انام سے تو لوگ وہاں آ سکتے ہیں، اور میں اتنے قریب سے نہیں جا سکتا۔ بات معقول تھی

ساون کے میلے کے موقع پر اپنے پڑوسی من سکھ لال کو ہمراہ لے کر ایک دن صبح ناشتے سے پیشتر وہاں جا دھمکا۔ حسبِ معمول گھر پر ناشتہ نہ کرنے کے سبب بھوک تو لگ ہی گئی تھی لیکن میں تو مہمان بن کر جا رہا تھا۔ جیسی امید تھی مجھے دیکھ کر شام لال کی باچھیں کھل گئیں۔ فرطِ مسرت سے بغلگیر ہو گئے حالانکہ ایک ماہ قبل ہی ہماری ملاقات ہوئی تھی لیکن یہ مصرع پڑھنے لگے

اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا

اور جیسے یہ کافی نہ ہو "وہ آئیں گھر پہ ہمارے" والا شعر بھی غلط سلط طریق سے گانے لگے۔ پھر میرے ساتھی کی تعریف پوچھی:

"آپ ہیں میرے پڑوسی من سکھ لال۔" میں نے کہا۔

"آپ کے پڑوسی دوست کے دوست ہیں اس لئے میرے دوست ہیں۔ اور ایک دوست سے مل کر کتنی خوشی ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے نا سکھ من لال جی؟"

"من سکھ لال۔" میں نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔

"ایک ہی بات ہے،" شام لال نے جواب دیا "لیکن آپ لوگ کھڑے کیوں ہیں؟ تشریف رکھئے نا!"

ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے

میں نے کمرے میں نظر دوڑائی۔ وہ کھڑکی سے باہر جھانکنے ہی والی تھی کہ شام لال نے اُسے دبوچا اور بولے۔

"کمرہ آپ کو پسند آیا؟"

"بہت۔ یہاں سے ساپنی کا پورا دید ہو سکتا ہے۔"

"آپ کو معلوم ہے مجھے یہ کمرہ کیسے ملا؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں" میں نے جواب دیا۔

"یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے"۔ وہ بولے۔ "لیکن سکھ من لال جی! آپ کے ہاتھ میں یہ کون سی کتاب ہے؟"

"میرا نیا ناول ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ کا نیا ناول؟" وہ حیرت سے بولے۔ "کب اور کہاں چھپا؟ دیکھوں، خوب! چھپائی تو عمدہ ہے۔ لیکن آپ نے اس کے متعلق مجھ سے کچھ نہیں کہا۔"

"ملاقات ہی کب ہوئی؟" میں نے کھسیانا سا ہو کر کہا۔

"ارے بھائی! ڈاک سے بھجوا دیا ہوتا۔ آخر سوا روپے پر خرچ ہی کتنا آتا ہے!"

"خرچ کی تو کوئی بات نہیں" میں نے کہا۔ "دراصل ......"

"خیر چھوڑیئے۔" شام لال جی بولے۔ "کیا یہ نیا پین خریدا ہے؟"

"نیا ہی سمجھئے۔" میں نے جواب دیا۔ "روشن لال نے کلکتہ سے میرے جنم دن پر بھیجا ہے۔"

"خوب، دیکھوں ذرا۔ سچ عمدہ اور قیمتی قلم ہے۔ لیجئے۔ اس کتاب پر اسی قلم سے میرا نام لکھ دیجئے۔"

"آپ کا نام؟ مطلب؟"

"میرا مطلب ہے اوپر میرا اور نیچے اپنا نام لکھ کر کتاب مجھے بھینٹ کر دیجئے۔"

"اوہ! اب سمجھا۔ دراصل میں بھیجنے ہی والا تھا۔" میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔

"وہ تو میں جانتا ہوں۔ اس سے پہلے آپ کی کتابوں کا جو سیٹ میں اٹھا لایا تھا۔ مطلب آپ سے بھینٹ کرا کے لایا تھا، اُسے میری بیوی کے ماما کے سالے کا سسرے گیا۔ میں نے بہت کہا کہ یہ سیٹ مجھے مصنف نے خود اپنے ہاتھوں سے بھینٹ کیا ہے۔ لیکن وہ کب ماننے والے تھے۔ بولے۔ "آپ کو تو دوسرا سیٹ بھینٹ کر دیں گے مجھے تو نہیں کریں گے" سنا آپ نے! میری بیوی بھی ان کی ہامی بھرنے لگیں۔ اب بتلایئے کوئی کیا کرے؟"

مجھے خاموش دیکھ کر بولے

"کیا سوچ رہے ہیں؟"

"یہی کہ واقعی کوئی کیا کرے؟" میں نے جواب دیا۔

"آپ ہرگز نہ سوچیے" وہ مجھے تشفی دیتے ہوئے بولے "آپ تو جلدی سے دوسرا سیٹ بھیج دیجئے اور ہاں یہ تو بتایئے کہ ان کتابوں کے دوسرے ایڈیشن بھی چھپ گئے ہیں؟"

"چھپ تو گئے ہیں" میں نے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے رونی صورت بنا کر کہا۔

"تو بس ٹھیک ہے۔ میرے لئے نیا سیٹ ہی بھیجنا" انھوں نے آخری فیصلہ کرتے ہوئے کہا "اور ہاں میرے ساتھ پہلے والی چالاکی مت کرنا۔"

"پہلے والی چالاکی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ مجھے سادا جلد والا سیٹ بھیج دیا اور خود اپنی الماری میں کپڑے کی جلد والا سیٹ رکھا ہے۔"

"دراصل وہ ایک سیٹ میرے پبلشر نے دیا ہے۔ اس کے علاوہ باقی پانچ سیٹ سادہ جلد کے تھے جو بھینٹ چڑھ چکے۔"

"خیر۔ یہ تو چلتا ہی ہے اور ہاں میری بیوی کہہ رہی تھی تم اچھا لکھ لیتے ہو۔ وہ تمھارے قلم کی داد دے رہی تھی۔ دراصل یہ قلم ہی داد دینے کے قابل۔ دکھا دیجئے ذرا۔ یہی نہایت خوبصورت ہے۔ کتابیں مجھے بھینٹ کی ہیں، قلم میری بیوی کی بھینٹ ہوگا۔"

"اور میں خود کس کی بھینٹ ہوں گا؟"

"ہا ہا ہا۔ یار تم بڑے پھکڑ ہو۔"

وہ اپنی جیب میں میرا نیا پین رکھتے ہوئے بولے اور بات کو ٹالنے کے ارادے سے بلند آواز سے پکارنے لگے۔

"پنو! او بٹیا! ادھر آ۔ تیرے بھوپال والے چچا آئے ہیں۔"

اور پنچ پنچ بٹیا فوراً کمرے کے اندر آ گئی جیسے دروازے کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔

"انھیں نمستے کرو بٹیا۔"

"لیکن میرے لئے گڑیا تو لائے نہیں۔"

"گڑیا؟ نہیں بٹیا، بھوپال میں گڑیا کہاں ملتی ہے۔ وہاں تو لٹکا ملتا ہے۔"

"ملتی کیوں نہیں؟ ماں نے کہا ہے۔ اگر تیرے چچا وہاں سے لانا بھول گئے ہیں تو یہیں میلے سے لے دیں گے۔"

"اچھا۔ جا۔ جا۔ ضد نہیں کرتے۔"

"کیسے جاؤں؟ اگر گڑیا نہ ملی تو ماں ہڈی پسلی توڑ دے گی۔ ہے نا ماں؟" وہ چلّا کر بولی۔

"ماں کہتی ہے۔ چار روپے میں تو آ جاتی ہے۔ یہیں میلے کی دکان سے۔ چچا چار روپے دے دیں گے، میں دکان سے لے لوں گی۔"

"ضرور ضرور" میں نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا

"ارے یار! رہنے دو۔" شام لال مجھے سمجھاتے ہوئے بولے۔ "یہ بڑی تیز لڑکی ہے لیکن اب مانے گی تھوڑے۔ اچھا سے لے (میرے ہاتھ میں پانچ کا نوٹ دیکھ کر بولے) دیکھو۔ چار کی گڑیا خرید لے اور ایک کی ٹافی۔ اور خبردار اگر پھر یہاں آ کر ہمارے کان کھانے کی کوشش کی۔"

"کان نہیں، ٹافی کھاؤں گی۔" اور ہونہار باپ کی ہونہار بیٹی میرے ہاتھ سے پانچ روپے کا نوٹ لے کر رفوچکر ہو گئی۔

"بڑی نٹ کھٹ ہے۔" اپنی لڑکی کی تعریف کرتے ہوئے شام لال فرمانے لگے۔

"نہیں صاحب! بہت بھولی ہے" سوسکھ لال بولے "بالکل باپ پر ہے۔"

"ہی ہی ہی۔" شام لال نے جیسے ہامی بھری۔ "اچھا یہ تبلایئے کہ آپ لوگ چائے پئیں گے یا شربت؟ آپ لوگ بھوپال سے کس وقت روانہ ہوئے تھے؟"

"یہی کوئی نو بجے۔" میں نے آخری جملے کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"گھر سے چلنے کا یہی مناسب وقت ہے۔" شام لال سر ہلاتے ہوئے بولے "ہمارے پتا جی (ایشور انھیں سورگ میں سکھی رکھے) کہا کرتے تھے، بیٹا! کھائے

پیے بغیر گھر سے مت نکلو۔ گھر سے کھا پی کر جاؤ گے تو باہر جا کر بھی کوئی پوچھ لیتا ہے۔ اور اگر گھر پر نہ کھاؤ تو . . . . . خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔ آپ تو یہ بتلایئے کہ آپ لوگوں کے لئے چائے بنے یا شربت؟ ہاں آپ کی کون سی کتاب آرہی ہے؟" مجھے مخاطب کرکے بولے۔

" افسانوں کا مجموعہ"۔ میں نے آخری جملے کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

" خوب!" وہ خوش ہو کر بولے۔" آپ بہت اچھا کرتے ہیں جو پہلے افسانے لکھ کر رسالوں میں چھپواتے ہیں، بعد میں انھیں کتابی شکل میں چھپوا لیتے ہیں۔ اگر آپ لوگ چائے یا شربت نہیں پئیں گے، تو کھانا بنواؤں؟ لیکن آپ افسانے لکھ کیسے لیتے ہیں؟"

" بس ایسے ہی"۔ میں نے دوسرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ کھانے کے متعلق جواب دینے کی باری ہی نہ آئی۔

" لیکن آپ کو پلاٹ کیسے مل جاتے ہیں؟"

" ایسے ہی۔" میں نے روکھی سی ہنسی ہنس کر کہا۔

" جیسے یہ بھی تو ایک پلاٹ ہے۔" من سکھ لال نے لقمہ دیا۔

" یہ بھی پلاٹ ہے، سکھ من لال جی؟ یہ تو خوب رہی!" وہ حیرت سے بولے۔

" پتا جی!" بچی نے کمرے کے اندر آ کر کہا۔" ماں کہتی ہے کہ اگر چاچا لوگ چائے یا شربت نہیں پینا چاہتے تو انھیں ٹھنڈا پانی تو پلا دیجئے۔"

" ہاں ہاں بیٹی! میں تو بھول ہی گیا۔ جا۔ بدھ دیر سنگھ سے کہہ مٹکے سے دو عمدہ ٹھنڈے پانی کے گلاس لائے۔"

" نہیں نہیں۔ تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے شیروانی کے اوپر کے بٹن بند کرتے ہوئے کہا۔

میں نے دیکھا من سکھ لال کے جسم میں کپکپی پیدا ہو رہی تھی۔ سردی کے سبب یا ٹھنڈے پانی کا نام سن کر۔

شاید شام لال کی پتنی، پتی ورتا تھیں، یا بدھ دیر سنگھ وفادار ملازم تھا۔ ٹھنڈے پانی کے دو گلاس ضرور آئے۔ ایک میرے اور ایک غریب من سکھ کے لئے۔ انھوں نے غصے بھری نظروں سے میری طرف دیکھا، جیسے یہ سب میرا قصور تھا اور اسی حالت میں دسمبر کی سردی میں پیاسے کی طرح ٹھنڈے پانی کا گلاس، منہ سے لگا کر غٹا غٹ پی گئے! میں نے دائیں دیکھا، بائیں دیکھا، بجرنگ بلی کا نام لیا اور ایک ہاتھ سے ناک کو بند کر دوائی کی طرح پانی کو پی گیا اور پھر میزبان سے بولا:۔

" اب کیا ارشاد ہے؟"

" آپ کو سانچی کی سیر کراؤں گا۔ آیئے گھر سے چلیں۔"

میلے کے سبب بازار میں رونق تھی۔ اسٹالوں پر بھیڑ تھی۔ چین، جاپان، تبت، سیام، ہند و چین اور آسام سے یاتری بھگوان بدھ کی پوتر بھومی کے درشن کرنے آئے ہوئے تھے۔ لوگ خوش خوش نظر آرہے تھے۔ لیکن نہ جانے من سکھ لال کیوں ناراض دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی روتی صورت دیکھ کر میرا دل بھی بیٹھے جا رہا تھا۔ دل کی اس کیفیت کا اثر ٹانگوں پر ہونے لگا۔ وہ جیسے چلنے کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرنے لگیں۔ پیٹ کے اندر بیٹھا جیسے کوئی پکار رہا تھا۔ بھوک — روٹی — بھوک — اور اس کی بھوک مٹانے کے بدلے شری شام لال جی اپنی زبان سے امرت ورشا کر رہے تھے۔ ایک چائے کی دکان کے پاس پہنچ کر من سکھ لال سے نہ رہا گیا اور بولا:

" ایک کپ چائے پینے میں کیا حرج ہے؟"

میں نے میزبان کی طرف سہمی سہمی نظروں سے دیکھا۔ انھوں نے فوراً میری ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا:۔

" کوئی حرج نہیں، چائے پینے میں کیا ہے؟"

میں نے اطمینان کا سانس کھینچا۔ ایٹی کیٹ کے ناطے میں نے چائے کا ایک کپ میزبان کی طرف بڑھایا اور انھوں نے ایٹی کیٹ کے ناتے اسے قبول فرمایا۔ مٹھائی اور نمکین کی طشتریاں بھی صاف کیں۔ جب میں دکاندار کو پیسے دینے لگا تو اس بد صورت لیکن فرشتہ سیرت انسان نے ہمارے ساتھ شام لال کو دیکھ کر پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ شام لال نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا:۔

" جگی رام جی! یہ تو اپنے پروفیسر صاحب ہیں۔ ان سے پیسے لینے میں کوئی حرج نہیں۔ میرے ہوئے یا ان کے، ایک ہی بات ہے۔ آپ بے شک لے لیجئے۔"

" لیکن . . . . "

" کوئی بات نہیں۔ ایسا نہیں کرتے۔ آپ تو دے ہی دیجئے پروفیسر صاحب!" انھوں نے مجھے نوٹ جیب میں رکھتے دیکھ، گھبرا کر کہا۔

حساب چکانے کے بعد میں نے اور من سکھ لال نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کیں۔ تب میں نے میزبان سے مخاطب ہو کر کہا:۔

اچھا شام لال جی! اب ہم واپس بھوپال جا رہے ہیں۔ مجھے یاد آ گیا ایک صاحب سے ضروری کام سے ملنا ہے۔ آپ چلئے۔ خواہ مخواہ آپ کو اتنی زحمت دی۔ اچھا نمستے۔"

" بس اتنی جلدی؟ اچھا نمستے۔ لیکن آج مزہ نہیں آیا۔ آئندہ فرصت سے آیئے گا۔ آج تو آپ نے اور آپ کے ساتھی سکھ من لال نے کھانا بھی نہیں کھایا۔"

" بھوک بھی تو نہیں لگی۔" میں نے کہا۔

"وہ تو سمجھتا ہوں میں۔ اس عمر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اسی لئے میں نے زور نہیں دیا۔ لیکن اگلی بار آپ دونوں کو میرے ساتھ کھانا ہوگا۔ ہاں کتابیں بھیجنا مت بھولیے گا۔"

رخصت ہوکر ہم جلدی جلدی اسٹیشن کی طرف چل دیئے۔ وہاں پہنچ کر مسٹر سکھ لال نے اپنے من کا غبار خاکسار ہی پر نکالا۔ اگلی پچھلی سب باتیں کہہ ڈالیں۔ میں نے محض ایک کام کیا۔ نگاہ نیچی کئے سب خاموشی سے سنتا رہا۔ جب وہ مجھے کوس کر تھک گیا تو بولا۔

"اب بھوکا مار ڈالو گے یا کچھ کھلاؤ گے بھی؟"

"کیا گالیوں سے پیٹ نہیں بھرا؟" میں نے طنزاً کہا۔

"بلکہ بھوک اور بھی تیز ہو گئی۔"

"تو آؤ میرے ساتھ"

ہم ڈاک بنگلے کی جانب نکل گئے۔ وہاں جاکر بیرے کو جلد چار آدمیوں کا کھانا بنانے کا آرڈر دیا۔ اس نے پوچھا۔

"صاحب! چار کا کیوں؟ آپ تو دو ہیں۔"

"بھوک چار کی لگی ہے۔"

"جو حکم۔"

ایک گھنٹہ جس مشکل سے کھانے کے انتظار میں کاٹا، اس کے متعلق ایک پورا مضمون قلمبند کیا جا سکتا ہے۔ اور کیا جائے گا۔

جب بیرے نے کھانا میز پر لگا کر ہمیں خوش خبری سنائی۔ ہم اس پر ٹوٹ ہی تو پڑے، مطلب بیرے پر نہیں، کھانے پر۔ لیکن عجیب حالت تھی، جتنا کھا رہے تھے بھوک اور بھی تیز ہو رہی تھی۔ لیکن تبھی، صاف وشفاف مطلع ابر آلود ہو گیا۔ مسٹر شام لال، ایک بڑھیا کے ساتھ جس کی آنکھوں پر عینک لگی تھی۔ ڈائننگ روم میں داخل ہوئے۔ ہم دونوں پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ میں نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے خاتون کی طرف دیکھ کر دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا:۔

"ماتاجی۔ پرنام۔"

"اوہ! اوہ! اوہ! ہا! ہا! ہا!" شام لال نے قہقہہ لگا کر کمرہ سر پر اٹھا لیا۔ "ہا۔ ہا۔ ہا۔ ماتاجی! خوب رہی۔ ارے بھئی! منّی کی ماتاجی تمھاری ماتاجی کیسے بن گئیں؟"

اب ظاہر ہے، متحیر اور شرمندہ ہونے کی میری باری تھی لیکن شام لال فوراً میری مدد پر اتر تے ہوئے، اور مجھے دلدل سے نکالتے ہوئے بولے۔

"میں سمجھ گیا تھا کہ آپ کو گاڑی نہیں ملی ہوگی۔ کیوں کہ نکل چکی تھی۔ بس نہیں ملی ہوگی کیوں کہ آئی نہیں۔ اسٹیشن پر آپ کا دل نہیں لگا ہوگا۔ بازار میں آپ نظر نہیں آئے۔ ستوپوں کے اندر آپ کیا بیٹھیں گے؟ اس جگہ کے سوائے جا ہی کہاں سکتے تھے؟ اس لئے ہم یہیں آ گئے۔"

"جب آ ہی گئے تو تھوڑا بہت کھا لیجئے۔"

میں نے رسماً کہا۔ اس بات کا مجھے احساس تھا کہ وہ شرمندہ ضرور ہوں گے۔ لیکن شام لال فوراً بولے۔

"خیال تو برا نہیں، کیوں ڈیئر!" بیوی سے مخاطب ہوکر کہنے لگے۔ "اب گھر پر کیا کھانا بناؤ گی؟ یہیں کھا لو۔ منّی کو بلوا بھیجتے ہیں۔"

"لیکن۔"

"لیکن ویکن کیا؟ تم بہت بھولی ہو۔ اس میں شرمانے کی کیا گنجائش ہے؟ آخر یہ اپنے دوست ہیں۔ اگر ان کی کتابیں تمھارے ماما کے سامنے کاشمر نے گیا ہوتا، تو تم ضرور پڑھتیں۔ لیکن اب یہ ہمیں نیا اور کپڑے کی جلد والا سیٹ بھیجیں گے۔ بیٹھو، بیٹھو، ان کے ساتھ نہیں تو اور کس کے ساتھ کھائیں گے؟"

اور وہ دونوں ہمارے ساتھ کرسیوں پر ڈٹ گئے۔ پھر آواز کو بدل کر، اس میں رعب بھر کر بولے۔

"بیرا! لڑکے کو بھیجو کہ ہماری بٹیا کو بلا لائے۔ اور ہاں، پروفیسر صاحب سے پیسے لے کر، جنگی رام کی دکان سے، ایک سیر ربڑی اور تین پاؤ گلاب جامن بھی لیتا آئے۔ لیکن جلدی گاڑی آنے والی ہے۔ ٹھیک ہے نا سکھ من لال جی؟"

میں اور مسٹر سکھ لال ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

ع۔م

نئی کتابیں اور رسالے

دیوانِ غالب

ناشر ہندستانی بک ٹرسٹ ۳۔ اے نانز بلڈنگ بمبئی ۲۔ مرتّبہ سردار جعفری۔ تقطیع ۲۲×۳۰/۴ صفحات ۷۶۶، کپڑے کی خوبصورت اور مضبوط جلد۔ طباعت: اردو اور ہندی ٹائپ میں نہایت خوبصورت، کاغذ عمدہ۔ قیمت ۲۵ روپے فی جلد۔ ہندی شبد اولی (فرہنگ الفاظ) الگ شائع ہوئی ہے۔ اس کی قیمت ۵ روپے فی جلد، یہ بھی مجلد ہے۔ غالب کی تصویر اور چار رنگین و مصوّر صفحوں کی دلآویز طباعت زینتِ کتاب ہے۔

دیوانِ غالب کے خوبصورت اور مصوّر پہلے ایڈیشن 'مرقّع چغتائی' کی ایک جلد کی قیمت ۱۰۰ روپے تھی۔ جب یہ شائع ہوا تھا تو اہلِ ادب نے غالب کی پیش گوئی کو درست مانا تھا

کوکبم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است
شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن

اس کے بعد دیوانِ غالب کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے جو اپنی نظیر آپ تھے لیکن تقسیم کے بعد ہندستان میں غالب شناسی اور بھی ترقی پذیر ہوئی۔ دیوان کی شرحیں اور دیوان کے تصحیح کردہ مستند نسخے شائع ہوئے۔ زیرِ تبصرہ کتاب اپنی جگہ لاجواب ہے۔ دیوانِ غالب کا یہ دبدبہ زیب نسخہ اردو اور ہندی دونوں لکھاوٹوں میں ہے۔ ایک صفحے پر ہندی میں اور ایک صفحے پر اردو ٹائپ میں مقدمہ اور کلام چھپا ہے یہ التزامِ اوّل سے لے کر آخر تک ہے۔ مقدمہ سردار جعفری نے بڑی محنت سے لکھا ہے۔

غالب کے متعلق کیا کچھ نہیں کہا گیا۔ باریک بینوں نے دنیا کی ہر خوبی غالب کے یہاں دیکھی ہے۔ سردار جعفری بھی انھیں ستم ظریفوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ لیکن ان کے یہاں حزم و احتیاط ہے۔ غالب ایسا جوہرِ قابل تھا کہ اس کی مدح میں کوئی مبالغہ مبالغہ نظر نہیں آتا۔ غالب انسان تھے اس لئے ان کے کردار میں کمزوریاں لازم ہیں۔ مجموعی حیثیت سے وہ ایک شگفتہ کردار والے ذہین انسان تھے اور ادبی حیثیت سے اُن کا مقام بہت بلند تھا۔

مقدمے میں سردار جعفری نے غزل اور غالب دونوں کا تجزیہ کیا ہے۔ غالب کے تصورِ عشق، تشنگیٔ منزل، قلندری و آزادگی، تیکھے طنز اور رجائیت کے باب میں مقدمہ نگار نے بڑے لطیف اشارے کئے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ مدّلل مداحی بن کر رہ گیا ہے۔ غالب جو زیادہ تر ایک غزل گو شاعر ہے، قنوطیت اور بیزاری کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مُردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

صرف اسی پر ختم نہیں۔ اس کے یہاں تلقینِ غم بھی موجود ہے

مجھ سے چیرِ سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں

حسبِ مزاج مقدمہ نگار نے غالب کے اشعار سے غالب کو سائنس اور اس کے عہد کی صنعتی ترقی کا مدح خواں بھی ثابت کیا ہے۔ ان کی ایک ایسی تحریر بھی پیش کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تحریر ان کے ذہن کا ایک وقتی عکس ہو۔ اُن کی تخلیقات میں اس کی ایک عام جھلک تو نہیں ملتی۔ ہر صاحبِ اقبال و جاہ کی قصیدہ خوانی بالخصوص انگریز افسروں کی، غالب کا شعار رہا۔ لیکن اس کا یہ

شعر اس لحاظ سے کتنا برمحل ہے ؎

رنگوں میں دم توڑتا ہے شاہِ ظفر
غالب کہے اپنے طورے مانگے سے غرض

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود سردار جعفری نے کمال محنت و عقیدت سے یہ نسخہ مرتب کیا ہے۔ مقدمہ محمولی حیثیت سے مقدمہ نگار کی سخن شناسی اور دقیقہ رسی کا ایک روشن ثبوت ہے۔

اردو کو ناگری لکھاوٹ میں منتقل کرنے کے سلسلے میں مرتب نے کچھ قابلِ قدر اور قابلِ غور اصول وضع کئے ہیں۔

"ذ" نے "عین" اور "ہے" (ذ - ع - ہ) کے لئے نئی علامتوں سے کام لیا ہے۔ ذ کے لئے ज کے نیچے بندی لگائی گئی ہے۔ ہمارے خیال میں ज کے نیچے دو بندیاں لگا دی جاتیں تو بہتر ہوتا۔ ज़ ۔ ذ کی آواز "ز" کی آواز سے قریب تر ہے اور "ش" سے دور تر۔

اردو اور ہندی جاننے والوں کے لئے یہ کتاب ایک بڑی نعمت ہے۔ ہر صفحہ دو رنگوں میں چھپا ہے۔ ٹائپ بہت خوبصورت ہے۔ یہ کتاب دیوانِ غالب کا مستند نسخہ بھی ہے۔ اس خوبصورت استنا اور محنت سے مرتب کی ہوئی کتاب کو ہر صاحبِ استطاعت کے پاس ہونا چاہیئے۔

سردار جعفری اور ہندستانی بک ٹرسٹ اس حسین و جمیل تحفۂ ادب کے لئے قابلِ مبارک باد ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ دنیائے ادب ان کی اس کوشش کی قدر کرے گی۔

تارِ پیراہن

شان الحق حقی کے کلام کا مجموعہ۔ ناشر اردو اکیڈمی سندھ کراچی۔ تقطیع $\frac{۲۲ \times ۳۶}{۱۶}$، صفحات ۲۸۴۔ کاغذ اوسط، کتابت عمدہ، جلد اور جلد پوش عمدہ۔

حقی غزل اور نظم دونوں پر دسترس رکھتے ہیں۔ شعر کا مذاق پختہ ہے روایت اور جدت کی دلآویز آمیزش نے ان کے کلام کو قبولِ عام عطا کیا ہے زیرِ تبصرہ مجموعے میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ غزل کا مزاج رکھنے کے باوجود نظموں میں تنوع اور ہمہ گیری ہے۔ دس گیارہ منظوم تراجم بھی شامل ہیں جن میں سے تین ٹیگور سے متعلق ہیں۔ شاید یہ ذاتی پسند ہے یا محض اتفاق۔ حقی کے کلام کے باب میں خود ان کی زبان سے سُنئے۔

ہم کو خدمت یہ ملی ہے کہ سرِ محفلِ ناز حُسن کی بات کریں عشق کا افسانہ کہیں

ان کے کچھ دلآویز اشعار بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

لوگ تم سے بھی ستم پیشہ کہاں ہوتے ہیں جو کہیں کا نہ رکھیں اور پھر اپنا نہ کہیں

ہم نے سینے میں رکھا غم کو دلِ جاں کی طرح پاسِ دشمن بھی کیا خاطرِ خوباں کی طرح

مری نگاہ نے مانگی تھی جیرتوں سے پناہ تو بڑھ کے زیست سے نکلے عجائباتِ عدم

نظموں میں بھی تغزل موجود ہے۔ "محفلِ شب"

نہ آئے تم گئی کلیاں بکس بھی ہوائیں لے اڑیں پھولوں کا رس بھی

بہاریں کر گئیں آزادِ دامن یہیں تک تھی جنوں کی دسترس بھی

حقی زبان و بیان کے نکات جاننے والے ہیں۔ دلی کی چھاپ ہر جگہ موجود ہے۔ اس مجموعے میں سب کچھ ہے لیکن اس کے علاوہ بھی حقی نے زندگی سے نہایت قریب تر ہو کر بہت سی شگفتہ کاریاں کی ہیں۔ ان کا نمونہ اس کتاب میں نہیں۔ شاید اس لئے کہ "تارِ پیراہن" ابھی باقی ہیں۔

نقوش (طنز و مزاح نمبر)

ناشر ادارۂ فروغِ اردو لاہور، مرتب محمد طفیل، ضخامت ۸۰۰ صفحے قیمت دس روپے۔ شعراء و ادبا کے متعدد رنگین اسکیچ بھی کتاب میں شامل ہیں مندرجات کی تفصیل یہ ہے۔ آٹھ مقالے طنز و مزاح سے متعلق، گیارہ نمونے دنیا کی بڑی زبانوں کے مزاحیہ ادب کے، دس نمونے اردو کے ابتدائی طنزیہ و مزاحیہ ادب کے، اودھ پنچ کا دور ۲۴ نمونے، فتنہ اور عطرِ فتنہ کا دور ۸ نمونے، شیرازہ کا دور ۱۱ نمونے، طنزیہ و مزاحیہ ادب کا دور ۵۱ نمونے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا نیا دور ۵۱ نمونے، اردو کے مزاحیہ شاعر ۴۲ مضمون مزاحیہ کردار ۵ مضمون مزاحیہ کالم ۹ مضمون، اس کے بعد شعراء اور ادباء کے لطائف۔ اس موضوع پر نہ اتنی جامع کتاب ہی مرتب ہوئی ہے اور نہ کسی رسالے کا خاص نمبر ہی نکلا ہے۔

مسلم یونیورسٹی گزٹ

ایڈیٹر ڈاکٹر محمد حسن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی سرگرمیوں، امتحان کے نتائج وغیرہ کے علاوہ، اردو نظم و نثر پر مشتمل تخلیقات بھی شائع ہوتی رہتی ہیں پرچہ نہایت باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔



روز بہ روز بہ روز...
رکسونا صابن
آپ کی جلد کو نکھارے چلا جاتا ہے
ہر بار جب آپ رکسونا سے منہ ہاتھ دھوتے ہیں...
آپ کی جلد زیادہ چکنی زیادہ نرم نظر آتی ہے کیونکہ
رکسونا میں تیلوں کا ایک خاص مرکب کیڈل ملایا جاتا
ہے جو جلد کی تندرستی اور دلکشی کو فروغ دیتا ہے
رکسونا کا ملائی جیسا ملائم جھاگ اپنی جلد پر اچھی طرح ملئے
اور دیکھئے کہ روز بروز کیسے نکھرتی چلی جاتی ہے!
آپ کے حسن کے لئے... رکسونا
ہندوستان لیور لمیٹڈ نے رکسونا پروپرائٹری لمیٹڈ آسٹریلیا کیلئے ہندوستان میں بنایا۔

Edited and Published by the Director, Publications Division., Old Secretariat, Delhi—8
and Printed by the Model Press Private Ltd., Delhi.

Regd. No. D-569

۱/۱۲

آجکل

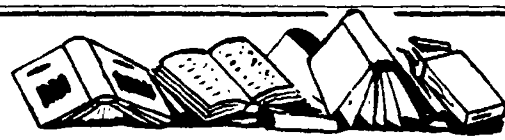


اساڑھ شک سمت ۱۸۸۱

ائی ۱۹۵۹ء

۵۰ نئے پیسے

ہماری کتابیں



نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
پنڈت نہرو سے بات چیت (نامور فرانسیسی جرنلسٹ تیبر منڈی سے)	دو روپے	۴۰ نئے پیسے
دیس دیس کی لوک کہانیاں	۷۵ نئے پیسے	۲۵ نئے پیسے
بھارت کی لوک کہانیاں	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
اپنے گھر کو آگ سے بچائیں	۷۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
ہماری کامیابیاں اور نئی منزلیں	۶۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی	۷۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
ناپ تول کا میٹری نظام	۲۵ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
ہمارے نئے سکے	۲۵ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
کیلنڈر کی اصلاح	۴۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے

نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
جواہر لال نہرو کی تقریریں (۱، ۲، ۳، ۴، ۵)	۱۰ نئے پیسے (فی کاپی)	۸ نئے پیسے (فی کاپی)

ہندوستان ترقی کی راہ پر

نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
نئے سماجی نظام کی جانب	۱۰ نئے پیسے فی کاپی	۸ نئے پیسے فی کاپی
آبپاشی اور بجلی		
ہمارے پلان اور سوشلزم		
صنعتی ترقی		
خوراک اور زراعت		
رسل و رسائل		

(رجسٹری خرچ الگ)

پچیس ۲۵ روپے یا اس سے زیادہ کی کتابوں پر ڈاک خرچ نہیں لیا جائے گا قیمت پیشگی اور پوسٹل آرڈر کے ذریعے بھیجنے سے آسانی رہتی ہے

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸

ترتیب

سرورق:- نامیچہ [illegible]
[illegible]
چھاپی گئی [illegible]

اساڑھ [illegible] ۱۸۸۱
جولائی ۱۹۵۹ء

[illegible] آج کل [illegible] دہلی

اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آج کل

دہلی

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں چھ روپے
پاکستان میں چھ روپے (پاک)
غیر ممالک سے:- نو شلنگ یا سوا ڈالر

فی پرچہ:- ہندوستان میں ۵۰ نئے پیسے
پاکستان میں آٹھ آنے (پاک)

جلد ۱۷ نمبر ۱۲

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

مُلاحظات

۱۱ مئی کو حیدرآباد میں پردھان منتری ہمایوں کبیر وزیر سائنسی تحقیقات و ثقافتی امور کے ہاتھوں ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح ہوا۔ اس ادارے کا مقصد مولانا آزاد مرحوم کے خیالات اور اُن کے طرزِ فکر کی اشاعت کرنا ہے اور یہ کام اردو کے علاوہ عربی، فارسی، ہندی اور تلگو زبانوں میں بھی ہوگا۔ فلسفہ، کلچر اور تاریخ جیسے مضامین پر اعلیٰ اور معیاری تحقیقاتی کام کیا جائے گا۔ ملک کے ممتاز ادیبوں اور عالموں کی نگرانی میں یہ انسٹی ٹیوٹ اپنا پروگرام مرتب کرے گا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر تاراچند، پروفیسر سُنیتی کمار چیٹرجی، خواجہ غلام السیّدین جیسے بلند مرتبہ حضرات اس ادارے کی مجلس مشاورت میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر محی الدّین قادری زور انسٹی ٹیوٹ کے معتمد ہیں، جن کی مساعیٔ جمیلہ سے اس کی بنیاد پڑی ہے۔ امید ہے کہ ان کی نگرانی میں یہ انسٹی ٹیوٹ پروان چڑھے گا اور علم و ادب کی دنیا میں اپنا نام پیدا کرے گا۔

ملک میں غذائی پیداوار بڑھانے کے لئے پہلے وسیع مہم شروع کی گئی تھی جس کے نہایت حوصلہ افزا نتائج مُرتّب ہوئے۔ اب اس مقصد کے لئے خریف مہم شروع کی گئی ہے۔ اس موقع پر صدرِ جمہوریہ نے اپنی افتتاحی تقریر میں پھر اس بات پر زور دیا کہ غذا کی پیداوار بڑھانے کے لئے ملک بھر میں وسیع پیمانے پر کوششیں کی جائیں۔ توقع ہے کہ اس بار زیادہ بہتر نتائج نکلیں گے اور کاشتکاروں کی خصوصی کوششوں سے خوراک کے معاملے میں ہم جلد خود مکتفی ہو جائیں گے۔

۲۴ مئی کو امریکہ کے سابق وزیر خارجہ مسٹر جان فاسٹر ڈلس کا ۷۱ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ وہ صدر آئزن ہاور کے دستِ راست تھے اور انھوں نے کمیونسٹ طاقتوں کے خلاف مغربی ممالک کی گروہ بندی کے لئے زبردست کام کیا تھا۔ اس اعتبار سے نہ صرف امریکہ بلکہ پورے مغربی گروہ کی موجودہ سیاست پر اُن کی شخصیت کی چھاپ دیر تک قائم رہے گی۔ امریکہ میں ان کے انتقال سے جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ شاید آسانی سے پُر نہ ہو سکے گی۔

ہمارے پڑوسی ملک نیپال میں جمہوری بنیادوں پر پہلے عام انتخابات ہوئے ہیں۔ اور اکثریت حاصل کرنے والی پارٹی نیپالی کانگریس کے لیڈر شری بی پی کوئرالہ کی قیادت میں دستوری حکومت قائم ہوگئی ہے۔ اس دور میں جب کہ ایشیا کے بعض علاقوں میں جمہوریت کے مستقبل کی طرف سے مایوسی کا اظہار کیا جا رہا ہے، نیپال میں جمہوری حکومت کا قیام فالِ نیک ہے۔ اُمید کرنی چاہئے کہ نیپال ایک جمہوری ملک کی حیثیت سے زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کرے گا اور دُنیا کے امن و سلامتی کے قیام میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔

سلام سندیلوی

رُباعی کا فن

رُباعی ایک مشکل صنفِ سخن ہے۔ اس پر پورا عمل کرنا آسان نہیں۔ رباعی، اس کے لئے نظر کی وسعت اور شعور کی پختگی کی ضرورت ہے۔ اس لئے رباعی میں کامیابی تبھی حاصل ہوتی ہے جب شاعر کہنہ مشق ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر نومشق شعرا اس صنف میں ناکام نظر آتے ہیں۔ اس صنف کی فنی مشکلات کو مختلف ادیبوں اور نقادوں نے تسلیم کیا ہے۔ فروغی اور غنی مؤلفین "رباعیات حکیم خیام نیشاپوری" لکھتے ہیں:

"رباعی مشکل ترین اقسام شعر است، زیرا با شرائط و قیود سے کہ برائے آں مقرر شدہ وبایں کہ بیش از دو بیت بیشتر نیست، مجال سخن در آں تنگ است۔"[1]

جوش ملیح آبادی نے بھی "رباعیاتِ محروم" کے دیباچہ میں اس کی فنی مشکلات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"رباعی کہنا بڑا مشکل ہے۔ یہ وہ کم بخت صنفِ سخن ہے کہ بڑے بڑے بہادروں کو سپر انداختہ کر دیتی ہے اور یہ کافر صنف بڑے بڑوں کے بھی قابو میں اس وقت تک نہیں آتی ہے جب تک کہ زمانے کی سرد و گرم ہوائیں شاعر کی حساس و متفکر زندگی کے تقریباً چالیس پچاس ورق نہیں اُلٹ دیتی ہیں۔"[2]

جوش ملیح آبادی نے برج لال رعنا کے مجموعۂ رباعیات "رعنائیاں" میں بھی اس کافر صنفِ سخن کی سنگ دلی کو بے نقاب کیا ہے۔ ان کا قول ہے کہ:

"رباعی ایسی کم بخت چیز ہے جو "سالا جوبن گھالے تو ایک بالک پائے" کی طرح چالیس پچاس برس کی مشاقی کے بعد کہیں جا کر قابو میں آتی ہے۔"[3]

اسی طرح منشی تلوک چند محروم نے "رعنائیاں" میں اس کی فنی دشواریوں پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

"مسلّم ہے کہ رباعی لکھنے کے لئے کافی مشقِ سخن اور پختگی عمر کی ضرورت ہے اور یہی وجہ ہے کہ عام طور پر شاعر کی زندگی میں رباعی نویسی کا دور آخر میں آتا ہے۔"[4]

اس میں کوئی شک نہیں کہ رباعی مشکل ترین صنفِ سخن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رباعی گو شعرا بھی بہت کم نظر آتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں دیگر اصنافِ سخن میں مشہور شعراء کی تعداد زیادہ ہے۔

اس بات کو مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے مقدمۂ کلیاتِ خواجہ عزیز لکھنوی" میں مندرجہ ذیل الفاظ میں واضح کیا ہے:

"اصنافِ سخن میں سب سے زیادہ مختصر رباعی ہے جو سب سے مشکل ہے۔ دیکھو صدیوں کے دوران میں صرف چار یا پانچ ہی اُستاد رباعی گو رہے ہیں۔ حضرت ابوسعید ابوالخیر، شیخ الاسلام

---

[1] "رباعیات حکیم خیام نیشاپوری" مؤلفہ فروغی و غنی ص۹ مطبوعہ تہران ۱۳۲۰ھ

[2] "رباعیاتِ محروم" مصنفہ منشی تلوک چند محروم، دیباچہ جوش ملیح آبادی از ۱ تا ۷

[3] "رعنائیاں" رباعیات برج لال رعنا، دیباچہ جوش ملیح آبادی، سرورق

[4] "رعنائیاں" مصنفہ برج لال رعنا، دیباچہ منشی تلوک چند محروم صفحہ

انصاری، عمر خیام، سحابی، نجفی۔ دل چاہے تو سرمد کو بھی یاد کر لو۔ اس نے بھی ایک لطف پیدا کیا ہے۔"[۱]

اس کے بعد شروانی صاحب نے یہ بھی بتایا ہے کہ فارسی مثنوی میں شہرہ رسانی کی تعداد بیس سے زیادہ ہے۔ قصیدہ کے استاد سو کے اندر ہیں اور سب سے زیادہ آسان صنف سخن غزل ہے۔ استاد غزل بیسیوں ہیں اور مشاہیر غزل سیکڑوں ہیں۔ لیکن مشہور رباعی گو شعرا محدود سے چند ہیں۔

یہی حال اردو ادب کا بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو شاعری میں بہت کم ایسے شعرا گزرے ہیں جو خالص رباعی گو ہوں۔ اس سلسلہ میں صرف حضرت امجد حیدرآبادی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اب تک صرف رباعیاں کہی ہیں اور اگر انھوں نے کچھ نظمیں بھی کہی ہیں وہ بھی رباعی کی بحر میں ہیں۔ چنانچہ خود امجد کی "رگ بیں" جنگ کے عنوان سے جو نظم ہے وہ رباعی کے اخرب کی بحر میں ہے۔

ان تمام بیانات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رباعی کس قدر مشکل صنف سخن ہے اور اس پر عبور حاصل کرنے کے لئے کس قدر پختگی کی ضرورت ہے۔

رباعی بحیثیت فن اس وجہ سے مشکل ہے کہ اس کی بحر بہت پیچیدہ ہے۔ رباعی کے واسطے بحر ہزج ابتدا ہی سے متعین ہے۔ اس بحر سے ارکان مزاحف اور سالم مل کر بعض کے نزدیک اٹھارہ اور بعض کے نزدیک چوبیس ہوتے ہیں۔ مگر زیادہ تر چوبیس اوزان مانے گئے ہیں۔ یہ چوبیس اوزان دس ارکان سے مل کر بنتے ہیں یعنی مفاعیلن، مفعولن، مفعول، مفاعلن، مفاعیل، فعولن، فعل، فع، فاعلن، فاع۔ ان ارکان کا ذکر حمید عظیم آبادی نے جامع العروض میں بہت تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔[۲] چوبیس اوزان میں سے بارہ اوزان کا تعلق دائرہ اخرب سے ہے اور بارہ اوزان کا تعلق دائرہ اخرم سے ہے۔ ابن قیس نے "حدائق" میں لکھا ہے کہ خواجہ امام حسن قطان نے پہلی بار ان چوبیس اوزان کو ترتیب میں لانے کے لئے دو شجرے تیار کئے۔ وہی شجرے آج تک رائج ہیں۔ انہیں شجروں کو دائروں کی شکل میں مولانا حکیم محمد نجم الغنی رامپوری نے بحر الفصاحت[۳] میں نقل کیا ہے۔ انہیں شجروں کو انشاء اللہ خاں نے "دریائے لطافت" میں

اپنے مخصوص طرز نیاز انداز میں پیش کیا ہے۔[۱]

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ رباعی کی بحروں کی تعداد صرف چوبیس ہی نہیں ہے بلکہ ان بحروں میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ مؤلف بحر الفصاحت کے حساب سے رباعی کی بحروں کی تعداد ۲۷۴۱۴ تک پہونچتی ہے۔ ان کا قول ہے کہ جب ایک حصے کے بارہ وزنوں میں سے ہر ایک وزن کے پہلے مصرع کے ساتھ دوسرا مصرع بارہ بارہ طرح لگایا جائے گا تو اس دوسرے مصرع کے ملنے سے ۱۴۴=۱۲×۱۲ ثنائی شکلیں پیدا ہوں گی۔ اب ان ۱۴۴ شکلوں میں سے ہر ایک شکل کے ساتھ تیسرا مصرع چوبیس چوبیس طرح سے لگایا جائے گا تو اس تیسرے مصرعے کے ملنے سے ۳۴۵۶=۲۴×۱۴۴ ثلاثی شکلیں پیدا ہوں گی۔ پھر ۳۴۵۶ شکلوں میں سے ہر اک شکل کے ساتھ چوتھا مصرع بارہ طرح لگایا جائے گا۔ تو اس چوتھے مصرع کے ملنے سے ۴۱۴۷۲=۱۲×۳۴۵۶ کامل شکلیں پیدا ہوں گی۔[۲]

ایک رسالہ عروض میں جن کے مصنف کا نام نہیں معلوم ہو سکا ہے مگر جو ۱۲۸۳ء کا مطبوعہ ہے صفحہ ۴۷ پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے جس سے رباعی کی بحروں کی تعداد پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

"بعض عروضیوں نے دس ہزار اور بعضوں نے لاکھ تک شمار کئے ہیں۔"

ان حضرات کے علاوہ محمد عظمت اللہ خاں نے "سریلے بول" میں ہندی ماترے کے طریقے سے رباعی کی بحروں کی تعداد ۶۰۴۹ مقرر کی ہے۔[۳] مختصر یہ ہے کہ ان بیانات کی روشنی میں ہم کو رباعی کی بحر کی پیچیدگی اور دشواری کا پتہ بخوبی چل جاتا ہے۔ اس لئے رباعی پر عبور حاصل کرنا صرف اساتذہ کا کام ہے۔

جناب مولوی سید علی حیدر طباطبائی کا خیال ہے کہ رباعی کی بحر اس قدر مشکل ہے کہ اساتذہ بھی اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے "شرح دیوان اردوئے غالب" میں غالب کی مندرجہ ذیل رباعی کو ناموزوں بتایا ہے۔[۴]

---

[۱] "کلیات خواجہ عزیز لکھنوی" دیباچہ از مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی ص ۱

[۲] "جامع العروض" مؤلفہ حمید عظیم آبادی ص ۹۳

[۳] "بحر الفصاحت" مؤلفہ مولانا حکیم محمد نجم الغنی رامپوری ص ۲۴۳

---

[۱] "دریائے لطافت" مؤلفہ انشاء اللہ خاں انشا ص ۳۹۷

[۲] "بحر الفصاحت" مؤلفہ مولوی حکیم محمد نجم الغنی رامپوری ص ۲۴۳

[۳] "سریلے بول" مؤلفہ محمد عظمت اللہ خاں ص ۵۹

[۴] "شرح دیوان اردوئے غالب" از جناب مولوی سید علی حیدر طباطبائی

ڈکھ جی کو پسند ہوگیا ہے غالب دل رک رک کر بند ہوگیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں سونا سوگند ہوگیا ہے غالب

اس رباعی کے دوسرے مصرع کو طباطبائیؒ صاحب نے ناموزوں ثابت کیا ہے کیونکہ اس میں دو حرف زائد ہوگئے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ اتنے ارکان رباعی کے کسی مصرع میں نہیں ہوتے ہیں۔ جس مصرع میں سب سے زیادہ سبب خفیف ہیں وہ فارسی کا یہ مشہور مصرع ہے ؎

یا می گویم نام تو یا می گویم

اگر اس مصرع کے وزن پہ غالب کے دوسرے مصرع کو ملائیں تو وہ یوں ہو جائے گا ؎

دل رک رک کر بند ہوا ہے غالب

رباعی کی بحر کی دشواریوں کو ابھی عرض کیا جا چکا ہے۔ بحر کی ان پیچیدگیوں کے علاوہ رباعی گو شاعر کے لئے کچھ عروضی قیود کی پابندی بھی ضروری سمجھی گئی ہے۔

مثلاً عروضیوں کا قول ہے کہ جس رکن کے آخر میں سبب ہو تو اس کے بعد والے رکن کی ابتدا بھی سبب ہی سے ہونا چاہیئے۔ اور اگر رکن کے آخر میں وتد ہے تو اس کے بعد والے رکن کی ابتدا بھی وتد ہی سے ہوگی۔ مثلاً اگر ابتدا میں مفعول ہے تو اس کے بعد کا رکن مفاعلن یا مفاعیل یا مفاعیلن ہوگا۔ اور اگر مفعولن ہے تو اس کے بعد کا رکن فاعلن یا مفعول یا مفعولن ہوگا۔ یہ قید رباعی کے ایک مصرع پر عاید ہوتی ہے اور اس قید کو اساتذہ نے جائز رکھا ہے۔

کچھ عروضیوں کی رائے ہے کہ اخرب اور اخرم کی بحروں کو آپس میں نہ ملانا چاہیئے۔ اگر پہلا مصرع وزن اخرب میں ہے تو باقی تینوں مصرعے بھی اخرب ہی میں ہوں اور اگر پہلا مصرع اخرم میں ہو تو باقی تینوں مصرعوں کو بھی اخرم ہی میں نظم کرنا چاہیئے۔ مگر اساتذہ نے اس کی پابندی نہیں کی ہے عظمت اللہ خاں نے "سریلے بول" میں مشورہ دیا ہے کہ ایک رباعی کے چار مصرع مندرجہ ذیل بحروں میں کہے جا سکتے ہیں :

۱۔ مفعول مفاعیل مفاعیل فعل
۲۔ مفعول مفاعیلن مفعولن فع
۳۔ مفعولن فاعلن مفاعیل فعل
۴۔ مفعولن فاعلن مفاعیلن فع

اس کے علاوہ "معیار البلاغت" کے مصنف منشی دیبی پرشاد سحر بدایونی نے میر سوز کی ایک رباعی درج کی ہے جس میں مصرعۂ دوم دائرۂ اخرم سے تعلق رکھتا ہے اور باقی تینوں مصرعے دائرۂ اخرب سے متعلق ہیں۔

مدت ہوئی ہم کو جاں فشانی کرتے کیا ہو جاتا جو مہربانی کرتے
لخت جگر و کباب دل تھے تیار تم آتے تو ہم بھی میہمانی کرتے

کچھ عروضیوں نے رباعی گو شعرا پر یہ بھی پابندی عائد کی ہے کہ وہ اوزان جن کے عروض و ضرب میں فعول اور فاع ہیں اُن اوزان کے ساتھ جن کے عروض و ضرب میں فعل اور فع ہیں جمع نہ کرنا چاہیئے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ اخرب اور اخرم کے اوزان کو تو آپس میں ملا سکتے ہیں مگر جب مصرعۂ اوّل و دوم میں فعول اور فاع آگیا تو مصرعہ سوم و چہارم میں بھی فعول اور فاع آنا چاہیئے۔ اسی طرح سے جب مصرع اوّل و دوم میں فعل اور فع آگیا تو مصرعہ سوم و چہارم میں بھی فعل اور فع آنا ضروری ہے۔ مگر عملی طور پر شعرا اس اصول کے پابند نہیں رہے ہیں۔ شعرا نے عام قاعدہ یہ رکھا ہے کہ چوبیس اوزان میں سے کوئی بھی چار وزن ایک رباعی میں آ سکتے ہیں۔ بلکہ بعض عروضیوں کا یہ بھی خیال ہے کہ کم از کم چار مصرعوں میں سے ایک مصرعہ ضرور بدلی ہوئی بحر میں ہو۔ منشی دیبی پرشاد سحر نے معیار البلاغت[1] میں عبدالعزیز خاں عزیز لکھنوی کی تین رباعیاں اخرب کی اور تین رباعیاں اخرم کی درج کی ہیں جو مختلف بحروں میں ہیں۔ یہاں اخرب اور اخرم کی ایک ایک رباعی نمونتاً درج کی جاتی ہے۔ مصنف نے اختلاف بحر ظاہر کرنے کے لئے مصرعوں پر نمبر بھی ڈال دئے ہیں۔

اخرب کی رباعی

ہے چشم حیراں کو مجھ سے یہ حجاب (۸) آنکھوں کو کرے چار نہیں یہ تاب (۴)
حیرت کو مری غور اگر کرتا ہے (۱) آئینہ کی آنکھ میں بھر آتا ہے آب (۲)

اخرم کی رباعی

ہیں باغِ عالم میں کیا کیا گل و خار (۵) لیکن ہے دیدۂ بصیرت درکار (۱۲)
بینائی آنکھوں میں نرگس کے ہو (۶) گلشن میں تب کرے تماشائے بہار (۱۰)

رباعی کے فن کو سمجھنے کے لئے رباعی کے قافیوں پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ موجودہ دور کی رباعی میں عموماً مصرعۂ اوّل، مصرعۂ دوم اور مصرعۂ چہارم ہم قافیہ ہوتے ہیں مگر مصرعۂ سوم ہم قافیہ نہیں ہوتا ہے۔ فارسی متاخرین نے

[1] معیار البلاغت مؤلفہ منشی دیبی پرشاد سحر بدایونی صفحہ ۴۲

اس طرز کو جائز سمجھا تھا اور اسی وقت سے اب تک یہ طرز رائج ہے۔ مگر چوتھی اور پانچویں صدی کے شعرا چاروں مصرعوں کو ہم قافیہ کر دیتے تھے لیکن سید سلیمان ندوی کی رائے ہے کہ چوتھی اور پانچویں صدی میں یہ التزام ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس عہد کے شعرا بھی چاروں مصرعوں میں قافیہ لاتے تھے اور کبھی مصرعہ سوم کو غیر مقفیٰ کر دیتے تھے۔ چنانچہ رودکی، فردوسی اور عنصری وغیرہ کے یہاں کبھی تیسرے مصرع میں قافیہ ہے اور کبھی نہیں ہے۔[1]

پروفیسر محمود شیرانی نے مولانا سید سلیمان ندوی کے مندرجہ بالا قول کی سختی سے تردید کی ہے اور اپنے قول کی تائید میں ڈاکٹر اقبال کی رائے کو پیش کیا ہے۔ اقبال کا بیان ہے کہ

"ایک رباعی جتنی زیادہ قدیم ہوگی گمان غالب ہے کہ وہ مُصرّع ہوگی، جتنی متاخر ہوگی اتنی ہی خصی ہوگی۔"[2]

پروفیسر محمود شیرانی کا خیال ہے کہ چوتھی اور پانچویں صدی میں عام طور سے مُصرّع رباعیاں کہی جاتی تھیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ شعرائے عہد غزنویہ کے دواوین میں سے عنصری کی ۳۰ رباعیوں میں سے ۲۴، فرخی کی ۳۰ میں سے ۲۶، ناصر خسرو کے ہاں ایک میں سے ایک، ابو الفرج رونی کے ہاں ۵۰ میں سے ۱۵، قطران تبریزی کے یہاں ۱۵ میں سے ۱۱، مسعود سعد سلمان کے یہاں ۲۲ میں سے ۱۹ رباعیاں مُصرّع ہیں۔ اس کے علاوہ "لباب الالباب" مؤلفہ عوفی کی جلد دوم میں شعرائے آل سامان و شعرائے آن نامر کی ساری رباعیاں مُصرّع ہیں۔ چونکہ ان شعرا کے یہاں تمام تر رباعیاں مُصرّع پائی جاتی ہیں اور کہیں کہیں کوئی رباعی غیر مُصرّع مل جاتی ہے، اس لئے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں عام رواج تو مُصرّع رباعیاں کہنے کا تھا اور جو غیر مُصرّع رباعیاں مل جاتی ہیں ان کو متاخرین نے غلطی سے ان شعرا کی رباعیوں میں شامل کر دیا ہے۔

موجودہ دور کے اردو شعرا نے فارسی کے متاخرین شعرا کی تقلید کی اور غیر مُصرّع رباعیوں کی طرف توجہ کی۔ مگر کبھی کبھی شاعر کے یہاں مصرّع رباعی بھی مل جاتی ہے۔ مثلاً حالی نے مندرجہ ذیل مصرّع رباعی کہی ہے:

صحرا میں جو پایا اک چٹیل میداں   برسات میں سبزے کا نہ تھا جس پہ نشاں
یاد آئی ہمیں قوم کے ادبار کی شاں   یاں اس تھے جن کے جوتنے سے دہقاں

رباعی پر عبور حاصل کرنے کے لئے مصرعوں کی ترتیب کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ رباعی میں خاص بات یہ ہوتی ہے کہ اس کے تین مصرعوں میں تین باتیں کہی جاتی ہیں اور چوتھے مصرع میں تینوں مصرعوں کا نچوڑ رکھ دیا جاتا ہے۔ یہی مصرع سارے مضمون کا ماحصل ہوتا ہے اسی لئے چوتھا مصرع ہمیشہ تینوں مصرعوں کی بہ نسبت زوردار ہوتا ہے۔

نواب سید امداد امام اثر صاحب نے "کاشف الحقائق" میں چوتھے مصرع کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے:

"چونکہ یہ صنف شاعری عروض ترکیب کی رو سے بہت محدود ہے، شاعر کو لازم ہے کہ منتج مسائل کو اس طرح موزوں کرے کہ تھوڑے لفظوں میں بہت معنی پیدا ہوں اور چوتھا مصرع بہت پُر مضمون اور پُر زور ہو۔ ایسا گویا کہ ہر سہ مصرعہائے کا خلاصہ یا نیجہ ہو۔[1]"

مولانا احسن مارہروی نے "کلیاتِ ولی" کے دیباچہ میں رباعی کے چوتھے مصرع کی اہمیت کو واضح کیا ہے:

"چاروں مصرعوں میں آخری مصرع رباعی کی جان ہوتا ہے اور اسی کو زیادہ زوردار بنانے کے لئے تین مصرعے بہم پہنچائے جاتے ہیں۔[2]"

مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی نے "افاداتِ سلیم" میں رباعی کے مصرعوں کی ترتیب کی مندرجہ ذیل الفاظ میں وضاحت کی ہے:

"چاروں مصرعوں میں کوئی مضمون اس انداز سے بیان کرنا کہ سامعین پر اس کا اثر ہو، ایک ہنر ہے۔ اس میں کوئی مصرع بےکار اور برائے بیت نہ ہونا چاہیئے اور چوتھا مصرع خاص کر پہلے والے مصرعوں سے زیادہ شاندار اور اہم ہو۔ یہ مصرع ایسا ہونا چاہیئے کہ سننے والے کے دماغ میں اس کی گونج رہے

[1] "خیام" از مولانا سید سلیمان ندوی ص ۲۲۳

[2] تنقید شعر العجم از پروفیسر محمود شیرانی ص ۱۱۵ مضمون ڈاکٹر اقبال

[1] "کاشف الحقائق" جلد دوم مؤلفہ نواب سید امداد امام اثر ص ۲۷۴

[2] "کلیاتِ ولی" مؤلفہ مولانا احسن مارہروی ص ۲۷

تک باقی رہتے۔[1] "

مرزا فدا علی خنجر لکھنوی نے بھی " رباعیاتِ رشید " میں چوتھے مصرع کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

" علی الخصوص چوتھے مصرع میں روانی، برجستگی، اثر و سلاست اتنی ہونا چاہیئے کہ متکلم کی زبان سے نکلتے ہی سننے والے کے دلوں میں اُتر جائے، اور مفہوم سمجھنے میں کوئی تکلف نہ ہو۔ کیونکہ صرف ایک مصرع کی تشریح کے لئے قائل کو اوپر کے تینوں مصرعوں کو نوک پلک سے درست کرکے لانا پڑتا ہے۔ اور جب تک چاروں مصرعوں کی چول سے چول نہ بیٹھ جائے اسے کامیابی کا یقین نہیں ہوتا۔[2] "

پروفیسر ضیا احمد ضیا بدایونی نے " دیوانِ مومن " میں مومن کی رباعیات کے سلسلے میں چوتھے مصرع کی اہمیت کو واضح کیا ہے :

" چوتھا مصرع عموماً حاصلِ رباعی اور زبان کے اعتبار سے چست تر ہونا چاہیئے۔[3] "

" رباعیات شاد عظیم آبادی میں حمید عظیم آبادی نے چوتھے مصرع کی برجستگی پر زور دیا ہے :

" ان تمام خوبیوں کے ساتھ چاروں مصرعے باہم ہر طرح دست و گریباں ہوں کہ ایک خوش نما گلدستہ کے چار ہم رنگ پھول معلوم ہوں جن کی خوشبو مشامِ جاں کو معطر کرنے والی ہو اور دل و دماغ کو فرحت بخشنے والی ہو۔ بالخصوص چوتھا مصرع تو کڑی کمان کا تیر بن کر نکلے جو دلوں پر جا بیٹھے اور سامعین کو تڑپا دے۔[4] "

مصرعوں کی ترتیب کے علاوہ رباعی کی زبان بھی کامیاب رباعی گوئی کا ایک ضروری جز ہے۔ رباعی کی زبان دوسرے اصنافِ سخن سے ذرا مختلف ہوتی ہے۔ جس طرح قصیدے کے لئے پُرشکوہ اور شاندار الفاظ کی ضرورت ہے غزل کے لئے نرم و نازک اور شیریں الفاظ کی ضرورت ہے اسی طرح رباعی کے لئے، وہ چاہے فکریہ ہو یا طربیہ ہو، زبان کی بلاغت اور سادگی میں پرکاری کی ضرورت ہے، مرزا فدا علی خنجر لکھنوی نے " رباعیاتِ رشید " میں رباعی کی زبان کے لئے مندرجہ ذیل لوازم ضروری قرار دیئے ہیں :

" رباعی کی بہتری و برتری، حکمت، نعمت، اخلاق، ادب فلسفہ اور اسی طرح بعض بعض مضامین کی خوش اسلوبی، بندش، دل چسپ ترتیب، چستی اور صفائی پر منحصر ہے۔[5] "

شیخ چاند نے " سودا " میں رباعی کی زبان کے لئے مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے :

" خیال کی پختگی کے ساتھ ساتھ زبان بھی نہایت صاف ستھری اور اسلوبِ بیان بھی نہایت برجستہ اور شستہ و رفتہ ہونا چاہیئے تاکہ مضمون فوراً ذہن نشین ہو جائے یا قلب پر اثر کرے۔[6] "

مندرجہ بالا بحث و مباحثے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ رباعی جیسی مشکل ترین صنفِ سخن کے لئے شاعر میں چند خوبیوں کا ہونا لازمی ہے۔ سب سے پہلے ایسے شاعر کو الفاظ پر قابو حاصل ہونا چاہیئے تاکہ اپنے ذخیرہ سے موزوں الفاظ کا انتخاب کر سکے۔ مثلاً فلسفیانہ مسائل کو حل کرنے کے لئے مخصوص الفاظ اور اصطلاحات کی ضرورت پڑتی ہے۔ رباعی گو شاعر کو ان الفاظ اور اصطلاحات کا علم ہونا چاہیئے اور ان پر قابو حاصل ہونا چاہیئے۔

دوسری خوبی رباعی گو شاعر کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کو طرزِ بیان پر قابو حاصل ہو کیونکہ اس کو ایک تنگ خاکنائے سے گزرنا ہوتا ہے۔ اس کو بلند سے بلند اور ادق سے ادق مضمون کو صرف چار مصرعوں میں باندھنا ہوتا ہے یا یوں کہیئے کہ گاگر میں ساگر کو بھرنا ہوتا ہے۔ علامہ بریج موہن دتا تریہ کیفی نے " رباعیاتِ مرحوم " کے دیباچہ میں ایک رباعی گو شاعر کے لئے بیان کی پختگی کو ضروری بتایا ہے۔

" رباعی ایسی صنف ہے جو تخیل کی بلندی اور بیان کی پختگی

---

[1] " افاداتِ سلیم " از مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی ص ۹۲

[2] " رباعیاتِ رشید " مرتبہ مرزا فدا علی خنجر لکھنوی ص ۳۱

[3] " دیوانِ مومن " مرتبہ پروفیسر ضیا احمد ضیا بدایونی ص ۱۴

[4] " رباعیاتِ شاد عظیم آبادی " مرتبہ حمید عظیم آبادی ص ۲۵

[5] " رباعیاتِ رشید " مرزا فدا علی خنجر لکھنوی ص ۳۱

[6] " سودا " مرتبہ شیخ چاند ص ۲۱۳

چاہتی ہے۔ اسی وجہ سے عموماً اس کی طرف کم توجہ ہوتی ہے۔[1]

پروفیسر ضیا بدایونی نے بھی "دیوانِ مومن" میں شاعر کے قدرتِ بیان پر زور دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"ایک اچھے رباعی نگار کا فرض ہے کہ ایک منفرد خیال کو چار مصرعوں میں اس قدر مؤثر اور لطیف انداز میں بیان کرے کہ اس سے بہتر پیرایہ متصور نہ ہو سکے۔[2]"

تیسری خوبی رباعی گو شاعر میں یہ ہونا چاہیئے کہ وہ مضمون کی فصاحت کو مدِنظر رکھے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ جس مضمون کو نظم کرنا چاہے وہ اس کے ذہن میں بالکل صاف اور واضح ہو۔ شیخ چاند کی رائے اس سلسلے میں کافی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں :

"رباعی نظم کی ایک اہم صنف ہے۔ اس میں وہی شاعر کامیاب ہو سکتا ہے جس کے خیالات میں پختگی اور تسلسل ہو اور جس مضمون پر وہ طبع آزمائی کرے اس میں اپنی ذاتی مستقل رائے رکھتا ہو۔ اگر وہ اس پر حاوی نہ ہو تو چار مصرعوں میں وسیع خیال و مضمون کو ادا کرنا اس کے لئے مشکل ہے۔[3]"

آخری خوبی رباعی گو شاعر میں یہ ہونا چاہیئے کہ اس کو رباعی کی تمام بحروں پر قابو حاصل ہونا چاہیئے۔ اگر اس کو بحروں سے واقفیت نہیں ہے اور ان پر عبور نہیں حاصل ہے تو وہ ناموزوں رباعی کہہ سکتا ہے جو اس کے لئے خوبی کے بجائے خامی بن سکتی ہے۔

مختصر یہ ہے کہ رباعی کا فن اس کی بحر، اس کے قافیے، اس کی زبان، اس کے اسلوب اور اس کے مصرعوں کی ترتیب پر مشتمل ہے۔ ان تمام خصوصیات پر رباعی گو شاعر کے لئے عبور حاصل کرنا ضروری ہے۔ یہ عبور اس کو اس کی شاعری کے ابتدائی دَور میں حاصل نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کے آخری دَور میں جملہ خوبیاں اس میں جمع ہو جاتی ہیں تب رباعی گوئی کا فن بھی اس کو آ جاتا ہے اسی لئے عام طور سے کہنہ مشق شعرا رباعی گوئی میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

---

[1] "رباعیاتِ مرحوم" دیباچہ علامہ کیفی ص۱۷

[2] "دیوانِ مومن" مرتبہ پروفیسر ضیا بدایونی ص۱۲

[3] "سودا" مرتبہ شیخ چاند ص۲۴۳

غلام ربانی تاباں

غزل

بھولے تو جیسے ربط کوئی درمیاں نہ تھا
اتنے بدل بھی سکتے ہو تم یہ گماں نہ تھا

اُس انجمن سے اُٹھ کے بھی ہم انجمن میں تھے
خلوت وہ کون سی تھی تماشا جہاں نہ تھا

تم کیا بدل گئے کہ زمانہ بدل گیا
تم سرگراں نہ تھے تو کوئی سرگراں نہ تھا

ہم اور شکوہ سنجیٔ اہلِ جفا کہ دل
کم بخت بے مزہ تھا اگر خوں چکاں نہ تھا

تاباںؔ خلوص اہلِ حرم میں بھی تھا مگر
اُس انجمن میں اپنا کوئی رازداں نہ تھا

علی جواد زیدی

غزل

آتا ہے مجھ کو یاد کہ وقتِ وداعِ ہوش
کچھ مجھ سے کہہ رہی تھی نگاہِ خلش فروش

یہ اور کون ہوگا بجز عشقِ کفر کوش
تیشہ بدست، صاعقہ در دل، کفن بدوش

نظروں میں ہے حکایتِ طوفانِ زندگی
پاسِ ادب سے گو لبِ اظہار ہیں خموش

جس سر میں تھا غرورِ وفا، نازِ بندگی
فیضانِ عشق سے وہی سر ہے وبالِ دوش

کہتے ہیں کچھ نشاط کو بھی اس میں دخل تھا
اک موجِ غم اُٹھی تھی جو ہنگامِ نائے نوش

سنبھلی ہوئی سی کیفیتِ غم کا نام عشق
اور عشق ہے بجائے خود اک شورش و خروش

اے غم! انھیں بھی آج حقیقت کی اک جھلک!
مدت سے ہیں تلاش میں اربابِ خرقہ پوش

مذہب میں اور عشق میں، کیا ربط، کیا لگاؤ
اک زلزلہ بہ ذہن ہے، اک زمزمہ بگوش

ڈالے ہیں مصلحت نے حجاباتِ عیش بھی
ہے وارثِ موجِ درد، یہ عشقِ فسانہ پوش

ظلم و ستم نے دیکھ لیا، آزما لیا
دار و رسن سے رک نہ سکا زندگی کا جوش

مانگی تھی میں نے موت مگر مجھ کو مل گیا
زیدی، وفا شعار کا یہ جشنِ خموش

صالحہ عابد حسین

کب تک ؟

تھوڑی ہی دیر پہلے بیوی سے ایک زوردار جھڑپ ہو چکی تھی۔ میں دفتر کا کام کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ذہنی اُلجھن کام میں مانع تھی۔ احمد کے بی۔اے کے داخلے کی بھینٹ بیوی کے کنگن ہو چکے تھے۔ اور اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ کالج میں بغیر معقول کپڑوں کے کیسے جا سکتا ہے۔ بیوی کا عذر ٹھیک بھی کہ اب اُس کے پاس نہ روپیہ ہے اور نہ زیور مگر لڑکا بھی تو ٹھیک ہی کہتا ہے کہ وہ پھٹے حالوں کیسے بی۔اے کی کلاسیں اٹینڈ کرے۔ اور بار بار میرے ذہن میں یہ کیڑا رینگ جاتا کہ بیوی اس لئے احمد کے اخراجات پر کُڑھتی اور جھگڑتی ہے کہ وہ اس کا اپنا نہیں میرا بیٹا ہے۔ اور غصہ مجھے یہ جھلا دیتا کہ میں اُسے کون سی ایسی دولت لا کر دے دیتا ہوں جس میں وہ اتنے بڑے کنبے کا خرچ بھی چلائے اور یہ اُوپر کے بڑھتے بڑھتے اخراجات بھی پورے کرے۔

کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک نوعمر لڑکا آ کر ایک طرف چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ کام سے سر اُٹھائے بغیر میں نے پوچھا "کہو — کیا کام ہے؟"

"جی — مجھے — آپ سے — ایک سفارش کرانی ہے" اُس نے اٹک اٹک کر کہا۔

"مجھ سے سفارش؟ مگر میں تو تمھیں جانتا بھی نہیں۔"

"جی ہاں آپ مجھ سے واقف نہیں — لیکن میرے والد اور دادا مرحوم سے آپ کے گہرے تعلقات تھے۔"

"اچھا — تمھارے خاندان سے میرے گہرے تعلقات تھے؟" میں اپنا طنزیہ انداز نہ چھپا سکا۔ مگر یا تو وہ سمجھا نہیں یا پھر صاحبِ غرض تھا جو بے حس ہو ہی جاتا ہے۔ باپ دادا کے اصلی اور فرضی تعلقات کا حوالہ دے کر سفارش کرانے اور مانگنے والوں کا مجھے کافی تجربہ تھا۔

"جی ہاں — آپ ایک زمانے میں نظیرآباد میں ماسٹر تھے۔ وہاں آپ' شیخ احمد حسن سے ملاقات تھی اور اُن کے بیٹے شیخ محمد حسن کو آپ انگریزی پڑھاتے تھے۔"

"ہاں ہاں — یاد آیا پڑھاتا تھا۔ تو تم اُن کے ہاں سے آئے ہو؟" پھر پہلی بار نظر بھر کر لڑکے کی طرف دیکھا۔ ٹخنے کا اٹنگا پاجامہ اور پرانی سوتی اچکن پہنے اُلجھے بالوں اور مرجھائے چہرے والا ایک لڑکا گھبرایا ہوا سا میرے سـ کھڑا تھا۔ پہلی نظر میں تو اس کی عمر بارہ تیرہ سال سے زیادہ کی نہ معلوم ہوتی اوپر کے ہونٹوں پر سیاہی اور ٹھوڑی پر چند چھدرے بال بھی موجود تھے۔ جـ اندازہ ہوا کہ وہ جوانی کی سرحد میں داخل ہو چکا ہے مگر ماتھے پر فکر و پریشانیا شکنیں، آنکھوں میں تفکرات کا سایہ، کندھوں پر جیسے کوئی بھاری بوجھ اور کا ہونٹوں پر احساسِ ندامت اور شرمندگی کی پرچھائیاں — یہ سب جیسے پکا کہہ رہے تھے کہ جوانی اس لڑکے کو دور سے دیکھ کر بھاگ گئی اور بڑھا نے اس پر اپنا قبضہ جما لیا ہے۔

میرے سوال کا جواب دینے سے پہلے وہ ذرا جھجکا — جب میں نے دو پوچھا — "تو تم نظیرآباد سے آئے ہو؟ یہاں کیا کرتے ہو؟"

"میں نے بی اے آرٹس میں داخلہ لیا ہے۔"

"اچھا — تم کہہ رہے تھے کہ میں تمھارے خاندان سے واقف ہوں؟"

"شیخ احمد حسن میرے دادا تھے — میں شیخ محمد حسن کا بیٹا ہوں!"

قلم میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا — شاید منہ بھی کھل گیا ہو — میرے

سے انتہائی حیرت میں صرف اتنا نکلا "شیخ محمد حسن کا بیٹا !!" اور اس لڑکے کا منہ تکنے لگا جو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ چھپنے کے لئے کوئی جگہ تلاش کر رہا ہے۔ اور میرے ذہن میں اٹھارہ انیس برس پہلے کے مناظر سینما کی تصویروں کی طرح گھوم گئے۔

جب میں نیا نیا نظیر آباد میں اسکول ماسٹر ہو کر گیا تھا۔ ایک بڑے کنبے کا بار میرے سر پر تھا اور دو جگہ کا خرچ اٹھانا محال۔ ماں، بہن، بیوی بچوں کو پاس بلا کر رکھنا چاہتا تھا مگر اسکول کی طرف سے گھر نہیں ملتا تھا اور کرایہ کا مکان لے کر رہنے کی مقدرت نہ تھی۔ ایک دن وہاں کے ایک صاحب اثر رئیس شیخ احمد حسن سے ملاقات ہوئی۔ ان بزرگ کی نیکی اور خوش مزاجی سے میں بہت متاثر ہوا اور پھر جب انھیں اس کا علم ہوا کہ میں کسی مکان کی تلاش میں ہوں تو انھوں نے اصرار کر کے اپنا ایک مختصر صاف ستھرا مکان میرے رہنے کے لئے پیش کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ جب میں اس میں اُٹھ آیا تو مکان کو پلنگ، چوکی، کرسی، میز، گھڑے، مٹکے، سل بٹہ، توا، دستپناہ وغیرہ ضرورت کی سب چیزوں سے آراستہ پایا۔ ساتھ ہی انھوں نے اپنے بڑے صاحبزادے کو انگریزی پڑھانے پر بھی مجھے مقرر کیا اور پچیس روپے ماہوار دینے لگے۔ حالانکہ یہ صاحبزادے پڑھنے پڑھانے خاک بھی نہ تھے، پورے رئیس زادے تھے۔ انگریزی پڑھنے سے کہیں زیادہ دوسرے رئیسانہ اشغال سے دل چسپی رکھتے تھے۔ مگر باپ کی تمنا تھی کہ وہ پڑھ لکھ جائیں اور جائداد کی دیکھ بھال کریں۔

میری والدہ اور بیوی اکثر شیخ صاحب کے ہاں آتی جاتی رہتی تھیں۔ میلاد، مجلس، کسی تقریب، عید تہوار پر اصرار سے انھیں بلاوا آتا اور ان سے بہت اچھی طرح سب گھر والیاں ملتی تھیں۔ میری والدہ کہا کرتی تھیں کہ "بیٹا بڑا رئیس ہے۔ روپیہ پیسہ تو ہاتھ کا میل سمجھتا ہے اور پھر غرور کا کسی میں نام نہیں۔"

پیسہ کی بڑے میاں کی نظر میں کوئی حقیقت نہ تھی۔ محتاجوں اور ضرورت مندوں، یتیم خانوں اور خیراتی اداروں کو بھی دیتے تھے اور خاندان اور محلہ کے ضرورت مند اور غیر ضرورت مند رشتہ دار اور حوالی موالی، مصاحب، مفت خورے بہانے بے بہانے اُن سے پیسہ اینٹھتے رہتے تھے۔ کسی نے نئی گھڑی کی تعریف کر دی اور فوراً وہ اُن کی جیب سے اس کی جیب میں پہنچ گئی۔ کسی نے قیمتی پشمینے کی اچکن یا کشمیری شال کا قصیدہ پڑھا اور اب شیخ صاحب کو وہ کاٹنے لگی، جب تک مدّاح کے گھر نہ پہنچ جاتے۔ کوئی بیٹا اعتراض کرتا تو بگڑ جاتے۔ "میاں تم اپنے وقت میں فقیر کو بھیک بھی نہ دینا۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ خدا نے دیا ہی اسی لئے ہے کہ اس کے بندوں میں بانٹا جائے۔"

وہ دل کے اچھے تھے اور بڑے مخیر بھی، مگر بے اصولی اور فضول خرچی میں جواب نہ رکھتے تھے۔ انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ خیرات اور اسراف میں کیا فرق ہے۔ اگر ستر میں سے دس روپے ضرورت مندوں کو ملتے تھے تو باقی نوّے مفت خورے کاہل، خوشامد پیشہ اینٹھ لے جاتے تھے۔

بڑے بیٹے محمد حسن کو شیخ صاحب بے حد چاہتے تھے۔ ان کو پوری املاک کا متولی اور مختار بنا دیا تھا۔ اور اس وجہ سے ان کے سارے سگے سوتیلے بھائی بہن اور سوتیلی مائیں بے حد خار کھاتے تھے۔ محمد حسن میں نہ باپ والی فیاضی تھی نہ کوئی سوجھ بوجھ۔ وہ ایک عیش پرست، کاہل اور بے وقوف رئیس زادے کے سوا اور کچھ نہ تھے۔

میں وہیں تھا کہ محمد حسن کے یہاں کئی لڑکیوں کے بعد بیٹا پیدا ہوا۔ شیخ صاحب کا پہلا پوتا۔ بڑے میاں کی خوشی کی کوئی حد نہ تھی۔ "ولی عہد" کو خدا نے وارث عطا کیا تھا۔ ساری بستی میں آٹھ دن تک جشن منایا گیا۔ بستی بھر کی دعوت ہوئی، توڑے بندی کی گئی، چراغاں ہوا، ہرجا دہانیوں، مصاحبوں اور رشتہ داروں کو جوڑے دئے گئے۔ شیخ صاحب ہنس ہنس کر کہتے "ارے میاں بیس پچیس ہزار خرچ ہو گیا تو کیا بڑی بات ہے۔ لاکھ روپیہ کا پوتا بھی تو خدا نے دیا ہے۔"

اور اب — اب — یہ پھٹے حال لڑکا کہتا ہے کہ میں محمد حسن کا بیٹا ہوں، شاید وہی بچہ — میں اپنے خیالات سے چونک پڑا — "تمھارا نام مقصود حسن —"

"جی ہاں میرا یہی نام ہے۔"

اور میں نے اٹھ کر اس کو گلے سے لگا لیا اور اپنے آنسو نہ روک سکا۔ میری تو خیر ہمت ہی نہیں پڑی کہ اس سے پوچھتا کہ تم اس حال کو کیسے پہنچے۔ مگر اس کو جب میں نے بیوی سے جا کر ملایا تو وہ اس محبت سے اس لڑکے سے پیش آئی جیسے وہ اس کا اپنا ہی بیٹا ہو، اور دونوں جلدی ہی گھل مل گئے۔ بعد میں بیوی نے مجھے بتایا کہ جیسا ایسے ناعاقبت اندیش رئیس گھرانوں میں ہوتا ہے، شیخ صاحب کے مرنے کے بعد بھی کبھی جائداد اور زمینداری پر مقدمہ بازی ہوئی اور محمد حسن کچھ اپنی جہالت اور بے وقوفی کی وجہ سے، کچھ سوتیلے بھائیوں کی

بے ایمانی کی بدولت جائز حق بھی نہ پا سکے۔ بہت تھوڑا سامان کا حصہ جائیداد کا ان کے حصے میں آیا۔ محمد حسن نے وفاقی توازن تک لگا دیا۔ باغ اور دکانیں بیچ کر بڑے خاندان کا خرچ چلایا۔ پھر بیوی کے زیور پر نوبت آئی اور جب کچھ نہ رہا تو ایک دن مایوسی کے عالم میں خودکشی کر ڈالی۔ خاندان کا شیرازہ بکھر گیا۔ مفت خورے اپنے گھر سدھارے اور شیخ محمد حسین کی لاڈلی بہو، پونڈوں کی رئیس زادی محمد حسن کی بیگم اب ایک بے سہارا بیوہ تھی جو چار لڑکیوں اور دو لڑکوں کے ساتھ دنیا میں اس طرح بے سہارا رہ گئی کہ چاروں طرف دیکھتی اور کوئی اپنا نظر نہ آتا۔ مگر اس غیور عورت نے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا گوارا نہیں کیا بلکہ جو ہنر اور دستکاریاں عورت کا زیور سمجھی جاتی تھیں ان کا سہارا لیا اور سلائی کڑھائی وغیرہ کر کے کچھ پیسہ پیدا کرنے لگی۔ کچھ دن بچے کھچے زیور سے کام چلا۔ اس نے طے کر لیا کہ اپنے بیٹے کو ضرور اعلیٰ تعلیم دلائے گی۔ وہ کہتی "مقصود کے باپ جاہل نہ ہوتے تو آج اس کے بچے یوں بے یار و مددگار نہ رہ جاتے۔ میں اپنے بچوں کو ضرور تعلیم دلاؤں گی۔" مگر تعلیم ---- اس غریب ملک میں --- جس قدر مہنگی ہے۔ اس کی غریب کو کیا خبر تھی۔ اس نے مقصود کو جانے کس کس مشکل سے انٹر تک تو پڑھا دیا۔ مگر اب بالکل خالی ہاتھ ہو چکی تھی۔ پھر بھی اس کی تمنا تھی کہ چاہے اس کی جان چلی جائے مگر مقصود بی اے کرے۔ مگر مقصود کی حالت یہ تھی کہ وہ فیس نہیں دے سکتا، کتابیں نہیں خرید سکتا، رہنے کا ٹھکانا نہیں، کھانے کا سہارا نہیں، پارٹ ٹائم کام کہیں ملتا نہیں۔ ٹیوشن کہیں، اور ٹیوٹر در در مارے مارے پھرتے ہیں۔ کون کس کی مدد کرے؟ کس کس کی فیس معاف ہو؟ کتنوں کو اسکالرشپ ملیں؟ کتنوں کو فری شپ دی جائے؟ پچاس فی صدی سے زیادہ طالب علم ایسے ہی آتے ہیں۔ ایک سو ایک بہانے اس قسم کے تھے جو اس نوعمر بے سہارا لڑکے کو ہر دروازے سے دھتکار دیتے تھے۔

جانے کیسے اس کی ماں کو پتہ معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں اور یہاں کے بچے ... جب آج وہ یہاں آیا تھا۔ میں نے جو کچھ ہو سکا اس کے لئے کیا۔ فیس معاف کرائی۔ دو جگہ ٹیوشن دلوایا۔ میرا مکان بہت چھوٹا تھا۔ ایک دوست کے یہاں برآمدے میں ایک پلنگ ڈالنے کی جگہ دلوائی۔ کھانا میں نے چاہا کہ وہ میرے ساتھ کھا لیا کرے مگر اس نے دور ہونے کا بہانہ کر کے ٹال دیا۔ وہ بہت ہی اتنی ہی مدد کا طالب تھا کہ میں اسے کام دلاؤں اور فیس وغیرہ معاف کرا دوں۔

شاید اس کی غیرت اپنے دادا کے ملازم سے مدد لینے پر آمادہ نہ ہوئی۔

اور اس طرح ڈیڑھ سال گزر گیا۔ مقصود بہت کم آتا اور جب آتا پہلے سے بھی زیادہ پریشان اور ڈرا ہوا نظر آتا۔ میں کبھی کبھی اسے سمجھاتا "بس بیٹا تھوڑے دن اور ہیں۔ بی اے کر لو۔ پھر خدا نے چاہا تو سب مشکلیں دور ہو جائیں گی۔" لیکن دل اندر سے میری مخالفت ہی کرتا۔ بی اے کر کے کون سی پانچ سات سو کی نوکری مل جا رہی ہے جس میں وہ دس آدمیوں کے کنبے کو پال سکے گا۔

امتحانات کا زمانہ قریب آ رہا تھا اور طالب علموں کے امتحان کی فیسیں وصول کی جا رہی تھیں۔ میرے چھوٹے بچوں کی فیسیں جیسے تیسے داخل کی جا چکی تھیں مگر بھانجے صاحب جو پچھلے سال آوارہ گردی اور غنڈوں کی صحبت کی بدولت فیل ہو چکے تھے اب پھر امتحان میں بیٹھ رہے تھے اور بہن کا خط آیا تھا کہ جیسے بھی ہو اس کی فیسوں کا حساب صاف کر دو۔ ادھر امتحان کی فیس بھی داخل کرنی تھی اور ساتھ ہی نئی کالی اچکن اور جوتے کی اسے اشد ضرورت تھی۔ اس لئے کہ یونیورسٹی کی طرف سے وہ انٹر یونیورسٹی یوتھ فیسٹیول میں جا رہا تھا۔ ذہین اور شوقین لڑکا بھرا صورت میں وجیہہ --- ایکٹنگ ایسی کرتا کہ لوگ عش عش کر اٹھتے۔ گانے کا ایسا رسیا کہ کوئی فنکشن ایسا نہ ہوتا جس پر اسے حصہ لینے پر مجبور نہ کیا جائے۔ اب ایسے ہردلعزیز صلاحیتوں والے لڑکے کو کیسے منع کر دوں کہ تم فیسٹیول میں نہ جاؤ۔ یا جاؤ تو وہاں پھٹے حالوں جا کر اپنی عزت خاک میں ملاؤ۔ میلے کرنے والوں اور میلوں میں بھیجنے والوں کو کیا معلوم کہ اس قسم کے تہذیبی پروگرام غریب ماں باپ کے لئے مصیبت اور غریب لڑکے لڑکیوں کے لئے ذہنی تکلیف بن جاتے ہیں۔ ادھر لڑکی کا موڈ خراب رہتا تھا کہ جب وہ گھٹیا سوتی کپڑے --- وہ بھی گھر کے دھلے --- پہن کر اسکول جاتی ہے تو استانیاں اور لڑکیاں اسے کیسی تحقیر یا رحم کی نظروں سے دیکھتی ہیں اور کھاتے پیتے گھرانے کی شوقین لڑکیاں اکثر اس پر فقرے اور پھبتیاں کستی ہیں۔ میں لاکھ سمجھاتا کہ بیٹی عزت کپڑے سے نہیں، سیرت سے ہوتی ہے۔ جب تم امتحان میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو گی۔ سارا اسکول تمہیں عزت اور قدر کی نظر سے دیکھے گا۔ مگر چودہ پندرہ برس کی نوعمر لڑکی جس کے دل میں ہزاروں امنگیں اور خواہشیں ابھرتی رہتی ہیں بھلا یہ سب کچھ کیا سمجھ سکتی تھی۔ ہر طرح اس کی ماں کی باتیں "یہی تربیت اصول صاحبزادے کو بھی تو سکھاؤ --- کہ فرسٹ ڈویژن لانے سے عزت بنتی ہے۔ نئی شیروانی جوتے اور گھڑی

سے نہیں۔ میں لاجواب ہو کر اور جھنجھلا جاتا۔

ہمت کر کے ایک دن میں نے بیوی سے کہہ ہی دیا "اے بی آج کیا تاریخ ہے؟" "تین ہے انگریزی مہینے کی۔" "تو پھر احمد کے میلے میں جانے کے بیس ہی دن رہ گئے۔ اب تو جلدی سے اس کی اچکن سلنے کے لئے دے دینی چاہیئے۔"

"کہاں سے بنے گی اچکن؟" بیوی نے چتر سا کھینچ مارا۔

کہیں سے بنے بنانا تو ہے ہی۔ بچارا کیسے پھٹی اچکن پہن کر تین ہزار طالب علموں کے میلے میں جائے گا۔"

"مگر تم نے کبھی یہ بھی سوچا کر کیا گھر میں روپیہ گھر جاتا ہے۔"

"تم تو خواہ مخواہ کی باتیں کرتی ہو۔ چاہو گی تو کہیں نہ کہیں سے قسمت ہی دو گی۔ آخر جب وہ پڑھ لکھ کر اچھی نوکری پائے گا تو ہمارے تمہارے ہی کام آئے گا۔ چھوٹے بھائی بہنوں کو تعلیم دلائے گا۔ شادی بیاہ کرے گا۔"

"اسے ہے بڑا کام آئے گا۔ جیسے آج یہ احساس نہیں کہ باپ کس طرح پیٹ کاٹ کاٹ کر اسے پڑھا رہا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے بیزے گھسیٹتے پھرتے ہیں اور اسے نیا کریپ سول جوتا چاہیئے۔ وہ سردی میں ایک معمولی سوئٹر کو ترسیں، انہیں پچاس روپے کی اچکن بنوائی جائے۔ مزدوری تو یہ ہے اور میرے بچوں کے کام آئے گا۔"

بیوی کی باتیں لاکھ سچی ہوں لیکن زہر میں بجھی ہوئی۔ مجھے غصہ آ گیا۔

"تم ہمیشہ جب میرے کسی عزیز کا معاملہ ہوتا ہے تو ایسی ہی باتیں کرتی ہو۔ ابھی اپنی اولاد کے لئے ضرورت ہوتی تو کہیں نہ کہیں سے روپیہ نکل آتا۔"

"ہاں ہاں میری اولاد تمہاری اولاد تھوڑا ہی ہے۔ ان کم نصیبوں کو تو بڑا عیش نصیب ہے نا! سعید کے پاس ایک گرم کوٹ تک نہیں۔ حامد ہے اس کے پاس چار جوڑے بھی ثابت نہیں۔ سنا ہے وہ بھائی بہنوں کے پرانے اُتارے ہی پر گذر کرتا ہے۔ پھر بھی اپنی اور پرائی اولاد کے تانے۔" اور بیوی نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔

"اچھا اچھا۔ بھئی معاف کر دو۔ مگر تم ہی بتاؤ میں کروں کیا؟ خیر کہہ دوں گا احمد سے کہ نہ جائے یونیورسٹی میلے میں۔"

بیوی جھٹک کر اٹھی۔ صندوقچہ کھولا پچیس روپے لا کر میرے سامنے پٹخ دیئے۔ "لو یہ تمہارے ہی کوٹ کے لئے جانے کیسے جتن کر کے جمع کئے تھے۔ اب جا کر لاڈلے قابل فاضل صاحبزادے کو دے دو، تاکہ بیٹے کی عزت قائم رہے۔ بلا سے باپ پھٹا کوٹ پہنے پھرتا ہے تو پھرے۔"

"خواہ مخواہ! میرا کوٹ تو اچھا خاصا ہے۔ مگر بھئی۔ تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ بھلا پچیس روپے میں اچکن؟"

"پہنے یا نہ پہنے۔ میرے پاس اب اور کچھ نہیں۔ یہی تو اسے کالج میں پڑھتے ہیں نا؟ آخر منصور بھی تو ہے۔ کس کس جتن اور محنت سے اپنا خرچ چلاتا ہے۔ کوئی ایک پیسے کا سہارا لگانے والا نہیں۔ ماں بہنوں کے لئے خود فاقے کر کے پیسہ بھیجتا ہے۔ جانتے بھی ہو یہ رئیس دادا کا پوتا کیسی کیسی مزدوریاں کرتا ہے۔ رات کو اسٹیشن پر جا کر مسافروں کا سامان ڈھوتا ہے کبھی کبھی رکشا کھینچتا ہے۔ طالب علموں کا ہوسٹل سے کھانا لاتا ہے۔ کسی کے بچوں کو پڑھاتا ہے۔ کسی کا سودا سلف لا کر دیتا ہے۔ تب جا کر کہیں اپنی روٹی کا خرچ چلاتا ہے۔ اور ماں بہنوں کو بھی دس پندرہ بھیجتا ہے۔ وہ بھی تو بی اے میں پڑھ رہا ہے۔ اس کے بھی تو دل ہے۔ بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ اس جھوٹی عزت اور دنیا دکھاوے کی طلب اس کو بھی تو ہو سکتی ہے۔ جانتے ہو تمہارے نواب صاحبزادے اس سے اپنا کمرہ صاف کراتے اور برتن دھلوانے کا کام لیتے اور اس کو معاوضہ میں چار روپے مہینہ دیتے ہیں۔"

اس کی یک جھک جب شروع ہو جائے تو ختم ہونا مشکل ہے۔ میں چپ چاپ پچیس روپے جیب میں ڈال کر باہر نکل گیا۔ عورت کے منہ کون لگے اور پھر وہ بھی جبکہ سچی باتیں کہہ رہی ہو۔

میں نے احمد کو روپے دیئے تو بجائے شکرگذاری کے اُلٹی اس کی ناراضی ہی سہنی پڑی۔ وہ اپنی مری ماں کو یاد کر کے رونے لگا تو میرا بھی دل بھر آیا۔ اور جب گھر واپس آیا تو باہر ہی سے دیکھا کہ بیوی منصور کی جیب میں کچھ نوٹ رکھ رہی ہے اور یہ دیکھ کر مجھے ایک دم سخت غصہ آ گیا۔ مجھے تو جھینک کر پچیس روپے دے گئے، اب اس غیر لڑکے کے لئے کہاں سے روپے نکل آئے۔ ہے نا آخر کو سوتیلی ماں۔

میں نے اس پر بھی غور نہیں کیا کہ منصور کتنا دبلا اور زرد ہو رہا ہے۔ اس کے کپڑے پہلے سے بھی زیادہ پرانے، چہرہ پریشان اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہیں۔

اس کے جاتے ہی میں برس پڑا۔ "اب یہ روپے کہاں سے نکل آئے

"احمد کے لئے روپیہ نہیں — اس غیر لڑکے کے لئے ہے — سوتیلی ماں بھی —"

مگر بیوی کا چہرہ دیکھ کر میں چپ ہوگیا — اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور چہرہ سُرخ۔ بہت ملائم لہجے میں اس نے کہا "آپ خواہ مخواہ ناراض نہ ہوں۔ میں نے مقصود کو شوق پیدا کرنے کے لئے روپیہ نہیں دیا۔ اس کے امتحان کی فیس اب تک جمع نہیں ہوسکی تھی۔ کل آخری تاریخ ہے۔ اس کی ماں کا خط آج ہی میرے پاس آیا تھا کہ اس نے لاکھ جتن کئے مگر کہیں سے روپیہ کا انتظام نہ کرسکی۔ اگر اس وقت میں اسے روپیہ نہ دیتی تو اس کا سارا مستقبل تباہ ہوجاتا — وہ امتحان نہ دے سکتا، اسے نوکری نہ ملتی۔ اس کی بیمار ماں مرجاتی۔ اس کی جوان بہنیں در در ماری ماری پھرتیں۔ اس کا چھوٹا بھائی بھیک مانگتا —"

میں کانپ اُٹھا — اُف میں کیوں مقصود کے حال سے بے خبر رہا۔ بیوی کے دل کی دردمندی کا آج مجھے پہلی بار اندازہ ہوا۔ کچھ شرمندگی تھی کچھ جھنجھلاہٹ تھی مگر مجھ میں یہ کھٹک باقی تھی۔ "مگر تمھارے پاس تو کچھ تھا ہی نہیں — پھر یہ روپئے کہاں سے آگئے؟"

"نجمہ کا بیاہ ہونے والا ہے" اس نے عجیب غیر متعلق سا جواب دیا۔

"ہاں — اور تم وہاں جانے کے لئے بے چین ہو۔"

"بے شک — اس لئے کہ اپنی بڑی بہن کی اس بچّی کو میں نے اپنی اولاد کی طرح پالا ہے۔ میں اس کی شادی میں نہ جاسکی تو خیر میرے دل پر جو بھی گزرے — مگر بے ماں کی بچّی کا دل —" اور اس کی آنکھوں سے آنسو اس طرح گرنے لگے جیسے کسی مالا کا دھاگا ٹوٹ گیا ہو۔

"ارے — ارے روتی کیوں ہو — تمھیں منع کس نے کیا ہے — یہ تو پہلے ہی طے ہوچکا ہے کہ تم وہاں جاؤگی۔ اس کے لئے تو میں نے تمھیں روپئے بھی دئے تھے —"

"مگر میں نہیں جارہی ہوں۔"

"کیوں آخر — میں نے تو منع نہیں کیا۔"

"وہ روپئے میں نے مقصود کو دے دئے۔" اور وہ روتے روتے مسکرا پڑی۔ اس کا چہرہ ایک اندرونی مسرّت سے منوّر ہوگیا — وہ نجمہ کے پاس جانے کو کس قدر بے قرار تھی۔ کسی قیمت پر بھی وہ اپنے اس ارادے کو چھوڑنے پر تیار نہ ہوتی — مگر — اب — اس کا یہ ایثار دیکھ کر میرے دل میں اس کی عزّت اور محبت کہیں زیادہ ہوگئی۔ جو عورت غیروں کے لئے یہ سب کرسکتی ہے وہ بھلا سوتیلے بیٹے کی بدخواہ کیسے ہوسکتی ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور جانے کیوں میری آنکھیں نم ہوگئیں۔

امتحانات ختم ہوچکے تھے۔ اب اس بے قراری سے نتیجے کا انتظار تھا کہ کسی عاشق کو اپنے محبوب کا بھی شاید نہ ہوتا ہو — بارے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ جلیلہ صاحب کا نام سارے اخبار میں کہیں نہ ملا۔ البتہ احمد اور مقصود دونوں سیکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہوگئے۔ احمد کو بہت سمجھایا مگر وہ بضد تھا کہ ایم اے کرے گا۔ مقصود نے نوکری کی تلاش شروع کی اور ساتھ ہی ٹائپ بھی سیکھنے لگا۔ بیوی چاہتی تھی کہ احمد بھی اب نوکری کرے مگر وہ اس پر راضی نہ ہوتا تھا۔ اس کی بات بھی سچ تھی کہ مرکھپ کر سو پچاس کی کلرکی اگر مل جائے تو بڑی بات ہے۔ بغیر کسی ٹریننگ یا ایم اے کے کوئی حیثیت کی ملازمت ملنا محال ہے۔ چناں چہ اس کے وظیفے اور کتابوں اور فیس کے لئے بیوی کا آخری زیور مہاجن کے گھر پہنچ گیا۔ مگر ان کو اطمینان تھا کہ جس دن احمد نے ایم اے کرلیا۔ ماں کو سب زیور پھر سے بنوا دے گا۔

اب مقصود بہت کم نظر آتا۔ صرف اس وقت آتا جب کسی سے سفارش کرانی ہوتی۔ وہ دن رات نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ ایمپلائمنٹ ایکسچینج میں پہلے ہی سے نام لکھا چکا تھا۔ اسکولوں، کالجوں، دفتروں میں جہاں کہیں کوئی جگہ ہوتی وہاں کوشش کرتا رہتا تھا۔ کتنے لوگوں سے سفارشی خط لے چکا تھا۔ مگر ہنوز روزِ اوّل کا قصہ تھا۔ جیب میں بی اے کی سند تھی۔ انگلیوں میں ٹائپ کی قابلیت تھی مگر نوکری نہ تھی۔ شاید اس کا مرجھایا ہوا چہرہ اُڑا رنگ، پھٹے کپڑے ملازمت ملنے میں مانع ہوتے تھے۔ یا پھر شاید دیس میں بی اے پاس نوجوانوں کی کثرت اور ملازمتوں کی کمی، بڑھتی ہوئی بے کاری اور بے روزگاری اس کا سبب ہو۔

وہ جیسے تیسے اپنے دن بتا رہا تھا۔ ملازمت کی بھاگ دوڑ جاری تھی اور ساتھ ہی اپنے اور اپنے خاندان کے پیٹ کے دوزخ میں ڈالنے کے لئے ایندھن کی بھی تو ضرورت تھی۔ ایک پروفیسر صاحب کی سفارش پر اُسے اُن کے دفتر میں چپراسی کی جگہ مل گئی تھی۔ دیکھنے والے تو خیر کیا سمجھ پاتے کہ اس مفلوک الحال نوجوان کی جیب میں بی اے کی سند موجود ہے۔ اس کا حال تو دوسرے چپراسیوں سے کہیں بدتر تھا۔ مگر خود اس میں ایک عجیب سی تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔

پہلے وہ محنت مزدوری کرتا ضرور تھا مگر اپنے ساتھیوں اور ہم جماعتوں کے سامنے اس میں احساسِ کمتری اور بڑھ جاتا تھا۔ اور مغموم و رنج اس کے چہرے پر جیسے موٹے موٹے حرفوں میں لکھا نظر آتا۔ مگر اب یہ شرم اور جھجک دور سی ہو گئی تھی۔ وہ سر اٹھا کر اس انداز سے چلتا جیسے اسے کوئی بہت بڑی عزت کی جگہ مل گئی ہو۔ اس کے دل میں کام کی عظمت اور خود اعتمادی کی جوت جاگ گئی ہو۔ اس کے ہونٹوں کی اداس مسکراہٹ جیسے طنز کرتی تھی ان کم ہمت اور بےحس نوجوانوں پر جو دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے اور ان کے پیچھے پریشان کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ چپراسی گیری کی نوکری کو باعثِ شرم سمجھتا ہے اس سماج کے لئے جس میں چودہ سال علم کی دیوی کی پوجا کرنے کے بعد بھی پجاری کو چالیس روپے کی چپراسی گیری کا بدلہ نصیب ہوا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کوئی صاحب دل اس کے دل کی ٹیس اور دماغ کی تپک کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

اور چند مہینے یونہی گزر گئے۔ ایک دن میں دفتر سے واپس آیا تو دیکھا کہ مقصود بیوی کے پاس پلنگ کے پائنتی بیٹھا ہے۔ اس کا سر جھکا ہوا ہے اور چہرہ ضبطِ گریہ کی کوشش میں سرخ ہو رہا ہے۔ جس کی آنکھیں کبھی سخت سے سخت وقت میں غمناک نہ ہوتی تھیں اس وقت مجسم گریہ تھا۔ بیوی کہہ رہی تھی "بیٹا جی چھوٹا نہیں کرتے۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ اب جلد ہی تمہاری انتظار کا پیمانہ آیا چاہتا ہے۔" مقصود نے بھرائی آواز میں دھیرے سے کہا "آپا اب مجھ سے یہ سب نہیں سہا جاتا۔ میں خود تو فاقے کر لوں۔ مگر ماں بہنوں کو بھوکے مرتے ـــــ آپا اب تو امید کا دامن ہاتھ سے چھوٹا جا رہا ہے۔" بیوی کی آنکھوں میں جو آنسو تھے اس لئے انھیں نہیں پونچھا کہ مبادا مقصود اسے روتا دیکھ لے۔ "نہیں نہیں ـــــ ناامید ہونا کم حوصلہ لوگوں کا کام ہے۔ تم جیسے صاحب عزم نوجوان اور ایسی بزدلی کی بات کریں۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ اور اپنی قابلیت پر ـــــ" میں کھنکھارتا ہوا اندر داخل ہوا تو دونوں چپ ہو گئے۔ کچھ دیر میں اس کا جی بہلانے کو ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ جب وہ جانے کو اٹھا تو ایک دم جھکا کر بیٹھ گیا۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور صورت حال سمجھ گئے۔

بیوی نے مقصود سے کہا ـــ "ارے جلدی کیا ہے چائے پی کر جانا ـــ" اور چائے کے بعد میں نے اسے کہا۔ "بھئی مقصود تمہیں ہوٹل کا کھانا موافق نہیں آتا ـــ تم کچھ دن تک یہیں کھانا کھا لو ـــ" مگر میرے اس جملے سے شاید اس کی خودداری کو ٹھیس لگی ـــ "نہیں نہیں اس تکلیف کی ضرورت نہیں۔ اور پھر دونوں وقت مجھے بہت دور سے آنا پڑے گا ـــ" اور وہ جلدی سے باہر نکل گیا اور ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ شاید دونوں کے دلوں میں ایک ہی جذبہ تھا ـــ مقصود کی خودداری اور عزتِ نفس کی قدر کا جذبہ اور ساتھ ہی درد کی ایک ٹیس ـــ کہ اس طرح فاقے کرتے کہیں یہ ہونہار نوجوان اپنی صحت اور زندگی سے ہاتھ نہ دھو بیٹھے۔

کوئی دو ہفتے بعد کا ذکر ہے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ باہر سے مقصود نے آواز دی۔ اس کی آواز میں کچھ ایسی لہک اور جان تھی کہ میں چونک پڑا۔ اور جب وہ اندر داخل ہوا تو اس کا ہنستا ہوا چہرہ مجھے بہت ہی دلکش معلوم ہوا۔ مرجھائے ہوئے چہرے پر سے یاس کے بادل چھٹ گئے تھے۔ آنکھوں میں امید کی لہریں ناچ رہی تھیں۔ ہونٹوں پر آشنا کی مسکان کھیل رہی تھی ـــ آواز میں امنگ اور حوصلہ کی کھنک تھی "آپا ـــ آپا ـــ" وہ کچھ اور نہ کہہ سکا اور بیوی نے جلدی سے جملہ پورا کر دیا۔ "مل گئی ـــ نوکری مبارک ہو ـــ لاؤ مٹھائی میں تو دلاؤں گی ـــ" مقصود کی آنکھوں میں خوشی کے آنسوؤں کی چمک تھی۔ میں نے اٹھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

وہ رات گئے تک بیوی کے پاس بیٹھا آئندہ زندگی کے منصوبے بناتا رہا اور میں سوچتا رہا ـــ مگر اسے ملا کیا ہے ـــ چند روپلی ـــ ایک سو تیس روپیہ کی یہ نوکری، جو مقصود، اس کے خاندان ـــ اور اس جیسے اور ہزاروں نوجوانوں کے لئے روکھی روٹی بھی مشکل سے فراہم کر سکتی ہے ـــ کب تک آخر کب تک ......؟

اور رات بھر یہ سوال میرے ذہن میں گونجتا رہا ـــ

ہیرالال چوپڑہ

حسن لو کا کاسۂ طلائی

ایران کے شمال مغرب میں آذربائیجان کے صوبے میں رضائیہ کی جھیل کے نزدیک حسن لو کے مقام پر ایک قدیم ٹیلے کی کھدائی کرتے ہوئے جمعرات ۲۸ اگست ۱۹۵۸ء کو ایک ایسا سنہری پیالہ ہاتھ آیا ہے جو ایران کی گذشتہ تین ہزار سال کی تاریخ پر روشنی تو ڈالتا ہی ہے لیکن ایران اور ہندوستان کے پرانے ثقافتی تعلقات پر بھی استناد کی مہر ثبت کرتا ہے۔ یہ پیالہ آج کل تہران کے عجائب خانہ کی زینت اور خواص و عوام کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔

یوں تو حسن لو کے اس ٹیلے کی کھدائی کا کام ۱۹۳۶ء میں آج سے ۲۲ برس پیشتر شروع کیا گیا تھا جس میں مٹی کے برتن اور چند ایسے کھلونے ملے تھے جن کی مہنجو داڑو اور ہڑپہ سے دریافت شدہ چیزوں سے مماثلت پائی جاتی تھی لیکن اُس وقت کسی نے اس طرف زیادہ توجہ منعطف کی بھی کیوں کہ وہ کھدائی محض تجارتی نقطۂ نظر سے کی گئی تھی تاکہ عجائبات کی فروخت کے لئے ایسے ظروف سفالی کو فراہم کیا جائے جو باستان شناسی اور آثار قدیمہ کے دلدادوں سے اچھی قیمت وصول کر سکیں۔

دو سال بعد ۱۹۳۸ء میں جب کہ دوسری عالمگیر جنگ کے خدشات اپنے پورے شباب پر تھے تو مشہور مستشرق سر آرل سٹائن نے جو محکمہ آثار قدیمہ پنجاب یونیورسٹی اور لاہور کے اورینٹیل کالج سے وابستہ رہ چکے تھے۔ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ لیکن کچھ اپنی پیرانہ سالی اور کچھ بین الاقوامی سیاست کی وجہ سے وہ اس کام کو زیادہ دیر تک جاری نہ رکھ سکے اور اس سے ہٹ کر انھوں نے اپنا شغل کشمیری زبان کی تفحص و تحقیق نیز کلہن کی راج ترنگنی کے انگریزی ترجمے کو بنا لیا۔ اس کھدائی میں اُن کے ہمرکاب آقای دکتر بہمن کریمی بھی تھے۔ پھر یہ ٹیلہ دس سال تک کس مپرسی کی حالت میں پڑا رہا لیکن اس کے مالک نے اس کی پوری حفاظت کا اہتمام برقرار رکھا تاکہ پرندوں کی زد سے یہ بچا رہے۔

۱۹۵۶ء میں تیسری کوشش کی گئی لیکن وہ بھی زیادہ کامیاب نہ ہو سکی البتہ ۱۹۵۸ء کی چوتھی کوشش امریکہ کی فلیڈلفیا یونیورسٹی کے عجائب خانہ سے وابستہ دو شخصیتوں ڈاکٹر ڈائسن اور ڈاکٹر ینگ اور ایران کے محکمہ باستان شناسی کے پندرہ ارکان نے مل کر گرمی کے موسم میں کی اور کھدائی کرتے ہوئے ۲۸ اگست کو اُن کے ہاتھ یہ پیالہ آیا جو ایران کے قدیم رسوم و رواج اور اُن کی ہندوستان کی رسوم سے مماثلت پر دلالت کرتا ہے۔ کھدائی کرنے والی اس ٹیم نے پہلے دامغان، رے اور کردستان کے مختلف علاقوں میں کھدائی کرکے ڈیڑھ لاکھ سال کے پرانے انسانی پنجر کو دریافت کیا تھا۔ انھوں نے ہوتو کی غار میں سے جو بحیرۂ مازندران کے نزدیک ہے اور ہمدان کے آس پاس ہے اس پنجر کو نکالا تھا۔ ایک سال بعد ۱۹۵۸ء کی گرمیوں میں اُسی ٹیم نے اسی کاسۂ طلائی کو دریافت کیا۔ اس پیالے کے متعلق دریافت کرنے والوں کا دعویٰ ہے کہ یہ تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح کی ساخت ہے کیوں کہ اس زمانے کے بعد کی چیزیں اُن کو اوپر کی تہوں سے ملی ہیں اور پیالے والی تہہ اُن کے عقیدے کے مطابق ضرور مسیح سے ایک ہزار سے پہلے کی ہے۔

یہ پیالہ ایک قدیم اینٹوں کی عمارت میں دستیاب ہوا ہے جہاں یہ ایک آدمی کے ہاتھ میں تھا اور اُس کے دوسرے ہاتھ میں ایک سنہری دستے کا خنجر تھا۔ اُس کے قریب ہی دو انسانی پنجر بھی پائے گئے ہیں جہاں ایک آدمی

ہاتھ میں خنجر لئے دوسرے کی پیٹھ میں بھونک رہا ہے اور قریب ہی ایک چاندی کا پیالہ بھی گرا پڑا ہے۔ جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کسی متمول شخص کے مکان کو لوٹا جا رہا تھا اور آگ لگ جانے سے آناً فاناً وہ تمام عمارت بیٹھ گئی اور اُس میں حملہ آور، مالک مکان یا مکان کے محافظ اور یہ خزانہ جس کے لالچ میں یہ تمام خنجر زنی اور ہاتھا پائی ہو رہی تھی وہیں مکان اور اس کے مکینوں کے ساتھ ہی سب دفن ہو گئے تھے اور تین ہزار سال تک دبے اور مدفون رہے۔ اس پیالے کی قیمت مغرب کے بازاروں میں بیس ہزار پونڈ (دو لاکھ ساڑھے سات ہزار [illegible]) جا چکی ہے لیکن اس کی قیمت اس کے اردگرد کھدی ہوئی نقاشی کی تصویروں کے باعث اس سے کہیں زیادہ ہے۔ کیونکہ ابھی تک ان تصاویر کی تفسیر و تشریح نہیں ہو سکی جن کی وضاحت کے لئے دنیا بھر کے باستان شناس اور آثارِ قدیمہ کے ماہر مصروفِ کار ہیں۔

اس پیالے کا ارتفاع ۲۱ سنٹی میٹر یا ساڑھے آٹھ انچ اور اس کے دہانہ کا قطر ۶۲ سنٹی میٹر یا ساڑھے چوبیس انچ ہے۔ پیالے پر تین قطاروں میں اُبھرے ہوئے نقش پائے جاتے ہیں اُس میں ایک رتھ کو بیل چلا رہا ہے اور ایک ایسا فرشتہ اُسے ہانک رہا ہے جس کے دونوں شانوں سے اُس کے شہپر اوپر کو اٹھے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ رتھ چلانے والے بیل کے منہ سے پانی بہہ رہا ہے اور فرشتہ ہاتھ میں تازیانہ لئے ہانک رہا ہے بیل کے سامنے ایک شخص تمام جسم پر اوپر نیچے کی ایک دھوتی باندھے ہوئے ہاتھ میں ایک برتن لئے کھڑا ہے۔ اُس کے بال اُوپر کی طرف بندھے ہوئے ہیں۔ فرشتے کی ڈاڑھی بھی ہے لیکن سر کے بال کسی دستار نما چیز سے بندھے ہوئے ہیں۔ اس رتھ کے پیچھے ایک دوسرا رتھ ہے جسے ایک رتھ بان ہانک رہا ہے اس کے بیل کو زین و استر سے باندھا گیا ہے اور اس کے پیچھے ایک شخص مینڈھے پر سوار اُلٹی سمت کو جا رہا ہے۔ دونوں رتھ بانوں اور مینڈھا سوار کے سر پر لمبے بال ہیں اور سب کی درمیانی قسم کی ڈاڑھی ہے۔ مینڈھے کے نیچے ایک شخص سر کے بالوں کو سنوارے ہوئے اور اُن پر شوجی کی طرح سے سانپ لپیٹے ہوئے، شانے پر ترکش لٹکائے اور ایک ہاتھ میں تیر اور دوسرے میں کمان لئے کھڑا ہے اُس کے سامنے ایک پرندہ ہے جس کی گردن کے ساتھ عقب میں انسانی چہرہ اور نیچے پروں میں سے نکلے ہوئے دو پاؤں دکھائی دیتے ہیں۔ پرندے کی دوسری طرف ایک شخص شیر پر زین کسے اور سواری کئے ہاتھوں میں کلہاڑی لئے بچا رہا ہے تیر و کمان سنبھالے انسان کے پیچھے ایک برہنہ عورت دونوں ہاتھوں سے ایک کپڑے کو پھیلائے ہوئے کھڑی ہے۔ اس عورت کے پیچھے ایک تین سروں والا اژدہا ہے جو اپنے منہ کھولے ہوئے ایک انسان کو کھانے کے لئے آمادہ ہے لیکن وہ مرد ہاتھوں میں ایک تلوار کے دستانے پہنے ڈٹ کر اُس کا مقابلہ کر رہا ہے۔ اُس شخص کے پاؤں میں ایک شیر سویا ہوا ہے۔ پیچھے ایک کرسی پڑی ہے۔ جس کے چاروں پائے چوپایوں کے سُموں کی شکل کے ہیں۔ اُس کرسی کے نیچے ایک ویسی ہی کرسی پر ایک شخص بیٹھا ہوا اپنے ہاتھوں کو آگے پھیلائے سامنے والے شخص سے بچہ لے رہا ہے اور اُس کے سر کے پیچھے تین برہنہ خنجر گھما رہے ہیں۔ شیر کے نیچے تین آدمیوں کی تصویر ہے جس میں دو آدمی تیسرے کے بال اور کان کھینچ رہے ہیں۔ پیالے کی نچلی تہہ میں شطرنج کے سے خانے بنے ہوئے ہیں جو ایک طرف دس اور دوسری طرف نو ہیں اور اُس شطرنج کی بساط کے چاروں طرف ایک ایک پہاڑی بکری ہے۔

اس پیالے کی تصویروں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ پُرانی آیلائی تہذیب کی مظہر ہیں۔ بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے نیک شگون دکھائے گئے ہیں۔ انسان کو اُس کی مخفی طاقتوں سے آگاہ کیا گیا ہے۔ جنگ کے دیس و دیہہ میں جب قحط پڑا تھا تو اُس نے خود ہل چلایا تھا اور اپنی رعایا کو خوشحال کیا تھا۔ لہٰذا یہاں بھی کوئی فرشتہ اہل زمین کی خوشحالی کے واسطے بیوں کو ہانک کر دو سروں کی رہنمائی کر رہا ہے اور سامنے ایک شخص ہاتھ میں ایک ظرف میں پانی لئے اُسے نیک شگون سے وداع کر رہا ہے۔ آج بھی پنجاب میں یہ عام رواج ہے۔ کہ جب کسی نیک کام کے لئے گھر سے نکلنا ہوتا ہے تو باہر کمہار یا بھنگی برتن میں پانی لے کر کھڑا ہو جاتا ہے تاکہ جانے والے کو اپنے مقصد میں کامیابی نصیب ہو۔ اژدھوں سے لڑنے والے انسانوں کے پاؤں میں شیر سوتے ہیں لیکن کاہلوں اور بے کاروں کے بال کھینچے جاتے ہیں اور اُن کی گوشمالی کی جاتی ہے۔ انسان وہ ہے جو نہنگ، اژدہے اور شیر نر سے لڑتا ہے اور تیر و کمان لے کر ہر آنے والی مصیبت کا مقابلہ کرتا ہے۔

اس پیالے کی تصویروں میں انسان کو شرفِ انسانیت سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اُس کو پیغامِ عمل دیا گیا ہے اور اُس کے ہاتھ میں تازیانہ دے کر گردشِ روزگار کو موافق بنانے کی تلقین کی گئی ہے۔ ہمت کرنے والا انسان گرڑ کی سواری کر کے آسمان تک پہنچ سکتا ہے۔ پیالے کی تہہ میں شطرنج کی بساط سے یہ

مترشح ہوتا ہے کہ ایسی تضیع اوقات کرنے والی بساطیں اپنے آپ کو متغرق کرنے والے بکریوں کی طرح سست ہوتے ہیں۔ مقابلہ ہو تو شیروں اور اژدہوں کو پسپا کرنا لازم ہے۔ لیکن جب گھر کا آرام اور چین کی زندگی ہو تو بیوی بچّے کے ساتھ خوشی سے کھیل کود میں منہمک ہونا انسانی فرض ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

گندھا بن کے بیل نت۔ رَد کوہ و بیاباں سے

گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

برہنہ عورت دونوں ہاتھوں سے بدن کا کپڑا پھیلائے اپنی عصمت و عفت اور نسوانی لطافت کی آئینہ دار ہے۔ سب آدمیوں کے لباس ایسے ہیں جیسے آج بھی پنجاب کے دیہات میں جاٹوں کے ہوتے ہیں۔ ہر شخص کے چہرے بشرے سے عزم و استقلال کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ شطرنج کا کھیل ہندوستان سے ایران کو بھیجا گیا تھا اور قدیم پہلوی کتب میں شطرنج کے بارے میں ایک کتاب چترنگ نامک کا بھی ذکر آتا ہے۔

ایران میں پرسیپولس (تخت جمشید) میں بھی بہت قدیم زمانے کے اور خاص طور پر ہخامنشی دور کے آثار بافراط پائے جاتے ہیں۔ ہاتھ میں پانی کا ظرف لے کر کھڑا ہونے والے شخص کے تمام نقوش اُس دور کے دریافت شدہ آثار میں پائے گئے انسانوں سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ اس لئے یہ کاسۂ طلائی ہخامنشی دور کے آس پاس کا ضرور ہے اور اُس زمانے کا ہے جب ایران اور ہندوستان کے آریائی نسل کے لوگوں کی روایات مشترکہ تھیں۔ ایک زردشتی عالم کا یہ خیال کہ اس پیالے میں زردشتی نشانات پائے جاتے ہیں، ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اس پیالے میں کہیں روشنی کا ذکر نہیں کہیں سورج یا آگ کا نام و نشان نہیں البتہ اُس وقت کی زرعتی عظمتوں کو ضرور اُجاگر کیا گیا ہے۔

مگر مغرب امریکہ کے مستشرقین نے کھدائی کر کے اس پیالے کی دریافت کی ہے اور توقع رکھنی چاہیئے کہ نزدیک مشرق کے باستان شناس اور آثار قدیمہ کے ماہر اس پیالے کے بارے میں تسلی بخش وضاحت کر کے اس کے نقوش کی خاطر خواہ ترجمانی کریں گے۔

شہاب اشرف

غزل

کیا کہیں یار وکیا کیا دل پر عشق خرابی لایا ہے
آنکھ سے لے کر دل تک جیسے ایک دھندلکا چھایا ہے

شاید اب کے یار تو اُن سے صلح نہ ہو اس جنگ کے بعد
اب کے اپنے آپ کو ہم نے سنجیدہ سا پایا ہے

ایسی کیا تھی تجھ سے شکایت، ایسا کیا تھا تجھ سے ملال
آج تری ادنیٰ سی عنایت دیکھ کے دل بھر آیا ہے

راہ سے تیری ہٹ جانے کا جب بھی ہم نے عہد کیا
ایک اک نقشِ قدم نے پہروں اُٹھ اُٹھ کر سمجھایا ہے

میری غزل کے آئینے میں دیکھ کے اپنا رنگِ جمال
کس کس ناز سے سر کو جھکا کر کیا کیا وہ شرمایا ہے

جیسے دھنک آکاش سے نکلے بادل کے چھٹ جانے پر
یونہی تیرے غم میں رو کر وقت سہانا آیا ہے

بیت گئی گو ایک قیامت لب پہ شکایت لا نہ سکے
آپ کو کیا معلوم کہ ہم نے جان کے دھوکا کھایا ہے

میری بات نہ سننے والے پوچھ لے اس سے حال مرا
ایک فسانہ آنسو بن کر پلکوں پہ تھرّایا ہے

مل جل کر رہنے کا سلیقہ اُٹھ سا گیا ہے لوگوں سے
دنیا کی اس ریت کو اکثر دیکھ کے جی گھبرایا ہے

رات حسینوں کے جھرمٹ میں کیا کیا ناز کے پھول کھلے
سازِ طرب کی چھیڑ سے لیکن اور بھی دل گھبرایا ہے

صفدر آہ

احساسِ حقیقت

علم اور عقل نے بس ایک ہی بتلایا راز
رائگاں عمر ہوئی اور نہ کچھ بھی جانا

زعم یہ تھا کہ مرے جام میں کھنچ آئے گی مے
لیکن اب تک ہے اُسی طرح تہی پیمانا

خود پرستی میں ہوا صرف مرا وقتِ عزیز
پھر بھی رونا ہے کہ اب تک نہیں خود کو جانا

یہ بھی افسوس کہ شل ہوگئے پائے امید
یہ بھی احساس کہ دو گام پہ ہے میخانا

علمِ افلاک و زمیں پا کے بھی یہ حالت ہے
جیسے خرمن سے کوئی ایک اُٹھا لے دانا

سخت کوشش سے بھی حل ہو نہ سکا عقدۂ زیست
اُنگلیاں تھک گئیں سلجھا نہیں تانا بانا

دل یہ کہتا ہے کہ ناکام سہی میں لیکن
ان دُھندلکوں کی تہوں میں ہے کوئی افسانا

جیسے اک طفل سرِ ساحلِ دریائے محیط
ہے کھڑی غرقِ تحیّر مری فکرِ دانا

اعجاز صدیقی

غزل

رُخ پہ نگاہ، دل کی خبر کوئی بھی نہیں
سب کم نظر ہیں، اہلِ نظر کوئی بھی نہیں

کیا چیز ہے یہ ضبطِ الم اے نگارِ وقت
چہرے پہ درد و غم کا اثر کوئی بھی نہیں

اہلِ جنوں کی بے خبری بھی عجیب ہے
سب کی خبر ہے، اپنی خبر کوئی بھی نہیں

جس پہ قدم جنونِ وفا کے پڑے نہ ہوں
اے دوست، ایسی راہگذر کوئی بھی نہیں

ہیں سنگ بارِ دل کے مقابل ہزار ہا
آئینہ ساز، آئینہ گر کوئی بھی نہیں

شمعیں قدم قدم پہ فروزاں ہوئی تو ہیں
لیکن دلیلِ رنگِ سحر کوئی بھی نہیں

اس ربطِ ناشناس کو کیا نام دیجیے
محفل میں اُن کی سب ہیں، مگر کوئی بھی نہیں

اعجاز یہ نوازشِ اہلِ ہنر تو دیکھ
تو نے کہا تھا، قدرِ ہنر کوئی بھی نہیں

ہری کرشن

رباعیاتِ جگر بریلوی

رباعیات پر تبصرہ کرنے سے پہلے جناب جگر کا تعارف کرانا نہایت ضروری ہے۔ حضرت شام موہن لال جگر بریلوی کا دورِ حاضرہ کے قابل ترین شعرا و استادانِ فن و اساتذہ میں شمار ہے ۱۸۹۰ء میں آپ بریلی کے ایک نہایت متموّل اور علم پرور سکسینہ کایستھ خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد جناب رائے کنہیا لال صاحب جیّد عالم اور درویش صفت انسان تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ انگریزی اور فارسی کے عالم اور شاعرِ باکمال تھے۔ اسی لئے جگر صاحب قدرتی طور پر نہایت ذہین، ذکی، متین، قانع، عالم اور اعلیٰ درجہ کے شاعر ہیں یہ تمام صفاتِ حمیدہ آپ نے ورثہ میں پائی ہیں۔ آپ نے ۱۹۱۱ء میں ڈی بوآئی ایم ہائی اسکول سے جس کو اب تک انٹر کالج کہتے ہیں انٹرنس اور ۱۹۱۶ء میں بریلی کالج سے بی۔ اے، انگریزی ادب، فارسی ادب اور فلسفے میں پاس کیا ۱۹۱۸ء میں آپ نائب تحصیلداری کے معزز عہدے پر مقرر ہوئے۔ لیکن آپ کو افسروں کی بے جا خوشامد، دربارداری اور ضمیر فروشی سے قدرتاً نفرت تھی۔ اس لئے نائب تحصیلداری سے آگے نہ بڑھ سکے اور ۱۹۴۳ء میں اسی عہدے سے بوجہ خرابیِ صحت پنشن لے لی۔ ملازمت ہمیشہ آپ کے لئے بار خاطر رہی چنانچہ اپنی ایک رباعی میں فرماتے ہیں۔

مشکل کوئی چاکری سے خدمت ہی نہیں بدتر کوئی نوکری سے لعنت ہی نہیں
نااہلوں کی بندگی پہ ہونا مجبور اس سے بڑھ کر جگر اذیت ہی نہیں

آپ کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:۔

پپیہا اور پی کہاں۔ جو ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی۔

یادِ رفتگاں۔ جو خالص ریسرچ ہے ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی۔

رنگ و بو۔ جو تین مثنویوں کا مجموعہ ہے:۔ (ا) پریم کہانی جس میں شبری کی سخت ریاضت اور شری رام چندر جی کا اس کو درشن دینے کا حال ہے (ب) کرشن سداماں اور (ج) بسنتی روداد۔ یہ ۱۹۵۲ء میں طبع ہوئی۔

کایستھ درپن۔ جو ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔

پیام ساوتری۔ جو ۱۹۵۵ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی۔ اس مثنوی پر یو۔ پی گورنمنٹ نے جگر صاحب کو پانچ سو روپے بطور انعام عطا کئے

صحت زبان۔ جو ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ شعرا کے پڑھنے کے لئے قابل قدر تصنیف ہے۔

جناب جگر کی مندرجہ ذیل تصانیف زیر طبع ہیں۔

دو آتشہ۔ جگر صاحب کے خودنوشت حالاتِ زندگی اور اپنی غزلوں پر تبصرہ۔

جدید غزلیں جو تقریباً پانچ سو صفحات کی کتاب ہے

روحِ جگر۔ یعنی انتخاب غزلیاتِ جگر۔

اب ہم جگر صاحب کی رباعیات پر نظر ڈالتے ہیں۔ آپ نے گھر کے معاملات سے لے کر اعلیٰ درجہ کے روحانی مضامین تک ہر قسم کے مضمون پر رباعیاں لکھی ہیں۔ یہ روزانہ کا تجربہ ہے کہ گھر میں چھوٹے بچوں کی وجہ سے بڑی چہل پہل اور رونق رہتی ہے۔ ان کی عدم موجودگی میں سناٹا سا چھایا رہتا ہے والدین کی دنیا اور ان کی تفریح کا مرکز بچے ہی ہوتے ہیں۔ ان حقیقتوں کو مدِنظر رکھ کر رباعیاتِ ذیل کو دیکھئے جو جناب جگر نے اپنی چھوٹی بچی پشپل کی بابت لکھی ہیں۔

کیسی سنسان ہو رہی ہے دُنیا ساری تنویر کھو رہی ہے دُنیا
تاریکیٔ دہر کے نہ پوچھو اسباب پُتلی سوتی میں سو رہی ہے دُنیا

کیفیتِ نور جلوہ گر ہوتی ہے دُنیا گلزارِ سر بسر ہوتی ہے
پُتلیں کے دم سے ہے منوّر عالم پُتلی جاگی ہیں اب سحر ہوتی ہے

قدرتی مناظر پر اکثر شعرا نے نظمیں کہی ہیں۔ حضرت جگر نے بھی پپیہا، پی کہاں وغیرہ بہت سی نظمیں قدرتی مناظر پر لکھی ہیں جو اردو کے موقر رسالوں زمانہ، نگار وغیرہ میں شائع ہو کر خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں ان رباعیات میں فطرت کی عکاسی ملاحظہ ہو ؎

بادل کی گھٹاؤں میں شفق کا ہے ظہور پھیلا ہوا ہے سنہری کرنوں کا نور
یہ سبزہ و گل یہ رنگ و بُو کا عالم فطرت کی پرستشوں پہ دل ہے مجبور

چھائی ہوئی سر سر سی گھٹا کالی ہے پھیلی ہوئی ہریالی ہی ہریالی ہے
پانی جھیلوں میں ہے کہ رنگِ سیماب کیا رنگ شفق کھڑے کیا لالی ہے

چھائی ہوئی ہیں گھٹائیں اُٹھتی ہے پھوار شاداب کئے ہے دل کو سبزے کی بہار
موجیں ہیں شراب کی ہوا کے جھونکے ذرّہ ذرّہ شباب سے ہے سرشار

اُترے اُٹھی ہیں کیا گھٹائیں گھنگھور جنگل میں پپیہے ہیں کوئل اور مور
سبزہ کیسا لہک رہا ہے ہر سو طغیانِ شباب یا ہوا کا ہے زور

ہوا کے زور کی طغیانِ شباب سے تشبیہ کس قدر نادر ولطیف ہے۔

فلسفۂ عمل اور دنیا میں انسان کو کس طرح رہنا چاہئے اس کی بابت حضرت جگر کے نصائح جو آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں ملاحظہ ہوں ہماری زندگی کی زندگانیاں ہمارے خیالات کے نتیجے ہیں۔ سینکڑوں خیالات دماغ میں آتے جاتے رہتے ہیں مگر وہ کوئی خاص اثر پیدا نہیں کرتے مگر جن خیالات کا اعادہ بار بار ہوتا رہتا ہے وہ رفتہ رفتہ پختہ ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی پختگی کے بعد ہم ان کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ اسی نکتے کو مدِ نظر رکھ کر مقدس و متبرک کتابوں کو بار بار پڑھنے کی ہدایت اور عمدہ اشعار و نصائح کو اپنے کمروں میں آویزاں کرنے کی نصیحت کی گئی ہے تاکہ ان کو بار بار پڑھنے سے زندگی بہتر بن سکے۔ حضرت جگر کی رباعیاتِ ذیل بھی اس ذیل میں درج ہیں کہ گھروں میں آویزاں کی جائیں تاکہ ہر وقت نظر کے سامنے رہیں اور پڑھی جا سکیں ؎

نادان ہیں زندگی پہ مرنے والے ٹھہرے ہیں بھلا کبھی گزرنے والے
جینا ہے اگر تو کام کرنا سیکھیں زندہ رہتے ہیں کام کرنے والے

ہر لحظہ رہے جو بے ثباتی کا خیال پہنچے ہم سے کسی کو ایذا نہ ملال
چلنے لگیں خود بخود حقیقت کی راہ لغزش کرنا قدم کو ہو جائے محال

اپنوں کی حمایت کا طلبگار نہ ہو غیروں کی طبیعت پہ کبھی بار نہ ہو
پھولوں کی مثال رہ عزیزِ خاطر کانٹوں کی طرح در پئے آزار نہ ہو

تدبیر و عمل سے زندگانی ہو تمام تکمیلِ صفات ہی بشر کا ہے کام
جینا کیا ہے دماغ و دل کی اصلاح ہے زندگی خود ہی زندگی کا انعام

اس رباعی کے فلسفیانہ انداز پر غور کیجئے کتنے سادہ الفاظ میں کتنی گہری بات کہی ہے دوسرے شعر کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

یہ رنگ زمانے کا بدل جاتا ہے پل مارتے سر دور نکل جاتا ہے
جو کام بھی کرنا ہے جگر کر ڈالو کیا سوچتے ہو وقت نکل جاتا ہے

راحت ہو کہ رنج کچھ نہ کہنا سیکھیں دریا میں مثالِ مُردہ بہنا سیکھیں
جس کی درگاہ میں پہنچنا ہے جگر اُس کی مرضی پہ شاد رہنا سیکھیں

عام طور پر انسانوں کی زندگیاں جس طرح گزر رہی ہیں اُس کا نقشہ ملاحظہ ہو ؎

بچپن میں تو عقل ہی نہیں آتی ہے آتی ہے جوانی تو ستم ڈھاتی ہے
کٹتی تو ہے پیری میں کچھ نیکیاں جینا آتے ہی موت آ جاتی ہے

ذیل کی رباعی کس قدر سبق آموز و مؤثر ہے۔ دل پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے ؎

بچپن میں نشاط و شادمانی اچھی نیکی میں جو گزرے وہ جوانی اچھی
تکمیلِ فنا میں ہو پیری ہو صرف اس طرح کٹے تو زندگانی اچھی

ہندو مذہب کے مسئلۂ تناسخ کی تشریح ذیل کی رُباعی میں کتنے فلسفیانہ دل کش انداز میں کی ہے۔

ادراک سے باہر نہیں جاتا ہے خیال   پابندِ خیال ہوتے ہیں سب اعمال
ادراک، خیال اور اعمال جگرؔ   انسان کی قید کے لئے ہیں کیا جال

دی خواب ہواست اور ذریعہ قیاس   مردِ کار رکھ جتنا ہو ممکن احساس
کر ہوش و حواس سے چمن کو سیراب   ہے زندگی جب تک ہیں بجا ہوش و حواس

بزرگوں کی تعظیم کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

مسعود بزرگوں کا قدم ہوتا ہے   سایہ میں سلف ہی کے ارم ہوتا ہے
برحق ہے انھیں قبلہ و کعبہ کہنا   سجدے کے لئے ناصیہ خم ہوتا ہے

سیاسی آزادی کے ساتھ جو نقائص اہلِ ہند پر عائد ہو گئے ہیں ان کی بابت رقم طراز ہیں ؎

ہندی ہو ہی گیا ہے تو خود مختار   ہو جا اب امتحاں کو بھی تیار
آساں نہیں ہے راہ آزادی کی   تلوار کی دھار ہے یہ تلوار کی دھار
نیکی کو جلا دینے کو تیار بھی ہو   بدیوں کو مٹا برسرِ پیکار بھی ہو
دونوں ہاتھوں میں ہوں ترقی کے نشاں   امرت کا پیالہ بھی ہو تلوار بھی ہو

اب خود جگر صاحب کی زبانی حقیقی شاعر کی تعریف سُنئے ؎

شاعر سے بڑی نہیں ہے ہستی کوئی   اس کی سی کہیں نشہ و مستی ہی نہیں
شاعر ہو کر غرض کسی سے رکھے   ذلت نہیں اس سے بڑھ کے پستی ہی نہیں
شاعر شاعر ہے گرچہ یکتا ہے وہ   خضرِ رہِ رسمِ دین و دنیا ہے وہ
ہے اس کا وقار نفسِ گیتی کا وقار   جان و دلِ کائنات عنقا ہے وہ

حضرت جگر نے روحانی مسائل پر بھی خوب روشنی ڈالی ہے بعض اوقات تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنا ذاتی تجربہ بیان فرما رہے ہیں۔

کر جاتی ہے کچھ کام اگر عقلِ رسا   ہوتا ہے جو تدبیر سے عقدہ کوئی وا
ہستی کے قیود بھول جاتا ہے بشر   اپنے کو سمجھتا ہے کہ ہوں میں ہی خدا

اس رُباعی میں انانیت کی کتنی عمدہ تصویر کھینچی ہے۔

عرفان کے موضوعات پر رُباعیاں ملاحظہ ہوں ؎

پنہاں کب تک رہے گا پیدا ہو جا   اپنی ہستی پہ آپ شیدا ہو جا
تو پرتوِ حسنِ لایزالی ہے جگر   آئینۂ قلب پر ہویدا ہو جا

جب ٹوٹ کے دل گداز ہو جاتا ہے   غرقِ کیفِ نیاز ہو جاتا ہے
کیفیتیں ہو جاتی ہیں طاری ایسی   گویا درِ خُلد باز ہو جاتا ہے

جب رنج سے جی نڈھال ہو جاتا ہے   جب حد سے سوا ملال ہو جاتا ہے
محویتِ غم سے دل کی گہرائی میں   محسوس ترا وصال ہو جاتا ہے

حضرت جگر حقیقی عارف کی شناخت بتاتے ہیں۔

عارف ہے وہی یہی ہے اُس کی پہچان   کھولے جو نہ گفتگوئے عرفاں میں زبان
اُس کی صحبت میں دل کو حاصل ہو سکوں   اس کی قربت میں آ کے روشن ہو جہان

یہ پیشتر عرض کیا جا چکا ہے کہ قناعت، توکل، استغنا، ایمانداری وغیرہ درویشانہ صفات حمیدہ جناب جگر کی ذات میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس لئے اُن کی اکثر رُباعیاں عمر خیام و سرمد وغیرہ کی رُباعیوں سے ہمسری کا دعوےٰ کرتی ہیں۔ اس قسم کی کچھ رباعیاں بطورِ مشتے نمونہ از خروارے ذیل میں پیش کی جاتی ہیں ؎

گلشن ہیں مرے حسنِ خود آرا کے لئے   صحرا ہیں جنونِ دشت پیما کے لئے
محتاج مری نظر کے دریا اور کوہ   دنیا میرے لئے میں دُنیا کے لئے

دولت پہ نہیں ہے کامرانی موقوف   عشرت پہ نہیں ہے شادمانی موقوف
مضمر ہے محبت میں مسرت کا راز   صحت پہ ہے لطفِ زندگانی موقوف

تدبیر و عمل ہیں زندگی کا گہنا   اعضا نہ چلیں تو کچھ زباں سے کہنا
ہستی کا مدار کیا ہے؟ حرکت ہے جگر   زندہ رہنا ہے کام کرتے رہنا

آزاد ضمیر گر ہے آزاد ہیں ہم   کیا غم ہے جو خستہ حال و برباد ہیں ہم
سینہ ہے جگر کدورتوں سے خالی   ہاں شاد ہیں ہم اور بہت شاد ہیں ہم

انساں اک عقدۂ جمادات سے ہے   عالم عالم اُسی کے حالات سے ہے
جینے سے غرض ہے انکشافاتِ حیات   دنیا عقبیٰ انھیں کمالات سے ہے

حاصل ہیں تجھے عیش کے سارے اسباب   چلتا ہے دورِ جام۔ بجتا ہے رباب
پیاسوں کے نام پر چڑھا دے دو بوند   اچھا ہے جو ہو جائے کوئی کارِ ثواب

جس سے درِ خلد دل میں ہوتا ہے باز   صد مایۂ ناز جس سے ہوتا ہے نیاز
افسردۂ انگور نہ اُس مے کو سمجھ   سینے کا گداز ہے وہ سینے کا گداز

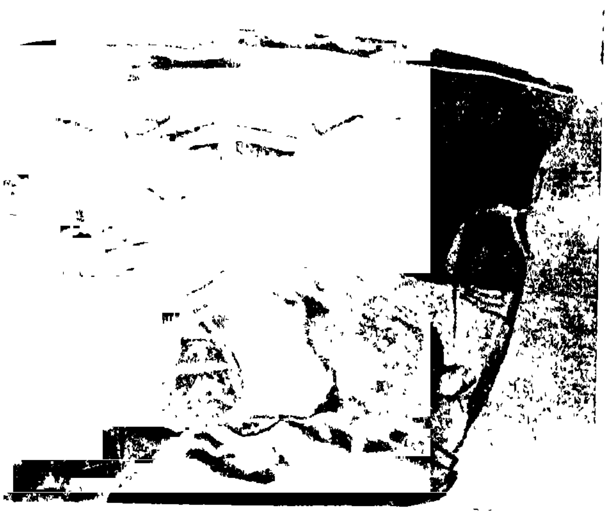
رگ رگ میں کیفِ مے سمو دے ساقی   ہوش اور حواس کو بھی کھو دے ساقی
اُٹھتی نہیں تہمتِ شعورِ ہستی   طوفانِ شراب میں ڈبو دے ساقی



امریکہ کے سابق وزیر خارجہ
مسٹر جان فاسٹر ڈلس
جن کا حال ہی میں انتقال ہو گیا



حسن لو کا کاسۂ طلائی
اس سے متعلق پروفیسر ہیرا لال چوپڑہ
کا مضمون صفحہ ۱۶ پر ملاحظہ فرمائیں









جنگل






کے باسی



دلّی میں محرّم الحرام

شفقت رضوی

مولوی فیض آباد

(جنگِ آزادی کا ایک بھولا ہوا سپاہی)

۱۸۵۷ء کی گھن گرج شروع ہونے سے قبل ایک دُبلا پتلا لمبے قد کا انسان جس کے چہرے پر شریعت کے مطابق نورانی داڑھی تھی فیض آباد کی گلیوں میں گھومتا پھرتا نظر آیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک ذہن کی تیزی کی غمازی کر رہی تھی۔ اس کی رفتار میں استقلال اور استحکام کا پرتو تھا تو تیور عزائم کو آشکار کر رہے تھے۔ ہچی سن کے کہنے کے مطابق وہ فروری ۱۸۵۷ء میں فیض آباد میں داخل ہوا۔ گبن کا کہنا ہے کہ وہ اپریل میں فیض آباد آیا۔ اس کے گرد جانثاروں کا ایک گروہ کثیر جمع ہو گیا۔ جن کے دلوں میں انقلاب کے حوصلے اور دماغوں میں لڑ مرنے کے منصوبے تھے۔ فیض آباد کے عوام نے اسے اس طرح سر آنکھوں پر لیا گویا وہ بے تاج کا بادشاہ تھا یہ تھا مولوی احمد اللہ شاہ۔

مولوی احمد اللہ شاہ تاریخ انقلاب کا بہت بڑا ہیرو پہلی جنگِ آزادی کا ایک نڈر اور باحوصلہ سپاہی — انقلاب کے دوران احمد اللہ شاہ کے کارنامے تاریخ کے صفحات پر بکھرے پڑے ہیں۔ لیکن ان کی زندگی کے ابتدائی حالات پوری طرح سامنے نہیں آ سکے۔ تمام مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ ان کا تعلق ریسیڈنسی سے تھا۔ ہچی سن اور گبن ارکاٹ کو ان کا وطن بتلاتے ہیں۔ لیکن ایک ہندوستانی تذکرہ نویس مفتی انتظام اللہ نے چنیا پٹن کو ان کا وطن ظاہر کیا ہے۔ موصوف کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ احمد اللہ شاہ کا تعلق گولکنڈہ کے شاہی خاندان سے تھا۔ وہ ابوالحسن تانا شاہ کے پڑپوتے تھے۔ نظام دکن کی حمایت میں مرہٹوں سے بھی برسرپیکار رہ چکے تھے۔ اور ان کے مقابلہ میں کامیابیوں کے صلہ میں ریاست کی طرف سے ایک بڑے عہدہ کی پیش کش کی گئی تھی لیکن انھوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ اپنے وطن میں وہ دلاور جنگ نواب احمد علی شاہ کہلاتے تھے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ انگریزوں کے خلاف عزم جہاد نے انھیں وطن سے بے وطن کیا لیکن ساورکر نے بغیر کسی حوالے کے لکھا ہے کہ مولوی فیض آباد کے تعلقہ داروں میں سے تھے۔ جن کی جائداد فرنگی ظلم و ستم کی نذر ہو جانے پر انھوں نے روحِ انقلاب کو اپنایا اور عہد کیا کہ ملک کو فرنگی راج سے آزادی دلانے کے لئے اپنی زندگی کی بازی لگا دیں گے۔

یہ زمانے کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ ان کے نام کے بارے میں بھی مختلف آراء ملتی ہیں۔ خود ان کے دور کے انگریز مورخین ان کے نام الگ الگ بتلاتے ہیں اور ہر ایک نے اپنے بیان کی مختلف شہادتیں بھی پیش کی ہیں۔ ہومس نے ان کا نام عماد اللہ لکھا ہے۔ ممکن ہے یہ نام روایتاً اس تک پہنچا ہو اور اپنی اصلی شکل بدل چکا ہو۔ بعض نے ان کا نام سکندر شاہ بھی لکھا ہے جو کسی طرح باور نہیں کیا جا سکتا۔ ہچی سن نے ایک پروانۂ راہداری کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس کی مہر پر ان کا نام احمد اللہ ہے۔ بعد میں عقیدت اور اختصار نے انھیں "مولوی" ہی بنا دیا۔ چنانچہ ۲۳ جون ۱۸۵۷ء کے دہلی گزٹ میں ان کی موت کے بعد جو خبر شائع ہوئی تھی اس میں صرف "مولوی" ہی لکھا گیا۔ لیکن زیادہ تر انھیں "مولوی فیض آبادی" ہی کہا جاتا ہے۔ مولوی نے انقلاب کی تیاریوں میں اتنا ہی کام کیا جتنا کہ عظیم اللہ یا

ناناصاحب نے کیا تھا۔ وہ اپنے وطن سے نکل کر شمالی ہند کے گوشے گوشے میں پھرتے رہے۔ انقلابی سوسائٹیاں قائم کیں۔ فرنگی استبداد اور اس کے ہتھکنڈوں کو عوام کے سامنے آشکار کر کے انھیں باعزت موت کے لئے تیار کیا۔ فرنگی چنگل سے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے انقلاب کے معماروں کے ساتھ مل کر تبادلۂ خیال کیا۔ منصوبے بنائے اور ہندوستان کا دورہ کر کے جگہ جگہ اپنی تقریروں سے بغاوت کی سوکھی گھاس میں چنگاری کو بھڑکایا۔ خفیہ انجمنیں قائم کیں اور انقلاب کے لئے ہر قسم کے ہتھیاروں سے کام لیا۔ ان کی شعلہ نوائی اور پُرجوش تحریروں نے ہندوستان میں نئی روح پھونکی۔ ان کی تقریروں میں ہزاروں آدمی ہندو اور مسلمان جمع ہو جاتے چنانچہ آگرہ کی تقریر میں دس ہزار کا مجمع تھا۔ کین نے لکھا ہے کہ ان کی سرگرمیوں کی وجہ سے انھیں آگرہ سے شہر بدر کیا گیا تھا۔ اور جب میدان میں اترنے کا وقت آیا وہ نوجوانوں کی اگلی صف میں نظر آئے ایک منجھے ہوئے جنرل کی طرح جنگ کے نقشے بناتے اور ان کی تلوار ایک قہر بن کر دشمنوں کے سروں پر منڈلاتی۔

انقلاب کی آگ ابھی بھڑکنے بھی نہ پائی تھی کہ مولوی نے انگریزوں کو للکارا۔ ان کی تقریروں نے فرنگیوں کے ہوش اڑا دیئے۔ آنے والے خطرہ کو ٹالنے کے لئے انگریزوں نے انھیں پابجولاں کرنا چاہا لیکن ان کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ پولس نے ان پر ہاتھ ڈالنے سے انکار کر دیا۔ لیکن کسی نہ کسی طرح وہ گرفتار کر لئے گئے اور انھیں فیض آباد کی جیل میں کڑی نگرانی میں رکھا گیا۔ ان پر بغاوت پھیلانے کا الزام لگا کر مقدمہ چلایا گیا اور موت کی سزا تجویز کر دی گئی۔ انگریز انھیں جیلخانے بھیج کر ایک طرح مطمئن ہو گئے لیکن مولوی وہاں بھی پُراُمید رہے ان کے عزائم کو فرنگی استبداد چکنا چور نہ کر سکا۔ وہ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں بھی اُبھرتے ہوئے انقلاب کی کرنوں کو محسوس کرتے رہے۔ موت سے ہمکنار ہوتے ہوئے بھی انھیں اطمینان تھا کہ اس جدوجہد میں انھوں نے اپنا حصہ ادا کر دیا ہے۔ چنانچہ کرنل لی نکس سے انھوں نے جیل میں حقہ پینے کی اجازت چاہی۔ کرنل نے ان کے لئے حقہ بھی فراہم کر دیا۔ قدرت ان کی سزائے موت پر صرف مسکرا کر رہ گئی کیونکہ وہ مولوی کی موت ان فرنگیوں کے ہاتھوں نہیں چاہتی تھی۔ موت کا حکم سنانے والوں کو یہ سبق دینا چاہتی تھی کہ موت ان کے ہاتھ کا کھلونا نہیں ہے۔ ایسا خوددار جو فرنگی سایہ میں جینا نہیں چاہتا اس کی انھیں ہاتھوں سے موت خودداری کی شکست تھی۔

انگریز اپنی دانست میں مولوی کو سزائے موت کا حکم سنا کر انھیں پھانسی کے تختے پر پہنچا چکے تھے کہ اتنے میں بنارس کی ان خبروں سے فیض آباد لرزنے اٹھا کہ وہاں سپاہیوں کو نہتا کر کے گولی مار دی گئی۔ اپنے ہم وطنوں کے قتلِ عام کا غصہ اور مولوی جیسی ہردلعزیز ہستی کے قید کے غم نے فیض آباد کی فضاؤں کو انقلابی نعروں سے دہلا دیا۔ تلواریں میانوں سے نکل پڑیں۔ بندوقوں کے دہانے کھل گئے۔ سپاہیوں نے انگریزوں کے احکام کی تعمیل سے انکار کر دیا پریڈ گراؤنڈ پر انگریز عہدہ دار فیض آباد میں متعینہ ۲۲ ویں رجمنٹ کی پریڈ لے رہے تھے کہ سپاہیوں نے ان کے احکام ماننے سے انکار کر دیا۔ اور صوبیدار دلیپ سنگھ کو اپنا افسرِ اعلیٰ بنا لیا۔ تمام انگریز فوراً گرفتار کر لئے گئے۔

اقتدار سے انحراف کے ساتھ ہی عوام نے جیل کے دروازے کھڑکھڑائے مولوی کی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں نے کروٹ لی اور وہ مسکراتے ہوئے جیل کی سلاخوں سے باہر آئے۔ مولوی نے نہ صرف انگریزوں کے منصوبوں کو شکست دے دی تھی بلکہ موت کا بھی ایک بار منہ پھیر دیا تھا۔ مولوی کی موت کی گھڑیاں گننے والوں کی زندگیاں اب ان کے ہاتھ میں تھیں۔ لیکن انھوں نے انقلابیوں کی قیادت قبول کرتے ہی کرنل لی نکس سے اپنی موت کی سزا کا بدلہ چکا دیا اور انھیں مشورہ دیا کہ وہ جان بچا کر دوسرے انگریزوں کے ساتھ فوراً وہاں سے چلے جائیں۔ ان فرنگیوں کے لئے زادِ راہ اور دوسری سہولتیں بھی فراہم کر دیں کشتیاں تیار کروا دیں۔ ضروری سامان ساتھ کر دیا اور مشرق و مغرب کے کردار کا کھلا فرق بتلا دیا حالاں کہ فوج انگریزوں کی جان بخشی کی مخالف تھی پھر بھی مولوی کی شخصیت اور ان کے حکم کے آگے فوجیوں کو سرِ تسلیم خم کر دینا پڑا۔ اسی دوران میں چنہٹ کی جنگ کے بعد انگریزی اقتدار مکمل طور پر اودھ سے ختم ہو گیا۔

۹ جون کی صبح اودھ کے لئے آزادی کا پیغام لے کر آئی۔ پوری سرزمین غیر ملکی اقتدار سے پاک ہو چکی تھی۔ اعلانِ آزادی کر دیا گیا۔ فضا میں اودھ کا شاہی پرچم لہرانے لگا۔ نواب اودھ کے پامال خاندان کو کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ نصیب ہوئی۔ واجد علی شاہ انگریزوں کی حراست میں کلکتہ میں تھے۔ اس لئے ان کے لڑکے برجیس قدر کو اتفاقِ رائے سے لکھنؤ میں گدی نشین کیا گیا۔ ان کی کم عمری کی وجہ سے ان کی ماں امراؤ بیگم حضرت محل حکومت کے کاروبار کی نگراں مقرر ہوئیں۔ حضرت محل نے زمانہ کے سرد و

کو دیکھا تھا۔ انھوں نے محل میں زندگی کے عیش کو لوٹا تھا اور اس کس مپرسی سے بھی دوچار ہو چکی تھیں۔ جو امجد علی شاہ کے انتقال کے بعد محلات پر گزری۔ انھوں نے باعزت موت اور باعزت زندگی کے لئے ان پردوں کو بھی ہٹا دیا جو محلات شاہی کے امارت پیشہ ہوتے تھے۔ اس باعزم خاتون کی نگرانی میں اودھ کی وہ آزاد حکومت قائم ہوئی جس کے تحت ملک کا گوشہ گوشہ آزاد تھا۔ چار ڈویژنوں پر ملکی راج قائم ہو گیا۔ اس موقع پر ہر جگہ ہندوستانیوں نے اپنی رواداری کا ثبوت دیا۔ عوام اور تعلقہ داروں کی بے عزتی اور ہر قسم کے ظلم کے باوجود ہر جگہ انگریزوں کی جان بخشی کی گئی۔ ایسے طرز عمل کی مثال یورپ کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ لیکن انگریزوں نے اس کا جواب اس خون کی ہولی سے دیا جس کے چند مناظر ہی روح انسانیت کو لرزا دینے کے لئے کافی ہیں۔

اعلان آزادی کے بعد سارا اودھ سمٹ کر لکھنؤ میں چلا آیا جہاں حضرت محل اور مولوی فیض آباد کی قیادت میں آزادی کے تحفظ کے لئے صف آرائی ہو رہی تھی۔

اودھ کے ہندو اور مسلم عوام نے مل کر ایک انقلابی کونسل بنائی جسے انقلابی حکومت بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس بارے میں تاریخی شہادت موجود نہیں کہ برجیس قدر کو نواب یا بادشاہ بنایا گیا یا نہیں۔ جنرل انس کا کہنا ہے کہ "برجیس قدر نواب بن گئے لیکن تمام شاہی احکام میں انھیں صرف "ولی" کہا گیا ہے۔ انقلابی کونسل میں شرف الدولہ کی حیثیت وزیر اعظم کے برابر تھی۔ مہاراجہ بالکشن وزیر مالیہ، مامون خان چیف جسٹس بنے اور راجہ جے لال سنگھ وزیر جنگ۔ پھر بھی مولوی کی شخصیت ان سب پر حاوی رہی۔ وہ کونسل کے اجلاسوں میں شریک رہتے اور ان کی رائے کا بڑا احترام کیا جاتا۔

نوید آزادی حضرت محل کی مہر کے ساتھ دربار دہلی بھجوائی گئی۔ قدیم روایات کے ساتھ شاہی کاروبار جاری ہوئے لیکن آزادی کی یہ مسرتیں دوامی نہ بن سکیں کیوں کہ وہی انگریز جن کی ہندوستانیوں نے جان بخشی کی تھی اس احسان کا بدلہ چکانے کے لئے ہر طرف سے امنڈ کر آنے لگے۔ والپول ایک طرف سے ۱۸ دسمبر کو روانہ ہوا اور علی گڑھ کو پامال کرتا ہوا کانپور کی طرف بڑھا۔ دوسری طرف سے سیٹن کاس گنج سے ہوتا ہوا مین پوری پہنچا جہاں یہ دونوں فوجیں ۳ جنوری کو ملیں۔ ادھر دہلی اور میرٹھ دم توڑ چکے تھے۔ اس لئے تمام فرنگی طاقت اودھ اور کانپور کے محاذوں پر دھکیل دی گئی۔ جالندھر کی تیسری سکھ رجمنٹ اور انگریزوں کی وفادار نیپالی فوج بھی اودھ کی طرف بڑھنے لگی۔ نیپالیوں کی سرکردگی جنگ بہادر کرتا تھا۔ یہ فوج دسمبر ۱۸۵۷ء میں کھٹمنڈو سے روانہ ہوئی جس کی تعداد ۹ ہزار کے قریب تھی۔ مشرق کی جانب سے جنرل فرانکس اور روکرافٹ پیش قدمی کر رہے تھے لیکن ان سب سے طاقت ور حملہ آور وہ تھے جو سر کولن کیمپ بل کی قیادت میں دریائے گنگا کے کنارے کنارے بڑھ رہے تھے۔ سر کولن کیمپ بل نے نواب فتح گڑھ اور نواب فرخ آباد کو شکست دی اور فرخ آباد کے دلیر سپاہی نادر خان کو پھانسی پر چڑھا کر فروری ۱۸۵۸ء میں کانپور سے لکھنؤ کی طرف بڑھا۔ ہیولاک بھی ایک بڑی سپاہ کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ خود لکھنؤ کی ریذیڈنسی اور گبن کے مکان میں کافی سپاہ موجود تھی۔

لکھنؤ کے مٹھی بھر جانبازوں کو کچلنے کے لئے چاروں طرف سے لشکر امنڈتے چلے آ رہے تھے لیکن قدم قدم پر جانبازوں نے بڑھ بڑھ کر داد شجاعت دی۔ دنوں کے فاصلوں کو مہینوں میں بدل دیا۔ چپہ چپہ زمین کے لئے دلمن پہ [illegible] سر تن کی بازی لگا دی۔ امیر پور، گورکھپور، سلطان پور کی جنگلیں انگریز کبھی بھلا نہ سکیں گے۔ جہاں چند سرفروشوں نے فرنگی طاقت سے ٹکر لے کر دشمنوں کو کئی درس جانبازی دیا۔ ادھر کانپور کی طرف سے نانا صاحب اور تانتیا ٹوپی کے چھاپے بھی شروع ہو چکے تھے۔ تاکہ انگریزوں کی فوجوں میں انتشار پیدا ہو اور وہ یکسوئی کے ساتھ لکھنؤ پر حملہ نہ کر سکیں۔ سر کولن کیمپ بل نے خود اس طرف توجہ کی لیکن اس موقع سے اہل لکھنؤ پوری طرح فائدہ نہیں اٹھا سکے کیوں کہ انقلابی فتح و نصرت کی بلندیوں پر پہنچنے کے بعد اب یہ دیکھ رہے تھے کہ ہر مورچہ پر انگریزوں کو کامیابی ہو رہی ہے جس سے دامن استقلال چھوٹا جا رہا تھا۔ حضرت محل مرکز اقتدار ہونے کے باوجود انقلابی راجاؤں اور مہاراجوں کو متحد کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھیں۔ کچھ تو غیر جانبدار تھے بیشتر کے دلوں میں انگریزوں کا رعب جما ہوا تھا۔ بعض مقامی طور پر انقلابی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ انقلابیوں کے دل میں اقتدار کی عزت ضرور تھی۔ ان میں دشمن سے مقابلہ کرنے کی جرأت تھی، لیکن اتحاد عمل نہیں تھا۔ حکم کی بجا آوری کی صلاحیت نہیں تھی۔ ہوس پرستی کی لعنت ابھی تک ان کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ آپس میں بغض کے بھی وہ شکار تھے۔ چناں چہ مولوی کا بڑھتا ہوا اثر دوسروں کی آنکھوں میں کھٹک رہا تھا۔ اس وقت مولوی انقلابی سرگرمیوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ ان کی رائے انقلابی کونسل میں حرف آخر سمجھی جاتی تھی۔ اس اثر کو لوگ برداشت نہیں کر سکے۔ اور حضرت محل کو ان کے خلاف بھڑکایا گیا۔ انس کے کہنے کے مطابق وہ اپنے

آپ کو خلیفۃ اللہ یا نائب خدا سمجھتے تھے ان کی شخصیت آسمانی و دنیوی اقتدار کا مرکز تھی جس کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ ایسی ہی باتیں ان کے خلاف پھیلائی گئیں چوں کہ برکت احمد اور ان کی ہمراہی فوج سلیمان قدر کی تائید کر رہی تھی اس لئے یہ یاد رکھنا کہ اس بحرانی دور سے ہر شخص فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا غیر صحیح نہیں تھا۔ اسی خیال کی بنا پر مولوی کو پھر ایک بار جیل جانا پڑا لیکن سپاہیوں پر ان کا اس قدر اثر تھا کہ حکمِ گرفتاری جلد ہی واپس لے لیا گیا اور مولوی جنگِ آزادی لڑنے کے لئے میدان میں واپس آ گئے۔

رہائی کے بعد جو صورت حال پیدا ہو چکی تھی وہ انقلابیوں کے لئے اُمید افزا نہیں تھی۔ بجائے اس کے کہ انقلابی بہتری لاتے اور اس کے ان ساتھیوں کو جو لکھنؤ کے ایک گوشہ میں پناہ گزین تھے باہر نکال پھینکتے آپسی اُلجھنوں میں مبتلا رہے۔ انگریزوں کی چاروں طرف سے بڑھتی ہوئی فوجیں بھی ہمتیں پست کرنے کے لئے کافی تھیں۔ انھوں نے کئی مضبوط مورچوں کو مسمار کر دیا تھا۔ نانا صاحب کی فوجیں منتشر ہو چکی تھیں اس لئے لکھنؤ کا مقابلہ کر سکنا ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس صورت حال کا اندازہ مولوی نے بالکل صحیح کیا اور اس موقعہ پر کہا تھا کہ "فوجی برتری کا وقت گذر چکا ہے۔ حالات ناسازگار ہیں۔ لیکن اب بھی ہمیں لڑنا ہے کیوں کہ یہ ہمارا فرض ہے۔" ان کی نگاہ میں فتح و شکست کا کوئی سوال نہیں تھا۔ کامیابی پر خوشی اور ناکامی پر رنج پیش نظر نہیں تھا بلکہ صرف ایک مقصد نظر آ رہا تھا کہ فرنگیوں سے لڑتے جاؤ تاکہ نتیجہ میں کوئی ایک فریق ختم ہو جائے۔ یاس اور حسرت کے چھائے ہوئے سیاہ بادلوں میں مولوی کی ایک ذات اُمید کی واحد کرن کی طرح انقلابیوں کے درمیان موجود تھی۔ اختلافات کے باوجود انھوں نے سلطنت اور آزادی کی بقا کے لئے تمام تر زور لگا دیا۔

لکھنؤ کے اطراف انگریزی فوجیں ڈیرے ڈال چکی تھیں اور جنگ بہادر کا انتظار تھا کہ اس کی فوج کے پہنچتے ہی زبردست حملہ شروع کر دیا جائے لکھنؤ سے بالکل قریب عالم باغ میں آؤٹ رم کو چار ہزار سپاہ کے ساتھ چھوڑ کر سر کولن تانتیا ٹوپی کے تعاقب میں روانہ ہو گیا تھا۔ مولوی دن اور رات اسی جستجو میں تھے کہ انگریزوں کی صفوں میں کہیں پر بھی کمزوری پیدا ہو جائے تو وہاں پہنچ کر ان کے قدم اکھیڑ دیں۔ اس موقعہ کو مولوی ہاتھوں سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنے سپاہیوں کے ساتھ عالم باغ پر پے بہ پے حملے کئے۔ ۲۲ دسمبر ۱۸۵۷ء کو ایک زبردست فوجی منصوبے کے ساتھ انھوں نے حملہ آور ہونے کی کوشش کی۔ وہ خود اپنے مٹھی بھر جانبازوں کے ساتھ انگریزوں سے کتراتے ہوئے لکھنؤ سے نکلے اور کان پور کی طرف روانہ ہو گئے۔ اپنے سپاہیوں کی ایک جماعت کو جسے وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے حکم دیا کہ جیسے ہی وہ انگریزی افواج کی پشت پر پہنچیں لکھنؤ کی جانب سے ان پر حملہ کر دیا جائے تاکہ انگریزی فوج کے اس طرف مصروف پیکار رہتے ہی وہ پشت سے حملہ کر دیں۔ واقعی یہ ایک شاندار منصوبہ تھا۔ لیکن پیچھے چھوڑی ہوئی جماعت میں موزوں قیادت کے فقدان نے اس منصوبہ کو خاک میں ملا دیا۔ اور یہ سپاہی ایک گولی چلائے بغیر ہی فرار ہو گئے۔ یہ صورت حال مولوی کے لئے بڑی پریشان کن تھی۔ اب وہ دشمنوں سے لڑے بغیر لکھنؤ میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ خود انگریز اس منصوبہ کی بو پا چکے تھے۔ لیکن مولوی نے ہمت و استقلال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ باوجود اس کے کہ ایک طرف کی سپاہ فرار ہو چکی تھی۔ انھوں نے اپنے بچے ہوئے ساتھیوں کے ساتھ انگریزوں کا جانبازی سے مقابلہ کیا اور لڑتے ہوئے پھر لکھنؤ میں داخل ہو گئے۔

ابھی اس معرکہ کو گذرے چند ہی روز ہوئے تھے کہ ۵ جنوری ۱۸۵۸ء کو انقلابیوں کو خبر ملی کہ انگریزوں کے لئے رسد اور کمک کان پور سے پہنچنے والی ہے اس کا روکنا نہایت ضروری تھا کیوں کہ اس سے انگریزوں کی طاقت میں نئی جان پڑ جاتی۔ انقلابی کونسل میں اس کمک کو روکنے کے لئے مباحثے ہوتے رہے لیکن عملی اقدام کے لئے کوئی آگے نہیں بڑھ سکا۔ اس موقعہ پر بھی جس نے جان ہتھیلی پر رکھ کر موت کے منہ میں گھس جانے کی بے مثال شجاعت کا اظہار کیا وہ مولوی ہی تھے۔ اس وقت مولوی کا منصوبہ یہی تھا کہ بغیر کسی اطلاع کے وہ یکدم دشمن پر ٹوٹ پڑیں۔ بے خبری میں ان کا حملہ یقیناً انگریزوں کے قدم اکھیڑ دیتا لیکن انگریزوں کے جاسوس تو ہر طرف لگے ہوئے تھے انھوں نے آؤٹ رم کو مولوی کے منصوبوں کی اطلاع پہنچا دی۔ اور اس نے مقابلہ کے لئے سپاہیوں کو پہلے ہی سے تیار کر دیا۔ مولوی اپنی دانست میں بے خبر دشمنوں پر حملہ آور ہو رہے تھے لیکن میدانِ جنگ کا نقشہ دیکھ کر سب کے سب حواس گم ہو گئے۔ دشمن پوری طرح تیار کھڑا تھا۔ لیکن مولوی نے سوچنے سمجھنے کے لئے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور اپنی غیر تربیت یافتہ فوج کے ساتھ دشمنوں پر جا گرا۔ بندوقوں اور توپوں کے چلانے کا موقعہ تک نہیں دیا اور دست بدست جنگ ہونے لگی۔ مولوی

اپنی روایتی سرفروشی سے انقلابیوں سے آگے ہی آگے بڑھ کر دشمن پر حملے کرتے رہے تھے۔ شدید جنگ کے بعد اُن کا ایک ہاتھ بُری طرح زخمی ہو گیا اور وہ زمین پر گر پڑے۔ باہمت جرنل کے ساتھ عام لوگ بھی سمجھ دار سپاہی بن چکے تھے انھوں نے ایک طرف تو جنگ کو جاری رکھا اور دوسری طرف نہایت سرعت اور دانشمندی سے مولوی کو ایک ڈولی میں ڈال کر لکھنؤ پہنچا دیا۔ مولوی کو گرفتار کرنے کا جو تجسس انگریزوں کے دلوں میں تھا ایک ارمان ہی بنا رہا۔ لیکن ان کے زخمی ہونے سے سپاہیوں میں بے چینی پھیل گئی۔ وہ شخصیت پرستی کے جنون میں مولوی کی قیادت کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اس موقع پر ہنومان نامی ایک برہمن نے ان کی جگہ لی اور ۷ جنوری کو صبح کے دس بجے سے شام کے چھ بجے تک لڑتا رہا۔ بالآخر وہ بھی بُری طرح زخمی ہوا اور گرفتار کر لیا گیا۔ اس شکست سے انقلابیوں کے رہے سہے حوصلے بھی جاتے رہے۔ لیکن مولوی کی ہمّت نے کبھی جواب نہیں دیا۔ ان کے سر میں یہی سودا سمایا ہوا تھا کہ سرکولن کے پہنچنے سے قبل ہی آؤٹ رم کا خاتمہ کر دیا جائے۔ چناں چہ ابھی زخم بھی پوری طرح بھرنے نہ پائے تھے کہ ۵ فروری کو ان کی تلوار پھر انگریزوں کے سروں پر منڈلاتی نظر آئی۔ (۷۰) ویں رجمنٹ کے صوبیدار نے بھی قسم کھائی کہ آٹھ روز کے اندر وہ عالم باغ میں مقیم انگریزوں کا صفایا کر دے گا۔ ان رہنماؤں اور سپاہیوں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے خود بیگم حضرت محل بھی ایک بار میدانِ جنگ میں پہنچیں لیکن انقلابی صرف جوہرِ تیغ دکھا کر رہ گئے اور انھیں کوئی کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔ اس موقع پر مولوی کے کردار سے متاثر ہو کر ہومس نے لکھا ہے کہ "چاہے دشمن کتنے ہی درندہ صفت کیوں نہ ہوں لیکن ان کا قائد ایک بلند مقصد کی پُشت پناہی کرنے اور ایک عظیم فوج کی رہنمائی کرنے کا ہر طرح اہل تھا۔"

اس اثناء میں سرکولن کمک لے کر عالم باغ پہنچ گیا۔ انگریز فوجیں لکھنؤ پر متحدہ حملے کے لئے پوری طرح تیار ہو چکی تھیں۔ دوسری مارچ کو کولن نے شمالی سرحد کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ اس طرف سے گومتی بہتی ہے اس لئے انقلابیوں نے وہاں مدافعت کی خاطر خواہ ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ سرکولن کے ساتھ ۱۳ ہزار سپاہی تھے۔ فرانکس اور جنگ بہادر کے ساتھ مل کر انگریزی فوج کی تعداد ۳۰ ہزار تک پہنچ گئی تھی اور لکھنؤ میں ان کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمت ہارے ہوئے غیر تربیت یافتہ بلکہ غیر مسلح عوام کا ہجوم تھا جو صرف سرفروشی جانتے تھے جن کے آگے صرف ایک مقصد تھا یعنی لڑنا۔ چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو۔ بعض انگریز مورخین نے لکھنؤ کی طاقت کو بڑے مبالغہ سے بیان کیا ہے۔ سر ہوپ گرانٹ کے بیان کے مطابق وہاں ۳۰ ہزار سپاہی اور ۵۰ ہزار رضاکار موجود تھے۔ کرنل ملیسن نے ۱۲۰ ہزار کی تعداد بتلائی ہے۔ بعض انگریزوں نے اس تعداد کو دو لاکھ تک پہنچا دیا ہے لیکن یہ قیاس آرائیاں اس لئے بھی قابلِ یقین نہیں ہیں کہ اگر اتنی فوجی طاقت ہوتی تو ایک ہی روز میں ریذیڈنسی کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی اور آؤٹ رم کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ سلطنت اودھ کے لئے بھی ناممکن تھا کہ وہ اتنی بڑی فوج کے اخراجات برداشت کر سکتی کیوں کہ کمپنی کے مطالبات کی ادائی کے بعد سلطنت بالکل دیوالیہ ہو چکی تھی اور جو ذخیرہ تھا لاکھوں کی قیمت کے قیصر باغ میں تھے، ہنری لارنس نے ہتھیا لئے تھے۔

۲ مارچ ۱۸۵۸ء کو لکھنؤ محاصرہ کی حالت میں تھا اور سرکولن کیمپ بل کی پیش قدمی شمال کی جانب سے جاری تھی۔ شہر کے گلی کوچوں میں مورچہ بندی کر لی گئی تھی۔ مکانات کی چھتوں پر جانفروش مختلف قسم کے اسلحہ سے لیس موجود تھے۔ دیواروں میں سوراخ کر کے دشمنوں پر گولیاں برسانے کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ ۲ مارچ سے ۱۵ مارچ تک لکھنؤ میں صرف جنگی نعرے اور بندوقوں اور توپوں کی آوازیں سُنائی دیتی رہیں۔ شاہراہوں، سڑکوں اور گلیوں میں خون کی ندیاں بہتی رہیں۔ رات اور دن کی مسلسل جنگ نے شہر کو ویرانہ بنا دیا۔ بے اطمینانی اور نا اُمیدی پھر ایک بار سرفروشی میں بدل گئی آزادی کے سپاہیوں نے مدافعت میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی لیکن انگریزی فوج بڑھتی ہی گئی۔ چپّہ چپّہ زمین کو لاشوں سے پاٹ کر ان پر سے گذرتی ہوئی فتح کے جھنڈے گاڑتی گئی۔ بیگم کوٹھی گیا، دلکشا باغ گیا، قدم رسول گیا، شاہ نجف گیا، قیصر باغ گیا، تمام مدافعتی مراکز چھن گئے اور اس جنگ کے دوران میں ۱۱ مارچ کو لکھنؤ میں ہڈسن کو مار کر مغل شہزادوں کی موت اور واجد علی شاہ کی بے عزتی کا بدلہ لے لیا۔ لیکن انقلابیوں کی جانفشانی کے باوجود انگریز کثیر نقصان کے بعد لکھنؤ پر قابض ہوتے چلے گئے۔ انگریزی فوج کے ہزاروں سپاہیوں کے قدموں کے نیچے مجاہدوں کی سرزمین کچل کر رہ گئی۔ انگریزوں سے ٹکر لینے والا مولوی اپنے بے پناہ عزم کے ساتھ مقابلہ کے لئے ڈٹا رہا۔ اور جہاں بھی انھوں نے اپنے سپاہیوں کی قیادت کی وہ لڑائی کی پہلی صف میں دیکھے گئے۔ جیسے جیسے انگریزوں کی فوجوں کا گھیرا چھوٹا ہوتا جا رہا تھا مولوی کو نرغے میں گھر جانے کا خدشہ

تھا اس لئے پہلے تو وہ دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے لکھنؤ سے باہر نکل گئے۔

لیکن جب فرنگی فوج لکھنؤ پر چھا گئی تو مولوی نے سوچا کہ دشمن فتح کی خوشیاں نہ منا سکیں۔ آرام اور اطمینان سے داد عیش نہ دے سکیں۔ انھیں لکھنؤ میں قتل عام کا موقعہ نہ ملے۔ ان کے قدم پوری طرح جم نہ سکیں۔ اس لئے وہ مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ لکھنؤ کے مضافات میں منڈلاتے رہے تاکہ تاریخ اس حقیقت کو نہ بھلا سکے کہ لکھنؤ نے دلیرانہ جنگ کے بغیر سرزمین دشمنوں کے حوالے نہیں کی لکھنؤ کے محروسین یہ نہ کہہ سکیں کہ انقلاب کے سورما انھیں دشمنوں کے سپرد کر کے فرار ہوگئے۔ مولوی نے بے مثال جرأت کے ساتھ حملے پر حملے کئے یہاں تک کہ شہادت گنج پر قبضہ کر لیا۔ ان کے مقابلے کے لئے لوگارڈ کو ۲۱ مارچ کو اس ڈویژن کے ساتھ روانہ کیا گیا جس نے بیگم کوٹھی پر حملہ کر کے پہلے ہی روز اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ مولوی نے اس کا نہایت دلیری سے مقابلہ کیا اور سینکڑوں سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا یا زخمی کر دیا۔ انگریزی فوج کو ہر طرح کی آسانی تھی۔ وہ مولوی بے حد کس مپرسی میں لڑ رہے تھے۔ انھیں رسد یا کمک ملنے کی کہیں سے امید نہ تھی لیکن وہ اس وقت تک لڑتے رہے جب تک کہ ان کی قوت مدافعت نے ساتھ دیا۔

اس مورچہ کو چھوڑ کر وہ بھی شاہجہاں کی طرف بڑھ گئے جہاں انقلاب کے دوسرے رہنما اپنی طاقت جمع کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مولوی نے "باری" کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ ہوپ گرانٹ ان کا پیچھا کر رہا تھا جس کے ساتھ ایک بڑی فوج تھی۔ مولوی نے گھٹی ہوئی طاقت کے پیش نظر میدان میں آکر مقابلہ کرنے سے گریز کیا اور انگریزوں کو گھیرے میں لے کر ان کا خاتمہ کرنے کے منصوبے بنائے یا گوریلا جنگ اختیار کی۔ ان کے جاسوس انگریزی فوج میں لگے ہوئے تھے تاکہ ان کی نقل و حرکت اور ان کے منصوبوں کے بارے میں اطلاع دیتے رہیں یہ آدمی ۱۲ ویں رجمنٹ کے تھے جو بغاوت کر کے مولوی کے ساتھ آملے تھے وہ بلاخوف و خطر فرنگی کیمپ میں گھس گئے اور وہاں کی معلومات مولوی کو پہنچاتے رہے۔ مولوی نے اپنا کیمپ "باری" سے چار میل دور ایک گاؤں میں قائم کیا۔ توپ خانے کو اپنے ساتھ رکھا اور گھوڑسواروں کو محفوظ دستے سے آگے بڑھا دیا تاکہ جب انگریز پیش قدمی کریں تو دونوں طرف سے ایک ساتھ حملہ کر کے انھیں ختم کر دیا جائے لیکن گھوڑسوار سپاہی حملے کے وقت سے قبل دشمن کے سامنے آگئے اور یہ اسکیم کامیاب نہ ہو سکی یہ جوں کہ دشمن چوکنا ہو چکا تھا اس لئے مولوی نے تدبیر سے اپنی فوجوں کو ہٹا لیا۔

اب انقلابیوں کا مرکز شاہ جہاں پور بن گیا تھا۔ سب انقلابی رہنما اسی مرکز کی طرف کھنچے چلے آرہے تھے۔ نانا صاحب، بیگم حضرت محل، شہزادہ فیروز شاہ مولوی بھی اسی طرف بڑھے۔ شاہ جہاں پور کو مرکز بنانے کا مقصد یہ تھا کہ روہیل کھنڈ کے صدر مقام بریلی پر انگریز اپنی پوری طاقت سے حملہ نہ کر سکیں جہاں خان بہادر خان نے انگریزوں کے اقتدار کے پرخچے اڑا دیئے تھے۔ کیمبل نے اپنی فوج کے بڑے حصّہ کے ساتھ شاہ جہاں پور کے اطراف اسی طرح گھیرا ڈالنا شروع کیا جس طرح لکھنؤ میں کیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے مقابلوں کے بعد پھر انقلابی منتشر ہونے لگے صرف مولوی شاہ جہاں پور میں رہ گئے چاروں طرف دشمن کی فوج ایک وسیع سمندر کی طرح امنڈتی چلی آرہی تھی۔ مولوی نے شاہ جہاں پور کے پرانے قلعہ میں مورچہ بندی کی اور اس میں محصور ہوگئے۔ سرکولن کا پڑاؤ مقامی جیل کے قریب تھا۔ دونوں طرف سے توپوں کی باڑھ چلتی رہی۔ شاہجہان پور کے در و دیوار لرزنے لگے۔ شہر پناہ کی عمارتیں دشمن کی گولہ باری سے ڈھ گئیں مولوی نے اس کا جواب نہایت پامردی سے دیا لیکن وہ کب تک دشمنوں کی اس عظیم طاقت کے مقابلہ میں ٹھہر سکتے۔ رفتہ رفتہ ان کی طاقت جواب دینے لگی سپاہی کم ہوتے گئے۔ مولوی نے سلامتی اسی میں دیکھی کہ وہاں سے بچ نکلیں لیکن دشمنوں کا نرغہ اس قدر مستحکم تھا کہ اس کو توڑ کر بچ نکلنا ممکن نہیں تھا سرکولن بھی مطمئن تھا کہ مولوی کو راہ فرار نہیں مل سکے گی۔ اس نے چاروں طرف اپنے افسروں کو حکم دے دیا کہ کسی فرد کو بھی باہر جانے نہ دیا جائے لیکن مولوی اسی سمت سے شہر کے باہر نکل گئے جس سمت میں سرکولن اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ اپنی دانست میں راستے مسدود کر چکا تھا۔ شاہجہان پور میں سرکولن کو فتح کے بعد پھر ایک بار مایوسی اور خفت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ انقلابی جس کی جان کا وہ دشمن تھا اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر جا چکا تھا۔ مولوی کے ہاتھ نہ آنے کے غم نے اس فتح کو سرکولن کی معنوی شکست میں تبدیل کر دیا۔

روہیل کھنڈ اب بھی آزاد تھا۔ دوسرے انقلابی رہنما بھی یہیں جمع ہوگئے تھے۔ بریلی کی فضاؤں میں آزادی کا پرچم لہرا رہا تھا۔ خان بہادر خان فرنگیوں سے لڑنے کے لئے پوری تیاریاں کر چکا تھا۔ گذشتہ تجربات کے بعد اُن کا یہ خیال تھا کہ قلعہ بند ہو کر لڑنے یا میدان میں مقابلہ کرنے کی بجائے گوریلا طرز کی جنگ لڑی جائے۔ ادھر سرکولن شاہ جہاں پور میں مختصر سی فوج چھوڑ کر باقی

تمام لاؤلشکر کے ساتھ بریلی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ روہیل کھنڈ کی فوجیں گوریلا جنگ کے لئے بریلی کو چھوڑ کر باہر نکلنے ہی والی تھیں کہ انھیں دشمنوں کی فوج آتی نظر آئی۔ انھیں دیکھ کر روحِ آزادی تلملا اٹھی۔ بہادری اور شجاعت نے انگڑائی لی۔ اس لئے انقلابی افواج نے شہر کا تخلیہ کرنے سے انکار کر دیا اور عہد کیا کہ وہ اپنے وطن کی قسمت کا فیصلہ اسی کے گلی کوچوں میں کریں گے جب تک دونوں فوجیں فاصلے پر رہیں توپوں کے دہانے آگ برساتے رہے آگ اور دھوئیں سے فضائیں معمور رہیں۔ لیکن ۵ مئی ۱۸۵۸ء کو انقلابی توپوں نے آگ اگلنا بند کر دیا۔ روہیلہ سپاہی ہاتھوں میں تلواریں لئے میدان میں کود پڑے۔ ان کے سروں پر سُرخ عمامے تھے۔ کمر پٹوں سے کمر ہمت کسی ہوئی تھی۔ انگلیوں میں آیاتِ قرآنی کندہ انگوٹھیاں تھیں اور ہاتھوں میں تلواریں دشمن کی موت کا پیغام بنی چمک رہی تھیں۔ موت کا بازار گرم تھا۔ جانبازوں کے بڑھتے ہوئے ریلوں میں انگریزی فوج کے قدم پیچھے ہٹنے لگے سپاہی بوکھلا گئے لیکن سرکولن کے تدبّر نے انقلابیوں کو روکا۔ فتح مند قدم تھم گئے۔ ان میں سب ہی انقلابی تھے، مولوی بھی تھے! جنگ کا رُخ پلٹ گیا۔ اب پانسہ انگریزوں کی طرف بھاری تھا لیکن انقلابیوں نے اس وقت تک مقابلہ کیا جب تک ان کا آخری سپاہی بھی موت سے ہم آغوش نہیں ہو گیا ۷ مئی کو بریلی انقلابیوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔

سرکولن فتح و نصرت کے شادیانے بجاتا شہر میں داخل ہوا۔ اس کی ننگاہیں ڈھونڈھ رہی تھیں کہ مولوی کہاں ہے؟ کہاں ہے مولوی؟ لیکن مولوی دشمن کے نرغے سے اس بار بھی نکل گئے تھے اور دشمن کی دسترس سے باہر ہو چکے تھے۔ اس بار ان کی نگاہوں نے پھر دشمن کے کمزور مورچے کو تاکا۔ مولوی اور نانا صاحب کو معلوم تھا کہ بریلی کی مہم کے پیشِ نظر انگریز اپنی پوری طاقت اسی طرف لگا دیں گے اور شاہجہان پور میں برائے نام کچھ فوج ہو گی۔ اس لئے انھوں نے پھر شاہجہان پور کا رُخ کیا۔ فرنگیوں پر موت کی آندھی بن کر جھپٹنے والا مولوی نئی طاقت اور جولانی کے ساتھ بڑھتا جا رہا تھا لیکن جاسوسوں نے شاہجہان پور میں مقیم فرنگی فوج کے اعلیٰ افسر کرنل ہیل کو اس پیش قدمی کی اطلاع پہنچا دی۔ اس لئے کرنل اپنی فوج کے ساتھ نو تعمیر شدہ قلعہ میں محصور ہو گیا۔ مولوی اپنے چند جانباز سپاہیوں کے ساتھ حملہ آور ہو گیا اور انتہائی شدید لڑائی کے بعد شہر اور قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ ایک بار پھر اس نے شاہجہان پور پر پرچمِ آزادی لہرایا۔ جب سرکولن کو مولوی کی اس جرأت اور فتح مندی کی اطلاع ملی تو وہ ایک لمحہ کے لئے ششدر رہ گیا۔ اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ ان انقلابیوں کی روحِ آزادی اس کے لئے ایک مستقل دردِ سر بنی رہے گی اس کا خیال تھا کہ تین بار شکستوں کے بعد اب وہ لڑنا یا فتح مند ہونا تو درکنار مقابلہ کرنے کی بھی طاقت نہیں پیدا کر سکیں گے لیکن پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ وہی مسکراہٹ جو شکاری کے ہونٹوں پر شکار کو جال میں پھنسا دیکھ کر ہوتی ہے۔

سرکولن نے اطلاع پاتے ہی برق رفتاری کے ساتھ بریلی سے شاہجہان پور کا رُخ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے شاہجہان پور کو اپنے مضبوط چنگل میں لے لیا۔ ۱۱ مئی سے سخت ترین جنگ کا آغاز ہوا تین دن تک مولوی نے سرکولن کا ہر حملے کا مردانہ وار مقابلہ کر کے اسے بار بار آگے بڑھنے سے روکا۔ لیکن گذشتہ تجربات نے دشمن کو محتاط کر دیا تھا۔ اس بار وہ نہ صرف فتح چاہتے تھے بلکہ مولوی کو زندہ یا مردہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے محاصرہ زیادہ سختی سے جاری رکھا گیا۔ انقلابیوں کو مولوی کی اس حالت سے بڑی تشویش ہو گئی۔ اس لئے منتشر فوجوں کو جمع کر کے حضرت محل، نانا صاحب، فیروز شاہ، نواب ماہ منڈی اور میاں صاحب کی فوجیں مختلف سمتوں سے فرنگیوں پر حملے کرنے لگیں تاکہ موقعہ ملے تو مولوی فرار ہو سکیں لیکن انگریزوں کی موجودہ طاقت انقلابیوں سے کئی گنا زیادہ تھی۔ رفتہ رفتہ ان کا گھیرا کم ہوتا گیا۔ فرنگی سنگینیں انقلابی سینوں میں گھسی جا رہی تھیں۔ شاہجہان پور کی سڑکوں پر انگریزی فوجیں گشت کر رہی تھیں۔ شہر کا گوشہ گوشہ ان سپاہیوں سے بھر گیا تھا لیکن ——— ؟ لیکن سرکولن ایک سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ اسے پھر معنوی شکست ہوئی تھی کیونکہ مولوی تک اس کے ہاتھ نہیں پہنچ سکے تھے۔ ہر موقعہ پر فرنگی تلوار مولوی کا گلا کاٹنے میں کُند ثابت ہو چکی تھی۔

اس انتشار اور پیہم شکست سے بڑے سے بڑا جری دامنِ اُمید چھوڑ بیٹھتا لیکن مولوی کی فطرت سکون ناآشنا تھی۔ وہ ایسے انقلابی تھے جو شکست سے غم کھانا نہیں جانتے تھے۔ ان کی روحِ آزادی آرام سے واقف نہ تھی اور نہ ہی وہ دشمن کو آرام سے بیٹھنے دینا چاہتے تھے۔ بریلی اور شاہجہان پور کی لڑائیوں کے بعد مولوی سرکولن کی دسترس سے دُور سے دُور تر ہوتے گئے اور پھر اودھ میں جا کر دم لیا۔ جس پر ایک سال کی خونریزی اور جانفشانی

کے بعد فرنگیوں نے قبضہ جمالیا تھا۔

جب سرکولن نے اودھ پر قبضہ کیا تو مولوی نے شاہ جہان پور پر پرچم آزادی بلند کیا۔ شاہ جہان پور ہاتھ سے جاتے ہی بریلی مرکزِ حریت بنا۔ بریلی کے مسمار ہوتے ہی پھر شاہجہان پور نے آزادی کی سانس لی۔ لیکن اب کی بار اس مورچہ کے ختم ہونے پر اودھ کے مردہ تن میں روحِ آزادی ڈالنے کے لئے مولوی سرگرداں ہوگئے یہاں انھوں نے پھر سے طاقت جمع کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں حضرت محل کی مہر سے ایک خط راجا مادو بی جگنا تھ سنگھ کو روانہ کیا گیا جس میں امداد اور اعانت کے لئے لکھا گیا تھا لیکن راجا سے اس سے قبل گفت و شنید کا ارادہ ظاہر کیا گیا۔ ۵ جون کو مولوی ایک ہاتھی پر سوار اکیلے راجا سے ملنے کے لئے روانہ ہوئے۔ لیکن ۲۳ جون ۱۸۵۸ء کے دہلی گزٹ میں اس اطلاع کو اس طرح شائع کیا گیا تھا کہ مولوی اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ راجا کے قلعہ گئے اور وہاں انھوں نے تحصیلدار اور تھانہ دار کو حوالہ کرنے کا مطالبہ کیا جنھیں راجا نے پناہ دی تھی لیکن راجا نے جس کی حیثیت عرصہ سے انگریزوں کے سامنے مشکوک تھی اپنے بارے میں انگریزوں کے خیالات کو بدلنے کے لئے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

مولوی جب قلعہ کے قریب پہنچے، فصیل پر راجا اور اس کا بھائی مسلح دستوں کے ساتھ موجود تھے۔ داخلہ کے تمام دروازے بند تھے۔ مولوی جس نے پہاڑوں سے ٹکر لی تھی اور بڑے بڑے جنرلوں کے دانت کھٹے کر دیئے تھے۔ راجا کو اس حالت میں دیکھ کر جھنجھلا گیا۔ اپنے مہاوت کو حکم دیا کہ ہاتھی کی ٹکروں سے دروازے کو چور چور کر دیا جائے۔ ممکن تھا کہ ہاتھی نے دروازے کو اکھیڑ دیا ہوتا کہ راجا کے بھائی نے مولوی پر گولی چلا دی۔ وہ زمین پر آ رہے مجروح مولوی کو بجائے گرفتار کرنے کے فوراً قتل کر دیا گیا۔ ان کے سر کو تن سے جدا کر کے راجا نے فرنگیوں کے سامنے اپنی وفاداری کا ثبوت دیا۔

دس جون کی رات کو دس بجے شاہ جہان پور میں انگریزی عہدہ دار کھانے کے بعد شراب نوشی کر رہے تھے محفل میں قہقہے بلند ہو رہے تھے کہ مولوی کے سر کے ساتھ راجا اس محفل میں پہنچا اور مولوی کے سر کو انگریزوں کے قدموں پر ڈال دیا۔ ان کی تلوار کمشنر کو نذر کی جس کے صلہ میں پچاس ہزار روپے انعام پائے۔ دوسرے دن کوتوالی کے سامنے لکڑی کے ایک کھمبے پر مولوی کا سر رکھا ہوا تھا جو اپنی کلاہ کج کے ساتھ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ ۱۷ جون کو کمشنر اور عوام کی موجودگی میں اس کی نعش کو جلا کر راکھ کو دریا میں بہا دیا گیا تاکہ زمین پر ان کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔ ان کی یاد ہندوستانیوں کے دلوں سے کبھی نہ مٹ سکے۔

مولوی کے افسوسناک انجام کو دہلی گزٹ کے حوالے سے لکھا گیا ہے، لیکن مفتی انتظام اللہ نے لکھا ہے کہ ان کی قبر موضع جہاں گنج متصل شاہجہان پور میں ہے۔ اب یہ کام حکومت کا ہے کہ مخصوص میں تحقیق کرے اور مولوی کی یادگار قائم کرے جس کے بارے میں مالیسن نے لکھا ہے:۔

"یہ مولوی ایک بڑا تجربہ کار شخص تھا۔ ان کے سوا کوئی شخص فخر کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے دو بار سر کولن کیمپ بل کو میدانِ جنگ میں زک دی ہے۔ مولوی احمد شاہ سچا محبِ وطن تھا۔ اس نے کسی نہتے کا خون بہا کر اپنی تلوار کو خراب نہیں کیا تھا۔ اس نے بہادری کے ساتھ ڈٹ کر کھلے میدان میں ان بدیشیوں کے ساتھ جنگ کی جنھوں نے اس کے وطن کو چھین لیا تھا۔ ہر ملک کے بہادر اور سچے لوگوں کو چاہیئے کہ مولوی احمد شاہ کو عزت کے ساتھ یاد رکھیں۔"

ضروری گذارش

(۱) مضمون کاغذ کے ایک طرف اور خوش خط لکھئے۔ (۲) غیر مطبوعہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جائیں گے جب کہ اُن کے ساتھ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ ہوں گے (ادارہ)

محمود نیازی

روہیل کھنڈ کے لوک گیت

شادی بیاہ، کھیل تماشوں اور تہواروں کے موقع پر دیہات کی عورتیں سیدھی سادی زبان میں جن گیتوں کو گاتی ہیں۔ ان کو لوک گیت کہا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں ہمیں یہ نہیں معلوم کہ ان کا بنانے والا کون تھا۔ اور یہی اُن کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ یہ گیت کسی شاعر کے دیوان میں نہیں ملتے بلکہ کتابِ دل کے وہ غیر مطبوعہ اوراق ہیں جن کا علم سینکڑوں برس سے سینہ بسینہ چلا آ رہا ہے۔ دُنیا کے ہر ملک، ہر قوم اور ہر فرقہ کے لوک گیت ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی کشمیر سے راس کماری تک اور امرتسر سے آسام تک ہر علاقے میں گائے جاتے ہیں اور ہندوستان کی تقریباً ہر زبان میں پائے جاتے ہیں۔

لوک گیت ہر ملک کی معاشرت قومی اور تہذیب کہن پر روشنی ڈالتے ہیں۔ شادی بیاہ، خوشی و غمی، مذہبی تقریبات، تہواروں، کھیل کود اور تفریحی مشاغل میں لوک گیت ہماری زندگی کا لازمی جزو بن گئے ہیں۔ ان سے ہماری روایات قومی کی حقیقی عکاسی ہوتی ہے۔

اکثر لوک گیت دیہاتوں سے متعلق ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان میں معنویت اور بلند پروازیٔ تخیل کا فقدان نہیں ہے۔ اَن پڑھ کسانوں، گوالوں، خانہ بدوشوں اور میواتیوں کے سیدھے سادے لوک گیتوں سے ہم کو ملک کے ہر دور کے تاریخی، معاشرتی، سیاسی اور مذہبی رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ بعض گیت تو زبان اور معنویت کے اعتبار سے اتنے بلند ہیں کہ سُن کر مستند شعراء اور اساتذہ تک جھوم جاتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ہر ملک کے لوک گیت ہی اُس کے ادب اور شاعری کی خشتِ اوّل ہیں۔ زمانہ قدیم میں جب انسان نے علم و ادب کی طرف توجہ کی تو نقشِ اوّل یہی لوک گیت تھے انھیں بنیادوں پر ادب کی شاندار عمارتیں تعمیر ہوتی چلی گئیں۔ اس لئے لوک گیتوں کی اہمیت ادبی اعتبار سے بھی کچھ کم نہیں ہے۔ آج ہمارے ادیب ہندوستان کے مختلف علاقوں کے لوک گیت فراہم کرنے میں کوشاں ہیں۔

ہندوستان کے بہت سے صوبوں اور علاقوں کے لوک گیت جمع کئے جا چکے ہیں لیکن ابھی تک روہیل کھنڈ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی تھی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ روہیل کھنڈ کا نام دو تین سو برس سے زیادہ پُرانا نہیں ہے لیکن پہلے اس اہم اور تاریخی مقام کا نام 'پانچال دیش' تھا۔ مہابھارت کے زمانہ میں یہاں کے راجہ کا نام "دُروپد" تھا اور وہ پانڈوؤں کا دوست اور سمدھی تھا۔ راجہ دُروپد کی لڑکی دروپدی کی عزت بچانے کے لئے ہی مہابھارت کی جنگِ عظیم ہوئی اور اٹھارہ اکشوہنی سینا "صرف اٹھارہ دن میں کاٹ دی گئی۔ راجہ دُروپد کی راجدھانی "ماکندی نگری" اسی مقام پر تھی جہاں آج کل قصبہ آنولہ کے پاس رام نگر کا گاؤں بسا ہوا ہے۔ اس طرح روہیل کھنڈ کو جو تاریخی اہمیت حاصل ہے وہ ہندوستان کے کسی دوسرے مقام کو شاید ہی حاصل ہو۔ اس کے بعد روہیل کھنڈ کا نام بھگوان مہابیر کے زمانہ میں "اہی چھیتر" رکھا گیا۔ اگرچہ میرے اس مختصر مضمون کا موضوع علم تاریخ نہیں ہے۔ لیکن اس پُرفضا اور شاداب خطۂ زمین کی قدیم تاریخی اہمیت کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری تھا۔ جب حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے مورثِ اعلیٰ غور و غزنی سے منتقل ہو کر اس کوہستانی خطۂ زمین پر آباد ہو گئے اور داؤد خاں کے متبنّٰی اور جانشین علی محمد خاں نے ۱۷۴۲ء میں یہاں پر مکمل قبضہ کر لیا تو اس حصۂ ملک کا نام "روہیل کھنڈ" ہو گیا۔ روہیلوں کے عہدِ حکومت میں یہاں نسلی تعصبات اور مذہبی منافرت کا کبھی سوال نہ اٹھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے

تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے اسی وجہ سے یہاں کی زبان ہمیشہ برج بھاشا رہی لیکن اس پر کھڑی بولی کا بھی کچھ کم اثر نہ پڑا۔ مسلمانوں کے اثر سے اس میں فارسی اور عربی کے بھی کافی الفاظ شامل ہو گئے۔ اس طرح روہیل کھنڈ کی اپنی ایک ملی جلی زبان بن گئی جس کا ہندوستانی ادب میں ایک اعلیٰ اور مخصوص مقام ہے۔ اب روہیل کھنڈ کی مخصوص زبان کے کچھ لوک گیت پیش کئے جاتے ہیں۔

سجنوا بیری ہو گئے ہمار — سجنوا بیری ہو گئے ہمار
پلنیا ہوئی تو سب کوئی بانچے
کرموا کوئی نہ بانچے ہمار — سجنوا بیری ہو گئے ہمار
نیّا ہوئی تو سب کوئی کھیوے
گٹھریا کوئی نہ کھیوے ہماری — سجنوا بیری ہو گئے ہمار
جوانی ہوئی تو سب کوئی پوچھے
بڑھاپا کوئی نہ پوچھے ہمارا — سجنوا بیری ہو گئے ہمار
تو بیاہ ہوئی تو سب کوئی پوچھے
بپتیا کوئی نہ دیکھے ہماری — سجنوا بیری ہو گئے ہمار

دنیا کی بے ثباتی اور دنیا والوں کی بے وفائی کا تذکرہ تو بڑے بڑے شعراء نے بھی کیا ہے۔ لیکن اس سیدھے سادے لوک گیت کا جو انداز بیان ہے وہ بہت کم دوسرے گیتوں میں ہوگا۔ اس کا ہر ہر بول زہر میں بجھا ہوا نشتر ہے جو دل کے آر پار ہو جاتا ہے۔

یہ لوک گیت خالص دیہاتی زبان میں ہوتے ہوئے بھی معیاری ہے دینی اور دنیوی دونوں قسم کی محبتوں کو بھولے بھالے انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ غالباً یہ گیت بلند پایہ عشقیہ گیتوں میں سے ایک ہے۔

کانٹا لاگے ری دیوریا موسے ڈگر چلو نہ جائے — موسے ڈگر چلو نہ جائے
نتّہ چھوڑ کے بیے نتّہ لایا
(رستہ)
الارا ساری دیہہ پہرائی — موسے ڈگر چلو نہ جائے دیوریا موسے...
اپنے محلا میں ہیں البیلی
جوبن میرا پھول چنبیلی
دھوپ پڑت کمھلائے — موسے ڈگر چلو نہ جائے دیوریا موسے...
انگلی پکڑ موری پہنچا پکڑو
ساس ننند کہہ نہیں آئیو
آدھی رات گھر سے لے آئیو — موسے ڈگر چلو نہ جائے دیوریا موسے...
میرا ابھی کچھ نہ بگڑو
تیرا ہی نصیبا ہوئے دیوریا — موسے ڈگر چلو نہ جائے دیوریا موسے...

چھوٹے دیور اور بھاوج کا یہ ایک مزاحیہ لوک گیت ہے جو صرف روہیل کھنڈ میں ہی نہیں بلکہ متھرا تک گایا جاتا ہے۔

مولا تیرے رنگ میں پھروں دن رین — مولا تیرے رنگ میں پھروں دن رین
اپنے پیا کو ڈھونڈنے نکسین
پیا ملے تو پارسے تن چین — مولا تیرے رنگ میں پھروں دن رین
ہمرے پیا نے سب کچھ دینی
گائے، بھینس اور گھر جوڑی
اور بھیتی کی جوڑی — مولا تیرے رنگ میں پھروں دن رین
اپنے پیا کو جگ جگ ڈھونڈا
پیا ملے تو پاوے کل چین — مولا تیرے رنگ میں پھروں دن رین
ہمرے پیا نے سب کچھ دینی
توسے پیر نبیا اور موتون جینا — مولا تیرے رنگ میں پھروں دن رین
[illegible]

ساون میں لینے آوے گا بھوجی تیرا بھیا — بھوجی تیرا بھیا
پہلی نہیں آوے دوج نہیں آوے
وہ تو تیجوں کو لینے آوے گا — بھوجی تیرا بھیا
دودھ کا شربت پلاوے گا — بھوجی تیرا بھیا
چھٹ نہیں آوے سات نہیں آوے
وہ تو ہولی کو لینے آوے گا — بھوجی تیرا بھیا
پوری کچوری کھلاوے گا — بھوجی تیرا بھیا
ماہ نہیں آوے پوس نہیں آوے
وہ تو کاتک میں لینے آوے گا — بھوجی تیرا بھیا
گنگا نہوا کے لاوے گا — بھوجی تیرا بھیا

جولائی ۱۹۵۹ء

بھاوج کو میکے گئے دن ہو گئے ہیں۔ چھوٹی نند یا دیور اس کو تسلی دے رہے ہیں اس کا دل بہلانے کے لئے ان تمام مواقع کو بتا رہے ہیں۔ جن پہ اس کا جانا ہو سکتا ہے۔ ان تمام خاطر مدارات کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ جو اس کے میکے والے کریں گے۔

برسو برسو شری مہاراج   برسو برسو شری مہاراج
برج میں بدرا کالے کالے
سب سکھیاں گاویں اگ ملہار
گھر بیٹھے ہے ہم من مارے
پیا چھائے رہے پردیس
کسی سوتینا کے دوارے   برسو برسوں شری مہاراج
(سوکن)
چھیچ بیچ پڑے پھوار   برسو برسو شری مہاراج
کانن میں کس مت رہا
سر پر لیے کارے کیس
جوگن بن کر چلی پیا بیں تمھارے دیس   برسو برسو شری مہاراج
برسو برسو شری مہاراج   برسو برسو شری مہاراج

یہ ایک برہن کا گیت ہے جو زیادہ تر ساون بھادوں میں گایا جاتا ہے۔ ڈھولک کی تھاپ اور مجیروں کی گونج سے اس کی درد انگیزی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

چناکیوں بویا کیوں بویا کیوں بویاری   چنایوں بویا یوں بویا یوں بویاری
اس رے چنے کو میں کیسے سینچوں   چنایوں سینچا یوں سینچا یوں سینچاری
اس رے چنے کو میں کیسے کاٹوں   چنایوں کاٹا یوں کاٹا یوں کاٹاری
اس رے چنے کو میں کیسے گہاؤں   چنایوں جھاڑا یوں جھاڑا یوں جھاڑاری
اس رے چنے کو میں کیسے پھٹکوں   چنایوں پھٹکا یوں پھٹکا یوں پھٹکاری
اس رے چنے کو میں کیسے بھونوں   چنایوں بھونا یوں بھونا یوں بھوناری
اس رے چنے کو میں کیسے چباوں   چنایوں چبکا یوں چبکا یوں چبکاری

چناکیوں بویا کیوں بویا کیوں بویاری
چنایوں بویا، یوں بویا، یوں بویاری

یہ لوک گیت فصل کٹنے پر گایا جاتا ہے۔ مرد تو کام کرتے ہیں اور عورتیں چاندنی راتوں میں لوک نرت کے ساتھ اس گیت کو گاتی ہیں۔ بہت سی عورتیں کھڑے ہو کر نرت کے ساتھ گاتی ہیں۔ چنے کو بونے، سینچنے، کاٹنے، گہانے پھٹکنے، بھوننے اور چبانے کے سارے کام تمثیلاً دکھائے جاتے ہیں۔

انیس امام

دیارِ دار و رسن

(آرہ ضلع پر یہ نظم ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں کہی گئی ہے ۔ ا-ا)

فضائے رنج و محن پر سکوت طاری تھا   دیارِ دار و رسن پر سکوت طاری تھا
زمینِ شعر و سخن پر سکوت طاری تھا   غرض کہ سارے چمن پر سکوت طاری تھا
کہ ایک رات یہ ظلمت نے مسکرا کے کہا
مقامِ عشق سے اب کوئی آشنا نہ رہا

یہ سنتے ہی جو مجھے دفعتاً جلال آیا   لباسِ فکر میں فردائے خوش جمال آیا
ادب سے سر کو جھکائے گدائے حال آیا   پلٹ کے قافلۂ روز و ماہ و سال آیا
ابھی تو کی بھی نہ تھی میں نے شعلہ افشانی
فلک پہ عام ہوئی تیرگی کی نادانی

جو دیکھا حال نے مستقبلِ حسیں کی طرف   نگاہ دوش نے کی حالِ پُر یقیں کی طرف
ادب سے سب نے جھکائی نظر زمیں کی طرف   مکاں نے سر سے اشارہ کیا مکیں کی طرف
مرے جلال کا قصہ جو یوں چمن میں چھڑا
وفا کا ذکر ستاروں کی انجمن میں چھڑا

اگرچہ سینکڑوں قصے مری وفا کے ہوئے   بہ شرح و بسط مگر دورِ ابتلا کے ہوئے
امین[1] و خاں[2] کے ہوئے تانتیا ٹوپیا کے ہوئے   وفائے لکشمی[3] و پیر[4] پارسا کے ہوئے
مگر جو گفتگو اک مردِ پیر[5] کی آئی
فسانۂ شبِ وحشت میں زندگی آئی

بیانِ قصۂ دار و رسن نہ تھا منظور   کچھ ایسی بات مگر تھی کہ میں ہوا مجبور
نہ دلکشی کی یہ خطا تھی نہ حال کا ہی قصور   مجھے دراصل مٹانا تھا تیرگی کا غرور
غرض یہ بات جب اپنوں کے درمیاں چھیڑی
بیک زباں یہی تینوں نے داستاں چھیڑی

[1] امین الدین فیض آبادی [2] عظیم الدین خاں [3] لکشمی بائی جھانسی کی رانی [4] پیر علی پٹنہ [5] کنور سنگھ ہشتاد سالہ آرہ کے ہیرو

جولائی ۱۹۵۹ء

یہ سرزمینِ کنور سنگھ، شیرِ دار و رسن — یہ سرزمین جہاں سال فوجیوں کا وطن
پہنا چکی ہے جو سو بار دشمنوں کو کفن — امینِ رازِ گلستاں، عروسِ سرو و سمن

مقامِ عشق و مقامِ وفا یہیں پہ ملا
جنوں کا درس اسی خطۂ زمیں پہ ملا

سنان و تیغ کا خطہ، زمینِ چنگ و رباب — ہمیشہ تند رہی اس کے میکدے کی شراب
یہیں پہ لکھی گئی داستانِ عہدِ شباب — لہو چھڑک کے اگائے گئے یہیں پہ گلاب

کنارِ سون[1] میں اک گلعذار ہے یہ زمیں
نشانِ منزلِ طوفان و دار ہے یہ زمیں

ہر ایک ذرہ ہے اک حرفِ انقلاب اس کا — ہر ایک رات بدلتا رہا ہے خواب اس کا
ازل سے برجِ عمل میں ہے آفتاب اس کا — کہن یہ دلکش ہمیشہ رہا شباب اس کا

جھکا دیا سرِ میداں سرِ عدو اس نے
سناں کی نوک پہ اچھالا ہے کوہِ نور اس نے

جواں ہے اب بھی دھنپرا[2] کا قصۂ شب تار — کیا جہاں پہ حلیفوں نے دشمنوں کو شکار
برس پڑے کبھی افرنگیوں پہ مثلِ شرار — فرس بڑھا کے کبھی تیز کر لی تیغ کی دھار

اُٹھے نڈر کے حوصلے جدھر بھی وار کیا
وطن کی خاک کو شیروں نے لالہ زار کیا

یہ سرزمیں کہ جسے رشکِ صد ارم کہیے — متاعِ قلب و نظر، قسمتِ امم کہیے
مگر طلسم زدہ مرکزِ ستم کہیے — زبانِ رہروِ منزل میں دشتِ غم کہیے

یہ رزم گاہِ دلیراں یہ آہوؤں کا ختن
ازل سے بیشۂ ضیغم ہے شیر خاں کا وطن

یہ کہہ کے ہو گئے رخصت سبھی بجز "اک حال" — ادب سے پھر وہ یہ بولا نہ تھی مری یہ مجال
مگر جب آ ہی گیا سامنے وطن کا سوال — تو عرض کر دوں خفیفت ہوا یہ دل میں خیال

عجیب کچھ ہے ادھر گلشنِ حیات کا رنگ
نہ موت کی ہی تمنا نہ زندگی کی امنگ

کبھی نہ ہوں گی مکمل وفا کی تفسیریں — ہر ایک صبح بدلتی رہیں گی تعبیریں
یہ زندگی کے مسائل یہ غم کی زنجیریں — میں چاہتا ہوں پھر اُبھریں یہیں سے تدبیریں

اٹھو کہ صبحِ گلستاں کو تابدار کریں
عروسِ عزم کو گل رنگ و گلعذار کریں

[1] سون ندی   [2] دھنپرا آرہ شہر سے کوئی بیس میل اُتّر پورب میں واقع ہے جہاں کنور سنگھ کے آدمیوں نے انگریزی فوج کو جو کیپٹن ڈنبر اور ڈنگلی کی قیادت میں آرہ ہاؤس کی طرف بڑھ رہی تھی، شکست دی تھی۔

جوگندر پال

بایاں سایہ

لاجو کے شوہر کی لاش جلتی رہی، لاجو کی بھری جوانی جلتی رہی، اُس کا سہاگ کا سرخ جوڑا جلتا رہا، اُس کی مسکراہٹیں جل جل کر راکھ ہوتی رہیں، مانو اُس کا ہنستا ہوا بے پروا مستقبل آنکھوں پر پٹی باندھ کر آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے اچانک ٹھوکر کھا کر آگ کی گود میں آگرا ہو!

لاجو کے پتی کو مرے سات روز ہو گئے تھے۔

بیوہ ساری پچھلی رات اپنے شیر خوار بچّے کو گلے لگائے پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ پو پھٹنے سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے اُس کی آنکھ لگ گئی لیکن تھوڑی دیر بعد وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔

"ارے، اُن کے دفتر کا ٹائم ہو گیا ہے اور میں ابھی تک سو رہی ہوں!"

"کس کے دفتر کا ٹائم؟" جیسے لاجو کے کلیجے پر زہر آلود تیر آ لگا ہو۔"

وہ سامنے دیوار کی طرف دیکھنے لگی جہاں 'اُن' کا مسکراتا ہوا فوٹو لٹک رہا تھا۔ لاجو کا شوہر جب کبھی اپنی بیوی کی جانب دیکھتا، بالکل اسی طرح مسکراتے ہوئے۔ اور پھر وہ بھی دانتوں میں اپنی چُنری کا کونہ دبائے مسکرانے لگتی۔ مگر آج فوٹو میں اپنے شوہر کی خنداں شکل کو دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں پانی اُمڈ آیا اور وہ اپنے خوابیدہ بچّے کو چارپائی سے اٹھا کر دیوانہ وار چومنے لگی۔

"لاجو بیٹی۔" اسی اثنا میں اُس کا بوڑھا سسر کمرے میں داخل ہوا۔

لاجو نے اپنے ننھّے کو چارپائی پر لٹایا اور آگے بڑھ کر اپنے سسر کے پاؤں چھونے لگی۔

"سسر[1]" لاجو کی خاموشی اُس کے سسر سے کہہ رہی تھی: "یہ سب کچھ کیا ہو گیا ہے پتا جی؟ میں کیا کروں؟" اُس کا دل چاہا کر وہ اپنے سسر کے پاؤں سے اُٹھ کر اُس کی چھاتی پر سر رکھے بچّوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے لیکن وہ آنسو پی کر چُپ چاپ ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

"قسمت کا لکھا کون مٹا سکتا ہے لاجو بیٹی۔ دھیرج رکھو، یہ لو گیتا، اسے پڑھ کر تمھارے جی کو شانتی ملے گی۔"

بیس سالہ لاجو نہایت ادب سے اپنے سسر سے گیتا لیتے ہوئے یوں نظر آ رہی تھی جیسے کوئی نوجوان جوگن پرتگیا لے رہی ہو کہ وہ سنسار کے سب سکھ تیاگ کر موت کی سرحد پر بیٹھی سارا جیون ایک ٹانگ پر تپسیا کرتے ہیں گزار دے گی۔

"ارے ارجن، تمھارا کام ہر حالت میں اپنا فرض بجا لانا ہے۔"

اپنے سسر کو کمرے کے باہر جاتے دیکھ کر لاجو نے قسم کھائی کہ وہ اپنا فرض کبھی نہیں بھولے گی۔ اپنے پتی کے پوتر نام کی مالا جپتے ہوئے اپنی عمر گزار دے گی۔ اپنے بچّے، اپنے پتی کے پیار کی متبرک امانت کی اعلیٰ پرورش کرنے کے لئے کمر باندھ کر کھڑی رہے گی۔ اور پھر جب ایک دن اُس کا بیٹا مسکراتے ہوئے اپنی کمر تان کر کھڑا ہو جائے گا اور بڑھاپے سے اُس کی اپنی کمر خمیدہ ہو جائے گی تو وہ ہر دم یہی دعا مانگے گی کہ اب اپنے من مندر کے دیوتا، اپنے پتی سے جا ملے، اُس کے قدموں پر گھٹنے ٹیک کر اُس کی آرتی اتارتی رہے۔

"اے ارجن، روح ہمیشہ زندہ رہتی ہے، جسم کی موت کے بعد بھی۔"

لاجو کے پتی کی روح سامنے دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویر میں سے جھانک جھانک کر اپنی وفادار نیک پتنی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکراتی رہی، مانو کرشن بھگوان

[1] ایبو انڈیں۔

گیتا کا اُپدیش دینے کے بعد ارجن کو آشیرواد دے رہے ہوں

لاجو اٹھ کر کھڑکی کے پاس آکھڑی ہوئی۔ سامنے سڑک کی ہر شے نے گویا اُس سے پوچھا "تم کہاں تھیں لاجو؟ آج کئی روز بعد کھڑکی کے پاس آئی ہو۔"

بائیں طرف کے آم کے درخت نے اپنے پہلو کی ایک عمارت سے کہا۔ "تم نہیں جانتیں؟ بے چاری کا پتی بیمار تھا۔"

"اب تمھارے پتی کا کیا حال ہے لاجو؟"

سڑک کی گیلی گیلی آنکھیں اُس عمارت کی جانب گھور گھور کر دیکھنے لگیں "بے وقوف! انجان!! مردے کا حال پوچھ کر لاجو کو اور رُلانا چاہتی ہو؟ جانتی نہیں پچھلے اتوار کو یہاں سے کس کا جنازہ گذرا تھا؟"

لاجو دوپٹے سے اپنی نم آلود سوجی ہوئی آنکھیں پونچھنے لگی

یہ سڑک! دو سال پہلے میں سہاگ کا سُرخ جوڑا پہن کر اِس لمبی سڑک پر سے گزرتے ہوئے یہاں اس مکان میں آئی تھی۔ تانگے میں میرے پہلو میں وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ بے تاب، نہایت خوش، بار بار کچھ گنگناتے ہوئے میرے کانوں میں کچھ کہنے کے خواہاں۔ اور میں شرما شرما کر اپنا گھونگھٹ اور نیچے لٹکا دیتی۔

یہ سڑک! ہر صبح سائیکل پر بیٹھے پیڈل گھماتے ہوئے وہ دفتر جانے کے لئے اس سیدھی لکیر پر دُور کہیں گم ہو جاتے۔ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوتے میں یہاں کھڑکی پر کھڑی دیر تک انھیں دیکھتی رہتی۔ اب وہ منڈو حلوائی کی دوکان کے بالکل سامنے ہیں۔ اب اپنے کسی دوست کو دیکھ کر رُک گئے ہیں۔ اب پھر سائیکل چلانے لگے ہیں۔ اب ڈاکٹر سیف الدین کی ڈسپنسری کے قریب پہنچ گئے ہیں (ڈاکٹر سیف الدین انھیں آخری انجکشن لگاتے ہوئے رو دیا تھا۔ بھلا کوئی ڈاکٹر اپنے مریضوں کو مرتے دیکھ کر رونے لگتا ہے؟)"

لاجو نے ایک بار پھر دوپٹے سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔

"اب وہ دُور نکل گئے ہیں۔ وہاں۔ وہ ہیں، اُس بس کے پیچھے پیچھے اب۔ اب، وہ نظر نہیں آتے۔ نہ جانے کہاں کھو گئے ہیں۔!

"یہ سڑک! دفتر سے لوٹتے ہوئے اُن کی نگاہیں اس کھڑکی پر جمی ہوتیں 'ہائے رام، سامنے اُس گاڑی کا بھی تو خیال کیجئے۔ میں یہاں کھڑکی سے بھاگی تو نہیں جا رہی۔

لاجو تم میکے نہ جاؤ، نہیں تو دفتر سے لوٹتے ہوئے تمھیں کھڑکی پر نہ پاکر میں اپنی سائیکل کا منہ تمھارے گاؤں کی جانب موڑ دوں گا۔

"پانچ بج کر پندرہ منٹ ہو گئے ہیں مگر ابھی تک وہ سڑک پر کہیں نظر نہیں آئے۔"

لاجو کھڑکی پر سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

یہ سڑک، جس کے پہلے دائیں موڑ پر تھوڑی دُور چلیں تو شمشان گھاٹ پر پہنچ جاتے ہیں۔ شمشان گھاٹ، جہاں پچھلے اتوار کو انھیں جلتا چھوڑ کر سب لوگ اپنے اپنے گھر لوٹ گئے۔ میں بھی گھاٹ کے دروازہ کی طرف پلٹنے لگی۔ اُن کی اداس شکل نے لاش سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں میں سے بار بار نکل کر مجھ سے پوچھا۔ تم بھی جا رہی ہو لاجو؟ مجھے جلتا چھوڑ کر جا رہی ہو؟ میرا جی چاہا کہ دوڑ کر اُن کی لاش سے لپٹ جاؤں۔ ستی ہو جاؤں مگر ایسا کرنے کی بجائے اپنے ننھے کو بازوؤں میں لئے میں چُپ چاپ گھر لوٹ آئی۔"

"اے ارجن! تیری قسمت کا فیصلہ بھگوان کے ہاتھ میں ہے۔ رونے دھونے کی بجائے تیرا کام ہر حالت میں اپنا فرض بجا لانا ہے۔"

لاجو پھر سڑک کی طرف دیکھنے لگی۔ تھوڑے فاصلے پر بائیں طرف ایک گلی سے زرق برق کپڑوں میں ملبوس ایک نیا نیا بیاہا ہوا جوڑا نمودار ہوا۔ انیس بیس سال کی لڑکی اور چوبیس پچیس سال لڑکا، دونوں کی چال بہکی ہوئی تھی۔ نظریں، گال، منہ، ہاتھ، کچھ پرے پرے، لیکن ایک دوسرے کو بھینچنے کے لئے بے قرار سے۔ وہ دونوں منڈو حلوائی کی دوکان پر آکھڑے ہوئے۔ منڈو حلوائی سے خوشبودار سفید سفید رس گلے لے کر کھانے لگے۔ اپنے رس گلے کو منہ کی جانب لے جاتے ہوئے ایک کی انگلیاں دوسرے کے منہ کی طرف اُٹھنے کو بے تاب ہوتیں، جیسے اُس کی خواہش ہو کہ وہ خود کھانے کی بجائے رس گلوں کا مزہ دوسرے کی زبان سے چکھے۔

لاجو سانس روک کر اُن کی پشتوں پر آنکھیں جمائے جانے کیا سوچتی رہی۔ پھر وہ دونوں منڈو حلوائی کی دوکان سے اٹھ کر آگے چلنے لگے، بظاہر پہلو بہ پہلو، بباطن بغلگیر۔ دائیں طرف لڑکا تھا، بائیں طرف لڑکی۔ اب وہ نیشنل بنک کے آگے اُس پیپل کے درخت کے نیچے سے گزر رہے تھے۔ اب نیشنل ... کے سامنے آگئے۔ اب اُن کی پیٹھیں واضح طور پر نظر نہیں آ رہی تھیں۔

دُور ان چلتے ہوئے دو دھندلے سایوں کو آنکھوں پر زور ڈال ڈال کر دیکھتے ہوئے لاجو کو ایسا معلوم ہوا جیسے بائیں طرف چلتے ہوئے سائے کی پیٹھ اُس کی اپنی پیٹھ ہے۔

اُس کا سر چکرانے لگا اور نیم بے ہوشی کی حالت میں گٹھڑی سی بنی وہ اپنے مرحوم شوہر کی مسکراتی ہوئی تصویر کے عین نیچے آگری۔

سنت رام

کنر لوگ

شملہ شہر سے کوئی ایک سو میل کے فاصلے پر شمال کی جانب، رامپور شہر کی سابق ریاست میں ایک نہایت خوبصورت اور دلکش علاقہ ہے۔ جسے لوگ کنور کے نام سے پکارتے ہیں۔ کنور کا علاقہ سابق مہاراجہ شہر کے دوسرے دارالخلافہ سراہن سے لے کر تبت کی سرحد تک پھیلا ہوا ہے وہاں کے پربت دیودار کے ہرے بھرے جنگلوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر کھڑے ہو کر چاروں طرف نظر دوڑانے سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا پہاڑوں کا راجہ ہمالیہ دھانی پوشاک پہنے عبادت الٰہی میں مصروف ہے۔ بنوں میں مختلف قسم کے پھولوں سے لدی ہوئی بیلیں اور جھر جھر بہتے والے ٹھنڈے اور شیریں پانی کے چشمے کنور کی خوبصورتی کو دوبالا کرتے ہیں۔ پھولوں کی خوشبو سے بسی ہوئی ہوا ساری فضا کو معطر رکھتی ہے۔ ستلج ندی کا بلور جیسا صاف پانی پربتوں کے ساتھ کھیلتا ہوا دلکش آواز کے ساتھ بہتا ہے۔ اس خوبصورت علاقے میں ایک قوم آباد ہے جسے عام لوگ کنورا کہتے ہیں۔ یہ وہی قوم معلوم ہوتی ہے جس کا ذکر ہماری قدیم کتابوں میں کنر کے نام سے ہوا ہے رنگ روپ اور شکل و شباہت سے یہ لوگ آریہ نسل کے معلوم ہوتے ہیں۔ چھریرا جسم، چوڑی پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں اور گورا رنگ، یہ سب باتیں آریہ قوم کے نشان ہیں۔ کنر عورتیں بڑی سمجھ دار اور خوش رو ہوتی ہیں۔ ان کا قدرتی حسن ایسا چمکتا ہے جیسے گدڑی میں لعل۔

کنر مرد اونی کپڑے کا کوٹ، پاجامہ اور ٹوپی پہنتے ہیں۔ عورتیں انگریزی گاؤن جیسا ایک اونی کپڑا پہنتی ہیں۔ اسے پہاڑی بولی میں "دوڑھو" کہتے ہیں دور سے دیکھنے پر گاؤن اور دوڑھو میں بہت کم فرق معلوم ہوتا ہے۔ دوڑھو کو اٹکائے رکھنے کے لئے ایک طرح کی سوئی یا بکسوا ہوتا ہے۔ جسے بیچوں کہتے ہیں عورتیں بھی ٹوپی پہنتی ہیں۔ ٹوپی کے آگے انگریزی ٹوپی کی طرح کپڑے کا ایک چھجا سا ہوتا ہے جو دھوپ سے ان کی آنکھوں کی حفاظت کرتا ہے۔ عورتیں عموماً گلے میں مونگے کی مالا اور دوتنی چونی وغیرہ کے ہار، کانوں میں بالیاں، ہاتھوں میں کنگن اور ناک میں نقرہ پہنتی ہیں۔ جسے کنر زبان میں گنڈی کہتے ہیں۔ خوبصورت اور بھڑکیلے کپڑے انھیں عموماً بہت کم میسر ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں اونی کپڑے ہی کا زیادہ رواج ہے۔ کنور میں زیادہ سردی پڑتی ہے اسی لئے کھیتی بہت کم ہوتی ہے۔ برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کے آس پاس تو سال بھر میں صرف گیہوں کی ایک ہی فصل ہوتی ہے اور وہ بھی تھوڑی سی۔ اس لئے اجناس کی یہاں بہت کمی ہے۔ مگر اس علاقے میں شفتالو بہت ہوتا ہے۔ لوگ اسے اکٹھا کر کے سکھا لیتے ہیں اور اس کے چھلکے کو پیس کر آٹا بنا لیتے ہیں اور اس سے خوراک کا کام لیتے ہیں۔ اسی خوراک کو وہ اپنی زبان میں 'پھمی' کہتے ہیں شفتالو کی گٹھلی توڑ کر اس کا بیج نکال لیتے ہیں۔ وہ کھانے میں بڑا لذیذ ہوتا ہے اس سے تیل بھی نکالتے ہیں۔ یہ لوگ یہی تیل استعمال کرتے ہیں۔

گیہوں کے علاوہ یہاں پھاپھرہ اور اوگلا نام کے دو اور موٹے اناج بھی ہوتے ہیں۔ گوشت، شراب اور چائے کا بھی یہاں بہت رواج ہے لیکن عورتیں شراب نوشی نہیں کرتیں۔ یہاں کے لوگ بڑے نرم مزاج اور ملنسار ہیں یہ بڑے موجی اور زندہ دل واقع ہوئے ہیں۔ ہر حال میں خوش اور مگن رہنا ان کی عادت ہے۔ یہاں کی عورتیں پردا نہیں کرتیں۔ گانے بجانے اور کھانے پینے کا سب کو شوق ہے۔ عورت، مرد اور لڑکے لڑکیاں سب مل کر

گاتے اور ناچتے ہیں۔ جلسوں اور میلوں میں عورت مرد برابر حصہ لیتے ہیں تہوار کے موقعہ یہ لوگ غسل کرتے ہیں پھر شام کو دیوتا کے مندر میں جاکر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کے قطار باندھ کر ناچتے اور گاتے ہیں۔ اگلی قطار میں عموماً مرد رہتے ہیں اور اُن کے پیچھے عورتیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مرد و عورت مل جُل کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اُن کا ناچ گانا دیکھ کر دل خوش ہو جاتا ہے

دن بھر کی کڑی مشقت کے بعد جب یہ لوگ گھروں کو لوٹتے ہیں تو عورت مرد ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے، دو دو کی قطار میں بلند آواز سے گاتے ہوئے چلتے ہیں۔ یہ بھی بڑا دلکش نظارہ ہوتا ہے۔ ان کا گانا دو دو چار چار گھنٹے چلتا ہے۔ اس کے علاوہ کھیت میں بیٹھی ہوئی دو چار نوجوان لڑکیاں جب مل کر گاتی ہیں تو اُن کی سریلی آواز پہاڑوں میں رقص کرنے لگتی ہے۔ ان لوگوں کو پھولوں سے بڑی محبّت ہے۔ اپنی ٹوپی میں پھول لگائے رکھتی ہیں۔

کنز لوگوں کی اپنی الگ زبان ہے۔ ہاں جن لوگوں کو دوسرے علاقے والوں سے کام پڑتا ہے وہ کام چلاؤ ہندی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور بول بھی لیتے ہیں۔ اُن کی زبان تبتی اور سنسکرت کا امتزاج معلوم ہوتی ہے مثلاً تمہارا نام کیا ہے؟ کنز زبان میں اس کا ترجمہ ہوگا "کین نامنگ جھد؟" ان لوگوں کے نام بھی زبان کے اعتبار سے تین طرح کے ہیں۔ خالص سنسکرت خالص تبتی اور تبتی و سنسکرت کے امتزاج سے۔ نیچے ہم تینوں طرح کی مثالیں دیتے ہیں۔ ناظرین دیکھیں گے کہ ان میں سے کئی نام کتنے دلکش معلوم ہوتے ہیں۔

۱۔ خالص سنسکرت نام۔ (مردوں کے نام)

پدم وید، اندر وید، اندر جیت، نرگیان، نکل، ترپال، دھرم راج

پدم داس، گیان وید، سرب جیت، سکھانند۔

(عورتوں کے نام)

چندرمنی۔ اندرمنی۔ ہیرامنی۔ دیوکلی۔ شام کلی۔ کُنتی۔ دروپدی۔ پریتیہ۔ گنگا داسی۔ دھرم داسی۔ انار داسی جیو داسی۔ شردھا۔

۲۔ خالص تبتی نام۔ (مردوں کے نام)

ڈنڈپ چھیتل۔ ٹاسی چھرنگ۔ چھرنگ ڈوپ۔ ینگ تن۔ گیال چھیدن

(عورتوں کے نام)

ٹاسی بوٹی۔ گنلیجو۔ رہا۔ چھرنگ ٹاشی۔

تبتی اور سنسکرت کی آمیزش سے (مردوں کے نام)

نرتن چھرنگ۔ ٹاشی رام جنم سُکھ۔ ینگ سُکھا رام۔

(عورتوں کے نام)

جنم منی۔ پتی چھو۔ جگت پوری۔ دمن جھی۔ چھارنگ پتی۔

یہ لوگ ہندو دھرم کے ماننے والے ہیں۔ لیکن بودھ دھرم کی بھی بہت سی باتیں ان میں پائی جاتی ہیں۔ ان لوگوں میں دیوی دیوتاؤں کی پوجا کا بہت رواج ہے۔ جگہ جگہ معبد بنے ہوئے ہیں۔ تجار نامی مقام پر اوشا دیوی کا ایک بڑا مندر ہے۔ تعلیم کی کمی کے باعث یہ لوگ عموماً ضعیف الاعتقاد ہیں۔ مگر اب تعلیم کا رواج ہوتا جا رہا ہے۔ ابتدائی سکول کھل رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ جلد ہی یہاں علم کی روشنی پھیل جائے گی اور یہ لوگ بھی ترقّی کے میدان میں آگے بڑھیں گے۔

اُن کے یہاں بیاہ کا رواج بڑا عجیب سا ہے گھر کے چھوٹے بڑے سب بھائی مل کر ایک بیوی رکھ لیتے ہیں۔ اس بیاہ کو یہ لوگ پانڈب بیاہ کہتے ہیں۔ بڑے بھائی کی بیوی سب بھائیوں کی بیوی سمجھی جاتی ہے۔ اس رواج کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ بہت سی عورتیں غیر شادی شُدہ یا کنواری ہیں۔ اگر اُن سے اس رواج کی وجہ پوچھی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارا دیش ٹھنڈا ہے۔ یہاں اناج بہت کم پیدا ہوتا ہے۔ سب بھائیوں کے الگ الگ بیوی رکھنے سے اولاد کی تعداد بہت بڑھ جائے اور اس کی پرورش کے لئے اس علاقے میں کپڑا اور خوراک ملنا دشوار ہو جائے۔

سب جائداد بڑے بھائی کو ملتی ہے۔ وہ اپنے سر پر لمبی چوٹی رکھتا ہے دوسرے سب بھائی سر منڈاتے ہیں۔

اس علاقے کی عورتیں بڑی محنتی ہوتی ہیں۔ وہ مردوں سے بڑھ کر کام کرتی ہیں۔ مرد ہل جوتتے ہیں۔ باقی کام — بیج ڈالنا، ترائی کرنا، کاٹنا اور مانڈنا وغیرہ یہ سب کام عورتیں ہی کرتی ہیں۔ انگریزی عملداری میں ریاست کے راجہ کے حکم سے ہر ایک مرد کو باری باری پر بیگار بھگتنی پڑتی تھی۔ تب کبھی کبھی مرد کی باری آنے پر عورتیں ہی بیگار کرآتی تھیں۔ یہاں کی عورتیں کماتی ہیں۔ اس لئے مردوں کے رحم و کرم پر نہیں ہیں۔ اگر خاوند بگڑ جائے، بدچلن ہو جائے یا بیوی پر ظلم کرے تو بیوی اُسے چھوڑ دیتی ہے۔ ایسے موقع پر ایک خاص رسم ادا کی جاتی ہے۔ اسے کنز زبان میں "شنگ لکاش مے" کہتے ہیں۔ پہلے معزز لوگوں کی

ایک پنچائت بلائی جاتی ہے۔ اس میں میاں بیوی دونوں اپنی اپنی شکائتیں پیش کرتے ہیں۔ تب پنچ لوگ شکائتوں کو دُور کرکے دونوں کو محبت سے رہنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ اگر دونوں مان گئے تو ٹھیک نہیں تو پتلی لکڑی کا ایک سرا عورت کے ہاتھ میں اور دوسرا مرد کے ہاتھ میں پکڑا دیا جاتا ہے۔ اور لکڑی درمیان سے توڑ دی جاتی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ "جاؤ تمہارا ازدواجی تعلق ختم ہو گیا۔ اب تم دونو آزاد ہو، جس سے چاہو دوبارہ شادی کر سکتے ہو۔"

ان لوگوں کی گھریلو زندگی بڑی دلچسپ ہے۔ چائے پینے اور کھانا کھانے وقت گھر والی نمکین چائے کی دیگچی سامنے رکھ لیتی ہے۔ سارا خاندان قطار باندھ کر اس کے چاروں طرف بیٹھ جاتا ہے وہ پیالیوں میں چائے ڈالتی جاتی ہے اور سب لوگ پیتے جاتے ہیں۔ ایک گھونٹ پی لیتے ہیں پھر پیالی کو زمین پر رکھ کر باتیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ پیالی میں چائے ختم ہو جانے پر کسی کو مانگنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ گھر کی مالکن خود سب کا خیال کرتی ہے۔ پیالی خالی نہیں ہونے پاتی کہ اس میں وہ اور چائے ڈال دیتی ہے۔

ہر ایک معزز گھرانے میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی عموماً عمر بھر مجرد رہتی ہے اور اپنی زندگی کو دھرم کی سیوا میں لگاتے ہیں۔ کنرّ زبان میں مجرد لڑکی کو "زومو" اور مجرد لڑکے کو "لاما" کہتے ہیں۔ ہر طرح کی نفسانی بُرائی سے بچے رہنا اُن کے لئے لازمی ہے۔

بھادوں کے مہینے میں کنور کے علاقے میں ایک بڑا میلہ ہوتا ہے جسے "پھلائچ" کہتے ہیں۔ اس میلے میں خوب راگ رنگ اور ناچ گانا ہوتا ہے۔ اس میلے کے ساتھ سال بھر کی رنجشیں، ماتم اور دُکھ درد ختم ہو جاتے ہیں۔ سال میں اُن کے ہاں مختلف موقعوں پر کوئی دس میلے ہوتے ہیں۔ ان میں یہ لوگ خوب کھاتے پیتے اور گاتے بجاتے ہیں۔ میلے کے دن کھانے پینے کا سامان لے کر وہ جنگل میں جاتے ہیں۔ سارا دن وہاں کھیل کود میں گزار کر شام کو گھر واپس پہنچتے ہیں۔

باضابطہ منڈیاں اور کاشتکار

آج بھارت میں لگ بھگ ۱۸۰۰ بڑی بڑی منڈیاں ہیں جن میں سے ۵۹۴ منڈیوں کو زراعتی پیداوار کی منڈیوں کے قوانین کی رو سے باضابطہ بنایا جا چکا ہے توقع ہے کہ دوسرے پلان کے آخر تک مزید ۲۱۰ منڈیوں کو باضابطہ بنا دیا جائے گا کیونکہ دوسری ریاستوں میں بھی اس سلسلے کے قوانین بن جائیں گے۔ ایک ہزار کے لگ بھگ تھوک منڈیاں اب بھی قوانین کے دائرے سے باہر ہوں گی۔ تجویز ہے کہ تیسرے پلان میں وہ بھی باضابطہ بنا دی جائیں۔

جن جن علاقوں میں زرعی منڈیوں کو باضابطہ بنا دیا گیا ہے وہاں مارکیٹنگ کی حالت میں بہت حد تک سدھار ہو گیا ہے۔ پُرانی منڈیوں میں جو خرابیاں ایک عرصے سے چلی آرہی تھیں وہ ختم ہو رہی ہیں اور لین دین ایمانداری کے ساتھ ہونے لگا ہے۔ پھر باہمی مقابلے بھی صحت مند بنیادوں پر ہوتے ہیں۔ منڈیوں میں کسانوں کو مختلف قسم کی فیس اور کمیشن دینا پڑتا تھا۔ تول اور ماپ میں بھی کمی بیشی کر دی جاتی تھی۔ ناجائز کٹوتیاں کی جاتی تھیں اور مال بیچنے اور خریدنے والوں کے مابین آئے دن جھگڑے اٹھ کھڑے ہوتے تھے یہ ساری خرابیاں اب دورِ ماضی کی بھولی بسری باتیں ہو کر رہ گئی ہیں۔

باضابطہ منڈیوں میں فروخت کا مال لمبے چوڑے صحن میں رکھا جاتا ہے۔ پھر کینٹینیں بھی ہوتی ہیں اور کسانوں کے لئے آرام گھر ہوتے ہیں۔ مال نیلام کرنے کے لئے گودام اور شیڈ بھی ہیں۔ اب باضابطہ منڈیاں کسانوں میں زیادہ سے زیادہ مقبول ہوتی جا رہی ہیں۔ کسانوں کو اپنے حقوق کا احساس ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے مشکل ہی سے دس فی صدی کسان تھوک منڈیوں میں اپنی زرعی پیداوار لاتے تھے۔ لیکن اب ان کی تعداد ۶۰ فی صدی ہو گئی ہے بعض بعض منڈیوں میں تو ۹۰ فی صدی کسان ہی اپنا مال لاتے ہیں۔

باضابطہ منڈیاں مشترکہ فائدے کے لئے چلائی جاتی ہیں۔ ہر باضابطہ منڈی کو چلانے کے لئے ایک مارکیٹ کمیٹی ہوتی ہے جس میں کاشتکاروں، بیوپاریوں اور مقامی تنظیموں کے نمائندے ہوتے ہیں۔ ان کمیٹیوں میں اکثریت کسانوں کی ہوتی ہے۔ بہت سی کمیٹیوں کے چیئرمین کسان ہی چُنے گئے ہیں یہ کمیٹیاں منڈیوں میں کام کرنے والے تمام اشخاص کو لائسنس دیتی ہیں۔ کاشتکار منڈیوں کے بارہ میں تازہ ترین معلومات بھی انہیں کمیٹیوں سے حاصل کرتے ہیں۔

نئی کتابیں اور رسالے

مشرق و مغرب کے نغمے

مصنف میراجی۔ پبلشرز [illegible] قیمت [illegible] روپے [illegible] تقطیع [illegible] کاغذ [illegible] کتابت عمدہ، کپڑے کی خوبصورت جلد [illegible] آغاز صلاح الدین احمد نے لکھا ہے اور میراجی کے فن پر فیض احمد فیض کا [illegible] ہے۔ میراجی کی نثر کے باب میں صلاح الدین احمد صاحب لکھتے [illegible] کی تیزی [illegible] جس کی شوخی اور جس کی متانت [illegible] جس کی [illegible] اور جس کی سادگی، جس کی نزاکت اور جس کی اشتریت جس کا تنوع اور جس کا [illegible] دیدنی ہے گفتنی یا شنیدنی نہیں۔۔۔۔۔۔"

میراجی کے ۱۳ مضامین مشرق اور مغرب کی شاعری سے متعلق اس کتاب میں [illegible] ہندوستانی شاعروں میں چنڈی داس، ودیاپتی اور امارو کا ذکر ہے، کوریا اور چین کے شعراء کا ذکر ہے [illegible] کے گیت پر ایک مقالہ ہے۔ فرانس [illegible] انگلستان، روس اور امریکہ کے شعراء پر متعدد مقالے ہیں۔ یہ مضامین رسالہ ادبی دنیا لاہور میں ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۲ء کے درمیان شائع ہوئے تھے۔ یہ تحریریں [illegible] ادب عالم کے [illegible] شعراء کو [illegible] حاصل ہو گی [illegible] ان کے فکر کو ایک ایسی بنیاد ملے گی جس پر وہ اپنی تخلیق [illegible]

زبان و بیان

[illegible] انصاری [illegible] کتاب گھر کلاں محل [illegible] قیمت [illegible] صفحات [illegible] تقطیع [illegible] کتابت اوسط، طباعت [illegible] کاغذ اوسط، جلد اور جلد پوش [illegible] آٹھ منتشر مضامین اس مجموعے میں [illegible] شامل [illegible] خود [illegible] کہ ان کا [illegible] غزل باقی رہے گی [illegible] کہ اگر [illegible] بدل چاہتے ہیں یہی مضمون زیادہ [illegible]

بھی سے [illegible] انصاری رائے قائم کرتے وقت حق وناحق کی پروا نہیں کرتے۔ [illegible] کی انتہاپسندی ان کے مضامین سے [illegible] ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے غزل کو بہت ملعون کیا ہے۔ خود ہی فرماتے بھی ہیں کہ ردو کی سے غالب تک قریب قریب [illegible] سو برس کا فاصلہ ہے اور غزل کی اس دور میں ایران و ہندوستان میں قدر ہوئی۔ لیکن شاید انھیں نہیں معلوم کہ غالب کے بعد یہاں تک غزل کتنے مدارج ترقی طے کر چکی ہے۔ ہر وہ بات جو [illegible] انصاری اور ان کے ہم خیال ادیب [illegible] چاہتے ہیں غزل میں موجود ہے۔ یہ حیثیت [illegible] ہے۔ ہاں اگر اردو غزل گوئی کی پستی اور انحطاط کے دور کو ذہن میں رکھ کر غزل کو ملعون کیا جائے تو اس کا علاج کون کر سکتا ہے

پیاس

نوجوان [illegible] کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ صفحات ۲۰۸ تقطیع [illegible] ناشر فکر جدید [illegible] عالم باغ لکھنؤ۔ قیمت دو روپے پچاس پیسے کتابت، طباعت، کاغذ، جلد، جلد پوش اوسط۔ ان نفسیاتی افسانوں میں اجتماعی زندگی کی سماجی کشمکش تو نہیں لیکن انفرادی مسائل کچھ ایسے انداز سے پیش کیے گئے ہیں کہ افسانوں کی افادیت میں فرق نہیں آتا۔ مصنف کے ذوق ادب سے ہمیں امید ہے کہ وہ مستقبل میں [illegible] تخلیقات دنیائے ادب کے سامنے پیش کریں گے۔

نئی دھرتی پرانے گیت

رام لعل کے افسانوں کا مجموعہ۔ ناشر فکر جدید [illegible] عالم باغ لکھنؤ یا ۵۶۲۶ قطب روڈ نئی دہلی۔ صفحات ۲۰۸ تقطیع [illegible] کاغذ، کتابت طباعت، جلد، جلد پوش اوسط۔

رام لال اردو ادب کے جانے پہچانے افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں میں حقیقت نگاری ہے۔ وہ صرف فن کا پورا لحاظ بھی رکھتے ہیں۔ ان [illegible] معلومات



RP. 168-X52 UD

ہندوستان لیور لمیٹڈ نے رکسونا پروپرائٹری لمیٹڈ آسٹریلیا کیلئے ہندوستان میں بنایا۔



Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi—8
and Printed by the Model Press Private Ltd., Delhi.

Regd. No. D-509.